

# ترجمان السنہ

عربی-اردو

سوئم

استاذ المحدثین زیدۃ الفقہاء، فخر العلماء  
حضرت مولانا بیدار عالم حبیب میاں صاحب مدظلہ العالی قدس سرہ

نہج



مکتبہ رحمانیہ

اقرء سننہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور



# ترجمان السنۃ

عربی-اردو جلد سوئم

جدید دور کی ضرورت کے مطابق جدید عنوانات اور  
مباحث کے ساتھ احادیث مبارکہ کا مستند جامع اور خوبصورت مجموعہ

استاذ المحدثین زیدۃ الفقہاء فخر العلماء  
حضرت مولانا بک زب عالمی صاحب مدظلہ العالی قدس سرہ

مکتبہ رحمانیہ © اقترا سنٹر لاہور  
غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار



## کتاب کی تخریج و کتابت کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	ترجمان السنۃ
مؤلف	حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی
طابع	مقبول الرحمن
ناشر	مکتبہ رحمانیہ
مطبع	لٹل سٹار

## ملنے کے پتے

- ⇐ مکتبۃ العلم نمبر ۱۸ اردو بازار لاہور
- ⇐ خزانہ علم و ادب الکرم مارکیٹ اردو بازار لاہور
- ⇐ اسلامی کتب خانہ فضل الہی مارکیٹ اردو بازار لاہور
- ⇐ مکتبہ سید احمد شہید الکرم مارکیٹ اردو بازار لاہور
- ⇐ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی



## فہرست مضامین ترجمان السنۃ جلد سوم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
	یہ اعتقاد رکھنا کہ فرمانبرداروں کو دوزخ میں ڈال دینا یا نافرمانوں کو جنت بخش دینا مختار کل کی بارگاہ میں دونوں باتیں انصاف ہیں مسئلہ قدر کی جان ہیں ۶۶	۱۱	دیباچہ
	بندے اپنے افعال میں مختار ہیں ان کے اس اختیار سے کرایا وہی جاتا ہے جو پہلے مقدر ہو چکا ہے اس لئے وہ مجبور بھی ہیں ۶۹	۱۷	اعتراف و اعتذار
۷۲	حکم عدولی کے لئے تقدیر کا عذر تراشنا و انہیں مصیبت میں تقدیر کا سہارا لینا حضرت آدم علیہ السلام کی سنت ہے ۷۳	۲۰	القضاء و قدر اور اس پر ایک لمحہ فکریہ
۷۶	قضاء و قدر کے احاطہ سے کوئی شے باہر نہیں کائنات کا ذرہ ذرہ قضاء و قدر کے فولادی پنچہ میں کسا ہوا ہے ۸۱	۳۱	مسئلہ قضاء و قدر علمی نظر میں
	حق تعالیٰ کے علم ازلی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی قضاء و قدر کے تحتانی مراتب میں تبدیلی بھی ہو جاتی ہے ۹۳	۳۱	قضاء و قدر اور اکتشافات عصریہ کا اس پر اثر
	دنیا میں لوگوں کی جو کچھ بھی جدوجہد نظر آ رہی ہے درحقیقت یہ تقدیر ہی کی خفیہ کار فرمایاں ہیں ۹۸	۳۱	قضاء و قدر اور انسانی جدوجہد سے اس کا تعلق
	دنیا کے واقعات کے ساتھ ان کے اسباب بھی قضاء و قدر کے تحت ہی ہوتے ہیں۔ ۹۹	۳۳	قضاء و قدر کی حقیقت اور شرعی نظر میں اس کی اہمیت
	قضاء و قدر کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ نظام تقدیر اور نظام تدبیر ٹکرائی نہیں ۱۰۳	۳۴	مسئلہ مذکورہ میں زمانہ قدیم کے چیدہ خیالات اور مذہب اہل حق کی توضیح و تحقیق
	قضاء و قدر کا اعتقاد اسباب کے ارتکاب سے نہیں روکتا بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے ۱۰۷	۳۸	مسئلہ تقدیر کے لاینحل ہونے کا راز
	قوت ارادیہ کے استحکام میں قضاء و قدر پر اعتقاد کا	۴۱	نا تمام اختیار کا فائدہ
		۴۳	فرقہ قدریہ کی مختصر تاریخ اور ان کے کفر کی ضروری تنقیح
		۴۷	قضاء و قدر کے مسئلہ میں امام ترییدی کے مسلک کی اہم توضیح
		۵۲	قضاء و قدر پر ایمان لانا اسلام کا ایک رکن ہیں
			منکرین تقدیر کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید کلمات
		۵۵	قضاء و قدر لکھی جا چکی ہے
		۵۷	قضاء و قدر کی کتابت عالم کی پیدائش سے کتنی قبل ہوئی
		۶۰	قضاء و قدر میں بحث و مباحثہ سے گریز کرنا چاہئے
		۶۱	قضاء و قدر میں گفتگو کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے
		۶۲	قضاء و قدر کے فیصلہ پر رضا مندی ضروری ہے اور یہ انسان کی بڑی سعادت کی علامت ہے
		۶۳	



۱۳۰	مصالح عام کی رعایت ہے	۱۱۲	عجب اثر ہوتا ہے۔
۱۳۲	حلال و حرام کا صحیح مفہوم		حضرت انبیاء علیہم السلام کی مقدس ہستیوں کا مختصر
	علوم نبوت کی دوسری خصوصیت حقیقت کی صحیح ترجمانی	۱۱۷	تذکرہ احادیث اور تاریخ کی روشنی میں
۱۳۲	ہے	۱۱۷	انبیاء علیہم السلام کا مقام ابن سینا کی نظر میں
۱۳۲	علوم نبوت کی تیسری خصوصیت جزم و قطعیت ہے	۱۱۷	فلاسفہ کے نزدیک نبوت کیوں کسی چیز تھی
	انبیاء علیہم السلام کے رشد و ہدایت اور جمیع کمالات کی		اسلامی الفاظ و اصطلاحات کا صرف استعمال کرنا کافی
۱۳۳	نوع علیحدہ ہوتی ہے		نہیں جب تک کہ ان کی اس حقیقت کا اعتراف بھی نہ
	نبی کی عام صفات کی حقیقت بھی مخلوق کی عام صفات	۱۱۸	ہو جو اسلام نے بیان کیا ہے
۱۳۴	سے علیحدہ ہوتی ہے		حضرت شاہ ولی اللہ کی نظر میں نبوت کی حقیقت اور اس
۱۳۶	قرآن کریم اور دیگر معجزات میں ایک خاص امتیاز		کے ارکان ثلاثہ یعنی ملوکیت و سیاست و علم و حکمت اور
	حافظ ابن تیمیہ کی نظر میں انبیاء علیہم السلام کی معرفت کا	۱۱۹	رشد و ہدایت کی فطری اور غیر معمولی استعداد
	طریقہ بھی دوسرے انواع انسانی کی طرح ان کے	۱۲۰	تعلیمات نبوت کے متعلق ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ
۱۳۷	امتیازات و خواص ہیں	۱۲۲	نبوت کے ارکان ثلاثہ کی مزید تشریح
	نبوت و رسالت کی حقیقت دریافت کرنی گو مشکل ہے		مقدمہ ہر شے کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک
۱۳۸	مگر نبی کی معرفت بدیہی ہے	۱۲۲	حقیقت مگر اعتبار کا ہی اور کمال مجموعہ میں ہے
	انبیاء علیہم السلام جب کبھی دنیا میں تشریف لائے ہیں تو	۱۲۲	ملوکیت کی صورت اور اس کی حقیقت
۱۴۰	اپنے کامل تعارف کے ساتھ آئے ہیں	۱۲۳	ملوکیت نبوت کی صورت و حقیقت
۱۴۱	مشرکین عرب نے آپ کو ساحر و مجنون کیوں ٹھہرایا	۱۲۵	ملوکیت نبوت کا اہم رکن عالم غیب سے اس کا رشتہ ہے
۱۴۲	نبوت کے صدق و صفا کا بلند مقام	۱۲۷	ملوکیت نبوت کی حقیقت خلافت ہے
	قرآن کریم کا مشرکین کے مقابلہ میں اعلان کہ آپ		نبوت کے لئے قدرت جن نفوس کا انتخاب کرتی ہے
۱۴۳	ہرگز کاہن نہیں	۱۲۸	ان میں اعلیٰ قابلیتیں بھی ودیعت فرمادی ہیں
۱۴۴	قرآن کریم کا اعلان کہ آپ شاعر بھی نہیں		آدم علیہ السلام کی سرگزشت میں اسی حقیقت پر ایک
	قرآن کریم کا اعلان کہ آپ کو ساحر و مجنون کہنا بھی	۱۲۸	اہم تنبیہ
۱۴۵	انتہا درجہ ظلم اور سفاکت ہے		آدم علیہ السلام اور ملائکہ اللہ میں مقابلہ کا امتحان اور
۱۴۶	حافظ ابن تیمیہ کی تحقیق کہ نبی و ساحر میں فرق بدیہی ہے	۱۲۹	اس کا نتیجہ
	مشرکین کے لیے حقیقت اعتراض کی طرف قرآن	۱۳۰	نبوت کا رکن ثانی یعنی علم و حکمت
۱۴۷	کریم کے التفات فرمانے کی حقیقت		علوم نبوت کی پہلی خصوصیت حقوق انسانیت کا تحفظ اور



۲۳۷	علاج اسی طرح کیا جیسا بشر کرتے ہیں	۱۴۹	آپ کی صفات حمیدہ کے مشاہدہ کر لینے کے باوجود ابتداء میں مشرکین عرب نے آپ کو کیوں نبی نہیں مانا؟
۲۳۸	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان امور کی فکر لاحق ہوتی تھی جن کی فکر بشر کو فطرۃ لاحق ہوتی چاہئے	۱۵۱	ضرورت نبوت و رسالت
۲۳۹	بشری سنت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر آخرت	۱۵۸	رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک ورق حق پسند انسانوں کے غور و فکر کے لئے
۲۴۰	حضرات انبیاء علیہم السلام میں بہت سی خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ تمام نوع بشر سے ممتاز بھی ہوتے ہیں	۱۶۱	جن کو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور ان کی خصوصیات کا ذرا بھی علم تھا وہ ان کو دیکھ کر یا ان کے مختصر حالات زندگی سن کر فوراً ان کو پہچان لیتے تھے
۲۴۱	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی امتیازی خصوصیت	۲۱۵	انبیاء علیہم السلام میں وہ اخوت نبوت ہوتی ہے کہ ان میں ہر ایک دوسرے کے لئے ہمہ تن احترام ہوتا ہے اور ان میں کہیں اختلاف کا نام و نشان نہیں ملتا
۲۴۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کا ایک کرشمہ	۲۲۵	انبیاء علیہم السلام سب بشر تھے اور سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے اور اللہ تعالیٰ کی جو سنت نوع بشر کے لئے ٹھہر چکی ہے وہ ہمیشہ ان پر بھی جاری ہوتی چلی آئی ہے
۲۴۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک کی امتیازی خصوصیت	۲۳۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی شدت اسی طرح پس آئی جیسا عام بشر کو بھی پیش آ جاتی ہے
۲۴۴	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت سامعہ کی امتیازی خصوصیت	۲۳۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھونے ایک بار کاٹا اور آپ نے اس پر اسی طرح دم فرمایا جیسا بشر کو دم کرنا چاہئے
۲۴۵	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت ذائقہ کی امتیازی خصوصیت	۲۳۴	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو چلایا گیا اور آپ پر بھی اسی طرح چل گیا جیسا عام بشر پر چل جاتا ہے
۲۴۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت بینائی کی امتیازی خصوصیت	۲۳۶	ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کھلایا گیا اور اس کے اثرات سے آپ کو بھی اسی طرح تکلیف ہوئی جیسی بشر کو ہونی چاہئے
۲۴۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کی خصوصیت	۲۳۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار زخمی ہوئے حتیٰ کہ آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے آپ نے اس کا
۲۴۸	وفات سے قبل انبیاء علیہم السلام کی اپنی حیات و موت میں اختیار ملنے کی خصوصیت		
۲۴۹	وفات کے وقت انبیاء علیہم السلام کو پھر اختیار ملنے کی خصوصیت		
۲۵۰	بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی خصوصیت		
۲۵۱	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز جنازہ کی ایک امتیازی خصوصیت		
۲۵۲			



۲۸۸	اہل جنت سے دوسری مشابہت ان کی دائمی حیات اور دائمی عبادت ہے	۲۵۴	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ کی غیبی تفریت کی خصوصیت
۲۹۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی فضلات میں اہل جنت سے مشابہت	۲۵۵	انبیاء علیہم السلام کے دفن میں امتیازی خصوصیت
۳۰۱	بحالت جنابت آپ کے لئے مسجد میں قیام کی اجازت اور اس میں اہل جنت کی ایک مشابہت	۲۵۶	انبیاء علیہم السلام کی وراثت میں امتیازی خصوصیت
۳۰۳	کثرت ازواج میں انبیاء علیہم السلام کو اہل جنت سے مشابہت	۲۵۶	فرشتوں کے ساتھ آپ کی ہم کلامی کی خصوصیت
۳۰۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں قدرت کے بعض تکوینی اسرار	۲۵۹	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنت و دوزخ کے تمثیل کی خصوصیت
۳۱۵	انبیاء علیہم السلام میں اہل جنت کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں	۲۶۱	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جنت و دوزخ کے مشاہدہ فرمانے کی خصوصیت
۳۱۵	مسئلہ عصمت میں اختلاف کا سبب	۲۶۱	انبیاء علیہم السلام کی سب سے ممتاز خصوصیت وحی نبوت ہے اور اب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے
۳۱۵	عصمت کی حقیقت امام ماتریدی کی نظر میں	۲۶۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم غیب سے تعارف کی ابتداء
۳۱۶	مؤلف کے نزدیک مسئلہ عصمت میں غور و خوص کے لئے سب سے اہم نقطہ انبیاء علیہم السلام کی صفات و ملکات سے بحث ہے	۲۶۶	وحی کی اقسام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید ترویجی اور وحی کی آواز
۳۱۹	انبیاء علیہم السلام کا جو ہر فطرت	۲۶۸	فرشتہ کا غیبی طور پر قلب میں کوئی بات ڈالنا
۳۲۰	انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے لئے اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں	۲۷۲	الرؤیا (خواب)
۳۲۰	انبیاء علیہم السلام پیدائشی طور پر نفس مطمئنہ رکھتے ہیں اور ضلالت کی تمام طاقتیں ان کے سامنے سرنگوں ہوتی ہیں	۲۷۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کا ایک منظر
۳۲۲	انبیاء علیہم السلام کی برکات اور صحابہ اور ماحول پر	۲۷۵	وحی اور اس کا وزن آپ کے صحابہ پر
۳۲۳	انبیاء علیہم السلام کے خصائل و عادات کا اثر ان کی امتوں پر اسی طرح ہوتا ہے جیسا والد کا اس کی اولاد پر بلکہ اس سے بڑھ کر	۲۷۸	نزول وحی کے وقت آپ کی اور اونٹنی کی بے چینی
		۲۷۹	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ پر وحی آرہی ہے
		۲۸۰	انبیاء علیہم السلام کو اپنی صفات میں اہل جنت کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے ان کے جسم تغیر سے محفوظ رہتے ہیں
		۲۸۱	



۳۷۰	اس کا یقین	۳۲۲	عصمت کے ارکانِ اربعہ
۳۷۱	نبیؐ کی مبارک نظر میں متاعِ دنیا کی حقیقت	۳۲۵	یہاں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام کا اپنی عصمتوں کے متعلق نظریہ کیا ہے
۳۷۲	نفرت و بیداری	۳۲۵	مسئلہ عصمت کی بحث میں ایک فروگزاشت
۳۷۵	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جزم و یقین کہ آخرت میں آپ سے کوئی مواخذہ نہیں	۳۲۶	حضرت آدم علیہ السلام کی ذلت قرآن کریم کی نظر میں
۳۸۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے لئے اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ نمونہ تھے	۳۲۷	مقام عصمت کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شانِ رفیع میں کسی ناشایاں عمل کی صورت بھی حقیقت کی برابر شمار ہو
۳۸۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہر عمل میں لازم ہے	۳۳۰	انبیاء علیہم السلام کی شانِ استغفار عصمت کے خلاف نہیں
۳۸۸	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل میں اتباع کرنے میں پس و پیش کرنا آپ کے غصہ کا موجب ہے	۳۳۲	انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ اللہ کی عصمتوں میں فرق
۳۹۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات پر خاموشی بھی شریعت میں اس کے جواز کے قطعی دلیل ہے	۳۳۸	مکتوب حضرت مولانا نانوتویؒ اور معصومیت انبیاء علیہم السلام وہم تحقیق حقیقت کل طبعی
۳۹۳	رسول اگر معصوم نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ روئے زمین کے حق میں اس پر کیسے اعتماد کر سکتا ہے؟	۳۳۹	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہدِ طفولیت
۳۹۶	اگر انبیاء علیہم السلام معصیت کریں (والعیاذ باللہ) تو ان کی امتیں گمراہ ہو کر رہ جائیں	۳۵۱	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہدِ شباب
۳۹۷	آپ کی عصمت کے خلاف قلب میں وسوسہ بھی ایسی خطرناک بات ہے جس سے ہلاکت کا خطرہ ہے	۳۵۵	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عصمت کا رعب و دبدبہ اور گمراہی کی طاقتوں کا اس کے سامنے سپر ڈالنا
۳۹۸	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تشریع میں	۳۶۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم شکل بننے سے شیطان کا عاجز رہنا
۴۰۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کی عصمت	۳۶۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ کا شیطانوں پر خوف اور ڈر
۴۱۰	انبیاء علیہم السلام سے بددعا کیے کلمات کا بر محل صدور بھی صرف بشریت کی بناء پر ہوتا ہے	۳۶۷	آپ کے خاص محلِ بعثت میں شیطانوں کی مایوسی
۴۱۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ استغنی	۳۶۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرتِ سلیمہ کی پاکیزگی۔
۴۱۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبادت	۳۶۹	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر الہی سطوت و جبروت کا استیلاء
۴۱۷	حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعداد		آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ آخرت کا استحضار اور



۴۸۵	کے بجائے تخریب عالم کے نظم و نسق پر قیاس کرنا چاہئے	۴۱۸	نبی کے معنی
۴۸۸	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جزئی معاملات کی اہمیت	۴۱۹	نبی اور رسول کا فرق
۴۸۹	مسئلہ نزول کی حیثیت احادیث میں	۴۲۰	علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل کا مقصد
۴۸۹	مسئلہ نزول کی حیثیت انجیل میں	۴۲۰	وحی کا عام اطلاق
۴۹۱	مسئلہ نزول کی حیثیت قرآن کریم میں	۴۲۱	رسالت کے عام معنی
۴۹۱	مسئلہ نزول کی اہمیت اور اصول دین سے اس کا تعلق	۴۲۱	بعثت کے دوسرے معنی
۴۹۲	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اہمیت تاریخی نظر میں		سیدنا و سید ولد آدم الرسول الاعظم محمد
۴۹۲	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اہمیت تاریخ کی نظر میں		النبی الامی المطلبی الهاشمی اولہم خلقاً و
۴۹۳	کیوں ہیں؟	۴۲۳	آخر ہم بعثاً صلوات اللہ و سلامہ علیہ
۴۹۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی تو نصاریٰ اور اہل اسلام خاص طور پر ان ہی کی حیات کے قائل	۴۳۶	ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام اولی نبی اللہ فی الارض
۴۹۳	کیوں نہیں؟	۴۴۸	سیدنا ادریس علیہ الصلوٰۃ والسلام
۴۹۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر وفات پا چکے ہیں تو ان کے متعلق حدیث و قرآن میں کہیں موت کا صاف لفظ	۴۵۰	سیدنا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام
۴۹۳	کیوں نہیں؟	۴۵۰	اول آنحضرت الی الارض
۴۹۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا مسئلہ عام انسانوں کی موت پر قیاس کرنا صحیح نہیں	۴۵۲	سیدنا ہود علیہ السلام
۴۹۵	حیات و موت کا مسئلہ دنیا کے عام واقعات میں شامل ہے پھر قرآن و حدیث میں اس کی اہمیت کیوں ہے؟	۴۵۶	سیدنا صالح علیہ السلام
۴۹۵	خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں لفظ نزول کی اہمیت		سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام خلیل اللہ وجد سیدنا
۴۹۶	غیر موقت پیشین گوئیوں کا انکار یا تاویل دونوں خطرناک اقدام ہیں	۴۶۱	حبیب اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام
۴۹۷	قرآن کریم میں نزول کا مسئلہ بھی رفع جسمانی کی طرح صاف طور پر کیوں ذکر میں نہیں آیا؟	۴۶۸	سیدنا اسمعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ذبیح اللہ
۴۹۸	قرآن کریم کے رفع جسمانی اور حدیث کے نزول جسمانی کے اہتمام فرمانے کی حکمت	۴۷۴	حضرت موسیٰ کلیم اللہ
۴۹۹		۴۸۳	حضرت داؤد علیہ السلام
		۴۸۴	حضرت سلیمان علیہ السلام
			سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ کی ایک اہم سرگزشت کے متعلق چند جدید علمی اور منصفانہ نکات
		۴۸۵	قرآن و حدیث اور تاریخ کی روشنی میں
		۴۸۵	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی بڑی علامت ہے اس لئے اس کو عالم کے تعمیری نظم و نسق

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جتنی تفصیلات ثابت ہو چکیں کیا اس کے بعد بھی یہاں تاویل کرنا معقول ہے	۵۰۱	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے واقعہ میں لفظ مکر کا استعمال بھی ہوا ہے۔ ہر دو مقامات پر تدبیر الہی اور اس کا موازنہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں سب سے زیادہ اہم لفظ رفع کا ہے توفی کا لفظ قرآن کریم کی نظر میں اتنا اہم نہیں	۵۰۲	شان برتری کا اس میں ظہور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب و رفع کی تحقیق قرآنی روشنی میں
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ پوری تفصیلات کے ساتھ زیر بحث آچکا ہے یہاں ان کے معاملہ میں ایک ایک لفظ پر علیحدہ بحث معقول نہیں	۵۰۲	حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لانے کے بعد جملہ اہل اسلام کے نزدیک بھی وفات پائیں گے زیر اختلاف ان کی گزشتہ موت ہے
اسلام صرف علمی حدیث نہیں بلکہ سلف صالحین سے اس کی عملی صورت منقول چلی آتی ہے لہذا محض کتب لغت کی حدود سے اس کی کوئی اور شکل بنالینا درست نہیں	۵۰۳	حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی تحقیق امام بخاری کی کتاب التفسیر میں حل لغات کا حصہ خود ان کا تصنیف کردہ نہیں بلکہ امام ابو عبیدہ کا ترتیب دادہ ہے
حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق آیات پر غور کرنے قبل یہاں ان کے مقدمہ کی پوری وہ روئداد جو قرآن کریم نے نقل فرمائی ہے اور فریقین کے بیانات پیش نظر رکھنا ضروری ہے	۵۰۵	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمات میں صلیب شکنی کا نکتہ قرآن کریم کی شان اس سے کہیں اعلیٰ وارفع ہے کہ وہ دشمنان اسلام کے خوف سے حقائق کے بیان کرتے میں ادنیٰ پس و پیش بھی اختیار کرے
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے اور ان کے عزت سے مرجانے کی جدید داستان صلیبی موت کا لغتی ہونا اور اس کے مقابلہ میں عزت کی موت کا افسانہ اسلام میں بالکل بے اصل بلکہ معقول ہے	۵۰۶	شبہات اور وساوس کا اثر عقائد کی ترمیم کرنا غلط ہے خود ان کا جواب دینا چاہئے
رفع کا لفظ قرآن کریم میں ایک جگہ بھی لغتی موت کی تردید کے لیے مستعمل نہیں	۵۰۹	کتاب اللہ میں حدیثوں میں دیگر موجودہ کتب سماویہ کا مقابلہ میں مجازات اور استعارہ کا استعمال بہت کم ہے اور یہ اسلام کا ایک طغریٰ امتیاز بھی ہے۔
رفع کے معنی قرآن اور لغت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا قرآن کریم سے اور اس کی تردید لفظ مکر کے معنی عربی لغت میں خفیہ تدبیر کے ہیں	۵۱۰	سیدنا روح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کی حیات طیبہ کی ایک اہم سرگزشت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یقینی ہے حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قسم کھا کر ذکر فرمایا ہے
	۵۱۱	
	۵۱۲	



۵۲۰	حرف بھی ذکر نہیں فرمایا کیونکہ یہ خدمت دراصل خود اس امت ہی کے ایک شخص کے متعلق ہوگی اس کے بعد پھر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منتقل ہو جائے گی	۵۲۷	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اب تک وفات نہیں ہوئی ان کو تشریف لانا ہے اس کے بعد ان کی وفات ہونی ہے
۵۲۱	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمات میں سب سے نمایاں تر خدمت دجال کو قتل کرنا ہے	۵۳۰	حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اترینگے اور زمین کے کسی خطہ میں پیدا نہیں ہوں گے
۵۲۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ظہور برتری		آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے یقین کے ساتھ فرمایا ہے کہ آئندہ تشریف لانے والے وہی عیسیٰ ہوں گے جن کی پیدائش بغیر والد کے ہوئی ہے
	انما ینزل عیسیٰ علیہ السلام من بین سائر النبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام خاصۃً لانہ اولی الناس ینبئ صلی اللہ علیہ وسلم وحجۃ وایتانہ علی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و سلامہ		چنانچہ اس کی وضاحت کے لئے آپ نے ان کے نام ان کے نسب اور ان کی شکل و صورت بیان فرمانے کا خاص اہتمام فرمایا ہے اسی کے ساتھ ان کی خدمات مفوضہ ان کا منصب ان کے زمانہ میں امن عام کی کیفیت رزق کی فراوانی اور دیگر تفصیلات بھی فرمادی ہیں
۵۲۶	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول کے بعد شادی کرنا پھر ولادت ہونی اس کے بعد آپ کی وفات اور مقام دفن کا ذکر	۵۳۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے شہر کا نام اور اس شہر میں خاص اس محل نزول کے وقت ان کا مکمل نقشہ اور ان کے زمانہ کی برکات
۵۲۷	نبی امی و مطلبی الباشی سیدنا محمد بن عبد اللہ جو سب سے برتر رسول ہیں بلحاظ بعثت سب سے آخر اور بلحاظ پیدائش سب سے اول ان پر خدا کے بے شمار درود و سلام	۵۳۵	شب معراج میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تذکرہ کرنا کہ قیامت کی آمد کا صحیح وقت ان کو بھی معلوم نہیں مگر صرف یہ معلوم ہے کہ اس سے پہلے ان کو دجال کو قتل کرنا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح کا ایک
۵۲۹	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختصر حلیہ جس کو پڑھ کر آپ کی نبوت اور آپ کی شان بزرگی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے		
۵۵۶			

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پھر جمع کر رہا ہوں جگر لخت لخت کو مدت ہوئی ہے دعوت مرگاں کئے ہوئے

بے شک ترجمان السنۃ کی یہ پیش کردہ جلد غیر معمولی وقفہ کے بعد آپ کے سامنے آ رہی ہے لیکن جب آپ کو درمیانی واقعات و حالات کی نامساعدت اور اس پر اس جلد کے مضامین کی اہمیت کا علم ہوگا تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ تاخیر بھی کوئی تاخیر نہیں، صرف اس ایک جلد کے لئے ہزار ہا ہزار صفحات کی ورق گردانی کی گئی ہے، پھر اس پیچیدہ مسائل کو سلجھانے میں جو دماغی کاوش کی گئی ہے، اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا، اگر اس کو بیان کیا جائے تو کون ہے جو اس کو باور کرے گا۔

واقعات یہ ہیں کہ دوسری جلد کی تالیف سے جب مؤلف کا قلم فارغ ہوا تو وقت کے بعض اہم تقاضوں سے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ تیسری جلد میں سلسلہ وار کی بجائے ”اسلامی اقتصادیات“ پر قلم اٹھایا جائے، لیکن اس کے لئے ضرورت تھی کہ پہلے فن اقتصادیات پر جدید نظریہ کے تحت ہلکی سی نظر ڈال لی جائے، تاکہ عنوانات اور تشریحی نوٹ اسی روشنی میں پیش کئے جاسکیں اور احادیث کا ذخیرہ بھی اسی نظریہ کے ماتحت مرتب کیا جاسکے، چنانچہ اس کا بہت سا مواد جمع کر لیا گیا تھا، لیکن یہ سب مواد دماغ ہی کے اندر بکھرا پڑا تھا، ہنوز اس کے ضبط و قید کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک دوسری دینی خدمت مؤلف کے سامنے آ گئی جو اس تالیفی خدمت سے کہیں زیادہ اہم تھی اور اس کا وقت اب اتنا آخر ہو چکا تھا کہ اگر کہیں اور زیادہ تاخیر کی جاتی تو پھر اس میں سعی کرنا بعد از وقت ہو جاتی اس لئے اپنے اس محبوب ترین شغل کو چھوڑ کر ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا، پوری کوشش کی کہ اس جدید مصروفیت کے ساتھ تصنیف و تالیف کا قلم بھی متحرک رہ سکے، مگر میرے جیسے بے بضاعت انسان کے لئے بیک وقت ان دو مختلف کاموں کا جمع کرنا ناممکن ہو گیا، بالآخر کچھ مدت کے لئے تالیف سے یک قلم دست کش ہو جانا پڑا، پورے ایک سال کے بعد جب اس جدید خدمت کی طرف سے کچھ اطمینان میسر ہوا تو قسمت سے مؤلف کو سفر حجاز نصیب ہو گیا۔

اب بلاشبہ مقام تو ایسا تھا جہاں حدیث کی خدمت صحیح معنی میں قضیہ زمین بر سر زمین کا مصداق تھی، لیکن تصنیف و تالیف کی نزاکت جن حالات کی متقاضی تھی وہ یہاں پھر سازگار نہ تھے، ادھر حسب الاتفاق مؤلف کی آنکھوں میں کچھ ایسی تکلیف پیدا ہو گئی کہ چند منٹ کتاب دیکھنا بھی مشکل ہو گیا، سوچئے کہ جس کام کے لئے ہزاروں صفحات کا مطالعہ درکار ہو، وہ اب چلتا تو کیونکر چلتا، اس لئے رضاء بقضا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا پڑا، تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد جب مرض میں ذرا خفت محسوس ہوئی تو صحت کا انتظار کئے بغیر پھر قلم ہاتھ میں اٹھالیا، لیکن اب جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ جدید ترتیب کے لئے جو مواد جمع کیا گیا تھا اس کی سب کڑیاں بکھر چکی ہیں اگر از سر نو ان کو پھر جوڑا جاتا تو تصنیف میں اور تعویق در تعویق ہوتی، اس لئے مجبوراً پہلی ترتیب کی طرف لوٹ جانا پڑا۔

ابھی رکے ہوئے کام کو شروع کئے کچھ مہرہ گذرنے نہیں پایا تھا کہ ناگہانی طور پر احقر کا دست راست شدید زخمی ہو گیا، حتیٰ کہ انگشت شہادت کا ایک حصہ قطع کرنا پڑا، اور اب ضعف بصارت کے ساتھ کتابت کا یہ دوسرا آلہ بھی معطل ہو گیا، والحمد للہ علی کل حال و اعوذ باللہ من حال اہل النار، مقصود مقدرات کا شکوہ کرنا نہیں ہے اور کیسے کیا جاسکتا ہے، جبکہ سامان تبطل سب جمع تھے مگر تعطل کسی ایک جانب میں نہ تھا، قدرت نے ہر کام کے لئے دوسرے راستے کھول دیئے تھے، مقصد اس غیر مشوق



تاخیر کی معذرت ہے، الحمد للہ کہ ان معذوریوں پر بھی ترجمان السنۃ کی تالیف سے کوئی مایوسی نہیں ہوئی، البتہ اب صورت تالیف بدل دینی پڑی یعنی خود کتابت کی بجائے صورت املاء یعنی دوسرے شخص کی مدد سے کتابت اختیار کرنی پڑی، گو مؤلف کے دماغ اور اس کے ہاتھ کے مابین قدرت نے مضامین کی آمد میں جو کنکشن رکھا ہے اس کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے مضامین میں نقصان واقع ہونا لازمی تھا مگر جبراً و قہراً اس پر راضی ہو جانا پڑا اور اللہ تعالیٰ کی مدد و فضل سے قدیم ترتیب پر کام شروع کر دیا گیا، اس لحاظ سے کتاب کا جو پہلا حصہ سامنے آیا وہ انبیاء علیہم السلام کی مقدس ہستیوں کے تذکرے تھے، بظاہر یہ موضوع سب سے آسان موضوع تھا، اکثر کتب احادیث میں اس پر مستقل ایک باب قائم کیا گیا ہے اور اس سلسلے کی حدیثیں ایک ہی جگہ مرتب کر دی گئی ہیں، اس لئے اس سلسلہ کی حدیثیں جمع کرنے میں بظاہر کوئی دشواری نہ تھی اور اس طریق پر ان کے ترجمے اور نوٹس میں بھی کوئی دقت نہ تھی، لیکن جب اس موضوع پر کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو ترجمان السنۃ کی تالیف کے مقاصد کے پیش نظر یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس باب کو بھی موجودہ ضروریات کے تقاضوں کے مناسب مرتب کیا جائے اب دیکھا تو یہی موضوع کتاب کے موضوعات میں سب سے مشکل بن گیا کیونکہ مذہب کی بنیاد اسی مقدس جماعت کے ذریعے قائم ہوئی ہے اور ان ہی کی حیثیت سمجھنے میں عقلاء اور خود اہل مذہب کو بہت غلطیاں لگی ہیں، خالق اور صانع کا وجود کسی نہ کسی پہلو سے سب تسلیم کرتے ہیں کم از کم ایک (Creator) کی حیثیت ہی سے سہی اور اس کے مباحث بھی دروس اور کتابوں میں ہمیشہ ذکر ہوتے رہتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام اور مسائل نبوت ہمیشہ سے زیر بحث رہے ہیں اور متاخرین نے جو بحثیں کی ہیں وہ اور الجھاؤ کا موجب بن گئی ہیں، یہاں فلاسفہ قدیم جن کو الہیات سے کسی حد تک روشناس کہا جاسکتا ہے جب اس مسئلہ پر گزرے تو حقیقت تک رسائی تو درکنار وہ بالکل دوسری مخالف سمت میں جانکے رہے ہمارے دور کے عقلاء تو وہ اس موضوع ہی سے روشناس نہ تھے وہ بھلا اس موضوع میں کوئی صحیح بات لکھتے تو کیا لکھتے، ادھر خود اہل مذہب بھی اس اس افراط و تفریط میں پھنسے ہوئے نظر آئے کہ ایک فریق نے انبیاء علیہم السلام کی پراسرار ہستیوں اور ان کے معجزات کو دیکھا تو ان کی بشریت ہی کا صاف انکار کر دیا اور ان کو یہ بتانا ہی مشکل ہو گیا کہ جب وہ بشر نہ تھے تو پھر اور کس نوع میں داخل تھے؟ آخر انہوں نے تو جیہہ کرتے کرتے اسلام کے اس نکھرے ہوئے مسئلہ کو ٹھیک نصرانیت کی سرحد سے جا ملایا، دوسری جماعت نے اگر ان کی محسوس بشریت کا یقین کیا تو ان کے خصائص و کمالات کا انکار کرتے کرتے ان کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اب وہ طبقہ جو مذہب کا تو عقیدت مند تھا لیکن مذہبی تعلیم سے نابلد تھا، ان اختلافات کو دیکھ کر انبیاء علیہم السلام کے صحیح مقام معلوم کرنے سے قاصر ہو گیا اور اس کے لئے ان کا اصل مقام سمجھنا ہی ایک بھول بھلیاں بن کر رہ گیا، اس لئے انہوں نے اپنی فہم اور اپنے انداز فکر کے مطابق جو مقام ان کے ذہن میں آیا وہ ان کے لیے تجویز کر لیا اور اس طرح یہ مسئلہ جو دین کا اساسی مسئلہ تھا تاریکی در تاریکی میں پڑ گیا اس لیے مؤلف کے لئے ضروری ہو گیا کہ اس باب کو اس طرح مرتب کیا جائے جس کے مطالعہ کے بعد اس میں تمام غلط خیالات کی تصحیح ہو جائے اور ان بزرگ ہستیوں کا شرعاً جو صحیح صحیح مقام ہے وہ ان کے حالات کے ضمن میں کسی تکلف کے بغیر خود بخود

۱۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات کے متعلق ”ندوة المصنفین“ نے ”قصص القرآن“ مستقل ایک محققانہ تصنیف شائع کی ہے لیکن اس کا خاص موضوع وہ قصص ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، اس لئے وہ بھی ہمارے لئے کارآمد نہ ہو سکی، لہذا اس باب کی ترتیب میں کتب الاحادیث کے علاوہ ”البدایہ و النہایہ“ اور الدر المنثور سے ہم کو زیادہ مدد ملی ہے

واضح ہوتا چلا جائے اس غور و خوض میں یہ محسوس ہوا کہ جس طرح نبوت تمام دین کی اساس ہے اسی طرح وحی نبوت کی اساس ہے اس لحاظ سے وحی کی حدیثیں اور اس پر مختلف عنوانات بھی قائم کرنے اہم نظر آئے غالباً اسی لئے امام بخاری علیہ الرحمہ نے بھی عام محدثین کی ترتیب کے خلاف اسی باب سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے اس سے امام موصوف کی وقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے اس عنوان کے تحت اگرچہ خود امام بخاری کی کتاب میں چند حدیثیں جمع کی گئی ہیں لیکن ”ترجمان السنۃ“ کے مقاصد و عنوانات کے پیش نظر وہ کافی نہیں تھیں اس لئے اس کے لئے دور دور سے مختلف ابواب سے حدیثیں تلاش کرنی پڑیں مثلاً کتاب الحج، کتاب الدعوات، کتاب التفسیر، باب التوکل، اب ذرا اندازہ فرمائیے کہ ان ابواب کی وحی کے ساتھ کیا مناسبت ہے اس لئے کس جانفشانی کے ساتھ یہ احادیث ان ابواب سے منتخب کی گئی ہوں گی پھر جب آپ ”ترجمان السنۃ“ ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ان عنوانات کے لئے ان احادیث کا انتخاب کتنا اہم تھا۔

انبیاء علیہم السلام کے تعارف کے سلسلہ میں انکی بشریت اور ان کی بشریت کی خصوصیات پھر عام بشریت سے اس کے امتیازات پر متعدد ابواب بھی قائم کئے گئے ہیں تاکہ اگر ایک طرف ان کی بشریت ثابت ہوتی رہے تو دوسری طرف عام بشریت سے ان کی برتری بھی واضح ہوتی رہے اور اس طرح یہ مسئلہ پورے توازن اور اپنی تمام نزاکتوں کے ساتھ ذہن نشین ہوتا چلا جائے نیز یہ بھی واضح ہو جائے کہ جن انسانوں کو اللہ تعالیٰ ہم کلامی کا شرف بخشا ہے انکی صفات کیا ہوتی ہیں پھر یہ بات خود بخود سمجھ میں آ جائے گی کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے صفت عصمت ہونا کیوں ضروری ہے اس کے بعد وحی اور انبیاء علیہم السلام کی معصومیت پر خاص طور پر نظر ڈالی گئی ہے، کیونکہ ان کے تعارف کے لئے سب سے زیادہ اہم یہی دو صفتیں ہیں اس کے بعد پھر جن انبیاء علیہم السلام کے اسماء گرامی اور ان کی حیات طیبہ کے کچھ حالات جو حدیثوں میں آچکے تھے چونکہ ”ترجمان السنۃ“ جلد اول میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلحاظ خلقت سب سے پہلے اور بلحاظ بعثت سب سے آخری رسول ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس باب کو ہم آپ ہی کے اسم مبارک سے شروع کریں اور آپ ہی کے اسم مبارک پر ختم کر دیں تاکہ آپ کی اولیت و آخریت کا نقشہ ہماری تصنیف میں بھی آنکھوں سے نظر آجائے۔

یہاں بھی حسب دستور سابق نبوت کے متعلق پہلے ایک بسیط مضمون سپرد قلم کیا گیا ہے جس کے مطالعہ کے بغیر اس باب کے تشریحی نوٹ پورے طور پر واضح نہیں ہو سکتے اسی طرح عصمت انبیاء علیہم السلام کی حدیثوں سے پہلے اس موضوع پر بھی ایک مقالہ لکھا گیا ہے حدیثوں سے تشریحی نوٹ دیکھنے کے لئے اس کا مطالعہ کرنا بھی اہم ہے اس جگہ ضروری ہے کہ جلد اول ص ۱۳۸ تا ص ۱۴۲ و از ص ۲۵۵ تا ص ۲۶۲ بھی ملاحظہ فرمالیا جائے کیونکہ اس مسئلہ کے بہت سے اہم پہلو ان صفحات میں صاف

۱۔ اس موضوع پر بھی ندوۃ المصنفین کی مشہور کتاب ”وحی الہی“ مدت ہوئی شائع ہو چکی ہے افسوس ہے کہ اس وقت وہ ہمارے سامنے نہ تھی اس لیے استفادہ نہ ہو سکا مناسب ہے کہ تفصیلی مباحث کے لئے کتاب مذکورہ کا مطالعہ کیا جائے۔

۲۔ اس موضوع پر امام رازی نے اپنی مشہور تفسیر کی جلد اول و ثالث و خامس میں تقریباً دس مقامات پر کلام فرمایا ہے ہم نے ان تمام مقامات کے علاوہ بھی تفسیر مذکورہ کی ورق گردانی کی مگر کوئی ایسی بات دستیاب نہ ہو سکی جو موجودہ دور کے مذاق کے مطابق ہوتی اس لئے اس باب کی ترتیب میں حافظ ابن تیمیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مولانا قاسم نانوتوی اور دیگر کتب محققین سے مدد لی گئی ہے۔



کئے جا چکے ہیں اس سلسلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ آپ کو سب سے زیادہ طویل نظر آئے گا اور اس کا راز یہ ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس کا تعلق امت محمدیہ کے ساتھ آئندہ زمانہ میں بھی ثابت ہوتا ہو صرف ایک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہستی ایسی ہے جن کے متعلق حدیثوں میں باصرار و تکرار یہ بتایا گیا ہے کہ یہ بحیثیت ایک حکم (جسٹس) کے تشریف لا کر اہل کتاب اور اہل اسلام کے مابین مختلف فیہ مسائل میں فیصلہ فرمائیں گے اور قیامت سے قبل اتحادِ ملل کی اہم خدمت انجام دیں گے اس لئے ضروری تھا کہ وہ رسول ایسا ہی ہو جس کی شخصیت فریقین کے نزدیک مسلم ہو۔

ظاہر ہے کہ ہنگامہ قیامت اگر حق ہے تو ان کی تشریف آوری اس سے کچھ عجیب تر نہیں ہے جس دور میں اولین و آخرین کا قبروں سے زندہ ہو کر ایک میدان میں جمع ہونا ادیانِ سماویہ کا متفقہ عقیدہ ہو اس کے قرب میں صرف ایک انسان کا اور وہ بھی ایسا انسان جو زندہ ہو آسمان سے زمین پر آ جانا کیا تعجب کی بات ہے صحیح مسلم جو امام بخاری کی کتاب سے بلحاظ صحت گودوسرے نمبر پر خیال کی گئی ہے لیکن از روئے حسن ترتیب اس کو امام موصوف کی کتاب پر بھی ترجیح دی گئی ہے ہم نے بارہا دیکھی مگر اس مقام پر جس باریک بینی سے امام موصوف نے کام لیا ہے اس کی طرف کبھی ہمارا ذہن منتقل نہیں ہوا یعنی انھوں نے جب کتاب الایمان پر عنوانات رکھے تو عام محدثین کے مذاق کے مطابق عنوانات قائم کرتے کرتے یہاں ایک جدت بھی کر گئے کہ مسئلہ نزول عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور معراج جیسے مسائل کی اہمیت کے پیش نظر ان کو کتاب الایمان کا جزو بنا گئے حالانکہ ان کے دور میں یہ مسائل کسی اختلاف کے بغیر امت مسلمہ میں بالاتفاق ایمان کا ایک جزو ہی سمجھے جاتے تھے چنانچہ کتب عقائد میں مسئلہ نزول مسیح علیہ السلام کو بالاتفاق عقائد ہی کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے جب ترجمان السنۃ کی ترتیب کا زمانہ آیا تو اس وقت ہم کو امام موصوف کی اس دور بینی کی قدر ہوئی اور امام موصوف کی وجہ سے اس مسئلہ کو کتاب الایمان کا جزو بنانے میں ہم کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور اب ذہن اس طرف متوجہ ہو گیا کہ اس مسئلہ کی حیثیت دیگر عام پیش گوئی کی سی نہیں ہے بلکہ ان عقائد کی سی ہے جو تواتر سے ثابت شدہ ہیں ہماری خوش نصیبی سے حضرت استاذ مرحوم اس مسئلہ کی احادیث اپنی حیات میں بشکل رسالہ جمع فرما گئے تھے اس لیے ہم نے اس مجموعہ کا بقدر ضرورت انتخاب یہاں درج کر دیا ہے البتہ عنوانات اپنی جانب سے لگا دیئے ہیں مگر ان عنوانات کی وجہ سے احادیث میں صحت و حسن کی ترتیب قائم رکھی نہیں جاسکتی اگر ان عنوانات کے ساتھ آپ نبوت و رسالت پر جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں ان کو بھی شمار کر لیں تو صرف اس ایک مسئلہ پر تقریباً سو عنوانات ہوں گے۔

ترتیب کے لحاظ سے اسکے بعد قصا و قد رکا مسئلہ تھا لیکن چونکہ وہ مرتب کر کے پہلے ارسال کیا جا چکا تھا اس لئے اس کی کتابت پہلے ہو گئی اور اب وہ اس جلد کے شروع میں آپ کو ملے گا یہ مسئلہ خود اہل سنت والجماعت کے درمیان ابھی تک کوئی آخری فیصلہ نہیں پاسکا چنانچہ آج تک امت مسلمہ کے دو مشہور امام شیخ ابوالحسن اشعریؒ اور امام ماتریدیؒ کا اختلاف کتب کلام میں منقول ہوتا چلا آ رہا ہے اگرچہ اکثر علماء کی رائے امام ماتریدیؒ کے مسلک کی طرف ہے لیکن صرف اس رجحان سے مسئلہ کا قطعی فیصلہ نہیں ہوتا اس لئے ہم نے یہاں دو مقالے الگ الگ اپنے مقدارِ علم کے مطابق پیش کر دیئے ہیں مگر دونوں مذہبوں کے مابین اختلاف کی زیادہ تشریح نہیں کی اور نہ ہر موقع پر اس کی تنبیہ ضروری سمجھی ہے کیونکہ یہ ایک فنی دائرہ کی چیز تھی قارئین کو اس میں الجھانا مناسب نہ تھا لیکن اہل علم حضرات اس کا بھی اندازہ فرما سکیں گے افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں اردو اور فارسی کتب کا کوئی ذخیرہ یہاں ہمارے

پاس موجود نہ تھا اور نہ اہل قلم کے وہ مضامین جو اس موضوع کے متعلق منتشر طور پر شائع ہو چکے تھے پیش نظر تھے اس لئے ان سے استفادہ کا قطعاً موقع نہیں مل سکا حالانکہ بہت اہم تھا کہ اپنے قریبی دور کے علماء کے شائع شدہ مقالات کا مطالعہ کر لیا جاتا تاکہ جو پہلو ان میں صاف ہو چکے تھے ان کو بھی اختصار کے ساتھ ہدیہ ناظرین کر دیا جاتا، مگر اس قسم کا ذخیرہ یہاں کلیتہً مفقود تھا اور یہ امر تو جلد ثانی کے مقدمہ میں ظاہر کیا جا چکا ہے کہ یہاں جو کاوش خود مؤلف نے پہلے ایک بار کی تھی قسمت سے وہ دورِ فتن کے نذر ہو چکی اس لئے اب اس فرصت میں جو ممکن تھا وہی پیش کیا جا رہا ہے، بائیں ہمہ اس موضوع میں جو کچھ لکھا گیا ہے اگر اس کو آپ بار بار ملاحظہ فرمائیں گے تو یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ مسئلہ ایک پہلو سے جتنا نظری ہے دوسرے پہلو سے اتنا ہی بدیہی بھی ہے اور غالب کا یہ مشہور شعر غالباً اسی مسئلہ کے لئے زیادہ مناسب ہے ۔

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں!

ساری مشکل یہ ہے کہ انسان اپنے ناقص ادراکات کو کامل اور قلیل علم کو کثیر سمجھتا ہے اور اس لئے اپنے دائرہ محسوسات سے خارج اشیاء کو نہ سمجھتا ہے اور نہ اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ ان کو بھی اپنے مشاہدات ہی کی حدود میں لانا چاہتا ہے مسئلہ قضاء و قدر کا ایک پہلو تو خالق سے متعلق ہے جو اس کے تصور سے بھی وراء الوریاء ہے اور دوسرا خود اسی کے باطن سے متعلق ہے انسان نہ اتنی دور بینی کی طاقت رکھتا ہے اور نہ اتنے قریب تر دیکھنے کی اس کی بصارت کے لئے بھی قرب و بعد کے مابین ایک محدود مسافت شرط ہے کہ اگر اس چیز کو اس سے زیادہ نزدیک لے آؤ تو پھر وہ دیکھنے سے قاصر رہتا ہے اور اگر ذرا دور لے جاؤ تو پھر اس کے ادراک سے عاجز ہو جاتا ہے اسی طرح اس کی بصیرت کا معاملہ ہے یہاں بھی زیادہ دور اور بہت زیادہ نزدیک شے کے ادراک سے اس کی عقل عاجز رہتی ہے اس لئے نہ الہیات کا وہ پورا ادراک کر سکتا ہے اور نہ اپنے نفس کے اختیار کی حدود کی پوری پوری تشخیص کر سکتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ اس عجز و قصور کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، تاہم ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ مسئلہ کو جتنا قریب الی الفہم کیا جاسکے کر دیا جائے اس لئے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ خالی الذہن ہو کر پہلے ان اوراق کا مطالعہ فرمائیں اور بار بار فرمائیں اور سمجھنے سے پہلے اس میں اعتراضات پیدا کرنے کی الجھن میں نہ پڑیں امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ سکون و اطمینان کی روشنی سے مستفیض ہو سکیں گے اس سلسلہ میں منتشر کتب کے علاوہ جن کتابوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

- (۱) شرح الموقف للدوانی<sup>۲</sup> (۲) شرح العقائد للنسفی<sup>۳</sup> (۳) حاشیہ الکنبوی (۴) حاشیہ اجر جانی (۵) کتاب السنۃ للامام احمد (۶) شرح العقیدہ الطحاوی (۷) حجة الله البالغة (۸) الروضة البہیہ (۹) شفاء العلیل لابن القيم (۱۰) منهاج السنہ لابن تیمیہ (۱۱) شرح الفقہ الاکبر (۱۲) المسامرہ لابن الہام (۱۳) الاستبصار للکوثری (۱۴) موقف البشر المصطفیٰ البصری۔

ان میں سے آخر کی دو کتابیں ہمارے ہی دور کے علماء کی تالیف کردہ ہیں جن میں علامہ کوثری، امام ماتریدی کے مسلک کی تائید میں ہیں اور مصطفیٰ صبری، شیخ اشعری کے مسلک کے۔ مصطفیٰ صبری کی کتاب کا ہم نے پورے غور و خاص کے ساتھ بار بار مطالعہ کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی مساعی قابل داد ہیں علامہ کوثری نے ان کے جواب کی پوری سعی کی ہے اب یہ فیصلہ ناظرین کے سپرد ہے کہ علامہ مصطفیٰ اور علامہ کوثری میں یہاں کس کا پلہ بھاری ہے؟ ہم نفس مسئلہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار تو



درکنار ان علماء کے مابین فیصلہ کرنا بھی اپنی مقدارِ علم سے بالاتر بات سمجھتے - وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ.

جلد ثالث کی ترتیب میں مؤلف کے سامنے ایک جدید مشکل یہ بھی درپیش رہی کہ اب بحمدہ تعالیٰ کتاب میں احادیث کا ذخیرہ ایک ہزار سے تجاوز کر چکا ہے چونکہ احادیث بالکل جدید ترتیب سے جمع کی جا رہی ہیں اس لئے اتنے طویل ذخیرہ میں پورے طور پر یہ استحضار رہنا بہت مشکل ہے کہ کس مناسبت سے یہ حدیث کس عنوان کے تحت پہلے گزر چکی ہے بسا اوقات بڑی تلاش و تتبع کے بعد تیسری جلد کے عنوان کے لئے ایک حدیث منتخب کی گئی لیکن جب زیادہ غور کیا تو معلوم ہوا کہ حدیث ایک بار پہلے بھی گزر چکی تھی اس لئے نہ صرف سعی بیکار رہی بلکہ اس کے لئے اب دوسری حدیث کا انتخاب کرنا ایک جدید محنت کا محتاج ہو گیا اب اس دور میں نہ اتنا حفظ قوی ہے نہ اتنا تعقیظ کہ جو احادیث قلم سے ایک بار نکل جائیں پھر جب کہیں وہ مکرر آئیں تو یہ یاد آجائے کہ اس مناسبت سے ایک بار پہلے وہ فلاں عنوان میں گزر چکی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ پوری جانفشانی کے باوجود کوئی حدیث آپ کو مکرر بھی نظر پڑے آپ اس کو مؤلف کے قصورِ حفظ پر محمول کر کے ساتھ تا امکان ہم نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ جہاں کوئی مضمون کے مناسب حدیث گزر چکی ہے اس کا حوالہ دے دیا جائے اور اگر گزشتہ کسی مضمون کا مطالعہ اس جلد کے لئے ضروری ہو تو اس کا حوالہ بھی دے دیا جائے اب اتنی محنت قارئین کے ذمہ ہے کہ وہ اس حوالہ کی مراجعت کر کے اس سے فائدہ حاصل کر لیں۔

ترجمان السنۃ نے جس خدمت کا ارادہ کیا ہے اس کی تشریح کسی حد تک جلد اول و ثانی کے مقدمہ میں کر دی گئی ہے لیکن اب اس کی جلد ثالث سامنے آنے کے بعد اس امر کی وضاحت کر دینے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے کہ ”ترجمان السنۃ“ نے حدیث کی خدمت کے ساتھ ساتھ مسائل کلامیہ کی حدیثی روشنی میں دیکھنے اور شرعی پہلو سے ان کے سلجھانے میں بھی کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے اور اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر اسی طرح کسی وقت علم کلام پورا کا پورا احادیث کے تحت کھینچ لیا جائے تو اس کے مستقل فن بن جانے کی وجہ سے جو موشگافیاں پیدا ہو چکی ہیں وہ ایک حد تک ختم ہو جائیں اور یہ فن مضر ہونے کی بجائے بڑی حد تک مفید بن جائے یہ امر بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ جب یہ کام شروع کیا گیا تھا تو اس وقت یہ تصور بھی نہ تھا کہ یہ کام اتنا پھیل جائے گا اور خیال یہ تھا کہ کتاب الایمان صرف پہلی جلد میں سما جائے گی اور اگر بالفرض جدید عنوانات کے پیش نظر پہلی جلد نا کافی رہی تو زیادہ سے زیادہ دوسری جلد کے لئے یقیناً کافی ہو جائے گی لیکن جب تیسری جلد کا وقت آیا تو ایسے اہم مباحث سامنے آ گئے کہ اب یہ جلد بھی اس کے لئے نامافی ثابت ہوئی اور انشاء اللہ تعالیٰ یہ بحث غالباً اب چوتھی جلد میں تمام ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ جو ترتیب مؤلف کے سامنے ہے اس کے لحاظ سے پانچویں جلد تک بھی پھیل جائے گی یہ ظاہر ہے کہ اس طرح اضافہ صرف ابواب و عنوانات ہی میں ہو رہا ہے یعنی جو احادیث کتب مدونہ میں دوسرے ابواب و عنوانات کے تحت پھیلی ہوئی تھیں وہ ہمارے یہاں کتاب الایمان میں سمٹی آ رہی ہیں اور اس طرح اگر کتاب ایک طرف طویل ہو رہی ہے تو دوسری طرف مختصر بھی ہوتی جا رہی ہے اس لئے کتاب کی طوالت سے اضطراب و گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ہرچند می رو و سخن دوست خوشتر است

## اعتراف واعتماد

ہم کو اس امر کا پورا اعتراف ہے کہ اس جلد میں چند حدیثیں ایسی بھی آ گئی ہیں جو محدثین کے نزدیک زیادہ ضعیف ہیں، مگر یہ ان ہی مقامات میں آئی ہیں جہاں نہ تو کسی عقیدہ کی بحث ہے اور نہ عمل کی، پھر اس موضوع میں اس سے زیادہ نکھری ہوئی حدیثیں ہماری نظر سے کسی کتاب میں نہیں گذریں، نیز اسی کے ساتھ ان کے خلاف بھی کوئی حدیث خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو نظر سے نہیں گذری، غالباً ان ہی وجوہات کی بناء پر اخبار و فضائل کی حدیثیں جمع کرنے والے محدثین نے اس قسم کی حدیثیں بھی اپنی مؤلفات میں شامل کر لی ہیں اور اس علم کے ساتھ شامل کی ہیں کہ ان کی اسنادی حیثیت کیا ہے، اس لئے یہاں منکرین حدیث کے لئے خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

ہمیں اس جلد میں یہ مزید تنبیہ کرنی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور آپ کی سیرت کے حصے کے لئے بھی عقائد و اعمال کی حدیثوں کی طرح اعلیٰ درجہ کی اسنادوں کی شرط لگانی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ تشدد بے جا تشدد ہے، بلکہ سیرت کے ایک بیش قیمت حصہ کا عظیم الشان نقصان ہے، آخر آج ہمارے سامنے دنیا کی دیگر تاریخیں بھی موجود ہیں جن کو اعتبار ہی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، مگر کیا ان کو اسنادی لحاظ سے یہ مقام بھی حاصل ہے یا وہ محض معاصرین کے بے سند بیانات یا چند قدیم کتبوں اور محض افواہوں کی بناء پر مرتب ہوئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہاں اصولِ درایت کو سامنے رکھے بغیر ان کو اعتبار کا کوئی مرتبہ حاصل نہیں اسی عادت کے پیش نظر بعض سیرت نگاروں نے اعداء اسلام کے محض متعصبانہ اعتراضات سے خائف ہو کر یہ ضرورت محسوس کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بھی دوبارہ نظر ڈالی جائے اور مافوق العادة اور غیبی عجائبات سے خالی کر کے جہاں تک اس کو مادی عقول کے قریب لایا جاسکتا ہے قریب کر دیا جائے، ہمیں اس سے انکار نہیں کہ جن مصنفین نے سیرت کے صرف اتنے حصہ کو جمع کیا ہے جو صحیح حدیثوں سے ثابت ہے یہ بھی ایک مستحسن سعی ہے، لیکن سیرت کے اس حصہ کو دوسرے یا تیسرے نمبر کی حدیثوں سے ثابت ہے، بالکل نظر انداز کر دینا یہ طریقہ مستحسن نہیں ہے، جب یہ تشدد احکام کی حدیثوں میں قائم نہیں رکھا جاسکا اور صحیحین کی شرائط سے کم تر دوسرے اور تیسرے نمبر کی احادیث بھی جمع کی گئیں بلکہ معاجم اور مسانید میں اور ہلکے سے ہلکے معیار کی حدیثیں بھی لے لی گئیں تو پھر سیرت کے عام حصوں کے لئے اس معیار کو معیوب کیوں سمجھا جائے، جب دینی مسائل کی تفصیلات کے لئے اعلیٰ معیار سے اترنا پڑا ہے تو پھر سیرت کے حصے کی پوری تفصیلات صرف اعلیٰ معیار کی حدیثوں سے کیونکر سامنے آ سکتی ہیں، ہمیں یہاں نہ تو محض حسن عقیدت سے آپ کی سیرت میں کوئی بات اضافہ کرنی چاہئے اور نہ صرف اعداء اسلام کی خاطر آپ کی سیرت میں قطع برید کرنی چاہیے۔ نیز ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس وقت ہمارے سامنے آپ کا کونسا حصہ ہے ظاہر ہے کہ واقعات و حالات کی نوعیت کے ساتھ ان کے ثبوت کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے بعض کی واقعات محض قرائن سے تصدیق کر لی جاتی ہے اور ان کے لیے اسناد کا مطالبہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں گزرتا مثلاً ایک قدیم بیمار کے متعلق شہرت ہوتی ہے کہ اس کی وفات ہو گئی، یا کسی گھر میں اُمید کا سال معلوم ہوتا ہے اور خبر اڑتی ہے کہ فلاں گھر میں ولادت ہو گئی تو فوراً اس کا یقین پیدا ہو جاتا ہے، کون ہے جو یہاں ان خبروں



2

پر یقین کر کے فوراً ان کے مناسب انتظامات کرنے میں مشغول نہ ہو جاتا ہو اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہر خبر کے اعتماد کا دارو مدار صرف اسناد پر قرار دے دینا عام دستور بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ان حصوں کے لیے بھی جن کا تعلق آپ کے ابتدائی حالات زندگی کے ساتھ ہے، اعلیٰ درجہ کی اسانید کا مطالبہ کرنا انصاف کا مطالبہ نہیں، کیا کوئی سلیم الفطرت انسان یہ حکم لگا سکتا ہے کہ ایک ایسی ہستی کے ابتدائی واقعات کے لیے جن کے متعلق کسی کے ذہن میں ابھی یہ نہ گزرا ہو کہ قدرت ان کو کل کس منصب جلیل سے نوازنے والی ہے شروع سے پورا پورا اہتمام کیا گیا ہو گا بالخصوص ایک امی ماحول میں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ چند در چند وجوہات کی بناء پر ان واقعات کے قانون روایت و درایت کے تحت باضابطہ لانے میں کچھ امور مانع آگئے ہوں مثلاً اس وقت ان کے زیر مشاہدہ ہونے کی وجہ سے ان کے تحفظ کی اہمیت ذہنوں میں نہ آئی ہو اور آئندہ دور میں چل کر شغل جہاد کی وجہ سے ان کے اعلیٰ معیار پر جمع کرنے کا اہتمام نہ ہو سکا ہو یا ان کے عقائد و اعمال کے مسائل نہ ہونے کی وجہ سے ان سے عام طور پر بحث ہی نہ کی گئی ہو یا قدرت کے عجائبات کے خوگر دماغوں نے ان کو خلاف عقول امور کی فہرست میں داخل ہی نہ کیا ہو، ظاہر ہے کہ جہاں نبوت، ملائکہ، وحی الہی اور متواتر معجزات کا شب و روز سماں بندھا ہو وہاں ان چند واقعات کی اہمیت کیا ہوگی جو اول تو نبوت سے پہلی زندگی کے ہیں پھر ان میں ایک واقعہ بھی ان واقعات سے عجیب تر نہ ہو جو روز و شب ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آرہے تھے۔ اس قسم کے وجوہات کی بنا پر اگر ان کی اعلیٰ درجہ کی اسانید دستیاب نہ ہو سکی ہوں تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم آئندہ آنے والی نسلوں کے غور و فکر کا یہ سارا مواد ہی آپ کی سیرت سے حذف کر ڈالیں یا اپنے ثبوت کی نوعیت کے لحاظ سے ان کو سیرت کا جزء نہ دے دیں، حافظ ابن کثیر جو بالتفاق معتمد محدثین میں شمار ہوتے ہیں اسی قسم کا ایک واقعہ لکھ کر تحریر فرماتے ہیں:

وهذا سياق حسن عليه البها والنور و  
سيماء الصدق و ان كان في رجالة من هو  
متكلم فيه. (البدایہ و النہایہ ج ۲ ص ۲۱۹)  
اسی واقعہ کی اسناد میں اگرچہ ایسے راوی موجود ہیں جن میں کلام  
کیا گیا ہے بائیں ہمہ یہاں ایسے قرائن موجود ہیں جن کی وجہ  
سے اس خبر پر صدق و صفا کا نور چمک رہا ہے۔

آپ کی سیرت کے اس حصہ کے روایتی پہلو کے ساتھ اگر ہم اس پر درایتی پہلو سے نظر ڈالیں تو ہم کو پہلے یہ غور کرنا بھی ضروری ہوگا کہ یہ حالات ہیں کس ہستی کے متعلق؟ کیونکہ حالات کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس شخصیت کو بھی سامنے رکھا جائے جس کی نسبت یہ واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انور بے اور ہٹلر جیسے عاقل افراد کے متعلق ہر بعید سے بعید واقعہ کی تصدیق معقول سمجھی جاسکتی ہے گو اس کی نوعیت ثبوت کتنی ہی کمزور ہو، لیکن اگر ان میں سے ایک حیرت انگیز واقعہ بھی کسی دوسری عام شخصیت کی طرف منسوب کیا جائے تو قوت و اہم اس میں سو طرح کے احتمالات نکال کھڑے کرتی ہے خواہ اس کی نوعیت ثبوت کتنی ہی پختہ کیوں نہ ہو، پس اس لحاظ سے جب ہم نظر کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ادیانِ سماویہ کے جتنے حاملین ہیں وہ سب متفقہ طور پر اپنے اپنے رسولوں کے متعلق کچھ نہ کچھ مافوق العادۃ عجائبات نقل کرتے چلے آئے ہیں، یہ امر یقینی ہے کہ ان میں اکثر واقعات کی نوعیت روایت و درایت ہر پہلو سے صفر کے برابر نظر آتی ہے مگر اس قدر مشترک اتفاق سے اتنا تو ماننا پڑتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ابتدائی زندگیوں میں کچھ امور عام انسانوں کی زندگیوں سے ضرور ممتاز تھے خواہ اس کے اسباب و وجوہات کچھ بھی

ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دورِ طفولیت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حمل اور ولادت اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات خود قرآن کریم میں بھی موجود ہیں جن کا روایتی پہلو اگر اتنا مضبوط نہ ہوتا تو شاید صرف درایت کے لحاظ سے ہمارے روشن خیال مسلمانوں کے لیے ان کا یاور کرنا مشکل ہوتا، لیکن یہاں تو گفتگو اس شخصیت کے متعلق ہے جس کے بارے میں دعویٰ یہ ہے کہ وہ عالم کی سب سے عظیم تر ہستیوں میں بھی عظیم تر ہستی تھی پس اگر ان کی حیات میں کچھ ایسے عجائبات کا ظہور ملتا ہے جو اس نوع کے انسانوں میں تو اتر کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے تو کیا ان کو اصولِ درایت کے خلاف کہا جاسکتا ہے۔

ہمیں یہاں اس جماعت کے ساتھ بھی شدید اختلاف ہے، جنہوں نے پیغمبر اسلام کی حیات میں محض بے سرو پا موضوعات داخل کر کے ان کو بھی عقائد کی فہرست میں داخل کر لیا ہے، زیر بحث امر صرف یہ ہے کہ آپ کی ابتدائی زندگی کے واقعات جو اسانید کے ساتھ ثابت شدہ ہیں، گو وہ ضعیف سہی مگر غیر معقول بھی نہیں بلکہ اس قسم کی شخصیات بارزہ کی زندگیوں میں ہمیشہ نظر آتے رہے ہیں، کیا ان کو یکسر آپ کی سیرت سے خارج کر دیا جائے یا ان کے ثبوت کی نوعیت پر تنبیہ کے ساتھ ان کو سیرت کا جزو رہنے دیا جائے تاکہ وہ آپ کی نبوت کے مابعد حالات پر غور و خوض کرنے میں کارآمد ہوں۔

ترجمان السنہ کا مقصد اپنے مخاطبوں میں کسی ایک فریق کے ساتھ ساتھ چلنا نہیں ہے بلکہ اس کے پیش نظر احادیث کی روشنی میں جو بات متفق ہوئی ہو صرف اس کو واضح کر دینا ہے، سعید ہیں وہ جو اپنے عقائد کی روشنی میں حدیثوں کا مطالعہ نہیں فرماتے بلکہ حدیثوں کی روشنی سے اپنے عقائد کی اصلاح کر لیتے ہیں، اس لیے ہم نے بلا خوف و لومۃ لائم آپ کی زندگی کے وہ سب حالات جو محدثین کے نزدیک اس سے قبل ذکر میں آتے رہے ہیں یہاں بھی ذکر کر دیئے ہیں، اگر کوئی فریق اس پر چیں، کجیں ہوتا ہو تو ہو، ان مشکلات و حالات کو سامنے رکھ کر اب آپ ہی غور فرمائیے کہ اس طرح مسائل کلامیہ کے عنوانات حدیث کی کتاب میں قائم کرنا پھر اس کے لیے بعید سے بعید مقامات سے حدیثیں تلاش کر کر کے لانا اور ساتھ ساتھ جگہ جگہ ان پر محدثانہ نظر بھی کرتے جانا اور عنوانات و احادیث میں ایسی ترتیب قائم کرنا کہ مسئلہ کے تمام پہلو روشن ہو جائیں پھر ایسے متعدد مقالات لکھنا جو تمام تر حدیثوں کی روشنی ہی میں لکھے گئے ہوں، یہ کتنی فرصت کا محتاج ہے، بس یہی کچھ باتیں تھیں جو اس جلد کی تصنیف میں اتنی تاخیر کا باعث بن گئیں میں نے اس تاخیر کو تو بخوشی گوارا کر لیا مگر میں یہ گوارہ نہیں کر سکتا تھا کہ رسالت اور نبوت کے اتنے اہم مضامین اپنی مقدور بھر سلجھائے بغیر یوں ہی جوں کے توں ناظرین کے سامنے اٹھا کر رکھ دوں، اب یہ فیصلہ آپ کے سپرد ہے کہ اپنے ان مقاصد میں میں کہاں تک کامیابی حاصل کر سکا۔

مسودہ اب بھی اس حیثیت میں نہ تھا کہ بخوشی اس کو روانہ کیا جاسکتا، مگر چونکہ وہ صرف حجاج ہی کی معرفت روانہ ہو سکتا تھا، اس لیے اگر اصلاح و ترمیم کا اور انتظار کیا جاتا تو پھر بات ایک سال پر جا پڑتی اس لیے بادلِ نخواستہ اپنے قبضہ سے جدا کرنا پڑا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس ادھوری اور پراگندہ کوشش کو قبول فرما کر امت مسلمہ کے لیے نافع بنائے، آمین۔

**نوٹ:** ہر باب کے تشریحی نوٹوں کے ملاحظہ سے قبل از بس ضروری ہے کہ اس موضوع کے متعلق جو مقالہ لکھا گیا ہے اس کو بغور اور بار بار پڑھ لیا جائے ورنہ اگر تشریحی نوٹوں کے سمجھنے میں کوئی الجھن رہ گئی تو اس میں مؤلف کے قصور کے ساتھ تھوڑی سی کوتاہی آپ کی بھی ہوگی۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

بندہ محمد بدر عالم نزیل مدینہ منورہ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## القضاء والقدر

قال الشاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ اعلم انّ اللہ تعالیٰ شمل علمہ الازلی الذاتی کل ما وجد او سیوجد من الحوادث محال ان یختلف علیہ عن شیء او یتحقق غیر ما علم فیکون جہلاً لا علماً و هذا مسئلۃ شمول العلمو لیست بمسألۃ القدر و لا یخالف فیہا فرقة من الفرق الاسلامیۃ انما القدر الذی دلت علیہ الاحادیث

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## قضاء وقدر اور اس پر ایک لمحہ فکریہ

مسئلہ قضاء وقدر بے شک بہت مشکل ہے لیکن ہمارے نزدیک خالق کا وجود تسلیم کرنے کے بعد اس کا انکار کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ جس نے یہاں شریعت کی بیان کردہ راہ اعتدال چھوڑی اس کو ہدایت کا انکار کرنا پڑا یعنی یا تو بندہ کو پتھر کی طرح مجبور ماننا پڑا اور یا اس کو خالقیت میں خالق کے برابر تسلیم کرنا پڑا۔ ہم یہاں آپ کے غور و فکر کی دعوت کے لیے چند رسطور پیش کرتے ہیں۔ مسئلہ گوان سے حل نہ ہو مگر ممکن ہے کہ کسی حد تک مزید انکشاف کا باعث ہو جائے وہ نستعین۔

اسلامی جملہ فرقوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے ان سب کا حق تعالیٰ کو پہلے سے علم ہے اور یہ بات بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ حق تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق جو کچھ ہونا ہے وہ سب کچھ قید کتابت میں بھی آچکا ہے اور اب عالم کا ایک ذرہ اس کے خلاف جنبش نہیں کر سکتا۔ اس لیے بحث یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اب انسانی افعال کی حقیقت کیا ٹھہری؟ کیا اس کو ان میں مجبور سمجھ لیا جائے یا مختار کہا جائے۔ اگر مختار کہا جاتا ہے تو پھر لازمی طور سے اس میں قدرت اور اختیار کی صفت بھی تسلیم کرنی ہوگی۔ ادھر قدرت اور اختیار تسلیم کر لینے کے بعد پھر قضاء وقدر کے سامنے اس کو مجبور کہنے کا مفہوم باطل ہو جاتا ہے اور اگر مجبور کہہ دیا جائے تو یہ ضروری ہوگا کہ اس میں قدرت و اختیار کی صفت کا بھی انکار کر دیا جائے اس لیے قضاء وقدر کی بحث میں اصل نقطہ غور و فکر ”افعال عباد“ یعنی بندوں کے افعال بن جاتے ہیں۔ اس پر غور کرنے سے قبل جب آپ عالم پر ایک نظر ڈالیں گے تو آپ کے سامنے دو قسم کی مخلوقات نظر آئے گی ایک وہ جو اختیار و ارادہ کے بداہتہ ایک نہیں وہ کھلے طور پر قدرت الہیہ کی مستخر بنی ہوئی ہے۔ مثلاً آفتاب حرکت کرتا نظر آتا ہے یا زمین و آسمان میں جو بھی متحرک ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ یہ اپنے ارادہ سے متحرک نہیں بلکہ ارادہ و قدرت الہیہ سے متحرک ہیں۔ دوسری قسم کی مخلوق وہ ہے جو بداہتہ ارادہ و اختیار کی مالک نظر آتی ہے۔ یہ تین قسم کی ہے ایک وہ جو صرف خیر ہی کا ارادہ کرتی ہے شر کا ارادہ کر ہی نہیں سکتی۔ یہ فرشتے کہلاتے ہیں ان کی شان لَا یَعْصُونَ اللّٰہَ مَا أَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُونَ مَا یُؤْمَرُونَ ہے۔ یعنی جو حکم ان کو ملتا ہے وہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتے اور صرف وہی کرتے ہیں جس کا ان کو

المستفیضة و مضی علیہ السلف الصالح و لم یوفق له الا المحققون و یتجد علیہ السؤال بانه متدافع مع التکلیف و انه فیم العمل هو القدر الملزم الذی یوجب الحوادث قبل وجودها فیوجد بذلك الایجاب لایدفعه هرب و لا ینفع منه حلیة. (صفحہ ۶۵ حجۃ اللہ)

الواحد منا یعلم بداهة انه بمدیده ویناول القلم مثلاً و هو فی ذلک مرید قاصد یتسوی بالتسبیہ الیہ

حکم دیا جاتا ہے یہاں نفی و اثبات دونوں کو جمع کرنے سے اسی مضمون کی تاکید مقصود ہے۔ دوسری مخلوق اس کے برعکس ہے وہ شر کے سوا خیر کا ارادہ کرتی ہی نہیں، یہ شیطان ہے، تیسری قسم وہ جو ہر دونوں کے ارادہ کی مالک ہے، اور دونوں قسم کے ارادے کرتی بھی ہے یہ حضرت انسان ہیں۔ انسانوں کی پھر تین قسمیں ہیں ایک وہ جس کا ایمان اور جس کی عقل و معرفت اس کی خواہشات نفسانی پر غالب ہوتی ہے، یہ تو ترقی کر کے فرشتوں سے جا ملتا ہے۔ دوسری اس کے برعکس ہے، یہ برادر شیطان بن جاتا ہے اور تیسری قسم وہ ہے جس کی عقل اس کی قوت شہوانیہ کی مفتوح ہو جاتی ہے، یہ بہائم اور حیوانات سے ملحق ہو جاتا ہے، جس طرح ان جملہ مخلوقات کا وجود محض حق جل و علا کی بخشائش ہے، اسی طرح ان کا ارادہ و اختیار بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔

اب ہم پہلے اصطلاحات اور مذاہب کی تفصیلات سے علیحدہ ہو کر سادہ طور پر اس مسئلہ پر نظر کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات ہم کو مانتی پڑتی ہے کہ بندہ میں اختیار و قدرت کی صفت یقینی ہے اس کا انکار کرنا اپنے بدیہی وجدان کا انکار ہوگا۔ ایک بیوقوف سے بیوقوف شخص بھی اختیاری حرکات اور ایک رعشہ زدہ شخص کی حرکات کے مابین فرق سمجھتا ہے اور ہرگز دونوں کو یکساں کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن یہ بھی بدیہی ہے کہ جس طرح بندہ کا خود وجود اور اسی کے ساتھ اس کی دیگر صفات کمزور اور ضعیف ہیں، اسی طرح اس کی یہ قدرت اور اختیار بھی ضعیف در ضعیف ہے۔ دیکھئے انسان دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے، اس لیے اس کو شنوا اور بینا کہا جاتا ہے، مگر چونکہ اس کی یہ صفات ضعیف ہیں اس لیے ان کی کچھ شرائط بھی ہیں، اگر وہ نہ ہوں تو وہ نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے۔ پھر ان شرائط کے ساتھ جہاں وہ سنتا اور دیکھتا بھی ہے وہاں بھی کچھ دور چل کر اس کی شنوائی اور بینائی کی دونوں صفتیں معطل نظر آتی ہیں مثلاً ایک خاص فاصلہ کے بعد نہ وہ کچھ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے، مگر کیا اس کی اس معذوری پر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس میں سمع و بصر کی صفت ہی نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں دو رائیں پیدا نہیں ہو سکتیں بالاتفاق یہی کہا جائے گا کہ ضرور ہیں مگر اتنی ضعیف ہیں کہ زیادہ دور چل کر کام نہیں دے سکتیں۔ اگر صفت اختیار بھی ایسی ہی ضعیف صفت ہو جس کا کچھ دور تک تو اثر ظاہر ہوتا رہے لیکن ذرا آگے چل کر اس کا اثر ظاہر نہ ہو تو کیا اس ضعف کی وجہ سے اس کے وجود ہی کا انکار کر دینا صحیح ہوگا یا اگر اس کا اقرار کر لیا جائے تو کیا پھر یہ بھی ضروری ہوگا کہ آخر تک اس کا اثر تسلیم کیا جائے۔ پس اگر ہم اپنے اختیار کے اثرات کچھ دور چل کر مضحل یا معدوم دیکھتے ہیں تو اس بناء پر ہم کو اپنے بدیہی وجدان کے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اسی طرح اگر ہم اپنے بدیہی وجدان کی بنا پر اپنے نفس میں صفت اختیار تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ بھی کوئی لازمی امر نہیں ہے کہ پھر اس کے اثرات آخر تک بھی تسلیم کرتے چلے جائیں، اس لیے ہم پوری بصیرت کے ساتھ اس بات کے اقرار کرنے پر مجبور ہیں کہ ہم میں قدرت و اختیار کی صفت موجود ہے مگر ہاں خود



الفعل والترك بحسب هذا لقصد وبحسب هذه القوى المتشججه في نفسه وان كان كل شئ بحسب المصلحة الفوقانية اما واجب الفعل او واجب الترك فكذلك الحال في كل ما يستوجبه استعداد خاص فينزل من باري الضرور نزول الصور (۱) على المواد المستعدة لها كالا ستجابة عقيب الدعاء مما فيه دخل لمتجدد حادث بوجه من الوجوه و لعلك تقول هذا جهل بوجوب الشئ بحسب المصلحة الفوقانية فكيف يكون في موطن

اس صفت اختیار پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے یعنی اس پر ہم قدرت نہیں رکھتے کہ اس اختیار کو جدھر چاہیں لگا دیں بلکہ ہماری یہ صفت مشیت الہیہ کے تحت اسی طرح جبری حرکت کرتی ہے جس طرح ایک سنگ انداز کے ہاتھ کا پھینکا ہوا پتھر نہ اس پتھر کو یہ قدرت ہے کہ وہ اس سمت کو چھوڑ کر جدھر سنگ انداز نے اس کو پھینکا ہے کسی اور سمت چلا جائے نہ بندہ میں طاقت ہے کہ وہ اس جانب کے سوا جس جانب قدرت نے اس کے اختیار کو لگا دیا ہے کوئی ادنیٰ حرکت کر سکے۔ لہذا بندہ جو کرتا ہے یقیناً اپنے اختیار ہی سے کرتا ہے مگر وہ اپنے اختیار سے کرتا وہی ہے جو مختار مطلق اس سے کرانا چاہتا ہے۔ پس اس لحاظ سے کہ ہم جو کرتے ہیں اپنے اختیار سے ہی کرتے ہیں مختار کہلاتے ہیں اور اس لحاظ سے کہ اختیار سے وہی کر سکتے ہیں جو مشیت الہیہ ہوتی ہے مجبور کہلاتے ہیں یا بمنزلہ مجبور مگر یہ ایسا جبر ہے جو جبر مطلق سے ممتاز ہے کیونکہ جبر مطلق میں مجبور کو اپنے ارادہ کے ساتھ مزاحمت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی مؤمن کو کلمہ کفر کہنے کے لیے مجبور کیا جائے تو اگرچہ وہ کلمہ کفر زبان سے کہہ تو دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس خارجی جبر کی مزاحمت کا احساس بھی کرتا رہتا ہے یا مثلاً ایک منافق زبان سے کلمہ ایمان ادا تو کرتا ہے مگر یہاں بھی ظاہری خوف اس کے باطنی ارادہ کے لیے مزاحم رہتا ہے۔ لیکن جو چیز یہاں ہے اس کی ارادہ مجبور کے ساتھ کوئی مزاحمت نہیں ہوتی۔ انسان جو افعال بھی کرتا ہے وہ اپنے احساس کے مطابق آزادانہ اور پوری خود اختیاری سے کرتا ہے حتیٰ کہ اگر تقدیر کا جبر اس کو بتایا بھی جائے تو وہ اس کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے۔ جس طرح یہاں بندہ کا جبر جبر مطلق سے ممتاز ہے اسی طرح اس کا اختیار بھی مطلق اختیار سے ممتاز ہے کیونکہ وہ جو چاہے اختیار نہیں کر سکتا بلکہ وہی اختیار کر سکتا ہے جس کا اختیار مختار مطلق نے اس کو دے دیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے مگر چاہتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اس سے کرانا چاہتا ہے۔ اب اگر اس اختیار کے ساتھ کوئی شخص اپنے نفس کو مجبور کہتا ہے تو کہے مگر وہ ایسا مجبور ہوگا جو معذور نہیں ٹھہر سکتا۔ پروردگار عالم کی خالقیت کا یہ کرشمہ بھی عجیب ہے کہ اس نے ایک مجبور محض کو کس حکمت سے ایسا مختار بنا دیا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش میں اپنے احساس کے مطابق ادنیٰ سا جبر بھی محسوس نہیں کرتا ہے حالانکہ جبر کی گرفت اس پر اس درجہ سخت ہوتی ہے کہ وہ جنبش کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت اس لیے پیدا ہو گئی ہے کیونکہ یہاں افعال پر جبر نہیں افعال تو اپنے اختیار سے ہوتے ہیں مگر خود اس کا اختیار حق تعالیٰ کی مشیت کاملہ کے تحت ہوتا ہے اس لیے اس مختار کو اپنے جبر کا احساس نہیں ہوتا اگر جبر افعال پر ہوتا تو ضرور اس کا احساس ہوتا۔ یہ صفت صرف رب قدیر کی ہے وہ بندوں کے اختیار پر بھی حکومت کرتا ہے قضاء و قدر کے راز ہائے سر بستہ سب اسی نقطہ میں پنہاں ہیں۔ بندہ مجبور ہو کر اپنے مختار ہونے کا مدعی بھی اسی لیے رہتا ہے کہ اس کو اپنا اختیار ہی اختیار محسوس ہوتا ہے اور چونکہ اس کو یہاں اپنے ارادہ کے ساتھ کوئی

من مواطن الحق؟ فاقول حاش لله بل هو علم و ايفاء لحق هذا الموطن انما الجهل ان يقال ليس بواجب اصلا و قد نفت الشرائع الالهية هذا الجهل حيث أثبتت الايمان بالقدر و ان ما اصابك لم يكن يحطئك و ما اخطأك لم يكن ليصيبك و اما اذا قيل يصح فعله و تركه بجسب هذا الموطن فهو علم حق لا محالة كما انك اذا رأيت الفعل من البهائم يفعل افعال الفحليه و رأيت الانثى تفعل افعال الانثويه فان حكمت بان هذه الافعال صادرة جبراً

مزاحمت محسوس نہیں ہوتی اس لیے فوقانی جبر کا اس کو کوئی احساس نہیں ہوتا اور جب جبر و اختیار اس طرح مدغم ہو جائیں تو پھر اپنے افعال پر مسئول ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ کیا ایسا مختار بھی مسئول نہ ہونا چاہیے جو اپنے وجدان میں بھی خود مختار ہو۔ اس فوقانی جبر کا حال تو صرف انبیاء علیہم السلام نے بتایا ہے۔ حیرت ہے کہ یا تو انسان ایک طرف مختار مطلق بننا چاہتا ہے ایسا مختار کہ تقدیر کے جبر کو سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا اور مسلمان ہو کر بھی اس کی تصدیق میں ہزار جہتیں نکالنے کو بیٹھ جاتا ہے اور دوسری طرف جب تقدیر کا جبر تسلیم کرنے پر آتا ہے تو یہاں بھی اس کی روش معاندانہ ہی نظر آتی ہے۔ یعنی پھر جزاء و سزا میں الجھنے لگتا ہے و لقد صدق الله عز وجل ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (الكهف: ۵۴) (انسان فطرتاً جھگڑالو ہے) حالانکہ سوچنا تو یہ چاہیے تھا کہ کیا محکومیت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ محکوم ہمیشہ حاکم کے زیر دست رہے پھر یہاں تو رشتہ صرف محکومیت کا ہی نہیں بلکہ مخلوقیت کا بھی ہے کیا یہ معقول نہیں کہ یہاں ہمارا غیر مستقل اختیار بھی مختار کل کی مشیت کا محکوم بنا رہے جب یہ معقول بات سامنے رکھی جاتی ہے تو دنیا شور مچا کر دیتی ہے کہ ہم کو مجبور بنا دیا حالانکہ غور کی بات تو یہ تھی کہ جو سرے سے موجود ہی نہ تھا وہ مختار تھا کس دن پھر جتنا کچھ مختار تھا تقدیر نے اس کو ختم کب کیا بلکہ آئینی طور پر اور تسلیم کر لیا ہے پس یہاں تو یہ احسان کہ ایک معدوم محض کو شرف وجود بخشا پھر اپنی حکمت کاملہ سے ایک جماد محض (یعنی نطفہ) کو سمیع و بصیر اور مختار بنا دیا ادھر یہ احسان فراموشی کہ شکوہ یہ ہے کہ مختار کو مجبور بنا دیا۔

یہاں ایک مغالطہ یہ لگ گیا ہے کہ تقدیر اور بندہ کے اختیار کو علیحدہ علیحدہ سمجھ کر تقدیر کو بندہ کے اختیار پر حاکم مانا گیا ہے حالانکہ ہمارا اختیار بھی خود تقدیر کے دائرہ میں شامل ہوتا ہے اسی قسم کا سوال ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے آنحضرتؐ کے سامنے پیش کیا تھا ”یا رسول اللہ! امراض میں دواء کا استعمال اور جنگ میں ڈھال کا کیا خدائی تقدیر کو ٹال سکتا ہے؟“ یعنی جب نہیں ٹال سکتا ہے تو پھر ان کے استعمال کا فائدہ؟ آپؐ نے جواب کتنا مختصر مگر کیسا تشفی بخش ارشاد فرمایا میرے صحابہ تم ان اسباب کو تقدیر سے خارج سمجھتے ہی کیوں ہو۔ تقدیر میں یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ دواء کرو گے تو شفا یاب ہو گے سپر استعمال کرو گے تو دشمن کے وار سے بچ جاؤ گے۔ پس ارتکاب اسباب بھی احاطہ تقدیر میں داخل ہو چکا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ و براء شام کے قصہ میں نقل فرماتے ہیں کہ جب عمرؓ مقام سرغ کے پاس پہنچے تو آپؐ کو اطلاع ملی کہ شام میں تو براء پھیل رہی ہے یہ سن کر آپؐ نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اس پر ابو عبیدہؓ نے تعجب سے فرمایا ”اچھا آپؐ تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟“ یعنی اگر موت مقدر ہو چکی ہے تو پھر اس واپسی کا فائدہ؟ عمرؓ نے اس کا کیا حکیمانہ جواب دیا فرمایا: ابو عبیدہؓ اگر دو وادیاں ہوں ایک سرسبز دوسری خشک بولوا اپنے اونٹ کس میں چراؤ گے؟ اگر سرسبز وادی میں چراؤ اور یقیناً اسی میں چراؤ گے تو کیا



كحركة الحجر في تدحرجة كذبت و ابن حكمت بانها صادرة من غير علة موجبة لها فلا المزاج الفحلى  
يوجب هذا الباب و لا المزاج الانثوى يوجب ذلك كذبت و ان حكمت بان الارادة المتشجه في انفسهما  
تحكى وجوباً فوقانيا و تعتمد عليه و انها لا تفور فوراً (۳) استقلالاً كان ليس و راء ذلك عرفى فقد كذبت  
بل الحق اليقين امر بين الامرين و هو ان الاختيار معلول لا يختلف عن علله و الفعل المراد توجهه العلل

یہ تقدیر سے گریز ہو گا یا یہ بھی اسی تقدیر کے تحت ہو گا، اسی طرح میری واپسی کو احاطہ تقدیر سے باہر کیوں سمجھتے ہو۔ اگر موت کی وادی سے بچ کر جا رہا ہوں تو یہ بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہو گا، جب ہی تو جا رہا ہوں۔ (موطا مالک)

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ تقدیر و تدبیر میں جنگ نہیں ہے اور جنگ تو اس وقت ہوتی جب کہ تدبیر تقدیر کے احاطہ سے کہیں باہر ہوتی اب تو تدبیر بھی تقدیر کا جزء بنی ہوئی ہے تقدیر و تدبیر کے مراتب کو اس طرح محفوظ رکھنا یہ علوم نبوت کا فیض ہے، دیکھئے حضرت یعقوب علیہ السلام جب اپنے فرزندوں کو مصر روانہ کر رہے ہیں تو نظر گزر کے خطرہ سے تحفظ کے لیے یہ بھی فرماتے جاتے ہیں ﴿يَا بُنَيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَ ادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ﴾ (یوسف: ۶۷) بچو! دیکھنا کہیں ایک ہی دروازہ سے سب کے سب مت داخل ہو جانا بلکہ متفرق دروازوں سے جانا (کہیں خاندان نبوت کو کسی کی نظر نہ کھا جائے) ادھر شفقت پوری نظر گزر سے تحفظ کی یہ تدبیر بھی کرتی جاتی ہے ادھر لسان نبوت رمز تقدیر سے بھی آگاہ کیے جاتی ہے اور فرماتی ہے ﴿وَمَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (یوسف: ۶۷) یعنی میری یہ تدبیر صرف عالم اسباب کی ایک تسلی ہے جو مقدر ہو چکا ہے کہیں اس کو میں ٹال سکتا ہوں۔

یہاں اس پر بھی ذرا غور کیجئے کہ جس کو آپ تقدیر کا جبر سمجھتے ہیں اس کی حقیقت ہے کیا۔ یہی تو کہ قدرت نے اپنے دیئے ہوئے اختیار کو اپنے ہی کنٹرول میں رکھا ہے، یا یہ کہ جو اختیار عطا فرمایا تھا اس کو سلب کر لیا ہے پھر اس جبر کا اثر ہے تو کہاں ہے، کیا ان اشیاء میں ہے جہاں آپ کو تقدیر سے قبل اختیار حاصل تھا یا ان میں جہاں پہلے بھی آپ مجبور ہی مجبور تھے اس لیے یوں نہ کہیے کہ تقدیر نے ہم مختاروں کو مجبور بنا دیا، بلکہ یوں کہیے کہ ہم مجبوروں کو ایک محدود پیمانہ پر مختار بنا دیا ایسا مختار کہ وہ اختیار بھی ہماری حیثیت سے کہیں زیادہ تھا، ایک مجبور میں نہیں بلکہ معدوم محض میں اختیار کا تصور کرنا ہی کب معقول ہے یہ تو مختار مطلق کا کرم تھا کہ اس نے محض اپنے کرشمہ قدرت سے ایک جماد کو اختیار بخش دیا اور اس کے اس اختیار کے سامنے اپنا خبر ایسا پس پردہ کر دیا کہ اس عالم میں اس جبر کا ادراک کرنا مشکل ہو گیا۔ ﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ (الانفال: ۲)

ذرا اور دقت نظر سے کام لیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ہمارا یہ ناتمام اختیار قائم ہی جب رہ سکتا ہے جب کہ قدرت کا اختیار اس کے ساتھ ساتھ لگا رہے اگر قدرت کا اختیار کہیں اس کی سرپرستی چھوڑ دے تو ہمارا اختیار خود بخود فناء ہو جائے۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ بچہ جب ہٹ کرتا ہے کہ چلے اور اپنے پیروں ہی چلے اس کے والدین جانتے ہیں کہ اس غریب کے پیروں میں خود چلنے کا دم نہیں ہے اس لیے اپنی طاقت سے اس کو چلاتے ہیں اور جس طرف وہ چلنا چاہتا ہے اسی طرف چلاتے ہیں۔ اس کا

و لا يمكن ان لا يكون و لكن هذا الاختيار من شأنه ان يتهج بالنظر الى نفسه و لا ينظر الى مافوق ذلك فان ادبت حق هذا الاختيار من شأنه ان يتهج بالنظر الى نفسه و لا ينظر الى مافوق ذلك فان ادبت حق هذا الموطن و قلت اجد في نفسي ان الفعل و الترك كانا مستويين و اني اخترت الفعل فكان الاختيار علة لفعله صدقت و بررت فاجزت الشرائع الالهية عن هذه الارادة المتشعبة في هذه الموطن و بالجملة فقد ثبتت ارادة

نا تمام اختیار جب اس طرح والدین کے اختیار مستقل کے سہارے سہارے کام کرنے لگتا ہے تو اس بچہ کے ارمان تو یوں پورے ہو جاتے ہیں کہ جو اس کی ضد تھی وہ پوری ہو گئی اور والدین یوں خوش ہو جاتے ہیں کہ اس طرح ان کا بچہ خوش ہو گیا، اور ان کا کچھ بگڑا نہیں۔ اگر کہیں یہ بچہ اس کی ضد کر بیٹھے کہ والدین کی دستگیری کے بغیر خود اپنی ہی طاقت سے چلے تو ظاہر ہے کہ جتنا فاصلہ اپنے اس نا تمام اختیار کے ساتھ اس نے طے کر لیا تھا یہ بھی طے نہ ہو۔ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ بچہ تو اپنی مشیت بھی رکھتا ہے اور کچھ طاقت بھی ادھر اس کے والدین کو طاقت اس سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔ مگر اپنی مشیت اور اپنی طاقت کو اس بچہ کے تابع بنائے رکھتے ہیں اور ادھر ہی اس کو صرف کرتے ہیں جدھر وہ بچہ ارادہ کرتا ہے مگر خالق کے معاملہ میں بندہ کی مشیت کی ہستی ہی نہیں ہوتی، وہ اگر کچھ قدم چل سکتی ہے تو خالق کی مشیت کے سارے سارے ہی چل سکتی ہے ﴿وَمَا تَشَاؤْنَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ یعنی تم ارادہ ہی وہ کر سکتے ہو جو مشیت الہیہ چاہتی ہے۔ تعجب ہے کہ اتنی محکومیت کے باوجود اگر سطحی نظر ڈالو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس عالم میں مشیت الہیہ ہمارے ارادہ کے تابع بنی ہوئی ہے اور جو ہم کرنا چاہتے ہیں وہی وہ پورا کرتی رہتی ہے۔ یہ تمام کرشمہ اسی حکمت کا ہے کہ ہمارے افعال پر قدرت نے جبر نہیں فرمایا بلکہ خود ہمارے اختیار ہی کو اپنے اختیار میں لے رکھا ہے، لہذا مجبور محض ہونے کے باوجود ہمارا احساس یہی رہتا ہے کہ ہم مختار مطلق ہیں اور اس عالم کے لحاظ سے یہ غلط بھی نہیں، جو جبر یہاں ہے وہ عالم غیب کے لحاظ سے ہے، اور وہ ہماری دسترس سے باہر ہے۔ اب اس کے سواء چارہ کار نہیں کہ اس معاملہ میں صرف انبیاء علیہم السلام کے بیان پر اعتماد کیا جائے یہاں دلائل کا اگر انبار بھی لگا دیا جائے تو انسان اپنے ذاتی وجدان کے بالمقابل ان کو باور نہیں کر سکتا، اس لیے اسلام نے یہاں صرف تسلیم و رضاء کی ایک راہ بتادی ہے۔ حقیقت سے بے خبر بھی نہیں رکھا اور اس کو پورے طور پر حل کرنا چونکہ ہمارے بس سے بالاتر تھا اس لیے بحث کرنے سے بھی روک دیا۔ ﴿فَاتَّبِعُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ﴾

بالفاظ دیگر اس مضمون کو یوں سمجھئے کہ بعض مرتبہ شیء کا وجود ہی اتنا کمزور اور ضعیف ہوتا ہے کہ وہ خود بخود قائم نہیں رہ سکتا، اس کے وجود کی کل حقیقت ہی اتنی ہوتی ہے کہ کسی موجود حقیقی کے ساتھ اس کو کوئی صحیح نسبت لگی رہے اور اس لیے اس کا وجود بھی اسی وقت قائم رہتا ہے جب تک کہ یہ نسبت قائم رہتی ہے جہاں یہ نسبت ختم ہوئی اس کا وجود بھی ختم ہوا۔ دیکھو دن میں دھوپ کی تمازت و تیزی کا کیا عالم ہوتا ہے۔ موسم گرما میں فضاء عالم گویا کرۂ نار بنی ہوئی نظر آتی ہے، مگر جہاں آفتاب نے غروب ہونے کے لیے رختِ سفر باندھا اسی کے ساتھ ساتھ حرارت کے آثار بھی مضمحل اور مدہم پڑنا شروع ہوئے، ادھر آفتاب غروب ہوا اور ادھر یہ آثار بھی معدوم ہوئے، اور وہی فضاء جو ابھی ابھی بقعہ نور بنی ہوئی تھی ایک دم میں تیرہ و تاریک بن گئی۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہاں



یتحدد تعلقها و ثبتت المجازاة في الدنيا و الآخرة و ثبت ان مدبر العالم دبر العالم يا يجاب شريعة يسلكونها لينقنوا فكان الامر شبيها بان السيد استخدم عبيده و طلب منهم ذلك و رضى عمن خدم و سخط على من لم يخدم فنزلت الشرائع الالهية بهذه العبارة لما ذكرنا أن الشرائع تنزل في الصفات و غيرها بعبارة ليس هنالك افصح و لا ابين للحق منها اكانت حقيقة لغوية او مجازا متعارفان مكنت الشرائع الهية هذه المعرفة الغامضة

آفتاب نے کچھ ظلم کیا ہے کہ ہماری یہ بزم کی ساری رونق اپنے ساتھ ہی لوٹ کر لے گیا، نہیں نہیں حقیقت یہ ہے کہ عالم کی فضاء پہلے سے تاریک ہی تھی جو نور اس کو عطا ہوا تھا یہ آفتاب ہی کی سخاوت تھی مگر کیا کیا جائے کہ اس میں استعداد ہی اتنی تھی کہ جب تک اس کی نسبت آفتاب کے ساتھ درست رہے وہ روشن رہے اور جب یہ نسبت ختم ہونے لگے تو اس کا وجود بھی معرض خطر میں نظر آئے۔ یہاں اس فضاء میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اس کا بخشا ہوا نور تھوڑی سی دیر کے لیے جذب ہی کیے رہے چار و ناچار نتیجہ یہ نکل کر رہتا ہے کہ اس کی اصل مظلم و تاریک شکل پھر عود کر آتی ہے اس میں آفتاب کا ظلم کیا ہے۔ جتنی دیر فضاء منور رہی یہ اس کا کرم تھا اور جب مکدر و مظلم ہوئی تو یہ خود اس فضا کا اپنا ہی قصور ہے۔ اسی طرح ممکنات کی حقیقت وجود سے معرئی اور خالی ہے جو عارضی وجود ان کو ملا ہے یہ خالق کل کا عطا کردہ ہے۔ اب سوچے کہ ایسے موجود کی صفات کا حال کیا ہوگا، اسی سے اس کی صفت اختیار کو بھی قیاس کر لیجئے، پس اس کا اگر وجود قائم ہے تو اسی موجود حقیقی کے انتساب سے قائم ہے اور اگر اس کا اختیار ہے تو بھی اسی کے اختیار مطلق کے زیر سایہ رہ کر ہے۔ حق تعالیٰ عالم کو پیدا فرما کر اس سے علیحدہ نہیں ہو گیا، بلکہ اسی نے پھر اس کی ہستی کو برقرار رکھ چھوڑا ہے اگر اس کی یہ نگرانی نہ رہے تو اسی آن میں سارا عالم درہم و برہم ہو جائے۔ اسی وجہ سے اس کا نام قیوم بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَإِنَّ اللَّهَ يُمَسِّكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ﴾ (فاطر: ۴۱)

پس جب ممکنات کا نفس وجود ہی اتنا ضعیف ہو کہ موجود ہونے کے بعد آئندہ اپنی بقا کے لئے بھی سہارے کا محتاج رہے تو پھر کیا اس کی صفات مستقل ہو کر قائم رہ سکتی ہیں۔ ظل کی کیا مجال کہ اپنی اصل سے مستغنی ہو سکے نا واقف اظلال کی طوفان خیز حرکت کو دیکھتا ہے تو ان حرکات کا خالق ان اظلال ہی کو سمجھنے لگتا ہے واقف خوب جانتا ہے کہ ان میں کیا رکھا ہے یہ سب بے حقیقت ہے جو کچھ ہو رہا ہے یہ حرکات اصل ہیں جو اظلال میں بطریق عکس نمایاں ہو رہی ہیں اگر یہ اظلال اپنے اصول کے استقبال کی درخواست پیش کرنے لگیں تو یہ کیسی نادانی ہوگی ظاہر ہے کہ خیریت اسی میں ہوگی کہ یہ سب درخواستیں مسترد کر دی جائیں ورنہ ظاہر ہے کہ ظلال کی حقیقت ہی اتنی ضعیف ہے کہ ان کا استقلال بس یہی ان کی فناء ہے۔ مثل مشہور ہے کہ جب چیونٹی کے پر نکلنے لگتے ہیں تو اس کے فناء کا زمانہ قریب ہوتا ہے اسی لئے بعض سلف کا مقولہ ہے:

والله ما احب ان يجعل امرى الى و كون امرى بخدا میں اپنے معاملہ کو خدا تعالیٰ کی قدرت کے تحت رکھنا اس سے

بید الله خير من ان يكون بیدی. (موقف ص ۲۲۴) بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنی قدرت میں رکھوں۔

غالباً اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جبر کا سوال نہ تو تقدیر سے متعلق ہے نہ پروردگار عالم کے عدل سے بلکہ یہ ذات ممکن کا خود اپنا ہی قصور ہے اور جب یہ قصور خود اپنی حقیقت کا ہے تو پھر اس کے ازالہ کی فکر بھی عبث ہے۔ اتنی تطویل کے بعد بھی یہ مشکل پھر جوں کی توں رکھی ہوئی ہے کہ انسان اپنے وجود کو ضعیف سمجھے کیونکہ وہ اپنے نفس ہی کو موجود حقیقی سمجھتا اور جس کی خبر انبیاء

من نفوسهم بثلاثة مقامات مسلمة عندهم جارية مجرى المشهورات البديهية بينهم، احدهم انه تعالى منعم و شكر المنعم واجب و العبادة شكراً له على نعمه، و الثانى انه يجازى المعرضين عنه التاركين لعبادته فى الدنيا اشد الجزاء، و الثالث انه يجازى فى الآخرة المطيعين و العاصيين فانبسطت من هنالك ثلاثة علوم، علم التذكير بالآلاء الله، و علم التذكير بأيام الله، و علم التذكير بالمعاد فنزل القرآن العظيم شرحاً لهذه العلوم. (صفحہ ۶۸ حجتہ اللہ)

علیہم السلام دیتے ہیں اس کو آنکھوں سے دیکھتا نہیں، اگر کہیں اس کو دیکھ لیتا ہے تو مسئلہ تقدیر اسی وقت بدیہی بن جاتا۔ اب نہ قیامت سے قبل موجود حقیقی کا دیدار ممکن ہے اور نہ مسئلہ تقدیر کا حل ممکن ہے، بس یہاں صحیح راستہ ایک ہی ہے وہ یہ کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر خالق کا وجود مان لیا گیا ہے اسی طرح ان ہی کے اعتماد پر خالق کی تقدیر پر بھی اعتماد کر لیا جائے۔

### مسئلہ مجازات

جزاء و سزا کے مسئلہ میں الجھنا بھی بیکار ہے، اول تو اس لیے کہ یہ مسلم قاعدہ ہے کہ مالک اور خالق سے کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا بلکہ مالک کی تعریف ہی یہ ہے کہ جو ہر قسم کا تصرف کرنے کا مجاز ہو آپ ایک چیز عاریتہ لیتے ہیں، کرایہ پر بھی لیتے ہیں مگر یہاں الٹی اور اس کی حفاظت ہی آپ کے سر پر پڑتی ہے اور آپ صرف وقت مقرر تک وہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانے کے مجاز ہوتے ہیں، اس کو فروخت نہیں کر سکتے، ہبہ نہیں کر سکتے، اس میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کر سکتے اس کو توڑنا اور خراب کرنا تو درکنار لیکن جس چیز کے آپ مالک کہلاتے ہیں اس میں آپ کو ان تمام تصرفات کا حق حاصل ہوتا ہے، بلکہ ایک قیمتی چیز کے ضائع کر دینے پر بھی آپ مسئول نہیں ہو سکتے۔ جب ایک مجازی ملک کے حقوق یہ ہیں تو حقیقی ملک کے حقوق کیا ہوں گے پھر یہاں علاقہ صرف ایک ملکیت کا ہی نہیں مخلوقیت کا بھی ہے اور چونکہ اس نے بلا شرکت غیرے پیدا فرمایا ہے اس لیے مالکیت حقیقیہ کا حق بھی صرف اسی کا رہنا چاہیے۔ ایسے مالک سے جو خالق بھی ہو جزاء و سزا کا سوال ہی کیا؟

دیکھئے حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالیٰ نے مالکیت نہیں صرف ملکیت عطا فرمائی تھی وہ بھی بہت محدود و پیمانہ پر لیکن اس نا تمام ملکیت کے لیے بھی جو امتیازی شان عطا فرمائی وہ ان الفاظ سے ظاہر ہے:

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ

یہ ہماری بخشش ہے اب آپ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں آپ سے اس کا کوئی حساب نہیں لیا جائے گا۔

حِسَابٍ. (ص: ۳۹)

حافظ ابن کثیر اپنی مشہور تاریخ البدایہ والنہایہ کی جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چونکہ نبوت کے ساتھ سلطنت بھی مرحمت ہوئی تھی اس لیے یہ تنبیہ کر دی گئی کہ یہ بادشاہت ہے تو ہمارا عطیہ مگر چونکہ بادشاہ سے کوئی باز پرس نہیں ہوا کرتی اس لیے جاؤ اس بارے میں تم سے بھی کوئی حساب نہیں ہوگا۔“ اسلام میں غلامی کے مسئلہ سے ذرا سی مالکیت کا پتہ چلتا ہے اگرچہ وہ صرف یہ جتانے کے لیے مقرر کی گئی ہے کہ جو مولائے حقیقی اور مالک حقیقی کی مالکیت پر راضی نہیں ہوتا اس کو پھر غلاموں کی مالکیت پر راضی ہونا پڑے گا مگر اس مالکیت کے بھی جتنے حقوق ہیں وہ اس سے ظاہر ہیں کہ جو ابھی ابھی غلامی سے قبل خود مالک بننے کی اہلیت رکھتا تھا ملکیت کا لفظ سی



افعال العباد اختیاریۃ، لکن لا اختیار لهم فی ذلك الاختیار، و انما مثله کمثل رجل اراد ان یرمی حجراً، فلو انه کان قادراً حکماً خلق فی الحجر الحركة ایضاً، و لا یرد علیه ان الافعال اذا كانت مخلوقة اللہ تعالیٰ و كذلك الاختیار ففیم الجزاء، لان معنی الجزاء یرجع الی ترتب بعض افعال اللہ تعالیٰ علی البعض، بمعنی ان اللہ تعالیٰ خلق هذه الحالة فی العبد، فافتضى ذلك فی حکمته ان یخلق فیہ حالة اخرى من النعمة أو الا لم کما

پہلو سے اس پر عائد ہو نہیں سکتا تھا ہر تصرف اس کا نافذ اور ہر حکم اس کا ناطق تھا وہی غلامی کے بعد اس طرح مملوک بن جاتا ہے کہ مالکیت کی اس میں اہلیت ہی نہیں رہتی نہ اس کا کوئی تصرف درست ہوتا ہے نہ کوئی حکم نافذ ہونے کے قابل ہوتا ہے اور اس کے مالک کو اس کو بیچ ڈالنے کا بھی حق حاصل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اگر وہ اس کو مار بھی ڈالے جب بھی بعض ائمہ کے نزدیک گو اس کو گناہ کتنا ہی بڑا ہو مگر دنیا میں اس سے قصاص نہیں لیا جاتا۔ باپ بیٹے میں خالقیت سے ذرا سی مشابہت پائی جاتی ہے، وہاں بھی بیٹے کے قتل کرنے کا قصاص باپ سے نہیں لیا جاتا۔ پس جب کہ مالکیت و خالقیت کی ادنیٰ سی مشابہتوں کے بعد سوال و جواب کا مرحلہ ختم ہو جاتا ہو تو جہاں یہ دونوں باتیں اپنی پوری حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہوں بھلا وہاں محاسبہ اور سوال کا حق کس کو ہو سکتا ہے اس لیے فرمایا ﴿لَا یَسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُونَ﴾ (الانبیاء: ۲۳)

دوم آپ نے کبھی اس مسئلہ پر بھی غور کیا ہے کہ آخر اس عالم کی آفرینش ہوئی کیوں؟ یہاں صرف ذات جامع صفات کا ایک اقتضاء ہی تو تھا۔ لہذا اب جس صورت سے بھی یہ اقتضاء پورا ہو گا وہی مناسب ہوگی۔ کمال یہ چاہتا ہے کہ مہر و قہر دونوں ہی کا ظہور ہو اس لیے ضروری ہوا کہ دونوں کے لیے اسباب بھی پیدا فرمائے جائیں اور چونکہ جزاء و سزا کا عنوان چاہتا ہے کہ جزاء میں عمل کی کچھ تاثیر بھی عیاں رہے تاکہ اچھے پر اچھی جزاء اور برے عمل پر اس کی سزا دی جاسکے اس لیے ضروری ٹھہرا کہ بندہ کو کچھ اختیار دے دیا جائے اس تناسب کے لیے جتنا اختیار عقلاً ممکن تھا وہ عطا کر دیا گیا اور اسی پر جزاء و سزا کو دائر کر دیا گیا۔ اب جب کبھی بندہ اپنے اس عطا کردہ اختیار سے برا عمل کرتا ہے وہ دنیا میں بھی برا کہلاتا ہے اور اگر بھلا کرتا ہے بھلا کہلاتا ہے جب اس کے ان افعال پر دنیا میں تعریف و مذمت کرنا معقول ہو گئی تو آپ میں معقول کیوں نہ سمجھی جائے۔

چلا عدم سے میں ہستی کو بول اٹھی تقدیر بلا میں پھنسنے کو کچھ اختیار لیتا جا

رہ گئی یہ بات کہ جب برے افعال کرنا بری بات ہے تو اس کا پیدا کرنا کمال کیونکر سمجھا جائے تو سمجھئے کہ خلق اور کسب میں بڑا فرق ہے۔ انسان جب کوئی عمل کرتا ہے تو وہ عمل اس کے ساتھ اس طرح قائم ہوتا ہے جیسے کپڑے کے ساتھ سفیدی اور سیاہی۔ اب جب اس لحاظ سے کپڑے کو سفید اور سیاہ کہہ سکتے ہیں تو ان اعمال کے لحاظ سے بندہ کو برا اور بھلا بھی کہہ سکیں گے، مگر مخلوق خالق سے علیحدہ رہتی ہے وہ اس کے ساتھ قائم نہیں ہو جاتی، لہذا بری مخلوق خالق کی صفت نہیں ہو سکتی، البتہ اس کا پیدا کرنا اس کی صفت ہوتی ہے۔ صفت خلق بہر کیف کمال ہے اسی لیے ناقص نہ خیر پیدا کر سکتا ہے نہ شر کیونکہ خلق مطلقاً ایک کمال ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ خلق شر کمال کیوں ہے؟ تو ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ جب خلق کفر میں ظہور قہر کی مصلحت بھی ہو تو پھر اس کو بھی مقتضائے کمال کیوں نہ کہا جائے۔

درکار خانہ خلق از کفر ناگزیر است آتش کر ابسوز دگر بولہب نباشد

شاعر یہاں یہی مضمون کہہ رہا ہے کہ عالم میں کفر اس لیے ضروری ہے کہ اگر ابولہب جیسا کافر نہ ہو تو پھر جہنم کی پیدائش کا فائدہ؟

انه يخلق في الماء حراره' فيقتضى ذلك ان يكسوه صورة الهواء' و انما يشترط وجود اختيار و كسب العبد في الجزاء بالعرض لا بالذات' و ذلك لان النفس الناطقة لا تقبل لون الاعمال التي لا تستند اليها بل الى غيرها من جهة الكسب و لا الاعمال التي لا تستند الى اختيارها و قصدها' و ليس في حكمة الله ان يجازي العبد بما لم تقبل نفسه الناطقة لونه' فاذا كان الامر على ذلك كفى هذه الاختيار غير المستقل في الشرطية اذا كان مصححاً

بادشاہی کا کمال دونوں قسم کی طاقتوں ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے کافر کے حق میں کفر کتنا ہی قبیح سہی لیکن خالق کے حق میں تو مظہر کمال ہوتا ہے۔ دیکھئے بیت الخلاء یعنی پاخانہ خود کتنی ہی کمتر چیز ہو لیکن ایک بڑی سے بڑی کوٹھی اس وقت تک ناقص ہی سمجھی جاتی ہے جب تک کہ اس میں یہ ناقص در ناقص چیز بھی موجود نہ ہو۔ جس طرح ایک کوٹھی کے لیے بیت الخلاء کا وجود ضروری ہے اسی طرح عالم کے کمال کے لیے بھی صدیق اکبرؑ جیسے مؤمن کامل کے بالمقابل ایک ابو لہب جیسے کافر کی بھی ضرورت ہے، پھر جس طرح کوٹھی میں یہ سوال کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے کہ اس زمین نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو بیت الخلاء بنادیا، اور اس ٹکڑے میں کیا کمال تھا کہ اس کو شہ نشین بنادیا۔ اسی طرح یہاں بھی یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ ابو لہب نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو کافر بنادیا، اور صدیق اکبرؑ میں کیا کمال تھا کہ ان کو صدیقیت سے نوازا دیا یہ سب مالک کے اپنے ارادہ اور پسند کی بات ہے، کسی کو اس میں دخل در معقولات کا حق نہیں ہے۔

بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے فوائد قرآن کریم میں زیر تفسیر آیہ ﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ (الکہف: ۴۹) مسئلہ تقدیر کا حل اس طرح تحریر فرمایا ہے:

”رب جو کرے سوظلم نہیں سب اسی کا مال ہے پر ظاہر میں جو ظلم نظر آئے وہ بھی نہیں کرتا بے گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی ضائع نہیں کرتا، اور جو کوئی کہے (یعنی اعتراض کرے) گناہ میں ہمارا کیا اختیار ہے؟ سو (یہ) بات نہیں (ہے) اپنے دل سے پوچھ لے جب گناہ پر دوڑتا ہے اپنے قصد سے دوڑتا ہے اور جو کوئی کہے قصد بھی اسی نے دیا تو قصد دونوں طرف لگتا ہے، اور جو کوئی کہے اسی نے ایک طرف لگا دیا، سو بندہ کی دریافت سے باہر ہے، بندہ سے معاملہ ہوتا ہے اس کی سمجھ پر، بندہ بھی پکڑے گا اسی کو جو اس سے بدی کرے، یہ نہ کہے گا کہ اس کا کیا قصور اللہ نے کرا دیا۔“

ان سطور کو بار بار بغور پڑھیے مسئلہ تقدیر کا جتنا واضح حل اور جتنی سادگی سے آپ کو یہاں ملے گا بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملے گا، بشرطیکہ سمجھنے کا ارادہ بھی ہو۔ خاتمہ بحث پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق حضرت الاستاذ علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کی جو نظم ہے وہ بھی ہدیہ ناظرین کر دی جائے، اس میں تمام گزشتہ تفصیلات کو بہت مختصر اور عمدہ پیرایہ میں سمیٹ دیا گیا ہے، اگر آپ نے ان تفصیلات کو سمجھ کر ذہن نشین کر لیا ہے تو پھر آپ ان اشارات سے جو اس مختصر نظم میں اس مسئلہ میں اشکالات کے حل کے لیے کیے گئے ہیں پورے طور پر محفوظ ہو سکتے ہیں:

ایسا صاحبی ان الکلام بقدر تک طویل و تحریر الخلاف بطول

عزیز من! تمہاری قدرت کی داستان بہت دراز ہے، اگر اس میں مذاہب کی تفصیلات بھی بیان کی جائیں تو افسانہ اور دراز ہوتا ہے۔



قبول لون العمل، وهذا الكسب غير المستقل اذا كان مصححا لتخصيص هذا العبد بخلق الحالة المتأخرة فيه دون غيره، وهذا تحقيق شريف مفهوم من كلام الصحابة و التابعين فاحفظه. (صفحہ ۱۶۷ حجتہ اللہ)

ففيك اختيار ليس منك و ذلك لجر اختيار لا يکنک ذہول  
اس لیے مختصر یہ سن لو کہ تم میں اختیار کی صفت تو یقیناً پیدا فرمائی گئی ہے، مگر اس اختیار پر تمہارا اختیار نہیں ہے اس لیے یہاں جبر بھی ہے مگر افعال پر نہیں اختیار پر ہے۔

و اما اختيار مستقل فانه محال فلا یسألک عنہ سنول  
اب رہا ایسا اختیار مطلق جس کے اوپر کسی کا جبر نہ ہو تو وہ مخلوق کے حق میں محال ہے، نہ مخلوق خالق بن سکتی ہے نہ اختیار مستقل اس کو مل سکتا ہے، لہذا اس کے متعلق تم سے کوئی حریص سوال نہ کرے۔

فافعالنا منا علی اختیارنا و لکنہا نحو القدير یؤل  
خلاصہ یہ ہوا کہ ہمارے افعال ہماری قدرت سے سرزد ہوتے ہیں اور ہمارے اختیار ہی سے صادر ہوتے ہیں لیکن چونکہ ہماری قدرت و اختیار قادر مطلق کی عطا فرمودہ ہیں اس لیے افعال کی نسبت اس طرف بھی رہتی ہے۔

وهذا هو الكسب الذی کلفواہ و فیہ اقتصاد فلیکنک قبول  
امام ماتریدی نے اس مسئلہ میں خلق و کسب کا جو فرق فرمایا ہے اس کی تفسیر بھی یہی ہے اور یہی درمیانی راہ بھی ہے اس لیے چاہیے کہ تم اس کو بسر و چشم قبول کر لو۔

و یثمر شرّ ما ینبغی لہ فیزعمہ الظلم الصریح جہول  
رہا جزاء و سزا کا مسئلہ تو وہ واضح ہے کہ شر سے شر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ جاہل آدمی اس کو ظلم سمجھنے لگتا ہے۔  
کایسرات خبث البذر خبث نباتہ طباعاً و لا یأتیہ قال یقول  
دیکھو اگر خراب درخت کا تخم ہو تو کیا اس سے ویسا ہی درخت طبعاً پیدا نہیں ہوتا پھر یہاں کون سوال و جواب کرتا ہے کہ اس تخم سے یہ خراب درخت ہی کیوں پیدا ہوا؟

ولیس جزاء ذاک عین فعالنا و لکن سترّا حال سوف یزول  
اگر غور کرو تو جس کو تم جزاء سمجھ بیٹھے ہو یہ جزاء نہیں وہی دنیا میں کیے ہوئے تمہارے اچھے برے اعمال ہیں جو دوزخ اور جنت میں ثواب و عذاب کی شکل میں نظر آئیں گے۔ جو حجاب یہاں ہماری آنکھوں پر اس حقیقت کے دیکھنے سے مانع ہو رہا ہے قیامت میں وہ اٹھ کر رہے گا، اس وقت یہ بات صاف صاف نظر آ جائے گی۔

ولا یتوی المیزان الابحضلة تفوت بادنئی میلة فیعمل  
ترازو کے دونوں پلوں کے برابر رہنے کی صرف ایک ہی صورت ہوتی ہے، جہاں ایک طرف جھکاؤ پیدا ہوا اور وہ ختم ہوئی۔ اسی طرح تقدیر کے جبر و اختیار کے پلوں کو بھی برابر رکھنا چاہیے ورنہ جبر یہ یا قدر یہ میں شامل ہو جاؤ گے۔

و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ و خیرتہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تسلیما کثیرا

## مسئلہ قضاء و قدر علمی نظر میں

### قضاء و قدر اور اکتشافات عصریہ کا اس پر اثر

مسئلہ قضاء و قدر اگرچہ عہد قدیم سے عقلاء کے درمیان معرکہ بحث بنا ہوا ہے، مگر ہمارے دور میں جس نظریہ کے ماتحت اس پر نظر ڈالی جا رہی ہے وہ قدیم نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ عہد ماضی میں خالق کی زبردست ہستی تو سب کو مسلم تھی بحث صرف اسی میں تھی کہ بندوں کے افعال قدرت کی گرفت سے آزاد ہیں یا ان پر بھی اس کا فولادی شکنجہ کسا ہوا ہے؟ لیکن دور حاضر کا انسان تو یہ سمجھتا ہے کہ جب اکتشافات عصریہ نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا ہے کہ انسان اپنے افعال کی دنیا ہی نہیں بلکہ اپنی ضروریات کی جملہ مصنوعات کی تخلیق و تخریب کے لیے خود کافی ہے تو اب کسی خارجی قدرت کو بے وجہ تسلیم کیے چلے جانا محض بے معنی اور کورانہ تقلید ہے۔ گویا اب بحث یہ نہیں رہی کہ کوئی خارجی طاقت تو موجود ہے مگر ہمارے افعال پر اس کا کنٹرول کتنا ہے؟ بلکہ نقطہ بحث یہ بن گیا ہے کہ انسانی قدرت کے ان مظاہروں کے بعد کیا اس پر کسی خارجی قدرت کا تسلط تسلیم کر لینا معقول بھی ہے؟ عالم غیب سے اس نا آشنا جماعت کو یہ خبر ہی نہیں کہ مسئلہ تقدیر انسانی جدوجہد یا اس کی در ماندگی کی وجہ سے کسی وقت بھی زیر بحث نہیں رہا بلکہ ہمیشہ زیر بحث یہ رہا ہے کہ انسانی افعال خواہ وہ معمولی سے معمولی ہوں یا مشکل سے مشکل در حقیقت ان میں انسانی قدرت کا دخل ہوتا بھی ہے یا نہیں اگر ہوتا ہے تو کتنا؟ جس جماعت کا خیال یہ ہے کہ انسان گو خود مخلوق ہے مگر اپنے افعال کی تخلیق کی اس کو پوری پوری قدرت عطا کر دی گئی ہے اس کے نزدیک اس کے محیر العقول کارنامے اور اس کے معمولی سے معمولی افعال دونوں کے دونوں اسی کی قدرت کے رہن منت ہیں اور جس کے نزدیک اس کو یہ قدرت عطا نہیں ہوئی اس کے نزدیک بھی انسانی افعال میں معمولی اور غیر معمولی کی کوئی تفریق نہیں خواہ وہ سائنس کی جدید ایجادات ہوں یا ادنیٰ سے ادنیٰ افعال دونوں کے دونوں اس کی قدرت سے خارج اور براہ راست قدرت الہیہ کے زیر اثر ہیں۔

پس انسان کی مصنوعات کی حیرت انگیز ترقیات دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھنا گویا اب مسئلہ تقدیر سے حجاب اٹھ گیا ہے، صرف ایک خوش فہمی ہے۔ یاد رکھیے کارخانہ عجائبات جتنا پھیلتا چلا جائے گا قضاء و قدر کا سوال بھی اتنا ہی اور پھیلتا چلا جائے گا، کیونکہ قضاء و قدر کا سبق ہمیں اپنی مصنوعات اور مساعی سے کہیں باہر جا کر پڑھنا نہیں ہے بلکہ خود اپنے ان افعال ہی کے ضمن میں پڑھنا ہے اس لیے ہمارے افعال کا عمق جتنا اور بڑھتا رہے گا قضاء و قدر کا سوال بھی اتنی ہی گہرائی میں اٹھتا رہے گا۔

### قضاء و قدر اور انسانی جدوجہد سے اُس کا تعلق

موجودہ مفکرین کو ایک مغالطہ یہاں یہ بھی ہے کہ مسئلہ قضاء و قدر انسانی ترقیات میں ایک بہت بڑی رکاوٹ کا باعث ہے، ان کے زعم میں انسانی دماغ پر کسی فوقانی طاقت کی قہرمانی کے اعتقاد کا اثر اس کے عزائم اور قوائے عملیہ پر پڑے بغیر رہ نہیں سکتا وہ



تقدیر پر یقین کر کے عزم و ہمت کے ساتھ کسی معاملہ میں بھی پوری پوری جدوجہد کر نہیں سکتا بلکہ اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا اور نوشتہ تقدیر پر اعتماد کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہتا ہے۔ یہ مغالطہ بھی محض اپنی ہی خام خیالی کا ثمرہ ہے، کیونکہ اس مسئلہ کا حاصل محض ایک غیبی حقیقت کا انکشاف ہے، یعنی یہ کہ عالم اسباب میں جو کچھ بھی نظر آ رہا ہے خواہ وہ اسباب ہوں یا ان کے نتائج یہ دونوں حالتیں اس کے وسیع احاطہ میں شامل ہوتی ہیں۔ یوں نہیں ہے کہ تقدیر تو کہیں جدا گانہ لکھی ہوئی رکھی ہے اور انسانی افعال اس سے کہیں ایک طرف ہو رہے ہیں بلکہ وہ انسانوں کی ان ہی مختلف جدوجہد میں پنہاں ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی یہ ظاہری جدوجہد سب اسی کی مسخر اور اسی کے تابع ہے، اگر وہ اس کے خلاف کرنا چاہے بھی تو کر نہیں سکتا بلکہ اس کے دل میں اس ارادہ کا خطور بھی نہیں ہو سکتا۔

اگر تقدیر کے تحت صرف ثمرات و نتائج ہوتے اور اسباب و وسائل اس سے باہر تو اب اسباب و وسائل میں ضعف کا امکان ہوتا اور ہر انسان یہ خیال کر سکتا تھا کہ جب نتائج طے شدہ ہیں تو اب اپنی جدوجہد بے سود ہے لیکن جب کہ نتائج کی طرح اسباب بھی احاطہ تقدیر میں شامل ہو چکے ہیں تو صرف اس عقیدہ سے ترک اسباب کا اثر کیسے پیدا ہو سکتا ہے، بالخصوص جب کہ ثمرات و نتائج کا کسی کو علم بھی نہیں ہوتا۔ فرض کر لو اگر ہمیں کسی معاملہ میں اپنی کامیابی یا ناکامی کا علم ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ ہماری عملی جدوجہد بھی سرد پڑ جائے، لیکن اگر نتائج کا علم ہی نہ ہو اور اسباب کے علم کے ساتھ ساتھ ان پر قدرت بھی حاصل رہے تو کیا کوئی انسان ان کے ارتکاب سے باز رہ سکتا ہے یا اس کے عزم میں کوئی ادنیٰ سا ضحلال بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نتائج سے لاعلمی کی وجہ سے اسباب کے ارتکاب کرنے پر فطرۃً مجبور ہوگا اور اسے ہونا بھی چاہیے۔ بلکہ اگر نتائج کا علم بھی ہو جائے پھر بھی قضاء و قدر پر اعتقاد کسی ادنیٰ ضعف کا موجب نہیں ہو سکتا کیونکہ تقدیر یہ تعلیم نہیں دیتی کہ جب نتائج میرے احاطہ میں شامل ہو چکے ہیں تو اب وہ برآمد ہو کر ہی رہیں گے خواہ تم سعی کرو یا نہ کرو، بلکہ یہ حکم دیتی ہے کہ تم میری طرف مت تکیو تم اپنی عملی جدوجہد جاری رکھو اور اپنی حماقت سے یہ مت سمجھو کہ اسباب و وسائل کا ارتکاب کرنا میرے وسیع احاطہ سے خارج ہے، وہ بھی ٹھیک نتائج کی طرح اس کے اندر داخل ہے، اس لیے جس طرح نتائج مقدرہ کا ظہور ضروری ہے اسی طرح اسباب مقدرہ کا ارتکاب کرنا بھی لازمی ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ قضاء و قدر پر ایمان رکھنے کے بعد اسباب پر وہ اعتماد نہیں رہتا جو منکرین قدر کو ہوتا ہے تو ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینے میں ذرا تامل نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک اسباب پر یہ بے اعتمادی ایمان باللہ کا لازمی ثمرہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود قضاء و قدر کا نتیجہ ترک اسباب نہیں نکلتا، مؤمن بالقدر بھی پوری سعی کرتا ہے مگر اس یقین پر کہ فتح و نصرت صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگی لیکن چونکہ ارتکاب اسباب کے لیے اس کا حکم ہے اور ان ہی کے ضمن میں اس کا وعدہ نصرت بھی ہے، اس لیے ان کا ارتکاب لازم ہے اور جو منکر قدر ہے سعی وہ بھی کرتا ہے مگر بندۂ اسباب بن کر۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ صرف ایک علمی اور مخفی حقیقت کا انکشاف ہے، اگر اس کو انسانی جدوجہد کے ساتھ کوئی ادنیٰ بھی اختلاف ہوتا تو اس عقیدہ پر ایمان لانے کے ساتھ شریعت ہم پر عملی جدوجہد کا بوجھ کبھی نہ ڈالتی، حالانکہ قرآن کریم کی صد ہا آیات، احادیث کے دفتر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک ایک لمحہ ہم کو یہی سبق دیتا ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی

عملی زندگی اگر دیکھی جائے تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قضاء و قدر پر اعتماد کا سبق انہوں نے ہمیشہ عملی جدوجہد کے ضمن ہی میں پڑھا ہے۔ فتح و شکست کے میدانوں اور نماز و نیاز کی عبادت گاہوں میں دونوں جگہ یکساں جو عملی سرگرمی ان کی نظر آتی ہے تقدیر کا انکار کرنے والے شاید اس کا کوئی شمعہ اپنی زندگی میں پیش نہیں کر سکتے۔

## قضاء و قدر کی حقیقت اور شرعی نظر میں اس کی اہمیت

شرعی نظر میں اس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کی طرح ایمان بالتقدیر کو بھی اسلام کا ایک رکن لازم قرار دیا ہے، گویا جو شخص تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا وہ اللہ اور اس کے رسول پر بھی ایمان نہیں رکھتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کو ماننا اسی وقت صحیح طور پر ماننا کہا جاسکتا ہے جب کہ ان کی فرمودہ تمام باتوں کو بھی تسلیم کیا جائے۔ لہذا صرف تقدیر ہی نہیں بلکہ اس کی تمام کتابوں کا ماننا، اس کے رسولوں اور فرشتوں کا ماننا، جنت و دوزخ اور اسی طرح قیامت کا ماننا بھی لازم ہوگا۔ ادیان سماویہ میں کسی دین کو بھی ان امور میں کوئی اختلاف نہیں رہا، اسی لیے ان امور کو اصول دین کہا جاتا ہے۔ رسول خدا نے تنہائی میں، محفلوں میں، کوچوں میں اور بازاروں میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں پہنچ پہنچ کر ایک بار نہیں بار بار ان کا اعلان نہ کیا ہو۔ فرمائیے کہ اس شد و مد کے اعلان کے بعد بھی اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک بات کا بھی انکار کر گزرتا ہے، کیا وہ درحقیقت رسول خدا کو مانتا ہے اور کیا جو رسول کو نہیں مانتا وہ صحیح طور پر خدا کو مانتا ہے؟

ایمان بالتقدیر کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے اس کی حقیقت کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لیں اس کے بعد آپ کو یہ سمجھ لینا آسان ہوگا کہ اس کو رکن اسلام کی حیثیت کیوں دی گئی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ تقدیر صرف اس یقین کا نام نہیں ہے کہ کائنات میں جو حرکت و سکون ہو رہا ہے ان سب کا اللہ تعالیٰ کو علم حاصل ہے، کیونکہ یہ تو قضاء و قدر کی بحث نہیں ہے یہ تو صفت علم کا مسئلہ ہے، اس میں تو اسلامی فرقوں میں سے کسی کو بھی کلام نہیں، جو شخص اس کا منکر ہے وہ تو کھلا کافر ہے۔ تقدیر کے جس معنی کے سمجھنے کی توفیق صرف اہل حق کے حق میں آئی ہے وہ یہ ہیں کہ تقدیر کے آگے تمام عالم مجبور ہے اس کا کوئی ذرہ اس کے خلاف جنبش نہیں کر سکتا، جس کے حق میں جنتی ہونا طے پا چکا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جنتی شخص ہی کے سے عمل کرے اور جس کے لیے اس کے خلاف طے ہو گیا ہے اس کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ کوئی دوسرا عمل کر سکے۔ اس کے باوجود انسان سے افعال شرعیہ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ کارخانہ عالم تمام کا تمام اسباب و مسببات کے پورے پورے تناسب کے ساتھ قدرت نے باہم اس طرح الجھا دیا ہے کہ اس کی ظاہری سطح کو دیکھ کر یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اپنا نظام قائم رکھنے کے لیے شاید یہی خود بخود کافی ہو۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لا کر کسی ظن و تخمین سے نہیں بلکہ پوری تحقیق سے یہ تعلیم فرماتے ہیں کہ جس طرح یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہو گئی اسی طرح اس کا نظام عمل بھی خود بخود نہیں بن گیا بلکہ خالق کائنات نے اس کو شرف وجود بخشے سے قبل ہی اس کا نظام عمل بھی بنا کر رکھ دیا تھا۔ عالم نہ خود اپنا کوئی نظام حیات بنا سکتا ہے نہ اس پر خود عمل کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ جس طرح سرتا سر اپنے



3 | وجود میں خالق کا محتاج ہے اسی طرح اپنے نظام حیات میں بھی بلکہ اس پر عمل کرنے میں بھی اسی کا محتاج ہے۔ جب انبیاء علیہم السلام کی زبانی انسان کو اپنی بے بسی و بے بسی کی یہ داستان معلوم ہوتی ہے تو پھر اس کے اعتقاد کی دنیا بھی بدل جاتی ہے اور اس میں ایک عظیم انقلاب برپا ہونے لگتا ہے۔ اسبابِ سفلیہ اس کی نظروں میں حقیر ہو جاتے ہیں، دنیا کے ہوش ربا نظارے اس کی نظروں میں ہیج بن جاتے ہیں، اسبابِ مجازیہ کی تاثیر کا تصور اس کے دماغ سے نکل جاتا ہے وہ ان کا ارتکاب کرتا تو ضرور ہے مگر ان کو معبود بنا کر ان سے چپک نہیں جاتا بلکہ اس حالت میں بھی اس کی دور بین نظریں برابر مؤثر حقیقی کی طرف لگی رہتی ہیں اور اس طرح معبودانِ باطلہ سے کٹ کر معبودِ برحق سے ملنے کا راستہ صاف ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ ایمان بالقدر کی اہمیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اس کے بغیر انسان کو اپنی خود مختاری کے گھمنڈ سے نجات حاصل نہیں ہوتی یا عالمِ غیب کی ایک ضروری حقیقت سے جہل کا داغ دور نہیں ہوتا بلکہ اس لیے بھی ہے کہ اس کے بغیر پروردگارِ عالم سے عالم کا کوئی ربط ہی قائم نہیں رہتا، جو لوگ اس کے قائل نہیں وہ یا تو خالق سے مستغنی بن چکے ہیں یا اس کو ایسی حیثیت دے چکے ہیں جس کے بعد اس کا خالق ماننا نہ ماننا برابر ہو جاتا ہے۔ ہمارے اس بیان سے جہاں اس عقیدہ کی اہمیت ظاہر ہو گئی اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ماننے میں تقدیر کا ماننا بھی کیوں داخل ہے اور تقدیر کا انکار اللہ تعالیٰ کے انکار کے مرادف کیوں ہے؟ اس لیے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

ایمان بالقدر نظام التوحید فمن امن و  
یعنی نظام توحید ایمان بالقدر پر دائر ہے جو شخص ایمان  
کذب بالقدر فهو نقص للتوحید۔  
لائے اور تقدیر کا انکار کرے اس نے توحید کو بھی باطل کر

(کتاب السنۃ للامام احمد ص ۱۲۳) دیا۔

اسی طرح قیامت کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار ہی کے برابر ہے سورۃ التین میں ﴿الیس اللہ باحکم الحاکمین﴾ (آیت ۸) فرما کر اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کو مانتے ہو تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ اس کی حکومت سب پر ہے پھر لازم ہوگا کہ وہ ایک دن اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ بھی کرے ورنہ وہ احکم الحاکمین تو کیا ہوتا حاکم بھی نہ ہوا، اسی طرح جنت و دوزخ کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار ہی کے مرادف ہے، تفصیل اپنے اپنے موقع پر آئے گی یہاں صرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

## مسئلہ مذکورہ میں زمانہ قدیم کے چیدہ خیالات

اور

### مذہبِ اہل حق کی توضیح و تحقیق

مذکورہ بالا مسئلہ میں اصولی مذاہب چار ہیں۔ جبریہ، معتزلہ، اشاعرہ، مانریدیہ، جبریہ کہتے ہیں کہ بندہ کے افعال صرف اللہ

۱۔ تعجب ہے کہ مسئلہ قضاء و قدر میں اگر ہمارے دور میں کوئی اشکال پیدا ہوتا ہے تو انسان کے مجبور کہنے میں ہوتا ہے اگر اس کو مختار مطلق لفظ.....

تعالیٰ کی قدرت سے صادر ہوتے ہیں اس میں خود کوئی قدرت نہیں۔ معتزلہ کا یہ خیال ہے کہ اس میں صفت قدرت بھی ہے اور اسی کی تاثیر سے انسانی افعال صادر ہوتے ہیں۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ بندہ میں صفت قدرت تو ہے مگر اس کے افعال میں اس کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی بلکہ جب کبھی بندہ کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اس کو پیدا فرما دیتا ہے، گویا اشاعرہ کا مذہب ان دونوں کے درمیان ہے ان کے نزدیک بندہ نہ تو جبریہ کی طرح مجبور محض ہے اور نہ معتزلہ کی طرح مختار مطلق۔

بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جبریہ کے نزدیک بندہ میں نہ قدرت ہے نہ ارادہ بلکہ نہ فعل، وہ بالکل جماد محض کی طرح بے اختیار ہے اور اشاعرہ قدرت، ارادہ اور فعل تینوں کے قائل ہیں، مگر یہ کہتے ہیں کہ اس کی قدرت کو صدور افعال میں کوئی تاثیر نہیں، اس کے افعال کو اللہ تعالیٰ خود پیدا فرما دیتا ہے، اسی طرح بندہ میں صفت ارادہ بھی ہے اور اس کے افعال اس ارادہ کی طرف منسوب بھی ہوتے ہیں، مگر ارادہ و اختیار کی یہ صفت از خود انسان میں نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ نے جیسا خود انسان کو پیدا فرمایا ہے اس کی اس صفت ارادہ و اختیار بلکہ تمام صفات کو بھی اسی نے پیدا فرمایا ہے، اسی وجہ سے انسان کو مختار کہا جاتا ہے۔ اگر اس میں اختیار کی صفت نہ ہوتی تو اس کو مختار کیسے کہا جاسکتا ہاں چونکہ یہ اختیار خود اس کے اختیار میں نہیں اس لحاظ سے اس کو مضطر اور مجبور کہنا بھی صحیح ہے، لہذا کہا جاتا ہے کہ بندہ مختار بھی ہے اور مجبور بھی یعنی اپنے افعال میں تو مختار کیونکہ صفت اختیار اس میں پیدا کی گئی ہے اور خود اس صفت اختیار میں مجبور ہے کیونکہ یہ صفت نہ اس کی پیدا کردہ ہے اور نہ اس صفت پر اس کا اختیار ہے کہ جس طرف چاہے اس کو لگا دے وہ اسی جانب لگنے پر مجبور ہے جس طرف مختار مطلق اس کو لگا دے۔ اشاعرہ نے صفت قدرت کا اقرار کر کے اپنے مذہب کو جبریہ کے مذہب سے ممتاز کرنے کی کوشش تو کی مگر چونکہ قدرت غیر مؤثرہ کے اقرار اور نفس قدرت کے انکار میں بلحاظ نتیجہ کوئی فرق نہیں نکلتا اس لیے ان کا مذہب جبریہ کے مذہب سے زیادہ ممتاز نہیں ہوتا اس لیے اس فرق کی وضاحت کے لیے کسی قدر اور تفصیل کی ضرورت ہے۔

شیخ اشعریؒ کے مذہب کی توضیح کے لئے حسب ذیل امور کو صاف کر لینا ضروری ہے:

(۱) انسانی افعال میں جب اس کی قدرت و اختیار کی کوئی تاثیر نہیں تو پھر انسان اور اس کے افعال میں صحیح رشتہ کیا ٹھہرا اور ان کی نسبت انسان کی طرف کرنا کیونکہ درست ہوئی۔

(۲) افعال انسانیہ میں جب کہ اس کی قدرت و اختیار کی تاثیر بدایۃ محسوس ہوتی ہے تو اس کا انکار کیسے کر دیا جائے۔

(۳) اگر افعال انسانیہ میں اس کی قدرت کی کوئی تاثیر نہیں تو پھر ان پر نہ مدح و ذم معقول ہے اور نہ جزاء و سزا۔

پہلی نتیجہ کا جواب یہ ہے کہ شیخ کے نزدیک ان افعال کا علاقہ انسان کے ساتھ صرف اتنا ہوتا ہے کہ جب بندہ کسی فعل کا

للہ ..... پھر دماغوں میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی حالانکہ جن کی اتباع میں آج اسلام کی ہر بات کے اندر نکتہ چینیاں کی جارہی ہیں ان کا ایک ایسا طبقہ جس کو مسائل فلسفہ کا ہیرو کہنا چاہیے جبریہ ہی کی طرف مائل تھا، چنانچہ سینٹ اوگسٹن، لوتھر، کانون، جانسن نیوس سب جبریہ تھے اور آخر دور میں ہابز (Hobbes) اسپینوزا (Spinoza) ڈیویڈ ہیوم، کولنس، نیل، لائیچ بھی جبری تھے۔ اسی طرح کانٹ (Kant) سٹورٹ میل، دیدرو، درلہاخ، لامٹری۔ سب جبر کے قائل تھے۔ (دیکھو دائرۃ المعارف - الموقف البشری ص ۲۳۸)



ارادہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو اپنی قدرت کاملہ سے اس بندہ میں پیدا فرما دیتا ہے، بس اس کا ان افعال کے لیے محل ہونا یہی انسان اور اس کے افعال کا علاقہ سمجھنا چاہیے اسی کا نام کسب ہے گویا اب بندوں کے افعال کا حاصل یہ ہے کہ وہ مخلوق تو اللہ تعالیٰ کی ہیں اور مکسوب بندوں کے، لیکن چونکہ بندہ کا محل بننا یہ ہوتا ہے اس کی صفت اختیار کے ساتھ ساتھ اس لیے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ افعال اسی کے اختیار سے ہو رہے ہیں اس کو ایک مثال سے سمجھئے مثلاً ایک ٹرین جو لاکھوں ٹن کی ہوتی ہے اس کو حرکت دینے والا حقیقت میں تو انجن ہی ہوتا ہے، لیکن اگر ایک بچہ بھی اس کو اسی جانب حرکت دے رہا ہو تو بظاہر یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید اس بچہ کی طاقت کی بھی یہاں کچھ تاثیر ہوگی، بالخصوص جب کہ اس میں بھی قدرت موجود ہے خواہ وہ کتنی ہی ضعیف سہی مگر اس کے باوجود چونکہ یہاں حقیقت حال روشن ہو چکی ہے اس لیے یہی کہا جاتا ہے کہ ٹرین کی حرکت میں صرف انجن کی طاقت مؤثر ہے، بچہ میں گو طاقت تو ہے مگر وہ ٹرین کی حرکت میں کچھ مؤثر نہیں صرف انجن کی طاقت کے ساتھ ساتھ اور اس کے مقارن ہو رہی ہے اسی طرح ”خلق“ بھی بڑی وزنی چیز ہے، وہ ممکن کے بس کی بات نہیں یہاں انسانی قدرت کو اپنے افعال کے خلق میں بس اتنی ہی تاثیر ہوتی ہے جتنی کہ ابھی آپ نے مثال مذکور میں بچہ کی دیکھی بلکہ اتنی بھی نہیں کیونکہ وہاں پھر بھی کسی درجہ میں تو تاثیر کہی جاسکتی ہے گو وہ کتنی ہی قلیل ہو، اور یہاں تو کسی درجہ میں بھی کوئی تاثیر نہیں کہی جاسکتی۔ مگر چونکہ انسانی قدرت صرف ہونے کے ساتھ ساتھ افعال اس کے ساتھ قائم ہوتے چلے جاتے ہیں اور خالق حقیقی رہتا ہے پردہ غیب میں اس لیے یہ حکم لگانے کا موقعہ پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ افعال خود انسان ہی کی قدرت کی پیداوار ہیں۔

اب رہا انسانی قدرت کے تاثیر کا بدیہی ہونا تو جہاں بڑے بڑے عقلاء کا اتنا اختلاف موجود ہو وہاں بداہت کا حکم کیسے لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں بدیہی صرف اپنی قدرت کا ادراک ہے۔ آگے اس قدرت کی ان افعال میں تاثیر ہے بھی یا نہیں، اور اگر ہے تو کتنی یہ بدیہی نہیں ہے اور کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اس میں اختلاف آراء بدیہی ہے، بس جتنی بات بدیہی تھی اس کا شیخ نے بھی اقرار کر لیا ہے، یعنی انسان میں صفت قدرت تسلیم کر لی ہے، اور جتنی بات بدیہی نہیں ہے اس کے تسلیم کرنے سے شیخ نے انکار کر دیا ہے۔ دیکھو قدرت نے بے شبہ آگ کو پیدا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ چونکہ جلانا ہمیشہ سے اس کا فعل نظر آ رہا ہے اس لیے یہاں بھی یہ حکم لگا دیا جاتا ہے کہ آگ بداہتہ جلاتی ہے، حالانکہ جلانے میں آگ کی تاثیر کا گمان کر لینا یہ اپنے ذہن کا حکم ہے، بدیہی نہیں اگر ابتداء آفرینش سے آگ جلایا نہ کرتی تو کسی کو بھی اس تاثیر کا دوسرہ نہ گزرتا لیکن اس عالم میں چونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ جب آگ کہیں ہوتی ہے تو وہ اس کے ساتھ ساتھ جلانے کا فعل بھی پیدا کر دیتا ہے اس لیے یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ شاید یہ اسی کی تاثیر ہوگی۔ اسی طرح انسان اور اس کے افعال کا حال سمجھنا چاہیے، یہاں تاثیر کا گمان کرنا مغالطہ کے سواء اور کچھ نہیں۔ اہل عرف کی نظریں چونکہ اتنی دور رس اور باریک ہیں نہیں ہوتیں اس لیے وہ صرف اس ظاہری معیت کو دیکھ کر خود انسان ہی کو اپنے افعال کا فاعل کہہ دیتے ہیں، اور ظاہر کے لحاظ سے درست کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ افعال انسانیہ کا علاقہ انسان کے ساتھ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ ان افعال کے لیے محل ظہور ہوتا ہے اور چونکہ یہ افعال اس کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اس لیے ان پر اس کی تعریف یا مذمت بھی کی جاتی ہے۔ دیکھو خوب صورتی اور بد صورتی

ان پر بھی انسان کی تعریف یا مذمت ہوتی ہے، حالانکہ یہ بھی اس کی اختیاری صفت نہیں، معلوم ہوا کہ مدح و ذم کے لیے ان صفات کا بالاختیار صد و ضروری نہیں ہے بلکہ صرف ان کا قیام کافی ہوتا ہے۔

شارح عقیدۃ الطحاویہ اس کی مزید وضاحت اس طرح فرماتے ہیں کہ یہاں فعل و مفعول اور خلق و مخلوق کے مابین خلط ہو رہا ہے اس لیے بات صاف نہیں ہوتی، یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بندہ کا جو فعل ہوتا ہے مثلاً نماز، یہ بے شبہ اسی کا فعل ہے اور حقیقتاً ہے مگر یہ اللہ تعالیٰ کا فعل نہیں ہے ہاں اس کا مفعول اور اس کی مخلوق ہے۔ اس جگہ جو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے وہ فعل صلوٰۃ کا خلق یعنی اس کا پیدا فرمانا ہے۔ پس جس طرح بندہ کا فعل الگ ہے اور اللہ تعالیٰ کا فعل الگ ہے اور اس کی مخلوق الگ۔ دیکھو جب صلوٰۃ کو یہاں بندہ کا فعل قرار دیا گیا تو جس کا وہ فعل ہے اسی کے ساتھ وہ قائم بھی ہوتی ہے اور جو خدا کا فعل ہے یعنی اس کو پیدا فرمانا یہ خلق اس کی صفت ہے اور وہ اس کے ساتھ قائم ہے۔ نماز اس کا فعل نہیں یہ اس کی مخلوق ہے، لہذا اس کے ساتھ قائم بھی نہیں ایسے فعل کو جس کا نفع و نقصان اس کے فاعل کی طرف عود کرے کسب کہتے ہیں، اس لیے کہا جاتا ہے کہ بندے اپنے افعال کے کاسب ہیں اور حق تعالیٰ ان کا خالق ہے اس کا نہ ہماری نماز سے کوئی فائدہ نہ نقصان۔ بندوں کا نماز سے فائدہ بھی ہے اور نہ پڑھنے سے نقصان بھی۔ اس سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے افعال کا علاقہ ہمارے ساتھ کیا۔ اسی کو علماء خلق و کسب سے اداء کرتے ہیں یعنی ہمارے افعال کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے خلق کا ہے اور بندہ سے کسب کا، اس بنا پر جزاء و سزا عطا فرماتا ہے بلکہ یہاں دونوں افعال الہیہ ہیں اور افعال انسانی پر جزاء و سزا کا حاصل خود بعض افعال باری کا بعض پر ترتیب کے مرادف ہے جیسے ابھی آپ نے سنا کہ آگ پر اللہ تعالیٰ جلانا مرتب فرمادیتا ہے، اسی طرح بد عملی پر سزا پیدا فرمادیتا ہے نہ وہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ آگ نے جلایا کیوں نہ یہاں یہ سوال ہونا چاہیے کہ بد عملی پر سزا کیوں دی گئی، بلکہ انسان کے افعال اختیار یہ میں اس کی دوسری غیر اختیاری صفات جن پر اس کی مدح و مذمت کی جاتی ہے اتنی خصوصیت اور زیادہ ہے کہ جن افعال پر صرف مدح و ذم ہوتی ہے وہ انسانی قدرت و اختیار سے مخلوق نہیں ہوتے بائیں ہمہ ان پر تعریف بھی کی جاتی ہے اور مذمت بھی لیکن جن افعال پر جزاء و سزا مرتب ہوتی ہے۔ ان کی تخلیق انسانی قدرت و اختیار کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے، اس لیے یہاں تعریف و سزا اور زیادہ معقول ہے۔

شارح عقیدۃ الطحاویہ اس حقیقت کی یوں توضیح فرماتے ہیں کہ انسانوں کے افعال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو اس کی قدرت اور ارادہ سے صادر نہیں ہوتے جیسے رعشہ زدہ انسان کی حرکات۔ ان افعال کو اگرچہ انسان کی صفت تو کہا جاتا ہے مگر ان پر انسانی افعال کا اطلاق نہیں کیا جاتا چنانچہ اگر کسی ایسے شخص کا ہاتھ غیر اختیاری طور پر متحرک ہو تو چونکہ یہ حرکت اس کی صفت ہے لہذا اس کو متحرک تو کہا جائے گا مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شخص اپنا ہاتھ ہلا رہا ہے۔ یعنی یہ حرکت اس کا فعل ہے۔ دوسرے قسم کے افعال وہ ہیں جو بظاہر اس کے اختیار و قدرت سے موجود ہوتے ہیں ان کو اس کی صفت بھی کہا جاتا ہے اور ان پر انسانی فعل کا بھی اطلاق ہوتا ہے جیسے سارے افعال اختیار یہ۔ ثواب و عذاب انسان کے صرف ان افعال اختیار یہ ہی پر ہوتا ہے، غیر اختیاری افعال پر نہیں ہوتا۔ اب مسئلہ مجازات کی حقیقت یوں سمجھنی چاہیے کہ جس طرح زہر کھانے سے موت آنا ضروری ہے، اسی طرح زناء سے عذاب ہونا



ضروری ہے، ظلم کا سوال نہ وہاں پیدا ہوتا ہے نہ یہاں پیدا ہونا چاہیے، جس طرح یہ کہا جائے گا کہ زہر کھانا سبب ہی تھا موت کا اسی طرح یہ کہا جائے گا کہ زنا بھی سبب ہی تھا عذاب کا، گویا یہ دونوں باتیں قدرت کی اسی ترتیب سے پیدا کردہ ہیں جب کوئی شخص خدائی تقدیر سے زہر کھا لیتا ہے تو اس پر وہی قدرت دوسرا فعل یعنی موت پیدا فرما دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح جب اسی تقدیر کی بناء پر کوئی شخص زنا کر لیتا ہے تو قدرت نے جب یہ فعل پیدا کیا تھا تو اسی کے ساتھ وہ دوسرا فعل عذاب کا پیدا کر دیتی ہے اور اس طرح مسئلہ مجازات کی حقیقت بعض افعال الہیہ کا بعض پر ترتیب ہے۔

اتنی وضاحت کے بعد بھی غیر مؤثر قدرت کے اقرار اور سرے سے قدرت کے انکار میں کوئی خاص فرق واضح نہیں ہوتا اور نہ یہ بات نکھر کر صاف ہوتی ہے کہ کسب انسانی کا تعلق کس چیز کے ساتھ ٹھہرا صرف اتنا کہہ دینا کہ کسب بندہ کا اپنے لیے صرف محل بن جانے کا نام یہاں تشفی بخش نہیں۔ اس لیے امام ماتریدی نے کسب کی اس تفصیل کو بے مصداق سمجھا ہے اور اس سے ذرا آگے بڑھ کر اس کا مصداق بھی معین فرمایا ہے کہ بندہ جب کوئی فعل کرتا ہے تو یہاں بدابتنہ دو چیزیں نظر آتی ہیں ایک اس کا فعل دوم اس فعل کی ہیاۃ پہلی چیز کو معنی مصدری اور دوسری کو حاصل بالمصدر کہتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص اپنا ہاتھ اوپر سے نیچے ہلاتا ہے تو ایک چیز تو اس کا یہ ہلانا اور یہ حرکت ہوئی یہ تو معنی مصدری ہیں اور دوسری چیز وہ نقشہ ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہاتھ کے اوپر سے نیچے آنے میں نظر آتا ہے، یہ حاصل بالمصدر کہلاتا ہے ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ یہ فعل تو ایک موجود چیز ہے اور انسان کے ہاتھ کے ساتھ قائم ہے دوسری چیز صرف اعتباری ہے اس کا خارج میں کہیں وجود نہیں نہ وہ جو ہر ہے نہ عرض، گویا معنی مصدری تو موجود ہیں گو اس کا وجود بھی خود قائم نہیں ہاتھ کے ساتھ قائم ہے لیکن حاصل بالمصدر موجود ہی نہیں ہوتا، وہ صرف ایک خیالی حقیقت ہے جیسا کہ کسی تنکہ کو روشن کر کے دائرہ کی شکل پر زور سے حرکت دی جائے تو حرکت کی سرعت کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے ایک روشن دائرہ سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس دائرہ کا بھی حقیقتاً کوئی وجود نہیں ہوتا، اسی طرح حاصل بالمصدر کو سمجھنا چاہیے۔

امام ماتریدی فرماتے ہیں کہ یہاں یہ فعل اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور حاصل بالمصدر بندہ کی اور چونکہ حاصل بالمصدر کا وجود محض خیالی ہوتا ہے اس لیے اگر وہ خدا تعالیٰ کی خالقیت سے خارج رہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اشعری اس اعتباری حرکت کو بھی خدا تعالیٰ کی مخلوق قرار دیتے ہیں۔ بہر حال بندوں کے افعال میں جملہ اہل حق کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہیں اور بندہ ان کا صرف کاسب ہے اختلاف ہے تو کسب کی تفسیر میں ہے۔ اشعری انسان کے ساتھ ان افعال کے صرف قیام کو کسب فرماتے ہیں اور ماتریدی حاصل بالمصدر کو کسب فرماتے ہیں۔ علماء کلام نے ماتریدیہ کے نزدیک کسب کے اور معانی بھی بیان فرمائے ہیں مگر ان تمام تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔

## مسئلہ تقدیر کے لایئجل ہونے کا راز

یہاں دو حقیقتیں اپنی اپنی جگہ اس طرح ثابت شدہ ہیں کہ جب انسان ان کو جدا جدا دیکھتا ہے تو ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، مگر جب دونوں کو جمع کرنے کی سعی کرتا ہے تو یکسر ناکام ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دو باتیں ہیں تو جس طرح وہ

علیحدہ علیحدہ صحیح ہیں اسی طرح دونوں کو مل کر بھی صحیح رہنا چاہیے، مگر اس مسئلہ میں جب ان دو ثابت شدہ حقیقتوں پر یکجا نظر ڈالی جاتی ہے تو ان میں کھلا تضاد نظر آنے لگتا ہے۔ اس لیے نہ تو انسان بیک وقت دو متضاد باتوں پر جزم ہی کر سکتا ہے اور نہ ثابت شدہ حقیقتوں کے صاف انکار کر دینے کی جرأت کر سکتا ہے اس لیے اس کے سامنے تفویض و تسلیم کے سوا اور کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

دیکھئے انسان جب اپنے وجدان کی طرف غور کرتا ہے تو اپنے نفس میں جبر کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی محسوس نہیں کرتا اور اس کو اتنا ہی مختار پاتا ہے جتنا کہ صفت اختیار کا تقاضہ ہونا چاہے اپنے اس بدیہی وجدان کے ساتھ جب وہ مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ اس کو یہ باور کراتا ہے کہ کائنات ہستی کا کوئی ذرہ حتیٰ کہ خود اس کے ارادات و خطراتِ قلبیہ بھی اس کی قدرت میں نہیں ہیں، بلکہ وہ سب ارادۃ الہیہ کے تحت گردش کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ قدرت کے سامنے مجبور محض ہے اسی کے ساتھ جب وہ اس طرف بھی نظر ڈالتا ہے کہ اس جبر کے باوجود آخرت میں وہ اپنے افعال پر مسئول بھی ہے تو اس کی حیرت اور بڑھ جاتی ہے اور یہ مسئلہ اس کے سامنے اور پر پیچ بن جاتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ اول تو جب انسان کو اپنا مختار ہونا آفتاب کی طرح محسوس ہو تو وہ اپنے مجبور ہونے کا یقین کرے تو کیسے کرے اور اگر مجبور فرض کر لے تو ایک مجبور کو مسئول مانے تو کیونکر مانے مگر جب کہ ایک سچا مذہب اس کو یہی تعلیم دیتا ہے تو وہ انکار کیسے کر سکتا ہے۔ اب ایک طرف تو اس کے سامنے اپنے وجدان کا یقین ہوتا ہے دوسری طرف مذہب کا یقین ہوتا ہے اور ہوتے ہیں دونوں متضاد آخر مسئلہ تقدیر اس کے لیے ایک معمہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہاں محض عقلی شہسوار تو آزاد ہے مشکل اُس کی ہے جس نے مذہب کی قید و بند بھی اپنے سر لے رکھی ہے۔

اس عالمِ سراسیمگی میں جبر یہ پر تو قدرتِ الہیہ کا اس درجہ غلبہ ہوا کہ انہوں نے انسانی وجدان ہی کو غلط قرار دے دیا اور صاف اعلان کر دیا کہ انسان میں نہ تو قدرت ہے اور نہ اختیار وہ محض ایک پتھر کی طرح مجبور محض ہے قدرتِ الہیہ جس طرح اور جس طرف چاہتی ہے اس کو کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔ ان کے نزدیک جو قادرِ مطلق اور مالکِ علی الاطلاق ہو وہ مجبور محض سے بھی سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ لہذا اب مجبور کے مسئول ہونے میں بھی کوئی اشکال نہیں رہا۔ یہ فیصلہ تسلیم کر لینا اس فرقہ کے لیے خواہ کتنا ہی خوش کن ہو لیکن ایک خالی الذہن انسان کے لیے اپنے وجدان کے خلاف اس کو تسلیم کر لینا سخت مشکل ہے۔ اس لیے دوسری جماعت نے اس کو قطعاً غیر معقول سمجھا اور ان پر انسان کو پتھر کی طرح مجبور سمجھ لینا پھر اس مجبور کو مسئول ٹھہرانا اتنا بارگراں ہوا کہ انہوں نے بندوں کو اپنے افعال کا خود خالق قرار دے ڈالا اور یہ تسلیم کر لیا کہ بندہ میں اپنے افعال کی تخلیق کی قدرت ہے اور اسی قدرت سے وہ افعال کرتا ہے اور جب اپنے اختیار سے کرتا ہے تو اس کو مسئول بھی ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ مسئلہ تقدیر گو مشکل ہے مگر اس کا انکار اس سے زیادہ مشکل ہے۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ ان دونوں جماعتوں نے اپنے خیال کے مطابق اس مسئلہ کا حل تلاش تو کر لیا مگر یا بد اہت کی تکذیب کی یا نصوصِ قرآنیہ کی تخصیص کی یہاں اہل سنت نے معاملہ سلجھتا ہوا نہ دیکھ کر تفویض کی راہ لی اور اس اعتراف میں کوئی باک نہ سمجھا کہ اگر کوئی عقدہ ان سے حل نہ ہو سکا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حل شدہ نہیں ہے۔ اس بناء پر اس کا انکار اور تاویل دونوں ہی غلط ہیں۔

اس حد پر پہنچ کر ضعیف الاعتقاد انسانوں کے دلوں میں مذہب کی جانب سے کچھ شکوک پیدا ہونے نہیں چاہئیں کیونکہ سب



سے پہلے تو ان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب کبھی دنیا نے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی حقیقت کا سراغ لگانا چاہا ہے تو وہ ہمیشہ ناکام ہی ہو کر اٹھی ہے، حتیٰ کہ قدیم عقلاء نے تو قاعدہ کلیہ کے طور پر کہہ دیا ہے: ”التحدید الحقیقی عسیر جداً“ کسی چیز کی ٹھیک ٹھیک حقیقت کا پتہ چلانا یا تو ناممکن ہے یا اتنا مشکل ہے کہ اس کو قریب قریب ناممکن کہہ دینا چاہیے۔ بے چارے قدیم عقلاء نے تو بعض جگہ اپنے عجز کا اعتراف بھی کر لیا ہے لیکن آج کے عقلاء زمانہ اس اعتراف میں بھی اپنی کسر شان سمجھتے ہیں، دیکھو ہوا اور پانی کتنی کثیر الاستعمال چیزوں میں سے ہیں لیکن اب تک جو ان کے آخری اجزاء سمجھے گئے تھے اب ثابت ہو گیا ہے کہ وہ آخری نہیں تھے ان کا تجزیہ ابھی اور ہو سکتا ہے اور ہو گیا ہے۔ جب اتنی تگ و دو کے بعد ایسی معمولی معمولی اشیاء کی حقیقت دریافت نہیں ہو سکی تو باریک مسائل میں اگر ذرا توقف کر لیا جاتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا، اس سے بڑھ کر خود انسان ہی کو لے لیجئے، جب اس نے اپنی حقیقت دریافت کرنے کے لیے قدم اٹھایا تو صدیوں کے بعد جس نتیجہ پر وہ پہنچا وہ یہ تھا کہ اصل میں وہ ایک بندر تھا۔ میں اس وقت یہ بحث نہیں کرنا چاہتا کہ یہ تحقیق کس حد تک صحیح تھی، لیکن صرف یہ تنبیہ کرنی چاہتا ہوں کہ بہت جلد اس خیال کی بھی تغلیط کر دی گئی اور ابھی تک خود انسان کی حقیقت بھی ایک معمہ بنی ہوئی ہے، یہی حال اس جگہ بھی سمجھئے، چونکہ یہاں بھی افعال انسانی اور قدرت انسانی کی حقیقت میں گفتگو ہو رہی ہے اس لیے ضروری ہے کہ جو دشواری ہر چیز کی حقیقت تلاش کرنے میں پیش آئی ہے یہاں بھی پیش آئے، اگر یہاں شریعت اپنی جانب سے تقدیر کی حقیقت کا اعلان نہ کر چکی ہوتی تو اس مسئلہ میں بھی آپ کی بحث و تمحیص کی وہی حیثیت رہتی جو اس قسم کے دوسرے مسکوت عنہ مسائل میں ہے لیکن یہاں تو بڑی مشکل یہ ہے کہ بعض مصالحوں کی بناء پر شریعت یہاں خود اس کی حقیقت کا اعلان کر چکی ہے اس لیے اب آپ پر اسی کا تسلیم کر لینا لازم ہو گیا ہے، اتنی عقل ناقص، العقل انسان میں بھی نہیں کہ وہ راز ہائے قدرت کو پورا پورا پا سکتا اس لیے مذہب نے یہاں ایک ہی راستہ تعلیم کیا ہے اور وہ تفویض و تسلیم کا ہے۔ جس مذہب کی صداقت اور معقولیت اور ہزاروں مسائل میں ثابت ہو چکی ہو کچھ حرج تو نہ تھا اگر انسان صبر کر کے اس ایک مسئلہ کو اسی کے بیان پر مان لیتا، مگر وہ اتنا کم عقل ہے کہ اپنی کم عقلی کو بھی نہیں سمجھتا اور جتنا اس کو روکا جاتا ہے رونا اتنا ہی اس کی تحقیق کے اور درپے ہونے لگتا ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ قدس سرہ فرماتے تھے کہ سر تقدیر فہم سے بالاتر کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو بندہ کے افعال میں خود اس کی قدرت کا احساس بدیہی ہے ادھر مذہب یہ کہتا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے اختیار و قدرت سے ہوتے ہیں لہذا کوئی چارہ کار نہیں کہ دونوں قدرتوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ اب جو فعل بھی بندہ سے صادر ہوتا ہے ہر جگہ اس میں ان دو قدرتوں کا ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں جو باریکی پیدا ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم کتنا ہی تجزیہ کریں مگر کسی مرتبہ میں بھی جا کر بندہ کی قدرت کو اور حق تعالیٰ کی قدرت کو علیحدہ علیحدہ ممتاز نہیں کر سکتے یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس فعل میں اتنا کام تو بندہ کی قدرت سے ہوا اور اتنا قدرت الہیہ سے۔ آپ بندہ کے افعال کا تجزیہ کرتے چلے جائیے آپ کو کوئی مرتبہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں قدرت الہیہ کا اثر نہ ہو اور جب تک یہ بات صاف نہ ہو اس وقت تک بندہ کا مختار کہنا بھی مشکل ہے، اور مجبور کہنا بھی۔ اس لیے اب اس کو نہ مختار کہے بنتی ہے نہ مجبور۔ دیکھئے ایک شہسوار گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے ارادہ و اختیار سے اس کو چلاتا ہے اور گھوڑا گو اس کے اختیار کے ماتحت ہی چلتا ہے مگر آپ یہ بھی بداہتہ جانتے ہیں کہ چلتا ہے وہ اپنی قدرت سے اپنے مالک کی قدرت سے نہیں چلتا، مگر یہاں دو قدرتیں علیحدہ

علیحدہ سمجھنے ہیں آپ کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی لیکن یہاں قدرتِ عبد کی حقیقت یہ نہیں اس کے جس مرتبہ میں بھی غور کیجئے گا وہ قدرتِ الہیہ سے علیحدہ ثابت نہیں ہو سکتا اس لیے آپ تجزیہ کیے چلے جائیے مگر قدرتِ عبد کے علیحدہ اور قدرتِ الہیہ کے علیحدہ علیحدہ کرنے سے آخر عاجز ہو جائیں گے اور جب تک یہ امتیاز پیدا نہ کر لیں اس وقت تک جبر و اختیار کے اشکالات حل نہیں ہوتے اس لیے یہ مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ کا اشکال یوں نہیں ہے کہ یہاں کوئی غیر معقول چیز موجود ہے بلکہ یوں ہے کہ اس کی نظیر کوئی ملتی نہیں اور حیات میں جہاں نظر نہیں ملے عقل خود اپنا ہی حکم مقدم رکھتی ہے اسی لیے شریعت نے یہ تعلیم فرمائی ہے کہ جو مجھ کو تسلیم کر چکا ہے اس کو میرا حکم ماننا ہوگا اور یہی ایمان بال تقدیر ہے آخر جنت و دوزخ کو کس نے دیکھا بلکہ خدا تعالیٰ ہی کی ذات کو کس نے دیکھا یہ تمام حقائق غیب ہیں یہاں جو شخص محض انبیاء علیہم السلام کے بیان پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کر چکا ہے بس وہی مؤمن ہے اور جس نے راہ انحراف اختیار کی وہ دوسری طرف شمار ہو جاتا ہے۔

## نا تمام اختیار کا فائدہ

اس ساری تحقیق کا حاصل اگر یہی ہے کہ انسان میں اختیار تو ہے مگر ہے نا تمام اور نا تمام بھی ایسا جو صرف انسان کے لفظی طور پر مختار کہلانے کے لیے کافی ہو اور بس تو صرف اتنے سے اختیار کے مان لینے سے تو جزاء و سزا کا مسئلہ صاف نہیں ہوتا۔ اس کا جواب پہلے تو یہ ہے کہ اگر حاکم علی الاطلاق ایسا ہی کر دیتا تو ظلم پھر بھی نہ تھا مگر اس کی حکمت نے چاہا کہ عمل اور اس کی جزاء و سزا کے مابین کچھ صوری مناسبت بھی باقی رکھے اس لیے اس نے انسان کو ایک نا تمام سا اختیار مرحمت فرما دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ قدرت نے انسان کو عملی اور علمی ہر دو پہلوؤں میں دوسرے حیوانات سے امتیاز بخشا ہے۔ اس کا عملی امتیاز یہ ہے کہ اس کا نفس اپنے برے بھلے افعال کے اثرات کو اس طرح جذب کر لیتا ہے جیسا سیاہی کو جاذب۔ حیوانات کے نفوس میں یہ خاصیت نہیں ان سے بھی افعال اختیار یہ سرزد ہوتے ہیں مگر ادھر صادر ہوئے ادھر فناء ہو گئے ان کے نفس میں ان افعال سے کوئی رنگ پیدا نہیں ہوتا مگر انسان جب افعال اپنے اختیار سے کرتا ہے تو اس کا نفس اسی کے مناسب اثرات سے رنگین ہوتا چلا جاتا ہے۔ افعال غیر اختیار یہ کا یہاں بھی کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ان پر نہ مدح کی جاتی ہے نہ قدح۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح زہر مہلک ہوتا ہے مگر اس کے مہلک ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ حلق کی راہ سے پیٹ میں پہنچے اسی طرح افعال کی تاثیر کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان کا صدور اختیار کی راہ سے ہو اور اس کی یہی وجہ ہے کہ جب تک ان افعال کا صدور اختیار سے نہیں ہوتا نفس انسانی میں ان کا رنگ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ حکمتِ الہیہ چاہتی ہے کہ جس فعل کا رنگ نفس انسانی میں پیدا ہو چکا ہے اس پر یا تو انعام فرمائے یا اس کا انتقام لے اور جس عمل کا اس میں کوئی اثر پیدا نہیں ہوا اس کی باز پرس نہ فرمائے اب اگر یہ اختیار صرف اسی مناسبت کے پیدا کرنے کے لیے شرط کیا گیا ہے تو اس کے لیے مستقل اختیار ضروری ہے۔

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ یہاں دو عالم علیحدہ علیحدہ موجود ہیں ایک عالم تقدیر وہ غیب در



غیب ہے دوسرا عالم تکلیف یعنی جس میں ہم کو افعال شرعیہ کا مکلف بنایا گیا ہے یہ مشہود ہی مشہور ہے۔ عالم تکلیف میں بندہ کھلا ہوا مختار رکھا گیا ہے حتیٰ کہ جب تک اس کا اختیار مستقل نظر آنے نہیں لگتا یعنی وہ بالغ نہیں ہو جاتا اس سے افعال شرعیہ کا مطالبہ بھی نہیں ہوتا مگر یہاں عالم تقدیر ظاہر نہیں ہے اور جہاں عالم تقدیر ظاہر ہے وہاں اس کو مجبور ہی مجبور بنایا گیا ہے مگر وہاں ہم مکلف بھی نہیں ہیں ان دونوں عالموں کے درمیان خلط کر دینے سے مفت میں اشکالات پیدا ہو گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ غیبی نظر میں ہم صرف ایک مجبور مخلوق ہیں، حکمت ایزدی نے اس جہان میں ہم کو بصورت مختار ظاہر فرما دیا ہے اب چاہو تو اس کو نام تمام اختیار سے تعبیر کر لو اور چاہو تو اس جہان کے لحاظ سے مستقل اختیار کہہ دو۔ جزاء و سزا کا مسئلہ بس اسی پر دائر ہے۔ جو اس عالم میں موجود ہے اس کو دوسرے عالم میں اپنے مجبور ہونے کا عذر کرنا نہ چاہیے اور نہ یہ معقول ہو سکتا ہے۔ مشہور ہے قصہ زمین بر سر زمین۔ یہاں جب کبھی اپنے نفس کو دیکھو گے تو اس کو مختار ہی پاؤ گے پھر اپنے اس بدیہی وجدان کو چھوڑ کر تقدیر میں الجھنا کٹ جتی نہیں تو اور کیا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ انسان جب کتے کے لٹھی مارتا ہے تو کتا کبھی لٹھی کو قصور وار نہیں سمجھتا وہ انسان ہی پر حملہ کرتا ہے یا اگر کسی پھل دار درخت سے کوئی پھل اس پر آگرتا ہے تو وہ کبھی درخت پر حملہ نہیں کرتا، معلوم ہوتا ہے کہ مجبور و مختار کے فرق کو ایک کتا بھی سمجھتا ہے جس کو مختار سمجھتا ہے اس پر حملہ کرتا ہے اور جس کو مجبور سمجھتا ہے اس پر حملہ بھی نہیں کرتا۔ لہذا اس کھلے ہوئے فرق کو نظر انداز کر کے محض تقدیر کے مسئلہ میں الجھنے کے لیے اپنے نفس کو مجبور محض کہہ دینا کتنا غیر معقول ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ و خیرتہ محمد و سلم تسلیما کثیرا



## فرقہ قدریہ کی مختصر تاریخ

اور

### اُن کے کفر کی ضروری تنقیح

احادیث قضاء و قدر پڑھنے سے قبل ضروری ہے کہ فرقہ قدریہ کی مختصر تاریخ معلوم کر لی جائے تاکہ یہ بات بخوبی واضح ہو جائے کہ احادیث میں اس فرقہ کے متعلق جو تعبیری شدت اختیار کی گئی ہے وہ کیوں کی گئی ہے اور ائمہ و علماء نے اس فرقہ کی جو تکفیر کی ہے وہ کس بنیاد پر کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ خلفاء راشدین کے عہد مسعود میں اس فرقہ کا نام و نشان نہ تھا، صحابہ کرام کے آخری دور میں اس کا ظہور ہوا اور جو صحابہ اس وقت بقید حیات تھے انہوں نے پوری قوت کے ساتھ اس کے استیصال میں حصہ لیا جن میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ عراق سے اس فتنہ کا آغاز ہوا اور بصرہ کے ایک یہودی النسل شخص نے اس کی بنیاد ڈالی جس کا نام سوسن یا سیویہ تھا، پھر اس سے معبد جہنی نے اور معبد جہنی سے عیلمان نے اس عقیدہ کو سیکھا، شدہ شدہ یہ فتنہ بصرہ سے لے کر شام و حجاز تک پھیل گیا۔ لکھتے ہیں کہ اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک مرتبہ جب خانہ کعبہ کو آگ لگی تو کسی شخص کی زبان سے بیساختہ نکلا کہ تقدیر الہی یوں ہی ہوگی، اس پر کسی دوسرے شخص نے کہا اللہ تعالیٰ بھلا ایسا کیوں مقدر فرماتا بس اتنی بات پر قضاء و قدر کی بحث چل پڑی۔

قدریہ کا عقیدہ یہ تھا کہ ”الامرانف“ عربی زبان میں ”روض انف“ اس باغ کو کہتے ہیں جس میں سرسبزی کے باوجود کسی جانور نے منہ نہ ڈالا ہو۔ اور یہاں اس سے غرض یہ ہے کہ بندہ کی سعادت و شقاوت بھی خود اپنے ہی عمل سے پیدا ہوتی ہے، حق تعالیٰ کو پہلے سے نہ اس کا علم ہوتا ہے اور نہ کہیں اس کی کتابت ہوتی ہے۔ ہر انسان جب کسی عمل کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے وہی خود اس کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے پھر اسی کے مطابق اس کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے اسی ذہنی نقشہ تیار کرنے کا دوسرا نام خلق ہے۔ کسی شاعر نے ذیل کے شعر میں خلق کا لفظ اسی معنی میں اختیار کیا ہے:

و لا نت تفری ما خلقت و بعض الناس یخلق ثم لا یفری

یعنی یہ شان تو ایک تمہاری ہے کہ جو ذہن میں سوچ لیتے ہو اس کو خارج میں عملی جامہ بھی پہنا کر رہتے ہو اور تمہارے سوا اور لوگ ہیں کہ وہ خیالات تو پکا لیتے ہیں مگر بس اس کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔

اس بناء پر قدریہ کو بندہ کے خالق کہنے میں بھی کوئی باک نہیں ہوتا۔ اس بد بخت جماعت کا یہ عقیدہ تھا کہ حق تعالیٰ گوا اپنے بندوں کے لیے شریعت نازل فرماتا ہے مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون اس کی فرمان برداری کرے گا اور کون نافرمانی، کون ان میں دوزخی ہوگا اور کون جنتی، حتیٰ کہ جب بندے خود عمل کر کے دوزخ اور جنت کے مستحق ہو جاتے ہیں تو اب اس کو بھی دوزخیوں اور جنتیوں کا علم ہو جاتا ہے۔ نعوذ باللہ من هذا الخرافات۔ اس عتیدہ کا بطلان اظہر من الشمس ہے، قرآن کریم ان دونوں



باتوں کے خلاف بھرا پڑا ہے۔ وہ تصریح کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کو جملہ اشیاء کا پہلے سے علم بھی حاصل ہے اور آئندہ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ نیز وہ اپنے اس علم کو قید کتابت میں بھی لا چکا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ. (القمر: ۴۹)

بلاشبہ ہم نے ہر چیز پہلے سے طے کر کے بنائی ہے۔

کبھی وہ اپنے علم ازلی کا اظہار بھی فرما دیتا ہے جیسا کہ شیطان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

لَا مُلَانَ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ. (ص: ۸۵)

مجھ کو تجھ سے اور ان میں جو جو تیری تابعداری کرے گا ان سب سے دوزخ کو بھرنا ہے۔

دوسری جگہ ایک موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَاجِلٌ مُّسَمًّى. (طہ: ۱۲۹)

اگر آپ کے پروردگار کی جانب سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی اور عذاب کا ایک مقررہ وعدہ نہ ہو چکا ہوتا تو یقیناً عذاب الہی آ جاتا۔

رسولوں کے متعلق فرمایا:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ وَإِنَّ جُنَدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ. (الصافات: ۱۷۱-۱۷۳)

اور ہمارے بندوں میں جو مرسلین ہیں ان کے لیے ہمارا یہ حکم پہلے ہو چکا ہے کہ بے شک وہی منصور اور فتح مند ہیں اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب ہے۔

ایک اور موقع پر فرمایا ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ. (هود: ۱۱۰)

اور البتہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی پھر اس میں اختلاف کیا گیا اگر کہیں تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے متعلق فیصلہ کر دیا جاتا۔

اسی طرح تقدیر کی کتابت کے متعلق بھی بہت سی آیات میں تصریح موجود ہے:

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَلِكَ فِي كِتَابٍ. (الحج: ۷۰)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ بھی آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ سب کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ آیت بالا کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا، پھر جو عمل بھی وہ کرنے والی تھی ان سب کا اس کو پہلے سے علم حاصل تھا، اس نے اپنے اس علم کو کتاب کی شکل عنایت فرمائی، چنانچہ اب وہ کتاب کی شکل میں موجود ہے چاہو تو اس کی تصدیق کے لیے مذکورہ بالا آیت پڑھ لو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ (الحديد: ۲۲)

ایک اور موقعہ پر فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (الانبیاء: ۱۰۵)

محوذات کے متعلق فرمایا ہے:

يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَ عِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ (الرعد: ۳۹)

جب کوئی مصیبت ملک میں یا تمہاری جانوں میں پیش آتی ہے تو اس سے قبل کہ ہم اس کو دنیا میں پیدا کریں وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔

اور نصیحت کرنے کے بعد ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ آخر کار زمین کے مالک میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔

اللہ جو چاہتا ہے لوح محفوظ میں سے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اس میں باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔

الغرض علم ازلی اور اس کی کتابت کے متعلق قرآن کریم میں بے شمار آیات موجود ہیں یہاں ان سب کا احصار مقصود نہیں ہے صرف بطور مشتمل نمونہ از خروارے چند آیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی لیے امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے اس فرقہ کی تکفیر کی ہے اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیث بھی اسی فرقہ کے حق میں ہے۔

علماء اسلام نے جب اس عقیدہ کو باطل کر دکھایا اور اس کی دھجیاں اڑا دیں تو ان کو لاچار ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا اور وہ علم الہی کے تو قائل ہو گئے مگر افعال عباد کا مشیت الہیہ کے تحت ہونے کا ان کو پھر بھی انکار رہا۔ اس جماعت کو کافر کہنا تو مشکل ہے البتہ ان کو بدعتی کہنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلق افعال عباد کا مسئلہ خود ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس کی تحقیق میں خود اہل سنت کا قلم بھی کسی ایک رائے پر نہیں جم سکا، ایسے مسئلہ میں کفر کا حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جو مسائل عہد سلف میں مسلم ہوں اور قطعی ثبوت کے ساتھ ہم تک پہنچ جائیں ان میں تاویل یا ان کا انکار تو ایک لمحہ کے لیے بھی قابل برداشت نہیں ہے جیسا مسئلہ ختم نبوت یا نزول عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ لیکن جو مسائل اس وقت زیر بحث نہیں آ سکے اور بعد میں دماغی کاوشوں، عقلاء کی نکتہ سنجیوں یا زائفین کی مغالطہ آمیزیوں سے پیدا ہو گئے ہیں اگر شریعت اسلام میں اس کا کوئی واضح حکم نہیں ملتا تو اس کے انکار یا اقرار سے تکفیر نہیں کی جاسکتی۔ خلق افعال عباد کا مسئلہ بھی ان ہی میں داخل ہے لہذا اس مسئلہ میں جو فرقے بھی اہل حق سے جدا ہو گئے ہیں ان کو کافر نہیں کہا جائے گا البتہ بدعت کے حکم سے بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔ بعض متاخرین نے قدریہ کے متعلق ائمہ کی جو تکفیر نقل کر دی ہے اس کو اسی تفصیل کے ماتحت سمجھنا چاہیے۔ یعنی یہ وہ فرقہ ہے جس کا یہ عقیدہ تھا کہ حق تعالیٰ کو بندوں کے افعال کا ان کے وجود سے قبل کوئی علم نہیں ہوتا اور نہ پہلے سے لوح محفوظ یا کہیں ان کی کتابت ہوتی ہے۔ دیکھو کتاب الایمان ص ۱۵۲ و ۱۵۵ ائمہ حدیث جیسے بخاری و مسلم نے اگر کہیں کسی قدری راوی کی روایت اپنی اپنی صحیح میں درج فرمائی ہیں تو وہ اسی دوسرے فرقہ کا شخص ہوا ہے کیونکہ پہلا فرقہ بالاتفاق کافر ہے اور کافر کی روایت کے مردود ہونے میں کوئی اختلاف نہیں البتہ بدعتی کی روایت کے قبول و رد میں اختلاف ہے جس کی تفصیل کا محل اصول حدیث ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے



حاشیہ ابی داؤد میں قدریہ اور چند بدعتی فرقوں کے ظہور کی تاریخ اس ترتیب سے تحریر فرمائی ہے۔

و اما الارجاء، و الرفض، و القدر، و التجهم، و الحلول و غیرہا من البدع: فانہا حدیث بعد انقراض عصر الصحابہ.

و بدعة القدر: ادركت اخر عصر الصحابة، فانكرها من كان حيًا، كعبد الله بن عمر، و ابن عباس و امثالهما رضى الله عنهم. و اكثر ما يجنى من ذمهم: فانما هو موقوف على الصحابة من قولهم فيه ثم حدثت بدعة الارجاء بعد انقراض عصر الصحابة، فتكلم فيها كبار التابعين الذين اوركوها كما حكيناہ عنهم.

ثم حدثت بدعة التجهم بعد انقراض عصر التابعين. و استفحل أمرها، و استعار شرها في زمن الائمة كالامام احمد و ذويه.

ثم حدثت بعد ذلك بدعة الحلول، و ظهر امرها في زمن الحسين الحلّاج.

یعنی تقدیر کے انکار کی بدعت صحابہ کرام کے آخری دور میں شروع ہوئی اور عبد اللہ بن عباسؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ اور اس قسم کے اور صحابہ نے جو اس دور میں بقیہ حیات تھے اس کی تردید میں کافی حصہ لیا، اسی لیے اس فرقہ کی مذمت جن احادیث میں آئی ہے وہ کثرت سے صحابہؓ ہی کے اقوال ہیں۔ اس کے بعد ارجاء کی بدعت نکلی، ان کی تردید میں اکابر تابعین نے حصہ لیا، پھر جب عہد تابعین بھی ختم ہوا تو جہمیہ فرقہ پیدا ہوا اور امام احمدؒ وغیرہ جیسے ائمہ کے دود میں اس کا خوب چرچا رہا، اس کے بعد حلول کا عقیدہ ظاہر ہوا اور حسین حلّاج کے زمانہ میں اس کا زور و شور ہوا۔



## قضاء و قدر کے مسئلہ میں امام ماتریدی کے مسلک کی اہم توضیح

امام ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسباب میں تاثیر اور اشیاء میں طبعی خواص کا انکار کرنا آیات و احادیث کے ظاہری الفاظ کے قطعاً خلاف سمجھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں جس طرح قدرت نے مسببات میں اسباب کی تاثیر و دیت فرمائی ہے اسی طرح بندہ کے افعال میں بھی اس کی قدرت کی تاثیر رکھی ہے۔ عالم اسباب کے طویل و عریض سلسلہ میں ہر جگہ تاثیر کا انکار کر کے یہ کہہ دینا کہ یہاں دو چیزوں کے درمیان صرف وقتی مقارنت ہے اور ان میں باہم تاثیر و تاثر کا کوئی علاقہ نہیں بداہت کے بھی خلاف ہے، عرف کے بھی خلاف ہے اور آیات و احادیث کے بھی خلاف ہے۔ ہم کو صاف آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ آگ جلاتی ہے۔ آدمی زہر کھاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ تریاق زہر کا اثر باطل کر دیتا ہے پھر اسی عرفی نسبت کو آیات و احادیث میں بھی قائم رکھا گیا ہے لہذا ہم کو ان کا مفہوم وہی لینا ہوگا جو اہل عرف اس نسبت سے سمجھتے ہیں۔ ان تمام آیات میں اور اپنے حسی مشاہدات میں صرف مجازی نسبتیں مراد لے لینا کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ ان جملہ مقامات میں تاثیر کا اقرار کیا جائے مگر یہ تاثیر ہوتی ہے اسی کے اذن سے۔ بندہ کی صفت اختیار اور اس کے افعال کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے یہاں بھی اختیار کی صفت حق سبحانہ کی پیدا فرمودہ ہے اور بندہ کے افعال میں تاثیر بھی اسی کے اذن سے ہوتی ہے پھر جس طرح دوسرے مقامات میں کسی چیز کے وجود کے لیے صرف اسباب کا وجود کافی نہیں ہوتا بلکہ موانع کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ موانع بھی قدرت ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ جہاں یہ موانع موجود ہوتے ہیں وہاں بندہ کی صفت اختیار کے باوجود پھر افعال کا صدور نہیں ہوتا۔

(ج ۲ ص ۱۷-۱۸-۲۶ منہاج السنۃ - وشفاء العلیل ص ۱۵۲)

اس مسئلہ کی تقریر کرتے ہوئے حافظ موصوف ایک دوسرے مقام پر اور زیادہ زور دے کر تحریر فرماتے ہیں کہ تمام کتب سماویہ میں کسی ایک کتاب نے بھی قرآن کریم سے بڑھ کر اسباب کا اثبات نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ پھر کیونکر اسباب کی تاثیر کا انکار کر دیا گیا ہے اور کیونکر اس تاثیر کو توحید کے خلاف سمجھا گیا ہے جب کہ عقیدہ یہ ہے کہ سبب اور مسبب دونوں کا خالق وہی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے اور سبب کی اپنے مسبب میں تاثیر بھی اسی کی قدرت اور مشیت سے ہے۔ اگر وہ چاہے تو سبب کی تاثیر باطل بھی فرما سکتا ہے جیسا کہ اپنے خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں آتش نمرود کی تاثیر باطل فرمادی اور اگر چاہے تو اسباب کی تاثیر قائم رکھتے ہوئے پھر کچھ موانع ایسے فرما دے سکتا ہے جو ان کی تاثیر سے مانع ہو جائیں اور اگر ارادہ فرمائے تو ان کو اٹھا بھی دے سکتا ہے کہ پھر پہلے کی طرح وہی تاثیر کرنے لگیں۔ ایسی تاثیر کے اعتقاد سے بھلا توحید کو کیا ٹھیس لگ سکتی ہے اور شرک کا کیا وہم ہو سکتا ہے، لیکن بے علم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پکی توحید یہ ہے کہ نہ آگ میں جلانے کی تاثیر ہے نہ پانی غرق کرنے کی اور نہ روٹی میں پیٹ بھرنے کی اور نہ تلوار میں قطع کرنے کی یہ اثرات سب براہ راست قدرت کا فیض ہیں یہ توحید ایسی ناقابل فہم توحید ہے کہ جس کو سن سن کر آج دشمنان اسلام، اسلام ہی سے منکر ہوئے جارہے ہیں واقعی سچی مثل ہے کہ ”نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے“۔ (دیکھو شفاء العلیل ص ۱۸۹ و ۱۹۰)



اس لیے امام ماتریدی فرماتے ہیں کہ بندہ میں قدرت و اختیار کی صفت بھی ہے اور اس کے افعال میں اس کے اختیار و قدرت کی تاثیر بھی ہے۔ امام کے مذہب کی بناء پر اگر بندہ کو مجبور کہا جائے گا تو صرف اس معنی سے کہ قدرت نے اختیار کی صفت اس میں جبراً پیدا فرمائی ہے۔ اس میں بندہ کے اختیار اور پسندیدگی کا کوئی دخل نہیں پس جس طرح ایک پتھر اپنے غیر مختار ہونے میں مجبور ہے اسی طرح بندہ اپنے مختار ہونے میں مجبور ہے۔ یہاں جبر اسی معنی سے نہیں ہے کہ اس اختیار کے استعمال کرنے پر بھی کوئی اور جبر اس پر مسلط کیا گیا ہے کہ بلکہ ہر طرف کے راستے اس کے سامنے کشادہ رکھے گئے ہیں۔ اب جس طرف بھی وہ چاہے اپنی صفت اختیار کو استعمال کر سکتا ہے قدرت نے ہر طرف اس کی معاونت فرمانے کا وعدہ فرمالیا ہے اور اس کے عزم کے موافق جب بھی وہ ارادہ کرتا ہے تو قدرت اس عمل کو پیدا فرمادیتی ہے گویا رشتہ خالقیت ہر جگہ دست قدرت ہی کے ساتھ مربوط رہتا ہے۔ اس صفت اختیار کو کسی ایک جانب استعمال کرنے کا نام کسب ہے اور اسی کے لحاظ سے اس کو بندہ کا فعل اور اس کو اس کا حقیقی فاعل کہا جاتا ہے اور خلق کے لحاظ سے اس فعل کو حق سبحانہ کی مخلوق کہا جاتا ہے۔ گویا ایک ہی عمل میں بندہ کی تاثیر صرف اس کے کسب کرنے میں ہوتی ہے اور خالق کی اس کے پیدا فرمانے میں۔ اس لحاظ سے وہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی اور مکسوب بندہ کا ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ مخلوق ہمیشہ اپنے خالق سے علیحدہ موجود ہوتی ہے اور فعل اپنے فاعل کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ بندہ کا فعل جو اس کے کسب سے متعلق ہے وہ بندہ کی صفت ہے اور اسی کے ساتھ قائم ہے اور چونکہ وہ حق سبحانہ کی مخلوق ہے اس لیے ہمیشہ اس سے علیحدہ موجود ہوتا ہے قدرت جب بندہ کا عزم دیکھ لیتی ہے تو اس کے پیدا فرمانے کی سب شرائط موجود فرمادیتی ہے اور اس کو بندہ میں پیدا بھی کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برے اور بھلے ہر قسم کے افعال سے خالق کو نہ برا کہہ سکتے ہیں نہ بھلا کیونکہ ان افعال کی وجہ سے برایا بھلا اسی کو کہہ سکیں گے جس کی یہ صفات ہوں اور اس کے ساتھ قائم ہوں۔ خالق کے ساتھ بندہ کے یہ افعال چونکہ قائم نہیں ہوتے اس لیے نہ اس کی صفت بنتے ہیں اور نہ اس کو ان کے لحاظ سے برایا بھلا کہا جاسکتا ہے۔ دیکھو سیاہ یا سرخ رنگ دینے سے اس کپڑے کو تو سیاہ یا سرخ کہا جاتا ہے مگر جو اس کا رنگنے والا ہے اس کو نہ سیاہ کہا جاتا ہے نہ سرخ کیونکہ یہاں بھی سیاہی اور سرخی کپڑے کی صفت ہوتی ہے رنگنے والے کی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ضعیف مخلوق کے اختیار کی تاثیر صرف اس حد تک ہی ہو سکتی ہے کہ جب وہ چاہے اپنے اس اختیار کو کسی ایک جانب استعمال کر لے رہی وہ طاقت اور قدرت جو کسی چیز کو عدم سے نکال کر لباس وجود عطاء کر دے تو یہ صرف قدرت قدیمہ کا خاصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہی ہر جگہ اس کی مالک بنی ہوئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایک ہی عمل دو اعتبار سے خدا تعالیٰ اور بندہ دونوں کی طرف منسوب رہتا ہے جیسا کہ مال و املاک یہ سب خدا تعالیٰ کے پیدا فرمودہ ہیں اور ملک بھی حقیقتاً سب اسی کی ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی نسبت حق سبحانہ کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی نسبت بندہ کی طرف بھی ہوتی ہے۔ پس اموال کی طرح اعمال کا قصہ بھی ہے۔ یہ بھی سب ان کے پیدا کردہ ہیں مالوں کا مالک اور اعمال کا کاسب اسی نے بندوں کو بنایا ہے اور جس طرح کہ دنیا میں مال بندہ کے کسب سے حاصل ہوتا ہے حالانکہ وہ پیدا کردہ حق سبحانہ کا ہوتا ہے اسی طرح اعمال بھی بندہ کے کسب سے حاصل ہوتے ہیں اور پیدا کردہ حق سبحانہ کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مال تو قدرت کا پہلے سے پیدا کردہ ہوتا ہے اور بندہ کے اعمال اس کے ارادہ اور عزم کے بعد پیدا کیے جاتے ہیں اس لیے یہاں قدر یہ کو مغالطہ لگ گیا

ہے اور انہوں نے ان کا خالق خود بندوں کو قرار دے ڈالا ہے۔ اسی طرح ناک، کان، زبان سب قدرت ہی نے پیدا فرمائے ہیں اور ان میں جدا جدا قوتیں بھی سب قدرت ہی نے پیدا فرمائی ہیں اور ان کو اپنے اختیار سے استعمال کرنے کی طاقت بھی سب اسی نے مرحمت فرمائی ہے۔ بندہ جب چاہتا ہے اپنی ان قوتوں کا استعمال کر لیتا ہے اور جب چاہتا ہے نہیں کرتا۔ اسی طرح اس میں اختیار کی بھی ایک صفت ہے اس کو بھی وہ جب چاہتا ہے استعمال کرتا ہے اور جب چاہتا ہے استعمال نہیں کرتا۔ خالق ان سب مقامات پر وہی ذات وحدہ لا شریک لہ رہتی ہے اور بندہ بھی ان کے ساتھ اپنا ایک اعتباری علاقہ پیدا کر کے ”کسب“ کی نسبت حاصل کرتا رہتا ہے کسی عمل کے بندہ کی طرف صرف منسوب ہو جانے سے یہ سمجھ لینا کہ اس میں شرک ہو گیا ہے سخت بے علمی اور نا فہمی ہے۔ کیا ایک بچہ کی نسبت اپنی ماں کی طرف اور غلہ کی کسی خاص زمین کی طرف اور پھل کے کسی خاص درخت کی طرف نہیں کی جاتی اور کیا پھر ان سب اشیاء کی نسبت خالق کی طرف بھی نہیں کی جاتی۔ مگر ان دونوں نسبتوں کا مفہوم بالکل جدا جدا ہوتا ہے۔ کیا یہاں کسی کو شرک کا وہم گزر سکتا ہے۔ اس لیے محض اس وہم کی بناء پر جبر یہ کا بندہ سے اس کے افعال کی نسبت قطع کر کے اس کو مجازی نسبت قرار دینا اور براہ راست ان کو حق سبحانہ کی طرف منسوب کر دینا کھلی ہوئی غلطی ہے۔<sup>۱</sup>

مسئلہ مذکورہ پر بحث کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ نے ایک اور بہت لطیف بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جبر و قدر کا مسئلہ سمجھنے کے لیے پہلے جبر کے معنی سمجھ لینے چاہئیں۔ جبر کے ایک معنی تو اکراہ کے ہیں یعنی کسی کی رضا مندی اور اختیار کے خلاف اس سے کام لینا۔ اس معنی سے اللہ تعالیٰ نے کسی پر جبر نہیں کیا۔ جب وہ بندوں سے کسی عمل کرانے کا ارادہ فرماتا ہے تو پہلے ان کو اختیار بخش دیتا ہے پھر ان میں اس عمل کے کرنے کی رغبت یا اس سے نفرت پیدا فرمادیتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ کسی کام کو کرتے ہیں یا نہیں کرتے تو دونوں صورتوں میں اپنی خوشی اور اختیار ہی سے کرتے ہیں۔ یہ اس کی کمال قدرت ہے کہ وہ دوسروں کے اختیار و رغبت سے وہی کرالیتا ہے جو اس کی مشیت ہوتی ہے۔ لہذا اب وہ کسی پر اکراہ کرے تو کیونکر کرے۔ یہ اکراہ تو وہ شخص کرتا ہے جس کو

۱۔ حافظ ابن تیمیہؒ افعال عباد کے من العباد ہونے کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں۔

انہا قائمة به حاصلة بمشيئة و قدرته و هو المتصف بها فانه قد يقال لما اقصف به المحل و خرج هذا منه و ان لم يكن له اختيار كما يقال هذا الريح من هذا الموضع و هذه الثمرة من هذه الشجرة و هذا الزرع من هذا الارض فلان يقال لما صدر من حى باختياره هذا منه بالطريق الاولى. و هي من الله بمعنى انه خلقها قائمة بغيره و جعلها عملاً له و كسباً و هو خلقها بمشيئة نفسه و قدرة نفسه بواسطة خلقه بمشيئة العبد و قدرته كما تخلق المسببات باسبابها فيخلق السحاب بالريح و للطر بالسحاب و النبات بالمطر. (و الخلاصه) ان الحوادث تضاف الى خالقها باعتبار والى اسبابها باعتبار فهي من الله مخلوقة له في غيره و هي من العبد صفة قائمة به و ح فلا شركة بين العبد و بين الرب كما انا قلنا هذا الولد من المراء ة بمعنى انها ولدته و من الله بمعنى انه خلقه الخ. و اذا كان غير الله يعاقب عبده على ظلمه و ان كان مقراً بان الله خالق افعال العباد و ليس ذلك ظلاً منه فالله سبحانه ان لا يكون ظلماً منه محكون الرب خالق كل شيء لا يمنع كون العبد هو المعلوم على ظلمه كما ان غيره من المخلوقين يلومه على ظلمه و عدوانه مع اقراره بان الله خالق افعال العباد. ص ۲۶ و ۲۷ و ۲۸ ج ۲ منها ج السنه.



4 دوسرے کو مختار بنا کر اس کی خوشی سے کام لینے کی قدرت حاصل نہ ہو لیکن جس کو یہ قدرت بھی حاصل ہو کہ وہ دوسرے کو مختار اور فاعل بالارادہ بنا کر اس میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا داعیہ فرما سکے تو اس کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ کسی سے زبردستی کام لے۔ بندہ کو چونکہ اتنی وسیع قدرت حاصل نہیں ہوتی اس لیے لازمی طور پر اس کو دوسروں کو مجبور کرنا پڑتا ہے اور اس طرح وہ اس کو مجبور کر کے اپنی منشاء کے موافق کام لے لیتا ہے۔ جبر کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ کسی میں اختیار کی صفت پیدا فرما کر پھر اس سے اپنی مرضی کے موافق کام لے لیتا ہے۔ اس لحاظ سے بے شک یہاں جبر موجود ہے اور اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں ایک اسم جبار بھی ہے چنانچہ محمد بن کعب قرظی اس اسم کی تشریح میں فرماتے ہیں: ”هو الذي جبر العباد على ما اراد“ یعنی جبار اس کو کہتے ہیں جو اختیار عطا فرما کر اپنی مرضی کے مطابق کام لے۔ (دیکھو منہاج السنہ ص ۵۱ ج ۲)

حافظ ابن قیم اس مضمون کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالجبر بهذا المعنى معناه القهر والغلبة والغلبه و انه سبحانه و تعالى قادر على ان يفعل لعبده ما شاء و اذا شاء منه شيئاً و وقع و لا بدوان لم يشاء لم يكن ليس كالعاجز الذي يشاء ما لا يكون و يكون ما لا يشاء.

یعنی جبر کے ایک معنی قہر و غلبہ کے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ایسا قاہر و غالب ہے کہ وہ ان سے جو چاہے کام لے سکتا ہے اگر وہ کسی کام کے کرانے کا ارادہ فرمائے تو وہ ہو کر رہتا ہے اور اگر ارادہ نہ فرمائے تو پھر وہ ہو نہیں سکتا اس عاجز شخص کی طرح نہیں کہ جو کسی بات کا ارادہ تو کرے اور پھر وہ ہو

نہ سکے اور وہ ہوتا رہے جس کا اس نے ارادہ نہ کیا ہو۔ (شفاء العلیل ص ۱۲۹)

حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں اس مسئلہ کی طویل تقریر کر کے آخر میں لکھا ہے کہ یہی مسلک جمہور کا مسلک ہے اور یہ ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے اس میں نہ تو قدریہ کی طرح بندوں کو اپنے افعال کا خالق تسلیم کیا گیا ہے نہ جبریہ کی طرح ان کو ایک پتھر کی طرح قدرت و اختیار سے معرئی مانا گیا ہے۔ اشعری نے اگرچہ یہاں صفت قدرت کو تسلیم کر کے جبریہ سے ایک قدم آگے ضرور بڑھایا لیکن افعال عباد میں اس کو غیر مؤثر ٹھہرا کر پھر ناقابل فہم بنادیا۔ حتیٰ کہ اب ہر ناقابل فہم بات کے لیے یہ مثل بن گئی ہے کہ ”یہ بات تو اشعری کے کسب سے بھی زیادہ باریک ہے“ یعنی ناقابل فہم ہے۔ لیکن تحقیق یہ ہے کہ شیخ اشعری بھی تاثیر کے قائل تھے۔ جس کسی نے ان کی طرف محض نفی کی نسبت کر دی ہے اس نے نا تمام نظر کی ہے۔ حاشیہ اسماعیل کلبوی ص ۲۵۰ میں ہے

قال بعضهم ان التحقيق ان مذهبه موافق لمذهب الماتريدية.

تنبیہ: قضاء و قدر کا پہلا مقالہ حاشیہ البحر جانی علی شرح العقائد للذوانی سے ماخوذ ہے۔ دیکھو ص ۲۵۷۔



## قضاء و قدر کے باب میں تغیرات حمل کی حدیث کے متعلق ایک اہم حاشیہ

داؤد انطاکی اپنی مشہور تصنیف ”التذکرہ“ میں حمل کے تغیرات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اطباء کے نزدیک نطفہ میں اس تقسم کے تغیرات ہوتے ہیں۔ پہلے ہفتہ میں وہ پانی کی شکل پر ہوتا ہے پھر اس کے باہر ایک جھلی بنتی ہے اور اندر منجمد نطفہ ہو جاتا ہے اور سولہ دن میں اس پر لمبے لمبے خطوط کی شکل نمودار ہو جاتی ہے اس کے بعد وہ سرخ رنگ کا خون بن جاتا ہے اس کے بعد اس کی شکل گوشت کے لوٹھڑے کی ہو جاتی ہے اور سب سے پہلے اس میں قلب کی شکل نمودار ہوتی ہے پھر دماغ کی۔ بتیس دن میں اس میں ہڈیوں کے نشانات قائم ہوتے ہیں اور حمل کے بچہ بننے کی یہ لم سے کم مدت ہے۔ پچھتر دن کے بعد وہ اپنی غذا جذب کرنے لگتا ہے اور اس پر گوشت آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اب وہ پہلے سے بالکل علیحدہ ایک جدید مخلوق کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس میں حرارت عزیز یہ پیدا ہو جاتی ہے اور اب اس میں طبعی نمو شروع ہو جاتا ہے (اسی کا نام روح طبعی ہے) اور سو دن کے بعد اس میں نباتات کی طرح نمو ہونے لگتا ہے اس کے بیس دن کے بعد وہ ایک سوتا ہوا حیوان معلوم ہونے لگتا ہے اور اب اس میں حقیقی روح پھونکی جاتی ہے۔ اس تقریر سے جو اختلاف نفخ روح کے بارے میں فلاسفہ اور اہل شرع کے مابین تھا وہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک نفخ روح کی مدت ستر دن ہے اور اہل شرع کے نزدیک چار ماہ ظاہر ہے کہ فلاسفہ روح شرعی کو نہیں پہچانتے ان کے نزدیک روح طبعی ہی ایک روح ہے اسی کے ذریعہ سے انسان کا نشوونما ہوتا ہے اہل شرع کے نزدیک انسان کی حقیقت اس کا جسم نہیں بلکہ دراصل وہ روح انسانی ہے جس میں اپنے خالق کی معرفت مرکوز ہوتی ہے وہ روح چار ماہ کے بعد پھونکی جاتی ہے اور جو روح طبعی ہے وہ مذکورہ بالا تحقیق کے مطابق اہل اسلام کے نزدیک بھی پچھتر دن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے دونوں طبقوں کے درمیان روح طبعی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دیکھو حاشیہ ابن عابدین الشامی ص ۸۷ ص ۱- از باب النفاس۔“





بسم اللہ الرحمن الرحیم

قضاء و قدر پر ایمان لانا اسلام کا ایک رکن ہے

(۸۸۵) یحییٰ بن یعمر بیان کرتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر میں جس نے سب سے پہلے کلام کیا وہ بصرہ میں ایک شخص معبد جہنی تھا۔ میں اور میرے ساتھ حمید بن عبد الرحمن حمیری حج یا عمرہ کرنے کی نیت سے نکلے تو ہم نے کہا کاش ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے کوئی شخص مل جاتا تو ہم اس سے ان شبہات کے متعلق جو یہ لوگ تقدیر کے بارے میں نکالتے رہتے ہیں، کچھ باتیں دریافت کر لیتے۔ حسب الاتفاق ہمیں عبد اللہ بن عمرؓ سے ملاقات نصیب ہو گئی اس وقت وہ اور میں مسجد میں داخل ہو رہے تھے بس میں اور میرا ساتھی ایک ان کی دائیں جانب سے اور دوسرا بائیں جانب سے ان کو لپٹ گئے۔ میں جانتا تھا کہ میرا رفیق سلسلہ گفتگو کا آغاز میرے ہی سپرد کرے گا اس بناء پر میں نے ہی عرض کی اے ابو عبد الرحمن (عبد اللہ بن عمر کی کنیت ہے) ہمارے اطراف میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور علم میں بہت کدو کاوش بھی کرتے ہیں۔ پھر ان کی مفصل روئداد بیان کی، ان کا عقیدہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں اور دنیا کے واقعات کسی تقدیر کے بغیر یونہی چلتے رہتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا جب ان سے تمہاری ملاقات ہو تو ان کو مطلع کر دینا کہ نہ میرا ان سے کوئی تعلق رہا نہ ان کا مجھ سے۔ اس ذات کی قسم جس کے نام کی قسم عبد اللہ بن عمر کھاتا ہے کہ اگر ان میں سے کسی

الایمان بالقدر رکن من ارکان الاسلام  
(۸۸۵) عَنْ یَحْیٰی بْنِ یَعْمَرٍ فِی مُسْلِمٍ قَالَ  
كَانَ اَوَّلُ مَنْ قَالَ فِی الْقَدْرِ بِالْبَصْرَةِ مَعْبَدُ  
الْجَهْنِیِّ فَاَنْطَلَقْتُ اَنَا وَ حَمِیْدُ بْنُ  
عَبْدِ الرَّحْمَنِ الْحَمِیْرِیُّ حَاجِّیْنِ اَوْ مُعْتَمِرِیْنِ  
فَقُلْنَا لَوْ لَقِیْنَا اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ  
صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلْنَاهُ عَمَّا یَقُوْلُ  
هُوَ لَا فِی الْقَدْرِ فَوْقَ لَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ  
بْنِ الْخَطَّابِ دَاخِلًا الْمَسْجِدَ فَاُكْتَفَفْنَاهُ اَنَا وَ  
صَاحِبِیْ اَحَدُنَا عَنْ یَمِیْنِهِ وَ الْاٰخَرُ عَنْ  
شِمَالِهِ فَظَنَنْتُ اَنَّ صَاحِبِی سَیَكُلُ الْكَلَامَ  
اِلَیَّ فَقُلْتُ یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ اِنَّهُ قَدْ ظَهَرَ لَنَا  
قَبْلَنَا اُنَاسٌ یَقْرَءُوْنَ الْقُرْآنَ وَ یَتَقَفَّرُوْنَ الْعِلْمَ  
وَ ذَكَرَ مِنْ شَاۡنِهِمْ وَ اَنَّهُمْ یَزْعُمُوْنَ اَنَّ لَا  
قَدَرَ وَ اَنَّ الْاَمْرَ اُنْفٌ قَالَ اِذَا لَقِیْتُ اُولٰٓئِكَ  
فَاُخْبِرْهُمْ اِنِّیْ بَرِیٌّ مِنْهُمْ وَ اَنَّهُمْ بُرَآءٌ مِنِّْیْ وَ  
الَّذِیْ یُحْلِفُ بِهٖ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لَوْ اَنَّ

(۸۸۵) \* قدریہ کی تاریخ میں آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اس کی ابتداء کیونکر ہوئی، اور یہ کہ معبد جہنی بھی اس فتنہ کے بانیوں کی ابتدائی صف میں داخل تھا اور الامر انف کے معنی بھی معلوم کر چکے ہیں اور یہ بھی کہ عبد اللہ بن عمرؓ کے اس فرمان کا تعلق اس فرقہ کے ساتھ ہے جو علم الہی کا بھی منکر تھا۔ اب غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اس عقیدہ کو آخر اتنی اہمیت کیا ہے کہ اس کو دین کا ایک رکن قرار دے دیا گیا ہے۔ تو اس کے متعلق بھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر بندہ کا اللہ تعالیٰ سے کوئی رابطہ ہی قائم نہیں ہو سکتا وہ اگر اس کی خالقیت کا اقرار کر بھی لیتا ہے مگر آئندہ اس کی زندگی میں جب اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں دیکھتا بلکہ اپنی دنیا کے خود خالق ہونے کا گمان کر بیٹھتا ہے تو اس کو اس کے عالم کی خالقیت کے اعتقاد پر بھی پورے طور پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے سو چو کہ جب ایک شخص اپنا اور اپنے افعال کی ساری دنیا کا تعلق خالق السموات و الارضین کے ساتھ قائم نہیں رکھ سکتا تو بھلا اس کو اسلام ہی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اب اگر وہ اُحد کے برابر بھی سونا خرچ کر ڈالے تو یہ صرف ایک کافر کا صدقہ ہوگا جس کا بارگاہ بے نیاز میں کوئی وزن نہیں ہے۔

لَا أَحَدِهِمْ مِثْلَ أُحَدٍ ذَهَبًا فَانْفَقَهُ مَا قَبِلَ اللَّهُ مِنْهُ حَتَّى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ. (رواہ مسلم فی کتاب الایمان و ابوداؤد و الامام احمد فی

کتاب السنہ ص ۱۱۹)

(۸۸۶) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ وَحَتَّى يَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهُ وَ أَنَّ مَا أَخْطَأَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَهُ. (رواہ الترمذی و

قال غریب و فیہ عبد اللہ بن میمون منکر)

(۸۸۷) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ بَارِعٌ يَشْهَدُ أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ بَعَثَنِي بِالْحَقِّ وَ يُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَ يُؤْمِنُ بِالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ يُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ.

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ. و اخرجه الحاکم فی المستدرک و قال علی شرط الشیخین و لم يتعبه

اللمبی)

(۸۸۸) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِكُلِّ شَيْءٍ حَقِيقَةٌ وَمَا

کے پاس اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو اور وہ اس کو خیرات کر ڈالے جب بھی وہ اس وقت تک اُس سے قبول نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس کا ایمان تقدیر پر نہ ہو۔

(مسلم شریف)

(۸۸۶) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک بندہ اس پر ایمان نہ لائے کہ برا، بھلا سب تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور اس کا یقین نہ کرے کہ جو خیر و شر اس کو پہنچ گیا یہ ناممکن تھا کہ اس کو نہ پہنچتا اور جو نہیں پہنچا یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اس کو پہنچ جاتا۔ اس وقت تک اس کا ایمان کچھ نہیں۔

(ترمذی)

(۸۸۷) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تک بندہ چار باتوں کی دل سے گواہی نہ دے مؤمن نہیں ہوتا۔ اس بات کی کہ معبود کوئی نہیں مگر ایک اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی کہ میں کسی تردد کے بغیر اس کا رسول ہوں، اس نے سچا دین دے کر مجھ کو بھیجا ہے۔ اور مر کر قیامت میں پھر جینے کا یقین نہ کرے اور جب تک کہ تقدیر کو نہ مانے۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

(۸۸۸) ابودرداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہر چیز کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے، اسی طرح ایمان کی بھی

(۸۸۷) \* احادیث در حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان گفتگوؤں کا ایک مجموعہ ہیں جو آپ اپنی مجلسوں میں وقتاً فوقتاً فرمایا کرتے تھے اس لیے ان کا انداز بیان کتابی شکل کا نہیں ہوتا، اس کی تفصیل جلد ثانی ہی میں ملاحظہ فرمائیے، اس لیے یہاں بھی ایمانیات کے صرف وہی چند اجزاء بیان کر دیئے گئے ہیں جو اس محفل میں کسی وقتی مناسبت سے زیادہ اہم سمجھے گئے تھے۔ ان امور کے علاوہ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ اللہ اور اس کی سب کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، مگر چونکہ یہ جملہ امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار میں آ جاتے ہیں اس لیے ان سب کی ہر جگہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ جس نے آپ کو رسول مان لیا ہے وہ ان سب باتوں کو بھی ضرور مانے گا جن کی آپ نے خبر دی ہے، ورنہ ان کا انکار آپ کی رسالت ہی کا انکار ہوگا۔

(۸۸۸) \* انسان اس عالم میں مختار ہی مختار نظر آتا ہے اگر کہیں انبیاء علیہم السلام تشریف لا کر اس پر عالم غیب کے جبر کی اطلاع ملے.....



بَلَغَ عَبْدٌ حَقِيقَةَ الْإِيمَانِ حَتَّى يَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَهُ  
لَمْ لَكُنْ لِيْخْطِئُهُ وَ مَا أَخْطَاةُ لَمْ يَكُنْ لِيْصِيبَهُ.

(رواہ احمد و الطبرانی قال الہیثمی و رجالہ ثقات)

(۸۸۹) عَنِ الشَّعْبِيِّ قَالَ لَمَّا قَدِمَ عَدِيُّ بْنُ

حَاتِمٍ الْكُوفَةَ أَتَيْنَاهُ فِي نَفَرٍ مِنْ فُقَهَاءِ أَهْلِ

الْكُوفَةِ فَقُلْنَا لَمْ حَدِّثْنَا مَا سَمِعْتَ مِنْ رَسُولِ

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا عَدِيُّ بْنُ حَاتِمٍ

أَسْلِمْتَ تَسْلِمُ قُلْتُ وَ مَا الْإِسْلَامُ فَقَالَ تَشْهَدُ

أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ وَ تُوْمِنُ

بِالْأَقْدَارِ كُلِّهَا خَيْرَهَا وَ شَرَّهَا حُلُوهَا وَ

مُرَّهَا. (رواہ ابن ماجہ و فی الزوائد هذا اسناد

ضعیف لا اتفاقہم علی ضعف عبد الاعلی و لہ

شاهد من حدیث جابر رواہ الترمذی)

(۸۹۰) عَنْ أَبِي حَفْصَةَ قَالَ قَالَ عُبَادَةُ بْنُ

الصَّامِتِ لِابْنِهِ يَا بُنَيَّ إِنَّكَ لَنْ تَجِدَ طَعْمَ

حَقِيقَةِ الْإِيمَانِ حَتَّى تَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ

ایک حقیقت ہے۔ بندہ اس وقت تک ایمان کی حقیقت نہیں پاسکتا جب تک  
اس کا یقین نہ رکھے کہ جو کچھ اس کو پہنچ گیا یہ ناممکن تھا کہ اس کو نہ پہنچتا اور جو  
نہیں پہنچا یہ بھی ناممکن تھا کہ اس کو پہنچ جاتا۔ (احمد الطبرانی)

(۸۸۹) امام شعبی روایت کرتے ہیں کہ عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جب کوفہ آئے تو ہم اہل کوفہ کے کچھ سمجھ دار لوگوں کو لے کر ان کی خدمت

میں حاضر ہوئے اور ہم نے ان سے گزارش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے جو باتیں آپ نے سنی ہیں وہ ہمیں بھی سنائیے۔ انہوں نے فرمایا میں

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: عدی! اسلام قبول کر لو تو امن و چین سے رہو گے۔ میں نے عرض کی

اسلام کیا چیز ہے؟ فرمایا یہ کہ اس بات کی دل سے گواہی دو کہ معبود کوئی نہیں

مگر ایک اللہ کی ذات (عزوجل) اور اس بات کی کہ میں کسی تردد کے بغیر

اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور اس پر بھی یقین کرو کہ برا بھلا اور تلخ و شیریں جو

کچھ بھی ظاہر ہو تا رہتا ہے وہ سب پہلے سے مقدر ہو چکا ہے۔

(ابن ماجہ)

(۸۹۰) ابو حفصہ روایت فرماتے ہیں کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے اپنے فرزند سے کہا اے میرے عزیز فرزند تم کو اس وقت تک ایمان

کی حقیقت کی لذت نہیں آسکتی جب تک کہ تم اس کا یقین نہ کرو کہ جو خیر و شر تم

لگے..... نہ دیں تو وہ مدت العمر اپنے اسی جہل میں مبتلا رہے۔ وہ نظر حقیقت میں اس کی مجبوری کو پیرایہ بہ پیرایہ سمجھاتے ہیں۔ اس تاکید کے

ساتھ سمجھاتے ہیں کہ اگر اس کو اپنی اس مجبوری کا یقین نہیں تو وہ اس کا بھی یقین رکھے کہ ابھی اس کو ایمان کی حقیقت بھی حاصل نہیں۔ پس جب

کہ حقیقت یہ ٹھہری کہ انسان مختار ہونے کے ساتھ مجبور بھی ہے تو پھر ان احادیث کی اہمیت بھی واضح ہو گئی مسئلہ کی تفصیل پہلے معلوم ہو چکی ہے۔

(۸۹۰) \* پہلی حدیث میں اسی پختہ اعتقاد کو حقیقت ایمان سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اعتقاد جب پختہ ہو جاتا ہے تو پھر قلب سے گزر کر تمام جسم

کو اس کی لذت کا احساس ہونے لگتا ہے اس لیے اعتقاد اب ذائقہ کی چیز بن جاتا ہے اسی کو اس حدیث میں اس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قضاء و

قدر پر اس درجہ کا اعتقاد چونکہ ہر شخص کا حصہ نہیں ہوتا اس لیے ان دونوں حدیثوں میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ یہ مقام کامل مؤمن کا ہے۔

ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ جان و دل سے اس مقام اعلیٰ پر پہنچنے کی کوشش کرے تاکہ جواب تک صرف مؤمن تھا وہ حقیقی مؤمن بن جائے اور

جس کا ایمان آج تک صرف ایک علمی حیثیت رکھتا تھا اب وہ وجدانی اور وجدانی سے حسی بن جائے۔ یہی وہ احسان کا مرتبہ ہے جس کا تذکرہ

آپ حدیث جبریل میں پھر ترجمان السنہ جلد اول و ثانی میں موقعہ بموقعہ دیکھتے چلے آئے ہیں۔

کو پہنچ گیا وہ کبھی خطا نہیں کر سکتا تھا اور جو نہیں پہنچا اس کا پہنچنا ممکن نہ تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جو شے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے بنائی وہ قلم ہے پھر اس کو حکم دیا کہ لکھ۔ اس نے عرض کی پروردگار کیا لکھوں۔ ارشاد ہوا قیامت تک جس چیز کے لیے جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ سب لکھ۔ اے میرے فرزند عزیز میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ جو شخص اس عقیدہ کے سوا کسی دوسرے عقیدہ پر مرے گا وہ مجھ سے نہ ہوگا۔

(ابوداؤد)

منکرین تقدیر کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید کلمات (۸۹۱) ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تقدیر کا انکار کرنے والے اس امت کے مجوسی ہیں، اگر بیمار ہوں تو ان کی عیادت بھی نہ کرنا اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازہ میں بھی شریک نہ ہونا۔ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

(رواہ احمد و ابوداؤد روى الطبرانی فی الاوسط عن انس الوعيد فی القدرية و المرجئة کلیها قال الیثمی و رجاله رجال الصحیح غیر ہارون بن موسی الفروی و هو ثقة و ماردی عن ابن عمر فیہ زکریا بن منظور و ثقہ احمد بن صالح و غیرہ و ضقفہ جماعة قال السندی و قد جاء اصل هذا المتن من حدیث ابن عمر ایضا عند ابی داؤد و قد اخرجہ الترمذی و حسنه و قد صححه الحاکم و قال علی شرط الشيخین ان صح سماع ابی حازم عن ابن عمر و حقق الحافظ ابن حجر انه صحیح علی شرط مسلم فی الاکتفاء بالمعاصرة فلا وجه للحکم بوضعه کما قبل (وفی النسخه بوصفه و هو غلط) يقول العبد الضعیف و قد اخرجہ السیوطی فی الدر المنثور بلفظ المکذبون بالقدر مخرج موهذه الامه و فیهم انزلت هذه الآية ان المجرمین فی ضلال و سر الی قوله انا کل شیء خلقه بقدر ج ۶ ص ۱۳۸)

(۸۹۱) \* حدیث مذکور میں عیادت اور جنازہ کی شرکت کے متعلق خاص طور پر ممانعت فرمانے کا نکتہ یہ ہے کہ یہ ان حقوق میں سے ہیں جو عام مسلمانوں کے لیے بھی واجب ہیں۔ پس جب منکرین قدر کے لیے یہ عام حقوق بھی واجب نہ رہے تو سوچو ان کا شمار کیا مسلمانوں کے زمرہ میں ہوگا۔ قدر یہ چونکہ تقدیر کے منکر ہیں اور بندوں کے افعال کا خالق خود ان کو قرار دیتے ہیں اس لیے وہ بھی گویا خالق میں تقسیم کے قائل ہو گئے جس طرح کہ مجوس قائل ہیں یہ خیر و شر کے خالق کو جدا جہا مانتے ہیں اور منکرین قدر بندوں کے افعال کے خالق جدا جہا مانتے ہیں اس لحاظ سے اس امت کے مجوس یہ ہوئے۔ بلکہ یہ ان سے بھی بدتر ہیں کہ مجوس تو صرف دو خالق کے قائل ہیں اور یہ بے شمار خالقوں کے قائل ہو گئے۔ نعوذ باللہ منه۔



(۸۹۲) عَنْ نَافِعٍ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ إِنَّ فُلَانًا يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ فَقَالَ إِنَّهُ بَلَغَنِي أَنَّهُ قَدْ أَحَدْتُ فَإِنْ كَانَ قَدْ أَحَدْتُ فَلَا تُقْرِئُهُ مِنِّي السَّلَامَ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ يَقُولُ يَكُونُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ أَوْ فِي أُمَّتِي الشَّكُّ مِنْهُ خَسَفٌ أَوْ مَسْخٌ أَوْ قَذْفٌ فِي أَهْلِ الْقَدْرِ. (رواه الترمذی و قال هذا حديث حسن صحيح غریب و رواه احمد قال الهیثمی و رجاله رجال الصحيح)

(۸۹۳) عَنْ نَافِعٍ قَالَ كَانَ لِابْنِ عُمَرَ صَدِيقٌ مِنْ أَهْلِ الشَّامِ يُكَانِبُهُ فَكَتَبَ إِلَيْهِ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ أَنَّهُ بَلَغَنِي أَنَّكَ تَكَلَّمْتَ فِي شَيْءٍ مِنَ الْقَدْرِ فَإِيَّاكَ أَنْ تَكْتُبَ إِلَيَّ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ أَنَّهُ سَيَكُونُ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ يُكَذِّبُونَ بِالْقَدْرِ. (رواه الحاكم و قال صحيح على شرط مسلم و اقره الذهبي)

(۸۹۴) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ ثَلَاثَةٌ أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي الْإِسْتِسْقَاءَ بِالْأَنْوَاءِ وَ حَيْفُ السُّلْطَانِ وَ تَكْذِيبُ الْقَدْرِ. (رواه احمد)

(۸۹۲) نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا فلاں شخص آپ کو سلام کہتا ہے۔ فرمایا میں نے سنا ہے اس نے تقدیر کے متعلق کوئی نیا عقیدہ اختیار کیا ہے۔ اگر اس نے کوئی نیا عقیدہ اختیار کیا ہو تو میری جانب سے اس کو سلام مت کہنا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ اس امت میں یا میری امت میں (یہ شک راوی کی جانب سے ہے) جو لوگ تقدیر کا انکار کریں گے ان پر عذاب نازل ہوگا زمین میں دھنسا کر یا اس کی شکل بدل کر یا اوپر سے پتھر برساکر۔

(ترمذی، مسند احمد)

(۸۹۳) نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ایک شامی دوست تھا، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اُس کو اس مضمون کا ایک خط لکھا: مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے تقدیر کے بارے میں کچھ بات چیت شروع کی ہے، لہذا آئندہ سے ہرگز مجھ سے خط و کتابت نہ رکھنا، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہے کہ اس امت میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو تقدیر کی تکذیب کریں گے۔ (متدرک)

(۸۹۴) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ مجھے اپنی امت کے متعلق تین باتوں کا اندیشہ ہے۔ پختروں سے بارش طلب کرنا، بادشاہ کا ظلم کرنا اور تقدیر کا انکار کرنا۔ (احمد)

(۸۹۳) \* اس حدیث میں اس سے پہلی حدیث سے کچھ زیادہ تفصیل تھی اس لیے اس کو دوبارہ درج کیا گیا ہے۔ جو لوگ اسلامی تعلیمات سے دور ہو جائیں ان کے ساتھ مذاقی سلف کیا تھا! اس حدیث سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ جہاں معمولی باتوں پر سخت گیری اسلامی معاشرت سے ناواقفی کی دلیل ہے وہاں اہم امور میں تساہل بھی اسلامی تعلیمات سے جہالت کا ثمرہ ہے۔

(۸۹۴) \* حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان باتوں کا تخم کلیۃً ایسا فنا نہیں ہوگا کہ ان کا انفرادی طور پر بھی کہیں وجود باقی نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی خطہ میں کسی نہ کسی درجہ تک یہ اعتقاد باقی رہے چلا جائے گا۔ آپ کا فرمودہ صبح صادق کی طرح پورا ہو رہا ہے۔ آج بھی لوگ گواہ اپنے منہ سے تقدیر کا اقرار کرتے ہیں مگر کیا اپنے باطن میں بھی اس پر صحیح اعتقاد رکھتے ہیں۔ بادشاہوں کے ظلم کا افسانہ تو کب کا کہنہ ہو چکا، بارش کا معاملہ بھی ظاہر ہے۔

(۸۹۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا منکرین تقدیر کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھو اور نہ ان کے ساتھ سلام میں پیش قدمی کرو۔ (ابوداؤد) یعنی متعدی بیماری اگر ہے تو یہ ہے اس لیے اس سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ ان کی صحبت سے بھی بچا جائے۔

(۸۹۶) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھ شخص ایسے ہیں جن پر میں بھی لعنت کرتا ہوں اور خدا تعالیٰ بھی لعنت فرماتا ہے (اور تم جانتے ہو) کہ ہر نبی کی دعاء مقبول ہی ہوتی ہے (لہذا میری لعنت معمولی بات نہیں) (۱) کتاب اللہ میں اپنی طرف سے زیادتی کرنے والا (۲) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا منکر (۳) ظلم و تعدی کر کے بادشاہ بن بیٹھنے والا۔ جس کی حرکات ناشائستہ یہ ہوں کہ خدا کے نزدیک قابل عزت بندوں کو ذلیل کر ڈالے اور جو قابل ذلت ہوں ان کو عزت دے (۴) خدا تعالیٰ کے حرم میں جو باتیں ناروا ہوں ان کو حلال کر دینے والا (۵) میری اولاد کا احترام نہ رکھنے والا (۶) میرا طریقہ چھوڑ بیٹھنے والا۔

(۸۹۵) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ (رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ) عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُجَالِسُوا أَهْلَ الْقَدَرِ وَلَا تُفَاتِحُوهُمْ. (رواه ابوداؤد. و اخرجہ الحاکم و لم یتکلم علیہ الذہبی)

(۸۹۶) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةَ لَعْنَتُهُمْ وَلَعْنَهُمُ اللَّهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ مُجَابٍ الزَّائِدُ فِي كِتَابِ اللَّهِ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدْرِ اللَّهِ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبْرُوتِ فَيَعِزُّ بِذَلِكَ مَنْ أَدَّلَهُ اللَّهُ وَيَذِلُّ مَنْ أَعَزَّهُ اللَّهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللَّهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِزَّتِي مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِي. (اخرجہ الترمذی و حاکم عن علی و اخرج نحوه الطبرانی فی الاوسط قال الہیثمی رجالہ ثقات و قد صححه ابن حبان. و ماروی عن وائلۃ و جابر و ابی سعید صنفان من هذه الامۃ الحدیث فکلھا صعاۃ)

### کتابۃ القدر

(۸۹۷) عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا وہ قلم ہے۔ پھر اس کو حکم دیا کہ لکھ۔ اس نے عرض کیا کیا لکھوں؟ حکم ہوا

(۸۹۷) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ اكْتُبْ قَالَ مَا اُكْتُبُ

(۸۹۶) \* حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اعتقادی یا عملی پہلوؤں میں جب کبھی اسلام کے مرکزی نقطہ سے کوئی ادنیٰ سا ٹکراؤ بھی پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس کی نظروں میں قابل برداشت نہیں سمجھا جاتا اور اسی مقام پر اس قسم کی تعبیرات آ جاتی ہیں۔ مذکورہ بالا جتنی باتیں ہیں ان سب ہی میں یہ ٹکراؤ موجود ہے۔

(۸۹۷) \* یہاں اس بحث میں پڑنا کہ سب سے اول قلم ہی کو پیدا کیا گیا ہے یا اس سے پہلے کچھ اور بھی۔ اسی طرح اس قلم کی تصویر کشی کے درپے ہونا یہ سب امور زیر بحث آ تو چکے ہیں مگر ہمارے نزدیک ہیں غیر ضروری مشغلہ۔ ہاں اگر کسی کو عالم کا لطفہ.....



الْقَدَرِ فَكُتِبَ مَا كَانَ وَ مَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى الْآبَدِ۔ جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ سب لکھ تو اس نے قیامت تک جو ماضی و مستقبل میں (رواہ الترمذی و قال هذا حدیث غریب اسناداً) شدنی تھا سب لکھ دیا۔ (ترمذی)

لہذا ..... جغرافیہ لکھنا ہو تو اس کے لیے بے شک ضروری ہوں گے۔ ہمیں تو یہاں صرف اتنی بات بتانی ہے کہ حق تعالیٰ نے جب عالم کو بتدریج بنایا تھا اور اس میں اسباب و مسببات کا سلسلہ بھی قائم فرمایا تھا تو اس کی بنیاد سے لے کر آخر تک جملہ امور بھی اسی مناسبت سے پیدا فرمائے تھے۔ یہاں قلم اور اس کی کتابت وغیرہ کو بھی اسی کی مناسبت سے سمجھنا چاہیے ورنہ جس کی شان کن فیکون ہو وہ کسی شے کا محتاج نہیں ہے۔ علاوہ ازیں کتابت تقدیر میں کچھ مختلف فوائد بھی ہیں:

(۱) تقدیر اس بات کی دلیل ہے کہ حق تعالیٰ کو جمیع مخلوقات کا علم پہلے سے حاصل تھا۔ کیونکہ یہ بدیہی ہے کہ جب تک کسی کو پہلے سے علم حاصل نہ ہو وہ کسی مخلوق کو کسی حکیمانہ نظام کے ساتھ پیدا نہیں کر سکتا۔ تعجب ہے کہ بعض غالی معزز نے بندوں کے افعال پر حق تعالیٰ کے علم ازلی کا بھی انکار کر دیا ہے۔

(۲) تقدیر میں چونکہ ہر چیز کا پورا پورا اندازہ اور اس کی مخصوص مقدار و شکل بھی لکھی ہوئی موجود ہے اس لیے یہ اس کے علم کی اور واضح دلیل ہے گویا خلق اور پیدا کرنے کے لیے جہاں پہلے سے اس شے کا علم ضروری ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کا صحیح اندازہ اور اس کی پوری پوری شکل کا بھی علم ہوتا کہ اسی کے مناسب اس کو پیدا کیا جاسکے ارشاد ہے:

قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔ (طلاق: ۳)

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا۔ (فرقان: ۲)

(۳) تقدیری حالات چونکہ مخلوقات کے وجود سے بھی پیشتر مفصلاً لکھ کر رکھ دیئے گئے ہیں جن کا بقدر ضرورت انکشاف انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ان کے وقوع سے قبل بھی ہوتا رہتا ہے تو یہ اس بات کا اور بدیہی ثبوت ہوگا کہ جب ان امور کا علم بندوں کو ممکن ہے تو پھر خالق کو بھلا کیونکر نہ ہوگا۔

(۴) تقدیر کی کتابت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عالم حق تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے پیدا ہوا ہے۔ اس طرح نہیں جیسا کہ آفتاب سے دھوپ کا صدور اضطرار ہوتا ہے۔

(۵) چونکہ تقدیر عالم کے وجود سے قبل لکھی گئی اس لیے جہاں ایک طرف یہ حق تعالیٰ کے اختیار و مشیت کی دلیل ہے اسی طرح تمام مخلوق کے حدوث کی بھی دلیل ہے۔ حدوث کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام کی تمام مخلوق کسی زمانہ میں معدوم تھی پھر مشیت الہیہ اور اس کی قدرت سے پیدا ہوئی ہے یوں نہیں ہے کہ ہمیشہ سے اسی طرح بنی ہوئی موجود تھی۔ (شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ۲۰۵ و ۲۰۶)

علامہ سید رشید رضا مرحوم تفسیر المنار میں فرماتے ہیں کہ جب صانع عالم نے عالم کو پیدا فرمایا اور اس طرح پیدا فرمایا کہ اس کے ساتھ عرش و کرسی بھی پیدا فرمائے اس کے نظام قائم رکھنے کے لیے ابر و باد بھی بنائے اور باطنی نظام چلانے کے لیے ملائکہ اللہ بھی مقرر فرمائے تو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ اس کا نظام بھی مقرر فرما کر لکھ دیا جاتا۔ بس یہی قضاء و قدر اور اس کی کتابت کی حکمت ہے۔ (دیکھو تفسیر مذکور۔ ص ۷۷ ج ۷)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ عبد اللہ بن طاہر نے ایک مرتبہ حسین بن الفضل سے پوچھا کہ جب سب کچھ طے ہو کر لکھا بھی جا چکا ہے تو کہیے پھر کُلْ یَوْمَ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن: ۲۹) کا کیا مطلب ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہي شئون یبدیہا لاشئون یتدیہا۔ (فتح الباری ج ۱۱ ص ۳۹۶) لہذا ...

(۸۹۸) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ إِنِّي عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ جَاءَ قَوْمٌ مِنْ بَنِي تَمِيمٍ فَقَالَ اقْبُلُوا الْبُشْرَى يَا بَنِي تَمِيمٍ قَالُوا بَشِّرْنَا فَأَعْطَانَا فَجَاءَ نَاسٌ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ اقْبُلُوا الْبُشْرَى يَا أَهْلَ الْيَمَنِ إِذْ لَمْ يَقْبَلُهَا بَنُو تَمِيمٍ قَالُوا قَبِلْنَا جُنَّاتِكَ لِنَتَفَقَّهَ فِي الدِّينِ وَلِنَسْأَلَكَ عَنْ أَوَّلِ هَذَا الْأَمْرِ مَا كَانَ قَالَ كَانَ اللَّهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهُ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَكَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلِّ شَيْءٍ ثُمَّ أَتَانِي رَجُلٌ فَقَالَ يَا عِمْرَانُ أَذْرِكُ نَاقَتَكَ فَقَدْ ذَهَبَتْ فَأَنْطَلَقْتُ أَطْلُبُهَا فَإِذَا السَّرَابُ يَنْقَطِعُ دُونَهَا وَأَيُّمُ اللَّهِ لَوْ دِدْتُ أَنَّهَا قَدْ ذَهَبَتْ وَلَمْ أَقُمْ.

(رواه الشيخان)

(۸۹۸) عمران بن حصین بیان فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھا کہ بنی تمیم قبیلہ کے کچھ لوگ آگئے آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا اے بنی تمیم کے لوگو! لو بشارت قبول کرو انہوں نے عرض کیا اچھا آپ بشارت دیتے ہیں تو اب دیجئے کیا دیتے ہیں؟ اس کے بعد کچھ لوگ یمن والے آگئے آپ نے ان سے بھی یہی فرمایا اے یمن والو! بنو تمیم نے تو اس بشارت کو قبول نہ کیا تو تم قبول کر لو وہ بولے یا رسول اللہ ہم نے سر و چشم قبول کیا، ہم تو دین سیکھنے کے لیے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور یہ بات بھی دریافت کرنی ہے کہ اس عالم کی ابتداء کیسے ہوئی تھی؟ آپ نے فرمایا بس اللہ تعالیٰ ہی اللہ تعالیٰ کی ذات تھی اور اس سے پہلے کچھ نہ تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا اس کے بعد اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے اور لوح محفوظ میں ہر چیز لکھ کر ثبت فرمادی ہے اتنے میں میرے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا عمران اپنی ناقہ کو پکڑو وہ تو بھاگ گئی۔ میں اس کو تلاش کرنے کے لیے نکلا تو وہ اتنی دور جا چکی تھی کہ ریت کی چمک بھی نظر نہ آ سکے۔ (حالانکہ وہ بہت دور سے چمکتا رہتا ہے یعنی بہت دور جا چکی تھی) اور خدا کی قسم مجھے یہ پسند تھا کہ وہ چلی جاتی اور میں اپنی جگہ سے نہ اٹھتا۔

(متفق علیہ)

لہذا ..... یعنی اپنی ان نئی نئی شانوں کا وہ ہر دن اظہار فرمایا کرتا ہے اگرچہ طے پہلے کر چکا تھا یہ نہیں کہ ان کی ابتداء ہی اب کرتا ہے۔ یہ جواب سن کر عبد اللہ بن طاہر امیر خراسان اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دیا۔

(۸۹۸) \* یہاں آپ کو بنی تمیم کی یہ اداسپند نہ آئی کہ انسان اتنا گر جائے کہ اس کی نظر میں خوش خبری کا محور بس دنیوی منفعت کے سواء اور کچھ باقی ہی نہ رہے۔ آپ نے سکوت فرمایا اور یہ ناگواری کا سکوت تھا اس پر بھی ان کو کچھ تنبیہ نہ ہوا اور طبائع جب گرنے لگتی ہیں تو یہ قاعدہ ہے کہ ان کا احساس بھی گرنے لگتا ہے۔ اتنے میں یمن کے کچھ عالی ہمت لوگ آنکھوں سے اس بشارت کو لپک لے گئے اور ان کے سوال کے جواب میں یہ بات بھی ذکر میں آگئی کہ عالم کی تقدیر لکھی جا چکی ہے۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ عالم غیب چونکہ ہم سے غائب ہی ہے اس لیے اگر وہ ہمارے سامنے بیان میں آتا بھی ہے اس وقت بھی بسا اوقات اس کے گوشوں میں ابہام ہی رہتا ہے گویا مذکور ہو جانے کے بعد بھی وہ مشہود کے درجہ میں نہیں آتا اس کے علاوہ بعض حالتوں میں ابہام فی نفسہ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ انعام و اکرام کے مواقع پر دنیا کا بھی یہی دستور ہے یہاں بھی بشارت منظور تو ہوئی تھی مگر وہ کس کے نصیب میں ہے یہ گوشہ مبہم چھوڑ دیا گیا تھا حتیٰ کہ جب بانصیب جماعت آگئی تو یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کے نصیب کی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی ایک جماعت کو عالم خواب میں ایک خاص انداز کی فضیلت میں دیکھا۔ جب آپ نے اس خواب کا ذکر فرمایا تو ایک شخص عکاشہ بن محسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ محفل مبارک میں لہجہ ...



## متی کُتِبَ الْقَدْرُ

## قضاء و قدر کی کتابت عالم کی پیدائش سے کتنی قبل ہوئی؟

(۸۹۹) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُتِبَ اللَّهُ مَقَادِيرُ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ. (رواه مسلم)

(۸۹۹) عبد اللہ بن عمرو روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل تمام مخلوقات کے لیے جو بھی مقدر فرمادیا تھا وہ سب قید کتابت میں لا کر محفوظ کر دیا ہے اور اس سے پیشتر اس کا عرش پانی پر تھا۔ (مسلم شریف)

(۹۰۰) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَكُلَّ اللَّهُ بِالرَّحِمِ مَلَكًا

(۹۰۰) انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے رحم مادر پر ایک فرشتہ مقرر فرما

لہ..... حاضر تھے بے ساختہ بول اٹھے یا رسول اللہ دعا فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس جماعت میں بنادے۔ آپ نے فرمایا جاؤ تم ان میں سے ہو گئے۔ اس پر پھر دوسرے صاحب اٹھے اور انہوں نے بھی یہی درخواست پیش کی۔ آپ نے فرمایا ”سبقک بہا عکاشہ“ وہ تو عکاشہ لے اڑے یعنی اس وقت کسی مبہم کے حق میں اس جماعت میں ہونا طے پایا تھا وہ عکاشہ کے نصیب سے ان کو مل گیا اب تیسرے اور چوتھے کی گنجائش نہیں ہے۔ جہاں ایک طرف تقدیر لکھی جا چکی تھی وہاں اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کی قبولیت بھی اہل یمن کے حصہ میں لکھی جا چکی تھی۔

(۸۹۹) \* حضرت شاہ ولی اللہ نے تقدیر کے پانچ مراتب تحریر فرمائے ہیں سب سے پہلا مرتبہ ارادہ ازلیہ ہے جو تمام کائنات کا اصل مبدأ و منشاء ہے اس کے بعد دوسرا نمبر یہ کتابت ہے جس کا یہاں ذکر ہے تیسرا نمبر وہ ہے جب کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمالیا اور ارادہ کیا کہ نوع انسانی کی ان سے بنیاد قائم ہو تو ان کی تمام اولاد کو ان سے نکالا اور ان میں مطیع و عاصی اور مؤمن و کافر کی تقسیم فرمائی چوتھا نمبر وہ کتابت ہے جو رحم مادر میں ہوتی ہے۔ اس کا تذکرہ آئندہ حدیثوں میں آ رہا ہے پانچویں نمبر کی تفصیل یہاں عوام بلکہ اکثر خواص کے ذہن سے بھی بالاتر ہے اس لیے اس کو ذکر نہیں کیا گیا۔ دیکھو حجتہ اللہ - ص ۶۵ و ۶۶ - عرش اور پانی کے درمیان میں جب تک آسمان و زمین کا وجود ہی نہ تھا اس وقت تک یہی کہا جائے گا کہ نیچے پانی اور اوپر عرش پھر جب درمیان میں آسمان و زمین آ گئے تو اب تعبیر یہ ہوگی کہ عرش آسمانوں کے اوپر ہے۔ درحقیقت عرش جہاں پہلے تھا اب بھی وہیں ہے یہ تغیرات سب تحتانی ہوئے ہیں۔

حافظ ابن قیم نے تقدیری مراتب کو ایک دوسرے پیرایہ میں لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ایک تو وہ مرتبہ ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھا گیا تھا دوسرا وہ ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد لکھا گیا ہے مگر ذریت ابن آدم کی پیدائش سے قبل۔ اس کا پتہ حدیث میثاق سے چلتا ہے۔ تیسرا مرتبہ وہ ہے جو شکم مادر میں لکھا جاتا ہے اور چوتھا مرتبہ حولی ہے یعنی وہ سالانہ لکھا جاتا ہے یعنی شب قدر میں اور پانچواں یومی یعنی جو روزمرہ لکھا جاتا ہے۔ کُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ - حق تعالیٰ کی شان ہر دن نرالی ہے کسی کو پست کرتا ہے اور کسی کو بلند۔ ان میں سے ہر مرتبہ پہلے مرتبہ کی صرف ایک تفصیل ہی ہوتی ہے۔ شفاء العلیل ص ۲۳ و ۲۴ - اس کی مثال اس عالم میں بھی ہے یہاں بھی سالانہ بجٹ کی منظوری کے بعد پھر تحتانی دفاتر میں علیحدہ علیحدہ منظوریوں بھی ہوتی ہیں مگر یہ سب بجٹ میں داخل ہوتی ہیں۔

(۹۰۰) \* واضح رہے کہ اس حدیث کی اصل غرض اطوار جنین کی پوری تفصیلات بیان کرنی نہیں ہیں یہ موضوع علم تشریح کا ہے لہ.....

رکھا ہے وہ یہ عرض کرتا رہتا ہے پروردگار ابھی تک یہ نطفہ ہے پروردگار اب یہ خون بستہ کی شکل ہو گیا۔ پروردگار اب یہ گوشت کا لوتھڑا بن گیا۔ اب اگر اللہ تعالیٰ یہ ارادہ فرماتا ہے کہ اس کو پیدا فرمادے تو وہ عرض کرتا ہے پروردگار اس کے متعلق کیا لکھوں مرد ہو گا یا عورت بد بخت ہو گا یا نیک بخت پھر اس کا رزق فراخ ہو گا یا تنگ اور عمر کتنی ہو گی؟ تو اس طرح یہ ساری باتیں ماں کے پیٹ کے اندر ہی اندر لکھ دی جاتی ہیں۔ (بخاری شریف)

فَيَقُولُ أَيُّ رَبِّ نُطْفَةٍ أَيُّ رَبِّ عَلَقَةٍ أَيُّ رَبِّ مُضْغَةٍ فَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَقْضِيَ خَلْقَهَا قَالَ أَيُّ رَبِّ أَذْكَرٌ أَمْ أُنْثَى أَشَقِيٌّ أَمْ سَعِيدٌ فَمَا الرِّزْقُ فَمَا الْأَجَلُ فَيَكْتُبُ كَذَلِكَ فِي بَطْنِ أُمِّهِ.

(رواہ البخاری)

### التحذير عن التنازع في القدر

قضاء وقدر میں بحث و مباحثہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے (۹۰۱) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر تشریف لائے اس وقت ہم تقدیر کے مسئلہ میں

(۹۰۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي

للہ ..... یہاں اطوار جنین یعنی حمل کے تغیرات اور بچہ کی تدریجی ترقیات کا تذکرہ صرف مسئلہ تقدیر کے لیے ایک تمہید کے طور پر آ گیا ہے تاکہ تقدیر کی کتابت کی نشان دہی ہو سکے۔ اس لیے اس کو پورے طور پر علم تشریح کے ساتھ منطبق کرنا قطعاً غیر ضروری ہے۔ نطفہ اور علقہ اور مضغہ کی تینوں حالتیں بلاشبہ ہر جنین کے لیے ضروری ہیں اب ان کی درمیانی ترقیات کیا کیا ہوتی ہیں نہ ان کا یہاں ذکر ہے اور نہ چالیس دن کی مدت جیسا کہ آئندہ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں آرہی ہے وہ پوری تحدید ہے۔ صحیح مسلم میں اس روایت کے الفاظ میں راویوں کی جانب سے کچھ اور اختلاف بھی ملتا ہے۔ ادھر اطباء نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی ان کی آراء کے اختلاف کے سوا خود جنین کے اختلاف سے بھی مختلف حالتیں ہو جاتی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ جب تک نطفہ میں مکمل تغیر نہیں ہوتا اس کو یہاں نطفہ ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر جب اس میں معمولی سا انجماد ہو جاتا ہے اس کو علقہ سے ادا کیا گیا ہے جب اس سے زیادہ انجماد ہو جاتا ہے تو اس کو مضغہ کہا گیا ہے خواہ اس میں ہڈیاں بھی نمایاں ہو چکی ہوں پھر جس طرح کہ دنیا میں گٹھلی لگا کر باغبان جانتا ہے کہ کتنے کتنے دنوں میں اس میں کیا کیا تغیرات ہوتے ہیں پھر زمین اور پانی کی موافقت کے لحاظ سے کہاں کہاں درخت عمدہ اور کہاں کہاں خراب پیدا ہوتا ہے اسی طریقہ پر وہ فرشتے جو رحم مادر پر موکل و مقرر ہیں حق تعالیٰ کی جانب سے اس کے احوال کو جانتے پہچانتے ہیں۔

(۹۰۱) \* انسانی عاقبت نااندیشی کی بھی انتہاء ہے کہ جس مسئلہ میں گفتگو کرنے کی عاقبت معلوم ہو چکی ہو اس میں بھی ممانعت کے باوجود وہ الجھنے سے باز نہیں آتا۔ یہاں ممانعت اس لیے نہیں کہ درحقیقت یہاں کچھ پانی مرتا ہے بلکہ دریا میں جہاں پانی زیادہ گہرا اور خطرناک ہوتا ہے وہاں ہر شفیق ناآموزوں کو تیراکی سے روکا ہی کرتا ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تو اس تاقتن کہ جاہا سپر باید انداختن

انسانی تفتیش کی اس طبعی حرص کو ختم کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت ہی نہ تھی کہ آپ کے چہرہ مبارک پر آثار غضب نمایاں ہوں اور بس یہ دیکھتے ہی مخاطبین کے قلوب اس بحث سے ایسے متنفر ہو جائیں کہ دلوں میں کبھی اس کا خطرہ بھی نہ گذر سکے۔ سبحان اللہ یہ غصہ بھی کیسی شانِ رحمت لیے ہوئے تھا۔



بحث کر رہے تھے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا غصہ آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک مارے غصہ کے سرخ ہو گیا یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخساروں میں انار کا عرق نچوڑ دیا گیا ہے۔ فرمایا کیا تم کو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے یا میں اسی بات کے لیے تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں خوب یاد رکھو تم سے پہلی امتوں نے جب اس بارے میں جھگڑے نکالے تو وہ برباد کر دی گئیں اس لیے میں تم کو تاکید کرتا ہوں کہ تم ہرگز اس بارے میں بحث و تمحیص نہ کرنا۔

(ترمذی شریف)

قضاء و قدر میں گفتگو کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے

(۹۰۲) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ جس شخص نے تقدیر کے مسئلہ میں ذرا بھی زبان ہلائی قیامت میں اس کی اُس سے باز پرس کی جائے گی اور جس نے کوئی گفتگو نہیں کی اس سے کوئی باز پرس بھی نہ ہوگی۔ (ابن ماجہ)

(رواہ ابن ماجہ قال الہیثمی اسنادہ ضعیف لاتفاقہم علی ضعف یحییٰ بن عثمان قال فیہ ابن معین و البخاری و ابن حبان منکر الحدیث زاد ابن حبان لا يجوز الاحتجاج به و یحییٰ بن عبد اللہ بن ابی ملیکۃ قال ابن فی الثقات یعتبر بحدیثہ اذا روی عنہ غیر یحییٰ بن عثمان)

(۹۰۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آخِرَ الْكَلَامِ فِي الْقَدَرِ لَشِرَارِ أُمَّتِي فِي آخِرِ الزَّمَانِ. (رواہ الطبرانی و الحاکم)

(۹۰۳) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ تقدیر کے بارے میں جھگڑے کرنا میری امت کے بدترین افراد کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے یہ قیامت کے قرب میں ہوں گے۔ (طبرانی - حاکم)

(۹۰۲) \* قضاء و قدر کا مسئلہ ایسا دقیق مسئلہ ہے کہ اس میں جھگڑا تو درکنار گفتگو کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے باریک مسائل میں جہاں گفتگو کی وہیں کوئی نہ کوئی پہلو بحث و جدل کا نکلا اور جہاں بحث و جدل کا پہلو نکلا بس انکارِ قدر کے امکانات پیدا ہوئے جس گفتگو کی انتہاء یہ ہو شریعت اس کی ابتداء سے بھی روکتی ہے، لیکن اگر ہزار ممانعت کے باوجود گفتگو شروع ہو ہی جائے اور انفرادی انکار سے نکل کر معاملہ کی نوعیت اجتماعی بننے لگے تو اب اثباتِ قدر کے لیے گفتگو کرنا شاید مذموم گفتگو نہ رہے گی، لیکن یہ اجازت ایک دوسرے پہلو سے پیدا ہوگی۔ خطرہ کی بات بہر حال خطرہ ہی کی ہے۔ امارت اور قضاء کے بڑے فضائل ہیں اگر ان کے حقوق کی ادائیگی کی جائے مگر ہیں پھر دونوں مناصب خطرہ ہی کے۔ اس لیے سلف تا امکان ان سے بچا ہی کرتے تھے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خطرہ کی بات کرتے ہی کیوں ہو کہ جواب دہی کی نوبت آئے۔

(۹۰۴) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ أَمْرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ مُرَاصِرًا أَوْ قَالَ مُقَارِبًا مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوا فِي الْوِلْدَانِ وَالْقَدَرِ. (قال الحاكم على شرط الشيخين و اقره الذهبي)

يجب الرضاء بالقضاء و هو علامة لسعادة الانسان

(۹۰۵) عَنْ سَعْدِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَعَادَةِ ابْنِ آدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللَّهُ وَ مِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ آدَمَ تَرْكُهُ اسْتِخَارَةَ اللَّهِ وَ مِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ آدَمَ سَخَطُهُ بِمَا قَضَى اللَّهُ. (رواه الترمذی قال هذا حديث غريب)

(۹۰۴) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت کے معاملات درست رہیں گے جب تک کہ وہ دو مسئلوں میں گفتگو نہ کریں۔ ایک وفات شدہ بچوں کی نجات و عدم نجات کے متعلق دوم تقدیر کے معاملہ میں۔ (متدرک)

قضاء و قدر کے فیصلہ پر رضامندی ضروری ہے اور یہ انسان کی بڑی سعادت کی علامت ہے

(۹۰۵) سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تقدیر کے فیصلہ پر راضی ہو جانا آدمی کی سعادت کی دلیل ہے اور اس کی بدبختی کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ نیکی کی توفیق مانگنا چھوڑ دے اور تقدیر کے فیصلہ پر ناراض ہونا تو اس کی انتہائی بدبختی کا ثبوت ہے۔ (ترمذی شریف)

(۹۰۴) \* صاحب شریعت یہ چاہتے ہیں کہ امت اپنی حد استطاعت تک صرف عمل کرنے کی سعی میں لگی رہے۔ دقیق امور میں بحث کرنے سے صرف دماغی انتشار پیدا ہوتا ہے اور اس دماغی انتشار سے مذہب کا شیرازہ بھی منتشر ہونے لگتا ہے۔ وحی کے علوم دماغی مشاقی سے مستغنی ہوتے ہیں اس لیے ان کو جتنا بتا دیا جائے بس اس پر ایمان لے آنا چاہیے اور آئندہ عملی قدم اٹھائے چلا جانا چاہیے۔ راہ سلامتی یہ ہے اس کے سوا ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ پھر جن مسائل سے ہمارے عمل کا تعلق ہے ان کا صاف صاف فیصلہ کیا جا چکا ہے اور اگر ان میں اختلاف ہے بھی تو ہر صورت میں اجر کا وعدہ موجود ہے۔ رہے وہ معاملات جو ہمارے عمل سے متعلق نہیں ہیں ان کا تذکرہ بھی گو کافی حد تک مل جاتا ہے مگر کسی بدیہی چیز کا قبل از وقت معرض بحث میں لانا چونکہ کبھی بے وجہ الجھاؤ کا باعث بھی بن جاتا ہے اس لیے ان کی اتنی تفصیلات جتنی کہ انسان کا نفس بے وجہ کرنا چاہتا ہے نہیں ملتیں اور ان کو اپنے وقت پر چھوڑ دیا جاتا ہے قیامت میں یہ دونوں مسئلے بدیہی ہو کر آنکھوں کے سامنے آجائیں گے پھر ابھی سے اس کے درپے ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن یہ انسان کی فطرت ہے کہ جتنا اس کو منع کیجئے تحقیقات کے لیے وہ اتنا ہی اور بے چین ہوتا ہے حالانکہ وہ نہیں سمجھتا کہ بعض مرتبہ اگر مسئلہ کی تفصیلات اس کی خاطر سب سامنے کر دی جائیں تو اس کے لیے شاید اس سے بڑھ کر کسی اور مصیبت کا باعث ہو جائے۔

(۹۰۵) \* حضرت شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ ابتداء حدیث میں جب خدا تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر رضامندی کی تاکید آئی تو کسی کے دل میں یہ وہم گزر سکتا تھا کہ پھر اگر انسان سے معصیت ہو جائے تو اس پر بھی اس کو راضی ہونا چاہیے۔ اس لیے فرمایا کہ انسان کے لیے جہاں یہ ضروری ہے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ خیر اور اس کی مرضیات ہی کی توفیق مانگا کر رہے۔ اگر اس نے یہ دعاء چھوڑ دی تو یہ اس کی بدبختی کی نشانی سمجھنی چاہیے۔ علماء نے لکھا ہے کہ قضاء اور فیصلہ خداوندی تو اس کا حکم ہے اس لیے اس پر تو رضامندی ضروری للہ.....



(۹۰۶) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ عَظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عَظَمِ الْبَلَاءِ وَإِنَّ اللَّهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَاءُ وَمَنْ سَخَطَ فَلَهُ السَّخَطُ.

(۹۰۶) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جتنی آزمائش سخت ہوتی ہے اس کا بدلہ بھی اتنا ہی بڑا ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب وہ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اس کو ضرور آزمائش میں بھی ڈالتا ہے پھر جو اس پر راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتا ہے اور جو ناراض ہوا وہ بھی اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

(۹۰۷) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الطَّاعُونَ فَأَخْبَرَنِي أَنَّهُ عَذَابٌ يُعْطَاهُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ وَأَنَّ اللَّهَ جَعَلَهُ رَحْمَةً لِلْمُؤْمِنِينَ لَيْسَ مِنْ

(۹۰۷) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے متعلق پوچھا آپؐ نے بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے جس پر چاہے نازل فرمائے لیکن مؤمنوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے اس کو رحمت بنا دیا ہے۔ لہذا جو شخص بھی طاعون میں مبتلا ہو اور یہ یقین رکھتا ہو کہ جو

اللہ..... ہے لیکن اگر وہ چیز خود قبیح ہے تو اس پر نارضائی ضروری ہے۔ کافر کا کفر بھی ایزدی تقدیر سے ہوتا ہے پس اس کا حکم تو پر حکمت ہونے کی وجہ سے بہتر ہی کہا جائے گا گو یہ خود قبیح ہو۔ دیکھو خود بیت الخلاء کیسی گندی چیز ہے مگر کسی مکان کے لیے اس کا بنانا بھی ضروری ہے اور یہ کمال ہے۔

(۹۰۶) \* بات یہ ہے کہ امتحان کے بغیر کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ کہیں بھی نہیں ہوتا۔ قدرت چاہتی ہے کہ روزِ محشر جب اپنی مخلوق کو انعام تقسیم فرمائے تو اس کا معیار صرف اپنے علم ازلی پر نہ رکھے بلکہ انصاف و عدالت کے دن ایسا معیار مقرر کر دے جس کا مشاہدہ ہماری آنکھیں بھی کر سکیں وہ چاہتی ہے کہ جن شرکاء اُحد کو انعامِ شہادت دے تو اس طرح دے کہ ان کے جسم زخموں سے چور ہوں لیکن اس خشکی میں بھی لبوں پر مسرت کی مسکراہٹ نظر آئے اور جن منافقین کو جہنم میں داخل فرمائے تو اس طرح کہ بروقت رسول سے دغا بازی کا ٹیکہ اُن کی پیشانی پر لگا ہوا ہو۔

(۹۰۷) \* طاعون جیسا تکلیف دہ مرض دنیا میں اپنے اسباب سے ہی آتا ہے مگر دنیا آج تک اس نکتہ سے غافل تھی کہ اس بیماری کے آنے کا مقصد کیا ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انکشاف فرمایا کہ یہ بیماری ظاہر تو ہوئی تھی ایک قوم کے عذاب کے لیے لیکن میری امت کے حق میں رحمت بنا دی گئی ہے لیکن اس کی چند شرائط بھی رکھی گئی ہیں۔ یہ کہ جب اس کے شہر میں طاعون آئے تو ڈر کر وہاں سے بھاگ نہ جائے یہ مسلمان کی پختگی اور تقدیر پر اعتماد کے خلاف ہے یہ کہ شہر میں رہنا بھی ہو تو صابر بن کر ہو کسی مجبوری سے نہ ہو۔ یہ کہ اس میں ثواب کی نیت اور شامل کر لے اور یہ کہ اس کے اس عقیدہ میں کوئی تزلزل بھی نہ آنے پائے بس یہ یقین رکھے کہ جو اللہ تعالیٰ میرے مقدر میں لکھ چکا ہے نہ اس کے خلاف وقوع پذیر ہو سکتا ہے اور نہ اس سے رست گاری ممکن ہے۔ اگر ان شرائط کی ادائیگی کے بعد تقدیری طور پر اس کی موت آگئی تو اس کو ایک شہید کا ثواب ملتا ہے۔ ذیل کی روایت سے اس کی مزید تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں ”کہ عام طور پر مرنے والوں اور شہیدوں کے مابین اللہ.....

أَحَدٍ يَقَعُ الطَّاعُونَ فَيَمُوتُ فِي بَلَدِهِ صَابِرًا  
مُحْتَسِبًا يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا يُصِيبُهُ إِلَّا مَا كَتَبَهُ اللَّهُ لَهُ  
إِلَّا كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ شَهِيدٍ. (رواه البخاری)

(۹۰۸) عَنْ أَنَسٍ قَالَ خَدَمْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا ابْنُ ثَمَانَ سِنِينَ خَدَمْتُهُ عَشَرَ  
سِنِينَ فَلَمَّا لَا مَنِيَّ عَلَيَّ شَيْءٍ قَطُّ أَتَى فِيهِ عَلِيٌّ  
يَدِي فَإِنْ لَا مَنِيَّ لَأَتِمَّ مِنْ أَهْلِهِ قَالَ دَعُوهُ فَإِنَّهُ لَوْ  
قُضِيَ شَيْءٌ كَانَ شَيْءٌ. (هذا اللفظ المصاحیح و

رواه البيهقي في شعب الإيمان مع تغيير يسير)

کچھ اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے اس کے سوا اس کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ  
سکتی، پھر صبر کے ساتھ ثواب کی امید میں اسی شہر میں پڑا رہے (اور اس کو  
موت آ جائے) تو اس کو شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔

(۹۰۸) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے آٹھ سال کی  
عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت شروع کی اور دس سال تک  
خدمت کی ہے اس عرصہ میں جب کبھی میرے ہاتھ سے کوئی نقصان ہو گیا تو  
مجھے آپ نے اس پر کبھی ملامت نہیں فرمائی، اگر گھر والوں میں سے کبھی کسی  
نے کچھ کہا بھی تو آپ نے فرما دیا رہنے دو کچھ نہ کہو اگر مقدر یوں ہوتا (یعنی  
نقصان نہ ہونا) تو یونہی ہو جاتا۔ (مصالح - بیہقی)

للہ ..... ان مردوں کے معاملہ میں جھگڑا ہوتا ہے جن کا انتقال مرض طاعون میں ہوتا ہے۔ شہداء تو یہ کہتے ہیں پروردگار جیسا ہم قتل کیے  
گئے یہ بھی اسی طرح قتل کیے گئے ہیں، لہذا یہ ہمارے بھائی ہوئے ان کا شہیدوں میں شمار ہونا چاہیے اور عام مردے کہیں گے کہ ان کی موت  
بستر پر آئی ہے جس طرح ہماری موت اس لیے یہ ہمارے بھائی ہیں۔ پروردگار کا ارشاد ہو گا اچھا ان کے زخم کی شکل دیکھو اگر وہ شہیدوں کے  
زخموں کے مشابہ ہوں تو ان کا شمار بھی ان میں ہو گا اور یہ ان ہے کہ ساتھ رہیں گے جب اس کی تحقیق کی جائے گی تو ان کے زخم شہیدوں کے  
مشابہ ملیں گے اس لیے فیصلہ شہداء کے حق میں ہو جائے گا۔“ (احمد و نسائی) اس روایت سے اوپر کی حدیث کی پوری وضاحت ہو گئی اور شہید  
کے اجر ملنے کی تفصیل بھی معلوم ہو گئی، اور یہ بھی کہ اسباب و مسببات کے اثرات اس عالم سے گزر کر بھی شاید دوسرے عالم میں بھی ظاہر  
ہوتے چلے جاتے ہیں وہاں بھی شہادت کا ثواب دینے کے لیے اسباب و علل کا ایک نقشہ جمایا گیا اس میں بحث و تمحیص ہوئی پھر جس جانب  
پلہ بھاری دیکھا گیا اس جانب فیصلہ صادر کر دیا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر شہید کا اجر ملے تو پہلے شہید کا سائل ہونا چاہیے اگر وہ نہ ہو تو اس عمل کا  
کوئی اثر ہونا چاہیے۔ شہید بھی بڑے دشوار گزار موقع پر صبر کر کے محض رضاء الہی کی خاطر جان قربان کرتا ہے، طاعون کا مریض بھی بظاہر اپنی  
جان کو معرض خطر میں ڈال کر صرف رضاء الہی کے لیے وہیں جان دیتا ہے۔ جنگ میں میدان قتال اور طاعون میں وباء زدہ علاقے موت کی  
گرما گرمی کے یکساں سے بازار نظر آتے ہیں رحمت بھی اس مشابہت کی رعایت کر لیتی ہے۔ جب ایک ہی بیماری تو مومنوں کے اختلاف سے  
ثواب و عذاب کی دو متضاد شکل اختیار کر سکتی ہے تو ایک ہی عمل خالق و مخلوق کے فرق سے حسن اور قبیح کیوں نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو فرق بھی  
واضح ہے کہ جو خدا کا فعل ہے وہ اور ہے اور جو بندہ کی صفت ہے وہ دوسری چیز ہے۔ جس پر قبیح ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے وہ خالق کی صفت ہی  
نہیں ہے اور جس کو حسن کہا جاتا ہے وہ بندہ کی صفت نہیں بلکہ ایک ہی چیز کا وہ تعلق جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے یعنی اس کا پیدا کرنا یہ  
حسن ہے اور وہ تعلق جو بندہ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اس کے ساتھ قائم ہو جانا یہ بعض جگہ قبیح کا حکم اختیار کر لیتا ہے۔

(۹۰۸) \* دیکھنے میں تو یہ ایک معمولی سی بات ہی معلوم ہوتی ہے لیکن غور کیجئے گا تو آپ کو رضاء بقضاء کا ایک کرشمہ ہی معلوم ہو گا کہ اول تو  
دس سال کی طویل زندگی پھر نہ معلوم اس میں کتنی بار اس قسم کے واقعات پیش آئے ہوں گے۔ ان تمام واقعات میں بلا استثناء اس طرح  
راضی بقضاء رہنا کیا یہ کسی معمولی انسان کی استقامت ہو سکتی ہے بلاشبہ یہ کمال صرف اس شخصیت ہی کا ہو سکتا تھا جس کی نظروں للہ .....



5

(۹۰۹) عَنْ أُسَامَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ جَاءَهُ رَسُولُ أَحَدَى بَنَاتِهِ وَعِنْدَهُ سَعْدٌ وَ أَبِي بَنُ كَعْبٍ وَ مُعَاذٌ أَنَّ ابْنَهَا يَجُودُ بِنَفْسِهِ فَبَعَثَ إِلَيْهَا لِلَّهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أُعْطِيَ كُلُّ بِأَجَلٍ فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ.

(۹۰۹) اسامہ بیان کرتے ہیں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ دفعۃً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صاحبزادی کی طرف سے قاصد آیا اس وقت حضرت سعدؓ اور ابی ابن کعبؓ اور معاذ بھی آپ کی مجلس میں حاضر تھے پیغام یہ تھا کہ ان کا لخت جگر سفر آخرت کے لیے تیار ہے۔ آپ نے کہا ابھیجا کہ جو دیا تھا وہ بھی اسی کا تھا اور جو لیا ہے وہ اسی کی ملک ہے اور ہر چیز کی ایک مدت مقرر ہو چکی ہے۔ لہذا صبر کرنا چاہیے اور اس میں

ثواب کی نیت رکھتی چاہیے۔ (بخاری شریف)

یہ اعتقاد رکھنا کہ فرمان برداروں کو دوزخ میں ڈال دینا یا نافرمانوں کو جنت بخش دینا مختارِ کل کی بارگاہ میں دونوں باتیں انصاف ہیں مسئلہ قدر کی جان ہیں

(۹۱۰) ابْنُ دَلِيمٍ بَيَانُ كَرْتِهِ فِي مِثْلِ ابْنِ كَعْبٍ كِي خِدْمَتِ فِي حَاضِرِ

(۹۱۰) عَنْ ابْنِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ أَتَيْتُ أَبِي بَنَ

اللہ ..... کے سامنے عالم غیب عالم شہادت سے پہلے مستحضر رہا کرتا ہو اور وہ تو کیا جو شخص بھی ایمان کے ساتھ اس کی محفل میں بیٹھ گیا اس کا سینہ بھی اس معرفت سے لبریز ہو گیا۔ یہاں معمولی نقصانات کا تذکرہ ہی کیا ہے آپ کے لخت جگر کا انتقال ہوتا ہے وہاں بھی عین حالت اضطراب میں زبان سے ایسے نپے تلے کلمات نکلتے ہیں جو ایک طرف ضعیف امت کے لیے اسوہ بن سکیں اور دوسری طرف رضاء بقضاء کا مرقع ہوں آنکھیں اشکبار ہیں مگر آپ درد بھری آواز سے جو فقرے فرما رہے ہیں وہ یہ ہیں: وَ لَا نَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضَى بِهِ رَبُّنَا۔ یعنی ان صبر آزما حالات میں بھی زبان سے بجز ان کلمات کے جو رضاء الہی کا موجب ہوں ایک کلمہ نہیں نکل سکتا۔

(۹۰۹) \* انتہائی اضطراب اور صبر شکن مقام میں اطمینان و سکون پیدا کرنے کے لیے ان جامع اور مختصر کلمات سے زیادہ مؤثر اور کلمات نہیں ہو سکتے یہاں سب سے اہم اور سب سے پہلا جو تصور ذہن نشین کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہے اور مالک کے کسی فعل پر نارضائی کا کسی کو حق ہی نہیں پس اگر کسی کی اولاد اس نے لے لی ہے تو یہ دی کس نے تھی۔ دوم یہاں اس کی بھی یاد دہانی کی گئی ہے کہ تقدیر میں ہر چیز کی ایک مدت معین کی جا چکی ہے لہذا جو چیز دی جاتی ہے اتنی ہی معین مدت کے لیے دی جاتی ہے پس اگر ایک مقرر وقت کے لیے دی ہوئی چیز اپنے وقت مقرر پر لے لی جائے تو اس میں بے صبری کی وجہ کیا۔ یہ تو ایک علمی درس ہوا۔ اب عملاً یہ ضروری ہے کہ صبر کیا جائے اور اس صبر میں ثواب کی نیت بھی کی جائے تاکہ ثواب اور زیادہ حاصل ہو۔ یہ نکتہ یاد رکھیے کہ مصیبت میں صبر کا اجر تو ملتا ہی ہے لیکن اگر اس میں ثواب کی نیت تفصیلی طور پر بھی ہو تو اس کا ثواب اور بڑھ جاتا ہے۔ احتساب کا لفظ اسی نکتہ پر تنبیہ کے لیے آتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایمان بالتقدیر انسان کے لیے کتنی قوت کا باعث ہے اور زندگی کے ہر گوشہ میں کس طرح کارآمد ہے۔

(۹۱۰) \* مسئلہ تقدیر میں گفتگو کی تان جس جگہ جا کر ٹوٹتی ہے وہ یہی باب مجازۃ ہے یعنی انسانی جزاء و سزا کا مسئلہ۔ اس لیے صحابی نے

یہاں اسی دھتکتی رگ کو پکڑ لیا ہے اور اپنے کلام کا آغاز ہی یہیں سے فرمایا ہے۔ اللہ.....

کَعْبٍ فَقُلْتُ لَهُ قَدْ وَقَعَ فِي نَفْسِي شَيْءٌ مِنَ الْقَدْرِ فَحَدِّثْنِي لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يُذْهِبَهُ مِنْ قَلْبِي فَقَالَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ عَذَّبَ أَهْلَ سَمَوَاتِهِ وَ أَهْلَ أَرْضِهِ عَذَابَهُمْ وَ هُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ وَ لَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ أَعْمَالِهِمْ وَ لَوْ أَنْفَقْتُ مِثْلَ أَحَدِ ذَهَبًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ مَا قَبِلَهُ اللَّهُ مِنْكَ حَتَّى تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ وَ تَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطَاكَ وَ أَنَّ مَا أَخْطَاكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ وَ لَوْ مُتَّ عَلَى

ہوا اور میں نے عرض کی تقدیر کے متعلق میرے دل میں کچھ شبہات پڑ گئے ہیں لہذا آپ کچھ فرمائیے شاید اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے قلب سے ان کا ازالہ فرمادے۔ انہوں نے فرمایا (سنو) اگر اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کی تمام مخلوق کو عذاب میں ڈال دے تو بھی اس کو ظالم نہیں کہا جاسکتا اور اگر سب پر رحم فرمادے تو اس میں کسی کا استحقاق نہیں اس کی رحمت ان کے اعمال سے کہیں بڑھ کر ہوگی (سنو) جب تک تم تقدیر پر یقین نہ کرو اور اس کا یقین نہ رکھو کہ جو کچھ تم کو پہنچ گیا ناممکن تھا کہ نہ پہنچتا اور جو نہیں پہنچا یہ بھی غیر ممکن تھا کہ تم کو پہنچ جاتا اس وقت تک اگر تم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی خیرات کر ڈالو جب بھی وہ تم سے قبول نہ فرمائے گا۔ اور

اللہ ..... حافظ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں کہ دنیوی حوادث میں انسانوں کے مختلف حالات ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کا مالک ہے اس کو ہر امر پر پوری پوری قدرت حاصل ہے اور وہ جو ارادہ فرماتا ہے کرتا ہے لہذا یونہی اس کی مشیت ہوگی یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو اس کو قادر اور مالک ہونے کے ساتھ منعم اور مہربان بھی سمجھتا ہے مگر خاص اپنے اس معاملہ میں اس کی کسی نعمت کا ادراک نہیں کرتا۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جس کا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا مہربان ہے کہ جو بھی کرتا ہے وہ مؤمن کے حق میں خیر ہی خیر ہوتا ہے اس لیے اس کو تلخ سے تلخ حوادث میں بھی نعمت ہی نعمت کا کیف حاصل ہوتا رہتا ہے۔ چوتھا وہ ہے جس کی نظر مرتبہ صفات سے گزر کر ذات قدسی صفات پر جا پہنچی ہے وہ سمجھتا ہے کہ ذات باری خود مستحق عبادت ہے اور اس کے احسان و انعام سے قطع نظر وہ جو بھی کرے اس کو بہر کیف اس کا حق حاصل ہے وہ ہر حالت میں لائق ستائش ہی ہے کیونکہ وہ علیم ہے رحیم ہے اور حکیم ہے جو بھی کرتا ہے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ پس وہی اس کا مستحق ہے کہ اسی سے محبت کی جائے اس کی عبادت کی جائے اور اس کی حمد و ثناء کی جائے۔ اس شخص کی حمد و ثناء براہ راست ذات باری تعالیٰ کی ہوتی ہے گو اس کو صفات کا علم ہوتا ہے مگر وہ ان صفات کو بھی ذات باری تعالیٰ کا ایک کمال سمجھتا ہے اور اس کی حمد و ثناء ان صفات کے استحضار کے ساتھ نہیں بلکہ براہ راست ذات منبع صفات کی کرتا ہے۔

پہلا طبقہ صابریں کا ہے دوسرا راضی بقضاء کا، مگر غیر شا کر کا، تیسرا راضی بقضاء کا جو شا کر بھی ہے۔ اور چوتھا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کو احادیث میں ”متمادون“ کا لقب دیا گیا ہے اور جن کے حق میں یہ بشارت ہے کہ جنت کی طرف سب سے پہلی آواز ان ہی کو دی جائے گی۔ دوسرے اور تیسرے طبقہ کی معرفت جس نے صرف خدا تعالیٰ کی ربوبیت، مشیت اور قدرت کو پہچانا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کے انعام و احسان کو بھی پہچان لیا ہے ناقص معرفت ہے۔ جہمیہ اور جبریہ تو صرف پہلی قسم کی معرفت رکھتے ہیں قدریہ معتزلہ دوسری قسم کی اور تمام معرفت وہ اہل علم ہیں جو ذات باری کو صفات سے قطع نظر بھی ہر حالت میں موجب حمد و ثناء سمجھتے ہیں ان کی نظر صرف حکم حاکم کی طرف رہتی ہے نہ کسی مطیع کی اطاعت اور نہ کسی عاصی کی معصیت کی طرف لہذا اگر وہ مطیع کو دوزخ میں داخل فرمادے یا عاصی کو جنت میں دونوں حالتوں میں وہ عادل منصف اور حکیم ہی رہے گا۔ ﴿لَا يَسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْأَلُونَ﴾ (تفسیر سورہ اخلاص ص ۱۶۷ مع تہذیب و ترتیب) اللہ .....



غَيْرِ هَذَا لَدْخَلَتِ النَّارَ قَالَ ثُمَّ أَتَيْتُ عَبْدَ اللَّهِ  
 بَنَ مَسْعُودٍ فَقَالَ مِثْلَ ذَلِكَ قَالَ ثُمَّ أَتَيْتُ  
 حُذَيْفَةَ الْيَمَانِ فَقَالَ مِثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ أَتَيْتُ  
 زَيْدَ بَنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِي عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ ذَلِكَ. (رواه احمد)  
 ابوداؤد و ابن ماجه و الحاکم فی صحیحہ

اگر اس عقیدہ کے سوا کسی دوسرے عقیدہ پر مرو گے تو یاد رکھو دوزخ میں جاؤ  
 گے۔ ابن ویلی کہتے ہیں اس کے بعد میں عبد اللہ بن مسعود کی خدمت میں  
 حاضر ہوا تو انہوں نے بھی یونہی فرمایا پھر میں حذیفہ بن یمان کے پاس پہنچا  
 تو انہوں نے بھی یونہی فرمایا اور پھر زید بن ثابت کی خدمت میں حاضر ہوا تو  
 انہوں نے یہ مضمون خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نقل فرمایا۔  
 (احمد - ابوداؤد - حاکم - ابن ماجہ)

للہ ..... حافظ ابن تیمیہ کی اس تفصیل کے بعد آپ اس صحابی کے جواب کی بلندی ٹھیک ٹھیک سمجھ سکتے ہیں۔ جبر و قدر کے مسئلہ میں جو  
 شکوک پیدا ہو سکتے ہیں وہ درحقیقت اس معرفت سے محرومی کا ثمرہ ہیں اگر انسان کو ذات باری کے کمال کا اندازہ ہو جائے تو شبہات کی  
 ساری دنیا خود بخود نیست و نابود ہو جائے۔ جب تک اس کمال خداوندی کا استخراج حاصل نہ ہو شکوک ختم نہیں ہو سکتے یہ استخراج ہر ایک کے  
 لیے مشکل مرحلہ ہے اس لیے صاحب شریعت نے بجائے جواب و سوال کرنے کے اس مسئلہ میں گفتگو ہی کی ممانعت فرمادی ہے۔ آپ اس  
 سارے بیان کو ایک بار پھر پڑھ جائیے جو اس موضوع کے متعلق ہم نے ان صفحات میں مختلف عنوانات سے پھیلا یا ہے۔ آپ کو لوٹ پلٹ کر  
 پھر اسی نقطہ پر آنا پڑے گا جس کی اس صحابی نے اپنی پہلی مختصر تقریر میں رہبری کی ہے۔ قضاء و قدر ایک غیبی حقیقت ہے اور جب تک کہ انسان  
 حقائق غیبیہ تسلیم نہ کر لے اس مسئلہ میں اس سے گفتگو لا حاصل ہے۔ دیکھئے یہاں صحابی نے قضاء و قدر کے معاملہ میں جس تقریر کی تمنا ظاہر کی  
 ہے اس سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف دلائل سننا نہیں چاہتا بلکہ وہ طریقہ چاہتا ہے جس سے قلب کو شفا ہو جائے اور ایک ایسا باطنی نور پیدا  
 ہو کہ شبہات کی کھٹک ہی سینہ سے نکل جائے۔ اسی لیے جواب میں بھی صرف ایسا پہلو اختیار کیا گیا ہے جس کو سن کر ایک خدا پرست کی دل پر  
 الہی قدرت و سطوت کا ایسا اثر پڑنا ضروری ہے کہ پھر شبہات خود بخود ختم ہو جائیں۔ اگر دل اپنی گہرائیوں میں اس عقیدت سے خالی ہے  
 (والعیاذ باللہ) تو پھر اس ضعیف الایمان کے لیے یہ جواب بھلا کب شافی ہو سکتا ہے۔ یہ تصور جواب کا نہیں بلکہ خود اسی کا ہے یا مصرف  
 القلوب صرف قلوبنا الی طاعتک و معرفتک۔

اصولی بات تو اتنی تفصیل کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن پورے طور پر یہ سمجھنے کے لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ سب کو عذاب دے تو بھی اس کو ظالم کیوں  
 نہیں کہہ سکتے۔ ضروری ہے کہ آپ عدل و ظلم کے معنی سمجھ لیں۔ تو سنیے عدل ہر اس تصرف کو کہتے ہیں جو اپنی ملکیت میں ہوتا ہے اور ظلم کہتے ہیں کسی  
 کے حق دبا لینے کو۔ اب سوچئے کہ زمین و آسمان میں ایسا کون ہے جس کو ثواب دینا حق تعالیٰ پر لازم اور ضروری حق ہو پس اگر یہ حق کسی کا بھی  
 نہیں تو اگر کسی کو بھی جنت عطا نہ فرمائے تو یہ ظلم کیوں ہو بلکہ چونکہ یہ تصرف اپنی ہی ملک میں ہوگا اس لیے اس کو عین عدل کہا جائے گا اور فضل  
 یہ ہے کہ جو کسی کا حق نہ ہو اس کو محض اپنے کرم سے عطا کر دینا لہذا اگر وہ سب کو ثواب عطا فرمادے تو یہ اس کا فضل ہی فضل ہوگا۔ فضل کے  
 متعلق یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا کہ فلاں شخص پر کیوں کیا اور فلاں پر کیوں نہیں کیا یہ تو مالک اور حکیم کی اپنی مرضی کی بات ہوتی ہے جس پر چاہے  
 کرے جس پر نہ چاہے نہ کرے پھر حکمت والا ہی یہ خوب جانتا ہے کہ کس کو اس نے فضل کا محل بنایا ہے اور کس کو اس کا محل نہیں بنایا۔ قرآن  
 کریم میں ارشاد ہے ﴿وَإِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ﴾ (الحديد: ۲۹) دوسری جگہ جب مشرکین نے سوال کیا تھا ﴿قَالُوا أَهَؤُلَاءِ مَنْ  
 اللَّهُ عَلَيْهِمْ مَنْ بَيْنَا﴾ (الانعام: ۵۳) کافر کہتے ہیں اچھا ہم سب میں بس یہ مسلمان ہی رہ گئے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا ہے۔ للہ .....

بندے اپنے افعال میں مختار ہیں مگر ان کے اس اختیار سے  
کرایا وہی جاتا ہے جو پہلے مقدر ہو چکا ہے اس  
لیے وہ مجبور بھی ہیں

العباد مختارون فی افعالهم و هم  
مسوفون الها و مہیاؤن بہ للقدر  
السابق فہم مجبورون ایضاً

(۹۱۱) مسلم بن یسار جہنی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
سے ایک مرتبہ اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی وَ اِذَا اخَذَ رَبُّكَ  
نَفْسًا مِّنْ بَنِي اٰدَمَ مِنْ ظُھُورِھُمْ ذُرِّیَّتَھُمْ  
فَقَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ  
وَسَلَّمَ سِئْلَ عَنْہَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ  
ثُمَّ مَسَحَ ظُھْرَہُ بِیَمِیْنِہِ فَاَسْتَخْرَجَ مِنْہُ ذُرِّیَّةً  
فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَ یَعْمَلُ اَھْلُ  
الْجَنَّةِ یَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظُھْرَہُ فَاَسْتَخْرَجَ

(۹۱۱) مسلم بن یسار جہنی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
سے ایک مرتبہ اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی وَ اِذَا اخَذَ رَبُّكَ  
نَفْسًا مِّنْ بَنِي اٰدَمَ مِنْ ظُھُورِھُمْ ذُرِّیَّتَھُمْ  
فَقَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ  
وَسَلَّمَ سِئْلَ عَنْہَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ  
ثُمَّ مَسَحَ ظُھْرَہُ بِیَمِیْنِہِ فَاَسْتَخْرَجَ مِنْہُ ذُرِّیَّةً  
فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَ یَعْمَلُ اَھْلُ  
الْجَنَّةِ یَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظُھْرَہُ فَاَسْتَخْرَجَ

للہ ..... تو ان کے جواب میں ارشاد ہوا ﴿اَلَيْسَ اللّٰہُ بِاَعْلَمَ بِالشَّاكِرِیْنَ﴾ (الانعام: ۵۳) یعنی جی ہاں یہ بات ہم ہی جانتے ہیں کہ  
کون ہماری نعمتوں کا قدر دان اور شکر گزار ہوگا اور کون ناقدر اس لیے نہ بنجر زمین میں کوئی تخم پاشی کرتا ہے نہ ہم ناشکر پر اپنا فضل فرماتے ہیں۔  
(شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ۲۷۳)

(۹۱۱) \* اس حدیث میں سب سے پہلے عالم تقدیر کے فیصلہ شدہ عالم ہونے پر تنبیہ کی گئی اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ عمومی  
حالات وہاں کے فیصلہ اعمال کس نوعیت پر دائر کیے گئے ہیں پھر عمل کی نسبت بندوں کی طرف ظاہر فرما کر ان کے اختیار پر بھی تنبیہ کر دی گئی  
اور اس پر بھی کہ اختیاری اعمال پر جزاء و سزا معقول ہے لیکن چونکہ یہ سب کچھ ہو چکا تھا انسان کے عالم وجود میں آنے سے قبل ہی قبل اس  
لیے آخر کار انسان مجبور ہی ٹھہرا عجیب بات ہے کہ صحابہ کرام کو مسئلہ تقدیر میں جب کہیں شبہ ہوا ہے تو اپنے معاملہ میں ہوا ہے یعنی جب قضاء و  
قدر کا فیصلہ ہو چکا ہو تو اب ہماری عملی جدوجہد بیکار ہوگی۔ یہ شبہ کبھی نہیں ہوا کہ جب ہم مجبور ہیں تو پھر ہم کو دوزخ میں ڈالنا ظلم ہوگا، گویا شبہ  
ہے تو اپنی مجبوری کی بناء پر نہ کہ مختار کل کے اختیار پر۔ حق تعالیٰ کو خالق مالک اور مختار کل مان کر پھر تو اس پر کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی  
لیے آپ کے جواب کا رخ بھی اسی طرف رہا ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ قضاء و قدر نے تمہارا اختیار سلب نہیں کیا ہاں یہ ضروری ہوگا کہ تم  
وہی جانب اختیار کر سکو گے جو قضا و قدر کے تحت ہوگی، مگر اختیار کرو گے اپنے اختیار ہی سے ظاہر ہے کہ انسان بیک وقت کسی عمل کی دونوں  
جانبوں کو تو اختیار کر نہیں سکتا ایک ہی جانب کو بھی وہ اختیار کرے گا بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہی جانب اس کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ  
کہ تقدیر کا جبر تمہارے اختیار پر ہے تمہارے عمل پر نہیں اگر تم یہ کہو کہ عمل گو ہمارے اختیار سے صادر ہوتا ہے مگر ہمارا اختیار جب جبر کے تحت  
ہو تو بواسطہ گویا عمل بھی جبر کے تحت آ گیا تو یہ درست ہے اس لحاظ سے یقیناً تم مجبور ہو گئے مگر ایسے مجبور نہیں جو معذور ٹھہر سکو جہاں جبری عمل  
پر جزاء و سزا ظلم نہ ہو وہاں اختیاری عمل پر جزاء و سزا بھلا کیا ظلم ہو سکتا ہے۔



سے عمل کریں گے۔ اس پر ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ تو پھر اب عمل کس لیے کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو جنت کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتی شخص کے سے عمل بھی کرا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی اسی قسم کے عملوں پر ہو جاتا ہے اور آخر جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جب کسی کو دوزخ کے لیے پیدا فرماتا ہے تو اس سے عمل بھی دوزخی شخص کے کرا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی ان ہی اعمال پر ہو جاتا ہے جو دوزخی لوگوں کے عمل ہیں اور آخر وہ دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔

(رواہ مالک فی الموطا و الترمذی و ابو داؤد و قال الحاکم علی شرط مسلم و قال الحافظ ابن عبد البر ہو حدیث منقطع ثم قال هذا الحديث و ان كان عییل الانساد فان معناه قدروی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم من وجوه كثيرة عن عمر بن الخطاب وغيره و ممن روى معناه فی القدر علی بن ابی طالب و ابی بن کعب و ابن عباس و ابن عمرو ابو هريره و ابو سعید الخدری و ابو سريحة العبّاری و عبدالله بن مسعود و عبدالله بن عمرو بن العاص و ذوالنحیة الکلابی و عمران بن الحصین و عائشه و انس ابن مالک و سراقه بن جعشم و ابو موسی الاشعری و عبادة بن الصامت و زاد غيره حذیفة الیمان و زید بن ثابت و جابر بن عبدالله و حذیفة ابن اسید و ابا ذر و معاذ بن جبل و هشام بن حکیم فاحادیث القدر متواتر المعنی) - (انظر و اشفاء العییل ص ۱۰)

(۹۱۲) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ خَرَجَ إِلَى الشَّامِ حَتَّى إِذَا كَانَ بِسَرُغَ لَقِيَهُ أُمَرَاءُ الْأَجْنَادِ أَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ وَ أَصْحَابُهُ فَأَخْبَرُوهُ أَنَّ الْوَبَاءَ

(۹۱۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ شام کی طرف تشریف لے گئے جب مقام سرغ میں پہنچے تو لشکروں کے جرنیل ابو عبیدہ اور ان کے ہمراہیوں نے یہ اطلاع دی کہ ملک شام میں تو طاعون ہو رہا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا ان لوگوں کو ذرا بلاؤ جنہوں نے سب سے پہلے ہجرت کی تھی۔ ان کو بلا کر اس

(۹۱۲) \* حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہاں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے کہ جو افعال ہم کرتے ہیں اگر چہ وہ اپنے اختیار ہی سے کرتے ہیں لیکن اس اختیار کی وجہ سے قضاء و قدر کے جبر سے خارج نہیں ہو جاتے وہ رہتے ہیں پھر اسی کے نیچے نیچے لہذا اگر میں یہاں سے اپنے اختیار سے بھاگ رہا ہوں تو کیا ہوا مجھ کو بھگا بھی قضاء و قدر ہی رہی ہے اگر یہاں رہتا تو بھی تقدیر کے تحت رہتا اور اب جا رہا ہوں تو یہ بھی تقدیر ہی کے تحت ہے۔

حضرت عمرؓ ان صائب الفکر صحابہ میں سے تھے جن کی رائے کی موافقت بسا اوقات خود وحی نے بھی فرمائی تھی آج پھر کسی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی آ نکلا اور اس سے پھر معلوم ہوا کہ جو رائے اس معاملہ میں ان کی قائم ہو چکی تھی وہی عین وحی الہی کا منشاء تھا۔

قَدْ وَقَعَ بِالشَّامِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ عُمَرُ  
أَدْعُ لِيَ الْمُهَاجِرِينَ الْأَوَّلِينَ فَدَعَاهُمْ  
فَاسْتَشَارَهُمْ وَ أَخْبَرَهُمْ أَنَّ الْوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ  
بِالشَّامِ فَاخْتَلَفُوا فَقَالَ بَعْضُهُمْ قَدْ خَرَجْتَ  
لَا أَمْرَ وَلَا نَرَى أَنْ تَرْجِعَ عَنْهُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ  
مَعَكَ بَقِيَّةُ النَّاسِ وَأَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا نَرَى أَنْ تُقَدِّمَهُمْ  
عَلَى هَذَا الْوَبَاءِ فَقَالَ ارْتَفِعُوا عَنِّي ثُمَّ قَالَ  
أَدْعُ لِيَ الْأَنْصَارَ فَدَعَوْتَهُمْ فَسَلَكُوا سَبِيلَ  
الْمُهَاجِرِينَ وَ اخْتَلَفُوا كَاخْتِلَافِهِمْ فَقَالَ  
ارْتَفِعُوا عَنِّي أَدْعُ لِيَ مَنْ كَانَ هَهُنَا مِنْ  
مَشِيخَةِ قُرَيْشٍ مِنْ مُهَاجِرَةِ الْفَتْحِ فَدَعَوْتَهُمْ  
فَلَمْ يَخْتَلَفْ مِنْهُمْ عَلَيْهِ رَجُلَانِ فَقَالُوا نَرَى  
أَنْ تَرْجِعَ بِالنَّاسِ وَلَا تُقَدِّمَهُمْ عَلَى هَذَا  
الْوَبَاءِ فَنَادَى عُمَرُ فِي النَّاسِ أَنِّي مُصَبِّحٌ  
عَلَى ظَهْرِ فَاصْبَحُوا عَلَيْهِ قَالَ أَبُو عُبَيْدَةَ  
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَفِرَارًا مِنْ قَدَرِ اللَّهِ قَالَ  
عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ لَوْ غَيْرُكَ قَالَهَا  
يَا أَبُو عُبَيْدَةَ نَعَمْ نَفَرُ مِنْ قَدَرِ اللَّهِ إِلَى قَدَرِ  
اللَّهِ أَرَأَيْتَ لَوْ كَانَ لَكَ إِبِلٌ هَبْطَتْ وَ  
إِدْيَالُهُ عُذُوتَانِ إِحْدَاهُمَا خَصِيبَةٌ وَ الْأُخْرَى  
جَذْبَةٌ أَلَيْسَ إِنْ رَعَيْتَ الْخَصِيبَةَ رَعَيْتَهَا  
بِقَدَرِ اللَّهِ وَ إِنْ رَعَيْتَ الْجَذْبَةَ رَعَيْتَهَا بِقَدَرِ  
اللَّهِ قَالَ فَجَاءَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ رَضِيَ  
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ وَ كَانَ مُتَغَيِّبًا فِي بَعْضِ  
حَاجَتِهِ فَقَالَ عِنْدِي فِي هَذَا عِلْمًا سَمِعْتُ

معاملہ میں ان سے مشورہ کیا اور کہا کہ شام میں تو طاعون ہو رہا ہے یہ سن کر  
ان کی رائے باہم مختلف ہو گئی کسی نے تو یہ کہا کہ جب آپ جہاد کے ارادہ  
سے نکل چکے ہیں تو ہمارے خیال میں اب آپ کی واپسی مناسب معلوم نہیں  
ہوتی اور کسی نے یوں کہا کہ آپ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے  
بچے کچھے صحابہ ہیں ہمارے نزدیک تو مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ان کو  
اس طاعون زدہ علاقہ میں لے جا کر ڈال دیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا  
اچھا آپ لوگ تشریف لے جائیں اس کے بعد فرمایا اب انصار کو بلاؤ۔ میں  
نے ان کو بلا لیا انہوں نے بھی مہاجرین کا سا جواب دیا اور جیسے ان کی  
رائے مختلف ہو گئی تھی انہوں نے بھی مختلف جوابات دیئے۔ حضرت عمرؓ نے  
ان سے بھی فرمایا کہ آپ لوگ بھی تشریف لے جائیے اس کے بعد فرمایا اچھا  
ان مہاجرین قریش حضرات کو بلاؤ جو فتح مکہ میں شریک تھے۔ میں ان کو بلا کر  
لایا تو ان میں سے دو شخصوں نے بھی ذرا اختلاف نہ کیا اور سب نے یک  
زبان ہو کر کہا ایسی حالت میں ہمارے نزدیک واپس ہو جانا ہی مناسب ہے  
اور ہمارے نزدیک لوگوں کو اس وباء زدہ علاقہ میں لے جانا نامناسب ہے۔  
اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ کل صبح کو سوار یوں پر جانے  
کے لیے تیار ہو جائیں میں بھی چلوں گا۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا  
اے عمرؓ کیا یہ واپسی کا حکم تقدیر الہی سے بھاگ کر دیا جا رہا ہے۔ یہ سن کر  
حضرت عمرؓ نے فرمایا اے ابو عبیدہؓ یہ بات تو تمہارے شایان شان نہیں تھی  
کاش کہ تمہارے سوا ایسی موٹی بات تو کوئی اور شخص کہتا جی ہاں میں تقدیر  
الہی سے بھاگ کر جا رہا ہوں مگر تقدیر الہی کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ فرمائیے  
تو سہی اگر آپ کے پاس کچھ اونٹ ہوں اور آپ ان کو لے کر کسی وادی میں  
اتریں جس کے دو کناروں میں ایک کنارہ خشک ہو اور دوسرا سرسبز تو فرمائیے  
اگر آپ اپنے اونٹوں کو اس سرسبز جانب چرائیں گے تو کیا یہ تقدیر الہی کے  
موافق ہی نہ ہوگا اور اگر خشک جانب چرائیں گے تو کیا یہ بھی تقدیر کے تحت  
ہی نہ ہوگا۔ راوی کہتا ہے کہ اس درمیان میں عبدالرحمن بن عوف واپس آ  
گئے وہ اپنی کسی ضرورت سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے انہوں نے فرمایا کہ



اس معاملہ کے متعلق میرے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا فرمودہ علم موجود ہے۔ میں نے آپ سے خود سنا ہے کہ جب کسی خطہ میں طاعون ہو جائے تو اس میں تم جاؤ مت اور اگر طاعون اس جگہ ہو جائے جہاں تم موجود ہو تو موت کے ڈر سے وہاں سے بھاگو مت یہ سن کر حضرت عمرؓ نے خدا تعالیٰ کی حمد کی اور مدینہ طیبہ واپس ہو گئے۔ (بخاری وموطا مالک)

حکم عدولی کے لیے تقدیر کا عذر تراشنا روا نہیں

(۹۱۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس شب میں تشریف لے آئے اور فرمایا تم لوگ تہجد کی نماز نہیں پڑھتے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہماری جانیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ جب ہمیں اٹھانا چاہے گا اٹھا دے گا۔ یہ جواب سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہو گئے اور میری بات کا کوئی جواب نہ دیا، جب آپ پشت پھیر کر تشریف لے جا رہے تھے تو میں سن رہا تھا کہ آپ اپنا دست مبارک اپنی ران پر مار کر یہ آیت پڑھتے ہوئے جا رہے تھے وَكَانَ الْإِنْسَانُ الْخَبْلُ.. انسان بہت جھگڑا لیا واقع ہوا ہے۔ (بخاری شریف)

رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بَارِضٍ فَلَا تَقْدِمُوا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بَارِضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهُ قَالَ فَحَمِدَ اللَّهُ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ ثُمَّ انْصَرَفَ. (رواه البخاری و مالک فی الموطأ)

لایسوغ لاحدا لا عتذار بالقدر

(۹۱۳) عَنْ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَرَقَهُ وَفَاطِمَةُ بِنْتُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً فَقَالَ أَلَا تَصَلِّيَانِ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَنْفُسَنَا بِيَدِ اللَّهِ فَإِذَا شَاءَ أَنْ يَبْعَثَنَا بَعَثَنَا فَانْصَرَفَ حِينَ قُلْتُ ذَلِكَ وَلَمْ يَرْجِعْ إِلَيَّ شَيْئًا ثُمَّ سَمِعْتُهُ وَهُوَ مُوَلَّ يَضْرِبُ فِخْذَهُ وَهُوَ يَقُولُ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا. (رواه البخاری و البيهقی و فی کتاب الاسماء و الصفات)

(۹۱۳) \* آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ انسان کو جب مختار بنایا گیا ہے اور اسی اختیار پر اس کو احکام شریعت کا مکلف بھی کیا گیا ہے تو اب اس اختیار پر تقدیری جبر کا عذر کرنا بے موقعہ عذر ہونا چاہیے کیونکہ یہ جبر اپنے احساس میں نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں چونکہ یہ عذر اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ نماز تہجد کے لیے اٹھنے سے کوئی انحراف تھا، حضرت علیؓ جو امام الاولیاء ہوں ان کی عبادت و ریاضت کا حال کس سے پوشیدہ ہے لیکن بعض مرتبہ کسی عمل کا ارادہ رکھنے کے باوجود انسانی فطرت اپنی گزشتہ فروگزاشت کا وقتی عذر کر دیتی ہے۔ پوری عقیدت کے ساتھ اگر ناز کا کوئی رشتہ بھی حاصل ہو تو اس مقام میں ایسی تعبیری آزادی کے لیے کچھ نہ کچھ وسعت بھی نکل آتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور امہات المؤمنین کے خانگی معاملات میں گفتگو سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ دیکھو ترجمان السنہ ج ۳ ص ۳۷۳۔ نوٹ حدیث (۹) مگر معاملہ چونکہ یہاں نبی وقت کے سامنے کا تھا اس لیے کچھ اغماض اور کچھ تنبیہ ضروری ہو گئی۔ تنبیہ تو اس لیے کہ ہر شخص سے مخاطب اس کے منصب کے مناسب ہوا کرتا ہے اور اغماض اس لیے کہ جو پیرایہ عذر یہاں اختیار کیا گیا تھا وہ بہر حال ایک حقیقت کا حامل تھا۔ لہذا آپ نے ان دونوں باتوں کی رعایت فرما کر کوئی معارضہ بھی نہیں فرمایا صرف اپنی ایک ادنیٰ بے التفاتی سے یہ ظاہر فرمادیا کہ صحیح بات اگر بے موقعہ منہ سے نکل جائے تو بے مزہ رہتی ہے اور صراحتہً ان کے اس عذر کی تصویب بھی نہیں فرمائی۔ اگر بات صحیح ہو مگر بے محل واقع ہو جائے تو وہاں یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

مصیبت میں تقدیر کا سہارا لینا حضرت آدم علیہ السلام کی

سنت ہے

الالتجاء الى القدر عند المصيبة من

سۃ ادم عليه السلام

(۹۱۴) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک مرتبہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کے مابین اپنے پروردگار کے سامنے گفتگو ہو گئی اس میں حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی آپ وہی آدم تو ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست مبارک سے پیدا فرمایا، پھر آپ میں اپنی خاص روح پھونکی، آپ کو فرشتوں سے سجدہ کرایا اور آپ علیہ السلام کو اپنی جنت میں بسایا۔ آپ نے یہ کیا کیا کہ اپنی ایک خطا کی بدولت اپنی تمام اولاد کو زمین پر نکلوا پھینکا۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا۔ اچھا تم بھی وہی موسیٰ تو ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور شرف ہم کلامی کے لئے منتخب کیا، تورات کی تختیاں عنایت

(۹۱۴) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِخْتَجَّ آدَمُ وَمُوسَىٰ عِنْدَ رَبِّهِمَا فَحَجَّ آدَمُ مُوسَىٰ قَالَ مُوسَىٰ أَنْتَ آدَمُ الَّذِي خَلَقَكَ اللَّهُ بِيَدِهِ وَنَفَخَ فِيكَ مِنْ رُوحِهِ وَاسْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتَهُ وَاسْكَنَكَ فِي جَنَّتِهِ ثُمَّ أَهْبَطْتَ النَّاسَ بِخَطِيئَتِكَ إِلَى الْأَرْضِ قَالَ آدَمُ أَنْتَ مُوسَىٰ الَّذِي أَصْطَفَاكَ اللَّهُ بِرِسَالَاتِهِ وَبِكَلَامِهِ وَأَعْطَاكَ الْأَلْوَابَ فِيهَا تَبَيَّنَ كُلُّ

(۹۱۴) خلاق عالم نے عالم کو پیدا فرما کر جہاں عالم کے جملہ حوادث طے فرما کر لکھ دیے تھے اس کے ساتھ ہی نسل انسانی کی سبق آموزی کے لئے تقدیر کے ایک واقعہ کا ذکر بھی کر دیا ہے وہ یہ کہ ہماری ہی مشیت تھی کہ زمین میں اپنا ایک ٹھکانہ بنائیں اس لئے ہم نے ہی آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ہم نے ہی ان کو گیہوں کھانے سے منع کیا اور پھر ہم نے ہی ان کو اس کی قدرت دے کر ان سے اس کا ارتکاب بھی کرایا اس کے بعد پھر ہم نے ہی آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ سوال کیا ”اے آدم کیا ہم نے تم کو اس درخت کے پاس پھٹکنے سے بھی منع نہیں کر دیا تھا اور کیا اس سے بھی خبردار نہیں کر دیا تھا کہ دیکھو شیطان تمہارا بڑا پکا دشمن ہے اس کے کہے میں نہ آنا، پھر تم ان سب باتوں کو فراموش کر کے کیوں گیہوں کھا بیٹھے۔

اب نسل انسانی کو خوب سن لینا چاہیے کہ اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام نے جو جواب دیا وہ صرف گریہ و زاری تھا اس کے سوا ایک حرف تک منہ سے نہیں نکالا اور کلمات استغفار بھی اُس وقت کہنے کی جرأت کی جب کہ پروردگار ہی کی طرف سے ان کا القاء کیا گیا۔ اس واقعہ میں بھی بڑا سبق تھا کہ جو خالق اور مالک ہو اس سے سوال کرنے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا یہ حق صرف اسی کا ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے باز پرس کرے۔ یہاں ممکن تھا کہ کسی کے دل میں یہ وسوسہ گزر جاتا کہ شاید حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں اس وقت جواب نہ آ سکا ہو گا اس لیے عالم غیب میں اس عقدہ کے حل کے لیے بھی ایک محفل مکالمہ مرتب فرمائی گئی اور عالم غیب میں کشف اسرار کے لیے یہ بھی ایک طریقہ ہے اور ”گفتہ آید در حدیث دیگران“ کی صورت سے معاملہ کی حقیقت واضح کر دی گئی۔ یہاں ابوالبشر سے مکالمہ کے لیے مشیت الہیہ نے ان کی اولاد میں سے ایسے فرزند کو منتخب فرمایا جو فطرۃ تیز مزاج اور ناز پروردہ تھے تا کہ ان سے گفتگو کی ابتداء کر سکیں اور ان کے سامنے سوال و جواب کے لیے یہی موضوع رکھ دیا اور اس ضمن میں یہ واضح کر دیا کہ ابوالبشر کے پاس جواب تو تھا اور ایسا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا اولوالعزم پیغمبر بھی اس کے جواب سے عاجز ہو گیا، مگر یہاں معاملہ مخلوق کا مخلوق کے سامنے تھا لیکن جب یہی معاملہ خالق کے سامنے پیش آیا تھا تو آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ایسے لا جواب تھے کہ گریہ و زاری کے سوا ان کے پاس کوئی اور جواب ہی نہ تھا۔ .....



شَيْءٍ وَ قَرَّبَكَ نَجِيًّا فَبِكُمْ وَجَدْتُ اللَّهَ  
 كَتَبَ التَّوْرَاتِ قَبْلَ أَنْ أُخْلَقَ قَالَ مُوسَى  
 بَارْبَعِينَ عَامًا قَالَ آدَمُ فَهَلْ وَجَدْتُ فِيهَا وَ  
 عَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَعَوَى قَالَ نَعَمْ قَالَ أَقْتُلُونِي  
 عَلَى أَنْ عَمِلْتُ عَمَلًا كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَى أَنْ  
 أَحْمَلُهُ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَنِي بَارْبَعِينَ سَنَةً قَالَ  
 رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَجَّ آدَمُ  
 مُوسَى . (وفى لفظ اخر جتنا و نفسك من  
 الجنة و فى لفظ حييتنا) (رواه مسلم)

فرمائیں جس میں ہر بات کی تفصیل موجود تھی پھر تم کو اپنی سرگوشی کے لئے  
 قریب باایا۔ ذرا بتاؤ تو سہی اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے کتنے پہلے  
 تورات لکھ دی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چالیس سال پہلے۔ آدم علیہ  
 السلام نے فرمایا کیا تم کو اس میں یہ لکھا ہوا بھی ملا تھا و عصى آدم ربہ  
 فعوى . انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا پھر بھلا ایسی  
 بات پر مجھے کیا ملامت کرتے ہو جس کا کرنا اللہ تعالیٰ میری قسمت میں مبری  
 پیدائش سے بھی چالیس سال پیشتر لکھ چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 فرمایا بس اس بات پر آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔  
 (مسلم شریف)

(۹۱۵) عَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ سَرْنَا مَعَ النَّبِيِّ  
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ لَيْلَةً فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ لَوْ  
 (۹۱۵) ابوقنادہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک شب میں آنحضرت صلی  
 اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں سفر کیا کچھ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ کاش

اللہ ..... یہ واضح رہنا چاہیے کہ جو سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا ہے وہ  
 یہ نہیں ہے کہ آپ نے گےہوں کھایا کیوں بلکہ یہ ہے کہ آپ نے ہم کو اس دارالتکلیف میں رہنے کی مصیبت میں کیوں ڈال دیا مگر چونکہ  
 یہاں آنا گےہوں کھانے کے نتیجے میں ہوا تھا اس لیے اس کا ذکر بھی ضمنا آ گیا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اپنی معصیت کے لیے تقدیر کا عذر کرنا  
 کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے چہ جائیکہ نبی کے لیے ورنہ تو پھر تمام بساط شریعت ہی درہم برہم ہوئی جاتی ہے اور دنیا اپنے تمام معاصی کے  
 لیے یہی تقدیر کا عذر پیش کر کے اپنا پیچھا چھڑا سکتی ہے۔ پس آدم علیہ السلام نے تقدیر کا عذر اپنی معصیت کے لیے نہیں کیا بلکہ دنیا میں آنے کی  
 جو مصیبت ان کی اولاد کو پیش آ گئی ہے اس کی تسلی و تشفی کے لیے کیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ یہ مصیبت تمہارے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی تھی پھر جو  
 بات پہلے سے مقدر ہو چکی تھی اس کے لیے باعث گو میں ہی ہوا لیکن اس پر مجھے ملامت کرنا درست نہیں وہ تو شدنی امر تھا ہو کر رہتا۔ مصیبت  
 میں تقدیر کا ذکر کرنا رضاء بقضاء کی علامت ہے اور گناہ پر تقدیر کی آڑ لینا انتہائی جسارت ہے۔ آج بھی دنیا اس قسم کے مواقع میں تقدیر ہی کا  
 تذکرہ کر کے اپنے دل کی تسلی کا سامان کیا کرتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص تجارت کا ایک شعبہ چھوڑ کر دوسرا شعبہ اختیار کر لے اور اس میں اس کو  
 کافی نقصان ہو جائے تو اگر لوگ اس تبدیلی پر اس کو ملامت کریں تو ان سے پیچھا چھٹانے اور اپنے نفس کو تسلی دینے کے لیے وہ تقدیر ہی کا پہلو  
 اختیار کرتا ہے اور میں کہتا ہے کہ میرے مقدر کی بات تھی اس لیے نقصان ہونا تھا ہو گیا حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی مختلف تصانیف میں اس واقعہ کی  
 بھی توجیہ فرمائی ہے اور یہی سب سے مستحسن اور بے تکلف بھی ہے مگر اس کی پوری وضاحت حافظ ابن قیمؒ نے فرمائی ہے اس کے علاوہ بھی اور  
 جوابات دیئے گئے ہیں مگر وہ سب تکلف معلوم ہوتے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ نے ان کی تردید بھی فرمائی ہے۔ دیکھو شفاء العلیل ص ۱۸ و شرح  
 عقیدہ الطحاویہ ص ۷۹۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۸۵۔

(۹۱۵) \* نبی کے منہ سے نکلی ہوئی بات پوری ہو کر رہتی ہے آپ کے دہن مبارک سے نماز کے قضاء ہونے کا خطرہ نکلا دیکھو اللہ .....

شب میں آرام کی اجازت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ تم صبح کی نماز سے نہ رہ جاؤ۔ بلالؓ بولے میں آپ لوگوں کو بیدار کر دوں گا۔ اس پر سب لوگ لیٹ رہے ادھر بلالؓ نے اپنی سواری سے ذرا کمر لگائی (اور خیال یہ تھا کہ بیٹھا صبح صادق کو دیکھتا رہوں گا) وہ بھی اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ سکے اور سو گئے اب آپ بیدار ہوئے تو آفتاب کا کنارہ چمک رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا بلال! وہ بات جو تم کہتے تھے کہاں گئی (آخر جس کا مجھے خطرہ تھا وہ واقع ہو گیا یا نہیں) بلالؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اتنی سخت نیند تو مجھے کبھی نہیں آئی (معذور ہوں معاف کیجئے) آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب چاہا تمہاری جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور تم سو گئے اور جس وقت چاہا ان کو چھوڑ دیا اور تم بیدار ہو گئے۔ بلال! لو کھڑے ہو اور اذان دے کر لوگوں کو نماز کی اطلاع کر دو۔ پھر وضوء فرمایا جب آفتاب اونچا ہو گیا اور طلوع کی زردی کی بجائے سفید روشنی ہو گیا۔ آپؐ کھڑے ہوئے اور صبح کی نماز قضاء فرمائی۔ (بخاری شریف)

عَرَسْتُ بِنَايَا رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَخَافُ أَنْ تَنَامُوا عَنِ الصَّلَاةِ قَالَ بِلَالُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَا أَوْ قِطْكُمْ فَاصْطَجِعُوا وَاسْنَدَ بِلَالُ ظَهْرَهُ إِلَى رَاحِلَتِهِ فَعَلَبَتْهُ عَيْنَاهُ فَنَامَ فَاسْتَيْقِظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ طَلَعَ حَاجِبُ الشَّمْسِ فَقَالَ يَا بِلَالُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَيْنَ مَا قُلْتَ قَالَ مَا أَلْقَيْتُ إِلَيَّ نَوْمَةٌ مِثْلَهَا قَطُّ قَالَ إِنَّ اللَّهَ قَبَضَ أَرْوَاحَكُمْ حِينَ شَاءَ وَرَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِينَ شَاءَ يَا بِلَالُ قُمْ فَادْنُ بِالنَّاسِ بِالصَّلَاةِ فَتَوَضَّأْ فَلَمَّا ارْتَفَعَتِ الشَّمْسُ وَابْيَاضَتْ قَامَ فَصَلَّى.

(رواہ البخاری فی اخر مواقیت الصلوۃ)

اللہ ..... آخر وہ قضاء ہو کر رہی۔ سورہ یوسف میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے نکلا تھا ﴿وَ أَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذَّنْبُ﴾ ڈرتا ہوں کہیں میری یوسف کو بھیڑ یا نہ کھا جائے۔ آخر بھائیوں نے وہی بہانا بنایا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے نکلا رَبِّ السَّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ“ پروردگار جس کام کے لیے یہ مجھے دعوت دے رہی ہے اس سے تو مجھے جیل خانہ پیارا ہے۔ آخر وہ پورا ہوا اور جیل خانہ بھگتنا پڑا۔ یا یوں کہہ دو کہ بعض مرتبہ جو مقدرات ہوتے ہیں وہ مقررین کی زبانوں پر کبھی کبھی اپنے وقوع سے قبل غیر اختیاری طور پر آ جاتے ہیں۔ اس واقعہ میں غور تو کیجئے، حضرت بلالؓ نے کس مستعدی سے پہرہ دینے کا ارادہ کیا ہے یعنی آفتاب کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے لیئے بھی نہیں، مگر کیا اس تدبیر سے قضاء و قدر ٹل گئی نہیں وہ آئی اور آخر بلالؓ کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں، نیند وہ بھی آخری شب میں پھر مسلسل سفر کے بعد آنکھ نہ کھلنے کا معقول عذر تھا مگر یہاں بلالؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں تقدیر کا عذر پیش کیا۔ اس روایت کے اور الفاظ سے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی اس تقصیر سے تمام صحابہؓ پر پریشانی اور خوف کا عجیب عالم تھا۔ لہذا اب اس کا موقع آ گیا تھا کہ تقدیر ایزدی کا حوالہ دے کر اپنی بے چینی و اضطراب کو تسلی دیتے۔ دیکھئے یہ وہی الفاظ تو تھے جو ابھی ابھی حضرت علیؓ نے آپؐ کے تہجد کی نماز میں تاکید پر آپؐ کے جواب میں فرمائے تھے مگر وہاں یہ عذر قبل از وقت تھا، اگر کوشش کے بعد بھی آنکھ نہ کھلتی تو بے شک غم و افسوس کی تسکین کے لیے موزوں ہوتے۔ لیکن چونکہ سعی کرنے سے قبل ہی یہ عذر پیش کیا گیا تھا اس لیے آپؐ کی مسرت کا باعث نہ ہوا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ادھر تقدیر پر وہ غیب میں نافذ ہوا کرتی ہے ادھر عالم اسباب میں انسان پر ارتکاب اسباب کی ذمہ داری بھی پوری پوری عائد رہتی ہے، بلکہ اسباب کے ارتکاب کرنے کے بعد بھی تقصیر و کوتاہی کا الزام پھر عائد رہتا ہے اور اس الزام کے جواب میں اللہ .....



لَا يَغْرُبُ عَنْ أَحَاطَةِ الْقَدَرِ شَيْءٌ

(۹۱۶) عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ. (رواه مسلم و مالك في الموطأ)

(۹۱۷) عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ اللَّهَ خَالِقُ كُلِّ صَانِعٍ وَصَنَعَتِهِ.

(رواه الحاكم في المستدرک وقال وهو الذهبي على شرط مسلم قال الحافظ ابن القيم)

(۹۱۸) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا شَيْءَ عَبْدُ الْقَيْسِ إِلَّا فِيكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُجِبُهُمَا اللَّهُ الْحِلْمُ وَ

قضاء و قدر کے احاطہ سے کوئی شے باہر نہیں ہے

(۹۱۶) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے سب کچھ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے یہاں تک کہ انسان کی در ماندگی اور ہوشیاری بھی۔ (مسلم۔ موطا)

(۹۱۷) حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جتنے کاریگر ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور جو ان کے کام ہیں ان کو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔

(مستدرک۔ خلق افعال عباد)

(۹۱۸) ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبد القیس سے فرمایا (یہ اپنے وفد اور قبیلہ کے سردار تھے) تم میں دو عادتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول پسند فرماتے ہیں۔ ایک برداشت

اللہ..... کسی کو تقدیر کی آڑ لینے کی اجازت نہیں ہے اور کیوں ہو جب ہم اس عالم میں اپنے احساس کے مطابق پورے پورے مختار ہیں تو ہم سے ہمارے اس علم کے مطابق باز پرس ہونی چاہیے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی جب ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں نزول کی مصیبت میں مبتلا کرنے کا الزام دیا محض تسلی کے لیے تقدیر کا نوشتہ یاد دلایا تھا۔ وہاں بھی جو کچھ ہوا ارادۂ نہیں ہوا۔ اپنی سی کوشش ختم کر لینے کے بعد ہوا اور یہاں بھی جو کچھ تقصیر ہوئی وہ پوری جدوجہد ختم کر لینے کے بعد ہوئی مگر اس کے باوجود سوال حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ہوا اور یہاں بلالؓ سے بھی ہوا اگرچہ نتیجہ کے لحاظ سے کچھ تو واقعہ اور متکلم کی نوعیت کے اختلاف سے اختلاف بھی رہا۔

(۹۱۶) \* ہوشیاری اور عجز انسان کی دو صفاتیں ہیں۔ حدیث کہتی ہے کہ ان کا تعلق بھی تقدیر ہی کے ساتھ ہے پس تقدیر کو صرف جنت و دوزخ تک محدود رکھنا غلط ہے وہ انسانی حیات کے ہر شعبہ کو حاوی ہے خواہ وہ اس کے خلقی اوصاف ہوں یا کسبی اعمال بلکہ اس عالم سے گذر کر دوسرے عالم میں اس کے اعمال کے جو نتائج ہیں وہ بھی اس کے وسیع احاطہ میں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کاتب تقدیر کا قلم قیامت تک کے جملہ احوال کی کتابت کر رہا تھا تو وہ انسان کے ان احوال کی کتابت سے کیسے چوک سکتا تھا۔ اس وسعت کے بیان سے مقصد قضاء و قدر کی عظمت کا نقش قائم کرنا ہے۔

(۹۱۷) \* عقلاء کو افعال عباد میں بحث ہے یعنی یہ کہ بندہ تو ضرور مخلوق ہوا لیکن آگے چل کر جو ان کے افعال ہوتے ہیں کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے مخلوق ہوتے ہیں یا وہ بندوں کے اپنے اختیار کے اثرات ہیں۔ اس بارے میں یہ حدیث بہت صریح ہے اس لیے ہم نے اس کو یہاں نقل کیا ہے۔ مسئلہ پر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بندہ کی طرح اس کے افعال بھی خدا تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں اب ذرا انسان اپنی ہستی اور اس کی بیچارگی پر غور کرے کہ اس کی حقیقت ہے کیا اور وہ اس کو سمجھتا کیا ہے۔

(۹۱۸) \* یہ حدیث ایک بار ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۲۰۷ پر مجملاً گزر چکی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح انسان کے.....

الْأَنَاءُ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ خَلَّتَيْنِ تَخَلَّقْتُ بِهِمَا أَوْ جُبِلْتُ عَلَيْهِمَا قَالَ قَالَ بَلْ جُبِلْتُ عَلَيْهِمَا قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي جَبَلَنِي عَلَى خَلَّتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللَّهُ. (رواه مسلم)

(۹۱۹) عَنْ ابْنِ بُرْدَةَ بْنِ أَبِي مُوسَى عَنْ بُرْدَةَ قَالَ أَتَيْتُ عَائِشَةَ فَقُلْتُ يَا أُمَّاهُ حَدِّثْنِي بِشَيْءٍ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّيْرُ تَجْرِي بِقَدَرٍ وَكَتَانَ يُعْجِبُهُ الْفَالُ الْحَسَنُ.

(رواه الحاكم في المستدرک و قال قد اجمع به الشيخان برواة هذا الحديث عن آخرهم

دوم بردہاری۔ انہوں نے دریافت کیا یہ خصلتیں مجھ میں پیدائشی طور پر رکھی گئی ہیں یا میری حاصل کردہ ہیں؟ فرمایا پیدائشی ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے کہا خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ میں دو عادتیں ایسی پیدا فرمادیں جن کو وہ پسند فرماتا ہے۔ (مسلم شریف)

(۹۱۹) ابو بردہ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے مادر محترم! آج تو مجھے آپ کوئی ایسی حدیث سنا دیجئے جو آپ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ اس پر انہوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ جو پرندہ اڑ کر جاتا ہے یہ تو تقدیر کے موافق اڑ کر جاتا ہے (لیکن اس سے فال بد لینا جو عرب کا طریق ہے یہ بات بے اصل ہے اور آپ کو ناپسند تھا) ہاں نیک فال لینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پسند فرماتے تھے۔

(متدرک)

غیر یوسف بن ابی بردہ و الذی عندی انہما لم یہملاہ بنجرح و لا بضعف بل لقلة حدیثہ فانہ عزیز الحدیث جدا و اقرہ الذہبی)

اللہ..... لیے صفت کیس اور عجز مقدر ہوتی ہے اسی طرح حلم اور اناۃ جیسی صفات بھی مقدر شدہ ہیں۔ حلم غضب کے مقابل صفت کا نام ہے اور اناۃ عجلت کے مقابل صفت کا۔ یہ صفتیں اگر کسب سے حاصل ہوں تو بھی وہ تقدیر کے احاطہ سے خارج نہیں ہوں گی مگر اس وقت تقدیر میں لکھا ہوا بھی یونہی ہوگا کہ یہ شخص اس صفت کے حاصل کرنے میں سعی کرے گا اور اس طرح حق تعالیٰ اس کو کسی حد تک ان کا کوئی حصہ عطا فرمادے گا اگرچہ کسی صفات پیدائشی صفات کے مرتبہ کو نہ پہنچیں مگر ایک کمال بہر حال کمال ہی رہتا ہے۔ شیخ عبدالقیس نے اسی فرق کے لحاظ سے یہ سوال کیا تھا کہ یہ صفتیں مجھ میں پیدائشی ہیں یا کسب ہیں؟ اور اسی لیے جب ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ پیدائشی ہیں تو زیادہ مسرت ہوئی۔ عربی کا شاعر کہتا ہے لیس التکحل فی العینین کالکحل۔ سرمہ لگا کر سرگیں چشم ہونے کے برابر بھلا کب ہو سکتا ہے۔

(۹۱۹) \* اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ پرندہ کی پرواز بھی کیا کوئی شے ہے مگر قضاء و قدر کے احاطہ میں یہ معمولی سی بات بھی آچکی ہے آگے اس کو نحوست یا برکت کا باعث سمجھنا یہ عرب کی اپنی وہم پرستی ہے اور بے اصل بات ہے۔ جس فال کے متعلق یہاں ذکر آیا ہے یہ بھی زمانہ جاہلیت کی فال نہیں بلکہ اس کی تفصیل دوسری حدیثوں میں صرف اتنی ہے کہ اگر کسی پیش آمدہ معاملہ کے وقت آپ کے سامنے کوئی اچھا نام آ جاتا تو اس کو سن کر آپ خوش ہو جاتے تھے۔ گویا اس کو اس معاملہ کی حسب دلخواہ طے ہو جانے کی ایک بشارت تصور فرماتے تھے یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ مریض عیادت کرنے والوں سے اپنی شفاء کے کلمات سن کر خوش ہو جاتا ہے اور اس کو نیک فال تصور کرتا ہے حالانکہ ان کے کہہ دینے سے کہیں شفاء ہوتی ہے جو مقدر ہو چکا ہے ہوتا تو وہی ہے مگر ان کلمات سے مریض کا دل ضرور خوش ہو جاتا ہے۔ اچھا نام سن کر آپ کی مسرت بھی اسی نوع کی ایک چیز تھی۔



(۹۲۰) عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قُبْضَةٍ قَبْضُهَا مِنْ جَمِيعِ الْأَرْضِ فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلَى قَدَرِ الْأَرْضِ مِنْهُمْ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَيْنَ ذَلِكَ وَالسَّهْلُ وَالْحَزَنُ وَالْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ. (رواه احمد والترمذی و ابو داؤد)

(۹۲۰) ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی زمین میں سے ایک مٹھی بھری پھر اس مٹھی سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا ہے اس لیے ان کی اولاد بھی زمین کے رنگوں کی طرح مختلف رنگوں کی پیدا ہوئی۔ کوئی سرخ، کوئی گورا، کوئی کالا، اور کوئی درمیانی اسی طرح کوئی نرم خوتو کوئی تند خو، کوئی خبیث طبیعت تو کوئی شریف طبیعت۔

(۹۲۱) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ يُصِيبُكَ فِي كُلِّ عَامٍ وَجَعٌ مِنَ الشَّاةِ الْمُسْمُومَةِ الَّتِي أَكَلْتَ قَالَ مَا أَصَابَنِي شَيْءٌ مِنْهَا إِلَّا وَهُوَ مَكْتُوبٌ عَلَيَّ وَآدَمُ فِي طِينَتِهِ.

(۹۲۱) حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ خیر کے یہود نے زہر آلود بکری کا جو گوشت آپؐ کو کھلا دیا تھا (میں دیکھتی ہوں) کہ اس کی تکلیف ہر سال ہی آپؐ کو ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اس کی وجہ سے جو تکلیف بھی مجھ کو اب ہوتی ہے وہ میرے مقدر میں اس وقت لکھی جا چکی تھی جب کہ حضرت آدم علیہ السلام گارے کی شکل میں تھے (یعنی ان کا پتلہ بھی تیار نہ ہوا تھا) (رواہ ابن ماجہ)

(۹۲۰) \* مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے رنگوں کا معمولی سا اختلاف بھی قدرت کا پیدا کردہ ہے۔ زمین کے مختلف رنگ بھی قدرت نے بنائے پھر جو مخلوق ان سے مرکب کی اس کے رنگ بھی مختلف ہوئے، مگر یہ اس لیے نہیں کہ یہ ان کے مادہ کا اقتضاء تھا بلکہ یہ بھی براہ راست قدرت ہی کا فیض ہے۔ فطرت پرست تو دو چیزوں کے مابین صرف ظاہری تناسب دیکھ کر ایک کو دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے فارغ ہو جاتا ہے مگر قدرت کا قائل صرف اس حد پر جا کر ٹھہر نہیں جاتا وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ قدرت کے وسیع احاطہ میں کالے سے سفید اور سفید سے کالا بنانا بھی ہے لیکن وہ بس اس تناسب کا نقض پسند نہیں کرتی۔ اور اس عالم کی زیبائش قائم رکھنے کے لیے کالے سے کالا اور گورے سے گورا ہی بناتی رہتی ہے پس مواد میں جو خواص ہیں وہ بھی قدرت نے رکھے ہیں اور ان کے مناسب جو آثار ان سے رونما ہوتے ہیں وہ بھی اسی نے پیدا فرمائے ہیں اور اس کے بعد ان آثار کا ترتیب بھی قدرت ہی کے تحت رہتا ہے اور یہ کچھ اسی ایک جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دائرہ مخلوقات میں یہ اللہ تعالیٰ کی سنت قدیمہ ہے کہ جو خواص اس نے مادہ میں رکھے ہیں وہ ان کے مناسب ہی ان پر آثار مرتب فرماتی رہتی ہے اور اس صورت میں ایک طرف قدرت کا کمال دوسری طرف عالم کی مرتب زیبائش دونوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ (دیکھو حجۃ اللہ ص ۱۷)

(۹۲۱) \* یہ حدیث عقائد شرعیہ کو حقائق بنا کر ان کو استعمال کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ ہر ہر موقع پر تقدیر کی یاد دہانی اس کے استحضار کا موجب ہوتی ہے اور بار بار استحضار سے انسان کو ایک فطری ہایقین میسر آ جاتا ہے عالم غیب پر یقین کرنے کا راستہ بس ایک یہی ہے۔ وہ دلائل کی رسائی سے بہت بلند عالم ہے انبیاء علیہم السلام کا احسان ہے کہ وہ اس سے خبردار کرتے ہیں پھر اتنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبوں میں قدم قدم پر اس کو استعمال کر کر کے یقینی بھی بنا دیتے ہیں۔ اب دیکھئے حضرت ام سلمہؓ نے آپؐ کی تکلیف ﷺ.....

(۹۲۲) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلْتُ خَدِيجَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَلَدَيْنِ مَاتَا لَهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُمَا فِي النَّارِ قَالَ فَلَمَّا رَأَى الْكَرَاهَةَ فِي وَجْهِهَا قَالَ لَوْ رَأَيْتِ مَكَانَهُمَا لَا بُغْضُتَهُمَا قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَوَلَدِي مِنْكَ قَالَ فِي الْجَنَّةِ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الْمُؤْمِنِينَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ وَإِنَّ الْمُشْرِكِينَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي النَّارِ ثُمَّ قَرَأَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ (رواه احمد)

(۹۲۲) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا میرے دو بچے جو کفر کے دور میں پیدا ہوئے تھے وہ دوزخ میں ہیں یا جنت میں؟ فرمایا دوزخ میں۔ یہ سن کر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرہ پر غم کے آثار دیکھے تو فرمایا اگر تم ان کا ٹھکانا دیکھ لو تو تمہارے دل میں بھی ان سے نفرت پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ اچھا جو میری اولاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے ان کا حال بتائیے؟ فرمایا وہ جنت میں ہے۔ اس کے بعد فرمایا مؤمنین اور ان کی اولاد جنت میں جائیں گی اور مشرکین اور ان کی اولاد دوزخ میں اس کے بعد اس کی تصدیق کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی: وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ (مسند احمد)

اللہ..... کا احساس کر کے محض ایک کلمہ محبت کہا تھا جیسا کہ محبت میں ہر محبت بھرا شخص کہہ دیا کرتا ہے لیکن آپ نے فوراً ان کو ایک ایسی حقیقت کی طرف متوجہ فرمادیا جس کے بعد یہ اثر تو ہلکا ہو گیا اور اس سے کہیں بڑھ کر دوسرا اثر پیدا ہو گیا اور وہ قضاء و قدر پر اعتقاد جازم تھا آپ کی یہ شانِ تعلیم دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے۔

جزاک اللہ کہ چشم باز کردی مرابا جانِ جاں ہمراز کردی

جب علوم شرعیہ مشاہدہ کی کیفیت میں بدلنا شروع ہو جائیں تو بشارت ہونی چاہیے کہ اب احسان کا میدان شروع ہو گیا ہے یہ وہی احسان ہے جس کا سوال و جواب حدیث جبریل علیہ السلام میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس زمانہ میں اعتقادات کا تذکرہ چونکہ صرف کتابوں میں رہ گیا ہے جن کا ذکر تعلیم و تعلم میں صرف ایک کہانی کے طور پر آ جاتا ہے اور بس اس لیے ہمارے ایمان کا حال بھی ناگفتہ بہ ہو چکا ہے۔ اگر کاش وہ موقعہ بموقعہ اسی طرح استعمال بھی ہوتے رہیں تو مذہب میں شکوک و شبہات کا یہ عالم پیدا ہی نہ ہو اور دلائل کی دردسری کے بغیر وہ نعمت یقین نصیب ہو جائے جس کو پہاڑوں کی ٹکر بھی نقصان رسا نہ ہو سکے۔

(۹۲۲) \* دوزخ اور جنت کی جو تقدیر شکم مادر میں لکھ دی جاتی ہے، علم الہی میں وہ بھی کسی ضابطہ کے تحت ہوتی ہے اس کا ضابطہ اسی کو معلوم ہے کہیں اس کا مدار ظاہری عمل پر ہوتا ہے اور کہیں صرف اس استعداد پر جو اچھے برے عمل کا اصلی سبب ہوتی ہے (حجۃ اللہ ص ۱۶۲) تقدیر کا یہ پہلو بھی قدرت نے صیغہ راز میں رکھا ہے اور جس طرح قیامت کے وقت کا انفا کیا گیا ہے، کیونکہ نظام عالم اسی میں مضمر ہے اسی طرح محشر سے قبل جنتی اور دوزخی ہونے کا آخری فیصلہ بھی مستور رکھا گیا ہے۔ ہاں اجمالی طور پر اتنا پتہ دے دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی اولاد جنتی ہے اور کفار و مشرکین کی دوزخی۔ تقدیر کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ سوال بالکل بے معنی رہ جاتا ہے کہ جب بچہ نے کوئی برا عمل.....



(۹۲۳) عَنْ أَبِي بِنِ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى  
 اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْغُلَامُ الَّذِي قَتَلَهُ  
 الْخَضِرُ طَبَعَ يَوْمَ اطْبَعَ كَافِرًا. (رواه الترمذی)  
 ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا تھا وہ  
 جب شکم مادر میں جماتا تھا اس کی تقدیر میں کافر ہی لکھا گیا تھا۔ (ترمذی شریف)  
 و قال هذا حديث صحيح غريب و أخرجه مسلم و ابوداؤد و الترمذی. قال الحافظ ابن القيم المراد به انه كتب كذلك  
 و قدر و ختم فمومن طبع الكتاب و لفظ الطبع لا صار يستعمله كثير من الناس الطبيعة التي هي بمعنى الخلقه و المجله  
 ظن الظان ان هذا المراد الحديث ۱ھ. شفاء العليل ص ۲۹۵)

اللہ..... عمل ہی نہیں کیا تو پھر اس کے لیے دوزخ کیوں ہے۔ اول تو یہ اعتراض اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ جزاء سزا کا ضابطہ صرف ایک  
 عمل ہی ہو پھر یہ تو بتائیے کہ جس نے عمل کر لیے ہیں اسی کے لیے دوزخ کیوں ہو جب کہ دوزخ کے عمل کرا کے دوزخ میں ڈالنا بھی قابل  
 اعتراض ہونا چاہیے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عمل اس بات کی شہادت ہوتا ہے کہ اس میں استعداد ناقص تھی۔ پھر اگر مدار استعداد پر ہو تو بچوں  
 میں بھی قدرت نے مختلف نوع کی استعدادیں رکھی ہیں بری استعداد کا بچہ اسی طرح قابل رحم نہیں ہوتا جیسا سانپ اور بچھو کا بچہ یہاں کوئی  
 بے رحمی کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان کے کائے ہوئے بغیر بھی ان کو مار ڈالنا دنیا کے حق میں بڑی رحم دلی ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام  
 نے جب اپنی قوم کا حال اسی درجہ پر تباہ دیکھا تو آخر بددعاء کے لیے ہاتھ اٹھانے کے لیے مجبور ہو ہی گئے۔ اور اس کا یہی عذر بیان فرمایا رب  
 ﴿إِنَّكَ إِن تَذَرَهُمْ يَصْلَوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾ (نوح: ۲۷) یعنی اب یہ تخم ہی خراب ہو چکا ہے اگر آگے باقی رہا تو اس  
 سے جو پیداوار ہوگی وہ ایسی ہی بد بخت قوم کی ہوگی۔ پس جس کو دوزخ میں ڈالنا منظور ہوگا اس کی استعداد بھی اسی کے مناسب ہوگی اور اس  
 کی اس کی علامت یہ ہے کہ وہ کافر و مشرک کے یہاں پیدا ہوگا۔ یہ بھی صرف ایک علامت کے طور پر ہے پوری بات یہاں بھی ہم کو بتانا  
 منظور نہیں کیونکہ یہ بھی تقدیر کا ایک شعبہ ہے اور اس کو بھی محشر سے قبل کھول دینا پسند نہیں ہے۔ اسی لیے حدیث میں بچوں کی نجات و ہلاکت  
 کے مسئلہ میں بحث کرنے کی بھی ممانعت آئی ہے۔ اس جگہ حدیث نمبر ۸۰۲ کو بھی دیکھ لینا چاہیے۔ ملاحظہ ہو ترجمان السنہ ج ۲ ص ۳۶۸۔

(۹۲۳) \* آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ شقاوت و سعادت شکم مادر ہی میں لکھ دی جاتی ہے اور اس کتابت کے تحت وہ مولود ایسا مسخر ہوتا ہے  
 کہ بڑے ہو کر وہی افعال کرتا ہے جو اس کتابت کے مطابق ہوتے ہیں۔ گو کرتا ہے اپنے اختیار ہی سے۔ تقدیر کا سارا جغرافیہ کیسے بتایا جاسکتا  
 ہے اور اگر تباہ دیا جائے تو کون اس کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ دیکھئے یہاں والدین مسلمان ہیں ادھر تقدیر بچہ میں ایسی استعداد و دیعت فرما چکی ہے کہ  
 بڑے ہو کر اس سے کفر ہی کے افعال سرزد ہوں اور ادھر مقصد یہ ہے کہ والدین اس کی محبت میں آ کر کافر نہ ہو جائیں تو ان دونوں مقدرات  
 میں جوڑیوں لگایا جاتا ہے کہ اس نوبت سے قبل ہی قبل بچہ کو ان سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ والدین پر بڑا ظلم ہوا کیسا  
 خوش رو بچہ اور کس طرح موت کے زبردست ہاتھوں نے ان سے چھین لیا مگر تقدیر یہ کہتی ہے کہ بہت بہتر ہوا کیونکر اگر اس کی حیات مقدر ہو  
 جاتی تو اس کے ساتھ ساتھ ان کا کفر بھی مقدر ہو جاتا بچہ کی حیات سے یہ زندگی تو بہت پر لطف گزرتی مگر آخرت کی زندگی برباد ہو جاتی۔ اب  
 اگر یہ راز یہیں کھول دیا جاتا ہے تو بتائیے کہ اس بچہ کی وفات پر والدین کے صبر میں کیا بات رہ جاتی۔ تقدیر کے اخفاء کے ساتھ جب وہ صبر  
 کرتے ہیں تو پروردگار کی طرف سے ان کو رضا بقضاء کا تمغہ مل جاتا ہے حالانکہ ان کا صبر بھی قضاء الہی کے ماتحت ہوتا ہے مگر عالم اسباب میں یہ  
 تمام باتیں مستور رہتی ہیں ظاہر میں تو یہی نظر آتا ہے کہ ایک شخص کے بچہ کا انتقال ہوتا ہے اور وہ محض خدا تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد اللہ.....

الحوادث کلها تحت سيطرة القدر کائنات کا ذرہ ذرہ قضاء و قدر کے فولادی شکنجہ میں کسا ہوا ہے  
(۹۲۴) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ شَيْئًا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آیۃ الذین یجتنبون

للہ..... کر کے صبر کر لیتا ہے بس اس عالم ظاہر کے اختیار ہی پر یہ جزاء و سزا مرتب ہو جاتی ہے اگر عالم غیب ظاہر ہو جائے تو جزاء و سزا کے لیے اس دنیا کو اتنی تفصیل کے ساتھ بچانے کی ضرورت نہ تھی۔

اور دیکھئے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فرزند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں استعداد تو وہ رکھی جاتی ہے کہ اگر عمر پائیں تو نبوت سے سرفراز ہوں ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم نبوت کا تاج پہنایا جا چکا ہے اب اگر ان کو حیات بخشی جاتی ہے تو اس استعداد کے ماتحت ان کا نبی ہونا مناسب ہوتا اگر یہ استعداد نہ رکھی جاتی تو قدرت کو یہ گوارا نہ ہوتا کہ خاتم النبیین کی اولاد ایسی ہو جس میں منصب نبوت کی استعداد بھی نہ ہو۔ اس لیے ان دونوں باتوں میں ربط یوں قائم کیا جاتا ہے کہ ان میں تو نبوت کی استعداد رکھ دی گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ عمر مقدر نہ فرمائی جس میں نبوت ملا کرتی ہے تاکہ خاتم النبیین کے بعد دوسرا نبی پیدا نہ ہو خواہ وہ آپ کا خاص فرزند ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح ختم نبوت کا کمال اپنی جگہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند کی استعداد کی بلندی اپنی جگہ درخشاں رہے۔ اتفاق سے اس معاملہ میں بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں آپ زیر شرح حدیث ج ۱ ص ۱۵۶ پڑھ چکے ہیں جس میں صاف موجود ہے کہ اگر (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) زندہ رہتے تو نبی ہوتے اور اسی لیے جب آیت خاتم النبیین میں قرآن کریم نے آپ کے باپ ہونے کی نفی کی تو اس کو مردوں کے ساتھ مقید کر دیا۔ ورنہ تو آپ کی دختری اور پسری دونوں اولادیں تھیں لیکن پسری اولاد سن بلوغت کو کوئی نہیں پہنچی۔

(۹۲۴) \* اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ قدرت نے انسان میں قوت شہوانیہ اور رغبت الی النساء خلقہ و دیعت فرمائی ہے اور اس میں ہاتھ آنکھیں زبان اور نفس بھی پیدا فرما دیئے ہیں جو اس کی لذت کا مرتبہ بہ مرتبہ ادراک کرتے ہیں اگرچہ اس فعل کی حقیقت انسانی شرم گاہ کے ساتھ تمام ہوتی ہے مگر شریعت میں مقامات زناء کو بھی ایک مرتبہ کا زناء قرار دیا گیا ہے لہذا بد نظری سے غیر محرم کو دیکھنے والا یہ نہ سمجھے کہ اس نے کسی مخطور امر کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے آنکھوں کا زناء کر لیا اسی طرح غیر محرم کو ہاتھ لگانے والا بھی یہ نہ سمجھے کہ اس نے کوئی بری حرکت نہیں کی بلکہ اس کو یقین کرنا چاہیے کہ اس کے ہاتھوں نے زنا کر لیا اور ان کا زناء یہی ہے کہ انہوں نے غیر محرم کو چھو لیا۔ مگر چونکہ یہ اقتضاء انسان میں قدرت نے رکھ دیا ہے اس لیے اگر انسان کسی غفلت کے موقع پر ان مقدمات میں مبتلا ہو جائے اور پھر خدا کے خوف سے اس فعل کی تکمیل سے باز رہے تو اسے پروردگار عالم کی رحمت سے امیدوار رہنا چاہیے کہ جو ناجائز حرکات اس سے سرزد ہو چکیں وہ ”لمم“ یعنی صغائر میں شمار ہوں گی اور ان کی مغفرت ہو جائے گی۔

تقدیر کا دائرہ بھی کتنا وسیع ہے کہ اس میں صرف حسنات اور سیئات ہی نہیں ان کے مقدمات بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔ انسان سمجھنا ہے کہ جب اس نے زناء نہیں کیا تو شاید اس سے قبل جو حرکات اس سے سرزد ہو گئیں وہ نہ ہونے کی برابر ہوں گی۔ اس لیے شاید وہ محاسبہ تقدیر میں داخل نہ ہوں مگر اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ وہ بھی مقدرات میں شامل ہیں۔ پھر تقدیر کی گرفت بھی کتنی زبردست ہے کہ جو حصہ زناء اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے اس کا ارتکاب کیے بغیر بھی اس کو چارہ کار نہیں تعجب ہے کہ جبر تو اتنا پھر جو کچھ آگے ظہور پذیر ہوتا ہے اپنے ہی اختیار سے۔ فَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

حافظ ابن تیمیہ سورہ اخلاص کی تفسیر میں اس حدیث کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی لا بد للانسان من مقدمات للہ.....



أَشْبَهَ بِاللَّسَمِ مِمَّا قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزَّنى أَدْرَكَ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ فَرَنَى الْعَيْنَ النَّظْرَ وَزَنِ اللِّسَانَ الْمُنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمْنَى وَتَشْتَهَى وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذَلِكَ وَيُكَذِّبُهُ. (رواه البخاری و عند مسلم مثله و فی المتفق علیه عن ابی ہریرۃ ایضاً)

(۹۲۵) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُولُ

كَبَائِرِ الْأَثَمِ وَ الْفَوَاحِشِ إِلَّا اللَّهُمَّ مِثْلَ "اللَّهُمَّ" كِي تَفْسِيرِ مِثْلِ ان بَاتُونَ سَے زیادہ مناسب مجھے اور کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی جو ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا ہے وہ اس کو ضرور مل کر رہے گا۔ پس آنکھ کا زنا تو غیر محرم کو دیکھنا ہے اور زبان کا زنا اس قسم کی بات چیت کرنا اور نفس کا کام اس کی خواہش کرنا اور تمنا کرنا ہے۔ پھر آخر میں شرمگاہ اس کی تصدیق کر دیتا ہے یا تکذیب کر دیتا ہے۔ (متفق علیہ)

(۹۲۵) ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ رَوَايَتِ كَرْتِے هِیں كِه رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى

للهم ..... الكبيرة و كثير منهم بقع لى الكبيرة فيومر بالتوبة و يومرون ان لا يصرو اعلی صغيرة فانه لا صغيرة مع اصرار و لا كبيرة مع استغفار (ص ۱۸)۔ یعنی بشر آخر بشر ہے کبیرہ گناہ سے اگر بچ رہے تو بچ رہے مگر اس کے مقدمات و مبادی سے بچنا مشکل ہے کبھی نہ کبھی نظر اٹھ ہی جاتی ہے اس سے ترقی کر کے کبھی اور اعضاء بھی اس میں ملوث ہو ہی جاتے ہیں پھر کوئی بد نصیب آخر کبیرہ گناہ میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اب جو کبیرہ سے بچ نکلا اس کو حکم یہ ہے کہ آئندہ یہ حرکت نہ کرے اور جو پھنس گیا اس کو حکم یہ ہے کہ فوراً توبہ کرے۔ پس اس طرح اگر صغائر پر اصرار نہ ہو اور کبائر پر ہمیشہ توبہ ہوتی رہے تو اس کو سن لینا چاہیے کہ نہ صغائر صغائر رہتے ہیں اور نہ کبائر کبائر بارگاہِ رحمت میں سب پر قلم غفور کھینچ دیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ زنا کی مکمل توبہ صرف زبان سے نہیں ہوتی اس کی واضح شہادت یہ ہے کہ شرعی حکم اپنے نفس پر جاری بھی کرائے اور جس جرم کی گہرائی اتنی ہو کہ اس میں اس کا عضو عضو شریک ہو چکا ہو اس کی سزا بھی اس کے ہر ہر عضو کو بھگتنی چاہیے شاید جنابت میں تمام جسم کا غسل بھی اسی لیے فرض قرار دیا گیا ہو (اس کی پوری بحث اپنے محل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک آدھ واقعہ ایسا بھی ہو گیا ہے اور جب ہو گیا ہے تو اس صحابی نے اپنی جان قربان کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں دیکھا۔ ایسے صحابی کے متعلق اگر اس وقت کے اسلامی معیار کی بلندی کی بناء پر کسی کی زبان سے کوئی کلمہ کچھ کمی کا مشعر نکل گیا ہے تو آپ نے فرمایا ہے؟ "لقد تاب توبة لو قسمت على اهل المدينة لو سعتهم" اُس نے تو ایسی زبردست توبہ کر لی کہ اگر اس کو سارے اہل مدینہ پر تقسیم کر دیا جاتا تو ان کے گناہوں کی بخشش کے لیے بھی کافی ہو جاتی۔ (او کما قال)

(۹۲۵) \* صحیح مسلم میں اس حدیث میں کچھ اضافات ہیں اس میں اس حدیث کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ ابن مسعود نے فرمایا جو شخص شقی ہوتا ہے وہ ماں کے پیٹ ہی سے شقی پیدا ہوتا ہے اور سعید کی شناخت یہ ہے کہ جو دوسرے کو دیکھ کر نصیحت حاصل کر لے۔ اس پر کسی صحابی نے سوال کیا۔ عمل کیے بغیر شقاوت کیسی؟ اس پر اس شخص نے جواب دیا۔ اس میں تعجب کیا ہے اس کے بعد حدیث مذکورہ بالا بیان کی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سعادت و شقاوت شکم مادر ہی میں لکھ دی جاتی ہے۔ اور اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ثم يخرج الملك بالصحيفة في يده - یعنی پھر فرشتہ اپنے ہاتھ میں جو دفتر تھا وہ نکالتا ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جن چار امور کی لمابت کا یہاں ذکر ہے ان کی کتابت کسی متعلقہ دفتر میں ہوتی ہے.....

اللّٰهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ اِنَّ خَلْقَ اَحَدِكُمْ یَجْمَعُ فِی بَطْنِ اُمِّهِ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نُّطْفَةٌ ثُمَّ یَكُونُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ یَكُونُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذَلِكَ ثُمَّ یَعْبَثُ اللّٰهُ اِلَیْهِ مَلَكًا بِارْبَعِ کَلِمَاتٍ فِیْکُتُبُ عَمَلَهُ وَاجَلَهُ وَرِزْقَهُ وَشَقِیُّ اَوْ سَعِیْدٌ ثُمَّ یُنْفَخُ فِیْهِ الرُّوْحُ فَاَوَّلَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ غَیْرُهُ اِنَّ اَحَدَكُمْ لَیَّمْلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰی مَا یَكُونُ بَیْنَهُ وَبَیْنَهَا

اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خود بیان فرمایا اور بے شبہ آپ صادق تھے ایسے صادق جن کی جہان تصدیق کرتا تھا تم چالیس دن تک اپنے شکم مادر میں بشکل نطفہ رہتے ہو پھر ایک فرشتہ چار باتوں کی تحریر کے لیے بھیجتا ہے وہ اس کے عمل اس کی عمر اس کا رزق اور نیک و بد ہونا لکھ دیتا ہے اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے اس خدا کی قسم ہے جس کے سوا معبود کوئی نہیں کہ (پیدائش کے بعد) تم میں کا ایک شخص (ساری عمر) جنتی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے بعد جنت کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے لیکن آخر نوشتہ تقدیر غالب آ جاتا ہے اور وہ دوزخی شخص کے

لے..... ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امور دونوں آنکھوں کے درمیان لکھے جاتے ہیں واللہ تعالیٰ اعلم۔ شاید یہ بھی کتابت کا محل ہو۔ اہل عرف کو دیکھا کہ وہ آج بھی پیشانی پر ہاتھ مار کر ہائے مقدر کہا کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے اس حدیث میں حضرت عبد اللہ بن مسعود کی جانب سے چار باتوں کے علاوہ پانچویں چیز مقام موت کا ذکر بھی ہے۔ مسند بزار میں ابن عمرؓ فرماتے ہیں: ”ثم یکتب بین عینیہ ما ہو لاق حتی انکبۃ ینکبہا“ یعنی پھر اس کی آنکھوں کے درمیان جو امور پیش آمدنی ہیں وہ سب لکھ دیئے جاتے ہیں حتیٰ کہ جو ذرا سی خراش کبھی اسی کو لگنی ہے وہ بھی لکھ دی جاتی ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ذرؓ سے بھی اس تعلیم کو نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ایک اور مفید ٹکڑا بھی نقل کیا ہے: فیقال اذهب الی ام الكتاب فانک تجد فیہ قصۃ هذه النطفۃ۔ (جامع العلوم) حق تعالیٰ کی جانب سے اس فرشتہ کو جو رحم مادر پر مقرر ہے حکم ہوتا ہے۔ جا اور لوح میں جا کر دیکھ وہاں تجھ کو اس نطفہ کے متعلق پوری پوری تفصیلات مل جائیں گی۔ ان مختلف آثار کے نقل سے مقصد یہ ہے کہ ہر مقام پر سوالات تو بہت پیدا ہو جاتے ہیں جن کے جوابات بعض مرتبہ کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں اور بعض مرتبہ نہیں ملتے۔ یہ چیزیں ان ضروریات میں شامل نہیں ہیں جن کا معلوم ہونا امت کے لیے فرض و لازم ہو اس لیے نہ بیان میں اس کی اہمیت رہی ہے نہ آپ کو اس کی اہمیت چاہیے۔ جتنا بیان آ بھی چکا ہے وہ بھی اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ اب اس کا کوئی پہلو ہی تشنہ نہ رہے۔ پھر اس میں بھی راویوں کے اختلاف سے بڑی حد تک اشتباہ لگ جاتا ہے اس کو براہ راست اسلام کے سر نہ لگانا چاہیے۔ یہاں راوی کا قصور اس لیے نہیں ہوتا کہ ہر شخص اپنے انداز فکر کے مطابق اور اپنے ہی شرائط حفظ کے مطابق روایت کرتا ہے جس کی دوسرے راوی کو نہ اطلاع ہوتی ہے اور نہ وہ ان امور کی پابندی کر سکتا ہے اس طرح ایک ایک حدیث میں بیس مختلف صحابہ سے ملک کے مختلف گوشوں سے سننے میں آتی ہے ضروری طور پر یہاں لفظی اختلاف ہو جانا چاہیے۔ حیرت ہے کہ ایک طبقہ تو یہاں اسی اختلاف کو حدیث سے دست برداری کا ایک اچھا بہانہ بنا لیتا ہے اور دوسرا اسی کو حفاظت حدیث کی دلیل سمجھتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ جب ایک ہی بات ملک کے مختلف حصوں، زمانہ کے مختلف ادوار اور مختلف اشخاص سے مسلسل سنی گئی ہے تو اگر اس کے الفاظ میں تھوڑا سا اختلاف بھی پایا جائے تو بھی یہ اس کا بین ثبوت ہے کہ اصل واقعہ یقیناً اپنی جگہ ہوا ہے اور ضرور ہوا ہے لہذا ایسے مقامات پر جو بات متفقہ طور پر ثابت ہو جائے اس کو مان لینا چاہیے اور جس میں اختلاف باقی رہے اور کوئی راہ ترجیح یا توفیق بھی نہ کھل سکے تو اس کو راویوں کے اختلاف کا نتیجہ سمجھنا چاہیے نہ یہ کہ اصل بیان ہی کو ناقص سمجھ کر اس کو شریعت کے سر رکھا جائے۔



الَّا ذِرَاعٌ فَيَسْتَبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ  
 أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَإِنْ أَحَدُكُمْ لَيَعْمَلُ  
 بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا  
 ذِرَاعٌ فَيَسْتَبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ  
 أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا. (متفق علیہ)

سے عمل کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور اسی طرح تم میں  
 ایک شخص ساری عمر دوزخی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس  
 کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے آخر نوشتہ تقدیر  
 غالب آتا ہے اور وہ جنتی شخص کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل  
 ہو جاتا ہے۔ (متفق علیہ)

(۹۲۶) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ  
 اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ  
 عَمَلَ أَهْلِ النَّارِ وَ إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَيَعْمَلُ  
 عَمَلَ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَ إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ وَإِنَّمَا  
 الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ. (متفق علیہ)

(۹۲۶) سہل بن سعد روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 فرمایا بندہ دوزخی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے اور ہوتا ہے وہ جنتی اور اسی  
 طرح جنتی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے اور ہوتا ہے وہ دوزخی۔ بات یہ ہے  
 کہ دار و مدار صرف خاتمہ پر ہے (اس وقت جیسے عمل ہوں)  
 (متفق علیہ)

وفى لفظ عند مسلم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ان الرجل ليعمل عمل اهل الجنة فيما يبدو للناس و هو من اهل النار و  
 ان الرجل ليعمل عمل اهل النار فيما يبدو للناس و هو من اهل الجنة.

(۹۲۷) وَ عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى

(۹۲۶) \* اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل فیصلہ وہی ہوتا ہے جو قضاء قدر کر چکی ہے رہے اعمال ظاہری تو وہ انسان کے اچھے اور برے  
 ہونے کی صرف ظاہری نشانیاں ہیں اسی کے مناسب ایک حدیث آپ جلد ثانی میں پڑھ چکے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی راہ  
 خدا میں جانبازی دیکھ کر بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہاں اچھے اعمال سے حسن خاتمہ کی امید اور برے اعمال سے سوء خاتمہ کا اندیشہ ضرور ہوتا  
 چاہیے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جہان میں فیصلہ بیشتر عمل کے تابع رکھا گیا ہے لہذا جس کو جنت عطا فرمائیں گے اس سے عمل بھی  
 اہل جنت کے کرائیں گے اور جس کو بخشنا منظور نہیں اس سے پہلے اعمال بھی اسی کے مناسب کرائے جائیں گے تاکہ اعمال اور جزاء کے  
 درمیان ظاہری تناسب بھی باقی رہے اگرچہ وہ اصل علت نہ سہی۔ حق تعالیٰ اچھے عمل والے کو دوزخ میں اور برے عمل والے کو جنت میں بھی  
 داخل فرما سکتا ہے مگر وہ خود یہ خبر دے چکا ہے کہ وہ ایسا کرے گا نہیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ جو دوزخی ہو اس عمل بھی اہل دوزخ کے سے  
 کرائے جائیں تاکہ عمل و جزاء کے مابین مماثلت باقی رہے۔ صحیح مسلم میں یہ لفظ ہیں: ان الرجل ليعمل عمل اهل الجنة فيما يبدو  
 للناس. یعنی ایک شخص لوگوں کو جنتی شخص کے سے عمل کرتا نظر آتا ہے گویا حقیقت کی انہیں خبر نہیں ہوتی کہ وہ دوزخی ہے پس جب مدار خاتمہ پر  
 رہا تو اب ظاہر پر قطعی حکم کیسے لگایا جائے اسی حدیث نے اولیاء اللہ کا خون پانی بنا رکھا ہے کیونکہ یہ خبر کس کو ہے کہ اس کا خاتمہ کیسے اعمال پر  
 ہوگا اور اسی خوف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جلیل القدر صحابی بھی یہاں گریہ و زاری میں مبتلا ہے۔ دیکھو حدیث ۹۲۸۔

(۹۲۷) \* سیاہ و سفید شاید یہ عالم تقدیر میں کامیاب و ناکامیاب کے رنگ مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ  
 اس عالم میں شاید اس وقت ارواح کو کسی خاص قسم کا مختصر سا جسم بھی مرحمت کر دیا گیا تھا حتیٰ کہ بعض علماء نے اس کا نام ہی عالم ذر رکھ دیا ہے۔

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ حِيْنَ خَلَقَهُ فَضَرَبَ كَتِفَهُ مَا لِيْمُنِيْ فَاَخْرَجَ ذُرِّيَّةَ بَيْضَاءَ كَانَتْهُمْ الذَّرُّ وَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُسْرٰى فَاَخْرَجَ ذُرِّيَّةَ سَوْدَاءَ كَانَتْهُمْ الْحُمَمُ فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَمِيْنِهِ اِلَى الْجَنَّةِ وَ لَا اُبَالِيْ وَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ كَتِفِهِ الْيُسْرٰى اِلَى النَّارِ وَ لَا اُبَالِيْ. (رواه احمد)

کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کے دائیں بازو پر ایک ضرب لگائی تو اس سے سفید رنگ کی ایسی چھوٹی چھوٹی ذریعہ نکالی جیسی چوٹی پھر بائیں بازو پر ضرب لگائی تو سیاہ رنگ کی ایسی ذریعہ نکالی جیسا کونڈہ پھر دائیں طرف والی کو فرمایا کہ یہ جنت میں جائیں گے اور مجھے کوئی پروا نہیں اور جو بائیں جانب تھے ان کو فرمایا کہ یہ دوزخ میں جائیں گے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔

(۹۲۸) وَ عَنْ اَبِيْ نَضْرَةَ اَنَّ رَجُلًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَالُ لَهُ اَبُو عَبْدِ اللّٰهِ دَخَلَ عَلَيْهِ اَصْحَابُهُ يَعُوْذُوْنَ وَهُوَ يَبْكِيْ فَقَالُوْا لَهُ مَا يُبْكِيْكَ اَلَمْ يَقُلْ لَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذْ مِنْ شَارِبِكَ ثُمَّ اَقْرَهُ حَتّٰى تَلْقَانِيْ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَبَضَ بِيَمِيْنِهِ قُبْضَةً وَ اُخْرٰى بِالْيَدِ الْاُخْرٰى وَ قَالَ هَذِهِ لِهَذِهِ وَ هَذِهِ لِهَذِهِ وَ لَا اُبَالِيْ وَ لَا اَدْرِىْ فِىْ اَيِّ الْقُبْضَتَيْنِ اَنَا. (رواه احمد و قال الهيثمى رجاله رجال الصحيح)

(۹۲۸) ابونضرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ایک شخص کے پاس جس کی کنیت ابو عبد اللہ تھی عیادت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم آئے تو اس وقت وہ رو رہے تھے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے رونے کا سبب پوچھا اور کہا کیا تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم اپنی لہیں تراشتے رہنا اور اسی طریق پر ہمیشہ قائم رہنا یہاں تک کہ مجھ سے آملو انہوں نے کہا کیوں نہیں ضرور فرمایا تھا، لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے بھی خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دائیں ہاتھ سے ایک مٹھی بھری اور دوسری دوسرے ہاتھ سے پھر فرمایا کہ یہ دائیں مٹھی والے تو جنت کے لیے بنائے ہیں اور یہ بائیں والے دوزخ کے لیے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ دوستو! مجھے کیا علم ہے کہ میں اس کی کس مٹھی میں آ گیا۔

(۹۲۹) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ قَتَادَةَ السُّلَمِيِّ

(۹۲۹) عبد الرحمن بن قتادہ سلمی سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ

(۹۲۸) \* تقدیر کی قہرمانی کا جس کسی کے دل پر ایسا تسلط ہو وہی اس کا ادراک بھی کر سکتا ہے کہ اس ہیبت کے سامنے کیا کسی کا حافظہ ساتھ دیا کرتا ہے یا سب کچھ فراموش ہو جاتا ہے اور صرف ایک دعاء کے سواء کچھ بن نہیں آتی۔ جو قلوب اس خشیت سے خالی ہیں وہ اس کو کیا سمجھیں۔ یہاں انکشاف حال سے قبل اطمینان کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی۔ جب صحابی کا یہ حال ہو تو عامہ مؤمنین کا حال کیا ہونا چاہیے۔ اللھم اقسمنّا من خشیتک ما تحول بہ بیننا و بین معاصیک۔

(۹۲۹) \* ان تمام احادیث کے آخر میں لفظ ”لا ابالی“ (ہمیں کوئی پروا نہیں) حق تعالیٰ کی شان بے نیازی کے اظہار کے لیے بیان ہوتا جا رہا ہے وہاں نہ اس کی پروا ہے کہ جنتیوں پر اس انعام و اکرام کا انتظام کہاں سے ہو گا اور نہ اس کا غم ہے کہ یہ سارے جہنمی مل کر ہمارے خلاف کیا سازش بنائیں گے۔



سَمِعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ  
خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ ثُمَّ خَلَقَ الْخَلْقَ مِنْ ظَهْرِهِ ثُمَّ  
قَالَ هَؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَلَا أَبَالِي وَهَؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَلَا  
أَبَالِي فَقِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَعَلَى مَاذَا نَعْمَلُ  
قَالَ مُوَافَقَةَ الْقَدَرِ. (رواه الحاكم قال الذهبي

على شرطهما الى الصحابي)

(۹۳۰) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَرَجَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِي يَدَيْهِ  
كِتَابَانِ فَقَالَ أَتَدْرُونَ مَا هَذَانِ الْكِتَابَانِ قُلْنَا  
لَا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِلَّا أَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِي  
فِي يَدِهِ الْيُمْنَى هَذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ  
فِيهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَسْمَاءُ آبَاءِهِمْ وَ  
قَبَائِلِهِمْ ثُمَّ أُجْمِلَ عَلَى آخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ  
فِيهِمْ وَلَا يُنْقَضُ مِنْهُمْ أَبَدًا ثُمَّ قَالَ لِلَّذِي فِي  
شِمَالِهِ هَذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ فِيهِ  
أَسْمَاءُ أَهْلِ النَّارِ وَأَسْمَاءُ آبَاءِهِمْ وَ قَبَائِلِهِمْ  
ثُمَّ أُجْمِلَ عَلَى آخِرِهِمْ فَلَا يُزَادُ فِيهِمْ وَلَا  
يُنْقَضُ مِنْهُمْ أَبَدًا فَقَالَ أَصْحَابُهُ فَفِيمَ الْعَمَلُ  
يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنْ كَانَ أَمْرٌ قَدْ فَرِغَ مِنْهُ فَقَالَ  
سَدُّوْا وَقَارِبُوا فَإِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يَخْتِمُ لَهُ  
بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنْ عَمِلَ أَيْ عَمَلٍ وَإِنْ

صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت آدم علیہ  
السلام کو پیدا فرمایا اس کے بعد ان کی پشت سے بتیہ انسانوں کو نکالا اور فرمایا  
یہ تو جنت کے لیے بنائے ہیں اور یہ دوزخ کے لیے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔  
اس پر کسی نے عرض کی یا رسول اللہ معاملہ جب یوں ہے تو اب عمل کس لیے؟  
فرمایا وہ تو تقدیر میں لکھے جا چکے۔ (اس کے موافق ہو کر رہیں گے)

(متدرک)

(۹۳۰) عبد اللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم اپنے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں لیے ہوئے باہر تشریف لائے اور  
فرمایا جانتے ہو یہ کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے کہا یا رسول اللہ ہمیں کیا پتہ آپ  
ہی بتائیں تو کچھ پتہ چلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کی طرف  
اشارہ کر کے فرمایا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں تھی یہ وہ  
کتاب ہے جس میں پروردگار عالم نے تمام جنتی اشخاص کے نام اور ان کے  
باپ دادوں کے اور قبیلوں کے نام لکھ دیئے ہیں۔ اور آخر میں ان کی میزان  
بھی لگا دی ہے اب اس میں نہ کسی اور نام کا اضافہ ہو سکتا ہے نہ کمی ہو سکتی ہے  
پھر جو کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں ہاتھ میں تھی اس کی طرف  
اشارہ کر کے فرمایا یہ وہ کتاب ہے جس میں تمام دوزخی اشخاص کے نام ہیں  
اور ان کے باپ دادوں اور قبیلوں کے نام ہیں۔ ان کے آخر میں بھی میزان  
لگا دی ہے اب اس میں بھی کسی نام کا اضافہ اور کمی نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے فرمایا رسول اللہ اگر دوزخی اور جنتی ہونا پہلے  
سے لکھا جا چکا ہے تو پھر عمل کرنے کا کیا فائدہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا کہ بلند پروازیاں چھوڑو اور سیدھے سیدھے عمل کیے جاؤ، کیونکہ جنتی

(۹۳۰) \* اس حدیث کے سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ کے ہاتھوں میں جو دو کتابیں تھیں وہ حقیقتاً دو کتابیں ہی تھیں۔  
حدیث کے الفاظ از اول تا آخر بار بار پڑھیے ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کو یہ خیال نہیں آ سکتا کہ یہاں راوی نے کسی حقیقت کو مجازی صورت  
سے بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے پھر جب کہ نبی کا تعلق خود عالم غیب سے اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو جنت کے باغوں میں سے انگور کا  
خوشہ توڑ لائے اور ہم کو دے دے چاند کی طرف اشارہ کرے تو اس کے دو ٹکڑے کر دے انگلیوں کو جھکا دے تو اس سے چشمے لہجہ.....

صَاحِبِ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ وَإِنْ عَمِلَ أَى عَمَلٍ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدَيْهِ فَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ فَرَعَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ. (رواه الترمذی)

(۹۳۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي رَجُلٌ شَابٌّ وَ أَنَا أَخَافُ عَلَى نَفْسِي الْعَنَتَ وَ لَا أَحَدٌ مَّا اتَّزَوْجُ بِهِ النِّسَاءَ فَسَكَتَ عَنِّي ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذَلِكَ فَسَكَتَ عَنِّي ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذَلِكَ فَسَكَتَ عَنِّي ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذَلِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ فَاخْتَصِ عَلَى ذَلِكَ أَوْ ذَرُ.

شخص کا خاتمہ ایسے ہی اعمال پر ہوگا جو دوزخی اشخاص کے ہوتے ہیں اگرچہ اس سے قبل کیسے ہی اچھے کام کرتا ہو۔ اس کے بعد آپ نے اشارہ کر کے دونوں کتابوں کو اپنے پیچھے کی طرف پھینک دیا اور فرمایا کہ تمہارا پروردگار سب کچھ لکھ لکھا کر فارغ ہو چکا، بس اسی کے مطابق اب کچھ لوگ جنت میں چلے جائیں گے اور کچھ دوزخ میں۔ (ترمذی شریف)

(۹۳۱) ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ میں نو جوان شخص ہوں عورتوں سے نکاح کے مصارف میرے پاس نہیں مجھے اپنے نفس پر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے (اجازت ہو تو خسی ہو جاؤں) یہ سن کر آپ خاموش رہے میں نے پھر عرض کی آپ پھر خاموش ہو رہے ہیں میں نے پھر مکرر عرض کی اور پھر بدستور خاموش رہے (ابو ہریرہؓ کا منشاء یہ تھا کہ آپ ان کو خسی ہونے کی اجازت دے دیں) جب میں نے چوتھی بار وہی سوال دہرایا تو آپ نے فرمایا۔ تمہیں جس جس مصیبت میں بھی گرفتار ہونا ہے وہ تو تقدیر کا قلم لکھ لکھا کر فارغ بھی ہو چکا، اب چاہو تو خسی ہو جاؤ اور چاہے رہنے دو۔ (بخاری شریف)

(رواہ البخاری)

اللہ..... پھوٹ نکلیں اگر ایسے ہاتھوں میں آپ دو کتابوں کا ذکر سنتے ہیں تو اس پر چوکتے کیوں ہیں اور کیوں اس کی تاویل کی فکر میں پڑ جاتے ہیں جو لوگ عالم غیب پر ایمان نہیں رکھتے وہ اسی ایک جگہ کیا ہر جگہ عالم تردد ہی میں پڑے رہتے ہیں ان کا غم نہ کھائیے۔ ان کے تو یہ بھی فہم سے بالاتر ہے کہ اتنی غیر متناہی مخلوق کے اسماء کے لیے اتنا مختصر دفتر کیسے ہو سکتا ہے وہ صرف دنیا کا شارٹ ہینڈ ہی جانتے ہیں وہ مسکین کیا جانیں کہ غیب کے اختصار و طول کا عالم کیا ہوتا ہے ﴿وَإِنْ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ نبی کی پراسرار ہستی اگر عالم غیب کی دو کتابیں اپنے ہاتھوں میں لے آتی ہے اور ایک اشارہ سے پھر انہیں عالم غیب میں پہنچا دیتی ہے تو اس کو بسر و چشم قبول کر لیجئے اور فکر یہ کیجئے کہ معلوم نہیں آپ کا نام کس فہرست میں درج ہو چکا ہے۔

یہاں کمی و بیشی کے لیے جتنے احتمال ہو سکتے تھے سب کو ذکر کر کے میزان کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ جس طرح اس صورت میں زیادتی کمی کا کوئی موقع نہیں رہتا اسی طرح اب نئے جنتی اور نئے دوزخی بننے کا بھی کسی کے متعلق کوئی احتمال باقی نہیں رہا۔ قضاء و قدر کی قہر مانی اور تسلط کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۹۳۱) \* آپ کی بار بار کی خاموشی بتا رہی تھی کہ منشاء مبارک کیا ہے مگر حاجت مند اور حکم کا منتظر چاہتا تھا کہ کسی طرح بھی ہو اگر اس کو خسی ہو جانے کی صراحت اجازت مل جائے تو وہ اس تکلیف کو برداشت کر کے زناء جیسی مصیبت سے بچ رہے۔ سبحان اللہ معصیت سے صحابہؓ کے تنفر کا عالم بھی کیا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی زناء سے اس درجہ نفرت گو قابل داد تھی مگر ان کے بار بار اصرار سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ اللہ.....



(۹۳۲) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ أَصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ يَصْرِفُهُ كَيْفَ يَشَاءُ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُمَّ مُصَرِّفِ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ. (رواه مسلم)

(۹۳۲) عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام انسانوں کے دل رحمن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جس طرف چاہتا ہے ان کو پھیر سکتا ہے اس کے بعد آپ نے یوں دعا فرمائی اے دلوں کے لوٹنے پلٹنے والے ہمارے دلوں کو تو اپنی تابعداری ہی کی طرف جھکائے رکھنا۔

(مسلم شریف)

(۹۳۳) عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ أَنْ يَقُولَ يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى ذِيكَ فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللَّهِ أَمَّا بِكَ وَبِمَا جِئْتَ بِهِ فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا قَالَ نَعَمْ إِنَّ الْقُلُوبَ بَيْنَ أَصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللَّهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ.

(۹۳۳) انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات یوں دعا فرماتے اے قلوب کے پلٹنے والے میرے قلب کو اپنے دین پر جمائے رکھ ایک مرتبہ میں نے عرض کی یا نبی اللہ ہم تو آپ پر اور آپ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے ہیں کیا آپ کو ہمارے متعلق اب بھی کوئی خطرہ باقی ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں قلوب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں ان کو جیسے چاہے پلٹ سکتا ہے۔

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

(ترمذی و ابن ماجہ)

اللہ ..... وہ اپنی اس تدبیر سے گویا تقدیر کو بھی پلٹ دیں گے اس لیے صاحب شریعت نے بڑے تاثر کے انداز میں فرمایا: ابو ہریرہ! تقدیر کے سامنے تدبیر کی کچھ پیش نہیں جاتی 'تقدیر کا قلم چل چکا ہے۔ اب اگر تمہاری قسمت میں زنا لکھا جا چکا ہے تو وہ ہو کر رہے گا اور اگر مقدر نہیں ہوا تو پھر اگر خصی نہ بھی ہو گے جب بھی نہیں ہو سکتا اب چاہو تو خصی بن جاؤ اور چاہو تو رہنے دو۔ آپ کے جملوں کے بعد قضاء و قدر کی گرفت کا جتنا اثر ہو سکتا تھا ظاہر ہے۔ اس لیے اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ کو آئندہ سوال کی نہ جرات ہوئی نہ ضرورت رہی۔ دوسری جگہ حدیثوں میں موجود ہے کہ اس قسم کی ضرورت کے وقت شریعت نے روزہ رکھنے کی تعلیم فرمائی ہے۔ روزہ اگر ہماری سی سحری و افطاری کے ساتھ نہ ہو تو اس خواہش کے قطع کرنے کا بہترین علاج ہے۔ اس کے بعد ایسے خلاف فطرت فعل کا حاصل کیا؟

(۹۳۲) \* حق تعالیٰ کی علی الاطلاق قدرت اور بندہ کی انتہائی بے چارگی اور بے بسی کا نقشہ اس سے زیادہ مؤثر اور مختصر انداز میں اداء نہیں کیا جاسکتا۔ ایک نیم مختار انسان جب کبھی اپنے اختیار کلی کے اظہار کا ارادہ کرتا ہے تو وہ مخاطب کے سامنے انگلیوں کا اشارہ کر کے ہی اس کو سمجھاتا ہے۔ یہاں اسی معبود طریقہ کو استعمال کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ اعضاء سے منزہ و مبرا ہے۔ احادیث میں بندہ کو مختار ثابت کیا گیا ہے مگر ایسا مختار جس کے اوپر قدرت کا اختیار اس طرح مسلط ہے کہ اس کے بعد اس اختیار کی ہستی فناء ہو جاتی ہے اور حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس اعتقاد کے بعد انسان کی زبان پر جو بے ساختہ درخواست آئی چاہیے وہ سب سے پہلے ایک یہی۔ پروردگار! ہمارے دلوں کو اپنی تابعداری کی طرف ہی جھکائے رکھنا۔

(۹۳۳) \* یہاں صحابہ کرام کے فہم و ادب پر بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء سنتے ہیں آپ اللہ .....

(۹۳۴) عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْقَلْبِ كَرِيشَةٍ بَارِضٍ فَلَاةٌ يُقَلِّبُهَا الرِّيحُ ظَهَرَ الْبَطْنِ. (رواه احمد و ابن ماجه و فى الزوائد اسناده ضعيف ففیه یزید الرقاشی و قد اجمعوا على ضعفه)

(۹۳۴) ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انسان کے قلب کی مثال اس پر کی سی ہے جو بیابان زمین میں پڑا ہوا ہو اور ہوائیں اس کو کبھی سیدھا اور کبھی الٹا کر رہی ہوں۔

(ابن ماجہ، مسند امام احمد)

(۹۳۵) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَتَذَكَّرُ مَا يَكُونُ إِذْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهِ فَصَدَّقُوهُ وَإِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهِ فَلَا تُصَدِّقُوهُ فَإِنَّهُ يَصِيرُ إِلَى مَا جُبِلَ عَلَيْهِ.

(۹۳۵) ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگوں کے عادات و اخلاق کے متعلق کچھ ذکر کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو اس کی تصدیق کر لینا اور اگر یہ سنو کہ کسی شخص کی فطری عادات بدل گئی ہیں تو اس کی تصدیق نہ کرنا۔ آخر کار ایک دن وہ پھر ان ہی خصائل کی طرف لوٹے گا جس پر کہ اس کی پیدائش ہوئی ہے۔ (احمد)

(رواه احمد قال الهیثمی و رجاله رجال الصحيح الا ان الزهری لم یدرك ابا الدرداء)

اللہ..... کے حق میں اور سمجھتے ہیں اپنے حق میں اسی لیے سوال یہ کرتے ہیں کہ جب ہم آپ پر ایمان لا چکے تو کیا پھر بھی آپ کو ہمارے متعلق کوئی خطرہ ہے۔ آپ کا جواب یہ ہے جی ہاں مقام صحابیت پر فائز ہو جانے کے بعد بھی کوئی شخص قضاء و قدر کے قابض نہ تصرف سے نڈر نہیں ہو سکتا۔ خوف کی بات بہر حال خوف ہی کی رہتی ہے شانِ بندگی اسی میں ہے کہ کسی بلند سے بلند مقام پر پہنچ جانے کے بعد بھی مختارِ کل کے اختیار سے ڈرتا رہے۔ اس جگہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ صحابہ کرام جو بڑی حد تک ان خطرات سے مامون تھے جب ان کے متعلق بارگاہِ نبوت سے جواب یہ ملا تو پھر ماوشا کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

(۹۳۴) \* ایک وسیع جنگل میں تند و تیز ہوا اور ایک ذرا سے پرکا بھلا کیا مقابلہ لیکن پھر یہ دونوں مخلوق ہی مخلوق ہیں اور دونوں کے دونوں محکوم ہی محکوم ہیں۔ قلوب بنی آدم کی جو نسبت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے وہ تو خالق و مخلوق اور حاکم و محکوم کی ہے یہاں اس بے چارگی کا اندازہ ہی کیا لگایا جاسکتا ہے یہاں وہ نسبت بھی نہیں ہے جو عدم کو وجود سے، لیکن احادیث میں بسا اوقات حقیقت سے ہٹ کر محاورات کے مطابق کلام اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس کا اصل مقصد تفہیم و تعلیم ہوتا ہے انسان جتنا جلد اپنے محاورات سے کسی حقیقت کو سمجھ سکتا اور متاثر ہو سکتا ہے اتنا وہ فلسفیانہ تعبیرات سے کسی حقیقت کو نہیں پاسکتا اور نہ ان سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اسی لیے کہیں احادیث میں اصابع (انگلیوں) کا لفظ بھی آیا ہے اور کہیں مذکورہ بالا حدیث کے اندازِ بیان کو اختیار کیا جا رہا ہے تاکہ ان امثال سے انسان اپنی بے چارگی کا اندازہ لگا سکے اور اس کے بعد حق تعالیٰ کی بالا است قدرت و اختیار کے سامنے جتنا اسے جھکنا چاہیے جھک جائے۔

(۹۳۵) \* انسان کی عادات و اخلاق بھی چونکہ کاتبِ تقدیر کے قلم کے نیچے آچکی ہیں اس لیے جس طرح قضاء و قدر کے دوسرے شعبوں میں تبدیلی و ترمیم نہیں ہو سکتی اسی طرح اس میں بھی نہیں ہو سکتی اسی لیے مشہور ہے: ”جبل گرد و جلی نہ گرو“ عقلاء کے مابین ایک مسئلہ یہ بھی زیر بحث ہے کہ اخلاق کسی ہیں یا خلقی؟ اس حدیث سے اس پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ غرض انسانی اختیار کا افسانہ جتنا اس لئے.....



(۹۳۶) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ رَبِيعَةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ عَبْدِ اللَّهِ يَعْنِي ابْنَ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَذَكَرَ الْقَوْمُ رَجُلًا فَذَكَرُوا مِنْ خُلُقِهِ فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ أَرَأَيْتُمْ لَوْ قَطَعْتُمْ رَأْسَهُ أَكُنْتُمْ تَسْتَطِيعُونَ أَنْ تُعِيدُوهُ قَالُوا لَا قَالَ فَيَدُهُ قَالُوا لَا قَالَ فَرِجْلُهُ قَالُوا لَا قَالَ فَإِنَّكُمْ لَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تُغَيِّرُوا خُلُقَهُ.

(رواہ الطبرانی قال الہیثمی و رجالہ ثقات)

(۹۳۷) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ أُمُّ حَبِيبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا زَوْجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلْهَمَ امْتَعْنِي بِزَوْجِي رَسُولَ اللَّهِ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) وَبَابِي أَبِي سُفْيَانَ

(۹۳۶) عبد اللہ بن ربیعہ روایت کرتے ہیں کہ ہم عبد اللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے لوگوں نے ایک شخص کا ذکر کیا اور اسی ضمن میں اس کے عادات و اخلاق کا ذکر بھی آ گیا۔ اس پر حضرت ابن مسعود نے فرمایا: تم لوگ بتاؤ اگر تم اس کا سر کاٹ دو تو کیا اس کو پھر جوڑ سکتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ فرمایا اچھا اگر اس کا ہاتھ کاٹ ڈالو تو کیا پھر اس کو جوڑ سکتے ہو؟ وہ بولے نہیں۔ آخر میں فرمایا اچھا پیر؟ انہوں نے کہا یہ بھی نہیں۔ فرمایا اگر تم یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تو یاد رکھو اسی طرح اس کے عادات و اخلاق کو بھی بدل نہیں سکتے۔ (طبرانی)

(۹۳۷) عبد اللہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ام حبیبہ زوجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ دعا مانگی کہ الہ العالمین میرے شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے والد ابوسفیان اور میرے بھائی معاویہ کا سایہ مدت دراز تک مجھ پر قائم رکھنا۔ یہ دعا سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اللہ..... عالم میں گرم ہے عالم غیب میں وہ اتنا ہی سرد ہے۔ یہ قدرت کا کمال ہی کمال ہے کہ جو سرتاپا مجبور ہے وہ مختار ہی مختار نظر آتا ہے۔ (۹۳۶) \* اس حدیث سے اوپر کی حدیث کی ذرا اور تشریح ہو جاتی ہے اس لیے اس کو یہاں نقل کیا گیا ہے۔ ابودرداء کی اوپر والی حدیث میں ایک نہایت لطیف نکتہ ہے وہ یہ کہ حدیث میں ”جسل“ کا لفظ استعمال کیا ہے ”جبر“ کا نہیں استعمال کیا گویا بندہ خیر و شر پر مجبور یعنی مخلوق تو ہوتا ہے مگر ان پر مجبور نہیں ہوتا۔ بے شک جیسا حدیث میں انسان کا انجام وہی ہوگا جس پر وہ مخلوق ہوا ہے مگر اس سے خیر و شر کا ظہور ہوگا بالا اختیار ہی اس لیے اس کو مجبور تو کہا جائے گا لیکن مجبور نہیں کہا جاسکتا۔ دیکھو شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ۳۷۳۔

(۹۳۷) \* دیکھئے یہاں بھی حضرت ام حبیبہ کی دعا کچھ ایسی دعا نہ تھی جس کو انسان کی فطرت نہ کہا جاسکے لیکن صاحب نبوت کو یہاں ایک دوسرا تاثر پیدا کرنا تھا جو انسان کی فطرت میں خود بخود موجود نہیں ہوتا، ہاں نبی جیسا معلم اس کو پیدا کر دیتا ہے۔ کسی بی بی کے پہلو میں اپنے محبوب ترین شوہر کسی لڑکی کے دل میں اپنے مکرم ترین والد اور کسی ہمشیرہ کے قلب میں اپنے عزیز ترین بھائی کی حیات کے کتنے ارمان ہو سکتے ہیں یہ ظاہر ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سارے جذبات کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیتے ہیں کہ یہ تو سب طے شدہ باتیں ہیں جس کا جتنا رزق جس کی جتنی عمر اور جو وقت موت لکھ دیا گیا ہے اس سے ایک انچ بھر بھی اس سے تجاوز نہیں ہو سکتا۔ یہ دعا مانگنی اتنی اہم نہیں، اہم یہ ہے کہ دوزخ یا قبر کے عذاب سے نجات کی دعا مانگی جائے حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جس طرح پہلی باتیں مقدر ہو چکی ہیں عذاب و ثواب کا مسئلہ بھی مقدر ہو چکا ہے مگر انسان کو اس کا علم تو حاصل ہوتا ہے لیکن اس دعا کے لیے اس کے قلب میں وہ جذبات نہیں اٹھتے جو شوہر یا والد کی درازی عمر کے لیے اٹھتے ہیں آپ چاہتے ہیں کہ آخرت کا استحضار اتنا ہو کہ دعا کے موقع پر عزیز سے عزیز کی درازی عمر سے پہلے اپنی آخرت کا تصور آ جائے اور اس طرح شریعت اُس جگہ آ جائے جہاں انسان کی فطرت ہوتی ہے۔ جب آخرت کا استحضار اتنا نصیب لہے.....

وَبَاخَى مُعَاوِيَةَ قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ سَأَلَتِ اللَّهُ لِأَجَالِ مَضْرُوبَةٍ وَ أَيَّامٍ مَعْدُودَةٍ وَ أَرْزَاقٍ مَقْسُومَةٍ لَنْ يُعْجَلَ شَيْئًا قَبْلَ حِلِّهِ أَوْ يُؤَخَّرَ شَيْئًا عَنْ حِلِّهِ وَ لَوْ كُنْتُ سَأَلْتُ اللَّهَ أَنْ يُعِزُّكَ مِنْ عَذَابِ فِي النَّارِ أَوْ عَذَابِ فِي الْقَبْرِ كَانَ خَيْرًا أَوْ أَفْضَلَ قَالَ وَ ذَكَرْتُ عَنْهُ الْقِرْدَةُ قَالَ مِسْعَرٌ وَ أَرَاهُ قَالَ وَ الْخَنَازِيرُ مِنْ مَسْخٍ فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ لَمْ يَجْعَلْ لِمَسْخٍ نَسْلًا وَ لَا عَقَبًا وَ قَدْ كَانَتِ الْقِرْدَةُ وَ الْخَنَازِيرُ قَبْلَ ذَلِكَ.

(رواه مسلم)

تم نے اللہ تعالیٰ سے دعاء تو کی مگر ایسی مدتوں کے لیے جو پہلے سے مقرر شدہ ہیں۔ ان کی زندگی کے ایام سب شمار کیے جا چکے ہیں، ان کے رزق بھی سب تقسیم شدہ ہیں اللہ تعالیٰ وقت سے پہلے ان میں سے نہ کسی چیز کو مقدم کرے گا اور نہ وقت کے بعد اس کو مؤخر کرے گا۔ کاش اگر تم دوزخ کے عذاب یا قبر کے عذاب سے پناہ مانگتیں تو اس سے بہتر رہتا (یہاں راوی کو خیر یا افضل کے لفظ میں میں تردد ہو گیا ہے) راوی کہتا ہے کسی شخص نے اس وقت بندروں کا ذکر چھیڑ دیا کہ کیا وہ مسخ شدہ قوم ہے، مسعر کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ سوروں کے متعلق بھی ذکر آیا اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کسی مسخ شدہ قوم کی نسل جاری نہیں کی اور نہ وقت مقرر کے بعد ان میں سے کسی کو باقی رکھا ہے۔ آخر بندر اور سور ان سے پہلے بھی تو ہوا کرتے تھے۔ (مسلم شریف)

للہ..... ہو جائے تو اب امید کرنی چاہیے کہ وہ جاں کنی کی تکالیف میں 'ملک الموت کی ہیبت' شیطان کے اغواء اور منکر و نکیر کے سوال کے وقت بھی ان شاء اللہ تعالیٰ صحیح و سالم رہے گا۔ قضاء و قدر کے تسلط اور آخرت کی اہمیت ذہن نشین کرنے کا یہ بھی کیا نرا انداز ہے۔ موت کی گھڑیاں بھی کیسی گنی چنی ہوتی ہیں کہ آپ نے جلد اول حدیث نمبر ۸۳ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ دیکھئے حق تعالیٰ کو اپنے نبی کی یہاں کتنی خاطر داری بھی منظور ہے اس لیے یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ ایک نیل کی کمر پر ہاتھ رکھ دو جتنے بال تمہارے ہاتھ کے نیچے آ جائیں گے اتنے سال تمہاری عمر اور ہوگی، مگر اس کے بعد بھی موت کا وقت مقرر نہیں ملتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ جب اتنے سالوں کے گزرنے کے بعد بھی موت سے چارہ نہیں ہے تو پھر اس جام کو آج ہی کیوں نہ منہ سے لگا لیا جائے یہ کہہ کر وہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ پس موت کا وقت نبی کا بھی ملنا نہیں کرتا اور کسی کا تو ذکر کیا ہے۔ اب بھی آپ کچھ سمجھے کہ تقدیر کا جبر انسان کے اختیار پر کس طرح مسلط ہے اور وہ کتنی آسانی سے انسانی اختیار کو اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہے دیکھئے ابھی ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی موت پر کیسے ناراض تھے یا ابھی کیسے خوش نظر آ رہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہاں مسخ شدہ قوموں کے متعلق تھا۔ سوال و جواب کے انداز سے یہ صاف ظاہر ہے کہ جن حضرات نے مسخ سے معنوی مسخ اور طبائع کی کجی مراد لی ہے وہ محض باطل اور غلط خیال ہے اس بناء پر نہ کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ آپ کا جواب منطبق ہوتا ہے ہاں یہ بات بھی مسلم ہے کہ شکلیں اسی وقت مسخ کی جاتی ہیں جب کہ قلوب پہلے مسخ ہو جاتے ہیں۔ پس مسخ کا تعلق صرف ظاہر شکلوں ہی کے ساتھ نہیں ہوتا باطن پر اس کا اثر پڑتا ہے اُولَئِكَ كَانُوا لَإِنْعَامٍ بَلْ هُمْ أَصْلٌ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ انسان جب اپنے باطن بندر اور سور کے خصال اختیار کر لے تو پھر اس کے لیے احسن تقویم کی صورت زیبا نہیں رہتی اور مشیۃ الہیہ کبھی کبھی ان کے ظاہر کو بھی باطن کے ہم شکل بنا دیتی ہے تاکہ آئندہ انسان اس کے ذکر سے عبرت حاصل کرے۔



(۹۳۸) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلْتُمْ عَلَى الْمَرِيضِ فَنَفْسُوَالَهُ فِي أَجَلِهِ فَإِنَّ ذَلِكَ لَا يَرُدُّ شَيْئًا وَيَطِيبُ بِنَفْسِهِ . (رواه الترمذی و ابن ماجه و قال الترمذی غریب)

(۹۳۸) ابو سعید روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم کسی بیمار کی عیادت کو جایا کرو تو اس کی درازی عمر کے کلمات کہا کرو کیونکہ تمہارے اس کہنے سے کچھ تقدیر تو بدلتی نہیں البتہ مریض کا دل خوش ہو جاتا ہے۔

(ترمذی شریف - ابن ماجہ)

(۹۳۹) عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ وَلَدَ جَعْفَرٍ تُسْرِعُ إِلَيْهِمُ الْعَيْنُ أَفَأَسْتَرْتَنِي لَهُمْ قَالَ نَعَمْ فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابِقُ الْقَدَرِ لَسَبَقْتَهُ الْعَيْنُ . (رواه الترمذی و احمد و ابن ماجه و قال الترمذی حسن صحیح)

(۹۳۹) اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ جعفرؓ کے بچوں کو نظر بڑی جلدی لگ جاتی ہے کیا میں ان پر یہ منتر پڑھ سکتی ہوں؟ فرمایا پڑھ سکتی ہو کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر پر بھی غالب آ سکتی تو وہ نظر ہوتی۔

(ترمذی - ابن ماجہ - احمد)

(۹۳۸) \* اسلام کو باہم مروت و اخلاق اور ہمدردی کی بھی کس حد تک رعایت منظور ہے کہ وہ ایک بیمار کے حق میں ایسے کلمات کہہ دینے کی بھی اجازت دے دیتا ہے جن کے متعلق اگر کہیں صریح اجازت نہ آ جاتی تو شاید ممانعت کا شبہ لگ سکتا تھا۔ لیکن یہ انبیاء علیہم السلام کا کمال ہے کہ وہ عام مخاطب میں بھی اس کا خیال رکھتے ہیں کہ کسی گوشہ سے بھی اسلام کے کسی اہم نقطہ نظر کو نہیں نہ لگنے پائے۔ دیکھئے یہاں کس طرح عیادت کے بیان میں تقدیر کا سبق تازہ کیا جا رہا ہے اور کس طرح تنبیہ کی جا رہی ہے کہ وہ عالم ناقابل ترمیم ہے اور اس کے فیصلے سب اہل ہیں لیکن جب وہ ہمارے علم میں نہیں تو پھر اگر کسی تعبیری طریقہ سے ہمارے بھائی کا دل خوش ہوتا ہے تو اس سے بخل کیوں کیا جائے مگر یہ نکتہ پھر فراموش نہ ہو کہ ہوگا یہ سب کچھ لفظی جمع خرچ جو مقدر ہے وہی ہو کر رہے گا۔

واضح رہے کہ اخلاق اس کا نام نہیں کہ محض کسی کا دل خوش کرنے کے لیے خلاف واقع کلمات کہہ دیئے جائیں یہ تو کذب ہے۔ اخلاق یہ ہے کہ جہاں ہمارا علم قاصر ہو وہاں ہم اللہ تعالیٰ سے اچھی ہی امید رکھیں اور وہی اپنی زبانوں سے نکالیں انا عند ظن عبدی بی۔ یہ تمام وسعتیں صرف اس لیے ہیں کہ تقدیر پر وہ غیب میں رکھی گئی اگر کہیں ظاہر کر دی جائے تو دنیا کی ساری چہل پہل ایک آن میں ختم ہو جائے۔ اس پر بھی عاقبت نااندیش انسان تقدیر ہی کے سراغ لگانے کی فکر میں پڑا رہتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ اس کے حق میں اس کا انخفاء اس کے اظہار سے کہیں سودمند ہے۔

(۹۳۹) \* نظر لگنے کی حقیقت کچھ بھی سہی لیکن یہ امر واقعہ کہ نظر ضرور لگتی ہے۔ دو چار مغلوب العقل انسانوں کے صرف مذاق اڑا دینے سے ہزاروں انسانوں کے تجربے کی تکذیب نہیں کی جاسکتی حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس کے وجوہ و اسباب اور اس کی حقیقت پر بصیرت افروز بحث کی ہے۔ پھر جس طرح نظر لگنے کی حقیقت عام طور پر نہیں سمجھی جاتی اسی طرح اس کے علاج بھی اکثر اسی طرح کے کلمات ہیں جو بیشتر معقول المعنی نہیں ہوتے اس قسم کے مقامات پر حدیث کا رویہ کتنا معتدل ہے کہ وہ نہ تو واقعات کا انکار کرتی ہے اور نہ غیر معقول امور کی حقیقت کے دریافت کے درپے ہوتی ہے۔ بلکہ اس امر کے متعلق جو عوام کا دستور چلا آتا ہے اگر اس میں کوئی شرعی سقم نہیں للہ.....

(۹۴۰) عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُونَ كُفْرًا وَكَادَ الْحَسَدُ أَنْ يَغْلِبَ الْقَدْرَ.

(۹۴۰) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے احتیاج میں کفر تک نوبت پہنچ سکتی ہے اور حسد ایسی سخت چیز ہے کہ کہیں تقدیر پر بھی غالب نہ آجائے۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

(شعب الایمان)

يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ

حق تعالیٰ کے علم ازلی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی قضاء و قدر کے تحتانی مراتب میں تبدیلی بھی ہو جاتی ہے

(۹۴۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَسَقَطَ عَنْ ظَهْرِهِ كُلُّ نَسَمَةٍ

(۹۴۱) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کر لیا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان کی نسل سے جتنی اولاد اس کو تا قیامت پیدا کرنی تھی

لہذا ..... ہوتا تو اس میں دست اندازی نہیں کرتی۔ اسی ضابطہ کے مطابق نظر لگنے کا معاملہ بھی ہے اہل تجربہ کے نزدیک جو کلمات یا جو طریقے اس بارے میں مفید ثابت ہو چکے ہیں اگر وہ کلمات شرکیہ پر مشتمل نہ ہوں تو یہ صرف ایک علاج کے طور پر ہوں گے اس لیے شریعت ان سے ممانعت بھی نہیں فرماتی اور نہ ان کے استعمال کی رغبت دلاتی ہے۔ نظر اور سانپ بچھو کا کانایہ سب ایسی موزی چیزیں ہوتی ہیں کہ اس میں مریض طبیب کا انتظار بھی نہیں کر سکتا اور ان میں تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اکثر جھاڑ پھونک فوری فائدہ بخش ہو جاتی ہیں کہ اس میں مریض طبیب کا انتظار بھی نہیں کر سکتا اور ان میں تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اکثر جھاڑ پھونک فوری فائدہ بخش ہو جاتے ہیں اس لیے ایسے مواقع پر جھاڑ پھونک سے آپ نے روکا بھی نہیں اور اجازت دے دی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمادی کہ چونکہ نظر کی تاثیر اتنی قوی ہوتی ہے کہ اگر تقدیر بھی کسی چیز سے بدل سکتی تو نظر سے بدل جاتی۔ اس لیے اس بارے میں اپنے تجربوں پر عمل کر سکتے ہو بشرطیکہ وہ ممنوعات شرعیہ سے خالی ہوں۔

(۹۴۰) \* فقر جب حد سے تجاوز کر جائے تو اس کا نتیجہ کبھی کفر کی صورت میں بھی نکل آتا ہے۔ دوسری چیز جو انتہاء درجہ خطرناک ہے وہ حسد ہے اسی لیے سورہ فلق میں حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی تعلیم کی گئی ہے اس کی تاثیر کو اس انداز میں ادا کیا گیا ہے کہ جو چیز کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتی وہ تقدیر ہے کہ سب اس کے زیر اثر ہیں اور وہ کسی کے زیر اثر نہیں اور حقیقت ہے بھی یہی کہ جو علم الہی ہے وہ کسی کے زیر اثر ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز تقدیری فیصلوں پر بھی اثر انداز ہو سکتی تو وہ حسد ہوتا۔ سلسلہ اسباب و مسببات میں انسانی عزائم کو بڑا دخل ہی حاسد کا نفس جب ہمہ وقت پوری عزیمت کے ساتھ کسی کے درپے ہو جاتا ہے تو یہاں بھی ایسے ایسے شگونے کھلنے لگتے ہیں جس سے شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید تقدیر ہی بدل دی گئی ہے۔

(۹۴۱) \* تقدیر کی کتابت کے پانچ نمبروں میں سے یہ وہی دوسرا نمبر ہے جس کو ابھی آپ حدیث کی شرح میں بحوالہ حضرت شاہ ولی اللہ پڑھ چکے ہیں۔ اس سے پہلا مرتبہ علم الہی کا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اس مرتبہ کے لحاظ سے حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر سو سال ہی کی تھی مگر اس حساب سے ۶۰ + ۴۰ = ۱۰۰۔ یعنی حق تعالیٰ جس کو عالم کا ذرہ ذرہ روشن ہے یہ جانتا تھا کہ آئندہ واقعہ اس طرح پیش آئے گا.....



وہ سب ظاہر ہو گئی، ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک چمکتا چمکتا نور پیدا فرمایا اور اس کے بعد ان سب کو آدم علیہ السلام کے سامنے حاضر کیا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی پروردگار یہ لوگ کون ہیں؟ ارشاد ہوا یہ تمہاری ہی اولاد ہے۔ آدم علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو ایک شخص کی آنکھوں کے درمیان چمکتا ہوا نور ان کو بہت پیارا معلوم ہوا۔ عرض کی پروردگار یہ کون ہیں ارشاد ہوا داؤد (نبی اللہ علیہ السلام) رض کی پروردگار تو نے ان کی عمر مقرر فرمائی ہے؟ ارشاد ہوا ساٹھ سال۔ عرض کی پروردگار ان کی عمر میں تو میری عمر میں سے چالیس سال اور بڑھادے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب آدم علیہ السلام کی عمر پوری ہو گئی اور صرف چالیس سال باقی رہ گئے تو تو ملک الموت قبض روح کے لیے ان کے پاس آ گئے۔ آدم علیہ السلام نے کہا ابھی تو میری عمر میں چالیس سال باقی ہیں۔ انہوں نے فرمایا کیا آپ وہ اپنے فرزند داؤد کو بخش نہیں چکے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کر دیا۔ (باپ کے خصائل

هُوَ خَالِقُهَا مِنْ ذُرِّيَّتِهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَ جَعَلَ بَيْنَ عَيْنَيْ كُلِّ إِنْسَانٍ مِنْهُمْ وَ بَيَّضًا مِنْ نُورٍ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى آدَمَ فَقَالَ أَيُّ رَبِّ مَنْ هَؤُلَاءِ قَالَ ذُرِّيَّتَكَ فَرَأَى رَجُلًا مِنْهُمْ فَأَعْجَبَهُ وَ بَيَّضَ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ قَالَ أَيُّ رَبِّ مَنْ هَذَا قَالَ دَاوُدُ فَقَالَ أَيُّ رَبِّ كَمْ جَعَلْتُ عُمرَهُ قَالَ سِتِّينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمرِي أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا انْقَضَى عُمرُ آدَمَ إِلَّا أَرْبَعِينَ جَاءَهُ مَلَكُ الْمَوْتِ فَقَالَ آدَمُ أَوْلَمْ يَبْقَ مِنْ عُمرِي أَرْبَعُونَ سَنَةً قَالَ أَوْلَمْ تُعْطِ ابْنَكَ دَاوُدَ فَجَحَدَ آدَمُ فَجَحَدَتْ ذُرِّيَّتُهُ وَ

اللہ ..... آئے گا ان کی عمر میں چالیس سال کا اضافہ ہوگا اور مجموعہ سو ہو جائے گی۔ پس اگر اس تفصیل کو دیکھو تو یوں کہہ دو کہ چالیس سال کا اضافہ ہوا اور اگر نظر ذرا اس سے اور اوپر کر کے دیکھو تو حق تعالیٰ کے علم کے لحاظ سے آخری بات یہی تھی کہ ان کی عمر سو سال ہوگی، اس لیے اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔

یاد رہے کہ دوسرے مرتبہ کے اس ذرا سے ایر پھیر سے حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی میں اتنا نمایاں اثر پیدا ہو گیا کہ قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کی اتنی بڑی تعداد میں سے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد خلیفہ کا لقب صرف ان ہی کو دیا ہے۔ ﴿يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ﴾ ان کے علاوہ جتنے اور انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے ظاہر ہے کہ سب انبیاء خلیفۃ اللہ ہی تھے مگر چونکہ اصل خلیفۃ اللہ کی عمر کے چالیس سال صرف داؤد علیہ السلام ہی کو ملے تھے اس لیے تقدیر کی اس حقیقت کا اثر قرآنی الفاظ میں بھی اتنا سا نمایاں ہونا ضروری ہوا عالم غیب حقیقت ہی حقیقت کا عالم ہے وہاں جو بھی ہوتا ہے اس عالم میں اس کا اثر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ رہا اس جگہ یہ سوال کرنا کہ کیا کسی اور نبی کی پیشانی کا نور اتنا پیارا نہ تھا یہ محض بے علمی کا سوال ہے۔ عالم غیب کی ساری تفصیل نہ ہم کو بتائی گئی ہے نہ اس کی ضرورت تھی۔ اس حدیث میں تمام انبیاء کی خصوصیات بیان کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا گیا۔ قضاء و قدر کا یہ ایک واقعہ بھی کسی خاص مصلحت کے لیے معرض بیان میں آ گیا ہے۔ جو عالم ہم سے پوشیدہ رکھا گیا ہے اور قصد پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اس کی کچھ کچھ جزئیات اس لیے بھی ذکر کر دی جاتی ہیں کہ اس عالم کو اس عالم کی باتیں سن سن کر یہ تمنیہ ہوتا رہے کہ اس عالم کے سوا کوئی اور دوسرا عالم بھی ہے اور اس طرح اس پر ایمان لانے میں مدد مل سکے۔

اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ ترجمان السنۃ جلد ثانی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب موت کا لہجہ ..... اس

نَسِيَ آدَمَ فَأَكَلَ مِنَ الشَّجَرَةِ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهُ  
وَ خَطَا آدَمُ وَ خَطَا ثُ ذُرِّيَّتُهُ

اولاد میں ظاہر ہوا کرتے ہیں) اس لیے ان کی اولاد میں بھی کہہ کر مکر جانے کی عادت ظاہر ہوئی وہ بھولے تھے اور شجرہ معنوعہ کھالیا تھا اور خطا کی تھی اس لیے

(رواہ ترمذی) اولاد میں بھی بھولنے اور خطا کاری کی سرشت باقی رہی۔ (ترمذی)

(۹۴۲) عَنْ ابْنِ شَهَابٍ قَالَ قَالَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ وَ ابْنُ حَزْمٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَضَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى خَمْسِينَ صَلَوةً فَرَجَعْتُ بِذَلِكَ حَتَّى

(۹۴۲) ابن شہاب انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن حزم سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (شب معراج میں) اللہ تعالیٰ نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض فرمائیں جب میں ان کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انہوں نے پوچھا آپ (صلی

للہ..... فرشتہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو اس پر غصہ آ گیا اور انہوں نے اس کے تھپڑا مارا آخر میں بات یہاں پہنچی کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ نیل کی کمر پر ہاتھ رکھ دو جتنے بال تمہارے ہاتھ کے نیچے آ جائیں اتنے سال تمہاری عمر۔ یہاں عمر کی زیادتی کا سوال ہی نہیں ہے کیونکہ جہاں یہ اختیار دیا گیا تھا اسی کے ساتھ ان کے اختیار کو اس طرف لگا دیا گیا تھا کہ وہ موت ہی کو اختیار فرمائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس صورت سے نبی اولوالعزم کا اکرام بھی پورا ہو گیا اور جو تقدیر الہی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔

تنبیہ: مستدرک حاکم میں روایت ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے یہ لازم کر دیا گیا کہ آئندہ ملک الموت جس کی روح بھی قبض کرنے جائیں اپنی اصل صورت میں جائیں۔ اس سے یہ بات بھی حل ہو گئی کہ فرشتے پر اس رسول اولوالعزم کو غصہ آیا کیوں تھا یعنی وجہ یہ تھی کہ اس وقت وہ بشری صورت پر حاضر ہو گئے تھے۔

(۹۴۲) \* یہ حدیث بہت مجمل ہے تفصیلی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ہر بار پانچ پانچ نمازوں کی معافی ہوتی رہی ہے اور جب پانچ ہی رہ گئی تھیں تو چلتے وقت کچھ ایسے کلمات ارشاد ہو گئے تھے جن سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب اس سے زیادہ تخفیف کی گنجائش نہیں رہی اس نکتہ کے سمجھ جانے کے بعد گو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے واپس جانے کا اصرار بھی فرمایا اور یوں بھی امت کے حق میں تخفیف کے لیے آپ کے قلب مبارک میں نہ معلوم کتنے ارمان ہوں گے لیکن شانِ عبدیت حکم کے سامنے جھک گئی اور جو اتنی بار آمد و رفت سے نہ تھکے تھے وہ اس مرتبہ جانے میں شرم محسوس فرمانے لگے۔ سبحان اللہ! شانِ معبودیت بھی کیسی بلند ہے اور اس کے بالمقابل شانِ عبدیت بھی کتنی کامل ہے۔ ادھر جب آخری فیصلہ فرمادیتے ہیں تو پھر کوئی نہیں جو اس میں ذرا سی ترمیم بھی کر سکے اور ادھر شانِ عبدیت کا کیا کمال ہے کہ جب آخری حکم ہونے کا احساس بھی ہو جاتا ہے تو پھر ترمیم کی درخواست پیش کرنے کے لیے قدم ہی نہیں اٹھتے اس لیے ایک طویل حدیث میں حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جب ان کو جیل خانے سے نکلنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے تو یہ فرمادیا تھا کہ پہلے جا کر ان عورتوں کے حال کی تحقیق کرو جنہوں نے مجھے متہم کیا تھا۔ لیکن اگر یہی واقعہ مجھ کو پیش آتا تو میں تو فوراً اس بلائے والے کے ساتھ ساتھ ہو لیتا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس میں بھی آپ کی کمالِ عبدیت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک مشیت الہیہ جیل میں رکھتی جیل میں رہتا اور جب باہر نکالتی تو باہر نکل آتا۔ نہ عذر اس میں ہوتا نہ تاخیر اس میں ہوتی۔

عالم تقدیر میں ایک ترمیم و تبدیل کی شکل تو وہ تھی جو آپ نے ابھی پہلی حدیث میں پڑھی تھی یعنی ساٹھ سال کی عمر میں چالیس سال کا اور اضافہ ہو گیا دوسری شکل یہ ہے کہ پچاس میں ترمیم ہو کر پانچ رہ گئیں مگر اس کے باوجود ایک لحاظ سے وہ پچاس ہی رہیں۔ غور للہ.....



اللہ علیہ وسلم) کے پروردگار نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں۔ میں نے کہا پچاس۔ انہوں نے فرمایا جائیے پھر جا کر کچھ تخفیف کی درخواست کیجئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت میں ان کی ادائیگی کی سکت نہیں ہے۔ میں واپس ہوا اور پروردگار کی خدمت میں عرض معروض کی اس نے ایک حصہ معاف فرمادیا۔ میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس واپس آیا اور سرگزشت بیان کی۔ انہوں نے کہا میں کہتا ہوں کہ پھر جائیے ابھی اور تخفیف کرائیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ میں پھر گیا اور پروردگار سے درخواست کی ارشاد ہوا دیکھو اب یہ پانچ ہیں مگر ہمارے یہاں وہی پچاس کی پچاس شمار ہوں گی ہمارے یہاں جو بات ایک بار طے ہو جاتی ہے پھر وہ بدلا نہیں کرتی۔ میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا انہوں نے پھر واپس جا کر مزید تخفیف کے لیے فرمایا۔ میں نے کہا اب تو مجھے بار بار جانے میں شرم آتی ہے۔

(نسائی شریف - صحیحین وغیرہ)

مَرْبُوسِي عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ مَا فَرَضَ رَبُّكَ عَلَيَّ أُمَّتِكَ قُلْتُ فَرَضَ عَلَيْهِمْ حَسَنِينَ صَلَوةً قَالَ مُوسَى فَرَجِعْ رَبُّكَ عَزَّوَجَلَّ فَإِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَطِيقُ ذَلِكَ فَرَجَعْتُ رَبِّي عَزَّوَجَلَّ فَوَضَعَ شَطْرَهَا فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسَى فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ رَاجِعْ رَبُّكَ فَإِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَطِيقُ ذَلِكَ فَرَجَعْتُ رَبِّي عَزَّوَجَلَّ فَقَالَ هِيَ خُمْسٌ وَهِيَ خُمْسُونَ لَا يَبْدُلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسَى فَقَالَ رَاجِعْ رَبُّكَ فَقَالَ إِنِّي اسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَبِّي عَزَّوَجَلَّ وَفِي لَفْظِ انِّي يَوْمَ خَلَقْتُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فَرَضْتُ عَلَيْكَ وَ عَلَى أُمَّتِكَ خَمْسِينَ صَلَوةً.

(رواہ النسائی و الحدیث أخرجه الشيخان وغيرهما)

للہ ..... کیجئے تو پہلی جگہ بھی علم الہی میں کوئی ترمیم نہیں اس کو معلوم تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر سو سال ہوگی مگر ہوگی اس طرح کہ اس میں چالیس سال کے اضافہ کی حضرت آدم علیہ السلام درخواست فرمائیں گے اور وہ ہم منظور کریں گے یہاں یہ صورت ہوئی کہ پچاس کو پانچ تو کیا گیا مگر ایک دوسرے ضابطہ کے تحت پھر ان پانچ کو پچاس بنا دیا گیا وہ یہ کہ اس کی ایک نیکی کا ثواب دس گنا لکھا جائے اس لحاظ سے جو دنیا میں پانچ ہوں گی وہ آخرت کے دفتر میں پھر پچاس رہیں گے۔ اگر پہلی امتوں کے ضابطہ کے مطابق حساب رکھا جاتا تو ایک نیکی ایک ہی کا ثواب ملتا اس لیے یا تو تخفیف ہی نہ کہہ جاتی اور یا پھر پچاس کی کو پانچ ہی کر دیا جاتا مگر چونکہ ادھر طے شدہ قدر کی ترمیم منظور نہیں ادھر خالی ہاتھ آپ کو واپس کر دینا گوارا نہیں اس لیے طے یہ پایا کہ ایک دوسرے ضابطہ کے ماتحت یہ دونوں باتیں قائم رکھی جائیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ اظہار بھی کر دیا جائے کہ تقدیر کے فیصلے ٹلا نہیں کرتے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے آپ کی خاطر داری اور اکرام میں ہوا ہے اور اسی لیے صرف پہلی بار مراجعت پر آخری فیصلے کا اعلان نہیں کیا گیا کہ آپ کی بار بار آمد ہو اور درخواست ہو اور ہر بار اس کو منظور کر کے آپ کے اکرام میں اور اضافہ فرمایا جائے مگر آخر میں ہر فیصلے پر قضاء و قدر کی حاکمیت کا اعلان بھی کر دیا جائے۔

یہاں ایک اور واقعہ بھی مطالعہ کر لینا مفید ہوگا۔ ترجمان السنۃ جلد دوم ص ۳۷۹ میں حدیث نمبر ۸۱۵ ملاحظہ کیجئے اس میں ثوبانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعاء کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ آپ نے پروردگار عالم سے اپنی امت کے حق میں یہ دعاء فرمائی تھی پروردگار میری امت پر ایسا عام قحط نازل نہ فرمانا جو ان سب کی ہلاکت کا باعث بن جائے۔ اور ایک یہ کہ غیروں کو ان پر مسلط نہ کیجیو ورنہ للہ .....

(۹۴۳) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرُدُّ الْقَدَرُ إِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا يَزِيدُ فِي الْعُمْرِ إِلَّا الْبِرُّ وَإِنَّ الرَّجُلَ لِيُحْرَمَ الرِّزْقُ بِالذَّنْبِ يُصِيبُهُ. (رواه ابن ماجه)

(۹۴۳) ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تقدیر کو کوئی چیز پلٹ نہیں سکتی مگر صرف دعاء اور مقررہ عمر میں کوئی شے زیادتی نہیں کر سکتی مگر نیکی اور یقیناً آدمی گناہوں کی شامت سے کبھی رزق سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

لہذا .... وہ ان کی جڑ نکال کر پھینک دیں گے۔ حق تعالیٰ کی جانب سے ارشاد ہوا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کی یہ دونوں دعائیں تو منظور کر لیں انی اذا قصیت قضاء فانہ لا یرد۔ لیکن جو فیصلہ ہم ایک بار کر دیتے ہیں پھر وہ بدلا نہیں کرتا۔

دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک دعاء یہ بھی فرمائی تھی کہ ان کو باہمی اختلاف اور آپس کی جنگ کے عذاب میں بھی گرفتار نہ کرنا، مگر یہ نامنظور ہوئی اور خدائی فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ عالم غیب میں ایک چیز کو پہلے مبہم رکھنا پھر رفتہ رفتہ اس کی تفصیل کرنا بھی ایک طریقہ رکھا گیا ہے۔ اسی باب میں اس کی چند مثالیں آپ کی نظروں سے گزر چکی ہیں۔

(۹۴۳) \* اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر آیا ہے تقدیر، عمر اور رزق اسی کے اجزاء ہیں۔ ان تین کے بالقابل آپ نے یہاں تین چیزیں اور بیان فرمائی ہیں جن کی تاثیر سے آج تک دنیا ناواقف تھی یعنی دعاء، نیکی اور گناہ۔ ان میں سے دعاء کی برکت سے کبھی نوشتہ تقدیر بھی ٹل جاتا ہے اور نیکی کی بدولت کبھی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے حالانکہ وہ بھی مقرر شدہ ہے اور گناہوں کی شامت سے وہ رزق بھی جو مقرر شدہ ہے کبھی منقطع ہو جاتا ہے پھر یہ سب کچھ احاطہ تقدیر میں شامل ہوتا ہے۔ یعنی کوئی دعاء کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو شفاء عطا فرما دے گا، نیکی کرے گا تو اتنی عمر دے دی جائے گی اور فلاں گناہ کے باعث رزق گھٹ جائے گا اور یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ دعاء کرے گا یا نہیں نیکی کی توفیق ملے گی یا نہیں اور اسی طرح گناہ کا صدور ہو گا یا نہیں۔ پس اگر تقدیر کے پہلے نمبر کی طرف نظر کی جائے جس میں رد بلاء دعاء کے ساتھ اور عمر کا اضافہ نیکی کے ساتھ اور رزق کا انقطاع گناہ کے ساتھ معلق ہوتا ہے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مقدرات بھی قابل تبدیل ہوتے ہیں اور جب اس سے اوپر نظر کی جائے جہاں تعلیقات کچھ نہیں صرف احکام ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مقدرات میں جو ترمیمات ہیں وہ سب تحتانی مراتب میں ہیں حقیقت میں کوئی ترمیم نہیں۔

اس جگہ مکتوباتِ امام ربانی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے وہ تحریر فرماتے ہیں۔ ”حضرت قبلہ گا ہی ام قدس سرہ میفرمودند کہ حضرت سید محی الدین جیلانی قدس سرہ در بعض رسائل نوشتہ اند کہ در قضاء مبرم ہیج کس را مجال نیست کہ تبدیل کند مگر مرا کہ اگر خواہم آنجا ہم تصرف کنم“ پھر اس مقولہ کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ ”قضاء معلق بردگوندہ است قضائے است کہ تعلیق اور ادر لوح محفوظ ظاہر ساختہ اند و ملائکہ را براں اطلاع دادہ و قضائے کہ تعلیق او نزد خدا است جل شانہ و بس در لوح محفوظ صورت قضاء مبرم دارد و ایں قسم اخیر از قضائے معلق نیز احتمال تبدیل دارد در رنگ قسم اول و بقضاء کہ بہ حقیقت مبرم است تصرف و تبدیل در ایں محال است عقلاً و شرعاً۔ مکتوبات شریفہ نمبر ۷ ص ۲۱۲ بنام ملا طاہر بدخشی۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ علم الہی کے لحاظ سے تو تقدیر کے سب ہی فیصلے مبرم اور اٹل ہوتے ہیں لیکن جہاں اس عالم اسباب کا نقشہ کھینچ کر رکھا گیا ہے وہاں کچھ دور تک اسباب و مسببات کا الجھاؤ دکھانا بھی مناسب معلوم ہوا ہے۔ جس طرح اس عالم میں اسباب و مسببات تمیں فعل و اتفعال ظاہر ہے۔ اسی طرح عالم غیب میں بھی اسباب و مسببات کا جو سلسلہ دکھایا گیا ہے اس میں بھی تاثیر اور عمارت موجود ہے اب جہاں تقریر کے احکامات کے استحکام پر زور دینا منظور ہوتا ہے وہاں پیش نظر اس کا وہ مرتبہ ہوتا ہے جس میں نہ کوئی تعلیق ہے نہ ترمیم اور جہاں لہذا ....



مَسَاعِي النَّاسِ الْيَوْمَ هِيَ مِنْ عَوَامِلِ  
الْقَدَرِ الْمَكْنُونَةِ

(۹۴۴) عَنْ أَبِي خِزَامَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قُلْتُ يَا  
رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ رُقِيَ نَسْرَقِيهَا وَدَوَّاءُ  
نَسْدَاوِي بِهِ وَتُقَاةٌ نَتَقِيهَا هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ  
اللَّهِ قَالَ هِيَ مِنْ قَدَرِ اللَّهِ

(رواه احمد و الترمذی و ابن ماجه)

(۹۴۵) عَنْ عُمَرَ بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ رَجُلَيْنِ  
مِنْ مُزَيْنَةَ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَرَأَيْتَ مَا يَعْمَلُ  
النَّاسُ الْيَوْمَ وَيَكْذَحُونَ فِيهِ أَشْيَاءُ قُضِيَ  
عَلَيْهِمْ وَ مَضَى فِيهِمْ مِنْ قَدَرٍ سَبَقَ أَوْ فِيمَا  
يُسْتَقْبَلُونَ بِهِ مِمَّا آتَاهُمْ بِهِ نَبِيُّهُمْ وَ ثَبَتَتْ  
الْحُجَّةُ عَلَيْهِمْ فَقَالَ لَا بَلْ شَيْءٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ

دنیا میں لوگوں کی جو کچھ بھی جدوجہد نظر آ رہی ہے درحقیقت یہ  
تقدیر ہی کی خفیہ کار فرمایاں ہیں

(۹۴۴) ابو خزامہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ فرمائیے یہ جو منتر ہم لوگ پڑھتے ہیں یا دواء کا  
استعمال کرتے ہیں یا ہتھیاروں سے جنگ میں اپنا بچاؤ کرتے ہیں کیا یہ چیزیں  
تقدیر کو بدل دیتی ہیں؟ فرمایا نہیں یہ چیزیں خود تقدیر کے اندر لکھی ہوئی موجود ہوتی  
ہیں۔ (اور یہ ظاہری جدوجہد اسی کی کار فرمائی ہوتی ہے)۔ (احمد ترمذی ابن ماجہ)

(۹۴۵) عمران بن حصین بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ مزینہ کے دو شخصوں نے  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ فرمائیے آج دنیا  
اپنے اعمال میں جو کچھ بھی جدوجہد کر رہی ہے کیا یہ سب کچھ ان کی تقدیر میں  
پہلے سے طے شدہ تھا یا جب انبیاء علیہم السلام تشریف لا کر خدائی حجت ان پر  
پوری کر دیتے ہیں تو اس کے بعد لوگ اپنے اعمال کا سلسلہ کسی تقدیر کے بغیر  
خود شروع کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یوں نہیں ہے بلکہ ان کی تمام جدوجہد

اللہ... کسی عمل کے اچھے یا برے ہونے پر زور دینا مقصود ہوتا ہے وہاں تقدیر کا وہ درجہ لے لیا جاتا ہے جس میں احکامات اپنے اسباب کے ساتھ معلق  
ہوتے ہیں۔ حدیث مذکور میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو تین باتیں ناقابل ترمیم ہیں جن میں سے عمر اور رزق کی فکر ہر انسان کے سر پر سوار رہتی ہے عالم غیب  
میں اگر ان میں ترمیم کا کوئی سبب نظر آتا ہے تو صرف وہ یہ تین ہی اعمال ہیں دعائیں کی یا نقصان رزق کے لیے معصیت۔

(۹۴۴) \* حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قضاء و قدر اسباب کی سمیت کے خلاف نہیں ہے بلکہ اسباب  
خود قضاء و قدر کے اندر داخل ہوتے ہیں (حجۃ اللہ ص ۶۷) صحابہ کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ جب اسباب تقدیر کو بدل نہیں سکتے تو ان کا  
ارتکاب کرنا ہی لا حاصل ہے آپ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ ارتکاب کرنا بھی تقدیری احاطہ میں داخل ہے لہذا اس کے ارتکاب کرنے  
نہ کرنے کا سوال ہی بے محل ہے اب چاہے تو یوں سمجھ لو کہ جو مقدر ہو چکا ہے ہم کرتے وہی اسباب ہیں اور چاہے یوں کہہ دو کہ جو اسباب بھی  
ہم اس عالم میں کرتے ہیں یہ سب اسی خفیہ تقدیر کی کار فرمایاں ہوتی ہیں نتیجہ دونوں باتوں کا ایک ہی نکلتا ہے۔

(۹۴۵) \* اس حدیث کے بعض الفاظ میں کچھ لفظی تشویش ہے بعض الفاظ مراد میں واضح ہیں ہم نے یہاں ان کو بھی نقل کر دیا ہے اس لیے  
ان الفاظ کو بھی پیش نظر رکھا جائے تاکہ مطلب سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہاں بھی آپ کے جواب کا حاصل یہی ہے کہ اس عالم میں جو کچھ نظر آ رہا  
ہے یہ سب عالم تقدیر کی کار فرمایاں ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ آیت ﴿فَالْتَمِمْهَا فُجُورَهَا﴾ میں الہام سے مراد یہ ہے کہ اللہ  
تعالیٰ نفس میں تقویٰ و فجور کی صورت پیدا فرمادیتا ہے جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ شکم مادر ہی میں سقاوت لکھ دی جاتی ہے اس کا لفظ.....

وَمَضَى فِيهِمْ وَتَصْدِيقُ ذَلِكَ فِي كِتَابِ  
اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ وَنَفْسٍ وَ مَا سَوَّاهَا فَالْهَمَّهَا  
فَجُورَهَا وَتَقْوَاهَا.

طے شدہ تقدیر کے تحت ہوتی ہے چنانچہ اس کی شہادت خود قرآن شریف میں  
بھی موجود ہے۔ ارشاد ہے ”وَنَفْسٍ وَ مَا سَوَّاهَا“ یعنی اور قسم ہے انسان  
کے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست کیا پھر اس کو بدکاری اور

(رواہ مسلم) نیکوکاری دونوں کا الہام فرمایا، یعنی دونوں کی صورت پیدا فرمادی۔

(قلت و قد اخرجہ السيوطی فی الدر المنثور فی تفسیر سورة و الشمس و فی قدر سبق مکان ”من قدر سبق“ و ”ما اتاهم به  
نبیہم“ الخ و ”و اتخذت علیہم به الحجة“ مکان ”ثبت علیہم الحجة“ و فیہ زیادة و ہی ”قال فلم يعملون اذا قال من كان الله  
خلقه لواحدة المنزلتين هياهما لعملها و تصديق ذلك“ الخ ج ۶ ص ۳۵۲ و اخرجہ فی سورة و الليل عن جابر و فیہ اسم السائل  
ايض و لفظه ان سراقه بن مالك قال يا رسول الله افي اى شىء نعمل افي شىء ثبت فيه المقادير و جرت فيه الاقلام ام في شىء  
نستقبل فيه العمل قال بل في شىء ثبت فيه المقادير و جرت فيه الاقلام ج ۶ ص ۳۵۹ و اخرج نحوه ابن ماجة عن سراقه بن  
جعشم و هو مالك بن جعشم قال قلت يا رسول الله العمل فيما جف به القلم و جرت به المقادير ام امر مستقبل قال فيما جف به  
القلم و جرت به المقادير و كل ميسر لما خلق له و فی الزوائد فی اسناده فقال فان مجاهد الم يسمع من سراقه فلزم الانقطاع و  
عطاء مختلف فيه انتهى قال السندی و المتن قد ذكره ابو داود و من رواية ابن عمر و عند مسلم عن جابر قال جاء سراقه بن مالك  
بن جعشم قال يا رسول الله بين لنا ديننا (ای ما نعتقد من حال اعمالنا) كانا خلقنا الان (ای نهم غير عاملين بتلك المسئلة) فيما  
العمل اليوم اينما جفت به الاقلام و جرت به المقادير ام فيما نستقبل (الخ)

الحوادث الكونية مع اسبابها كائنة  
تحت القدر  
دنیا کے واقعات کے ساتھ ان کے اسباب بھی قضاء و قدر کے  
تحت ہی ہوتے ہیں

(۹۴۶) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرَيْتُكَ قَبْلَ أَنْ  
أَتَزَوَّجَكَ مَرَّتَيْنِ رَأَيْتُ الْمَلِكَ يَحْمِلُكَ

(۹۴۶) حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا شادی سے قبل مجھے تم کو دو مرتبہ خواب میں دکھایا گیا تھا۔ میں نے کیا  
دیکھا کہ ایک فرشتہ ہے جو ایک ریشمین کپڑے میں تم کو لیے ہوئے ہے، میں

اللہ ..... خلاصہ بھی یہی ہے۔ الہام اصل میں اس صورت علمیہ کو کہتے ہیں جس کی بناء پر کسی کو عالم کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر وہ صورت  
اجمالیہ جو آثار کے لیے مبدء و منشاء ہو الہام کے نام سے موسوم ہو جاتی ہے خواہ اس کی بناء پر عالم کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو۔ اس جگہ الہام کے  
یہی معنی مراد ہیں۔ (حجۃ اللہ ص ۱۶۹)

شرح عقیدۃ الطحاویہ میں اس جگہ ایک اور لطیف بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ لفظ الْهَمَّهَا (جس کا ترجمہ ہے اسی نے نفس کو الہام  
کیا اور سکھایا) قدر کی طرف اشارہ ہے اور فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا میں فجور اور تقویٰ کے نفس کی اضافت سے اس کے اختیار کی طرف اشارہ ہے  
کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بندہ کا بھی کوئی فعل ضرور ہوتا ہے جس کی بناء پر اس کا نفس فاجرہ یا متقیہ بن جاتا ہے اسی طرح آئندہ  
آیت میں زَكَّهَہَا اور دَسَّهَہَا میں تزکیہ اور تدسیس کی انسان کی طرف نسبت بھی دلالت کرتی ہے کہ یہاں عبد کا بھی کچھ فعل ہوتا ہے۔ گویا تقدیر  
کے جبر اور بندہ کے فاعل بالا اختیار ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے۔ دیکھو ص ۳۶۸ اس کے اختیار کے ساتھ ساتھ تقدیر کا جبر بھی لگا جا رہا ہے۔  
(۹۴۶) \* انبیاء علیہم السلام کی شخصیت بھی کتنی پاکیزہ اور بلند ہوتی ہے کہ بیداری کی حالت ہو یا خواب کی امور شرعیہ ہوں یا اللہ.....



فِي سَرَقَةٍ مِنْ حَرِيرٍ فَقُلْتُ لَهُ اكْشِفْ فَإِذَا  
كَشَفَ فَإِذَا هِيَ أَنْتِ فَقُلْتُ أَنْ يَكُ هَذَا مِنْ  
عِنْدِ اللَّهِ يُمِضُهُ. (رواه البخاری فی التعبير)

(۹۴۷) عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِابْنِ صَيَّادٍ خَبَأْتُ لَكَ  
خَبِيئًا قَالَ الدُّخَّ قَالَ إِخْسًا فَلَنْ تَعُدَّ وَ  
قَدَرَكُ قَالَ عُمَرُ ائْذَنْ لِي فَأَضْرِبَ عَنْقَهُ

نے اس کہا ذرا پردہ ہٹانا اس نے پردہ ہٹایا دیکھتا کیا ہوں کہ وہ تم ہو میں نے  
اپنے دل میں کہا اگر اللہ تعالیٰ نے اس خواب کو اپنی اسی ظاہری شکل پر پورا  
کرنا مقدر فرما دیا ہے تو وہ پورا کر کے رہے گا۔ (بخاری شریف)

(۹۴۷) ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
ابن صیاد سے امتحان فرمایا میں نے تیرے امتحان کرنے کے لیے ایک بات  
دل میں چھپائی ہے بتاؤ کیا ہے اس نے کہا کہ وہ دُخ کا کلمہ ہے۔ آپؐ نے  
فرمایا جا تو اپنی مقدار اوقات سے تجاوز نہیں کر سکتا اس پر عمرؓ نے فرمایا اجازت

للہ..... تکوینیہ ان کے ذاتی معاملات ہوں یا دوسروں کے کسی وقت بھی ان کا تعلق ملاء اعلیٰ سے علیحدہ نہیں ہوتا اس لیے ان کی خواب کو بھی  
وحی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اب ذرا دیکھئے یہ کیا چھوٹا سا معاملہ تھا بات بھی خواب کی تھی اور وہ بھی ایک ذاتی معاملہ میں جس کا کوئی ظاہری  
سامان بھی نہ تھا مگر یہاں بھی نبی کی ذات اس پر اسی طرح یقین رکھتی ہے جس طرح کہ اپنی بیداری کی وحی پر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
یہاں اتنی بھی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ بیداری کے بعد اس ظاہری حلیہ کا کوئی سراغ ہی لگاتے بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ کر اس کو  
تقدیر کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ نے اس خواب کا اسی ظاہری شکل پر پورا ہونا مقدر فرما دیا ہے تو وہ پورا ہو کر رہے گا اور اس کے  
اسباب بھی ہو کر رہیں گے۔

(۹۴۷) \* تقدیر کا قطعی فیصلہ اگر کہیں کسی کے لیے ٹل سکتا تو آج عمر رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر مایوس نہ کر دیا جاتا کہ تم اس بچہ کو قتل کر ہی نہیں  
سکتے۔ دیکھئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں دوبارہ تشریف لانا اور تشریف لا کر دجال کو قتل کرنا تقدیر کے ان حتمی فیصلوں میں داخل ہو چکا  
ہے جو ٹل ہیں یہاں فاروق اعظمؓ جیسے کی قوت آزمائی بھی بیکار ہے۔ یہ قدرت کے راز ہیں اگر آج وہ کسی قید و شرط کا اظہار فرما کر اپنے اس  
فیصلہ کو ٹال دیتی تو آج ہی امت محمدیہ ان تمام ہولناک مصائب سے نجات پالیتی جن کے تصور سے بھی رونگٹا کھڑا ہوتا ہے مگر ذات بے نیاز کو  
اس کی پروا نہیں ہے اس نے شیطان کی درخواست منظور کر لی اور قیامت تک کے لیے اس کو طویل حیات بخش دی۔ تقدیر کے فیصلے اسی طرح  
ٹلا نہیں کرتے اور اگر کہیں ٹل سکتے تو ایک بار ایسا نازک موقعہ بھی آچکا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ عالی مقام کی روح  
قبض ہو رہی تھی اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بندھی ہوئی تھیں مگر یہاں بھی یہ سب کچھ گوارا کر لیا گیا مگر ختم نبوت کے فیصلہ پر نظر  
ثانی نہیں کی گئی آخر آپؐ کے فرزند گرامی کی وفات ہو گئی۔ اگر اس فیصلہ میں بھی کوئی قید یا کوئی شرط مستور ہوتی تو آج سے زیادہ اس کے لیے  
کوئی دوسرا موقعہ نہ تھا۔ یہاں یہ بات کتنی قابل غور ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کے بعد عمرؓ کے قلب میں اب یہ  
وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا کہ لاؤ ذرا آزمائش تو کر کے دیکھوں کہ مجھ میں اس کے قتل کی طاقت ہے بھی یا نہیں بلکہ وہ ہاتھ جو ابھی شمشیر کے  
قبضہ پر اس طرح رکھا ہوا تھا کہ اب اجازت ملے تو فوراً شمشیر بے نیام کر لے وہی ہاتھ اس حکم کے سننے کے بعد اس طرح مفلوج بن چکا تھا  
گویا کہ اس میں اس آزمائش کے لیے کوئی حس و حرکت ہی نہ تھی۔ جب تک قضاء و قدر پر یہ ایمان نصیب نہ ہو اس وقت تک مؤمن بھی کیا  
مؤمن ہے خلاصہ یہ ہے کہ تقدیر میں جس طرح دجال کا قتل مقدر ہو چکا ہے اس کا قاتل بھی مقدر ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ قتل تو ہو  
جائے مگر ہو کسی اور سبب سے۔ نہیں وہ ضرور ہوگا اور اسی اپنے سبب کے ذریعہ ہوگا جو اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ پھر جب دونوں للہ.....

قَالَ دَعُهُ أَنْ يَكُنْ هُوَ فَلَا تُطِيقُهُ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ هُوَ فَلَا خَيْرَ لَكَ فِي قَتْلِهِ.

(رواہ البخاری فی ابواب القدر)

(۹۴۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْأَلِ الْمَرْأَةَ طَلَاقَ أُخْتِهَا لِتُسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَتُنْكَحَ فَإِنَّ لَهَا مَا قَدَّرَ لَهَا.

(رواہ البخاری ص ۷۷۴ و ابوداؤد وغیرہما)

(۹۴۹) عَنْ جَابِرٍ قَالَ إِنَّ رَجُلًا أَتَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنَّ لِي جَارِيَةً هِيَ خَادِمَتُنَا وَ أَنَا أَطُوفُ عَلَيْهَا وَ أَكْرَهُ أَنْ تَحْمِلَ فَقَالَ اِغْزِلْ عَنْهَا إِنْ شِئْتَ

دیتے تو میں ابھی اس کی گردن اڑا دوں۔ آپؐ نے فرمایا جانے دو کیونکہ اگر یہ وہی دجال اکبر ہے تو تم چاہو بھی جب بھی اس کو قتل نہیں کر سکتے اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو پھر اس نابالغ بچہ کے قتل سے کیا فائدہ۔ (بخاری شریف)

(۹۴۸) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کو یہ نہ چاہیے کہ وہ دوسری عورت کی طلاق کا اس نیت سے مطالبہ کرے کہ جو اس کے نصیب کا لکھا ہے وہ بھی سب یہی حاصل کر لے اس کو نکاح کر لینا چاہیے کیونکہ جو اس کے نصیب کا ہوگا وہ اسی کو ملے گا۔ (دوسری کو نہیں مل سکتا) (بخاری شریف۔ ابوداؤد شریف وغیرہما)

(۹۴۹) جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میری ایک باندی ہے جو میرے کام کاج کرتی ہے اور میں اس سے صحبت بھی کرتا ہوں اس لیے مجھے یہ پسند نہیں کہ وہ حاملہ ہو جائے (کیا میں عزل کر سکتا ہوں؟) آپؐ نے فرمایا اگر تم چاہو تو

اللہ..... باتیں قضاء و قدر کے تحت داخل ہو چکی ہیں تو یہ سوال کیسے ہو سکتا ہے کہ جب تقدیر کے فیصلے اٹل ہیں تو ہمارے مساعی کی ضرورت کیا؟ جی ہاں ان مساعی کا کرنا بھی آپؐ کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ان فیصلوں کا منصفہ شہود پر آنا لہذا آپؐ کا سوال ہی مہمل ہے آپؐ ایسے فعل کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال فرما رہے ہیں جس کی ایک جانب پہلے سے آپؐ کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے۔ اس لیے اگر آپؐ بضد آ کر سعی نہ کریں تو یقین رکھیے کہ یہی جانب آپؐ کے مقدر میں تھی، لیکن چونکہ اس فعل کو اپنے اختیار ہی سے کیا ہے اس لیے جو جبر آپؐ کے اختیار پر مسلط تھا (یعنی آپؐ کے اختیار ہی کو اس طرف لگا دینا) وہ آپؐ کو محسوس نہیں ہوتا۔ ابن صیاد کون تھا اس کے متعلق بحث ان شاء اللہ تعالیٰ دوسرے مقام میں کی جائے گی۔

(۹۴۸) \* انسانی پست ہمتی اور خست کی یہ ایک بدترین مثال ہے کہ جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا ارادہ کرے تو پہلے وہ اس سے یہ شرط لگائے کہ جو عورت اس کے نکاح میں موجود ہے اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو یہ اس سے نکاح کر سکتی ہے اور یہ بھی ہو صرف اس لالچ میں کہ اس صورت میں وہ شوہر کے پورے مال پر قابض رہے گی حتیٰ کہ جو اس وقت اس کی اسلامی بہن کا حصہ ہے وہ بھی اسی کے پاس آ جائے گا۔ اسلام اپنے نفع کی خاطر دوسرے کو نقصان رسانی کی اس بدتر صورت کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کٹھن سبق کو یہ کہہ کر آسان کر دیتا ہے کہ سرے سے لالچ کا یہ تخیل ہی غلط ہے کیونکہ کسی کے مقدر کا رزق دوسرے کو مل جائے یہ ممکن ہی نہیں تو پھر مفت میں اس دنائت اور خست کے اظہار کی ضرورت۔ اب آپؐ نے دیکھا کہ تقدیر کا مسئلہ کتنی مشکلات کا حل ہے حیات و موت کا کوئی گوشہ جب انسان کے لیے لانیل بن رہا ہو تو تقدیر کا سبق بڑی آسانی سے اس کو حل کر دیتا ہے۔

(۹۴۹) \* عزل لغت میں اس کو کہتے ہیں کہ جب مرد انزال کے قریب پہنچے تو اپنے عضو کو باہر نکال کر باہر انزال کر دے تاکہ اللہ.....



فَإِنَّهُ سَيَأْتِيهَا مَا قُدِّرَ لَهَا فَلَبِثَ الرَّجُلُ ثُمَّ أَتَاهُ  
فَقَالَ إِنَّ الْجَارِيَةَ قَدْ حَبَلَتْ فَقَالَ قَدْ  
أَخْبَرْتُكَ إِنَّهُ سَيَأْتِيهَا مَا قُدِّرَ لَهَا.

(رواہ مسلم)

(۹۵۰) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ سُئِلَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْعَزْلِ  
فَقَالَ مَا مِنْ كُلِّ الْمَاءِ يَكُونُ الْوَلَدُ وَإِذَا  
أَرَادَ اللَّهُ خَلْقَ شَيْءٍ لَمْ يَمْنَعْهُ شَيْءٌ.

(رواہ مسلم)

(۹۵۱) عَنْ ابْنِ عُمرَ قَالَ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى

عزل کر لو مگر اس کے مقدر میں جو بچہ لکھا جا چکا ہے وہ اسے جن کر رہے گی۔  
کچھ عرصہ گزرا ہوگا کہ وہی شخص پھر حاضر ہوا اور عرض کی کہ وہ تو حاملہ ہو گئی۔  
آپ نے فرمایا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ جو بچہ اس کے مقدر میں لکھا جا چکا  
ہے وہ اس سے ضرور پیدا ہو کر رہے گا۔ (مسلم شریف)

(۹۵۰) ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے  
عزل کرنے کے متعلق دریافت کیا گیا آپؐ نے فرمایا مرد کی ساری منی سے تو  
بچہ بنتا نہیں (تو پھر عزل سے فائدہ) اور اللہ تعالیٰ جب کسی بچہ کے پیدا  
فرمانے کا ارادہ کرے تو پھر کوئی شے اس کے لیے مانع نہیں ہو سکتی۔

(مسلم شریف)

(۹۵۱) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ

للہ .... استقرار حمل نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ اگر بات غیر پسندیدہ ہوتی تو اس کی اجازت تو دیتے مگر اپنی  
نا پسندیدگی کا اظہار فرما کر۔ مشکل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا رسول اگر منع فرمادے تو حرمت کا مرتبہ آ سکتا ہے اور اگر کھلی اجازت دے دے تو یہ  
خلاف مقصود ہوتا ہے اس لیے یہاں لفظ ”إِنْ شِئْتُ“ (یعنی اگر تو چاہتا ہے تو کر لے) فرما کر تنبیہ فرمادی کہ ہماری مرضی کی تو یہ بات ہے  
نہیں۔ دوم اس عمل کے بیکار ہونے کی طرف بھی اشارہ فرمادیا۔ حدیث کی مراد یہ نہیں ہے کہ اگر تقدیر میں اولاد مقدر ہوگی تو مرد کے نطفہ  
کے بغیر بھی ہو کر رہے گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر اولاد مقدر ہوگی تو عزل کے بعد بھی غیر شعوری حالت میں اتنا مادہ رحم میں پہنچ جائے گا جو بچہ  
بننے کے لیے کافی ہوگا اور اس طرح تقدیر کا نوشتہ تو پورا ہو کر رہے گا اور یہ عمل آخر کار بیکار ثابت ہوگا چنانچہ یہاں ایسا ہی ہوا اور اس وقت  
آپ نے پھر اس کو اپنا مقولہ یاد دلا دیا۔

(۹۵۰) \* اس حدیث میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ تقدیر آ کر رہتی ہے مگر اسباب کو توڑ کر نہیں بلکہ اس طرح کہ اس کے اسباب بھی ہو کر رہتے  
ہیں مثلاً یہ کہ اس صورت میں عزل سے قبل نطفہ کا کوئی نہ کوئی حصہ نکل جائے اور اسی سے لڑکا پیدا ہو جائے۔ اولاد کی پیدائش کے لیے پورے  
کا پورا مادہ تو ضروری ہے نہیں۔ پھر عزل کرنے والے کو ایسے وقت میں بھلا اس کی احتیاط کیا رہ سکتی ہے کہ وہ اس طرح عزل کرے کہ ایک  
قطرہ منی بھی اندر نہ نکلے پائے۔

(۹۵۱) \* انسانی بخل کی بھی حد ہو گئی کہ وہ اپنے خالق کی بارگاہ میں بھی اس وقت تک مال خرچ کرنا پسند نہیں کرتا جب تک کہ اس سے بھی  
اس کا کوئی معاوضہ وصول نہ کر لے اور وہ بھی پیشگی یعنی وہ نیاز ادا کرنے کا عزم بھی جب کرتا ہے جب کہ مثلاً پہلے اس کا مریض شفا یاب ہو  
جائے حدیث کہتی ہے کہ کارکنان قضاء و قدر کے سامنے یہ مشروط نذر و نیاز بیکار اور لا حاصل بات ہے وہ طے شدہ معاملہ ہے اور اسی طرح  
ہو کر رہے گا۔ مشروط نذریں فیصلوں پر ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ صدقہ کرنے سے بے شک کبھی رو بلا ہو جاتا ہے اس لیے تم  
اگر یہ چاہتے ہو تو شرط کیے بغیر صدقہ دیتے رہو۔ اگر عالم تقدیر میں یہ طے پا چکا ہے کہ تم صدقہ کرو گے تو یہ بلا تم سے ٹل جائے گی للہ ....

اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّذْرِ وَقَالَ إِنَّهُ لَا يَرُدُّ شَيْئًا وَوَ إِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهِ مِنَ الْبَخِيلِ.

(رواه البخاری)

القدر تأتي على وجه لا ينحزم نظام  
الاسباب

(۹۵۲) عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ إِذَا أَرَادَ بَعْدَ خَيْرٍ أَسْتَعْمَلَهُ فَقِيلَ وَ كَيْفَ يَسْتَعْمَلُهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ يُؤَفِّقُهُ بِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ.

(رواه الترمذی و قال هذا حديث صحيح)

(۹۵۳) عَنْ أَبَانَ بْنِ عُثْمَانَ قَالَ سَمِعْتُ أَبِي يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

عليه وسلم نے منتیں ماننے سے روکا ہے اور فرمایا ہے کہ منتیں ماننے سے تقدیر تو بدلتی نہیں ہاں اس بہانہ سے نجیل آدمی کا مال اس کے قبضہ سے زبردستی نکلوا لیا جاتا ہے۔ (بخاری شریف)

قضاء و قدر کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ نظام تقدیر اور نظام تدبیر ٹکرائے نہیں

(۹۵۲) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے متعلق بھلائی کا ارادہ فرما لیتے ہیں تو اس سے نیک کام کرا لیتے ہیں۔ دریافت کیا گیا نیک کام کرانے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا کہ موت سے قبل اس کو نیک کام کرنے کی توفیق بخش دیتے ہیں۔

(۹۵۳) ابان بن عثمان کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کو یہ بیان کرتے خود سنا ہے کہ اگر کوئی بندہ ہر صبح و شام کو تین بار یہ کلمات پڑھ لیا

اللہ ..... تو ان شاء اللہ تعالیٰ تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور تمہارے اس بخل کا مظاہرہ بھی نہ ہوگا۔ حدیث میں جہاں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ امور مقدرہ کے لیے اسباب بھی مقدرہ ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض اسباب ایسے بھی ہیں جن کا ارتکاب عبث ہے۔ عالم تقدیر میں ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ ایسے اسباب نہیں ہیں جیسے عمر میں برکت کے لیے صدقہ۔ اس لیے ان کا ارتکاب کرنا ضاعت وقت کے ساتھ ساتھ حماقت بھی ہے۔ عورت کا کسی مرد سے نکاح کرنے کے لیے دوسری بی بی کے طلاق کا مطالبہ کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔

(۹۵۲) \* یعنی جنتی جنت میں یا دوزخی دوزخ میں جائے گا تو اپنے مقدر ہی سے مگر خانہ پری کے لیے پہلے اس سے اعمال ویسے ہی کرا لیے جائیں گے تا کہ دوزخ یا جنت ملے تو ان کے اسباب کے ساتھ ملے اور قضاء و قدر بھی نافذ ہو تو اسی طرح نافذ ہو کر عالم اسباب میں جو نظام اسباب رکھا گیا ہے وہ درہم برہم نہ ہونے پائے۔ جب اسباب ظاہر یہ قضاء و قدر کے اس طرح جزء بنے ہوئے ہوں تو یہ کون کہہ سکتا ہے کہ تقدیر پر ایمان رکھنے والے اسباب کے بیکار ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

(۹۵۳) \* دیکھئے یہ صحابی اسباب اور قضاء و قدر کا باہم ربط کتنا ٹھیک سمجھے ہوئے ہے۔ وہ بہت مختصر الفاظ میں یہ بتاتا جاتا ہے کہ جب کوئی امر ظہور پذیر ہونا مقدر ہوتا ہے تو وہ اسباب کو توڑ کر مقدر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے اسی کے مناسب اسباب بھی مقدر ہو جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ میرے لیے فالج کی بیماری مقدر ہوئی تو یوں نہیں ہوئی کہ میں اس سے حفاظت کے اسباب تو پورے کر لوں اور اس کے باوجود پھر فالج میں مبتلا ہو جاؤں بلکہ یوں مقدر ہوئی کہ آج اس کے سامان تحفظ ہی نہ کروں تا کہ نظام تقدیر اور نظام تدبیر دونوں کے دونوں قائم رہیں۔ مستدرک حاکم میں ابن عباس کے جلیل القدر شاگرد عکرمہ نے اپنے استاد حضرت ابن عباس سے سوال کیا کہ آپ تو یہ فرماتے ہیں کہ ہد ہد زمین میں چونچ مار کر حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پانی کا سراغ لگا دیتا تھا۔ تعجب ہے کہ زمین کی تہہ کا پانی تو اس کو نظر لگا .....



وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ يَقُولُ فِي صَبَاحٍ كُلِّ يَوْمٍ وَمَسَاءٍ كُلِّ لَيْلَةٍ بِسْمِ اللَّهِ الَّذِي لَا يَضُرُّهُ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَيُضَرُّهُ شَيْءٌ فَكَانَ أَبَانٌ قَدْ أَصَابَهُ طَرْفٌ فَالَجَ فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَنْظُرُ إِلَيْهِ فَقَالَ لَهُ أَبَانٌ مَا تَنْظُرُ إِلَيَّ أَمَا إِنَّ الْحَدِيثَ كَمَا حَدَّثْتُكَ وَلَكِنِّي لَمْ أَقْلَهُ يَوْمَئِذٍ لِيَمْضِيَ اللَّهُ عَلَى قَدَرِهِ. (رواه الترمذی و ابن ماجه)

کرے تو پھر کوئی چیز اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بسم اللہ الذی لا ینصر الخ اس اللہ کے نام کے ساتھ جس کے نام کی برکت سے کوئی چیز نہ زمین پر نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ آسمان میں اور وہ جاننے والا ہے سننے والا ہے ابان کو اتفاق سے فالج پڑ گیا تھا، تو جس شخص سے ابان یہ روایت بیان کر رہے تھے وہ ان کو ازراہ تعجب دیکھنے لگا۔ اس پر ابان نے فرمایا دیکھتے کیا ہو سن لوحیث تو ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح کہ میں نے تم سے بیان کی ہے لیکن آج مجھ کو یہ کلمات پڑھنے ہی یاد نہ رہے تاکہ اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی تقدیر جاری فرمادے۔ (ترمذی - ابن ماجہ)

للہ..... آجائے لیکن جب بچے جال بچھا کر ایک مٹھی بھر خاک اس پر ڈال دیں تو وہ اس کو نظر نہ آئے اور وہ ان کے جال میں پھنس جائے۔ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا خدا تجھے فہم دے اذا جاء القضاء ذهب البصر۔ جب قضاء آ جاتی ہے تو اسی طرح آنکھیں بیکار ہو جایا کرتی ہیں۔ غالباً اسی لیے فارسی کی مثل ہے ”چون قضاء آید طبیب البصر“ اس جواب کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ نفاذ قضاء کے لیے اسباب سے غفلت یہ بھی حکمت تقدیر ہے۔

یہاں یہ اہمیت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے دنیا میں آ کر مذاقِ سخن اور اندازِ غور و فکر بھی اتنا بدل دیا تھا کہ جب تک آپ اسی سانچے میں ڈھل نہ جائیں ان کے کلمات کی گہرائی کو پا نہیں سکتے۔ اگر آج یہی سوال ہمارے سامنے کیا جاتا تو ہم بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیوانات میں قدرت نے کچھ خصوصی شعور طبعاً رکھ دیے ہیں وہ صرف اسی حد تک ان سے استفادہ کرتے رہتے ہیں جس حد تک کہ وہ ان میں رکھے گئے ہیں۔ کسی جانور میں پانی کا کھوج لگانے کا خاصہ رکھا گیا ہے تو یہ اس کا کوئی ہنر نہیں بلکہ ایک طبعی شعور ہے اسی طرح کے دوسرے حیوانات میں بھی دوسرے قسم کے علیحدہ علیحدہ خواص موجود ہیں اور حیوانات ہی میں نہیں جمادات میں بھی یہ خواص نظر آتے ہیں۔ مقناطیس ایک خاص تناسب کے ساتھ لوہے جیسے بھاری چیز کو تو گھسیٹ سکتا ہے مگر کاغذ جیسی خفیف چیز کو ادنیٰ جنبش بھی نہیں دے سکتا۔ مگر یہ جواب اور یہ مذاقِ سخن اسی وقت تک باقی رہ سکتا ہے جب تک کہ عالم حقیقت کا انکشاف نہیں ہوتا۔ جن کے سامنے عالم غیب عالم حقیقت ہے ان کے نزدیک یہ سارا جہان ایک ٹاکیز سینما سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اس لیے ہر سوال و جواب کے موقع پر ان کے سامنے پہلے عالم غیب آ جاتا ہے اس لیے وہی کلمات ان کی زبان سے نکلتے ہیں جو اس کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ دنیا کے واقعات پر بھی آپ ذرا غور کریں یہاں ایک مؤرخ، ایک فلسفی، پھر ان میں نفسیات کے ماہرین، علم طبقات الارض کے رمز شناس سب علیحدہ علیحدہ نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں اور اسی طبقہ کے پہلو بہ پہلو ایک کمر سے کمر طبقہ جو تشیوں کا بھی اپنی پوتھی لیے غور کرتا نظر آتا ہے ان دونوں سے بلند تر اسلام کا بھی یہاں ایک نقطہ غور و فکر ہوتا ہے اور جس طرح کسی ایک واقعہ کے جواب میں ان سب کے جوابات مختلف ہوتے ہیں یہاں اسلام کا بھی ایک علیحدہ جواب ہوتا ہے۔ وہ دنیوی اسباب کا انکار نہیں کرتا بشرطیکہ وہ محض وہم پرستی نہ ہو، مگر اسی کے ساتھ دوسرے اسباب سے خبردار کرتا ہے۔ جن سے عام عالم بے خبر ہوتا ہے اس لیے یہاں ابن عباسؓ نے وہی جواب دیا ہے جو اس وقت عبرت آموز اور سخن شناس طبائع کے لیے مناسب تھا۔

سخن شناس نئی دلبر اخطا اینجا ست

(۹۵۴) عَنْ أَبِي عَزَّةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَضَى اللَّهُ بَعْدَ أَنْ يَمُوتَ بَارِضٌ جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةٌ أَوْ قَالَ بِهَا حَاجَةٌ.

(۹۵۴) ابو عزرہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کی موت کسی جگہ مقدر فرما دیتے ہیں تو اس جگہ اس کو کوئی ضرورت پیدا فرما دیتے ہیں (جس کے پورا کرنے کے لیے وہ جاتا ہے اور اس ذریعہ سے وہ اپنی موت کی جگہ جا پہنچتا ہے)

(رواہ احمد، و الترمذی و قال هذا حديث حسن صحيح و ابو عزة له صحبة اسمه يسار بن عبد و روى الحاكم في المستدرک عن ابن مسعود و عروة بن مفرس و مطر بن عکامس نحوه)

(۹۵۵) عَنْ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ أَنَّهُ قَالَ كَانَ صَدِيقًا لِأُمِّيَّةَ بْنِ خَلْفٍ وَ كَانَ أُمِّيَّةُ إِذَا مَرَّ بِالْمَدِينَةِ نَزَلَ عَلَى سَعْدٍ وَ كَانَ سَعْدٌ إِذَا مَرَّ بِمَكَّةَ نَزَلَ عَلَى أُمِّيَّةَ فَلَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِينَةَ انْطَلَقَ سَعْدٌ

(۹۵۵) سعد بن معاذ روایت فرماتے ہیں کہ ان کا اور امیہ بن خلف کا باہم دوستانہ تھا جب کبھی امیہ مدینہ طیبہ آتا تو ان کا مہمان بنتا اور جب یہ مکہ مکرمہ جاتے تو اس کے مہمان ہوتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے تو ایک بار سعد عمرہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ گئے اور حسب قاعدہ امیہ کے مہمان ہوئے اور اس سے کہا ذرا دیکھنا کوئی خالی

(۹۵۴) \* ان احادیث میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عالم میں بعض واقعات محض اسباب کا بھرم قائم رکھنے کے لیے پیش آتے ہیں اگر تقدیر عالم اسباب کو توڑ کر سامنے آ جائے تو اسباب کی تاثیر کا سارا راز فاش ہو جائے۔ دیکھئے آدمی سفر کرتا ہے اپنی ضرورت کی خاطر ادھر تقدیر کھینچتی ہے موت کی خاطر۔ ظاہر میں تو یہ سمجھتا ہے کہ یہاں آنا ہوا تھا ایک ضرورت کے لیے اس لیے یہاں موت آ گئی اور تقدیر یہ کہتی ہے کہ چونکہ موت ہی یہاں کی مقدر تھی اس لیے یہاں آنا ہوا۔ پہلی صورت میں انسان کے دل میں یہ خیال رہ رہ کر آ سکتا ہے کہ اگر کاش یہ شخص یہاں نہ آتا تو اس کی موت اپنے وطن ہی میں آتی اور موت غربت سے بچ جاتا۔ لیکن دوسری صورت میں اس خیال کی بجائے دل میں یہ جزم حاصل ہوتا ہے کہ جب موت یہاں کی مقدر تھی تو یہ اپنے وطن میں رہتا کیونکر۔

نقول میں کسی جگہ نظر سے گزرا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجلاس میں ایک مرتبہ حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی بصورت انسان موجود تھے وہ بار بار ایک شخص کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اس درمیان میں اس شخص نے کسی بعید مقام پر پہنچا دینے کی ان سے درخواست کی اس پر حضرت عزرائیل علیہ السلام کے چہرہ پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس شخص کے متعلق مجھ کو فلاں مقام پر اس کی روح قبض کرنے کا حکم ہوا ہے وہ مقام یہاں سے بہت طویل مسافت پر ہے اور اس کی قبض روح میں اتنے وقت کی گنجائش نہیں پھر یہ ہوگا کیسے۔ جب اس نے یہ درخواست پیش کی تو مجھ کو اس پر ہنسی آ گئی کہ اس کے وہاں پہنچنے کے سامان حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعہ مقدر تھی ادھر اب یہ وہاں پہنچتا ہے اور ادھر ٹھیک محل ٹھیک وقت پر حکم ربی نافذ ہوتا ہے۔

حضرت سلیمان کی تسخیر کا تذکرہ خود قرآن عزیز میں موجود ہے اس لیے اس خاص واقعہ کو صرف اس کے بر محل ہونے کی وجہ سے ذکر کر دیا گیا ہے اسی لیے اس کے اسناد وغیرہ کی تفتیش بھی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو اس پر بھی تحقیق کر لی جاتی۔

(۹۵۵) \* آپ نے دیکھا مٹی کی کشش کیسی ہوتی ہے اور یہ کہ جب کسی شخص کی موت کسی جگہ مقدر ہوتی ہے تو وہ کس طرح مجبور ہو کر آخر اسی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ یہاں امیہ نے ہزار جتن کیے مگر ایک نہ چلا اپنے ارادہ کے خلاف اس کو جنگ میں شریک ہونا بھی پڑا اور وہ اونٹ لٹے.....



ساوقت ملے تو مجھے بیت اللہ کا طواف کرنا ہے۔ دوپہر کے قریب یہ طواف کے لیے نکلے اتفاقاً ابو جہل کی ان دونوں سے ملاقات ہوگئی اس نے پوچھا ابو صفوان! (امیہ کی کنیت ہے) یہ تمہارے ساتھ کون آدمی ہے؟ اُس نے کہا سعد بن معاذ ہیں۔ اس پر ابو جہل بولا میں دیکھ رہا ہوں تم بڑے اطمینان سے بیت اللہ کا طواف کر رہے ہو حالانکہ تم نے ان لوگوں کو جو یہاں سے اپنا آبائی دین چھوڑ کر چلے گئے ہیں اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے اور تمہارا گھمنڈ یہ ہے کہ جنگ میں تم ان کی مدد بھی کرو گے۔ خدا کی قسم اگر اس وقت تم ابو صفوان کے ساتھ نہ ہوتے تو اپنے گھر زندہ نہیں جاسکتے تھے۔ اس پر سعد برہم ہو کر ذرا بلند آواز سے بولے خدا کی قسم اگر تو مجھ کو طواف سے روکے گا تو میں تجھ کو ایسی بات سے روکوں گا جو اس سے زیادہ تجھ پر شاق ہوگی۔ یعنی اہل مدینہ کی طرف سے تیرا تجارتی راستہ بند کر دوں گا۔ امیہ نے کہا دیکھو سعد ان سے ایسی تیزی سے گفتگو نہ کرو آخر یہ بھی اس وادی کے سردار ہیں۔ سعد نے امیہ سے مخاطب ہو کر کہا بس آپ بھی رہنے دیجئے خدا کی قسم میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ وہ تم کو قتل کریں گے۔ امیہ بولا ارے کیا مکہ میں۔ سعد نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ امیہ نے کہا خدا کی قسم میں مکہ سے کہیں باہر نکلوں گا ہی نہیں۔ اس گفتگو کے بعد جب غزوہ بدر کی نوبت آئی تو ابو جہل نے لوگوں کو جمع کرنا شروع کیا اور یہ تقریر کی۔ تمہارا تجارتی قافلہ روک لیا گیا ہے لوگو! تم اس کی خبر لو۔ لیکن امیہ کو جنگ کے لیے نکلنا سخت ناگوار تھا۔ ابو جہل کو جب یہ احساس ہوا تو وہ اس کے پاس آیا اور سمجھانے لگا۔ ابو صفوان! دیکھئے آپ اس وادی کے سردار ہیں جب لوگ آپ ہی کو دیکھیں گے کہ آپ جنگ سے ہٹ رہے ہیں تو وہ بھی آپ کے ساتھ ہے رہ جائیں گے۔ ابو جہل اس کو برابر سمجھاتا رہا یہاں تک کہ وہ بولا۔ اچھا ابھی جب تم

مُعْتَمِرًا فَنَزَلَ عَلَى أُمِّيَّةَ بِمَكَّةَ فَقَالَ لَأُمِّيَّةَ أَنْظِرْ لِي سَاعَةَ خَلْوَةٍ لَعَلِّي أَنْ أَطُوفَ بِالْبَيْتِ فَخَرَجَ بِهِ قَرِيبًا مِنْ نِصْفِ النَّهَارِ فَلَقِيَهُمَا أَبُو جَهْلٍ فَقَالَ يَا أَبَا صَفْوَانَ مَنْ هَذَا مَعَكَ فَقَالَ هَذَا سَعْدٌ فَقَالَ لَهُ أَبُو جَهْلٍ أَلَا أَرَاكَ تَطُوفُ بِمَكَّةَ إِمْنَا وَقَدْ أُوَيْتُمُ الصَّبَاةَ وَ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ تَنْصُرُونَهُمْ وَ تَعِينُونَهُمْ أَمَا وَاللَّهِ لَوْلَا أَنَّكَ مَعَ أَبِي صَفْوَانَ مَا رَجَعْتُ إِلَى أَهْلِكَ سَالِمًا فَقَالَ لَهُ سَعْدٌ وَ رَفَعَ صَوْتَهُ عَلَيْهِ أَمَا وَاللَّهِ لَئِنْ مَنَعْتَنِي هَذَا لَأَمْنَعَنَّكَ مَا هُوَ أَشَدُّ عَلَيْكَ مِنْهُ طَرِيقُكَ عَلَى أَهْلِ الْمَدِينَةِ فَقَالَ لَهُ أُمِّيَّةُ لَا تَرْفَعْ صَوْتَكَ يَا سَعْدُ عَلَى أَبِي الْحَكَمِ سَيِّدِ أَهْلِ الْوَادِي فَقَالَ سَعْدٌ دَعْنَا عَنْكَ يَا أُمِّيَّةُ فَوَاللَّهِ لَقَدْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ أَنَّهُمْ قَاتِلُوكَ قَالَ بِمَكَّةَ قَالَ لَا أَدْرِي فَقَالَ أُمِّيَّةُ وَاللَّهِ لَا أَخْرُجُ مِنْ مَكَّةَ فَلَمَّا كَانَ يَوْمَ بَدْرٍ اسْتَنْفَرَ أَبُو جَهْلٍ النَّاسَ قَالَ أَدْرِ كَوَعِيرُكُمْ فِكْرَهُ أُمِّيَّةُ أَنْ يَخْرُجَ فَاتَّاهُ أَبُو جَهْلٍ فَقَالَ يَا أَبَا صَفْوَانَ إِنَّكَ مَتَى يَرَاكَ النَّاسُ قَدْ تَخَلَّفْتَ وَ أَنْتَ

اللہ..... جس کو جان کے ساتھ لگائے پھرتا تھا وہ بھی خاک کا مہ آسکا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو پیش گوئی تھی وہ صبح صادق کی طرح پوری ہو کر رہی۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار گوزبانوں سے آپ کی نبوت کا اقرار نہ کرتے ہوں مگر دلوں میں اس کا یقین رکھتے تھے کہ آپ کا فرمودہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے، ٹل نہیں سکتا۔ یہاں ابو صفوان کی بیوی چلتے چلتے سمجھاتی رہی مگر قضاء و قدر جہاں کی موت لکھ چکی تھی وہاں ابو صفوان کو کسی نہ کسی حیلہ بہانہ سے آنا ضروری تھا کچھ نہ سہی تو ابو جہل کا اصرار اور قوم کی عار ہی کے سبب سہی۔

سَيِّدُ أَهْلِ الْوَادِي تَخَلَّفُوا مَعَكَ فَلَمْ يَزَلْ بِهِ أَبُو جَهْلٍ حَتَّى قَالَ أَمَّا إِذَا غَلَبَتْنِي فَوَاللَّهِ لَا شَتْرَيْنَ أَجُورَ بَعِيرٍ بِمَكَّةَ ثُمَّ قَالَ أُمِّيَّةُ يَا أُمَّ صَفْوَانَ جَهَّزِينِي فَقَالَتْ لَهُ يَا أَبَا صَفْوَانَ وَ قَدْ نَسِيتُ مَا قَالَ لَكَ أَخُوكَ الْيَثْرِبِيُّ قَالَ لَا وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَجُورَ مَعَهُمْ إِلَّا قَرِيبًا فَلَمَّا خَرَجَ أُمِّيَّةُ أَخَذَ لَا يَنْزِلُ مَنْزِلًا إِلَّا عَقَلَ بَعِيرَهُ فَلَمْ يَزَلْ بِذَلِكَ حَتَّى قَتَلَهُ اللَّهُ بَيْدَرٍ .

(رواه البخاری فی باب من یقتل بیدر)

اعتقاد القدر لا یمنع ارتکاب

الاسباب بل یحث علیها

(۹۵۶) عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضَى بَيْنَ رَجُلَيْنِ فَقَالَ الْمَقْضَى عَلَيْهِ لَمَّا أَذْبَرَ حَسْبِيَ اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يُلْوِمُ عَلَى الْعَجْزِ وَ لَكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَيسِ فَإِذَا غَلَبَكَ أَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ .

(رواه ابوداؤد)

(۹۵۷) عَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْكَيسُ مَنْ وَ ان

میرا پیچھا چھوڑتے ہی نہیں تو دیکھو میں مکہ میں جو بڑھیا سے بڑھیا اونٹ ہوگا وہ خریدتا ہوں۔ اس کے بعد اپنی بیوی ام صفوان سے کہا سامان سفر تیار کر۔ اس نے کہا ابو صفوان کیا وہ بات جو تمہارے یثربی بھائی نے تمہارے متعلق کہی تھی بھول گئے ہو؟ ابو صفوان نے کہا نہیں تو مگر میرا ارادہ ان کے ساتھ صرف دو ایک دن ہی رہنے کا ہے۔ یہ انتظام کر کے جب امیہ جنگ کے لیے نکلا تو جس پڑاؤ پر ٹھہرتا اپنا اونٹ پاس ہی باندھتا (تاکہ ذرا خطرہ ہو اور اونٹ پر بیٹھ بھاگ لے) یہ انتظامات وہ برابر کرتا رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں اس کو ہلاک کیا۔

(بخاری شریف)

قضاء و قدر کا اعتقاد اسباب کے ارتکاب سے نہیں روکتا بلکہ

اس کی ترغیب دیتا ہے

(۹۵۶) عَوْفُ بْنُ مَالِكٍ رَوَى عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَضَى بَيْنَ رَجُلَيْنِ فِي شَيْءٍ فَخَالَفَ فِيصْلَهُ هُوَ أَتَاهَا جَبَّ وَهُوَ بِشَتْ يَحْمِلُ حِجْلًا لَهَا تَوَّاسُ نَفْسُ كَانَتْ مَعَهُ حَسْبِيَ اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ يَعْنِي مَجْهَدُ تَعَالَى كَانِي هُوَ وَهُوَ بِهْتَرِينَ كَارِسَا زَهِي - يَهْنُ كَرِ آفَ نَفَرَا مَالِ اللَّهِ تَعَالَى سَعَى وَ كُوشَشَ نَهْ كَرْنِ فَرَمَلَمَتُ كَرْتَا هُوَ اس لِيَهْ هِمِيشَهْ پَهْلَ اِپْنِ مَعَامَلَاتِ مِیْنِ دَانَانِیْ سَهْ كَامَ لِيَا كَرِ پَهْرَ اس كَهْ بَعْدَ بَهْیِ اِگَرِ حَالَاتِ خَلَاَفَ هُوَ جَائِیْنِ تَوَّاسُ وَ قَتَّ حَسْبِيَ اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ پُرْ هَا كَرِ -

(ابوداؤد شریف)

(۹۵۷) شَدَّادُ بْنُ أَوْسٍ رَوَى عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَضَى بَيْنَ رَجُلَيْنِ فِي شَيْءٍ فَخَالَفَ فِيصْلَهُ هُوَ أَتَاهَا جَبَّ وَهُوَ بِشَتْ يَحْمِلُ حِجْلًا لَهَا تَوَّاسُ نَفْسُ كَانَتْ مَعَهُ حَسْبِيَ اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ يَعْنِي مَجْهَدُ تَعَالَى كَانِي هُوَ وَهُوَ بِهْتَرِينَ كَارِسَا زَهِي - يَهْنُ كَرِ آفَ نَفَرَا مَالِ اللَّهِ تَعَالَى سَعَى وَ كُوشَشَ نَهْ كَرْنِ فَرَمَلَمَتُ كَرْتَا هُوَ اس لِيَهْ هِمِيشَهْ پَهْلَ اِپْنِ مَعَامَلَاتِ مِیْنِ دَانَانِیْ سَهْ كَامَ لِيَا كَرِ پَهْرَ اس كَهْ بَعْدَ بَهْیِ اِگَرِ حَالَاتِ خَلَاَفَ هُوَ جَائِیْنِ تَوَّاسُ وَ قَتَّ حَسْبِيَ اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ پُرْ هَا كَرِ -

(۹۵۶) \* سبحان اللہ تقدیر کا سبق دینے والے تو تدبیر میں ادنیٰ سے تساہل کا نام بھی غمزہ رکھیں اس کو نفرت سے دیکھیں اور دانائی و ہوش سے کام لینے کی سخت تاکید فرمائیں اور جب تمام کوششیں پوری کرنے کے بعد بھی گھٹنے ٹک جائیں اس کے بعد اپنی تسلی کے لیے تقدیر کو یاد کرنے کی ہدایت فرمائیں اور لوگ یہ سمجھیں کہ آپ خود گھٹنے توڑ کر بیٹھ رہے اسباب کو یکسر معطل کر ڈالنے کے عقیدہ کی تعلیم دے رہے ہیں۔

(۹۵۷) \* یہ حدیث کہتی ہے کہ جو جدوجہد کے میدان میں سرگرمی دکھا رہا ہے اس کا نام تو دانا ہے اور جو اسباب کیے بغیر بیٹھا ہے.....



اور اپنی موت کے بعد کی زندگی کے لیے سامان کیا اور در ماندہ شخص وہ ہے جس نے اپنے نفس کو تو اس کی خواہشات کے تابع رکھا اور اس پر لگا اللہ تعالیٰ سے امیدیں باندھنے۔ (ترمذی - ابن ماجہ)

نَفْسُهُ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَ الْعَاجِزُ مَنْ  
اتَّبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَ تَمَنَّى عَلَى اللَّهِ.

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

(۹۵۸) عَنْ نَافِعٍ قَالَ كُنْتُ أُجْهَزُ إِلَى  
الشَّامِ وَ إِلَى مِصْرَ فَجَهِزْتُ إِلَى الْعِرَاقِ  
فَأَتَيْتُ إِلَى أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ عَائِشَةَ فَقُلْتُ لَهَا يَا  
أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ كُنْتُ أُجْهَزُ إِلَى الشَّامِ  
فَجَهِزْتُ إِلَى الْعِرَاقِ فَقَالَتْ لَا تَفْعَلْ مَا لَكَ  
وَ لِمَتَجَرَّكَ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِذَا سَبَّ اللَّهُ لَا  
حَدَّكُمْ رِزْقًا مِنْ وَجْهِهِ فَلَا يَدْعُهُ حَتَّى يَتَغَيَّرَ لَهْ  
أَوْ يَتَنَكَّرَ لَهْ. (رواہ احمد و ابن ماجہ)

(۹۵۸) نافع بیان فرماتے ہیں کہ میں اپنا سامان تجارت ملک شام اور مصر کی طرف لے جایا کرتا تھا کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ عراق لے گیا (واپسی میں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے ام المؤمنین پہلے میں اپنا سامان تجارت شام لے جایا کرتا تھا۔ اس مرتبہ عراق لے گیا تھا۔ آپ نے فرمایا آئندہ ایسا مت کرنا آخر تم نے اپنی پہلی تجارت گاہ میں کیا نقصان دیکھا (جو دوسری بدلی) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کی روزی کسی حیلہ سے لگا دے تو جب تک وہ صورت خود ہی نہ بدل جائے اس وقت تک اس کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ (احمد - ابن ماجہ)

لہ..... ہوا ہے اور اس بے عملی میں پڑا ہوا بڑی بڑی تمناؤں میں پھنسا ہوا ہے اس کا نام متبع نفس اور در ماندہ انسان ہے۔ پھر مخالفین کو یہ سبب کیسے پیدا ہو گیا کہ عقیدہ تقدیر ہی امت مسلمہ کے عملی ضعف کا باعث بنا ہوا ہے اور اسی لیے یہ امت دنیوی ترقیات میں سب سے پیچھے رہ گئی ہے۔ یہاں دنیوی ترقیات میں پیچھے رہ جانا تو صحیح ہے مگر اس کا سبب ہے کیا؟ اس کے جواب میں ہر شخص کا جواب مختلف ہے۔ منکر تقدیر تو تقدیر پر اعتقاد سمجھتا ہے۔ سود خور یہ کہتا ہے کہ سود نہ لینا اس کا سبب ہے۔ کمیونسٹ کہتا ہے کہ اس کسل کا اصل راز مذہب کی افیم کھانا ہے۔ یہاں اسلام بھی کچھ کہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اصل سبب جس کے دامن سے وابستہ ہو کر بام عروج پر پہنچے تھے اسی کو چھوڑ بیٹھنا ہے۔

(۹۵۸) \* اس حدیث کو بار بار پڑھنا چاہیے کہ حضرت ام المؤمنین نے اس کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ تیری یہ شکایت کرنا ہی غلط ہے تیری قسمت میں اس مرتبہ تھوڑا ہی رزق ہو گا اگر شام جاتا تو بھی تجھ کو تھوڑا ہی نفع ہوتا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ جن ممالک میں تجارت فائدہ بخش ہو چکی ہو اس کو ترک کرنا اسباب ظاہریہ کے بھی خلاف ہے آپ بھی جانتے ہیں کہ آمد و رفت کی جگہ آدمی کی معرفت پیدا ہو جاتی ہے اور بھی تجارتی منافع ہو جاتے ہیں اجنبی جگہ میں نہ انسان کی معرفت ہوتی ہے نہ وہ تجارتی منافع تو پھر بے وجہ تقدیر آزمائی کی ضرورت۔ جتنی بات تقدیر کے حق میں ہم پر لازم قرار دے گئی ہے وہ اس پر ایمان رکھنا ہے یعنی یہ سمجھ لینا کہ ہماری ہر نقل و حرکت سب پہلے سے لکھی جا چکی ہے مگر اس طویل دفتر میں سے ہمیں علم ایک شوشہ کا بھی نہیں ہوتا اس لیے عملی طور پر ہم کو صرف صحیح طور پر جدوجہد کرتے رہنے کا ہی مکلف بنایا گیا ہے۔

غور فرمائیے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کس طرح اسباب اور قضاء و قدر دونوں کے اسرار لپیٹے ہوئے ہیں۔ رزق کا معاملہ چونکہ مقدرات میں داخل ہے مگر ہے اپنے اسباب کے ساتھ اس لیے فرماتے ہیں کہ رزق کا سبب ہونا تو ضروری ہے مگر لہ.....

(۹۵۹) عَنْ أَنَسٍ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا كُنَّا فِي دَارٍ كَثُرَ فِيهَا عَدَدُنَا وَ أَمْوَالُنَا فَتَحَوَّلْنَا إِلَى دَارٍ قَلَّ فِيهَا عَدَدُنَا وَ أَمْوَالُنَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَرُوهَا ذَمِيمَةً. (رواه ابو داؤد)

(۹۵۹) انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلے ہم ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس میں ہماری جانوں اور ہمارے مال دونوں میں بڑی برکت ہوئی اب جو دوسرے مکان میں آئے ہیں تو وہاں جان و مال دونوں میں گھٹا ہو رہا ہے۔ آپ نے فرمایا ایسے خراب کو چھوڑ دو۔ (ابوداؤد)

(۹۶۰) عَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بَحِيرٍ قَالَ أَخْبَرَنِي مَنْ سَمِعَ فَرُوةَ بْنِ مُسِيكٍ يَقُولُ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ عِنْدَ نَارِضٍ يُقَالُ لَهَا أَبِينُ وَ هِيَ أَرْضُ رَيْفِنَا وَ مِيرَتَنَا وَ إِنَّ وَ بَاءَ هَا شَدِيدٌ فَقَالَ دَعَهَا عَنْكَ فَإِنَّ مِنَ الْقَرْفِ التَّلَفُ. (رواه ابو داؤد)

(۹۶۰) یحییٰ کہتے ہیں کہ مجھے ایک ایسے شخص نے اطلاع دی ہے جس نے فروۃ بن مسیک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرتے ہوئے خود سنا ہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری ایک زمین ہے جس کا نام ”ابین“ ہے ہمارے کھانے پینے اور کھیتی کی جگہ وہی ہے لیکن وہاں کی آب و ہوا بہت خراب ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو کیونکہ ایسی جگہ بود و باش رکھنے سے جان کا نقصان ہوتا ہے۔ (ابوداؤد)

لہذا ..... اس کو سبب بنانے والا بھی تو کوئی ہونا چاہیے اب سبب پر تو نظر کرنا اور مسبب سے قطع نظر کرنا یہ کس درجہ نا انصافی اور احسان فراموشی کی بات ہے۔ پھر جب اس نے تمہاری روزی کا کوئی سبب پیدا فرما دیا ہے تو اب اچھی خاصی لگی لگائی روزی پر لات مارنا بھی کتنی ناشکری ہے۔ ناشکری کی جزاء ہے یہی کہ دی ہوئی نعمت لے لی جائے۔ حدیث کا ہر ہر جملہ اس کا ثبوت ہے کہ آپ کو جوامع الکلم مرحمت ہوئے تھے عمیق حقائق کو اس طرح سادے سادے الفاظ میں پھراتی بے تکلفی اور برجستگی سے کیا یہی ایک کمال آپ پر ایمان لانے کے لیے کافی نہیں ہے۔

(۹۵۹) \* یہ وہ برکت و نقصان نہیں جو زمانہ جاہلیت کے قدیم لوگ صرف کسی مکان کا اثر سمجھا کرتے تھے خواہ وہ کتنا ہی بہتر سے بہتر کیوں نہ ہو یا آج بھی جیسا بعض ضعیف الاعتقاد نحوست وغیرہ کے قائل ہو جاتے ہیں بلکہ وہ برکت و نحوست ہے جو مکان کے محل وقوع یا اس کی ناموزونیت یا اس کے تعمیری سقم سے عالم اسباب کے تحت پیدا ہونی ناگزیر ہے۔ قضاء و قدر کا اعتقاد یہ تعلیم نہیں دیتا کہ رہائش کے لیے ایسا مکان انتخاب کیا جائے جس میں نہ وسعت ہو نہ ہوا کی آمد و برد ہو اور نہ اس کا محل وقوع ہی مناسب ہو انسان کو دنیا میں مختار بنایا گیا ہے اور اعمال شرعیہ کا مطالبہ اس کے اسی اختیار کی بناء پر ہے پس جس طرح وہ اچھے اعمال کے کرنے اور برے اعمال کے نہ کرنے کا مکلف بنایا گیا ہے اسی طرح اپنی دنیوی زندگی میں بھی اس کو ان دونوں راہوں کا امتیاز لازم ہے۔

(۹۶۰) \* وبائی امراض اچھی آب و ہوا کے ملکوں میں بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا حکم ان علاقوں سے بالکل علیحدہ ہے جن کی آب و ہوا مستقلاً خراب ہو۔ اس حدیث نے یہ درمیانی راہ تعلیم دی کہ انسان کو نہ تو اتنا ضعیف الاعتقاد ہونا چاہیے کہ اگر اچھی آب و ہوا کے ملک میں اتفاقاً کوئی وبائی مرض آجائے تو وہاں سے بھاگ پڑے اور نہ اتنا جامد ہونا چاہیے کہ بود و باش ہے ایسے ملک میں رکھے جہاں کی آب و ہوا ہلاکت کا باعث ہو۔ بندہ مختار ہے اور قضاء و قدر کے تحت بھی ہے۔ ان دونوں اعتقادوں کا ثبوت اس کے عمل سے ظاہر ہونا چاہیے لہذا .....



(۹۶۱) عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّاعُونَ رَجَزُ أُرْسِلَ عَلَى طَائِفَةٍ مِّنْ بَنِي إِسْرَآئِيلَ أَوْ عَلَى مَن كَانَ قَبْلَكُمْ فَإِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ فَلَا تَقْدُمُوا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهُ. (متفق عليه)

(۹۶۱) اسامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاعون خدا تعالیٰ کا عذاب تھا جو بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں پر نازل ہوا تھا (آپ نے یہ لفظ کہے یا ”تم سے پیشتر کے لوگوں پر“ فرمایا) لہذا جب تم کسی جگہ طاعون سنو تو وہاں نہ جاؤ اور اگر طاعون اس جگہ آ جائے جہاں تم رہتے ہو تو طاعون کے خوف سے بھاگ کر بھی نہ جاؤ۔ (متفق علیہ)

(۹۶۲) عَنْ عُمَرُو بْنِ الشَّرِيدِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ كَانَ فِي وَفْدٍ ثَقِيفٍ رَجُلٌ مَّجْدُومٌ فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّا قَدْ بَايَعْنَاكَ فَارْجِعْ. (رواه مسلم)

(۹۶۲) عمرو بن شرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وفد (جماعت) ثقیف (قبیلہ کا نام ہے) میں ایک شخص تھا جس کو جذام کا مرض تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کہلا بھیجا۔ ہم نے تجھے بیعت کر لیا ہے لہذا وہیں سے واپس چلا جا۔ (مسلم شریف)

اللہ..... پس خراب آب و ہوا میں رہنا اس کے قدر کے اعتقاد کی پختگی کا ثبوت ہے۔ مگر اس عالم اسباب میں انسانی اختیار کی نفی کرتا ہے اور اچھے مقام سے وبائی امراض میں بھاگ پڑنا صرف اس کے مختار ہونے کا ثبوت ہے مگر قضاء و قدر پر اس کے اعتقاد کی نفی کرتا ہے۔ اس عالم اسباب میں اعتدال کی راہ درمیان کی ہے نہ خراب آب و ہوا میں بود و باش رکھو اور نہ اتفاقی و باء سے ڈر کر بھاگ نکلو۔

(۹۶۱) \* اس حدیث میں ”فراراً منه“ کی قید بہت زیادہ قابل لحاظ ہے۔ وباء زدہ علاقہ سے نکلنا اگر کسی اتفاقیہ ضرورت سے ہو تو وہ ممنوع نہیں جس بات سے روکا گیا ہے وہ بندہ کا ایسا عمل ہے جو قضاء و قدر کی تکذیب کرتا ہو۔ طاعون کے خوف سے بھاگنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس تدبیر سے یا تو تقدیر الہی کو بدل دے گا یا اس کے نزدیک یہ معاملہ قضاء و قدر کے تحت ہی نہیں ہے۔ لیکن جس کا اعتقاد یہ ہو کہ اس کی موت و حیات سے لے کر اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت بھی کاتب تقدیر کے قلم کے تحت آ چکی ہے اور اس کا اعتقاد بھی ہو کہ کسی صورت میں بھی اس کے خلاف ہو سکتا ہی نہیں وہ وباء زدہ علاقہ سے ڈر کر ہرگز ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ دین اسلام میں اعتقاد کے ساتھ ضرورت اسباب اور انسانی ضعف کی اس حد تک خود رعایت کر لی ہے جس سے اس کے اعتقاد کی تکذیب لازم نہ آتی ہو۔

(۹۶۲) \* فطرۃ کمزور انسان کو اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی اپنے آپ کو آزمائش میں نہ ڈالے۔ وباء زدہ علاقوں میں جا جا کر نہ گھسے جو مریض موزی امراض میں گرفتار ہیں ان کو بلا بلا کر نہ لائے اعتماد علی التقدير کے ساتھ اپنی کمزور فطرت کی رعایت بھی ضروری چیز ہے۔ ہاں اگر طاعون اسی کے شہر میں آ جائے یا گھر میں ہی کوئی شخص کسی موزی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اب اپنی استقامت کا ثبوت دے اور تقدیر کو یاد کر کر کے اپنے فطری ضعف کا مقابلہ کرتا رہے۔ چونکہ بہت سے انسانوں کے دلوں میں اختلاط تعدیہ امراض کے اعتقاد کا سبب ہو جاتا ہے اس لیے بے وجہ شریعت اپنی فطرت کے ساتھ زور آزمائی کی اجازت نہیں دیتی۔ اور جب ضرورت سر پر آ جائے تو اب ضعف بشری کے بہانے کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ اسلام ثبات قدمی کی دعوت دیتا ہے۔ مگر ہوش کے ساتھ صرف جوش کے ساتھ نہیں۔ اسی لیے آپ نے فرمایا لا تتضمنوا لقاء العدو (دشمن سے جنگ ہو یہ تمنا نہیں نہ کیا کرو) ہے بڑے فضیلت کی چیز مگر اتنی ہی پر خطر بھی ہے اگر میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تو پھر کہیں تمہارا بھی نہیں اس لیے اس کی تمنا نہ کرو اور جب سر پر آ جائے تو پہاڑوں سے بڑھ کر ثابت قدمی دکھاؤ۔

(۹۶۳) عَنْ جَابِرٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ فَإِذَا أُصِيبَ دَوَاءُ الدَّاءِ بَرَأَ بِإِذْنِ اللَّهِ تَعَالَى.

(رواہ مسلم)

(۹۶۴) عَنْ أُسَامَةَ بْنِ شَرِيكَ قَالَ قَالَتْ الْأَعْرَابُ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَا تَدَاوِي قَالَ نَعَمْ تَدَاوُوا فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً أَوْ قَالَ دَوَاءً إِلَّا دَاءً وَاحِدًا فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا هُوَ قَالَ الْعَرَمُ. (رواہ احمد و ابوداؤد و

الترمذی و قال هذا حديث حسن صحيح)

(۹۶۵) عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ إِخْوَانُ عَلِيٍّ عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ أَحَدُهُمَا يَأْتِي النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْآخَرُ يُخْتَرِفُ فَشَكَى الْمُخْتَرِفُ

(۹۶۳) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہر مرض کے لیے دوا ہے جب کسی بیماری کے لیے ٹھیک دوا پہنچ جاتی ہے تو خدا تعالیٰ کے حکم سے شفاء ہو جاتی ہے۔ (مسلم شریف)

(۹۶۴) اسامہ بن شریک روایت کرتے ہیں کہ کچھ دیہاتی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ہم بیماریوں کا علاج کیا کریں؟ فرمایا ہاں دوا کا استعمال کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کے لیے دوا پیدا کی ہے مگر صرف ایک بیماری۔ انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کون سی بیماری ہے؟ فرمایا حد سے گزرا ہوا بڑھا پیا۔

(احمد ترمذی، ابوداؤد)

(۹۶۵) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو بھائی تھے ان میں ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر رہا کرتا اور دوسرا تجارت کرتا۔ جو بھائی تجارت کرتا تھا اس نے اپنے بھائی کے کام میں شرکت نہ کرنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے

(۹۶۳) \* اس عالم میں بیماری اور اس کی دوا دونوں قدرت ہی نے پیدا فرمائی ہیں لہذا دوا کا استعمال کرنا تو ضروری ٹھہرا لیکن یہ غلط ہوگا کہ شفاء تو شافی مطلق دے اور تم تعریف کرو دوا کی۔ سوچنا یہ چاہیے کہ اس جمادِ محض میں یہ اثر پیدا کس نے فرمایا؟ کہو اس نے جس نے بیماری پیدا فرمائی۔ اس جگہ ترجمان السنۃ جلد ثانی حدیث ۶۵۶ ص ۳۳۸ کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

(۹۶۴) \* یہاں دوا کرنے کا صریح حکم ہو رہا ہے کیا اس کے بعد بھی یہ وسوسہ لانا چاہیے کہ قضاء و قدر اسباب سے تعطل کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر کہیں انسان کے قبضہ میں بڑھا پے کی دوا بھی آجائے تو شاید وہ بڑی جرأت سے قدرت کا انکار کر دے عام بیماریوں کے معالجات پر بھی اب تک اس نے جتنا قابو پالیا ہے وہی اس کے اعتقاد کو متزلزل بنا رہا ہے اب اگر کہیں بوڑھے بھی جوان بن بن کر خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی دنیا میں ڈٹے رہتے تو خالق کا کون یقین کرتا اس لیے ہر دروازہ پر شکست دینے کے لیے قدرت کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا لانیل بنا دیتی ہے جہاں انسان متحیر کھڑا نظر آتا ہے۔ یہاں پہنچ کر نصیب والے کی تو آنکھیں کھل جاتی ہیں اور بدنصیب آئندہ انکشاف کی امید میں پھر بھی یہ سبق بھی قدرت الہیہ کا قائل ہو کر نہیں دیتا۔

(۹۶۵) \* تقدیر کے معلم اول نے کبھی کسی کو ایک مرتبہ بھی یہ سبق نہیں دیا کہ وہ کسبِ معاش چھوڑ کر صرف تقدیر کے بھروسہ پر معطل ہو کر بیٹھ جائے البتہ جب کہیں یہ دیکھا ہے کہ کسبِ معاش کا خمار اتنا چڑھ چکا ہے کہ دوسروں کا رزق بھی اپنے ذمہ سمجھ لیا ہے تو اس جگہ اتنی سی تنبیہ کر دینی ضروری سمجھی ہے کہ معاملہ کہیں اس کے برعکس نہ ہو یعنی تمہارا ہی رزق اس کی بدولت نہ مل رہا ہو۔ یہاں بھی آپ نے اس لئے.....



أَخَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهِ. (رواه الترمذی و قال هذا  
شکایت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید تجھے رزق اُسی کے مقدر سے ملتا ہو۔)

(ترمذی شریف)

(حدیث صحیح غریب)

الایمان بالقدر من اعظم منابع القوة (۹۶۶) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ يَا غُلَامُ احْفَظِ اللَّهَ يَحْفَظْكَ احْفَظِ اللَّهَ تَجِدْ تُجَاهَكَ وَإِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللَّهَ وَ  
قوتِ ارادہ کے استحکام میں قضاء و قدر پر اعتقاد کا عجب اثر ہوتا ہے (۹۶۶) ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، آپ نے فرمایا اللہ کو یاد رکھا کرو وہ تمہارا نگہبان رہے گا، اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو تو اس کو اس طرح پاؤ گے جیسے وہ تمہارے سامنے موجود ہے۔ جب مانگنا تو خدا تعالیٰ سے ہی مانگنا اور جب مدد طلب کرنا تو

اللہ..... محترف کو اس کے حرفہ سے نہیں روکا لیکن جب حرفہ پر اعتماد کی یہ نوبت آگئی کہ جو بھائی علم نبوت کی تحصیل میں مشغول تھا اور اس وجہ سے کسی حرفہ کے کرنے سے معذور تھا اس کی شکایت کی گئی تو اس وقت آپ نے ضروری سمجھا کہ اب اس کے سامنے ایک دوسرا ورق بھی کھول دیا جائے۔ اور فرمایا جیسا ماں کی چھاتیوں میں دودھ بچہ ہی کے مقدر کا اترتا ہے ایسا ہی کبھی کبھی حرفہ کرنے والے کو بھی کسی غیر محترف کے مقدر کا رزق مل جاتا ہے اس لیے یہ سمجھنا تو صحیح کہ رزق کے لیے کسب کی ضرورت ہے مگر یہ صحیح نہیں کہ جس کا رزق ہو اسی کے لیے کسب کرنا بھی ضروری ہے بلکہ کبھی کسب کوئی کرتا ہے اور اس میں رزق کسی کا ہوتا ہے دولت اور کسب کے مابین کیا رشتہ رہنا چاہیے اس حدیث سے اس مسئلہ پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہاں ایک خیال تو یہ ہے کہ کسب کا دولت سے کوئی تعلق ہی نہیں لہذا جو کماتا ہے اس کا اپنی کمائی ہوئی دولت میں کوئی حق نہیں ہوتا۔ دوسرا خیال اس کے بالمقابل ہے وہ یہ کہ کسب کا دولت سے اتنا گہرا ربط ہے کہ انسان کی کمائی ہی دولت سرتاسر کمانے والے ہی کی ملکیت ہوتی ہے ایسی ملکیت کہ اس میں کسی غیر کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اسلام کی رائے یہاں کتنی معتدل ہے وہ کہتا ہے کہ کسب سے ملکیت تو ضرور ثابت ہو جاتی ہے آخر کمائی ہوئی دولت اسی کی محنت کا ثمرہ ہے مگر غریبوں کے حقوق واجب اور غیر واجب منضبط اور منتشر اس میں اتنے ہیں کہ پھر یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سارا کا سارا کمایا ہوا مال خالص اسی کی ملکیت تھا اس لیے اسلام نہ تو امپریلیزم کا حامی ہو سکتا ہے نہ کمیونزم کا وہ اپنا ایک مستقل مقام رکھتا ہے اس میں یہ لچک نہیں ہے کہ کبھی اس کو اس طرف کھینچ لیا جائے کبھی اس طرف۔  
اس حدیث سے ایک اور بلند نظریہ کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی مدد کرے تو اس کو یہ سمجھنا زیبائیں ہے کہ خود وہ اس کی مدد کر رہا ہے بلکہ یہ تصور کرنا مناسب ہے کہ جو رزق اس کے پاس اس کے مقدر کا جمع تھا وہ اس نے اُس کے حوالہ کر دیا ہے گویا حق بحق دار رسید کا مصداق ہے۔

(۹۶۶) \* پہلی جلدوں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اسلام کا اعلیٰ مرتبہ احسان کا ہے یہاں اسی کو پھر تازہ کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہم سے دور نہیں وہ ہم سے اتنی قریب ہے کہ اگر ہم توجہ کریں تو اس کو اپنے سامنے ہی پائیں گے جو بُعد اور دوری ہے وہ ہماری ہی طرف سے ہے بس حجاب غفلت اٹھا دو پھر قرب در قرب دیکھو گے۔ جب یہ قرب میسر آ جائے تو کب مناسب ہوگا کہ ایسے داتا کو چھوڑ کر ہاتھ کسی اور کے سامنے پھیلاؤ اور ایسے تو انا کو چھوڑ کر مدد کسی اور سے مانگو مگر انسان فطرۃً اتنا کچا ہے کہ سوال کی ذلت اٹھائے بغیر اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا وہ ایک محتاج مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلائے بغیر باز نہیں آتا اور ذرا سی مشکل میں جب کبھی مدد کی ضرورت لگے.....

اِذَا اسْتَعْنَتْ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَ اعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوْ  
اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَّمْ يَنْفَعُوْكَ  
اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ و لَوْ اجْتَمَعُوْا عَلٰى  
اَنْ يَضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَّمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ  
قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَ جُفَّتِ  
الصُّحُفُ. (رواہ احمد و الترمذی)

(۹۶۷) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ  
كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ قَالُوا  
يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَلَا نَتَّكِلُ عَلَى كِتَابِنَا وَ نَدْعُ  
الْعَمَلَ قَالَ اَعْمَلُوا فِكُلُّ مُسَرٍّ لِمَا خُلِقَ لَهُ أَمَّا  
مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُسَّرُ لِعَمَلِ  
السَّعَادَةِ وَ أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ  
فَسَيُسَّرُ لِعَمَلِ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَأَ فَأَمَّا مَنْ  
أَعْطِيَ وَ اتَّقَى وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنَى الْإِلَهِ مُتَّفَقٌ  
عَلَيْهِ وَ فِي مُسْنَدِ عُمَرَ عِنْدَ أَحْمَدَ زَادَ مُسَدِّدٌ  
دَقَلْتُ فَفِيمَ الْعَمَلِ قَالَ لَا يَنَالُ إِلَّا بِالْعَمَلِ قُلْتُ  
إِذَا نَجْتَهَدُ وَ فِي حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ عِنْدَ

اسی سے طلب کرنا اور اس کا یقین رکھنا کہ اگر سارے لوگ مل کر بھی تم کو کچھ نفع  
پہنچانا چاہیں تو بس اتنا ہی پہنچا سکتے ہیں جتنا کہ وہ تمہاری تقدیر میں پہلے سے لکھ  
چکا ہے اور اگر سب مل کر نقصان پہنچانا چاہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر  
بس اتنا ہی جتنا کہ وہ تمہاری تقدیر میں پہلے لکھ چکا ہے۔ تقدیر کا قلم سب کچھ لکھ  
لکھا کر کاغذ سے اٹھالیا گیا ہے اور تقدیر کے کاغذات کی سیاہی خشک ہو چکی  
ہے۔ (اب کوئی جدید نوشتہ و خواندہ کا موقعہ ہی باقی نہیں) (ترمذی - مسند امام احمد)  
(۹۶۷) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا تم میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کا ٹھکانا دوزخ میں یا جنت  
میں لکھا نہ جا چکا ہو۔ صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ تو کیا پھر اس نوشتہ  
خداوندی پر بھروسہ کر کے عملی جدوجہد کو ترک نہ کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ  
وسلم نے فرمایا عمل کیے جاؤ کیونکہ جو شخص جن اعمال کے لیے پیدا کیا گیا ہے  
اس سے اسی قسم کے اعمال سرزد ہوں گے تو جو نیک ہوگا اسے توفیق ہی نیک  
کام کی ملے گی اور جو بد بخت ہوگا اس سے کام بھی بد بختی کے لیے جائیں  
گے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ثبوت میں قرآن کریم  
کی یہ آیت تلاوت فرمائی فَأَمَّا مَنْ أَعْطِيَ النِّخْرَ مُسْنَدُ أَحْمَدَ فِي حَدِيثِ عُمَرَ  
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ كِي رَوَايَتٍ فِيهِ اس طَرَحَ هِيَ كِه عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ  
فَرَمَاتِهِ هِيَ - فِيهِ نِي آخِرَتِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِي پُورِ چھایا رسول اللہ جب  
سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے تو پھر عمل کس لیے ہوا؟ اس پر آپؐ نے ارشاد

للہ ..... محسوس کرتا ہے تو اسی کی طرف اس کی نظریں اٹھتی ہیں اس لیے فرمایا کہ اس فطری خامی کا علاج قضاء و قدر کا استحضار ہے بس جب  
یہ عقیدہ جما لو گے کہ نفع و نقصان پہنچانا جہاں بھر میں کسی کے بس کی بات نہیں اور یہ کہ یہ سارے معاملات سب طے شدہ ہیں تو تمہارے دل  
میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے گی کہ جب کبھی تم کو کوئی ضرورت ہوگی تو تمہارے ہاتھ صرف اسی کی طرف انھیں گے جو سارے جہاں کو دیتا ہے  
اور جب کبھی مدد کی ضرورت ہوگی تو صرف اسی سے مدد مانگو گے جو ہر محتاج کا فریاد رس ہے۔ پس قضاء و قدر کا عقیدہ اسباب کے ارتکاب  
سے بے نیازی کی تعلیم نہیں دیتا ہاں مخلوق سے بے نیازی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی عملی جدوجہد اب اور بھی بڑھ جانی چاہیے جو  
انسانوں کا بھروسہ رکھتا ہے وہ بسا اوقات اسباب میں بھی تساہل کر جاتا ہے۔

(۹۶۷) \* حیرت ہے کہ جس حدیث کو آج سننے والے سن کر ترک عمل کا عہد کرتے ہیں اسی کو کل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ  
راست سننے والے صحابہؓ نے جدوجہد کا عہد کر رہے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ حکم کے تابع دار تھے اور ہم عقل کے بندے ہیں۔ عقل للہ .....



البنار فقال القوم بعضهم لبعض فالحج اذا و  
عند الطبرانی فی اخر حدیث سراقۃ قال  
الان الجد الان الجد و عند الفریابی بسند  
صحیح الی بشیر بن کعب احد کبار  
التابعین قال سأل غلامان رسول الله صلی  
الله علیه وسلم فیما العمل فیما جفت به  
الاقلام و جرت به المقادیر ام شیء  
نستأنفه قال بل فیما جفت به الاقلام قال  
ففیم العمل قال اعملوا و کل میسر لما هو  
عامل قال فالحج الان

(کذا فی فتح الباری ملخصاً ج ۷ ص ۴۰۱)

(۹۶۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى  
عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللَّهِ  
مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ وَفِي كُلِّ خَيْرٍ احْرَصُ

فرمایا کہ عمل کیے بغیر تو جنت نہیں مل سکتی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر تو  
ہم عمل میں جان توڑ کوشش کریں گے۔ مسند بزار میں حضرت ابن عباسؓ کی  
روایت کے آخر میں ہے کہ مذکورہ بالا سوال و جواب کے بعد صحابہؓ نے فرمایا  
اب تو کوشش کرنے کے سوا چارہ کار نہیں اور طبرانی میں حضرت سراقہ کی  
حدیث کے آخر میں ہے اب تو کوشش کرنی ہے کوشش کرنی ہے۔ فریابی نے  
صحیح سند کے ساتھ دونو جوانوں کا واقعہ ذکر کیا ہے وہ آپ کی خدمت میں  
حاضر ہوئے اور وہی مذکورہ بالا سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
تمہاری جتنی جدوجہد ہے یہ سب تقدیر کا قلم لکھ کر فارغ ہو چکا ہے۔ اس پر  
انہوں نے عرض کی پھر عمل کا فائدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر عمل  
کرنے والا عمل ہی وہ کر سکے گا جو اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے یہ سن کر انہوں  
نے کہا تو پھر تو کوشش کیے بغیر چارہ کار نہیں۔

(۹۶۸) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے فرمایا۔ مضبوط مؤمن کمزور سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پیارا ہوتا ہے اور یوں  
میں دونوں ہی بہتر (یاد رکھو) جو چیز تم کو نفع رساں ہو اس کے لیے حریص  
بنے رہنا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے مدد مانگا کرنا اور در ماندہ

للہ ..... نارسا بچاری دنیا کی معمولی الجھنوں کو سلجھا نہیں سکتی وہ تقدیر کے مسئلہ کو کہاں سمجھتی ہاں جب وہ بھی اسلام قبول کر لیتی ہے تو پھر  
مسائل شرعیہ میں اس کے نزدیک بھی کوئی الجھن الجھن نہیں رہتی پھر اس میں وہ بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ جتنا اختیار اس کو مل چکا ہے اس کو  
وہ کام میں لے آنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور تقدیر میں ہے کیا اس سے کوئی بحث نہیں کرنی وہ اس کے علم سے بالاتر ہے۔ کس کو یہ خبر ہے کہ فلاں  
معاملہ میں ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے جب یہ خبر نہیں تو پھر محسوس اختیار سے کام کیوں نہ لیا جائے۔

(۹۶۸) \* حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اس کے اسماء و صفات کا مظہر بنا رہے۔ مثلاً اس کا اسم مبارک  
”القوی“ ہے تو وہ یہ پسند کرتا ہے کہ مؤمن بھی قوی ہو۔ وہ جمیل ہے اس لیے وہ جمال کو بھی پسند فرماتا ہے وہ علیم ہے اس لیے علماء کو پسند  
فرماتا ہے اسی طرح اس کا اسم حسن اور صابر بھی ہے اس لیے وہ محسنین اور صابریں کو بھی پسند فرماتا ہے۔ جو مسئلہ یہاں ہمارے موضوع بحث سے  
متعلق ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث میں حریص بننے کا حکم دیا گیا ہے۔ حرص کے معنی یہ ہیں کہ جدوجہد کی جو طاقت بندہ میں ودیعت فرمائی گئی ہے  
اس کو اپنی معاش و معاد میں ختم کر ڈالنا لیکن یہ حرص کمال اسی وقت شمار ہوگی جب کہ ہواں ہی چیزوں میں جو اس کے لیے نفع رساں ہوں پس  
مؤمن قوی وہی ہے جس میں حرص کا مادہ موجود ہو اور ہر نیکی میں وہ مسابقت کے لیے تیار رہے۔ وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ۔  
معاصی اور گناہوں پر حرص کرنا اتنا ہی بڑا عیب بھی ہے۔ چونکہ یہ حرص بھی انسان کے اپنے بس کی بات نہیں ہے اس لیے یہ حکم للہ.....

عَلَى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِزْ بِاللَّهِ وَلَا  
تَعْجِزْ وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّي  
فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا وَلَكِنْ قُلْ قَدَرُ اللَّهِ  
وَمَا شَاءَ فَعَلَ فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ.

(رواہ مسلم)

(۹۶۹) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ

بن کر سعی کرنے سے بیٹھ مت رہنا اور اگر کبھی کوئی نقصان ہو جائے تو یہ مت  
کہنا۔ اگر میں ایسا کرتا تو ایسا ہو جاتا بلکہ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے یونہی مقدر  
فرمادیا تھا لہذا جیسا اس نے چاہا تھا اسی کے موافق ہو گیا۔ کیونکہ اس ”اگر“  
کے کلمہ سے آئندہ ایک شیطانی عقیدہ کا دروازہ کھلتا ہے (یعنی تدبیر کی  
حاکمیت) (مسلم شریف)

(۹۶۹) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

ﷺ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس بارے میں بھی مدد طلب کرنی چاہیے۔ حدیث کہتی ہے جو شخص مفید اور نافع اعمال میں حریص نہیں  
وہ عاجز انسان ہے کمال عاجز بن جانے میں نہیں ہے بلکہ کامیابی کے لیے جان توڑ کوشش کرنے میں ہے اور یہ سمجھ کر کرنے میں ہے کہ جو  
ہمارے مقدر میں لکھا جا چکا ہے ہماری یہ کوشش سب اسی کے لیے ہے پس تدبیر کرنا تو ضروری ہو اگر اس کو حاکم بنا کر نہیں بلکہ تقدیر کا محکوم سمجھ  
کر۔ اب اگر تدبیر کا رگڑ نہ ہوئی اور اسباب کر لینے کے بعد بھی مقصد برآوری نہ ہو سکی تو یہ کہنے لگنا اگر ہم یوں کرتے تو کامیاب ہو جاتے یہ بھی  
درحقیقت تقدیر کو تدبیر کا محکوم بنانے کے مرادف ہے۔ اس لیے یہ عبد مؤمن کی شان نہیں یہ شیطان کی حرکت ہے کیونکہ اب ”اگر“ کہنے  
سے سوائے ندامت، پشیمانی اور افسوس کے ہوتا ہی کیا ہے جو مقدر تھا وہ تو واقع ہو ہی چکا لہذا اب اس دروازہ کو کھولنے سے نفع؟ ہاں جدوجہد  
کے بعد بھی جب مقصد حاصل نہ ہو تو اب اس کو قضاء الہی کے حوالہ کر دینا یہ مؤمن کی شان ہے اور یہ اس کے لیے باعث تشفی و تسکین بھی ہے۔  
پس ظہور نتائج سے قبل تدبیر سے غفلت کا نام تو عجز ہے اعتماد علی التقدير نہیں اور نتائج کے خلاف ہونے کی صورت میں اپنی ضعف تدبیر کو یاد کرنا  
عمل شیطانی ہے اور اس کو تقدیر الہی کے سپرد کر دینا یہ شان مؤمن ہے۔ خلاصہ یہ کہ قضاء و قدر اپنی جگہ ہیں اور کسب و اختیار اپنی جگہ اور شان  
مؤمن اسی میں ہے کہ کامیابی ہو یا نا کامیابی دونوں حالتوں میں وہ اپنی بندگی اور عبودیت کو قائم رکھے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے  
معاملات کے لیے پوری جدوجہد کرے پھر اگر نتیجہ موافق برآمد ہو تو اس پر اترائے نہیں اور اگر خلاف ہو جائے تو بے صبری بھی نہ دکھائے۔  
اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

﴿لَكَيْلًا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا  
بِمَا آتَاكُمْ﴾ (الحديد: ۲۳)

تاکہ اس پر تم غم نہ کھایا کرو جو تم کو حاصل نہ ہو۔ کا اور نہ اس پر شینگی  
مارا کرو جو تم کو عطا فرمایا۔

یعنی تقدیر میں ہر چیز کی نوشت موجود ہے اس پر تم کو اس لیے اطلاع بخشی ہے کہ تم خوب سمجھ لو کہ جو تمہارے لیے مقدر ہو چکا ہے وہ  
ضرور پہنچ کر رہے گا اور جو مقدر نہیں ہوا وہ کبھی ہاتھ نہیں آ سکتا جو کچھ اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں ٹھہر چکا ہے بس ویسا ہی ہو کر رہے گا لہذا جب  
فائدہ کی چیز ہاتھ نہ لگے اس پر غمگین و مضطرب نہ ہو اور جو مقدر سے ہاتھ لگ جائے اس پر اکڑو اور اترائے نہیں بلکہ مصیبت و ناکامی میں صبر و  
تسلیم اور راحت و کامیابی میں ثناء و شکر سے کام لو۔

(۹۶۹) \* اس حدیث میں عالم غیب کے چند مہم اسباق کی تعلیم دی گئی ہے۔ پہلا یہ ہے کہ انسان کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ مرنے کے بعد دفعۃً  
جنت یا دوزخ میں پہنچ جاتا ہے بلکہ اپنے عملی مساعی کے لحاظ سے کبھی وہ اس طرف قریب ہو جاتا ہے کبھی اس طرف۔ پس زندگی کیا ہے وہ  
دوزخ و جنت کی مسافت کا نام ہے جتنا وہ ختم ہوتی ہے اتنا ہی وہ ایک طرف کا راستہ طے کر لیتا ہے ہر چند کہ اصل دار و مدار تو خاتمہ اللہ ﷻ.....



صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرَّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ وَلَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرَّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَأَنَّ الرُّوحَ الْأَمِينِ وَفِي رَوَايَةٍ أَنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوعِي إِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمَلَ رِزْقَهَا إِلَّا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاجْمَلُوا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ أَنْ تَطْلُبُوهُ بِمَعَاصِي اللَّهِ فَإِنَّهُ لَا يَذَرُكُمْ مَا عِنْدَ اللَّهِ إِلَّا بِطَاعَتِهِ.

(رواہ فی شرح السنۃ و البیہقی فی شعب الایمان)

عالیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو! اب ایسی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہی جو تم کو جنت سے قریب کر دے اور دوزخ سے دور کر دے مگر ان سب کا میں تم کو حکم دے چکا ہوں اور اسی طرح نہ ایسی کوئی چیز رہ گئی ہے جو دوزخ سے تم کو قریب کر دے اور جنت سے دور مگر میں تم کو اس سے بھی روک چکا ہوں اور حضرت جبریل علیہ السلام نے ابھی میرے قلب میں یہ بات ڈالی ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنا مقدر رزق پورا نہیں کر لیتا وہ ہرگز مر نہیں سکتا۔ دیکھو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور رزق حاصل کرنے میں صاف ستھرے طریقے اختیار کرو ایسا نہ ہو کہ رزق کی ذرا سی تاخیر تم کو خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کر دے کیونکہ تمہارا رزق خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور جو چیز اس کے قبضہ میں ہو وہ صرف اس کی فرمان برداری ہی کر کے حاصل کی جاسکتی ہے۔

(شرح السنۃ - شعب الایمان)



للہ ..... بی پر رکھا گیا ہے، لیکن ایک مؤمن قانت کو اپنے اوقات و اعمال کا محاسبہ ہمہ وقت لازم ہے کہ وہ اپنی عمر میں کتنا کس طرف قریب ہو رہا ہے جتنا وہ جس طرف بھی قریب ہو گیا بظاہر امید یہ ہی ہوتی ہے کہ بقیہ عمر میں بھی وہ اسی سمت کی بقیہ مسافت طے کرے گا لہذا زندگی کا ہر قدم بہت پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہے کسی جگہ سے قریب ہو کر پھر دفعۃً دور ہو جانا بڑا مشکل کام ہے۔ اس لیے عموماً جس حالت میں بھی عمر گزرتی ہے اسی پر خاتمہ بھی ہو جاتا ہے گو کبھی کبھی اس کے خلاف بھی پیش آ جاتا ہے۔

دوسری بات اہم یہ ہے کہ انسان عبث ایسی چیز کے پیچھے لگا رہتا ہے جو خود اسی کے پیچھے لگی ہوئی ہے یعنی رزق۔ انسانی مقدرات میں جہاں اور باتیں لکھی جاتی ہیں اس کے مقدر کا رزق بھی لکھا جاتا ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کو پورا کیے بغیر وہ سفر آخرت کر سکے۔ تیسری بات اہم تر یہ ہے کہ انسان رزق کی ہوس میں یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ حلال ذریعہ سے رزق تھوڑا حاصل ہوتا ہے اور حرام ذرائع سے زیادہ اس لیے حرام ذرائع اختیار کر لیتا ہے حدیث اس کو سمجھاتی ہے کہ تمام مخلوق کا رزق رزاق کے پاس ہے۔ جب یہ ہے تو پھر جس کے ہاتھ میں رزق ہو تم اس کی مخالفت کو کیسے رزق کا ذریعہ سمجھ لیتے ہو۔ چہارم یہاں کسبِ حلال پر اتنا ہی زور دیا گیا ہے جتنا کہ تقویٰ کی تحصیل پر۔ حلال کے بارے میں جدوجہد کرنا اور حرام سے بچنے کے لیے تقدیر کو یاد رکھنا اسلامی معیشت کے لیے سہل ترین نسخہ ہے۔

## الانبياء والرسل عليهم الصلوٰۃ والسلام

### فی ضوء الاحادیث و التاریخ

حضرات انبیاء علیہم السلام کی مقدس ہستیوں کا مختصر تذکرہ احادیث اور تاریخ کی روشنی میں

اس مقدس گروہ کے تذکرہ سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ کے سامنے نبوت اور رسالت کے متعلق قدیم عقائد کے خیالات کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس مسئلہ میں جو قیاس آرائیاں آج کی جا رہی ہیں یہ زمانہ قدیم کے وہی فرسودہ خیالات ہیں کوئی جدید تحقیق نہیں ہے۔

متاخرین علماء میں سے حافظ ابن تیمیہ نے اس مسئلہ پر مبسوط بحثیں کی ہیں ان کی دیگر تصانیف کے سواء ”شرح عقیدۃ الاصفہانیہ“ اور ”الجواب الصحیح“ میں بھی اس پر کافی بحث ہے اور ”کتاب النبوات“ تو اس موضوع پر ان کی ایک مستقل تصنیف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قدیم عقائد میں سے ارسطو اور اس کے تابعین تو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے کچھ آشنائی نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کے یہاں تو نبوت اور رسالت کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ملتا البتہ فارابی نے اس پر کچھ بحث کی ہے۔ پھر ابن سیناء نے آکر اس کی مزید تشریح و تفصیل کی ہے اس کے نزدیک نبی کے متین خاصے ہوتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا مقام ابن سیناء کی نظر میں \* (۱) نبی وہ ہوتا ہے جس کی قوت عقلیہ اتنی کامل ہو کہ کسی سے سیکھے بغیر اس کو خود بخود علم حاصل ہو جائے اس کا نام اس نے قوت قدسیہ رکھا ہے۔

(۲) نبی اپنے علم کے مطابق خود اپنے نفس میں کچھ نورانی صورتیں دیکھتا ہے اور مختلف نوع کی آوازیں بھی سنتا ہے مگر خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ عام انسان خواب کی حالت میں مختلف صورتیں مشاہدہ کرتے اور مختلف آوازیں سنتے ہیں مگر یہاں بھی خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ گو نبی کو محسوس یہی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ خارجی عالم میں ہو رہا ہے جیسا کہ خواب دیکھنے والا شخص بھی اپنے مریات اور مسموعات کے متعلق عقیدہ یہی رکھتا ہے کہ یہ سب کچھ وہ خارجی عالم میں دیکھ رہا ہے۔ ابن سیناء کے نزدیک اسی مسموع صوت کا نام ”کلام اللہ“ ہے۔ والعیاذ باللہ۔ خلاصہ یہ کہ ابن سیناء کے نزدیک نبی کے مبصرات و محسوسات کی حقیقت وہ ٹھہری جو عالم رویاء کے مبصرات و محسوسات کی ہوتی ہے نہ وہ بالکل بے حقیقت ہے نہ یہ بے حقیقت ہیں۔ مگر خارجی عالم میں دونوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ (والعیاذ باللہ)

(۳) نبی کو عالم کے مادہ میں تصرف کرنے کی فطری طاقت حاصل ہوتی ہے اور اس فطری طاقت سے ہی وہ عجیب عجیب افعال کی قدرت رکھتا ہے اسی کا نام ”معجزہ“ ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک اس مادی عالم میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ سب انسانی قوت نفسیہ یا قوت طبعیہ یا عقل فعال کا فیض ہے۔ شیاطین اور فرشتوں کی یہ جماعت قائل ہی نہ تھی کہ عالم کے تصرفات کو ان کی طرف منسوب کر سکتی۔ ہنود اور ترک شیاطین و جنات کے قائل تھے ان کے نزدیک یہ تصرفات جنات کے تصرفات تھے۔

فلاسفہ کے نزدیک نبوت کیوں کسی چیز تھی؟ \* جب ان کے نزدیک نبوت ’کلام اللہ‘ معجزہ اور فرشتے کی حقیقت یہ ٹھہری



تو ظاہر ہے کہ یہ تمام امور کسب انسانی اور ریاضت سے بھی حاصل ہونا ممکن ہیں، اس لیے ان کے نزدیک نبوت و رسالت بھی دیگر صنعتوں کی طرح کسی چیز تھی۔ سہروردی مقتول اور ابن سبعین اسی جدوجہد میں مصروف تھے کہ ان کو نبوت کا مقام حاصل ہو جائے۔ اسی لیے ان فلاسفہ کے نزدیک ایک فلسفی کو نبی پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ فلسفی کی نظر بہ نسبت نبی کے پھر پر از حقیقت ہوتی ہے۔ (والعیاذ باللہ)

اسلامی الفاظ و اصطلاحات کا صرف استعمال کرنا کافی نہیں جب تک کہ ان کی اس حقیقت کا اعتراف بھی نہ ہو جو اسلام نے بیان کی ہے \* نبوت کے متعلق فلاسفہ کی اصل تحقیق تو یہ تھی لیکن جب اسلامی دور میں فلاسفہ کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات پہنچیں تو انہوں نے ان کے اور فلاسفہ قدیم کے علوم کے مابین پیوند لگانا چاہا اور اسلامی اصطلاحات یعنی وحی، نبوت، فرشتہ، قیامت، جنت اور دوزخ وغیرہ کو اپنے تراشیدہ معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اب جس کو اس حقیقت کا متنبہ نہ ہوا وہ تو اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا کہ شاید یہ جماعت بھی ان سب امور کی قائل تھی۔ جن کے انبیاء علیہم السلام قائل تھے۔ مثلاً جب انہوں نے ابن سینا کے کلام میں نبوت، معجزہ وغیرہ کے الفاظ دیکھے تو یہ خیال قائم کر لیا کہ شاید ابن سینا بھی ان سب امور کا قائل تھا لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ ان الفاظ کی حقیقت اس کے نزدیک وہ نہیں جو انبیاء علیہم السلام کے نزدیک تھی تو پھر محض ان الفاظ کے استعمال کر لینے سے اس کو اسلامی تعلیمات کا حامل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ جب تک کہ یہ بھی ثابت نہ کر دیا جائے کہ ان الفاظ کی حقیقتیں بھی اس کے نزدیک وہی تھیں جو ادیانِ سماویہ کے نزدیک مسلم تھیں۔

۱۔ مثلاً ختم نبوت اور نزول مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ ہمیشہ سے امت مسلمہ میں تو اتر کے ساتھ مستعمل ہوتے چلے آئے ہیں لیکن ہمیشہ ان کا یہی ایک مفہوم سمجھا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بنفس نفیس خود آسمان سے اپنے اسی جسم عنصری کے ساتھ تشریف لانے والے ہیں اور کبھی اس کا یہ مفہوم نہیں سمجھا گیا کہ ان کا کوئی معنوی نظیر یا مشابہ شخص اسی امت میں سے پیدا ہوگا۔ اسی طرح ختم نبوت کا مفہوم بھی صرف یہی سمجھا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی جدید نبوت کا کوئی امکان نہیں ہے، خواہ وہ کسی قسم اور کسی مرتبہ ہی کی کیوں نہ ہو، ظنی ہو یا بروزی اور صفحات تاریخ نے بھی ہمیشہ اسی کی تائید کی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر آج تک جب کبھی کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو آپؐ نے اور آپؐ کے بعد ہمیشہ امت مسلمہ نے اس کو کاذب اور دجالین کی فہرست میں شمار کیا ہے جیسا کہ مسیلمہ کذاب اور اسود غسانی کی تاریخ سے ظاہر ہے۔ اور اگر زمانہ کے دستور کے مطابق کبھی کسی قلیل جماعت نے اس کی تصدیق کی بھی ہے تو ہمیشہ تاریخ نے اس کو مسلمانوں کی عام جماعت سے علیحدہ شمار کیا ہے اور اس جماعت کا ہمیشہ ایک جداگانہ لقب کے ساتھ علیحدہ تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے اگر کوئی جماعت صرف نزول مسیح علیہ السلام اور ختم نبوت کا لفظ تو استعمال کرتی ہے مگر ان معنوں سے نہیں جن میں کہ عام مسلمان ان کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں تو محض ان الفاظ کے استعمال کرنے والے فلاسفہ کو صرف ان الفاظ کے استعمال کرنے سے مسلمانوں کے عقائد سے متفق نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ ان الفاظ کے استعمال ان ہی معنوں میں کرتے ہیں جن میں کہ عام مسلمان ان کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ کیا نصاریٰ اور ہنود بھی تو حید کا اقرار نہیں کرتے، مگر کیا صرف لفظ تو حید کے استعمال کر لینے سے ان کو اسلامی تو حید کا معتقد کہا جاسکتا ہے اس لیے اس نکتہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان و اسلام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان حقائق کو اپنے ان ہی معنوں میں مانا جائے جن میں کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں میں مسلم رہے ہیں، صرف اسی الفاظ کی نقالی بے سود ہے۔

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ ہمارے دور کے عقلاء نبوت کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہتے ہیں؟ یہاں ابن سیناء اور اس کے ہمنواؤں کی کل کائنات تو یہ تھی اب آپ ذرا علوم نبوت سے روشن دماغوں کی بات بھی سنئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی نظر میں نبوت کی حقیقت اور اس کے ارکان ثلاثہ یعنی ملوکیت و سیاست و علم و حکمت اور رشد و ہدایت کی فطری اور غیر معمولی استعداد \* حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اگر تم نبی اور اس کے خواص جاننا چاہتے ہو تو یوں سمجھو کہ حیات انسانی کے نظم و نسق کے لیے جن جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بیک وقت نبی کی ذات میں تمام انسانوں سے بڑھ کر پیدا فرمائی جاتی ہیں وہ ایک بادشاہ کی طرح ہوتا ہے جس کے نفس ناطقہ کی قوت عاقلہ اور قوت عاملہ کے سایہ کے نیچے اہل قلم بھی بڑے بڑے جرنیل اور سیاست داں بھی کاشت کار اور تاجر بھی غرض تمام عالم اپنی اپنی زندگی کے مطابق تربیت حاصل کرتا ہے اور ہر شعبہ کا نظام اس کے اقوال و افعال کے دم سے قائم رہتا ہے۔ وہ اسی کے ساتھ ایک حکیم بھی ہوتا ہے جو علم اخلاق و تدبیر منزل اور سیاست مدن کا ماہر ہو وہ حکیم نہیں جو صرف ان علوم کے الفاظ سے آشنا ہو بلکہ وہ حکیم جس کی یہ تمام صفات طبیعت ثانیہ بن چکی ہوں حتیٰ کہ اس کے حرکات و سکنات سے یہ علوم ٹپکتے نظر آ رہے ہوں۔ وہ ایک مرشد کامل بھی ہوتا ہے جو جماعت صوفیاء میں مصدر کرامات و خوارق بنا ہوا ہو اور طاعات و عبادات کے ان تمام طریقوں سے آگاہ ہو جو تہذیب نفس کے لیے ضروری ہیں اور ان علوم حقہ کا ماہر ہو جن سے کہ انسانوں پر عالم ملک و ملکوت کے اسرار پنہاں روشن ہوتے ہیں اور اسی طرح اعمال جوارح اور اذکار لسانی کے علیحدہ علیحدہ تمام خواص سے بھی پورا پورا آشنا ہو۔ وہ جس طرح کہ آسمانوں پر حضرت جبریل علیہ السلام تدبیر الہی کا جارحہ اور علوم الہی اخذ کرنے میں واسطہ ہیں اسی طرح انسانوں میں ان تمام صفات جبرئلیہ کا مالک بھی ہوتی کہ ﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (یعنی فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اس بات میں جس کا وہ ان کو حکم دیتا ہے اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے) اس کی شان بن چکی ہو اور اس طرح اس کی فطرت کو عالم بالا سے وہ مناسبت حاصل ہو کہ علوم الہیہ اور یقین و اطمینان کی نعمت اس کے قلب و قالب پر بہہ رہی ہو اور اس کے یہ سب کمالات اس میں فطری ہوں کسی معلم اور درس گاہ کے رہن منت نہ ہوں۔ نبی کے ان علوم اس کی حکمت اس کے تزکیہ اور اس کے اس نظامی لیاقت کی طرف جس سے کہ وہ ان صفات کے اثرات خدا تعالیٰ کی مخلوق میں پھیلاتا ہے ذیل کی آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾ (جمعہ: ۲)

یہ خدا ہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول پیدا فرمایا جو خود انہی میں کا ہے پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے کتاب اور عقلمندی کی باتیں اور

اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اب آپ آیت بالا کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کا ایک ورق ملاحظہ فرمائیے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ اہم خدمت امیوں میں کس حکمت سے شروع کی گئی اور کس تدبیر و تدبر سے پایہ تکمیل کو پہنچی جس دور میں آپ تشریف لائے اس وقت ضلالت و ظلمت کی حالت کیا تھی؟ عبادت میں شرک کرنا ان کا دین بن چکا تھا قیامت کا وہ انکار کرتے تھے اور ملت



حقیقہ کی صورت انہوں نے بالکل مسخ کر ڈالی تھی پھر آپؐ نے تشریف لا کر کیا کیا؟ عبادات میں سے شرک کی رسم منادی، قیامت کا وجود ثابت کیا اور ملت حقیقہ کو تحریفات سے پاک کر کے پھر سر نو اس کو اصل بنیادوں پر راست فرما دیا۔ اس پر جب عرب کے عوام و خواص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تو آخر کار جہاد کی طاقت سے اس کو دبا دیا چھوٹی چھوٹی بے سرو سامان جماعت کو لے کر جہاد لشکروں کا مقابلہ کیا، مگر تائید ربانی سے فتح و کامرانی آپ کے حصہ میں آئی اور شکست و ہزیمت کفار کا حصہ رہا۔ اور ان میں ایسے علوم کے دریا بہا دیئے جن سے کہ وہ اس سے قبل قطعاً آشنا نہ تھے یعنی علم قرآن، علم ایمان یعنی ارکان پنجگانہ اسلام وغیرہ۔ علم معاد یعنی احوال برزخ و حشر و نشر و جنت و دوزخ علم احسان جس کو آج کی اصطلاح میں حقیقت اور معرفت کہا جاتا ہے۔ علم شریع و تدبیر منزل و سیاست مدن و طریق معاش، علم اخلاق، علم آداب، علم فتن یعنی آئندہ واقعات و حوادث کے متعلق خبریں، علم فضائل اعمال، علم مناقب پھر ان علوم کو اس خوبی سے مشرح بیان کیا کہ تھوڑی سی مدت میں قوم کی قوم کا وہ طبعی مذاق بن گئے اور خورد و کلاں، ذکی و غبی میں کوئی ایسا نہ رہا جس کے دل و دماغ میں وہ نقش کا لجر نہ بن گئے حتیٰ کہ جو آپ کی بعثت سے قبل صحراء نشین بدو تھے وہ اب مقررین بارگاہ صمدیت اور دنیا کے حکمران نظر آنے لگے۔ نبوت جیسی نعمت کی حقیقت اور اس کی برکات کا اسی سے کچھ اندازہ کر لینا چاہیے۔ (قرۃ العینین - ص ۲۱ و ۲۲)

میں کہتا ہوں کہ اسلامی دور کے اس آخری فلسفی نے جو کچھ اپنی علمی زبان اور اصطلاحی الفاظ میں یہاں بیان فرمایا ہے اگر اس کا لب لباب فنی اصلاحات کی قید و بند سے آزاد ہو کر انتہائی سادگی اور مؤثر الفاظ میں آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ تقریر پڑھ لیجئے جو حضرت جعفر طیار (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے شاہ حبشہ کے سامنے فرمائی تھی انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ نبوت کے ان تمام خواص کی طرف اشارہ فرما دیا ہے، جس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے مذکورہ بالا بیان میں فرمائی ہے۔

تعلیمات نبوت کے متعلق ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ \* حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعلیمات کے متعلق کچھ فہموں کو ہمیشہ سے یہ مغالطہ رہا ہے کہ ان کا تعلق صرف ایک ایسی غیر محسوس حیات کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے جس کے وجود میں بھی مادی عقول بہت سے شکوک و شبہات رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک گویا مذہبی تعلیمات کا تعلق اگر ہے تو صرف قبر، حشر و نشر اور مابعد الموت زندگی کے مسائل کی حد تک ہے دنیوی نظم و نسق کے ساتھ اس کا کوئی محکم رشتہ ثابت نہیں۔ ادھر عالم غیب اور اس کے علوم سے چونکہ مادی عقول بالکل خالی ہوتی ہے اس لیے وہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعلیمات کے لیے کوئی بلند مقام تجویز کرنے سے قاصر رہتی ہیں لیکن دوسری طرف مذہب کا رشتہ اس پر ان کو مجبور کرتا ہے کہ ان کی برتری کو چار و ناچار تسلیم کیا جائے اس کشمکش کی وجہ سے ان کو ایسی تو جیہات کرنی پڑتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی صداقت و امانت اور فہم و دانائی بھی اپنی جگہ مسلم رہے اور پھر مادی عقول کو ان کی کوئی خاص فوقیت بھی تسلیم کرنی نہ پڑے۔

اس لیے اسلامی دور کے فلاسفہ نے تو ان کی قوت عقلیہ اور قوت عملیہ کی برتری کا اعتراف کر کے یہ سمجھ لیا کہ بس اتنی بات سے انہوں نے مقام نبوت کا حق ادا کر دیا مگر اسی کے ساتھ ان کے علوم کی حیثیت ایک خوابیدہ شخص کے منامات کی برابر قرار دے کر ان کو ایسا بے وقعت بنایا کہ حقیقت کی دنیا میں وہ از اول تا آخر لایعنی بن کر رہ گئیں۔ والعیاذ باللہ۔

تعجب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی قوت عقلیہ اور عملیہ کی عام برتری تسلیم کر لینے کے بعد ان کے مدرکات کی حقیقت اتنی بے حقیقت بنا دینا کون سی عقل اور کیا فلسفہ کی بات ہے۔ اگر آج یہی حیثیت ڈارون، ہٹلر اور لینن کے علوم کی قرار دے دی جائے تو شاید اس شخص کو محبوظ الحواس سمجھا جائے حالانکہ اگر ان کے فلسفوں پر غور کیا جائے تو وہ بھی ابتداء میں نامعقول بات ہی سمجھے جاتے تھے۔ ہٹلر کی ساحرانہ کرشمہ سازیاں، لینن کی اشتراکیت اور مذہب کشی اور ڈارون کا فلسفہ ارتقاء بھلا کس شخص کے ذہن میں آنے والی باتیں تھیں لیکن کیا کچھ عرصہ بعد ہی پھر وہی ایک دنیا کا دین و مذہب نہیں بن گئیں؟ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات گو آج پھر اس سے نا آشنا ماغوں کو بعید از عقل نظر آ رہی ہیں، مگر کیا عہد ماضی کے عقلاء نے اس کی معقولیت کا اعتراف نہیں کیا اور کیا آج بھی مذہبی دنیا کا بڑا حصہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ اگر آپ ان کے لائے ہوئے آئین پر کبھی نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں ملوکیت سے لے کر دنیا کے ادنیٰ سے ادنیٰ معاملات کے متعلق پوری پوری ہدایات موجود ہیں اس میں صرف عقائد و عبادات کا باب نہیں بلکہ بیع و شراء، ہبہ و عاریۃ، رہن و شفعہ، نکاح و طلاق، وصیت و وراثت، غرضیکہ جملہ معاملات و تعزیرات حتیٰ کہ صلح و جنگ کے قوانین بھی پوری روشنی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس میں تہذیب اسماء اور تہذیب الفاظ کے ابواب تک بھی ہیں۔ غرض کھانے پینے، سونے جاگنے اور ہنسنے بولنے جیسی معمولی اشیاء کے متعلق بھی تمام اہم ہدایات ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ منافقوں نے طعن کے طریق پر کہا کہ تمہارا نبی تم کو سب ہی باتیں سکھاتا ہے حتیٰ کہ پیشاب و پاخانہ کا طریقہ بھی۔ اس پر صحابہؓ نے کیا اچھا جواب دیا ہے۔ جی ہاں، وہ ہمیں ان جیسی معمولی باتوں کے متعلق بھی ہدایات دیتے ہیں مگر سنو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنی عمیق اور ضروری ہوتی ہیں یہاں آپ کی ہدایت یہ ہے کہ اس حالت میں قبلہ کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھو، اپنی شرم گاہ کو دایاں ہاتھ نہ لگاؤ اور تین بار سے کم ڈھیلے کا استعمال نہ کرو وغیرہ اگر ہم اس کی شرح کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حیات انسانی کے ہر شعبہ کے متعلق اسلامی آئین میں کتنی مکمل اور کتنی ضروری ہدایات موجود ہیں۔ حدیث و تفسیر اور فقہ کا مطبوع ذخیرہ آج کتب خانوں کی شکل میں آپ کے سامنے ہے بلکہ اس کا کچھ حصہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہو چکا ہے۔ اگر عملی لحاظ سے دیکھنا ہو تو قرآن شریف اٹھ کر پڑھ لیجئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ملوک دنیا کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی بحث و نظر اور جنگی معرکوں کی سرگرمیوں کا نقشہ کیا تھا۔ یعنی کیا وہ صرف ایک معلم کی حیثیت رکھتے تھے یا عمل کے ہر میدان میں سب سے پیش پیش نظر آتے تھے۔ صحیح حدیثوں میں تو آج کل کی اصطلاح کا لفظ سیاست بھی انبیاء علیہم السلام کی شان میں موجود ہے کانت بنو اسرائیل تسوسہم الانبیاء الخ یعنی بنی اسرائیل کی سیاست اور نظم و نسق یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام چلایا کرتے تھے۔ میں چونکہ خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں اس لیے میری امت کا نظم و نسق خلفاء کے حوالہ ہو گیا ہے۔ (دیکھو ترجمان السنۃ ج ۱)

ان واضح حقائق کے ہوتے ہوئے اس بے وجہ غلط فہمی کا کوئی موقع تو نہ تھا کہ نبوت کا رشتہ مادی دنیا کے ساتھ کچھ نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام صرف ایک خیالی عالم کے مالک ہوتے ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے مذکورہ بالا بیان میں بڑی خوبی کے ساتھ اس خیال کی تردید کر دی گئی ہے۔ انہوں نے قرآن کریم سے انبیاء علیہم السلام کی ان صفات پر روشنی ڈالی ہے جن کے انبیاء علیہم السلام حامل ہوتے ہیں اور تاریخ سے یہ ثابت کیا ہے کہ حقیقت کی دنیا میں ان صفات کے اثرات کیا نکل چکے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون



کی ذرا اور تفصیل کر دیں تاکہ پورے طور پر اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے اور انبیاء علیہم السلام کا صحیح صحیح تعارف ہو جائے۔  
 نبوت کے ارکان ثلاثہ کی مزید تشریح \* حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ دنیوی انسان تو حیاتِ انسانی کے صرف ایک ایک شعبہ کی ہدایت کرتے ہیں اور وہ بھی ناقص اور انبیاء علیہم السلام انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایات فرماتے ہیں اور وہ بھی انتہاء درجہ مکمل گویا عالم کو اپنے نظام کے لیے جن مختلف قابلیتوں کے مختلف انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام قابلیتیں بیک وقت اعلیٰ سے اعلیٰ طریق پر تنہا ایک نبی میں موجود ہوتی ہیں یہاں سب سے پہلے بادشاہی اور ملوکیت کی صفت کو لے لیجئے اور اسی صفت میں شاہانِ دنیا کے ساتھ اس مقدس گروہ کا مقابلہ کر لیجئے۔

### مقدمہ

ہر شے کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت مگر اعتبارِ حقیقت کا ہے اور کمالِ مجموعہ میں ہے \* پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جس طرح کہ ہر چیز کے لیے اس کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت، مثلاً انسان اس کی ایک خاص صورت ہے اور اسی طرح انسانیت کی چند مخصوص صفات بھی ہیں جو اس کی حقیقت کہلاتی ہیں۔ مکمل انسان وہ ہے جو ان دونوں کا جامع ہو۔ صورت بھی انسان کی رکھتا ہو اور خواص و صفات بھی اسی کو رکھتا ہے۔ بندر میں صرف انسان کی سی صورت تو ہے مگر چونکہ وہ انسانی صفات سے بالکل معرئی ہے اس لیے کوئی اس کو انسان نہیں کہتا۔ اسی طرح اگر کسی انسان میں ہیكل انسانی تو ہو مگر انسانیت کی صفات ناقص ہوں تو فوراً اس کی انسانیت پر نقصان کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔ ایک بیوقوف کو آپ گدھا اور لڑاکو شخص کو بھڑیا کہہ دیتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اس کی صورت گوانسان کی نظر آتی ہے مگر اس میں کسی ایک انسانی صفت کی کمی ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اصل اعتبارِ صورت کا نہیں بلکہ حقیقت کا ہے اگر کسی کی حقیقت انسان کی ہے پھر اس کی صورت میں خواہ کتنا ہی نقص کیوں نظر نہ آنے لگے مگر اس کا شمار انسانوں ہی کے زمرہ میں رہتا ہے لیکن اس کے برخلاف اگر کسی میں انسان کی حقیقت ہی نہ ہو تو صرف اس کی صورت کے انسانی صورت ہونے سے کوئی اس کو انسانوں میں شمار نہیں کرتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اصل اعتبارِ حقیقت کا ہے۔ ہاں مکمل انسان وہی کہا جائے گا جس میں صورت اور سیرت دونوں جمع ہوں۔ اس فرق کو کسی شاعر نے کیا اچھے انداز میں ادا کیا ہے وہ کہتا ہے:

نالہ من صورتے بگرفت بلبل ساختند      لخت ہائے دل بیک جامع شد گل ساختند

یعنی دنیا جس کو بلبل شوریدہ کہتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ میرا نالہ و فغاں قدرت نے اس حقیقت کو بلبل کی صورت عطا کر دی ہے۔ اسی طرح جس کو دنیا گل کہتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ میرے پارہائے جگر۔ قدرت نے انہی کو گل کی صورت پہنا دی ہے۔

ملوکیت کی صورت اور اس کی حقیقت \* اسی طرح آپ بادشاہی کو بھی سمجھ لیجئے اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت اس کی حقیقت پر غور فرمائیے تو یہ صفات ہیں:

معاشی، معاشرتی، تمدنی انتظامات، ملک کی اندرونی و بیرونی حفاظت، رعایا کی تعلیم و تربیت کے پورے نظم و نسق کی پوری استعداد و قابلیت، اولوالعزمی، بہادری و فیاضی، عدل و انصاف، دل سوزی و ہمدردی اور عام اخلاق کی برتری اور ان صفات کے ساتھ

اس کے نمایاں اوصاف یہ بھی ہیں مثلاً طبعی نخوت و تکبر، تعیش و تملذ اور تنعم و تکلف وغیرہ۔ اس کی ظاہری صورت دیکھئے تو یہ ہے۔ جاہ و جلال، شان و شوکت، تخت و تاج، دولت و خزانہ، فوج و لشکر، محل و قلعہ، داد و دہش، یعنی انعام میں تہذیر و اسراف اور انتقام میں ظلم و تعدی وغیرہ۔

پس اگر ایک انسان تاج و تخت کا تو مالک ہو مگر ملکیت کے معنوی اوصاف میں کورا ہو تو دنیا اس کو بادشاہ نہیں کہتی وہ صرف صورت کا بادشاہ ہے حقیقت میں وہ ایک قزاق، لیرا اور نفس پرور انسان سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی میں یہ اوصاف مذکورہ تو ہوں مگر وہ تخت و تاج کا مالک نہ ہو تو دنیا اس کو بھی بادشاہ نہیں کہتی مگر ان دونوں میں جو سیرت ملکیت کا مالک ہوتا ہے وہ اپنی درویشی میں بھی بادشاہ کہلاتا ہے اس کی حکومت جسموں سے تجاوز کر کے مخلوق کی جانوں تک ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جو صرف ظاہری صورت ملکیت رکھتا ہے اس کی حکومت صرف جسموں تک محدود رہتی ہے، لوگوں کے قلوب اس پر لعنت کرتے ہیں اور عزت کی بجائے اس کو ذلیل ترین انسان شمار کرتے ہیں۔

**ملوکیت نبوت کی صورت و حقیقت \*** اب اس معیار سے آپ انبیاء علیہم السلام کو دیکھیں اور صرف اعتقاد کی روشنی میں نہیں بلکہ تاریخ اور واقعات کی روشنی میں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ بہترین صفات ملکیت کے حامل ہوتے ہیں اور اسی طرح ان میں ملکیت کی صحیح صورت بھی موجود ہوتی ہے۔ دیکھئے جب دنیا میں وہ آتے ہیں تو اس وقت دنیا کے عام اخلاق، ان کا عام تمدن ان کی زندگی کا عام نظم و نسق، ان کی عام تعلیم و تربیت کا عالم کیا ہوتا ہے؟ رہا عالم قدس سے ان کا تعلق تو اس جگہ ہم اس کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ پہلے یہاں اس پر نظر کیجئے کہ جب اس ماحول میں رسول آئیں تو عقلاً رسولوں کو کن صفات کا ہونا چاہیے۔ پھر یہ دیکھئے کہ وہ ہوتے ہیں کن صفات کے۔ اسی کے ساتھ اس پر بھی نظر رکھیے کہ یہ صفات ان میں کبھی اور تعلیم کا ثمرہ ہوتی ہیں یا محض فطری اور قدرتی، پھر وہ بھی کس اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں۔ ان کی اولوالعزمی اور فیاضی، ان کا عدل و انصاف اور ان کی عام ہمدردی کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ وہ صدق و امانت میں کیا مقام رکھتے ہیں، ان کا کیریکٹر کیا ہوتا ہے؟ اگر یہ تمام صفات ان میں بادشاہوں بلکہ شہنشاہوں جیسی موجود نظر آتی ہیں تو عقل و انصاف کی روشنی میں آپ کو یہ حکم لگانا ہوگا کہ وہ یقیناً بادشاہ سیرت ہوتے ہیں۔ اب اگر اس کے ساتھ ان میں بادشاہی کی صورت بھی موجود ہو تو پھر ان کے مکمل بادشاہ ہونے میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس معیار پر ہم سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ملکیت اور بادشاہی کے جتنے اوصاف حمیدہ عقل تصور کر سکتی ہے وہ سب آپ کی ذات ستودہ صفات میں اعلیٰ مرتبہ کے جمع تھے۔ عرب کے بگڑے ہوئے نظام میں آپ تشریف لائے جہاں تعلیم کا دور دور تک پتہ نہ تھا، قوم اتنی درشت اور جنگجو جس کی انتہا نہیں، عادات و اطوار اتنے بگڑے ہوئے کہ خدا کی پناہ، اخلاق اتنے گرے ہوئے کہ العظمت للہ ملک میں وہ بدامنی کہ انسانوں کا جینا مشکل، تمدنی نظم و نسق کی اتنی ابتری کہ ہر فرد خود مختار اور بادشاہ کی جہالت کی یہ نوبت کہ برہنگی شراب خواری و حرام کاری باعث ناز و افتخار اور قتل و غارت ان کی شرافت کا معیار۔

ایسے پست ماحول میں آپ کا ظہور ہوا تو آپ کن صفات کے مالک تھے، کسی سے تعلیم حاصل کی تھی یا فطرۃً ممتاز صفات رکھتے تھے؟ کسی شاہی خاندان سے متعلق تھے یا صرف ایک شریف گھرانے کے نو نہال تھے؟ ان سب باتوں کا جواب اگر سننا ہو تو



ہر قل و ابوسفیان کی زبانی سن لیجئے جس میں دونوں غیر مسلم ہیں۔ پھر ایک شہنشاہ ہے اور دوسرا اپنی قوم کا دانا سردار۔ تاریخ کی روشنی میں یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ عقل و ہنر، علم و دانائی، تہذیب و اخلاق، عدل و انصاف، شجاعت و سخاوت اور جملہ ملکیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ صفات کے مالک تھے۔ جو ملک بھی آپ کی زیر تعلیم آ گیا اس کی کاپی پٹ گئی اور وہ انسانیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر جا پہنچا۔ عرب کی تاریخ آپ کی بعثت سے قبل اور بعد کی ملا کر دیکھ لیجئے تو آپ کو یوں معلوم ہوگا کہ وہ ایک ایسی قوم بن گئے تھے جو صفحات عالم پر گویا اب پہلی بار نمودار ہو رہی ہے ان کے اوضاع و اطوار بدل چکے ہیں وہ اب قتل و غارت کی زندگی کے بجائے امن کے شہزادے اور سارے جہان کے لیے پیغام سلامتی بن چکے ہیں، حرام و حلال کی تمیز کرنا معروف و منکر کو پہچاننا، عہد و پیمان کا پورا پابند رہنا، معاملات میں دوست و دشمن کو ایک نظر سے دیکھنا اور انسانوں کو چھوڑ کر خدا کی بے زبان مخلوق یعنی حیوانات کے ساتھ بھی بے رحمی سے اجتناب رکھنا ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ عفت و پاک بازی، حیاء و غیرت، صلہ رحمی اور عام خلق اللہ کی ہمدردی ان کی فطرت کا جز، بھڑک چکی ہے۔ وہ جس ملک میں نکل گئے ہیں وہ ملک ان کا گرویدہ بن گیا ہے۔ آخر وہ نوبت بھی آ گئی ہے جب کہ دشمن اہل کتاب نے ان کو دیکھا تو بے ساختہ بول اٹھے ہیں کہ یہ امت وہی امت ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے سے اپنی کتابوں میں پڑھتے چلے آئے ہیں اور کسی جنگ کے بغیر اپنا ملک ان کے حوالہ کر دیا ہے اتنے عظیم پھر اس سرعت کے ساتھ انقلاب اور وہ بھی اتنے پائدار انقلاب کی تاریخ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتی کیا آپ کی شاہانہ قابلیتوں کے لئے اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور ثبوت درکار ہے۔

اب اگر ملکیت کی ظاہری صورت پر نظر کیجئے تو یہاں بھی جاہ و جمال، شان و شوکت میں کئی کمی نظر نہیں آئی بلکہ آپ کے رعب و ہیبت کا جو عالم یہاں نظر آتا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ دشمنوں کے قلوب دور دور سے ہی آپ سے سہمے ہوتے رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ نے جن مخصوص صفات سے مجھ کو نوازا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میرا رعب بے سرو سامانی میں بھی ایک ماہ کی مسافت سے دشمن کے دل پر پڑتا ہے ابوسفیان جب زمانہ جاہلیت میں ہر قل کے دربار سے واپس آئے تو باہر آکر ان کا جو احساس تھا وہ انہوں نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ”انہ یخافہ ملک بنی لاصفر“ یعنی مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور غالب رہیں گے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ ان سے شاہ روم تک خائف ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب اہل مکہ نے عروہ بن مسعود کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تو انہوں نے آپ کی محفل کو دیکھ کر اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا تھا وہ یہ تھے۔

”اے قریش میں نے شاہ حبش، شاہ قسطنطنیہ اور شاہ ایران کے دربار دیکھے لیکن کوئی بادشاہ ایسا نظر نہیں آیا جس کی عظمت اس کے دربار والوں کے دلوں میں ایسی ہو جیسی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابیوں کے دلوں میں محمد کی ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھوکتے ہیں تو ان کا لعاب دہن زمین پر گرنے سے پہلے لوگ اس کو ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ پر مل لیتے ہیں۔ جب وہ کسی بات کا حکم دیتے ہیں تو سب اسی تعمیل کے لئے دوڑ پڑتے ہیں ان کے دل میں محمد کا اتنا ادب و احترام ہے کہ وہ ان کے دربار میں نظر اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے۔“

رہی آپ کی فوج و لشکر اور اس کے تقسیم و نسق تو وہ بھی تاریخوں میں موجود ہے آلات حرب کی فراہمی اور ان کی حفاظت کے حالات، فوجی راشن اور اس کی تقسیم کے انتظامات بھی سب سیرت کی کتابوں میں مدون ہیں۔ آپ کے دربار میں شاہانہ داد و

دہش اور انعام و اکرام کا حال بھی ایک ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ لیکن جس طرح انبیاء علیہم السلام کی ملوکیت کی سیرت میں شاہان دنیا کے بعض اجزاء نظر نہیں آتی اسی طرح ان کی ملوکیت کی صورت میں بھی اس کے کچھ نمایاں اجزاء نہیں ملتے، ان کی شاہانہ سیرت میں نخوت و تکبر کی بجائے تواضع و انکسار، تعیش و تملذذ کی بجائے جفاکشی و تعب اور تکلف و تنعم کی بجائے انتہاء درجہ سادگی اور بے تکلفی ہوتی ہے، اسی طرح اس کی صورت میں بھی تخت و تاج دولت و خزانہ اور شاہانہ محل سرائے کا نام و نشان نہیں ملتا اور ان کی اس انوکھی ملوکیت کی وجہ سے ہی تاریخ نہ تو ان کو ملوک دنیا کی فہرست میں شمار کر سکتی ہے اور نہ اس سے پورے طور پر انکار ہی کی قدرت رکھتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی اس بلند شخصیت کا اگر آپ کو اندازہ ہو جائے تو آپ اس حقیقت کو باور کر لیں کہ وہ دنیا میں جو نظام حیات لے کر آئے ہیں اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا نظام ممکن ہی نہیں ہے۔ کاش ملوکیت کا جو تصور اسلام نے دنیا کے سامنے رکھا ہے اگر دنیا اس کو محفوظ رکھتی تو یقین کیجئے کہ آج امپیریلزم اور کمیونزم کی یہ عالمگیر اور بھیانک جنگ دنیا کے کسی خطہ میں آپ کو نظر نہ آتی۔ اور اگر آج بھی اس پر غور کر لیا جائے تو دنیا کو پھر اس جنگ زرگری سے نجات مل سکتی ہے۔

ملوکیت نبوت کا اہم رکن عالم غیب سے اس کا رشتہ ہے \* انبیاء علیہم السلام کی ملوکیت کی حقیقت اگر صرف اسی حد تک جا کر ختم ہو جاتی تو یقیناً مادی عقول کے لیے ملوکیت کے اس تصور سے بڑھ کر کوئی دوسرا تصور نہ ہوتا، لیکن یہاں ملوکیت کی حقیقت میں جس اہم جزء کا وہ آ کر اضافہ فرماتے ہیں بس وہی ان کے لیے نقطہ اختلاف بن جاتا ہے یعنی عالم غیب کے ساتھ ان کا رشتہ اور وہ بھی اس شد و مد کے ساتھ کہ سطحی نظروں کو یہ متوہم ہونے لگتا ہے کہ مادی نظام کے ساتھ ان کا رشتہ گویا کٹ چکا ہے۔ وہ اپنی کسی حالت میں بھی اس رشتہ سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ وہ چلتے ہیں تو عالم غیب ان کے سامنے ہوتا ہے، نماز پڑھتے ہیں تو عالم غیب ان کے سامنے ہوتا ہے، حتیٰ کہ جب سو جاتے ہیں تو بھی بیداری کی طرح عالم غیب ان کے سامنے ہی رہتا ہے، اسی لیے ان کے خواب کو بھی وحی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ عالم غیب میں کبھی خود جا کر اس کا مشاہدہ کر آتے ہیں اور کبھی خود عالم غیب ان کے اتنا قریب آ جاتا ہے کہ اگر چاہیں تو اس کے باغات کے پھل توڑ کر لوگوں کے حوالہ کر دیں اور اس طرح عالم شہادت میں عالم غیب کی گویا وہ ایک مجسم دلیل ہوتے ہیں۔ جس نے ان کو دیکھ لیا گویا اس نے پورے عالم غیب کو دیکھ لیا۔ یہی سبب ہے کہ جو ان کا منکر ہو گیا وہ عالم غیب کا بھی منکر ہو گیا، اور جو ان کا معتقد ہو گیا وہ عالم غیب کا بھی معتقد بن گیا۔ اس لیے ان کی ملوکیت بھی تمام تر عالم غیب سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ دشمنوں کی سازشوں کی اطلاعات مخلصین صحابہ کرامؓ سے پہلے ان کو خدا تعالیٰ کے فرشتے بلکہ خود اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق سے ہو جاتی ہے۔ آپ کی حیات میں دشمنوں نے کتنی سازشیں خفیہ در خفیہ کیں مگر یہاں دیکھا تو آپ کو پہلے سے ان کی اطلاع مل چکی تھی ایک بار یہود نے آپ کو کھانے میں زہر دیا، آپ نے فوراً ان کو بلا کر پوچھا بتاؤ تم نے کھانے میں زہر ملا یا ہے انہوں نے اس کا اعتراف کیا مگر حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ آپ کو یہ راز بتایا کس نے؟ آپ نے اسی کھانے میں سے بکری کا دست اٹھا کر فرمایا۔ اس نے۔ پس یہاں گھر باہر، دوست و دشمن کی بہت سی خبریں ظاہری انتظام سے پہلے ہی ان کو عالم غیب سے مل جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں آپ کے ایک خانگی معاملہ کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ایک واقعہ کے متعلق آپ کی بیوی صاحبہ نے اپنی ایک رازدارانہ گفتگو پر آپ کو خبردار دیکھ کر تعجب سے پوچھا ”من انباک هذا؟“ یا رسول اللہ بھلا یہ تو بتا دیجئے کہ اتنی پوشیدہ بات کی



اطلاع آپ کو دی کس نے؟ آپ نے فرمایا ”نَبَايَ الْعَلِيمِ الْخَبِيرُ“ اس نے جس سے بڑھ کر نہ کوئی جاننے والا ہے اور نہ کوئی خبر رکھنے والا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تو قرآن کریم میں ایک معجزہ ہی یہ موجود ہے کہ تم لوگ جو اپنے گھروں میں کھاتے پیتے اور جمع کر کر کے رکھتے ہو وہ سب میں جانتا ہوں اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کی ملکیت کا رشتہ کسی جگہ بھی عالم غیب سے کٹ جائے۔ ان کے نزدیک ان کی ملکیت کی حقیقت قوتِ نفیذ سے ایک ذرہ آگے نہیں ہوتی، اپنی ذاتی حکومت کا وہ کوئی تصور ہی نہیں رکھتے اور جو آئین وہ لے کر آتے ہیں وہ کسی انسان کا ساختہ پرواختہ نہیں ہوتا۔ وہ یہ اعلان کر کر کے کہتے ہیں کہ جس آئین کی ہم تم کو دعوت دیتے ہیں وہ آئین خود خالق کائنات ہی کا بنایا ہوا ہے ہم اس میں ایک شے کا نہ اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ اس میں ذرا سی کمی کر سکتے ہیں۔ ﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي﴾ (یونس: ۱۵) کہہ دو کہ میرا تو ایسا مقدور نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں (کسی قسم کا) رد و بدل کروں بلکہ اس پر عمل کرنے میں خدا تعالیٰ کی دوسری تمام مخلوق کے ساتھ ہم بھی شریک ہیں وہ اپنے غیبی رشتہ کو صرف عقیدہ کی حد تک نہیں رکھتے بلکہ بدرو حنین کے میدانوں میں اس کا تجربہ بھی کر دیتے ہیں اور علی الاعلان کہتے ہیں۔ اب بتاؤ فتح و نصرت تمہاری قلت و کثرت پر منحصر ہے یا خالق کائنات کی غیبی مدد پر۔

﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ﴾ فتح تو اللہ کی طرف سے ہے بے شک اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت

والا ہے۔

﴿حَكِيمٌ﴾ (انفال: ۱۰)

اور اسی غیبی رشتہ کے اعتماد پر اپنی بے سرو سامان فوج لے کر دنیا کی بڑی سے بڑی حکومت سے بھڑ جاتے ہیں اور اس کا دوسرہ بھی نہیں لاتے کہ فتح ان کو نہیں ہوگی، وہ تنہا کھڑے ہو کر بڑی بے جگری کے ساتھ اپنے پروگرام کا اعلان کر دیتے ہیں اور یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ہم تنہا نہیں ہیں، ہماری پشت پر خالق کائنات کی غیبی مگر حقیقی طاقت موجود ہے اس لیے تم جو بھی کر سکتے ہو کر کے دیکھ لو۔

﴿فَاجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُون﴾ پس تم اور تمہارے شریک سب مل کر اپنی ایک بات ٹھہرا لو تمہاری وہ بات تم میں کسی پر مخفی نہ رہے (تاکہ سب اس کی تکمیل میں شریک ہو سکیں) پھر (جو کچھ تم کو کرنا ہے) میرے ساتھ کر

چکو اور مجھ کو مہلت نہ دو۔ (یونس: ۷۱)

وہ دشمن کے مقابلہ میں جب صف آرا ہوتے ہیں تو اپنی فوج کو بینڈ کی بجائے ذکر اللہ کا ترانہ گانے کا حکم دیتے ہیں اور ان کی نظر ظاہری ساز و سامان ہونے کے باوجود دعاؤں کے ہم اور ملائکہ اللہ کی ایسی طاقت پر زیادہ لگی رہتی ہے۔ اسی لیے عین حالت جنگ میں بھی وہ نمازوں کو اپنے اوقات سے مؤخر نہیں کرتے گو وہ اس حالت میں اپنی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھنا بھی لازم سمجھتے ہیں۔ ان کی جنگ کا مقصد صرف قتل و غارت اور اقتدار و ملکیت نہیں ہوتا وہ اس نازک موقع پر بھی مجرم اور غیر مجرم کی تمیز رکھتے ہیں اور یہ ہدایت کرتے ہیں۔ کسی بچہ کو قتل نہ کیا جائے کسی عورت پر ہاتھ نہ ڈالا جائے جو شخص خدا کی حکومت کا اقرار کرے اس سے فوراً درگزر کر دیا جائے۔ جو مال دشمن سے حاصل ہو اس کو اپنی ملکیت نہ سمجھا جائے جو ملک قبضہ میں آئے اس کے باشندوں

کے ساتھ عادلانہ سلوک کیا جائے۔ عام ملکی حقوق جان و مال کی حفاظت میں ملکی اور غیر ملکی کا کوئی امتیاز نہ رکھا جائے، کافر کا دعویٰ مسلمان پر اسی نوعیت کے ساتھ سنا جائے جیسا مسلمان کا کافر پر اور یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ ملک دراصل اللہ تعالیٰ کا ہے ہماری جنگ و صلح بھی اسی کے حکم کے تابع ہے، وہ خالق کائنات ہے اس لیے جو حقوق کائنات کی بقاء کا موجب ہیں اس میں مساوات رکھی جائے گی۔ دوست و دشمن، کافر و مسلم کے درمیان پورے امتیاز کا دن فروائے قیامت ہے۔ ﴿إِنَّ صَلَوتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ یعنی ہماری موت و حیات تک کا اصل مقصد بھی صرف رضاء الہی ہے۔ بس اسی نقطہ پر پہنچ کر ملوکیت اور نبوت کی راہیں علیحدہ علیحدہ پھٹ جاتی ہیں۔ ملوکیت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ ملک اس کا ہو، ملک اس کی ہو، آئین اس کا ہو، دولت و خزانہ اس کا ہو، قوت اس کی ہو اور اختیار و اقتدار تمام تر اس کا ہو۔ اس کے برعکس نبوت کا اعلان یہ ہے کہ یہ ملک اس کا ہے نہ ملک اس کی نہ آئین اس کا ہے نہ حکومت و اقتدار اس کا۔ دولت و خزانہ اور طاقت و اختیار جو کچھ بھی ہے وہ سب مالک علی الاطلاق کی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی بادشاہت کا نام حاکم اور ملک کی بجائے خلیفہ رکھتی ہے۔

ملوکیت نبوت کی حقیقت خلافت ہے \* یعنی اس کی جانب سے ایک مقرر شدہ نائب اور بس۔ ان کے سامنے بس یہی ایک پروگرام ہوتا ہے کہ وہ خدائی آئین کو اس کی پیدا کردہ مخلوق میں پوری جدوجہد کے ساتھ نافذ کر دیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے طویل و عریض سلسلہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملوکیت کی ظاہری شان و شوکت کا تذکرہ خود قرآنی اوراق میں موجود ہے، مگر اس کی حقیقت بھی قدم قدم پر خلافت سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتی، وہ اس اقتدار اور حکومت کے بعد بھی ہر ہر موقعہ پر یہی اعلان کرتے رہے کہ میں ایک نائب کی حیثیت سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔ نصب العین میرا بھی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جو دیگر انبیاء علیہم السلام کا تھا یعنی احکام الہیہ کی تنفیذ۔

مادی عقول اس غیبی رشتہ کا ادراک نہیں کرتیں، اس لیے وہ ہر موقعہ پر رسولوں کا یہ رشتہ سن کر بدکتی ہیں اور وہ خلافت کی بجائے انسان کو خود مستقل مالک و حاکم کی حیثیت دے دینا معقول بات سمجھتی ہے حالانکہ اگر انصاف کے ساتھ غور کیا جائے تو ملوکیت کی صحیح حقیقت اگر ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہو سکتی ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام کی ذات میں نظر آتی ہے اور صرف اسی کی نظام عالم کو ضرورت بھی ہے۔ اس سے زیادہ ملوکیت کا جو تصور مادی عقول نے تراش لیا ہے نہ تو اس کی کوئی حقیقت ہے اور نہ نظام عالم کو اس کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو اپنی مستقل مالکیت و حاکمیت کا دعویٰ کرنا حقیقت کی نظر میں کتنا خلاف واقع ہے پھر اس پر آئین سازی اور اختیار مطلق کے جو شاخسانے اس نے اور لگا لیے ہیں وہ اور بھی زیادہ مضحکہ خیز ہیں۔ اور ان بے حقیقت خیالات کی نظام عالم کو کوئی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ عالم میں فتنہ و فساد کی جڑ ملوکیت کا یہی مادی تخیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی مملکت بھی گویا ظاہر میں کتنے ہی اقتدار و حکومت کی مالک ہو مگر اس کی زیر دست رعایا کے قلوب پر بھی اس کا سکہ نہیں جمتا اور اسی لیے ہمیشہ دنیوی بادشاہوں کو اپنے گرد و پیش سے خطرات لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک نہ ایک دن صفحہ ہستی سے ان کو نابود ہو جانا پڑ جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام جس ملوکیت کے حامل ہوتے ہیں اس میں چونکہ انسانی فلاح و بہبود کے سوا کوئی تخیل ہی نہیں ہوتا وہ اپنی مالکیت و حکومت کا کوئی دعویٰ ہی نہیں رکھتے اس لیے فطرت انسانی کو ان سے ٹکرانے کا موقعہ ہی نہیں ہوتا اور اس لیے ان کی محبت



اور محبت کے ساتھ عقیدت بھی دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ ان کی محفل کا نقشہ وہ بن جاتا ہے جو ابھی عروہ بن مسعود کی زبان سے آپ سن چکے ہیں اور اسی لیے ان کی عقیدت میں حیات اور بعد حیات کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قلوب جس طرح ان کی حیات میں ان کا انتہائی درجہ احترام کرتے ہیں ان کی وفات کے بعد بھی ان کے احترام کے لیے اتنے ہی مضطرب رہتے ہیں۔ اس مقام سے یہ بات بھی حل ہو گئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ اتنی والہانہ محبت اور عقیدت کیوں تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ محض بے سمجھے سوچے آپ پر فدا ہو گئے تھے بلکہ وہ آپ کی ذات مبارک میں جاذبیت کے جو متفرق سامان متعدد انسانوں میں جمع ہو سکتے تھے وہ یہاں بیک وقت زیادہ سے زیادہ جمع دیکھتے تھے وہ تجربہ کر کر کے دیکھ چکے تھے کہ رسول خدا کی ذات میں ان کی خیر خواہی خود ان کی اپنی جانوں سے زیادہ موجود ہے۔ اس لیے بادشاہ والد محسن اور ان کے علاوہ محبت کے جتنے رشتے تصور میں آ سکتے ہیں وہ سب کے ساتھ آپ میں جمع ہو گئے تھے۔ سچ پوچھئے تو ان کی محبت و ادب کا جو نقشہ عروہ بن مسعود نے اپنے الفاظ میں ادا کیا تھا وہ بھی ناتمام تھا۔

نبوت کے لیے قدرت جن نفوس کا انتخاب کرتی ہے ان میں اعلیٰ قابلیتیں بھی ودیعت فرما دیتی ہے \* اور اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ یہ شاہانہ حکومت انبیاء علیہم السلام کے یونہی حوالہ نہیں کی جاتی بلکہ اس نوع کی حکومت اور شاہی کی قابلیت چونکہ صرف ان ہی میں پیدا کی جاتی ہے اس لیے خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق میں صرف وہی اس کے اہل ہوتے ہیں کہ خدائی حکومت کا نازک اور اہم منصب ان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اسی لیے مقام نبوت کا انتخاب انسانوں کے سپرد نہیں کیا جاتا بلکہ جو خالق کائنات ہے وہی خود ان کا انتخاب فرماتا ہے۔

﴿اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ (الحج: ۷۵)

اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے بعض کو اپنے احکام پہنچانے کے لیے انتخاب فرمالینا ہے اور اسی طرح بعض کو آدمیوں میں سے بھی۔

اگر تاریخی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کا یہ جوہر استعداد دیکھنا ہو تو سورہ یوسف اٹھا کر پڑھ لیجئے۔ کس طرح فوطی فارفرعون کی فوج کے سردار نے پہلے غلام سمجھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو خرید اپھر تجربہ کے بعد کسی طرح اپنی سلطنت کا نظم و نسق سب ان کے حوالہ کر دیا۔ حسب بیان تو رات ان کے حسن انتظام سے فوطی فار کی آمدنی دو گنی ہو گئی تھی۔ (پیدائش ۳۹: ۴۰)

کون باور کر سکتا ہے کہ اگر انبیاء میں یہ جوہر استعداد نہ ہوتا تو جو کل زر خرید غلام نظر آ رہا تھا وہ بہت تھوڑی سی مدت میں مصر کے تاج و تخت کا مالک نظر آ سکتا تھا بالخصوص جب کہ وہ اپنے گھرانے سے جدا ہوا تو اس کے ماحول کی زندگی بدویانہ زندگی تھی اور جہاں آ کر اس نے زمام حکومت سنبھالی وہ انتہاء درجہ پر متمدن ملک تھا۔ اسی خدا نے آخر میں پھر ایک صحرائین ہی کو پیدا فرمایا اور فارس و روم جیسی متمدن حکومتیں سب اس کے زیر نگیں کر دیں۔ کیا اب بھی کوئی یہ شبہ کر سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں ملوکیت کا جوہر نہیں ہوتا۔

آدم علیہ السلام کی سرگزشت میں اسی حقیقت پر ایک اہم تنبیہ \* اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آدم علیہ السلام کی خلافت اور ملائکہ اللہ کی سرگزشت کا جگہ جگہ تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ اور خوب واضح کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو زمین

کی خلافت صرف یونہی سپرد نہیں کر دی گئی تھی بلکہ قدرت نے پہلے سے ان میں وہ اعلیٰ جوہر بھی ودیعت فرمادئے تھے جو خدائی خلافت اور نیابت کے لیے ہونے چاہئیں۔ اور اسی لیے زیر حکومت آنے والی اشیاء کی تعلیم خاص طور پر ان ہی کو دی گئی تھی۔ تعجب کی بات ہے کہ ملائکہ اللہ ہزار اپنی تسبیح و تقدیس کا بڑے عجز و نیاز کے ساتھ اظہار کرتے رہے مگر قدرت کا فیصلہ پھر ان کے خلاف ہی رہا یہ اس لیے کہ دنیا کو یہ سبق ملے کہ اسلامی حکومت یا خلافت میں سب سے پہلے صلاحیت و قابلیت کو جانچا جاتا ہے۔

آدم علیہ السلام اور ملائکہ اللہ میں مقابلہ کا امتحان اور اس کا نتیجہ \* صرف مصلیٰ اور تسبیح کی فضیلت سے ملک حوالہ نہیں کر دیا جاتا۔ اس قابلیت کے فقدان کی وجہ سے خلافت تو درکنار اشیاء کے اسماء کی بھی ان کو تعلیم نہیں دی گئی۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب نبوت ملا اور ان کو معلوم ہوا کہ سب سے پہلے ان کو فرعون کا مقابلہ کرنا ہے۔ ایسے بد دماغ کو یہ بات سمجھانی کہ تو نہ حقیقی مالک ہو سکتا ہے نہ حقیقی ملک۔ کتنی فصاحت لسانی کا محتاج ہے ادھر میری زبان میں لکنت ہے تو ان کی نظر بھی اسی طرف گئی اور انہوں نے یہ درخواست پیش کی کہ اگر مجھے ایک فصیح البیان وزیر بھی مددگار کے طور پر عنایت ہو جائے تو میرے کام میں بہت سہولت پیدا ہو جائے پھر جب اس امت کا دور آیا تو یہاں بھی خلافت کے وقت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے زاہد کی طرف کسی کی نظر نہ اٹھی بلکہ اس سے بڑھ کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرابت کی طرف بھی اس وقت نظریں نہ گئیں۔ معلوم ہوا کہ دنیوی خلافت ہو یا اخروی ہر جگہ قابلیت و صلاحیت کی رعایت انبیاء علیہم السلام نے بھی سب سے مقدم رکھی ہے ان کے خلفاء نے بھی اور خود خالق کائنات نے بھی۔ پھر یہ خیال کس قدر سفیہانہ خیال ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے حکومت کے لیے صرف تسبیح و تہجد کی تلاش ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو زمین کی خلافت کے لیے تسبیح و تقدیس سے زیادہ نظامی قابلیت کا ہونا ضروری ہے۔ بھلا جو مخلوق اپنی زیر حکومت اشیاء کے ناموں تک سے نا آشنا ہو وہ ان کی ضروریات کی رعایت کیا کر سکتی ہے اور ان کا نظم و نسق کیا چلا سکتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب کسی منصب کے لیے دنیا میں اس کی قابلیت کا ہونا ضروری ہو اور اس کے لیے مقابلہ کا امتحان بھی لازم سمجھا جائے تو جس کے قبضہ میں قابلیتوں کی آفرینش ہے وہ قابلیت اور امتحان مقابلہ کے بغیر صرف یونہی اپنی نیابت کا اہم منصب آدم علیہ السلام کے سپرد کر دیتا۔ بے شک حکومت کے لیے جہاں صرف تسبیح و تہجد کو دیکھا نہیں جائے گا وہاں یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ جو نیابت کے فرائض ہی سے نا آشنا ہو اور حکومت الہیہ کی بجائے خود اپنے تراشید و قوانین نافذ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ خدا تعالیٰ کی زمین اس کے حوالہ کر دی جائے۔ دنیا کی تاریخ میں جب کبھی ایسا ہوا ہے تو خدا تعالیٰ کی زمین ہمیشہ طغیان و سرکشی اور شر و فساد سے بھر گئی ہے لہذا اسلامی حکومت کے لیے وہی شانِ جامعیت درکار ہے جس کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ کے کلام میں ذکر ہو چکا ہے۔

ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یہ مغالطہ بھی دور ہو جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اس غیبی رشتہ کا مطلب یہ ہے کہ مادی نظام ان کی نظروں میں بالکل معطل ہوتا ہے۔ علل و اسباب ظاہری کا قدرتی نظام سب بیکار ہوتا ہے اور اب حصول مقاصد کے لیے صرف دعاؤں اور خدا تعالیٰ کے مقدس فرشتوں کا انتظار کرنا چاہیے۔ نہیں نہیں مادی نظام کی رعایت مادہ پرستوں سے کم یہاں بھی



نہیں ہوتی مگر یہاں اس کو صرف اسباب و علل ظاہری کی حد تک ہی سمجھا جاتا ہے، مؤثر حقیقی نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے لشکر کی صف آرائی بھی ہوگی، جس سمت سے دشمن کا خطرہ ہو اس طرف پہرہ بھی مضبوط رکھا جائے گا۔ جدید آلات بھی استعمال کیے جائیں گے، خندق بھی کھودی جائے گی، جنگی راشن اور اس کی تقسیم کا انتظام بھی پورا پورا کیا جائے گا۔ غرض تمام نظام زندگی کے ہر گوشہ میں مادی اسباب کی بھی پوری رعایت رہے گی یہ سب کچھ ہوگا مگر ہوگا اسی استحضار کے ساتھ کہ اصل تاثیر صرف وحدۃ لا شریک لہ کے قبضہ میں ہے۔ اس لیے اگر ان کے پیچھے دشمن ہو اور سامنے سمندر اور موت کے اسباب ظاہری سب جمع نظر آئیں پھر بھی ان کو ذرا ہراس نہیں ہوتا اور بڑے اطمینان کے لہجے میں وہ یہ کہہ دیتے ہیں ﴿إِنَّ مَعَ رَبِّي سَيْفُهُدِينَ﴾ جب میرے رب کی حقیقی طاقت میری پشت پر موجود ہے تو مجھے غم کیا ہے۔ سیال پانی بھی مجھ کو راستہ دینے پر مجبور ہوگا۔ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور اس میں جھونک دینے پر دشمن تلے نظر آتے ہیں مگر ان کے بحر سکون میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ جس نے آگ میں جلانے کی فطری صفت پیدا کی ہے وہ اس کو بدل بھی سکتا ہے۔ بس عالم غیب پر ان کے اس اعتماد کو دیکھ کر ہی ناواقف عقول کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ مادی نظام ان کے یہاں معطل ہوتا ہے۔ حالانکہ مادی نظام کی فیہی نظام کے سامنے حقیقت ہی اتنی ہوتی ہے کہ مادی نظام صرف ایک صورت کی حیثیت رکھتا ہے اس کی روح وہی فیہی نظام ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ضعیف نظریں اس فیہی نظام کا ادراک ہی نہ کر سکیں۔

اب آپ دنیوی حکومت اور اسلامی خلافت کا فرق سمجھ گئے ہوں گے۔ ہم آخر میں پھر اس کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام صرف جبرئیل صفت نہیں ہوتے بلکہ وہ ملوکیت مگر شرعی ملوکیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ صفات کے حامل بھی ہوتے ہیں، بے شک ان کے پورے کے پورے آئین کا رشتہ خواہ وہ دنیوی ہو یا اخروی ہدایت ربانی سے کٹ نہیں سکتا اور نہ ہمارے نزدیک یہ ممکن ہے۔ جب دنیا میں ہر کمزور کی سیاست یہ ہے کہ وہ کسی طاقتور کی پناہ میں رہے تو انبیاء علیہم السلام جیسے حقائق آگاہ سے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے عہد خلافت میں خود اپنی حکومت کی اصل طاقت ہی کو فراموش کر بیٹھیں۔ یہ تو ان کی ملوکیت کی کچھ تفصیل تھی اب اسی پر ان کے علم و حکمت اور رشد و ہدایت کے معاملہ کو قیاس کر لیجئے۔

**نبوت کا رکن ثانی یعنی علم و حکمت** \* انبیاء علیہم السلام جو علوم لے کر آتے ہیں اس کی تفصیل آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان میں ملاحظہ فرما چکے ہیں یہ وہ علوم ہیں جن سے کہ نفس انسانیہ کے شرف و کمال اور تمام نظام عالم کی اصلاح کا تعلق ہوتا ہے، اگر عالم ان علوم سے غافل رہے تو انسانیت کا کمال ہی عالم سے معدوم ہو جائے۔

**علوم نبوت کی پہلی خصوصیت حقوق انسانیت کا تحفظ اور مصالح عالم کی رعایت ہے** \* اب مثال کے طور پر آپ صرف معاملات کے ایک شعبہ ہی کو لے لیجئے، جیسے بیع و شراء اور نکاح و طلاق، یوں تو سب دنیا ہی اس پر ہمیشہ سے غور کرتی چلی آئی ہے۔ اور اپنے اپنے زاویہ خیال کے مطابق ان کا ایک آئین بھی مقرر کرتی رہی ہے مگر اس کی انتہاء صرف بائع و مشتری اور صرف زوج و زوجہ کی بہبودی کی حد تک ہے یا اس سے اور آگے اپنے ملک کی حد تک سمجھ لیجئے لیکن بقیہ عالم پر اس کے اثرات کیا ہوں گے اس بحث سے ان کو کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام کی نظر اس طرف بھی رہتی ہے کہ ان کے آئین میں ایک دفعہ بھی ایسی

نہیں ہو سکتی جو عالم کے کسی خطہ کے حق میں بھی مضرت رساں ہو۔<sup>۱</sup> یہ اس لیے کہ وہ حقوق انسانیت کے سب سے بڑے محافظ بنا کر بھیجے جاتے ہیں اور دراصل خلافتِ الہیہ کا تقاضہ بھی یہی ہے اور اسی لیے ان کی ملوکیت کا بڑا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ اگر آپ انبیاء علیہم السلام کے آئین کی تلاش کریں گے تو اس میں حیوانات تک کے حقوق کے تحفظ کا بھی ایک مستقل باب دیکھیں گے۔ چنانچہ اس کے متعلق بھی احادیث میں کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اس وقت اگر ہم اس پر تفصیلی کلام کریں تو اصل موضوع سے بہت دور ہو جانے کا خطرہ ہے اس لیے ہم صرف معاملات پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی نظام میں اگر کوئی جزء اہم سمجھا گیا ہے تو وہ صرف طرفین کی رضامندی ہے اگر طرفین کسی معاملہ پر راضی ہو جاتے ہیں تو اس معاملہ کا اثر خواہ نظام عالم پر کچھ بھی ہو اور حقوق انسانیت اس کی بدولت کتنے ہی پامال ہوتے نظر آئیں مگر مادی قانون میں وہ جائز تصور کیا جاتا ہے اسی بناء پر سود کا لین دین جائز ہی نہیں بلکہ ایک بڑے طبقہ کی نظر میں ترقی کی سب سے بڑی شاہراہ سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح زنا اگر طرفین کی رضامندی کے ساتھ ہو تو وہ کوئی جرم متصور نہیں ہوتا لیکن انبیاء علیہم السلام کی شریعت میں طرفین کی رضامندی بھی گواہم جزء ہے مگر صرف اتنی بات کسی عقد کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی وہ اس پر بھی نظر رکھتے ہیں کہ اس معاملہ کا اثر بقیہ عالم اور حقوق انسانیت پر کیا پڑتا ہے اس لیے اسلام طرفین کی رضامندی کے باوجود سود کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ سود اگرچہ ایک طبقہ کے لیے جلب زر کا ذریعہ ہو جائے مگر دوسرے طبقہ کے لیے یقیناً نقصان کا موجب ہو جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کے آئین کی ایک دفعہ بھی ایسی ہو جس سے اصولی طور پر عالم انسانی کے کسی طبقہ کی بربادی کا خطرہ یقینی ہو جائے اس لیے ان کی نظروں میں یہاں طرفین کی رضامندی کوئی چیز نہیں ہے۔

اسی طرح زنا کا مسئلہ ہے یہاں بھی ان کے آئین میں رضامندی کوئی حقیقت نہیں رکھتی ان کے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ایسے انسان کو خدا تعالیٰ کی زمین پر جینے کا کوئی حق ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے اگر شرعی ثبوت کے بغیر کسی انسان کے متعلق یہ تہمت لگائی جائے تو ہمیشہ کے لیے اس تہمت لگانے والے کی گواہی قابل قبول نہیں رہتی۔ کیونکہ یہ معاملہ صرف دو انسانوں کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ تمام ماحول اور آئندہ نسل تک بھی اس کے برے اثرات متعدی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس فعل کا کسی حیوان کے ساتھ بھی مرتکب ہو تو اس حیوان کی نقل و حرکت سے چونکہ اس مخرب اخلاق فعل کی یاد تازہ ہوتی ہے اس لیے اس کے بھی

۱۔ کیونست بھی گواہی دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں مگر یہ دعویٰ ان کا صرف زبانی ہے۔ وہ ریاست کے نام سے وہ تمام مظالم جائز سمجھتے ہیں جو ملوک شخصی نام سے جائز سمجھتے رہے ہیں بس مع وہی فتنہ ہے لیکن یا ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی انہوں نے ملوکیت کی نفی میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ نظام عالم کو جس مہذب ملوکیت کی ضرورت تھی اس کی بھی نفی کر ڈالی ہے اور اس طرح اب گویہ وہ ملوکیت تو نہیں رہی جس کے ظلم سے تنگ آ کر دنیا چیخ اٹھی ہے لیکن اس سے بدتر وہ صورت بن گئی ہے کہ جس کے مظالم سے دنیا کے نابود ہو جانے کے خطرات آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے ہیں جو آج نہیں تو کل ضرور آپ کے مشاہدہ میں آ کر رہیں گے اس وقت آپ چیخ چیخ کر کہیں گے کہ رحم اللہ علی النباش الاولیٰ۔ یعنی اس سے تو پہلی ہی ملوکیت غنیمت تھی۔ درحقیقت ملوکیت کا اگر کوئی صحیح تصور ہو سکتا ہے تو وہ صرف خلافت کے لفظ سے ادا ہو سکتا ہے جس کی قدرے تفصیل آپ سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔



معدوم کر دینے کا حکم ہے۔ یہ شدت اسی لیے رکھی گئی ہے کہ اس حیاء سوز حرکت سے حقوق انسانیت کو بھی دھبہ لگتا ہے اور نظام عالم بھی درہم برہم ہوتا ہے۔

مادی دنیا کے نزدیک دولت جمع کرنے کا اصول دولت کی آمد و صرف کا صحیح علم حاصل کرنا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی معاشیات میں بھی اس نقطہ سے غفلت نہیں ہوتی ان کے یہاں بھی مالی مسئلہ صرف ان دو سوالوں ہی کے ماتحت دائر ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت میں سب سے پہلا سوال جو مالیات کے متعلق ہو گا وہ یہی ہو گا ”من این اکتسبه و این انفقه“ یعنی اس کے ذرائع آمدنی اور مواقع صرف بتاؤ۔ مگر مادی دنیا میں اس سوال کی جوابدہی خالق عقل کے سامنے بھی کافی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس لیے ان کے یہاں آمد اور صرف کے ذرائع میں پہلی بحث یہ ہوتی ہے کہ یہ مال حلال ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے یا حرام ذرائع سے اور اسی طرح اس کا صرف بھی کس محل پر ہوا ہے۔

حلال و حرام کا صحیح مفہوم \* حلال و حرام کی تعبیر سے آپ متوحش نہ ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے آمد و صرف میں نظام عالم کی صلاح و بہبودی کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے یا نہیں یعنی کسی انسان پر ظلم تو نہیں کیا گیا، کسی ظلم کے لیے صرف تو نہیں ہوا، جو چیز مال کی تعریف میں نہیں آتی اس کو مال تو نہیں بنالیا گیا۔ اس قسم کے دوسرے مصالح کی رعایت سے شریعت حلال و حرام ہونے کا حکم لگا دیتی ہے اب رہے وہ علوم جو انسان کی خارجی ضروریات سے متعلق ہیں چونکہ ان کا تعلق زندگی کے ارتقاء و انحطاط کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اس لیے وہ خود انسانی عقل کے حوالے کر دیئے گئے ہیں تاکہ وہ حسب ضرورت جتنا چاہے ان کو پھیلا لے۔ یہاں صرف اتنی ہی مداخلت کی گئی ہے کہ ان میں شریعت کے اہم اصول پیش نظر رہنے چاہئیں یعنی نہ حرام طریقے پر وہ حاصل کیے جائیں اور نہ حرام مقصد سے حاصل کیے جائیں وغیرہ وغیرہ۔

علوم نبوت کی دوسری خصوصیت حقیقت کی صحیح ترجمانی ہے \* انبیاء علیہم السلام کے علوم کی دوسری امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ حقیقت کی ترجمانی کے لیے پورے ضامن ہوتے ہیں اسی لیے کسی نبوت میں بھی ان کے اصول قابل ترمیم نہیں ہوتے جس طرح ایک حقیقت ہمیشہ حقیقت رہتی ہے اسی طرح ان کے اصول بھی یکساں رہتے ہیں۔ رہ گئے فروعی تغیرات تو چونکہ وہ انسانی تغیرات کے تابع ہیں اس لیے ان میں ترمیم اور کمی بیشی ہونا ضروری ہے مگر یہ بھی ان ہی اصول کی روشنی میں ہوتی ہے جو روز ازل مقرر ہو چکے ہیں۔ دنیا کے جتنے بھی علوم ہیں وہ کسی جگہ بھی اپنے متعلق حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے، اسی لیے یہاں ہر شخص کو طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے اور ہر نئے دن ایک نئی تحقیق دنیا کے سامنے آ جاتی ہے اور وہ بھی متناقص۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ فلسفہ ارتقاء کا کس زور شور سے نقارہ پیٹا جا رہا تھا، یا فوراً کچھ ہی مدت کے بعد اس کو ایک علمی جرم سمجھا جانے لگا۔ کمیونزم ابھی اپنے شباب کو بھی نہیں پہنچا کہ افراط و تفریط کی کتنی صورتیں بدل چکا ہے اور ابھی اس کا انتظار کیجئے کہ وہ جا کر ٹھہرتا کہاں ہے۔ یا پھر واپس ہو کر ادھر ہی آتا ہے جدھر اسلام نے راہنمائی کی ہے۔

علوم نبوت کی تیسری خصوصیت جزم و قطعیت ہے \* انبیاء علیہم السلام کے علوم کی تیسری امتیازی صفت قطعیت ہے۔ وہ یقین کے اس نقطہ پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اسی صفت کو قرآن کریم میں جا بجا

﴿لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ کہہ کر ادا کیا گیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ عالم غیب مادی عقول کے نزدیک جتنا علم و یقین سے دور ہے انبیاء علیہم السلام کے نزدیک وہ اس سے زیادہ علم و یقین میں ہوتا ہے۔ مثلاً قیامت کا عقیدہ۔ دیکھ لیجئے ہمیشہ سے مادی عقول اس کو قابل مضحکہ سمجھتی رہی ہیں اور اس کے خلاف عقلی دلائل کا زور بھی صرف کرتی رہی ہیں۔ عقلاء کو چھوڑ کر اگر عرب کو دیکھئے وہ ہر بعید سے بعید بات کو مان لیتے تھے مگر یہاں ان کو بھی صاف انکار تھا، مگر تمام عالم کے اس انکار اور خلاف دلائل کی بھرمار کے باوجود کیا کوئی نبی بھی ایسا گزرا ہے جس کو قیامت کے وجود میں ادنیٰ سا بھی شبہ گزرا ہو۔ حتیٰ کہ آخر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دور مبارک آیا تو یہاں پھر جتنے زور کے ساتھ اس کا انکار کیا گیا اتنے ہی زور کے ساتھ اس کا اثبات کیا گیا، اور اس مسلسل اور مدلل انکار سے ادنیٰ شبہ بھی پیدا نہ ہو سکا۔

﴿قُلْ بَلٰی وَ رَبِّیْ لَتَاْتِنَّکُمْ﴾  
اے پیغمبر کہہ دو ہاں مجھ کو اپنے پروردگار کی قسم کہ قیامت تم پر ضرور آ کر رہے گی۔ (السبا: ۳)

دنیا کے کسی علم میں اتنی قطعیت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ محض توہمات اور ظلیات کے دفتر کو قطعیت سمجھ لیا جائے یہ اپنے قصور علم اور قصور فہم کا نتیجہ ہے۔ پھر ان کے یہ سب علوم وہ ہوتے ہیں جن کے حصول کا انسانوں کے ہاتھ میں کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے آپ قرآن کریم میں جا بجا ان کا یہ اعلان پڑھیں گے۔ ﴿اِنِّیْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی میرے جو علوم ہیں سب اللہ کی طرف سے ہیں تم ان کو نہیں جانتے۔ پھر چونکہ ان علوم کی نوعیت ہی کسی اور اصطلاحی علوم سے جداگانہ ہوتی ہے اس لیے جو کسی اور فنی علوم کے خوگر دماغ ہیں وہ ان کے ان علوم کو بھی اسی معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں اور جب وہ انسانی دماغ کے تراشیدہ علوم سے مطابقت نہیں رکھتے اس پر طرح طرح کی نکتہ چیدیاں کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ معقول بات ہمیشہ معقول ہی رہتی ہے اگر وہ علوم درحقیقت معقول ہیں تو اس بناء پر کہ وہ چونکہ موجودہ کتابوں میں کہیں مدون نہیں ملتے، بس اس لیے ان کو تسلیم نہ کرنا کوئی معقول بات نہیں وہاں اگر آپ کے پاس چشم بینا ہو تو آپ ان کو خود اپنے صحیفہ فطرت اور صحائف عالم میں پڑھ بھی سکتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے رشد و ہدایت اور جمیع کمالات کی نوع علیحدہ ہوتی ہے \* ان کے رشد و ہدایت کا معاملہ بھی الفاظ میں کیا ادا کیا جاسکتا ہے۔ بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ جو ان کی صحبت میں ایمان کے ساتھ ایک مرتبہ آ بیٹھا وہ باجماع امت جنید و شبلی سے کہیں بڑھ کر بن کر اٹھ گیا۔ اگر یہ ہستیاں دنیا میں نہ آتیں تو نہ کوئی جنید بنتا نہ شبلی۔ خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جملہ کمالات خواہ وہ ان کی قوت علمیہ کے ہوں یا قوت عملیہ کے سب کی نوع ہی تمام مخلوقات کے کمالات سے علیحدہ ہوتی ہے۔ ان کی صفات کا منبع براہ راست حق تعالیٰ کی صفات کاملہ ہوتی ہیں، خدا تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں مالک الملک، علیم، حکیم، رشید بھی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے مذکورہ بالا کمالات ان اسماء حسنیٰ کے مظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی صفت ملوکیت وہ نہیں ہوتی جو قیصر و کسریٰ کی تاریخوں میں مدون ہے بلکہ خود حاکم حقیقی اور مالک علی الاطلاق کا ظل ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ گو وہ خود حکومت کا دعویٰ نہیں کرتے مگر ان کی نیابت کا احترام ارضی اور سماوی سب طاقتیں کرتی ہیں۔ سمندر و ٹکڑے ہو کر ان کی فوج کو راستہ دے دیتے ہیں اور



آسمان کے فرشتے نمازوں میں اور جنگلوں میں حاضر ہو کر ان کے ساتھ شرکت کرنا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ ان کی حکمت اور ان کا علم بھی وہ نہیں ہوتا جس پر یونان کو یا ڈارون اور ہٹلر کو ناز تھا، بلکہ وہ اس علم بیکراں اور حکمت بے پایاں سے سیراب کیے جاتے ہیں جس کے احاطہ کے لیے اگر دنیا کے اشجار قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی تو بھی ناکافی رہیں۔ ان کی رشد و ہدایت بھی وہ ہوتی ہے کہ اگر کہیں اس کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو تمام جہان میں رشد و ہدایت کی ایک کرن بھی چمکتی نظر نہ آتی۔ اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ کی ان بیان کردہ صفات کا اندازہ صرف اتنا ہی نہیں کرنا چاہیے کہ نبی میں قوتِ علمیہ بھی ہوتی ہے اور عملیہ بھی، بلکہ یہاں تمام مخلوقات میں کسی کو ان کے ساتھ شرکت حاصل نہیں ہوتی اور جو شرکت محسوس ہوتی ہے وہ صرف اسی شرکت ہوتی ہے، ان کی حقیقت میں کوئی شرکت نہیں ہوتی۔ اگر کچھ اجمالاً اشارہ کیا جاسکتا ہے تو صرف اتنا کہ جس طرح نبوت و رسالت کسب سے بالاتر کمال ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے رشد و ہدایت کا معاملہ بھی کسب سے بالاتر ہوتا ہے۔ ع قلم ایخار سید و سر بشکست۔ تفصیل دیکھنی ہو تو مکتوبات امام ربانی کا مطالعہ فرمائیے۔

نبی کی عام صفات کی حقیقت بھی مخلوق کی عام صفات سے علیحدہ ہوتی ہے \* یہاں ایک بات قاعدہ کلیہ کے طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی مذکورہ بالا صفات کے سواء ان کی جتنی اور صفات ہیں ان کی حقیقت بھی عام مخلوق کی صفات سے بالکل جدا گانہ ہوتی ہے۔ مثلاً صداقت، دیانت و امانت، اخلاق کی رفعت، خلق اللہ کے ساتھ ان کی عام ہمدردی اور ان کا عدل و انصاف وغیرہ۔ جب کبھی انبیاء علیہم السلام کے تعارف کے ذیل میں آپ ان صفات کا تذکرہ پڑھتے ہیں تو آپ کا قلب اس کا ضرور اعتراف کر لیتا ہے کہ اپنے اپنے دور میں بے شک و شبہ وہ بلند کردار کے حامل انسان تھے مگر اسی کے ساتھ آپ ہر دور میں ایسے اور انسان بھی تاریخ میں دیکھ لیتے ہیں جن میں یہ صفات موجود ہوتی ہیں مگر وہ نبوت و رسالت کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتے اس لیے آپ اپنے ذہن میں ان صفات اور نبوت و رسالت کے مابین کوئی ایسا ربط نہیں سمجھتے جس کی وجہ سے آپ کسی انسان کو ان صفات کا مالک دیکھ کر کوئی ایسا غیر مدرک بالعقول منصب دے دیں جو مادی عالم میں ممکن الحصول نہ ہو اس لیے آپ اس کو صرف فرط عقیدت اور دنیا کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثمرہ تصور کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو ثابت ہو جائے گا کہ دنیا میں جب کبھی ایسی ہستیوں نے نبوت و رسالت کا دعویٰ کیا ہے تو ہمیشہ عقلاء نے ان کے متعلق ان کے اخلاق، ان کی صفات، ان کی تعلیمات اور متبع جماعت ہی کی تفتیش کی ہے جیسا کہ ہر قل کی حدیث میں عنقریب آپ ملاحظہ فرمائیں گے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان صفات اور اس دعوے کے درمیان عقلی لحاظ سے گو کوئی تلازم نہ ہو مگر خارجی تاریخ کے لحاظ سے کوئی ایسا ربط ضرور ہے جس کے سبب ایسا دعویٰ غور و تامل کا محتاج ہو جاتا ہے اور اگر اس وقت ایسے دعوے کا امکان ہو تو اس کی تصدیق کے لیے شاہانہ عقل بھی مضطر ہو جاتی ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ یہ صفات گو عام انسانوں میں بھی پائی جاسکتی ہیں مگر اس کی وہ خاص نوعیت نہیں ہوتی جو نوعیت کہ انبیاء علیہم السلام کی صفات کی ہوتی ہے مثلاً صدق و امانت عام انسانوں میں بھی موجود ہو سکتی ہے۔ مگر جب آپ انبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے صدق و صفا پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں اگر کوئی والدہ اپنے بچہ کو کچھ دینے کے بہانہ سے بلائے اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز نہ ہو تو یہ بھی ایک جھوٹ شمار ہو جاتا ہے اسی طرح دو شخص اگر باتیں کر رہے ہیں اور باتیں کرتے کرتے

ان میں سے کوئی دفعۃً اپنے دائیں بائیں دیکھ لیتا ہے تو ان کے نزدیک یہ بات بھی امانت میں داخل ہو جاتی ہے اور اس کو اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے سامنے کہنا روا نہیں رہتا۔ جب عام امت کے لیے ان معمولی اوصاف میں ان کا معیار یہ ہو تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس کی نوعیت کیا ہوگی اس کا اندازہ آپ خود فرمالیں یہی وجہ تھی کہ صدق و امانت کی صفت اگرچہ آپ کے زمانہ میں بھی بہت سے شرفاء میں موجود تھے خود ابوسفیان کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ آئندہ لوگ میری نسبت دروغ گوئی کا عیب نقل کرتے رہیں گے تو ہر قل کے سامنے میں آپ کے متعلق ضرور کوئی بات جھوٹی لگا کر رہتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی کذب کی تہمت ناقابل برداشت عیب سمجھا جاتا تھا۔ اب سوچئے کہ ایسے ماحول میں پھر وہ بات کیا تھی جس کی بناء پر لوگوں نے صدوق و امین کا لقب صرف آپ ہی کی ذات گرامی کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اسی طرح تاریخ میں ایک عبد اللہ بن سلام کی نہیں بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جو لوگ آپ کی صفات کا حال سن کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکے مگر جب انہوں نے پچشم خود ان کا نظارہ کر لیا تو پھر ان کا صرف یہی ایک فیصلہ تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ بات یہی تھی کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ آپ کی صفات کے صرف سننے اور پڑھنے والے ان کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے اور مشاہدہ کرنے والے یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ صفات جو عام انسانوں ہی کی ہیں مگر یہاں ان کی نوعیت کچھ علیحدہ نظر آتی ہے۔

ساحرین فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصاء کا حال جب تک سنا ہی سنا تھا اس وقت تک وہ ذرا مرعوب نہ تھے بلکہ خود اپنی رسیاں لے لے کر ان سے مقابلہ کرنے کے لیے آڈٹے تھے مگر جب آپ کر پچشم خود اس کا مشاہدہ کر لیا تو اپنے منہ کے بل جا پڑے اور حق کی اس قاہرانہ طاقت کو دیکھ کر بے ساختہ ایمان لے آئے۔ پس انبیاء علیہم السلام کی ظاہری صفات ہوتی تو وہی ہیں جو عام انسانوں میں ہوتی ہیں مگر ان کی حقیقت اور ان کے مراتب کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا نہ الفاظ میں وہ ادا کی جاسکتی ہے۔

گر مصور صورتے آں دلربا خواہد کشید      لیک حیرانم کہ نازش راچہ ساں خواہد کشید

اسی لیے جب ایک بار حضرت عائشہؓ سے آپ کے اخلاق کے متعلق سوال کیا گیا وہ کیا تھے اور کیسے تھے؟ تو اس کے جواب میں وہ صرف ایک یہ جملہ کہہ کر خاموش ہو گئیں کان خلقہ القرآن۔ آپ کا اخلاق دیکھنا چاہو تو بس یہ قرآن دیکھ لو۔ اگر وہ چاہتیں تو یہاں آپ کے اخلاق حسنہ کا ایک دفتر کھول دیتیں مگر ان کے سامنے اخلاق نبوت کی حقیقت بے حجابانہ جلوہ تما تھی وہ دیکھ رہی تھیں کہ ان کی تفصیل کرنی حیطہ بیان سے باہر ہے اگر اداء کریں تو اس کے لیے الفاظ کہاں سے لائیں اور اگر بیان نہ کریں تو جواب کیا دیں۔ سبحان اللہ آپ کی اس نو سالہ صحبت یافتہ زوجہ مطہرہؓ نے کیا فصاحت و بلاغت سے لبریز جواب دیا جس کو سن کر ایک فہیم انسان کے سامنے آپ کے معجز اخلاق اور ان کی ادائیگی کے لیے الفاظ کی کوتاہی کا پورا پورا فوٹو کھینچ جاتا ہے۔ فرماتی ہیں کان خلقہ القرآن۔ یہ سارا کا سارا قرآن آپ کا اخلاق ہی تو ہے۔ اسی طرح آپ کی تہجد کی رکعات کے متعلق جب ان سے پوچھا گیا۔ ذرا بتائیے وہ کس کیفیت اور کس انداز کی ہوا کرتی تھیں تو یہاں بھی ان کا پورا نقشہ کھینچنے سے وہ اپنے عجز و قصور کا اعتراف کر کے خاموش ہو گئیں۔ یصلی اربعاً فلا تسئل عن حسنہن و طولہن۔ آپ چار چار رکعتیں پڑھتے مگر وہ کتنی لمبی لمبی رکعتیں ہوا کرتی تھیں اور کیسی دلفریب ہوتی تھیں اس کا حال نہ پوچھو بس اتنا ہی سن لو کہ وہ پڑھنے والے تھے اور میں ان کا نظارہ کرنے والی وہ زبان



میرے پاس نہیں کہ جس سے ان کا طول و حسن ادا کر سکوں۔

نہ حسش غایتے دارد نہ سعدی راخن پایاں  
بمیرد تشنہ مستقی و دریا ہچناں باقی  
دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار  
گلچیں بہار تو زد اماں گلہ دارد

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سارا عالم ہی نرالا ہوتا ہے ان کی صورتوں کا بھی ان کی سیرتوں کا بھی۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہاں بھی صرف تاریخ کے چند الفاظ پر ہی فیصلہ کر ڈالیں۔ اور ادھر ذرا توجہ نہیں فرماتے کہ تاریخ اتنا ہی کر سکتی ہے کہ ان کی صفات اور ان کے اخلاق کو صرف الفاظ کا جامہ پہنا کر آپ کے سامنے لے آئے یہ فرض آپ کا ہونا چاہیے کہ خارجی حالات و واقعات سے ان کے مراتب اور ان کی نوعیت کا اندازہ لگائیں مگر ان سے بھی حقیقت کا انکشاف کیا ہو سکتا ہے کیونکہ جب واقعات آپ کے سامنے آئیں گے تو وہ بھی الفاظ کا نقاب ڈال کر آئیں گے اس لیے حقیقت پھر مخفی کی مخفی رہ جائیں گی بس یہی ذرا سی بات تھی جس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک میں آنے والی امت کے ایمان کا رتبہ بہت بلند ہو گیا تھا۔ جمال رسالت کے مشاہدہ کی دولت گو صحابہ کے نصیب میں آ گئی تھی مگر اس وجہ سے ان کو ایمان لانے میں بھی بڑی سہولت بہم پہنچ گئی تھی اس لیے وہ اگر ایمان نہ لاتے تو یہ قابل تعجب ہوتا اور پچھلی امت گو اس نعمت سے محروم رہی لیکن ان نامساعد حالات میں بھی چونکہ وہ ایمان لے آئی اس لیے ان کا ایمان لانا قابل تعجب بن گیا۔ (تفصیل کے لیے ترجمان السنہ جلد دوم کا پہلا باب ملاحظہ فرمائیے)

قرآن کریم اور دیگر معجزات میں ایک خاص امتیاز \* بے موقعہ نہ ہوگا اگر ہم یہاں اتنا اور عرض کر دیں کہ آئندہ امت کے سامنے جس طرح رسول کی ہستی موجود نہیں تھی اگر کہیں ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی خاص معجزہ بھی اپنی اصل صورت پر موجود نہ ہوتا اور وہ بھی صرف تاریخ اور راویوں کے بیان پر رہ جاتا تو نہ معلوم ایمان لانے والوں کی راہ میں کتنے کانٹے اور پیدا ہو جاتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فلق بحر کا معجزہ دکھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بڑھ کر شق قمر کا معجزہ دکھایا مگر یہ دونوں کے دونوں قاہرانہ معجزے صرف ناظرین کے سامنے ہی سامنے ظاہر ہوئے اور ختم ہو گئے آئندہ امت کے سامنے صرف ان کی نقل درنقل باقی رہ گئی گو ان کی صداقت کی ذمہ داری خود قرآن کریم نے اٹھالی اور اپنی واضح اور محکم آیات میں جا بجا اس کا تذکرہ بھی فرمایا مگر کیا کج فطرت انسانوں نے پھر ان مقدس الفاظ کی گردن مروڑ کر نہیں رکھ دی اور کیا آفتاب کی چمکتی ہوئی روشنی اور شب کے چمکتے ہوئے چاند کے یہ دونوں معجزے پھر مخفی کے مخفی نہ رہ گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعہ کی اصل صورت دیکھنے اور صرف اس کے سن لینے یا پڑھ لینے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام کی صفت ملوکیت، علم و حکمت اور رشد و ہدایت کا تو کہنا ہی کیا ہے یہاں ان کے روزمرہ کے اخلاق و عادات کی گہرائی کا بھی اندازہ لگانا مشکل ہے۔ غریب ابن سینا تو یہ کہتا ہے کہ ان کی بیداری کے علوم کی حیثیت منامات کی برابر ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے منامات کی حیثیت بیداری کی وحی کے برابر ہوتی ہے۔ اس کا خیال تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مدرکات کی خارج میں کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی وہ صرف ان کے نفس کے اندرونی خیالات ہوتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ خارج میں درحقیقت کوئی حقیقت ہوتی ہے تو صرف ان کے علوم ہی کی ہوتی ہے۔

قرآن کریم کو دیکھو وہ تم کو بتائے گا کہ مادی عالم سارا کا سارا لہو و لعب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ یہاں جو کچھ نظر آ رہا ہے سب بے حقیقت ہے، حقیقت کا عالم دوسرا ہے اور یہ عالم وہ ہے جس کا علم انبیاء علیہم السلام کو مرحمت ہوتا ہے کتنا تعجب ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے علوم سے عالم خارجی کے گوشہ گوشہ میں جو عظیم الشان انقلابات مشاہدہ میں آچکے ہیں ان کے بعد بھی عقلاء کو یہ کہنے کی جرأت کیسے ہو جاتی ہے کہ ان کو خارجی عالم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ان کے علوم کو خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو بھی عقل مندی اور دانائی کی ہر بات قابل غور ہوتی ہے۔ مگر یہاں تو جتنا گہرائی میں جائیے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جن امور کو انسانی زندگی سے جتنا زیادہ لگاؤ ہوتا ہے وہ اتنا ہی انبیاء علیہم السلام کے لیے زیادہ دلچسپی کا موجب ہوتے ہیں اور جتنا ان کا انسانی زندگی سے تعلق نہیں ہوتا اتنا ہی وہ ان کے نزدیک دلچسپی کے قابل نہیں رہتے۔ اسی لیے افلاک و نجوم کے مباحث ان کے دائرہ علوم سے بالکل خارج ہوتے ہیں بلکہ جن علوم کا تعلق صرف خیالات کے ساتھ وابستہ ہو خواہ وہ کتنے بھی قابل ستائش اور ناز کے لائق شمار ہوں مگر وہ ان کے منصب سے گرے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔ عرب میں شاعری کا جو درجہ تھا سب کو معلوم ہے کیا یہ ممکن نہ تھا کہ قرآن کریم ایک دیوان کی شکل ہی میں نازل ہو جاتا، مگر یہ تو کیا ہوتا وہاں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت ہی کو شاعری سے اتنا بعید رکھا گیا تھا کہ اگر شاذ و نادر طور پر کسی دوسرے شاعر کا شعر کبھی آپ کی زبان مبارک پر آ گیا ہے تو آپ نے قصداً اس کا وزن شعری کسی کلمہ کو مقدم مؤخر کر کے توڑ دیا ہے۔ گویا شعر گوئی تو درکنار شعر خوانی بھی نبوت کے شایان شان نہیں ہوتی پھر دنیا جانتی ہے کہ ظرافت بھی حیات انسانی کا ایک باب ہے جس میں ملوک و سلاطین بھی شریک ہوتے ہیں مگر یہاں ظرافت میں بھی کیا مجال کہ ایک کلمہ زبان سے ایسا نکل جائے جو ہو بہو حقیقت نہ ہو اسی طرح غصہ کی حالت میں ایک ضابطہ سے ضابطہ انسان کی زبان پر بھی ایسے کلمات آ جاتے ہیں جو صرف حالت غضب کا مظہر ہونے کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ مگر یہاں حالت غضب کا عالم بھی یہ ہے کہ جو بات اس حالت میں آپ کی زبان مبارک سے نکلتی ہے وہ بھی اتنی ہی اہمیت سے قابل ضبط و کتابت ہوتی ہے جیسا کہ عام حالات کی۔ پس جن شخصیتوں کی ظرافت اور غصہ کے کلمات بھی حقیقت سے سرمو تجاوز نہ کرتے ہوں ان کے علوم کو منامات کے برابر سمجھنا کتنا ظلم عظیم ہے اسی طرح جن کے نظام زندگی کا خارجی عالم سے اتنا گہرا تعلق ہو اور عالم حقیقت کے فوز و فلاح کا اسی پر دار و مدار ہو ان کے متعلق یہ خیال قائم کر لینا کہ خارجی عالم سے ان کو کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا کتنی بے بنیاد بدظنی ہے۔

امید ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے اس بیان سے آپ نے نبوت کے کمالات کا کچھ اندازہ کر لیا ہوگا اور اسی طرح اس کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کی شخصیتوں کا بھی آپ کو کچھ نہ کچھ تعارف حاصل ہو گیا ہوگا، لیکن چونکہ اس کو پورے طور پر سمجھنا علم و دقت فہم کا محتاج ہے اس لیے ہم یہاں آپ کے سامنے دوسرا وہ طریقہ بھی پیش کیے دیتے ہیں جو نہایت سادہ اور صاف ہے اور اس کا سمجھنا زیادہ غور و فکر کا محتاج بھی نہیں ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کی نظر میں انبیاء علیہم السلام کی معرفت کا طریقہ بھی دوسرے انواع انسانی کی طرح ان کے امتیازات و خواص ہیں \* حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی شناخت کا طریقہ وہی ہے جو دوسرے انواع انسانی کی شناخت کا ہوتا ہے دنیا میں اس مقدس نوع کے افراد بھی اسی طرح کثرت سے آتے رہے ہیں جس طرح کہ اطباء، شعراء،



ساحرین، مجنون اور کاہنوں کے۔ ان میں سے ہر ہر نوع کے ہر زمانہ میں کچھ ایسے خواص و امتیازات بھی صفحات تاریخ میں مدون ہوتے چلے آئے ہیں جن سے کہ وہ نوع کسی دور میں خالی نہیں رہی اس لیے بعد کی نسلوں نے ان کی ان ہی خصوصیات سے ان کو کسی تکلیف و تکلف کے بغیر پہچان لیا ہے۔ مثلاً جن اطراف میں طبیب پیدا ہوتے رہے ہیں یا کم از کم طبیبوں کی تاریخ سے ان کو پوری آگاہی حاصل ہوئی ہے ان کو اپنے دور کے کسی طبیب کی شناخت میں کبھی کوئی لاینحل دشواری پیش نہیں آئی۔ اسی طرح سحر و کھانت بھی مدت سے دنیا کی جانی پہچانی باتیں ہیں اس لیے یہاں بھی ساحر و کاہن کا حکم لگانے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی اور اگر بالفرض کچھ دشواری ہوتی بھی ہے تو اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک حالات کا صحیح علم نہیں ہوتا۔ پاگل اور مجنون اور صفر اوی بیماریوں کا حال اس سے بھی زیادہ روشن ہے کیونکہ اس نوع کا وجود پہلی انواع سے بھی زیادہ عام ہے اس لیے ان کی خصوصیات بھی ان سے زیادہ روشن ہیں۔ اس لیے عام آدمی بھی مجنون اور غیر مجنون میں فرق کر لیتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا گروہ بھی آفرینش عالم سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ہوتا چلا آیا ہے۔ ان کی بھی ایک تاریخ زندگی اور اس کی خصوصیات معلوم ہیں۔ لہذا جس طرح انسانوں کی دوسری انواع اپنی اپنی خصوصیات سے باسانی معلوم ہو سکتی ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی نوع کا معلوم کرنا بھی ذرا دشوار نہیں ہے۔ یہاں دشواری اگر ہے تو صرف اس کے لیے ہے جس کو اس نوع کی تاریخ ہی کا صحیح علم نہیں یا اس کا صحیح مطالعہ نہیں تو پھر ایک ان ہی پر کیا انحصار ہے طبیب اور ڈاکٹروں سے ناواقف کے لیے ان کی شناخت بھی اتنی ہی دشوار ہے۔ اب یہ بات بھی حل ہو گئی کہ یہ بدیہی مسئلہ آخر فارابی و ابن سیناء جیسے عقلاء کو حل کیوں نہیں ہوا اور آج بھی وہ کیوں لاینحل بنا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کو چونکہ انبیاء علیہم السلام کے صحیح حالات نہیں پہنچے اور جن کو پہنچے انہوں نے غور کے ساتھ ان کا مطالعہ نہیں کیا اس لیے لازمی طور پر ان کو یہاں صرف انکل کے تیر ہی چلانے پڑے جیسا کہ ابن سینا نے صاف ہی کہہ دیا ہے کہ نبوت کی یہ تحقیق ہم نے اس وقت لکھی جب کہ ہم کو ایک جماعت کے کچھ حالات پہنچے تو ہم نے چاہا کہ دوسری اشیاء کی طرح اس کے بھی کچھ اسباب لکھ دیں۔

اس جگہ آپ کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ نبوت اور معجزات و وحی یہ سب اشیاء دین کے اہم مبادیات میں داخل ہیں۔ جب تک پہلے یہی مفہوم و معقول نہ ہو جائیں اس وقت تک دین کے آئندہ مسائل بھلا کیسے قابل تسلیم ہو سکتے ہیں اور جب ان مبادی کی حقیقتوں کے سمجھنے سے ارسطو اور فارابی اور ہمارے موجودہ دور کے عقلاء بھی عاجز ہو تو ایسے امور کو دین کی مبادیات میں کیسے شمار کیا جاسکتا ہے؟

نبوت و رسالت کی حقیقت دریافت کرنی گو مشکل ہے مگر نبی کی معرفت بدیہی ہے \* یہ اہم سوال درحقیقت ایک ذرا باہمکنہ فروگزاشت کر دینے سے پیدا ہوتا ہے اگر آپ اس پر غور کر لیں کہ بہت سی اشیاء بدیہی ہوتی ہیں، لیکن جب بحث ان کی حقیقت معلوم کرنے میں آتی ہے تو وہی ہر نظری سے بڑھ کر نظری بن جاتی ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوگا، بے شک نبوت، معجزہ اور وحی کی حقیقت معلوم کرنی صرف عقلاء غیر مسلمین کے لیے ہی دشوار نہیں خود اہل اسلام کے لیے بھی لاینحل مسئلہ ہے، چنانچہ آج تک کتب کلام وغیرہ میں اس کی حقیقت کی تنقیح میں مختلف اقوال موجود نظر آتے ہیں لیکن اس وقت کے باوجود پھر خود نبی، وحی اور معجزہ کی معرفت اتنی بدیہی ہے کہ اس سے بڑھ کر شاید کوئی بات بدیہی نہ ہو اہل کتاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور

آپ کو اس طرح پہچان لیا جیسے باپ اپنے بیٹے کو پہچان لیتا ہے عرب کے امی ایک دو نہیں ہزاروں ہزار کی تعداد میں آپ کی خدمت میں آئے بہتوں نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی آپ کے نبی برحق ہونے کا یقین کا لیا اور بہتوں نے کسی معجزہ کو دیکھا اور اس معجزہ کو بھی بدابہت سمجھا اور پھر کسی وقت کے بغیر آپ کی نبوت پر بھی یقین کر لیا۔ اس کے بعد کسی کو آپ کے فیض صحبت سے کوئی خاص حصہ مل گیا وہ رموزِ وحی سے یہاں تک آشنا ہو گیا کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو وہ فوراً پہچان لیتا کہ اب آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے اور اس سے زیادہ اگر کسی کو اور قرب نصیب ہو گیا تو نزولِ وحی کے وقت اس کے قلب پر وحی کا کبھی اتنا انعکاس بھی ہو گیا کہ وحی کے ظاہری شکل میں آنے سے قبل ہی اس کا کوئی کلمہ اس کی زبان پر جاری ہو گیا۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ عناصرِ ربوہ یعنی پانی، آگ، ہوا اور خاک یہ ان بدیہیات میں داخل ہیں جن کے سمجھنے اور شناخت کرنے میں کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا سا بچہ بھی پیاسا ہوتا ہے تو پانی کہہ کر اپنی ماں سے مانگ لیتا ہے اور اپنی تشنگی دور کر لیتا ہے۔ لیکن اگر اسی پانی کی حقیقت اس سے دریافت کی جائے تو وہی بچہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب کالج سے باہر نکلتا ہے تو بھی اس کی پوری تشریح سے قاصر نظر آتا ہے۔ یہی حال ہوا کا ہے وہ پانی سے کہیں لطیف عنصر ہے اتنا لطیف کہ آنکھوں سے اس کا ادراک بھی نہیں ہو سکتا، لیکن اس کا بھی ایک بچہ ادراک کر لیتا ہے اور گرمی کے وقت پنکھا ہاتھ میں لے کر ہوا حاصل کر لیتا ہے لیکن کیا وہ اس کی حقیقت بتا سکتا ہے۔

یہ حال تو ان بدیہی محسوسات میں ہے آپ اگر اس سے ذرا قدم آگے بڑھا کر عقلیات میں قدم رکھیے تو یہاں ان کی حقیقت کے ادراک میں آپ کو اور تاریکی درتاریکی نظر آئے گی۔ اسی لیے عقلاء قدیم نے عاجز آ کر یہ بطور قاعدہ مسلمہ لکھ دیا کہ ان التحدید الحقیقی عسیر جداً۔ یعنی کسی چیز کی حقیقت کا صحیح صحیح پتہ دینا یہ بہت مشکل ہے آپ اس فیصلہ کو تسلیم کریں یا نہ کریں مگر بہر حال ہے یہ بھی ایک عقلاء کی جماعت ہی کا فیصلہ یہی وجہ تھی کہ کسی نبی نے ان اشیاء کی نہ تو حقیقت بیان کرنے کی طرف خود کوئی خاص توجہ کی اور نہ اس کا بوجھ ہماری ضعیف عقول پر ڈالا ہے اور نہ کبھی ان پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور صرف بدیہی معجزات دکھا کر اپنے نبی ہونے کی بدیہی شناخت کرائی ہے اس کے بعد وحی کے آبِ زلال سے تشنگانِ راہ خدا کی پیاس بجھائی ہے۔ پس نبوت اور معجزہ کی حقیقت کی پہچان خواہ کتنی ہی دقیق ہو لیکن خود نبی اور معجزہ کی شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہے اور یہی شناخت دین کی بنیاد ہے۔ حقیقت کے ادراک کی بحث کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نبوت تو درکنار ولایت والہام جو اس کے تحت کی اشیاء ہیں ان کی حقیقتوں کا ادراک بھی ناممکن ہے جب تک کہ خود اس شخص کو مقام ولایت حاصل نہ ہو۔ اسی وجہ سے مشہور ہے کہ ولی را ولی می شناسد۔ اگر اس ضرب المثل مقولہ پر بھی آپ ذرا گہری نظر ڈالیں گے تو یہ بھی آپ کو محلِ تامل نظر آئے گا اور واقعات شہادت دیں گے کہ یہ مقولہ بھی اطلاق کے ساتھ قابل تسلیم نہیں ہے بسا اوقات ایک ولی کو بھی دوسرے ولی کی ولایت کا پورا ادراک نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ نفس ولایت کے بارے میں خود اولیاء کرام میں بڑا اختلاف موجود ہے۔ پھر نبوت کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں:

اس لیے رسول کے مقام میں رسول ہی کو اور انبیاء علیہم السلام

کے مقام میں صرف نبی ہی کو گفتگو کرنا مناسب ہے۔ انبیاء علیہم

فلا ينبغي ان يتكلم في مقام الرسول الا

رسول ولا في مقام الانبياء الا انبي ولا ذوق



لنا فی مقام الانبیاء حتی تتکلم علیہ۔ السلام کے مقامات ہی سے جب ہم آشنا نہیں تو ان سے بحث (الیواقیت ج ۲ ص ۴۷ و ۷۲) کیا کر سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قدرت نے جس امر کا مخلوق کو مکلف بنایا ہے اس کو ہمیشہ آسان سے آسان تر رکھا ہے اور جس حقیقت کا پورا ادراک نہیں ہو سکتا اس کا ہم کو مکلف بھی نہیں بنایا۔ یہ شیطان کا ایک گہرا فریب ہے کہ جب وہ کسی کو راہِ حق سے روکنا چاہتا ہے تو مقاصد سے ہٹا کر ہمیشہ ایک عبث مشغلہ میں الجھا دیتا ہے اور ایسا الجھاتا ہے کہ انسان اسی میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور مقاصد تک اس کو رسائی کی نوبت ہی نہیں آتی۔ والعیاذ باللہ۔ اس لیے ہم یہاں ان مباحث میں پڑنے کی بجائے خود انبیاء علیہم السلام کے تعارف اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

## انبیاء علیہم السلام جب کبھی دنیا میں تشریف لائے ہیں تو اپنے کامل تعارف کے ساتھ آئے ہیں

یہ واضح رہنا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں جب کبھی دنیا میں ظاہر ہوئی ہیں تو اپنے پورے تعارف کے ساتھ ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ اچانک دنیا کے سامنے یونہی نہیں آ گئیں بلکہ پہلے سے ان کی ذات کا تعارف ان کے مقام کا تعارف اور ان کی خدمات کا تعارف بھی کر دیا جاتا رہا ہے حتیٰ کہ ان کی آمد سے قبل ایک طبقہ کو جو اس تعارف سے آشنا ہوتا ہے ان کی آمد کا اس طرح انتظار ہونے لگتا ہے جیسا کسی متعارف اولوالعزم شخصیت کی آمد کا انتظار ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر اس وقت ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تاریخ اور معتبر احادیث اس کی شاہد ہیں اور کتب سابقہ بھی اس کی گواہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل آپ کے ظہور کی علامات آپ کا آبائی وطن اور آپ کی ہجرت کا مقام بلکہ اس کا نقشہ آپ کا اسم مبارک اور مکمل حلیہ شریف حتیٰ کہ آپ کے خاص اصحاب اور ان کے ساتھ عام امت کی صفات بھی اس تفصیل سے بیان میں آ چکی تھیں کہ آپ کے ظہور سے قبل عام محفلوں میں بھی آپ کا تذکرہ آنے لگا تھا دشمنوں کے مقابلہ میں آپ کے وسیلہ سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ قیس اور رہبان آپ کی تلاش میں چشم براہ تھے اور سلمان فارسی جیسے عشاق گھر بار چھوڑ کر آپ کی جستجو میں صحراء، صحراء، خاک چھانتے پھرتے تھے۔ جس طرح دن نکلتا ہے اور اس کے اجالے سے قبل روشنی کے آثار افق عالم پر چمکنے لگتے ہیں شب کی تاریکی آتی ہے اور اس کے چھانے سے پہلے افق کا اجالا مدھم پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی دستور کے مطابق اس آفتابِ ہدایت کے طلوع سے پہلے بھی آسمان کے افق اور زمین کے اطراف میں طرح طرح کے عجائبات کا ظہور ہونا لازمی امر تھا جن کے سبب سے بے علم انسانوں میں بھی کچھ شعور پیدا ہونے لگا تھا اور خفتہ طبیعتیں بیدار ہونے لگی تھیں۔ حتیٰ کہ ذی شعور انسانوں اور جنات سے گزر کر بے شعور مخلوق حجر و شجر بھی اس عظیم الشان انقلاب انگیز ہستی کی آمد آمد کے اثرات سے متاثر ہونے لگے تھے اور اس طرح ایک غیر معمولی واقعہ کے انتظار میں عالم کی آنکھیں لگ گئی تھیں۔ دوسری طرف حاسدین کی جماعت تھی جو جزم و یقین میں تو اس طبقہ کی شریک تھی لیکن اس مبشر نبی کی آمد سے قبل ہی اس کا سینہ عداوت سے بھڑک رہا تھا اس نے بھی اپنی فرط عداوت سے چاروں طرف آدمی دوڑا دیے تھے۔ خدا ہی جانے کہ آپ کی آمد سے قبل آپ کا یہ تعارف کس درجہ کا

تعارف ہوگا کہ کھوج لگانے والوں نے ٹھیک اس راستہ اور مقام کا بھی کھوج لگا لیا تھا جس راستہ سے آپ سفر کر رہے تھے۔ اس سے بڑھ کر بعض روایات سے یہاں تک بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ملوک و سلاطین کے پاس تو آپ کی اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی شکل و شمائل کی تفصیلات سن کر ہی ہو بہو تصاویر بھی تیار کر لی گئی تھیں۔ یہاں اگر اس بیان کی جزئیات سے کسی معاند کو اختلاف ہو تو ہو مگر اس حقیقت سے ایک دشمن سے دشمن معاند کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ کی آمد سے قبل اہل علم طبقہ کو ایک نبی آمد کا حد درجہ انتظار تھا۔ ہم اس کو ایک تاریخی حقیقت سمجھتے ہوئے اور زیادہ طول دینا نہیں چاہتے، کیونکہ اس وقت ہمارا موضوع صرف یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق صرف دماغی فلسفیانہ مباحث سے ہٹا کر آپ کو واقعات کی اس دنیا میں لے آئیں جہاں ان کی شخصیات کا سابق تعارف ان کی معرفت کے لیے دماغ سوزی سے مستغنی کر دیتا ہے۔ یہاں ان نا منصف اور جاہل قوموں کا تذکرہ کرنا بالکل عبث ہے جنہوں نے اتنے تعارف کے بعد بھی ان کو نہیں پہچانا یا اگر پہچانا تو محض ضد کی راہ سے ان کی بات نہیں مانی۔ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام نے دنیا میں آ کر جس سادہ اور واضح انداز سے اپنا تعارف امتوں کے سامنے رکھا ہے آپ اس کو خالی الذہن ہو کر مطالعہ کر لیجئے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کے بعد عدل و انصاف کی دنیا میں کسی شک و تردد کا محل ہی باقی نہیں رہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل کی حالت تو خود قرآن کریم ہی میں موجود ہے اور ملوک و سلاطین کے بیانات سے کچھ ان اوراق میں بھی آپ کے سامنے عنقریب آنے والی ہے۔ ارشاد ہے: وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا - یعنی ان اہل کتاب کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل تو یہ لوگ کافروں کے مقابلہ میں آپ کے توسل سے دعائیں مانگا کرتے تھے اور جب آپ تشریف لے آئے تو اب انکار کرنے لگے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو اس کو پیش نظر رکھ کر اب خود یہ فیصلہ کر لیجئے کہ سطح عالم پر اس منظم سلسلہ کے ظہور کی حقیقت کیا صرف اتنی ہی ہونی چاہیے جتنی کہ فارابی اور ابن سیناء نے سمجھی یا جیسا کہ آج ہمارے فلسفیانہ دماغ اس کو سمجھ رہے ہیں؟

مشرکین عرب نے آپ کو ساحر و مجنون کیوں ٹھہرایا؟ \* مشرکین عرب اور جو اس زریں تاریخ سے جاہل تھے انہوں نے ازراہ جہالت کبھی تو انبیاء علیہم السلام کو بے علم و نا فہم سمجھ کر مجنون قرار دے دیا اور کبھی ان کے علوم کی تاثیر دیکھی تو زیادہ سے زیادہ ان کو ساحر کہا، مگر جس طرف ان کا دماغ نہ چل سکا وہ یہی ایک بات تھی کہ آپ خدا تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّ رَسُولَكُمْ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ﴾ (الشعراء: ۲۷) تمہارا یہ رسول جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے یقیناً مجنون ہے۔

﴿إِنَّ هَذَا السَّاحِرُ عَلِيمٌ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسُحْرِهِ﴾ (الشعراء: ۳۴-۳۵) یہ بہت علم والا جادوگر ہے اس کی نیت یہ ہے کہ تم لوگوں کو اپنے جادو کے زور سے اپنے ملک سے نکال دے۔

دیکھئے پہلی آیت میں خدا کے سچے رسول کو بے علم سمجھا تو دیوانہ قرار دیا، اور دوسری آیت میں اگر اس کے علم سے مرعوب ہوئے تو اس کو جادوگر کا لقب دیا۔ گو عناد اور جہالت کی باتوں کے اسباب بیان کرنے کی کوئی ضرورت تو نہیں ہے تاہم رسولوں کے مجنون کہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جن باتوں کو کفار سود مند سمجھا کرتے تھے خدا تعالیٰ کے رسول آ کر ان کو مضرت رساں کہتے اور جن



کو وہ مضرت رساں سمجھا کرتے تھے وہ آ کر ان کو سود مند بتاتے۔ چونکہ دیوانہ بھی نفع و نقصان میں امتیاز نہیں کرتا اس لیے یہ احمق جماعت اپنے زعم باطل میں برعکس رسولوں ہی کو دیوانہ قرار دیتی تھی، پھر جب کبھی قرآن کریم پر نظر کرتے تو اس کو نظم و نثر کے درمیان ایک تیسری نوع کا کلام دیکھتے تھے جس سے وہ اب تک آشنا نہ تھے اس لیے کبھی تو مبہوت ہو کر اس کو شعر قرار دیتے اور کبھی کانہوں کے کلام سے تشبیہ دیتے تھے۔ قرآن کریم نے ان تمام طبقوں کو اسی کی دعوت دی ہے کہ وہ ان طبقات کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات سے آپ کو جانچ لیں۔

سب سے پہلے خود نبی کی ذات پر نظر ڈالیں وہ سب میں معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اس کے اخلاق اس کی سلامت فطرت اور اس کی اولوالعزمی ضرب المثل ہوتی ہے۔ اس کی صداقت اس کی دیانت و امانت اور اس کی خدا ترسی پر کسی کو حرف رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی وہ عدل و انصاف اور غم خواری و ہمدردی میں خدا کے بندوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا، کبر و نخوت طمع و لالچ کا کہیں اس کے کوچہ میں بھی گزر نہیں ہوتا اور اس قسم کے جملہ اوصاف اس کی حیات میں اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے دور طفولیت ہی سے ان میں گویا ایک علیحدہ ممتاز انسان نظر آتا ہے۔ اس کی زندگی میں سب سے نمایاں عنصر اس کی راست بازی اور دیانت ہوتی ہے وہ راست بازی اور اور دیانت جس کا دشمن بھی اعتراف رکھتے ہیں اور عین عداوت کی حالت میں بھی اس میں ذرا لب کشائی کی مجال نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں جذبات امنڈتے ہیں کہ کسی حیلہ سے اگر وہ اس پر تہمت لگا سکتے ہیں تو لگا دیں۔ مگر پھر اس کی جرأت اس لیے نہیں کر سکتے کہ اس کی دیانت و امانت کو ایک بدیہی مسئلہ دیکھتے ہیں۔ اس کا ایک راز یہ بھی ہے کہ جو ”نبی اللہ“ ہوتا ہے اس کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے: **وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا**۔ نبوت کے صدق و صفا کا بلند مقام \* اس لیے جس نبی کا دعویٰ یہ ہو کہ اس کو اللہ تعالیٰ غیب کی خبریں دیتا ہے اس میں بھی صدق و صفا کا اتنا ظہور ہونا چاہیے کہ وہ اس صفت میں بھی تمام کلاموں میں ممتاز نظر آئے۔ یہاں اس کی کوئی تفریق نہیں ہوتی کہ وہ خبریں کس نوعیت کی ہیں معمولی معاملات کے متعلق ہیں یا غیر معمولی، قریبی دور سے متعلق ہیں یا بعید زمانہ سے، دوستوں کے متعلق ہیں یا دشمنوں کے وہ اس عالم کے حوادث سے تعلق رکھتی ہیں یا عالم غیب کے عجائبات سے یہاں بلا تفریق دو باتیں ان سب میں یکساں نمایاں نظر آتی ہیں ایک تو صدق و صفا، دوم جزم و یقین واقعات اور اسباب کا رخ خواہ کسی جانب کیوں نظر نہ آئے مگر نہ تو ان خبروں میں اس کو ادنیٰ سے کذب کا احتمال ہوتا ہے اور نہ اس کے جزم و یقین میں ذرا سا تذبذب پیدا ہوتا ہے۔ ایک جنگ کا واقعہ ہے کہ آپ کا ایک جانباز صحابی اس بے جگری سے جنگ کرتا نظر آیا کہ دوسرے صحابہ کو بھی اس پر غبطہ ہونے لگا، مگر جب آپ کے سامنے اس کا تذکرہ آیا تو آپ نے فرمایا ”وہ تو دوزخی ہے“ دیکھئے واقعات کیا ہیں اور رسول اعظم کی خبر اس کے متعلق کتنی برخلاف ہے۔ لیکن کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ ایک شخص آ کر شہادت دیتا ہے۔ یا رسول اللہ جو خبر آپ نے دی تھی وہ موبہو سچی نکلی۔ اس شخص نے زخمی ہو کر خودکشی کر لی۔ (دیکھو ترجمان السنہ)

جنگ حنین کے واقعہ پر نظر کیجئے جہاں دشمنوں کے شدید حملوں سے تھوڑی دیر کے لیے تو صحابہ کی صفیں بھی پھٹ گئی تھیں اور میدان کا رخ کچھ دوسری طرف نظر آنے لگا تھا حتیٰ کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب صرف چند افراد ہی باقی رہ

گئے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ جنگ جتنی خطرناک ہوتی جاتی تھی۔ خدا تعالیٰ کے رسول کا پائے ثبات اتنا ہی اور مضبوط ہوتا جاتا تھا۔ ابو سفیانؓ کوشش کر رہے تھے کہ اس خطرناک حالت میں آپؐ کی سواری کا ایک قدم دشمن کی جانب بڑھنے نہ پائے، مگر دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا رخ دونوں دشمن ہی کی جانب کیے جا رہے ہیں حتیٰ کہ جب بہادروں کی آنکھوں کے سامنے بھی صرف موت کا نقشہ تھا، ادھر دیکھتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خچر سے نیچے اترے کھڑے ہیں اور بڑے جزم و یقین کے ساتھ یہ کلمات زبان پر رواں ہیں:

انا النبی لا کذب      انا ابن عبدالمطلب

میں سچا نبی ہوں جھوٹا نہیں      اور میں ہوں وہی عبدالمطلب کا بیٹا

انبیاء علیہم السلام کی صداقت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر یہاں تمام زندگی کی خبروں میں ایک بھی خلاف نکل آئے تو سارا کارخانہ نبوت ہی درہم برہم ہو جائے کیونکہ ان کو خبر دینے والا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور اس کی خبر میں ذرہ برابر بھی کذب کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات آج بھی دوست و دشمن سب کے سامنے کھلی پڑی ہے کیا اس قسم کا کوئی ایک واقعہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے جہاں دشمنوں نے بھی آپ کے متعلق ادنیٰ سی کذب بیانی کا کوئی حرف رکھا ہو، یہاں فیصلہ اکثری حالات پر نہیں ہوتا بلکہ یہاں ساری عمر کی صداقت ایک غلط بیانی سے ختم ہو جاتی ہے۔ پھر جب اس کی خبروں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ان کی نوعیت بھی عام خبروں سے بالکل جدا گانہ ہوتی ہے ان میں مختلف انواع، مختلف ادوار اور مختلف طبقات و بلاد کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی سب ہی قسم کی خبریں ہوتی ہیں مگر کیا مجال کہ کسی میں ذرا سا بھی خلاف ثابت ہو جائے۔ اس کے صدق و صفا کی یہ حالت اس کی نبوت کے بعد کے زمانہ سے مخصوص نہیں ہوتی بلکہ اس کی پہلی زندگی بھی اتنی ہی صاف ستھری ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر قل شاہ روم نے اس معاملہ میں آپ کی پہلی زندگی کا حال دریافت کیا، اور جب اس کو اطمینان بخش جواب مل گیا تو وہ یہ معقول بات کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ انسان جو دوسرے انسانوں کے معاملات میں کبھی جھوٹ نہ بولے وہ خدا تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ باندھنے کے لیے تیار ہو جائے۔“ یہاں ابوسفیان اپنے دورِ جاہلیت میں بڑے پیچ و تاپ کھاتا ہے مگر اس کا سر نیچا ہے اور وہ ایک حرف بھی اس کے خلاف بولنے پر قادر نہیں ہے۔

قرآن کریم کا مشرکین کے مقابلہ میں اعلان کہ آپ ہرگز کاہن نہیں \* بھلا اس مقدس جماعت کو کاہنوں یا شاعروں کے گروہ سے کیا نسبت ہو سکتی ہے لیکن چونکہ اس وقت عرب میں کثرت سے کاہن موجود تھے جو غیب کی خبریں بیان کیا کرتے تھے اس لیے عرب کو یہ تہمت لگانے کا موقع مل گیا تھا کہ آپ بھی ان ہی کی طرح ایک کاہن ہیں، مگر یہاں قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ تم کہتے ہو آپ کاہن ہیں۔ اچھا تو دونوں کے خصائص تمہارے سامنے ہیں، جماعتی خصوصیات ہی سے افراد کی شناخت کی جاتی ہے۔ اس معیار پر آپ کو بھی پرکھ کر دیکھ لو۔ تم جانتے ہو کہ کاہنوں کی خبریں اگر دو سچی نکلتی ہیں تو دس جھوٹی، پھر بھی بالکل ادھوری اور نامتتام ہوتی ہیں اور اگر خود ان کی ذات کی طرف نظر کرو تو عام طور پر جھوٹے فریبی اور لالچی اس کا راز یہ ہے کہ کاہن کو غیب کی خبریں دینے والا شیطان ہوتا ہے اور شیطان چونکہ خود کذب و زور اور فسق و فجور کا مجسمہ ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی وحی کے



لیے بھی ایسی ہی جماعت کا انتخاب کرتا ہے جو اسی کی مذاق کی ہوتی ہیں مشہور ہے: کندہم جنس باہم جنس پرواز ☆ کبوتر با کبوتر باز با باز خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور بہتان طرازی کر کر کے عالم میں شر و فساد کی بنیادیں قائم کرنا ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيْطَانُ تَنَزَّلُ  
عَلَىٰ كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيمٍ. (۲۲۱-۲۲۲)

ہے۔ ان کے پاس آتا ہے جو سخت بہتان طراز اور سخت گنہگار ہوں۔  
حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ”ابن صیاد“ نامی شخص کے حالات سن کر اس کی تحقیق حال کے لیے تشریف لے گئے اس وقت آپ نے اپنے دل میں یہ آیت سوچ کر اس سے پوچھا ”بتا میرے دل میں کیا ہے؟“ ﴿يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ (الدخان: ۱۰) تو جیسا نا تمام خبریں دینا کا ہنوں کا خاصہ ہوتا ہے اس نے بھی کہا آپ کے دل میں کچھ دغ دغ کا لفظ سامعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا یہ نا تمام جواب سن کر آپ نے فوراً اس کے کاہن ہونے کا فیصلہ فرما دیا اور کہا۔ احسأ فلن تعدو قدرک انما انت من اخوان الکھان۔ جا دور ہو جا تو اپنی اوقات سے آگے نہیں بڑھ سکتا تو تو ٹھیک ٹھیک کاہنوں کی جماعت میں سے ہے اور بس۔ جس طرح کاہنوں کی ذات اپنے قبیح اوصاف میں ممتاز اور علیحدہ ہوتی ہے اسی طرح ان کے کلام کی نوعیت بھی رسولوں کے کلام سے علیحدہ اور جدا ہوتی ہے۔ وہ بہ تکلف اپنے کلام میں جمع بندیاں کرتے ہیں اور یہاں ان کو حق و باطل سے کوئی بحث نہیں ہوتی چنانچہ آپ کے زمانہ میں ایک شخص حمل بن مالک نے آپ کے ایک فیصلہ پر جو آپ نے ایک عورت کے حمل ضائع کر دینے پر مجرم کے متعلق صادر فرمایا تھا یہ کلمات کہے: اُبودی من لا شرب و لا اکل و لا نطق و لا استھل فمثل ذلک یطل۔ یعنی بھلا ایسے حمل ضائع کرنے کی دیت بھی کہیں لازم ہوا کرتی ہے جس نے اب تک نہ کھایا ہو نہ پیا ہو بلکہ آواز تک بھی نہ نکالی ہو وہ تو قابل معافی ہونا چاہیے یہ سن کر آپ نے فرمایا انما انت من اخوان الکھان۔ تو تو کاہنوں کی طرح فقرہ باز شخص معلوم ہوتا ہے۔ اس مجمع کلام کی مناسبت ہی سے قرآن کریم نے کاہن اور شاعر کو ایک سیاق میں جمع فرما دیا ہے۔

انہ لقول رسول کریم و ما هو بقول شاعر  
قلیلاً ما تؤمنون۔ و لا بقول کاہن قلیلاً ما  
تذکرون۔ تَنَزَّلُ مِنَ رَبِّ الْعَلَمِينَ. (الحاقہ: ۴۰-۴۳)

قرآن کریم کا اعلان کہ آپ شاعر بھی نہیں \* غرض جب آپ کی صفات اور آپ کے کلام کی صفات دونوں کاہنوں کی جماعت سے جدا جدا ہیں تو پھر آپ پر کاہن کا شبہ کرنا کیسے درست ہے۔ تم کہتے ہو آپ شاعر ہیں۔ اچھا شاعروں کو بھی تم خوب جانتے پہچانتے ہو ان کی اور آپ کی خصوصیات کا موازنہ کر لو تم کو خود معلوم ہو جائے گا یہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ارشاد ہے:

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشُّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ. (یسین: ۶۹)

ہم نے نہ شعر گوئی آپ کو سکھائی نہ یہ شان نبوت کے مناسب تھی  
شاعروں کی بات مانتے ہیں بے راہ چلنے والے۔

وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ. (الشعراء: ۲۲۴)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہروادی میں سرمارتے پھرتے ہیں  
اور کہتے ہیں ایسی باتیں جو کرتے نہیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ وَأَنَّهُمْ

يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ. (الشعراء: ۲۲۵)

یعنی اس رسول امی کو جو کچھ سکھایا یا پڑھایا ہے ہم ہی نے سکھایا پڑھایا ہے۔ پس پہلی بات تو یہ ہے کہ جو اس کا معلم ہے وہی خود اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہم نے شعر گوئی کی اس کو تعلیم نہیں دی تو پھر یہ شاعر ہو کیسے سکتے ہیں اور جو بات انسان کو سکھائی نہیں جاتی اگر وہ اس کو نہیں جانتا تو یہ اس کا کوئی عیب بھی نہیں اور یہاں تو برعکس اس علم کی تعلیم ہی ان کے حق میں عیب ہے، کیونکہ منصب نبوت شاعری سے کہیں بلند تر ہوتا ہے۔ شاعروں کو دیکھو تو ان کے پیچھے لگنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو صحیح اور پر از حقیقت باتوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ شاعر محض مبالغہ آمیزی، خیال بندی اور بے حقیقت باتوں کی حقائق کے رنگ میں دکھانے کے درپے ہوتے ہیں ان کے اشعار دیکھو تو معرفت سے لبریز اعمال کا جائزہ لو تو رند مشرب۔ ادھر انبیاء علیہم السلام کو دیکھو تو ان کے اقوال و اعمال میں سرِ موخافت نہیں ہوتی، وہ جو بات زبان سے نکالتے ہیں پہلے اس پر خود عمل کرتے ہیں، ان کے کلام کو دیکھو تو اس کو مبالغہ اور خیال بندی سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا اگر کہیں وہ بھی مبالغہ آمیزی کا مزاج رکھتے تو جنت و دوزخ، ثواب و عذاب اور اس سے بڑھ کر ذات و صفات کا نازک اور پر از حقیقت کارخانہ سب درہم و برہم ہو کر رہ جاتا، ان کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ حقیقت کے کانٹے پر تلا ہوا نکلتا ہے یہاں رضاء و غضب کی بے اختیاری حالت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا حتیٰ کہ ان کے کلام میں تشبیہات کا باب بھی اس معیار سے نہیں اترتا۔ ان کی تشبیہات میں بھی ایک حقیقت اور اس حقیقت میں صداقت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تشبیہ و استعارات عام محاورات کے مطابق کثرت سے نہیں ملتے۔ اس کے باوجود جب اس کو بلاغت کے معیار پر پرکھا جاتا ہے تو وہ اعجاز کی سرحد سے ملا ہوا نظر آتا ہے جو تاثیر دوسرے کلاموں میں سو طرح کی مبالغہ آمیزیوں کے بعد بھی پیدا نہیں ہوتی وہ ان کے روزمرہ کے کلام میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ بس اسی تاثیر کو دیکھ کر کافر مجبور ہو جاتے تھے کہ اس کو سحر کہہ دیں یا شاعر قرار دیں، مگر قرآن کریم کا معقول فیصلہ یہاں بھی یہ ہے کہ آپ کی صفات کو دیکھو کیا ان میں شاعروں کی ایک صفت بھی ہے۔ پھر آپ کے کلام پر بھی غور کرو اس میں عالم غیب اور انبیاء علیہم السلام کے مقدس گروہ اور ان کے دوستوں اور دشمنوں کے عواقب کے سوا کہیں شاعرانہ مضامین کا تذکرہ ہے؟ اگر ان کی ذات شاعروں کی صفات سے منزہ و مبرا ہے اور اسی طرح ان کا کلام بھی شعرِ سخن کی خصوصیات سے بالکل ممتاز ہے تو پھر ان کو شاعر کہنا کتنا معقول ہے۔

قرآن کریم کا اعلان کہ آپ کو ساحر و مجنون کہنا بھی انتہاء درجہ ظلم اور سفاہت ہے \* اچھا تم کہتے ہو آپ ساحر و مجنون ہیں تو لو اس جماعت کی خصوصیات پر بھی آپ کو جانچ لو۔ ساحر بد عمل صرف انسانوں میں کچھ تصرف کرنے کی مشق رکھتا ہے خواہ وہ نظر بندی کی حد تک ہو یا اس سے زیادہ مرض اور ہلاک کرنے کی حد تک بھی ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو ساحر مقابلہ کے لیے آئے تھے ان کے قصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جادو کا اثر کچھ نہ کچھ حواسِ انسانی پر ضرور پڑتا ہے۔ ارشاد ہے:

فَلَمَّا الْقَوْاسُ سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ

جب انہوں نے ڈالا تو باندھ دیں لوگوں کی آنکھیں اور ان کو

وَجَاءُوا بِسِحْرِ عَظِيمٍ (الاعراف: ۱۱۶)

پھر ساحر کی زندگی دیکھو تو ہمیشہ ایک پست زندگی ہوتی ہے، اس کا نصب العین صرف چند دراہم ہوتے ہیں آخرت کی لازوال حیات ان کے دائرہ فکر میں بھی کہیں نہیں گذرتی، ان کے عملیات کو دیکھو تو اپنے عملوں میں وہ ہمیشہ ارواحِ خبیثہ اور شیاطین



سے استعانت طلب کیا کرتے ہیں اور جو امر خارق دکھاتے بھی ہیں وہ اس اندازہ کے مطابق ہی ہوتا ہے جتنا کہ شیاطین کا مقدور ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ساحروں کے سامنے آخرت کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔

وَلَقَدْ عَلِمُوا الْمَنَ اشْتَرَاهُ مَالَهُ فِي الْآخِرَةِ  
اور وہ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ جس نے جادو اختیار کیا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

اب اس کے بالمقابل انبیاء علیہم السلام کی جماعت کو دیکھو تو ان کی تمام زندگی تقویٰ و طہارت، عفت و پاکیزگی اور اخلاق و مروت کا مرقع ہوتی ہے ان کا بڑا نصب العین آخرت کے فوز و فلاح اور بنی نوع انسان کے دارین کی فلاح و بہبود ہوتی ہے ذاتی منافع کا ان کے دماغوں میں کہیں گزر نہیں ہوتا، شرک و کفر اور استعانت لغیر اللہ سے بیزاری تو ان کے دین کی بنیاد ہوتی ہے۔ ان کے معجزات کے مقابل جو بھی آتا ہے اس کو ہمیشہ شکست فاش ہوتی ہے ساحرین موسیٰ علیہ السلام کا حشر جابجا قرآن کریم میں مذکور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قرآن کریم کے بالمقابل جو کلام پیش کیے گئے ہیں وہ آج تک اپنے قائلین کے لیے صفحات تاریخ پر قابل مضحکہ بنے ہوئے ہیں پھر ساحر تو حواس کو معطل اور بیکار کرتا ہے اور یہ جماعت معطل شدہ حواس کو اور بیدار کرتی ہے چنانچہ جب عطاء بن یسار نے عبداللہ بن عمرو سے آپ کے ان اوصاف کے متعلق پوچھا تھا جو تورات میں مذکور تھے تو انہوں نے منجملہ دیگر صفات کے یہ بھی بیان کیا تھا وَلَن اَقْبِضَهُ حَتَّى اَقِيمَ بِهِ اَمَلَةَ الْعَوْجَاءِ فَافْتَحَ بِهِ اَعْيُنَا عَمِيَا وَاِذَا نَا صَمَا وَقُلُوبُنَا غُلْفًا۔ یعنی وہ رسول ایسا ہوگا کہ میں اس وقت تک اس کو نہیں اٹھاؤں گا جب تک کہ اس کے ذریعہ کج شدہ ملت کو پھر سیدھا نہ کر دوں اور اندھی آنکھوں کو پھر بینا اور بہرے کانوں کو پھر شنوا اور غافل دلوں کو پھر سر نو کھول نہ دوں۔

حافظ ابن تیمیہ کی تحقیق کہ نبی و ساحر میں فرق بدیہی ہے \* حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ نبی اور ساحر و مجنون میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بلکہ ان میں کوئی اشتراک ہی نہیں۔ ان دونوں میں خبر، مخبر اور غایت ہر لحاظ سے فرق ہے۔ نبی کو خبر دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہوتی ہے اور ساحر کو شیطان۔ نبی کی وحی سرتاسر ہدایت ہی ہدایت ہوتی ہے اور شیطان کی ضلالت ہی ضلالت نبی کے کلام میں صدق ہی صدق اور حقیقت ہی حقیقت ہوتی ہے اور ساحر و مجنون کا کلام بیشتر کذب ہی کذب اور بے معنی باتوں سے مملو اور صرف خیال ہی خیال پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ رَّسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ  
ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُطَاعٍ ثَمَّ اٰمِيْنٍ ۝  
مَا صٰحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ  
بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلٰی الْغَيْبِ  
بَضِيْنٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝  
فَاَيْنَ تَذٰهَبُوْنَ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ  
لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (التکویر: ۱۹-۲۷)

یہ قرآن اس فرشتہ کا آوردہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے، عزت والا ہے، قوت والا ہے، عرش کے مالک کے نزدیک بڑے درجہ والا ہے اور سب کا مانا ہوا ہے اور وہاں کا معتبر ہے اور یہ تمہارے رفیق کچھ دیوانے تو نہیں اور وہ اس فرشتہ کو آسمان کے صاف کنارے پر ایک بار پہلے بھی دیکھ چکے ہیں اور نہ وہ غیب کی بات بتانے میں بخیل ہیں۔ یہ قرآن کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے پھر تم کدھر جا رہے ہو یہ تو جہاں بھر کے لیے ایک نصیحت (کا پیغام) ہے۔

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس کا تخیل کیسے ہو سکتا ہے یہ ایک فرشتہ کا آوردہ ہے جو آپ سے منفصل اور اپنا علیحدہ وجود رکھتا ہے اور وہ بھی اپنی جانب سے خود کچھ نہیں کہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوتا ہے جو اس کو حکم ملتا ہے بس وہی کہتا ہے۔ اور نہ یہ قرآن شیطان مردود کا قول ہو سکتا ہے بھلا کجا وہ فرشتہ جس کی صفات یہ ہوں کہ جس کی جانب سے وہ یہ قرآن لاتا ہے اس کے نزدیک وہ حرمت و عزت والا ہو اور مراتب قرب میں سب فرشتوں میں بلند پایہ ہو آسمانوں کے سب فرشتے اس کی بات مانتے ہوں اور اس پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہوں اور کجا وہ شیطان لعین جس کی دنائت اور خست کے لیے صرف اس کا مردود ہونا ہی کافی ہے وہ بھلا ایسا کلام کیسے نازل کر سکتا ہے جس میں بنی آدم کی سرتاسر بھلائی ہو اور جس میں خود جا بجا اسی کی مذمت کی گئی ہو۔ یہ فرق تو مخبر کی جہت سے تھا اب اگر رسول ملکی سے گزر کر خود اس کی ذات یعنی رسول بشری کی صفات ملاحظہ کرو تو تم چالیس سال سے برابر اس کو دیکھتے چلے آئے ہو یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ وہ تم میں عاقل سے عاقل مسلم رہا ہے یا نہیں پھر اس کو مجنوں کیسے کہا جاسکتا ہے پھر جس کی سخاوت کا یہ عالم ہو کہ وہ آخرت کے لازوال خزانے دنیا کو مفت لٹا رہا ہو اس کو بھلا اس ساحر اور کاہن سے کیا نسبت ہو سکتی ہے جو ذرا سی بات بھی شیرینی لیے بغیر بتانا نہیں جانتا اس کے بعد اگر اس پر نازل شدہ کلام کی نوعیت پر غور کرو گے تو روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گا کہ یہ قرآن کسی خاص ملک یا کسی خاص زمانہ کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور تمام جہانوں کے لیے ایک مجسم نصیحت ہے۔ ایسے مفید کلام کا بھلا کاہن و ساحر اور مجنوںوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ساحر و مجنوں کے کلام کی غایت و غرض چند در اہم مغشوشہ جمع کرنا ہوتا ہے اور یہاں قرآن کریم دارین کی فلاح و بہبود کے لیے ایک پیغام ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام اور ساحر و کاہن کے مابین اتنا ہی فرق سمجھنا چاہیے جتنا کہ فرشتہ اور شیطان کے درمیان ہوتا ہے۔

مجنون کا تو پوچھنا ہی کیا ہے وہ تو حق تعالیٰ کی سب سے عام نعمت یعنی نعمت عقل ہے سے محروم ہوتا ہے اس کے اقوال و افعال کسی اخلاقی معیار پر تو کیا تو لے جاتے و سرتاپا لغویات اور بے معنی ہوتے ہیں۔ یہ الزام اس شخصیت پر لگانا جس کی ایک ایک بات دانائی و فراست، علم و عاقبت اندیشی سے لبریز ہو کیسے معقول ہے۔ ارشاد ہے:

مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۚ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ۚ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۚ (القلم: ۲-۴)

تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانہ نہیں ہو اور تمہارے لیے ثواب ہے بے انتہاء اور تم تو فطرۃً بلند اخلاق ہو۔

(سورہ القلم)

مشرکین کے بے حقیقت اعتراض کی طرف قرآن کریم کے التفات فرمانے کی حکمت \* قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے ان کے دماغوں کی رسائی یہیں تک تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر ساحر و شاعر اور کاہن و مجنوں ہونے کے بدیہی البطلان الزامات تھوپ دیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ مگر قرآن نے ان بے معنی الزامات کا جواب بھی بڑا مدلل بڑی فراخ دلی اور بڑے معقول انداز سے دیا ہے اور انداز بیان ایسا انوکھا اختیار فرمایا ہے کہ اس سے جہاں ایک طرف معاند مخاطبین کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اس قسم کی آئندہ موشگافیوں کا بھی شافی خواب ہو جاتا ہے۔ نیز اس تقریب سے بہت سے حقائق بلند اور معارف ارجمند بیان میں آ جاتے ہیں۔ مثلاً آیات بالا ہی کو ملاحظہ فرمائیے۔ سیاق کلام تو



ایک ایسے بے سرو پا الزام کے جواب میں ہے جس کا یہاں کوئی احتمال ہی نہ تھا، مگر کیا کیا جائے کہ جب اس وقت قرآن کریم کے مخاطبین قرآنی دعوت قبول نہ کرنے کے لیے یہ بھی ایک بہانہ بنا رہے تھے تو مقاصد تبلیغ کے پیش نظر یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کا بھی جواب دے دیا جائے، مگر قرآن کریم نے جب ادھر توجہ فرمائی تو اس انداز سے فرمائی کہ ان کے جواب کے ساتھ ساتھ مقام رسالت و نبوت کے بعض ایسے گوشے بھی سامنے آ گئے جن کی طرف کسی کا ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے یہ تنبیہ کی کہ انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعت بہت سی صفات میں ممتاز ہوتی ہے، ان کی پرورش ابتداء ہی سے نعمت کے گہوارہ میں ہوتی ہے حتیٰ کہ سب سے اول اُنْعُمْتَ عَلَیْہُمْ کا مصداق وہ ہوتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق یہاں ان کی طفیلی نظر آتی ہے۔ پھر جس ذات برتر کا تذکرہ آج تمہارے سامنے ہے وہ تو اُنْعُمْتَ عَلَیْہُمْ میں بھی وہ شان رکھتی ہے جس کو اَتَمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی منعم حقیقی نے اپنے انعامات کی دولت تو بہتوں پر تقسیم کی ہے۔ مگر ان کی ذات پر تو اپنی خاص نعمت کو پورا فرما دیا ہے۔ اب سوچو کہ جو خدا تعالیٰ کی مخلوق میں منعم علیہم کی پہلی صف میں ہو پھر ان میں بھی اَتَمَمْتُ عَلَیْکُمْ کا تاج اس کے سر پر نظر آ رہا ہو حتیٰ کہ رحمۃ للعالمین اس کا لقب بن چکا ہو کیا اس کو مجنون کہا جاسکتا ہے جو کہ خدا تعالیٰ کی عام نعمت جس میں سب شریک ہوتے ہیں یعنی عقل اس میں بھی حصہ دار نہیں ہوتا۔ اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کی دوسری امتیازی شان ان کا مستقبل ہے، وہ اتنا شاندار ہوتا ہے کہ بقیہ تمام مخلوق کا مستقبل گویا ان کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق کو صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمانے والے وہی ہوتے ہیں اس لیے امت میں جو فرد بھی کوئی حسد کرتا ہے اس کا ثواب ان کو بھی ملتا ہے اور اس طرح اپنے اعمال کے ساتھ ساتھ تمام امت کے اعمال کا ثواب بھی ان کے اعمال نامہ میں درج ہو جاتا ہے پھر ان کے مستقبل کا پوچھنا کیا اور جن کا تذکرہ یہاں ہے چونکہ ان کی امت کے بعد کوئی دوسری امت نہیں اس لیے جب ان کی امت اور ان کے اعمال کا ثواب لامتناہی ہے تو پھر آپ کے ثواب کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے وہ بھی بے انتہاء اور بے حساب ہے کیا ایسی ذات پر بھی مجنون کی تہمت لگائی جاسکتی ہے جس کے ایک عمل کا بھی کچھ ثواب نہیں ہوتا۔ تیسری سب سے کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ ہر نبی اپنے اپنے زمانہ میں اخلاق جمیلہ کی تصویر ہوتا ہے۔ خدا کی مخلوق میں جو بھی صحیح اخلاق سیکھتا ہے ان سے سیکھتا ہے۔ پھر جس ہستی کا تذکرہ تمہارے سامنے ہے ان کے اخلاق کے متعلق تو خود خالق کائنات خلقِ عظیم فرماتا ہے۔ ﴿اِنَّکَ لَعَلٰی خُلِقِ عَظِیْمٌ﴾ (القسم: ۴) ایسی مجسم اخلاق ذات پر مجنون کی تہمت کتنا عظیم ظلم ہے۔ غریب مجنون کا تو ایک عمل بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ اخلاق کے معیار پر نہیں تو لا جاسکتا۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں جو مخاطبوں نے کہا وہ تو ان کے ظرف کے مطابق تھا لیکن جو جواب ان کو قرآن نے دیا وہ اس کی شانِ رفیع کے مطابق تھا۔ اس لیے یہ دیکھنا نہیں چاہیے کہ الزامات اور اعتراضات کی حیثیت کتنی رکیک ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ جواب کی جو نوعیت قرآن نے اختیار فرمائی وہ کتنی بلند ہے جو ابنِ سیناء جیسے عاقل پر نہ کھل سکا۔ قرآن کریم کے اسی فیصلہ کے ماتحت اب یہاں ابنِ سیناء جیسے عقلاء کو بھی غور کر لینا چاہیے کہ دنیا میں کیا صفاوی مریضوں کے اوصاف بھی یہی ہوئے ہیں۔ کیا کبھی تاریخ نے ان کی صفات اور ان کے قبعین کی صفات ان کی مخالفت اور موافقت کے نتائج اسی طرح مدون کیے ہیں جس طرح کہ انبیاء علیہم السلام کے۔ کیا صفاوی مریضوں نے اسی تسلسل کے ساتھ اپنے بعد میں آنے والوں کی بشارتیں اسی طرح سنائی ہیں۔ کیا عالم کی ہوشمند جماعتوں نے ان

کے ہدایات کو اسی طرح اپنا نصب العین بنایا ہے۔ بس اسی ایک نقطہ پر نظر کرنے سے جہاں عرب کے جاہلوں کا جواب ہو جاتا ہے اسی طرح ابن سینا جیسے عقلاء کا جواب بھی نکل آتا ہے۔

یہاں ابن سینا اور اس کے ہم مشربوں کو غور کرنا چاہیے کہ اگر کارخانہ نبوت عالم خیال سے متعلق ہوتا تو خیالات سے تاثر کی زیادہ صلاحیت یا عورتوں میں ہوتی ہے یا پھر بچوں میں عورت بھی اپنے صنفی ضعف کی وجہ سے ان کا زیادہ اثر لیتی ہے اور اسی طرح بچہ بھی خیالات کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے اسی لیے مسمریزم کے لیے جب کسی معمول کی تلاش ہوتی ہے تو بچہ ہی تلاش کیا جاتا ہے۔ لیکن جب آپ نبوت کی تاریخ اٹھا کر پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں نہ عورتوں میں کوئی نبی گزرا ہے اور نہ بچپن میں نبی مبعوث ہوئے ہیں۔ نبوت کے لیے قدرت نے ابتداء ہی سے وہی صنف پسند فرمائی ہے جو تاثر سے نسبتاً بالاتر تھی اور ان میں بھی جن کو نبوت سے سرفراز کیا ہے ان کو جسمانی طاقتوں میں بھی دوسرے افراد پر فوقیت بخشی ہے پھر بعثت کے لیے بالعموم وہی عمر مقرر کی گئی ہے جو خیالات سے آزاد ہونے کی عمر ہے یعنی چالیس سال۔ اس کے بعد جو تعلیمات ان کو دی جاتی ہیں جب ان پر نظر کیجئے تو وہ بھی شاعرانہ مضامین کی طرح صرف نازک خیالی کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا ایک مکمل دستور العمل ہوتی ہیں ان کی تعلیمات کا اگر ایک حصہ عالم غیب کی غیر مدد رک جزئیات پر مشتمل ہوتا ہے تو دوسرا بڑا حصہ باہمی معاشرت و معاملات کے متعلق بھی ہوتا ہے اس میں جہاں بانی کے اصول بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ معیار عقل پر رکھے جاتے رہے ہیں ان پر عمل کر کے جو قوم بکریاں چرایا کرتی تھی وہ تخت و تاج کی مالک بن چکی ہے۔ صفحہ عالم پر کوئی جماعت ایسی نہیں ملتی جس کے اصول میں کچھ نہ کچھ تفاوت موجود نہ ہو لیکن انبیاء علیہم السلام کی ایک لاکھ سے زیادہ کی عظیم الشان جماعت میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ملتا جس کی اصولی تعلیمات میں ایک ذرہ کا بھی فرق ثابت کیا جاسکے ان کی عظیم الشان جماعت میں کبھی کوئی نبی دوسرے کی کاٹ پر نظر نہیں آتا ہمیشہ ایک دوسرے کا احترام کرتا ہے اور اپنی امتوں کو بھی اسی کی ہدایت کرتا ہے اور اگر اس میں کوئی ذرا سی بھی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کو ایسا ہی مجرم قرار دیتا ہے جیسا اپنی اہانت کرنے والے کو ان معمولی اور کھلے ہوئے امتیازات کے بعد بھی انبیاء علیہم السلام کی جماعت اور ان کے علوم کا نہ پہچاننا یا ان کو شعبہ بازوں اور خفۃ انسانوں سے تشبیہ دینا بد اہت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تاریخ کو انصاف و غور کے ساتھ مطالعہ کرنے کی کبھی فرصت ہی تلاش نہیں کی گئی اور اگر کبھی ادھر توجہ کی گئی ہے تو صرف اسی نظریہ سے کی گئی ہے کہ ان کے انکار کو کس طرح اور مدلل و مبرہن کیا جائے اور اس طرح اس کھلے ہوئے مسئلہ کو خود بخود بھول بھلیاں بنا دیا گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آپ کی صفات حمیدہ کے مشاہدہ کر لینے کے باوجود ابتداء میں مشرکین عرب نے آپ کو کیوں نبی نہیں مانا؟ \* یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عام طور پر عرب انبیاء علیہم السلام کی جنس ہی سے نا آشنا تھا۔ اس لیے ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ نبوت بالکل ایک جدید اور اجنبی آواز تھی وہ آپ کے متعلق بعید سے بعید بات سوچ سکتے تھے مگر جو بات ان کے دماغوں میں نہیں آ سکتی تھی وہ صرف آپ کی نبوت تھی۔ اسی لیے ان کے مقابلہ میں قرآن کریم نے اپنا اسلوب بیان بدل دیا ہے۔ اس نے مکی سورتوں میں جس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی جنس کی آمد کا اثبات ہے اس نے بتایا ہے کہ تم



خود ان کے حالات پڑھو پھر اہل کتاب سے بھی جو اس جنس کے قائل ہیں جا کر پوچھ لو۔ ان کے مخالفوں کا حشر دیکھو۔ ارم کے اجڑے ہوئے سبزہ زار، قوم لوط کے الٹے ہوئے دیار اور عاد و ثمود کی ویران بستیاں یہ سب تم کو شہادت دیں گے کہ جن اقوام نے خدا تعالیٰ کے رسولوں کی مخالفت کی ہے وہ کس طرح برباد ہو کر رہ گئی ہیں۔ دریائے نیل اور کوہ جودی اس کے گواہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے رسولوں کی بات نہ ماننے والوں کا نام و نشان صفحہ عالم سے کس طرح مٹ گیا ہے اور جنہوں نے ان کی اتباع کی ہے وہ کس طرح کامیاب اور خدا کی زمین کے وارث بن گئے ہیں۔ ان واقعات پر اگر انصاف سے نظر کرو گے تو تم کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ بے شک یہ اولوالعزم ہستیاں اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ اور اس کی رسول تھیں۔

پس اگر ان حالات پر غور کرنے کے بعد تم اس نتیجہ پر پہنچتے ہو تو اب تمہارے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر یقین لانا ایک بدیہی مسئلہ ہوگا، یہاں بھی آپ کے مخالفوں کا حشر اور متبعین کی سرسبزی و کامیابی اپنے سامنے رکھو، آپ کے کمالات اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے کمالات کا موازنہ کر لو، آسمانی صحائف سب ایک طرف اور دوسری طرف اکیلے قرآن کریم کو رکھ لو، تم کو روشن ہو جائے گا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ اگر آپ کے آثار و برکات کا موازنہ کرنا ہو تو آپ کی امت موجود ہے، اس کی جاں نثاری، اس کی بے مثال قربانی، اس کی ہمدردی اور خدا ترسی، اس کا عدل و انصاف اور اس کے اخلاق و شائل سب تاریخ میں مدون ہیں، تم بہت آسانی کے ساتھ فیصلہ کر لو گے کہ یہ امت ان اوصاف اور برکات میں جملہ امتوں سے آگے ہے یا نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اگر پہلی امتوں کے رسول خدا کے سچے رسول تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے رسول نہ ہوں ارشاد ہوتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے
الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا	ساتھ ہیں وہ شدید ہیں کافروں کے حق میں اور رحم دل ہیں
يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي	آپس میں تم ان کو دیکھو گے رکوع میں ہیں اور سجدہ میں ہیں اور
وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ. (الفتح: ۲۹)	اللہ کے فضل اور اس کی خوشی کے جویاں ہیں۔

آیت بالا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر غور کرنے کے لیے آپ کے آثار و برکات اور خاص طور پر ان انقلابی اثرات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو عرب کی فطرت ہی کے بالکل متضاد تھے دیکھو وہ آپ سے قبل کس طرح باہم دشمن تھے اور آپ کے بعد کیسے فداکار دوست بن گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ عبودیت کتنا کٹ چکا تھا اور آپ کے بعد کتنا مستحکم اور عمیق ہو گیا تھا کہ ان کے سامنے ایک اُس کی رضا کے سوا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہا تھا۔ ان کے باطن کے تذلل و عبودیت کی کیفیات ان کے چہرہ بشرہ بلکہ جسم کے ایک ایک رومیں سے کس طرح ٹپکتی تھیں۔ پس جس نے ایک ایسی امت کی دنیا میں بنیاد ڈالی ہو اس کے آثار و برکات کا پوچھنا کیا ہے۔ لہذا جو شخص بھی یہاں رسولوں کی جنس کا قائل ہوگا اس کو آپ کی رسالت بھی طوعاً و کرہاً تسلیم کرنی ہوگی۔

درحقیقت گزشتہ اقوام کے حالات کی تکرار میں بڑی روح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اثبات ہے۔

ارشاد ہے:

فَكَأَيُّ مَن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ  
خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا وَبَنِي مُعْتَلَّةٍ وَ قَصْرِ  
مَشِيدِهِ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونُ لَهُمْ  
قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا  
فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى  
الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ. (الحج: ۴۵-۴۶)

تو کتنی بستیاں ہم نے غارت کر ڈالیں اور وہ گنہگار تھیں وہ گری  
پڑی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنوئیں نلمے پڑے ہیں اور کتنے  
پختہ محل کیا انہوں نے سیر نہیں کی ملک کی جوان کے دل ہوتے  
جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے تو یہ بات نہیں ہے کہ  
آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں لیکن وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو  
سینوں میں ہیں۔

اسی طرح کفار مکہ کی تکذیب پر آپ کے لیے جو سامان تسلی بیان فرمایا گیا ہے وہ بھی انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی  
تلخ سرگزشت ہے:

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ. (الاحقاف: ۹)  
وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ  
وَعَادٌ وَثَمُودٌ وَقَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ وَ  
أَصْحَابُ مَدْيَنَ وَ كُذِّبَ مُوسَى فَأَمَلَيْتُ  
لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ  
نَكِيرِي. (الحج: ۴۲-۴۴)

کہہ دو! کہ میں کوئی نیا رسول نہیں آیا ہوں۔  
اور اگر وہ تم کو جھٹلائیں تو ان سے پہلے قوم نوح، قوم ثمود، قوم  
عاد، قوم ابراہیم، قوم لوط اور مدین کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں  
اور موسیٰ (علیہ السلام) بھی جھٹلائے گئے پھر میں نے ڈھیل  
دی ہے مکروں کو پھر ان کو پکڑ لیا تو (دیکھا) میرے انکار کا  
حشر کیا ہوا۔

غرض ان حقائق کے ماتحت یہ انصاف کر لو کہ یہ مقدس گروہ خدا تعالیٰ کے سچے رسول تھے یا نہیں اس کے بعد یہ فیصلہ کر لو کہ تم  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کی صف میں شامل ہو کر دنیا میں صرف کہانیاں بن کر رہنا پسند کرتے ہو یا اس کے وارث اور  
خدا تعالیٰ کے ملک کے مالک بن کر باقی رہنا چاہتے ہو۔ جو قوم رسولوں کی مقدس تاریخ سے واقف نہ تھی ان کے سامنے علامات  
نبوت اور سابق بشارات بیان کرنا بے سود ہے۔ اب آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ عرب کیوں آپ کی نبوت کی طرف نہیں آتا تھا  
اور کیوں ساحر و مجنون کے بے جا الفاظ آپ کے متعلق کہتا تھا۔

## ضرورت نبوت و رسالت

مذکورہ بالا عنوان ترتیب کے لحاظ سے تو سب سے پہلا عنوان ہے مگر ہم نے اپنے مخاطبوں کی رعایت سے اس کو دوم نمبر میں  
رکھا ہے۔ ہمارا خطاب یہاں ان اصحاب کے ساتھ ہے جو انبیاء علیہم السلام پر ایمان لا چکے ہیں اور صرف اپنے اطمینان قلبی کی خاطر  
کسی قدر اس کی وضاحت کے متلاشی ہیں اس جماعت سے ہمارا خطاب ہی نہیں ہے جو انبیاء علیہم السلام کی علی التواتر آمد اور اب  
ان کے خاتمہ کے قطعی اعلان کے بعد بھی ابھی اسی میں بحث کر رہی ہے کہ عالم انسانی کو اپنی ہدایت کے لیے کسی سماوی ہدایت اور



سماوی ہادی کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ ساری یوسف زلیخا پڑھ لینے کے بعد یہ سوال کرنے والے کہ زلیخا مرد تھی یا عورت ہمارے نزدیک قابل خطاب نہیں ہیں۔

امام رازی تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفت حاکمیت اور ملوکیت کا یہ تقاضا ہے کہ جس طرح شاہان دنیا اپنی رعایا کے پاس اپنے ملک کا قانون خود لے کر نہیں آیا کرتے بلکہ اس کے لیے اپنے پیغمبر اور رسول مقرر کیا کرتے ہیں اور ان کے واسطے سے اپنا ملکی قانون بھیجا کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی اپنی مخلوق کے پاس اپنے رسول بھیجے اور ان کی معرفت اپنا قانون ان کو بتائے پھر اس کی صفت حکمت یہ چاہتی ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں کو انعام اور اس کی خلاف درزی کرنے والوں کو سزا بھی دے گا اس کے علی الاطلاق خالق اور حاکم ہونے کی وجہ سے اس کے بغیر بھی جزاء و سزا دینے کا اس کو حق حاصل تھا لیکن اس کی صفت حکمت نے یہ تقاضا کیا کہ جن کو سزا دے ان کو پوری تفہیم کے بعد دے تاکہ عام عدالت کے دن کسی کو اپنی لاعلمی کے عذر کا موقعہ بھی نہ رہے ارشاد ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ  
عَلَىٰ فِتْرَةٍ مِنَ الرَّسُولِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا  
مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَ  
نَذِيرٌ.  
(المائدہ: ۱۹)

اے اہل کتاب جب رسولوں کا آنا مدتوں تک نہ ہوا پھر ہمارے یہ رسول تمہارے پاس آئے جو صاف صاف احکام الہی بیان کرتے ہیں اور ان کو ہم نے اس لیے بھیجا ہے مبادا کل تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس تو نہ کوئی رسول خوشخبری سنانے والا آیا اور نہ ڈرانے والا تو لو اب تمہارے پاس خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا آ گیا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنَاهُمْ بِعَذَابٍ مِّن قَبْلِهِ لَقَالُوا رَبَّنَا  
لَوْ لَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِنْ  
قَبْلِ أَنْ نَذِلَّ وَنَخْزَىٰ. (طہ: ۱۳۴)  
وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا.

اگر ہم قرآن اتارنے سے قبل ہی کسی عذاب سے ان کو ہلاک کر دیتے تو وہ ضرور یہ عذر کرتے کہ ہمارے پروردگار تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہم تیرے حکموں پر چلتے۔

ہم عذاب نہیں دیتے جب تک کہ پہلے اپنا کوئی رسول نہ بھیج دیں۔

امام موصوف لکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت عقلاً تمام مخلوق پر واجب ہے اور انبیاء علیہم السلام کے بغیر یہ معرفت حاصل ہونا ہی ناممکن ہے اس لیے نبوت و رسالت کا انکار درحقیقت حق تعالیٰ کی ذات پاک کا ہی انکار ہے ارشاد ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنْزَلَ  
اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ. (انعام: ۹۱)

انہوں نے حق تعالیٰ کے کمالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہی نہیں لگایا جب کہ یہ کہا کہ اس نے کسی بشر پر کوئی کتاب ہی نازل نہیں فرمائی۔

یعنی جب یہ لوگ رسولوں پر شریعت کے نزول کا انکار کرتے ہیں تو گویا خدا تعالیٰ کی جانب سے رسالت ہی کا انکار کرتے ہیں اور رسالت کا انکار اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو خدائی صفات اور اس کے کمالات کی برتری کا کوئی اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ آج دنیا کی اقوام پر نظر ڈال لیجئے آپ کو ثابت ہو جائے گا کہ جو قوم نبوت و رسالت کی منکر ہوئی ہے اس کو پھر خدائی معرفت میں بھی کوئی

حصہ نصیب نہیں ہوا بلکہ جو رسولوں کی معرفت میں جتنی پیچھے رہ گئی ہے وہ اتنی ہی خدا تعالیٰ کی معرفت میں بھی پیچھے رہ گئی ہے۔ آج نصاریٰ جو عقلاء زمان کہلاتے ہیں جب انہوں نے اپنے رسول کے صحیح مقام کو پہچاننے میں ٹھوکر کھائی تو پھر دیکھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کی معرفت میں بھی ان کا حصہ کتنا رہا حتیٰ کہ توحید فی التلیث کا بنیادی مسئلہ بھی ان کے نزدیک تقدیر کی طرح مذہب کا ایک راز بن کر رہ گیا۔ اس کے بالمقابل امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جب وہ اپنے رسول کا صحیح مقام پہچاننے میں پیش گام رہی تو اس کو اپنے رب کی معرفت کا جام بھی سب میں بھر پور نصیب ہوا۔ اسی لیے یہ امت تمام امتوں پر فوقیت لے گئی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ  
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ  
بِاللَّهِ. (آل عمران: ۱۱۰)

تم امتوں میں سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر صحیح ایمان رکھتے ہو۔

آیت بالا کی روشنی میں اب یہ فیصلہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعتراف نہیں کرتے اور صرف توحید کے قائل ہیں کیا ان کو صحیح معنی میں توحید اور ”ایمان باللہ“ نصیب ہو سکتا ہے۔ اسی لیے امام موصوف فرماتے ہیں:

من انكر النبوة و الرسالة فهو في الحقيقة  
ما عرف الله عز وجل. (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۱۲۸)

جس نے نبوت اور رسالت کا انکار کیا درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی معرفت ہی سے بے نصیب رہا۔

پس رسالت اور ربوبیت کا رشتہ اتنا مستحکم ہے کہ اس میں تفریق کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا ہے:

وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ. (النساء: ۱۵۰)

اور اللہ میں اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں۔

جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ تعالیٰ کا۔

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ. (النساء: ۸۰)

اب اندازہ فرمالیجئے کہ جن ہستیوں کی معرفت و عدم معرفت حق تعالیٰ کی معرفت و عدم معرفت کا معیار ہو۔ دنیا میں خدا تعالیٰ کے دوست و دشمن کی تفریق اور آخرت میں دوزخ و جنت کی تقسیم ان کے وجود پر دائر ہو گویا دنیا و آخرت کا کارخانہ ان کے دم کے ساتھ وابستہ ہو وہ کتنی بلند ہستیاں ہوں گی۔ درحقیقت قدرت کی رافت و رحمت کا سب سے بڑا مظہر یہی ہستیاں ہوتی ہیں ان ہی کی تشریف آوری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ”رحمن“ کو اپنی مخلوق پر کتنی رحمت ہے کہ جب وہ سرکشی اور طغیانی کی حد کر دیتی ہے اس کے دوستوں کی صف سے نکل کر دشمنوں کی صف میں جا کھڑی ہوتی ہے اور ہدایت کی روشنی چھوڑ کر گمراہی کی تاریکی اختیار کر لیتی ہے اور جنت کی لازوال نعمت سے محروم ہو کر ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتی ہے تو وہ ان کو مٹا دینے کی بجائے پھر ان کی بقاء کے سامان پیدا فرما دیتا ہے۔ دشمنوں کی صف سے نکال کر پھر دوستوں کی صف میں شامل فرما لیتا ہے تاریکی در تاریکی میں پھنس جانے کے بعد پھر ہدایت کی چمکتی ہوئی روشنی میں لاکھڑا کرتا ہے اور ہلاکت کے گڑھے سے نکال کر پھر جنت الفردوس کا مالک بنا دیتا ہے مگر اس کے یہ سارے انعامات اور اس کی یہ ساری نعمتیں میسر آتی ہیں ان ہی نفوس قدسیہ کے طفیل میں۔ سبحان اللہ رسولوں کی شخصیتیں بھی کتنی بلند اور پراسرار ہوتی ہیں جو ان سے جڑ جاتا ہے اس کا رشتہ عالم قدس سے جڑتا ہے اور جو ان سے کٹ جاتا ہے اس کا رشتہ بھی



عالم قدس سے کٹ جاتا ہے۔

وَ كُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا. (آل عمران: ۱۰۳)

اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے پھر تم کو اس سے نجات دی۔

حافظ ابن قیمؒ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اقوال و اعمال و اخلاق کی وہ صحیح میزان ہوتے ہیں کہ جو اس پر پورا اتر گیا وہ ہر معیار پر پورا اتر گیا اور جو یہاں سر مو او چھا رہ گیا ہے وہ ان تمام امور میں بھی ناقص رہ گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جتنی ضرورت جسم کو جان کی اور آنکھوں کو نور کی ہے اس سے زیادہ ضرورت عالم کو انبیاء علیہم السلام کی ہے کیونکہ جسم کو جان اور آنکھ کو نور کی ضرورت صرف حیات دنیا تک محدود ہے اور حیات دنیا خود بھی محدود ہے لیکن ان نفوس قدسیہ کی ضرورت دونوں جہان کے ساتھ وابستہ ہے انسان اپنی عارضی اور دائمی دونوں حیات میں ان کا یکساں محتاج ہے۔ اسی کے ساتھ ضمناً امام موصوف انبیاء علیہم السلام کی شناخت پر بھی مختصر سا کلام کر گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح خدا تعالیٰ کی صفت ملوکیت کا یہ تقاضہ تھا کہ وہ اپنی مخلوق کے پاس اپنے رسولوں کو بھیجے اسی طرح اس کی صفت قدرت کا یہ تقاضہ تھا کہ رسولوں کے ہاتھوں پر ایسے افعال کا ظہور فرمائے جو عام انسانوں کی طاقت سے بالاتر ہوں تاکہ یہ اس کی علامت ہوں کہ درحقیقت کسی ایسی ہی ذات کی طرف سے آئے ہیں جس کی قدرت کے سامنے سب عاجز ہیں اور اس طرح رسولوں کی شخصیت کا پورا تعارف ہو جائے۔ لہذا جو شخص معجزات کا منکر ہے وہ درحقیقت خدا تعالیٰ کی صفت قدرت ہی کا منکر ہے۔ امام موصوف کا مطلب یہ ہے کہ معجزات خود انبیاء علیہم السلام کے افعال نہیں ہوتے اور اسی لیے دوسرے افعال کی طرح وہ ان کی قدرت اور اختیار سے سرزد نہیں ہوتے کہ جب چاہیں اپنے دوسرے افعال کی طرح معجزات دکھا دیا کریں جیسا کہ آئندہ معجزات کی بحث میں ان شاء اللہ تعالیٰ ہم اس کی تفصیل کریں گے۔ پس یہاں معجزات کا اندازہ دوسرے انسانی افعال سے لگانا ہی غلطی ہے یہاں اگر ان کا موازنہ کرنا چاہیے تو قدرت کے براہ راست افعال کے ساتھ کرنا چاہیے۔ زمین و آسمان میں قدرت کی خالقیت اور عجائبات کی جتنی عجیب و غریب داستان بکھری پڑی ہے کسی نبی کا کوئی معجزہ ان سے عجیب تر نہیں ہے قرآن کریم کے بیان کردہ معجزات اور احادیث کے تمام معجزات قدرت کے بلا واسطہ افعال کے مقابلہ میں اٹھا کر رکھ لیجئے تو آپ کو یقین ہو جائے گا کہ اگر وہ بلا واسطہ افعال معقول ہیں تو پھر اس قدرت کے سامنے یہ معجزات بھی نامعقول نہیں ہو سکتے۔ لیکن جو شخص نبی کے واسطہ سے قدرت کے عجائبات کا انکار کرتا ہے اس کے لیے پھر قدرت کے دیگر براہ راست افعال کے قبول کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ امام موصوف کے اس مختصر بیان سے رسالت و نبوت کی ضرورت اور ان کی شناخت کے دونوں مسئلے عقلاً و نقلاً ہر دو طریقہ پر ثابت ہو گئے۔ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ﴾

حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مخلوق کو اپنی دین و دنیا میں جس چیز کی حاجت جتنی شدید تھی خالق کائنات نے اتنی ہی زیادہ سخاوت اور بہتات کے ساتھ اس کو پیدا فرمایا ہے۔ دیکھئے سانس لینے کے لیے ہوا کی ضرورت سب کو ہے اور ہر ضرورت سے زیادہ لہذا اس کو پیدا بھی اس افراط کے ساتھ فرمایا ہے کہ اپنی حاجت روائی میں کسی کو کہیں بھی ذرا تکلیف نہیں ہوتی اس سے دوم نمبر میں پانی کی حاجت ہے اس کے بعد پھر کھانے اور پینے کی ہے اس لیے پانی کو بھی اسی فراوانی سے پیدا فرمایا ہے لیکن اس

فراوانی سے نہیں جس سے کہ ہوا کو اسی طرح اب دینی پہلو کو لیجئے تو یہاں سب سے زیادہ حاجت ربوبیت کی معرفت کی ہے اس لیے اپنی ربوبیت کے دلائل انسان کی شش جہت میں اس کثرت کے ساتھ پھیلا دیئے ہیں کہ ذرہ ذرہ اس کی ربوبیت کا شاہد بنا ہوا ہے۔

ففی کل شیء لہ ایۃ تدلّ علی انہ واحد

اس سے دوم نمبر کی حاجت نبوت کی ہے، کون نہیں جانتا کہ ایک انسان جب اپنے جیسے دوسرے انسان کی خوشی اور ناخوشی کے ذرائع و اسباب اس کے بتائے بغیر نہیں جان سکتا تو خالق کی خوشی و نارضائی کے اسباب اس کے فرمائے بغیر بھلا کون جان سکتا ہے اس لیے اس نے انبیاء علیہم السلام بھیجے تاکہ ان کے ذریعہ وہ اس کے تمام اسباب بتفصیل بیان فرما دے۔ اور ان کی شناخت کے دلائل بھی اتنی کثرت سے ظاہر فرمائے کہ پھر ایک ان پڑھ سے ان پڑھ انسان کے لیے بھی ان کی شناخت میں کوئی دشواری نہ رہے۔ اگر عقلی مناقشات کا میدان چھوڑ کر آپ خود ان کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی معرفت کے سامان قدرت نے ہر دور میں اس کثرت کے ساتھ جمع کر دیئے تھے کہ ان پڑھ جاہلوں کے لیے بھی انبیاء علیہم السلام کی شناخت میں کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ دشمنوں کے لیے ان سے انکار کرنا ایک بڑا غور طلب مسئلہ بن گیا۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون جیسے مدعی الوہیت کے مقابلہ کا واقعہ مذکور ہے دیکھئے کس طرح ساحرین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آ کر ذرا سی دیر میں ان کی نبوت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے اور وہ بھی کس یقین کے ساتھ کہ پر فرعون نے ہزار دھمکیاں بھی دیں مگر کیا وہ ذرائع سے مس ہوئے؟ بلکہ اور صاف یہ اعلان کر دیا:

فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ  
الْحَيَاةَ الدُّنْيَا إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطِئَاتِنَا  
وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ.

تو اب جو تو کرنے والا ہے کر گزرتو اس دنیا کی زندگی پر ہی حکم  
چلا سکتا ہے (یعنی بہت سے بہت مراد دے) بس ہم تو اپنے  
پروردگار پر ایمان لا چکے تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما  
دے اور خاص کر جادو کے گناہ کو جس پر تو نے ہم کو مجبور کیا۔

(طہ: ۷۲-۷۳)

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ کے گرد و پیش میں جو دلائل کی بارش برسی اس کی کیفیت تو آج دنیا کی زندہ تاریخ سے ظاہر ہے کن نامساعد حالات میں تشریف لائے اور کس قبول اور جاذبیت کے ساتھ جہان کو چند سالوں میں فتح کر ڈالا جس میں بادشاہ بھی تھے اور فقیر بھی، کاہن اور ساحر بھی تھے اور سخن شناس شاعر بھی۔ پھر جن ضدی اور ہٹ دھرموں نے آپ کو نہیں مانا تو اس انکار کے لیے ان کو کتنی سازشیں، کتنے ظلم اور کتنے اور حربے استعمال کرنے پڑے اور اس پر بھی کوئی جماعت ان کے ساتھ نہ ہو سکی آخر کار شقاوت کا داغ اپنی ہی پیشانی پر لگا کر محروم اور نا کام دنیا سے گزر گئے جیسا کہ آئندہ اوراق میں اس کا مختصر سا نمونہ آپ کے ملاحظہ سے گزرے گا۔ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی - فَبَآئِ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ. (الجواب الصحيح ص ۲۸۴ ج ۴)

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے مکتوبات شریف میں متعدد مقامات پر ضرورت نبوت پر طویل بحث فرمائی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رب کریم کی ان عام بخشائشوں میں سے جو کسی ملک، کسی خطہ اور کسی خاص جماعت کے



ساتھ مخصوص نہیں رہیں سب سے بڑی بخشش یہ ہے کہ اس نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان ہم کلامی کی راہ کھول دی۔  
 ﴿وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر: ۲۴) یعنی ہر جماعت میں ایک ایک ڈرانے والا آچکا ہے جس نے آ کر وہ راز ہائے گہراں مایہ جن سے ایک انسان بھی رشک ملک بن سکتا تھا سب ارزاں کر دیئے ہیں۔

وجود کی نعمت، ابر و باد کی نعمت، شمس و قمر کی نعمت اور ان سب سے برتر شرف انسانی کی نعمت گو یہ سب ہی ان عام نعمتوں میں داخل ہیں جو دوست و دشمن اور شاہ و گدا سب ہی میں عام رکھی گئی ہیں، لیکن ان سب میں بیش بہا نعمت نبوت کی نعمت ہے کہ اگر یہ نعمت نہ ہوتی تو ساری نعمتیں ہیچ ہو جاتیں۔ اسی نعمت کے ذریعہ پروردگار عالم نے اپنی ذات و صفات کا اشرف علم بخشا، حشر و نشر، جنت و دوزخ اور انسان کی دائمی وابدی زندگی کی اطلاع دی اور عالم غیب کے بیش بہا حقائق سے حجاب اٹھا دیا۔ ان ہی نفوس قدسیہ کے ذریعہ اپنی رضامندی کے راستے بتلائے۔ عقل انسانی خواہ کتنی ہی دور بین کیوں نہ ہو مگر اس کی جولانگاہ صرف عالم امکان تک ہے اور وہ بھی زیادہ تر اپنے ہی دائرہ محسوسات و مشاہدات میں محدود ہے، حق تعالیٰ کی ذات پاک تک اگر کروڑوں عقلاء میں سے کسی کی رسائی ہوئی بھی تو وہ بہت نا تمام اور ناقص در ناقص تھی، اگر یہاں دلائل کے بڑے تیر چلائے بھی گئے تو زیادہ سے زیادہ یہی دریافت ہو سکا کہ اس عالم کے لیے کوئی فاعل مختار ہونا ضروری ہے جس کی صناعت کی شہادت ذرہ ذرہ میں عیاں ہے، لیکن اس کی توحید اور اس توحید کی نزاکتیں، اس کی صفات اور ان صفات کی دقتیں تو یہاں آ کر عقل بے چاری پھر حیران و سر اسیمہ رہ گئی۔ اس وادی میں جب عقلاء قدیم نے قدم رکھا اور بزور عقل خالق تک رسائی کی سعی نافرجام کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کو فاعل اور علت تو مانا مگر بالایجاب یعنی بے اختیار۔ اس کی ذات اقدس اور عالم کے درمیان بہت سے اور قدما گھڑ لیے، اور عالم اشرف کا وجود جس کے حوالہ کیا اس کا نام عقل عاشر رکھا۔ ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ أَنْ يَقُولُوا إِلَّا كَذِبًا﴾ (الکہف: ۵) وہ افلاک جن کے وجود کا بھی آج کوئی ثبوت نہیں ملتا قدیم مانے گئے بلکہ متحرک بالارادہ کہے گئے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ان میں خرق و التسام یعنی ٹوٹ پھوٹ کا تغیر بھی محال سمجھا گیا اور آخر کار یہاں تک نا فہمی کا ثبوت دیا کہ براہ راست عالم کا صدور ہی حق تعالیٰ کی ذات سے محال قرار دے دیا۔ رہ گئیں صفات باری تعالیٰ تو ان سے بھی ان کو کوئی بہرہ نصیب نہ ہوا ملائکہ اللہ اور دوسرے غیوب کا تو ذکر ہی کیا ہے، آپ نے دیکھا کہ جب انسان ماوراء محسوسات و مشاہدات میں قدم رکھتا ہے تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے۔ پھر جب ہمارے عقلاء کا دور آیا تو ان بلند پروازوں کی نظر اتنی پیچھے رہی کہ انہوں نے تو سرے سے خالق کا انکار کر دیا اور عالم کا وجود خود عالم ہی کے سپرد کر کے اپنی عقل کا سب زور خواص مادیات کی تلاش پر صرف کر ڈالا، پھر اس ضمن میں بھی جو سوال سب سے اہم ان کے سامنے آیا وہ ایسا سوال تھا جس کو انسانی شرافت ہمیشہ خست کی نظر سے دیکھتی رہی ہے یعنی دولت و زر کی تقسیم اور پیٹ کا مسئلہ۔<sup>۱</sup>

۱۔ جب سے اس مسئلہ کا حل اس جدید انداز سے شروع ہوا ہے عالم جس دور حیات سے گزر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اب غریب اس مسئلہ کا حل ایٹم بم سے ہونے والا ہے اور اس کے استعمال کے بعد امید ہے کہ پیٹ کا مسئلہ اور دولت کی تقسیم کا قضیہ خود بخود اتنا مختصر ہو جائے گا کہ اس پر غور و خوض کی جاحت ہی نہ رہے گی اور اس وقت انبیاء علیہم السلام کے علوم اور ان کے برکات اور عقلاء کے علوم اور ان کے نتائج کا موازنہ کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔

کاش یہ عقلاء اگر زرا اس پر غور کر لیتے کہ قدرت نے جس طرح ان کو مختلف ذرائع علم عطا فرمائے ہیں اسی طرح ان کے معلومات کی انواع بھی مختلف بنائی ہیں، حواسِ خمسہ کو دیکھئے ہر حاسہ دوسرے حاسہ کے محسوسات سے کتنا بے خبر ہے مثلاً حاسہ سمع عالم مبصرات سے اسی طرح نا آشنا ہے جس طرح کہ حاسہ بصر عالم مسموعات سے ایک حدید البصر سے حدید البصر انسان ہزار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اگر آواز کو اپنی آنکھوں سے سننا چاہے تو نہ اس کو سن سکتا ہے اور نہ دیکھ ہی سکتا ہے اسی طرح اگر مبصرات کو حاسہ سمع کے قریب سے قریب تر لے آؤ تو اس کو بھی اس کے رنگ و ہیات کا ادنیٰ سا ادراک بھی نہیں ہو سکتا۔ پس اگر یہاں فیصلہ صرف ایک ہی حاسہ کے ادراک پر ختم کر دیا جائے تو نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ محسوسات کے ایک بڑے حصہ کا انکار کر دینا پڑے گا مگر یہاں ہر شخص اس کے انکار کے بجائے اپنے اس حاسہ ادراک ہی کا قصور سمجھتا ہے اگر کہیں قدرت اس کے ادراک کے لیے اس کو دوسرا حاسہ عطا نہ فرمادیتی تو جاہل انسان آپ کو یہاں صرف انکار کرتا ہوا نظر آتا پھر ان حواسِ خمسہ سے بالاتر انسان کو ایک آلہ ادراک اور رحمت ہوا ہے جس کا نام عقل ہے، ان حواسِ خمسہ کی حقیقت عقل کے سامنے ٹھیک وہی ہے جو ایک حاسہ کی دوسرے حاسہ کے سامنے یعنی یہاں حواسِ خمسہ کا مجموعہ مل کر بھی مملکت عقل کے ایک چھوٹے سے چھوٹے گوشہ کے ادراک سے عاجز نظر آتے ہیں۔ اگر رحمت کی فیاضی اس کے علوم کے ادراک کے لیے اس کو دوسرا آلہ ادراک عطا نہ فرمادیتی تو یہ مسکین صرف اپنے حواسِ خمسہ کے بھروسہ پر عقل کے جملہ ادراکات کا منکر ہی نظر آتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوت ادراک میں عقل کا نمبر سب سے فائق تر ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی امر کے ادراک سے بھی وہ عاجز نہیں ہے لیکن اگر فیصلہ صرف کسی ایک ہی حاسہ کے تابع رکھا جائے تو ہر حاسہ اپنے ماحول میں اتنی ہی وسعت اور حدت رکھتا ہے مگر جب دوسرے آلات ادراک کی طرف بھی نظر کی جاتی ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی یہ ساری وسعت اپنے ہی دائرۂ احساس میں محدود تھی، اسی طرح عقل کا حال بھی سمجھنا چاہیے۔ عالم غیب جو حواس اور مشاہدہ اور اسی طرح عقل کی دسترس سے باہر ہے اس کے ادراک سے عقل بھی ٹھیک اسی طرح در ماندہ ہے جیسا کہ حواسِ خمسہ عقل کے علوم کے ادراک سے۔ پس جس طرح وہاں راہِ صواب یہی ہے کہ حواسِ خمسہ ہی کا قصور تسلیم کر لیا جائے اور عقل کی معلومات کا انکار نہ کیا جائے۔ اسی طرح یہاں بھی یہی ایک بات درست ہے کہ ادراکات نبوت اور وحی کا اعتراف کر لیا جائے اور اپنی عقل کوتاہ کی نارسائی کی وجہ سے اس کا انکار نہ کیا جائے۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ وہاں آلہ ادراک یعنی عقل سب کو ملی ہے اور یہاں وحی و نبوت صرف چند مخصوص اور چیدہ افراد کو پھر جس طرح عقلیات میں ہر انسان دوسرے کی عقل پر اعتماد کر لیتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی انبیاء علیہم السلام کی عقل اور دیگر عقلاء کے ان کی تصدیق کرنے پر اعتماد کر لینا چاہیے تھا اور ان کے علوم غیبیہ کو بے چون و چرا تسلیم کر لینا چاہیے تھا۔ مگر یہاں ہر انسان یہی مطالبہ کرتا ہے کہ جب تک براہِ راست وہ خود بھی ان علوم کا ادراک نہ کر لے محض انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر ان کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ۔ (دیکھو مکتوباتِ امام ربانی جلد ثالث ص ۳۸)





## رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک ورق

### حق پسند انسانوں کے غور و فکر کے لیے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس طویل و عریض بحث کے بعد آپ کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک ورق پیش کر دیا جائے جس کو مذکورہ بالا مضمون کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت و رسالت آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں ہی محدود ہو گئی تھی۔ چنانچہ بعد میں جو نبی آیا ان ہی کی ذریت میں آیا آپ کے دو فرزند تھے اسحاق اور اسمعیل علیہما السلام دونوں کا تذکرہ تورات میں موجود ہے۔ حسب بیان تورات حضرت اسمعیل علیہ السلام نسل میں صرف ایک ہی نبی کی بشارت تھی۔ حضرت خلیل علیہ السلام جب بناء بیت سے فارغ ہو چکے تو انہوں نے حضرت اسمعیل علیہ السلام جو بناء بیت میں ان کے شریک تھے ان کی ذریت کے حق میں ایک رسول مبعوث ہونے کی دعاء فرمائی تھی جو اسی بلدہ مبارکہ میں پیدا ہوں جہاں انہوں نے خدا تعالیٰ کا بیت تعمیر فرمایا تھا، چنانچہ دعاء ابراہیمی کے مطابق آپ تشریف لائے۔ نسب میں سب سے عالی، حسب میں سب سے برتر، اپنی عہد طفولیت ہی سے ہمیشہ ممتاز سیرت، ممتاز صورت، عادات و شائل میں قوم سے علیحدہ، عبادات و رسوم میں ان سے الگ، لہو و لعب سے مجتنب، شرک و کفر سے متنفر، صدق و صفا، احسان و سلوک سے مزین، ظلم و عدوان اور جملہ فواحش سے کوسوں دور، جنگ و جدال سے نفور، مال و جاہ کی محبت سے بالاتر، عدل و انصاف کے شاہزادے۔ غرض جملہ اخلاق فاضلہ سے محلی اور جملہ اخلاق رذیلہ سے معری، جوانی میں عصمت و عفت کے فرشتے، پیری میں وقار و رعب کا پیکر، بال بال سے حسن، ٹپکنا، کلمہ کلمہ سے پھول جھڑتے، روئیں روئیں سے فہم و فراست چمکتی، غصہ و محبت اور جدل و ہزل میں یکساں حق گو۔ عفو و درگزر کرنے والے، مخلوق خدا کے سب سے بڑے ہمدرد، عہد و پیمان کے سب سے پکے، سب سے زیادہ راست گو، سب سے بڑھ کر امانت دار، لطف یہ کہ خود امی اور قوم بھی سب امی۔ تورات و انجیل کو نہ آپ جانتے نہ آپ کی قوم جانتی، نہ کسی سے کوئی حرف پڑھا، نہ اہل علم کے پاس نشست و برخاست رکھی، قسیس و رہبان آپ کے موعود نبی ہونے پر سب متفق اور مشرکین عرب سب آپ کی ان صفات کے معترف۔ اسی حالت پر چالیس سال گزارے، کبھی نبوت کا ایک حرف زبان سے نہ نکالا۔ جب عمر مبارک چالیس سال کو پہنچی تو ایک ایسا عجیب و غریب دعویٰ کیا جس سے نہ ملک آشنا، نہ باپ دادا، آشنا اور ایک ایسا کلام لوگوں کے سامنے پیش کیا جو آج تک نہ کسی نے سنا اور نہ آئندہ اس کی نظیر ممکن، صحف سماویہ سب اس کے سامنے سرنگوں نہ الہیات و عملیات میں کوئی اس کے ہم پلہ نہ سیاسیات و معاشیات میں کوئی اس کا ہمسر، اسرار کا مخزن، علوم کا سمندر، قصص و امثال، نصائح و عبرت کا دریا، طبیبات کے حلال کرنے والے اور خباثت کے حرام کرنے والے، بھلائی کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے، کوئی بھلی چیز ایسی نہ تھی جس کو عقول سلیمہ بھلی سمجھیں کہ اس کا حکم نہ دیا ہو اور کوئی برائی ایسی نہ تھی جس کو عقول سلیمہ برا جانیں مگر اس سے روک نہ دیا ہو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جس کا آپ حکم دیں

طبائع سلیمہ کی خواہش یہ ہو کہ آپ اس کا حکم نہ دیتے اور نہ کبھی ایسی بات سے روکا جس کے متعلق طبائع سلیمہ کی تمنا یہ ہو کہ آپ نہ روکتے۔ اس پر ریاست و سرداری سے بیزار دشمنوں اور مخالفوں سے لاپرواہ احباب و انصار سے بے نیاز نہ ہاتھ میں کوئی دولت نہ پشت پر کوئی طاقت نہ قبضہ میں کوئی ملک زن زر کی کوئی دولت نہیں جو قدموں پر ڈال نہ دی گئی ہو اور آپ نے اس کو ٹھکرا نہ دیا ہو جس و قید جلاء وطنی حتیٰ کہ قتل کی کوئی تدبیر اٹھا کر نہیں رکھی گئی جس کو پورا نہ کر لیا گیا ہو مگر آپ دشمنوں کے جھرمٹ میں اسی طرح خدا کے دین کے بے خوف و ہراس مناد کو چوں میں بازاروں میں ایام حج میں کوئی جگہ نہ چھوڑی جہاں پہنچ کر اعلان حق نہ کر دیا ہو تنہائی میں بھی اور محفلوں میں بھی عوام میں بھی اور خواص میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے دین قبول کرنے کے لیے کسی کو قتل کی دھمکی دی ہو یا کسی قسم کی طمع و لالچ دی ہو تیرہ سال اسی طرح گزار دیئے نہ ساز و سامان اور نہ کوئی یار و مددگار مگر نہ دل میں کسی کا خوف نہ چہرہ پر کچھ ہراس۔ جب اقتدار ملا تو دشمنوں سے درگزر اور ایذا رسانیوں کے لیے عفو کا اعلان کسی پر ذرا ظلم و تعدی ہو کیا مجال۔ تمام عمر کانٹے پر تلی ہوئی۔ امن ہو یا خوف فراغت ہو یا تنگی شکست ہو یا فتح اپنے متبعین کی قلت ہو یا کثرت ہر حال میں وہ استقامت کہ ایک انچ قدم ادھر ادھر پڑ جائے کیا ممکن۔

خلاصہ یہ کہ جب دنیا میں تشریف لائے تو فضائے عالم تاریک نہ دنیا سے باخبر نہ ہدایت سے آشنا بت پرستی سے خدا کی زمین ناپاک خوں ریزی اور قتل و غارت سے نالاں نہ مبدء کی خبر نہ معاد کا علم اور جب آپ تشریف لے گئے تو وہی سب سے بڑھ کر عالم سب سے زیادہ مہذب سب میں ممتاز دیندار انصاف و امن کے قائم کرنے والے اور دنیا کی نظروں میں ایسے سر بلند کر اگر ان پر بادشاہوں کی نظر پڑتی تو وہ مرعوب ہو جاتے اور اگر اہل کتاب ان کو دیکھتے تو بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری بھی بھلا ان سے کیا افضل ہوں گے۔

اس اقتدار و قبول کے ساتھ جب آپ نے دنیا کو چھوڑا تو ترکہ میں نہ درہم و دینار نہ کوئی ملک و خزانہ صرف خچر اور ذرہ مبارک کہ وہ بھی ایک یہودی کے ہاتھ میں صاع جو کے عوض میں مرہوں۔

جب آپ کے خلفاء پر نظر کیجئے تو ان میں اول خلیفہ وہ جو سب میں مشہور عاقل اخلاق میں برتر قوم میں محبوب بستی کے بزرگ جس دن سے آپ کا دامن پکڑا پھر مرتے دم تک کسی خطرناک سے خطرناک جگہ ساتھ نہ چھوڑا۔ ہر موقع پر اپنی جان قربان کی اپنا سارا مال آپ کی حمایت میں لٹا دیا اور جب آپ کے بعد خلیفہ ہوئے تو شروع میں پھیری پھر کر اپنا اور گھروالوں کا پیٹ پالتے۔ آخر میں جب مجبوری و وظیفہ قبول کیا تو وہ بھی صرف اتنا کہ بمشکل گزران کے لیے کافی ہو اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو بیت المال کے یہ محدود مصارف بھی بے باق کر گئے۔ (دیکھو فتح الباری ص ۲۴۳ ج ۴)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کہنا ہی کیا۔ روم و فارس کی سلطنتیں فتح کیں۔ پھر بیت المال سے ادھار لے کر کھایا۔ آخر جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو بیت المال کا حجبہ ادا کر گئے اور اس کے لیے ایک گھر جو اپنی ملکیت تھا اس کی فروختگی کی وصیت کر گئے۔

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بات ہی کیا خود غنی مگر ان کا سب مال ہمیشہ مسلمانوں کے لیے بے حساب لٹا رہا۔ پورے اقتدار



کے ساتھ مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ بہنا گوارا نہ فرمایا آخر اپنی جان قربان کر دی۔

حضرت علیؓ اور صاحبزادگان اطہار کا کیا پوچھنا کس مظلومیت میں دین پر جانیں دیں اور صرف حق کی خاطر سچی قربانی کی جو مثالیں قائم کیں وہ تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنی یادگار رہ گئیں۔

امت پر نظر کیجئے تو وہ امت جس کی دیانت داری بے لوثی اور بے طمع بھی مدتوں تک ضرب المثل اپنے مذہب کے اتنے بڑے نگران اور اپنی سماوی کتاب کے بلکہ اپنے رسول کے حرف حرف کے بھی ایسے محافظ جس پر جہان ششدر نہ ان سے قبل اس کی کوئی مثال مل سکتی ہے نہ ان کے بعد ممکن۔ حکمرانی میں اتنے ممتاز کہ صدیوں تک اطراف عالم پر حکمران رعایا میں یگانہ و بیگانہ سب یکساں مداح اور اپنی پستی میں بھی اتنے بھاری کہ عالم ان سے خائف قوموں نے جتنا ان کو منایا اتنے ہی وہ ابھرے۔ الغرض اس دور پستی میں بھی ان کی وہ دھاک کہ عالم کفر کو اگر کچھ خطرہ ہے تو صرف ایک ان سے!

گو یہ کوئی طریقہ عدل و انصاف کا نہیں ہے کہ جب کسی قوم پر نظر ڈالی جائے تو صرف اس کے انحطاط ہی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کے دور عروج کی تاریخ دیگر اقوام کے بالمقابل کیا تھی؟

اب آپ اس رسول اعظم کے یہ اجمالی صفات اور ان کی آمد سے یہ عظیم انقلابات سامنے رکھ کر خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ نبوت کیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کیا ہوتے ہیں اور ان سب میں افضل الرسل اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام رفیع کیا ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ ہماری آنکھیں نیچی ہیں اور قلم شرمندہ کہ بحث و نظر کا جو طریقہ کبھی اہل کتاب اور منکرین کے سامنے اختیار کیا گیا تھا آج بصد افسوس وہی طریقہ مسلمانوں کو ان کے عقائد کی تفہیم کے لیے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال اب تک جو سبق آپ نے تاریخ و عقل کی روشنی میں پڑھا اب ایک بار پھر اس کو حدیثوں کی روشنی میں ملاحظہ فرما لیجئے۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ



جن کو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور ان کی خصوصیات کا

ذرا بھی علم تھا وہ ان کو دیکھ کر یا ان کے مختصر

حالات زندگی سن کر فوراً ان کو

پہچان لیتے تھے

الذین کان لهم علم بسیر الانبیاء

علیہم السلام و معرفة بمیزاتہم

کانوا یعرفونہم بسیمائہم او بنبذہ

من احوالہم من غیر تامل

(۹۷۰) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ أَبَا سُفْيَانَ ابْنَ

حَرْبٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ هِرْقْلَ أَرْسَلَ إِلَيْهِ فِي رَكْبٍ

مِنْ قُرَيْشٍ كَانُوا تَجَارًا بِالشَّامِ فِي الْمَدَّةِ

الَّتِي كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَادْفِيهَا أَبَا سُفْيَانَ وَ كُفَّارَ قُرَيْشٍ فَاتَوْهُ وَ هُمْ

بِإِيلِيَاءٍ فَدَعَا هُمْ وَ حَوْلَهُ عُظَمَاءُ الرُّومِ ثُمَّ

دَعَاهُمْ فَدَعَا بِالتَّرْجُمَانِ فَقَالَ أَيُّكُمْ أَقْرَبُ

نَسَبًا بِهَذِهِ الرَّجُلِ الَّذِي يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ قَالَ

أَبُو سُفْيَانَ فَقُلْتُ أَنَا أَقْرَبُهُمْ فَقَالَ أَذْنُوهُ مِنِّي

وَ قَرَّبُوا أَصْحَابَهُ فَاجْعَلُوهُمْ عِنْدَ ظَهْرِهِ ثُمَّ

(۹۷۰) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ابوسفیان بن حرب نے (یہ

واقعہ ان کے اسلام سے پیشتر کا ہے) ان سے بیان کیا کہ ہرقل (شاہ روم) نے

ان کے بلانے کے لیے ایک آدمی بھیجا جب کہ وہ قریش کے ایک ایسے قافلہ میں

شامل تھے جن کی تجارت ملک شام سے ہوتی تھی۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور دیگر کفار قریش کے ساتھ ایک

معین مدت کے لیے صلح کر رکھی تھی۔ القصہ ابوسفیان مع اپنے قافلہ کے ہرقل کے

دربار میں حاضر ہو گئے۔ اس وقت یہ لوگ اتفاق سے مقام ایلہاء میں تھے۔ ہرقل

نے ان کو اپنے سامنے طالب کیا اس وقت اس کی مجلس میں روم کے اور بڑے

بڑے لوگ بھی موجود تھے پھر ان کو ذرا اور قریب بلایا اور ایک ترجمان طلب کیا اور

قریشی لوگوں سے کہا کہ بلحاظ نسب تم میں وہ شخص کون ہے جو ان کا سب سے زیادہ

(۹۷۰) \* یہ ایسے دو شخصوں کا باہم مکالمہ ہے جن میں ابھی تک دونوں غیر مسلم ہیں یعنی ہرقل شاہ روم اور ابوسفیان رئیس قافلہ پھر کیا بات

تھی کہ ہرقل تو چند سوالات کے بعد ہی حقیقت تک جا پہنچا اور ابوسفیان آپؐ کے چشم دید حالات کے بعد بھی جس بات کے سمجھنے سے قاصر رہا

وہ صرف ایک بات یہی تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ غور کیجئے گا تو آپؐ کو معلوم ہو جائے گا کہ فرق صرف یہ تھا کہ ہرقل چونکہ اہل

کتاب میں سے تھا اس لیے اس کو انبیاء علیہم السلام کے خصائص و امتیازات اور ان کی تاریخ کا پورا علم حاصل تھا اور ابوسفیان ان امور سے

قطعاً لاعلم تھا وہ نہ تو خود اہل کتاب میں سے تھا نہ ان سے استفادہ کا اس کو موقع مل سکا تھا اس کے ماحول میں ساحر و شاعر اور کاہنوں کے سواء

انبیاء علیہم السلام کا کوئی تذکرہ نہ تھا اس لیے نبوت کے مسئلہ کو سمجھنا اس کے لیے ایک لائیکل مسئلہ بنا ہوا تھا۔ عرب کے امیوں کے لیے ایمان

لانے کا راستہ دوسرا تھا جو آئندہ خود ان کے بیانات سے واضح ہوگا۔

ہرقل نے یہاں جتنے سوالات بھی کیے ہیں ان سے قدم قدم پر آپؐ کو یہ ظاہر ہوتا چلا جائے گا کہ اس کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ وہ

انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے اہم اسباق آپؐ کی سیرت میں بھی مطالعہ کر لے اور صرف اسی ایک بات سے آپؐ کے صدق و کذب کا فیصلہ

کردے۔ چنانچہ اس نے آپؐ کے خاندان کی تحقیق سب سے پہلے کی اور اس کا جواب سن کر جو پہلی بات کہی وہ یہی تھی کہ گذشتہ رسول بھی

ہمیشہ عالی خاندان ہی ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب آپؐ کے متبعین کے متعلق یہ جواب سنا کہ اس میں بڑی تعداد عوام اور کمزور طبقہ کی

ہے تو اس کے بعد جو لفظ اس نے کہے وہ بھی یہی تھے کہ یہی جماعت ہے جو پہلے بھی ہمیشہ رسولوں کی متبع ہوا کرتی تھی اسی طرح جب اللہ ....



قریبی رشتہ دار ہو جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ ابوسفیان کہتے ہیں میں نے کہا ان کے سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار میں ہوں۔ یہ سن کر ہر قل نے کہا اچھا ابوسفیان کو میرے اور قریب لے آؤ اور اس کے رفقاء کو اس کی پشت کی جانب پاس بٹھا دو۔ اس کے بعد اپنے ترجمان سے کہا اس کے رفقاء سے کہہ دو کہ میں ان کے متعلق اس شخص سے چند سوالات کرتا ہوں اگر یہ ذرا بھی غلط بیانی سے کام لے تو تم لوگ فوراً اس کی تکذیب کر دینا۔ ابوسفیان کہتا ہے خدا کی قسم اگر مجھ کو اس بات کی غیرت نہ ہوتی کہ میری نسبت لوگ ہمیشہ دروغ گوئی کا عیب لگاتے رہیں گے تو یقیناً میں آپ کے متعلق جھوٹی جھوٹی باتیں بیان کر کے رہتا۔ اس کے بعد سب سے پہلا سوال جو ہر قل نے مجھ سے کیا یہ تھا۔ جو شخص پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے اس کا خاندان کیسا ہے؟ میں نے کہا بڑا شریف گھرانا ہے۔ پھر اس نے پوچھا اس کے خاندان میں سے کسی اور نے کبھی پہلے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں۔ اس نے پوچھا کیا اس کے آباء واجداد میں کوئی بادشاہ بھی ہوا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں۔ پھر ہر قل نے پوچھا اچھا جو لوگ اس پر ایمان لائے ہیں وہ رئیس لوگ ہیں یا غریب؟ میں نے عرض کی جی کمزور اور غریب لوگ۔ پھر ہر قل نے پوچھا ان کی مردم شماری بڑھ رہی یا گھٹ رہی ہے؟ میں نے عرض کی بڑھ رہی ہے۔ پھر اس نے پوچھا کوئی شخص اس کے دین سے بیزار ہو کر پھر بھی جاتا ہے؟ میں نے عرض کی جی نہیں۔ اس کے بعد ہر قل نے سوال کیا پیغمبری کے دعوے سے بھی پہلے تم لوگوں نے کبھی اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی ہے؟ میں نے عرض کی جی نہیں۔ پھر اس نے پوچھا یہ

قَالَ لَتَرْجُمَانِهِ قُلْ لَهُمْ اِنِّیْ سَئِلٌ هَذَا عَنْ هَذَا الرَّجُلِ فَاِنْ كَذَّبَنِیْ فَكَذَّبُوْهُ فَوَاللّٰهِ لَوْ لَا الْحِیَاءُ اَنْ یُّوْثِرُوْا عَلٰی كَذِبًا لَّكَذَّبْتُ عَنْهُ ثُمَّ كَانَ اَوَّلَ مَا سَئَلَنِیْ عَنْهُ اَنْ قَالَ کَیْفَ نَسَبُهُ فِیْكُمْ قُلْتُ هُوَ فِیْنَا ذُوْ نَسَبٍ قَالَ فَهَلْ قَالَ هَذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ اَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهُ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ اَبَانِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَاَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوْهُ اَمْ ضَعَفَاوْهُمْ قُلْتُ ضَعَفَاءُ هُمْ قَالَ اَیْزِیْدُوْنَ اَمْ یَنْقُصُوْنَ قُلْتُ بَلْ یَزِیْدُوْنَ قَالَ فَهَلْ یَسْتَدُّ اَحَدٌ مِنْهُمْ سُخْطَةً لِّدِیْنِهِ بَعْدَ اَنْ تَدْخُلَ فِیْهِ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ تَتَّهَمُوْنَهُ بِالْكَذْبِ قَبْلَ اَنْ یَقُوْلَ مَا قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ یَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَ نَحْنُ مِنْهُ فِیْ مُدَّةٍ لَا نَدْرِیْ مَا هُوَ فَاعِلٌ فِیْهَا وَلَمْ یُمْکِنْنِیْ کَلِمَةً اَدْخُلُ فِیْهَا شَیْئًا غَیْرَ هَذِهِ الْکَلِمَةِ قَالَ فَهَلْ قَاتِلْتُمُوْهُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَکَیْفَ كَانَ قِتَالُکُمْ اِیَّاهُ قُلْتُ الْحَرْبُ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهُ سَجَالٌ یْنَالُ مِنَّا وَ نَنَالُ مِنْهُ قَالَ فَمَاذَا

للہ ..... اس کو معلوم ہوا کہ آپ کی جماعت برابر ترقی پر ہے اور ان میں اپنے دین سے ناراض ہو کر اس کو ترک کرنے والا ایک تنفس بھی نہیں ہے تو یہاں بھی اس نے انبیاء سابقین پر ایمان لانے والوں کا حال بھی بیان کیا ہے۔ پھر جب اس نے آپ کے صدق و کذب کا حال دریافت کیا جو کسی نبی کے لیے سب سے پہلی شرط ہوتی ہے تو جو کلمات ابوسفیان کی زبان سے نکلے وہی سب سے زیادہ زوردار تھے وہ کہتا ہے کہ آپ کے صدق و صفا کا پوچھنا ہی کیا ہے یہاں دوست تو دوست دشمن بھی آپ کو صدق و امین کے لقب سے پکارتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ نازک مسئلہ جنگ کا ہے یہ معاملہ قومی ہوتا ہے اور یہاں ایک راست باز سے راست باز انسان بھی لغزش کر سکتا ہے مگر جب ہر قل کو معلوم ہوا کہ آپ کے پائے استقلال کو یہاں بھی ادنیٰ سی لغزش نہیں ہوتی اور یہاں بھی آپ ایفاء عہد میں نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر اس کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں تو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ استقامت تو صرف انبیاء علیہم السلام ہی کا حصہ ہوتی ہے۔ صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے کہ جنگ کے نتائج کا حال سن کر ہر قل نے کہا کہ شکست و فتح میں انبیاء سابقین کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وہ ان دونوں للہ .....

يَأْمُرُكُمْ قُلْتُ أَعْبُدُوا اللَّهَ وَحْدَهُ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَاتْرُكُوا مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالصَّدَقِ وَالْعِفَافِ وَالصَّلَاةِ فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ قُلْ لَهُ إِنِّي سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهِ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ فِيكُمْ ذُونَسَبٍ وَكَذَلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِي نَسَبٍ قَوْمِهَا وَسَأَلْتُكَ هَلْ قَالَ أَحَدٌ مِنْكُمْ هَذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقُلْتُ لَوْ كَانَ أَحَدٌ قَالَ هَذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ لَقُلْتُ رَجُلٌ يَتَأَسَّى بِقَوْلٍ قِيلَ قَبْلَهُ وَسَأَلْتُكَ هَلْ كَانَ فِي آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقُلْتُ لَوْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ رَجُلٌ يَطْلُبُ مُلْكَ أَبِيهِ وَسَأَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهَمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقَدْ أَعْرِفَ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبُ عَلَى اللَّهِ وَسَأَلْتُكَ أَشْرَافَ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضَعَفَاءُ هُمْ فَذَكَرْتَ أَنَّ ضَعَفَاءَ هُمْ اتَّبَعُوهُ وَهُمْ أَتْبَاعُ الرُّسُلِ وَ

شخص کبھی عہد و پیمان کو توڑ بھی دیتے ہیں میں نے جواب دیا نہیں۔ لیکن ان کے ساتھ اس سال جو ہمارا معاہدہ ہوا ہے دیکھنا ہے کہ اس کو وہ پورا کرتے ہیں یا نہیں۔ ابو سفیان کا بیان ہے کہ ایک بات کے سواء آپ کے حالات میں نکتہ چینی کا ایک حرف بھی میں داخل نہ کر سکا۔ پھر اس نے سوال کیا اچھا ان کے ساتھ کبھی تمہاری جنگ بھی ہوئی ہے؟ میں نے جواب دیا جی ہاں۔ اس نے پوچھا تو اس کا نتیجہ کیا رہا؟ میں نے عرض کی اس کے اور ہمارے درمیان جنگ ڈول کی طرح سے رہتی ہے کبھی وہ جیت جاتے ہیں (بدر) اور کبھی ہم (احد) پھر اس نے پوچھا وہ تم کو کس بات کی تعلیم دیتے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ صرف ایک خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ آباء و اجداد کی بت پرستی چھوڑ دو نماز پڑھو سچ بولو یا کباز بنو رشتہ کا حق پہچانو۔ یہ تمام حالات سن کر ہر قل نے اپنے ترجمان سے کہا ابو سفیان سے کہہ دو میں نے ان کے خاندان کے متعلق تجھ سے تحقیق کی تو تو نے جواب دیا وہ بڑے شریف المنسب ہیں اور اسی طرح نبی ہمیشہ شریف گھرانے کے ہوتے چلے آئے ہیں۔ پھر میں نے تجھ سے پوچھا اس کے دعویٰ نبوت سے قبل تم میں سے کسی اور نے تو کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا؟ تو تو نے جواب دیا نہیں۔ اس پر میں نے سوچا کہ اگر کوئی شخص ان سے پہلے بھی یہ دعویٰ کر چکا ہوتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ یہ اس دعوے کی ریس کرتے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا تھا کہ ان کے باپ دادا میں کوئی بادشاہ تو نہیں گذرا؟ تو تو نے جواب دیا نہیں۔ اس پر میں نے خیال کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھ لیتا کہ وہ اس بہانہ سے اپنے باپ دادا کی سلطنت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر میں نے تم سے اس

للہ ..... حالتوں سے گزرتے تھے پھر آخر کار کامیابی ان ہی کو نصیب ہوتی تھی۔ اس مسئلہ پر اگر عقلی طور سے غور فرمائیے تو شاید آپ پر حکم لگائیں کہ صداقت کی علامت دائمی فتح ہونی چاہیے۔ مگر یہاں ہر قل اس کے برعکس گاہ گاہ شکست کو بھی صداقت کی علامت سمجھتا ہے کیونکہ وہ انبیاء سابقین کی تاریخ پڑھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ بشر ہوئے ہیں اور اس لیے ان کی حیات میں انسانی حیات کے سب نشیب و فراز نظر آنے چاہئیں۔ آخر میں اس نے آپ کی تعلیمات کے متعلق اہم سوال کیا ہے اور جب خوب دیکھ لیا کہ آپ کی تاریخ نبوت کی تاریخ سے کہیں بھی سر موخلاف نہیں جاتی تو آپ کے رسول برحق ہونے کے اظہار پر مجبور ہو گیا یہ دوسری بات ہے کہ دنیا کی عارضی بادشاہت کی طمع نے آخرت کی لازوال بادشاہت سے اس کو محروم رکھا۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام جب کبھی صفات عالم پر نمودار ہوئے ہیں تو ان کے سامنے مختلف طبقات کے لوگ آئے ہیں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا تھا جو رسولوں کی جنس ہی سے انکار کرتے تھے جیسے قوم نوح علیہ السلام اور قوم عاد و ثمود علیہما السلام انی لیے للہ.....



سَأَلْتُكَ أَيْزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ فَذَكَرْتُ  
أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ وَكَذَلِكَ أَمْرُ الْإِيمَانِ حَتَّى  
يَتِمَّ وَ سَأَلْتُكَ أَيْرَتُدُّ أَحَدٌ سَخَطَةً لَدَيْهِ بَعْدَ  
أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ فَذَكَرْتُ أَنْ لَا وَ كَذَلِكَ  
الْإِيمَانُ حِينَ تُخَالِطُ بِشَاشَتِهِ الْقُلُوبَ وَ  
سَأَلْتُكَ هَلْ يَغْدِرُ فَذَكَرْتُ أَنْ لَا وَ  
كَذَلِكَ الرُّسُلُ لَا تَغْدِرُ وَ سَأَلْتُكَ بِمَا  
يَأْمُرُكُمْ فَذَكَرْتُ أَنَّهُ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَعْبُدُوا اللَّهَ  
وَحْدَهُ وَ لَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَ يَنْهَاكُمْ عَنْ  
عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ وَ يَأْمُرُكُمْ بِالصَّلَاةِ وَ الصَّدَقِ  
وَ الْعَفَافِ فَإِنْ كَانَ مَا تَقُولُ حَقًّا فَسَيَمْلِكُ  
مَوْضِعَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ وَ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ  
خَارِجٌ لَمْ أَكُنْ أَظُنُّ أَنَّهُ مِنْكُمْ فَلَوْ أَعْلَمْتُ أَنِّي  
أَخْلَصُ إِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهُ وَ لَوْ

کی تحقیق کی کہ کیا اس دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی ہے؟ تو تو نے بیان کیا نہیں۔ اس پر میں نے سوچا یہ نہیں ہو سکتا کہ جس شخص نے کبھی لوگوں پر جھوٹ نہیں بولا ہے وہ خدا پر جھوٹ باندھے۔ اس کے بعد میں نے سوال کیا کہ اس کو ماننے والا طبقہ غریبوں کا ہے یا رئیسوں کا؟ تو تو نے بتایا غریب مسکینوں کا اور ہمیشہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو رسولوں کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ پھر میں نے دریافت کیا ان کی مردم شماری بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے تو تو نے بتایا بڑھتی ہے اور درحقیقت ایمان کا یہی نقشہ ہوتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے آخر حد کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر میں نے تجھ سے پوچھا کوئی شخص ان کا دین قبول کرنے کے بعد اس سے کبھی بیزار ہو کر پھر بھی جاتا ہے؟ تو نے جواب دیا نہیں اور لذت ایمان کی تاثیر درحقیقت یہی ہوتی ہے کہ جب وہ دلوں میں گھر کر جاتی ہے تو پھر نکال نہیں کرتی۔ پھر میں نے تجھ سے پوچھا وہ عہد شکنی تو نہیں کرتے؟ تو نے جواب دیا نہیں۔ اور تمام نبیوں کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ کبھی عہد شکنی نہیں کرتے۔ پھر میں نے تجھ سے پوچھا تم کو تعلیم کیا دیتے ہیں؟ تو نے بیان کیا یہ کہ صرف ایک خدا کی پرستش کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور بتوں کی پوجا سے تم کو منع کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں

للہ ..... قرآن کریم نے ان کا حال ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے: ﴿كَذَبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ كَذَبَتْ قَوْمُ عَادِ الْمُرْسَلِينَ ۝ كَذَبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝﴾ دوسرا طبقہ وہ تھا جن کو رسولوں کی ضرورت اور ان کی جنس تو مسلم تھی مگر ان کو یہ بحث رہتی تھی کہ رسول وہی مبشر رسول ہے یا نہیں۔ یہاں ہر قل چونکہ اہل کتاب میں سے تھا اس کے سامنے ضرورت نبوت و رسالت کا مسئلہ نہ تھا اس لیے اس کے سوالات بھی اس نوعیت کے نہ تھے جو رسالت کی ضرورت پر روشنی ڈالتے اس کو صرف یہ تحقیق کرنی تھی کہ جس رسول کی بشارات وہ کتب سابقہ میں پڑھتا چلا آ رہا ہے جس کا حلیہ جس کی صفات اور جس کی زندگی کی مفصل تاریخ اس نے مطالعہ کی ہے کیا یہ وہی رسول منتظر ہیں؟ اسی لیے حقیقت تک رسائی میں اس کو صرف ایک ہی قدم کی دیر تھی اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی آمد کی تاریخ مقرر ہو جائے تو اس مقرر تاریخ پر ہوائی جہازوں کی آمد اور توپوں کی آوازوں کے سننے کے ساتھ ہی فوراً یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ بادشاہ کی آمد ہو گئی ہے یہاں کسی وہمی مزاج شخص کو بھی یہ خطرہ نہیں گزرتا کہ بادشاہ کی آمد کے سوا یہاں کوئی دوسرا احتمال بھی ہوگا۔ چنانچہ ہر قل نے آخر میں خود ہی اس کی تصریح کر دی کہ مجھے ان کی آمد کا تو یقین تھا مگر تحقیق طلب بات صرف یہ تھا کہ وہ رسول منتظر کہاں مبعوث ہوئے ہیں۔ میرے گمان میں یہ نہ تھا کہ اس رسول اعظم کی آمد کے لیے نظر ربوبیت امیوں کا انتخاب کر چکی ہے۔ ترجمان السنہ ج ۲ ص ۶۸ میں آپ یہ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ابن نا طور نے بھی جو اہل کتاب میں ہر قل ہی کے مرتبہ کا دوسرا عالم سمجھا جاتا تھا جب آپ کی تفصیلات سنیں تو آپ کے آخری رسول ہونے میں ہر قل کے ساتھ قطعی طور پر اتفاق کیا۔ للہ .....

كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ ثُمَّ دَعَا  
بِكِتَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
الَّذِي بَعَثَ بِهِ دَحِيَّةَ إِلَى عَظِيمِ بَصْرَى  
فَدَفَعَهُ إِلَى هِرْقَلٍ فَقَرَأَهُ فَإِذَا فِيهِ بِسْمِ اللَّهِ  
الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ) عَبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى هِرْقَلٍ عَظِيمِ  
الرُّومِ. سَلَامٌ عَلَى مَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى أَمَا بَعْدُ  
فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدَعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْتَ تَسْلَمَ  
يُوتِكَ اللَّهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ  
عَلَيْكَ أَثْمَ الْأَرِيسِيِّينَ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ  
تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا  
نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ  
بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا

کہ نماز پڑھو سچ بولو پابکار ہو۔ اگر تم نے یہ سب جوابات سچ دیئے ہیں تو ایک دن  
وہ میرے ان قدموں کی جگہ یعنی شام و بیت مقدس کے مالک ہو کر رہیں گے مجھے  
اس کا تو پہلے سے علم تھا کہ ایک نبی آنے والے ہیں مگر یہ گمان نہ تھا کہ وہ تم میں سے  
ہوں گے۔ اگر میں ان کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تو آپ کی ملاقات کے لیے پوری  
سعی کرتا اے کاش کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کے قدم مبارک دھو  
کر پیتا۔ اس کے بعد اس نے آپ کا وہ نامہ مبارک جو دحیہؓ نے بصری کی معرفت  
بھیجا تھا طلب کیا انہوں نے ہرقل کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کو پڑھا تو اس کا  
مضمون یہ تھا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ خط ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے جو اللہ  
تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہے ہرقل کے نام جو روم کا بڑا معزز شخص ہے۔ وہ لوگ  
سلامت رہیں جو سیدھی راہ چلیں۔ میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اسلام قبول کر لو  
دونوں جہان کی آفتوں سے محفوظ رہو گے اور تم کو اللہ تعالیٰ اس کا دو گنا ثواب دے گا  
اور اگر تم نے انکار کیا تو اریس کے سب متبعین کا گناہ تمہارے سر رہے گا۔ اے اہل  
کتاب ایک ایسی بات کی طرف آ جاؤ جس میں ہمارے تمہارے درمیان کوئی

اللہ..... اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ رسول صرف عالی نسب یا صادق القول ہونے سے رسول نہیں بن جاتے۔ رسول بننے کے  
لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رسول بنادے۔ البتہ جس کو وہ رسول بنادیتا ہے اس کے لیے پھر یہ ضروری ہوتا ہے کہ  
وہ ان تمام صفات کا مالک ہو جو حدیث ہرقل میں آپ نے پڑھی ہیں۔ نیز یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جہاں چند امور کے مجموعہ سے یقین  
حاصل ہو گیا ہو وہاں ہر ہر جزاء علیحدہ بھی یقین کا فائدہ دے سکے اس لیے یہ بھی غلط ہے کہ اس مجموعہ کے بعض اجزاء کو لے کر نبوت کی دلیل  
بنادیا جائے۔

یہاں ایک تیسرا طبقہ امت محمدیہ کا ہے جس کے سامنے ان مسائل میں سے اب کوئی مسئلہ بھی باقی نہیں ہے وہ نبوت کی ضرورت سمجھنے  
سے جس طرح مستغنی ہے اسی طرح کسی جدید نبی کی آمد کے انتظار اور اس کی تعیین کی بحث سے بھی فارغ ہو چکی ہے۔ کتنی بد نصیبی ہوگی کہ جو  
امت ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کی اجمالی اور تفصیلی تاریخ پڑھ چکی ہو اس کے افراد یا تو نبوت کی ضرورت پر بحث کرنے والوں کی  
صف میں نظر آئیں یا پھر کسی جدید رسول کی تلاش میں سرگرداں و سراسیمہ ہوں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسول جب دنیا میں آتے ہیں تو وہ  
پہلے سے اپنا پورا تعارف بھی رکھتے ہیں ان کی بشارت بیان ہو جاتی ہے۔ ان کی علامات بلکہ مختصر تذکرہ بھی امت کے سامنے ذکر میں آ جاتا  
ہے۔ اس لیے جب وہ ان تمام خصوصیات و امتیازات کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں جو اس نوع کی ہمیشہ ہوتی چلی آئی ہیں۔ تو یہاں ان کے  
مخالفین میں ان کو مجنون سمجھنے والی صرف وہی ایک جماعت ہوتی ہے جو تاریخ نبوت سے جاہل ہوتی ہے۔ کیا مجنون اور صغراء کے مریض اسی  
اہتمام اور اسی تاریخ حیات کو لے کر آیا کرتے ہیں؟ لیکن ناشکر انسان جب اللہ تعالیٰ کی بڑی سے بڑی نعمت کا انکار کرنے پر آمادہ لگے.....



فَقُولُوا أَشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ . قَالَ قَالَ أَبُو  
سُفْيَانٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فَلَمَّا قَالَ مَا  
قَالَ وَفَرَعَ مِنْ قِرَاءَةِ الْكِتَابِ كَثُرَ عِنْدَهُ  
الصُّخْبُ وَارْتَفَعَتِ الْأَصْوَاتُ وَ أَخْرَجْنَا  
فَقُلْتُ لِأَصْحَابِي لَقَدْ أَمَرَ أَمْرُ ابْنِ أَبِي  
كَبْشَةَ إِنَّهُ يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الْأَصْفَرِ فَمَا  
زِلْتُ مُوقِنًا أَنَّهُ سَيُظْهِرُ حَتَّى أَدْخَلَ اللَّهُ  
عَلَى الْإِسْلَامِ .

(رواه البخاری و قد مضى باقى الحديث فى

ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۶۶)

(۹۷۱) قَالَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ فِى خُرُوجِهِ  
إِلَى الْمَقَوْسِ مَعَ بَنِي مَالِكٍ وَ أَنَّهُمْ لَمَّا  
دَخَلُوا عَلَى الْمَقَوْسِ قَالَ كَيْفَ خَلَصْتُمْ  
إِلَى مَنْ طَائِفَتِكُمْ وَ مُحَمَّدٌ وَ أَصْحَابُهُ بَيْنِي  
وَ بَيْنَكُمْ؟ قَالُوا الصَّقْنَا بِالْبَحْرِ وَ قَدْ خِفْنَا

اختلاف نہیں ہے یعنی یہ کہ ایک اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس  
کا شریک نہ ٹھہرائیں اور آپس میں کوئی کسی کے لیے خدائی کا درجہ تجویز نہ کرے۔ اگر  
اہل کتاب اتنی بات بھی نہ مانیں تو تم ان سے صاف کہہ دو کہ ہم تو خدا کے فرمان  
بردار ہو چکے۔ ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ ابوسفیان کہتے ہیں جب ہرقل کو جو کہنا  
تھا اس نے کہہ لیا اور آپ کا نام مبارک پڑھ کر وہ فارغ ہو گیا تو اس کی محفل میں  
ایک چیخ و پکار اور غوغا مچ گیا۔ اور ہم لوگ باہر نکال دیئے گئے تو میں نے باہر آ کر  
اپنے رفقاء سے کہا ابن ابی کبشہ (اس کنیت سے مراد آپ کی ذات تھی) کا معاملہ تو  
اب ایسا بڑھ گیا کہ روم کا بادشاہ تک ان سے ڈرتا ہے اس کے بعد سے مجھے ہمیشہ  
اس بات کا یقین رہا کہ آپ عنقریب سب پر غالب آ جائیں گے یہاں تک کہ وہ  
روزِ سعید آ پہنچا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مشرف باسلام فرمادیا۔ (بخاری شریف)

(۹۷۱) مغیرہ بن شعبہؓ (اپنے اسلام لانے سے قبل) اپنے اس سفر کا حال  
بیان کرتے ہیں جس میں وہ قبیلہ بنی مالک کے ساتھ شاہ مقوقس کے پاس  
گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں جب وہ پہنچے تو شاہ مقوقس نے پوچھا۔ محمد (صلی اللہ  
علیہ وسلم) اور ان کے رفقاء کے ہوتے ہوئے تم یہاں میرے پاس تک بھلا  
کیسے پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا ہم دریا کے کنارہ کنارہ آباد ہو گئے تھے مگر ہم کو

اللہ ..... ہوتا ہے تو اس سے زیادہ حیا سوز کلمات سے بھی نہیں شرما تا۔ ﴿قَتَلَ الْإِنْسَانُ مَا اكْفَرَهُ﴾

لفظ اریسین کی تحقیق: اس لفظ کے ضبط و تحقیق میں شارحین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ لیکن تاریخ کی روشنی میں جو بات رائج قرار  
پاتی ہے وہ یہ ہے کہ ”عبداللہ بن اریس“ ایک مشہور پادری تھا یہ اسکندر یہ میں قسوس کا منصب رکھتا تھا اور اس کا عقیدہ تو حید ہی کا تھا اور  
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کی مخلوق اور اس کا بندہ ہی سمجھتا تھا۔ اس کا زمانہ وہی تھا جس میں قسطنطین اول بانی قسطنطنیہ ہوا ہے۔  
شاہانِ روم میں سب سے پہلے نصرانی مذہب اختیار کرنے والا یہی تھا اور اسی ”اریس“ پادری کا مقلد تھا۔ اس لحاظ سے جو لوگ اس کے متبع  
تھے ان کو اریسین کہا جاتا تھا۔ یہ ہرقل اور اس کی رعایا بھی چونکہ اسی کی متبع تھی اس لیے ان کو اریسی کہا جاتا تھا۔ لہذا آپؐ نے اپنے نامہ  
مبارک میں اس کو یہ تنبیہ فرمائی تھی کہ اگر تو اسلام سے منحرف ہوا تو تیری اتباع میں اریس کے جتنے متبعین ہیں تیری رعایا ہونے کی وجہ سے یہ  
بھی منحرف ہو جائیں گے اس لیے اس لیے ان کے انحراف کا گناہ بھی تیری گردن پر رہے گا (دیکھو مشکل الآثار امام طحاوی۔ الملل والنحل  
ابن حزم ج ۱ ص ۲۸ اور الجواب الصحیح ج ۳ ص ۱۴) ہماری اس تحقیق سے جنہوں نے اس لفظ کے معنی رعایا لکھے ہیں ان کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی  
ہوگی۔ یعنی چونکہ اریس کے متبع لوگ ہی اس کی رعایا تھے اس لیے بلحاظ مصداق رعایا کو اریسی کہنا بھی صحیح ہے گو بلحاظ لغت اس کا صحیح ترجمہ  
”اروس والے لوگ“ ہی صحیح ہو۔ تاریخ میں اس کا نام اروس اور اریوس دونوں طرح نظر سے گذرا ہے۔

عَلَى ذَلِكَ قَالَ فَكَيْفَ صَنَعْتُمْ فِيمَا دَعَا  
كُمُ إِلَيْهِ قَالُوا مَا تَبِعَهُ مِنَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ قَالَ وَ  
لَمْ ذَلِكَ؟ قَالُوا جَاءَ نَابِدِينَ مُجَدِّدٍ لَا تَدِينُ  
بِهِ الْأَبَاءُ وَلَا يَدِينُ بِهِ الْمُلُكُ وَ نَحْنُ عَلَى  
مَا كَانَ عَلَيْهِ آبَاءُ نَا قَال فَكَيْفَ صَنَعَ قَوْمُهُ  
قَالُوا تَبِعَهُ أَحَدًا تُهُمْ وَقَدْ لَاقَاهُ مَنْ خَالَفَهُ مِنْ  
قَوْمِهِ وَ غَيْرِهِمْ مِنَ الْعَرَبِ فِي مَوَاطِنَ مَرَّةً  
تَكُونُ عَلَيْهِمُ الدَّائِرَةُ وَمَرَّةً تَكُونُ لَهُ قَالَ أَلَا  
تُخْبِرُونَنِي إِلَى مَاذَا يَدْعُو إِلَيْهِ قَالَ يَدْعُونَا إِلَى  
أَنْ نَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ نَخْلَعَ مَا  
كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَ يَدْعُو إِلَى الصَّلَاةِ وَ  
الزَّكَاةِ قَالَ وَ مَا الصَّلَاةُ وَ الزَّكَاةُ أَلَهَا وَقْتُ  
يُعْرَفُ وَ عَدَدٌ تَنْتَهِي إِلَيْهِ؟ قَالُوا يُصَلُّونَ فِي  
الْيَوْمِ وَ اللَّيْلَةِ خَمْسَ صَلَوَاتٍ كُلَّهَا  
لِمَوَاقِيتِ وَ عَدَدٌ سَمُوهُ لَهُ وَ يُؤَدُّونَ مِنْ كُلِّ  
مَا بَلَغَ عَشْرَيْنَ مِثْقَالًا لَا نِصْفَ مِثْقَالٍ وَ أَخْبَرَهُ  
بِصَدَقَةِ الْأَمْوَالِ كُلِّهَا قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ إِذَا  
أَخَذَهَا أَيْنَ يَضَعُهَا؟ قَالُوا يَرُدُّهَا عَلَى  
فُقَرَائِهِمْ وَ يَأْمُرُ بِصَلَةِ الرَّحِمِ وَ وَفَاءِ الْعَهْدِ وَ  
تَحْرِيمِ الزَّوْنَاءِ وَ الْخَمْرِ وَ لَا يَأْكُلُ مِمَّا ذُبِحَ  
لِغَيْرِ اللَّهِ فَقَالَ الْمَقْوُوسُ هَذَا نَبِيُّ مُرْسَلٌ  
إِلَى النَّاسِ وَ لَوْ أَصَابَ الْقَبْطُ وَ الرُّومَ اتَّبَعُوهُ  
وَ قَدْ أَمَرَهُمْ بِذَلِكَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ وَ هَذَا  
الَّذِي تَصِفُونَ مِنْهُ بُعِثَ بِهِ الْأَنْبِيَاءُ مِنْ قَبْلِهِ وَ  
سَيَكُونُ لَهُ الْعَاقِبَةُ حَتَّى لَا يُنَازِعُهُ أَحَدٌ وَ  
يُظْهَرُ إِلَى مُنْتَهَى الْخُفِّ وَ الْحَافِرِ وَ مُنْقَطِعِ

یہاں بھی ان کا خوف لگا رہتا تھا۔ اس نے کہا اچھا بتاؤ ان کی باتوں پر تم نے کیا  
عمل کیا؟ انہوں نے کہا۔ ہم میں سے تو کسی ایک نے بھی ان کی بات نہیں مانی۔  
اس نے کہا کیوں؟ ہم نے کہا اس لیے کہ وہ ایک ایسا انوکھا دین لے کر آئے  
ہیں جس کو نہ ہمارے بڑوں نے مانا نہ ملک اس کو مانتا ہے اور ہم تو اپنے بڑوں ہی  
کے دین پر قائم ہیں اس نے پوچھا کہ اچھا تو اس کی قوم کے لوگوں نے کیا کیا؟  
ہم نے کہا انو جوانوں نے تو اس کو مان لیا ہے جو لوگ مخالف تھے خواہ وہ عرب تھے  
یا غیر عرب انہوں نے ان کے ساتھ جنگ کی نتیجہ میں کبھی ان کو شکست ہوتی رہی  
کبھی آپ کو پھر اس نے پوچھا اچھا یہ تو بتاؤ کہ آخر وہ کن باتوں کی دعوت دیتا  
ہے؟ ہم نے کہا اس کی کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں جس کا کوئی شریک  
نہیں۔ اور جن بتوں کی ہمارے بزرگ عبادت کرتے آئے ہیں ان کو یکخت  
چھوڑ دیں اور نماز اور زکوٰۃ کی بھی دعوت دیتے ہیں۔ اس نے کہا۔ نماز اور زکوٰۃ  
کیا چیز ہے؟ کیا اس کا کوئی وقت بھی مقرر ہے جس کو لوگ جانتے ہوں اور کوئی  
مقرر عدد بھی ہے؟ انہوں نے کہا شب و روز میں وہ پانچ نمازیں پڑھتے ہیں اور  
پانچوں کی پانچوں اپنے اپنے وقتوں میں پھر اس سے ان کا عدد بھی بیان کیا۔ نیز  
یہ لوگ ہر مال میں سے جس کی قیمت بیس مثقال ہوتی ہے نصف مثقال ادا  
کرتے ہیں۔ اس کے بعد مال کے جملہ اقسام میں جو جو صدقہ واجب ہوتا تھا وہ  
سب تفصیلاً بیان کیا۔ اس نے پوچھا اچھا بتاؤ تم سے وصول کر کے پھر یہ صدقہ وہ  
کہاں خرچ کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ جن کے مال داروں سے  
وصول کرتے ہیں ان ہی کے فقیروں پر تقسیم کر دیتے ہیں اور عزیزوں کے ساتھ  
حسن سلوک اور عہد پورا کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں زنا اور شراب کو حرام قرار  
دیتے ہیں اور بجز اللہ کے نام کے کسی اور کے نام کا ذبیحہ نہیں کھاتے۔ یہ سن کر شاہ  
مقوس نے کہا۔ خوب سن لو کہ یہ اللہ کے برحق نبی ہیں جن کو اللہ نے سب لوگوں  
کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اگر وہ مصر اور روم کے پاس بھی پہنچیں گے تو وہ  
لوگ بھی ان کی اتباع کریں گے کیونکہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام بھی ان کی اتباع کا  
حکم دے گئے ہیں اور جو جو باتیں تم لوگ بیان کر رہے ہو ان ہی سب باتوں کو لے  
کر پہلے تمام انبیاء علیہم السلام بھی مبعوث ہوئے ہیں۔ یقین رکھو کہ نتیجہ ان ہی کے



الْبُحُورِ وَيُوشِكُ قَوْمُهُ أَنْ يَدْأِفُوهُ بِالرَّاحِ  
قَالُوا فَلَوْ دَخَلَ النَّاسُ كُلُّهُمْ مَعَهُ مَا دَخَلْنَاهُ  
قَالَ الْمُغِيرَةُ فَاَنْغَضَ الْمُقَوْقِسُ رَأْسَهُ وَقَالَ  
أَنْتُمْ فِي اللَّعِبِ ثُمَّ قَالَ كَيْفَ نَسَبُهُ فِي قَوْمِهِ؟  
هُوَ أَوْ سَطُهُمْ نَسَبًا قَالَ كَذَلِكَ<sup>۱</sup> وَالْمَسِيحُ  
الْأَنْبِيَاءُ تَبَعَتْ فِي نَسَبِ قَوْمِهَا ثُمَّ قَالَ  
فَكَيْفَ صِدْقُ حَدِيثِهِ قَالَ قُلْنَا مَا يُسَمَّى إِلَّا  
الْأَمِينُ مِنْ صِدْقِهِ قَالَ انْظُرُوا فِي أَمْرِكُمْ  
أَتَرُونَهُ يَصْدُقُ فِيمَا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ وَيَكْذِبُ  
عَلَى اللَّهِ قَالَ فَمَنْ تَبِعَهُ قُلْنَا الْأَخْدَاطُ قَالَ  
هُمْ<sup>۲</sup> وَالْمَسِيحُ اتَّبَعَ الْأَنْبِيَاءَ قَبْلَهُ قَالَ فَمَا  
فَعَلْتُ يَهُودُ يَشْرِبُ فَهُمْ أَهْلُ التَّوْرَةِ قُلْنَا  
خَالِفُوهُ فَأَوْقَعَ بِهِمْ فَقَتَلَهُمْ وَسَبَاهُمْ وَ  
تَفَرَّقُوا فِي كُلِّ نَاحِيَةٍ قَالَ هُمْ قَوْمٌ حَسَدَةٌ  
حَسَدُوهُ أَمَا إِنَّهُمْ يَعْرِفُونَ مِنْ أَمْرِهِمْ مِثْلَ مَا  
نَعْرِفُ قَالَ الْمُغِيرَةُ فَقُمْنَا مِنْ عِنْدِهِ وَقَدْ  
سَمِعْنَا كَلَامًا ذَلَّلَنَا لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ وَخَضَعْنَا لَهُ وَمُلُوكُ الْعَجَمِ يَصْدُقُونَهُ  
وَيَخَافُونَهُ فِي بَعْدِ أَرْحَامِهِمْ مِنْهُ وَنَحْنُ  
أَقْرَبَاؤُهُ وَجِيرَانُهُ وَلَمْ نَدْخُلْ مَعَهُ وَقَدْ جَاءَ  
نَادِئًا إِلَى مَنْزِلِنَا قَالَ الْمُغِيرَةُ فَرَجَعْتُ إِلَى  
مَنْزِلِنَا فَأَقَمْتُ بِالْأَسْكَندَرِيَّةِ لَا أَدْعُ كَنِيْسَةً  
إِلَّا دَخَلْتُهَا وَسَأَلْتُ أَسَاقِفَتَهَا مِنْ قِبْطِهَا وَ

موافق نکل کر رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک تنفس کو بھی یہ طاقت نہ ہوگی کہ ان کے  
ساتھ مقابلہ کر سکے۔ خشکی و تری کے آخری حصوں تک ان کا غلبہ ہو جائے گا۔  
عنقریب اس کی قوم اس کے ساتھ دست بدست جنگ کرے گی۔ مگر یہ سب سن  
سنا کر انہوں نے کہا اگر تمام لوگ بھی اس کے ساتھی ہو جائیں پھر بھی اس کا  
ساتھ نہیں دیں گے۔ مغیرہ کہتے ہیں یہ سن کر شاہ مقوقس نے ناگواری سے اپنا سر  
ہلایا اور کہا تم بڑی غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ اس کے بعد پوچھا اپنی قوم میں  
اس کا خاندان کیسا ہے؟ ہم نے جواب دیا۔ سب سے بہتر۔ اس نے کہا اسی  
طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام بھی اپنی قوم میں بہترین  
خاندان میں سے ہوئے ہیں۔ پھر اس نے پوچھا اچھا اس کی راست گوئی کی کیا  
کیفیت ہے؟ ہم نے جواب دیا۔ اس کی راست گوئی کی وجہ سے ہی اپنی قوم میں  
اس کا لقب امین مشہور ہے۔ اس نے کہا اب تم خود ہی غور کر لو۔ کیا تم یہ خیال کر  
سکتے ہو جو شخص باہم اپنے معاملات میں راست باز ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر  
جھوٹ بول سکتا ہے۔ پھر اس نے پوچھا۔ کن لوگوں نے اس کی اتباع کی ہے؟  
ہم نے کہا۔ نوجوانوں نے۔ اس نے کہا یہی لوگ ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام اور ان  
سے پہلے انبیاء کے متبعین ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ یثرب (مدینہ) کے یہودیوں  
نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ کیونکہ وہ لوگ تو توریت کے ماننے اور  
جاننے والے ہیں۔ ہم نے کہا انہوں نے تو اس کی مخالفت کی ہے اور اس وجہ  
سے اس نے ان کو سزا دی ہے۔ یعنی بعض کو قتل کیا ہے اور بعض کو قید کیا ہے۔ بقیہ  
ادھر ادھر اطراف میں تتر بتر ہو گئے ہیں۔ شاہ مقوقس نے کہا یہ لوگ تو ہمیشہ سے  
بڑے حاسد ہیں انہوں نے ان پر بھی حسد کیا ہے ورنہ یہ لوگ آپ کی صداقت  
ہماری طرح پہچانتے ہیں۔ مغیرہ کہتے ہیں کہ ہم مقوقس کے دربار سے ایسی گفتگو  
سن کر اٹھے جس کے بعد ہمارے حوصلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پست  
ہو گئے اور ہم نے اپنے دل میں کہا کیا غضب ہے کہ شاہان عجم تو اس کے ساتھ

۱۔ بظاہر عبارت یہ ہے: کذلک المسیح و الانبیاء تبعث فی نسب قومہ.

۲۔ بظاہر عبارت یہ ہونی چاہیے: لم اتباع المسیح و الانبیاء من قبلہ.

رُومَهَا عَمَّا يَجِدُونَ مِنْ صِفَةِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ أُسْقُفَ مِنَ الْقِبْطِ هُوَ رَأْسُ كَنِيسَةٍ يُوحَنَسُ كَانُوا يَأْتُونَهُ بِمَرْضَاهُمْ فَيَدْعُو لَهُمْ لَمْ أَرْقُطْ أَشَدَّ اجْتِهَادًا مِنْهُ فَاتَيْتُهُ فَقُلْتُ هَلْ بَقِيَ أَحَدًا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ قَالَ نَعَمْ هُوَ الْآخِرُ الْأَنْبِيَاءِ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ عِيسَى بْنِ مَرْيَمَ أَحَدٌ وَهُوَ نَبِيُّ مُرْسَلٍ وَأَمَرْنَا عِيسَى بِاتِّبَاعِهِ وَهُوَ النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ الْعَرَبِيُّ اسْمُهُ أَحْمَدُ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) لَيْسَ بِالطَّوِيلِ وَلَا بِالْقَصِيرِ فِي عَيْنِهِ حُمْرَةٌ وَلَا لَيْسَ بِالْأَبْيَضِ وَلَا بِالدَّمِ يُعْفَى شَعْرُهُ وَيَلْبَسُ مَا غُلِظَ مِنَ الثِّيَابِ وَيَجْتَزِي بِمَا بَقِيَ مِنَ الطَّعَامِ سَيْفُهُ عَلَى عَاتِقِهِ وَلَا يُبَالِي بِمَنْ لَا قِيَّ يُبَاشِرُ الْقِتَالَ بِنَفْسِهِ وَمَعَهُ أَصْحَابُهُ يَفْدُونَهُ بِأَنْفُسِهِمْ هُمْ لَهُ أَشَدُّ حُبًّا مِنْ أَوْلَادِهِمْ وَأَبَائِهِمْ يَخْرُجُ مِنْ أَرْضٍ حَرَمٍ وَيَأْتِي إِلَى حَرَمٍ يَهْأَجِرُ إِلَى أَرْضٍ سَبَاحٍ وَنَحْلٍ يَدِينُ بِدِينِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ الْمُغِيرَةُ فَقُلْتُ لَهُ زِدْنِي فِي صِفَتِهِ قَالَ يَأْتِرُ عَلَى وَسْطِهِ وَيَغْسِلُ أَطْرَافَهُ وَيَخْصُ بِمَا لَا تَخْصُ بِهِ الْأَنْبِيَاءُ قَبْلَهُ وَكَانَ النَّبِيُّ يَبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ وَيُبْعَثُ هُوَ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً وَجُعِلَتْ لَهُ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا أَيْنَمَا

نسب و رشتے کا دور کا تعلق بھی نہ رکھتے ہوئے اس کی تصدیق کریں اور اس سے خوف کھائیں اور ہم اس کے عزیز و قریب اور پڑوسی ہو کر بھی اس کا دین قبول نہ کریں بالخصوص جب کہ وہ خدا تعالیٰ کا داعی بن کر ہمارے گھروں میں خود آیا ہے۔ مغیرہ کہتے ہیں اس واقعہ کے بعد میں اپنے گھر واپس آیا اور مقام اسکندریہ میں آ کر ٹھہر گیا۔ میں نے کسی گرجہ کو نہیں چھوڑا جس میں نہ گیا ہوں اور اس کے ہر پادری سے خواہ وہ مصری تھا یا رومی ان علامات کی تحقیق کی جو یہ لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کتب سابقہ میں دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اس وقت ایک مصری پادری تھا جو کنیسہ یوحنس میں سب کا سردار سمجھا جاتا تھا جس سے بڑھ کر عابد و زاہد کوئی شخص میں نے نہیں دیکھا تھا اس کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنے مریضوں کو لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور وہ ان کی صحت کے لیے دعاء کیا کرتا تھا میں اس کی خدمت میں پہنچا اور میں نے اس سے پوچھا کیا انبیاء علیہم السلام میں کوئی نبی ایسا رہ گیا ہے جس کی آمد ابھی باقی ہو۔ وہ بولا ہاں ایک نبی باقی ہے اور وہی آخر الانبیاء ہے۔ ان کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی اور نبی نہیں ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی اتباع کرنے کا ہم کو حکم دیا ہے۔ وہ ایسا نبی ہے جس نے کسی درس گاہ میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ عرب کا رہنے والا ہے اسم مبارک اس کا احمد ہے۔ نہ حد سے زیادہ دراز قامت اور نہ انتہا سے زیادہ کوتاہ قد اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے نہ چوڑے جیسا سفید رنگ نہ بالکل گندم گوں۔ زلفیں رکھنے والا۔ موٹا جھوٹا سادہ لباس پہننے والا۔ بچا کھچا کھا لینے والا۔ جہاد کے لیے تیار۔ اس کی تلوار اس کے کاندھے پر۔ اپنے مقابل دشمن کی پروا نہ کرنے والا اور جنگ میں خود شریک ہونے والا۔ اس کے ساتھ سو جان سے اس پر قربان۔ اپنی اولاد اور والدین سے زیادہ ان پر شفیق۔ ایک حرم محترم سے نکل کر دوسرے ایسے ہی حرم محترم کی طرف ہجرت کرنے والا جس میں زمین کا ایک حصہ شور دوسرے حصہ

(۹۷۱) \* روایت بالا میں خط کشیدہ جملہ بہت اہمیت رکھنے کے قابل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب سابقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو علامات ذکر کی گئی تھیں ان میں ایک علامت یہ بھی تھی کہ آپ کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی اور نبی نہ ملے گا۔



میں کھجور کا باغ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر اس کا دین - مغیرہ کہتے ہیں میں نے اس پادری سے کہا ذرا ان کی علامات کے متعلق کچھ اور ارشاد فرمائیے۔ اس نے کہا وہ پنڈلیوں تک تہ بند باندھنے والا اور اپنے ہاتھ پیر اور چہرے کو دھونے والا اور اس کے علاوہ ایک ایسی خصوصیت کا مالک جو اس سے قبل انبیاء علیہم السلام میں نہ تھی۔ یعنی ہر نبی صرف اپنی ہی قوم کے لیے مبعوث ہو کر آیا اور وہ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوگا۔ تمام زمین اس کے لیے مسجد اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنادی جائے گی۔ یعنی جس جگہ بھی نماز کا وقت ہو جائے گا اسی جگہ وہ تیمم کر کے نماز ادا کر لے گا۔ اس سے قبل انبیاء پر اس بارے میں تنگی تھی وہ گرجوں اور مندروں کے سوائے کسی اور جگہ نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں یہ تمام باتیں میں نے اس کی زبانی اور اس کے سواء دوسروں کی زبانی بھی سنی ہیں۔ اس کے بعد واقدی (مشہور مؤرخ) نے مغیرہ کی واپسی ان کے اسلام اور آنحضرتؐ کی جن علامات کو انہوں نے بیان کیا بتفصیل ذکر کیا ہے۔ سرور کائناتؐ کو مغیرہ کی یہ حدیث بہت پسند آتی تھی اور آپؐ چاہتے تھے کہ آپؐ کے اور صحابہ بھی اس کو سنیں۔ مغیرہ کہتے ہیں اس لیے میں اس حدیث کو صحابہ کرام کے سامنے بیان کیا کرتا تھا۔ یہ تمام واقعہ اہل کتاب اور ان کے بڑے بڑے پادریوں کے درمیان معروف و مشہور واقعہ ہے۔ (الجواب الصحیح)

(۹۷۲) عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ مسلمانوں کا ایک لشکر باہر نکلا جس کا میں امیر تھا۔ یہاں تک کہ ہم مقام اسکندریہ میں جا کر اترے وہاں کے بڑے پادریوں میں سے ایک بڑے پادری نے کہا کہ میرے پاس کسی ایسے شخص کو بھیجو جس سے میں کچھ گفتگو کروں اور وہ مجھے جواب دے سکتے۔ میں نے سوچا کہ میرے سوائے اس کے پاس بھلا اور کون جائے گا۔ یہ کہتے

أَدْرَكَتُهُ الصَّلَاةُ تَيَمَّمُ وَصَلَّى وَمَنْ كَانَ قَبْلَهُ كَانَ مُشَدِّدًا عَلَيْهِمْ لَا يُصَلُّونَ إِلَّا فِي الْكَنَائِسِ وَالْبَيْعِ قَالَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فَوَعَيْتُ ذَلِكَ كُلَّهُ مِنْ قَوْلِهِ وَقَوْلِ غَيْرِهِ وَمَا سَمِعْتُ مِنْ ذَلِكَ فَذَكَرَ الْوَاقِدِيُّ حَدِيثًا طَوِيلًا فِي رُجُوعِهِ وَإِسْلَامِهِ وَمَا أَخْبَرَهُ مِنْ صِفَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ ذَلِكَ مِمَّا يُعْجِبُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ يُحِبُّ أَنْ يَسْمَعَهُ أَصْحَابُهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ قَالَ الْمُغِيرَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فَكُنْتُ أَحَدَهُمْ بِذَلِكَ وَهَذَا أَمْرٌ مَعْرُوفٌ عِنْدَ عُلَمَاءِ أَهْلِ الْكِتَابِ وَ عَظَمَائِهِمْ.

(رواہ محمد بن عمر الواقدی. کذا فی الجواب الصحیح)

(۹۷۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّهُ قَالَ خَرَجَ جَيْشٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ أَنَا أَمِيرُهُمْ حَتَّى نَزَلْنَا الْإِسْكَندَرِيَّةَ فَقَالَ عَظِيمٌ مِنْ عَظَمَائِهِمْ أَخْرِجُوا إِلَيَّ رَجُلًا يُكَلِّمُنِي وَ أَكَلِمَهُ فَقُلْتُ لَا يَخْرُجُ إِلَيْهِ غَيْرِي قَالَ فَخَرَجْتُ إِلَيْهِ وَ

للہ..... ہوگا۔ اس کے بعد جن حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”ہمارے دونوں کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ ورنہ دونوں کے درمیان کسی نبی کا ہونا یا نہ ہونا کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس کے بیان کی کوئی خاص اہمیت ہو۔ اب اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ چونکہ یہ بھی آپؐ کی ایک علامت تھی اس لیے جس طرح آپؐ نے اپنی دوسری علامات کا اعلان فرمایا ہے اسی طرح اس کا بھی اعلان فرمایا ہے۔

مَعِيَ تَرْجُمَانِي وَمَعَهُ تَرْجُمَانُهُ فَقَالَ مَا  
أَنْتُمْ؟ فَقُلْتُ نَحْنُ الْعَرَبُ وَنَحْنُ أَهْلُ  
الشَّرِكِ وَنَحْنُ أَهْلُ بَيْتِ الْحَرَامِ كُنَّا  
أَضْيَقُ النَّاسِ أَرْضًا وَ أَجْهَدُهُمْ عَيْشًا نَأْكُلُ  
الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ يُغَيِّرُ بَعْضُنَا عَلَى بَعْضٍ  
حَتَّى خَرَجَ فِينَا رَجُلٌ لَيْسَ بِأَعْظَمِنَا يَوْمَئِذٍ  
وَ لَا بِأَكْثَرِنَا مَالًا فَقَالَ أَنَا رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ  
فَأَمَرْنَا بِمَا لَا نَعْرِفُ وَ نَهَانَا عَمَّا كُنَّا عَلَيْهِ  
وَ كَانَ عَلَيْهِ أَبَاءُ نَا فَكَذَّبْنَاهُ وَ رَدَدْنَا عَلَيْهِ  
مَقَالَهُ حَتَّى خَرَجَ إِلَيْهِ قَوْمٌ غَيْرُنَا فَقُلْنَا وَ  
ظَهَرَ عَلَيْنَا وَ غَلَبَنَا وَ تَنَاوَلَ مَنْ يَلْبِهِ مِنَ  
الْعَرَبِ فَقَاتَلَهُمْ حَتَّى ظَهَرَ عَلَيْهِمْ وَ لَوْ  
يَعْلَمُ مَنْ وَ رَأَى مِنَ الْعَرَبِ مَا أَنْتُمْ فِيهِ مِنَ  
الْعَيْشِ لَمْ يَبْقَ أَحَدٌ إِلَّا جَاءَ كُمْ يَشْرُكُكُمْ  
فِيمَا أَنْتُمْ فِيهِ مِنَ الْعَيْشِ فَضَحِكَ ثُمَّ قَالَ  
إِنَّ رَسُولَكُمْ قَدْ صَدَقَ قَدْ جَاءَ تَنَارُ سُلْنَا  
بِمِثْلِ الَّذِي جَاءَ بِهِ رَسُولُكُمْ فَإِنْ أَنْتُمْ  
أَخَذْتُمْ بِأَمْرِ نَبِيِّكُمْ لَمْ يُقَاتِلْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا  
غَلَبْتُمُوهُ وَلَنْ يُشَادِرْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا ظَهَرْتُمْ  
عَلَيْهِ وَ إِنْ فَعَلْتُمْ مِثْلَ الَّذِي فَعَلْنَا وَ تَرَكْتُمْ  
أَمْرَ نَبِيِّكُمْ لَمْ تَكُونُوا أَكْثَرَ عَدَدًا مِنَّا وَ لَا  
أَشَدَّ مَنَاقِرَةً.

(اخرجه ابو حاتم في صحيحه)

(۹۷۳) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ فِي قِصَّةِ الْهَجْرَةِ وَ

کہ میں اس کے پاس گیا میرے ساتھ میرا ترجمان اور اس کے ساتھ اس کا  
ترجمان تھا۔ اس نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ میں نے کہا۔ عرب ہم شرک کیا  
کرتے تھے۔ درانحالیکہ ہم بیت الحرام کے باشندے تھے۔ ہمارے پاس  
رہنے کے لیے زمین بہت تنگ تھی، ہمارا گذران بہت عسرت کی حالت میں  
تھا۔ مردار اور خون کھایا کرتے تھے۔ ہمارا ایک قبیلہ دوسرے پر لوٹ مارا مچایا  
کرتا تھا ہم اسی عسرت اور جہل کے عالم میں تھے کہ ہم میں ایک شخص پیدا ہوا  
جو اس وقت ہم میں نہ سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا نہ سب سے زیادہ مال دار  
تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف تمہارے پاس رسول ہو کر آیا  
ہوں اس نے ہم کو ایسی باتوں کا حکم دیا جن سے ہم آشنا نہ تھے اور ان تمام  
باتوں سے روکا جن کے ہم اور ہمارے باپ دادے ہمیشہ سے خوگر تھے۔ اس  
لیے ہم نے اس کی تکذیب کی اور اس کی بات ٹھکرا دی تا آنکہ ہمارے علاوہ  
کچھ اور لوگ اس کے ساتھ ہو کر ہم سے جنگ کے لیے نکلے اور ہم کو قتل کیا اور  
ہم پر غالب آ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے عرب کے گرد و نواح کا قصد کیا  
اور ان پر بھی غالب آ گئے۔ اور بزرگ من! اگر عرب اس پر عیش زندگی کو جان  
لیں جو اس وقت آپ کی ہے تو ان میں ایک تنفس بھی ایسا نہ رہے جو آپ کی  
خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے عیش و عشرت میں حصہ دار نہ بن جائے۔ یہ سن  
کر وہ ہنس پڑے اور بولے کہ تمہارا رسول سچا ہے۔ ہمارے پاس بھی اللہ تعالیٰ  
کے رسول اسی قسم کی باتیں لے کر آئے تھے جیسی تمہارے رسول تمہارے  
پاس لے کر آئے ہیں۔ اب اگر تم اپنے نبی کے حکم پر کار بند ہو گے تو جو قوم بھی  
تم سے جنگ کرے گی اس پر تم غالب ہی رہو گے اور جو بھی تم سے برسر پیکار  
ہوگا وہ مغلوب ہو کر رہے گا۔ اور اگر کہیں تم نے وہی حرکت کی جو ہم نے کی  
تھی اور اپنے نبی کا حکم نہ مانا تو یاد رکھو کہ تم نہ تو مردم شماری میں ہم سے زائد ہو  
اور نہ قوت و طاقت میں بڑھ کر۔ (صحیح ابو حاتم)

(۹۷۳) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حبشہ کی طرف اپنی ہجرت اور

(۹۷۳) \* یہاں سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ حضرت جعفرؓ نے اپنے اسلام لانے کا جو بڑا سبب ذکر فرمایا ہے وہ ایک لمحہ.....



سَوَالُ النَّجَاشِيِّ عَنْ سَبَبِ مُفَارِقَتِهِمْ مِنْ دِينِهِمْ  
 قَالَتْ فَكَانَ الَّذِي كَلَّمَهُ جَعْفَرُ بْنُ أَبِي طَالِبٍ  
 فَقَالَ أَيُّهَا الْمَلِكُ كُنَّا قَوْمًا أَهْلَ جَاهِلِيَّةٍ نَعْبُدُ  
 الْأَصْنَامَ وَنَأْكُلُ الْمَيْتَةَ وَنَأْتِي الْفَوَاحِشَ وَ  
 نَقْطَعُ الْأَرْحَامَ وَنُسِي الْجَوَارِ وَيَأْكُلُ الْقَوِيُّ مِمَّا  
 الضَّعِيفُ فَكُنَّا عَلَى ذَلِكَ حَتَّى بَعَثَ اللَّهُ إِلَيْنَا  
 رَسُولًا مِمَّنَّا نَعْرِفُ نَسَبَهُ وَصِدْقَهُ وَآمَانَتَهُ وَ  
 عَفَافَهُ فَدَعَانَا إِلَى اللَّهِ لِنُوحِدَهُ وَنَعْبُدَهُ وَنَخْلَعَ  
 مَا كُنَّا نَعْبُدُ نَحْنُ وَآبَاءُنَا مِنْ دُونِهِ مِنَ  
 الْحِجَارَةِ وَالْأَوْثَانِ وَأَمَرَنَا بِصَدَقِ الْحَدِيثِ وَ  
 آدَاءِ الْأَمَانَةِ وَصِلَةِ الرَّحِمِ وَحُسْنِ الْجَوَارِ وَ  
 الْكَفِّ عَنِ الْمَحَارِمِ وَالدَّمَاءِ وَنَهَانَا عَنِ  
 الْفَوَاحِشِ وَقَوْلِ الزُّورِ وَأَكْلِ مَالِ الْيَتِيمِ وَقَذْفِ

نجاشی کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے اس سوال کے جواب میں کہ  
 انہوں نے اپنا قدیم دین کیوں چھوڑا بیان فرماتی ہیں کہ ہماری طرف سے  
 جنہوں نے گفتگو کی وہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ انہوں نے  
 ارشاد فرمایا۔ اے بادشاہ ہم لوگ جاہلیت کی ایک قوم تھے بتوں کی پوجا  
 کرتے مردار کھاتے بے حیائیوں میں مبتلا رہتے آپس کے رشتہ کاٹتے  
 اپنے پڑوسی سے برا سلوک کرتے اور جو شخص ہم میں مضبوط اور بااقتدار ہوتا  
 وہ کمزور کو کھالیا کرتا تھا ہم اسی تاریکی میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ  
 نے ہمارے ہی اندر سے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا کہ جس کا نسب، جس  
 کی راست گوئی، جس کی امانت داری اور جس کی پاک دامنی ہم اچھی طرح  
 جانتے پہچانتے تھے اس نے ہم کو ایک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی کہ ہم  
 اس کو ایک جانیں اور اسی کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے باپ دادا  
 جن پتھروں اور بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے ان کو یکسر چھوڑ دیں اور اس کا  
 حکم دیا کہ سچ بولیں امانت کو ادا کریں اور رشتہ داری کا لحاظ رکھیں۔ پڑوسی

اللہ ..... تاریک ماحول میں آپ کی درخشاں تعلیمات ہیں جن سے یک لخت ان کی کایا پلٹ گئی تھی یا تو وہ ابھی ابھی عباد اوثان میں داخل  
 تھے یا دوسری ہی ساعت میں عباد الرحمن میں شامل تھے جن کے متعلق قرآن کریم نے ﴿الَّذِينَ يَمُشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ کی صفت  
 بیان فرمائی ہے۔ اس کے بعد اپنی ہجرت کا سبب یہ بتایا ہے کہ ہماری قوم ہمارے اور ہمارے دین میں حائل بن گئی ہے۔ گویا اب اس مقدس  
 دین کی محبت ان پر اتنی غالب ہو چکی تھی کہ اس کے مقابلہ میں مال و متاع اور احباب و وطن کا چھوڑنا سب آسان تھا۔ سوچئے کہ یہ حالات سن  
 کر شاہ حبشہ آخر سوچ میں کیوں پڑ گیا۔ اگر اسی قسم کا واقعہ آج بھی فرض کر لیا جائے تو اس قسم کی گری ہوئی قوم کی ایسی غیر مانوس باتیں کیا  
 بادشاہوں کے لیے کچھ درخور اعتناء ہو سکتی ہیں، مگر یہاں شاہ حبشہ غور کر رہا ہے اور پھر یہ سوال کرتا ہے کہ اچھا اس کلام کا کچھ حصہ پڑھ کر مجھ کو  
 بھی سناؤ جو ان پر نازل ہوتا ہے۔ اور جب اس کا ذرا سا حصہ سنتا ہے تو اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے تمام اہل محفل سب آنسو بہانے پر  
 مجبور ہو جاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ یہ کلام کیسا ہوگا اور جن پر یہ کلام اترتا ہے ان کی ذات کن عالی صفات کی مالک ہوگی، پھر جو کلمات اس کی زبان  
 سے یہاں نکلے ہیں وہ اس کی شاہانہ فہم اور عالمانہ دقت نظر کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کی چند آیات ہی سن کر کس طرح یہ دریافت کر لیتا  
 ہے کہ قرآن کریم اور تورات دونوں ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہوئی کتابیں ہیں اور وہ ان میں ایک دوسرے کے ساتھ اس یکسانیت کو بھی پالیتا  
 ہے جس کے بعد اس کو یہ حکم لگا دیا آسان ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی مصدر کا فیضان ہیں اگر شاہ حبشہ کو تاریخ انبیاء اور ان پر  
 نازل شدہ کلاموں کا پورا پورا ذوق نہ ہوتا تو وہ ذرا سی خبر سے چند بادیہ نشینوں کو لے کر نہ بیٹھتا اور نہ اتنی جلد یہ حکم لگا سکتا کہ قرآن کریم جو  
 عربی زبان میں ہے اور وہ انجیل جو عبرانی یا سریانی زبان میں تھے ان کی متکلم ایک ہی ذات معلوم ہوتی ہے۔ اللہ .....  
 عربی زبان میں ہے اور وہ انجیل جو عبرانی یا سریانی زبان میں تھے ان کی متکلم ایک ہی ذات معلوم ہوتی ہے۔ اللہ .....

المُحَصَّنَةِ وَ أَمَرَنَا أَنْ نَعْبُدَ اللَّهَ لَا نُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَ أَمَرَنَا بِالصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ وَ الصِّيَامِ قَالَتْ فَعَدَّدَ عَلَيْهِ أُمُورَ الْإِسْلَامِ. قَالَ فَصَدَّقْنَاهُ وَ آمَنَّا بِهِ وَ اتَّبَعْنَاهُ عَلَى مَا جَاءَ بِهِ فَعَبَدْنَا اللَّهَ فَلَمْ نُشْرِكْ بِهِ شَيْئًا وَ حَرَّمْنَا مَا حَرَّمَ عَلَيْنَا وَ أَحَلَّلْنَا مَا أَحَلَّ لَنَا فَعَدَى عَلَيْنَا قَوْمُنَا فَعَذَّبُونَا وَ فَتَنُونَا عَنْ دِينِنَا لِيَرُدُّونَا إِلَى عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ عَنْ عِبَادَةِ اللَّهِ وَ أَنْ نَسْتَحِلَّ مَا كُنَّا نَسْتَحِلُّ مِنَ الْخَبَائِثِ فَلَمَّا قَهَرُونَا وَ ظَلَمُونَا وَ شَقُّوا عَلَيْنَا وَ حَالُوا بَيْنَنَا وَ

کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور حرام اور خوں ریزی سے اجتناب کریں اور ہم کو بے حیائیوں سے اور جھوٹ بات منہ سے نکالنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورت پر تہمت لگانے کی سخت ممانعت فرمائی اور اس کا حکم دیا کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور ہم کو نماز، زکوٰۃ، روزے کا بھی حکم دیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام کے اور بقیہ احکام بھی گنوائے۔ اس پر ہم نے آپ کو خدا تعالیٰ کا پیغمبر مانا اور آپ پر ایمان لے آئے اور جو دین آپ لے کر آئے تھے اس کی پیروی کی چنانچہ اب ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور ذرہ برابر بھی کسی کو اس کا شریک

اللہ..... انجیل و قرآن کریم کی اس اندرونی یک رنگی سمجھنے کے لیے پہلے ذرا اس پر غور کر لیجئے کہ ہر اہل کمال اپنی مصنوعات میں اس طرح صاف پہچان لیا جاتا ہے کہ جس کو اس صنعت کا ذرا سا بھی ذوق ہو اس کو فوراً پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ فلاں شخص ہی کی صنعت ہو سکتی ہے مثلاً ایک مشہور معمار اگر دس عمارتیں تعمیر کرتا ہے تو وہ سب عمارتیں اس کی دست کاری کی اس طرح شہادت دیا کرتی ہیں کہ جس کو ذرا بھی سلیقہ ہو وہ فوراً شناخت کر لیتا ہے کہ یہ ایک ہی معمار کی بنائی ہوئی ہیں۔ دہلی کی عمارات کی سیر کر جائیں شاہ جہاں کو اس سلسلہ میں جو ذوق تھا اس کے دور کی بنی ہوئی عمارات آپ کو الگ بتا دیں گے کہ یہ شاہ جہاں کی تعمیر کردہ ہیں حالانکہ شاہ جہاں نے ان کو ہاتھ تک بھی نہیں لگایا۔ اسی طرح ایک خیاط کا حال ہے۔ کسی جگہ کسی دکان پر آپ کسی مشہور خیاط کا سلاہوا کپڑا دیکھ لیتے ہیں تو فوراً حکم لگا دیتے ہیں کہ ہونہ ہو یہ فلاں خیاط کا سلاہوا ہے۔ اس سے اور اوپر اگر نظر اٹھائیے تو شعر و سخن کا حال ہے یہاں ایک ایک شعر اور اس کی ہر ہر بندش میں شاعر اس طرح نظر آتا یا کرتا ہے کہ اہل ذوق سامعین ہزار اشعار میں سے اس ذوق کا شعر الگ پہچان لیتے ہیں۔

درخشن مخفی مہم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد درخشن بیند مرا

اگر اس حقیقت سے ان موٹی موٹی مثالوں میں آپ روشناس ہو چکے ہیں تو پھر یہیں سے قرآن کریم کے طرز استدلال کو بھی سمجھ لیجئے وہ آسمان کی بلندی اور زمین کی پستی دونوں کی طرف آپ کو متوجہ کر کے کہتا ہے کہ دونوں پر اپنی اپنی جگہ غور کرو گے تو تم کو دونوں میں ایک ہی کامل کا کمال نظر آئے گا۔ آسمان کی خلقت بارش کا نزول اور اس سے رونق کے پیدا شدہ باغوں پر نظر کر۔ تم کو یقین ہو جائے گا کہ یہ سب نیرنگیاں ایک ہی کامل کا کمال ہیں۔ اس کے بعد زمین کی طرف نظر بڑھاؤ اس میں پہاڑوں کو دیکھو اور بڑے بڑے سمندروں کو بھی دیکھو کس طرح ایک دوسرے سے ملنے نہیں پاتے۔ تم کو منکشف ہو جائے گا کہ جس کی دیکھو اور بڑے بڑے سمندروں کو بھی دیکھو کس طرح ایک دوسرے سے ملنے نہیں پاتے۔ تم کو منکشف ہو جائے گا کہ جس کی صنعت کا کمال آسمانوں میں نظر آ رہا ہے اسی کی صنایع کا مظاہرہ زمین کی اس بے مثال صنعت میں ہے۔ آسمان اور ملک ساوی کے کمالات اگر چہ زمین اور ارضی انقلابات سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر اس اختلاف میں پھر ایک ایسی یک رنگی نمایاں ہے کہ اس کے بعد یہ جزم حاصل ہونا ضروری ہے کہ ان سب کمالات کا سرچشمہ ایک ہی ذات پاک ہے۔

گلستان میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا تری ہی سی رنگت تری ہی سی بو ہے اللہ.....



نہیں کرتے جو چیزیں اس نے ہمارے حرام کر دیں بس ان کو حرام سمجھتے ہیں اور جو حلال فرمادیں ان کو حلال جانتے ہیں۔ بس اسی بات پر ہماری قوم ہم سے بگڑ گئی ہے اور ہم کو دین سے ہٹانے کے لیے طرح طرح کی تکلیفیں دی ہیں تاکہ ہم خدا تعالیٰ کی عبادت کی بجائے پھر بتوں کی پوجا کرنے لگیں اور جو خبیث چیزیں ہم نے پہلے حلال بنا رکھی تھیں ان کو پھر حلال سمجھنے لگیں۔ جب انہوں نے ہم پر بہت زور ڈالا اور ہم پر ظلم کیا اور ہماری مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور ہم کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روکنے لگے تو ہم نے آپ کے شہر کا رخ کیا ہے اور سب کو چھوڑ کر آپ کو اور آپ کے پڑوس کو پسند کیا ہے اے بادشاہ ہم کو آپ سے امید ہے کہ اب یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں یہ سن کر نجاشی بادشاہ نے پوچھا جو کلام وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس لے کر آئے ہیں کیا اس کا کوئی حصہ تم کو یاد ہے؟ جعفر بولے جی ہاں اس پر نجاشی نے کہا اچھا اس کو میرے سامنے بھی پڑھو انہوں نے سورہ مریم کی شروع کی آیتیں پڑھیں (جس کی ابتداء یہ ہے) کَهِيعَصْ ..... حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں یہ سن کر بخدا نجاشی ایسا زار و قطار رو یا کہ اس کی

بَيْنَ دِينِنَا خَرَجْنَا إِلَى بَلَدِكَ وَ اخْتَرْنَاكَ عَلَى مَنْ سِوَاكَ وَ رَغَبْنَا فِي جَوَارِكَ وَ رَجَوْنَا أَنْ لَا نُظْلَمَ عِنْدَكَ أَيُّهَا الْمَلِكُ قَالَتْ فَقَالَ لَهُ النَّجَاشِيُّ هَلْ مَعَكَ مِمَّا جَاءَ بِهِ عَنِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ قَالَتْ فَقَالَ لَهُ جَعْفَرٌ نَعَمْ فَقَالَ لَهُ النَّجَاشِيُّ فَأَقْرَأْهُ عَلَى فَقَرَأَ عَلَيْهِ صَدْرًا مِنْ سُورَةِ مَرْيَمَ كَهِيعَصْ ذَكَرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدُهُ زَكِرِيَّا إِلَى قَوْلِهِ أَنَا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ إِنَّا يُرْجَعُونَ. قَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ فَبَكَى وَ اللَّهُ النَّجَاشِيُّ حَتَّى اخْضَلَ لِحْيَتَهُ وَ بَكَتْ أَسَافَتُهُ حَتَّى اخْضَلُوا مَصَاحِفَهُمْ حِينَ سَمِعُوا مَا تَلَى عَلَيْهِمْ ثُمَّ قَالَ النَّجَاشِيُّ إِنَّ هَذَا وَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَى لِيَخْرُجَ مِنْ مِشْكُوهِ وَاحِدَةً. (رواه احمد و ابن سعد و ابو نعيم في الحلية و غيرهم قال الحافظ ابن تيمية و

لِللَّهِ ..... أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضَ وَ أَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوا شَجَرَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْبَالِغِينَ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ. (النمل: ٦٠)

بھلا کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور اتارا تمہارے لیے آسمان سے پانی پھر ہم نے اگائے اس سے باغ رونق والے تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ تم اگاتے ان کے درختوں کو کیا کوئی اور معبود ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی نہیں وہ لوگ کج روی کرتے ہیں۔

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَ جَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِي وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْبَالِغِينَ قَوْمٌ يَعْلَمُونَ. (النمل: ٦١)

بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور پیدا کر دیں اس کے بیچ میں نہریں اور بنادیں اس کے لیے پہاڑ اور رکھی دو سمندروں میں اوٹ۔ کیا کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ کوئی نہیں۔ بلکہ ان میں بھتیرے جانتے نہیں۔

أَمَّنْ يَجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْبَالِغِينَ قَوْمٌ يَعْلَمُونَ. (النمل: ٦٢)

بھلا کون بیقرار کی فریاد کو پہنچاتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اٹھا دیتا ہے سختی کو اور تم کو بناتا ہے نائب زمین میں کیا اللہ .....

داڑھی تر ہو گئی اور اس کے ارد گرد پادری لوگ بھی اتنے روئے کہ ان کے سامنے جو صحیفے تھے وہ بھی تر ہو گئے۔ اس کے بعد نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور وہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے بلاشبہ ایک ہی چشمہ سے نکلے ہوئے ہیں۔

(احمد - ابو نعیم وغیرہما)

(۹۷۴) محمد بن اسحاق سے روایت ہے کہ اس واقعہ کے بعد جب آپ کی خبر حبشہ میں پھیلی تو آپ کی خدمت میں بیس یا اس سے کچھ کم و بیش اور نصرانی حاضر ہوئے اس وقت آپ مکہ مکرمہ ہی میں تھے انہوں نے آپ کو ایک مجلس میں تشریف فرمایا دیکھا آپ سے کچھ گفتگو کی اور کچھ سوالات بھی کیے۔ قریش کے چند لوگ بھی کعبہ شریف کے ارد گرد اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے (یہ ماجرا دیکھ رہے تھے) جب ان لوگوں کو جو سوالات آپ سے کرنے تھے کر چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے سامنے قرآن کریم کی کچھ آیتیں تلاوت فرمائیں۔ انہوں نے سنیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے انہوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی آپ کی تصدیق کی اور وہ سب علامتیں جو آپ کے متعلق ان کی کتاب میں بیان کی گئی تھیں آپ میں دیکھ لیں۔ جب یہ لوگ آپ کی مجلس سے اٹھ کر چلنے لگے تو

ذکرہا اہل التفسیر و الحدیث و الفقہ وہی متواترہ عند العلماء و قدروی جمل هذه القصة ابو داؤد فی سننہ من حدیث ابی موسیٰ وفی الصحیحین ایضاً کما فی الجواب الصحیح ج ۱ ص ۸۱ و ۸۷)

(۹۷۴) عَنْ ابْنِ إِسْحَاقَ قَالَ ثُمَّ قَدِمَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرُونَ رَجُلًا وَهُوَ بِمَكَّةَ أَوْ قَرِيبَ مِنْ ذَلِكَ مِنَ النَّصَارَى حِينَ ظَهَرَ خَبْرُهُ فِي الْحَبَشَةِ فَوَجَدُوهُ فِي الْمَجْلِسِ فَكَلَّمُوهُ وَسَأَلُوهُ وَرَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ فِي أُنْدِيَّتِهِمْ حَوْلَ الْكُعْبَةِ فَلَمَّا فَرَّغُوا مِنْ مَسْأَلَتِهِمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَمَّا أَرَادُوا دَعَاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَلَّى عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ فَلَمَّا سَمِعُوا فَاضَتْ أَعْيُنُهُمْ مِنَ الدَّمْعِ ثُمَّ اسْتَجَابُوا لَهُ وَآمَنُوا بِهِ وَصَدَّقُوهُ وَ

اللہ ..... کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ (کوئی نہیں) تم بہت ہی کم غور کرتے ہو۔

أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ مَنْ يُرْسِلُ الرِّيَّاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ أَلَا اللَّهُ مَعَ اللَّهِ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ. (النمل: ۶۳)

بھلا کون تم کو راہ دکھاتا ہے جنگل اور سمندر کے اندھیروں میں اور کون بھیجتا ہے ہوائیں خوشخبری دینے والی اپنی رحمت (بارش) کے آگے آگے کیا کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ (کوئی نہیں) اللہ اس سے بہت بلند ہے یہ لوگ شریک کرتے ہیں۔

اس اندرونی یک رنگی ہی کہ قرآن کریم نے لفظ ”مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ“ سے تعبیر کیا ہے عام لوگ اس کے معنی صرف لفظی تصدیق تک ہی محدود سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لفظ اسی بلند حقیقت کا حامل ہے اور اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ قرآن کریم اور انجیل و تورات میں گویا بانی اور بہت سے احکام کا اختلاف بھی سہی لیکن اپنی اپنی جگہ ان کے کمالات میں ایک ایسی یک رنگی بھی ہے کہ ان کو سامنے رکھ کر ایک سلیقہ شناسی یہ حکم لگانے پر مجبور ہوگا کہ یہ دونوں کلام ایک ہی سرچشمہ کا فیض ہے جیسا آپ نے یہاں شاہ نجاشی کا حال دیکھا اسی کے قریب ورقہ بن نوفل کی شہادت ہے۔



عَرَفُوْهُ مِنْهُ مَا كَانَ يُوصَفُ لَهُمْ فِي كِتَابِهِمْ  
مِنْ أَمْرِهِ فَلَمَّا قَامُوا مِنْ عِنْدِهِ اعْتَرَضَهُمْ  
أَبُو جَهْلٍ فِي نَفَرٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَقَالَ خَيِّبَكُمْ اللَّهُ  
مَنْ رَكِبَ بَعَثَكُمْ مَنْ وَرَاءَكُمْ مِنْ أَهْلِ  
دِينِكُمْ تَرْتَادُونَ لَهُمْ فَتَأْتُونَ لَهُمْ بِخَبَرِ  
الرَّجُلِ فَلَمْ تَطْمَئِنِّ مَجَالِسُكُمْ عِنْدَهُ حَتَّى  
فَارَقْتُمْ دِينَكُمْ وَصَدَقْتُمُوهُ بِمَا قَالَ لَكُمْ مَا  
نَعْلَمُ رَكِبًا أَحْمَقَ مِنْكُمْ أَوْ كَمَا قَالَ لَهُمْ  
فَقَالُوا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَجَاهِلُكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا  
وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا تَأْلُوا لَأَنْفُسِنَا إِلَّا خَيْرًا

(کما فی جواب الصحیح) (محمد ابن اسحاق)

(۹۷۵) عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللَّهُ  
عَنْهَا قَالَتْ أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا  
يَرَى رُؤْيَاءَ إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ  
حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءٍ  
فَيَتَحَنَّنُ فِيهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِي ذَوَاتِ  
الْعَدَدِ قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ وَيَتَزَوَّدَ

راستہ میں ابو جہل چند اور قریشی لوگوں کو لے کر سامنے آیا اور بولا تمہاری  
جماعت کو خدا کا کام کرے تمہارے ہم عقیدہ لوگوں نے تم کو بھیجا تو اس لیے  
تھا کہ تم تلاش کر کے اس شخص کے متعلق ذرا تحقیق حال کرنا اور اس کی اطلاع  
جا کر اپنی قوم کو دینا مگر تم اس کے پاس آ کر ابھی اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ  
پائے تھے یہاں تک کہ تم خود ہی اپنا دین چھوڑ بیٹھے اور جو بات اس نے کہی  
بس اس کی تصدیق کر لی، ہم نے کوئی جماعت تم سے زیادہ احمق نہیں دیکھی یا  
اسی قسم کے اور سخت و ست کلمات کہے انہوں نے اس کے جواب میں بس اتنا  
ہی کہا آپ صاحبان کو ہمارا سلام ہم آپ سے الجھنا نہیں چاہتے۔ ہم کو ہمارا  
دین مبارک اور آپ کو آپ کا دین مبارک۔ اپنی جانوں کی خیر خواہی کرنے  
میں خود ہم کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کر سکتے۔

(سیرت محمد بن اسحاق)

(۹۷۵) ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں سب سے  
پہلی وحی جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی وہ اچھے خواب تھے چنانچہ جو  
خواب آپ دیکھتے وہ صبح صادق کی روشنی کی طرف صاف صاف ظاہر ہو جاتا  
اس کے بعد آپ کو تنہائی اور خلوت گزینی پسند ہو گئی۔ چنانچہ آپ غار حرا میں  
آ کر تنہا رہا کرتے اور وہاں کئی کئی شب تَحَنُّنُ کیا کرتے تھے۔ راوی  
تَحَنُّنُ کی تفسیر عبادت کرنا کرتا ہے یعنی عبادت کیا کرتے تھے بغیر اس کے  
کہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر آتے اور اس مدت کے لیے زادِ راہ اپنے

(۹۷۵) \* ابن ہشام اپنی سیرت میں صدیقہ عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جب صدیق اکبرؓ نے کفار کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر ترک  
وطن کا قصد کیا تو ابن الدغنه نے ان سے پوچھا آپ کہاں جاتے ہیں؟ صدیق اکبرؓ نے کفار کی ایذا رسانی کا سارا ماجرا بیان کیا اس پر جو  
کلمات اس نے صدیق اکبرؓ کی شان میں کہے وہ ان الفاظ سے بہت ہی ملتے جلتے ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے یہاں آپؐ کی شان مبارک میں  
فرمائے ہیں وہ کہتا ہے واللہ انک لتزین العشیر، و تعین علی النوائب، و تفعل المعروف، و تکسب المعدوم، ارجع و انت  
فی جوارى۔ (ص ۲۳۱ ج ۱۔ مطبوعہ بر حاشیہ روض الف)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ اوصاف خیر لوگوں میں عام طور پر مشہور تھے اور کسی انسان کی بلندی کا سب سے اعلیٰ معیار

تجھے جاتے تھے اسی بناء پر حضرت خدیجہؓ نے بے ساختہ یہاں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ للہ.....

لِذَلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا  
 حَتَّى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارٍ حَرَاءٍ فَجَاءَهُ  
 الْمَلَكُ فَقَالَ اقْرَأْ قَالَ مَا أَنَا بِقَارِي قَالَ  
 فَاخْذِنِي فَعَطْنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ ثُمَّ  
 أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِي فَاخْذِنِي  
 فَعَطْنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي  
 فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِي فَاخْذِنِي فَعَطْنِي  
 الثَّلَاثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي  
 خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ  
 الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ . فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ  
 اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فَوَادُهُ  
 فَدَخَلَ عَلَى خَدِيجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ زَمِّلُونِي  
 زَمِّلُونِي فَرَمَلُوهُ حَتَّى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوَغُ فَقَالَ  
 لِيَخْدِيجَةَ وَ أَخْبَرَهَا الْخَبْرَ لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى

ساتھ لے جاتے پھر جب یہ زادِ راہ ختم ہو جاتا تو اتنی ہی مدت کے لیے اور  
 زادِ راہ لے جاتے یہاں تک کہ آپ کے پاس حق کا پیغام غارِ حراء میں آ  
 پہنچا۔ چنانچہ خدا کا فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا پڑھو۔ آپ نے  
 فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ فرشتہ نے مجھ کو پکڑا اور  
 اتنی زور سے دبایا کہ مجھ کو تکلیف ہوئی پھر چھوڑ کر مجھ سے کہا پڑھو۔ تو میں نے  
 وہی کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اس پر فرشتہ نے پھر مجھے پکڑ کر زور سے دبایا  
 یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی، پھر چھوڑ کر کہا پڑھو تو میں نے پھر کہا میں پڑھا  
 ہوا نہیں ہوں۔ تیسری بار اس نے مجھے پکڑ کر زور سے دبایا پھر مجھے چھوڑ کر کہا۔  
 اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ  
 الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ . یعنی اپنے پروردگار کے نام کی برکت سے  
 پڑھو جس نے ہر چیز کو پیدا کیا (اور) انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا۔ پڑھو  
 تمہارا پروردگار بہت بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ آپ ان  
 آیات کو لے کر واپس آئے اور اس واقعہ سے آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ آپ  
 حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے اور فرمایا مجھے کھل اڑھا دو مجھے کھل اڑھا دو۔

..... یہ حدیث نزولِ قرآن کے سلسلہ میں سب سے پہلی ہے اور اتصالِ ملکی و بشری کے بہت سے رموز کی حامل ہے۔ ابتدائی واقعہ میں  
 وحی کا ثقل آپ کا اضطراب اور حضرت خدیجہؓ کے تسلی آمیز کلمات سب بالکل قرین قیاس اور معقول باتیں ہیں اور آپ کی صداقت کی سب  
 سے واضح دلیل ہیں۔ دیکھئے ورقہ بن نوفل ذرا سا واقعہ سن کر کس طرح یہ سمجھ گئے کہ یہ فرشتہ جو آپ پر وحی لے کر آیا ہے وہی فرشتہ ہے جو آپ  
 سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا۔ اس سے جہاں آپ کی بے لوث صداقت کا ثبوت ملتا ہے اسی کے ساتھ وحی اور نبوت کی  
 حقیقت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے مگر کیا تاریخِ نبوت کے علم کے بغیر محض عقلی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے جو یہاں چند جملوں سے ورقہ نے  
 اخذ کر لیا اور وہ بھی کس جزم اور یقین کے ساتھ۔

یہ بات بھی قابلِ یادداشت ہے کہ جب نزولِ وحی شروع ہوتا ہے تو ایسے حال میں شروع ہوتا ہے جب کہ آپ اس سے قطعاً لاعلم  
 تھے۔ اور جب آپ وحی سے آشنا ہو چکے تھے تو ایک مدت کے لیے نزولِ وحی ایسا بند ہو جاتا ہے کہ اس کے اشتیاق میں بارہا آپ کے قلب  
 مبارک میں یہ خیال گذرتا ہے کہ کسی پہاڑ پر جا کر اپنے آپ کو گرا دیں مگر وحی کا ایک حرف بھی نازل نہیں ہوتا۔ وحی کی اس ابتداء اور اس  
 انقطاع سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عالمِ نبوت پروازِ خیال سے کتنا بالاتر عالم ہے۔ کیونکہ خیالی معاملات تمام تر انسان کے خیال کرنے نہ  
 کرنے پر موقوف ہوا کرتے ہیں۔ اور یہاں نبوت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب وحی کا خیال بھی نہ تھا تو وحی نازل ہوئی اور جب انتہائی شوق و  
 ذوق موجود تھا تو مدت تک وحی کا ایک حرف بھی سننے میں نہیں آیا۔ ....



نَفْسِي فَقَالَتْ خَدِيجَةُ كَلَّا وَاللَّهِ مَا يُخْرِيكَ  
اللَّهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ  
وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ  
عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ فَانْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ  
حَتَّى آتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلٍ بْنِ أَسَدِ بْنِ  
عَبْدِ الْعُزَّى بْنِ عَمِّ خَدِيجَةَ وَكَانَ أَمْرًا قَدْ  
تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ  
الْعِبْرَانِيَّ فَيَكْتُبُ مِنَ الْإِنْجِيلِ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ  
يَكْتُبَ وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ فَقَالَتْ  
خَدِيجَةُ يَا ابْنَ عَمِّ اسْمَعْ مِنْ ابْنِ أَخِيكَ  
فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ يَا ابْنَ أَخِي مَاذَا تَرَى فَأَخْبَرَهُ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبْرَ مَا رَأَى  
فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي نَزَّلَ اللَّهُ  
عَلَى مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَأْتِيَنِي فِيهَا جَذَعًا يَأْتِيَنِي  
حَيًّا إِذَا يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ فَقَالَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ مُخْرِجِي هُمْ قَالَ  
نَعَمْ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا  
عُودِي وَإِنْ يُذِرْكُنِي يَوْمُكَ أَنْصُرَكَ نَصْرًا  
مُؤَزَّرًا لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ تُوفَى وَفَرَّ  
الْوَحْيُ. (رواه البخاری)

گھر والوں نے آپؐ کو کبل اڑھا دیا۔ یہاں تک کہ جب آپؐ کے قلب مبارک  
سے خوف کا وہ عالم جاتا رہا تو آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان فرمایا  
اور فرمایا خدا کی قسم مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہو گیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ بولیں ہرگز  
نہیں خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپؐ کو کبھی شرمندہ نہیں کرے گا آپؐ تو صلہ رحمی فرماتے  
ہیں بے وسیلہ شخص کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور محتاج کو مال کما کر دے دیتے ہیں، مہمان  
کی مہاں نوازی کرتے ہیں اور راہِ حق کے حادثوں میں لوگوں کی امداد کرتے ہیں  
(پھر آپؐ ناکام کیسے رہ سکتے ہیں) پھر حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچا زاد بھائی  
ورقہ کے پاس لے کر آئیں یہ زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے اور عبرانی لکھا  
کرتے تھے اس لیے انجیل جس قدر اللہ کو منظور ہوتی عبرانی میں لکھا کرتے تھے اور  
اس وقت بڑھاپے کی وجہ سے نابینا ہو چکے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے فرمایا اے ابن  
عم! ذرا اپنے بھتیجے سے ان کا حال تو سنے۔ ورقہ نے آپؐ سے کہا بھتیجے تم نے کیا  
واقعہ دیکھا۔ آنحضرتؐ نے جو کچھ دیکھا تھا ان سے بیان کر دیا۔ یہ سن کر ورقہ نے  
آپؐ سے کہا یہ تو وہی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے  
پاس بھیجا تھا اے کاش کہ میں آپؐ کے زمانہ نبوت میں تو انا جوان ہوتا اے کاش  
کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا۔ جب آپؐ کی قوم آپؐ کو مکہ مکرمہ سے نکالے گی  
آنحضرتؐ نے تعجب سے فرمایا اچھا کیا میری قوم مجھ کو نکالے گی ورقہ نے کہا جی  
ہاں ہمیشہ جب کوئی رسول وہ دین لے کر آیا ہے جیسا تم لے کر آئے ہو تو ضرور  
اس کے ساتھ دشمنی کی گئی ہے اور اگر مجھ کو آپؐ کی نبوت کا زمانہ مل گیا تو میں آپؐ  
کی بہت زوردار مدد کروں گا۔ مگر ایسا ہوا کہ چند ہی روز بعد ورقہ کی وفات ہو گئی اور  
ادھر وحی کی آمد کچھ مدت کے لیے بند ہو گئی۔ (بخاری شریف)

اللہ..... نیز حضرت خدیجہؓ جو خود بڑی عاقلہ تھیں اور مدت دراز تک آپؐ کے روز و شب حالات کا جائزہ لے چکی تھیں وہ اس واقعہ کو سن کر  
ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شبہ میں نہیں پڑیں اور قسم کھا کر پورے جزم و وثوق کے ساتھ کہتی ہیں کہ آپؐ کا معاملہ ہر ایسے تصور سے جو آپؐ کے  
شایانِ شان نہ ہو بالاتر ہے اور یہ اس لیے کہ آپؐ کے اوصاف خود اس کے شاہدِ عدل ہیں کہ خدا ایسے نیک طینت اور بلند فطرت انسان کو  
ناکام نہیں کر سکتا اس کے بعد جب یہ واقعہ ورقہ کے سامنے آتا ہے تو وہ صرف اس کا اجمالی حال سن کر آنے والے فرشتے آپؐ کی وحی آپؐ  
کی نبوت اور آئندہ آپؐ کے حالات کا اس طرح اندازہ کر لیتے ہیں گویا یہ سب پہلے سے مسلم باتیں ہیں۔ حدیث مذکور میں آپؐ کے قبل از  
نبوت دور کے عجائبات کا کچھ نقشہ بھی ملتا ہے صوفیاء کرام نے غارِ حراء کے اس قیام کو چلہ کی اصل قرار دیا ہے۔

(۹۷۶) عَنْ خَدِيجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ أَنَّهَا قَالَتْ قُلْتُ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا ابْنَ الْعَمِّ اتَّسَطِيعُ إِذَا جَاءَكَ هَذَا الَّذِي يَأْتِيكَ أَنْ تُخْبِرَنِي بِهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ قَالَتْ خَدِيجَةُ فَجَاءَ جَبْرِئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ذَاتَ يَوْمٍ وَأَنَا عِنْدَهُ فَقَالَ يَا خَدِيجَةُ هَذَا صَاحِبِي الَّذِي يَأْتِينِي قَدْ جَاءَ فَقُلْتُ لَهُ قُمْ فَاجْلِسْ عَلَيَّ فَخَذِي فَجَلَسَ عَلَيْهَا فَقُلْتُ هَلْ تَرَاهُ قَالَ نَعَمْ فَقُلْتُ تَحَوَّلْ فَاجْلِسْ عَلَيَّ فَخَذِي الْيُسْرَى فَجَلَسَ فَقُلْتُ هَلْ تَرَاهُ قَالَ نَعَمْ قَالَتْ خَدِيجَةُ فَتَحَمَّرْتُ فَطَرَحْتُ خِمَارِي فَقُلْتُ هَلْ تَرَاهُ قَالَ لَا فَقُلْتُ هَذَا وَاللَّهِ مَلَكٌ كَرِيمٌ

(۹۷۶) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے میرے چچا زاد بھائی! کیا یہ ممکن ہے کہ یہ شخص جو آپ کے پاس آتے ہیں اب کی بار آئیں تو آپ مجھ کو بھی بتادیں؟ آپ نے فرمایا ہو سکتا ہے۔ حضرت خدیجہ کہتی ہیں ایک دن ایسا ہوا کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور میں اتفاق سے اس وقت آپ کے پاس ہی بیٹھی تھی تو آپ نے فرمایا لومیرے رفیق جو میرے پاس آیا کرتے ہیں وہ اس وقت تشریف لائے ہیں۔ یہ سن کر میں نے کہا اچھا آپ اٹھ کر ذرا میری دائیں ران پر آ بیٹھیے آپ ادھر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر میں نے کہا اچھا اب آپ میری بائیں ران پر آ جائیں آپ ادھر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں؟ فرمایا ہاں۔ حضرت خدیجہ فرماتی ہیں پھر میں نے اپنی اوڑھنی اتار کر (سرنگہ کر کے) پوچھا اچھا کیا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا نہیں؟ میں نے کہا خدا کی قسم یہ تو خدا تعالیٰ کا بزرگ فرشتہ

(۹۷۶) \* حضرت خدیجہؓ گواہی کتاب میں سے نہ تھیں مگر اپنی فطری دانش مندی سے اتنا ضرور جانتی تھیں کہ جس طرح نبی و ساحر اور کاہنوں کی شخصیتوں میں پاکیزگی و بلندی کا بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح جو ان کے پاس غیبی خبریں لانے والا ہوتا ہے ان میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہونا چاہیے اس امتحان کے لیے جو فوری اور آسان صورت ان کے ذہن میں آئی اس پر انہوں نے صورت حال کو پرکھا اور اس کے بعد جو عقیدہ ان کا پہلے قائم ہو چکا تھا وہ اور مستحکم ہو گیا۔ یہ بات تو اس وقت کی تھی جب کہ آپ نبوت سے سرفراز ہو چکے تھے لیکن آپ کے حالات تو کچھ ابتداء ہی سے اس قسم کے تھے کہ جب حلیمہ سعدیہ شق صدر کے واقعہ سے خائف ہو کر آپ کو آپ کی والدہ کی خدمت میں پہنچانے کے لیے آئیں تو انہوں نے متحیر ہو کر پوچھا تم تو اصرار پر اصرار کر کے ان کو مجھ سے اپنے گھر لے گئی تھیں کچھ بات بتاؤ آخر آج کیوں از خود ان کو لے کر آ رہی ہو انہوں نے مجبور ہو کر سارا واقعہ بیان فرما دیا اس پر آپ کی والدہ کے جو کلمات ابن ہشام نے اپنی سیرت میں نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

قالت افتخوفت عليه الشيطان قالت قلت نعم قالت كلا والله ما للشيطان عليه من سبيل وان لبنی لسانا (فذكرت ما رأت في حملي و عند ولادته من كرامته تعالى عليه صلى الله عليه وسلم)

آپ کی والدہ ماجدہ نے حلیمہ سعدیہ سے کہا کیا ان کے متعلق تم کو کسی شیطانی دخل کا خیال ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا خدا کی قسم ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ فرزند بہت بڑی شان والا ہے شیطان کو ان پر ذرا بھی دسترس نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے حالت حمل اور آپ کی ولادت کے وقت کے سارے مشاہدات بیان فرمائے۔ للہ.....



ہی ہے خدا کی قسم یہ شیطان نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد آپ کا سارا واقعہ نوافل سے بیان کیا (جو پہلے مذکور ہو چکا ہے) دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص زمین و آسمان کے درمیان نظر آ رہا ہے جو نہ اوپر جاتا ہے نہ نیچے اترتا ہے (میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر کہا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذرا میرے قریب آ جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریب آ گئے۔ انہوں نے پوچھا کیا اب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔ اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اچھا اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گریبان میں منہ ڈال لیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ ڈال لیا۔ پھر پوچھا کہیے کیا اب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھ رہے ہیں آپ نے فرمایا نہیں۔ اب انہوں نے ادھر سے اپنا رخ پھیر لیا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت ہو یہ خدا تعالیٰ کا بزرگ فرشتہ ہے اگر شیطان ہوتا تو بھلا یہ شرم کہاں کرتا۔ (دلائل النبوة)

(۹۷۷) ابو موسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابو طالب ملک شام کے ارادہ سے نکلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سفر میں ان کے ہمراہ تھے اور قریش کے کچھ اور بڑے لوگ بھی تھے جب یہ قافلہ بحیرا کے پاس پہنچا

لَا وَاللَّهِ مَا هَذَا شَيْطَانٌ ثُمَّ ذَكَرْتُ لَوْ رَقَّةَ مَا أَخْبَرَهَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِي رَوَايَةٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ جَالِسًا مَعَ خَدِيجَةَ يَوْمًا مِنَ الْأَيَّامِ إِذْ رَأَى شَخْصًا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَزُولُ فَقَالَتْ خَدِيجَةُ أَدْنُ مِنِّي فَدَنَا مِنْهَا فَقَالَتْ لَهُ أَتَرَاهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ قَالَتْ خَدِيجَةُ أَذْخِلْ رَأْسَكَ تَحْتَ دِرْعِي فَفَعَلَ ذَلِكَ فَقَالَتْ خَدِيجَةُ لَهُ أَتَرَاهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا قَدْ أَعْرَضَ عَنِّي قَالَتْ خَدِيجَةُ أَبْشِرْ فَإِنَّهُ مَلَكٌ كَرِيمٌ لَوْ كَانَ شَيْطَانٌ مَا اسْتَحْيَيْتُمْ ذَكَرْتُ إِسْلَامَهَا. (رواه ابو نعیم فی دلائل النبوة و الطبرانی فی الاوسط قال الحافظ الہیثمی و اسنادہ حسن. و ذکرہ ابن ہشام فی سیرتہ)

(۹۷۷) عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ خَرَجَ أَبُو طَالِبٍ إِلَى الشَّامِ وَ خَرَجَ مَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اللہ..... حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذات شروع سے ہی ایسے صفات و حالات کی حامل رہی ہے کہ مخالفین نے بھی گو آپ کو رسول نہ مانا ہو مگر نبوت کے معاملہ کے سواء ہر موقع پر آپ کے غیر معمولی انسان ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اگر فطری سعادت امداد نہ کرے تو جنہوں نے نہ تو کسی نبی کی تاریخ کبھی دیکھی ہو اور نہ سنی ہو بلکہ اس کے برعکس ضد اور جہل نے اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہو وہ اس کھلی ہوئی صداقت سے کیا فائدہ اٹھاتے۔

آپ نے دیکھا کہ تاریخ نبوت کے جاننے والے یا آپ کی شخصیت کے مشاہدہ کرنے والوں میں سے کسی کے دل میں کبھی یہ دوسرہ نہیں گزرا کہ جو کچھ آپ دیکھتے یا سنتے ہیں یہ صرف آپ کے نفس ہی کے خیالات ہیں ان کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے۔

(۹۷۷) \* تاریخ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل دو سفر ایسے معلوم ہوتے ہیں جن میں اہل کتاب کے علماء کے ساتھ آپ کا اجتماع ہوا ہے ایک ”بحیراء“ راہب اور دوسرے ”نسطوراء“ پہلا سفر آپ کا بالکل صغریٰ میں ہوا ہے۔ البتہ دوسرا سفر آپ کے عہد للہ.....

وَسَلَّمَ فِي أَشْيَاخٍ مِّنْ قُرَيْشٍ فَلَمَّا أَشْرَفُوا عَلَى الرَّاهِبِ هَبَطُوا فَحَلُّوا رِحَالَهُمْ فَخَرَجَ إِلَيْهِمُ الرَّاهِبُ وَكَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ يَمُرُّونَ بِهِ فَلَا يَخْرُجُ إِلَيْهِمْ وَلَا يَلْتَفِتُ قَالَ فَهُمْ يَحْلُونَ رِحَالَهُمْ فَجَعَلَ يَتَخَلَّلُهُمُ الرَّاهِبُ حَتَّى جَاءَ فَأَخَذَ بِيَدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ هَذَا سَيِّدُ الْعَالَمِينَ هَذَا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ يَبْعَثُهُ اللَّهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ فَقَالَ لَهُ أَشْيَاخٌ مِّنْ قُرَيْشٍ مَا عِلْمُكَ فَقَالَ إِنَّكُمْ حِينَ أَشْرَفْتُمْ مِنَ الْعَقَبَةِ لَمْ يَبْقَ شَجَرٌ وَلَا حَجَرٌ إِلَّا خَرَّ سَا جِدًا وَلَا يَسْجُدُونَ إِلَّا لِنَبِيِّ (صَلَّى اللَّهُ

جو اس وقت نصرانیوں کا بڑا درویش تھا تو یہاں آ کر انہوں نے اپنے کجاوے کھول دیئے اور اس سے قبل جب کبھی ان کا اس طرف سے گزر ہوتا تو یہ درویش کبھی ان کے پاس نہ آتا اور نہ ان کی طرف کوئی توجہ کرتا اس مرتبہ خلاف معمول وہ نکل کر ان کے پاس آیا لوگ ابھی اپنے کجاوے کھولنے ہی میں مشغول تھے یہ قافلہ کے درمیان گھس کر کچھ ٹٹولنے لگا یہاں تک کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا کہ یہ شخص ہیں جو تمام جہانوں کے سردار ہیں یہ وہ ہیں جو سارے جہانوں کے پروردگار کے رسول ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اس پر قریش کے مشائخ نے پوچھا تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس نے کہا جب تم لوگ اس گھاٹی کے قریب پہنچے تو نہ کوئی درخت ایسا رہا اور نہ کوئی پتھر جو سرنگوں نہ ہو گیا اور جمادات و نباتات نبی کے علاوہ کسی اور کے لیے اس طرح سرنگوں نہیں ہوا کرتے اور ان کو تو میں ایک اور خاص علامت سے بھی پہچانتا ہوں یعنی مہر نبوت جو آپ کے شانہ کی باریک ہڈی کے نیچے سب کے سے انداز کی ہے۔ اس کے بعد

للہ..... شباب کا ہے لیکن ان ہر دو سفروں میں کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے ان راہبوں سے کہیں تنہائی میں ملاقات کی ہو چہ جائیکہ ان سے کوئی تعلیم حاصل کی ہو اس کے علاوہ آپ کا مفصل لایا ہوا دین آج بھی سب کے سامنے موجود ہے جس میں بہت سے مقامات پر نصاریٰ کے دین سے صراحتہ اختلاف موجود ہے۔ سب سے بنیادی مسئلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کا ہے۔ قرآن کریم نے اس کا جا بجا رد کیا ہے اور ان کے معاملہ میں اہل کتاب میں جو جو غلط یا بے تحقیق باتیں مشہور تھیں ان کی تردید کی ہے پھر کیسے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قرآن اس ملاقات کا نتیجہ ہے۔ رہا فروع اور عملی احکام کا معاملہ تو پہلے تو انجیل میں یہ حصہ ہی بہت کم ہے اور نصاریٰ کے اپنے خیال کے مطابق تو ان کے یہاں حلال و حرام کا کوئی منظم باب ہی نہیں اس کے برخلاف ہماری شریعت میں جس تفصیل کے ساتھ یہ ابواب موجود ہیں وہ کسی شخص پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ پھر فتح مکہ کے بعد کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ اسلام میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ عملی احکام میں اختلاف ایک بنیادی مسئلہ بن گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت مقدس کا سولہ سترہ ماہ استقبال فرما کر پھر کعبۃ اللہ کا استقبال فرمایا کیا ان لوگوں کے ساتھ یہ معمولی اختلاف تھا۔ اگر آپ شروع سے ہی بیت مقدس کا استقبال نہ فرماتے تو بھی ایک بات تھی لیکن اس کی طرف استقبال کر کے پھر قبلہ بدلنا کتنے طعن اور ناگوار یوں کا موجب بنا۔ اس کا تذکرہ خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ پھر شریعت اسلام کچھ دو چار کلمات کی شریعت نہیں۔ رہ گئے قرآنی قصص تو وہ کچھ افواہ کا مجموعہ نہیں۔ اس تفصیل اور اس تحقیق اور اس شرح و بسط کے ساتھ واقعات کا بیان فرمانا بلکہ ان واقعات کا بھی بیان کر دینا جن کے متعلق تو رات خاموش نظر آتی ہے کیا چند لمحات کی صحبت کے تعلم سے حاصل ہو سکتا ہے پھر عجیب تر حکمت ایزدی یہ ہے کہ قرآن کریم تو رات کی طرح لکھا لکھا یا نہیں اتر آ۔ آپ کی تیس سالہ زندگی میں ہر ضرورت کے مناسب اترتا رہا ہے۔ مگر نزول کی ترتیب اور تالیف کی ترتیب پھر مخالف رہی ہے آپ کی ہدایت آیتوں کو اپنی اپنی سورتوں میں علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا تھا ایک للہ.....



عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) وَ إِنِّي أَعْرِفُهُ بِخَاتَمِ النُّبُوَّةِ  
 أَسْفَلَ مِنْ غُضْرُوفٍ كَتِفِهِ مِثْلَ التُّفَّاحَةِ ثُمَّ  
 رَجَعَ فَصَنَعَ لَهُمْ طَعَامًا فَلَمَّا أَتَاهُمْ بِهِ وَ  
 كَانَ هُوَ فِي رِغْيَةِ الْإِبْلِ فَقَالَ أَرْسِلُوا إِلَيْهِ  
 فَأَقْبَلَ وَ عَلَيْهِ غَمَامَةٌ تَظِلُّهُ فَلَمَّا دَنَى مِنَ  
 الْقَوْمِ وَ جَدُّهُمْ قَدْ سَبَقُوهُ إِلَى فِي الشَّجَرَةِ  
 فَلَمَّا جَلَسَ مَالَ فِي الشَّجَرَةِ عَلَيْهِ فَقَالَ  
 أَنْظِرُوا إِلَيَّ فِي الشَّجَرَةِ مَالَ عَلَيْهِ. قَالَ  
 فَبَيْنَمَا هُوَ قَائِمٌ عَلَيْهِمْ يُنَاشِدُهُمْ أَنْ لَا  
 يَذْهَبُوا بِهِ إِلَى الرُّومِ فَإِنَّ الرُّومَ إِنْ رَأَوْهُ  
 عَرَفُوهُ بِالصَّفِّهِ فَيَقْتُلُونَهُ فَالْتَفَتَ فَإِذَا  
 وَهُوَ وَاپس ہو گیا اور اس نے ان کے لیے کھانے کا انتظام کیا جب وہ کھانا لے کر آیا تو  
 آپ اس وقت اونٹ چرانے نکل گئے تھے اس نے کہا کسی کو آپ کے پاس بھیج دو۔  
 آپ تشریف لے آئے تو سب لوگ آپ سے پہلے درخت کے سایہ میں جا چکے  
 تھے جب آپ آ کر بیٹھے تو درخت کا سایہ آپ کی طرف جھک گیا۔ اس درویش  
 نے کہا دیکھو ذرا درخت کے سایہ کو دیکھو کیسا آپ کی طرف جھک گیا ہے۔ ابھی یہ  
 درویش ان سے کھڑے یہ اصرار ہی کر رہے تھے کہ آپ کو وہ اپنے ہمراہ روم نہ لے  
 جائیں کیونکہ وہ لوگ اگر آپ کو دیکھ پائیں گے تو آپ کی خاص علامت کی وجہ سے  
 آپ کو پہچان جائیں گے اور آپ کو قتل کے درپے ہو جائیں گے۔ اس نے جو رخ  
 بدلا کیا دیکھتا ہے کہ سات آدمی روم سے آرہے ہیں۔ درویش صاحب نے ان کا  
 استقبال کیا اور پوچھا آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟ انہوں نے کہا اس لیے کہ وہ نبی  
 اسی مہینہ میں اپنے وطن سے باہر نکلنے والا ہے کوئی راستہ ایسا نہیں رہا جس پر لوگ نہ

للہ ..... ہی زمانہ میں کئی کئی سورتیں جدا گانہ جدا گانہ اترتی رہتی تھیں پھر علیحدہ علیحدہ ہی ان کی ترتیب دی جاتی تھی کیا کوئی شخص ہر سوال کا  
 مناسب جواب اور ہر مصلحت پر مناسب مناسب احکام کا نزول دیکھ کر یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ یہ کتاب تقریباً چالیس سال قبل کسی کی تعلیم  
 سے مرتب ہو چکی تھی اور سب سے بڑھ کر حیرت یہ کہ جن کو اس راز کا بانی کہا جائے ان سے اس کی کوئی شہادت بھی نہ ملے۔ کیا اس موقع پر  
 صرف مابعد کے لوگوں کی غلط اور غیر معقول قیاس آرائیوں پر فیصلہ کر دینا بھی کوئی عقل کا فیصلہ کہا جاسکتا ہے۔ مدعی ست اور گواہ چست اسی کو  
 کہتے ہیں۔ اس بارے میں اگر مذکورہ بالا روایت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیراء راہب سے ملاقات ثابت ہوتی ہے تو اسی سے یہ بھی  
 ثابت ہوتا ہے کہ بحیراء کے نزدیک جس آنے والے نبی کی پیش گوئی گزشتہ کتابوں میں کی گئی تھی وہ آپ ہی کی ذات ہے۔ چلئے اگر خود ان  
 راہبوں سے اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے دین کے حرف کا کوئی کلمہ آپ کو بتایا ہے تو پھر دوسرے نمبر کی شہادت آپ کے  
 رفقاء سفر کی ہے کم از کم ان میں سے ہی کسی کا یہ بیان ہونا چاہیے اور اگر یہ بھی اس کی شہادت نہیں دے سکتے تو سب سے کمزور شہادت آپ  
 کے زمانہ کے اہل کتاب کی ہے کم از کم وہی یہ شہادت دیں کہ آپ نے ان راہبوں سے دین یا غیر دین کی کوئی تعلیم تھوڑی یا بہت حاصل کی تھی  
 لیکن اگر یہ شہادت نہ خود ان راہبوں کی ہے جن کو اس افسانہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے اور نہ ان رفقاء کے جو واقعہ کے مشاہدہ کرنے والے اور  
 آپ کے ہم سفر تھے اور نہ اس زمانہ کے اہل کتاب ہی یہ دعویٰ رکھتے ہیں تو پھر بعد کی قیاس آرائیوں کی کیا وقعت کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ  
 ہے کہ جب بعد کے اہل کتاب نے ایک رسول امی کی زبان سے علوم و معارف کا وہ سمندر موجیں مارتا دیکھا جس کے سامنے انجیل و تورات  
 سرنگوں کھڑی تھیں تو فطرۃ میزان مستوفی ملانے کے لیے یہی ایک عذر گناہ بدتر از گناہ تراش سکے کہ یہ علوم درحقیقت ان ہی کے گھر کا فیض  
 ہیں مگر کیا آپ کے عہد کے کسی ایک شخص کی شہادت بھی وہ اپنے اس دعوے کے لیے پیش کر سکتے ہیں۔ ان بے چاروں کو اتنی فہم بھی نہ آئی کہ  
 ان کے راہبوں کا تو ذکر کیا ہے قرآن کے علوم کا براہ راست انجیل و تورات سے موازنہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں کون معلوم للہ.....

بھیجے گئے ہوں اور ہم کو اطلاع ملی ہے کہ وہ آپ کے اسی راستہ پر ہیں۔ درویش صاحب نے کہا ذرا بتاؤ تو سہی جس بات کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرما چکا ہو کہ وہ پوری کر دے پھر لوگوں میں وہ کون ہے جو اس کو ہال سکتا ہو۔ یہ سن کر وہ لوگ اس کی بات مان گئے اور کچھ دن اس کے یہاں قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد ان درویش صاحب نے کہا اے عرب کے لوگو قسم کھا کر بتاؤ تم میں سے اس کا ولی کون ہے؟ ابوطالب بولے میں۔ اس پر وہ آپ کی واپسی پر برابر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ ابوطالب نے آپ کو مکہ مکرمہ واپس کر دیا۔ اور رخصت کے وقت درویش صاحب نے آپ کے ساتھ زاد راہ کے لیے کچھ زیتون کا تیل اور چپاتیاں پیش کیں اور ابوبکرؓ نے بلال کو آپ کے ساتھ بھیج دیا (ترمذی وغیرہ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند اچھی ہے اگرچہ اس کا راوی تنہا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں اور اس میں آخری جملہ کے سواء کوئی بات منکر نہیں ہے۔ بظاہر ابوبکر کا بلال کو آپ کے ہمراہ بھیجنا کسی اور سفر کا واقعہ تھا کسی راوی کو وہم ہو گیا ہے اور اس نے اس کو اس قصہ کے ساتھ لگا دیا ہے۔

قال الترمذی هذا حدیث حسن غریب لانعرفه الا من هذا الوجه. و رواه البيهقي في كتاب دلائل النبوة من حدیث العباس بن محمد عن قراد بن نوح. وقال العباس لم يحدث به يعنى بهذا الاسناد غير قراد و سمعه يحيى و احمد بن قراد قال البيهقي ارادانه لم يحدث بهذا الاسناد سوى هؤلاء فاما القصة فهي عند اهل المغازی مشهورة. و اخرجه ابن سعد في الطبقات ايضوا بن الجوزي كما ذكره الحافظ ابن تيمية في الجواب الصحيح ص ۲۰۵ ج ۱. وفيه و تابعوه

للہ..... کی حیثیت میں اور کون متعلم کی حیثیت میں نظر آ رہا ہے۔ باادب نجاشی کے کانوں نے جب یہاں سورہ مریم کی چند آیتیں ہی سنیں تو اس نے معلم اور متعلم کی بجائے کیا سچے اور ادب سے لبریز کلمات کہے کہ جو کلام موسیٰؑ پر اترا تھا وہ اور یہ ایک ہی چشمہ سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

پھر اگر صرف ان دور راہوں کی ملاقات سے آپ کی تعلیمات پر کوئی حرف آ سکتا ہے تو صحیح بخاری میں ورقہ بن نوفل سے بھی آپ کی ملاقات ثابت ہے اور یہ تو اس وقت کی بات ہے جب کہ آپ کو قباء نبوت پہنایا جا چکا تھا اور ان راہوں کے سواء بھی بہت سے نصرانی آپ سے ملتے رہے ہیں ان کے ساتھ آپ کو بڑی بڑی دیر تک گرم مجلسیں بھی رہی ہیں یہاں تو اس قیاس کا اور بھی بہت اچھا موقعہ تھا پس محض دشمنوں کے بے سرو پا اعتراضات سے ثابت شدہ حدیثوں کو آپ کے تذکرہ سے نکال ڈالنا نہ علم کی بات ہے نہ دانش مندی کی۔

اب ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ اگر اس اعتراض کا کوئی بھی محل ہوتا تو کیا قرآن اس سے سکوت اختیار کرتا آخر مشرکین عرب نے بھی آپ پر یہی تہمت تو رکھی تھی کہ مکہ مکرمہ میں یہ جو ایک عجمی آدمی ہے یہی آپ کو سب کچھ سکھاتا پڑھاتا ہے۔ لیکن اس محض بے اصل بکواس کو قرآن نے نقل بھی کیا ہے اور اس کے بعد اس کا مسکت جواب بھی دیا ہے۔ للہ.....



بدل بايعوه و معناه كما في السيرة الحلبيه اى على عدم التعرض منه كما يدل عليه لفظ تابعوه ثم قال الحافظ ابن تيمية في المجلد الرابع منه عند ذكر ما ينقله كثير من اهل الجهل من معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم مثل قول كثير من العامة ان الغمامة كانت تظله دائما فهذا لا يوجه في شيء من كتب المسلمين المعروفة عند علمائهم ولا نقله عالم من علمائهم بل هو كذب عندهم و ان كلان كثير من الناس ينقله. و انما نقل ان الغمامة اظلت له لما كان صغيرا. فقدم مع عمه الى الشام تاجرا و راه بحيرا الراهب و مع هذا فهذا لا يحزم بصحته (الجواب الصحيح فحه ۲۳۰ و ۲۳۱)

اللہ ..... وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ  
بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَ  
هَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ. (النحل: ۱۰۳)

ہمیں بخوبی علم ہے کہ یہ کافر کہتے ہیں کہ اسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے  
اس کی زبان جس کی طرف یہ نسبت کر رہے ہیں عجیبی ہے اور یہ  
قرآن تو صاف عربی زبان میں ہے۔  
قدرت کے عجب رموز ہیں کہ مشرکین عرب کی زبانوں سے اگر کوئی اعتراض نکلا بھی تو یہ کہ فلاں شخص قریشی کا فلاں غلام آپ کو یہ قرآن  
سکھاتا ہے۔ کتنی بے جوڑ بات تھی کہ اس دریائے علوم کا منبع کس کو قرار دیا جائے اس کو جو خود غلام ہے اور پھر عجیبی ہے نہ وہ عربی سے آشنا ہے  
اور نہ آپ عجیبی زبان سے واقف ہیں۔ اگر یہ تہمت لگانی تھی تو یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ یہ باتیں آپ علماء اہل کتاب سے سیکھ کر آتے ہیں، مگر وہ  
اتنے جھٹک نہ تھے کہ جس بات کے لیے کوئی بھی قرینہ موجود نہ ہو اس کو اپنے منہ سے نکال کر مفت میں رسوا ہوتے۔ یہ غلام گوجہی تھا مگر اس کے  
ساتھ ہم شہر ہونے کی وجہ سے آپ کا اختلاط بعید از قیاس نہ تھا مگر اہل کتاب کے علماء کے ایسے مشتبہ اختلاط کا چونکہ کوئی وجود ہی نہ تھا اس لیے  
ان سے تعلیم حاصل کرنا بالکل بیرون از قیاس بات تھی۔ معلوم ہوا کہ انتہائی دشمنوں کے نزدیک بھی آپ پر علماء اہل کتاب سے تعلیم حاصل  
کرنے کی تہمت رکھنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

و لم يقل احد منهم ما يمكن ان يكون شبهة  
في تعلمه انباء الغيب من علماء اهل  
الكتاب و نحو ذلك و انما قالوا ما ظهر  
بطلانه لكل احد و لم ينقل عن احد منهم انه  
قال قولا يخفى بطلانه بل ما يظهر كذبه  
لكل احد فتبين انه لم يمكنهم ان يقولوا انه  
تعلم اخبار الغيوب من احد.

(الجواب الصحيح ج ۴ ص ۲۶)

یہ بحث ابھی نہیں ہے کہ قرآنی نظم اور اس کا اسلوب بیان آپ کی چالیس سالہ عمر اور آپ کی بے لوث صداقت کی زندگی میں بھی کیا  
اس شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے اسی لیے آپ نے اہل فکر و انصاف کو اپنی ماضی زندگی پر غور کرنے کی دعوت دی اور فرمایا:  
لَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا  
تَعْقِلُونَ.  
میں اس سے قبل ایک بڑی مدت سے تم ہی میں رہا ہوں تو کیا تم اتنی  
بات سمجھتے نہیں۔

بہر حال اگر صحیح طریقوں سے ایک نہیں ایک ہزار راہوں کی ملاقات بھی آپ کے ساتھ ثابت ہو تو ہم نصاریٰ کے محض لٹلے.....

ج ۴) و اخرجه الحافظ ابن كثير فى البداية و النهاية و قال هكذا رواه الترمذى و الحاكم و البيهقى و ابن عساكر و غير واحد من الحفاظ و مع هذا فى حديثه غرابة ثم عددها فقال انه من مراسلات الصحابة فان ابا موسى الاشعرى انما قدم فى سنة خيبر سنة سبع من الهجرة.... و لعله نلقاه من النبى صلى الله عليه وسلم فيكون ابلغ او من بعض كبار الصحابة او كان هذا مشهوراً مذكوراً اخذه من طريق الاستفاضة. الثانى ان الغمامة لم تذكر فى حديث اصح من هذا و الثالث قوله و بعث معه ابوبكر بلالاً. ثم ذكر سياق الواقدى و ابن سعد و قال عند ذكره قصة بحيرا الواهب و قد اورده الحافظ ابن عساكر شواهد و سائغات فى ترجمة بحير او لم يورد ما رواه الترمذى و هذا عجب. قال الحافظ ابن حجر فى الاصابة الحديث رجاله ثقات و ليس فيه منكر سوى هذا اللفظ و بعث معه ابوبكر بلالاً فتحمل على انها مدرجة فيه

اللہ..... بے بنیاد اعتراضوں کی خاطر ہرگز اس سے اغماض نہیں کر سکتے اور نہ ہم کو کرنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس ہم کو یہ تلاش کرنا چاہیے کہ کس کس راہب سے آپ کی ملاقات ثابت ہوئی ہے اور اس نے ظلم یا انصاف کی راہ سے آپ کے متعلق کیا کیا رائے ظاہر کی ہے کیونکہ تورات و انجیل کے وہی حامل تھے اور اگر آپ کے بارے میں ان ہی کی جانب سے ہم کو کوئی مفید شہادت ملتی ہے تو یہ بڑی مضبوط شہادت ہو گی۔ اور اگر وہ آپ کے خلاف شہادت دیتے ہیں جس پر وہ ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ذیل کی آیتوں میں اسی لیے مشرکین کے سامنے اہل کتاب کی شہادت رکھی ہے۔

کیا ان کے لیے یہ بات نشانی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء اس کی خبر رکھتے ہیں۔

کہہ دو اللہ تمہارے اور میرے درمیان گواہ کافی ہے اور جس کو کتاب کی خبر ہے۔

اور دیکھ لیں جن کو ملی ہے سمجھ کہ جو تجھ پر اتر اترے رب سے وہی ٹھیک ہے۔

جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی ہے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب وہ ان کو سنائی جائے تو کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے یہی ٹھیک ہے ہم تو اس سے پہلے کے حکم بردار ہیں۔

اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ یقیناً تیرے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان کو پہچانتے ہیں جیسا پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو۔

اور جب اس کو سنتے ہیں جو نازل ہوا ہے رسول پر ان کی آنکھیں دیکھو تو ابلیتی ہیں آنسوؤں سے اس لیے کہ انہوں نے پہچان لیا ہے

أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةٌ أَنْ يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ. (الشعراء: ۱۹۷)

قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ. (الرعد: ۴۳)

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقُّ. (السبا: ۶)

الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا

إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ. (القصص: ۵۲-۵۳)

وَالَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنْزَلٌ مِّنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ. (انعام: ۱۱۴)

الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ. (البقرة: ۱۴۶)

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَى أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنْ



مقتطعة من حديث اخر و هما من احد رواته كذا في الخصائص (ص ۸۴ ج ۱) و ذكره ابن الاثير في تحريد الصحابة و قال رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل البعث و امن به ذكره ابن منده و ابو نعيم في الصحابة و هكذا في تاريخ الخميس ايضا ص ۲۵۷ ج ۱ - و حقق ابن حجر في الاصابة تحت تذكرة ورقة ما حاصله انه ينبغي ان يكون حال ورقة و بحيراء سواء و اما الذهبي فقد ضعف الحديث لكن قال الحافظ الحلبي في سيرته و لا جل هذا الوهم

لله..... الْحَقَّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ  
الشَّاهِدِينَ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ مَا جَاءَنَا  
مِنَ الْحَقِّ وَ نَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبَّنَا مَعَ الْقَوْمِ  
الصَّالِحِينَ. (المائدة: ۸۳-۸۴)

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ  
يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا. (سورة اسراء: ۱۰۷)  
الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ  
مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ. (اعراف: ۱۵۷)  
فَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْئَلِ  
الَّذِينَ يَقْرَأُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ. (يونس: ۹۴)

حق بات کو وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے تو تو ہم کو  
ماننے والوں کے ساتھ لکھ اور ہم کو کیا ہوا کہ ہم اس پر یقین نہ لائیں  
اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم کو حق سے پہنچی اور توقع رکھیں اس کی کہ  
ہمارا رب ہم کو نیک بختوں کے ساتھ داخل فرمائے۔

جن لوگوں کو اس سے پہلے علم ملا ہے جب ان کے سامنے اس کو پڑھا  
جائے تو جھک جاتے ہیں ٹھوڑیوں سے سجدہ میں۔  
وہ لوگ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو نبی امی ہیں جن کو وہ  
اپنے پاس تو رات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

تو اگر تم کو اس کتاب میں کچھ شک ہو جو ہم نے اتاری ہے تو تم ان لوگوں  
سے پوچھ دیکھو جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔ (یعنی اہل کتاب)

اس روایت کا ایک رخ تو یہ تھا۔ آئیے اب ہم آپ کو اس روایت کا دوسرا رخ بھی دکھائیں اور وہ اس کا افادی رخ ہے۔ اس  
روایت میں دوسرے اہل دین کی زبان سے آپ کی نبوت کی شہادت ہے جب کہ ابھی آپ کی عمر دس بارہ سال ہی کی ہے اور وہ بھی محض ظن  
و تخمین سے نہیں بلکہ ان علامات کی بناء پر ہے جو اہل کتاب کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے سواء کسی دوسرے شخص میں پائی نہیں جاتیں۔ اسی  
کے ساتھ اس میں وہ خاص علامت بھی ہے جو کتب سابقہ میں خاص سید العالمین اور رحمۃ للعالمین کے لیے بیان کی گئی تھی یعنی ”مہر نبوت“ اس  
کے بعد اس واقعہ میں چند ایسی وقتی علامات اور خصوصی خارجی قرائن کا بھی تذکرہ ہے جو آسمانی شخصیات بارزہ کے ساتھ ہمیشہ نظر آیا کرتی ہیں  
یعنی درختوں اور پتھروں کا سجدہ کرنا۔ ظاہر ہے کہ جس نبی کے معجزات میں حیوانات کا سجدہ پتھروں کا سلام کرنا اس کے دست مبارک میں  
کنکریوں کا تسبیح پڑھنا اور جس کے حکم سے کھجور کے درخت کے خوشہ کا آ جانا اور جس کے حکم سے دو درختوں کا آ کر باہم مل جانا اور پھر اس  
کے حکم سے جدا جدا اپنی جگہ جا کر کھڑے ہو جانا مستند طریقوں سے ثابت ہو وہاں اتنی بات پر ایک پر کیا تعجب کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ  
درخت کی شاخوں کا جھک جانا یا بادل کا امرا یزدی کے ماتحت صرف ایک واقعہ میں آپ کے ساتھ حرکت کرنا ان امور میں سے نہیں جو انبیاء  
علیہم السلام کے معاملوں میں موجب حیرت ہوں آخر اسی نبی اولوالعزم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صدقہ میں ابو طالب نے بارش مانگی تو کیا  
بادل نہ آ گئے اور نہ بر سے پھر کیا اسی رسول کی دعاء پر بار بادلوں نے اپنی بارش کے دہانے نہیں کھول دیے اور کیا پھر اسی رسول کی انگلی کے  
اشارہ پر بادلوں نے مدینہ طیبہ کی بستی کو چھوڑ کر ٹیلوں اور پہاڑوں کا رخ نہیں کر لیا۔ جی ہاں جس کے اشارہ پر چاند دو ٹکڑے ہو سکتا ہے اس  
کے اشارہ پر بادلوں کی اتنی حرکت کیا بعید ہونی چاہیے۔ پھر جب کہ میدان تہ میں بنی اسرائیل پر بادلوں کا سایہ فگن رہنا قرآن لہ.....

(۹۷۸) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ حَدَّثَنِي سَلْمَانُ الْفَارَسِيُّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي قِصَّةِ إِسْلَامِهِ مِنْ فِيمَ قَالَ لَحِقْتُ بِصَاحِبِ عُمُو رَبِّيهِ فَأَخْبَرْتُهُ خَبْرِي قَالَ أَقِمْ عِنْدِي فَاقَمْتُ عِنْدَ خَيْرِ رَجُلٍ عَلَى هُدًى أَصْحَابِهِ وَ أَمْرِهُمْ . قَالَ وَ اِكْتَسَبْتُ حَتَّى كَأَنْتَ لِي بَقَرَاتٌ وَ غُنَيْمَةٌ قَالَ ثُمَّ نَزَلَ بِهِ أَمْرُ اللَّهِ فَلَمَّا حَضَرَ قُلْتُ لَهُ يَا فَلَانُ إِنِّي كُنْتُ مَعَ فَلَانَ فَأَوْصَى بِي إِلَى فَلَانٍ ثُمَّ أُوصِيَ بِي فَلَانٌ ثُمَّ أُوصِيَ بِي فَلَانٌ ثُمَّ أُوصِيَ بِي فَلَانٌ إِلَيكَ

(۹۷۸) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں میں نے یہ واقعہ خود سلمان فارسی کی زبان سے سنا ہے وہ بیان کرتے تھے کہ میں اصحابان کے ایک گاؤں میں ایک پارسی مذہب کا آدمی تھا اور میرے والد اپنے گاؤں کے سردار تھے، میں ان کو بہت پیارا تھا اس لئے انہوں نے لڑکیوں کی طرح گھر کے اندر رکھ کر میری پرورش کی تھی میں مجوسیت کی عبادت میں ہر وقت لگا رہا کرتا، یہاں تک کہ آگ کے اس ٹکرا کی طرح بن گیا تھا جو ہر وقت اس کو روشن رکھتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی گل ہونے نہیں دیتا۔ میرے والد کی بڑی زمین تھی ایسا ہوا کہ وہ ایک دن کسی تعمیر کام میں لگ گئے اور مجھ سے فرمایا فرزند عزیز میں آج اس کام لگ گیا ہوں اس لئے آج زمین پر نہیں جاسکتا تم ذرا جا کر اس کو دیکھ لو اور جو کام کرنے کا وہاں ان کا زیادہ تھا وہ مجھ کو بتادیا اور تاکید سے کہہ دیا کہ میرے پاس آنے میں دیر نہ لگانا اگر تم نے دیر کی تو یاد رکھنا

..... کریم میں موجود ہو اس کے بعد بادل کے ایک ٹکڑے کا آپ پر سایہ کر لینا کون سی بیرون از قیاس بات ہونی چاہیے۔ مگر جو نفوس یہاں متردد ہیں وہ کچھ اسی ایک واقعہ میں نہیں معجزات اور خوارق کا سارا باب ہی ان کی مادی عقول کے لیے ایک پہاڑ بنا ہوا ہے۔ وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ نُورًا فَمَالَهُ مِنْ نُورٍ .

اب رہا اس حدیث کا اسنادی پلہ تو اس پر بھی ہم عربی کے حاشیہ میں مختصر سا کلام کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک امام ترمذی، بیہقی اور آخر میں حافظ ابن حجر جیسے متفق علیہ محدثین نے جب اس حدیث کو مستند مان لیا ہے اور حافظ ابن تیمیہ جیسے شخص نے نصاریٰ کے مقابلہ پر اس کو بطور حجت پیش کیا ہے تو اب اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نکالنا بہت ناموزوں ہے۔ صرف کتب رجال سے اٹھا اٹھا کر مخالفین کے اقوال نقل کرنا اور موافقین کا ذکر تک نہ کرنا انصاف نہیں ہے کون نہیں جانتا کہ ادھام سے صحیحین کی حدیثیں بھی خالی نہیں رہیں۔ ان کے رجال پر بھی کہیں کہیں کلام کیا گیا ہے بعض رواد کا حال تو یہ ہے کہ کسی خاص واقعہ کی بناء پر امام مالک جیسے شخص نے اس کو دجال تک کا لفظ کہہ دیا ہے مگر جو لوگ اس فن کا کچھ بھی مطالعہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک اس کا بھی ایک معیار ہے۔ ہم کو یہاں مناظرہ کا اکھاڑہ قائم کرنا نہیں ہے اس لیے ان تفصیلات کے درپے ہونا نہیں چاہتے اور مذکورہ بالا کبار محدثین کی رائے کی متابعت میں اس حدیث کو یہاں درج کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔

(۹۷۸) \* سلمان فارسی کی شخصیت ایک عظیم تاریخی شخصیت ہے۔ مذہب حق کی تلاش کی جوڑپ اللہ تعالیٰ نے ان کے سینہ میں لکھی.....



فَالْيَ مَنْ تُوَصِّى بِي وَبِمَ تَأْمُرُنِي قَالَ اَيُّ بَنِي  
وَاللّٰهِ مَا اَعْلَمُ اَصْبَحَ اَحَدٌ عَلٰى مِثْلِ مَا كُنَّا  
عَلَيْهِ مِنَ النَّاسِ اَمْرُكَ اَنْ تَاتِيَهُ وَ لَكِنَّهُ قَدْ  
اَظْلَ زَمَانُ نَبِيٍّ مَّبْعُوْتٌ بِدِيْنِ اِبْرَاهِيْمَ يَخْرُجُ  
بِاَرْضِ الْعَرَبِ مُهَاجِرُهُ اِلَى الْاَرْضِ بَيْنَ  
حَرَّتَيْنِ بَيْنَهُمَا نَخْلٌ بِهِ عَلَامَاتٌ لَا تَخْفٰى  
يَاْكُلُ الْهَدِيَّتَ وَ لَا يَأْكُلُ الصَّدَقَةَ بَيْنَ كِتْفَيْهِ  
خَاتَمُ النُّبُوَّةِ فَاِنْ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَلْحَقَ بِتِلْكَ  
الْبِلَادِ فافْعَلْ . قَالَ ثُمَّ مَاتَ وَ غِيْبَ وَ مَكَثَتْ  
بِعُمُورِيَّةٍ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ اَمُكَّتْ ثُمَّ مَرَّبِيْ نَفْرُ  
كَلْبٍ تَجَارًا فَقُلْتُ لَهُمْ اَحْمِلُونِيْ اِلَى اَرْضِ  
الْعَرَبِ وَ اعْطِيْكُمْ بِقِرَاتِيْ هَذِهِ وَ غَنِيْمَتِيْ  
هَذِهِ قَالُوا نَعَمْ فَاَعْطَيْتُمُوهَا وَ حَمَلُونِيْ  
مَعَهُمْ حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا وَادِي الْقُرٰى ظَلَمُونِيْ  
فَبَاعُونِيْ مِنْ رَّجُلٍ يَهُودِيٍّ عَبْدًا فَكُنْتُ  
عِنْدَهُ وَ رَاَيْتُ النَّخْلَ فَرَجَوْتُ اَنْ يَكُوْنَ  
الْبَلَدُ الَّذِي وَصَفَ لِيْ صَاحِبِيْ وَ لَمْ يَحِقْ  
فِيْ نَفْسِيْ فَبَيَّنَا اَنَا عِنْدَهُ اِذْ قَدِمَ ابْنُ عَمٍّ لَهُ  
مِنْ بَنِي قُرَيْظَةَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ فَاَبْتَاَعَنِيْ مِنْهُ  
فَاَحْتَمَلَنِيْ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَوَاللّٰهِ مَا هُوَ اِنْ  
رَاَيْتُهَا فَعَرَفْتُهَا بِصِفَتِ صَاحِبِيْ لَهَا فَاَقَمْتُ

مجھ کو زمین سے زیادہ تمہاری فکر ہو جائے گی اور میں یہاں کسی کام کا بھی نہ رہوں  
گا۔ یہ کہتے ہیں گھر سے نکلتے وقت تو میرا ارادہ اسی زمین پر جانے کا تھا جس کے  
لئے انہوں نے مجھ کو بھیجا تھا۔ لیکن درمیان میں نصاریٰ کے گرجوں میں سے  
ایک گرجے سے میرا گزر ہوا میں نے وہاں اس کی کچھ آوازیں سنیں وہ نمازیں  
ادا کر رہے تھے۔ چونکہ والد نے مجھے گھر میں بند کر رکھا تھا۔ اس لئے مجھے اس کا  
پتہ ہی نہ تھا کہ لوگ کس جہان میں بستے ہیں ان کی آوازیں سن کر میں اندر چلا گیا  
اور جا کر یہ دیکھنے لگا کہ وہ کرتے کیا ہیں جب میں نے ان کو دیکھا تو مجھے ان کی  
نماز پسند آئی اور میں نے ان میں شامل ہونے کی کوشش کی اور دل میں کہا خدا کی  
قسم جس دین میں میں اس وقت ہوں اس سے یہ دین بہتر معلوم ہوتا ہے یہ سوچ  
کر میں ان ہی کے ساتھ رہا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا اور اپنے والد کی  
زمین تک نہ جاسکا پھر میں نے کہا آپ لوگ اس دین کی اصل جگہ بتائیے۔  
انہوں نے کہا ملک شام۔ میں اپنے والد کے پاس واپس آ گیا۔ ادھر انہوں نے  
میری تلاش کے لئے آدمی بھیج رکھے تھے اور سب اپنے کاروبار سے معطل پڑے  
تھے۔ جب میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا عزیز فرزند تم کہاں تھے تم کو جو بات  
ضروری تھی کیا وہ بتا نہ دی تھی کہ دیر نہ لگانا۔ میں نے عرض کیا پدر بزرگوار بات یہ  
ہوئی کہ چند لوگوں کے پاس سے میرا گزر ہوا جو اپنے گرجوں میں نمازیں پڑھ  
رہے تھے مجھے ان کا دین پسند آیا اور اس لیے خدا کی قسم شام تک میں وہاں ہی  
رہا۔ والد نے فرمایا فرزند عزیز اس دین میں تو کوئی بھی خوبی نہیں تیرا اور تیرے  
بزرگوں کا دین اس سے کہیں بہتر ہے میں نے عرض کیا خدا کی قسم ہر گز نہیں وہ  
دین ہمارے دین سے بہت بہتر ہے۔ یہ کہتے ہیں والد نے مجھے بہت ڈرایا  
دھمکایا اور میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں اور گھر میں بند کر لیا۔ یہ کہتے ہیں

للہ ..... ودیعت فرمائی تھی اس کا اندازہ آپ کو ان چند سطور سے ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہاں جس چیز پر تنبیہ کرنی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان  
کے واقعہ سے آپ یہ اندازہ فرمائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا معاملہ اہل کتاب علماء کے درمیان کس درجہ شہرت اور وضاحت  
کے ساتھ مشہور و معروف تھا اور یہ کہ آپ کی چند علامات معلوم کر لینے کے بعد آپ کے شناخت کر لینے میں کیا سلمان رضی اللہ عنہ کو کوئی ادنیٰ  
سی دشواری بھی پیش آئی۔ اگر ان علامتوں پر محض عقلی لحاظ سے بحث کی جاتی اور نبوت و رسالت کے معنی محض عقلی اعتبار سے سمجھنے کی لئے .....  
.....

بِهَا وَبُعِثَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فَاقَامَ بِمَكَّةَ مَا اقَامَ وَلَا أَسْمَعُ لَهُ بِذِكْرِ مِمَّا  
أَنَا فِيهِ مِنْ شُغْلِ الرَّقِّ ثُمَّ هَاجَرَ إِلَى الْمَدِينَةِ  
فَوَاللَّهِ إِنِّي لَفِي رَأْسِ عِذْقٍ لِسَيِّدِي أَعْمَلُ  
فِيهِ بَعْضَ الْعَمَلِ وَ سَيِّدِي جَالِسٌ تَحْتِي إِذْ  
أَقْبَلَ ابْنُ عَمٍّ لَهُ حَتَّى وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ يَا  
فُلَانُ قَاتِلَ اللَّهِ بَنِي قَيْلَةَ وَاللَّهِ إِنَّهُمْ  
لَمُجْتَمِعُونَ الْآنَ بِقُبَاءٍ عَلَى رَجُلٍ قَدِمَ مِنْ  
مَكَّةَ الْيَوْمَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُ نَبِيٌّ قَالَ سَلْمَانُ فَلَمَّا  
سَمِعْتُهَا أَخَذْتَنِي الرَّعْدَةُ حَتَّى ظَنَنْتُ إِنِّي  
سَاقِطٌ عَلَى سَيِّدِي فَنَزَلْتُ عَنِ النَّخْلَةِ  
فَجَعَلْتُ أَقُولُ لِابْنِ عَمِّهِ مَاذَا تَقُولُ مَاذَا  
تَقُولُ قَالَ فَغَضِبَ سَيِّدِي فَلَكَمَنِي لَكَمَةً  
شَدِيدَةً ثُمَّ قَالَ مَالِكُ وَلِهَذَا أَقْبَلَ عَلَى  
عَمَلِكَ قَالَ فَقُلْتُ لَا شَيْءَ إِنَّمَا أَرَدْتُ أَنْ  
أَسْتَبِيهَ عَمَّا قَالَ. قَالَ وَقَدْ كَانَ عِنْدِي شَيْءٌ  
قَدْ جَمَعْتُهُ فَلَمَّا أُمْسَيْتُ أَخَذْتُهُ ثُمَّ ذَهَبْتُ بِهِ  
إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ  
بِقُبَاءٍ فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ فَقُلْتُ لَهُ إِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِي  
أَنَّكَ رَجُلٌ صَالِحٌ وَمَعَكَ أَصْحَابٌ لَكَ  
غُرَبَاءُ ذُو حَاجَةٍ وَ هَذَا شَيْءٌ كَانَ عِنْدِي

میں نے نصاریٰ کے پاس کہلا بھیجا کہ جب کبھی شام کا کوئی قافلہ تمہارے پاس  
آئے تو مجھے بھی خبر کرنا۔ یہ کہتے ہیں جب شام جانے والا ایک قافلہ ان کے پاس  
آیا تو وہ میرے پاس آئے اور مجھے اس کی خبر کی۔ میں نے کہا جب وہ اپنی  
ضروریات سے فارغ ہو لیں اور پھر شام واپسی کا ارادہ کریں تو اس وقت مجھے خبر  
کرنا چنانچہ جب وہ اپنے کام پورے کر چکے تو انہوں نے مجھے اس کی اطلاع دی  
یہ کہتے ہیں میں نے زنجیریں اپنے پیروں سے نکال پھینکیں اور ان کے ساتھ  
روانہ ہو لیا۔ یہاں تک کہ شام جا پہنچا۔ وہاں جا کر میں نے پوچھا اس دین کا  
یہاں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس گرجے کا پادری۔ یہ کہتے  
ہیں کہ میں اس کے پاس گیا اور میں نے کہا۔ مجھے یہ دین پسند ہے اور میری تمنا  
ہے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں اور اس گرجے میں آپ کی خدمت کیا کروں  
اور آپ سے نماز سیکھوں اور پھر آپ کے ساتھ نماز پڑھوں اس نے کہا اچھا آ جاؤ  
میں اس کے ساتھ گرجے میں داخل ہو گیا۔ یہ شخص بدنیت آدمی تھا لوگوں کو صدقہ  
کی ترغیب دیتا اور جب لوگ صدقہ لاتے تو اس کو اپنی ذات کے لیے جمع کرتا  
اور مسکینوں کو تقسیم نہ کرتا یہاں تک کہ اس تدبیر سے اس نے سات مٹکے چاندی  
اور سونے کے جمع کر لیے۔ یہ کہتے ہیں مجھے اس سے سخت بغض ہو گیا، ان حرکات  
کی وجہ سے جو میں نے اس کو کرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔  
اس کے دفن کے لیے نصاریٰ جمع ہوئے تو میں نے ان سے کہا یہ بڑا خراب  
انسان تھا، تم کو صدقہ کی ترغیب دیا کرتا تھا اور جب تم اس کے پاس صدقے  
لاتے تو اس کو اپنی ذات کے لیے جمع کر لیتا تھا اور مسکینوں کو کچھ نہ دیتا تھا۔  
انہوں نے کہا تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ میں نے کہا میں تم کو اس کے خزانہ کا پتہ بتاتا  
ہوں۔ انہوں نے کہا اچھا بتاؤ۔ چنانچہ وہ جگہ میں نے ان کو دکھائی۔ انہوں نے

اللہ..... کوشش کی جاتی تو جس آسانی سے سلمان رضی اللہ عنہ کو ساحل مقصود ہاتھ آ گیا کیا یہ ممکن تھا حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا  
کی ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں اس لیے قدرت نے ان کی شناخت بھی آسان سے آسان تر رکھی ہے اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ  
وسلم کی شناخت کے دلائل تو اور بھی زیادہ روشن رکھے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ کتب سابقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارات سو مقامات سے بھی زیادہ مذکور ہیں اللہ.....



لِلصَّدَقَةِ فَرَأَيْتُكُمْ أَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِكُمْ قَالَ  
فَقَرَّبْتُهُ إِلَيْهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ لَا ضَحَابَهُ كُلُّوا وَامْسِكْ يَدَهُ فَلَمْ  
يَأْكُلْ قُلْتُ فِي نَفْسِي هَذِهِ وَاحِدَةٌ ثُمَّ  
صَرَفْتُ عَنْهُ فَجَمَعْتُ شَيْئًا وَتَحَوَّلَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى الْمَدِينَةِ ثُمَّ  
جِئْتُهُ وَقُلْتُ إِنِّي رَأَيْتُكَ لَا تَأْكُلِ الصَّدَقَةَ  
وَهَذِهِ هَدِيَّةٌ أَكْرَمْتُكَ بِهَا قَالَ فَآكَلَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهَا وَآمَرَ  
أَصْحَابَهُ فَآكَلُوا مَعَهُ قَالَ فَقُلْتُ فِي نَفْسِي  
هَاتَانِ ثِنْتَانِ قَالَ ثُمَّ جِئْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ بِبَقِيعِ الْغَرَقِدِ قَدْ تَبَعَ  
جَنَازَةَ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِهِ وَ عَلَيْهِ شِمْلَتَانِ وَ  
هُوَ جَالِسٌ فِي أَصْحَابِهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ ثُمَّ  
اسْتَدْبَرْتُهُ أَنْظُرُ إِلَى ظَهْرِهِ هَلْ أَرَى الْخَاتَمَ  
الَّذِي وَصَفَ لِي صَاحِبِي فَلَمَّا رَأَيْتُ رَسُولَ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَدْبَرْتُهُ عَرَفَ  
أَنِّي اسْتَشَيْتُ فِي شَيْءٍ وَصَفَ لِي فَالْقَى  
رِذَاءَهُ عَنْ ظَهْرِهِ فَنَظَرْتُ إِلَى الْخَاتَمِ فَعَرَفْتُهُ  
فَاكْبَيْتُ عَلَيْهِ أَقْبَلُهُ وَابْكَيْتُ فَقَالَ لِي

سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے سات منکے وہاں سے برآمد کیے۔ جب  
انہوں نے یہ ماجرا دیکھا تو کہا ہم ایسے شخص کو ہرگز دفن نہیں کریں گے۔ اس کو  
سولی پر لٹکایا اور پتھروں سے سنگسار کیا اور دوسرا آدمی بلا کر اس کی جگہ بٹھلا دیا۔  
سلمانؓ کہتے ہیں میں نے اس آدمی سے بڑھ کر کوئی شخص جو پنجوقتہ نماز کا پابند دنیا  
سے بے رغبت اور آخرت کا طالب اور روز و شب عبادت میں مشغول ہو نہیں  
دیکھا لہذا مجھے اس سے اتنی محبت ہو گئی کہ اس سے پہلے دنیا کی کسی چیز سے نہ  
تھی۔ میں اس کے پاس ایک مدت تک مقیم رہا پھر جب اس کی وفات کا وقت  
قریب آیا تو میں نے ان سے عرض کیا میں اتنی مدت آپ کی خدمت میں رہا اور  
آپ سے اتنی محبت رکھتا ہوں کہ اس سے قبل دنیا کی کسی چیز سے مجھ کو اتنی محبت  
نہیں ہوئی۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے پاس پیغام اجل آ پہنچا ہے تو آپ  
مجھے کس کے سپرد کر کے جاتے ہیں اور میرے لیے آئندہ اب کیا حکم ہے۔  
انہوں نے فرمایا فرزند عزیز! خدا کی قسم میرے علم میں اب کوئی شخص نہیں ہے جو  
صحیح طور پر اس دین پر قائم رہا ہو جس پر کہ میں تھا لوگ تباہ و برباد ہو چکے ہیں اور  
جس دین پر پہلے تھے اس کو اکثر بدل بدل کر چکے ہیں ہاں موصل میں ایک شخص  
ہے جس کا نام فلاں ہے وہ شخص اسی دین پر ہے جس میں میں ہوں اس کے پاس  
چلے جانا۔ یہ کہتے ہیں جب ان کی وفات ہو گئی اور دفن ہو چکے تو میں ان موصل  
والے پادری کے پاس چلا گیا۔ میں نے ان سے کہا اے فلاں مجھ کو فلاں پادری  
نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور  
یہ بتایا تھا کہ آپ ان ہی کے دین پر پورے پورے قائم ہیں۔ انہوں نے فرمایا  
اچھا تو میرے پاس قیام کرو۔ میں نے ان کے پاس قیام کیا اور میں نے ان کو

للہ ..... (الجواب الصحیح ج ۲ ص ۲۷۷) اسی لیے یہود مدینہ کی حالت تو یہ تھی کہ آپؐ کے ظہور سے قبل وہ اوس و خزرج کے مقابلہ میں ہمیشہ  
آپؐ کے وسیلہ سے دعاء فتح و نصرت مانگا کرتے تھے لیکن جب آپؐ کا ظہور ہوا تو پھر سب سے بڑھ کر آپؐ کے دشمن یہی تھے چنانچہ معاذ بن  
جبل، بشر بن براء اور داؤد بن سلمہ نے یہود کو یہی طعنہ دیا کہ ہم مشرک تھے اور تم اہل کتاب ہمارے مقابلہ میں جب جنگ ہوتی تو تم لوگ آپؐ  
کے وسیلہ سے دعاء فتح مانگتے اور ہمارے سامنے آپؐ کی علامتیں اور آپؐ کی صفات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا کرتے اب تم کو کیا ہو گیا  
ہے کہ اسلام قبول نہیں کرتے بلکہ اور اگلے برسر پیکار نظر آتے ہو۔ للہ.....

رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَوَّلَ  
فَنَحَوَّلْتُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَقَصَصْتُ عَلَيْهِ حَدِيثِي  
كَمَا حَدَّثْتُكَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ فَأَعْجَبَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَسْمَعَ ذَاكَ  
أَصْحَابُهُ ثُمَّ شَغَلَ سَلْمَانَ الرَّقُّ حَتَّى فَاتَهُ مَعَ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَدْرٌ وَ  
أُحُدٌ قَالَ سَلْمَانُ ثُمَّ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاتِبُ يَا سَلْمَانُ  
فَكَاتَبْتُ صَاحِبِي عَلَى ثَلَاثِمِائَةِ نَخْلَةٍ أُحْيِيهَا  
لَهُ بِالْفَقِيرِ وَ أَرْبَعِينَ أُوقِيَةً فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَصْحَابِهِ أَعِينُوا  
أَخَاكُمْ فَأَعَانُونِي فِي النَّخْلِ الرَّجُلُ بِثَلَاثِينَ  
وَدِيَّةً وَ الرَّجُلُ بِعِشْرِينَ وَ دِيَّةً وَ الرَّجُلُ  
بِخَمْسٍ عَشْرَةٍ وَ دِيَّةً وَ الرَّجُلُ بِعَشْرَةٍ يُعِينُ  
الرَّجُلُ بِقَدْرٍ مَا عِنْدَهُ حَتَّى اجْتَمَعَتْ لِي  
ثَلَاثُمِائَةِ وَ دِيَّةٍ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اذْهَبْ يَا سَلْمَانُ فَفَقَّرْ لَهَا  
فَإِذَا فَرَعْتَ فَأَتِنِي أَكُنْ أَنَا أَضْعَهَا بِيَدِي قَالَ  
فَفَقَّرْتُ وَ أَعَانَنِي أَصْحَابِي حَتَّى إِذَا فَرَعْتُ  
جِسْتُهُ فَأَخْبَرْتُهُ فَخَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

بھی بہت نیک شخص پایا۔ جس دین پر ان کے پہلے رفیق تھے یہ بھی اسی پر تھے۔  
ابھی کچھ مدت نہ ہوئی تھی ان کی بھی وفات کا وقت آ گیا تو میں نے ان سے عرض  
کیا۔ اے فلاں مجھ کو فلاں پادری نے آپ کے لیے وصیت کی تھی اور یہ حکم دیا تھا  
کہ آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں اب جیسا آپ دیکھ رہے ہیں آپ کے پاس  
بھی حکم ربی آ چکا ہے تو آپ مجھے کس کی وصیت فرماتے ہیں اور میرے لیے کیا  
حکم دیتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا بخدا میں اس دین پر جس پر کہ خود قائم ہوں آج  
ایک شخص کے سوا کسی اور کو نہیں جانتا وہ شخص نصیبین میں ہیں ان کا نام فلاں ہے  
تم ان کے پاس چلے جانا۔ جب ان کا انتقال ہو گیا اور دفن ہو چکے تو میں ان  
نصیبین والے شخص کے پاس چلا گیا اور اپنا قصہ عرض کیا اور دو میرے بزرگ جو  
پہلے حکم دے چکے تھے وہ سب بیان کیا۔ انہوں نے کہا اچھا میرے پاس ٹھہرو  
میں نے ان کو بھی پہلے دو بزرگوں جیسا پایا اور میں اس مرد صالح کی خدمت میں  
رہا۔ خدا کی قسم ابھی ان کو بھی کچھ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ ان کی بھی وفات کا  
وقت آ گیا۔ اسی طرح میں متعدد بزرگوں کی خدمت میں گذرتا ہوا عموریہ والے  
بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے ان سے بھی اپنا سارا واقعہ عرض کیا۔  
انہوں نے فرمایا اچھا میرے پاس ٹھہرو۔ اب میں ایک ایسے بزرگ کی خدمت  
میں قیام پذیر تھا جو نہایت نیک اور اپنے سے پیشرو بزرگوں ہی کے قدم بقدم  
تھے۔ اس اثناء میں میں نے تھوڑا مال بھی کمایا تھا اور میرے پاس کچھ گائے اور  
تھوڑی سی بکریاں ہو گئی تھیں آخر کار ان کے پاس بھی فرمان الہی آ پہنچا۔ جب  
ان کی نزع روح کا وقت ہوا تو میں نے عرض کی کہ فلاں فلاں بزرگوں نے مجھ کو  
ایک دوسرے کی وصیت فرمائی تھی تا آنکہ میں آپ تک آ پہنچا اب آپ مجھے کس

للہ ..... حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل یہود مدینہ میں آپ کا بڑا چرچا رہا کرتا تھا اور یہی باعث تھا کہ انصار کسی  
پس و پیش کے بغیر حلقہ گوش اسلام ہو گئے تھے۔ ایک یہود مدینہ پر کیا منحصر تھا شاہ ہرقل، مقوقس اور شاہ حبشہ جیسے بڑے بڑے بادشاہوں نے  
آپ کی تصدیق کی اور اہل کتاب کا بڑا طبقہ آپ کی بشارات دیکھ دیکھ کر ہی اسلام میں داخل ہوا اور جوان میں داخل نہیں ہوا اس کو بھی آپ  
کے معاملہ میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی، بلکہ محض عناد و عداوت اور اپنی ریاست کی خاطر داخل نہ ہوا۔ یہ بیان اہل اسلام کا نہیں بلکہ خود ان کا ہے  
جنہوں نے اسلام لانے کے بعد اپنی زبانوں سے ان سب امور کا اقرار کیا ہے۔ للہ .....



عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعِيَ إِلَيْهَا فَجَعَلْنَا نُقَرِّبُ إِلَيْهَا  
الْوَدَىَّ وَيَضَعُهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ بِيَدِهِ حَتَّى إِذَا فَرَّغْنَا فَوَالَّذِي نَفْسُ  
سَلْمَانَ بِيَدِهِ مَا فَاتَتْ مِنْهَا وَدِيَّةً وَاحِدَةً  
فَأَذَيْتُ النَّخْلَ وَبَقِيَ عَلَى الْمَالِ فَاتَى  
رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِثْلِ  
بَيْضَةِ الدُّجَاجَةِ مِنْ ذَهَبٍ مِنْ بَعْضِ الْمَعَادِنِ  
فَقَالَ مَا فَعَلَ الْفَارَسِيُّ الْمَكَاتِبُ قَالَ  
فَدَعَيْتُ لَهُ قَالَ خُذْ هَذِهِ فَأَذِمْ عَلَيْكَ يَا  
سَلْمَانُ قَالَ قُلْتُ وَ أَيْنَ تَقَعُ هَذِهِ مِمَّا عَلَى يَا  
رَسُولَ اللَّهِ قَالَ خُذْهَا فَإِنَّ اللَّهَ يُؤْذِي بِهَا  
عَنْكَ قَالَ فَاخْذْتُهَا فَوَزَنْتُ لَهُمْ مِنْهَا وَ  
الَّذِي نَفْسُ سَلْمَانَ بِيَدِهِ أَرْبَعِينَ أَوْقِيَةً فَأَوْ  
فَيْتُهُمْ حَقَّهُمْ وَ عَتَقَ سَلْمَانُ فَشَهِدَتْ مَعَ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْخَنْدَقِ  
حُرًّا ثُمَّ لَمْ يَفْتَنِي مَعَهُ مَشْهُدٌ. رواه محمد  
ابن اسحق و الحاكم و البيهقي في كتاب  
دلائل النبوة قال الحافظ ابن كثير و طريق  
محمد ابن اسحاق اقوى اسنادا و احسن  
اقتصاصا الى ما رواه البخارى في صحيحه

بات کا حکم دیتے ہیں انہوں نے فرمایا بخدا میرے علم میں اب کوئی شخص ایسا نہیں  
ہے جو اس دین پر قائم رہا ہو جس پر کہ ہم لوگ تھے تاکہ میں تم کو ان کی خدمت  
میں حاضری کے لیے کہہ سکوں لیکن ایک نبی کے مبعوث ہونے کا وقت بالکل سر  
پر آ چکا ہے جو دین ابراہیمی لے کر آئیں گے سرزمین عرب میں ان کا ظہور ہوگا  
اور وہ ایسی سرزمین کی طرف ہجرت فرمائیں گے جس کے دو طرف سنگستان ہوگا  
اس میں کھجوروں کے باغات ہوں گے اس نبی میں ایسی کھلی علامتیں بھی موجود  
ہوں گی جو کسی پر پوشیدہ نہ ہوں گی وہ ہدیہ کھالیں گے اور صدقہ نہیں کھائیں گے  
ان کے دونوں شانوں کے درمیان ”مہرنبوت“ ہوگی اگر تم ان مقامات میں پہنچ  
سکتے ہو تو پہنچ جانا اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور دفن کر دیئے گئے۔ ان کے  
بعد جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا میں مقام عموریہ میں قیام پذیر رہا۔ پھر قبیلہ  
کلب کے کچھ تاجروں کا میری طرف سے گذر ہوا میں نے ان سے کہا مجھے بھی  
سرزمین عرب میں لے چلو اور میں اپنی یہ گائیں اور بکریاں (اس کے عوض میں)  
سب تم کو دیتا ہوں انہوں نے کہا اچھا۔ چنانچہ میں نے وہ سب ان کو دے دیں۔  
انہوں نے مجھ کو اپنے ساتھ لے لیا لیکن جب مقام ”وادی القری“ میں پہنچے تو  
انہوں نے مجھ پر بڑا ظلم کیا اور ایک یہودی کے ہاتھ مجھ کو غلام بنا کر فروخت کر  
ڈالا۔ میں اس کے پاس رہا گیا اور جب میں نے یہاں کھجور کے درخت دیکھے تو  
مجھے کچھ امید ہوئی کہ شاید یہ وہی مقام ہوگا جس کے متعلق عموریہ والے بزرگ  
نے مجھ کو ہدایت کی تھی، لیکن میرے دل میں اس کا پورا پورا یقین نہ ہوا ابھی میں  
اس کے گھر ہی میں تھا کہ اس کا ایک چچا زاد بھائی مدینہ (شریف) سے آیا جو بنو  
قریظہ کے خاندان سے تھا اس یہود نے مجھ کو اپنے چچا زاد بھائی کے ہاتھ فروخت

اللہ ..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف صفات ہی نہیں بلکہ بعض علماء اہل کتاب اور بادشاہوں کے پاس تو ان علامات کے مطابق  
آپ کی تصویریں تک بھی موجود تھیں چنانچہ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت جبیرؓ سے نقل کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ شام جانے کے ارادہ  
سے نکلا، بصری پہنچ کر چند اہل کتاب علماء سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا تم حرم کے باشندہ ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ یہ  
سن کر مجھ کو وہ ایک بڑے گرجا میں لے گئے جہاں متعدد تصویریں موجود تھیں انہوں نے مجھ سے کہا پہچان سکتے ہو ان میں تمہارے صاحب  
کون ہیں؟ میں نے ایک تصویر کو دیکھا تو وہ ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی اس کے بعد دیکھا تو آپ کے قریب ہی ایک دوسرے  
بزرگ نظر آئے جو آپ کے پیر کی ایڑی پکڑے بیٹھے تھے۔ انہوں نے پوچھا ان کو بھی پہچانتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں۔ اس نے کہا یا در کھو یہی شخص  
ہیں جو ان کے بعد ان کے خلیفہ ہوں گے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ جتنے اور انبیاء علیہم السلام ہوئے ہیں سب کے بعد کوئی نہ اللہ .....

عن سلمان انه تداوله بضعة عشر من رب  
الى رب اى معلّم و مربّ الى مثله و الله  
تعالى اعلم قال السهيلي تداوله ثلاثون  
سيّدًا من سيد الى سيد فالله اعلم. و  
كذلك استقصى قصة اسلامه الحافظ ابو  
نعيم فى الدلائل و او ردلها اسانيد و الفاظاً  
كثيرة. و قد حذفنا صدر القصة روماً  
للاختصار فتنه.

کر دیا وہ مجھ کو مدینہ لے آیا۔ خدا کی قسم جوں ہی کہ میں نے مدینہ کو دیکھا تو میں  
نے اپنے ان بزرگوں کے بیان کردہ علامات سے اس کو فوراً پہچان لیا۔ اب  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو چکی تھی لیکن اس وقت آپ کا قیام مکہ ہی  
میں تھا اور چونکہ میں غامی کے فرائض ادا کرنے میں پڑا رہا کرتا اس لیے مجھ کو  
آپ کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی کچھ عرصہ بعد ایسا اتفاق ہوا کہ آپ نے مدینہ کی  
طرف ہجرت فرمائی۔ بخدا میں اس وقت ایک کھجور کے درخت کے اوپر اپنے آقا  
کے کسی کام میں مشغول تھا اور میرا آقا نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اس کا چچا زاد  
بھائی اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور بولا اے فلاں خدا تعالیٰ بنوقیلہ کو موت دے

یہ سب کے سب ایک شخص کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں جو آج ہی مکہ سے آیا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نبی ہے۔ سلمانؓ  
کہتے ہیں بس یہ سننا تھا کہ میرے جسم پر ریشہ پڑ گیا اور مجھے یقین ہوا کہ میں اپنے آقا پر جاگروں گا اس لیے درخت کے اوپر سے اتر  
آیا اور اس کے چچا زاد بھائی سے پوچھنے لگا۔ ہیں کیا کہتے ہو؟ کیا کہتے ہو؟ اس پر میرا آقا بھڑک اٹھا اور مجھے ایک سخت لات ماری  
اور بولا تجھ کو اس کی کیا پڑی تو اپنے کام میں لگ۔ میں نے کہا کچھ نہیں میں تو صرف وہ بات سمجھنی چاہتا تھا جو انہوں نے کہی تھی۔ میں  
نے کچھ تھوڑا سا مال جمع کر لیا تھا جب شام کا وقت ہوا تو میں اس کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا پہنچا۔ ابھی  
آپ قباء ہی میں رونق افروز تھے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپ سے عرض کی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نیک  
شخص ہیں اور آپ کے ساتھ کچھ بے وطن غریب لوگ بھی ہیں۔ میرے پاس یہ کچھ صدقہ کا مال تھا میں نے دوسروں کی بجائے آپ  
لوگوں کو اس کا زیادہ حق دار سمجھا ہے۔ چنانچہ میں نے وہ مال آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء  
سے مخاطب ہو کر فرمایا اس کو تم لوگ کھا لو اور آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور خود تناول نہ فرمایا۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ ایک  
علامت تو پوری ہو گئی۔ پھر میں واپس آیا اور میں نے کچھ مال جمع کیا اب آپ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور میں نے حاضر ہو کر عرض  
کی۔ میں نے دیکھا کہ آپ صدقہ کا مال نہیں کھاتے ہیں لہذا یہ ہدیہ ہے آپ کی خدمت میں اکراماً حاضر ہے۔ سلمانؓ کہتے ہیں اس  
کو آپ نے بھی تناول فرمایا اور اپنے رفقاء سے بھی فرمایا تو انہوں نے بھی آپ کے ساتھ کھایا۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ دو  
علامتیں پوری ہوئیں اس کے بعد پھر ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ اپنے کسی صحابی کے جنازہ کے ساتھ  
بقیع غرقہ میں آئے ہوئے تھے اور اس وقت آپ دو چادریں اوڑھے ہوئے اپنے رفقاء میں رونق افروز تھے۔ میں نے آپ کو

للہ..... کوئی نبی ہوتا رہا ہے صرف یہ ایک ایسے نبی ہیں جن کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس واقعہ کو ابو نعیم نے بھی دلائل النبوة میں ذکر کیا ہے۔

اسی طرح موسیٰ بن عقبہ ذکر کرتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ہشام بن العاص، نعیم بن عبد اللہ اور تیسرے  
ایک شخص اور شاہ روم کے پاس بھیجے گئے تھے یہ کہتے ہیں کہ ہم جبلہ بن اسہم سے ملے اس وقت یہ مقام غوطہ میں تھے وہ ہم کو لے کر بادشاہ کی  
خدمت میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے ہم کو چند تصویریں دکھائیں پھر ایک تصویر کے متعلق کہا کہ یہ سب سے آخری تصویر تھی لیکن میں نے تم کو پہلے  
اس لیے دکھائی ہے کہ ان کے متعلق تمہارا خیال معلوم کروں۔ یہ تصویر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی اس کے بعد اس نے دیگر سب للہ.....



سلام کیا پھر میں آپ کے پیچھے کی جانب گھوماتا کہ پشت والی علامت بھی دیکھوں کہ مہر نبوت جو علامت میرے بزرگ نے مجھ سے بیان کی تھی وہ بھی ہے یا نہیں۔ جب آپ نے دیکھا کہ میں آپ کی پشت کی جانب گھوما ہوں تو آپ پہچان گئے کہ کوئی علامت مجھے بتائی گئی ہے میں اس کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنی پشت کے اوپر سے اپنی چادر اتار دی۔ میں نے مہر نبوت دیکھ لی اور اس کو خوب پہچان لیا اور یہ دیکھتے ہی میں اس کے اوپر گر پڑا بس اس کو چومتا تھا اور روتا تھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا ادھر آؤ۔ میں سامنے حاضر ہو گیا اور میں نے اے ابن عباس جس طرح اپنا قصہ آپ کے سامنے پورا بیان کیا ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی کہہ سنایا۔ آپ کو یہ پسند ہوا کہ اس قصہ کو آپ کے اور صحابہ بھی سنیں۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ سلمانؓ اپنی غلامی کے دھندوں میں پھنسے رہے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جنگ بدر واحد میں شریک نہ ہو سکے۔ سلمانؓ بیان کرتے ہیں مجھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سلمان دیکھو تم اپنے آقا سے عقد کتابت کر لو (یعنی کچھ مقرر رقم دے کر آزاد ہو جاؤ) چنانچہ میں نے اپنے آقا سے عقد کتابت کر لیا اس معاوضہ میں کہ میں اس کو تین سو کھجور کے درخت لگا کر دوں گا یہاں تک کہ وہ پھل لے آئیں اور ان کے نصب کرنے کے لیے گڑھے کھودنے بھی میرے ہی ذمہ ہوں گے اور چالیس اوقیہ سونا نقد بھی دوں گا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو ترغیب دی کہ تم لوگ اپنے بھائی سلمان کی امداد کرو۔ چنانچہ انہوں نے میری مدد کی کسی شخص نے تمیں پودے کھجوروں کے دیئے اور کسی نے بیس کسی نے پندرہ اور کسی نے دس غرض ہر شخص نے اپنی اپنی وسعت کے مطابق میری امداد کی یہاں تک کہ میرے پاس تین سو پودے جمع ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے مجھ سے فرمایا جاؤ سلمان اب جا کر ان گڑھوں کا انتظام کرو اور جب اس سے فارغ ہو جاؤ تو میرے پاس آنا تاکہ میں خود اپنے ہاتھ سے پودے نصب کروں۔ چنانچہ میں گیا اور گڑھے خود بھی کھودے اور میرے اصحاب نے بھی ان میں میری امداد کی یہاں تک کہ جب میں کھود کر فارغ ہو گیا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو اطلاع دی آپ میرے ساتھ وہاں تشریف لے آئے۔ ہم آپ کے سامنے ایک ایک پودہ پیش کرتے جاتے اور آپ اس کو اپنے دست مبارک سے نصب کرتے جاتے یہاں تک کہ ہم سب کو نصب کر کے فارغ ہو گئے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں سلمان کی جان ہے کہ ان پودوں میں ایک پودا بھی ایسا نہ تھا جو مرا ہو (اس کے بعد وہ باغ اگلے ہی سال پھل لے آیا) اور میں نے اس کو اپنے مالک کے حوالہ کر دیا۔ اب میرے ذمہ صرف نقد کی قسط باقی رہ گئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کسی کان میں سے آپ کے پاس مرغی کے انڈے کے برابر کچھ سونا آیا تو آپ نے فرمایا وہ فارسی مکاتب کدھر گیا۔ اس پر میں بلایا گیا۔ آپ نے فرمایا سلمان! لو اس کو لے لو اور جو قرض تم پر ہے اس کو ادا کر دو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ میرے قرض کے مقابلہ میں اتنا سونا بھلا کیا کافی ہوگا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اس کو لے لو اور اللہ تعالیٰ اسی سے تمہارا سب قرض ادا کر دے گا۔ میں نے اس کو لے لیا اور وزن کر کے چالیس اوقیہ ادا کر دیئے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں سلمان کی جان ہے میں نے اسی سونے سے اس کا سب حق ادا کر دیا اور یہ سلمان آزاد ہو گیا۔ اور میں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ خندق میں شریک ہوا اور پھر کوئی غزوہ ایسا نہ تھا جس میں میں شریک نہ رہا ہوں۔ (دلائل النبوة از بیہقی، حاکم وغیرہما)

للہ ..... انبیاء سابقین علیہم السلام کی تصاویر بھی دکھائیں۔ مغیرہ بن شعبہ نے شاہ مقوقس کا واقعہ بھی اسی کے قریب قریب نقل کیا ہے ان تاریخی شہادتوں سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ اہل کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کس حد تک تھا اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی نہیں بلکہ جملہ انبیاء علیہم السلام کا تعارف کس درجہ تھا۔

(۹۷۹) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حَضَرَتْ عَصَابَةُ مِنَ الْيَهُودِ يَوْمًا إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ حَدِّثْنَا عَنْ خِلَالٍ نَسْأَلُكَ عَنْهَا لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا نَبِيٌّ فَقَالَ سَلُونِي مِمَّا شِئْتُمْ وَلَكِنْ اجْعَلُوا لِي ذِمَّةَ اللَّهِ وَ مَا أَخَذَ يَعْقُوبُ عَلَى بَنِيهِ إِنْ أَنَا حَدَّثْتُكُمْ بِشَيْءٍ تَعْرِفُونَهُ صِدْقًا لِنَبَا بَعُونِي عَلَى الْإِسْلَامِ قَالُوا لَكَ ذَلِكَ قَالَ فَسَلُونِي مِمَّا شِئْتُمْ قَالُوا أَخْبِرْنَا عَنْ أَرْبَعٍ خِلَالٍ أَخْبِرْنَا عَنِ الطَّعَامِ الَّذِي حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَنْزَلَ التَّوْرَةُ وَ أَخْبِرْنَا عَنْ مَاءِ الرَّجُلِ كَيْفَ يَكُونُ الذَّكَرُ مِنْهُ حَتَّى يَكُونَ ذَكَرًا أَوْ كَيْفَ يَكُونُ أُنْثَى حَتَّى يَكُونَ أُنْثَى وَ أَخْبِرْنَا كَيْفَ هَذَا النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ فِي التَّوْرَاتِ وَ مَنْ وَلِيَهُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالَ فَعَلَيْكُمْ عَهْدُ اللَّهِ وَ مِيثَاقُهُ لَنْ أَنَا حَدَّثْتُكُمْ لَتَنَّا بَعُونِي فَأَعْطَوهُ مَا شَاءَ مِنْ عَهْدٍ وَ مِيثَاقٍ قَالَ أَنْشَدُكُمْ بِاللَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ التَّوْرَةَ عَلَى مُوسَى هَلْ تَعْلَمُونَ أَنَّ إِسْرَائِيلَ مَرِضٌ مَرَضًا شَدِيدًا طَالَ سَقَمُهُ فِيهِ فَنَذَرَ لِلَّهِ نَذْرًا لِأَنَّهُ شَفَاهُ اللَّهُ مِنْ سَقَمِهِ لِيُحَرِّمَنَّ أَحَبَّ الشَّرَابِ وَ أَحَبَّ الطَّعَامِ إِلَيْهِ وَ كَانَ أَحَبَّ الشَّرَابِ إِلَيْهِ اللَّبَنُ الْإِبِلِ وَ أَحَبَّ الطَّعَامِ إِلَيْهِ لَحُومُ الْإِبِلِ

(۹۷۹) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک دن یہودی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بولی یا رسول اللہ! ہم کو چند باتوں کا جواب دیجئے جو ہم آپ سے ابھی پوچھنے والے ہیں ان کو نبی کے سوا اور کوئی شخص نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا جو دل چاہے شوق سے پوچھو۔ لیکن اگر میں ایسا جواب دے دوں جس کی صداقت کا تم بھی اعتراف کر لو تو مجھ سے اس بات کا عہد کرو کہ تم اسلام قبول کر لو گے اور اس بات کا بھی عہد کرو جس کا عہد یعقوب نے اپنی اولاد سے لیا تھا یعنی خدا تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ انہوں نے کہا منظور ہے اس کے بعد آپ نے فرمایا اب جو تمہاری مرضی میں آئے مجھ سے پوچھو وہ بولے ہم کو آپ چار باتیں بتا دیجئے۔ پہلی یہ کہ تورات کے نزول سے قبل وہ کھانا کیا تھا جو اسرائیل علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ دوم یہ بتائیے کہ مرد کی منی سے جب لڑکا بنتا ہے تو کیسے بنتا ہے اور عورت کی منی سے جب لڑکی بنتی ہے تو کیسے بنتی ہے۔ تیسرے یہ بات بتائیے کہ تورات میں اس نبی امی کی کیا علامت بیان کی گئی ہے۔ چوتھی یہ کہ فرشتوں میں سے کون فرشتہ ان کا رفیق کار مقرر کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا مجھ سے اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ عہد کرو کہ اگر میں ان کا جواب دے دوں تو تم لوگ اسلام قبول کرنے میں میرا کہا مان لو گے۔ اس پر انہوں نے خوب لمبے چوڑے عہد کیے اس کے بعد آپ نے فرمایا اچھا میں اس خدا تعالیٰ کی تم کو قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تھی بتاؤ کیا تم نہیں جانتے کہ اسرائیل جب سخت بیمار پڑے اور ان کی علالت بہت طویل ہو گئی تو انہوں نے یہ منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مجھے بیماری سے صحت بخشی تو جو مجھے کھانے پینے کی چیزوں میں سب سے زیادہ پسند ہوگی میں اس کو چھوڑ دوں گا اور واقعہ یہ تھا کہ پینے کی اشیاء میں اونٹ کا دودھ اور کھانے کی چیزوں میں اونٹ کا گوشت ان کو بہت پسند تھا (لہذا صحت کے بعد انہوں نے اپنی منت کے مطابق ان کا استعمال ترک فرمادیا تھا) انہوں نے (یہ جواب سن کر) کہا اے اللہ بے شک یہی بات ہے۔ آپ نے

(۹۷۹) \* یہاں یہ بحث کرنی کہ ان امور کا علم خصائص نبوت سے ہو سکتا ہے یا نہیں بالکل غیر متعلق بحث ہے۔ ہمارا مقصد یہاں اللہ.....



قَالُوا اللَّهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُمَّ أَشْهَدُ عَلَيْهِمْ فَقَالَ فَاَنْشُدْكُمْ بِاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ التَّوْرَاتَ عَلَى مُوسَى هَلْ تَعْلَمُونَ أَنَّ مَاءَ الرَّجُلِ غَلِيظٌ أبيضٌ وَأَنَّ مَاءَ الْمَرْأَةِ رَقِيقٌ أَصْفَرُ فَإِثْمُهُمَا عَلَا كَانَ الْوَلَدُ وَالشَّبَّاهُ لَهُ بِإِذْنِ اللَّهِ قَالُوا اللَّهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ اللَّهُمَّ أَشْهَدُ قَالَ أَنْشُدْكُمْ بِاللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَأَنْزَلَ التَّوْرَاتَ عَلَى مُوسَى هَلْ تَعْلَمُونَ إِنَّ هَذَا النَّبِيَّ تَنَامُ عَيْنَاهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ قَالُوا اللَّهُمَّ نَعَمْ قَالَ اللَّهُمَّ أَشْهَدُ قَالُوا أَنْتَ الْآنَ حَدَّثَنَا مَنْ وَلِيكَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ فَعِنْدَهَا نَجَامِعُكَ نُفَارِقُكَ قَالَ وَلِيَّي جِبْرِيلُ وَلَمْ يَعْثُ اللَّهُ نَبِيًّا قَطُّ إِلَّا وَهُوَ وَلِيُّهُ قَالُوا فَعِنْدَهَا نُفَارِقُكَ وَلَوْ كَانَ غَيْرُهُ لَا تَبْعُنَاكَ وَقَدْ قُنَاكَ قَالَ فَمَا يَمْنَعُكُمْ أَنْ تُصَدِّقُوا بِهِ قَالُوا إِنَّهُ عَدُوْنَا مِنَ الْمَلَائِكَةِ فَانْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ إِلَى قَوْلِهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ﴾ (البقرة: ۹۷)

(رواہ ابو داؤد الطیالسی)

فرمایا الہی تو بھی اس پر گواہ رہ۔ پھر آپؐ نے فرمایا میں تم کو اس خدا کی ذات کی قسم دیتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے موسیٰؑ پر تورات نازل فرمائی۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ مرد کی منی سفید رنگ اور گاڑھی ہوتی ہے اور عورت کی زرد اور پتلی اور ان میں جو غالب رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بچہ اسی کے مشابہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ بولے اے اللہ بے شک یہی بات ہے۔ آپؐ نے فرمایا اے اللہ تو بھی اس پر گواہ رہ پھر آپؐ نے فرمایا تم کو اس خدا تعالیٰ کی ذات کی قسم جس کے سوا معبود کوئی نہیں اور جس نے موسیٰؑ پر تورات نازل فرمائی کیا تم نہیں جانتے کہ اس نبی کی ایک علامت یہ ہے کہ نیند صرف اس کی آنکھوں پر طاری ہوگی اس کے دل پر نہیں وہ اس حالت میں بھی بیدار رہے گا وہ بولے اے اللہ بے شک یہی بات ہے آپؐ نے فرمایا الہی تو بھی گواہ رہ اس کے بعد انہوں نے کہا آپؐ ایک آخری بات اور بتا دیجئے بس اس کے بعد یا تو ہم آپؐ کے ساتھ ہو جائیں گے یا آپؐ سے علیحدہ ہو جائیں گے اور وہ یہ کہ فرشتوں میں کون فرشتہ آپؐ کا رفیق کا رہے۔ آپؐ نے فرمایا میرے ولی اور رفیق کا جبریلؑ ہیں اور مجھ سے پہلے جو نبی بھی ہوا ہے یہی اس کے رفیق کا رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ بولے بس اسی بات پر ہم آپؐ سے علیحدہ ہوتے ہیں اگر ان کے سوا آپؐ کا رفیق کا کوئی اور فرشتہ ہوتا تو ہم آپؐ کی اتباع کر لیتے اور آپؐ کی تصدیق کرتے۔ آپؐ نے پوچھا ان کی تصدیق کرنے سے تمہیں کیا بات مانع ہے انہوں نے کہا فرشتوں میں یہ ہمارا دشمن ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ”کہہ دو کہ جو جبریلؑ کا دشمن ہو (وہ ہو) کسی شک کے بغیر انہوں نے ہی اللہ تعالیٰ کے حکم سے قرآن پاک آپؐ کے قلب پر نازل کیا ہے جو اس تورات کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے۔“

(ابوداؤد طیالسی)

اللہ ..... صرف اتنا ہے کہ جس امر کو اہل کتاب نبوت کی نشانی سمجھتے چلے آئے تھے اور جو اشیاء ان کے بیان کے مطابق علوم نبوت میں شمار تھیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات میں سب موجود تھیں۔ آپؐ کے جواب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے پوری دیانت داری کے ساتھ ہر امر کا صاف صاف اعلان کر دیا تھا اور ان کے ایمان کی خاطر اپنے بیان کے کسی پہلو میں ذرا سی لچک پیدا نہیں کی۔ حضرت جبریلؑ علیہ السلام کے معاملہ میں جب انہوں نے اپنی عداوت کا اظہار کیا تو آپؐ بہت صفائی کے ساتھ یہاں ان سے الگ ہو گئے اور خدا تعالیٰ کے دوست و دشمن میں بے وجہ سازگاری پیدا کرنے کی کوئی سعی نہیں کی۔ آپؐ کے اس بے لاک اور واضح طرز عمل میں اہل فہم و انصاف کے لیے انبیاء علیہم السلام کی شناخت کے لیے ایک بڑی شاہراہ کھلتی ہے۔

(۹۸۰) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ كُنْتُ قَائِمًا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ حَبْرٌ مِنْ أَحْبَارِ الْيَهُودِ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدٌ فَدَفَعْتُهُ دَفْعَةً كَادَ أَنْ يَضْرَعَ مِنْهَا فَقَالَ لَمْ تَدْفَعْنِي قَالَ قُلْتُ أَلَا تَقُولُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ إِنَّمَا سَمَّيْتُهُ بِاسْمِهِ الَّذِي سَمَّاهُ بِهِ أَهْلُهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اسْمِي الَّذِي سَمَّانِي بِهِ أَهْلِي مُحَمَّدٌ فَقَالَ الْيَهُودِيُّ جِئْتُ أَسْأَلُكَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْفَعُكَ شَيْءٌ إِنْ حَدَّثْتُكَ قَالَ أَسْمِعْ بِأُذُنِي فَنَكَتْ بَعُودٌ فِي يَدِهِ فَقَالَ لَهُ سَلْ فَقَالَ الْيَهُودِيُّ أَيْنَ النَّاسُ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَهَ السَّمَوَاتِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الظُّلْمَةِ دُونَ الْجَسْرِ قَالَ فَمَنْ أَوَّلُ النَّاسِ إِجَارَةً قَالَ فَقَرَاءُ الْمُهَاجِرِينَ فَقَالَ الْيَهُودِيُّ فَمَا تُحَفَّتُهُمْ حِينَ يَدْخُلُونَ قَالَ زِيَادَةُ كَبِدَحُوتٍ قَالَ فَمَا عَدَاؤُهُمْ عَلَى أَثَرِهِ قَالَ يُنَحِّرُهُمْ ثَوْرُ الْجَنَّةِ الَّذِي كَانَ يَأْكُلُ مِنْ أَطْرَافِهَا قَالَ فَمَا شَرَابُهُمْ عَلَيْهِ قَالَ مَنْ عَيْنٍ فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا قَالَ صَدَقْتَ قَالَ وَجِئْتُ أَسْأَلُكَ عَنْ شَيْءٍ لَا يَعْلَمُهُ أَحَدٌ مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ إِلَّا نَبِيٌّ أَوْ رَجُلٌ أَوْ رَجُلَانِ قَالَ يَنْفَعُكَ إِنْ حَدَّثْتُكَ قَالَ أَسْمِعْكَ بِأُذُنِي قَالَ جِئْتُ أَسْأَلُكَ عَنْ الْوَلَدِ قَالَ مَاءُ الرَّجُلِ أَبْيَضُ وَ مَاءُ الْمَرْءَةِ

(۹۸۰) ثوبان بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھڑا ہوا تھا کہ یہود کا ایک عالم آیا اور بولا السلام علیک یا محمد۔ یہ سن کر میں نے اس کو ایسا دھکا دیا کہ وہ گرنے کے قریب ہو گیا۔ اس نے کہا تم نے مجھے کیوں دھکا دیا۔ میں نے کہا اس لیے کہ تو نے یا رسول اللہ کیوں نہیں کہا۔ وہ بولا میں نے آپ کا وہی نام تو لیا ہے جو آپ کے گھر والوں نے آپ کا رکھا ہے۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے گھر والوں نے میرا نام محمد ہی رکھا ہے اس کے بعد اس یہودی نے کہا میں آپ سے کچھ باتیں دریافت کرنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں تجھ کو وہ باتیں بتا دوں تو تجھ کو کچھ فائدہ ہوگا؟ اس نے کہا میں اپنے کانوں سے سن لوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زمین کریدنے لگے (جیسا کچھ سوچ رہے ہیں) اور فرمایا اچھا پوچھو۔ یہودی نے کہا (جس دن زمین دوسری صورت میں بدل دی جائے گی اور آسمان الٹ جائے) اس دن بھلا لوگ کہاں ہوں گے؟ آپ نے جواب دیا۔ ایک تاریکی میں ہوں گے جو پل صراط سے پہلے ہو گی۔ اس نے پوچھا اچھا بتائیے سب سے پہلے پل صراط سے گزرنے والے کون لوگ ہیں؟ آپ نے جواب دیا مہاجرین کے فقیر۔ یہودی نے پوچھا جب جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ان کا پہلا ناشتہ کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا۔ مچھلی کے جگر کا جو حصہ بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا اس کے بعد پھر ان کو کیا کھانا ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ ایک بیل ذبح کیا جائے گا جو جنت کے کناروں میں چرا ہوا ہوگا۔ اس نے پوچھا اچھا اس کے بعد ان کا پانی کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اس چشمہ کا پانی ہوگا جس کا نام سلسبیل ہے اس کے بعد اس نے کہا بس ایک بات اور پوچھتا ہوں جس کو نبی کے سوا زمین پر بسنے والوں میں کوئی انسان نہیں جانتا یا ایک دو شخص اور۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں بتا دوں تو تجھ کو کچھ فائدہ بھی ہوگا؟ اس نے کہا میں اپنے کان سے سن تو لوں گا۔ اس کے بعد اس نے کہا فرمائیے لڑکا کیسے بنتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا



أَصْفَرُ فَإِذَا اجْتَمَعَ فَعَلَ مَنِ الرَّجُلِ مَنِ  
الْمَرْأَةِ ذَكَرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَإِذَا عَلِمَنِ الْمَرْأَةُ  
مَنِ الرَّجُلِ أَنَّهُ بِإِذْنِ اللَّهِ فَقَالَ الْيَهُودِيُّ  
صَدَقْتَ وَإِنَّكَ لَنَبِيٌّ ثُمَّ انْصَرَفَ. فَقَالَ  
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّهُ سَأَلَنِي هَذَا  
الَّذِي سَأَلَنِي عَنْهُ وَمَا أَعْلَمُ شَيْئًا مِنْهُ حَتَّى  
آتَانِي بِهِ اللَّهُ تَعَالَى.

(رواه مسلم و رواه عبد بن حميد فى تفسيره)

(۹۸۱) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا  
قَالَتْ كَانَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ ثَوْبَانِ قَطْرِيَّانِ غُلِيظَانِ وَكَانَ إِذَا  
قَعَدَ فَعَرَقَ ثِقْلًا عَلَيْهِ فَقَدِمَ بَزٌّ مِنَ الشَّامِ  
لِفُلَانِ الْيَهُودِيِّ فَقُلْتُ لَوْ بَعَثْتَ إِلَيْهِ  
فَاشْتَرَيْتَ مِنْهُ ثَوْبَيْنِ إِلَى الْمَيْسَرَةِ فَأَرْسَلَ  
إِلَيْهِ فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُ مَا تُرِيدُ إِنَّمَا يُرِيدُ أَنْ  
تَذْهَبَ بِمَا لِي فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَبَ قَدْ عَلِمَ إِنِّي مِنْ أَتْقَاهُمْ  
وَإِذَا هُمْ لِلْأَمَانَةِ.

(رواه الترمذی و النسائی)

یہ بات تو معلوم ہے کہ مرد کی منی سفید رنگ کی اور عورت کی زرد رنگ کی۔  
جب دونوں جمع ہو جاتی ہیں تو اگر مرد کی منی غالب رہی تو اللہ تعالیٰ کے حکم  
سے لڑکا ہوتا ہے اور اگر عورت کی منی غالب ہوئی تو اس کے حکم سے لڑکی ہوتی  
ہے۔ یہودی بولا آپ نے ٹھیک بتایا اور یقیناً آپ سچے نبی ہیں۔ یہ کہہ کر وہ چلا  
گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو باتیں اس نے مجھ سے دریافت کی تھیں  
اس کے پوچھنے سے پہلے ان میں کسی ایک بات کا بھی مجھ کو علم نہ تھا یہاں تک کہ  
(جب اس نے پوچھا) تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ان کا علم عطا فرمادیا۔

(مسلم شریف)

(۹۸۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی  
اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر دو موٹے موٹے کپڑے تھے جب آپ بیٹھتے اور  
آپ کو پسینہ آتا تو وہ پسینہ میں بھیگ کر اور بھاری ہو جاتے۔ حسب اتفاق  
شام سے فلاں یہودی کا کچھ کپڑا آیا تو میں نے عرض کی کاش آپ اس  
یہودی کے پاس کسی کو بھیج کر (دو ہلکے ہلکے) کپڑے خرید لیتے اس شرط سے  
کہ جب آپ کو گنجائش ہوگی تو اس کی قیمت ادا فرمادیں گے۔ آپ نے اس  
یہودی کے پاس کہلا بھیجا۔ اس نے یہ سن کر کہا اچھا میں آپ کا مطلب سمجھ  
گیا، آپ کا مقصد اس بہانہ سے صرف میرا مال مار لینا ہے۔ آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا یہ جھوٹ کہتا ہے یہ خوب جانتا ہے کہ میں ان سب  
سے زیادہ متقی ہوں اور سب سے بڑھ کر امانت کا اداء کرنے والا ہوں۔

(ترمذی - نسائی)

(۹۸۱) \* یہودی ناہموار فطرت کا تجربہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے ہوتا چلا آ رہا تھا اس یہودی سے بھلا کیا بعید تھا کہ وہ آپ پر  
بھی اس قسم کی بہتان طرازی سے کام لیتا لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کن بلند اخلاق کے مالک تھے کہ پورے اقتدار کے  
باوجود اس یہودی پر کوئی دفعہ جرم نہیں لگاتے اور صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ میری صفت کتب سابقہ میں موجود ہے جس کو یہ بھی  
خوب جانتا ہے اس لیے میرے متعلق اس کا یہ بیان کسی غلط فہمی سے نہیں ہے بلکہ صریح کذب پر مبنی ہے۔ جہاں نبوت اور دلائل نبوت پر کسی  
نے کوئی حملہ کیا ہے آپ نے وہاں کھلے طور اس کی تردید کی ہے۔ اخلاق و رواداری اور اعلان حق اور اعلان حق اور کسی نصب العین کے تحفظ  
کے حدود اس ایک واقعہ سے سمجھ لینے چاہئیں۔

(۹۸۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں، کہ قریش مکہ نے نصر بن الحارث اور عقبہ کو مدینہ کے یہودی علماء کے پاس بھیجا اور ان سے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ کی ذرا ان سے تحقیق کریں اور ان کے سامنے ان کی شکل و شمائل بھی بیان کریں اور جو قرآن یہ ہم کو سناتے ہیں اس کی بھی ان کو خبر کر دیں کیونکہ وہ لوگ پہلی کتابوں کے جاننے والے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو معلومات ان کو ہیں وہ ہم کو نہیں ہیں۔ یہ دونوں روانہ ہوئے یہاں تک کہ مدینہ پہنچ گئے اور یہود کے علماء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تحقیق کرنے لگے، ان سے کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بھی بیان کیے اور کلام پاک کا کچھ حصہ بھی سنایا اور کہنے لگے کہ آپ لوگ تورات کے عالم ہیں ہم اس لیے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ ہمارے اس ہم وطن کے متعلق آپ ہم کو صحیح صحیح بات بتا دیں۔ وہ بولے اس شخص سے جا کر تین باتیں پوچھنا اگر وہ تم کو بتا دیں تو وہ یقینی خدا کی طرف سے نبی اور رسول ہیں اور اگر نہ بتائیں تو سمجھنا کہ افتراء پر داز آدمی ہے اور پھر جو سلوک تمہاری رائے میں آئے وہ کرنا۔ پہلی بات تو یہ پوچھنا کہ گزشتہ زمانہ میں نو جوانوں کی جو جماعت اپنے شہر سے باہر چلی گئی تھی ان کا قصہ کیا ہے۔ کیونکہ ان کا قصہ ایک عجیب قصہ ہے۔ دوسری بات یہ دریافت کرنا کہ جس شخص نے مشرق و مغرب کی سیاحت کی تھی اس کا قصہ کیا ہے اور روح کے متعلق بھی دریافت کرنا اس کی حقیقت کیا ہے اگر وہ ان

(۹۸۲) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَعَثْتُ قُرَيْشَ النَّضْرَ بْنَ الْحَارِثِ وَ عُقْبَةَ بْنَ أَبِي مُعَيْطٍ إِلَى أَحْبَارِ يَهُودَ بِالْمَدِينَةِ فَقَالُوا لَهُمْ أَسْأَلُوهُمْ عَنْ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) وَ صِفُوا لَهُمْ صِفَتَهُ وَ أَخْبِرُواهُمْ بِقَوْلِهِ فَإِنَّهُمْ أَهْلُ الْكِتَابِ الْأَوَّلِ وَ عِنْدَهُمْ عِلْمٌ مَا لَيْسَ عِنْدَنَا مِنْ عِلْمِ الْأَنْبِيَاءِ فَخَرَجَا حَتَّى قَدِمَ الْمَدِينَةَ فَسَأَلُوا أَحْبَارَ يَهُودَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ وَصَفُوا لَهُمْ أَمْرَهُ وَ بَعْضَ قَوْلِهِ وَقَالَا إِنَّكُمْ أَهْلُ التَّوْرَةِ وَ قَدْ جِئْنَاكُمْ لِتُخْبِرُونَا عَنْ صَاحِبِنَا هَذَا قَالَ فَقَالَتْ لَهُمْ أَحْبَارُ يَهُودَ سَلُّوهُ عَنْ ثَلَاثٍ فَأَمْرُكُمْ بِهِنَّ فَإِنْ أَخْبَرَكُمْ بِهِنَّ فَهُوَ نَبِيُّ مُرْسَلٍ وَإِنْ لَمْ يَفْعَلْ فَالرَّجُلُ مُتَقَوِّلٌ فَارْوَا فِيهِ رَأْيَكُمْ سَلُّوهُ عَنْ فِتْيَةٍ ذَهَبُوا فِي الدَّهْرِ الْأَوَّلِ مَا كَانَ مِنْ أَمْرِهِمْ فَإِنَّهُ قَدْ كَانَ لَهُمْ (حَدِيثٌ عَجِيبٌ وَ سَلُّوهُ عَنْ رَجُلٍ طَوَّافٍ بَلَغَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا مَا

(۹۸۲) \* حافظ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایمان کے تین ارکان ہیں ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالقیامۃ۔ اصحاب کہف کے اس قصہ میں ایمان کے ان ہر سہ اصول کی دلیلیں موجود ہیں۔ حسب بیان قرآن چونکہ اصحاب کہف تین سو سال کی مدت سے زیادہ عالم خواب میں پڑے رہے اس کے باوجود ان کے جسم بدستور صحیح و سالم تھے ان پر تغیر کا ذرا کہیں نام نہ آیا تھا اس سے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر جب اتنی طویل مدت کے بعد وہ بیدار ہوئے تو اس سے ثابت ہوتا کہ قیامت میں مردوں کا جی اٹھنا بھی حق ہے وہ بھی اسی طرح پھر زندہ ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے اس واقعہ کو بیان فرما کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَذَلِكَ أَغَثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا. (الكهف: ۲۱)

اور اسی طرح ہم نے ان کو خبر ظاہر کر دی کہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لہذا.....



سب باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دے دیں تو یقیناً وہ سچے نبی ہیں، ان کی پیروی کرنا اور اگر نہ بتا سکیں تو وہ کوئی افتراء پر داز آدمی ہے پھر اس کے ساتھ جو سلوک چاہو کرنا۔ نضر اور عقبہ یہ باتیں سن کر مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے اور جب یہاں پہنچے تو قریش سے کہا۔ اے قریش ہم تمہارے پاس ایک ایسی بات لے کر آئے ہیں جو تمہارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ میں فیصلہ کن ہے۔ ہم سے یہود کے علماء نے یہ کہا ہے کہ ہم ان سے چند باتیں دریافت کریں اور وہ سب باتیں بیان کیں۔ اس کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَدْ اَمَرْنَا اَحْبَارُ

اللہ ..... اور چونکہ اس عجیب در عجیب قصہ کی اطلاع آپ نے کسی سے حاصل کیے بغیر یہود کو دے دی اس لیے آپ کی نبوت بھی ثابت ہو گئی کیونکہ یہود کو یہ معلوم تھا کہ اس قصہ کی اطلاع یا تو نبی کو ہو سکتی ہے یا اس کو ہو سکتی ہے جس کو نبی اطلاع دے یہ بات تو ظاہر تھی کہ آپ کو کسی اور شخص نے اس کی اطلاع نہیں دی۔ اب رہا کسی نبی کا براہ راست آپ کو اطلاع دینا تو اس کا یہاں کوئی امکان ہی نہ تھا۔ لہذا ایک صورت اب بھی باقی رہ گئی تھی کہ وحی الہی نے آپ کو اس کی اطلاع دی ہو۔ اسی لیے انہوں نے اس کو آپ کی نبوت کا معیار قرار دے دیا تھا۔

حافظ سیوطی اصحاب کہف پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان واقعات کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کر دینا گویا یہ سب آپ کے چشم دید حالات تھے۔ حتیٰ کہ ان کے کتے کی نشست کی صورت بھی بالخصوص جب کہ ماحول ایسا ہو کہ ایک بہادر انسان بھی اس کو غور کے ساتھ دیکھ نہ سکتا ہو اس کی صریح دلیل ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں۔ (الروض الانف ص ۱۹۲ ج ۱)

اس تاریخی اور اہم واقعہ کے متعلق بعض آزاد خیال مصنفین اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دعوت مسیحی کی ابتدائی صدیوں ہی میں رہبانیت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور کچھ لوگ عبادت کے شوق میں پہاڑوں میں چھپ چھپ کر اپنی عمریں اسی طرح ختم کر دینے کے عادی ہو چکے تھے کچھ عرصہ کے بعد مختلف شکلوں سے جو عبادتیں وہ کرتے اسی حالت میں ان کا انتقال ہو جاتا اور آخر سوکھ سوکھ کر ان کے ڈھانچے اسی شکل پر رہ جاتے۔ یہ لکھ کر انہوں نے اس واقعہ کا سرا بھی محض اپنی قیاس آرائی سے اس مسیحی رہبانیت سے جا ملایا ہے اور پھر اسی مفروضہ صورت پر قرآنی آیات کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ اس کو پورے طور پر تاریخی روشنی میں پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ یہاں صاحب معجم کا بیان تو یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے بھی چار سو سال قبل کا واقعہ ہے۔ حافظ ابن کثیر کا میلان بھی اسی طرف ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب اس قصہ کا چرچا یہود کے درمیان بھی تھا تو یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے یقیناً قبل کا ہے۔ لہذا بعض مفسرین کا اس کو عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا واقعہ کہنا درست نہیں ہو سکتا۔ البدایہ والنہایہ ص ۱۱۴ ج ۲۔ اسی کے ساتھ انہوں نے عبادۃ بن صامت سے ایک روایت پیش کیا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں جب ان کو شاہ روم کے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا گیا تو قسطنطنیہ کے ایک پہاڑ میں جا کر انہوں نے بہ چشم خود اصحاب کہف کو دیکھا تھا پھر ان کا عدد دو شمار ان کی صورتیں اور ان کے لباس کی پوری تفصیل بھی بیان کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک بھی ان کے جسم پورے طور پر محفوظ تھے یہ سب کچھ تحریر فرما کر صاحب معجم لکھتے ہیں ”هذا ما نقلته من كتب الثقات و الله اعلم بصحته“ معجم البلدان ص ۳۷۴ ج ۴۔ لہذا.....

یٰهُودَ اَنْ نَّسْأَلَهُ عَنْ اُمُورٍ فَاٰخَبُوهُمْ بِهَا فِجَاءً وَّارْسُولَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فَقَالَ يٰ مُحَمَّدُ خَبِّرْنَا فَمَا سَأَلُوهُ عَمَّا اَمَرَ وَهُمْ بِهِ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰخَبِرْكُمْ وَاَجَاءَ جَبْرِیْلُ مِنَ اللّٰهِ بِسُوْرَةِ الْكَهْفِ فِیْهَا خَبْرٌ مَا سَأَلُوهُ عَنْهُ مِنْ

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ان سوالوں کا جواب بتائیے اور وہ سوالات ذکر کیے جو یہود نے ان کو بتائے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان کا جواب دیتا ہوں۔ اس پر جبریل علیہ السلام سورہ کہف لے کر تشریف لے آئے جس میں ان نو جوانوں کا اور اس سیاح شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور یہ آیت بھی نازل ہوئی ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ﴾

للہ..... حافظ سہیلی نے ان کے جسموں کی بقاء اور عدم بقاء کے متعلق صرف ابن عباس سے اتنا نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہ باقی نہیں رہے تھے۔ ان حالات میں اس کو مسیحی رہبانیت کا نتیجہ قرار دے دینا اور اصحاب کہف کے اجسام کا عام انسانوں کی طرح سڑکھل کر برابر ہو جانا تاریخی بیان کے سراسر خلاف ہے رہا یہ کہ قرآنی آیات میں اس کے لیے کتنی گنجائش ہے تو اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ پھر عجائبات قدرت کا صرف اصحاب کہف ہی ایک نمونہ نہ تھے بلکہ اس کی اور بہت مثالیں قرآن پاک میں موجود ہیں:

اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ اَنِّیْ یُحْیِیْ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلٰی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا.

مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جن کا گزرا ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی وہ بولے بھلا ایسی (برباد شدہ) بستی کو اللہ تعالیٰ پھر کہاں زندہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دے دی۔ اور وہ سو سال تک اسی طرح مردہ رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی اور ان سے پوچھا بتاؤ تم اس حالت میں کتنی مدت سے ہو؟ انہوں نے عرض کی دن بھر یا صرف چند گھنٹے گزرے ہوں گے۔ فرمایا نہیں تم پر سو سال اسی حالت میں گزر چکے ہیں اب ذرا اپنے کھانے اور پینے کو دیکھو اس میں ذرا تغیر نہیں ہوا دوسری طرف اپنے گدھے کو دیکھو (کہ اس کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہیں) یہ سب اس لیے ہوا کہ ہم نے چاہا کہ تم کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنادیں اب ان ہڈیوں کو دیکھو کس طرح ہم ان کو ابھار کر جوڑ دیتے ہیں اور پھر کس طرح ان پر گوشت پوست

(البقرہ: ۲۵۹) چڑھاتے ہیں۔

ان دونوں واقعات کو سامنے رکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اصحاب کہف کے قصہ میں بھی اپنی نیند کی مدت کے متعلق باہم سوال ہوا تھا "قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ" تم لوگ کتنی مدت اس حالت پر رہے۔ پھر ان کا جواب یہ تھا قَالُوا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ - اور یہاں خدا تعالیٰ کے یہ برگزیدہ نبی جب دوبارہ جی اٹھے تو ان سے بھی سوال یہی ہوا "كَمْ لَبِثْتُمْ" جواب ان کا بھی یہی تھا "لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ" (ایک دن یا ایک دن سے بھی کم) فرق یہ ہے کہ اس برگزیدہ رسول کو ان کی موت کی مدت بتادی گئی اور اصحاب کہف کے متعلق صرف اتنی بات پر اکتفاء کی گئی "رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ" اسی طرح اصحاب کہف کے ساتھ بھی ایک جانور تھا اور یہاں بھی ایک جانور تھا۔ فرق یہ ہے للہ.....



یہ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ایک حکم ہے۔

(الجواب الصحیح)

أَمْرُ الْغَيْبَةِ وَالرَّجُلِ الطَّوَّافِ وَقَوْلِ اللَّهِ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ الْخ. (ذکرہ محمد

ابن اسحق کما فی الجواب الصحیح)

(۹۸۳) عبد اللہ بن سلام کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے زید بن سعنہ کو ہدایت دینے کا ارادہ فرمایا تو یوں ہوا کہ زید نے (اپنے دل میں کہا) کہ نبوت کی جتنی علامتیں تھیں وہ سب کی سب تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں پہچان چکا ہوں بجز دو علامتوں کے جن کے متعلق مجھ کو (ہنوز) کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ کہ ان کی بردباری ان کی ترش مزاجی سے بہت بڑھی ہوئی ہوگی دوم یہ کہ جتنا ان کے ساتھ بگڑو گے اتنا ہی ان کی شان بردباری اور زیادہ ہوتی جائے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں

(۹۸۳) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ إِنَّ اللَّهَ لَمَّا أَرَادَ هَذَا زَيْدَ ابْنِ سَعْنَةَ قَالَ زَيْدٌ لَمْ يَبْقَ شَيْءٌ مِنْ عَلَامَاتِ النَّبُوَّةِ إِلَّا وَقَدْ عَرَفْتُهَا فِي وَجْهِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ نَظَرْتُ إِلَيْهِ إِلَّا اثْنَتَيْنِ لَمْ أُخْبَرْ بِهِمَا مِنْهُ يَسْبِقُ عِلْمُهُ جَهْلَهُ وَلَا يَزِيدُهُ شِدَّةُ الْجَهْلِ عَلَيْهِ إِلَّا حِلْمًا قَالَ فَكُنْتُ أَتَلَطَّفُ لَهُ لِأَنِّي أَخَالَطُهُ

للہ..... کہ اصحاب کہف کا کتا صحیح و سلامت موجود تھا لیکن ان بزرگ نبی کا کھانا تو بدستور تھا مگر ان کا گدھا گل سڑ کر برابر ہو گیا تھا۔ دونوں واقعات میں اللہ تعالیٰ کی زبردست نشانیاں موجود ہیں۔ مگر یہ ظاہر کہ جتنا مردہ انسان کا اتنی طویل مدت کے بعد پھر زندہ ہو جانا عجیب ہے چند افراد کا چند صدیاں حالت خواب میں رہ کر بیدار ہو جانا اتنا عجیب نہیں۔ اسی طرح ایک کتے کا اتنی طویل مدت تک صحیح و سالم رہنا اتنا بعید نہیں جتنا بعید کہ کھانے جیسے سریع الفساد چیز کا نہ سڑنا اور گدھے کا آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جانا عجیب ہے۔ اس لیے فرمایا ﴿أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا﴾ (الکھف: ۹) کیا تم خیال کرتے ہو کہ اصحاب کہف اور رقیم ہماری نشانوں میں عجیب تھے۔ یعنی ہماری نشانیاں اور ہماری قدرت کے کرشمے اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب موجود ہیں۔ پس اگر ایک اصحاب کہف کے عجیب قصہ کو دنیا کے واقعات کے عام سطح پر سمجھ لیا جائے تو بھی فائدہ کیا ہے جب تک کہ سارے قرآن کریم ہی کو از اول تا آخر بدلا نہ جائے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے انحطاط کے ہر دور میں دماغ اس کے درپے رہے ہیں کہ اس قسم کی تمام آیات پر بھی ہاتھ صاف کریں اور گویا اس طرح اپنے زعم باطل میں اسلام کو مادی عقول کے فہم کے لیے زیادہ سے زیادہ قریب لے آئیں مگر اس قسم کے واقعات قرآن کریم میں اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ اب تک یہ سعی نافر جام پوری نہیں ہو سکی۔ اسلام کی اس مزعوم خیر خواہی کے ساتھ ساتھ اس کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالنی بھی ضرور تھی کہ اگر قرآن کریم کے اوراق سے ان سب آیات کو اس طرح مسخ کر دیا گیا تو پھر اس میں دلائل ربو بیت کا حصہ کتنا باقی رہ جاتا ہے۔ اگر دنیا میں احیاء موتی کی ایک مثال بھی باقی نہیں رہتی تو پھر قیامت کے یقین اور خدا تعالیٰ کے اسم ”الحیی“ کا ثبوت کیا ہوگا؟

(۹۸۳) \* چونکہ زید یہاں ایک معیاری آزمائش کرنے کے لیے آئے تھے اس لیے انہوں نے آتے ہی ایسی ناشائستہ حرکات اور ایسے نازیبا کلمات منہ سے نکالنے شروع کر دیئے جن کو سن کر ایک مرتبہ تو ٹھنڈے سے ٹھنڈے انسان کی رگ حمیت بھی بھڑک اٹھے۔ اول تو آتے ہی مجرم کی طرح آپ کو لپٹ گئے پھر کسی گفتگو کے بغیر نہ صرف آپ کی ذات بلکہ آپ کے سارے خاندان پر ایسی بات کا بیہ لگانے لگے.....

فَاعْرِفْ حِلْمَهُ وَجَهْلَهُ فَذَكَرَ قِصَّةَ إِسْلَافِهِ  
لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَا فِي ثَمَرَةٍ  
قَالَ فَلَمَّا حَلَّ الْأَجَلَ أَتَيْتُ فَأَخَذْتُ  
بِمَجَامِعِ قِمِيصِهِ وَرِدَائِهِ وَهُوَ فِي جَنَازَةٍ  
مَعَ أَصْحَابِهِ وَنَظَرْتُ إِلَيْهِ بِوَجْهِ غَلِيظٍ وَ  
قُلْتُ يَا مُحَمَّدُ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) أَلَا  
تُقْضِيَنِي حَقِّي؟ فَوَاللَّهِ مَا عَلِمْتُكُمْ بَنِي  
عَبْدِ الْمُطَلِّبِ لِمَطَلِّ قَالَ فَنَظَرُ إِلَى عُمَرَ وَ  
عَيْنَاهُ يَدُورَانِ فِي وَجْهِهِ كَالْفَلَكَ  
الْمُسْتَدِيرِ. ثُمَّ قَالَ يَا عَدُوَّ اللَّهِ أَتَقُولُ  
لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا  
أَسْمَعُ وَتَفْعَلُ مَا أَرَى فَوَاللَّهِ الَّذِي بَعَثَهُ  
بِالْحَقِّ لَوْ لَا أَحَازِرُ لَوْمَةً لَصُرْتُ بِسَيْفِي  
رَأْسَكَ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ يَنْظُرُ إِلَى عُمَرَ فِي سُكُونٍ وَتَوَدَّةٍ وَ  
تَبَسُّمٍ. ثُمَّ قَالَ أَنَا وَهُوَ كُنَّا أَحْوَجَ إِلَى غَيْرِ  
هَذَا مِنْكَ يَا عُمَرُ أَنْ تَأْمُرَنِي بِحُسْنِ  
الْأَدَاءِ وَتَأْمُرَهُ بِحُسْنِ التَّبَاعَةِ إِذْ هَبْ بِهِ يَا  
عُمَرُ فَأَقْضِهِ حَقَّهُ وَزِدْ عَشْرَيْنِ

اس تدبیر میں لگا رہا کہ ذرا ان سے بے تکلفی پیدا کر لوں تو ان کی بردباری  
اور ترش مزاجی کا بھی کچھ اندازہ لگا لوں۔ اس کے بعد انہوں نے پھلوں کے  
معاملہ میں آپ کو کچھ مال قرض دینے کا قصہ ذکر کیا یہ بیان کرتے ہیں کہ  
جب قرض کی مدت پوری ہو گئی تو میں آپ کے پاس آیا اور میں نے آپ  
کے قمیص اور چادر کے کنارے پکڑ لیے اس وقت آپ اپنے کسی صحابی کے  
جنازہ میں جا رہے تھے اور میں نے خوب غصہ کا منہ بنا کر آپ کو دیکھا اور کہا  
اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا حق کیوں ادا نہیں کرتے خدا کی قسم جہاں  
تک میرا تجربہ ہے تم سب عبدالمطلب والوں کی عادت قرض کے معاملہ میں  
یونہی ٹال مٹول کرنے کی ہے۔ یہ بیان کرتے ہیں یہ سن کر عمرؓ نے غضب ناک  
صورت میں میری طرف دیکھا اور مارے غصہ کے اس وقت ان کی آنکھیں  
چرخ دوار کی طرح تیزی کے ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ اس کے بعد بولے او  
خدا کے دشمن تو آپ کی خدمت میں یہ بکواس کر رہا ہے اور میں سن رہا ہوں  
اور آپ کے ساتھ ایسی گستاخانہ حرکات بھی کر رہا ہے اور میں اپنی آنکھوں  
سے دیکھ رہا ہوں اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق دے کر بھیجا ہے  
اگر مجھے آپ کی ناراضی کا خوف نہ ہوتا تو میں اپنی تلوار بھی تیرے سر پر رسید  
کرتا۔ ادھر عمرؓ یہ فرما رہے تھے ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑے سکون و  
وقار کے ساتھ ان کو دیکھتے جاتے تھے اور مسکراتے جاتے تھے۔ اس کے بعد  
آپ نے فرمایا تم مجھ کو اور اس کو ان باتوں کی بجائے کچھ اور سمجھاتے تو زیادہ  
مناسب ہوتا۔ مجھ سے یہ کہتے کہ اس کا قرض تاخیر کے بغیر پورا پورا اداء کر دو

للہ ..... لگے جس کا کوئی وجود ہی نہ تھا، مگر جو ذات ہر کسوٹی پر کھری اور ہر امتحان میں پوری اتری تھی وہ یہاں بھی اپنا جو ہر دکھائے بغیر نہ  
رہی یعنی اس سب کے بعد بھی یوں معلوم ہو رہا تھا گویا آپ کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ کی امتیاز غیرت ہزار جوش مار رہی تھی  
مگر علم نبوت کے سامنے کیا تاب و طاقت تھی چہرہ پر بل پر بل آتے رہے مگر نہ ایک قدم اپنی جگہ سے آگے ہلا سکے اور نہ کچھ سخت دست کہہ کر  
ہی دل کی بھڑاس نکال سکے۔ فداکاروں کی حالت تو یہ تھی اور جن کی خاطر یہ سارا غصہ تھا ان کی شانِ حلم یہ تھی کہ چہرہ مسکرا رہا تھا اور اسی  
حالت میں جو موتی دہن مبارک سے بکھرے وہ آپ کے خزانہ نبوت کے سچے گواہ بن کر بکھرے۔ سبحان اللہ وہ جماعت کدھر ہے جو کہتی ہے  
کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کے سامنے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کچھ بھی رہی ہے اس کو آپ کی تصدیق میں کبھی  
ذرا پس و پیش نہیں ہوا۔ وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ نُورًا فَمَالَهُ مِنْ نُورٍ۔



صَاعًا مِنْ ثَمَرٍ فَأَسْلَمَ زَيْدُ بْنُ سَعْنَةَ وَ شَهِدَ  
بَقِيَّةَ الْمَشَاهِدِ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ تَوَفَّى عَامَ تَبُوكَ رَحِمَهُ اللَّهُ  
تَعَالَى

(رواہ ابن کثیر فی البدایۃ ص ۳۱۰ ج ۲ و

ابو نعیم فی الدلائل ابسط منه)

(۹۸۴) عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ  
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ  
قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ نَجْنِي الْكَبَاثَ وَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عَلَيْكُمْ بِالْأَسْوَدِ مِنْهُ  
فَإِنَّهُ أَطْيَبُ قَالُوا أَكُنْتَ تَرَعَى الْغَنَمَ قَالَ وَ  
هَلْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا وَقَدَّرَ عَاهَا.

(رواہ البخاری)

(۹۸۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا بَعَثَ اللَّهُ إِلَّا رَعَى الْغَنَمِ  
فَقَالَ أَصْحَابُهُ وَ أَنْتَ فَقَالَ نَعَمْ كُنْتُ أَرَعَاهَا  
عَلَى قَرَارِبَطٍ لِأَهْلِ مَكَّةَ. (رواہ البخاری)

اور اس سے یہ کہتے کہ خوبصورتی کے ساتھ تقاضہ کر۔ اے عمر جاؤ اور اس کا قرض  
اداء کر دو اور کھجور کے بیس صاع اس کو اور دے دینا۔ آپ کی بردباری کا یہ نقشہ  
دیکھ کر زید اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور بقیہ جنگوں میں پھر آنحضرت صلی  
اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہی رہے اور جس سال تبوک کی جنگ ہوئی تھی اس سال  
میں ان کی وفات ہو گئی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

(دلائل النبوة لابی نعیم)

(۹۸۴) ابوسلمہ بن عبد الرحمن سے روایت ہے کہ جابر بن عبد اللہ نے بیان  
کیا کہ ایک موقع پر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیلو کے درخت  
کے پھل توڑ رہے تھے آپ نے فرمایا دیکھو ان میں سے جو سیاہ سیاہ ہوں وہ  
توڑنا کیونکہ وہی بہتر ہوتے ہیں۔ اس ذیل میں صحابہؓ نے آپ سے پوچھا کیا  
آپ نے کبھی بکریاں چرائی ہیں (کیونکہ جنگل کے اس قسم کے پھلوں کا تجربہ  
بیشتر ایسے ہی لوگوں کو ہوتا تھا جن کو اس سلسلہ سے جنگل میں رہنے کا زیادہ  
اتفاق ہو) آپ نے فرمایا ایسا کون نبی گذرا ہے جس نے بکریاں نہ چرائی  
ہوں۔ (بخاری شریف)

(۹۸۵) ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ  
تعالیٰ نے جو نبی بھی مبعوث فرمایا ہے اس نے بکریاں ضرور چرائی ہیں صحابہؓ  
نے عرض کی کیا آپ نے بھی؟ آپ نے فرمایا جی ہاں میں بھی چند قیراط پر  
مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ (بخاری شریف)

(۹۸۵) \* بکریاں چرائی ایک بہت ہی معمولی چیز ہے، لیکن تاریخ نبوت میں چونکہ اس کو بھی ایک اہمیت حاصل تھی۔ اس لیے آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس کا ثبوت بھی ملنا ضروری تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بکریاں چرانا نبوت کے ایسے لوازم میں سے ہے  
کہ ہر چرواہا نبوت کا دعویٰ کر سکتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو نبی ہوا ہے اس کی زندگی میں یہ جزئی ضرور پیش آئے ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ  
السلام کا بکریاں چرانا خود قرآن کریم کے اشارات سے ثابت ہے۔ اب رہی یہ بحث کہ بکریاں چرانے کی اتنی اہمیت کیا ہے یہ ایک جداگانہ  
مسئلہ ہے۔ اس پر علماء نے علیحدہ بحث کی ہے۔ اتنا سب جانتے ہیں کہ طبیعت کو غم کا خوگر بنانے کے لیے مشکل سے شاید کوئی دوسری ٹریننگ  
اس سے زیادہ مؤثر ہو جاتی کہ فارسی زبان میں یہ ایک مثل ہی بن گئی ہے کہ ”غم نہ داری بز بخر“ پھر انجیل میں ابھی تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام  
کی بازن مبارک سے بنی اسرائیل کو جگہ جگہ بھیڑوں کے لفظ سے خطاب کیا گیا ہے گویا ایک گمراہ امت کا نقشہ سمجھنے کے لیے جو کسی ایسے  
میدان میں نکل گئی ہو جہاں کھانے پینے کا کوئی سامان نہ ہو اور پھر چاروں طرف سے ڈاکوؤں اور قزاقوں میں گھر گئی ہے بکریوں للہ.....

(۹۸۶) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ أَبُو ذَرٍّ خَرَجْنَا مِنْ قَوْمِنَا غَفَارٍ وَكَانُوا يُحِلُّونَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ فَخَرَجْتُ أَنَا وَآخِي أَنِيسٌ. فَنَزَلْنَا عَلَى خَالٍ لَنَا فَآكَرَمَنَا وَ أَحْسَنَ إِلَيْنَا فَقَالَ أَنِيسٌ إِنَّ لِي حَاجَةً بِمَكَّةَ فَأَنْطَلِقُ أَنِيسٌ حَتَّى آتِيَ مَكَّةَ فَقُلْتُ مَا صَنَعْتَ قَالَ لَقِيتُ رَجُلًا بِمَكَّةَ يَزْعُمُ أَنَّ اللَّهَ أَرْسَلَهُ قُلْتُ فَمَا يَقُولُ النَّاسُ قَالَ يَقُولُونَ شَاعِرٌ كَاهِنٌ سَاحِرٌ وَ كَانَ أَنِيسٌ أَحَدَ الشُّعْرَاءِ قَالَ أَنِيسٌ لَقَدْ سَمِعْتُ قَوْلَ الْكُهَنَةِ فَمَا هُوَ بِقَوْلِهِمْ وَ لَقَدْ وَضَعْتُ قَوْلَهُ عَلَى أَقْرَاءِ الشُّعْرَاءِ فَمَا يَلْتَمِسُ وَ عَلَى لِسَانِ أَحَدٍ يَقْرَأُ بَعْدِي أَنَّهُ شِعْرٌ وَ اللَّهُ أَنَّهُ لَصَادِقٌ وَ أَنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ وَ ذَكَرَ الْقِصَّةَ وَ صِفَةَ

اسلامہ. (رواہ الشیخان)

(۹۸۷) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ الْمَلَأُ أَبُو جَهْلٍ لَقَدْ غَلَبَنَا أَمْرُ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فَلَوْ التَّمَسْتُمْ رَجُلًا عَالِمًا بِالشُّعْرِ وَالْكُهَانَةِ وَ

(۹۸۶) عبد اللہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا میں اور میرے بھائی انیس اپنی قوم غفار کے ساتھ ایک مرتبہ سفر کے لیے نکلے اور اپنے ماموں کے یہاں جا کر مہمان ہوئے، انہوں نے ہمارا بڑا اعزاز و اکرام کیا۔ انیس نے کہا مجھے مکہ میں کچھ کام ہے یہ کہہ کر انیس چل پڑے یہاں تک کہ مکہ پہنچ گئے (واپسی پر) میں نے کہا آپ نے وہاں کیا کام کیا؟ انہوں نے کہا وہاں میں نے ایک شخص سے ملاقات کی جس کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے میں نے کہا اچھا تو ان کے متعلق لوگوں کا خیال کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ کہتے ہیں کہ شاعر ہے، کاہن ہے، جادوگر ہے، یہ انیس خود بھی شاعر تھے۔ انیس کہنے لگے۔ میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے یہ ان کا سا کلام نہیں ہے اور میں نے اس کو شعراء کے اوزان پر بھی رکھ کر دیکھا تو کسی ایک وزن کے رنگ سے میل نہیں کھاتا۔ خدا کی قسم وہ یقیناً سچے ہیں جو لوگ یہ باتیں بناتے ہیں وہ سب جھوٹ کہتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے مشرف باسلام ہو جانے کا سب قصہ بیان کیا۔

(شیخین)

(۹۸۷) جابر بیان کرتے ہیں کہ ابو جہل اور اس کے سب اہل محفل نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ نے تو ہم کو اب عاجز کر دیا ہے۔ کوئی آدمی ایسا تلاش کرو جو شعر و سخن، کہانت اور جادو کا ماہر ہو وہ اس کے پاس جائے اور پھر ہم سے آ کر حقیقت حال بیان کرے۔ اس پر عتبہ نے کہا خدا

اللہ .... کے اس گلہ سے زیادہ کوئی اور دوسرا صحیح نقشہ نہیں ہو سکتا جو ایک بے آب و گیاہ میدان میں بھیڑیوں کے بیچ میں جا پھنسا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک طرف ان کی نا سمجھی، دوسری طرف بھیڑیوں سے ان کی حفاظت کی ذمہ داری اس پر ان کے بقاء حیات کے لیے ایسے محل میں خورد و نوش کا انتظام کرنا یہ کتنی درد سہی، کتنی درد مندی اور کتنے نظم و ہوشیاری کا محتاج ہو گا اس لیے انبیاء علیہم السلام کو انسانوں کے حوالے کرنے سے قبل تھوڑی سی ٹریننگ حیوانات سے شروع کی جاتی ہے تاکہ وہ ان ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے پہلے سے خوگر ہو جائیں۔ وہ اپنی امت کو محرمات کی چراگاہوں سے بچا بچا کر حلال کے میدانوں میں لے جائیں اور جوان سے بھاگ کر محرمات میں منہ ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہو اس کو پکڑ پکڑ کر کھینچ لیں۔ اس جگہ حدیث نمبر ۶۶ اور اس کا نوٹ جلد اول ”ترجمان السنۃ“ میں ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا حال سمجھنے کے لیے چراغ میں جلنے والے پروانوں اور ان کے بچانے والوں کا نقشہ بیان فرمایا گیا ہے اور قابل ملاحظہ ہے۔



السَّحَرِ فَاتَّاهُ فَكَلَّمَهُ فَاتَّانَا بَيَّانٍ مِنْ أَمْرِهِ  
 قَالَ عُتْبَةُ بْنُ رَبِيعَةَ وَاللَّهِ لَقَدْ سَمِعْتُ الشَّعْرَ  
 وَالْكَهَانَ وَالسَّحَرَ وَعِلِمْتُ مِنْ ذَلِكَ  
 عِلْمًا فَمَا يَخْفَى عَلَيَّ إِنْ كَانَ ذَلِكَ فَاتَّاهُ  
 فَخَرَجَ إِلَيْهِ فَلَمَّا فَرَغَ قَرَأَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
 اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ  
 الرَّحِيمِ. حَمْدَ تَنْزِيلٍ مِنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 كِتَابَ فُصِّلَتْ آيَتُهُ إِلَى قَوْلِهِ فَقَالَ ﴿أَنْذَرُ  
 تُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ﴾  
 (فصلت: ۱-۱۳) فَأَمْسَكَ عُتْبَةُ عَلَى فِيهِ وَ  
 نَاشَدَهُ بِالرَّحِمِ أَنْ يَكْفَى وَرَجَعَ إِلَى أَهْلِهِ  
 فَلَمْ يَخْرُجْ إِلَى قُرَيْشٍ فَأَخْتَبَسَ عَنْهُمْ عُتْبَةُ  
 فَقَالَ أَبُو جَهْلٍ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ وَاللَّهِ مَا نَرَى  
 عُتْبَةَ إِلَّا قَدْ صَبَى إِلَى مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللَّهُ  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فَاتَّاهُ أَبُو جَهْلٍ فَقَالَ يَا عُتْبَةُ مَا  
 حَبَسَكَ عَنَّا إِلَّا أَنَّكَ صَبَوْتَ إِلَى مُحَمَّدٍ  
 فَغَضِبَ وَأَقْسَمَ أَنْ لَا يُكَلِّمَ مُحَمَّدًا أَبَدًا وَ  
 قَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنِّي مِنْ أَكْثَرِ قُرَيْشٍ مَا لَا وَ  
 لِكُنِّي وَقَصَصْتُ عَلَيْهِ الْقِصَّةَ فَاجَابَنِي  
 بِشَيْءٍ وَاللَّهِ مَا هُوَ بِشَعْرٍ وَلَا كَهَانَةٍ وَلَا  
 سِحْرِ. (رواه ابن مردويه في كتاب التفسير و  
 يحيى بن معين و ابو يعلى في مسنده و رواه  
 سيد بن حميد عن شيخ ابي يعلى كما في  
 الجواب الصحيح ص ۴۵ ج ۴. و راجع  
 قصة ضماد من ترجمان السنة ص ۱۶۴ ج ۲)

کی قسم میں نے شعر، کہانت اور سحر سب سنے ہیں اور مجھے ان کا اچھا علم حاصل ہے اگر ان میں سے کوئی بات بھی ہوگی تو وہ مجھ سے چھپ نہ سکے گی۔ عتبہ یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا (اور آپ سے طرح طرح کی لالچ کی باتیں کرنے لگا۔ آپ سب خاموش سنتے رہے) جب وہ سب کہہ چکا تو اس کے جواب میں آپ نے سورہ حم سجدہ کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں یہاں تک کہ جب پڑھتے پڑھتے آپ ان آیتوں پر پہنچے ﴿فَقَدْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَ ثَمُودَ﴾ (فصلت: ۱-۱۳) (جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اگر باز نہ آؤ گے تو پھر عاد و ثمود کی طرح برباد ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ) تو (عتبہ کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ عذاب اب آیا چاہتا ہے) اس نے آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنی قرابت اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہا آپ اور آگے نہ پڑھیں وہ اپنے گھر آ کر بیٹھ رہا اور قریش کے پاس ہی نہ گیا اور مدت تک ان سے ملاقات نہیں کی۔ اس پر ابو جہل نے کہا خدا کی قسم ہمارا خیال ہے ضرور عتبہ بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ابو جہل اس کے پاس گیا اور کہا۔ عتبہ! کہو ہم سے کیوں نہیں ملتے، یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ تم بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب ڈھل گئے ہو۔ اگر کچھ ضرورت ہو تو ہم تم کو مال جمع کر کے دے دیں تاکہ تم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کھانے سے بے نیازی ہو جائے۔ یہ سن کر وہ غصہ میں بھر گیا اور قسم کھائی کہ محمد سے آئندہ کبھی بات چیت بھی نہ کرے گا۔ اور کہا تم جانتے ہو کہ میں قریش میں سب سے زیادہ مال دار آدمی ہوں لیکن بات یہ ہوئی کہ جب میں ان کے پاس گیا۔ اس کے بعد پورا واقعہ بیان کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھ کو ایسا کلام سنایا جو نہ شعر تھا نہ کہانت اور نہ جادو اور سورہ حم سجدہ کی آیتیں مجھے سنائیں جب اس میں پہلی قوموں کے عذاب کا ذکر آیا تو میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ان کو اپنی قرابت کا واسطہ دیا کہ بس آگے نہ پڑھیں۔ تم سب جانتے ہو کہ محمد جب کوئی بات منہ سے نکالتے ہیں تو اس میں ذرا جھوٹ نہیں ہوتا۔ مجھے یہ ڈر ہو گیا تھا کہیں تم پر بھی عذاب نہ آئے۔ (تفسیر ابن مردویہ، کذا فی الجواب الصحیح)

(۹۸۸) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَامَ النَّضْرُ بْنُ الْحَارِثِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ وَاللَّهِ لَقَدْ نَزَلَ بِكُمْ أَمْرٌ مَا ابْتُلِيتُمْ بِمِثْلِهِ لَقَدْ كَانَ مُحَمَّدٌ فِيكُمْ غُلَامًا حَدَّثَنَا أَرْضَاكُمْ فِيكُمْ وَأَصْدَقَكُمْ حَدِيثًا وَأَعْظَمَكُمْ أَمَانَةً حَتَّى إِذَا رَأَيْتُمْ فِي صُدْغِهِ الشَّيْبَ وَجَاءَكُمْ بِمَا جَاءَكُمْ بِهِ قُلْتُمْ سَاحِرٌ لَا وَاللَّهِ مَا هُوَ بِسَاحِرٍ قَدْ رَأَيْنَا السَّحْرَةَ وَنَفَثَهُمْ وَعُقْدَهُمْ وَقُلْتُمْ كَاهِنٌ لَا وَاللَّهِ مَا هُوَ بِكَاهِنٍ قَدْ رَأَيْنَا الْكَهَنَةَ وَ سَمِعْنَا سَجْعَهُمْ وَقُلْتُمْ شَاعِرٌ لَا وَاللَّهِ مَا هُوَ بِشَاعِرٍ لَقَدْ رَوَيْنَا الشُّعْرَ وَ سَمِعْنَا أَصْنَافَهُ كُلَّهَا مَخْرَجَهُ وَ رَجْزَهُ وَ قَرِيبُضَهُ وَقُلْتُمْ مَجْنُونٌ وَلَا وَاللَّهِ مَا هُوَ بِمَجْنُونٍ لَقَدْ رَأَيْنَا الْمَجْنُونِ فَمَا هُوَ بِخَنْقِهِ وَلَا تَخْلِيطِهِ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ انْظُرُوا فِي شَانِكُمْ فَإِنَّهُ وَاللَّهِ لَقَدْ نَزَلَ بِكُمْ أَمْرٌ عَظِيمٌ وَ كَانَ النَّضْرُ بْنُ الْحَارِثِ مِنْ شَيَاطِينِ قُرَيْشٍ وَ مِمَّنْ يُؤْذِي رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ يَنْصِبُ لَهُ الْعَدَاوَةَ.

(رواہ ابن اسحاق کما فی الجواب الصحیح)

(۹۸۹) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ الْوَلِيدَ بْنَ الْمُغِيرَةَ اجْتَمَعَ وَ نَفَرَ مِنْ قُرَيْشٍ وَ كَانَ ذَاسِنٌ فِيهِمْ وَ قَدْ حَضَرَ الْمَوْسِمُ فَقَالَ إِنَّ

(۹۸۸) ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ نضر بن الحارث کھڑا ہو کر بولا! اے جماعت قریش خدا کی قسم تم اس وقت ایک ایسی آزمائش میں پھنس گئے ہو کہ اس سے پہلے کبھی نہ پھنسے تھے۔ تم جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم ہی میں کے ایک نوجوان شخص ہیں جو تم میں سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ راست گو اور سب سے بڑھ کر امانت دار شخص تھے یہاں تک کہ جب ان کی عمر پختہ ہو گئی اور ان کی کنپیٹوں میں تم نے بڑھاپے کی سفیدی دیکھ لی اور تمہارے پاس دین لے کر وہ آئے تو اب تم نے ان کو جادو گر کہہ دیا۔ خدا کی قسم وہ جادو گر نہیں ہو سکتے، ہم نے جادو گروں کو دیکھا ہے نہ تو ان کی طرح سے وہ منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتے ہیں اور نہ ان کی طرح گندے بناتے ہیں اور کبھی تم نے ان کو کاہن ٹھہرایا خدا کی قسم وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے کاہن بھی بہت دیکھے ہیں اور ان کی تک بندیاں بھی سنی ہیں اور کبھی تم نے ان کو شاعر کہا خدا کی قسم وہ شاعر بھی نہیں ہمارے سامنے شعر کی روایات بھی ہیں اور ہم نے ان کی سب اقسام سنی ہیں (ان کا کلام نہ تو کاہنوں کے سجع بندیوں سے ملتا ہے نہ شاعروں کے شعروں سے) تم میں کسی نے ان کو مجنون بھی قرار دیا۔ خدا کی قسم وہ مجنون بھی نہیں ہم نے دیوانے بہت دیکھے ہیں، دیوانوں کی ایک علامت بھی ان میں نہیں۔ نہ ان کی سی بے ہوشی ان پر طاری ہوتی ہے نہ یہ ان کی سی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ اے قریش کی جماعت اپنے معاملہ میں ذرا پورے غور سے کام لو، بخدا تم بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہو۔ راوی بیان کرتا ہے یہ نضر بن حارث قریش بھر میں پر لے درجہ کا شیطان شخص تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی تکالیف دیتا اور آپ کی دشمنی کے سامان تیار کرتا تھا۔ (محمد ابن اسحاق)

(۹۸۹) ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ولید بن المغیرہ اور قریش کے چند افراد ایک جگہ جمع ہوئے حج کا موسم سر پر آچکا تھا چونکہ یہ ولید بن مغیرہ عمر میں ان سب سے بڑا تھا اس لیے بولا بھئی اب عرب کے لوگ تمہارے پاس ان



ایام میں آئیں گے اور یقیناً ان کو تمہارے اس ہم وطن شخص کی خبریں پہنچ گئی ہوں گی تو آؤ سب مل کر ایک بات طے کر لو ایسا نہ ہو کہ ان کے جواب میں کہیں باہم اختلاف پھیلاؤ اور خود ایک دوسرے ہی کی تکذیب کرنے لگو انہوں نے کہا اے ابو عبد شمس (ولید کی کنیت تھی) پھر آپ ہی ایک آخری رائے بتادیں ہم سب اسی پر متفق ہو جائیں گے اس نے کہا نہیں پہلے تم ہی بولو اور میں سنوں گا وہ بولے ہم یہ کہیں گے کہ یہ شخص کاہن ہے وہ بولا کاہن تو نہیں ہے میں نے کاہنوں کو دیکھا ہے ان کا کلام کاہنوں کے منتروں کی طرح نہیں ہے جو یہ لوگ گنگنا گنگنا کر پڑھا کرتے ہیں۔ وہ بولے اچھا تو ہم کہیں گے وہ دیوانہ ہے اس نے کہا دیوانہ بھی نہیں۔ ہم نے دیوانوں کو بھی دیکھا ہے اور ہم ان کو خوب جانتے پہچانتے ہیں نہ تو دیوانوں کی طرح ان کا دم بند ہوتا ہے نہ یہ ان کی سی بہکی بہکی بے ربط باتیں کرتے ہیں نہ دیوانوں کی طرح ان کے مزاج میں دسو اس ہے وہ بولے اچھا تو ہم کہیں گے یہ شاعر ہے۔ اس نے کہا یہ شاعر بھی نہیں۔ ہم نے شعر کے جتنے اقسام ہیں سب دیکھے ہیں ان کا کلام شعر کے وزنوں میں سے کسی وزن کے ساتھ نہیں ملتا۔ وہ بولے اچھا تو ہم کہیں گے یہ جادوگر ہیں۔ اس نے کہا میں نے بہت سے جادوگر بھی دیکھے ہیں اور ان کے جادو بھی دیکھے ہیں نہ تو ان کی طرح یہ منتر

وَفُودَ الْعَرَبِ سَتَقْدُمُ عَلَیْكُمْ فِیْهِ وَقَدْ  
سَمِعُوا بِأَمْرِ صَاحِبِکُمْ هَذَا فَاجْمَعُوا فِیْهِ رَأِیَا  
وَاحِدًا وَلَا تَخْتَلِفُوا فِیْکَذِبُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا  
وَيَرُدُّ بَعْضُکُمْ قَوْلَ بَعْضٍ فَقَالُوا فَأَنْتَ يَا أَبَا  
عَبْدِ شَمْسٍ فَقُلْ وَاقِمْ لَنَا رَأِیَا نَقُومُ بِهِ فَقَالَ  
بَلْ أَنْتُمْ فَقُولُوا وَآنَا أَسْمَعُ فَقَالُوا نَقُولُ  
كَاهِنٌ فَقَالَ مَا هُوَ بِكَاهِنٍ لَقَدْ رَأَيْتُ الْكُهَّانَ  
فَمَا هُوَ بِزُمَرَةِ الْكُهَّانِ فَقَالُوا نَقُولُ مَجْنُونٌ  
فَقَالَ مَا هُوَ بِمَجْنُونٍ رَأَيْنَا الْمَجْنُونِ وَلَا  
عَرَفْنَاهُ فَمَا هُوَ بِخَنَقِهِ وَلَا تَخَالِجْهُ وَلَا  
وَسُوسَتِهِ قَالُوا فَنَقُولُ شَاعِرٌ فَقَالَ مَا هُوَ  
بِشَاعِرٍ قَدْ عَرَفْنَا الشَّعْرَ بِرَجْزِهِ وَهَجْزِهِ وَ  
قَرِیْضِهِ وَمَضْبُوضِهِ وَمَبْسُوطِهِ فَمَا هُوَ  
بِالشَّعْرِ قَالُوا فَنَقُولُ سَاحِرٌ قَالَ فَمَا هُوَ  
بِسَاحِرٍ قَدْ رَأَيْنَا السَّحَّارَ وَسَحَرَهُمْ فَمَا هُوَ  
بِنَفْسِهِ وَغُقْدِهِ فَقَالُوا مَا نَقُولُ يَا أَبَا عَبْدِ

اللہ..... ہیں جن سے آپ یہ اندازہ فرمائیں گے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت میں کوئی دشواری پیش آئی تھی یا کچھ مشکلات تھیں تو آپ کے انکار کرنے میں تھیں۔ اگر واقعات سے یہی ایک بات ثابت ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی صداقت اس درجہ بدیہی ہوتی ہے کہ ان کے انکار کرنے کے لیے کوئی حیلہ بہانہ بنانا بھی آسان نہیں ہوتا تو پھر آپ بھی یہاں عقلی بحث اور خیالی پرواز کو چھوڑ کر تاریخ نبوت کے مطالعہ پر وقت کیوں صرف نہیں فرماتے دیکھئے یہاں مکہ کے مشرک کس صفائی سے کہہ رہے ہیں کہ کاہن اور ساحر کی نوع دنیا میں ہمیشہ ہوتی چلی آئی ہے ہم ان کو خوب جانتے پہچانتے ہیں۔ یہ شخص ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر ہم ان میں سے کوئی بات بھی کہیں گے تو وہ اپنے کذب پر خود شاہد ہوگی کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نبوت کا معاملہ کس درجہ واضح اور صاف ہوتا ہے یہاں اگر آپ ان سے سحر کی حقیقت اور کہانت کی ماہیت پر بحث شروع کر دیں تو ان غریبوں کو شاید اس کی ابتدائی معلومات بتانا بھی مشکل ہو جائیں لیکن ساحر اور کاہنوں کو وہ آپ سے زیادہ جانتے پہچانتے تھے۔ کیونکہ یہ انواع ان کے درمیان ہمیشہ سے ہوتی رہی ہیں اور ان کے ساتھ ان کا قدیم سے تعارف رہا ہے اس لیے نبی اور ساحر کے درمیان ان کو کوئی التباس نہیں ہوا اور ان چند جملوں ہی میں جس سادگی کے ساتھ انہوں نے مجنون، ساحر اور کاہنوں کی خصوصیات اداء کر دی ہیں محض عقلی اعتبار سے ان پر بحث کرنے والے شاید طویل دفتروں میں بھی ان کو اداء نہ کر سکیں۔

شَّمْسٍ قَالَ وَاللَّهِ إِنَّ لِقَوْلِهِ حَلَاوَةً وَإِنَّ أَصْلَهُ  
لَعَدَقٌ وَإِنَّ فَرْعَهُ لَجَنِيٌّ فَمَا أَنْتُمْ بِقَائِلِينَ مِنْ هَذَا  
شَيْئًا إِلَّا عَرِفَ أَنَّهُ بَاطِلٌ وَفِي لَفْظٍ إِنَّ أَعْلَاهُ  
لَمُثْمِرٌ وَإِنَّ أَسْفَلَهُ لَمُعَدَقٌ وَمَا يَقُولُ هَذَا الْبَشَرُ  
وَفِي لَفْظٍ إِنَّهُ لَيَعْلُو وَمَا يُعْلَى وَ أَنَّهُ لَيَحْطُمُ مَا  
تَحْتَهُ. (رواه عبد الرزاق و روى ابن اسحاق قصة  
النضربن الحارث نحوه كما سيحى)

(۹۹۰) عَنْ رُكَّانَةَ بِنِ عَبْدِ يَزِيدٍ وَ كَانَ مِنْ  
أَشَدِّ النَّاسِ قَالَ كُنْتُ أَنَا وَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غَنِيمَةٍ لِأَبِي طَالِبٍ نَرْعَاهَا  
فِي أَوَّلِ مَا رَأَيْ، إِذْ قَالَ لِي ذَاتَ يَوْمٍ هَلْ  
لَكَ أَنْ تُصَارَ عَنِّي قُلْتُ لَهُ أَنْتَ قَالَ أَنَا  
فَقُلْتُ عَلَى مَاذَا قَالَ عَلَى شَاةٍ مِنَ الْغَنَمِ  
فَصَارَعْتُهُ فَصَرَ عَنِّي فَآخَذَ مِنِّي شَاةً ثُمَّ قَالَ  
لِي هَلْ لَكَ فِي الثَّانِيَةِ قُلْتُ نَعَمْ فَصَارَعْتُهُ  
فَصَرَ عَنِّي فَآخَذَ مِنِّي شَاةً فَجَعَلْتُ التَّفْتُ هَلْ

پڑھتے ہیں نہ گنڈے بناتے ہیں۔ وہ بولے اے ابو عبد شمس تو اب آپ ہی  
فرمائیے ہم کہیں تو کیا کہیں اس نے کہا خدا کی قسم ان کے کلام میں غضب کی  
شیرینی ہے اس کا باطن دیکھو تو چشمہ کی طرح ابل رہا ہے اور ظاہر دیکھو تو  
پھل دار درخت کی طرح بار آور ہے۔ ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کہو  
گے وہ فوراً معلوم ہو جائے گی کہ بالکل غلط ہے یہ کلام بشر کا ہے ہی نہیں وہ  
سب پر غالب آ جاتا ہے اور کسی سے مغلوب نہیں ہوتا، یوں معلوم ہوتا ہے کہ  
تہ تک اس کے سب تختے پھٹے ہوئے ہیں کہ اس کی تہ کا پتہ ہی نہیں لگتا۔

(۹۹۰) رکانہ سے روایت ہے اور یہ لوگوں میں سب سے قوی مشہور تھے  
کہ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کی چند بکریوں کو چرا رہے  
تھے۔ یہ بات آپ کی نبوت کے شروع شروع کی ہے ایک دن آپ نے  
فرمایا کیا مجھ سے کشتی لڑتے ہو؟ میں نے کہا اچھا کیا آپ سے؟ آپ نے  
فرمایا جی ہاں مجھ سے۔ میں بولا اچھا کیا دو گے آپ نے فرمایا جو جیتے اس  
کی ایک بکری۔ میں نے آپ سے کشتی کی آپ نے مجھے زیر کر دیا اور مجھ  
سے ایک بکری لے لی۔ پھر مجھ سے فرمایا کیا دوبارہ پھر کشتی لڑو گے؟ میں  
بولا بہت اچھا۔ میں نے پھر آپ سے کشتی کی۔ آپ نے پھر مجھ کو زیر کر دیا  
اور ایک بکری مجھ سے اور لے لی۔ اس مرتبہ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا کہیں

(۹۹۰) \* ہر صاحب نہر اپنے نہر پر نازاں ہوتا ہے اور پھر جتنا اس نہر میں اس کی فوقیت مسلم ہوتی ہے اتنا ہی اس پر اس کا ناز بڑھتا چلا  
جاتا ہے۔ حتیٰ کہ آخر کار مثل مشہور کے مطابق ہچمو ماد گیرے نیست اس کے دماغ میں اپنی یکتائی کا غرور پیدا ہو جاتا ہے اب سوچئے کہ جس  
ماحول میں تعلیم و تعلم کا حرف نہ ہو کسی کو متاثر کرنے کے لیے کیا اس سے زیادہ بھی کوئی اور بات موثر ہو سکتی تھی۔ اسی لیے اس کے قلب پر اس  
کاسکہ اس طرح جم چکا تھا کہ آپ کے دعویٰ نبوت کی شہرت کے بعد اس کے دل کا مرہم بن گئی۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اس تمام معاملہ  
سے آپ کا اصل مقصد کیا تھا اور جب آپ نے سب سے پہلے اس کی بکریاں اس کے حوالہ کر دیں تو یہ بات پورے طور پر صاف ہو گئی کہ اس  
مارجیت کا راز کچھ اور ہی تھا نہ آپ کو اپنی طاقت کا اظہار مقصود تھا اور نہ چند بکریوں کے حاصل کرنے کی طرف کوئی توجہ تھی۔ اس واقعہ سے  
عرب کی بلند فطرت کا بھی اندازہ لگانا چاہیے کہ رکانہ کو سب سے بڑا غم یہ تھا کہ مالک کو اس کی بکریوں میں اپنی اس خیانت کا جواب کیا دوں گا  
یہ قصہ حضرت عباسؓ سے باسناد جید بھی مروی ہے۔ اس میں اس طرح سے ہے کہ جب تین بار وہ زیر ہو گیا تو اس نے فوراً آپ کی نبوت کا  
یقین کر لیا تھا۔ علماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مصارعت کے چند واقعات اور بھی نقل کیے ہیں۔ ابورکانہ ابواسد جمی جیسا کہ پہلی اور  
بیہقی اور ابوداؤد نے مراسل میں ذکر کیا ہے۔ (حاشیہ شفاء ص ۶۹)



مجھ کو کچھڑتے ہوئے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کیا دیکھ رہے ہو۔ میں نے کہا یہ دیکھ رہا ہوں میں کہ مجھ کو کہیں کوئی اور بکری چرانے والا دیکھ نہ رہا ہو اور میرے مقابلہ کی اس کو بھی ہمت ہو جائے کیونکہ میں سب سے زوردار آدمی مشہور ہوں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اچھا تیسری بار پھر لڑتے ہو اور جیتو گے تو ایک بکری ملے گی۔ میں بولا بہت اچھا۔ میں نے پھر کشتی کی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر مجھ کو زیر کر دیا اب تو میں غمگین ہو کر بیٹھ گیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا غمگین کیوں ہو۔ میں نے کہا: سب سے پہلے تو اس بات پر کہ جب میں عبد یزید کی بکریاں لے کر واپس ہوں گا تو ان میں تین بکریاں جو میں آپ کو دے چکا ہوں (وہ کم ہوں گی) دوسری بات یہ ہے کہ مجھ کو یہ بڑا گھنڈ تھا کہ قریش میں سب سے زیادہ مضبوط آدمی میں ہوں (مگر آج اس کے خلاف نکلا) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اچھا چوتھی بار پھر کشتی کرتے ہو؟ میں نے کہا کیا اب تین بار پٹ جانے کے بعد بھی۔ آپ نے فرمایا اچھا لو بکریوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ میں تم کو سب واپس کیے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ سب واپس کر دیں پھر اس کے متصل ہی آپ کی نبوت کا شہرہ ہو گیا اس وقت میں آپ کی خدمت میں آیا اور مشرف باسلام ہو گیا۔ اور میرے اسلام کا باعث یہی بات تھی کہ میں یقین کر چکا تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ کو اپنی طاقت سے زیر نہیں کیا بلکہ ضرور کسی اور دوسری (الہی) طاقت سے زیر کیا ہے۔

(بیہقی وغیرہ)

(۹۹۱) عمرو بن سلمہ کہتے ہیں۔ ہم ایک ایسے پانی پر ٹھہرے ہوئے تھے جو لوگوں کی گزرگاہ پر واقع تھا۔ ان کے قافلے ہماری طرف سے گذرتے تو ہم ان سے دریافت حال کے لیے پوچھا کرتے کہو لوگوں کا اب کیا رنگ ہے

يَرَانِي إِنْسَانٌ فَقَالَ مَا لَكَ قُلْتُ لَا يَرَانِي بَعْضُ الرَّعَاةِ فَيَجْتَرُّونَنِي عَلَى وَ أَنَا مِنْ أَشَدِّهِمْ قَالَ هَلْ لَكَ فِي الصَّرَاحِ الثَّلَاثَةِ وَ لَكَ شَاةٌ قُلْتُ نَعَمْ فَصَارَ عَتُهُ فَصَرَ عَنِي وَ أَخَذَ مِنِّي شَاةً فَقَعَدْتُ كَتِيبًا حَزِينًا فَقَالَ مَا لَكَ قُلْتُ إِنِّي أَرْجِعُ إِلَى عَبْدٍ يَزِيدُ وَ قَدْ أُعْطِيتُ ثَلَاثًا مِنْ غَنَمِهِ وَ الثَّانِيَةُ إِنِّي كُنْتُ أَظُنُّ أَنِّي أَشَدُّ قُرَيْشٍ فَقَالَ هَلْ لَكَ فِي الرَّابِعَةِ فَقُلْتُ بَعْدَ ثَلَاثٍ فَقَالَ أَمَا لَكَ فِي الْغَنَمِ فَإِنِّي أَرُدُّهَا عَلَيْكَ فَردَّ عَلَيَّ فَلَمْ يَلْبَثْ أَنْ ظَهَرَ أَمْرُهُ فَاتَيْتُهُ فَاسْلَمْتُ فَكَانَ مِمَّا هَدَانِي اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ إِنِّي عَلِمْتُ أَنَّهُ لَمْ يُصِرْ عَنِّي يَوْمَئِذٍ يَقْوَتِهِ وَ لَمْ يُصِرْ عَنِّي يَوْمَئِذٍ إِلَّا بِقُوَّةٍ غَيْرِهِ . رواه البيهقي و قد اخرجہ من طریق ابن اسحاق عن ابيه و ابی امامة ايضا و اخرجہ ابو نعیم ايضا کذا فی الخصائص ص ۱۲۹ ج ۱ قال ابن کثیر اخرجہ ابو داؤد و الترمذی ثم اخرجہ من رواية ابی بکر الشافعی عن ابن عباس بنحوه و قال اسنادہ جيد .

(البدایة و النہایة ص ۱۰۴ ج ۳)

(۹۹۱) عَنْ عَمْرِو بْنِ سَلَمَةَ قَالَ كُنَّا بِمَاءٍ مَمَرِ النَّاسِ يَمُرُّبْنَا الرُّكْبَانُ نَسْأَلُهُمْ مَا لِلنَّاسِ مَا هَذَا الرَّجُلُ فَيَقُولُونَ إِنَّ اللَّهَ أَرْسَلَهُ

(۹۹۱) \* غیر تعلیم یافتہ اشخاص اکثر بھیڑ چال ہوا کرتے ہیں۔ ان کا معیار تصدیق ہی کیا۔ اس لیے عرب کے عام لوگوں نے اپنے نزدیک آپ کی نبوت کے لیے یہی ایک معیار بنا رکھا تھا کہ اگر آپ اپنی قوم پر غالب آگئے تو بس یہی آپ کی صداقت کی سبب لے.....

أَوْحَى إِلَيْهِ أَوْحَى إِلَيْهِ كَذَا فَكُنْتُ أَحْفَظُ ذَلِكَ الْكَلَامَ فَكَانَ مَا يَعْزِي فِي صَدْرِي وَكَانَتِ الْعَرَبُ تَلُومُ بِإِسْلَامِهِمُ الْفَتْحَ فَيَقُولُونَ أَتُرْكُوهُ وَقَوْمَهُ فَإِنَّهُ إِنْ ظَهَرَ عَلَيْهِمْ فَهُوَ نَبِيٌّ صَادِقٌ فَلَمَّا كَانَتْ وَقْعَةُ الْفَتْحِ بَادَ رَكْلُ قَوْمٍ بِإِسْلَامِهِمْ وَبَدَرَ أَبِي قَوْمِي بِإِسْلَامِهِمْ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ جِئْتُكُمْ وَاللَّهِ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ حَقًّا فَقَالَ صَلُّوا صَلَاةَ كَذَابِي حِينَ كَذَابٍ وَصَلَاةَ كَذَابِي حِينَ كَذَابٍ إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤْذَنُ أَحَدُكُمْ فَلْيُؤْمِمْكُمْ أَكْثَرُكُمْ قُرْآنًا فَتَنْظُرُوا فَلَمْ يَكُنْ أَحَدًا أَكْثَرَ قُرْآنًا مِنِّي لَمَّا كُنْتُ أَتَلَّقِي مِنَ الرُّكْبَانِ فَقَدْ مُوْنِي بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَأَنَا ابْنُ سِتٍّ أَوْ سَبْعِ سِنِينَ وَكَانَتْ عَلَيَّ بُرْدَةٌ كُنْتُ إِذَا سَجَدْتُ تَقَلَّصْتُ عَنِّي فَقَالَتْ أَمْرَأَةٌ مِنَ الْحَيِّ إِلَّا تَغُطُّونَ عَنَّا إِسْتَقَارِئُكُمْ فَاشْتَرَوْا إِلَيَّ قَمِيصًا فَمَا فَرِحْتُ بِشَيْءٍ فَرِحْتُ بِذَلِكَ الْقَمِيصِ.

(رواه البخاری)

اور اس شخص کی کیا خبر ہے۔ لوگ کہتے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے وہ ان پر وحی نازل فرماتا ہے چنانچہ اب ان پر یہ یہ آیتیں تازہ تازہ اتری ہیں۔ میں ان آیتوں کو (سنتا اور) چپکے سے یاد کر لیتا۔ اور وہ مجھ کو اس طرح یاد ہو جاتیں جیسے میرے سینہ میں نقش ہو گئی ہیں۔ ادھر عرب کے لوگ اسلام قبول کرنے میں فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ کہتے تھے ابھی ان کو اور ان کی قوم کو نبٹ لینے دو اگر وہ اپنی قوم پر غالب آ گئے تو بس جان لو کہ وہ سچے نبی ہیں۔ جب یوں ہوا کہ مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو اب مسلمان ہونے کے لیے لوگ دوڑ پڑے۔ میرے والد اپنی قوم سے پہلے لپک کر مشرف باسلام ہو گئے اور اپنی قوم سے آ کر کھانا بخدا میں تمہارے پاس ایک سچے نبی کے دربار سے آ رہا ہوں ان کا حکم یہ ہے کہ فلاں نماز اس وقت میں اور فلاں اس وقت میں پڑھا کرو اور جب نماز کا وقت آ جائے تم میں سے کسی کو اذان دینی چاہیے اس کے بعد پھر جس کو سب سے زیادہ قرآن محفوظ ہو اس کو امام بنا چاہیے۔ چونکہ ان میں مجھ سے زیادہ قرآن کسی اور شخص کو یاد نہ تھا اور اس کا سبب یہی تھا کہ میں پہلے سے قافلہ والوں سے سن کر قرآن شریف یاد کر لیا کرتا تھا اس لیے انہوں نے مجھ کو ہی اپنے آگے بڑھا دیا۔ اس وقت میری عمر کل چھ سات سال کی ہو گئی اور میرے جسم پر اس وقت صرف ایک مختصر سی چادر تھی۔ جب سجدہ کرتا تو پیچھے کی جانب سے سکڑ کر جسم کے اوپر کے حصہ پر آ جاتی۔ ہماری قوم کی ایک عورت یہ دیکھ کر بولی اپنے قاری صاحب کے سرین تو ذرا ہمارے سامنے سے ڈھانک لیا کرو۔ یہ سن کر لوگوں نے میرے لیے ایک قمیص خرید لی مجھے اس وقت اس قمیص سے اتنی خوشی حاصل ہوئی کہ کسی چیز سے نہ ہوئی تھی۔ (بخاری شریف)

اللہ ..... سے بڑی دلیل ہوگی۔ اس کے برخلاف آپ شاہ روم کا حال پڑھ چکے ہیں وہ جب یہ سنتا ہے کہ آپ کو اپنی قوم پر کبھی فتح ہوتی ہے اور کبھی شکست تو وہ اس کے برعکس آپ کی شکست ہی کو حقانیت کی دلیل قرار دیتا ہے۔ یہاں عمرو بن سلمہ کا گوبچپن ہی میں فرضوں میں امام ہونا ثابت ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ انہی کے بیان سے اس کی وجہ بھی ظاہر ہو چکی ہے کہ اسلام کے بعد یہ ایک ابتدائی واقعہ تھا۔ تفصیلی مسائل رفتہ رفتہ ہی سیکھے جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے جب یہ سنا کہ جس کو قرآن شریف کا زیادہ حصہ یاد ہو امامت حق اسی کا ہے اور یہاں پہنچ کر جب دیکھا تو اس معیار پر عمرو بن سلمہ ہی کو اترتے دیکھا اس لیے ان کے لیے لازم ہو گیا کہ ان کو ہی اپنا امام مقرر کریں۔ حدیثوں میں اس طرح کے بہت سے واقعات ملتے ہیں جو ابتدائی حالات میں صرف اجمالی تعلیم کے تحت ہو گئے۔ پھر بعد میں تفصیلی ہدایات کے مطابق ان کو اداء کیا گیا۔ دیکھئے کہ اس امام کے پاس اتنی چادر بھی نہ تھی جو جسم کے مختلف حرکات کے ساتھ ساتھ اس کے ستر کی لٹہ .....



(۹۹۲) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَنَمًا بَيْنَ جَبَلَيْنِ فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ فَأَتَى قَوْمَهُ فَقَالَ أَيْ قَوْمِ اسْلِمُوا فَوَاللَّهِ إِنَّ مُحَمَّدًا لَيُعْطِي عَطَاءَ مَا يَخَافُ الْفَقْرَ.

(رواہ مسلم و راجع ترجمان السنہ ص ۱۵۲ ج ۲)

(۹۹۲) انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ سب بکریاں مانگیں جو اس وقت دو پہاڑوں کے درمیان چر رہی تھیں آپ نے اس کو وہ سب کی سب ذے دیں (یہ دیکھ کر) وہ اپنی قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا اے میری قوم بس اسلام قبول کر لو خدا کی قسم محمدؐ ایسے سخی اور عالی ہمت شخص ہیں کہ بے دریغ مال لٹاتے ہیں اور فقر کا ذرا خطرہ نہیں رکھتے۔ (مسلم شریف) یہ قصہ اسی کے قریب قریب الفاظ کے ساتھ ترجمان السنہ ص ۱۵۲ ج ۲ پر گزر چکا ہے۔

للہ..... حفاظت کر سکتی۔ مگر یہ بھی ایک بات تھی جو ابتداء میں ہو گئی۔ پھر جب ستر کے مسائل معلوم ہو گئے تو آئندہ انہی کی روشنی میں امت کا عمل بھی ہوتا رہا۔ فقہی تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔

(۹۹۲) \* ہر شخص کے فہم میں میں بلند انسانیت کا ایک جدا معیار ہوتا ہے کسی کے مزاج پر عالی ہمتی اور سخاوت کا اثر پڑتا ہے تو کسی کے مزاج پر ضبط و تحمل کا اثر ہوتا ہے۔ ترجمان السنہ ج ۱ ص ۳۸۸ میں آپ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت پڑھ چکے ہیں جس میں ایک یہودی نے اپنے قرض کے تقاضے میں آپ کے ساتھ ناروا درشتی سے کام لیا تھا لیکن اس پر بھی جب اس نے دیکھا کہ آپ کے ضبط و تحمل میں ذرا فرق نہیں آتا تو بول اٹھا کہ میرا مقصد آپ کو ایذا رسانی نہ تھا بلکہ صرف آپ کے تحمل کا امتحان کرنا تھا اور جب اس نے اپنے معیار کے مطابق آپ کے نبیانہ تحمل کا تجربہ کر لیا تو دوسری ساعت ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اسی طرح کسی کا معیار اس درجہ گرا ہوا تھا کہ اس میں دشمنی کی حقیقت کے سوا فہم کی ذرا سی بوجھ بھی نہیں آتی جیسا بعض یہود نے آپ کو کھانے میں زہر دے دیا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی اطلاع دے دی تو آپ کے استفسار پر ان کو اس کا اقرار کرتا پڑا اور انہوں نے کہا ہمارا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ سچے رسول ہوں گے تو زہر بھلا آپ کا کیا بگاڑ سکے گا ورنہ آپ سے ہماری جان چھوٹ جائے گی اس بے جا کج روی کا بھی کوئی علاج ہے۔ کسی کی طبیعت پر انجوبہ پرستی غالب ہوتی ہے تو وہ ایسی ہی بات رسول کی ذات میں دیکھنی چاہتا ہے جو اس کے نزدیک کسی انسان سے ممکن نہ ہو خواہ اس بات کا کرنا نبی کے لیے لازم ہو یا نہ ہو۔ مثلاً ایک اعرابی آیا اسکی انجوبہ پسند فطرت کی رغبت اس طرف معلوم ہوئی کہ کھجور کا ایک خوشہ یا کیکر کا درخت آ کر آپ کی نبوت کی شہادت دے یہاں ترجمان السنہ از ص ۱۴۱ تا ص ۱۵۱ ج ۲ ص ۴۲۷ اور حدیث نمبر ۴۲۷ ج ۲ ص ۱۵۲ ج ۲ کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ ہاں کوئی ایسا بھی نکل آتا ہے جس کو دلائل پر غور و خوض کیے بغیر ایک ہی نظر میں کھرا کھوٹا صاف نظر آ جاتا ہے جیسا کہ عبد اللہ بن سلام جب مدینہ آئے بس آپ کے رخ انور پر نظر پڑی اور بے ساختہ بول اٹھے یہ چہرہ تو کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۶۲ ج ۲۔ کسی کی فطرت میں اپنا ذاتی کوئی کمال ہوتا ہے اور وہ اپنی موٹی عقل کے مطابق اسی کو معیار بنا لیتا ہے کہ جو اس کمال میں اس کو شکست دے دے بس یہی اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔ جیسا رکنا نہ پہلوان کا واقعہ ابھی آپ نے پڑھا۔ یہاں اب یہ بحث کرنی کہ نبوت کے لیے یہ معیار بھی کوئی معیار بن سکتا ہے یا نہیں۔ مخاطب کی فطرت پر قبل از وقت ایسا بار ڈالنا ہے جس کو وہ اس حالت میں اٹھا نہیں سکتا اس لیے رحمت جس کے لیے سبقت کر چکی ہے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ گوارا کر لیا جاتا ہے اور ان کی ہر معقول اور نامعقول ضد کو پورا کر کے ان کو آغوش اسلام میں زبردستی کھینچ لیا جاتا ہے۔

(۹۹۳) عَنْ أَبِي جُرْمِيِّ جَابِرِ بْنِ سُلَيْمٍ قَالَ أَتَيْتُ الْمَدِينَةَ فَرَأَيْتُ رَجُلًا يَصْدُرُ النَّاسُ عَنْ رَأْيِهِ لَا يَقُولُ شَيْئًا إِلَّا صَدَرُوا عَنْهُ قُلْتُ مَنْ هَذَا قَالُوا رَسُولُ اللَّهِ قَالَ قُلْتُ عَلَيْكَ السَّلَامُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَرَّتَيْنِ قَالَ لَا تَقُلْ عَلَيْكَ السَّلَامُ عَلَيْكَ السَّلَامُ تَحِيَّةُ الْمَيِّتِ قُلِ السَّلَامُ عَلَيْكَ قُلْتُ أَنْتَ رَسُولُ اللَّهِ فَقَالَ أَنَا رَسُولُ اللَّهِ الَّذِي إِنْ أَصَابَكَ ضَرْفٌ فَدَعْوَتُهُ كَشَفَهُ عَنْكَ وَإِنْ أَصَابَكَ عَامٌ سَنَةٍ فَدَعْوَتُهُ أَنْتَبَهَا لَكَ وَإِذَا

(۹۹۳) جابر بن سلیم بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو یہاں میں نے ایک شخص دیکھے جن کی ہر بات لوگ غور سے سنتے اور جو بات بھی وہ فرما دیتے بس لوگ اسی کو قبول کر لیتے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ میں نے یہ سن کر آپ کو دو بار سلام کیا (اور یوں کہا) علیک السلام یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا علیک السلام علیک السلام مت کہا کرو۔ ”یہ طریقہ (زندوں کے سلام کرنے کا نہیں) یہ تو مردوں کو سلام کرنے کا ہے۔“ لہذا ”السلام علیک“ کہا کرو۔ میں نے عرض کی آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ آپ نے فرمایا میں اسی خدا کا رسول ہوں جو اگر تم کو کوئی تکلیف ہو اور تم اس سے دعاء مانگو تو وہ اس کو دور فرما دے اور اگر تم قحط سالی میں مبتلا ہو اور اس سے دعاء مانگو تو وہ تمہارے واسطے اس کو

(۹۹۳) \* آپ کی اس ایک ہی گفتگو میں الہیات، معاشیات اور معیشت کے جتنے شعبے تھے سب کے متعلق ایک ایسی مختصر فہرست بیان میں آ گئی ہے کہ اگر آپ کی یہی ایک گفتگو سامنے رکھ کر اس پر غور کیا جائے تو ایک امی زبان سے نکلے ہوئے یہ بیش قیمت علوم ہی آپ کی نبوت کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔ آپ حدیث کے الفاظ پر ایک بار پھر غور کر کے نظر ڈال لیں اور اپنے دماغ میں خود ان کو پھیلا لیں کہ آپ نے ان مختصر جملوں میں کس طرح خدا تعالیٰ کی ان صفات کا تذکرہ فرمایا ہے جو عرب کی فطرت پر خدا تعالیٰ کی ذات کے تعارف کے لیے سب سے زیادہ اثر انداز ہو سکتی تھیں۔ اس کے بعد آداب سلام، آداب گفتگو، آداب لباس اور علم الاخلاق کے کتنے اہم اسباق کی طرف اشارات فرمائے ہیں۔ جابر بن سلیم کی فطرت کو جس امر نے یہاں سب سے پہلے بیدار کیا تھا وہ آپ کی محفل کا نقشہ تھا اور درحقیقت رسولوں کی صداقت کی ایک دلیل یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کی محفل مادیت کے ساز و سامان سے یکسر خالی ہونے کے باوجود اتنی جاذبیت رکھتی ہے کہ سعید نفوس اس کو ایک نظر دیکھتے ہی ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ عالم میں قدرت نے انسانوں کے مختلف طبقات پیدا فرمائے ہیں ان میں بادشاہ بھی ہیں اور گدا بھی، عالم دقیق النظر بھی ہیں اور ان پڑھ نادان بھی، سلیم الفطرت بھی ہیں اور درشت فطرت بھی لیکن جس کو اللہ تعالیٰ نے بلا تفریق شاہ و گدا اور عالم و جاہل سب ہی کے لیے رسول بنا کر بھیجا تھا اس کی ذات میں ہر طبقے کی تصدیق کے لیے قابل اطمینان اور تشفی بخش دلائل سب ہی جمع کر دیئے تھے۔ آپ نے ان اوراق میں ہر طبقہ کا بیان نمونہ پڑھا ہے۔ بادشاہوں نے اپنے شاہانہ مزاج کے موافق آپ کو جانچا، علماء و اہل کتاب نے اپنی کتابوں کے بیان کردہ نقشوں سے ملا ملا کر آپ کو دیکھا، راہبوں نے اپنی فطری رہبانیت سے آپ کی طرف نظر کی قیافہ شناسوں نے اپنے قیافہ دوڑائے، کاہنوں نے اپنے علوم کے سب زور صرف کر ڈالے اور خن شناسوں نے آپ کے قرآن کو اپنے مذاق پر خوب تو لا مگر ہر طبقے کے منصف مزاج جس نتیجہ پر پہنچے وہ صرف ایک یہی بات تھی کہ آپ بے شبہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

بہار عالم حسنش جہاں راتازہ می دارد      برنگ اصحاب صورت را بیواریاب معنی را

حیرت ہے کہ ان میں سے کسی ایک طبقہ کا ہم کو یہ بیان نہیں ملا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو بزورِ شمشیر بھی مسلمان نہیں کیا.....



كُنْتَ بَارِضٍ قَفْرًا وَ نَلَاةٍ فَضَلْتُ رَاحِلِيكَ  
فَدَعَوْتُهُ رَدَّهَا عَلَيْكَ قُلْتُ اِعْهَدْ اِلَيَّ قَالَ لَا  
تَسْبَنَنَّ اَحَدًا قَالَ فَمَا سَبَبْتُ بَعْدَهُ حُرًّا وَ لَا عَبْدًا  
وَ لَا بَعِيرًا وَ لَا شَاةً قَالَ وَ لَا تَحْقِرَنَّ شَيْئًا مِنْ  
الْمَعْرُوفِ وَ اَنْ تُكَلِّمَ اَخَاكَ وَ اَنْتَ مُنْبَسِطٌ  
اِلَيْهِ وَ جَهْكَ اِنَّ ذَلِكَ مِنَ الْمَعْرُوفِ وَ اَرْفَعُ  
اِذَا رَكَ اِلَى نِصْفِ السَّاقِ فَاِنْ اَبَيْتَ فَاِلَى  
الْكَعْبَيْنِ وَ اِيَّاكَ وَ اِسْبَالَ الْاَزَارِ فَاِنَّهَا مِنَ  
الْمَخِيلَةِ وَ اِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمَخِيلَةَ وَ اِنْ امْرَأَةً  
شَتَمَكَ وَ عَيَّرَكَ بِمَا يَعْلَمُ فِيكَ فَلَا تُعَيِّرُهُ  
بِمَا يَعْلَمُ فِيهِ فَاِنَّمَا وَ بَالُ ذَلِكَ عَلَيْهِ.

(رواه ابو داؤد و روى الترمذى منه حديث السلام  
وفى روايته فيكون لك اجر ذلك و وباله عليه)

سبزہ زار کر دے اور اگر تم کسی بیابان جنگل میں ہو اور تمہاری سواری گم ہو  
جائے پھر تم اس سے دعاء مانگو تو وہ تمہاری سواری تم کو عطا فرما دے۔ میں  
نے عرض کی اچھا تو مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا دیکھو! کسی کو برا  
بھلا نہ کہنا۔ یہ کہتے ہیں آپ کے اس فرمان کے بعد میں نے نہ تو کسی آزاد  
انسان کو برا کہا اور نہ غلام کو بلکہ کسی بکری اور اونٹ کو بھی برا لفظ نہیں کہا۔  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور دیکھنا! کسی اچھی بات کو ہرگز حقیر مت  
سمجھنا اور اپنے مسلمان بھائی سے کشادہ روئی سے گفتگو کرنا کیونکہ یہ بھی ایک  
نیک کام ہے۔ اور دیکھنا! ٹخنوں سے کپڑا نیچے لٹکانے سے بہت احتراز کرنا  
کیونکہ یہ خصلت تکبر کی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تکبر بہت ناپسند ہے اور اگر بالفرض  
کوئی شخص تم کو برا بھلا کہے اور تم کو ایسے عیب کی عار دلانے جو تمہارے اندر  
موجود ہو تو تم یہ حرکت مت کرنا کہ جو عیب تم اس میں دیکھو تم بھی اس کو اس  
کی عار دلانے لگو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں تو اس کا ثواب ملے گا اور اس  
کی اس حرکت کا وبال اسی پر پڑے گا۔ (ابوداؤد)

لہذا..... بنایا تھا۔ پھر معلوم نہیں کہ متاخر مفکرین نے اسلام میں جہاد کے مسئلہ کو ایک ہوا کیوں سمجھ رکھا ہے۔ جہاد خواہ جارحانہ ہو یا مدافعانہ لیکن  
اس کا مقصد اشاعت اسلام سمجھنا ہی محل بحث ہے۔ فرض کر لیجئے کہ اگر اسلام میں جہاد جارحانہ بھی ہوا ہے تو کیا یہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اس کا  
مقصد زبردستی مسلمان بنانا تھا۔ اگر یہی مقصد ہوتا تو قانون اسلام میں جزیہ کی ایک مستقل دفعہ کیوں رکھی جاتی۔ بہر حال آج مخالفین اسلام کچھ بھی  
کہیں لیکن جن لوگوں کے سروں پر اسلام کی تلوار چمکی اور جن کے خاندان کے خون بہے ان میں مشرف باسلام ہونے والے بھی ہیں اور اپنے کفر پر  
قائم رہنے والے بھی مگر کوئی یہ بیان نہیں کرتا کہ اسلام نے یہ جہاد ان کو جبراً مسلمان بنانے کے لیے کیا تھا۔ یہ موضوع اس وقت ہمارا نہیں ہے۔ ہمیں  
تو یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ان جملہ طبقات کا پیچ و تاب کھانا اسی وقت تک ثابت ہوتا ہے جب تک کہ انہوں نے آپ کو متصفانہ نظر سے نہیں دیکھا  
لیکن جس ساعت بھی تقدیر نے یہ موقع ان کو دے دیا تو پھر وہ اہل کتاب تھے یا مشرکین مکہ کسی کو آپ کی نبوت میں تردد نہیں ہوا اور کیسے ہو سکتا تھا  
جب کہ دنیا میں خدا تعالیٰ کے دو چار رسول تو نہیں آئے تھے بلکہ اتنی بڑی تعداد آچکی تھی کہ ان کے حالات زندگی مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک ان  
کو پہچانا سب سے واضح مسئلہ بن گیا تھا۔ مشرکیں عرب گورسولوں سے آشنائے تھے مگر دعویٰ ان کا بھی یہی تھا کہ ہم ملت حنیفیہ رکھتے ہیں اور اپنی جبل  
جہالت پر اتنے معقول پسندوہ بھی تھے کہ اس بارے میں اہل کتاب کی رائے اپنی رائے پر مقدم سمجھتے تھے اور یہ اسی بنیاد پر کہ ان کے نزدیک ”لکل  
فن رجال“ کے مطابق نبیوں کو پہچانا یہ ان کا ہی فن تھا مگر یہ وسوسہ ان کو بھی نہیں گذرا کہ بندہ کی حقیقت صفراء کے مرض یا خواب سے کچھ ملتی جلتی  
ہے۔ یہ بحث ان ہی کے دماغ میں پیدا ہوئی جن کو انبیاء کی تاریخ مطالعہ کا کوئی موقع نہیں ملا بلکہ انہوں نے محض عقلی طور پر اس مسئلہ کو سامنے رکھا اور  
صرف عقل کی روشنی میں اس کو حل کرنے کی کوشش کی حالانکہ وجدانیات وحیات اور مشاہدات بلکہ جملہ محسوسات کا تعلق جتنا کہ ذوق صحیح کے ساتھ  
ہے اتنا دلائل کے ساتھ نہیں۔ آخر عبداللہ بن سلام اپنی یہودیت کے زمانہ میں آپ کے چہرہ پر نظر کرتے ہیں بے ساختہ کس دلیل سے بول اٹھے کہ  
”هذا الوجه ليس بوجه كذاب“ دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۴۸ ج ۲ یہ چہرہ تو جھوٹے کا چہرہ نہیں۔

الانبياء عليهم السلام بينهم اخوة  
النبوة يعظم اولهم اخرهم و اخرهم  
اولهم و لا يوجد بينهم اختلاف  
انبياء عليهم السلام میں وہ اخوت نبوت ہوتی ہے کہ ان میں ہر ایک  
دوسرے کے لیے ہمہ تن احترام ہوتا ہے اور ان میں کہیں اختلاف  
کا نام و نشان نہیں ملتا

(۹۹۴) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ رَوَيْتُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
(۹۹۴) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں حضرت عیسیٰ کے ساتھ سب سے قریب تر میں

(۹۹۴) \* دنیا میں اخوت کی مختلف قسمیں ہیں انسانی اخوت، ملک و وطن کی اخوت، کسی حرفہ و پیشہ کی اخوت، نسلی اخوت، نسبی اخوت اور  
عرب میں تو ان کے علاوہ ایک اور اخوت کا بھی رواج تھا جو باہم معاہدہ سے پیدا ہو جاتی تھی ان کے عرف میں اس کا نام ”مواخات“ تھا  
ہمارے لفظوں میں اس کو منہ بولا بھائی کہنا چاہیے مگر اس کے حقوق ان کے ہاں مثل نسبی اخوت کے سمجھے جاتے تھے۔ ان تمام اخوتوں کا حاصل  
درجہ بدرجہ انس و محبت اور تعاون و تناصر ہے۔ ایک مشرق کے باشندہ کو اگر مغرب کے باشندہ کی مصیبت پر کسی درجہ کا غم ہوتا ہے تو کیوں؟  
صرف اسی انسانی اخوت کی بناء پر اس سے بڑھ کر وطنی اخوت ہے۔ جب کبھی دو غیر متعارف انسانوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی  
ملک و وطن کے باشندے ہیں تو یہ سنتے ہی ان کے دلوں میں محبت و انس کے جذبات فوراً اُمنڈنے لگتے ہیں۔ نسل و نسب کی اخوت اس سے  
بھی بالاتر ہے اس کے مقابلہ میں تمام اخوتیں ماند پڑ جاتی ہیں یہاں ایک انسان بعض مرتبہ حق و ناحق کی بحث سے بھی علیحدہ ہو جاتا ہے لیکن  
یہ تمام اخوتیں ذرا ذرا سے عوارض سے بہت جلد ختم بھی ہو جاتی ہیں اور معمولی معمولی باتوں پر حسد و رقابت کے جذبات سے تبدیل ہو جاتی  
ہے جس کی شہادت کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی سرگزشت کافی ہے لیکن ان سب اخوتوں سے الگ ایک  
اخوت اور بھی ہے جو خاص انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں نظر آتی ہے جس کا نام اخوت نبوت ہے یہ تمام اخوتوں سے بالاتر اخوت ہے  
یہاں کسی حالت میں بھی ذرا سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی ان میں محبت و انس کے وہ جذبات نظر آتے ہیں کہ اگر بڑے اور چھوٹے کا  
تفاوت معلوم نہ ہو تو یہ محسوس کرنا ہی مشکل ہے کہ ان میں باہم ایک دوسرے پر کسی کو فوقیت بھی ہے یا نہیں ہر ایک کے جذبات دوسرے کی  
تعظیم و تکریم کے لیے وقف ہوتے ہیں پھر یہاں وہ روحانی تناسب موجود ہوتا ہے کہ ہر نبی کو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسی الفت و محبت  
ہوتی ہے گویا کہ وہ اب اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ موجود ہیں ایک سعید لڑکا بھی کچھ وقفہ کے بعد اپنے والد کی یاد اس طرح تازہ نہیں رکھ  
سکتا جس طرح کہ ایک نبی دوسرے گزشتہ نبی کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے گویا ان کے صرف قالب مختلف ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ سب  
ایک جان ہوتے ہیں اسی لیے کوئی نبی دوسرے نبی کے احترام کے خلاف ایک کلمہ بھی برداشت نہیں کر سکتا بلکہ ہر نبی کی شریعت کی ایک دفعہ  
ہی یہ ہوتی ہے کہ جو کسی ایک نبی کا منکر ہو وہ خود اس کا بھی منکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو اپنی امتوں میں ایک  
ایسی اخوت پیدا فرماتے ہیں جو ان کے مابین اخوت سے مشابہ ہوتی ہے اس کا نام ”اخوت ایمانی“ ہے۔ اس اخوت کے مقابلہ میں عام  
انسانوں کی تمام قسم کی اخوتیں ہیچ ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ آپ نے فرما دیا کہ اخوت ایمانی کے بعد اب عقد مواخات کرنا اصولاً غلط ہے کیونکہ محبت و  
انس کے جتنے جذبات ہو سکتے ہیں وہ سب ”اخوت ایمانی“ میں پنہاں ہیں۔ اس لیے آئندہ اب ”مواخات“ کا دستور منسوخ ہے وَاِذْ  
كُرُوا اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءَ فَالْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا۔ یعنی اس دور کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے لئے.....



وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِي  
الْاُولَى وَالْاٰخِرَةِ الْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ مِّنْ عَلَاتٍ وَ  
ہوں۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سب انبیاء علیہم السلام باہم علاقائی  
(سوتیلے) بھائیوں کی طرح ہوتے ہیں جن کا والد ایک ہوتا ہے اور مائیں

للہ..... دشمن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے انہوں نے آ کر تمہارے درمیان وہ الفت پیدا کر دی کہ تم سب بھائی بھائی بن گئے  
اور اب ایک دوسرے کی خاطر جان نثاری کے لیے تیار ہو گئے۔ آیت بالا میں اسی ”اخوت ایمانی“ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک  
حدیث میں سب مسلمانوں کو ایک عمارت سے تشبیہ دے کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح ایک مکان کی اینٹ دوسری اینٹ کے لیے باعث  
استحکام ہوتی ہے اسی لیے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ہونا چاہیے اب مثال کے طور پر آپ یہاں حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ  
ملاحظہ فرمائیے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے کر آپ کو یہ خطاب فرمایا تھا ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرِ اُولُو الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ  
الْحُوتِ﴾ یعنی جیسا اولو العزم رسول ہمیشہ صبر کرتے رہے ہیں تم بھی اسی طرح صبر سے کام لو اور صاحب حوت (یعنی یونس علیہ السلام) کی  
طرح نہ بنو۔ اس طرز خطاب سے شاید خطابات ربانی سے کسی نا آشنا شخص کو ایک نبی کے حق میں کسی کوتاہی کا وہم گزر سکتا تھا اس لیے  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس کا ازالہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ”مجھ کو یونس نبی پر فضیلت مت دو“ دیکھو ترجمان السنۃ ص ۳۲۲ ج ۲  
۲۔ مدتوں اس حدیث کی مراد سمجھ میں نہ آ سکی حتیٰ کہ ترجمان السنۃ میں بھی اس کی وہی مراد درج کر دی گئی جواب تک شارحین کے کلام سے  
سمجھی تھی۔ جب اس تیسری جلد کا وقت آیا تو اس طرف ذہن متوجہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ انبیاء علیہم السلام میں یہاں خاص  
حضرت یونس علیہ السلام کا نام لینا ضرور کسی حکمت پر مبنی ہو گا اسی وقت خیال قرآن کریم کی طرف گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی خاص طور پر ان  
ہی کا نام لے کر آپ سے کہا گیا تھا کہ تم ان کی طرح بے صبری کا کوئی قدم نہ اٹھانا۔ سبحان اللہ اخوت نبوت بھی کتنی بلند اخوت ہوتی ہے۔  
آپ نے فوراً ان ہی کا نام لے کر فرمایا ”تم مجھ کو ان پر فضیلت مت دو“ امت کے جذبات اس قسم کے مواقع پر حدود سے تجاوز کر جایا کرتے  
ہیں اس لیے بہت اہمیت کے ساتھ ان کو ہدایت فرمادی کہ اس خدائی طرز خطاب سے امت کا کوئی فرد بھی ان کے حق میں ادنیٰ سا کسر شان کا  
کلمہ منہ سے نہ نکالنے پائے یہ خالق کا اپنے رسول سے خطاب ہے یہاں کسی امتی کو مداخلت کرنا خطرناک ہے۔ حضرت حفصہؓ اور حضرت  
عائشہؓ کے حق میں ایک موقع پر عمرؓ اور صدیق اکبرؓ سے جو تنبیہی حرکات صادر ہوئی تھیں کس کی مجال ہے کہ ان کی نقل اتار سکے یا امہات المؤمنین  
کی شان عالی میں نصف کلمہ بھی زبان پر لاسکے۔ پس جب بندوں کے درمیان مراتب اور حقوق کے لحاظ سے فرق پڑتا ہے تو خالق اور مخلوق  
کے درمیان جتنا فرق ہونا چاہیے اس کو قیاس کر لیجئے بالخصوص جب کہ مخاطب رسول کی ذات ہو جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ لغزش پر سخت سے سخت  
باز پرس ہوتی ہے۔ اس کے بعد قلب مطمئن ہو گیا اور معلوم ہوا کہ اس حدیث کو جب آیت بالا کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو یہاں کسی سوال و  
جواب کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ عقیدہ کا ماب نہ تھا بلکہ اخوت نبوت کا کرشمہ تھا۔ اسی قسم کا دوسرا واقعہ ترجمان السنۃ ص ۳۲۲ ج ۲ میں گزر  
چکا ہے وہاں بھی بڑی ناگواری کے انداز میں آپ نے فرمایا تھا تم لوگ مجھ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت مت دو“ حضرت عیسیٰ علیہ  
السلام جب دنیا سے کچھ عرصہ کے لیے رخصت ہو رہے تھے تو اس وقت اپنی امت کے سامنے تسلی کے جو کلمات انہوں نے فرمائے تھے وہ  
حسب بیان انجیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی عظمت شان ظاہر کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ماضی اور  
آئندہ آنے والے رسولوں کا اس درجہ احترام انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کہیں نہیں ملتا یہاں ایک لاکھ سے زیادہ کی بڑی جماعت سب میں یہی  
صفت نظر آتی ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح خود ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوتا اسی طرح ان کے اصولی علوم للہ.....

أَمَّهَاتُهُمْ شَيْءٌ وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ وَلَيْسَ  
بَيْنَنَا بَيٌّ. (متفق علیہ)

مختلف اسی طرح ان سب کا دین یعنی اصولی عقائد ایک ہوتے ہیں اور شریعتیں  
مختلف مختلف اور میرے اور عیسیٰؑ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ (متفق علیہ)

(۹۹۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ عِفْرِيئًا مِنَ الْجِنِّ تَفَلَّتْ

(۹۹۵) ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ  
نے فرمایا آج کی شب ایک سرکش جن میری ایداء رسانی کے لیے چھوٹ نکلا

اللہ..... میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوتا فروع اور جزئیات میں گویاں بھی اختلاف ہو جاتا ہے مگر ایک شریعت نے دوسری شریعت کی کبھی  
تکذیب و تغلیط نہیں کی بلکہ ہمیشہ پہلی شریعت کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہہ دیا ہے کہ بعض احکام وقتی ہوتے ہیں اور وہ کسی  
خاص دور کے ساتھ مخصوص بھی ہو سکتے ہیں اس لیے مثلاً فلاں فلاں احکام جو گزشتہ دور کے مناسب تھے اب جدید آئین سے خارج کیے  
جاتے ہیں اور فلاں فلاں احکام کا جدید اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس تغیر و تبدل کو تغلیط نہیں کہا جاسکتا اس کا نام ”نسخ“ ہے۔ یہ رسول کا اپنا فعل ہی  
نہیں ہوتا یہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ وہ جو احکام چاہتا ہے نسخ فرما دیتا ہے اور جو چاہتا ہے جدید احکامات نازل فرما دیتا ہے اس لحاظ سے یہ  
کہنا بھی بالکل درست ہے کہ رسولوں کے علوم میں مطلقاً کوئی اختلاف نہیں ہوتا نہ اصول میں اور نہ فروع میں۔ اسی کے ساتھ اگر اس پر بھی  
غور کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کے علوم میں الہیات اور عالم غیب کا ایک بڑا باب ایسا بھی ہوتا ہے جس میں عقل انسانی قطعاً در ماندہ اور  
عاجز ہے اس کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود تک اس میں کہیں ایک نقطہ کا اختلاف  
نہیں ملتا تو اس سے بد اہتہ یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم کا سرچشمہ یقیناً ایک ہی تھا اور یقیناً یہاں جو حضرت آدم علیہ  
السلام کا معلم تھا وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی معلم تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانے ان کی زبانیں اور ان کے بعثت کے مقامات گو  
کتنے ہی مختلف تھے مگر علوم میں ایک ششہ کا کہیں اختلاف نہ تھا۔ ان عمیق مسائل پر اگر صرف بزور عقل غور کیا جائے تو کیا اتنے کثیر التعداد  
انسانوں میں جو عالم کے اتنے مختلف خطوں میں اتنے مختلف مختلف زمانوں میں ظاہر ہوئے ہوں اتنا اتحاد عقلاً ممکن ہے؟ پھر خود ان کے  
درمیان اتنی محبت اتنی ایک دوسرے کی عظمت اور ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط نظر آ سکتا ہے جس کی مثال دو حقیقی بھائیوں میں بھی نہ مل سکو۔  
یہاں حدیث کے الفاظ ”فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“ خاص طور پر قابل لحاظ ہیں شاید یہ اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف  
آوری بہ حیثیت آپ کے امتی ہونے کے ابھی باقی ہے اور آپ کی یہ حیثیت لازمی طور پر آخرت میں بھی ظاہر ہوگی ورنہ آپ کی نسبت سب  
انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابر ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اولویت کی نسبت کی۔ اس کے سوا کوئی وجہ حدیث کی روشنی میں ثابت  
نہیں ہوتی۔ اس روایت میں ایک فقرہ اور بہت زیادہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے ”لَيْسَ بَيْنَنَا بَيٌّ“ یعنی ہمارے درمیان کوئی اور ہی نہیں۔  
مدت دراز تک اس کی صحیح مرہ حل نہ ہو سکی اور یہ منکشف نہ ہو سکا کہ اس امر کے بیان فرمانے کی اہمیت کیا ہے۔ اس کے بعد نظر سے گذرا کہ  
کتب سابقہ میں آپ کی علامت میں یہ بھی ذکر کیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اس رسول کے درمیان کوئی اور نبی نہ ہوگا اس کے بعد  
سے پھر اس جملہ کی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہونے لگا۔ دیکھو حدیث نمبر ۸۸۶ جس میں مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شاہ مقوقس کے دربار میں  
جانے کا واقعہ مذکور ہے۔

(۹۹۵) \* حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ہر نبی جس طرح دوسرے نبی کی نبوت کا مصدق ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اس کے معجزات کا بھی مصدق  
ہوتا ہے اور ان کا بھی پورا پورا احترام کرتا ہے۔ یہ کبھی ثابت نہیں ہوا کہ کسی نبی نے دوسرے نبی کے مقابلہ پر کوئی معجزہ دکھلایا ہو۔ اللہ.....



عَلَى الْبَارِحَةِ أَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا لِيَقْطَعَ عَلَى الصَّلَاةِ فَأُمَكِّنِي اللَّهُ مِنْهُ وَأَرَدْتُ أَنْ أَرْبِطَهُ

تھا تا کہ کسی طرح میری نماز قطع کرادے مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر مجھ کو قدرت عنایت فرمادی اور میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس کو مسجد کے ستونوں میں سے

لہ..... اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو معجزہ ایک نبی کا ہو وہ دوسرے کا نہیں ہو سکتا بلکہ ایک ہی جنس کا معجزہ متعدد دنیوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ احیاء موتی - گو مشہور یہ ہے کہ یہ معجزہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ یہی معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ظاہر ہوا ہے۔ (دیکھو کتاب النبوات ص ۱۱۲) لیکن یہاں ہر ایک کا معجزہ جس طرح خود اس کی نبوت کی دلیل ہوتا ہے اسی طرح گزشتہ نبی کی صداقت بھی دلیل ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف کاہنوں اور ساحروں کی جماعت ہے یہاں ہمیشہ ایک ساحر دوسرے ساحر کی کاٹ پر نظر آتا ہے اور اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ دوسرے کا عمل باطل کر دے۔

سبحان اللہ! اب آپ حدیث مذکور میں ذرا اخوت نبوت کی اس پاسداری کو بھی ملاحظہ کیجئے کہ جس خاص تسخیر کے متعلق ایک پیغمبر کی زبان سے یہ دعاء نکل چکی تھی ”پروردگار مجھے وہ بادشاہت دے جو میرے بعد کسی دوسرے کو نہ ملے“ دوسرا پیغمبر اس کا کتنا احترام ملحوظ رکھتا ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ میں اقتدار حاصل ہو جانے کے باوجود اس کو صرف اس لیے نافذ نہیں کرتا کہ کہیں اس میں دوسرے پیغمبر کی دعاء کے خلاف کا ادنیٰ سا شائبہ پیدا نہ ہو جائے حریفانہ ہمسری سے اتنا احتراز اور اخوت نبوت کا اس درجہ احترام پس نبوت کا ایک اعجاز سمجھنا چاہیے۔ کیا اتنی بڑی جماعت میں بلا استثناء اس احترام کی مثال دنیا کی کسی دوسری جماعت میں مل سکتی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسخیر جنات سے بڑھ کر ایک اور نعمت عطا فرمائی تھی اور وہ جنات کے لیے آپ کی بعثت تھی۔ اس لیے آپ کا عام پیغمبرانہ سلوک ان کے ساتھ بھی وہی تھا جو نوع انسانی کے ساتھ تھا دونوں مخلوق کو آپ نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی دعوت دی ہے اور مالکانہ تصرف سے ہر جگہ احتراز فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ مالکانہ تسخیر سے دعوت الی الحق کہیں افضل ہے۔ (کتاب البوت ص ۱۲۶) حافظ سیوطی نے بھی الخصائص الکبریٰ میں اس کو ذکر کیا ہے۔ ہمارے نزدیک جس رسول اعظم نے اپنی پسند سے شانِ عبدیت اختیار فرمائی تھی اس کی فطرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اب کوئی عمل بھی اس سے ایسا سرزد ہو جو عہدِ سلیمانی کے دور شاہانہ سے ملتا جلتا رہے۔ یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے۔ (دیکھو ترجمان السنۃ ص ۳۲۱ ج ۲ حدیث ۷۱۱)

شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کہ شیطان چونکہ یہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں وہ دوسوہ اندازی سے تو عاجز ہے اس لیے اس نے یہ سعی کی کہ کسی صورت آپ کی نماز ہی میں خلل انداز ہو جائے اور آپ کو عمل کثیر کے لیے مجبور کر دے مگر حق تعالیٰ کے فضل سے اس کو اس پر بھی قدرت نہ ہو سکی آخر کار مایوس ہو کر پھٹکارا ہوا واپس ہو گیا۔ (دیکھو الیواقیت والجواہر: ص ۳۲ ج ۲)

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ یہ شیطان بلی کی شکل پر آیا تھا۔ عالم روحانیت میں صورت کی تبدیلی ممکن ہے اگر کہیں انسان میں اس کی ٹھوس مادیت حائل نہ ہو جاتی تو وہ بھی اپنی صورت بدل سکتا۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل کی تبدیلی کا ذکر بہت سے مواقع میں آیا ہے غالباً یہ بھی ان کے ”روح اللہ“ لقب کے اثرات میں سے ہوگا۔ بہر حال اس بنا پر آپ کا اس کو پکڑ کر ستون سے باندھنا اور بچوں کا اس کو دیکھنا وغیرہ سب معقول ہے۔ روحانیت کے جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر کوئی صاحبِ ہمت اپنی قوتِ ہمت سے کسی روح کو کسی جسم میں مقید کر دے تو پھر وہ اس کو بدل نہیں سکتا اور اسی میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ ترجمان السنۃ جلد دوم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرشتہ کے تھپڑ مارنا اور اس کی آنکھ پھوٹ جانا بھی اس کی نظیر سمجھنا چاہیے اگر وہاں بھی فرشتہ اپنی اصل صورت میں آتا تو خدا تعالیٰ کا مقدس لہ.....

إِلَى سَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ حَتَّى تُصْبِحُوا أَوْ تَنْظُرُوا إِلَيْهِ كُلُّكُمْ فَذَكَّرْتُ قَوْلَ أَحْيَى سُلَيْمَانَ رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي قَالَ رَوْحُ فَرَدَّه خَاسِنًا. (رواه البخاری)

کسی ستون کے ساتھ باندھ دوں یہاں تک کہ صبح کو تم سب کے سب اس کو آنکھوں سے دیکھ لو۔ لیکن پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی یہ دعایا آ گئی ”پروردگار مجھے ایسی بادشاہت عنایت فرما جو میرے بعد کسی اور کو زیان نہ ہو۔ روح (حدیث کا ایک راوی) بیان کرتے ہیں کہ (اس وجہ سے آنحضرتؐ نے اپنے ارادہ کو ترک کر دیا) اور اس کے مقصد میں اس کو ناکام واپس کر دیا۔ (بخاری)

(۹۹۶) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ

(۹۹۶) ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ابوداؤد علیہ السلام ایک دعاء یہ بھی فرمایا کرتے

..... رسول نہ اس کے تھپڑ مارتا اور نہ اس کی آنکھ ہی پھوٹی یہ سب بشری صورت میں آنے کے کرشمے تھے۔

حضرت شاہ اہل اللہ کا تاریخی واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ دہلی میں مسجد کے اندر بیٹھے ہوئے کچھ تحریر فرما رہے تھے پاس قلمدان رکھا ہوا تھا ایک بار نظر اٹھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھوٹا سا سانپ سامنے موجود ہے۔ آپ نے اپنے اسی انہماک کی حالت میں قلمدان سے چاقو نکال کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور پھر بدستور لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں نظر اٹھی تو اس سانپ کو وہاں نہ پایا اور ایک سپاہی مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا نظر پڑا۔ اس نے کہا بادشاہ سلامت آپ کو بلاتے ہیں۔ یہ خالی الذہن اس کے ساتھ ہو لیے۔ جب اس نے جنگل کا رخ کیا تو ان کو کچھ شبہ گذرا یہاں تک کہ اس نے ایک غار میں داخل ہونے کے لیے ان سے کہا۔ اب یہ سمجھ گئے کہ معاملہ کچھ اور ہے کچھ دور چل کر ان کو شاہی عدالت نظر آئی جہاں ایک شخص مقتول پڑا تھا۔ مدعی نے دعویٰ کیا کہ اس کا قاتل یہ انسان ہے۔ انہوں نے انکار فرمایا۔ بالآخر بادشاہ نے جو دو سفید ریش شخص اس کی دائیں بائیں طرف بیٹھے تھے ان کو دیکھا تو ان میں سے ایک صاحب نے ایک حدیث پڑھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ آپ نے فرمایا ہے جو اپنی صورت بدلے اس کو قتل کر دو۔ اس جن نے چونکہ اپنی صورت بدل کر سانپ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لہذا بموجب حدیث مذکور اس کے قاتل پر قصاص واجب نہیں ہوتا۔ شاہ اہل اللہ نے ان کی زبانی یہ کلمات سن کر پوچھا۔ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پایا۔ انہوں نے جواب دیا ہم جن ہیں اور ہماری عمریں اتنی طویل ہو سکتی ہیں۔ بہر حال جب جن سانپ کی شکل میں آ کر مقتول ہو سکتا ہے۔ اپنی لاعلمی میں حقائق کا صرف استہزاء کرنا علم نہیں۔

(۹۹۶) \* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلمات سے کچھ یہ اندازہ لگانا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کے قلوب میں حب خداوندی کی آگ کس درجہ بھڑکی ہوئی ہوتی ہے مگر محبت کا کمال یہی ہے کہ اگر اس کے شرارے سر بفلک بھی پہنچ رہے ہوں جب بھی ایک محبت کی تمنا یہی ہو کہ کاش یہ آتش محبت اور زیادہ بھڑکتی۔

بشر کی محبت یہ ہے کہ اس کا قدم جتنا محبت الہی کی طرف اٹھتا چلا جائے اتنا ہی وہ اس کی عبادت میں تیز گام ہوتا چلا جائے۔ اس لیے ابوالدرداءؓ یہاں وہ کلمات بھی نقل فرماتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے برادر نبوت حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت کی شان میں فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ خود عبدیت کا سب سے کامل مظہر تھے اس لیے آپ کی نظروں میں اپنے بھائی داؤد علیہ السلام کی جو ادا سب سے زیادہ پیاری معلوم ہوئی وہ ان کی عبادت ہی تھی پھر آپ کی عبدیت کا دوسرا کمال یہ تھا کہ جب ان کی عبادت کا ذکر فرماتے تو اس طرح فرماتے گویا وہ اپنی نظیر خود ہی تھے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں اپنی شکر گزاری کے لیے للہ.....



تھے۔ الہی میں تیری محبت مانگتا ہوں اور اس شخص کی محبت جو تجھ سے محبت رکھے اور وہ نیک عمل جو تیری محبت پیدا کر دے۔ الہی میرے دل میں اپنی محبت میری جان و مال میرے گھر بار اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ پیدا فرما دے۔ اور یہ بھی بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ فرماتے تو یہ بھی فرمایا کرتے تھے 'وہ بہت بڑے عبادت گزار بشر تھے۔

(ترمذی شریف)

(۹۹۷) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ (۹۹۷) ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

للہ ..... حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالیٰ نے خاص طور پر خطاب فرمایا تھا اس لیے انہوں نے بھی عبادت الہی کا ایک ایسا نظام قائم فرمایا تھا کہ شب و روز میں کوئی ساعت بھی ایسی نہ تھی جس میں کہ ان کے گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد ان کے عبادت خانہ میں عبادت کرتا ہوا نہ ملتا ہو۔ ارشاد ہے۔ ﴿اعْمَلُوا لِدَاوُدَ شُكْرًا﴾ (سبا: ۱۳)

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کبھی اپنے ان بردار نبوت کا تذکرہ آ جاتا تو آپ ان کی شان عبادت کی توصیف میں بے ساختہ رطب اللسان ہو جاتے یہ کون ہیں؟ وہ کہ جن کی عبادت کی فرشتوں میں بھی دھوم مچی ہوئی تھی، حتیٰ کہ خود معبود حقیقی نے جو لقب چھانٹ کر ان کو عطا فرمایا تھا وہ بھی عبد اللہ کا لقب تھا۔ سورہ اسراء میں جب آپ کا تذکرہ فرمایا تو اسی لقب سے ﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا﴾ اور سورہ النجم میں جب آسمانوں پر آپ کے ساتھ راز و نیاز کا ذکر کیا تو بھی اسی لقب سے ﴿فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ﴾ یہ ہے اخوت نبوت کہ عبودیت کے اس کمال تک پہنچنے کے بعد بھی اپنی عبادت کا ایک حرف زبان پر انہیں آتا اور جتنی مدح و ثناء زبان پر آتی ہے وہ اپنے ایک بردار نبوت کی ہے۔

(۹۹۷) \* حدیث مذکور میں یکجائی طور پر تین نبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جس کو پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نبیاناہ اخوة دوسرے نبیوں کے عزت و احترام بیان کرنے اور اپنی فروتنی کے اظہار کے لیے گویا بہانہ کی متلاشی رہا کرتی تھی۔ اگر کہیں اپنے جد بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آ گیا تو عظمت و برتری کے جتنے زوردار کلمات ہو سکتے تھے وہ ان کے حق میں اور عجز و نیاز کے جتنے کلمات ممکن تھے۔ وہ سب اپنے حق میں اداء ہونے لگے اور جب کہیں اپنے دوسرے علاقائی بھائیوں کی یاد تازہ ہو گئی تو فوراً آپ کے تلطیف و ترحم کے سمندر موجزن ہو گئے اور رحمت و رافت سے لبریز دعائیں ان کے لیے زبان سے نکلنے لگیں۔ پھر یہ سب کچھ محض شاعرانہ اور مبالغہ آمیزی کے طور پر نہیں بلکہ ٹھیک ٹھیک حقیقت پر مبنی۔

دیکھئے یہاں جو کلمات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آپ کی زبان مبارک سے نکلے وہ کتنی عمیق حقیقت کے حامل تھے یقیناً اگر کہیں فطرت ابراہیمی شک و تردد سے پاک و صاف نہ ہوتی تو ان کے بعد جو حنیف بھی آتا اس میں شک و تردد کے جراثیم ضرور سرایت کر کے رہتے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے سہو و نسیان سے ایک غلطی ہو گئی مگر آخر کار پھر ان کی ذریت کی سرشت میں داخل ہو کر رہی۔ اور اسی طرح ہر موسس کے نقصان و کمالات اس کے متبعین کے آئینوں میں چمکا کرتے ہیں۔ پس اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اگر رب ارنسی للہ .....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ أَحَقُّ بِالشَّكِّ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے مستحق ہم ہوتے (اگر

للہ..... کَیْفَ تُخَيِّی الْمَوْتٰی کا کلمہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی زبان مبارک سے کہیں ازراہ شک اداء ہوتا تو پھر شک و تردید ملت حنیفہ کی بنیاد ہی میں داخل ہو جاتا۔ اس کی بقیہ شرح ترجمان السنہ ص ۲۶ ج ۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔

حدیث کا دوسرا جملہ ذرا شرح طلب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے جب انکار و تمرد کی حد کر دی اور معاصی و فواحش میں خلاف وضع فطرت عمل کا ایک ایسا باب کھول دیا جس سے دنیا اس سے قبل آسان نہ تھی تو آخر ان کی ہلاکت کی ساعت سر پر آ گئی اور خدا تعالیٰ کے مقدس ملائکہ خوب صورت لڑکوں کی شکل میں آ پہنچے صورت یہ ہوئی کہ پہلے وہ حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان بن گئے، ان کو ابھی کچھ علم نہ تھا کہ اصل ماجرا ہے کیا، انہوں نے حسب دستور انبیاء علیہم السلام اپنے مہمانوں کو احترام سے لیا، ادھر ان کی قوم کو اس کی خبر لگی تو نشہ معصیت میں مخمور ان کے مکان پر آ چڑھے اور ان کے معزز مہمانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا۔ اندازہ فرمائیے کہ قوم کے سارے نانہجار افراد ایک طرف اور حضرت لوط علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی آبرو کا معاملہ ایک طرف نہ خود اپنے دست و بازو میں ان کی مدافعت کی طاقت نہ قبیلہ ہی اتنا زوردار کہ اس موقع پر ان کی مدد کر سکے۔ اس حیرت اور مجبوری کے عالم میں ان جاہلوں کو بڑی فہمائش کی اور جو ایک بلند حوصلہ اور بامروت انسان اپنے مہمانوں کی خاطر بڑے سے بڑا ایثار کر سکتا ہے وہ بھی کر گزرے یعنی ابھی تک کفار اور مسلمانوں کے درمیان نکاح درست تھا، خود حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی بھی کافرہ تھی اور ہماری شریعت کے ابتداء میں بھی یہ نکاح درست سمجھا جاتا تھا۔ لہذا انہوں نے خدائی حدود کے تحفظ اور اپنے مہمانوں کے ناموس کی خاطر وہ بات بھی برداشت کر لی جس کو جواز کے باوجود وہ بہ اختیار برداشت نہ فرماتے اور یہ بات کہی کہ تم میری لڑکیوں سے نکاح کر سکتے ہو یہ ایک شرعی راستہ ہے لیکن ایک حرام فعل کا ارتکاب اور وہ بھی میرے گھر پر پھر وہ بھی اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس پر ان کی جاہل قوم نے جو فواحش کے خوگر انسانوں کا للہ.....

۱۔ اگر یہاں لفظ بنات سے مراد بنات قوم لی جائے تو بے شبہ اس مجازی معنی کا استعمال خلاف محاورہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر پہلے یہ غور کر لینا ضروری ہوگا کہ نبی کی معنوی ابوت کے لحاظ سے عرف قرآن میں کہیں امت کی لڑکیوں پر نبی کی زبان سے ”بناتی“ کا اطلاق ہوا ہے؟ اس وقت ہمارے ذہن میں تو کوئی ایسی آیت نہیں آتی۔ دوم جب اخوت اسلامی کے لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زوجہ کو ”ہذہ اختی“ کہنا ایک کذب کی برابر سمجھا ہو تو پھر بالکل اجنبی عورتوں کو کسی معنوی رشتہ سے ”بنات“ کہہ کر پکارنا انبیاء علیہم السلام کے عرف میں کہاں تک قرین قیاس ہو سکتا ہے۔ سوم ”بناتی“ میں خاص اپنی طرف نسبت کرنے سے جس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے اس کا کوئی نکتہ بھی بیان کرنا ضروری ہوگا بالخصوص جب کہ وہ عورتیں کافرہ تھیں۔ چہارم یہ کہ قرآن کریم نے کفر کے ساتھ جب اپنے نسب عزیز کو ”ان ابنی من اہلی“ کہنے کی اجازت نہیں دی بلکہ صاف ”اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَہْلِکَ“ فرما دیا تو پھر جن کافرہ عورتوں کے ساتھ نسب کوئی رشتہ بھی نہ ہو ان کو ”بناتی“ کا پیارا کلمہ کہنا کہاں تک جائز ہوگا۔ کیا ان کافروں کی اولاد پر جو نبی کی فضیحت کے لیے چڑھ آئے تھے اپنے اس معنوی رشتہ کے اظہار کا یہی محل رہ گیا تھا۔ پنجم اگر ان مجبور کن حالات میں بھی اپنی حقیقی بنات کی جائز پیشکش قابل اعتراض ہو سکتی تھی تو کیا دوسروں کی لڑکیوں کی پیشکش پھر وہ بھی اسی قابل اعتراض عنوان سے کچھ کم قابل اعتراض ہے کیا نبی کی شان کے یہ مناسب ہوگا کہ وہ اپنی بائالنے کے لیے اپنی امت کی لڑکیوں کی پیشکش کرے اور صرف ”بناتی“ کے ایک محبت آمیز کلمہ کی آڑ لے کر وہی بلا ان کے سر ڈالنے کا ارادہ کر لے۔ ہمارے نزدیک تو یہ پہلے سے بھی زیادہ ناموزوں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام پر اپنے مہمانوں کی اس فضیحت سے اخلاقی طور پر جو ناقابل برداشت دباؤ پڑ رہا تھا اس کا کچھ اندازہ ہی نہیں لگایا گیا کہ کن حالات میں یہ جائز کلمہ ان کی زبان سے نکلا تھا۔ ایک بے حیا، بد معاش اور مضبوط ٹولی کے ہجوم کے سامنے تہذیب و آداب اور مروت ←



مِنْ اِبْرَاهِيمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُحْيِيْ ۖ یہ سوال انہوں نے ازراہ شک کیا ہوتا جب کہ عرض کیا تھا۔ میرے

للہ..... جواب ہوا کرتا ہے وہی جواب دے دیا اب حضرت لوط علیہ السلام کی اس بے چارگی اور قوم کی اس سرکشی اور فاسد ارادوں کا نقشہ سامنے رکھیے اور اندازہ لگائیے کہ یہ سماں دیکھ کر ایک با عصمت نبی کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی آپ کے دل کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبیانہ اخوت کے سامنے جب یہ نقشہ آیا تو آپ پر اس گزشتہ مصیبت کی ایک تازہ واقعہ کی طرح چوٹ لگی۔ اور بڑے درد کے انداز میں فرمایا: الہی میرے بھائی لوط پر بڑی رحمتیں نازل فرما کہ قوم کی نالائقیوں اور ایذاؤں سے شک آ کر انہیں ان کلمات کے کہنے کی نوبت آگئی جو فطرت بشری سے بدرجہ مجبوری نکلا کرتے ہیں۔ یعنی کاش اس معصیت و فحیحت کا نقشہ بدلنے کی طاقت خود میرے دست و بازو میں ہوتی یا میرا کوئی زوردار قبیلہ ہوتا تو ان نانبجاریوں کو مناسب سزا دی جاسکتی۔ انبیاء علیہم السلام کے مخلصانہ اور عاجزانہ کلمات کبھی خالی نہیں جاتے لہذا ان کی یہ آواز بھی آسمانوں پر سنی گئی اور اسی دن کے بعد سے سنۃ الہیہ یہی ٹھہر گئی کہ جب کوئی نبی آتا تو ہمیشہ مضبوط قبیلہ کا آتا۔

انسان کا خاصہ ہے کہ جب وہ طرح طرح کی ایذاؤں اور مصائب کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے صبر کے لیے اس قسم کے گزشتہ واقعات کا تصور بڑا تسلی بخش ہوتا ہے اس لیے جب آپ بھی مصائب و آلام کے اسی دور سے گزر رہے تھے تو ایک مرتبہ آپ کو اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یاد بے ساختہ آگئی پھر کیا تھا ان کی عظمت شان بیان کرنے کا گویا پھر ایک بہانہ مل گیا اس لیے فرمایا رحمہ اللہ موسیٰ لقد اودى اکثر من ذلک فصبر۔ خدا تعالیٰ میرے بھائی موسیٰ پر رحمتیں نازل فرما بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں اور ان مصائب سے بھی زیادہ شدید مصیبتیں جھیلیں مگر انہوں نے صبر ہی کیا۔

آپ نے دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب بھی اپنے بھائیوں کے شداوند کا نقشہ آیا تو ہمیشہ ان کے حق میں بزرگی اور دعاء کے کلمات ہی نکلے اور ہر ہر موقع پر اپنی فروتنی اور تواضع کا ہی اظہار ہوتا رہا اور کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ سالوں ایک گھاٹی میں بے آب و گیاہ قید رہنے کی حالت میں یا طائف کے میدانوں میں خون سے رنگین ہو جانے یا سر کے زخمی اور دندان مبارک کے شہید ہو جانے کے بعد بھی دوسرے انبیاء علیہم السلام کے بالمقابل کبھی یہ کلمہ زبان پر آیا ہو کہ ان مصائب پر جس طرح میں نے صبر کیا مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں کیا۔ تیسرا جملہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ تھا آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان بڑی ہوتی ہے مگر ان کی باز پرس بھی بڑی ہوتی ہے ان سے مواخذہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ایک بار یہ کلمہ نکل گیا ”انا اعلم“ اس وقت سب سے زیادہ علم مجھ کو ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی وقت سے زیادہ علم اور کس کو ہو سکتا ہے مگر ان کا یہ کلمہ بھی گرفت میں آ گیا حتیٰ کہ اس للہ.....

← کی تجاویز پیش کرنے کا وقت تھا یا کسی بھی صورت سے اپنے معزز مہمانوں کی آبرو بچالینے کا مرحلہ تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ”بنات“ کے مجازی معنی اختیار کرنے کے لیے اگر صرف یہی عقلی اعتراض داعی ہوا ہے تو اس کی کوئی معقول وجہ اب تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکی۔ مفسرین میں سے جن بعض حضرات نے اس مجاز کو استعمال کیا ہے اس کی وجہ اور ہے یہ عقلی شبہ نہیں ہے۔ زیادہ تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

۱۔ جن صاحبان نے ”رُكْنٍ شَدِيدٍ“ سے یہاں اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لی ہے انہوں نے قرآنی آیت ”اَوَاوِیْ اِلَیْ رُكْنٍ شَدِيدٍ“ میں او حرف تردید پر غور نہیں کیا اور صحیح بخاری کی ایک لفظ کی مراد بھی خود اسی معنی کی مؤید سمجھ لی ہے حالانکہ اس روایت کا مطلب بھی دوسرا ہے۔ ابن حزم نے مل و نخل میں لکھا ہے کہ اس سے مراد ملائکہ اللہ ہیں۔

الْمَوْتِ وَيَرْحَمُ اللَّهُ لَوْ طَا لَقَدْ كَانَ يَأْوِي پروردگار دکھلا دے تو مردہ کیسے زندہ کرتا ہے؟ خدا تعالیٰ لوط علیہ السلام پر

ﷺ کی سرگزشت سورۃ الکہف میں مستقلاً بیان کی گئی جو تاقیامت تلاوت کرنے والوں کی زبانوں پر تازہ ہوتی رہے گی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی زبان مبارک سے اپنی بی بی کے متعلق ایک نازک سے نازک وقت میں ”ہذہ اختی“ کا کلمہ نکل گیا مگر وہ ہمیشہ اس پر اتنے نادم رہے کہ محشر تک بھی زبان سے اس کی تلخی نہ گئی آخر جب اہل محشر ان سے شفاعت کے لیے عرض کریں گے تو اپنے اسی قسم کے کلمات یاد کر کے فرط مذامت سے اپنا سر جھکا لیں گے اور فرمائیں گے کہ میں اس بلند مقام کا اہل نہیں۔ پس اس طرح لفظی گرفت اور اپنی ذرا سی بات پر اس طرح ندامت صرف اسی مقدس گروہ کا خاصہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کا مقام گو کتنا ہی بلند ہو مگر بشریت پھر ان سے الگ نہیں ہوتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی جب زنان مصر کی دعوت کا ہوش رہا منظر آیا اور جیل خانہ کی سخت ہمکنی بھی ان کے کانوں نے سنی اور ان کو یہ یقین دلایا گیا کہ اب تمہارے لیے صرف دو ہی راستے ہیں یا ان کی دعوت کو قبول کرو یا پھر جیل خانہ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اب انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا اندازہ آپ یہاں سے فرمالیجئے کہ نو جوانی کے عالم میں سامنے سے حسن اپنی پوری شوکت و طاقت کے ساتھ خود دعوت دے رہا ہے مگر نبیانہ عصمت ہے کہ پہاڑ کی طرح ذرا متزلزل نہیں ہوتی اور جواب صرف یہ ہے کہ اگر میرے لیے راہیں صرف یہی دو ہیں تو مجھ کو اپنی عصمت کے مقابلہ میں جیل خانہ اختیار کر لینا بخوشی پسند ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ جواب زنان مصر کے سامنے تو ایک نبی کا نہیں فرشتہ کا جواب تھا، لیکن چونکہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی نظر اپنے رب کی طرف اٹھی ہوئی تھی جس نے ان کی تربیت نبیانہ تربیت فرمائی تھی اس لیے یہ بلند جواب بھی گرفت میں آ گیا رَبِّ السَّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ (پروردگار! جس بات کی دعوت یہ عورتیں مجھ کو دے رہی ہیں اس کے مقابلہ میں قید میں جانا میرے نزدیک قابل ترجیح ہے۔ ان مفسرین کا خیال یہ ہے کہ جب معاملہ پروردگار کے سامنے آ گیا تھا تو اب یہاں ایک تیسرا راستہ اور بھی تھا اور وہ پوری عافیت تھی یعنی نہ ان کی دعوت کو لبیک کہنا پڑے اور نہ جیل خانہ کی مصیبت سہنی پڑے۔ رب کے سامنے نہ یہ مشکل ہے نہ وہ مشکل ہے اس قسم کی گرفتیں صرف انبیاء علیہم السلام ہی کے ساتھ ہوتی ہیں اور ان کا مقصد ان کے منصب کی بلندی اور نزاکت کا اظہار اور عام انسانوں کو یہ سبق دینا ہے کہ ضعیف انسان کو کسی موقع پر بھی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالنا چاہیے جو اس کے ضعف بشری کے مناسب نہ ہو بلکہ اپنے پروردگار سے ہر حالت میں عافیت ہی عافیت طلب کرنی چاہیے انسان کی استقامت کتنی ہی مضبوط ہو مگر اس کو آزمائش میں ڈالنا کیا ضرور۔ یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کی شان ہے کہ جتنی آزمائشوں میں وہ پھنستے ہیں اتنے ہی اور کھرے ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کلمہ کو بھی جس صداقت کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے منہ سے نکالا تھا پھر آخر دم تک اسی مضبوطی کے ساتھ اس کو نباہا بھی حتیٰ کہ جب ان کو رہائی کی خبر ملی تو جلدی سے فوراً اس طرح باہر نہیں آ گئے کہ پہلے جو بات ان کے منہ سے نکل گئی تھی گویا وہ بے سوچے سمجھے نکل گئی تھی یا صرف وقتی جذبات تھے جس پر بعد میں ان کو ندامت ہو سکتی تھی بلکہ بڑی استقامت کے ساتھ فرمایا کہ تم رہائی کا حکم لے کر آئے ہو مگر جس نے اپنی خوشی سے جیل خانہ پسند کیا تھا وہ اس وقت تک اپنی رہائی پسند نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے سر تہمت رکھنے والی عورتیں خود بھی اس کے بے گناہی کا اعتراف نہ کر لیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ نبی کی زبان سے جو کلمہ نکل گیا تھا وہ اس کے قلب کی کس گہرائی سے نکلا تھا اور آخر تک کس شان کے ساتھ اس کو نباہا گیا۔ یہ شان انبیاء علیہم السلام ہے، مگر سنت اللہ یہاں بھی پوری ہو کر رہی۔ آخر ان کے الفاظ کے جو آثار ہونے لگے وہ نمایاں ہو کر رہے یہ شان الہی تھی یہ دونوں شانیں اپنی اپنی جگہ قابل داد ہیں اور عام انسانوں کی زندگی کے لیے اہم اسباق ہیں۔ اس کے پڑھنے کے لیے ﷺ.....



إِلَى رُكْنٍ شَدِيدٍ وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السَّجْنِ طُولَ رَحْمَتِ نَازِلٍ فَرَمَائِهِ وَهِيَ كَيْسِي أَوْ أَرَاكَ كَيْسِي فِي حَضْرَتِ يَوْسُفَ كَيْ بَرَامَتِ تَك

للہ..... ان کے اوراقِ زندگی متحمل نہیں یہ صرف انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی جگہ قابلِ داد ہیں اور عام انسانوں کی زندگی کے لیے اہم اسباق ہیں۔ اس کے پڑھنے کے لیے ان کے اوراقِ زندگی متحمل نہیں یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کے صحیفہ حیات میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ اس عمیق اور نازک پہلو کو بعض مفکرین نے نہیں سمجھا اور صرف یہ کہہ کر ان مفسرین پر رد کرنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کا معاملہ ان مفسرین کے نزدیک گویا صرف ان کی اپنی بدشگونی اور بدفالی کا نتیجہ تھا حالانکہ ان مفسرین کے سامنے اس قسم کی گرفتوں کا ایک پورا باب ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ایک بات جو دو انسانوں کے مابین کتنی بھی معقول سے معقول سمجھی جائے لیکن جب وہی بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان آجائے تو پھر ضروری نہیں کہ اسی درجہ میں معقول ثابت ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر سوال و جواب کیے تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو اتنا معقول جواب دیا کہ آخر ان کو خاموش ہو جانا پڑا۔ لیکن جب یہی سوال ان سے پروردگار نے فرمایا تو حضرت آدم علیہ السلام جواب کا ایک حرف زبان پر نہ لاسکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب اپنے بھائی یوسف کی اس مصیبت کا نقشہ آیا تو آپ ان کی داد دینے کے لیے یہاں بھی فوراً بے تاب ہو گئے اور صرف اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ ان کی عزت و احترام کی خاطر تواضع کے ہی کلمات اپنے حق میں استعمال فرما سکتے تھے وہ استعمال فرمالیے۔ یہ ہے اخوتِ نبوت کہ سر پر سرداری کا تاج رکھا ہوا ہے مگر یوں نظر آتا ہے کہ آپ اپنے بھائیوں پر فوقیت کے جذبات سے اتنے خالی ہیں گویا ادھر التفات ہی نہیں ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ ساری داستان صرف ایک ایسے خواب ہی کی بدولت تو پھیلی تھی جس سے ان کی برتری ظاہر ہوتی تھی مگر آپ کی شان یہاں بالکل جدا تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کامل کا کمال جتنا بڑھتا جاتا ہے اس کی شان تواضع اتنی ہی اور بڑھتی چلی جاتی ہے اس کے انکسار و تواضع کے کلمات اس کے نقص کا موجب نہیں ہوتے بلکہ اور اس کے کمال کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے مصائب کا نقشہ بار بار آپ کے سامنے آنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوگی کہ قرآن کریم نے خاص طور پر آپ سے خطاب فرمایا تھا فاصبر کما صبر اولو العزم من الرسل۔ یعنی جس طرح سب اولو العزم رسول ہمیشہ صبر کرتے چلے آئے ہیں اسی طرح تم بھی صبر پر قائم رہنا۔ پس چونکہ قرآن کریم ہی نے آپ کے صبر کے لیے انبیاء سابقین کا تصور آپ کے سامنے رکھا تھا اس لیے ہر ہر صبر آزمایا موقع پر آپ صبر فرماتے اور سابق انبیاء علیہم السلام کا اسوۂ صبر سامنے رکھتے جاتے اور جب یہ صورت حال حسب الاتفاق بیان میں آ جاتی تو ہر جگہ یوں معلوم ہوتا گویا آپ کی نظروں میں صبر کا پلہ ان ہی کا بھاری ہے۔

آپ کی اس شان تواضع و انکسار میں بڑا دخل اس کا بھی تھا کہ آپ کی فطرت میں عبدیت اس طرح گوندھی گئی تھی کہ آپ کی رفتار و گفتار نشست و برخاست غصہ و رضاء مقہوری اور اقتدار کی ہر ہر اداء میں وہ بے اختیار ٹپکتی نظر آتی تھی انبیاء علیہم السلام اپنی زبان سے جو نکالتے ہیں وہ صرف ان کے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ان کی فطرۃ کے ترجمان ہوتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ابھی آپ پڑھ چکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عبدیت کا تذکرہ عنقریب آپ اسی جلد میں پڑھنے والے ہیں پس ایک موقع پر آپ نے چونکہ عبدیت کو ملوکیت پر از خود ترجیح دے کر اپنے حق میں عبدیت ہی کو پسند فرمالیا تھا اور اس لیے پسند فرمایا تھا کہ یہ جو ہر روز ازل ہی سے آپ کی فطرت میں ودیعت فرما دیا گیا تھا اس لیے عمد و نسیان کے ہر ہر موقع پر اختیار و بے اختیار جو کلمات بھی آپ کی زبان مبارک سے نکلتے وہ للہ.....

مَا لَبِثَ يُوسُفُ لَاجِبُ الدَّاعِي.

(متفق علیہ وراجع ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۱۷)

الانبياء والرسل عليهم الصلوة والسلام

كلهم بشرو كلهم عبادا الله تجري

عليهم سنة الله ماتجري في سائر عبادہ

(۹۹۸) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ رَسُولَ

جیل خانہ میں قید رہتا اس کے بعد بادشاہ کی طرف سے میرے بلانے کے

لیے کوئی شخص آتا تو میں اس کے ساتھ ہولیتا۔ (متفق علیہ)

انبیاء علیہم السلام سب بشر تھے اور سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے

تھے اور اللہ تعالیٰ کی جو سنت نوع بشری کے لیے ٹھہر چکی ہے

وہ ہمیشہ ان پر بھی جاری ہوتی چلی آئی ہے

(۹۹۸) عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ

ﷺ ..... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت کے سچے گواہ ہوتے۔ اس لیے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات ہر موقع پر کسی خاص ارادہ یا خاص مصلحت ہی سے نکلا کرتے تھے بلکہ عربی کے محاورہ کا مصداق تھے (الاناء تیر شیخ بما فیہ) یعنی برتن سے وہی ٹپک ٹپک کر نکلتا ہے جو اس میں بھرا ہوا ہوتا ہے۔

اب آپ اس خاص صفت عبدیت کے پیش نظر سوچئے کہ ایک عبد کا نقشہ یہاں کیا ہونا چاہیے کیا یہی نہیں کہ جب اس کا آقا اس کو جیل خانہ میں بھیجے تو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ وہ جیل خانہ میں داخل ہو جائے اور جب اس کو باہر آنے کا حکم دے تو اسی طرح خوشی خوشی باہر نکل آئے۔ گویا قید و رہائی کے دونوں معاملے اپنے آقا کے حکم برداری کے سامنے اس کے لیے برابر ہوں۔ اگر آپ کا جواب آپ اس روشنی میں پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو فروتنی کے جملے یہاں آپ کے دہن مبارک سے نکلے رہے تھے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برتری کے سب سے کھلی دلیل تھے۔

آپ نے اس حدیث میں اور اس سے پہلی حدیث میں پانچ مشہور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آپ کی اخوة نبوت ملاحظہ فرمائی۔ اب چند اور واقعات بھی ترجمان السنۃ کے ان صفحات پر ضرور ملاحظہ فرمالیجئے: ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۳۱۸ تا ۳۲۳۔ امید ہے کہ اخوة نبوت کا مفہوم اور اس کی اہمیت ذہن نشین کرنے کے لیے یہ واقعات آپ کے لیے کافی ہوں گے۔ اور اس کے بعد ان احادیث میں جو سوال و جواب کیے گئے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی کوئی ضرورت بھی نہ رہے گی۔ اگر ان احادیث پر نظر کرنے کے وقت اس طرف بھی خیال کر لیا جاتا کہ یہ الفاظ کن تاثرات کے ماتحت تھے تو ان کی تاویل کی بجائے یہ روشن ہو جانا کہ اخوت نبوت کے ہوتے ہوئے ان الفاظ کے اداء کیے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا۔

(۹۹۸) \* انبیاء و رسل علیہم الصلوۃ والسلام کی بشریت کا مسئلہ کوئی حدیثی مسئلہ نہیں بلکہ قرآنی مسئلہ ہے اس نے ان کی بشریت کو جا بجا مسلمات اور بدیہیات کی طرح پیش کیا ہے۔ قاضی عیاض مالکی نے جو تو قیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑا بلند مذاق رکھتے ہیں اپنی تصنیف ”الشفاء“ میں مسئلہ عصمت پر بحث کرتے ہوئے آخر میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ رسول یقیناً معصوم ہوتے ہیں مگر بشریت سے معصوم نہیں ہوتے وہ بشر کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور انسانی زندگی کے جملہ ادوار طفلی، شباب اور شیخوخت سب سے عبور کرتے ہوئے آخر میں ہمیشہ کے لیے اسی طرح زمین میں جا کر مدفون ہو جاتے ہیں جیسا جنس بشری ہمیشہ سے مدفون ہوتی چلی آئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت عام انسانوں کے برخلاف صرف ایک صنف عورت سے ہوئی تھی بس اتنی سی بات سے نصاریٰ نے ان کا رشتہ عالم بشر سے کاٹ کر خالق بشر کے ساتھ جا جوڑا۔ مگر یہاں قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے لیے تو نہ والد تھے نہ والدہ جب وہ ﷺ .....



اللّٰهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم صَلَّی الظُّهْرُ ..... بشر ہی رہے بلکہ ابوالبشر تو یہاں عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تو تھیں۔ تعجب ہے کہ جن کی والدہ ماجدہ بھی تھیں اور والد ماجد بھی پھر ان کی بشریت سے انکار کی جرأت کیونکر ہو جاتی ہے۔ لیکن انسان کی عقل پر جب ابواء و خواہشات کے حجابات پڑ جاتے ہیں تو وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کا بھی انکار کرنے لگتا ہے اور اتنا بھی نہیں سوچتا کہ جب تمام مخلوقات میں بشر ہی سب سے افضل اور سب سے اشرف مخلوق ہے تو پھر رسولوں کی بشریت کا انکار کر کے وہ ان کو آخر اور کس مخلوق میں شامل کرے گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خالق کی جانب میں تو کسی امر میں بھی شرکت کی گنجائش نہیں نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں۔ پھر خالق سے ہٹ کر مخلوق ہی کا دائرہ ہے۔ اس میں سب سے افضل و اشرف یہی نوع انسانی ہے اسی کو قدرت نے اپنی خلافت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام کی بشریت سے انکار صرف قرآن و حدیث کا انکار نہیں اپنے مشاہدہ کا بھی انکار ہے بلکہ اس مقدس گروہ کی سب سے بڑی فضیلت کا انکار ہے۔ تعجب ہے کہ انسان نے مسجود ملائک ہونے کے بعد بھی اپنی شرافت کو نہیں سمجھا اور تاج خلافت کے بعد بھی اپنی قدر نہیں پہچانی اگر وہ اسی کی حقیقت سمجھتا تو رسولوں کو بشر کہنا اس کو ہرگز بار نہ گذرتا۔ اس کے برعکس یہاں دوسرا طبقہ وہ ہے کہ جب وہ بشریت کا قائل ہو تو اس نے رسولوں کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں اس طرح سمجھ لیا کہ پھر ان کے حق میں کسی امتیاز کا قائل ہونا ان کے نزدیک گویا ان کی بشریت ہی کے انکار کے مرادف بن گیا اس لیے اس بدیہی مسئلہ کی تفہیم کے لیے مجبوراً ہمیں یہ لکھنا پڑتا ہے کہ عالم میں قدرت نے مختلف انواع اور انواع میں مختلف اصناف پھر اصناف میں مختلف استعداد کے افراد پیدا فرمائے ہیں دیکھئے جمادات نباتات حیوانات اور انسان۔ یہ مختلف انواع ہیں۔ اور ہر عاقل جانتا ہے کہ ان انواع میں کتنا فرق ہے جمادات بالکل بے حس و شعور نظر آتے ہیں نباتات یہاں کچھ ان سے پیش گام ہیں اور حیوانات کچھ کچھ ادراک و علم سے بھی فیضیاب معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ جب آخری نوع کا نمبر آتا ہے تو اس کے شعور و حس، علم و ادراک کے سامنے دوسری انواع ایک ذرہ بے مقدار نظر آتی ہیں مگر کیا اس کی اس برتری کی وجہ سے دوسری انواع کے ساتھ اس کی مخلوقیت میں شرکت سے کوئی شخص انکار کر سکتا ہے؟ اسی طرح اب اگر اصناف برابر ہیں ان میں باہم کوئی تفاضل نہیں۔ اسی طرح اب اگر ہر صنف کے افراد پر غور کرو تو ہر صنف کے افراد میں بھی فضل و قیمت کا اتنا بڑا تفاوت نظر آئے گا کہ اس کا ضبط و احصاء مشکل ہے لعل و جواہرات کی قیمتوں کے تفاوت پر غور کرو۔ اسی طرح حیوانات میں گھوڑے کی صنف کے افراد کی قیمتوں پر غور کرو تو تم کو یہاں فضیلت کے اتنے درجات نظر آئیں گے کہ صنفی اشتراک کے بعد بھی ان میں گویا کوئی اشتراک ہی نہیں ہے۔ اسی طرح نوع انسانی کا حال ہے بلکہ یہ نوع جتنی شریف تر ہے اس کے افراد میں تفاوت بھی اتنا ہی بے اندازہ ہے۔ کافر بھی انسان ہی کا فرد ہے اور مسلم بھی پھر مقبولین کے افراد کو اگر مجملہ ضبط کرو تو قرآن کریم کے الفاظ میں وہ چار طائفہ ہیں انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین۔ ان کے مابین فضائل و کمالات میں بے اندازہ تفاوت ہے پھر یہی حال ان میں سے ہر طائفہ کا ہے۔ اس لیے کسی صنف یا نوع کے افراد میں ان کے باہم تفاضل کا انکار کرنا نہ تو یہ حقیقت پر مبنی ہے اور نہ ان کے تفاضل کا اقرار کر کے ان کے صنفی یا نوعی اشتراک کا انکار کرنا یہ علم کی بات ہے۔

واضح رہے کہ بشر گو اضعف المخلوقات ہے مگر اس میں ترقی و عروج کی اتنی عظیم صلاحیت موجود ہے کہ ایک انسان ترقی کرتے کرتے ایسے عالی سے عالی مقام تک بھی رسائی حاصل کر لیتا ہے جہاں مقرب سے مقرب ملک بھی جانے کی طاقت نہیں رکھتا شبہ لعلہ.....

مَآذَاكَ قَالُوا صَلَّيْتَ خَمْسًا فَسَجَدَ سَجْدًا انہوں نے عرض کیا، آج آپ نے پانچ رکعتیں ادا فرمائی ہیں۔ یہ سن کر تین بعد ما سلم و فی رواۃ قال إنما أنا بشر آپ نے سلام کے بعد سہو کے لیے دو سجدے کیے اور ایک روایت میں ہے

للہ ..... معراج کے سارے سفر میں حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے لیکن ایک موقعہ ایسا بھی آیا جہاں سے آگے تجاوز کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور جب ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفاقت ترک کرنے کی وجہ دریافت فرمائی تو بڑے خوف کے انداز میں اتنا ہی عرض کر سکے۔

اگر ایک سرموئے برتر پر دم فروغ تجلی بسوزد پر دم

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سب کے لیے بس اپنا ایک ایک مقام مقرر ہے۔ اس لیے اگر میں یہاں سے ایک بال بھر بھی آگے پرواز کروں تو تجلی ربانی میرے بال و پر سب سوخت کر دے۔ اس تجلی کی تاب و طاقت تھی تو ایک بشر ہی میں تھی آخر وہی آگے بڑھا اور صرف آگے ہی نہیں بلکہ منازل قرب طے کرتے کرتے وہاں جا پہنچا جہاں کا نقشہ اگر الفاظ میں کچھ اداء ہو سکتا ہے تو فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ ہے اور ابھی اسی پر بس نہیں ہوئی بلکہ اس میں ”أَوْ أَدْنَى“ کی گنجائش اور نکل آئی پھر اس کی حد کیا تھی۔ یہاں پہنچ کر قرآن کریم نے بھی سکوت اختیار کر لیا ہے۔ پھر کس کی مجال ہے کہ اس کے بعد لب کشائی کر سکے ع

قلم اینجار سید و سر بشکست

مگر کیا ان مدارج قرب کے بعد بشر مخلوقیت کے دائرہ سے ایک قدم بھی باہر نکل سکا نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔ چنانچہ وہی بشر جو قرب کے اتنے منازل طے کر چکا تھا جب پھر واپس ہوا تو اس پر بشریت کی قباء پہلے سے زیادہ مزین تھی اور اس عظیم الشان قرب کے بعد جو انعام ساتھ لایا وہ عبادت کا خاص طریقہ اور عبدیت کی ایک نرالی شان تھی۔ ہجرت سے پہلے پہلے ان سارے کمالات سے اس کو نوازا گیا اور ہجرت کے بعد تا وفات اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں جس امر کا اس نے مظاہرہ کیا وہ سر تا پا عبدیت ہی عبدیت تھی۔ شیخ اکبر لکھتے ہیں کہ مقام عبدیت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص مقام ہے ایک مرتبہ مجھ پر سوئی کے ناکہ کی برابر منکشف ہوا تھا تو میں اس کی بھی تاب نہ لا سکا اور قریب تھا کہ جل گیا ہوتا۔ سبحان اللہ جہاں جبریل علیہ السلام قدم نہ اٹھا سکے وہاں شیخ اکبر کے قدم کیا سنہلتے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تحریر فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں عبد اللہ بطور لقب صرف دو نبیوں کی شان میں آیا ہے ایک عیسیٰ علیہ السلام کے اور دوسری ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ولادت کے بعد جو پہلا کلمہ زبان سے نکالا وہ یہ تھا ﴿اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ﴾ (کسی شبہ و تردد کے بغیر میں اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ ہوں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَلَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَاذًا وَّ اَيْكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبْدًا﴾ (الجن: ۱۹) دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں عبد اللہ کا لقب اپنے حق میں خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے استعمال کیا ہے اور یہاں اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں خود حق تعالیٰ نے استعمال فرمایا ہے چنانچہ اسراء کا ذکر شروع فرماتے ہوئے ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ﴾ میں آپ کی اسی صفت عبدیت کو ذکر کیا ہے بلکہ اس کو خاص طور پر اپنی طرف منسوب کر کے اور مشرف و مکرم بنا دیا ہے پس معراج کا ثمرہ یہ نہیں تھا کہ آپ کی بشریت کی قباء اتار کر آپ کو کوئی دوسری قباء پہنا دی گئی تھی بلکہ اسی کی اور تکمیل کی گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مولیٰ کی نوازش جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے عبد کی عبدیت میں اتنا ہی اور اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے جس فریق نے انبیاء علیہم السلام کے امتیازات اور فضائل کا باب پڑھ کر ان کے بشر ہونے کا ہی انکار کر ڈالا وہ بھی تاریکی میں للہ .....



مِثْلُكُمْ أَنْسَى كَمَا تَنْسُونَ فَإِذَا نَسِيتُمْ  
فَذَكِّرُونِي وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ  
فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْيَتِمَّ عَلَيْهِ ثُمَّ لْيُسَلِّمْ ثُمَّ  
لْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ .

(متفق علیہ)

(۹۹۹) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْصِفُ نَعْلَهُ وَيَخِيطُ  
ثَوْبَهُ وَيَعْمَلُ كَمَا يَعْمَلُ أَحَدُكُمْ فِي بَيْتِهِ وَ

کہ یہ فرمایا میں بھی ایک بشر ہوں جیسے تم بشر ہو اور بھول بھی جاتا ہوں جیسا تم  
بھول جاتے ہو اس لیے جب میں بھولا کروں تو مجھے یاد دلادیا کرو اور ایک مسئلہ  
یہ اور سن لو کہ جب تم کو نماز میں شک پیش آ جائے تو پہلے کسی ٹھیک بات پر اپنی  
رائے جمانے کی کوشش کرو پھر اسی کے مطابق اپنی نماز پوری کر لو پھر سلام پھیر کر  
سہو کے دو سجدے کر لیا کرو۔ (متفق علیہ)

(۹۹۹) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی  
اللہ علیہ وسلم اپنے چپل کو خود درست فرمایا کرتے اپنے کپڑے خود سی لیتے  
اور اپنے گھر میں اسی طرح سب کام کاج کر لیا کرتے تھے جیسا تم سب لوگ

اللہ..... ہے اور جس نے ان کی بشریت کا اقرار کر کے ان کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ وہ بھی مقام رسالت سے  
بڑا بے بہرہ رہا۔ انبیاء علیہم السلام کا ٹھیک مقام یہ ہے کہ وہ بشر ہوتے ہیں بلکہ سید البشر ہوتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کے رسول بشر نہ ہوتے تو  
نوع بشری کے لیے کوئی فضیلت ہی نہ ہوتی بلکہ وہ اسفل السافلین میں پڑی ہوئی نظر آتی۔ سورہ والتین کے شروع میں چار بڑی نبوتوں کا  
تذکرہ فرما کر انسان کا احسن تقویم پر ہونا اس لیے بیان فرمایا گیا ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی انسان کی اس فضیلت کا ثبوت ملتا ہے ورنہ عام  
انسان جو نہ تو ایمان سے آشنا ہیں نہ عمل صالح سے ان کا رتبہ خس و خاشاک سے بھی بدتر ہے۔ ان کو دیکھ کر کون باور کر سکتا ہے کہ انسان سب  
سے اشرف مخلوق ہو سکتی ہے۔ جس کو زندگی کے باہم تعلقات میں محارم وغیرہ محارم حلال و حرام دُعاء و فریب قتل و غارت عریانی و ستر حتی  
کہ بول و براز تک کی تمیز نہ ہو کیا وہ انسان ہے جس کو دیکھ کر اشرف المخلوقات کہا جاسکتا ہے۔ معیشت و معاشرت کی یہ سب اصلاحیں صنف  
بشری میں صرف ان بشر کے ذریعہ ہوتی ہیں جو رسول کہلاتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ترجمان السنۃ جلد اول میں ”اسلام میں رسول کا تصور“ کا  
مضمون دیکھئے۔

(۹۹۹) \* یہ بات بڑی اہمیت کے ساتھ یاد رکھنی چاہیے کہ ہر انسان کی بیرونی اور اندرونی زندگی میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے خواہ  
وہ کتنا ہی بلند انسان کیوں نہ ہو بلکہ اس کی اندرونی زندگی میں ایک نہ ایک گوشہ ضرور ایسا ہوتا ہے جو خود اس کی نظروں میں بھی اس کی کمزوری  
کا ثبوت ہوتا ہے اسی لیے وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی اندرونی زندگی کا ہر گوشہ باہر آ جائے لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان بشریت بھی  
عجیب در عجیب ہوتی ہے ان کی ان دونوں حالتوں میں ذرا فرق نہیں ہوتا بلکہ ان کی اندرونی زندگی بھی اسی طرح شریعت کا ایک جزء ہوتی  
ہے جیسا کہ بیرونی زندگی اور اسی مقصد کے پیش نظر ازواج کی کثرت ان کے حق میں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہوتی ہے۔ انسانی معیشت کی  
خوبی یہ ہے کہ اس کو اپنے گھر کے کسی کام سے بھی عار نہ ہو وہ ایک طرف گھر کا آقا بھی ہو اور دوسری طرف اپنی ہر ضرورت کو بے تکلف خود بھی  
انجام دے لیتا ہو۔ جو تین کام یہاں حدیث میں مذکور ہیں گو یہ بہت معمولی سے ہیں مگر انسان کی نفسی بشریت کے ثبوت کے لیے بہت اہم  
ہیں صرف صورت کے بشر تو بہت ہوتے ہیں لیکن جو سیرت میں بھی بشر ہوں وہ کم ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ معمولی اعمال آپ  
کی بشریت کی تکمیل کے لیے نہ تھے بلکہ جس کامل بشریت کے آپ مالک تھے ان کے طبعی آثار تھے۔ اللہ.....

قَالَتْ كَانَ بَشَرًا مِّنَ الْبَشَرِ يَفْلِي ثَوْبَهُ وَ يَحْلُبُ شَاتَهُ وَيَخْدُمُ نَفْسَهُ. (رواہ الترمذی)

کر لیتے ہو اور فرماتی تھیں آپ بھی ایک بشر ہی تھے اپنے کپڑوں کی جوئیں تلاش کر لیتے۔ اپنی بکری کا دودھ نکال لیتے اور اپنی ضروریات کو خود انجام دے لیتے۔ (ترمذی)

(۱۰۰۰) عَنْ خَارِجَةَ بِنِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ دَخَلَ نَفَرٌ عَلَى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَقَالُوا لَهُ حَدِّثْنَا أَحَادِيثَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ جَارَهُ فَكَانَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ بَعَثَ إِلَى فُكَيْتَتِهِ لَهُ فَكَانَ إِذَا ذَكَرْنَا الدُّنْيَا ذَكَرَهَا مَعَنَا وَإِذَا ذَكَرْنَا الْآخِرَةَ ذَكَرَهَا مَعَنَا وَإِذَا ذَكَرْنَا الطَّعَامَ ذَكَرَهُ مَعَنَا فَكُلُّ هَذَا أَحَدٌ تُكْمَلُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواہ الترمذی)

(۱۰۰۰) خارجہ روایت کرتے ہیں کہ چند لوگ ان کے والد حضرت زید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ باتیں سنا دیجئے۔ انہوں نے فرمایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوسی تھا۔ جب آپ پر وحی آتی تو آپ مجھے بلا بھیجتے میں جا کر لکھ دیتا تھا اور جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو جاتے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ آخرت کا ذکر فرمانے لگتے۔ پھر جب ہم کھانے پینے کا تذکرہ کرتے تو آپ اس میں بھی شریک رہتے۔ یہ ساری باتیں میں تم سے آپ ہی کی باتیں بیان کر رہا ہوں۔ (ترمذی شریف)

اللہ..... حدیث مذکور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسولوں کا کمال یہ نہیں ہوتا کہ وہ راہبوں کی طرح ایک راہب بن جائیں بلکہ ان کے دنیوی مشاغل بھی ان کی عبادت ہی کی ایک دوسری شکل ہوتے ہیں۔ اگر رسول بشر نہ ہوتے تو ان کی عبادت بھی فرشتوں کی طرح صرف تسبیح و تقدیس میں منحصر ہو کر رہ جاتی لیکن چونکہ وہ بشر ہوتے ہیں اس لیے ان کی عبادت کی ایک مستقل نوع وہ ہے جس سے خدا تعالیٰ کے مقدس فرشتے یکسر نا آشنا ہیں یعنی خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوق سے تمتع حاصل کرنا مگر شرعی حدود میں رہ کر۔ پیٹ بھر لینا اور اسی طرح جملہ طبعی حاجات پوری کر لینا تو ایک عام بات ہے لیکن کس طریق پر ان کو پورا کرنا اور کس حد تک پورا کرنا حرام طریقوں سے اعراض کرنا اور اپنی حدود سے تجاوز نہ کرنا یہ ضعیف اور محتاج بشر کی وہ عبادت ہے جس کا مقابلہ فرشتوں کی تسبیح و تقدیس نہیں کر سکتی۔ حدیث مذکور کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ صرف صورت کے بشر نہ تھے بلکہ سیرت کے بھی بشر تھے۔

(۱۰۰۰) \* اوپر کے نوٹ میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ دنیا کی معمولی باتوں میں شرکت کرنا بھی رسولوں کا ایک کمال ہے اور ایسا کمال ہے جس کی ہر بشر کو ضرورت ہے۔ زید بن ثابت نے اس سارے بیان میں یہ بتا دیا کہ رسول اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی باتیں سننے کے لیے تم کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تم اگر چاہو تو اپنے روزمرہ کے معمولی امور میں رسول اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یاد تازہ کر سکتے ہو۔ اگر حضرت زید چاہتے تو یہاں آپ کی عبادت کا دفتر کھول کر رکھ دیتے مگر ان کو اسی نکتہ پر متنبہ کرنا تھا کہ رسالت کی شان ترک دنیا نہیں ہوتی وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ ان کی دنیا میں بھی شریک ہوتے ہیں اور اسی ضمن میں دنیا کو دین بنادینے کی خوان میں پیدا کر دیتے ہیں ان کی دنیا ان کی آخرت سے کسی جگہ بھی علیحدہ نہیں ہوتی اور جب کسی کو دنیا آخرت سے علیحدہ ہونے لگتی ہے تو وہیں وہ سختی کے ساتھ ٹوک دیتے ہیں۔



(۱۰۰۱) عَنْ الْأَسْوَدِ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصْنَعُ فِي بَيْتِهِ قَالَتْ كَانَ يَكُونُ فِي مَهْنَةِ أَهْلِهِ تَعْنِي خِدْمَةَ أَهْلِهِ فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ.

(رواه البخاری. و فی مصنف عبدالرزاق کان

يُخَصِّفُ نَعْلَهُ وَ يَخِيطُ ثَوْبَهُ وَ يَعْمَلُ فِي بَيْتِهِ كَمَا يَعْمَلُ أَحَدُكُمْ فِي بَيْتِهِ)

(۱۰۰۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ دُعِيتُ إِلَى كُرَاعٍ لَا جَبْتُ وَ لَوْ أُهْدِيَ إِلَيَّ ذِرَاعٌ لَقَبِلْتُ.

(رواه البخاری راجع ترجمان السنہ ص

۳۷۵ ج ۲ و لا بد)

(۱۰۰۳) عَنْ أَبِي حَازِمٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّمَ رَجُلًا فَأَرْعَدَ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَوْنٌ

(۱۰۰۱) اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں آ کر کیا کیا کرتے تھے؟ فرمایا اپنے اہل خانہ کی ضروریات پوری فرماتے تھے مگر جہاں نماز کا وقت آتا بس اسی وقت نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔

(بخاری شریف)

(۱۰۰۲) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ مجھ کو اگر ذرا سے گوشت پر دعوت دی جائے تو میں اس کو بھی قبول کروں اور اگر میرے سامنے بکری کی ایک دست کا بھی ہدیہ پیش کیا جائے تو میں اس کو بھی قبول کروں گا۔

(رواہ البخاری)

(۱۰۰۳) ابو حازم روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کچھ بات کی تو وہ مارے خوف کے کانپنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میاں گھبراؤ مت میں کوئی بادشاہ تو نہیں، میں تو ایک قریشی

(۱۰۰۱) \* بس بشر کی یہی وہ دینا ہے جس کو عبادت بھی کہا جاتا ہے۔ گھر کا کاروبار نہ کرنا کچھ مشکل نہیں مگر اس کا رو بار کو چھوڑ کر خدائی عبادت کے لیے طبعی حاجات کی طرح بے تکلیف چل پڑنا بہت مشکل ہے۔ عبد کامل وہ ہے جو بندوں کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے مولیٰ کے حقوق بھی اور جب دونوں میں معاوضہ آ پڑے تو مولیٰ حقیقی کا حکم اس طرح بجالائے گویا اب اس کے سامنے کوئی دوسرا کام ہی نہ تھا۔ جس رسول اعظم کی تمام زندگی میں دنیا کے حقوق کی اس طرح ادائیگی اور آخرت کے فرائض کی یہ ترجیح ایک غیر متبدل دستور العمل نظر آتا ہو کیا اس کے کمال میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے۔

(۱۰۰۲) \* یہ وہ ہیں جنہوں نے وادی میں بھری ہوئی بکریاں لوگوں کو تقسیم کر دی ہیں اور خود دوسروں کے ذرا سے گوشت کی دعوت یا معمولی گوشت کے ٹکڑے کا ہدیہ قبول کرنے میں ذرا عار نہیں رکھتے۔ عبدیت معمولی دعویٰ نہیں اس کا امتحان زندگی کے ہر گوشہ میں ہوتا ہے۔ انسانی ضعف کے نازک مقامات اس کی حیات کے شاندار واقعات نہیں بلکہ روزمرہ کے معمولی واقعات ہیں جہاں اس کو یہ وسوسہ بھی نہیں گذرتا کہ میرے امتحان کے یہ بھی کوئی محل ہو سکتے ہیں۔ یہاں آپ ترجمان السنہ ص ۳۲۲ ج ۲ خاص طور پر ملاحظہ فرمائیے۔

(۱۰۰۳) \* بادشاہوں کے درباروں میں مخاطبوں پر جو رعب پڑتا ہے وہ ان کی شاہانہ سطوت و شوکت کا اثر ہوتا ہے اور یہاں اس کمال سادگی میں جو رعب تھا وہ آپ کی کمال عبدیت کا اثر تھا۔ جب عبدیت کامل ہو جاتی ہے تو اس کا رعب صرف عام انسانوں ہی تک محدود نہیں رہتا وہ بادشاہوں پر بھی پڑتا ہے بلکہ حیوانات پر بھی اس کا اثر پہنچتا ہے۔

عَلَيْكَ فَإِنِّي لَسْتُ بِمَلِكٍ إِنَّمَا أَنَا ابْنُ  
امْرَأَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ كَانَتْ تَأْكُلُ الْقَدِيدَ.  
(ابن جوزی)

(رواہ ابن الجوزی من طرق بعضها متصلًا عن ابن مسعود و جریر قال ابن الجوزی و روی متصلًا و الصواب ارسالہ)  
(۱۰۰۴) عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْكَبُ الْحِمَارَ وَ  
يَلْبَسُ الصُّوفَ وَ يُحِبُّ دَعْوَةَ الْمَمْلُوكِ  
وَ لَقَدْ رَأَيْتُهُ يَوْمَ خَيْبَرَ عَلَى حِمَارٍ خَطَامُهُ  
لَيْفٌ. (رواہ ابو داؤد الطيالسی)  
(۱۰۰۴) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم گدھے پر بھی سوار ہو جاتے، صوف کا بنا ہوا کپڑا بھی پہن لیتے اور  
غلام کی دعوت بھی قبول فرما لیتے۔ جنگ خیبر میں نے آپ کو ایک گدھے  
پر سوار دیکھا جس کی باگ کھجور کی چھال کی بنی ہوئی تھی۔  
(ابوداؤد طیالسی)

(۱۰۰۵) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُسْرِ قَالَ كَانَ لِلنَّبِيِّ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِصْعَةٌ يَحْمِلُهَا أَرْبَعَةُ  
رِجَالٍ يُقَالُ لَهَا الْغَرَاءُ فَلَمَّا أَضْحَوْا سَجَدُوا  
(۱۰۰۵) عبد اللہ بن بسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک اتنا بڑا پیالہ تھا جس کو چار آدمی اٹھا کر لاتے  
تھے اس کا نام غراء تھا۔ ایک مرتبہ جب لوگ چاشت کی نماز ادا کر کے حاضر

(۱۰۰۴) \* اللہ تعالیٰ جب کسی کی بشریت میں کمال عطا فرما دیتا ہے تو اس کی نظر لباس اور سواری جیسی معمولی اشیاء سے بلند فرما دیتا ہے  
وہ وقت و حاجت اور اپنے ملک کے رسم و رواج کے مطابق ہر جائز چیز کے استعمال میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا، وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ اگر  
بشریت کا کمال حاصل ہے تو لباس یا سواری کی کمتری سے وہ کمتر نہیں ہو سکتا اور اگر وہ بشریت کے کمال سے محروم ہے تو صرف لباس یا سواری  
کی برتری سے برتر نہیں ہو سکتا۔ صدر ہر جا کہ نشین صدر است۔ نہ ملک کی مروج اشیاء کے استعمال سے پرہیز کرنا کمال ہے اور نہ زمانہ کی  
ترقیات سے فائدہ نہ اٹھانا کمال ہے، بشر ہونا ضرور ایک کمال ہے مگر بشر کا سارا کمال عبدیت کے ساتھ ہے۔ جس بشر میں عبدیت کے بجائے  
فرعونیت ہو وہ صرف صورت کا بشر ہے بلکہ یہ بھی نہیں۔ اُولَئِكَ كَانُوا لِنِعْمِ اللَّهِ غَافِلِينَ۔

(۱۰۰۵) \* پہلے زمانہ میں بڑے بڑے برتنوں کا عام رواج تھا اور اس زمانہ کی صنعت کے لحاظ سے وسیع اور بھاری برتن عمدہ سمجھے جاتے  
تھے۔ بالخصوص عرب علیحدہ علیحدہ کھانے کے عادی نہ تھے اس لیے ان کے یہاں مہمانی کے موقع پر لکڑی وغیرہ کے بڑے برتن استعمال ہوتے  
تھے۔ ثرید عرب میں عمدہ کھانوں میں شمار ہوتا تھا اور طبی لحاظ سے بھی وہ نہایت زود ہضم ہوتا ہے پھر ایسی نوبت شاذ و نادر آتی تھی کہ کبھی اس قسم  
کا موقع مل جائے اس لیے جب ایسا موقع مل جاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جمع کر لیتے ان میں شہری اور  
دیہاتی ہر شخص ہوتا۔ یہ کوئی بادشاہ کا دسترخوان نہ تھا جہاں کسی بے پڑھے دیہاتی کو تاب لب کشائی نہ ہوئی جس کے دل میں جو آتا وہ اپنی  
زبان سے کہہ گزرتا یہاں بھی ایک دیہاتی نے آپ کی اس نشست کو جب خلاف معمول دیکھا تو ٹوکا۔ مگر اس اخلاق پر قربان جائیے کہ آپ  
کو ذرا ناگوار نہ گذرا بلکہ یہاں بھی دہن مبارک سے نیچے تے وہ کلمات نکلے جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہدایت کا ایک سبق بن گئے  
یعنی انسانی بندگی اور مزاج کی شرافت یہی ہے کہ ان موقعوں پر دوسروں کا خیال مقدم رکھے آخر اس وقت میں میزبان ہوں جگہ کی تنگی میں بھی  
اپنی راحت کا خیال رکھنا اور ذرا جنبش نہ کرنا یہ تکبر اور سرکشی ہے۔ اتنا سا جملہ فرما کر جو دوسری بات دہن مبارک سے نکلی وہ کھانے لپٹے.....



ہوئے تو یہ پیالہ سامنے لایا گیا اس میں روٹی کے ٹکڑے گوشت کے شوربے میں پکے ہوئے تھے۔ لوگ اس کے ارد گرد بیٹھ گئے جب مجمع زیادہ ہو گیا تو آنحضرت (جگہ کی تنگی کی وجہ سے) اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اس پر ایک بادیہ نشین شخص نے کہا نشست کا یہ کیا طریقہ ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک شریف بندہ بنایا ہے متکبر اور سرکش نہیں بنایا۔ اس کے بعد فرمایا۔ کنارہ کنارہ سے کھاؤ اور درمیان سے نہ کھاؤ۔ کھانے میں برکت ہو گی۔ (ابوداؤد)

(۱۰۰۶) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری صحابی کے یہاں تشریف لے گئے آپ کے ہمراہ ایک صحابی اور تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا۔ اس انصاری نے جواب دیا۔ اس وقت وہ اپنے باغ کو پانی دے رہا تھا۔ آپ نے فرمایا میاں اگر کسی پرانی مشک میں باسی پانی موجود ہو تو لیتے آؤ ورنہ ہم منہ لگا کر ہی پانی پی لیں گے۔ اس نے عرض کیا میرے گھر میں پرانی مشک کا باسی پانی موجود ہے یہ کہہ کر وہ اپنے مکان میں گیا اور ایک پیالہ میں پانی نکال کر اس پر گھر کی پلی ہوئی بکری کا تھوڑا سا دودھ دوہا گویا لسی تیار کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نوش فرمایا۔ اس کے بعد وہ پھر گیا اور پھر لسی بنا کر لایا اور جو شخص آپ کے ہمراہ آئے تھے وہ انہوں نے پی۔ (بخاری شریف)

الضُّحَىٰ أُتِيَ بِتِلْكَ الْقُصْعَةِ وَقَدْ ثُرِدَ فِيهَا فَالْتَفُوا عَلَيْهَا فَلَمَّا كَثُرُوا جَثَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَعْرَابِيٌّ مَا هَذِهِ الْجُلْسَةُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ جَعَلَنِي عَبْدًا كَرِيمًا وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا عَنِدًا ثُمَّ قَالَ كُلُوا مِنْ جَوَانِبِهَا وَدَعُوا ذُرْوَتَهَا يُبَارِكْ فِيهَا. (رواه ابوداؤد)

(۱۰۰۶) عَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ وَمَعَهُ صَاحِبٌ لَهُ فَسَلَّمَ فَرَدَّ الرَّجُلُ وَهُوَ يُحَوِّلُ الْمَاءَ فِي حَائِطٍ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنْ كَانَ عِنْدَكَ مَاءٌ بَارِدٌ فِي شَنَةِ وَ إِلَّا كَرَعْنَا فَقَالَ عِنْدِي مَاءٌ بَاتَ فِي شَنْ فَانْطَلَقَ إِلَى الْعَرَبِشِ فَسَكَبَ فِي قَدَحٍ مَاءً ثُمَّ حَلَبَ عَلَيْهِ مِنْ دَاجِنٍ فَشَرِبَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ أَعَادَ فَشَرِبَ الرَّجُلُ الَّذِي جَاءَ مَعَهُ. (رواه البخاری)

اللہ..... کے متعلق ایک عام ہدایت تھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ قلب مبارک پر اس کا ادنیٰ سامیل بھی نہ تھا۔ سوچو کہ اگر اس زمانہ میں ایسا واقعہ پیش آجائے تو محفل اسی گفت و شنید میں تمام ہو جائے۔ کیا انسانوں میں ہے کوئی اور بندہ جو اس منصب و اختیار کے ساتھ اس بزرگی کا مالک ہو اور اپنی اس اعلیٰ بندگی کا ہر مجلس میں اس طرح ثبوت دے سکے۔

(۱۰۰۶) \* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو اضع اور اظہارِ عبدیت کا یہ نقشہ بھی قابل یادداشت ہے کہ اتنی نزاکت و نفاست مزاج کے باوجود جب آپ ایک کسان کے کھیت پر تشریف لاتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ بھی شاید ان ہی جیسے ایک عام انسان ہیں جنہوں نے پانی پینے کے آداب کا ایک پورا باب سکھایا ہو۔ آج وہ اس کسان پر باریک آداب کا بوجھ نہیں ڈالتے بلکہ بڑی سادگی سے فرما دیتے ہیں کہ میاں اگر باسی پانی نہ مل سکے تو ہم تازہ ہی پی لیں گے۔ اور اگر تمہارے پاس برتن مہیا نہ ہو تو ہمیں عام عرب کے دستور کے مطابق منہ لگا کر پانی پی لینے میں بھی کوئی عار نہیں ہے۔ مگر جس کے قلب میں حلاوتِ ایمان رچ چکی تھی وہ اپنے اس سارے جہاں سے معزز مہمان کے لیے وہ تکلف کر کے لایا جو ایک مہذب سے مہذب انسان اس موقع پر کر کے لاسکتا تھا ادھر یہاں چونکہ دوسرے کی مہمانی للہ.....

الرسول العظيم كان يبتلى بالجوع  
کما يبتلى به سائر البشر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی شدت اسی طرح پیش آئی  
جیسا عام بشر کو کبھی پیش آ جاتی ہے

(۱۰۰۷) عَنْ أَبِي طَلْحَةَ قَالَ شَكُونَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْجُوعَ فَرَفَعْنَا عَنْ بُطُونِنَا عَنْ حَجَرٍ حَجَرٍ فَرَفَعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَطْنِهِ عَنْ حَجَرَيْنِ.

(۱۰۰۷) ابو طلحہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غزوہ خندق میں شدت بھوک کی شکایت کی اور اپنے اپنے پیٹ کھول کر دکھائے کہ ان پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پیٹ جو کھولا تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

(بخاری شریف و ترمذی شریف)

(رواہ الترمذی و قال هذا حديث غريب و (یہاں ترجمان السنۃ ص ۲۴۹ جلد اول ضرور ملاحظہ فرمائی جائے)

الحديث مروي في البخاري في غزوة الخندق مع تغير يسير. و راجع ترجمان السنة ص ۴۴۹ ج ۱)

الرسول العظيم لدغته عقرب  
فاسترقى منه كما يسترقى سائر البشر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھونے ایک بار کاٹا اور آپ نے اس  
پر اسی طرح دم فرمایا جیسا بشر کو دم کرنا چاہیے

(۱۰۰۸) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ بَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ يُصَلِّيُ فَوَضَعَ يَدَهُ

(۱۰۰۸) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ نے اپنا دست مبارک زمین پر رکھا تو کسی

لہ..... تھی اس لیے پہلے آپ نے خود پانی نوش فرمایا پھر اپنے رفیق کو دیا لیکن جہاں آپ خود میزبان کی حیثیت میں ہوتے وہاں پہلے دوسروں کی خاطر فرماتے اور اپنے نفس کو سب کے آخر میں رکھتے کہاں تو یہ شانِ عبدیت اور کہاں لوگوں کے خیالاتِ خام۔

(۱۰۰۷) \* شکم سیری اور بھوک بھی انسان کی ضعیف زندگی کا ایک جزو ہیں۔ رسول اس سنت سے بھی مستثنیٰ نہیں ہوتے بلکہ جس طرح ان کی بیماری دوسروں سے شدید تر ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی وہ دوسروں سے پیش نظر آتے ہیں بھوک میں عام طور پر پیٹ میں ایک خاص قسم کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے پتھر باندھنے سے کچھ تو اس کی خنکی سے سکون مل جاتا ہے اور کچھ پیٹ کا خلا پر ہو جاتا ہے اور اس طرح بھوک میں کچھ فائدہ مند ہوتا ہے۔ بہر حال بھوک میں پیٹ سے پتھر باندھنے کا محاورہ اردو میں بھی مستعمل ہے۔ اس شدت کی حالت میں جب صحابہؓ نے مضطرب ہو کر اپنی تکلیف اپنے سب سے شفیق و مہربان رسول کے سامنے پیش کی تو معلوم ہوا کہ ان کا رسول دوہری تکلیف میں ان کا شریک تھا۔

(۱۰۰۸) \* اگر ایک طرف حیوانات نے آپ کو سجدہ کیا اور پتھروں نے سلام کیا ہے تو دوسری طرف بچھونے آپ کو کاٹا بھی ہے۔ پہلی صورت اگر آپ کی نبوت کی علامت تھی تو دوسری آپ کی بشریت کی دلیل تھی۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مبارک و ملعون کی تقسیم حیوانات میں بھی ہے جو حیوانات جبلی طور پر موزی ہیں ان کی ایذا کے لیے شعور شرط نہیں یہ ان کی فطرت ہے۔ نیش عقرب نہ از پے کین است۔ مقتضائے طبیعتش این است۔ پس جب ایک بے شعور بچھو اپنی فطرت کی وجہ سے ملعون ہو سکتا ہے تو ایک ذی شعور انسان کا اپنے اختیاری فعل پر معذب ہونے میں کیا اشکال رہا۔



بچھونے آپ کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چپل لے کر اس کو مار دیا جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا خدا تعالیٰ بچھو پر لعنت کرے نہ نمازی کو بخشتے نہ غیر نمازی کو یا یہ کہا کہ نہ نبی کو بخشتے اور نہ غیر نبی کو اس کے بعد ذرا سنا نمک اور پانی منگا کر ایک برتن میں ڈالا اور جس جگہ پر کہ بچھونے کا ٹاٹھا اس جگہ اس کو ڈالتے رہے اور معوذتین پڑھ پڑھ کر انگلی پر ہاتھ پھیرتے اور دم کرتے رہے۔

(بیہقی شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو چلایا گیا اور آپ پر بھی اسی طرح چل گیا جیسا عام بشر پر چل جاتا ہے

(۱۰۰۹) حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو چلایا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے اثر سے آپ کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسا آپ اپنی بیبیوں کے پاس گئے ہیں مگر آپ کو اس کی قدرت نہ ہوتی تھی (سفیان کہتے ہیں کہ جادو کی یہ سب سے سخت تر قسم تھی) یہ کہتے ہیں ایک دن آپ نیند سے بیدار ہوئے اور فرمایا۔ عائشہؓ جانتی ہو آج اللہ تعالیٰ نے جس

عَلَى الْأَرْضِ فَلَدَ غَتُهُ عَقْرَبٌ فَنَا وَلَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنَعْلِهِ فَقَتَلَهَا فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ لَعَنَ اللَّهُ الْعَقْرَبَ مَا تَدْعُ مُصَلِّيًا وَلَا غَيْرَهُ أَوْ نَبِيًّا وَغَيْرَهُ ثُمَّ دَعَا بِمِلْحٍ وَمَاءٍ فَجَعَلَهُ فِي إِنَاءٍ ثُمَّ جَعَلَ يَصُبُّهُ عَلَى إِبْصَعِهِ حَيْثُ لَدَغَتْهُ وَيَمْسَحُهَا وَيُعَوِّذُهَا بِالْمُعَوِّذِ تَيْنِ. (رواه البيهقي في شعب الإيمان)

الرسول العظيم سحر مرة فمرض

منه كما يمرض سائر البشر

(۱۰۰۹) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُحْرَ حَتَّى كَانَ يَرَى أَنَّهُ يَأْتِي النِّسَاءَ وَلَا يَأْتِي تِيهَنَ (قَالَ سُفْيَانُ وَهَذَا أَشَدُّ مَا يَكُونُ مِنَ السِّحْرِ إِذَا كَانَ كَذَا) قَالَ فَانْتَبَهَ مِنْ نَوْمِهِ

(۱۰۰۹) \* جادو کی تاثیر اتنی قوی ہوتی ہے کہ اس سے کسی کا بچنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے سورہ فلق میں جادو کے شر سے استعاذہ کی تعلیم فرمائی گئی ہے گمان ہو سکتا تھا کہ شاید رسول اس سے مستثنیٰ ہوں لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے اثبات کے لیے آپ کی حیات طیبہ میں ایک واقعہ آپ پر جادو چل جانے کا بھی دکھلا دے تاکہ خوب معلوم ہو جائے کہ جن چیزوں سے عام انسان متاثر ہوتے ہیں رسول بھی ان سے متاثر ہو سکتے ہیں پھر ان کے رسول ہونے کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ وہ اس کے ازالہ کے لیے خود جادو چلانے کے بجائے ایسے کلمات استعمال فرما لیتے ہیں جو قدرت ان پر نازل فرماتی ہے۔ وہ سحر سے اتنے ممتاز ہوتے ہیں کہ نہ اس میں کہیں ارواح خبیثہ سے استعمال کا حرف ملتا ہے اور نہ کلمات کفریہ کا کوئی لفظ اور اس طرح یہ بدیہی ہو جاتا ہے کہ یہ دوسروں پر تو جادو چلانا کیا جانتے یہ تو اپنے نفس کو بھی جادو سے بچانا نہیں جانتے حافظ ابن قیمؒ سورہ فلق کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس تکلیف میں چھ ماہ تک مبتلا رہے۔ جن میں تین دن تو اس کی تکلیف کی شدت رہی اس طویل مدت میں دشمن یوں خوش رہے کہ ان کا جادو چل گیا اور قدرت نے یہ ثابت کر دیا کہ ساحروں کی نوع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی علاقہ نہ تھا اور جب اس کے ازالہ کا وقت مقدر آ گیا تو اپنے رسول کی شفاء کے لیے عالم غیب سے فرشتے نازل فرمائے جنہوں نے مرض کی تشخیص، ساحر کا اتہ پتہ اور شفاء کے سبب راستے مفصل بیان کر دیئے۔ اس کے بعد آپ نے اس جادو کو نکلوا دیا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاء عطا فرمائی تو جادو گروں کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا زوسہ بھی نہ آیا کہ آؤ اب ان پر جادو چلایا جائے یا کسی اور تدبیر سے ان کو اس کا بدلہ دے دیا جائے بلکہ خاموش ہو گئے اور للہ.....

ذَاتِ يَوْمٍ فَقَالَ يَا عَائِشَةُ (رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا) أَعْلِمْتِ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَفْتَانِي فِيمَا اسْتَفْتَيْتُهُ فِيهِ أَتَانِي رَجُلَانِ فَقَعَدَا أَحَدُهُمَا عِنْدَ رَأْسِي وَالْآخَرُ عِنْدَ رِجْلِي فَقَالَ الَّذِي عِنْدَ رَأْسِي لِلْآخَرِ مَا بَالَ الرَّجُلِ قَالَ مَطْبُوبٌ قَالَ وَمَنْ طَبَّهُ قَالَ لَبِيدُ بْنُ الْأَعْصَمِ رَجُلٌ مِنْ بَنِي زُرَيْقٍ حَلِيفٌ لِيَهُودَ كَانَ مُنَافِقًا قَالَ وَفِيمَ قَالَ فِي مُشْطٍ وَمُشَاقَّةٍ قَالَ فَإِنَّ قَالَ فِي جُفٍّ طُلْعَةٍ ذَكَرَ تَحْتَ رَعُوفَةٍ بِسْرِ ذِي أَرْوَانَ قَالَ فَاتْنِي الْبُشْرَ حَتَّى اسْتَخْرِجَهُ فَقَالَ هَذِهِ الْبُشْرُ الَّتِي أُرِيتُهَا وَكَانَ مَاءُهَا نَقَاعَةَ الْحِنَاءِ وَكَانَ نَخْلَهَا رُؤُسُ الشَّيَاطِينِ قَالَ فَاسْتَخْرِجَ قَالَتْ فَقُلْتُ أَفَلَا تَنْشُرْتُ فَقَالَ أَمَّا اللَّهُ فَقَدْ شَفَانِي وَآكْرَهُ أَنْ أُثِيرَ عَلَى أَحَدٍ مِنَ النَّاسِ شَرًّا.

(رواه البخاری)

بات کو میں نے اس سے پوچھا تھا اس کا پتہ دے دیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ دو فرشتے میرے پاس آئے ایک میرے سرہانے بیٹھا اور دوسرا میرے پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔ جو میرے سرہانے بیٹھا تھا اس نے دوسرے سے کہا ان کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے کہا کس نے جادو کیا ہے؟ اس نے کہا لبید بن اعصم نے جو قبیلہ بنی زریق کا ایک آدمی ہے اور یہود کا حلیف ہے۔ یہ شخص منافق تھا اس نے پوچھا اچھا یہ جادو کس چیز پر کیا ہے؟ اس نے کہا ایک کنگھی اور کنگھی کشیدہ بالوں میں۔ اس نے پوچھا۔ اچھا تو وہ ٹونا کہاں ہے اس نے کہا وہ ایک نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں رکھ کر ذی اروان کنوئیں کے اندر کے پتھر کے نیچے ہے چنانچہ آپ اس کنوئیں پر تشریف لائے اور اس جادو کو نکالا اور فرمایا۔ یہی کنواں تھا جو مجھ کو دکھایا گیا تھا اس کا پانی ایسا تھا جیسا مہندی کا پانی سرخ ہوتا ہے اور اس کے ارد گرد درختوں پر ایسی وحشت برستی تھی گویا وہ شیطانوں کے سر ہیں۔ یہ کہتے ہیں آپ نے وہ جادو نکال لیا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ نے اس کو کھول کیوں نہیں؟ دیا آپ نے فرمایا۔ مجھ کو تو اللہ تعالیٰ نے شفاء عطاء فرما ہی دی اور اب مجھ کو یہ بات گوارا نہیں کہ میں کسی کو بھی کسی شر میں مبتلا کروں۔ (بخاری شریف)

للہ ..... عام طور پر لوگوں کے سامنے جادو کی ان اشیاء کو نکال کر دکھانا بھی پسند نہیں فرمایا مبادا مسلمانوں کو ناگواری ہو اور کوئی نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو۔ کیا ہے کوئی بندہ جو ایسی شان بندگی دکھا سکے۔

واضح رہے کہ حدیث مذکور میں صاف موجود ہے کہ اس سحر کی تاثیر صرف آپ کی ازدواجی حیات تک محدود تھی اور اسی قسم کو سب سے زیادہ سخت جادو مانا گیا تھا۔ انبیاء علیہم السلام نہ امراض سے مستثنیٰ ہوتے ہیں نہ ایسے کلمات کے اثر سے جو کسی مرض کا سبب بن جائیں۔ سحر کی تاثیر کے متعلق آج لوگ مکر ہیں مگر یہ ان کی کوئی جدید تحقیق نہیں ہے معتزلہ کی جماعت پہلے سے اس کی منکر ہے لیکن جس امر کا ثبوت تو اثر کے ساتھ آنکھیں مشاہدہ کر چکی ہوں دلائل سے اس کی نفی کرنا محض خام خیالی ہے۔ اس خاص قسم کے سحر کے لیے عرب میں ایک علاج بھی تھا جس کو نشرہ کہتے تھے۔ حدیث میں علا جا ان کلمات کی اجازت بھی آئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس علاج کا تذکرہ فرمایا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ میرے پروردگار نے مجھ کو سورہ فلق اور سورہ والناس کے ذریعہ سے شفاء عطاء فرمادی ہے اس لیے میں یہ علاج نہیں کرتا۔



الرسول العظيم سم مرة فتالم كما  
منه يتالم منه سائر البشر

(۱۰۱۰) عَنْ جَابِرٍ أَنَّ يَهُودِيَّةً مِنْ أَهْلِ خَيْبَرَ سَمَتْ شَاةً صَلِيَّةً ثُمَّ أَهْدَتْهَا الرَّسُولَ اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الذَّرَاعَ فَأَكَلَ مِنْهَا وَ أَكَلَ رَهْطٌ مِنْ أَصْحَابِهِ مَعَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ارْفَعُوا أَيْدِيَكُمْ وَ أَرْسَلْ إِلَى الْيَهُودِيَّةِ فَدَعَاَهَا فَقَالَ سَمِعْتُ هَذِهِ الشَّاةَ فَقَالَتْ مَنْ أَخْبَرَكَ قَالَ أَخْبَرْتَنِي هَذِهِ فِي يَدِي لِلذَّرَاعِ قَالَتْ نَعَمْ قُلْتُ إِنْ كَانَ نَبِيًّا فَلَنْ تَضُرَّهُ وَ إِنْ لَمْ يَكُنْ نَبِيًّا اسْتَرْحْنَا مِنْهُ فَعَفَا عَنْهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لَمْ يُعَاقِبْهَا وَ تُوَفَّى أَصْحَابُهُ الَّذِينَ أَكَلُوا مِنَ الشَّاةِ وَ احْتَجَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى مَحَاهِلِهِ مِنْ أَجْلِ الَّذِي أَكَلَ مِنَ الشَّاةِ حَجَمَهُ أَبُو هِنْدٍ بِالْقُرْنِ وَ الشَّفْرَةِ وَ هُوَ مَوْلَى لَبْنَى بَيَاضَةَ مِنَ الْأَنْصَارِ.

(رواه ابوداؤد و الدارمی)

(۱۰۱۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ فِي مَرَضِهِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ يَا عَائِشَةُ مَا أَزَالُ أَجِدُ أَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِي أَكَلْتُ بِخَيْبَرَ وَ هَذَا أَوَانُ وَ جَذْتُ انْقِطَاعَ أَبْهَرِي مِنْ ذَلِكَ السَّمِّ. (رواه البخاری)

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوز ہر کھلایا گیا اور اس کے اثر سے آپ کو بھی اسی طرح تکلیف ہوئی جیسی بشر کو ہونی چاہیے (۱۰۱۰) جابر بیان کرتے ہیں کہ خیبر کی ایک یہودی عورت نے ایک بھونی ہوئی بکری زہر ملا کر آپ کے سامنے بطور ہدیہ پیش کی آپ نے اس میں سے کچھ کھایا اور آپ کے بعض صحابہ نے بھی کھالیا۔ آپ نے فرمایا کھانے سے ہاتھ اٹھا لو۔ اور اس یہودی عورت کے بلانے کے لیے آدمی بھیجا اور اس سے پوچھا تو نے اس بکری میں زہر ملایا ہے؟ اس نے کہا آپ کو کس نے بتایا؟ آپ نے دست کے اس ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جو آپ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ سن کر وہ بولی جی ہاں میں نے اپنے دل میں کہا تھا اگر یہ نبی ہوں گے تو ان کو یہ زہر کیا نقصان دے گا اور اگر نبی نہ ہوں گے تو ان سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودن کو معاف فرمادیا اور اس کو کوئی سزا نہیں دی اور آپ کے جن بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے وہ گوشت کھالیا تھا ان کا تو انتقال ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس زہر آلود بکری کے اثر سے ہمیشہ اپنے شانوں کے درمیان سینگی لگوا لیا کرتے تھے۔ سینگی لگانے والا ابو ہند انصار کے قبیلہ بنو بیاضہ کا ایک آزاد کردہ غلام تھا۔ اس نے سینگ اور نشتر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینگی لگائی تھی۔

(ابوداؤد - دارمی)

(۱۰۱۱) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جس بیماری میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا ہے اس میں آپ فرماتے تھے۔ عائشہ! جو زہر آلود کھانا میں نے خیبر میں کھالیا تھا اس کی تکلیف مجھے ہمیشہ ہی محسوس ہوتی رہی لیکن اب اسی کے زہر لیے اثر سے مجھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ (میرا آخر وقت آ گیا ہے اور) میری شہ رگ کٹ گئی ہے۔ (بخاری شریف)

(۱۰۱۱) \* عالم تقدیر نے اس طرح اس یہودی عورت کا عذر بھی زائل کر دیا اور اس کے اس حیلہ کو ناکام بنانے کے لیے ایک مدت تک آپ کو بقیہ حیات رکھا اور آخر میں جس نوع کی شہادت ختم نبوت کے ساتھ جمع ہو سکتی تھی اس سے نوازنے کی یہ صورت اختیار فرمائی کہ پھر اسی زہر کا اثر ابھرا اور عالم اسباب میں وہی آپ کی وفات کا سبب بن گیا اور اس طرح آپ کو موت شہادت کی فضیلت بھی میسر آ گئی۔

الرسول العظيم جرح مرة حتى  
كسرت رباعة فتداوى منه كما  
يتداوى سائر البشر

(۱۰۱۲) عَنْ أَبِي حَازِمٍ أَنَّهُ سَمِعَ سَهْلَ بْنَ  
سَعْدٍ وَهُوَ يُسْأَلُ عَنْ جُرْحِ رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَمَا وَاللَّهِ إِنِّي لَا  
عُرِفْتُ مَنْ كَانَ يَغْسِلُ جُرْحَ رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ كَانَ يَسْكُبُ  
الْمَاءَ وَبِمَا دُووِي قَالَ كَانَتْ فَاطِمَةُ رَضِيَ  
اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا بِنْتُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَغْسِلُهُ وَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى  
عَنْهُ يَسْكُبُ الْمَاءَ بِالْمَجَنِّ فَلَمَّا رَأَتْ  
فَاطِمَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ الْمَاءَ لَا  
يَزِيدُ الدَّمَ إِلَّا كَثْرَةً أَخَذَتْ قِطْعَةً مِنْ حَصِيرٍ  
فَأَحْرَقَتْهَا فَالْصَقَتْهَا فَاسْتَمْسَكَ الدَّمُ وَ  
كُسِرَتْ رُبَاعِيَّتُهُ يَوْمَئِذٍ وَ جُرْحٌ وَ جُفْهُهُ وَ  
كُسِرَتِ الْبَيْضَةُ عَلَى رَأْسِهِ.

(رواه البخاری فی المغازی ص ۵۸۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار زخمی ہوئے حتیٰ کہ آپ کے  
دندان مبارک شہید ہو گئے آپ نے اس کا علاج اسی طرح  
کیا جیسا اور بشر کرتے ہیں

(۱۰۱۲) ابو حازم روایت کرتے ہیں کہ سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زخم کے متعلق دریافت کیا گیا جو جنگ  
احد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لگا تھا۔ انہوں نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کا  
یہ جواب خود سنا تھا وہ فرماتے تھے میں خوب جانتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے زخم کا دھالنے والا اور اس پر پانی ڈالنے والا کون کون تھا اور وہ دوا بھی  
کیا تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم پر استعمال کی گئی تھی۔ یہ کہتے تھے کہ  
حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تو زخم  
دھوتی جا رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ڈھال سے پانی لے  
کر اس پر ڈالتے جاتے تھے لیکن جب حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے  
دیکھا کہ پانی سے تو خون کسی طرح بند ہوتا نہیں بلکہ دونا دونا اور زیادہ ہی  
ہوتا جا رہا ہے تو چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور اس کی راکھ لے کر زخم پر لگائی جب  
کہیں جا کر خون بند ہوا۔ اس جنگ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے  
کے چار دانت شہید ہوئے روئے انور زخمی ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
سر مبارک پر جو خود تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔

(بخاری شریف)

(۱۰۱۲) \* شکست و فتح کے حالات بھی ایسے ہیں جو مسلم و کافر عام انسانوں میں یکساں رکھے گئے ہیں۔ ہر قتل نے جب ابوسفیان رضی اللہ  
تعالیٰ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق طویل سوالات کیے تو ان میں ایک سوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح و شکست کے متعلق بھی تھا۔  
پھر جب اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی شکست بھی ہوتی ہے تو وہ بے ساختہ بول اٹھا کہ رسولوں کی شان یہی ہے۔ وہ  
شکست بھی کھاتا ہیں مگر آخر کار بول بالا انہی کا ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر احد کے میدان میں یہ سنت بھی پوری ہو گئی اور اس درد  
آميز نظر کے ساتھ پوری ہوئی کہ روئے انور زخمی ہے، دانت شہید ہو چکے ہیں اور سر مبارک کا خود چکنا چور ہو گیا ہے۔ کیا اب بھی اس شبہ کا کوئی  
موقعہ ہے کہ رسول بشر نہیں ہوتے۔ رسولوں کی جو سنت نہیں جانتے یہاں ان کو اگر تردد ہو تو ہو مگر جو اس سے واقف تھے ان میں شاہ ہر قتل  
جیسے دانائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکست ہی کو صداقت کی علامات میں شمار کیا تھا۔



الرسول العظيم كان يهمله كما يهمل  
سائر البشر

(۱۰۱۳) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُولُ يَنْسَانِيَنَّ  
أَمْرُكُنَّ مِمَّا يَهْمُنِي مِنْ بَعْدِي وَلَنْ يَضْبِرَ  
عَلَيْكُنَّ إِلَّا الصَّابِرُونَ الصَّادِقُونَ قَالَتْ  
عَائِشَةُ يَعْنِي الْمُتَصَدِّقِينَ ثُمَّ قَالَتْ عَائِشَةُ  
لَأَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ سَقَى اللَّهُ  
أَبَاكَ مِنْ سَلْسَبِيلِ الْجَنَّةِ وَكَانَ ابْنُ عَوْفٍ  
قَدْ تَصَدَّقَ عَلَى أُمّهَاتِ الْمُؤْمِنِينَ بِحَدِيقَةٍ  
بِيعَتْ بِأَرْبَعِينَ أَلْفًا. (رواه الترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان امور کی فکر لاحق ہوتی تھی جن  
کی فکر بشر کو فطرۃ لاحق ہونی چاہیے

(۱۰۱۳) حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی  
بیبیوں سے فرمایا کرتے تھے۔ تمہارا معاملہ بھی ایسا ہے جس کی مجھ کو اپنے بعد  
فکر ہے اور تمہاری نگرانی میں حصہ لینے والے صرف وہی لوگ ہوں گے جو  
بڑے ضبط و ہمت والے ہوں گے۔ یہ حدیث بیان فرما کر حضرت عائشہ ابو  
سلمہ کے لیے دعائیہ کلمات فرمایا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے والد کو جنت  
کے اس چشمہ کے پانی سے سیراب کرے جس کا نام سلسبیل ہے اس کی وجہ یہ  
تھی کہ ان کے والد عبدالرحمن بن عوف نے امہات المؤمنین کی خدمت میں  
ایک باغ پیش کیا تھا جو چالیس ہزار درہم میں فروخت ہوا تھا۔  
(ترمذی شریف)

(۱۰۱۳) \* یہ پہلے بار بار گذر چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی فطرت ان تمام چیزوں سے متاثر ہوتی ہے جن سے کہ بشری فطرت کو متاثر  
ہونا چاہیے وہ جس طرح بھوک پیاس اور سرد و گرم کے احساس میں عام بشر کے شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح مسرت و غم میں بھی ان کے  
شریک ہوتے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ غمگین ہوئے اور آپ کی چشم مبارک سے  
آنسو بہ نکلے۔ اسی طرح بیبیوں کا بھی معاملہ ہے ان کے متعلق بھی آپ کو اس حد تک فکر تھی جس حد تک بشر کو ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ آپ  
نے ان کے لیے خاص طور کے متعلق بھی آپ کو اس حد تک فکر تھی جس حد تک بشر کو ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ آپ نے ان کے لیے خاص طور  
پر مال و اسباب کا کوئی ذخیرہ نہیں چھوڑا تھا، مگر جس امر میں یہاں بھی انبیاء علیہم السلام کو امتیاز ہوتا ہے وہ ان کے ان صبر آزمائیاں ہیں ان  
کے استقامت اور شرعی حدود کا پورا پورا تحفظ ہے۔ وہ بھی جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ بڑی خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے۔ ان کے قلب پر اس کا  
وسوسہ بھی نہیں گذرتا کہ ان حالات میں ان کا قدم محدود شریعت سے سرمو ادھر ادھر جائے۔ یہاں جس طرح ان کا احساس غم ان کی فطرت ہوتی  
ہے اس سے بڑھ کر اپنی شریعت کی حدود کا تحفظ بھی ان کی فطرت ہوتی ہے پھر یہ فطری احساسات بھی قدرت ان میں اس لیے ودیعت فرماتی  
ہے تاکہ وہ عام بشر کے لیے ان حالات کی سنت کا عملی نمونہ پیش کر سکیں۔ گزشتہ صفحات میں انسانی حیات کے معمولی سے معمولی حوادث آپ  
نے ملاحظہ فرمائے اور حدیثوں میں اس قسم کے علاوہ بھی اور بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن ان تمام مقامات میں آپ اسی سنت اللہ کے ماتحت  
نظر آئے جو نوع انسانی کے لیے روزِ اول سے مقدر ہو چکی ہے۔ کیا یہ آپ کی بشریت کا قطعی ثبوت نہیں۔ روایت مذکورہ بالا سے یہ بھی معلوم ہوا  
کہ امہات المؤمنین کا مقام حضرت رسالت میں کیا تھا اسی لیے ائمہ حدیث نے حدیث مذکور کو مناقب کے باب میں ذکر فرمایا ہے۔ کوئی شبہ  
نہیں کہ جن نفوس طاہرہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول کی و مساوی کے لیے انتخاب فرمایا تھا ان سے رسول کی ذات اقدس کا تعلق بھی اسی  
دل سوزی کا ہونا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات تلافی امہات المؤمنین کی بزرگی و عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

الرسول العظيم لحق بالرفيق

الا على على سنة سائر البشر

(۱۰۱۴) عَنْ أَبِي سَلَمَةَ أَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرَتْهُ قَالَتْ أَقْبَلَ أَبُو بَكْرٍ عَلَى فَرَسِهِ مِنْ مَسْكِنِهِ بِالسُّخِّ حَتَّى نَزَلَ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ فَلَمْ يُكَلِّمِ النَّاسَ حَتَّى دَخَلَ عَلَى عَائِشَةَ فَتَيَمَّمِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُسَجًى بِرُودِ حَبْرَةٍ فَكَشَفَ عَنْ وَجْهِهِ ثُمَّ أَكَبَّ عَلَيْهِ فَقَبَّلَهُ ثُمَّ بَكَى فَقَالَ يَا أَبِى أَنْتَ يَا نَبِىَّ اللَّهِ لَا يَجْمَعُ اللَّهُ عَلَيْكَ مَوْتَيْنِ أَمَّا الْمَوْتَةُ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْكَ فَقَدْ مُتُّهَا قَالَ أَبُو سَلَمَةَ فَأَخْبَرَنِي ابْنُ عَبَّاسٍ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ خَرَجَ وَغُمَرُ يُكَلِّمُ النَّاسَ فَقَالَ اجْلِسْ يَا نَبِىَّ فَقَالَ اجْلِسْ يَا نَبِىَّ فَتَشَهَّدَ أَبُو بَكْرٍ فَقَالَ إِلَيْهِ النَّاسُ وَتَرَكَوْا غُمَرَ فَقَالَ أَمَّا بَعْدُ فَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فَإِنَّ مُحَمَّدًا (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ

بشری سنت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

سفر آخرت

(۱۰۱۴) ابوسلمہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بی بی صاحبہ یعنی حضرت عائشہؓ نے ان سے بیان کیا کہ ابوبکرؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات سن کر) اپنی قیام گاہ مقام سخ سے گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لائے اور یہاں آ کر مسجد میں داخل ہوئے اور کسی سے بات کیے بغیر حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف لے گئے اور سیدھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا پہنچے۔ آپؐ پر اس وقت ایک یمنی چادر ڈھکی ہوئی تھی انہوں نے آپؐ کے چہرہ مبارک سے چادر اٹھائی اور جھک کر آپؐ کو بوسہ دیا اور رو پڑے اور فرمایا یا نبی اللہ آپؐ پر میرے ماں باپ قربان اللہ تعالیٰ آپؐ پر دو موتیں کبھی جمع نہیں کرے گا جو موت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے مقدر فرمائی تھی وہ تو آپؐ کو آچکی ہے۔ ابوسلمہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ اس کے بعد ابوبکرؓ باہر تشریف لائے تو عمرؓ لوگوں سے کچھ فرما رہے تھے۔ صدیق اکبرؓ نے ان سے فرمایا آپؐ بیٹھ جائیں لیکن وہ نہ مانے آپؐ نے ان سے پھر کہا آپؐ بیٹھ جائیں مگر انہوں نے پھر انکار کیا۔ اس پر صدیق اکبرؓ نے خود خطبہ دینا شروع کر دیا لوگ عمرؓ کو چھوڑ کر فوراً ان کی جانب متوجہ ہو گئے انہوں نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ جو شخص محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا ہو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تو

(۱۰۱۴) \* موت انسان کی بشریت کا آخری ثبوت ہے جو شخص ولادت اور موت جیسے واضح عوارض کو بھی بشریت کی دلیل نہیں سمجھتا وہ پھر خدا تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھ سکتا۔ اس حدیث سے یہ احکام ثابت ہوتے ہیں۔ وفات کے بعد آپؐ پر چادر ڈھانکتا۔ آپؐ کے روئے انور کو بوسہ دینا۔ وفات کے بعد آپؐ کو یا نبی اللہ سے خطاب کرنا۔ آپؐ کی وفات کا منبر پر اعلان کرنا اور یہ خطبہ دینا کہ عبادت کے قابل صرف وہی ایک ذات ہے جس کو کبھی فنا نہیں وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

عرب میں ندا کے بہت سے اقسام ہیں۔ نثر و نظم میں غائب و حاضر اسی طرح حی و میت بلکہ جمادات کو ندا یہ کلمہ سے یاد کرنا ان کا عام دستور تھا۔ محض اس لفظ سے عقائد بگاڑ لینے اور کفر کے فتوے لگا دینے دونوں علم سے ناواقفیت اور مبالغہ کی باتیں ہیں جس کو اپنے ایمان کی قدر ہو اس کو شرکیہ عقائد سے دور دور رہنا چاہیے اور اسی طرح بات بات پر کفر کے فتوے لگانے سے بھی احتراز رکھنا چاہیے۔



یَعْبُدُ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ حَتَّى لَا يَمُوتَ  
 قَالَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ  
 خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ إِلَى الشَّاكِرِينَ. وَاللَّهُ  
 لَكَانَ النَّاسَ لَمْ يَكُونُوا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ  
 عَزَّوَجَلَّ أَنْزَلَ هَذِهِ الْآيَةَ حَتَّى تَلَاهَا أَبُو بَكْرٍ  
 رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فَتَلَقَّاهَا مِنْهُ النَّاسُ فَمَا  
 يَسْمَعُ بَشَرًا إِلَّا يَتْلُوَهَا.

انقال ہو گیا۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ  
 اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے اس کو موت کبھی نہیں آئے گی۔  
 اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ  
 قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ..... الشَّاكِرِينَ﴾ تک۔ یہ خطبہ سن کر لوگوں کو  
 ایسا معلوم ہوا کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تلاوت فرمانے سے قبل یہ  
 آیت اللہ تعالیٰ نے گویا نازل ہی نہیں فرمائی تھی (اور آج ہی نازل ہوئی  
 ہے) اس کے بعد جس نے بھی اس آیت کو سنا وہی اس کو تلاوت کرتا ہوا نظر  
 آتا تھا۔ (بخاری شریف)

الانبياء عليه السلام لهم ميزات و  
 مزايا يمتازون بها عن سائر البشر  
 (۱۰۱۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ نَهَى رَسُولُ اللَّهِ  
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ فِي  
 الصَّوْمِ فَقَالَ رَجُلٌ إِنَّكَ تَوَاصِلُ يَا رَسُولَ  
 اللَّهِ قَالَ وَ أَيْكُمْ مِثْلِي إِنِّي أَبِيتُ يُطْعِمُنِي  
 رَبِّي وَيُسْقِينِي. (متفق عليه)

حضرات انبیاء علیہم السلام میں بہت سی خصوصیات ایسی ہوتی ہیں  
 جن کی وجہ سے وہ تمام نوع بشر سے ممتاز بھی ہوتے ہیں  
 (۱۰۱۵) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی  
 ممانعت فرمائی کہ دو روزے درمیان میں افطار کیے بغیر ایک ساتھ رکھے جائیں۔  
 اس پر ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ آپ تو ایسا بھی کر لیتے ہیں۔ آپ نے  
 فرمایا جی ہاں، مگر کیا تم میں کوئی میری طرح ہے؟ میں شب بسر کرتا ہوں اس  
 حالت میں کہ میرا رب مجھ کو کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ (متفق علیہ)

(۱۰۱۵) \* انبیاء علیہم السلام بشر ضرور ہوتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ بالکل ایسے ہی بشر ہوتے ہیں جیسے کے عام  
 بشر ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ ان سے اتنے ممتاز بھی ہوتے ہیں کہ اگر بیک وقت دونوں پر نظر ڈالی جائے تو یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا وہ  
 علیحدہ علیحدہ دو صنفوں کے افراد ہیں۔ متنبی مشہور شاعر نے ایک ہی صنف میں اشتراک کے باوجود ان کے افراد میں امتیاز کی معقولیت کو کیا  
 خوب انداز سے ادا کیا ہے وہ کہتا ہے۔

وَان تَفَقَّ الْأَنَامُ وَ انْت مِنْهُمْ فَانَّ الْمَسْكَ بَعْضُ دَمِ الْغَزَالِ

اے مدوح اگر تو مخلوق میں شامل ہو کر پھر ان سب پر فوقیت رکھتا ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے آخر مشک بھی تو اسی ہرن کے خون  
 کا ایک حصہ ہوتا ہے لیکن پھر ان دونوں میں کیا نسبت وہ متعفن اور یہ معطر وہ ناپاک اور یہ پاک پس اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی نفس بشریہ  
 میں گو سب انسانوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں لیکن پھر ان سے مشک کی طرح ممتاز بھی ہوتے ہیں صرف اپنی سیرت میں نہیں بلکہ اپنے جسم  
 و جوارح میں بھی اور ان کے خواص میں بھی انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع تو بہت بلند ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ ان کی بیبیاں بھی عام  
 عورتوں سے کچھ علیحدہ شان کی ہوتی ہیں۔ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ. (اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو  
 تمہاری بات ان سے بالکل الگ ہے۔ پس جس طرح کہ امہات المؤمنین صنف نساء میں شامل ہونے کے بعد پھر احکام میں ان لئے.....

(۱۰۱۶) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ حَدَّثْتُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلَوةُ الرَّجُلِ قَاعِدًا نِصْفُ الصَّلَوةِ قَالَ فَاتَّيْتُهُ فَوَجَدْتُهُ يُصَلِّي جَالِسًا فَوَضَعْتُ يَدِي عَلَى رَأْسِهِ فَقَالَ مَا لَكَ يَا عَبْدَ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو قَالَتْ حَدَّثْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّكَ قُلْتَ صَلَوةُ الرَّجُلِ قَاعِدًا عَلَى نِصْفِ الصَّلَوةِ وَأَنْتَ تُصَلِّي قَاعِدًا قَالَ أَجَلٌ وَلَكِنِّي لَسْتُ كَأَحَدٍ مِّنْكُمْ.

(رواہ مسلم)

منها ما يتعلق بیده الکریمہ (ﷺ)

(۱۰۱۷) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى

(۱۰۱۶) عبد اللہ بن عمرو نقل کرتے ہیں کہ مجھ سے یہ بیان کیا گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آدمی کے نوافل کا ثواب جو بیٹھ کر پڑھے جائیں نصف نماز کا ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہیں اتفاق ایسا ہوا کہ میں جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ کی بیٹھ کی ہی نوافل پڑھتے پایا۔ میں نے آپ کے سر مبارک پر اپنا ہاتھ رکھا آپ نے پوچھا عبد اللہ بن عمرو! کہو کیا بات ہے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ آدمی جو نماز بیٹھ کر پڑھتا ہے اس کا ثواب اس کو نصف ملتا ہے۔ اور آپ تو بیٹھ کر ہی نماز ادا فرما رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں میں نے یہ ضرور کہا ہے لیکن میری بات اور ہے مجھے اپنے اوپر قیاس نہ کرو میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔

(مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی امتیازی خصوصیت

(۱۰۱۷) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ

للہ..... سے ممتاز بھی تھیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام بشر ہو کر ان سے ممتاز بھی ہوتے ہیں۔ دیکھو اس حدیث میں کس صفائی کے ساتھ آپ نے فرمایا کہ میری بشریت کے سب خواص وہی نہیں ہیں جو تمہاری بشریت کے ہیں، میری بشریت آب و غذا میں بھی تم سے مختلف ہے۔ پھر یہاں آب و غذا کی نوعیت جو بھی ہو مگر عبارت کا کتنا حسن ہے کہ آپ نے اس کو بھی شب کے ساتھ مقید فرما دیا ہے، اگر ”انسی ابیت“ کی بجائے ”انسی اصبح“ فرما دیتے۔ یعنی میں صبح کرتا ہوں اس حالت پر، الخ تو عام انسانوں کے لیے آب و غذا کے ساتھ روزہ کی حقیقت کا قائم رکھنا کتنا بھاری ہو جاتا۔ یہ علیحدہ بحث تھی کہ جو غذاء آپ کو ملتی تھی روزہ اس سے افطار ہو سکتا بھی ہے یا نہیں۔ بہر حال اگر ایک طرف انبیاء علیہم السلام میں بشریت کی وہ عام صفات موجود ہوتی ہیں جو ان کی بشریت کا بدیہی ثبوت ہوتی ہیں تو اسی کے ساتھ دوسری طرف ان میں وہ صفات بھی موجود ہوتی ہیں جو عام بشریت سے ان کی فوقیت کا اس سے زیادہ بدیہی ثبوت ہوتی ہیں۔

(۱۰۱۶) \* جو بات عام طور پر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے ذہن نشین تھی وہ یہی تھی کہ شرعی احکام میں خدا کے رسول بھی عام بشر کے شریک رہتے ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو صاف کر دیا کہ اس کی شرکت کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اب کسی جہت سے کوئی امتیاز ہی نہیں رکھتے وہ عبادت کی شدت اور اس کی خفت دونوں میں عام بشر سے ممتاز ہوتے ہیں۔ صوم وصال یعنی افطار کے بغیر دو یا زیادہ روزے مسلسل رکھنا جس طرح ان ہی کی شان ہوتی ہے اسی طرح بیٹھ کر نوافل کا پورا ثواب یعنی بیٹھ کر نوافل کا پورا ثواب ملنا بھی ان ہی کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ ثواب کا درار و مدار صرف مشقت ہی پر نہیں اس کا انحصار نظر بوبیت کی پسندیدگی پر ہے۔ نیز انبیاء علیہم السلام کے عمل سے ہی چونکہ جواز و عدم جواز کا ثبوت ملتا ہے اس لیے جائزات پر عمل کرنے میں بھی ان کو واجبات کا ثواب ملتا ہے۔

(۱۰۱۷) \* یوں تو آپ کے دست مبارک کے اعجازی کرشمے بہت سی حدیثوں میں آتے ہیں۔ انگشتان مبارک سے چشمے بھی للہ.....



اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اشْتَكَى نَفَثَ عَلَى نَفْسِهِ  
وَمَسَحَ عَنْهُ بِيَدِهِ فَلَمَّا اشْتَكَى وَجَعَهُ الَّذِي  
يَه تھاکہ جب بیمار ہوتے تو پہلے اپنے ہاتھوں پر آپ معوذات پڑھ کر دم  
کرتے اس کے بعد ان کو اپنے سارے جسم پر پھیر لیتے۔ جب ایسا ہوا کہ

للہ ..... جاری ہوئے ایک اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے بھی ہو گئے اور ایک اشارہ سے مدینہ طیبہ سے ہٹ کر بادلوں نے اطراف کا رخ  
کر لیا وغیرہ وغیرہ۔ ترجمان ص ۳۷ ج ۲ ص ۲۱ ج ۲ ملاحظہ فرمائیے آپ کو ثابت ہو گا کہ آپ کے دست مبارک کی ایک ضرب سے یقین کی  
وہ کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ عالم قدس گویا آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ لیکن حدیث مذکور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم کے دست شفاء میں شفاء کی خاصیت عام معجزات کی طرح وقتی اور غیر اختیاری نہ تھی بلکہ اس کا طبعی اثر تھا۔ یہاں حضرت عائشہ کی فہم  
کتنی قابل داد ہے کہ وہ اس رمز کو جانتی تھیں اور اس لیے آپ کی بیماری کے معمول کو اس طرح پورا کرتی تھیں کہ جہاں تک معوذات پڑھنے کا  
تعلق تھا وہ تو خود پڑھ لیتیں اور بیماری میں آپ کو اس کی تکلیف نہ دیتیں لیکن جہاں دیکھتیں کہ اب یہاں وہ نیابت سے قاصر ہیں وہاں مجبور  
ہو کر آپ ہی کے دست مبارک کو استعمال کرتیں۔ معلوم ہوا کہ نبی کے ہاتھ میں کوئی امتیازی خاصیت ہوتی ہے جس میں عام بشر تو کیا امہات  
المؤمنین بھی شرکت نہیں رکھتیں۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جس طرح عام بشر سے اپنی روحانی قوتوں  
میں ممتاز ہوتے ہیں اسی طرح جسمانی طاقتوں میں بھی ممتاز ہوتے ہیں۔ اپنی سامعہ باصرہ شامہ اور ذائقہ سب ہی طاقتوں میں دیکھو تفسیر  
کبیر ص ۴۵۵ ج ۴۔

حافظ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک سے پتھروں کے نرم ہو جانے کے متعلق سوال و جواب کی  
شکل میں تحریر فرماتے ہیں:

کیا کتب حدیث میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ جس پتھر پر  
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر بیت اللہ کی تعمیر  
فرمائی تھی اس پر آپ کے قدم مبارک کا نشان پڑ گیا تھا۔ اس کا  
جواب یہ ہے کہ بے شک عبد اللہ بن سلام سے ازرقی کی تاریخ  
مکہ میں اس پر ایک روایت بسند صحیح موجود ہے مگر وہ موقوف  
ہے اور عبد بن حمید نے بھی حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے  
اس کو نقل کیا ہے۔ رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پتھر کا  
نرم ہونا تو وہ صرف غزوہ خندق میں تو ثابت ہے اس کے سواء  
ثابت نہیں۔

هل ورد في كتب الحديث ان سيدنا ابراهيم على  
لبينا و عليه افضل الصلوة اثرت قدماه في الحجر  
الذي كان بنى عليه البيت و هو المقام صغم. و  
رد ذلك. اخرجہ الازرقی فی تاریخ مکة من طریق  
ابی سعید الخدری عن عبد اللہ بن سلام رضی اللہ  
تعالیٰ عنہ موقوفا علیہ بسند صحیح و اخرجہ عبد  
بن حمید فی تفسیرہ عن قتادة. اما الان الصخرة  
للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فثبت فی حفر الخندق  
و لم یکتب غیر هذا. (الحاوی ج ۲ ص ۱۰۸)

حضرت ابراہیم خلیل الرحمن کے قدم مبارک کی تاثیر کا کرشمہ تو حافظ سیوطی نے تسلیم کیا ہے گو وہ موقوف ہو لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ  
وسلم کے قدم مبارک کے متعلق جو عام حکایات مشہور ہیں اس کے بسند صحیح ثبوت کا قطعی انکار کر دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ اس جگہ ان  
ناحق پسندوں کو غور کر لینا چاہیے جو محدثین کو مؤرخین کے درجہ میں بھی رکھنا نہیں چاہتے کہ انکا جو متوسط مزاج طبقہ تھا نقد للہ.....

تُوفِّي فِيهِ كُنْتُ أَنْفُثَ عَلَيْهِ بِالْمُعَوَّذَاتِ وَ  
أَمْسَحُ بِيَدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

(متفق علیہ)

منها ما يتعلق بحاسة الذوق

(۱۰۱۸) عَنْ عَاصِمِ بْنِ كُلَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ  
رَجُلٍ مِّنَ الْأَنْصَارِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جَنَازَةٍ فَرَأَيْتُ  
رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَلَى  
الْقَبْرِ يُوصِي الْحَافِرَ يَقُولُ أَوْسَعُ مِنْ قَبْلِ

آپ کی آخری بیماری ہوئی تو میں یوں کرتی کہ معوذات پڑھ کر دم تو خود  
کرتی لیکن جب ہاتھ پھیرنے کا نمبر آتا تو خود آپ ہی کا دست مبارک لے  
کر آپ کے جسم اطہر پر پھیرتی۔ (متفق علیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت ذائقہ کی امتیازی خصوصیت

(۱۰۱۸) ایک انصاری صحابی کہتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے  
ساتھ ایک جنازہ کی شرکت کے لیے نکلے میں نے دیکھا کہ آپ قبر کے اوپر  
سے گورکن کو یہ ہدایت فرماتے جاتے تھے دیکھنا ذرا پابندی کی جانب سے اور  
کشادہ کرنا ذرا سراہنے کی جانب سے اور کشادہ کرنا۔ جب اس کو دفن کر کے  
آپ واپس ہوئے تو سامنے سے اس کی بیوی کی جانب سے ایک شخص آپ

للہ ..... حدیث میں ان کا ذوق بھی کتنا بلند اور منصفانہ تھا۔ شیخ جلال الدین سیوطی ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فضائل کے باب میں  
خاص طور پر نقد کا معیار سخت نہیں رکھا اس کے باوجود جو فضیلت ان کے علم میں کسی ادنیٰ معیار پر بھی اتر نہیں سکی خواہ وہ کتنی ہی شہرت رکھتی تھی  
مگر انہوں نے اس کا ثبوت تسلیم نہیں کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں اگر اس کو تسلیم بھی کیا ہے تو اس کے مرفوع ہونے کا اقرار  
نہیں کیا اور صاف تحریر فرما دیا ہے کہ یہ صرف عبد اللہ بن سلام اور حضرت قتادہ کا بیان ہے۔ پھر یہ کتنا ظلم ہے کہ اتنے محتاط حضرات کو بھی غیر  
محتاط کہہ دیا جائے اور اپنے خیالات کو ان لوگوں کے اوپر بھی فوقیت دے دی جائے جن کے سامنے حدیثوں کے دفتر ہمہ وقت کف دست رہا  
کرتے تھے۔ ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی ایک ضرب سے پتھر کا ریزہ ریزہ ہو جانا چونکہ غزوہ خندق میں بسند صحیح  
ثابت تھا اس لیے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ کو انبیاء علیہم السلام کے دست مبارک یا قدم مبارک کے اثر سے ایک پتھر کا نرم ہونا  
قابل تعجب معلوم ہو رہا ہے اور وہاں قرآن کریم حضرت داؤد علیہ السلام کے حق میں لوہے کا نرم ہو جانا نقل کر رہا ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ  
آپ کے نزدیک قرآنی بیان اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی حقیقت بھی صرف ایک عام محاورہ کے برابر ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ اگر  
قرآن کریم صرف اس دور کے لیے محدود ہوتا جب کہ لوہے کی زرہ بنانے میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں جب بھی ”الانہ جدید“  
کو صرف ایک محاورہ سمجھ لینا اس کے سیاق و سباق کے بالکل خلاف تھا مگر جب کہ عقیدہ یہ ہے کہ قرآن عظیم قیامت تک کے لیے حکمت و  
موعظت کی کتاب ہے تو انصاف کیجئے کہ آج کی روشنی میں داؤد علیہ السلام کے اس معجزہ کو اگر صرف آپ کے مزعومہ خیال پر رکھا جائے تو  
اس کے پڑھنے والوں کا نظروں میں اس معجزہ کی حقیقت کتنی مضحکہ خیز ہو کر رہ جائے گی۔

(۱۰۱۸) \* تلخ و شیریں کا احساس تو عام بشر کی زبانیں بھی کر لیتی ہیں، مگر نبی و رسول وہ ہوتے ہیں جن کی زبان حلال و حرام کا بھی  
احساس کرتی ہے۔ سبحان اللہ۔ اسلام کتنا نازک اور کتنا پاکیزہ مذہب ہے کہ اس کے نزدیک ضیافت کا کھانا غیر ذمہ دارانہ اجازت کے بعد  
بھی کھانے کے قابل نہیں ہوتا وہ ایسے ہی مصرف میں آ سکتا ہے جہاں زیادہ چھان بین کا محل نہ ہو۔ جو لوگ میت کے مال میں قرض اور تقسیم  
وراثت سے قبل ہی کھانے پکا کر خود کھا لیتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ اس قسم کے کھانے اور اس قسم کے کھانے والوں سے میت کو ثواب ملتا ہے  
وہ ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر بھی غور کر لیں۔



رَجُلِيهِ أَوْسَعُ مِنْ قَبْلِ رَأْسِهِ فَلَمَّا رَجَعَ  
اسْتَقْبَلَ دَاعِيَ امْرَأَةٍ فَاجَابَ وَنَحْنُ مَعَهُ  
فَجِئْتُ بِالطَّعَامِ فَوَضَعَ يَدَهُ ثُمَّ وَضَعَ الْقَوْمُ  
فَاكَلُوا فَنَطَرْنَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلُوكُ لُقْمَةً فِيهِ ثُمَّ قَالَ أَجِدُ  
لَحْمَ شَاةٍ أُخِذَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ أَهْلِهَا فَأَرْسَلْتُ  
الْمَرْأَةَ تَقُولُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَرْسَلْتُ إِلَى  
النَّقِيعِ وَهُوَ مَوْضِعُ بَيْعٍ فِيهِ الْغَنَمُ لِيُشْتَرَى  
لِي شَاةٌ فَلَمْ تُوجَدْ فَأَرْسَلْتُ إِلَى جَارِ لِي قَدْ  
اشْتَرَى شَاةً أَنْ يُرْسَلَ بِهَا إِلَيَّ بِشَمْنِهَا فَلَمْ  
يُوجَدْ فَأَرْسَلْتُ إِلَى امْرَأَتِهِ فَأَرْسَلْتُ إِلَيْهَا  
فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
أَطْعِمِي هَذَا الطَّعَامَ الْأَسْرَى.

(رواه ابو داؤد و البيهقي في دلائل النبوة)

منها ما يتعلق بصوته صلى الله عليه وسلم  
(۱۰۱۹) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ جَلَسَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ  
لِلنَّاسِ اجْلِسُوا فَسَمِعَهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ رَوَاحَةَ وَ  
هُوَ فِي غَنَمٍ فَجَلَسَ فِي مَكَانِهِ. (رواه البيهقي  
و ابو نعيم كما في الخصائص ج ۶۶ ج ۱)

(۱۰۲۰) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ مُعَاذٍ التَّيْمِيِّ  
قَالَ خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

کو بلانے کے لیے آیا۔ آپ اس کے ہمراہ ہو لیے اس وقت ہم بھی آپ  
کے ساتھ تھے آپ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا، حسب دستور کھانے کے لیے  
پہلے آپ نے ہاتھ بڑھایا اس کے بعد صحابہؓ نے ہاتھ بڑھائے اور کھانا  
شروع ہو گیا۔ ہم نے دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لقمہ چبا رہے ہیں  
مگر نگلتے نہیں۔ اس کے بعد فرمایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گوشت کسی ایسی  
بکری کا ہے جو مالک کی اجازت کے بغیر حاصل کی گئی ہے۔ میت کی بیوی  
نے جواباً کہلا بھیجا یا رسول اللہ! واقعہ تو یہ ہے کہ میں نے مقام نقیع کے بازار  
میں جہاں بکریاں فروخت ہوتی تھیں ایک آدمی بھیجا تھا تا کہ وہ میرے لیے  
ایک بکری خرید لائے جب وہاں بکری نہ ملی تو میں نے اپنے ایک پڑوسی کے  
پاس آدمی بھیجا۔ اس نے ایک بکری خریدی تھی کہ جس قیمت میں اس نے وہ  
خریدی ہو اسی قیمت میں وہ مجھے بھیج دے۔ اتفاقاً وہ نہ ملا پھر میں نے اس کی  
بیوی کے پاس آدمی بھیجا اس نے مجھ کو یہ بکری بھیج دی ہے۔ رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر اس کھانے کو قیدیوں کو کھلا دو۔

(ابوداؤد و بیہقی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کا ایک کرشمہ

(۱۰۱۹) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم جمعہ کے دن جب منبر پر خطبہ کے لیے بیٹھے تو آپ نے لوگوں سے فرمایا  
بیٹھ جاؤ۔ آپ کی یہ آواز عبداللہ بن رواحہ کے کان میں بھی پہنچ گئی اس  
وقت وہ بکریوں میں تھے آپ کی آواز کا سننا تھا کہ وہ فوراً وہیں بیٹھ گئے۔

(الخصائص)

(۱۰۲۰) عبدالرحمن بن معاذؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے منیٰ میں ہمارے سامنے خطبہ دیا تو اس کو سننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے

(۱۰۲۰) \* ہوا کی مخالفت و موافقت سے اور آواز کی قدرۃ بلندی و پستی سے دور تک آواز کے پہنچنے نہ پہنچنے کا فرق تو عام بشر میں بھی ہو جاتا ہے  
مگر ایک ہی انسان میں اس کے معمول کے برخلاف اس کی آواز ہر ہر خیمہ میں اس طرح جا پہنچی جیسے وہ یہاں کھڑا بات کر رہا ہے کبھی کبھی انبیاء  
علیہم السلام ہی میں ثابت ہوتا ہے۔ صحابہؓ بھی کتنے فہیم کتنے با ایمان اور مستحکم عقیدہ کے لوگ تھے کہ نہ تو انہوں نے آپ کی اس غیر معمولی لہجہ.....

بِمَعْنَى فَفَتَحَتْ أَسْمَاعَنَا وَفِي لَفْظٍ فَفَتَحَ اللَّهُ  
أَسْمَاعَنَا حَتَّى أَنْ كُنَّا لَنَسْمَعُ مَا يَقُولُ وَنَحْنُ  
فِي مَنَازِلِنَا. (رواہ ابن سعد کما فی الخصائص)

ہمارے کان اس طرح کھول دیئے تھے کہ ہم تمام جہاں جہاں تھے بیٹھے  
ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سب وہیں سن رہے تھے۔  
(خصائص)

منہا ما يتعلق بحاسة البصر  
(۱۰۲۱) عَنْ أَنَسٍ قَالَ أَقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَأَقْبَلَ  
عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
بِوَجْهِهِ فَقَالَ أَقِيمُوا صَفُوفَكُمْ وَتَرَاوُوا  
فَإِنِّي أَرَاكُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِي. (رواہ البخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک کی امتیازی خصوصیت  
(۱۰۲۱) انس رضی اللہ عنہ سے روایت کہ ایک مرتبہ جماعت کھڑی ہوئی تو  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف اپنا رخ پھیر کر فرمایا۔ اپنی صفیں  
سیدھی کرو اور خوب مل کر کھڑے ہو، کیونکہ میں تم کو اپنی پشت کی طرف  
سے بھی دیکھتا ہوں۔  
(بخاری شریف)

(۱۰۲۲) عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ  
(۱۰۲۲) انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

للہ..... آواز کو ہوا کی موافقت کا کرشمہ سمجھا اور نہ اس کو غیر معقول تصور کیا بلکہ بڑی آسانی کے ساتھ یوں حل کر لیا کہ جس قدرت نے ہم  
کو ایک محدود فاصلہ پر شنوائی کی قوت عطا فرمائی ہے۔ اسی نے آج اس سے کچھ زیادہ فاصلہ پر شنوائی کی قوت بخش دی ہے۔ انبیاء علیہم  
السلام تو اپنے جسمانی خواص میں ممتاز ہوتے ہی تھے مگر حق یہ ہے کہ ان کے مخاطب بھی ساری مخلوق میں ممتاز صفت ہوتے تھے۔ آواز کی  
وسعت کا یہ کرشمہ کچھ آپ ہی کے عہد پر ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ ان کمالات میں سے تھا جس میں آپ کی امت کو بھی حصہ ملا تھا اس لیے ایک  
مرتبہ مدینہ طیبہ میں عمر رضی اللہ عنہ کی آواز نہاوند کی فوج میں بھی سنی جا چکی ہے۔ جیسا کہ کرامات کے باب میں آپ کی نظر سے گزرے گا۔  
غنیمت ہے کہ ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر نے اب روشن خیالوں کے لیے بھی اس کی وجہ جواز پیدا کر دی ہے۔

(۱۰۲۲) \* اپنے سامنے کی چیز دیکھ لینا تو ہر انسان کا خاصہ ہے لیکن رسول وہ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سامنے اور پیچھے دیکھنے کی یکساں  
طاقت عنایت فرمادیتا ہے۔ اگر آنکھ میں اپنے سامنے دیکھنے کی طاقت عام طور پر نہ ہوتی تو کیا کوئی انسان صرف عقل سے یہ حکم لگا سکتا تھا کہ  
اس عضو میں دیکھنے کی طاقت ہونی چاہیے پس جس نے اس میں صرف ایک سمت دیکھنے کی طاقت عام طور پر رکھ دی ہے کیا اس کو قدرت نہیں  
کہ وہ کسی کے حق میں مخالف سمت میں دیکھنے کی طاقت بھی پیدا فرمادے۔ قرآن کریم میں روزِ محشر انسانی جوارح کی بات چیت کرنا ثابت  
ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ جب انسان اپنے خلاف ان کی شہادت سن کر ان سے تعجب سے کہہ گا ”لم شہدتم علینا“ تو اس کے جواب  
میں وہ بھی کہیں گے ”جس نے اور چیزوں کو قوت گویائی عطا فرمائی تھی اس نے آج ہم کو بھی یہ طاقت عطا فرمادی۔ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ  
ہم اپنے سامنے رکھے ہوئے کھانے کی تسبیح خود سنتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کھانے میں سے بکری کی دست اٹھا کر یہود  
سے فرمایا تھا کہ کھانے میں زہر ملانے کی خبر مجھ کو اس نے دی ہے۔ جب ان اعضاء میں نطق کی طاقت پیدا ہو جانا ممکن ہوا تو آنکھ میں صرف  
بینائی کی طاقت کا اور ترقی کر جانا ناممکن کیوں سمجھا جائے۔ یہاں آپ کے قسم کھانے کے بعد بھی اگر کسی کو یقین نہ آئے تو اس کے لیے اب اور کوئی  
راستہ نہیں ہے۔ وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ۔ یہاں ترجمان السنۃ ج ۱۸ حدیث نمبر ۷۱۸ ضرور ملاحظہ فرمالیجئے۔



عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ اسْتَوُوا اسْتَوُوا فَوَ الَّذِي  
نَفْسِي بِيَدِهِ اِنِّي لَا رَاكُمْ مِنْ خَلْفِي كَمَا  
اَرَاكُمْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ. (رواه ابو داؤد)

(۱۰۲۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ صَلَّى بِنَا رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ وَفِي مُوْخَرِ  
الصُّفُوفِ رَجُلٌ فَاسَاءَ الصَّلَاةَ فَلَمَّا سَلَّمَ نَاوَاهُ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا فُلَانُ اَلَا  
تَتَّقِي اللَّهَ اَلَا تَرَى كَيْفَ تُصَلِّي اِنَّكُمْ تَرَوْنَ اَنَّهُ  
يَخْفِي عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا تَصْنَعُونَ وَاللَّهِ اِنِّي لَا رَى  
مِنْ خَلْفِي كَمَا اَرَى مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ. (رواه احمد)

منها ما يتعلق بحاسة السمع

(۱۰۲۴) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ بَيْنَا رَسُولُ  
اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلَى  
بَغْلَةٍ لَهُ وَنَحْنُ مَعَهُ اِذْ حَدَثَ بِهِ دَابَّتُهُ  
فَكَادَتْ تُلْقِيهِ وَاِذَا اقْبَرُ سِتَّةٌ اَوْ خَمْسَةٌ  
فَقَالَ مَنْ يَعْرِفُ اَصْحَابَ هَذِهِ الْقُبْرِ قَالَ  
رَجُلٌ اَنَا قَالَ فَمَتَى مَاتُوا قَالَ فِي الشُّرْكِ

فرمایا کرتے تھے (جماعت میں) سیدھے سیدھے کھڑے ہو جاؤ اس ذات  
کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تم کو اپنی پشت کی جانب سے بھی  
اسی طرح دیکھتا ہوں جیسا کہ اپنے سامنے کی جانب سے۔ (ابوداؤد)

(۱۰۲۳) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ظہر کی نماز پڑھائی۔ اس میں ایک شخص نے جو  
آخری صف میں شامل تھا نماز میں کچھ کوتاہی کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
جب سلام پھیرا تو اس کو آواز دے کر فرمایا اے فلاں اللہ سے ڈرتا نہیں؟  
دیکھتا نہیں کیسی نماز پڑھتا ہے۔ تم لوگوں کا خیال شاید یہ ہوگا کہ جو حرکتیں تم  
کرتے ہو وہ مجھ سے پوشیدہ رہتی ہیں بخدا جیسا میں اپنے سامنے سے دیکھتا  
ہوں اسی طرح پشت کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں۔ (رواہ احمد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ سامعہ کی امتیازی خصوصیت

(۱۰۲۴) زید بن ثابتؓ بیان فرماتے ہیں ایسا اتفاق ہوا کہ آنحضرت صلی  
اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بنو النجار کے کسی باغ میں ایک خچر پر سوار تھے اس وقت  
ہم لوگ بھی آپ کے ہمراہ حاضر تھے کہ دفعۃً آپ کی سواری اس زور سے  
بد کی قریب تھا کہ آپ گر جاتے۔ دیکھا تو وہاں پانچ یا چھ قبریں تھیں۔ آپ  
نے پوچھا کوئی ہے جو ان مدفون شخصوں کو پہچانتا ہو ایک شخص بولا میں پہچانتا  
ہوں۔ آپ نے پوچھا یہ مردے کس زمانے کے ہیں۔ اس نے جواب دیا

(۱۰۲۳) \* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک کی یہ صفت بھی مختلف صحابہؓ سے مختلف طور پر روایت کی گئی ہے اس روایت سے یہ  
معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ظہر کی نماز کا تھا۔ جو شخص اس ارشاد کا باعث بنا وہ سب سے آخر صف میں شامل تھا یہاں اتنی بات اور زیادہ ہے کہ  
نمازوں میں تمہاری ہر حرکت کا مجھے علم ہو جاتا ہے وہ بھی کسی اور ذریعہ سے نہیں بلکہ خاص دیکھ کر اور اس لیے آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ  
جس طرح میں اپنے سامنے سے دیکھتا ہوں اسی طرح پشت کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں۔ راہ اعتدال یہ ہے کہ حدیثوں میں جو صفات جس  
حد تک ثابت ہوں ان کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے نہ ان میں تاویلات کی جائیں اور نہ ان میں اپنی جانب سے مبالغے کیے جائیں۔

(۱۰۲۴) \* بیمار اور غم رسیدہ انسانوں کی آہ و بکا تو ہر بشر سنتا ہے لیکن رسول وہ ہوتے ہیں جو مردہ انسانوں کے نالہ و فریاد بھی سن لیتے ہیں  
چونکہ ان کے یقین کے عالم میں عقیدہ اور چشم دید حالت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا اس لیے جو باتیں وہ جانتے ہیں اس کو دیکھنے کی  
طاقت بھی رکھتے ہیں عام انسانوں میں یہ بات نہیں ہوتی اس لیے بعض شدید واقعات کے دیکھنے کی ان میں طاقت نہیں ہوتی۔ یہاں آپ نے  
مستقبل ہولناک حوادث میں سے سب سے پہلے عذاب دوزخ کی یاد دلائی اور سب سے آخر میں ایک ایسے فتنہ کی یاد تازہ کی جو امت میں سب  
سے زیادہ ہولناک ہوگا۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کے ہولناک فتنہ کا اثر بعض اہل قبور پر بھی ہوگا۔ اس لیے اس موقعہ اللہ.....

فَقَالَ إِنَّ هَذِهِ الْأُمَّةَ تُبْتَلَىٰ فِي قُبُورِهَا فَلَوْلَا  
أَنْ لَا تَدْفِنُوا لَدَعَوْتُ اللَّهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ  
عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِي أَسْمَعُ مِنْهُ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا  
بِوَجْهِهِ فَقَالَ تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ  
قَالُوا نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالَ تَعَوَّذُوا  
بِاللَّهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالُوا نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ  
عَذَابِ الْقَبْرِ قَالَ تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا  
ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالُوا نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ  
الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالَ تَعَوَّذُوا  
بِاللَّهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَالِ قَالُوا نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ  
فِتْنَةِ الدَّجَالِ (رواه مسلم)

منها ما يتعلق بريقة صلى الله عليه وسلم  
(۱۰۲۵) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ إِذَا اشْتَكَى  
الْإِنْسَانُ الشَّيْءَ مِنْهُ أَوْ كَانَتْ بِهِ قَرْحَةٌ أَوْ  
جُرْحٌ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
بِأَصْبَعِهِ بِسْمِ اللَّهِ تَرْبَةً أَرْضِنَا بِرِيقَةٍ بَعْضُنَا  
لِيَشْفَى سَقِيمُنَا بِإِذْنِ رَبِّنَا. (متفق عليه)

شرک کے زمانے کے اس پر آپ نے فرمایا اس امت کا قبر میں امتحان ہوتا ہے۔ اگر کہیں یہ خطرہ نہ ہوتا کہ مارے دہشت کے تم دفن کرنا ہی بھول نہ جاؤ گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتا کہ جو عذاب قبر میں سنتا ہوں وہ تم کو بھی سنا دے۔ پھر آپ نے ہماری طرف رخ بدل کر فرمایا اللہ تعالیٰ کے سامنے عذاب دوزخ سے پناہ مانگو۔ لوگوں نے فوراً کہا ہم اللہ کے سامنے عذاب دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں۔ پھر فرمایا عذاب قبر سے بھی پناہ مانگو ہم نے فوراً اللہ تعالیٰ سے عذاب قبر سے پناہ مانگی اس کے بعد آپ نے فرمایا اچھا تمام فتنوں سے بھی پناہ مانگو ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ ہم نے فوراً کہا ہم اللہ تعالیٰ سے تمام قسم کے فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ ہوں۔ آخر میں آپ نے فرمایا کہ دجال کے فتنے سے بھی پناہ مانگو ہم نے فوراً دعاء مانگی۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دجال کے فتنے سے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ (مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لعابِ دہن کی امتیازی خصوصیت  
(۱۰۲۵) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں۔ جب کوئی شخص بیمار پڑتا یا اس کے جسم میں کہیں زخم ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مٹی میں ذرا سا اپنا لعاب مبارک ڈال کر انگلی سے ملاتے جاتے اور یہ کلمات پڑھتے جاتے بسم اللہ الخ یعنی یہ ہماری زمین کی مٹی اور ہمارا لعاب دہن ہے ہم اس کو ملا کر اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لگاتے ہیں تاکہ ہمارے رب کے حکم سے ہمارا بیمار شفاء یاب ہو جائے۔

للہ..... پر اس سے بھی تعوذ کی تعلیم فرمائی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ آنحضرتؐ نے کس کس طرح ہر موقع پر جن فتنوں کی یاد دہانی فرمائی تھی امت کے ناخلف افراد آج یا تو ان کا صاف انکار کر رہے ہیں ورنہ تاویل پر آمادہ ہیں۔

(۱۰۲۵) \* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات میں یہاں آپ کے لعابِ دہن کا تذکرہ ہے اس کے معجزانہ کرشمے تو آپ کے سامنے معجزات کی بحث میں آئیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کسی کی آنکھ کا آشوب اس طرح صاف ہو گیا جیسے کبھی کوئی تکلیف ہی نہ تھی کسی کی شکستہ ہڈی اس طرح جڑ گئی جیسے کبھی اس میں کوئی نقصان ہی نہ ہوا تھا۔ یہاں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے سامنے مرہم شفاء کا یہ ایک عام نسخہ بھی تھا۔ سبحان اللہ کیا کمال تھا پھر اس کمال کے ساتھ کتنی فروتنی تھی اور اس فروتنی میں کتنی حقیقت تھی کہ اس مرہم کی ساری شفاء کا تصور آپ اسی کے نام کی یرکت کے ساتھ وابستہ فرماتے ہیں جو رب محمد ہے اللہم صل وسلم وبارک علیہ کما تحب وترضی۔ غور فرمائیے کہ رسول کس طرح ہر موقع پر انسانی نفع و ضرر کا رشتہ ایک اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں۔ کون تھا جس کو شفاء تو اس کیمیاوی نسخہ سے ہوتی مگر اس کے سامنے تصور یہ ہوتا کہ یہ ساری شفاء ہے سب حکم ربانی کے تحت۔ اس لیے انسان کی کمزور فطرت کے لیے اس جملہ کا ہر کلمہ میں اس حقیقت پر تنبیہ ضروری سمجھی گئی آپ کا یہ مختصر جملہ کیا تھا گویا شفاء کا تعویذ بھی تھا اور رسالت و توحید کا ہدایت نامہ بھی۔ آج اصولِ طب کے لحاظ سے بھی مٹی میں بہت سے امراض کے لیے شفاء مسلم ہو چکی ہے۔



### منہا ما يتعلق بالنوم

(۱۰۲۶) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوتِرَ فَقَالَ يَا عَائِشَةُ إِنَّ عَيْنِي تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي. (رواه الشيخان راجع ترجمان السنۃ ص ۴۳۲ ج ۱)

(۱۰۲۷) عَنْ عَطَاءٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَنَا مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ تَنَامُ أَعْيُنُنَا وَلَا تَنَامُ قُلُوبُنَا. (اخرجه ابن سعد كذا في الخصائص)

### آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کی خصوصیت

(۱۰۲۶) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا نماز وتر پڑھنے سے قبل آپ سو سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا عائشہ! صرف میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا وہ بیدار رہتا ہے۔ (شیخین)

(۱۰۲۷) عطاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ ہم لوگ جو انبیاء ہوتے ہیں ہماری صرف آنکھیں ہی آنکھیں سوتی ہیں ہمارے دل نہیں سوتے۔ (خصائص الکبریٰ)

(۱۰۲۶) \* حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ مسئلہ معلوم تھا کہ سونے سے وضو جاتا رہتا ہے۔ اس لیے جو شخص سو کر اٹھے اور نماز کا ارادہ ہوتا اس کو وضو کرنا لازم ہے مگر جب یہاں انہوں نے دیکھا کہ آپؐ سو جاتے ہیں اور پھر وضو اکیے بغیر وتر پڑھ لیتے ہیں۔ تو آپؐ کی فہم پر قربان کہ یہ نہیں فرمایا کہ آپؐ نے وضو کیوں نہیں کیا، بلکہ یہ فرمایا کیا آپؐ نماز سے قبل سو جاتے ہیں یعنی پھر اٹھ کر وضو اکیے بغیر نماز ادا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اب تک گو آپؐ کی نیند کی خصوصیت نہ جانتی ہوں مگر اتنا جانتی تھیں کہ نبیؐ اپنی بہت سی باتوں میں عام بشر سے ممتاز ہوتا ہے یہ صورت بھی ضرور کسی امتیاز ہی پر مبنی ہوگی۔

(۱۰۲۷) \* بیداری کی حالت میں تو عام بشر کے قلوب بھی بیدار رہتے ہیں مگر رسولؐ وہ ہوتے ہیں جن کے قلوب سونے میں بھی بیدار رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہ بیداری نہیں ہے جس کا آپؐ ادراک کر سکیں۔ یہ وہ بیداری ہے جس کے سامنے عالم غیب سب کھلا ہوا ہوتا ہے۔ عام بشر جس طرح بیداری میں عالم شہادت کا ادراک کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام حالت خواب میں بھی اس سے بڑھ کر عالم غیب کا ادراک فرما لیتے ہیں گویا عام بشر پر جن حالات میں پوری غفلت طاری ہوتی ہے وہ ان حالات میں بھی پورے ہوشیار رہتے ہیں پھر ان کے ادراک کی نوعیت بھی ہمارے ادراک سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کی حقیقت سمجھنے سے بھی وحی کی ایک قسم شمار کیا گیا ہے ایک واقعہ میں جو ”لیلۃ التعریس“ کے نام سے مشہور ہے حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں و کنا لا نوقظ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من منامة اذا نام حتی یستيقظ. (مسلم شریف ج ۱ ص ۲۴۰) یعنی صحابہؓ کا دستور یہ تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواب استراحت میں ہوتے تو ہم آپؐ کو اس وقت تک بیدار نہ کرتے جب تک کہ آپؐ از خود بیدار نہ ہو جائیں۔ بخاری شریف (ص ۶۸۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی یہی طریقہ تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چلتے چلتے ٹھیک منزل مقصود پر پہنچ گئے تو ان کی آنکھ لگ گئی مگر حضرت یوشع نے جو ان کے رفیق سفر تھے فرمایا ”لا اوقظه“ میں آپؐ کو بیدار نہیں کروں گا اس کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام خود بیدار ہوئے تو وہ مچھلی کے عجیب واقعہ کا ذکر کرنا ان سے بھول گئے اور آگے چل پڑے الی آخر القصة۔

پھر جب ان کی نیند صرف آنکھوں تک محدود ہوتی ہے تو اسی سے ان کی موت کا بھی کچھ اندازہ کر لینا چاہیے، کیونکہ ”النوم اخ الموت“ مشہور ہے وہ بھی نیند کی طرح ان پر طاری ضرور ہوتی ہے مگر عام بشر کی موت کی طرح نہیں یہاں بھی ان کو بڑا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر زندہ کا اطلاق آیا ہے۔ اللہ.....

## منہا تخیرہم قبل

## الوفاة

وفات سے قبل انبیاء علیہم السلام کو اپنی حیات و موت میں اختیار  
ملنے کی خصوصیت

(۱۰۲۸) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ إِنَّ عَبْدًا خَيْرُهُ اللَّهُ بَيْنَ أَنْ يُؤْتِيَهُ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا مَا شَاءَ وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ فَاخْتَارَ مَا عِنْدَهُ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ فَدَيْنَاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَبَائِنَا وَأُمَّهَاتِنَا قَالَ فَعَجَبْنَا فَقَالَ النَّاسُ انْظُرُوا إِلَى هَذَا الشَّيْخِ بِخُبْرٍ

(۱۰۲۸) ابوسعید خدریؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھے اور فرمایا اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دے دیا ہے اگر وہ چاہے تو دنیا کے مال و دولت کی رونق جیسی وہ چاہتا ہے اس کو عطا فرما دے اور اگر چاہے تو جو انعامات و اکرام حق تعالیٰ کے یہاں اس کے لیے تیار ہیں ان کو اختیار کر لے اللہ تعالیٰ کے اس بندہ نے ان دونوں میں سے ان انعامات ہی کو پسند کر لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہیں۔ یہ سن کر ابوبکرؓ بے ساختہ بول اٹھے یا رسول اللہ آپ پر ہم اپنے ماں باپ سمیت قربان ہوں۔ ابوبکرؓ کے اس فرمانے سے ہم کو تعجب ہوا اور

للہ..... قرآن جب شہداء کی موت کے متعلق صرف اس پر کفایت نہیں کرتا کہ تم ان کو مردہ مت سمجھو بلکہ یہ کہتا ہے کہ ان کو مردہ کہو بھی مت اور اس کی تشریح یوں کرتا ہے کہ ان کو رزق بھی ملتا ہے، گویا جس کو رزق تک ملے وہ مردہ کہاں ہیں۔ تو اب انبیاء علیہم السلام جو شہداء سے کہیں اونچا مقام رکھتے ہیں ان کی موت کو عام انسانوں کی طرح کہہ دینا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، مگر یہ ظلم بھی کتنا بڑا ظلم ہے کہ صرف اس امتیاز کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کو جنس بشر ہی سے خارج سمجھ لیا جائے۔ خوب یاد رکھو رب العالمین کی بارگاہ بلند وہ ہے جس کے متعلق ارشاد ہے لَا تَأْخُذْهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ وہ ایسا زندہ ہے جس کو نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ آتی ہے۔ پھر جس کو نیند بھی آتی ہو اور جو موت سے بھی مستثنیٰ نہ رہے اس کو خدا تعالیٰ کی کسی صفت میں شریک کر دینا کتنا بڑا شرک ہوگا۔ بشر کو خالق سے ممتاز کرنے کے لیے صرف اس کی مخلوقیت کی بیچارگی ہی بہت کافی ہے۔ اس جگہ ترجمان السنہ ۳۹۱ ج ۱ کا نوٹ ضرور ملاحظہ فرمالیا جائے۔

(۱۰۲۸) \* حدیث مذکور میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص امتیازی صفت کا ذکر آیا ہے اسی کے ساتھ صدیق اکبرؓ کے متعلق بھی ایک خاص امتیازی نوازش کا ذکر آ گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سروری تو امت کے سامنے ایک بدیہی مسئلہ تھا۔ پھر آپ کی شانِ عبدیت نے نام لے کر اس کو صاف صاف بیان کرنا پسند نہ کیا مگر اپنی وفات کے ساتھ ساتھ جس امر کا وضاحت کے ساتھ ذکر فرمانا احکام و مسائل کی طرح امت کے سامنے ضروری سمجھا وہ ابوبکرؓ صدیق کی ایک امتیازی شان تھی۔ اس پر بحث کرنا بہت نامناسب ہے کہ خلت کی حقیقت کیا ہے جس میں کسی کے لیے بھی شرکت کی گنجائش نہیں نکل سکتی مگر اتنا آپ کی زبان مبارک سے پھر نکل گیا کہ اگر اس میں شرکت کا کوئی امکان ہوتا تو اس کے حق دار بھی سب سے پہلے صدیق اکبرؓ ہوتے اور اس کی بنیاد اس کے سواء اور کچھ نہیں کہ اسلام کے لیے جان و مال کی جو قربانی اور جتنی بر محل انہوں نے پیش کی اس میں دوسرا کوئی ان کا شریک نہیں تھا۔ آپ کے بیان میں ان کے حق میں جو بلند سے بلند کلمات آ سکتے تھے وہ بھی آ گئے اور اسی کے ساتھ عملی لحاظ سے ”فتح خوختہ“ یعنی مسجد کی جانب صرف ایک ان کا دروازہ کھلا رکھنے کی اجازت اور دوسروں کے تمام دروازوں کے بند ہونے کا حکم بھی صادر ہو گیا۔ ادھر آپ کی عمر بھر کے صحبت یافتہ صحابہ کی زبانوں سے للہ.....



رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَبْدِ خَيْرِهِ اللَّهُ أَنْ يُؤْتِيَهُ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا مَا شَاءَ وَ بَيْنَ مَا عِنْدَ اللَّهِ وَ هُوَ يَقُولُ فَدَيْنَاكَ بِأَبَائِنَا وَ أُمَّهَاتِنَا فَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ الْمُخِيرُ وَ كَانَ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ هُوَ أَعْلَمُنَا بِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ أَمَنِ النَّاسِ عَلَى فِي صُحْبَتِهِ وَ مَا لَهُ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ وَ لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَا تَخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ خَلِيلًا وَ لَكِنْ أُخُوَّةَ الْإِسْلَامِ لَا تُبْقَيْنَ فِي الْمَسْجِدِ خَوْخَةَ إِلَّا خَوْخَةُ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ.

(رواه الترمذی و قال هذا حديث صحيح)

منها ما يتعلق بتخييرهم عند الوفاة (۱۰۲۹) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ وَ هُوَ صَحِيحٌ إِنَّهُ لَنْ يُقْبَضَ نَبِيٌّ حَتَّى يُرَى مَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ بُخِيرَ قَالَتْ عَائِشَةُ فَلَمَّا نَزَلَ بِهِ وَ رَأْسُهُ عَلَى فَحْدِي غَشِيَ عَلَيْهِ ثُمَّ أَفَاقَ فَاشْخَصَ بَصَرَهُ إِلَى سَقْفٍ ثُمَّ قَالَ اللَّهُمَّ

لوگوں نے کہا ان بزرگ کو دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بندہ کا حال نقل فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اختیار دے دیا ہے اگر وہ چاہے تو جتنی وہ چاہے اس کو دنیا کی زیبائش و آرائش مرحمت فرما دے اور اگر چاہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں کے انعامات و اکرام پسند کر لے۔ اس پر یہ بزرگ کیا فرما رہے ہیں کہ آپ پر ہم اپنے ماں باپ سمیت قربان ہوں۔ پھر بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ جس بندہ کو اختیار دیا گیا تھا وہ تو خود آپ ہی کی ذات گرامی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب میں اس راز کو زیادہ سمجھنے والے ابو بکر ہی تھے اس کے بعد رسول اللہ نے فرمایا۔ جس کی رفاقت اور جس کے مال کا احسان مجھ پر سب سے زیادہ ہے وہ ابو بکر کی ذات ہے اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو صرف ابو بکر ہی کو بناتا (لیکن میرا یہ تعلق صرف ایک ذات الہی کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے) اب ایک اخوت اسلامی باقی ہے لہذا مسجد کی جانب کی جتنی کھڑکیاں ہیں ان میں سے کوئی کھلی نہ رہے بس صرف ایک کھڑکی ابو بکر کے گھر کی کھلی رہے (کہ میرے بعد خلافت کی ذمہ داری کی وجہ سے ان کو آمد و شد کی ضرورت زیادہ ہوگی) (ترمذی شریف)

وفات کے وقت انبیاء علیہم السلام کو پھر اختیار ملنے کی خصوصیت (۱۰۲۹) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بالکل تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کسی نبی کی وفات نہیں ہوتی جب تک کہ جنت میں اس کا مقام اس کو دکھا نہیں دیا جاتا اس کے بعد پھر اس کو یہ اختیار بھی دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے پسند کر لے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت آیا اس وقت آپ کا سر مبارک میری ران پر رکھا ہوا تھا تو آپ کے اوپر بے ہوشی طاری ہو گئی اس کے بعد جب آپ کو ذرا ہوش آیا تو

..... ضمنی طور پر جو کلمہ یہاں نکل گیا اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس رفیق غار کے علم و فہم میں برتری کا مسئلہ ان کے درمیان ایک مسلم مسئلہ تھا پھر اس کا بھی جس طرح عملی ظہور ہوا وہ صدیق اکبر کے خطبہ سے ظاہر ہے۔ اب جس کے متعلق صحابہ کی شہادت یہ ہو اور خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز و تکریم کے کلمات یہ ہوں ان کے متعلق اب امت کا عقیدہ کیا رہنا چاہیے۔

(۱۰۲۹) \* ترجمان السنۃ ص ۸۲ ج ۲ میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اسی ضابطہ کے ماتحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اختیار دیا گیا تھا۔ اگر وہ ابھی دنیا میں اور جینا پسند کرتے ہیں تو جتنا چاہیں اور جی سکتے ہیں لیکن اس اختیار کا منشاء چونکہ صرف ان کی تشریف و تکریم تھا لہذا.....

الرَّفِیقُ الْأَعْلٰی قُلْتُ اِذْنُ لَا یَخْتَارُنَا قَالَتْ وَ  
عَرَفْتُ اَنَّهُ الْحَدِیْثُ الَّذِیْ كَانَ یُحَدِّثُنَا بِهِ وَ  
هُوَ صَحِیْحٌ فِیْ قَوْلِهِ اَنَّهُ لَنْ یُقْبَضَ نَبِیٌّ قَطُّ  
حَتّٰی یُرٰی مَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ یُخَیَّرُ قَالَتْ  
عَائِشَةُ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا فَكَانَ الْاٰخِرُ  
كَلِمَةً تَكَلَّمَ بِهَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم  
قَوْلُهُ اَللّٰهُمَّ الرَّفِیقُ الْأَعْلٰی.

(متفق علیہ)

(۱۰۳۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُبِضَ رَسُولُ اللّٰهِ  
صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم بَيْنَ سَحْرَى وَ نَحْرَى  
فَلَمَّا خَرَجَتْ نَفْسُهُ لَمْ اَجِدْ رِیْحًا قَطُّ اَطِیْبَ  
مِنْهُ. (اخرجه البزار و البیهقی بسند صحیح)

آپ نے اپنی نظر چھت کی طرف اٹھا کر فرمایا۔ الہی میں سب سے بڑے  
رفیق کو اختیار کر چکا میں اسی وقت سمجھ گئی کہ اب آپ ہم کو اختیار نہیں کریں  
گے اور اب یہ وہی وقت ہے جس کو آپ صحت کی حالت میں ہم سے بیان  
فرمایا کرتے تھے اور بے شک آپ اپنے بیان میں بالکل سچے تھے۔ جب  
تک نبی کو اس کا جنت کا مقام دکھایا نہیں جاتا اس کی وفات بھی نہیں ہوتی اس  
کے بعد پھر اس کو اختیار دے دیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ  
کی زبان مبارک سے جو آخری کلمہ نکلا تھا وہ یہ حرف تھے۔ الہی میں سب سے  
بڑے رفیق کو اختیار کر چکا۔ (متفق علیہ)

(۱۰۳۰) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا  
وصال میری ٹھوڑی اور سینہ کے درمیانی حصہ میں ہوا ہے۔ جب آپ کی  
روح عالم قدس کی طرف پرواز کرنے لگی تو میں نے ایک ایسی خوشبو محسوس کی  
جو پھر کبھی محسوس نہ کی۔ (بزار)

اللہ..... اس لیے ان کا دل اسی طرف مائل ہو گیا جو عالم تقدیر میں ان کے لیے مقرر ہو چکا تھا۔ پس موت انبیاء علیہم السلام کو بھی آتی ہے مگر  
عام بشر کی طرح اچانک نہیں بلکہ اطلاع کے بعد اور روح ان کی بھی قبض کی جاتی ہے مگر ان کی بلا اجازت نہیں بلکہ اجازت کے بعد۔ پھر جس  
طرح بانصیب امتی اپنے انبیاء کے کمالات میں حصہ رسد شریک ہو جاتے ہیں اسی طرح یہاں بھی ان کو اتنا حاصل جاتا ہے کہ جبر و اکراہ سے  
ان کو بھی موت نہیں آتی بلکہ عالم تکوین میں قدرت کچھ ایسے سامان پیدا فرما دیتی ہے کہ وہ موت سے پہلے دنیا کو بخوشی چھوڑنے پر آمادہ ہو  
جاتے ہیں۔ دیکھو ترجمان السنہ ص ۲۸۸ ج ۱۔ مذکورہ بالا حدیث کو ترجمان السنہ کی ان دونوں حدیثوں کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو آپ کو یقین  
ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی وحی انسانی خیالات سے کتنی بلند ہوتی ہے جس میں کہیں اختلاف و انتشار کا نام نظر نہیں آتا۔ ان کے کسی  
زمانہ کسی محل اور کسی حالت کے کلام کو ملا لیا جائے ان میں کہیں سرواختلاف نہیں ملتا۔ ہر جگہ وہ ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انبیاء  
علیہم السلام کا اس تحسیر کے مسئلہ پر ہی غور کر لیجئے۔ جو بات کبھی صحت میں آپ کی زبان مبارک سے نکلی تھی اور جب آپ کی وفات کا  
وقت آیا تو اس غیر اختیاری حالت میں بھی وہی حقیقت ثابت ہوئی اس لیے اختیاری اور غیر اختیاری حالتوں میں وحی کی یہ تعجب انگیز حقیقت  
دیکھ کر حضرت عائشہؓ کی زبان سے بے ساختہ آپ کی صداقت کی داد نکل گئی۔

اس جگہ انبیاء علیہم السلام کی خلوت و جلوت کا کچھ اندازہ بھی کرنا چاہیے کہ جو ابھی ابھی تمام ترامت کی طرف مخاطب تھے اور اپنی  
کرب و بے چینی کی حالت میں بھی ان کی نصیحت و خیر خواہی کے لیے گھلے جا رہے تھے۔ جب رفیق اعلیٰ کی جانب سے ان کو دعوت نامہ پہنچ گیا  
تو اتنے یکسو ہو کر سب سے بیگانہ بن گئے کہ سب سے محبوب بی بی بھی مایوس ہو کر بڑے حسرت کے لہجہ میں فرماتی ہیں میں سمجھ گئی اب آپ ہم کو  
اختیار نہیں فرمائیں گے۔



(۱۰۳۱) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا میں نے اپنا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر رکھ کر آپ کو دیکھا تھا۔ بس کیا کہوں کئی جمعے گزر چکے ہیں۔ کھاتی بھی ہوں اور وضو بھی کرتی ہوں مگر وہ مشک کی سی خوشبو میرے ہاتھوں سے نہیں جاتی۔

بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی خصوصیت

(۱۰۳۲) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو باہم یہ گفتگو ہونے لگی بخدا ہم کو اس کا علم نہیں کہ جس طرح ہم اپنے مردوں کے جسم کے کپڑے اتار لیتے ہیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کے کپڑے بھی اتار لیں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کپڑوں ہی میں غسل دے دیں۔ جب اختلاف زیادہ ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی نیند غالب کی کہ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ بچا جس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے جانہ لگی ہو پھر گھر کے ایک گوشہ سے کسی کہنے والے نے کہا معلوم نہیں وہ تھا کون ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں ہی میں غسل دے دو۔“

والحاکم و البیہقی و صححاه و ابو نعیم کما فی الخصائص ص ۲۷۵ ج ۲ و اخرج ابن ماجہ عن بريدة و ابن بريدة و ابن سعد و الطبرانی عن ابن عباس نحوه

آنحضرت پر نماز جنازہ کی ایک امتیازی خصوصیت

(۱۰۳۳) حضرت ابن مسعود روایت فرماتے ہیں جب آنحضرت صلی اللہ

(۱۰۳۱) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ وَضَعْتُ يَدِي عَلَى صَدْرِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ مَاتَ فَمَرَّبِي جُمَعَ أَكُلٌ وَ اتَوَضَّأَ مَا يَذْهَبُ رِيحُ الْمِسْكِ مِنْ يَدِي. (اخرجه البيهقي کما فی الخصائص ص ۲۷۴ ج ۲)

منها ما تتعلق بتجريدہ صلی اللہ

علیہ وسلم عن ثیابہ عند غسلہ

(۱۰۳۲) عَنْ عَائِشَةَ لَمَّا أَرَادُوا غُسْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوا وَاللَّهِ مَا نَذَرِي أَنْ جَرَّدَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ ثِيَابِهِ كَمَا نُجَرِّدُ مَوْتَانَا أَمْ نَغْسِلُهُ وَ عَلَيْهِ ثِيَابُهُ فَلَمَّا اخْتَلَفُوا أَلْقَى اللَّهُ عَلَيْهِمُ النَّوْمَ حَتَّى مَا مِنْهُمْ رَجُلٌ إِلَّا وَذَقْنَهُ فِي صَدْرِهِ ثُمَّ كَلَّمَهُمْ مُكَلِّمٌ مِنْ نَاحِيَةِ الْبَيْتِ لَا يَذَرُونَ مَنْ هُوَ أَنْ اغْسِلُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهِ ثِيَابُهُ. (اخرجه ابن سعد و ابو داؤد

منها ما تتعلق بالصلوة صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۰۳۳) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ لَمَّا ثَقُلَ

(۱۰۳۲) \* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غسل کی سنت میں یہاں عام بشر کے شریک بھی ہیں مگر اتنے ممتاز بھی ہیں کہ صحابہ آپ کے غسل میں متخیر کھڑے ہیں اور یہ جرات نہیں کر سکتے کہ جس طرح عام انسانوں کے کپڑے اتار لیے جاتے ہیں اسی طرح آپ کے کپڑے بھی اتار لیے جائیں پھر یہاں ندائے غیبی سے اس صورت پر عمل کر لیا جاتا ہے جو خود بھی قرین قیاس نظر آ رہی تھی۔ خدا تعالیٰ کی اس حکمت کے قربان کہ دین کامل بھی ہوا مگر پھر بہت سے معاملات میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہا اور اس طرح جس امت میں اب کوئی جدید رسول آنے والا نہ رہا تھا اس کے لیے بڑی سہولت اور وسعت پیدا ہو گئی۔

(۱۰۳۳) \* اللہ اکبر انبیاء علیہم السلام کی ہر ہر بشری عوارض میں شرکت بھی اور قدم قدم پر ان کے امتیازات بھی کس طرح ثابت لہے.....

رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْنَا مَنْ يَغْسِلُكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي الْأَذْنَىٰ فَلَا أَذْنَىٰ مَعَنَا مَلَائِكَةٌ كَثِيرَةٌ يَرَوْنَكُمْ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ قُلْنَا مَنْ يُصَلِّي عَلَيْكَ قَالَ إِذَا اغْتَسَلْتُمُونِي وَحَنَطْتُمُونِي وَكَفَنْتُمُونِي فَضَعُونِي عَلَىٰ سَرِيرِي هَذَا عَلَىٰ شَفِيرِ قَبْرِي ثُمَّ أَخْرَجُوا عَنِّي سَاعَةً فَإِنَّ أَوَّلَ مَنْ يُصَلِّي عَلَىٰ جَبْرِئِيلُ ثُمَّ مِيكَائِيلُ ثُمَّ إِسْرَافِيلُ ثُمَّ مَلَكُ الْمَوْتِ مَعَ جُنُودٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ ثُمَّ يُصَلِّي عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتِي ثُمَّ ادْخُلُوا عَلَىٰ أَفْوَاجًا وَفَرَادَىٰ قُلْنَا فَمَنْ يَدْخُلُ قَبْرَكَ قَالَ أَهْلِي مَعَ مَلَائِكَةٍ كَثِيرِينَ يَرَوْنَكُمْ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ. اخرجہ ابن سعد و ابن منیع و الحاکم و البیہقی و

علیہ وسلم کی علالت زیادہ بڑھ گئی تو ہم لوگوں نے آپؐ سے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ کو غسل کون دے؟ آپ نے فرمایا میرے گھر کے وہ آدمی جو نسب میں مجھ سے زیادہ سے زیادہ قریب تر ہوں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اور فرشتے بھی شامل ہوں گے جو تم کو دیکھتے ہیں اور تم ان کو نہیں دیکھتے۔ پھر ہم نے عرض کی اچھا آپ کی نماز کون پڑھائے؟ فرمایا جب تم مجھے غسل دے کر خوشبو لگا کر اور کفن پہنا کر فارغ ہو جاؤ تو مجھ کو میری اس چار پائی پر رکھنا اور اس کو میری قبر کے کنارہ رکھ دینا۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے تم سب باہر ہو جانا کیونکہ سب سے پہلے جو مجھ پر نماز پڑھیں گے وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں اور اس کے بعد پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر ملک الموت اور ان کے ساتھ اور بہت سے فرشتے ہوں گے اس کے بعد میرے اہل بیت مجھ پر نماز پڑھیں اس کے بعد تم لوگ جماعتیں جماعتیں اور علیحدہ علیحدہ داخل ہونا۔ ہم نے پوچھا اچھا تو آپ کو قبر میں کون اتارے؟ آپ نے فرمایا میرے گھر کے مرد اور ان کے ساتھ اور بہت سے فرشتے ہوں گے جو تم کو دیکھتے ہیں اور تم ان کو نہیں دیکھتے۔ (خصائص الکبریٰ)

الطبرانی فی الاوسط قال البیہقی تفرد به سلام الطویل عن عبد الملك بن عبد الرحمن و تعقبه ابن حجر فی المطالب العالیہ بان ابن منیع اخرجہ من طریق مسلمة بن صالح عن عبد الملك به فهذه متابعة لسلام الطویل و اخرجہ البزار من وجه اخر عن ابن مسعود و اخرجہ البیہقی و غیرہ عن ابن عباس ان الناس صلوا علیہ بغیر امام ارسالا کذا فی الخصائص ص ۲۷۶ ج ۲ و قد تکلم فی اسناده الحافظ ابن کثیر فی البدایة و النہایة ص ۲۵۴ ج ۵ و ذکر فی ص ۲۶۵ ج ۵ ان فی صحته نظرا و مع هذا قال ان صلاتهم علیہ فرادی لم يؤمهم احد علیہ امر مجمع علیہ لا خلاف فیہ.

اللہ..... ہوتے چلے جاتے ہیں مگر اس کے باوجود بعض نادان ان کا صحیح مقام سمجھنے میں پھر مغالطہ کھاتے ہیں حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ بخدا وہ بشر ہوتے ہیں بلکہ افضل البشر ہوتے ہیں اور ابو البشر کی ذریت کو بھی اگر بشر نہ کہا جائے تو بولو اور کیا کہا جائے ان کے امتیازی صفات میں ایک صفت بھی ایسی نہیں ہوتی جو بشریت کی صفت نہ ہو ان صفات سے جتنا ان میں اور عام بشر میں امتیاز ہو جاتا ہے اس سے زیادہ امتیاز ان میں اور رب العالمین میں بدیہی بن جاتا ہے۔ خود قرآن کریم نے اپنے سب سے مقرب اور محبوب رسول کے ساتھ جو خاص خاص مواقع پر انداز خطاب اختیار فرمایا ہے وہ اس لیے ہے کہ ہر جگہ یہ واضح ہوتا رہے کہ قرب و بلندی کے سارے مقامات طے ہو جانے کے بعد بھی رب العالمین کے سامنے کسی کی ہستی بندگی سے آگے نہیں جاتی۔

﴿سُبْحَانَهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدُنُونَ﴾



## آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ کی غیبی تعزیت کی خصوصیت

منها ما تتعلق تبغزية النبي صلى  
الله عليه وسلم

(۱۰۳۴) جابر بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تو آپ کے اہل بیت کی تعزیت ملائکہ نے بھی کی صرف ایک آواز آتی تھی مگر کوئی شخص نظر نہ آتا تھا اور تعزیت کے الفاظ یہ تھے ”اے اہل بیت السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ۔ ہر مصیبت میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک صبر کا سبب ہے اور ہر چیز کا جو ہاتھوں سے نکل جائے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک بہتر جانشین ہے (اس کا بدل دے دیتا ہے) لہذا صرف اسی کی ذات پر بھروسہ رکھو اور اسی سے اُمید لگائے رکھو کیونکہ محروم صرف وہ کہا جاتا ہے جو ثواب سے بھی محروم ہو جائے (تم کو صبر کا ثواب ملے گا تم محروم نہیں) السلام علیکم ورحمة اللہ (خصائص الکبریٰ)

(۱۰۳۴) عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا تُوفِّيَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَزَّتْهُمْ الْمَلَائِكَةُ يَسْمَعُونَ الْحِسَّ وَلَا يَرُونَ الشَّخْصَ فَقَالَتْ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ إِنَّ فِي اللَّهِ عَزَاءً مِنْ كُلِّ مُصِيبَةٍ وَخَلْفًا مِنْ كُلِّ فَائَةٍ فَبِاللَّهِ فَثَقُّوا وَآيَاهُ فَارْجُوا فَإِنَّمَا الْمَحْرُومُ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ.

(اخرجه الحاكم و صححه و البيهقي و روياه

عن انس و اخرج ابن ابى حاتم و ابو نعيم عن علي و سيف بن عمر عن ابن عمر نحوه كذا في الخصائص ص ۲۷۹ ج ۲. و في مشكوة المصابيح نحوه. و ذكر البيهقي له اسنادًا اخر و قال و هذان و ان كانا ضعيفين فاحدهما يتا كدبا لاخرو يدل على ان له اصلا. البداية و النهاية ص ۲۷۷ ج ۵)

(۱۰۳۴) \* جن اہل بیت کی شان میں اور جن کے گھروں میں کبھی وحی ربانی اتر ا کرتی ہو ان کے گھروں میں صرف ایک غیبی آواز پر تعجب کیا ہے۔ عام بشر کی تعزیت عام بشر کر لیتے ہیں۔ مگر رسول وہ ہیں جن کے گھر والوں کی تعزیت میں خدا کے مقدس فرشتے بھی شریک رہتے ہیں۔

واضح رہے کہ اس حدیث کے بعض طریقوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ غائب شخص خضر علیہ السلام تھے مگر حافظ ابن کثیر نے ان سب روایتوں کی سخت تضعیف کی ہے دیکھو البدایہ و النہایہ ص ۲۹۹، ۳۳۱، ۳۳۲ ج ۱ اس کے بعد کتاب مذکور کے ص ۳۳۶ ج ۱ پر حافظ سہیلی کی ندرجہ ذیل رائے نقل کی ہے۔

ورجح السهيلي رحمة الله تعالى عليه بقاء  
ه و حكاه عن الاكثرين قال و اما اجتماعه  
مع النبي صلى الله عليه وسلم و تعزيتہ  
لاهل البيت بعده فمردى من طريق صحاح  
ثم ذكر ما تقدم مما ضعفناه و لم يورد  
اسانيدھا و الله و اعلم.

حافظ سہیلی نے خضر علیہ السلام کی حیات اور ان کی بقاء کو ترجیح دی ہے اور اکثر علماء کا یہی قول نقل کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی ملاقات اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے اہل خانہ کی ان کی تعزیت کرنا صحیح طریقوں سے مروی ہے۔ اس کے بعد وہ روایتیں نقل کی ہیں جن کو ہم ضعیف قرار دے چکے ہیں۔ حافظ سہیلی نے ان کی اسنادیں نقل نہیں کیں۔

## منہا ما يتعلق بالدفن

## انبیاء علیہم السلام کے دفن میں امتیازی خصوصیت

(۱۰۳۵) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُبِضَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اخْتَلَفُوا فِي دَفْنِهِ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ سَمِعْتُ مَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَالَ مَا قَبِضَ اللَّهُ نَبِيًّا إِلَّا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُدْفَنَ فِيهِ إِذْفَنُوهُ فِي مَوْضِعٍ فَرَأَيْتُهُ. (رواه الترمذی)

(۱۰۳۵) حضرت عائشہ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہو گئی تو آپ کے دفن کے متعلق لوگوں کی رائیں مختلف تھیں، اس پر صدیق اکبرؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات خود سنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو وفات نہیں دی مگر اسی مقام پر جہاں وہ چاہتا ہے کہ اس کو دفن کیا جائے لہذا آپ کو وہیں دفن کرو جہاں آپ کا بچھونا تھا۔ (ترمذی شریف)

(۱۰۳۶) عَنْ أَنَسٍ قَالَ لَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الَّذِي دَخَلَ فِيهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِينَةَ أَضَاءَ مِنْهَا كُلُّ شَيْءٍ فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الَّذِي مَاتَ فِيهِ أَظْلَمَ مِنْهَا كُلُّ شَيْءٍ وَمَا نَفَضْنَا أَيْدِينَا عَنِ التُّرَابِ وَإِنَّا لَفِي دَفْنِهِ حَتَّى أَنْكَرْنَا قُلُوبُنَا. (رواه الترمذی وقال هذا

(۱۰۳۶) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے تو تمام مدینہ جگمگا اٹھا اور جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو تمام مدینہ تاریک تھا، اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی دے کر ابھی اپنے ہاتھ جھاڑنے بھی نہ پائے تھے کہ اپنے قلوب کی حالت دیکھی تو دیگر لوگوں تھی۔

(ترمذی شریف)

حدیث صحیح غریب و قد صححه ابن کثیر کما فی البدایة و النہایة ص ۲۷۴ ج ۵)

(۱۰۳۵) \* خدا تعالیٰ کے رسول بھی دفن ہوتے ہیں مگر جس طرح ان کی ولادت اور موت کے حالات میں امتیاز ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے دفن کے حالات میں بھی امتیاز ہوتا ہے وہ عام دستور کے مطابق ہر جگہ دفن نہیں ہوتے بلکہ وہیں دفن ہوتے ہیں جہاں ان کی تمنا ہوتی ہے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حضرت عائشہؓ کے گھر میں ہوئی اس لیے یہ اس کی دلیل تھی کہ اسی جگہ دفن ہونے کی آپ کی تمنا تھی لہذا آپ وہیں دفن کیے گئے۔ گویا جو آپ کی قیام گاہ تھی وہی آپ کا مدفن رہا۔ اب غور فرمائیے وہ بشر کیسے بشر ہوں گے جن کی وفات کے بعد محل رہائش کا بھی فرق نہیں پڑا صرف اس کی صورت ذرا بدل گئی اور جب ذرا ایک قدم اور آگے بڑھائیں تو حدیثیں پتہ دیتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے جسم زندوں کی طرح زمین کے تخریبی اثرات سے محفوظ رہتے ہیں اور اگر اس سے ذرا اور آگے قدم اٹھائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبروں میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں مگر پھر ان سب فضائل سے ان کی بشریت اور عبدیت ہی کا ثبوت ملتا ہے۔ جب دینا میں ایک محسوس حیات کے مالک ہو کر وہ بشر ہی رہے تو وفات کے بعد ان کی غیر محسوس حیات سے آپ اپنا عقیدہ کیوں خراب کرتے ہیں۔

(۱۰۳۶) \* جس ذات کو مجسم نور بنایا گیا اور جن کا لقب قمر منیر رکھا گیا تھا اگر حقیقت میں نظروں کے سامنے ان کی آمد سے نور اور ان کے دفن کے بعد تاریکی چھا گئی تو کیا تعجب ہے۔ حضرت حظلہ رضی اللہ عنہ کی روایت گزر چکی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم آپ کی صحبت سے ذرا الگ ہوتے تھے تو ہماری قلبی کیفیت بدل جاتی تھی پھر جب کہ عالم کا تفاوت ہو گیا ہو تو بولو قلبی کیفیات کیوں نہ بدل گئی ہوں گی۔ یہ عقیدت نہیں حقیقت تھی مگر جو انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع کو نہیں پہچانتے وہ ان حقائق کو سمجھ نہیں سکتے۔ مثل مشہور ہے: من لم یذق لم یدر

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی



## منہا انہم لایورثون

(۱۰۳۷) عَنْ أَبِي بَكْرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نُورِثُ مَا تَرَكَنَاهُ صَدَقَةً. (متفق علیہ)

## انبیاء علیہم السلام کی وراثت میں امتیازی خصوصیت

(۱۰۳۷) حضرت ابو بکرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہم جو انبیاء علیہم السلام کی جماعت ہوتے ہیں ہمارا وارث کوئی نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ سب راہِ خدا میں صدقہ ہوتا ہے۔ (متفق علیہ)

## منہا مناجاتہم مع الملائکۃ

(۱۰۳۸) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَكَلَ ثَوْمًا أَوْ بَصَلًا فَلْيَعْتَزِلْنَا أَوْ

## فرشتوں کے ساتھ آپ کی ہم کلامی کی خصوصیت

(۱۰۳۸) جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جو کچا لہسن یا کچی پیاز کھائے وہ ہم سے علیحدہ رہے یا یہ لفظ فرمائے کہ ہماری مسجد سے علیحدہ رہے (راوی کو ان الفاظ میں شک ہے) اس کو چاہیے

(۱۰۳۷) \* عام بشر جب مر جاتے ہیں تو ان کا ترکہ ان کے عزیزوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی شان یہاں بھی مختلف نظر آتی ہے ان کی میراث کسی کو نہیں ملتی وہ سب راہِ خدا میں صرف کی جاتی ہے سبحان اللہ جو ہستیاں اپنی حیات میں دنیوی طمع کا کوئی داغ اپنے دامن پر لگنا گوارا نہیں کرتیں ان کے لیے یہ بھی مناسب نہیں سمجھا گیا کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر اس داغ کے لگانے کی کوئی دشمن جرأت کر سکے اسی لیے ان کی خاص ذریت کے حق میں زکوٰۃ کا مال حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ اب اندازہ کر لینا چاہیے کہ ان کی موت عام بشر تو درکنار شہداء سے بھی کتنی ممتاز ہوتی ہے شہداء کے حق میں قرآن کریم نے حیات کا لفظ گواہ استعمال فرمایا ہے اور ان کو بھی رزق ملنے کی بشارت دی ہے مگر ان کا ترکہ پھر عام انسانوں کی طرح ان کے عزیزوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں اس کی بھی اجازت نہیں بلکہ آپ کی ازواج کو آئندہ ہمیشہ کے لیے نکاح کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ شہداء ہوں یا بڑے سے بڑا بزرگ کسی کی ازواج کو بھی شوہروں کی وفات کے بعد نکاح کرنے سے روکا نہیں گیا مگر نبی کے حق میں اس کو اتنا اہم سمجھا گیا ہے کہ اس دفعہ کا خود قرآن کریم نے اعلان فرمایا ہے۔ مگر ان کے حق میں یہ سخت دفعہ ان کی مرضی کے بغیر لگائی نہیں گئی۔ بلکہ آپ کی حیات طیبہ میں ان کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا وہ چاہیں تو دنیا کو اختیار کر لیں اور چاہیں تو اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کو اختیار کر لیں گویا اس میں اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اگر انہوں نے دوسری صورت کو ترجیح دی تو پھر آئندہ نکاح کا ان کو کوئی حق نہیں رہے گا، یہی وجہ تھی کہ آپ نے اس کی بڑی اہمیت محسوس کی اور سب بیویوں کو خود جا جا کر یہ پیغام سنا دیا اور جب ان میں سب سے پہلے حضرت عائشہؓ نے یہ جواب دے دیا کہ یہ بات نہ استخارہ کی محتاج ہے نہ کسی سے مشورہ کرنے کی ہم ایک طرف ہو کر آخرت اختیار کرتے ہیں تو گویا یہ بات برضاء و رغبت خود اختیار کر لی گئی تھی دیکھو ترجمان السنۃ ص ۷۹ و ۸۰ ج ۲۔ اس میں رسول کا احترام بھی ملحوظ تھا۔ باپ کی منکوحہ جو اپنی والدہ نہ ہو وہ بھی اولاد پر حرام ہے زمانہ جاہلیت میں وہ سب سے بڑی اولاد کے نکاح میں آ سکتی تھی مگر اسلام نے اس کو والد کے احترام کے خلاف سمجھا اور ہمیشہ کے لیے اس کو اولاد پر حرام کر دیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ابوت چونکہ ساری امت کے ساتھ تھی اس لیے یہاں تمام امت کے حق میں اس احترام اور حرمت کو باقی رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کی حیات کا مسئلہ سب سے ممتاز رکھا گیا تھا تو وفات کے بعد اس صفت میں بھی ان کو عام بشر سے ممتاز رکھا گیا۔

(۱۰۳۸) \* اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک چیز حلال ہوتی ہے مگر کبھی مخاطب کی خاطر اس کا استعمال ترک کیا جاتا ہے فرشتے للہ.....

لِيَعْتَزِلَ مَسْجِدَنَا وَلِيَقْعُدَ فِي بَيْتِهِ وَ أَنَّهُ أَتَى  
بِذَرٍ قَالَ ابْنُ وَهْبٍ يَعْنِي طَبَقًا فِيهِ خَضِرَاتٌ  
مِنْ بُقُولٍ فَوَجَدَلَهَا رِيحًا فَسَالَ عَنْهَا  
فَاخْبَرَ بِمَا فِيهَا مِنَ الْبُقُولِ فَقَالَ قَرَّبُوهَا إِلَيَّ  
بَعْضُ أَصْحَابِهِ كَانَ مَعَهُ فَلَمَّا رَأَاهُ كَرِهَ أَكْلَهَا  
قَالَ كُلْ فَإِنِّي أَنَا جِئْتُ مَنْ لَا تُنَاجِي  
(رواه البخاری)

کہ وہ اپنے گھر بیٹھا رہے۔ ایسا اتفاق ہوا کہ آپ کے سامنے ایک طشت  
پیش کیا گیا جس میں کچھ سبزی تھی آپ نے ان کی بو محسوس کی تو پوچھا یہ کیا  
ہے؟ فوراً عرض کیا گیا کہ اس میں لہسن یا پیاز ہے آپ نے جو صحابی آپ کے  
ہمراہ تھے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ ان کے سامنے رکھ دو مگر جب  
آپ نے دیکھا (کہ آپ کے انکار کی وجہ سے) وہ بھی اس کا کھانا پسند نہیں  
کرتے تو فرمایا تم کھا لو میں تو اس لیے نہیں کھاتا کہ میں اس مخلوق کے ساتھ  
ہم کلام ہوتا ہوں جس سے تم نہیں ہوتے۔ (بخاری شریف)

اللہ..... چونکہ نورانی مخلوق ہیں مادیت سے ان کو کوئی واسطہ نہیں اس لیے جس طرح ان کو کفر و شرک بلکہ ہر معصیت سے نفرت ہے اسی  
طرح بد بو اور نجاست وغیرہ سے بھی نفرت ہے۔ خدا تعالیٰ کی یہ مقدس مخلوق انبیاء علیہم السلام کی محفل کی ہمہ وقت حاضر باش ہوتی ہے اس  
لیے انبیاء علیہم السلام اپنے اہل محفل کی خاطر خود بھی اس قسم کی اشیاء سے احتراز کر لیتے ہیں۔ اسی طرح مسجدیں بھی خاص طور پر ان کا محل  
ہیں۔ یہاں بھی ان کی رعایت کی گئی ہے۔ چونکہ عام انسانوں کو یہاں صرف کچھ وقت کے لیے دعوت دی جاتی ہے۔ اس لیے ان کو یہ ہدایت  
بھی کر دی گئی ہے کہ جب وہ کسی کی خاص رہائش کی جگہ جائیں تو ان کو چاہیے کہ یہاں وہ تھوڑے ضبط نفس سے کام لیں اور ایسی اشیاء سے  
پرہیز رکھیں جو اس مقدس مقام کے ساکنوں کے لیے موجب اذیت ہو۔ اگر مسجدوں میں فرشتوں کا یہ احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے تو وہ بھی اپنے  
ان بشری مہمانوں کی دعاء خیر سے خوب تواضع کرتے ہیں اور اس طرح عام بشر کے مسجد میں بلانے کا جواہم مقصد تھا وہ اچھی طرح پورا ہو  
جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گناہگاری جس مخلوق کے ضمیر کا جزء ہو اس کے لیے اس مخلوق کی صحبت کتنی ضروری ہوگی جو صرف معصیت سے بھی آشنا  
نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث ایک بڑی عمیق حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے یعنی بشر کے ملکوتی صفات سے انصباغ تکوینی نظم و نسق  
کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ اس انعکاس و انصباغ کی صورت صحبت سے زیادہ مؤثر اور کوئی نہیں ہو سکتی اس لیے کبھی تو فرشتوں کو مؤمنوں کے  
گھروں میں بھیجا جاتا ہے تاکہ ان کی صحبت سے ان میں معصومیت کی صفت پیدا ہوتی چلی جائے اور اس صورت میں ہم کو یہ ہدایت کر دی گئی  
ہے کہ کوئی حرکت ہم ایسی نہ کریں جو ان کے آمد و شد کے لیے مانع ہو۔ مثلاً کتا گھروں میں نہ رکھیں، نجاست نہ رکھیں اور اسی طرح تصاویر نہ  
لٹکائیں کیونکہ یہ سب باتیں ان کے آنے سے مانع ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح کبھی ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم خود ان کے مستقر پر جا کر ان کی  
شرف صحبت سے مستفید ہوں اور ان کا سب سے بڑا مستقر مساجد ہیں اس صورت میں ہم کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہاں جا کر جو چیز ان کے  
لیے طبعاً قابل نفرت ہے اس کا استعمال نہ کریں اور شب و روز کی ان صحبتوں سے معصیت سے نفرت اور عبادت کی رغبت کا جواہم مقصد ہے  
وہ عاصی انسانوں میں بھی فرشتوں کی طرح پیدا ہو جائے جو شریعت کے ان اسرار کو پیش نظر نہیں رکھتے ان کی عبادتیں بھی صرف عبادت کا  
ایک بے روح خاکہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ صفت احسان میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ اب آپ ہی اندازہ فرمائیے کہ عام بشر کو انبیاء علیہم السلام  
سے کیا نسبت یہ اگر کچھ دیر کے لیے ان کی ہم نشینی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو خود ان کے مقام پر جا کر وہ بھی لفیل ہوتا ہے انبیاء علیہم السلام  
ہی کا اور رسول وہ ہوتے ہیں جن کی محفل میں خود ملائکہ اللہ حاضر ہو کر ان کے شرف صحبت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ اہل جنت کو جس نوعیت کا  
مکالمہ اور صحبت فرشتوں کے ساتھ جنت میں جا کر نصیب ہوگی انبیاء علیہم السلام کو وہ اسی عالم میں میسر ہوتی ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر۔



(۱۰۳۹) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ مغموم تھے اور فرماتے تھے کہ جبریل علیہ السلام نے آج کی شب مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا مگر آئے نہیں خدا کی قسم وہ مجھ سے وعدہ خلافی تو نہیں کر سکتے۔ پھر آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تخت کے نیچے کتے کا پلہ ہے آپ نے حکم دیا وہ فوراً نکال دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے پانی لے کر اس جگہ پر چھڑکا۔ جب شام ہوئی تو حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے آپ نے فرمایا۔ آپ نے تو گزشتہ شب میں مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا جی ہاں لیکن جس گھر میں کتابیا تصویر ہوتی ہے ہم جو فرشتوں کی جماعت ہیں اس گھر میں داخل نہیں ہوا کرتے۔ اسی دن صبح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ کتے مار دیئے جائیں اور اس تاکید سے حکم دیا کہ اگر کسی کا باغ چھوٹا ہو اور وہ خود اس کی حفاظت کر سکتا ہو تو جو کتا اس کی نگرانی کے لیے ہو وہ بھی مار دیا جائے ہاں اگر باغ بڑا ہو تو اس کی نگرانی کا کتا چھوڑ دیا جائے۔ (مسلم شریف)

(۱۰۳۹) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا عَنْ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَصْبَحَ يَوْمًا وَاجْمًا وَقَالَ إِنَّ جِبْرِيلَ كَانَ وَعَدَنِي أَنْ يَلْقَانِي اللَّيْلَةَ فَلَمْ يَلْقَى أَمْ وَاللَّهِ مَا أَخْلَفَنِي ثُمَّ وَقَعَ فِي نَفْسِهِ جِرْوُ كَلْبٍ تَحْتَ فُسْطَاطٍ لَهُ فَأَمَرَ بِهِ فَأُخْرِجَ ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِهِ مَاءً فَضَحَّ مَكَانَهُ فَلَمَّا أَمْسَى لَقِيَهُ جِبْرِيلُ فَقَالَ لَقَدْ كُنْتُ وَعَدْتَنِي أَنْ تَلْقَانِي الْبَارِحَةَ قَالَ أَجَلٌ وَلَكِنَّا لَا نَدْخُلُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ فَاصْبَحَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَئِذٍ فَأَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ حَتَّى أَنَّهُ يَأْمُرُ بِقَتْلِ كَلْبِ الْحَائِطِ الصَّغِيرِ وَيَتْرُكُ كَلْبَ الْحَائِطِ الْكَبِيرِ. (رواه مسلم)

(۱۰۳۹) \* کتا ایک ایسا جانور ہے جس کی فطرت کوشیاطین سے مناسبت ہے اور تصویر خالق حقیقی کی نقالی کا بدترین مظاہرہ ہے اس لیے فرشتے ان دونوں سے بیزار ہوتے ہیں۔ نبی و رسول کا گھر گوان کے لیے مرکز ثقل کی سی کشش رکھتا ہے مگر جس طرح آب و آتش کا اجتماع فطرۃ ناممکن ہے اسی طرح ملائکہ اللہ اور خباثت کا اجتماع بھی ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جلیل القدر فرشتے کی آمد کے لیے جو امر مانع بن گیا ہو اور وقتی طور پر آپ کو بھی کتنا شاق گذرا ہوگا۔ کتاباغات کی حفاظت کے لیے اس وقت بہت ضروری چیز سمجھا جاتا تھا اس لیے ضرورت تھی کہ اس کی مضرت ذہن نشین کرنے کے لیے کچھ مدت کے لیے ایسا حکم نافذ کر دیا جائے کہ پھر اس کا استعمال مجبوری کے درجہ ہی میں محدود ہو جائے۔ افسوس ہے کہ جو چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک گھر میں فرشتوں کی آمد کی مانع ہو گئیں آج وہی ہمارے گھروں کی سب سے بڑی زینت بنی ہوئی ہیں۔ اب یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ جب فرشتوں کی آمد کے لیے لاعلمی میں بھی صرف ایک کتے کا وجود مانع بن سکتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی ان کی آمد کے لیے مانع نہ ہوگی۔ خوب یاد رکھیے کہ فرشتوں کو جس طرح نجاسات اور خباثت سے بالطبع نفرت ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے بھی ان کو شدید نفرت ہوتی ہے۔ ترجمان السنہ ص ۲۱۵ ج ۲۔ میں آپ ملاحظہ فرما چکے کہ جھوٹ کی بدبو سے فرشتے ایک میل دور نکل جاتے ہیں۔ جاندار کی تصویر دیکھنا وہ برداشت نہیں کرتے لہٰذا و پیاز کی بدبو سے ان کو سخت ایذا ہوتی ہے۔ اگر العیاذ باللہ انبیاء علیہم السلام معصوم نہ ہوں تو کیا محفل کی حضوری اور ہر مقامات میں ان کی بلکہ ان کی استوں کی اعانت وہ اپنی سعادت تصور کر سکتے ہیں۔

## آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صلوٰۃ جنازہ کی ایک خصوصیت

(۱۰۴۰) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک سیاہ فام عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی یا وہ کوئی نوجوان مرد تھا (راوی کو اس میں شک ہے) ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہ دیکھا تو اس کے متعلق دریافت فرمایا۔ لوگوں نے کہا اس کا تو انتقال بھی ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا تم نے مجھ کو اس کی خبر کیوں نہیں کی؟ راوی کہتا ہے گویا لوگوں نے ایسی عورت کی موت کا معاملہ بہت معمولی سمجھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا مجھے بتاؤ اس کی قبر کہاں ہے؟ چنانچہ آپؐ کو قبر بتائی گئی۔ آپؐ نے اس پر نماز ادا کی اس کے بعد ارشاد فرمایا یہ جو مردوں کی قبریں ہیں یہ تاریکی در تاریکی سے بھری ہوئی ہیں میری نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو روشن اور منور فرما دیتا ہے۔ (متفق علیہ)

## آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنت و دوزخ کی تمثیل کی خصوصیت

(۱۰۴۱) ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات

منہا صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی الجنائز فانہا کانت نوراً لاهل القبور (۱۰۴۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ امْرَأَةً سَوْدَاءَ كَانَتْ تَقُمُ الْمَسْجِدَ أَوْ شَابًّا فَقَفَّهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَ عَنْهَا أَوْ عَنْهُ فَقَالُوا مَاتَ قَالَ أَفَلَا كُنْتُمْ اذْنَتُمُونِي قَالَ فَكَانَتْهُمْ صَغُرُوا أَمْرَهَا أَوْ أَمْرَهُ فَقَالَ ذُلُونِي عَلَى قَبْرِهِ فَذَلُّوهُ فَصَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ قَالَ إِنَّ هَذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظُلْمَةً عَلَى أَهْلِهَا وَإِنَّ اللَّهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلَوَتِي عَلَيْهِمْ.

(متفق علیہ و اللفظ لمسلم)

## منہا تمثیل الجنة و النار صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۰۴۱) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَسَفَتْ

(۱۰۴۰) \* نبی کی نماز اس کی امامت اور اس کی اقتداء کے مسائل بھی سب سے ممتاز ہوتے ہیں فضائل کے یہ سب گوشے چونکہ صرف آپ کی ذات سے متعلق تھے اس لیے وہ کسی تقریب سے بیان میں آ گئے ہیں۔ دنیا میں مسلمانوں پر ہمیشہ جنازہ کی نمازیں پڑھی جائیں گی مگر کیا ہے کوئی جس کی نماز تاریک قبروں کو منور کرنے کے لیے قطعیت کے ساتھ ضامن ہو سکے۔

ایک واقعہ ایسا بھی ہوا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ کی غیر حاضری میں امام بن گئے تھے اتفاق سے آپ عین نماز کی حالت میں تشریف لے آئے۔ ابو بکرؓ نے یہ محسوس کرنے کے ساتھ ہی امامت کے مصلے سے فوراً اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے آپؐ نے اشارہ سے فرمایا بھی کہ نماز پوری کر لو مگر حضرت ابو بکرؓ سے نہ ہوسکا اور بعد میں یہ عذر بیان کیا یا رسول اللہ ابو قحافہ (ان کے والد کی کنیت ہے) کے بیٹے کی مجال کہ جہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہوں وہاں اس کا قدم آگے نظر آئے۔ علماء نے لکھا ہے کہ نبی کی امامت اس کے اذن کے بغیر جائز نہیں۔ غالباً آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے جنازے کی نماز امام کے بغیر اسی نکتہ کی بناء پر ادا کی گئی تھی اور اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد امام مہدی نماز کے مصلے سے پیچھے ہٹ آئیں گے اور آئندہ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی مستقل امام ہوں گے۔

(۱۰۴۱) \* انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں اولیاء کرام کو بھی کبھی کبھی جنت و دوزخ کا مشاہدہ ہو جاتا ہے مگر یہ مشاہدہ صرف اسی حد تک ہوتا ہے کہ ان کو یہ دوسوہ بھی نہیں گزرتا کہ وہ جنت کی کوئی چیز اٹھالیں۔ مگر آپؐ کا یہ مشاہدہ اس درجہ پر از حقیقت تھا کہ اس کے اظہار کے لئے.....



الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلَّى قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ رَأَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِي مَقَامِكَ ثُمَّ رَأَيْنَاكَ تَكْفُكُكَ فَقَالَ إِنِّي رَأَيْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنُقُودًا وَلَوْ أَخَذْتُهَا لَا كَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا.

(رواه البخاری فی باب رفع البصر الی الامام فی الصلوة راجع ج ۱ ص ۴۳۴ ترجمان السنة و فيه قصة رؤية امرئة في النار دخلتها

فی ہرة كما فی البخاری ص ۱۰۳ قالت عائشة ان المرئة كانت كافرة الخ كما فی المجمع)

(۱۰۴۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ صَلَّى لَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ رَفَى الْمِنْبَرَ فَأَشَارَ بِيَدَيْهِ قَبْلَ قِبْلَةِ الْمَسْجِدِ ثُمَّ قَالَ لَقَدْ

میں ایک بار سورج گہن ہوا تو آپؐ نے صلوٰۃ الکسوف اداء فرمائی۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ ہم نے دیکھا تھا جب آپؐ نماز کے لیے کھڑے تھے تو آپؐ نے کوئی چیز سامنے سے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا اس کے کچھ بعد ہم نے یہ دیکھا تھا کہ آپؐ اپنے پیچھے کی جانب ہٹے تھے (یہ کیا بات تھی) آپؐ نے فرمایا جب میں سامنے کی جانب بڑھا تھا تو اس وقت میں نے جنت دیکھی تھی۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں اس میں سے ایک خوشہ لے لوں اور اگر کہیں میں لے لیتا تو تم اس کو کھاتے رہتے جب تک دنیا باقی رہتی (اور وہ ختم نہ ہوتا) اور جب پیچھے کی جانب ہٹا تھا تو اس وقت دوزخ دیکھی تھی۔ (بخاری شریف)

(۱۰۴۲) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ظہر کی نماز پڑھائی پھر منبر پر تشریف لا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے قبلہ کی جانب اشارہ کر کے فرمایا۔ میں نے ابھی ابھی جب تم کو

للہ ..... لیے سب سے مناسب تعبیر وہی ہو سکتی تھی جو حدیث مذکور میں آپؐ نے اختیار فرمائی۔ یہ ظاہر ہے کہ خود جنت بھی غیر فانی ہے اس لیے اس کی جو چیز ہو وہ بھی غیر فانی ہونی چاہیے۔ یقیناً اگر آپؐ اس کے باغات کا کوئی خوشہ لے لیتے تو رہتی دنیا تک وہ بھی فنا نہ ہوتا۔ آپؐ نے اس حقیقت کو واضح کر کے یہ سمجھا دیا کہ آپؐ نے بعینہ جنت ہی کو دیکھا تھا اور اسی لیے ایک قدم آگے بڑھایا تھا مگر چونکہ فانی غیر فانی لذتوں سے موت سے قبل متمتع نہیں ہو سکتا اس لیے صرف ایک قدم اٹھا کر آپؐ رک گئے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص انبیاء علیہم السلام کے مشاہدات کی حقیقت خواب و خیال کی برابر سمجھے تو اس کی کج فہمی کا کیا علاج۔ اسی واقعہ میں آپؐ نے ایک عورت کو دوزخ میں دیکھا جس نے ایک بلی کو باندھ کر پھر اس کے آب و دانہ کی خبر نہ لی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ عورت کافرہ تھی یہ عذاب اس کو اسی لیے ہوا تھا۔ کما فی مجمع الزوائد۔

(۱۰۴۲) \* عام عبادت کی حالت میں بھی اور بالخصوص نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع خدا ہی جانے کتنی بلند ہو جاتی تھی گویا اس جہان میں بس آپؐ کا جسم ہی جسم رہ جاتا تھا روح مبارک عالم بالا سے جا ملتی تھی۔ حضوری بھی وہ حضوری میسر آتی تھی کہ ملکوت و جبروت کے عجائبات طرح طرح سے سب کھلے ہوئے نظر آ جاتے تھے۔ رسول اعظم کی یہ شان بھی کتنی نرالی تھی کہ کبھی عالم غیب خود ایک صورت بن کر یعنی عالم مثال میں ان کے سامنے آ جاتا تھا اور کبھی وہ خود بنفس نفیس عالم غیب میں جا کر اس کی سیر کر آتے تھے ان کے لیے نہ یہ مشکل تھا نہ وہ مشکل تھا۔

اس حدیث میں جنت و دوزخ کے عینی مشاہدہ کی حقیقت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر چیز کے لیے للہ .....

رَأَيْتُ الْآنَ مُنْذُ صَلَّيْتُ لَكُمْ الصَّلَاةَ الْجَنَّةَ  
وَالنَّارَ مُمَثَّلَتَيْنِ فِي قِبْلَةِ هَذَا الْجِدَارِ فَلَمْ  
أَرَكَالْيَوْمَ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ ثَلَاثًا. (رواه  
البخاری قلت و هذا فی واقعة الظهر كما  
يعلم مما عند البخاری فی باب وقت الظهر عند الزوال ج ۱ ص ۷۷ و فيه واقعة سوال حذيفة "من ابی")  
منها رؤية صلى الله عليه وسلم الى  
الجنة و النهار بعينهما  
(۱۰۴۳) عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ أَصْبَحَ رَسُولُ اللَّهِ  
بُرَيْدَهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ رَوَايَتِ كَرْتِ هِيَ - اِیك مرتبه صبح كے  
نماز پڑھا رہا تھا تو جنت اور دوزخ كو اس قبلہ والی دیوار کی طرف دیکھا تھا  
كہ وہ مُتمثل ہو كر میرے سامنے ہیں کیا پوچھتے ہو كہ خوف و خوشی كا جیسا منظر  
آج میں نے دیکھا تھا ایسا عمر بھر كبھی نہیں دیکھا۔  
(بخاری شریف)

آ نحضرت صلی اللہ علیہ وسلم كے جنت دوزخ مشاہدہ فرمانے کی  
خصوصیت

(۱۰۴۳) عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ أَصْبَحَ رَسُولُ اللَّهِ  
بُرَيْدَهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ رَوَايَتِ كَرْتِ هِيَ - اِیك مرتبه صبح كے

للہ..... دو وجود ہیں اِیك خارجی دوم مثالی یعنی جیسا خارج كا عالم اِیك عالم ہے اسی طرح عالم مثال بھی مستقل اِیك عالم ہے خارجی عالم میں  
اس شے كا مادہ اور اس کی مقدار و کیفیت دونوں موجود ہوتی ہیں۔ عالم مثال میں صرف اس کی مقدار اور کیفیت ہی محفوظ رہتی ہے اس كا مادہ نہیں  
ہوتا۔ اسی لیے عالم مثال خارجی عالم سے زیادہ قوی مانا گیا ہے۔ عالم مثال خواب كے عالم سے بالكل مختلف ہے لیكن بطور نظیر كے اس كے سمجھنے  
كے لیے کافی ہے۔ اِیك خوابیدہ شخص بحالت خواب آسمان و زمین كا كتنا وسیع احاطہ دیکھ لیتا ہے جو اپنی وسعت میں عالم خارجی كے آسمان و  
زمین سے کسی طرح كم نہیں ہوتا مگر اتنا وسیع عالم پھر اس كے عالم خیال میں سمٹ كر اس طرح آ جاتا ہے كہ اس سارے عالم کی سمائی كے بعد بھی  
خیالی وسعت میں پھر گنجائش رہتی ہے اسی طرح جنت و دوزخ کی وسعت اتنی ہے كہ سبع سموات مع زمینوں كے اس كے اِیك گوشہ میں ہیں لیكن  
عالم مثال دوسرا عالم ہے اس کی یہ ساری وسعت بآسانی اس عالم كے کسی گوشہ میں دیکھی جاسكتی ہے۔ اس كا راز یہ ہے كہ اس عالم كا اس عالم  
سے علاقہ نہ ظرف و مظروف كا ہے نہ داخل و خارج كا اس لیے وہاں یہ سوالات ہی پیدا نہیں ہو سكتے جو اس عالم كے اشیاء كے متعلق پیدا ہو سكتے  
ہیں۔ یہ حقیقت قرآن كریم تك بھی سرايت كر گئی ہے۔ حضرت مریمؑ كے قصہ میں قرآن كریم كا ارشاد ہے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔

اب سوچئے كہ جبریل علیہ السلام کی یہ آمد كتنی پراز حقیقت تھی كہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت كا سارا واقعہ اسی آمد كے ساتھ  
مربوط ہے لیكن جبریل علیہ السلام کی اس آمد کی بھی بلفظ تمثیل ہی ادا فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے كہ اگر وہ بشری صورت میں متمثل ہو كر نہ آتے تو  
ان كے دیکھنے کی تاب حضرت مریم علیہا السلام میں کہاں تھی پھر خدا تعالیٰ كا اتنا عظیم فرشتہ جب متمثل ہو كر آیا تو وہ اتنا ہی مختصر نظر آ رہا تھا جیسا  
عام انسان ہوا كرتے ہیں۔ لہذا اگر جنت و دوزخ اپنی وسعت كے باوجود صرف قبلہ کی دیوار میں سمٹ كر آپؐ كو نظر آ گئی تو اس كو اِیك كشف یا  
خیال تصور كرنا قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام كا عالم غیب كے ساتھ علاقہ كتنا قوی ہوتا ہے۔ اگر آپؐ كو اس كا تصور ہو جائے تو پھر ان  
امور كے یقین آنے میں كوئی دیر نہیں۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی اہل جنت كے خواص ركھتے ہیں اس لیے جو معاملات اہل جنت كے حق  
میں فرمائے قیامت كے بعد قابل تصدیق ہیں وہ اس مقدس گروہ كے حق میں آج بھی لائق ایمان ہیں شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم اسی جسم كے ساتھ تشریف لے گئے تھے اور حضرت آدم علیہ السلام اسی جنتی جسم كو لے كر اس زمین پر اترے تھے۔ پس ثابت یہی ہوتا  
ہے كہ ان كے جسم دنیا میں بھی اہل جنت كے سے خواص ركھتے ہیں۔ ان كے حق میں یہاں بھی وہ گھراپنا ہی گھر ہوتا ہے۔

(۱۰۴۳) \* مذکورہ بالا روایت سے ثابت ہوتا ہے كہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم كا جنت میں داخل ہونے كا اكثر اتفاق ہوا كرتا للہ.....



وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا اور پوچھا تم کس عمل کی وجہ سے مجھ سے بھی پہلے جنت میں جا پہنچے۔ میں جب بھی جنت میں داخل ہوتا ہوں تمہارے پیروں کی آہٹ اپنے آگے آگے سنتا ہوں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جب اذان دیتا ہوں تو دو رکعتیں نفل ضرور پڑھ لیتا ہوں اور جب وضوء کی ضرورت ہو جاتی ہے تو فوراً وضوء ضرور کرتا ہوں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی یہ دو رکعتیں میں نے اپنے لیے فرض سمجھ لی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی بات ہے۔

(ترمذی شریف)

(۱۰۴۴) جابر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَعَا بِلَالًا فَقَالَ بِمَا سَبَقْتَنِي إِلَى الْجَنَّةِ مَا دَخَلْتُ الْجَنَّةَ قَطُّ إِلَّا سَمِعْتُ خَشْخَشَتَكَ أَمَامِي قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا أَذْنُ قَطُّ إِلَّا صَلَّيْتُ رَكَعَتَيْنِ وَمَا أَصَابَنِي حَدَثٌ قَطُّ إِلَّا تَوَضَّأْتُ عِنْدَهُ وَرَأَيْتُ أَنَّ لِلَّهِ عَلَى رَكَعَتَيْنِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهِمَا. (رواه الترمذی و عند البخاری نحوه فی باب فضل الظهور باللیل و النهار و فضل الصلوة بعد الوضوء)

(۱۰۴۴) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ

ﷺ ..... تھا اور بلال رضی اللہ عنہ کی یہ خوش نصیبی تھی کہ آج ان کا تذکرہ بیان میں بھی آ گیا تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر انسان اپنے فرائض کا پابند رہے تو بعض مرتبہ اس کے خیال میں جو معمولی اعمال ہوتے ہیں وہ اس کے حق میں کسی بلند مرتبہ کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہاں تحیۃ الوضوء کی فضیلت تو ثابت ہوتی ہی ہے، مگر اصولاً نوافل اداء کرنے کا فائدہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہاں آپ نے صرف اپنا مشاہدہ نقل نہیں فرمایا بلکہ جنت میں داخل ہونے کے بعد اس مشاہدہ کا ذکر کیا ہے اب اس دخول کی نوعیت کیا تھی اس پر بحث کرنا ہمارے دائرہ علم سے باہر بات ہے اس قسم کے کئی واقعات حدیثوں میں آتے ہیں اور قیاس نہیں کہتا کہ وہ سب کے سب خواب کی حالت کے واقعات ہوں گے اور جب تک حدیث میں اس کی تصریح نہ آ جائے اس وقت تک کسی کو اپنی جانب سے اس کا حق بھی نہیں ہے بالخصوص ان کے حق میں جن کا اسی جسم کے ساتھ ایک مرتبہ آسمانوں اور جنت کی سیر کرنا بلکہ دیدار الہی سے مشرف ہونا بھی امت کے نزدیک مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے۔ یہاں ترجمان السنہ ص ۱۷۱ ملاحظہ فرمائیے۔ غالباً یہ خواب اور شب معراج کے علاوہ کوئی اور صورت ہوگی واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

(۱۰۴۴) \* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو یہ سارے نظارے اب ہو رہے تھے لیکن جن کے حق میں یہ نظارے ہو رہے تھے ان کے لیے اس کے ظہور کا وقت فردائے قیامت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم دور بین نے تو وہ سب اہم واقعات جو امت میں گزرنے والے تھے وہ بھی بہت پہلے دیکھ لیے تھے۔ جنت تو آپ کے نظارہ کی مخصوص جگہ تھی اس کے نہ معلوم کتنے عجائبات آپ نے اور دیکھیں ہوں گے جو بیان میں نہیں آئے یہ ان تین مقدس ہستیوں کا نصیب تھا کہ ان کے حتمی طور پر جنتی ہونے کی بشارت اس زبان سے نکل گئی جو سب سے بڑھ کر راست گو تھی۔ پھر بشارت بھی وہ جو چشم دید تھی۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاسداری دیکھے کہ وہاں بھی اپنے جاں نثار کی خاطر گو قلبی تقاضہ تو رہا کہ ان کے جنت کی زیب و زینت اندر جا کر تفصیلاً بھی دیکھ آتے مگر پھر ان کی غیور طبیعت کا خیال اس سے مانع آ گیا۔ ادھر اس جاں نثار کا جذبہ دیکھئے کہ جو شرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جانے سے اس کو نصیب ہوتا اس کی محرومی پر وہ ایک حسرت بھرا کلمہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں جنت میں داخل ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ابو طلحہؓ کی بیوی رمیصاء موجود ہیں (انس کی والدہ ام سلیم کا نام تھا) پھر میں نے پیروں کی آہٹ سنی تو پوچھا یہ کون؟ کسی نے کہا کہ یہ بلالؓ ہیں۔ اس کے بعد میں نے ایک محل دیکھا اس کے آنگن میں ایک جا رہی نظر آئی میں نے پوچھا یہ محل کس کا ہے؟ انہوں نے بتایا عمرؓ کا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اندر داخل ہو کر بھی ذرا اس کو دیکھوں فوراً مجھے تمہاری طبعی غیرت کا خیال آ گیا۔ یہ سن کر عمرؓ بے اختیار بول اٹھے میرے ماں باپ آپ پر قربان یا رسول اللہ کیا میں آپ کے داخل ہونے پر بھی غیرت کرتا۔ (متفق علیہ)

انبیاء علیہم السلام کی سب سے ممتاز خصوصیت وحی نبوت ہے  
اور اب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
پر ختم ہو چکی ہے

(۱۰۴۵) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا آؤ بھی جس طرح کبھی آنحضرت صلی اللہ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَإِذَا أَنَا بِالرُّمَيْصَاءِ امْرَأَةِ أَبِي طَلْحَةَ وَ سَمِعْتُ خَشْفَةً فَقُلْتُ مَنْ هَذَا فَقَالَ هَذَا بِلَالٌ وَ رَأَيْتُ قَصْرًا بِفَنَائِهِ جَارِيَةٌ فَقُلْتُ لِمَنْ هَذَا فَقَالُوا الْعُمَرَاءُ بَنِي الْخَطَّابِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَدْخُلَهُ فَأَنْظَرُ إِلَيْهِ فَذَكَرْتُ غَيْرَتَكَ فَقَالَ بَابِي أَنْتَ وَ أُمِّي يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَعَلَيْكَ أَغَارُ.  
(متفق علیہ)

من أجل میزات الانبیاء علیہم السلام  
وحی النبوة و قد انقطع بعد نبینا و  
سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم  
(۱۰۴۵) عَنْ أَنَسٍ قَالَ أَبُو بَكْرٍ لِعُمَرَ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْطَلِقْ بِنَا إِلَى أُمِّ أَيْمَنٍ نَزُورُهَا كَمَا كَانَ

(۱۰۴۵) \* وحی کیا ہے؟ خدا تعالیٰ سے قطعی ہم کلامی کا ایک شرف ہے جو نوع بشری میں خاص قسم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے قرآن کریم نے آپ کی شان بشریت کے ساتھ آپ کی اسی امتیازی صفت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ﴾ (فصلت: ۶) یعنی میں بھی یقیناً ایک بشر ہوں مگر میرا امتیاز یہ ہے کہ مجھ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے اور اس کا سب سے اہم سبق تو حید الہی ہے۔ ہر بشر میں اس کی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خالق کے ساتھ بلا واسطہ ہم کلامی سے مشرف ہو سکے اس لیے قدرت اپنی جانب سے اس صلاحیت کے چند افراد منتخب فرمالتی ہے پھر ان کے ذریعہ سے عام بشر تک اپنے احکام پہنچا دیتی ہے اگر وہ چاہتی تو عام بشر میں بھی یہ استعداد پیدا فرما دیتی مگر یہ اس کی حکمت کا تقاضہ نہ تھا اس کو عالم میں کافر و مسلم، مطیع و عاصی کی تقسیم پیدا فرما کر اپنے قہر و مہر کے کمالات کا اظہار بھی منظور تھا اس لیے اگر وہ سب افراد اسی صلاحیت کے پیدا فرما دیتی تو انکار و نافرمانی کا تخم دنیا سے نیست و نابود ہو جاتا پھر اس کی طاعت کے لیے فرشتوں کی مخلوق ہی کیا کم تھی۔ دنیوی بادشاہوں کا دستور بھی یہی ہے کہ وہ اپنی رسالت کے لیے مخصوص صفات کے افراد ہی کا انتخاب فرماتے ہیں اور اپنی رعایا میں ہر شخص سے خود ہمکلام ہونا نہ اپنی ہی شان ملوکیت کے مناسب سمجھتے ہیں اور نہ ان کی شان رعیت کے واللہ سبحانہ اعلیٰ و اجل۔

یہ ام ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مولات یعنی آزاد کردہ باندی تھیں۔ محمد علان شافعی ریاض الصالحین کی شرح میں نقل کرتے ہیں کہ یہ ام ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد ماجد کے ترکہ میں ملی تھیں اور ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لے لیں.....



علیہ وسلم ام ایمن کی ملاقات کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے ہم بھی ان کی ملاقات کے لیے چلیں جب یہ دونوں حضرات ان کے گھر پہنچے تو ان کو دیکھ کر بے ساختہ ان پر گریہ طاری ہو گیا۔ انہوں نے فرمایا آپ روتی کیوں ہیں کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ عیش و آرام کے سامان موجود ہیں۔ انہوں نے فرمایا میں اس پر تو نہیں روتی کہ اتنا بھی نہیں جانتی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہتر سے بہتر راحتیں مہیا ہیں۔ رونا اس پر ہے کہ اب آسمان سے وحی کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ یہ کہہ کر ام ایمن نے ان دونوں حضرات کو بھی خوب رلایا اور یہ بھی ان کے ساتھ مل کر رونے لگے۔

(مسلم شریف)

رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَزُورُهَا فَلَمَّا انْتَهَيَا إِلَيْهَا بَكَتُ فَقَالَا لَهَا مَا يُبْكِيكِ أَمَا تَعْلَمِينَ أَنَّ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ إِنِّي لَا أَبْكِي إِنِّي لَا أَعْلَمُ أَنَّ مَا عِنْدَ اللَّهِ تَعَالَى خَيْرٌ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَكِنْ كُنِيَ أَنَّ الْوَحْيَ قَدْ انْقَطَعَ مِنَ السَّمَاءِ فَهَيَّجَتْهُمَا عَلَى الْبُكَاءِ فَجَعَلَا يُبْكِيَانِ مَعَهَا.

(رواہ مسلم و اخرجه صاحب مشکوٰۃ فی

باب وفاة النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اللہ..... کی خدمت آیا کی طرح انجام دیا کرتی تھیں اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماں کی طرح ان کا اکرام فرماتے تھے اور ان کی ملاقات کے لیے بھی تشریف لے جاتے تھے (دلیل الفالحین ص ۲۵۰ ج ۳) کتنی خوش نصیب تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ملاقات کو تشریف لے جاتے تھے۔ کتنی فہم تھیں کہ خالق اور اس کی مخلوق کے مابین سلسلہ گفت و شنید کی اہمیت کو پورا پورا سمجھ چکی تھیں اور کتنی با ایمان بی بی تھیں کہ اس نعمت عظمیٰ کے گم ہو جانے کے غم میں کس طرح گھلی جا رہی تھیں صدیق اکبرؑ اور فاروق اعظمؓ بھی کسی کی یاد تازہ کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں جب ام ایمن کا دل پارہ پارہ ہو تو یہ حضرات اس غم سے کب خالی رہ سکتے تھے گو بڑے بہادر اور بڑے متحمل تھے۔ لیکن دکھے ہوئے دلوں کا چھیڑ دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ ام ایمن کی زبان سے ایک فقرہ سننا تھا کہ ان کا پیمانہ صبر بھی چھلک پڑا اور بے اختیار اشکبائے غم ان کی آنکھوں سے بھی بہہ نکلے ابھی ابھی یہ محفل یا تو مسرت و ملاقات کی ایک محفل تھی یا ذرا سی دیر میں بے ارادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں گریہ و زاری کی ایک مجلس بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ و التحیہ کو ہر طرح مکمل ہو چکی تھی مگر اپنے خالق کے ساتھ ہم کلامی گوبالواسطہ سہی ایسا شرف نہ تھا جس سے محرومی با ایمان قلوب کے لیے غم کا پہاڑ نہ بن جاتی۔

دیکھئے صحابہ اکرام کی ہر ہر گفتگو میں جہاں ذرا بھی موقعہ ہوتا ہے یہ بات کس طرح نکلتی چلی آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے نزدیک نبوت کا انقطاع کیسا متفقہ اور یقینی عقیدہ تھا یہاں کسی کے دل میں وحی کی کسی قسم کے بقاء کا وسوسہ بھی نہ تھا خواہ وہ تشریعی ہو یا غیر تشریعی۔ اس حدیث کے فوائد میں ایک یہ ہے کہ خالق و مخلوق کے مابین ہم کلامی گوبالواسطہ ہوا انسانیت کا بڑا شرف ہے اور یہ کہ جب دنیا کی عمر آخر ہوئی تو یہ شرف بھی ختم ہو گیا اور یہ کہ باہم مسلمانوں کی ملاقات سنت انبیاء علیہم السلام ہے اور یہ کہ بڑا بھی چھوٹے کی ملاقات کے لیے جاسکتا ہے اور یہ کہ بڑوں کی یاد تازہ کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے بعد ان کے مراسم موزن و محبت کو نبھایا جائے۔ اس ایک حدیث میں اخلاقیات و معاشرت زندگی کے یہ کتنے اہم اسباق ہیں۔

(۱۰۴۶) عَنْ نَافِعٍ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ لِعُثْمَانَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ لَا أَقْضِي بَيْنَ رَجُلَيْنِ قَالَ فَإِنْ أَبَاكَ كَانَ يَقْضِي فَقَالَ إِنَّ أَبِي لَوْ أَشْكَلَ عَلَيْهِ سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَوْ أَشْكَلَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ سَأَلَ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَإِنِّي لَا أَجِدُ مَنْ أَسْأَلُهُ وَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ (۱۰۴۶) نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ابن عمرؓ نے حضرت عثمانؓ (کے فرمان پر ان) سے (معذرت کی اور) کہا کہ میں دو شخصوں کے معاملہ کا فیصلہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا انہوں نے فرمایا آخر کیوں تمہارے والد ماجد تو فیصلے کیا کرتے تھے۔ انہوں نے عرض کی میرے والد کو اگر مشکل پیش آتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر اس کو حل کر لیتے تھے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مشکل پیش آ جاتی تو آپ جبریل علیہ السلام سے معلوم کر لیتے تھے میرے پاس کون ہے جس سے دریافت کر کے میں اپنی مشکلات حل کر سکوں گا (اب عرض یہ ہے کہ) میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جس نے

(۱۰۴۶) \* دیکھئے یہاں ابن عمرؓ بھی اسی حقیقت کا پتہ دے رہے ہیں کہ جزم و یقین اور حقیقت رسی کی راہ صرف وحی کی راہ ہے اور اب وہ بند ہو چکی ہے فہم انسانی خواہ کتنی بھی عالی ہو اور اس کے ذرائع تحقیق و تفتیش خواہ کتنے بھی وسیع ہوں مگر اس کے باوجود حقیقت رسی اور جزم و یقین کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنے جہل کی بناء ظن کو یقین اور کجروی کو صراطِ مستقیم سمجھ بیٹھے یہی وجہ ہے کہ عقلاء ہمیشہ باہم اختلاف و نزاع کے گرداب میں غوطہ زن نظر آتے ہیں۔ اگر عقل انسانی حقیقت تک رسائی کی ضامن بن جاتی تو بھلا حقیقت میں اختلاف کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے مشہور ہے۔

چوں نہ دیدم حقیقت رہ افسانہ زدند

پس کسی جدوجہد کے بغیر حقیقت تک رسائی کا یہ انعام قدرت کا سب سے بڑا انعام تھا، کاش انسان اس کی قدر کرتا۔ یہاں ابن عمرؓ خدا تعالیٰ کی اس نعمت اور اپنے اسی نقصان پر تنبیہ فرما رہے ہیں کہ میرے پاس نہ تو خود حقیقت تک رسائی کا کوئی ذریعہ ہے اور نہ دوسرے کسی واسطہ سے اس کے حصول کا اب کوئی امکان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت تک رسائی اول تو بلا واسطہ تھی اور اگر کوئی واسطہ تھا تو جبریل امین کا تھا، جن کی حقیقت تک رسائی بلا واسطہ تھی اسی لیے آپ کے علوم سب حقیقت ہی حقیقت کے ترجمان تھے اور ان میں کوئی شک و تردید بھی نہ تھا۔ قرآن پاک نے جو اپنی پہلی صفت بیان فرمائی ہے وہ یہی ہے ”ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ“ پس علوم کا کمال یہی ہے کہ ان میں شک و تردید نہ ہو اور یہ صفت وحی کے بغیر پیدا ہونی مشکل ہے۔ رہا عالم غیب وہ تو عقل کی دسترس ہی سے بالاتر ہے اس میں تو عقل انسانی کا غور و خوض کرنا ہی سرتاسر ظلم ہے۔ ابن عمرؓ نے اپنی فطری شدت پسندی کی بناء پر اس کو یہاں ایسے محل پر گلو خلاصی کا بہانہ بنایا جہاں انسان صرف ظن ہی کی تحصیل کا مکلف ہے لیکن جب انسان پر خوف و خشیت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اس قسم کے امور کو اپنی جان بچانے کا آلہ بنا لیا کرتا ہے۔ شریعات میں شدت پسندی کا ذوق بھی عیب ذوق ہے۔

ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تانہ پیشی

حضرت عثمانؓ چونکہ ان کے فطری تاثرات پہچان چکے تھے اس لیے انہوں نے اب زیادہ اصرار کرنا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ زبردستی کسی پر اس ذمہ دار عہدہ کا بار ڈالنا بھی غیر ذمہ دارانہ فعل تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ فہمائش بھی کردی کہ آئندہ کسی سے اس کا تذکرہ نہ ہو ورنہ ہر لفظ.....



اللہ تعالیٰ کی پناہ لی اس نے سب سے بڑے کی پناہ لے لی اور میں نے آپؐ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر پناہ مانگے اس کو پناہ دے دو لہذا میں اللہ تعالیٰ کے نام کی پناہ لیتا ہوں اس بات سے کہ آپ مجھے قاضی بنائیں۔ یہ سن کر عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پھر اصرار نہیں کیا اور یہ بھی فرمادیا دیکھو اس معاملہ کی خبر کسی کو بھی نہ کرنا۔ (رزین - ترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم غیب سے تعارف کی ابتداء (۱۰۴۷) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں پندرہ سال قیام پذیر رہے جن میں سات سال تک آپؐ صرف روشنی دیکھا کرتے اس کے علاوہ فرشتہ وغیرہ کچھ نہ دیکھتے اور آٹھ سال آپؐ پر وحی نازل ہوتی رہی اس کے بعد آپؐ نے دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور پینسٹھ سال کی عمر میں وفات فرمائی۔ (متفق علیہ)

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَقَدْ عَاذَ بِعَظِيمٍ وَ سَمِعْتُهُ يَقُولُ مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَأَعِيدُوهُ وَ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ تَجْعَلَنِّىْ قَاضِيًا فَاَغْفَاهُ وَ قَالَ لَا تُخْبِرُ اَحَدًا.

(رواہ رزین و روى الترمذی نحوه)

### بدء تعارف النبى مع عالم الغيب

(۱۰۴۷) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَقَامَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَّةَ خَمْسَ عَشْرَةَ سَنَةً يَسْمَعُ الصَّوْتِ وَ يَرَى الضُّوْءَ سَبْعَ سِنِينَ وَ لَا يَرَى شَيْئًا وَ ثَمَانِ سِنِينَ يُوحَى اِلَيْهِ وَ اَقَامَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرًا وَ تُوْفِّى وَ هُوَ ابْنُ خَمْسٍ وَ سِتِّينَ سَنَةً. (متفق عليه)

..... شخص یہی بہانے کر کے اپنی جان بچالے گا اور مسلمانوں کے لیے یہ اہم عہدہ آخر خالی ہی پڑا رہے گا۔ اب آپؐ ہی ذرا انصاف کے ساتھ اندازہ لگالیجئے کہ جس دور میں مسلمانوں کے صرف ایک قاضی بننے کے متعلق احساسات یہ ہوں وہاں امیر یا خلیفہ بننے کے جذبات بھلا کیا ہوں گے۔ اگر تاریخ میں اس قسم کے نزاعات کا کہیں اثر ملتا ہے تو اس کو ٹھیک ایسا ہی سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ فرشتوں نے اپنی بالاتفاق معصومیت کے باوجود اپنی خلافت کے سلسلہ میں کچھ کلمات کہہ دیئے تھے۔ کیا ان کے ان کلمات کی بناء پر جو قرآن کریم میں ان کی جانب سے مذکور ہیں ان کو ادنیٰ سا بھی متہم کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ خلافت ارضی امارت ملکی سے کہیں بالاتر مقام تھا ہرگز نہیں۔

اسی طرح اگر کسی دور میں صحابہؓ کے مابین بھی اس قسم کا کوئی نزاع نظر پڑتا ہے تو محض جلد بازی کی بناء پر ان کی پاک نفسی کو متہم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے وہاں بھی تاریخ صحیح صحیح حالات کا پتہ دیتی رہی ہے بشرطیکہ کسی جماعت سے خدا واسطے کی بدظنی عقیدہ کا جزء نہ بن چکی ہو۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ جو عوام میں مشہور ہو گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب جبریل علیہ السلام کا نزول بھی منقطع ہو گیا ہے یہ بالکل بے اصل بات ہے۔ حافظ سیوطی نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تصریح کی ہے۔ چونکہ صاحب وحی حضرت جبریل علیہ السلام ہی ہیں اس لیے وحی نبوت کے انقطاع سے ان کے نفس نزول کی شہرت بے وجہ اڑ گئی ہے۔ اس لیے اگر جبریل علیہ السلام خدا کی رحمتوں کی بارشیں لے کر شب قدر اور اس کے سواء دوسرے اوقات میں جب بھی نازل ہوں یہ سب ممکن ہے ہاں چونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے اس لیے وحی نبوت کا بند ہونا بھی لازمی ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام ایک جلیل القدر فرشتہ ہیں اور نبوت کے ختم ہونے سے فرشتوں کے نزول کا انقطاع سمجھ لینا یہ صرف وہم کا فیصلہ ہے۔

(۱۰۴۷) \* یہاں عالم غیب سے آپ کے تعارف کی پہلی صورت ”نور“ سے معلوم ہوتی ہے اور ایک نورانی عالم کا تعارف نور سے لے کر.....

(۱۰۴۸) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي لَا عَرِفْتُ حَجْرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ إِنِّي لَا عَرِفُهُ الْآنَ. (رواه مسلم قال

(۱۰۴۸) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں مکہ مکرمہ میں اس پتھر کو خوب پہچانتا ہوں جو میری بعثت سے قبل مجھ کو سلام کیا کرتا تھا میں اب بھی اس کو خوب پہچانتا ہوں۔

(مسلم شریف)

ابو شامة و قد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يرى عجائب قبل بعثته كذا في البداية

(۱۰۴۹) عَنِ الشَّعْبِيِّ أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ النَّبُوءَةُ وَهُوَ ابْنُ أَرْبَعِينَ سَنَةً فَقُرِنَ بِنُبُوتِهِ إِسْرَافِيلُ ثَلَاثَ سِنِينَ فَكَانَ يُعَلِّمُهُ الْكَلِمَةَ وَالشَّيْءَ وَلَمْ يَنْزِلِ الْقُرْآنُ فَلَمَّا مَضَتْ ثَلَاثَ سِنِينَ قُرِنَ بِنُبُوتِهِ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَنَزَلَ

(۱۰۴۹) شعبي روایت کرتے ہیں کہ چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت ملی ابتداء نبوت میں تین سال تک اسرافیل علیہ السلام آپ کے ہمراہ رہے اور کبھی ایک کلمہ کبھی کوئی بات آپ پر القاء فرماتے رہتے، مگر قرآن ہنوز نہیں اتر ا تھا۔ جب تین سال کی مدت گزر گئی تو اس کے بعد جبریل علیہ السلام آپ کے ہمراہ رہنے لگے پھر ان کی معرفت بیس سال تک آپ پر قرآن

نزل..... شروع ہونا ہی مناسب بھی تھا۔ اس حدیث میں راوی نے آپ کی عمر پینسٹھ سال بیان کی ہے اور کسی روایت میں تریسٹھ سال بھی ہے۔ اگر وفات و ولادت کے ناتمام سالوں کو شمار کر لیا جائے تو پینسٹھ ورنہ تریسٹھ سال ہوتے ہیں اس لیے ان دونوں باتوں میں چنداں اختلاف نہیں ہے۔

(۱۰۴۸) \* جس طرح عام دستور کے خلاف روشنی کا دیکھنا عالم غیب سے تعارف کا ذریعہ بنا اسی طرح پتھر جیسی غیر ذی شعور چیز سے سلام کی آواز بھی اس کا ایک ذریعہ بن گئی اور اس پیرایہ سے آپ کو اس عالم کا رفتہ رفتہ تعارف پیدا ہوتا رہا جو عالم اسباب سے بالاتر ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو عالم غیب سے تعارف پیدا کرانے کے لیے ہی مبعوث ہوتے ہیں مگر چونکہ ان کا جسم عنصری عام انسانوں کی طرح عالم شہادت میں پیدا ہوتا ہے اس لیے ان کو عالم غیب کا فرد بنانے کے لیے قدرت ان کی بھی تدریجی تربیت فرماتی رہتی ہے اور اس تربیت کے بعد پھر عالم غیب بھی ان کے لیے اسی طرح قطعی ہو جاتا ہے۔ جیسا عالم شہادت بلکہ ان کی صحبت میں جو آبیٹھتا ہے صدق و یقین سے اس کا قلب بھی ایسا جگمگا اٹھتا ہے کہ اس کو بھی عالم غیب گویا عالم شہادت کی طرح سامنے نظر آنے لگتا ہے جب تک عالم غیب پر یہ یقین نصیب نہ ہو اس کی برکات سے پورا استفادہ نہیں ہو سکتا حضرت خظلہ کی حدیث آپ ترجمان السنہ جلد دوم میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور حدیث جبریل (علیہ السلام) میں اسی کا نام احسان رکھا گیا ہے۔

(۱۰۴۹) \* کہتے ہیں کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کو ارواح کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے۔ اسی وجہ سے ”نفخ صور“ کی خدمت ان کے سپرد کی گئی ہے۔ اس مدت میں قدرت کو منظور تھا کہ آپ کی روحانیت اور بلند سے بلند مراتب طے کر لے اور آئندہ آپ میں اس قرآن کریم کے نزول کے تحمل کی صلاحیت اور مکمل ہو جائے جس کے تحمل کی طاقت پہاڑوں میں نہیں ہے۔ سبحان اللہ کلام الہی بھی کیا پر عظمت کلام ہے جس کے نزول کے لیے کتنی تمہیدیں ہو رہی ہیں۔ کبھی جمادات سلام کرتے ہیں، کبھی صرف غیبی آواز آتی ہے، ایک مدت مسلسل سچے خواب دکھائے جا رہے ہیں اور اسی حد پر خاتمہ نہیں بلکہ ایک فرشتہ بھی ایک ایک کلمہ القاء کر کر کے اس صلاحیت میں اضافہ کر رہا ہے.....



الْقُرْآنُ عَلَى لِسَانِهِ عِشْرِينَ سَنَةً عَشْرًا بِمَكَّةَ وَعَشْرًا بِالْمَدِينَةِ فَمَاتَ وَهُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَسِتِّينَ سَنَةً. (رواه احمد باسناد صحيح)

شریف اترتا رہا، دس سال مکہ مکرمہ میں اور دس سال مدینہ طیبہ میں اس حساب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تریسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ (مسند احمد)

قلت وقد وقع في نقله سهواً من النسخ في بعض نسخ فتح الباری فایتنبه وراجع البداية و النہایة ص ۴ ج ۳

انواع الوحي و ایہا کان اشد علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و کیف کان صوت الوحي

وحی کے اقسام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید ترویجی اور وحی کی آواز

(۱۰۵۰) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ كَيْفَ يَأْتِيكَ الْوَحْيُ فَقَالَ

(۱۰۵۰) حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ؟ آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ آپ نے فرمایا کبھی تو یہ صورت ہوتی ہے کہ مجھے ایک گھنٹی کی سی آواز آتی ہے اور

لله..... لیکن اتنی تمہیدات کے بعد بھی جب قرآن کریم کے نزول کے لیے اصل مقرر شدہ فرشتہ ظہور فرماتا ہے تو آپ کی بشریت کاملہ کی بنیاد پھر متزلزل ہونے لگتی ہے۔ یہاں سے ان دو کلاموں کی حقیقت پر غور کرو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کان میں ڈالا گیا تھا اور جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل فرمایا گیا۔ کیا وحی کی اتنی عظیم الشان حقیقت کو بھی خواب و خیال کے برابر کہا جاسکتا ہے اگر انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے مطالعہ کے بعد بھی خواب و خیال اور نبوت کے درمیان فرق واضح نہیں ہوتا تو پھر ہمارے نزدیک دنیا میں کوئی حقیقت ایسی نہیں ہوگی جس پر ہم پورا اعتماد کر سکیں ہر گہری سے گہری حقیقت کے متعلق یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ شاید وہ بھی صرف ایک خواب و خیال ہے جو ہم کو سونے والے کے خواب کی طرح پر از حقیقت نظر آ رہی ہے۔

(۱۰۵۰) \* حافظ ابن تیمیہ نے ”کتاب الایمان“ میں ایک ضروری تنبیہ فرمائی ہے اور وہ یہ کہ بعض الفاظ جب شریعت کی اصطلاح میں کسی خاص معنی کے لیے مخصوص ہو جائیں تو اب قرآن و حدیث میں ان کے لغوی یا عام معنی مراد لینا صحیح نہیں مثلاً صلوٰۃ ایمان اور اسلام کے الفاظ۔ یہ سب الفاظ شریعت کی اصطلاح میں خاص خاص معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں اس لیے اب قرآن و حدیث میں عام طور پر اس کے وہی معنی مراد ہوں گے جو شرعی استعمال سے ایک مرتبہ متعین ہو چکے ہیں مثلاً لفظ ایمان لغت میں گو مطلقاً تصدیق کے معنی میں آتا ہے لیکن اصطلاح شریعت میں اس کا عام استعمال صرف عالم غیب کی تصدیق میں آیا ہے اس لیے اس کے جو معنی اب شرعی اصطلاح قرار پا چکے ہیں قرآن و حدیث میں وہی معنی مراد لیے جائیں گے۔ اسی طرح ”وحی“ کا لفظ ہے۔ لغت میں وہ کس معنی کے لیے ہے اب اس پر بحث کرنی غیر ضروری ہے کیونکہ قرآن کریم میں جب اس لفظ کا استعمال انبیاء علیہم السلام کے دائرہ میں ہوا ہے تو اس کے معنی بندہ اور حق تعالیٰ کے مابین ہم کلامی کے ہوئے ہیں اس لیے اب جب کہیں وحی کا لفظ انبیاء و رسل کے بارے میں مستعمل ہوگا تو اس کے یہی معنی مراد لیے جائیں گے۔

حافظ ابن تیمیہ کی اس تحقیق کا حاصل یہ نہیں ہے کہ شرعی استعمال لغت کے برخلاف ہوتا ہے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص استعمال میں جب کسی لفظ میں کوئی تخصیص پیدا ہو جائے تو اب لغت میں عموم کی وجہ سے اس کی یہ خصوصیت نظر انداز نہیں کی جائے گی۔ اب دیکھئے کہ لغت میں وحی کا لفظ خفیہ اشاروں میں بات چیت کے لیے آیا ہے۔ یرمون بالخطب الطوال وتارة... وحی الملاحظہ خیفۃ الرقباء کبھی تو یہ لمبی تقریریں اور کبھی رقیبوں کے ڈر سے چپکے چپکے صرف آنکھوں کے اشارے۔ اس لحاظ سے ہر خفیہ اشارہ للہ.....

رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلَاسَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّ عَلَيَّ فَيَقْصِمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَ أَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِي الْمَلَكُ رَجُلًا فَيَكَلِّمُنِي فَأَعِي مَا يَقُولُ قَالَتْ عَائِشَةُ وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يُنْزَلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَقْصِمُ عَنْهُ وَإِنْ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا. (متفق عليه)

(۱۰۵۱) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ سَمِعَ عِنْدَ وَجْهِهِ دَوِيَّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ فَأُنْزِلَ عَلَيْهِ يَوْمًا فَمَكَّنَا سَاعَةً فَسَرَّيْنَا عَنْهُ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ اللَّهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَ اكْرِمْنَا وَلَا

یہ قسم مجھ پر سب سے دشوار تر ہوتی ہے اس کے بعد جب وہ کیفیت دور ہو جاتی ہے تو جو وحی میں ارشاد ہوا تھا وہ مجھ کو محفوظ ہو جاتا ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ فرشتہ خود کسی شخص (دجیہ کلبی) کی صورت بن کر میرے سامنے آ جاتا ہے اور مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ پھر جو کچھ وہ کہتا ہے میں اس کو یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے سخت جاڑوں کے موسم میں آپ کو نچشم خود دیکھا ہے کہ جب آپؐ پر وحی آ کر تمام ہو جاتی تو آپؐ کی پیشانی مبارک پسینہ پسینہ ہو جاتی تھی۔ (متفق علیہ)

(۱۰۵۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کے پاس ایک ایسی آواز محسوس ہوا کرتی تھی جیسی شہد کی مکھیوں کے گنگنات کی ہوتی ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ آپ پر وحی آئی تو ہم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے جب وحی کے آنے کی کیفیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے جاتی رہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور اپنے دونوں ہاتھ دعاء کے

للہ..... اور خفیہ بات چیت پر وحی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے اور اسی معنی کے لحاظ سے اس لفظ کا استعمال حیوانات اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ بھی ہوا ہے، لیکن جب اس کا استعمال خاص رسولوں میں ہوا ہے تو پھر شریعت کی اصطلاح میں صرف اس کلام کو وحی کہا گیا ہے جو رسول اور حق تعالیٰ کے درمیان ہوتا ہے اس تخصیص کے بعد بھی لغت کے اصل معنی یہاں ملحوظ رہتے ہیں کیونکہ یہاں بھی متکلم اور اس کا کلام دونوں اتنے خفیہ ہوتے ہیں کہ اس کی اطلاع سوائے رسول کے اس کے پاس بیٹھنے والوں کو بھی نہیں ہوتی خلاصہ یہ ہے کہ اب وحی کے مختصر معنی یہ ہیں کہ وہ رسول اور خدا تعالیٰ کے مابین کلام کا نام ہے اب اس کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ وحی کے اقسام اور اس کی کیفیات کے معلوم کرنے سے جتنا اجمالاً حل ہو سکتا ہے بس اسی حد تک اس کو حل شدہ سمجھنا چاہیے اس سے زیادہ بحث کرنا اپنی حد سے تجاوز کرنا ہے اور ہمارے لیے غیر ضروری بھی ہے۔

(۱۰۵۱) \* اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی کسی قسم میں کبھی ایسی آواز بھی ہوتی تھی جس کو کبھی کوئی بلند فطرت صحابی بھی سن لیا کرتا تھا۔ مگر پھر بھی اس کا ادراک صرف ایک غیبی صوت کے سواء کچھ نہ ہوتا نہ تو اس کے حروف مسموع ہوتے نہ معنی مفہوم ہوتے بلکہ صرف ایک بسیط آواز ہوتی۔ عجیب بات ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس آواز کو تشبیہ دی تو گھنٹی کی آواز سے تشبیہ دی اور یہاں جب حضرت عمرؓ نے اس کو تشبیہ دی تو دوی نحل یعنی شہد کی مکھی کی آواز سے تشبیہ دی ہے علماء نے لکھا ہے کہ گھنٹی کی آواز گوشرنا پسندیدہ ہے مگر وحی کو اس کے ساتھ اس لحاظ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ بھی ایک بسیط آواز ہوتی ہے اور بے جہت مسموع ہوتی ہے۔ مکھیوں کی مسلسل جھنجھناہٹ سے بھی اس قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے یعنی اس کا مبداء مقطع بھی معلوم نہیں ہوتا صرف گھنٹی کی طرح ایک بسیط آواز للہ.....



تُهِنَّا وَاعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاتِرْنَا وَلَا تُؤْتِرْ عَلَيْنَا وَارْضَنَا عَنْكَ وَارْضَ عَنْنَا قَالَ أَنْزَلَ عَلَى عَشْرِ آيَاتٍ مَنْ أَقَامَهُنَّ دَخَلَ الْجَنَّةَ ثُمَّ قَرَأَ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ حَتَّى خَتَمَ عَشْرَ آيَاتٍ. (رواه احمد و الترمذی فی تفسیر سورة المؤمنین و تکلم فی اسنادہ فلیراجع و رواہ النسائی ثم قال النسائی منکر لا نعرف احدا رواہ غیر یونس بن سلیم و لا نعرفہ. کذا فی البدایہ والنہایہ ص ۲۱ ج ۳)

لیے اٹھائے اور یہ دعاء فرمائی اے اللہ ہمیں اور زیادہ کر اور گھٹا مٹ، ہمیں اور شرف عطا فرما اور ذلیل نہ فرما، ہمیں اور زیادہ دے اور محروم نہ رکھ، ہمیں دوسروں پر ترجیح دے اور دوسروں کو ہم پر ترجیح نہ دے اور ہم کو اپنے سے راضی رہنے کی توفیق بخش اور تو ہم سے راضی ہو جا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر دس آیتیں اتری ہیں جو شخص ان پر پورا پورا عمل پیرا ہوگا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دس آیتیں آخر تک پڑھیں ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ الخ... یقیناً وہ مؤمن کامیاب ہو گئے الخ۔

(احمد-ترمذی)

(۱۰۵۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ يَبْلُغُ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا قَضَى اللَّهُ الْأَمْرَ فِي

(۱۰۵۲) ابو ہریرہؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب آسمان پر کسی بات کا فیصلہ فرماتے ہیں تو فرشتے اس فرمان کی عظمت و دہشت سے اپنے پر

اللہ..... معلوم ہوتی ہے ان دونوں تشبیہوں پر اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہیں فرق ہو تو شاید صرف اتنا ہی ہو کہ صاحب وحی کو وہ آواز کچھ زیادہ تیز محسوس ہوتی ہو اس لیے آپؐ نے اس کو ’صلصلۃ‘ یعنی گھنٹے کی آواز سے تشبیہ دی ہو اور سامعین میں جس کو اس غیبی صوت کا سننا نصیب ہوتا ہو اس کو خفیف اور ہلکی محسوس ہوتی ہو اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی حقیقت خواب و خیال سے بالکل بالاتر ہے۔ عالم رویا کا سارا تماشا صرف سونے والے کے سامنے ہوتا ہے اور یہاں آثار وحی بقیہ سامعین پر بھی درجہ بدرجہ نمودار ہوتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات وحی کی بے کیف آواز کا ادراک بھی ہوتا تھا۔ ابھی آپؐ کے سامنے آنے والا ہے کہ نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو متاثر ہوتے ہی تھے لیکن اس حالت میں اگر آپؐ کا جسم اطہر کسی دوسرے کے جسم کے ساتھ ذرا متصل ہو جاتا تو وہ بھی وحی کی عظمت سے پس پس جاتا تھا۔ اب مختلف صحابہؓ کے ان مختلف احساسات کے بعد بھی کیا وحی کو محض ایک دماغی تخیل کہا جاسکتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

(۱۰۵۲) \* اس حدیث میں وحی کے وقت ایک تیسری قسم کی آواز کا بھی ذکر ہے لیکن ان تینوں پر اگر آپؐ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اصل غرض سب جگہ ایک ہی ہے۔ پھر پرزنجیر کی آواز بھی گھنٹہ کی آواز کی طرح ایک گونج رکھتی ہے اس میں بھی سننے والے کو کسی خاص جہت کا ادراک نہیں ہوتا اور یہاں بھی انسانی کلام کے برخلاف مبداء مقطع یعنی شروع اور خاتمہ علیحدہ علیحدہ ممتاز محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک بسیط اور مسلسل آواز محسوس ہوتی ہے اور بس۔ شارحین حدیث میں اس آواز کے متعلق اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ خود اس وحی کی آواز ہوتی ہے اور کسی کا خیال ہے کہ یہ فرشتے کے پروں کی آواز ہوتی ہے۔ ہم اس قسم کی بحثوں کا فیصلہ کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں اور غیر مفید بھی۔ فلاسفہ قدیم کو عام انسانی آواز کی سماعت کی حقیقت میں اختلاف رہا ہے پھر ہمارا کیا حوصلہ ہے کہ ہم وحی کی آواز کی حقیقت میں لب کشائی کر سکیں۔ غائبات یعنی عالم غیب کے متعلق سب سے صحیح اور آسان راستہ یہی ہے کہ اس پر یقین رکھا جائے اور اس کا اعتراف کر لیا جائے اللہ.....

السَّمَاءِ ضَرَبَتْ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَأَنَّهُ سِلْسِلَةٌ عَلَى صَفْوَانٍ وَقَالَ غَيْرُهُ صَفْوَانٌ يَنْفُذُهُمْ ذَلِكَ فَإِذَا فُزِعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا

اس طرح مارتے ہیں جیسے پتھر پر زنجیر لگتی ہے اور اس سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہاں بعض راویوں نے یہ اور اضافہ کیا ہے کہ وہ آواز ان کے آر پار ہو جاتی ہے۔ جب خوف و دہشت کی یہ کیفیت ان کے قلوب سے دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں ”پروردگار نے کیا حکم دیا“

للہ..... اور بس۔ اگر وہ ہمارے دائرہ ادراک کی چیز ہوتی تو پھر اس کو عالم غیب کہنا ہی کیونکر درست ہوتا۔ عالم غیب ہے وہی جو ہمارے حواس و ادراکات کے دسترس سے باہر ہو۔ اسی لیے اس کی اطلاع کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں اور ان ہی کے اعتماد پر اس پر یقین کرنے کے لیے ہم مکلف بنائے گئے ہیں۔ لیکن صرف ایک نظیر کے طور پر ٹیلیگراف یعنی تار کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ یہاں بھی عام سامعین کو صرف ایک کھٹکے کی بے معنی آواز آتی ہے لیکن جو اس کا رمز شناس ہوتا ہے وہ اس آواز کو اسی طرح سمجھ لیتا ہے جس طرح کہ آپ عام بات چیت کو سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح آپ بھی وحی کی آواز صلیۃ الجرس کی طرح سنتے اور اس کا مطلب پورا پورا سمجھ لیتے یا دوسری شکل ٹیلیفون کی ہے جس میں خود متکلم باتیں کرتا ہے مگر یہاں بھی مخاطب کے سواء کوئی دوسرا شخص اس آواز کو نہیں سنتا لیکن جو نہیں سنتا وہ سننے والے کے اعتماد پر ٹیلیفون کی تمام خبروں کا پورا یقین کر لیتا ہے اور اپنے دل میں دروغ بیانی یا اس کے وہم و خیال ہونے کا کوئی احتمال بھی نہیں لاتا۔ فرق ہے تو بس اتنا ہے کہ یہاں اس کو یہ اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ اس آواز کو ہر انسان سن سکتا ہے اور اگر چاہے تو وہ خود بھی سن سکتا ہے مگر وحی نہ ہر انسان پر آتی ہے اور نہ ہر انسان اس کی آواز سن سکتا ہے مگر کسی بات پر یقین کرنے کے لیے کیا یہ بھی کوئی اصول ہے کہ جب تک خود اس بات کو بلا واسطہ معلوم نہ کر لیا جائے اس کا یقین نہ کیا جائے۔ پھر کیا بنی اسرائیل کی ضدی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہی فرمائش نہیں کی تھی کہ جب تک ہم رب العزت کا کلام خود بلا واسطہ نہ سن لیں اس وقت تک محض آپ کے بیان پر یقین نہیں لاسکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خاطر آخران کی یہ ہٹ بھی پوری کی گئی۔ لیکن جن کو نہیں ماننا تھا وہ اس پر بھی نہ مانے اور ایک یہ حیلہ اور نکال کھڑا کیا کہ جب تک متکلم خود ہمارے سامنے آکر بالمشافہ آئے سامنے گفتگو نہ کرے ہمیں اس پس پردہ گفتگو پر کوئی اعتماد نہیں ہو سکتا گویا اس قوم کا مطالبہ یہ تھا کہ جو بات خود ان کے نبی کے لیے ممکن نہ تھی وہ ان کے لیے ممکن ہو جائے اور اگر بالفرض یہ بھی ہو جاتا تو یقیناً وہ کوئی اور تیسرا بہانہ نکال لیتے۔ پس نبوت وحی اور عالم غیب کے ہر ہر جزئی کے لیے علیحدہ علیحدہ دلائل کی فکر میں نہ پڑیے اور انبیاء علیہم السلام پر ایمان لے آنے کے بعد جو بات وہ کہتے ہیں ان کے اعتماد پر آپ اس کو مان لیجئے۔ وحی کے باب کی حدیثیں اس کی کیفیات اور دوست و دشمن کے سامنے اس کے نزول کے متعدد حالات آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو بار بار خالی الذہن ہو کر پڑھیے تو آپ اس فیصلہ پر مجبور ہوں گے کہ ضرور یہ کوئی قطعی حقیقت ہے خیالی افسانہ نہیں والعیاذ باللہ جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس کا اثر نہ صرف آپ ہی کی ذات تک محدود رہتا بلکہ سعید اہل مجلس پر بھی ہوتا اور پڑھے ہوئے اور ان پڑھ جو بھی اس وقت وہاں موجود ہوتے وہ وحی کا نزول اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور یہ یقین کر لیتے کہ ضرور یہ کوئی ایسی بلند حقیقت ہے جس سے ہر بشر آشنا نہیں ہو سکتا۔ یہاں نزول وحی کی دوسری ساعت بعد ہی خفیہ سازشیں سب عریاں ہو جاتی تھیں۔ ہر سائل اپنے مشکل سے مشکل سوال کا جواب پالیتا تھا، تشنگان ہدایت کے لیے وہ وہ ہدایات نصیب ہو جاتی تھیں جن سے صحفِ سماویہ اب تک خالی تھیں اور عقل انسانی آج تک اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہے۔ اگر آپ کو یہاں علمی مباحث کا شوق ہو تو تفسیر رازی ص ۴۰۷ ج ۷۔ التفسیر الیم سورہ فاتحہ کی تفسیر زیر لفظ ہدایت اور الروض الانف اور شروح حدیث ملاحظہ فرمائیے۔ للہ.....



لَلَّذِي قَالَ الْحَقُّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ.

تو جوان میں مقرب ہیں وہ جواب دیتے ہیں۔ وہی حکم دیا جو درست و

(رواہ البخاری ص ۷۰۸ و ۱۱۱۴) مناسب تھا اور وہ بڑا عالیشان اور سب سے بڑا ہے۔ (بخاری شریف)

## النفث فی الروع

## فرشتہ کا غیبی طور پر قلب میں کوئی بات ڈالنا

(۱۰۵۳) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ

(۱۰۵۳) ابن مسعود روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ لوگو! جو بات بھی تم کو جنت سے قریب

لے..... پھر جب وحی کی حقیقت ہی ایک غیبی حقیقت ہے تو اس کے اقسام میں بھی یقیناً یہی صفت ہونی چاہیے۔ اس لیے ہم اس پر بھی کچھ زیادہ کلام کرنا نہیں چاہتے۔ جتنا قرآن کریم کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وحی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ خود نبی کے باطن میں کوئی بات القاء فرمادے نہ کوئی آواز مسموع ہو اور نہ فرشتے کا واسطہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی پر کچھ القاء فرمائے مگر پس پردہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوہ طور پر تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ آئے اور اس کے ذریعہ سے وحی نازل ہو اس کی پھر دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ فرشتہ خود انسانی صورت میں متحمل ہو کر آئے دوم یہ کہ نبی کے باطن میں تصرف کر کے اس کو ملکوتیہ کے قریب کر دیا جائے۔ اس دوسری صورت میں چونکہ خود آپ کی ذات قدسی صفات میں تصرف کیا جاتا تھا۔ اس لیے وحی کی یہ قسم آپ پر شدید ہوتی تھی یوں تو وحی کی جو قسم بھی تھی وہ شدید ہی تھی۔ مگر اس قسم میں اس تصرف کی وجہ سے اس کی شدت میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وحی کی جتنی قسمیں ہیں وہ سب ان ہی میں سے کسی نہ کسی قسم میں داخل ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بآيَاتِهِ مَا يَشَاءُ. (الشوری: ۵۱)

اور کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے باتیں کرے مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کوئی پیغام لانے والا (فرشتہ) بھیجے پھر پہنچادے اس کے حکم سے جو وہ چاہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں جو اس باب میں سب سے پہلے ذکر کی گئی ہے تیسری قسم ہے دوسری قسم کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ اس کا وجود ہی نادر تھا۔ وحی کی یہ صورت یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر پیش آئی تھی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شب معراج میں پیش آئی۔ حضرت استاذ مولانا محمد انور شاہ قدس سرہ کا مختار یہ تھا کہ شب معراج میں نوازش کی ابتداء مکالمہ اور وحی سے شروع ہوئی تھی اور روایت پر جا کر منتہی ہو گئی تھی۔ یعنی شروع میں مکالمہ ہوتا رہا مگر اس وقت تک روایت نہ ہوئی اور جب مکالمہ ختم ہو گیا تو رب السموات والارضین نے اپنے دیدار سے آپ کو مشرف فرمایا۔ فسبحان من منعم مفضل۔

(۱۰۵۳) \* حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتہ کا براہ راست نبی کے قلب میں کوئی بات ڈال دینا بھی وحی کی ایک قسم ہے لیکن وحی ربانی شک و تردد سے کتنی پاک و صاف ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کی ہر نوع صاحب نبوت کے لیے روشن ہوتی ہے اور امت کے لیے اس پر ایمان لانا پہلا فرض ہوتا ہے۔ سیرت کے پڑھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ حالات کی پوری نامساعدت کے باوجود خدا کے رسولوں کو خدائی وعدہ میں کبھی ذرا تردد پیش نہیں آیا۔ صلح حدیبیہ کی صلح کتنی دب کر کی گئی تھی جس کی ہر ہر دفعہ مسلمانوں کے ضعف و کمزوری کی گویا ایک ایک دلیل تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کسی مخلص نے سوال کیا تو آپ نے کسی تردد کے بغیر اسی صلح نامہ کو مسلمانوں کی فتح سے تعبیر کیا چنانچہ بہت ہی قلیل مدت کے بعد واقعات نے اس کی تصدیق کی اور مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔ یہاں رزق کا معاملہ بھی جس جزم لے.....

مِنْ شَيْءٍ يُقَرَّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ وَلَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرَّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَإِنَّ الرُّوحَ الْأَمِينَ وَفِي رَوَايَةٍ وَ إِنْ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوعِي أَنْ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا إِلَّا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ أَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ أَنْ تَطْلُبُوهُ بِمَعَاصِي اللَّهِ فَإِنَّهُ لَا يُدْرِكُ مَا عِنْدَ اللَّهِ إِلَّا بِطَاعَتِهِ.

(رواہ فی شرح السنۃ و البیہقی فی شعب الایمان)

### الرُّوْيَا

(۱۰۵۴) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَشَّرْتُ عِنْدَ خَالَتِي مَيْمُونَةَ لَيْلَةَ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ

کرنے والی اور آتش دوزخ سے دور کر دینے والی تھی میں تم کو اس کا حکم دے چکا ہوں اور جو بات بھی تم کو آتش دوزخ سے قریب اور جنت سے دور کر دینے والی تھی اس کے کرنے سے میں تم کو روک چکا ہوں۔ اس سلسلہ میں حضرت جبریل علیہ السلام نے میرے قلب میں یہ بات بھی القاء فرمائی ہے کہ کوئی نفس جب تک کہ وہ اپنے مقدر کا رزق پورا نہ کر لے ہرگز مر نہیں سکتا، لہذا خبردار اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور ذرا صبر کے ساتھ رزق طلب کرو اور اگر مقدر کا رزق ملنے میں کچھ تاخیر ہو تو اس کو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کے ذریعہ سے حاصل کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو جایا کرو۔ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو رزق دست قدرت میں ہے وہ صرف اس کی حکم برداری سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ (شرح السنۃ بیہقی)

### خواب

(۱۰۵۴) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شب میں اپنی خالہ حضرت میمونہ کے گھر رہا جب کچھ شب گزر گئی تو آنحضرت صلی اللہ

ﷺ ..... یقین کے ساتھ اداء کیا گیا ہے وہ لفظ ”لن“ سے ظاہر ہے۔ عربی میں یہ لفظ تاکید کے لیے آتا ہے۔ کیا خواب اور صفراء کے تخیلات اور وحی میں اب بھی کوئی التباس ہو سکتا ہے۔

انسان کی کمزور فطرت رزق کو انسانی جدوجہد کے تابع سمجھتی ہے، مگر وحی کہتی ہے کہ یہ معاملہ صرف تقدیر کے تابع ہے اور مشکوک نہیں یقینی ہے اور اتنا یقینی ہے کہ موت جیسی یقینی چیز بھی اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک کہ انسان اپنے مقدر کا رزق پورا پورا حاصل نہ کر لے۔ انسان سمجھتا ہے کہ رزق آزاد ذرائع سے بآسانی اور وسعت سے حاصل ہوتا ہے حدیث یہ سمجھاتی ہے کہ یہ خیال غلط ہے رزق صرف خدا تعالیٰ کی حکم برداری سے مل سکتا ہے اور اس کو یوں آسان طریقہ سے دلنشین کرتی ہے کہ رزق خدا تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور جب یہ ہے تو پھر بھلا اس کی نافرمانی کر کے رزق کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس سے آپ یہ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ حدیث میں کسب و اکتساب کی ممانعت نہیں بلکہ حرام ذرائع کی ممانعت ہے۔ انسان یہ سوچتا ہے کہ سود، لوٹ مار، دغا و فریب اور اسی قسم کے دوسرے ناجائز ذرائع سے اس کو مال حاصل کرنا کچھ عیب نہیں۔ حدیث کہتی ہے یہ صرف اس کی ایمانی کمزوری ہے اس کو حلال ذرائع سے جدوجہد کرنی چاہیے اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ جو رزق اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے وہ اس ذریعہ سے بھی پہنچ کر رہے گا۔ رزق کو مقصد زندگانی بنانا بلند خیالی نہیں ہے۔ انسانی خلقت کا اصل مقصد خلافت کے فرائض کے انجام دہی ہے۔ لہذا یہ ضروریات ضمنی ہی رہنی چاہئیں۔

(۱۰۵۴) \* عالم نبوت سے نا آشنا تو یہ کہتے ہیں کہ نبوت کی حقیقت عالم خواب کی طرح بے حقیقت ہوتی ہے اور جو اس سے آشنا ہیں وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے عالم خواب کے ادراکات دوسروں کی بیداری کے ادراکات سے بھی کہیں بڑھ کر پر از حقیقت اور قطعی ﷺ.....



عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا كَانَ فِي بَعْضِ اللَّيْلِ قَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّأَ مِنْ عَنْ مَعْلَقٍ وَضُوءٌ خَفِيفًا يُخَفِّفُهُ عَمْرُو وَيُقَلِّلُهُ جِدًّا ثُمَّ قَامَ يُصَلِّي فَقُمْتُ فَتَوَضَّأْتُ نَحْوًا مِمَّا تَوَضَّأْتُ ثُمَّ جِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ فَحَوَّلَنِي فَجَعَلَنِي عَنْ يَمِينِهِ ثُمَّ صَلَّى مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتَّى نَفَخَ فَاتَّاهُ الْمُنَادِي يُؤَذِّنُهُ بِالصَّلَاةِ فَقَامَ مَعَهُ إِلَى الصَّلَاةِ فَصَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ قُلْنَا لِعُمَرَ وَإِنْ نَاسًا يَقُولُونَ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

علیہ وسلم اٹھے اور ایک مشک سے جو لٹکی ہوئی تھی وضوء فرمایا حدیث کا راوی عمر و کہتا ہے کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کم پانی صرف کیا اس کے بعد نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہو گئے تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جیسا وضوء آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اسی طرح میں نے بھی کیا پھر آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو بدل کر اپنی دائیں جانب گھڑا کر لیا اس کے بعد جتنی رکعتیں اللہ تعالیٰ کو منظور تھیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائیں پھر آپ آ کر لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سونے کی آواز آنے لگی مؤذن حاضر ہوا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اطلاع دی آپ اٹھ کر یوں ہی اس کے ساتھ نماز کو تشریف

لے ..... ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ بھی وحی ربانی کی ایک قسم شمار ہوتے ہیں۔ دیکھئے بیٹے کے ذبح کرنے کا معاملہ کتنا اہم معاملہ تھا جس کی اجازت نہ شرعاً ہے نہ عقلاً مگر جب خدا تعالیٰ کا برگزیدہ نبی اپنے خواب میں یہ دیکھ لیتا ہے تو اس کو پورا کرنے میں ذرا تردد نہیں کرتا اور فوراً اس کی تیاری شروع کر دیتا ہے پھر جو بیٹا نبی اولوالعزم ہونے والا تھا اس کی فطری استقامت بھی کتنی حیرت انگیز ہے کہ حکم رب کے سامنے جس مسرت اور رضامندی کے ساتھ وہ سر جھکا رہا ہے اس کی مثال نوع بشر میں ملنی مشکل ہے۔ عام انسانوں کے خواب کے ادراکات چونکہ حواس کے تعطل اور قوت واہمہ کے غلبہ کی حالت میں ہوتے ہیں اس لیے ان کی کوئی حیثیت نہیں سمجھی جاتی انبیاء علیہم السلام کی نیندان دونوں علتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ عین خواب میں بھی اپنی بیداری کی طرح عالم غیب سے خبردار رہتے ہیں اس لیے ان کی نیند کے عوارض صرف وہی ہوتے ہیں جن کا تعلق اس آنکھ کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی وہ انسانوں کی آوازیں نہیں سنتے ان کی صورتیں نہیں دیکھتے اور اسی طرح دوسرے امور جن کا تعلق صرف ظاہری حواس کے ساتھ ہوتا ہے ان سے معطل ہو سکتے ہیں مگر عالم غیب جس کا تعلق دراصل ان حواس ظاہری کے ساتھ نہیں ہوتا اس سے وہ کسی حالت میں بھی غافل نہیں ہوتے اس لیے ان کے خواب کے ادراکات کی حیثیت وہی رہتی ہے جو ان کی بیداری کے ادراکات کی ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت ابن عباسؓ اپنی اس نوعمری میں بھی کتنے فہیم تھے۔ اسی غرض کے لیے یہاں ایک شب گزارنے آئے کہ آپ کی شب کی عبادت کا نقشہ خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں ابھی بچپن کی عمر ہے مگر معلوم نہیں کہ اس شوق میں کیا تمام شب جاگ کر ہی کاٹ دی تھی کہ ادھر آپ کے اٹھنے کی آہٹ ہوئی ادھر جھٹ ان کی آنکھیں اپنے مقصد پر جا لگیں کتنے بادب تھے کہ سب کچھ دیکھتے رہے مگر اس طرح خاموش پڑے رہے گویا بے خبر سو رہے ہیں۔ جب دیکھ لیا کہ آپ عبادت الہی میں مصروف ہو گئے تو اب خود بھی اٹھے اور موہو اسی طرح نقل کرنے کی کوشش کی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا تھا۔ ابھی ذرا سی عمر تھی مسئلہ معلوم نہ تھا اس لیے بائیں طرف آ کر آپ کی نماز میں شامل ہو گئے لیکن جس کو اللہ تعالیٰ نے لیل و نہار میں صغیر و کبیر کے لیے معلم بنا کر بھیجا تھا اس نے ذرا توقف نہ کیا اور للہ .....

تَنَامُ عَيْنُهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ قَالَ عُمَرُو سَمِعْتُ  
عُبَيْدَ بْنَ عُمَيْرٍ يَقُولُ إِنَّ رُؤْيَا الْأَنْبِيَاءِ وَحْيٌ  
ثُمَّ قَرَأَ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ.

(رواه البخاری فی باب التخفیف فی الوضوء  
ص ۲۵ و فی باب وضوء الصبیان ص ۱۱۹  
ج ۱ و عند الترمذی فی مناقب عمر و یروی  
عن ابن عباس انه قال رؤیا الانبیاء وحی ص  
۲۰۹ ج ۲)

### الرَّسُولُ الْعَظِيمُ وَ مَشْهُدُهُ عِنْدَ

#### نَزُولِ الْوَحْيِ

(۱۰۵۵) إِنَّ صَفْوَانَ بْنَ يَعْلَى أَخْبَرَهُ أَنَّ يَعْلَى  
أَخْبَرَهُ قَالَ لِعُمَرَ ابْنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ حِينَ يُوحَى إِلَيْهِ قَالَ فَبَيْنَمَا النَّبِيُّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجِعْرَانَةِ وَمَعَهُ نَفَرٌ مِنْ  
أَصْحَابِهِ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ كَيْفَ  
تَرَى فِي رَجُلٍ أَحْرَمَ بِعُمْرَةٍ وَهُوَ مُتَضَمِّنٌ  
بِطَيْبٍ فَسَكَتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
سَاعَةً فَجَاءَهُ الْوَحْيُ فَأَشَارَ عُمَرُ إِلَى يَعْلَى  
فَجَاءَ يَعْلَى وَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ ثَوْبٌ قَدْ أَظْلَ بِهِ فَادْخَلَ رَأْسَهُ فَإِذَا

لے گئے اور نماز ادا فرمائی اور وضوء نہیں کیا۔ ہم نے عمر و راوی حدیث سے  
پوچھا لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف  
آنکھیں ہی آنکھیں سوتی تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اس حالت میں  
بھی بیدار رہتا تھا۔ عمر و کہتے ہیں میں نے عبید بن عمیر کو یہ کہتے خود سنا ہے کہ  
انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ اس پر قرآن کریم کی یہ آیت  
دلیل کے طور پر پڑھی اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ الْخَیْرَ یعنی حضرت ابراہیم علیہ  
السلام نے اپنے فرزند اسمعیل علیہ السلام سے کہا میں نے خواب میں دیکھا  
ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ (بخاری شریف)

### آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کا ایک

#### منظر

(۱۰۵۵) صفوان بن یعلی بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد یعلی نے حضرت عمر  
رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی  
آئے تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا مجھے بھی دکھائیے گا۔ راوی کہتا  
ہے ایسا اتفاق ہوا کہ آپ مقام جعرانہ میں تھے اور صحابہ کی ایک جماعت آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی کہ ایک شخص آیا اور اس نے یہ مسئلہ پوچھا یا رسول  
اللہ ایک شخص خوشبو میں لت پت ہو رہا تھا اور اسی حالت میں اس نے عمرہ کا  
احرام باندھ لیا اب وہ کیا کرے آپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور آپ  
پر وحی کا نزول شروع ہوا (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ  
وسلم کے چہرہ مبارک پر ایک کپڑا ڈھانک دیا) اور یعلیٰ کو اشارہ کیا آگے آؤ وہ  
آگئے اس وقت آپ کے چہرہ مبارک پر کپڑا پڑا ہوا تھا انہوں نے اپنا سر اس

..... نماز ہی کی حالت میں ان کو اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا جو درحقیقت تنہا مقتدی کا صحیح موقف تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر نماز کی  
حالت میں کوئی مکروہ فعل پیش آ جائے تو اسی وقت اس کی اصلاح کر لینی چاہیے۔ اس کے بعد جو عجیب بات انہوں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم اچھی طرح سو گئے تھے لیکن اس کے باوجود جب نماز کا وقت آیا تو اپنے پہلے وضوء سے ہی نماز ادا فرمائی گویا آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم کی نیند ناقص وضوء نہ تھی۔ خدا ہی جانے اس بیداری کا عالم کیا ہوگا جس میں اپنی طہارت اور غیر طہارت کا ادراک آپ صلی اللہ علیہ  
وسلم کو عالم خواب میں بھی رہتا تھا۔



رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُحَمَّرُ  
الْوَجْهِ وَهُوَ يَغْطُ ثُمَّ سُرِّي عَنْهُ فَقَالَ أَيْنَ الَّذِي  
سَأَلَ عَنِ الْعُمْرَةِ فَاتَى بِرَجُلٍ فَقَالَ اغْسِلِ  
الطِّيبَ الَّذِي بِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَانْزِعْ  
عَنْكَ الْجَبَّةَ وَاصْنَعْ فِي عُمْرَتِكَ كَمَا  
تَصْنَعُ فِي حَجِّكَ فَقُلْتُ لِعَطَاءٍ أَرَادَ الْإِنْقَاءَ  
حِينَ أَمَرَهُ أَنْ يَغْسِلَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ نَعَمْ.

(رواه البخاری فی باب غسل الخلق ثلاث

کے اندر داخل کیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہو رہا ہے اور وحی  
کی شدت سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپؐ کا دم گھٹ رہا ہو اس کے بعد جب  
وہ کیفیت جاتی رہی تو آپؐ نے فرمایا وہ عمرہ کا مسئلہ دریافت کرنے والا شخص  
کدھر گیا۔ اسی وقت اس کو آپؐ کی خدمت میں حاضر کیا گیا آپؐ نے اس سے  
فرمایا جو خوشبو تیرے جسم پر لگی ہوئی ہے اس کو تین بار دھو ڈال اور اپنا جبہ اتار  
دے اور پھر جیسے اپنا حج کرتا تھا اسی طرح عمرہ اداء کر لے میں نے عطاء راوی  
سے پوچھا۔ تین مرتبہ خوشبو کے دھونے سے آپؐ کی غرض یہی ہوگی کہ وہ خوب  
صاف ہو جائے۔ انہوں نے کہا جی ہاں۔ (بخاری شریف)

مرات ص ۲۰۸ ج ۱ - و فی باب یفعل بالعمرة ما یفعل فی الحج فانزل الله علی النبی صلی الله علیه وسلم فستر بثوب  
(۱۰۵۶) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ كَانَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ  
يَتَحَدَّثُ يُكْثِرُ أَنْ يَرْفَعَ طَرْفَهُ إِلَى السَّمَاءِ.

(رواه ابوداؤد)

(۱۰۵۷) عِبَادَةُ بْنُ صَامِتٍ فَرَمَاتِي هِيَ كَمَا جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
پرو وحی آتی تو اس کی شدت سے آپؐ کو اتنی تکلیف ہوتی کہ چہرہ مبارک تک  
متغیر ہو جاتا۔ ایک روایت میں اتنا اضافہ اور ہے کہ آپؐ اپنا سر مبارک جھکا  
لیتے اور آپؐ کے صحابہ بھی اپنے سروں کو جھکا لیتے پھر جب وحی کا نزول ختم  
ہو جاتا تو آپؐ اپنا سر اٹھا لیتے۔ (مسلم شریف)

(۱۰۵۷) عَنْ عِبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ  
النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ  
الْوَحْيُ كُرِبَ لِدَكَ وَتَرَبَّدَ وَجْهُهُ وَفِي  
رِوَايَةٍ نَكَسَ رَأْسَهُ وَنَكَسَ أَصْحَابُهُ رُؤُسَهُمْ  
فَلَمَّا أُتِيَ عَنْهُ رَفَعَ رَأْسَهُ. (رواه مسلم)

(۱۰۵۸) عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ رَوَايَتِي فَرَمَاتِي هِيَ كَمَا جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(۱۰۵۸) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَأَلْتُ

(۱۰۵۶) \* یہ نظروں کا اٹھانا وحی کے انتظار میں ہوتا تھا جیسا کہ تحویل قبلہ کے وقت بھی آپؐ کا نظریں اٹھا اٹھا کر وحی کا انتظار کرنا قرآن  
شریف میں مذکور ہے ﴿قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا﴾ (البقرة: ۱۴۴)

(۱۰۵۸) \* تعجب ہے کہ جب سب سے پہلی بار آپؐ پر قرآن کریم کا نزول شروع ہوا تھا تو اس وقت بھی حضرت خدیجہؓ کے پاس آ کر جو  
الفاظ آپؐ نے فرمائے تھے وہ بھی یہی تھے ”لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي“ مجھے اپنی جان کا فطرہ ہو گیا تھا اہل ابواء نے آپؐ کے اس لفظ کو  
لے کر اس پر اتنا طومار باندھا کہ استغفر اللہ اگر کاش ان کو وحی کی حقیقت کا علم ہوتا پھر قرآن کریم کی عظمت کا کچھ اندازہ ہوتا۔ اس کے بعد  
آپؐ کی آخر عمر تک نزول وحی کے وقت آپؐ کے حالات دیکھنے کی فرصت ہوتی تو جو بات ان کی عقول کے لیے پہاڑ بن گئی تھی وہی بات سب  
سے آسان بن جاتی۔ اس باب کی پہلی حدیث جبرانہ کا واقعہ ہے مگر آپؐ پر وحی کی شدت کا عالم قریب قریب وہی نظر آ رہا تھا جو روز لیلہ.....

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ جب آپ پر وحی آتی ہے تو آپ کو وہ محسوس ہوتی ہے؟ فرمایا پہلے میں گھنٹیوں کی سی آواز سنتا ہوں پھر اس وقت بالکل خاموش ہو جاتا ہوں اور جب کبھی مجھ پر وحی آتی ہے تو مجھ کو یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ میری جان اب نکلی۔ (مسند احمد)

(۱۰۵۹) سعید بن جبیر آیۃ لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرماتے ہیں کہ پہلے یوں ہوتا تھا کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آتے تو آپؐ اس کے یاد کرنے کی فکر میں وحی کے ساتھ ساتھ اپنے ہونٹ اور زبان ہلاتے جاتے۔ اس کی وجہ سے آپؐ کو اتنی تکلیف ہوتی کہ سب کو اس کا احساس ہوتا اس پر اللہ تعالیٰ نے سورہ لَا أُقْسِمُ کی یہ آیت نازل فرمادی کہ جلدی سے یاد کرنے کی فکر میں آپؐ نزول وحی کے ساتھ ساتھ اپنی زبان نہ ہلایا کریں قرآن کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے تھے مطلب یہ تھا کہ آپؐ کے سینہ مبارک میں اس کا محفوظ کر دینا پھر اس کا پڑھنا یہ دونوں باتیں ہمارے ذمہ ہیں اس کے بعد آئندہ

النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَلْ تُحَسُّ بِالْوَحْيِ فَقَالَ أَسْمَعُ صَلَاحًا ثُمَّ أَسْكُتُ عِنْدَ ذَلِكَ فَمَا مِنْ مَرَّةٍ يُوحِي إِلَيَّ إِلَّا ظَنَنْتُ أَنَّ نَفْسِي تُقْبَضُ. (رواه احمد)

(۱۰۵۹) عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِهِ لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا نَزَلَ جِبْرِيلُ بِالْوَحْيِ وَكَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَهُ وَشَفَتَيْهِ فَيَسْتَدَّ عَلَيْهِ وَكَانَ يُعْرِفُ مِنْهُ فَأَنْزَلَ اللَّهُ الْآيَةَ الَّتِي فِي لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ قَالَ عَلَيْنَا أَنْ نَجْمَعَهُ فِي صَدْرِكَ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ

للہ ..... اول تھا اس کے بعد حضرت عبادہ بن صامت اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیثیں آپ کے سامنے ہیں۔ ان تمام حدیثوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ نزول وحی کی شدت آپؐ ہمیشہ ہی محسوس فرمایا کرتے تھے تو پھر اس وقت جب کہ آپؐ کو اس سے قبل نزول وحی سے کوئی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا اگر اس شدت کا احساس ہوا اور آپؐ کی زبان مبارک سے خوف کے وہی کلمات نکلے جو اس پر شوکت کلام کے نزول سے نکلنے چاہئیں تھے تو یہ آپؐ کی اور زیادہ تصدیق کا سبب ہونے چاہئیں تھے نہ کہ برعکس تکذیب کا چنانچہ جب حضرت خدیجہؓ نے ان کو سنا تو فوری طور پر گو وہ کوئی قطعی فیصلہ تو نہیں دے سکیں مگر یہ اندازہ انہوں نے بھی اچھی طرح لگایا کہ ہے ضرور یہ کوئی ربانی معاملہ عرب نبوت اور وحی کی صفات سے کوسوں دور پڑا ہوا تھا لہذا فوراً آپؐ کو لے کر ورقہ کے پاس پہنچیں انہوں نے واقعہ کی اجمالی صورت سنتے ہی حقیقت حال معلوم کر لی اور آپؐ کی رسالت کی تصدیق کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے واقعہ کی تفصیلات اسی جلد میں پہلے آپ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہیں۔

(۱۰۵۹) \* اس جگہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر میں راوی نے جو الفاظ نقل کیے ہیں اس سے زیادہ واضح الفاظ وہ ہیں جو کتاب التفسیر میں موجود ہیں اس لیے علماء کو چاہیے کہ یہاں ان الفاظ پر ہی اعتماد کریں۔

ان احادیث کے پیش نظر اب یہ فیصلہ فرمائیے کہ وحی کا نزول جب اس میں جلالت و عظمت کے ساتھ ہوتا تھا۔ خود آپؐ کا معاملہ بھی وحی کے ساتھ وہ نہ تھا جو انسان کے اپنے خیالات اور مد رکات کے ساتھ ہوا کرتا ہے وحی کے ذریعہ جو جو انکشافات ہوتے وہ ہو بہ ہو واقعہ کے مطابق اور انسانی علوم سے مختلف ہوتے تو کیوں اس کو ادراک کا ایک علیحدہ سبب تسلیم نہ کیا جائے۔



فَاتَّبَعَ قُرْآنَهُ فَإِذَا أَنْزَلْنَاهُ فَاسْتَمِعْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا  
بَيَانَهُ عَلَيْنَا أَنْ نُبَيِّنَهُ بِلِسَانِكَ قَالَ فَكَانَ إِذَا  
آتَاهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَطْرَقَ فَإِذَا ذَهَبَ  
قَرَأَهُ كَمَا وَعَدَهُ اللَّهُ.

(اللفظ للبخاری)

(١٠٦٠) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ عَنْ فِتْرَةِ الْوَحْيِ فَبَيْنَا أَنَا أَمْشِي إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصْرِي قِبَلَ السَّمَاءِ فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءِ قَاعِدٍ عَلَى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَجِئْتُ مِنْهُ حَتَّى هَوَيْتُ إِلَى الْأَرْضِ فَجِئْتُ أَهْلِي فَقُلْتُ زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي فَأَنْزَلَ اللَّهُ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ إِلَى قَوْلِهِ فَاهْجُرْ قَالَ أَبُو سَلَمَةَ فَاهْجُرِ الْأَوْتَانِ ثُمَّ حَمِيَ الْوَحْيُ وَتَتَابَعَ.

(و اللفظ للبخاری)

الوحي وثقله على بعض اصحابه

(١٠٦١) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ أَنَّهُ  
رَأَى مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ فِي الْمَسْجِدِ  
فَاقْبَلْتُ حَتَّى جَلَسْتُ إِلَى جَنْبِهِ فَأَخْبَرَنَا أَنَّ

آپؐ یوں کیا کیجئے کہ جب ہم آپؐ پر قرآن نازل فرما چکیں تو نزول کے وقت تو آپؐ صرف سنا ہی کیجئے اس کے بعد خود پڑھ لیا کیجئے اس کے بعد اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس کے بعد جب جبریلؑ تشریف لاتے تو آپؐ اپنا سر مبارک جھکا لیتے۔ جب وہ تشریف لے جاتے تو حسب وعدہ الہی جیسا قرآن شریف اترتا اسی کے موافق پڑھتے۔ (بخاری شریف)

(۱۰۶۰) جابرؓ بیان فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس زمانہ کا تذکرہ جس میں آپؐ پر وحی کی آمد کچھ مدت کے لیے بند ہو گئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی خود سنی ہے۔ آپؐ فرماتے تھے کہ میں جا رہا تھا اچانک آسمان کی جانب سے مجھے ایک آواز آئی میں نے فوراً آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس حراء میں آیا تھا بڑی ہیبت و جلال کے ساتھ آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر معلق بیٹھا ہوا ہے اس حالت کو دیکھ کر مجھ پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ میں زمین پر گر پڑا اور اپنی اہلیہ کے پاس آیا اور میں نے کہا مجھے کبل اڑھاؤ مجھے کبل اڑھاؤ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ** سے **فَاھْجُرْ** تک ابو سلمہ کہتے ہیں کہ **فَاھْجُرْ** کا مطلب یہ تھا کہ بتوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو اس کے بعد پھر وحی گر ما گرمی کے ساتھ پے در پے نازل ہونے لگی۔ (بخاری شریف)

وحی اور اس کا وزن آپ کے بعض صحابہ پر

(۱۰۶۱) سہل بن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ انہوں نے مروان بن حکم کو مسجد میں دیکھا تو میں ان کے پاس آیا اور ان کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا انہوں نے ہم سے کہا کہ زید بن ثابت نے ابن سے بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے آیت لا یستوی

(۱۰۶۰) \* اس روایت سے ظاہر ہے کہ اس مرتبہ آپؐ نے جبریل علیہ السلام کو کسی خاص ہیبت میں دیکھا تھا اب وحی کی عظمت ایک طرف اور فرشتے کی ہیبت ایک طرف عام بشر کی کیا مجال کہ اس عظمت و ہیبت کی تحمل کر سکے۔ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ تھی کہ ان کو سنبھالا اور اس مرتبہ بھی گو آپؐ پر اثر تو ضرور ہوا مگر اتنا نہیں اسی لیے آئندہ تسلسل کے ساتھ وحی کا نزول شروع ہو گیا۔

(۱۰۶۱) \* سبحان اللہ صرف ایک کلمہ کا وزن جب زید بن ثابت کو اتنا محسوس ہوا تو جن پر یہ کلمہ نازل ہوا تھا ان کو اس کا وزن کتنا محسوس ہوا ہوگا۔ اب اندازہ کر لینا چاہیے کہ جن پر قرآن کریم پورا کا پورا نازل ہوا تھا عام بشر سے ان کو کتنا امتیاز ہوگا۔

الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (مؤمنوں میں جو لوگ جہاد سے بیٹھ رہے اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا برابر نہیں ہو سکتے) زید بن ثابت سے قلم بند کرائی ابھی آپ اس کو قلم بند کرا ہی رہے تھے کہ آپ کی خدمت میں ابن ام مکتوم آ گئے انہوں نے کہا یا رسول اللہ بخدا اگر میں جہاد کر سکتا تو ضرور جہاد کرتا۔ بات یہ تھی کہ یہ نابینا تھے ان کے عذر کرنے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر وحی نازل فرمائی اس وقت آپ کی ران میری ران کے اوپر رکھی ہوئی تھی (یعنی بے تکلفی کے ساتھ گھٹنے کے ساتھ گھٹنا ملائے بیٹھے تھے) تو میری ران پر اتنا وزن پڑا یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب چورا چورا ہوئی۔ اس کے بعد جب وحی کی کیفیت آپ سے دور ہو گئی تو جو کلمہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا وہ صرف یہ تھا ”غَيْرَ أُولَى الضَّرَرِ“ (یعنی یہ حکم ان کا ہے جو معذور نہ ہوں) (بخاری شریف)

زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَلَى عَلَيْهِ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَجَاءَهُ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ وَهُوَ يُمَلِّهَا عَلَى قَالَ وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اسْتَطِيعُ الْجِهَادَ لَجَاهَدْتُ وَكَانَ أَعْمَى فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ وَفَخَذَهُ عَلَى فَخْذِي فَثَقُلْتُ عَلَى حَتَّى خِفْتُ أَنْ تُرَضَّ فَخْذِي ثُمَّ سَرَى عَنْهُ فَأَنْزَلَ اللَّهُ غَيْرَ أُولَى الضَّرَرِ.

(رواہ البخاری)

(۱۰۶۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أُوحِيَ إِلَيْهِ لَمْ يَسْتَطِعْ أَحَدٌ مِّنَّا يَرْفَعُ طَرْفَهُ إِلَيْهِ حَتَّى يَنْقُضِيَ الْوَحْيُ. (اخرجه مسلم و الحاكم و صحيحه)

الوحي وَثَقُلَهُ عَلَى الناقَةِ

(۱۰۶۳) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا أُوحِيَ إِلَيْهِ وَهُوَ عَلَى نَاقَتِهِ وَضَعَتْ جِرَانَهَا فَمَا تَسْتَطِيعُ أَنْ تَتَحَوَّلَ حَتَّى يُسَرَّى عَنْهُ وَتَلَتْ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا.

(رواہ احمد و عبد بن حمید و ابن جریر و ابن نصر و الحاكم و صحيحه و قال الهیثمی رجالہ رجال الصّحیح)

(۱۰۶۲) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اترتی تو جس وقت تک تمام نہ اتر لیتی کس کی مجال تھی کہ وہ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکتا۔ (مسلم-حاکم)

نزول وحی کے وقت آپ کی اونٹنی کی بے چینی

(۱۰۶۳) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اترتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر ہوتی تو وحی کے وزن سے وہ بھی اپنی گردن نیچے ڈال دیتی تھی اور جب تک وحی کی آمد ختم نہ ہو لیتی اپنی جگہ سے گردن ہلانہ سکتی تھی اس کے بعد اس مضمون کی تصدیق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ غَوْلًا ثَقِيلًا۔ اتارنے والے ہیں۔

(احمد-عبد بن حمید ابن جریر-ابن نصر-حاکم) (کذا فی الدر المنثور)

(۱۰۶۳) \* اس روایت سے معلوم ہوا کہ وحی کے بار کا احساس صرف انسانوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ حیوانات کو بھی ہوتا تھا۔



(۱۰۶۴) عَنْ أَبِي أَرْوَى الدُّوسِيِّ قَالَ رَأَيْتُ  
الْوَحْيَ يَنْزِلُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ وَإِنَّهُ عَلَى رَاحِلَتِهِ فَتَرْغُو وَتَقْتُلُ  
يَدَيْهَا حَتَّى أَظُنُّ أَنَّ ذِرَاعَيْهَا تَنْفَصِمُ فَرُبَّمَا  
بَرَكَتٌ وَرُبَّمَا قَامَتْ مُؤْتِدَةٌ يَدَيْهَا حَتَّى  
يُسْرَى عَنْهُ مِنْ ثِقَلِ الْوَحْيِ وَإِنَّهُ لَيُنْحَدِرُ مِنْهُ  
مِثْلُ الْجُمَانِ. (رواه ابن سعد كفا في

الخصائص ص ۱۱۹ ج ۱)

الرسول العظيم كان يعرف عند

نزول الوحي

(۱۰۶۵) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ بَيْنَمَا أَنَا أَمْشِي  
مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ  
حَرْثٍ أَوْ حَرْبِ الْمَدِينَةِ وَهُوَ يَتَوَكَّأُ عَلَى  
عَسِيبٍ مَعَهُ فَمَرَرْنَا عَلَى نَفَرٍ مِنَ الْيَهُودِ فَقَالَ  
بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ سَلُوهُ عَنِ الرُّوحِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ  
لَا تَسْأَلُوهُ أَنْ يَجِيءَ فِيهِ بِشْيٌ تَكْرَهُونَهُ فَقَالَ  
بَعْضُهُمْ وَلَنْ سَأَلْنَاهُ فَقَامَ إِلَيْهِ رَجُلٌ مِنْهُمْ فَقَالَ يَا  
أَبَا الْقَاسِمِ مَا الرُّوحُ فَسَكَتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَلِمْتُ أَنَّهُ يُوحَى إِلَيْهِ فَقَالَ  
يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي  
وَمَا أُوتُوا مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا قَالَ أَلَا عَمَشُ  
هَكَذَا فِي قِرَائَتِنَا.

(و البخاری ص ۱۱۱۱ و رواه الترمذی فی  
سورة بنی اسرائیل و فیہ لفظ حتی انوحی صعد)

(۱۰۶۴) ابواروی دوسی کہتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی  
آتے اس وقت دیکھا ہے جب آپ اپنی سواری کے اوپر تھے کہ وہی کے  
وزن سے آپ کی اونٹنی آواز کرتی تھی اور اپنے دونوں پیر اس طرح ادلتی  
بدلتی تھی کہ مجھ کو یہ گمان ہوتا تھا گویا اس کے بازو ٹوٹے جاتے ہیں کبھی بیٹھتی  
اور کبھی اپنے پیروں پر سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی - وحی کے وزن سے اس کی  
یہی کیفیت رہتی تھی یہاں تک کہ وحی کی آمد ختم نہ ہو جاتی ادھر آپ کی پیشانی  
مبارک سے موتی کی طرح پینے کے قطرے نکلنے لگتے تھے۔

(خصائص الکبری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی آتی تو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ  
آپ پر وحی آرہی ہے

(۱۰۶۵) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک بار میں آپ  
صلی علیہ وسلم کی ہمراہی میں مدینہ کے کھیت یا کسی ویرانہ میں تھا آپ صلی اللہ علیہ  
وسلم اس وقت ایک شاخ پر سہارا دے کر کھڑے ہوئے تھے اتنے میں ہمارا گزر  
یہود کی ایک جماعت پر ہوا انہوں نے باہم ایک دوسرے سے کہا اس شخص سے  
روح کے متعلق دریافت کر کے دیکھو اس پر کسی نے یہ مشورہ دیا کہ نہ پوچھو کہیں وہ  
ایسا جواب نہ دے دیں جو تمہارے لیے اور کوفت کا سبب ہو۔ اس پر دوسرے  
لوگ بولے واہ ہم ضرور پوچھیں گے چنانچہ ان میں ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس  
نے کہا اے ابوالقاسم (آپ کی کنیت تھی) روح کے متعلق کچھ فرمائیے؟ یہ سن کر  
آپ خاموش ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے چنانچہ ان کے  
جواب میں آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی - يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ - یہ  
لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ  
ان سے کہہ دیجئے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ایک حکم ہے اور جتنا حصہ علم کا ان کو دیا گیا ہے  
وہ بہت ہی قلیل ہے اگرچہ وہ نادانی سے اس کو بہت سمجھیں (اعمش کہتے ہیں کہ  
ہماری قرآن میں اس آیت میں او تیتیم کی بجائے او تووا کا ہی لفظ ہے۔

(۱۰۶۵) \* خلاصہ یہ ہے کہ وحی کی حقیقت خواہ کتنی ہی دقیق کیوں نہ ہو لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول دیکھتے تھے لہذا.....

وَمِنْ مِيزَاتِ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ لَنْ لَهُمْ  
فِي الدُّنْيَا خَوَاصُّ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَمَنْ تَلَكَّ  
الْخَوَاصُّ أَنَّ أَجْسَادَهُمْ لَا تَبْلَى وَلَا تَفْنَى

انبیاء علیہم السلام کو اپنی صفات میں اہل جنت کے  
ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔ ان کے جسم  
تغیر سے محفوظ رہتے ہیں

(۱۰۶۶) عَنْ أَوْسِ بْنِ أَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

لِللَّهِ ..... وہ اتنی واضح ہو چکی تھی کہ جو آپ کے رفقاء تھے وہ اس کو فوراً پہچان لیتے تھے۔ مشکل جو کچھ بھی ہے وہ ان کے لیے ہے جنہوں نے  
وحی کا نزول خود تو دیکھا نہیں اور بد قسمتی یہ کہ جنہوں نے دیکھا تھا ان کے بیان پر ان کو اعتماد نہیں آتا۔

اس روایت میں امام ترمذی نے ایک خاص لفظ روایت کیا ہے اور وہ ”حتی صعد الوحي“ یعنی میں سمجھ لیتا تھا کہ اب آپ پر وحی آ  
رہی ہے یہاں تک کہ وحی چڑھ جاتی۔ وحی کے بارے میں نزول کا لفظ تو عام روایات میں آتا ہے لیکن اس روایت میں ”صعود“ کا لفظ بھی آ  
گیا ہے اور بظاہر اس سے مراد صاحب وحی یعنی فرشتہ کا صعود ہے۔

(۱۰۶۶) \* حدیث مذکور الصدر میں انبیاء علیہم السلام کے ایک جسمانی امتیاز کا تذکرہ ہے۔ یعنی یہ کہ عام انسانوں کے جسم میں تو صرف  
ایک جزء ایسا ہوتا ہے جو تمام جسم کے فنا ہو جانے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتا جیسا ابھی آپ کے ملاحظہ سے گزرے گا۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے  
پورے کے پورے غصری اجسام کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ زمین کے تخریبی اثرات سے بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ یوں تو ادویات کے  
ذریعہ سے اجسام کا محفوظ رکھنا مصر کی عام صنعت تھی اور اسی صنعت کی بدولت آج عجائب گھروں میں ہزاروں سال کی لاشیں آپ کو موجود  
نظر آتی ہیں اور آج کی ایجادات میں بھی ایسے آلات موجود ہیں جن کے ذریعہ پانی اور آگ کے اثرات سے کافی حفاظت ہو جاتی ہے۔  
وائر پروف، فائر پروف کا استعمال عام طور پر ہمارے زمانہ میں سب جانتے ہیں۔ تھرماس میں برف جیسی جلد گھل جانے والی چیز بے تامل  
چوبیس چوبیس گھنٹے تک محفوظ رہ سکتی ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام کے اجسام کا محفوظ رہنا بھی کوئی بہت بعید از قیاس بات تو نہ تھی بالخصوص  
جب کہ تاریخی واقعات سے بعض صحابہؓ کے اجسام کا محفوظ رہنا بھی صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہو لیکن ہم صرف آپ کی تسکین خاطر کی خاطر  
کچھ مزید وضاحت بھی کیے دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جس طرح عناصر کی تلطیف و تکثیف سے کون و فساد ہو سکتا ہے اسی طرح مرکبات عناصر میں بھی تلطیف و تکثیف سے  
مادیت و روحانیت کا تغیر ہو سکتا ہے دیکھئے پانی کو اگر آگ پر رکھا جائے تو وہ ایک دوسرے لطیف تر عنصر کی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی ہوا بن  
جاتا ہے پھر اس کے خواص بھی بدل جاتے ہیں اسی طرح بھاپ کو اگر ٹھنڈا کر دیا جائے تو پھر وہ پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو اس سے  
کثیف عنصر ہے۔ یہاں بھی اب اس کے خواص میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی جسم جو عناصر و اربعہ کا مرکب ہے اس میں بھی  
ریاضت و معصیت کے اثرات سے لطافت و کثافت کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں میں طبقہ صوفیاء نصاریٰ میں راہبین اور ہندوؤں میں  
جوگیوں کی تاریخ پڑھنے سے یہ حد یقین تک پہنچ جاتا ہے کہ ان کے ظاہری اجسام ریاضات کے اثرات سے اتنے لطیف ہو جاتے تھے کہ عام  
جسمانی انقلابات ان پر کم اثر انداز ہوتے تھے اس کے برعکس جو جماعت تن پروری کی ریاضت میں منہمک ہے ان کے اجسام بھی اسی قدر  
کثیف ہو جاتے ہیں آج کل کی اصطلاح میں اس مسئلہ کا نام ”تجسد ارواح اور تروح الاجساد“ ہے۔ یعنی روحوں میں یہ طاقت ہو جاتی ہے  
کہ وہ کسی جسم کی صورت اختیار کر لیں اور جسم لطیف ہو کر روح کے خواص پیدا کر لے۔ انبیاء علیہم السلام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام للہ .....  
.....



اللّٰهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم اِنَّ مِنْ اَفْضَلِ      فرمایا تمہارے سب دنوں میں سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن  
اَيَّامِكُمْ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خُلِقَ اٰدَمُ وَ فِيْهِ      میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے۔ اسی میں ان کی وفات ہوئی اسی  
قُبْضَ وَ فِيْهِ النَّفْخَةُ وَ فِيْهِ الصَّعْقَةُ فَاكْثِرُوْا      میں صور پھونکا جائے گا اور اسی میں صور کی آواز سے لوگوں پر بے ہوشی

اللہ..... کی پیدائش چونکہ عام دستور کے خلاف صرف فقہ جبریلی سے ہوئی تھی اس لیے ان کے جسم غصری میں بھی روح کے خواص اتنے نمایاں تھے کہ موجودہ انجیل کے بیان کے مطابق بعض مرتبہ بات کرتے کرتے ان کی شکل مبارک تبدیل ہو جایا کرتی تھی اور ہماری شریعت میں بھی ان کا لقب ”روح اللہ“ رکھا گیا ہے۔ ان کا آسمانوں پر جانا اور پھر اترنا بھی اسی کے اثرات میں سے ہے اسی طرح ان کے معجزات میں احیاء موتی کا ایک معجزہ سونا بھی ان کے ”روح اللہ“ ہونے کے مناسبات میں سے تھا۔

احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ معصیت کا اثر مادیت میں ترقی ہے اور طاعات کا اثر روحانیت میں اضافہ اس لیے اہل جہنم پر مادیت غالب کر دی جائے گی اور ان کی جسامت دنیوی جسامت سے سینکڑوں گنا بڑھادی جائے گی تاکہ ایک طرف ان کے عذاب میں شدت ہو اور دوسری طرف جہنم کے بھرنے کا جو وعدہ گزر چکا ہے وہ تکثیر افراد کی بجائے ایک ایک فرد کی جسامت میں اضافہ کر کر کے پورا کر دیا جائے۔ اس کے برخلاف اہل جنت پر روحانیت غالب ہو جائے گی اور اس وجہ سے جنت کی نعمتوں سے لطف اندوزی اور پروردگار عالم کی رویت جو عالم مجردات سے بھی دراء الوراء ہے ان کے لیے آسان ہو جائے گی۔ بے شک جو اجسام اپنی ساری عمر ریاضت و عبادت میں صرف کر کے یہاں بھی روح کے کچھ خواص حاصل کر چکے تھے جنت میں پہنچ کر ان کی اس صفت میں اور ترقی ہو جانی چاہیے۔ حیرت ہے کہ جب اس دنیا میں بھی موسم زمین کے شور ہونے نہ ہونے اور خود جسم کے بلغمی غیر بلغمی ہونے کے اختلاف سے لاش کے بگڑنے اور نہ بگڑنے میں فرق آ سکتا ہے تو معصیت و طاعت کے اثرات سے بھی اگر یہ اختلاف رونما ہو تو اس کا انکار کیوں کیا جائے۔ اگر مشاہدہ اور کچھ واقعات وہاں تصدیق کے لیے مجبور کرتے ہیں تو یہاں بھی اس سے زیادہ قوی ثبوت کے ساتھ مشاہدہ موجود ہے جیسا ابھی آپ کے ملاحظہ سے گذرے گا۔

اب تک جو ہم نے بیان کیا یہ تو کسب و اکتساب کے اثرات و نتائج تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی جماعت چونکہ صفت اصطفاء و اجتباء کے ماتحت ہوتی ہے اس لیے ان کے اجسام کے ابتدائی نہاد ہی ان کمالات سے بالاتر ہوتی ہے جو کسب و اکتساب کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ قالب انسانی ان کو بھی ملتا ہے مگر وہ قالب جو منور ہو روح بشری ان میں بھی ہوتی ہے اگر روح جو نشہ عبودیت میں سرشار ہو اور اس طرح وہ ظاہر و باطن منور ہستیاں جب عالم میں ظاہر ہوتی ہیں تو کفر کا تیرہ و تار یک عالم ان کے وجود سے منور ہو جاتا ہے۔ پسینہ ان کو بھی آتا ہے مگر وہ پسینہ نہیں جو دماغ کو متعفن کر دے بلکہ وہ جو مشام جان کو معطر کر دے سوتے وہ بھی ہیں مگر وہ نیند نہیں جو دل کو غافل کر دے کھاتے وہ بھی ہیں مگر وہ کھانا نہیں جس کی اصیاج عام انسانوں کی طرح ہو بلکہ عین نیند کی حالت میں ان کے دل دوسرے تمام بیداروں سے زیادہ بیدار ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان کا خواب وحی ہوتا ہے اور ان کی نیند ناقض وضوء نہیں ہوتی۔ وہ روزہ رکھتے ہیں تو کئی کئی دن کھانے کے قریب نہیں جاتے پھر اس وجہ سے ان کو کوئی ضعف بھی لاحق نہیں ہوتا۔ اس پر جب آپ کے فداکار آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ بڑی شفقت کے انداز میں ان سے یہ فرما دیتے ہیں کہ تم میری طرح نہیں ہو۔ میں اگر جسمانی غذاء ترک کرتا ہوں تو میرا پروردگار مجھے روحانی غذا سے سرفراز فرماتا ہے۔ تم لہسن پیاز سب کھا سکتے ہو مگر میں نہیں کھا سکتا کہ میرے اصحاب محفل تمہارے علاوہ نوح ملائکہ بھی ہے نکاح وہ بھی کرتے ہیں مگر وہ نکاح نہیں جس سے مقصود کسی درجہ میں بھی تلذذ ہو بلکہ وہ نکاح جس کا مقصد صرف عبادت و تقرب ہو۔ قوت باصرہ سامعہ اللہ.....

عَلَى مِنَ الصَّلَاةِ فِيهِ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوضَةٌ  
عَلَى قَالَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَكَيْفَ تُعْرَضُ  
صَلَاتُنَا عَلَيْكَ وَقَدْ أَدِمْتَ يَقُولُونَ بَلِيَّتْ

طاری ہوگی تو اس دن میں تم لوگ مجھ پر یہ کثرت درود بھیجا کرو کیونکہ تمہاری  
درود میرے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ راوی کہتا ہے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم  
اجمعین نے تعجب سے دریافت کیا یا رسول اللہ ہماری درود بھلا آپ صلی اللہ

ﷺ ..... ذائقہ وہ بھی رکھتے ہیں مگر وہ قوت نہیں جو صرف عالم مادیت تک محدود ہو بلکہ وہ جو مادیات کو بھی نفوذ کر جائے۔ زبانیں اگر  
صرف خوش مزہ اور بد مزہ کا ادراک کرتی ہیں تو ان کی زبان حرام و حلال غذاء کا بھی ادراک کر لیتی ہو۔ حتیٰ کہ بول و براز میں وہ بھی عام  
انسانوں کے شریک نظر آئیں مگر یہاں اس کے متعلق جذب کر لینا بھی منقول ہو اور سب سے آخر میں موت کا فرشتہ ان کے پاس بھی آئے  
مگر اجازت کے بغیر جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ اذن و اجازت سے اور دفن اگر چہ وہ بھی ہوں مگر یہاں بھی اپنی جائے وفات میں مدفون ہونے  
کا امتیاز باقی رہے۔ اب سوچئے کہ اگر ان کے جسم غضری ہی میں کوئی امتیاز و خصوصیت نہیں ہوتی تو جس غذاء کے اثر سے دوسرے جسموں کو  
متعفن پسینہ آتا ہے وہ ان کو کیوں نہیں آتا وہ عام انسانوں کی طرح غذاء کے محتاج کیوں نہیں ہوتے ان کے حواس کے ادراک کا دائرہ عام  
انسانوں سے بالاتر کیوں ہوتا ہے اور کیوں ان کی نیند عام انسانوں کی سی نیند نہیں ہوتی۔ دنیا میں غفلت کی نیند صحت کی علامت ہو اور ان کے  
یہاں تیقظ کی نیند موجب کمال ہو۔ کیا اس سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کے اجسام غضریہ کی نہاد ہی کچھ عام اجسام سے نرالی ہوتی ہیں  
بعض ضعیف حدیثوں میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
سے اہل جنت کی غذاء کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ معطر پسینہ بن کر ختم ہو جائے گی اس سے فضلہ نہیں بنے گا۔ اگر کہیں  
غذاء کی ادیت حائل نہ ہو جاتی تو شاید انبیاء علیہم السلام کا فضلہ اس عالم میں بھی پسینہ بن کر رہ جاتا گویا فرق اگر کچھ رہا تو وہ صرف غذاء کی  
نوعیت کے فرق سے رہا ورنہ بلحاظ خواص جسم کا جو خاصہ اہل جنت کے جسم میں تھا وہی یہاں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں رہ کے  
جب غذاء کھائی تو وہی جسم جو فضلہ کا محتاج نہ تھا اب فضلہ دفع کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ پس جسم ایک ہی تھا فرق جو ہو وہ غذاء کی نوعیت سے  
پیدا ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام جنتی جسم لے کر اس جہان کی آبادی کے لیے تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا بھی جسم غضری  
لے کر خدا تعالیٰ کے دیدار کے لیے تشریف لے گئے اور اسی جسم اطہر کے ساتھ جنت کو شرف قدوم سے نوازا۔ پس کیا شبہ ہے کہ انبیاء علیہم  
السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں اگر ان کا قالب غضری بھی اہل جنت کی طرح کون و فساد کے اثرات سے آزاد ہو تو  
بعید کیا ہے۔ پھر اس پر بھی ذرا غور کرنا چاہیے کہ انسانی زندگی میں عام انسانوں کے اجسام کے بگڑنے سے کیا چیز مانع ہے تو ظاہر ہو گا کہ وہ  
علاقہ روح یعنی حیات ہے ادھر روح نے جسم سے پرواز کی ادھر جسم کے اندر تغیر شروع ہوا۔ اگر انبیاء علیہم السلام کی ارواح کا ان کے جسموں  
کے ساتھ علاقہ شہداء سے کچھ زیادہ تسلیم کر لیا جائے تو کیا پھر بھی ان کے جسموں کے محفوظ رہنے میں کوئی وجہ اشکال ہو سکتی ہے۔ امام رازی  
تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کے نفوس قدسیہ  
عام انسانوں سے اپنی ماہیت میں ہی مختلف ہوتے ہیں ان  
نفوس میں فہم و فراست اور جسمانیات و شہوات سے ایک عجب  
قسم کی برتری ہوتی ہے جب ایک طرف روح کی طرف.....

و اعلم ان تمام الکلام فی هذا الباب ان النفس القدسية النبوية  
مخالفة بما هتیهما لسائر النفوس و من لوازم تلك النفوس  
الکمال فی الذكاء و الفطنة و الحرية و الاستعلاء و الترفع عن  
الجسمانیات و الشهوات فاذا كانت الروح فی غدية



فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ  
أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ. (رواه ابوداؤد و النسائی و  
الدارمی و البيهقی فی الدعوات الكبير و  
احمد و ابن حبان و الحاكم. قال الحاكم  
هذا حديث صحيح على شرط البخاری و لم  
يخرجاه و كذا صححه النووي فی الاذکار و قال الحافظ عبدالغنى النابلسی انه حسن صحيح و قال المنذرى انه  
حسن و قال ابن دحية انه صحيح محفوظ و اجاب الحافظ ابن القيم مما ذكر فيه من العلة فراجع جلاء الافهام ص  
۴۲ و ص ۴۳ و رواه ابن ماجه عن ابی الدرداء قال الحافظ المنذرى اسناده جيد)

(ابوداؤد-نسائی-ابن ماجه-دارمی-بيهقی)

۱۰۶۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ قَالَ  
كُلْ بَنِي آدَمَ تَأْكُلُهُ الْأَرْضُ إِلَّا عَجَبُ  
۱۰۶۷) ابو هريره رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم نے فرمایا ہے ابن آدم کا سب جسم زمین کھا لیتی ہے صرف اس کی ریڑھ کی

للہ..... الصفاء و الشرف و كان البدن في غاية النатар و  
الطهارة كانت هذه القوى المحركة و المدركة في غاية  
الكمال لانها جارية مجرى انوار فائضة من جوهر الروح  
واصلة الى البدن و متى كان الفاعل و القابل في غاية  
الكمال كانت الآثار في غاية القوة و الشرف و الصفاء.

(تفسیر کبیر)

(تفسیر کبیر ص ۴۵۶ ج ۲)

مگر ان تمام کمالات کے بعد بھی کیا انبیاء علیہم السلام کا قدم سر مو بھی بشریت سے باہر گیا۔ ہرگز نہیں جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کی بشریت کے منکر ہیں ان کو نہ تو بشریت کے کمالات سے آگاہی ہے نہ خدائی صفات کا اندازہ ہے ان جملہ کمالات میں سے ایک کمال بھی  
ایسا نہیں جو بشر کو خدا تعالیٰ کی کسی ایک صفت میں بھی شریک و سہیم بنا سکے۔ انسانی سارے کمالات کے بعد بھی قباء بشریت پر حدود و امکان کا  
ایک ہی داغ اس کو خالق بشر سے ممتاز کر دینے کے لیے کافی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے اجسام میں خواہ کتنی بھی خصوصیات ہوں مگر وہ پھر جسم  
کی خصوصیات ہوں گی جو ان کے عام اجسام سے بالاتر ہونے کی دلیل تو بن سکتی ہیں مگر جو ذات کہ جسم و جسمانیات سے ہی بالاتر ہو بھلا اس  
کے ساتھ کوئی ادنیٰ سا اشتراک کیسے پیدا کر سکتی ہے انصاف کیجئے کہ جسم کی پیدائش خواہ کتنی بھی نرالی ہو پسینہ خواہ کتنا ہی معطر سے معطر ہو بول و  
براز کی خصوصیات خواہ کتنی ہی عجیب در عجیب ہوں موت و دفن کے واقعات اور سلامتی جسم کی حقیقت خواہ کتنی ہی حیرت انگیز ہو اگر کیا ان  
عوارض یا ان سے بھی برتر عوارض کے ساتھ کسی انسان کو اس ذات اقدس کے ساتھ کوئی اشتراک پیدا ہو سکتا ہے جو ان صفات کی خالق ہے  
اور ان میں سے ہر صفت جس کے لیے نقص در نقص اور عجیب در عجیب ہے پس نہ تو آپ کے کمالات بشریت کے اقرار سے خدائی توحید کو مکدر  
کرنا چاہیے اور نہ خدائی توحید کا کمال آپ کے کمالات بشریت کے انکار میں مضمر سمجھنا چاہیے۔

۱۰۶۷) \* جدید تحقیق کے بموجب انسانی پیدائش کی ابتداء سلس (Sells) قرار دی گئی ہے جو قدرت الہی سے نہیں بلکہ اپنی فطرت  
سے ارتقاء کرتے کرتے انسانی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ یہاں حدیث یہ کہتی ہے کہ انسانی جسم کی بنیاد ہڈی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوتا ہے للہ.....

الدَّنْبِ مِنْهُ خُلِقَ وَفِيهِ يَرْكَبُ. (رواه مالک و الحاکم فی مستدرکہ و صححه و قراه الذہبی و الحدیث مروی عند الشیخین و لکنہ جزء من الحدیث الذی جلاء فی المدة بین النفختین)

ہڈی کا ایک حصہ نہیں کھاتی۔ اسی سے اس کی پیدائش کی ابتداء ہوئی تھی اور اسی سے وہ پھر بنایا جائے گا۔ (مالک - حاکم)

(۱۰۶۸) مَالِکٌ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَمْرُو بْنَ الْجَمُوحِ وَ عَبْدِ اللَّهِ بْنَ عَمْرُو الْأَنْصَارِيِّينَ ثُمَّ السُّلَمِيِّينَ كَانَا قَدْ حَفَرَ السَّيْلُ مِنْ قَبْرَيْهِمَا وَ كَانَا قَبْرَاهُمَا يَلِي السَّيْلُ وَ كَانَا فِي قَبْرِ وَاحِدٍ وَ هُمَا مِمَّنْ أُسْتُشْهِدَ يَوْمَ أُحُدٍ فَحُفِرَ عَنْهُمَا لِغَيْرِ مَنْ مَكَانَهُمَا فَوَجَدَ الْمُ يَتَغَيَّرَا كَانَهُمَا مَاتَا بِالْأَمْسِ وَ كَانَ أَحَدُهُمَا قَدْ جُرِحَ فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَى جُرْحِهِ فَذَفَنَ وَ هُوَ كَذَلِكَ فَأَمِيطَتْ يَدُهُ عَنْ جُرْحِهِ ثُمَّ أُرْسِلَتْ فَرَجَعَتْ كَمَا كَانَتْ وَ كَانَ بَيْنَ أَحَدٍ وَ بَيْنَ يَوْمٍ حُفِرَ عَنْهُمَا سِتُّ وَ أَرْبَعُونَ سَنَةً.

(۱۰۶۸) مالک عبد الرحمن بن عبد اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کو یہ بات معلوم ہوئی کہ عمرو بن الجموح رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو انصار میں سے تھے ان کی قبریں سیل (رو) کے متصل واقع ہوئی تھیں ایسا اتفاق ہوا کہ سیل آئی اور اس نے ان کی قبریں کھود ڈالیں۔ یہ دونوں انصاری غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے اور ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا تھا جب دوسری جگہ دفن کرنے کے لیے ان کی قبروں کو کھودا گیا۔ دیکھا تو ان میں ذرا بھی تغیر نہ تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کل دفن کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب جب زخمی ہوئے تھے تو انہوں نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھ لیا تھا اور اتفاق سے اسی طرح ان کو دفن کر دیا گیا تھا۔ قبر سے نکالنے کے بعد ان کا ہاتھ جب زخم سے علیحدہ کر کے چھوڑا جاتا تو پھر اسی طرح زخم پر جا چمکتا حالانکہ غزوہ احد اور جس دن ان کی قبریں کھودی گئی تھیں ان کے درمیان چھیالیس سال کی مدت گزر چکی تھی۔

(موطا مالک)

(رواه مالک فی الموطا من او اخر ابواب الجہاد)

(۱۰۶۹) عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا حَضَرَ أُجْدُ دَعَانِي أَبِي مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ مَا أَرَانِي إِلَّا مَقْتُولًا فِي أَوَّلِ مَنْ يُقْتَلُ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ

(۱۰۶۹) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب غزوہ احد سامنے آیا تو میرے والد ماجد نے مجھے شب کے وقت بلا کر فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں جو شہید ہونے والے ہیں

للہ..... جو دم علقہ اور مضغہ کی جملہ ارتقائی صورتوں میں محفوظ رہتا ہے حتیٰ کہ جب جسم کے سب اجزاء فناء ہو جاتے ہیں وہ اس وقت بھی فناء نہیں ہوتا مگر یہ تمام سلسلہ ہوتا ہے سب قدرت کے ماتحت جس نے ایک بار پہلے اس ارتقائی سلسلہ سے اس کو بنایا تھا دوسری بار پھر اس ارتقاء کے بغیر وہی اس کو بنا کر کھڑا کر دے گی۔

۱۔ جس حدیث کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

(۱۰۶۹) \* یہ چند واقعات تو خود اسی امت کے ہیں اور بسند صحیح ثابت ہیں ان کے علاوہ اس امت کے کچھ اور واقعات اور پہلی امت کا ایک واقعہ بھی آئندہ حدیث کے ذیل میں آپ کے سامنے آنے والا ہے اس لیے یہ ناگزیر طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ موت اور دفن کے بعد بھی جسم انسانی تغیرات سے محفوظ رہ سکتا ہے لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں جو بیان حدیث مذکورہ بالا میں للہ.....



ان سب میں پہلے میں مقتول ہوں گا اور دیکھو میرے بعد ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات متشبیٰ کر کے تم سے بڑھ کر مجھ کو کوئی اور پیارا نہیں ہے۔ دیکھو میرے اوپر قرض ہے اس کو ادا کر دینا اور اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھنا۔ جب صبح ہوڈا تو سب سے پہلے میرے والد ماجد ہی شہید ہوئے اور (شہداء کی کثرت کی وجہ سے) ایک صحابی اور ان ہی کے ساتھ دفن کر دیئے گئے مگر میرے دل کو یہ گوارا نہ ہو سکا کہ ان کے اس لیے چھ ماہ کی مدت کے بعد میں نے ان کو نکالا تو یوں معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ان کو دفن کیا تھا صرف ان کے کا پر ذرا سا اثر آتا تھا۔

(بخاری شریف)

و ذکر الحافظ ابن حجر من فوائد

الحديث كرامته بكون الارض لم تبل جسده مع لبثه فيها. و قد ذكر السهيلي في الروض الانف ص ۳۴ و ما وجد في صدر هذه الامة من الشهداء احد و غيرهم على هذه الصورة لم يتغيروا بعد الدهور الطويلة كحمزة بن عبدالمطلب فانه وجد حين حفر معاوية العين صحيحا لم يتغير و اصاب الفأس اصبعه فدميت و كذلك ابو جابر عبد الله بن حرام (و عمرو بن الحموح) و طلحة بن عبيد الله رضى الله تعالى عنهم استخرجته بنته عائشة (من قبره) حين رأت في المنام فامرها ان تنقله من موضعه فاستخرجته من موضعه بعد ثلاثين سنة لم يتغير ذكره ابن قتيبة في المعارف و الاخبار بذلك صحيحة ثم ذكر قصة الغلام و اصحاب الاخدو دو ذكر انه اخرج في زمن عمر بن الخطاب و اصبعه على صدغه كما وضعها حين قتل كما رواه الترمذي قلت نعم و للارض من كأس الكرام نصيب

اللہ..... آپ پڑھ چکے ہیں اس میں ذرا سا بھی تردد کیا جاسکے۔ پھر جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ اتنی طویل مدت کے بعد بھی مردہ جسم سے خون کیونکر برآمد ہوا تو شہداء کی حیات کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے مگر وہ ایسی حیات نہ ہو جس کی جملہ کیفیات کا ہم ادراک کر سکیں مگر یہ تو ماننا پڑے گا کہ عام مردوں سے ان کو امتیاز ضرور ہوتا ہے کہ ان کی مردہ نعشوں میں سالوں کے بعد بھی خون کا اثر موجود ہو سکتا ہے اب ایسا کیوں ہوتا ہے تو اس کا جواب ہم صرف یہی دے سکتے ہیں کہ یہ اس لیے کہ وہ کسی درجہ میں حیات رکھتے ہیں۔ رہا یہ کہ اس کی تفصیلات کیا ہیں تو ہم یہاں اپنے جہل کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم تو ابھی یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ بیداری اور سونے کی حالتوں میں ہماری روح اور جسم کے تعلق میں پورا فرق کیا ہے حالانکہ یہ دونوں حالتیں ہر شخص پر اس کی حیات کی حالتیں ہیں اور سالہا سال اس پر گذرتی ہیں لہذا اگر اس حالت کا ہم پتہ نہ دے سکیں جو موت کے بعد کی ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے۔

جب شہداء کے حیات کی کیفیات یہ ہیں تو انبیاء علیہم السلام جن کے رتبے ان سے کہیں بالاتر ہیں ان کی حیات کی نوعیت کیا ہوگی اس سے اس کا کچھ اندازہ کر لینا چاہیے۔ یہاں ان مشاہدات کے بعد محض اپنے خیالات سے نہ تو اس کا انکار کر ڈالنا مناسب ہے اور نہ اس پر ہزار خرافات کا اور اضافہ کر کے اصل حقیقت کا بھی گم کر دینا عقل کی بات ہے ظاہر ہے کہ جو بشر دنیا میں ایک مشاہد حیات کے مالک رہ چکے ہیں اگر وفات کے بعد کسی غیر مشاہد حیات کے مالک بن گئے ہیں تو اس سے ان کی بشریت میں کیا فرق پڑ سکتا ہے اور کیوں۔ لہذا اللہ.....

(۱۰۷۰) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ أَنَّ خَرَبَةَ  
أُخْصِرَتْ فِي زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ  
فَوَجَدُوا عَبْدَ اللَّهِ بْنَ تَامِرٍ وَاضْعًا يَدُهُ عَلَى  
ضَرْبَةِ رَأْسِهِ إِذَا أُمِيطَتْ يَدُهُ عَنْهَا انْبَعَثَتْ دَمًا  
وَإِذَا تُرِكَتْ ارْتَدَّتْ مَكَانَهَا وَفِي يَدِهِ خَاتَمُ  
حَدِيدٍ فِيهِ مَكْتُوبٌ رَبِّي اللَّهُ فَلَمَّا بَلَغَ ذَلِكَ عُمَرُ

(۱۰۷۰) عبد اللہ بن ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک  
اجاز زمین کھودی گئی تو اس میں عبد اللہ بن تامر کی لاش نکلی کہ اپنے سر کے زخم  
پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں جب اس زخم سے ان کا ہاتھ جدا کر لیا جاتا ہے تو  
خون بہنے لگتا ہے اور جب اس کو چھوڑ دیتے ہیں تو پھر اپنی جگہ جا چمکتا ہے۔  
ان کے ہاتھ میں لوہے کی ایک انگوٹھی تھی اس پر ”ربی اللہ“ کا نقش کندہ تھا۔  
جب یہ اطلاع حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ملی تو آپ نے لکھ بھیجا تم نے

للہ ..... انبیاء علیہم السلام اور شہداء کرام کی حیات تسلیم کر لینے کے بعد بھی ان کے بارے میں کسی ایک بات کا اضافہ کر دینا جو انہوں نے  
اپنی حسی حیات میں نہیں فرمائی بلکہ اس سے روکا ہے۔ جہاں دین پر افتراء ہے اسی طرح خود ان کی ذاتوں پر بھی افتراء ہوگا۔  
(۱۰۷۰) \* امام قریشی نے اصحاب اُحد دو کے قصہ کے ساتھ بعض اور واقعات بھی ذکر فرمائے ہیں:

وقال الامام القرطبي و كان اصحاب الاخذود  
في ايام الفسرة بين عيسى و محمد صلى الله  
عليه وسلم كما في صحيح مسلم و روى نقلة  
الاخبار ان معاوية لما اجرى العين التي استنبطها  
بالمدينة وسط البقرة و امر الناس بتحول  
موتاهم و ذلك في ايام خلافته و بعد احد من  
نحو خمسين سنة فوجد و اعلى جالهم حتى ان  
الناس رآوا السحابة اصابا قدم حمزة بن  
المطلب فسال الدم منها و روى كافة اهل  
المدينة ان جدار قبر النبي صلى الله عليه وسلم  
لما انهدم ايام خلافة الوليد بن عبد الملك بن  
مروان و لاية عمر بن عبد العزيز على المدينة  
مدت لم قدم فحافوا ان تكون قدم النبي صلى  
الله عليه وسلم فجزع الناس حتى روى لهم  
سعيد بن المسيب ان جثة الانبياء عليهم السلام  
لا تقسم في الارض اكثر من اربعين يوما ثم ترفع  
و جاء سالم بن عبد الله بن عمر بن الخطاب و  
عرف الناس انها قدم جده عمر بن الخطاب.

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ حسب بیان صاحب مسلم اصحاب اُحد و د کا  
زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی  
درمیانی مدت کا تھا۔ اس سلسلہ میں مؤرخین سے یہ بھی نقل کیا ہے  
کہ جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد  
خلافت میں مدینہ طیبہ میں نہر نکالنے کا ارادہ فرمایا تو اس کی گذر  
گاہ حسب الاتفاق قبرستان اُحد کے درمیان تھی لہذا انہوں نے  
اعلان کر دیا کہ لوگ اپنے اپنے مردے یہاں سے اٹھا کر  
دوسرے جگہ دفن کر دیں جب مردے اس غرض کے لیے نکالے  
گئے تو بالکل اپنی اصلی حالت پر تروتازہ معلوم ہوتے تھے حتیٰ کہ  
کھودنے میں کدالی حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیر میں جا  
لگی تو اسی وقت اس سے خون جاری ہو گیا۔ یہ واقعہ اُحد سے  
پچاس سال بعد کا ہے۔ اس کے علاوہ عام اہل مدینہ اس واقعہ  
کے ناقل ہیں کہ ولید بن عبد الملک کے عہد خلافت میں جب  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی جانب والی دیوار خستگی کی وجہ  
سے گر گئی تو ایک قدم نظر آیا جس کے متعلق لوگ پریشان ہوئے  
مبادا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم نہ ہو یہاں تک کہ سالم بن  
عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے آ کر اس کو پہچانا اور کہا یہ تو میرے  
دادا حضرت عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا قدم ہے۔

(مختصر تذکرہ قرطبی ص ۴۰)

(مختصر تذکرہ قرطبی ص ۴۰)



فَكُتِبَ أَنْ أَعِيدُوا عَلَيْهِ الَّذِي وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ. جس حال پر ان کو پایا ہے ان کو اسی حالت پر دفن کر دو۔ (تفسیر خازن)

(رواہ محمد بن اسحاق فی تفسیر الخازن. و محمد بن اسحاق موثوق بہ فی الاخبار و ان تکلم فیہ فی باب الاحادیث و معذک فقد روی عنہ الاثمة فی باب الاحکام ایضاً)

مِنْهَا حَيَاتُهُمْ وَ شُغْلُهُمْ بِالْعِبَادَاتِ اہل جنت سے دوسری مشابہت ان کی دائمی حیات اور دائمی عبادت ہے  
(۱۰۷۱) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْأَنْبِيَاءُ أَمْ يَمُوتُونَ أَمْ لَا؟ (ابو یعلیٰ)  
و سلم نے فرمایا انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں۔ قبروں میں نمازیں پڑھتے ہیں۔

البزار قال الهیثمی و رجال ابی یعلی ثقات کما فی المجمع و عزاء السہیلی فی المسند کما فی الروض و قال انفر دہ ثابت البنانی عن انس و قدروی ان ثابتاً التمس فی قبرہ بعد ما دفن فلم یوجد ف ذکر ذلک لہنتہ فقالت کان یصلی فلم تر وہ لان کنت اسمعہ اذا تہجد باللیل یقول اللہم اجعلنی ممن یصلی فی قبرہ بعد الموت و قد صنف البیہقی فی حیاة الانبیاء رسالۃ مستقلة)

(۱۰۷۲) عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكْثَرُ وَأَعْلَى الصَّلَاةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَإِنَّهُ يَوْمٌ مَشْهُودٌ تَشْهَدُهُ الْمَلَائِكَةُ وَأَنْ أَحَدًا لَا يُصَلِّيَ عَلَى إِلَّا غُرِضَتْ عَلَى صَلَاتِهِ حَتَّى يُفْرَغَ مِنْهَا قَالَ قُلْتُ وَ بَعْدَ الْمَوْتِ؟ قَالَ: إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ فَنَبِيُّ اللَّهِ حَتَّى يُرْزَقَ. (رواہ ابن ماجہ قال السخاوی و رجالہ ثقات لکنہ منقطع)  
(۱۰۷۲) ابوالدرداء روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت کے ساتھ درود بھیجا کرو کیونکہ اس دن کا لقب مشہور ہے کیونکہ اس میں فرشتوں کی بکثرت آمد ہوتی ہے اور جو شخص اس دن مجھ پر درود بھیجتا ہے اس کی درود جب تک وہ اس میں مشغول رہتا ہے میرے سامنے پیش ہوتی رہتی ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا موت کے بعد بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر یہ بات حرام کر دی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو گلا سڑا دے۔ لہذا خدا تعالیٰ کا نبی زندہ ہی رہتا ہے اور اس کو رزق بھی دیا جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

(۱۰۷۲) \* اہل جنت کی حیات اور دائمی عبادت ذکر حدیث سے ثابت ہے۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی وفات کے بعد بھی عبادت اور نیک اعمال سے معطل نہیں رہتے بلکہ دوسروں کی درود بھی ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے ان کے جسموں کو زمین نقصان نہیں پہنچاتی اور ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ یہ جملہ صفات حیات کی صفات ہیں اس لیے ان کی حیات اور عبادت اس عالم میں بھی اہل جنت کی حیات اور عبادت کی شان رکھتی ہے۔ لہذا جب اس مسئلہ پر غور کرنا ہو تو احادیث کی روشنی میں کرنا چاہیے یہاں صرف اتنی ہی باتوں کو سامنے رکھنا حیات کی حقیقت سمجھنے کے لیے کافی ہے اس سے زیادہ اپنی جانب سے محض قیاس آرائیاں کرنا بے وجہ عقائد کو خطرہ میں ڈالنا ہے اور ان کی موت کو بالکل عام انسانوں جیسی موت سمجھنا بھی محدثین علماء کے خلاف ہے جب کہ حدیث میں ان کے غسل، ان کے دفن ان کی نماز ان کے ترکہ اور ان کی بیویوں سے حرمت نکاح کے مسائل صاف صاف موجود ہیں تو ان کے حق میں بالکل عام موت کا عقیدہ رکھنا بھی کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

(۱۰۷۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَآ مِنْ أَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَى الْآرَدِّ عَلَى اللَّهِ رُوحِي حَتَّى آرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ. (رواه ابوداؤد)

(۱۰۷۳) ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جب کوئی شخص مجھ کو سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور میری روح کو اس طرف متوجہ کر دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو جواب بھی دیتا ہوں۔ (ابوداؤد)

(۱۰۷۳) \* اس مقام پر حافظ سیوطی نے اپنے فتاویٰ میں بڑی طویل بحث کی ہے اور لفظ ”رد علی روحی“ کے جملہ کی بہت مفصل شرح فرمائی ہے اور اس کی تقریر فرماتے ہوئے لکھا ہے:

آپ کا فرمان ”رد اللہ علی روحی“ یہ جملہ حالیہ ہے اور عربی قاعدہ ہے کہ جملہ حالیہ جب فعل ماضی ہو تو وہاں لفظ ”قد“ مقدر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول او جاؤ کم حصرت صدور ہم میں لفظ ”قد“ مقدر ہے اور مطلب یہ ہے کہ ”قد حصرت“ اگر یہاں آپ کے قول کے معنی ماضی کے بجائے حال یا استقبال کے لیے جائیں تو لازم آئے گا کہ ہر بار جب کوئی شخص آپ کو سلام کرے تو آپ کی روح کا بدن سے تعلق ہو اور ہر بار یہ تعلق پھر بدن سے جدا ہوا کرے اس کے کچھ زمانہ کے بعد میں نے بیہقی کی کتاب ”حیات الانبیاء“ میں دیکھا۔ انہوں نے ایک روایت ہی صراحتہ لفظ ”قد“ کے ساتھ پیش کی ہے اس لیے اب میرے نزدیک سب جوابوں سے یہی جواب زیادہ قوی ہے اور اس بناء پر حدیث کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وفات دینے کے بعد آپ کو پھر حیات دائمی عطا فرمادی ہے اس لیے جو شخص آپ کو آ کر سلام کرتا ہے آپ خود اس کا جواب دیتے ہیں۔ غرض آپ کی اور جملہ انبیاء علیہم السلام کی قبر میں حیات کا دلائل کے ساتھ ہم کو قطعی علم ہے اور اس بارے میں تواتر کے درجہ کو حدیث پہنچ چکی ہیں امام بیہقی نے اس پر ایک مستقل تصنیف لکھی ہے اور اس میں یہ تصریح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح قبض کرنے کے بعد پھر واپس کر دی جاتی ہیں اس لیے وہ شہداء کی طرح اپنے پروردگار کی حضوری میں زندہ رہتے ہیں۔ نیز امام قرطبی سے نقل کیا ہے کہ ان کی موت کا حاصل اتنا سمجھو کہ وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ کر دیئے گئے ہیں اور ان کا حال ایسا ہو گیا ہے جیسا فرشتوں کا۔ ہم نہ ان کا ادراک رکھتے ہیں نہ ان کا۔

ان قوله رد اللہ علی روحی جملة حالیه و قاعدة العربیة ان جملة بحال اذا وقعت فعلاً ماضیاً قدرت قیہ قد كقوله تعالى او جاؤ کم حصرت صدور هم ای قد حصرت ... ولو اخذ بمعنی الحال او الاستقبال لزم تکرره عند تکرر سلام المسلمین ... ثم بعد ذلك رایت الحدیث المسئول عنه مخرجاً فی کتاب حیاة الانبیاء للبیہقی بلفظ الاو قد رد اللہ علی روحی فهو اقوی الاجوبة عندی و مراو الحدیث علیہ الاخبار بان اللہ پر دالیہ روحہ بعد الموت فیصیر حیاً علی الدوام حتی لو سلم علیہ احد رد علیہ السلام لوجود الحیات ص ۱۵۴ ج ۲ من الفتاوی و قال حیاة النبی فی قبره و سائر الانبیاء معلومة عندنا علماً قطعياً لما قام عندنا من الادلة فی ذلك وتواترت به الاخبار و قد الف البیہقی جزء فی حیاة الانبیاء فی قبورهم ... و نقل عنه من کتابه فی الاعتقاد الانبیاء علیہم السلام بعد ما قبضوا ردت الیهم ارواحهم فهم احياء عند ربهم کالشهداء و قد افرونا لاثبات حیاتهم کتاباً و قد نقل عن القرطبی من تذکرته فی حیاتهم ان موتهم انما هو راجع الی ان غیبوا عنا بحيث لا ندرکهم ... کالحال فی الملائكة. (ص ۱۴۷ ج ۲)



(۱۰۷۴) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ لِلَّهِ مَلَائِكَةً سَيَّاحِينَ فِي الْأَرْضِ يَلْفُظُونَ عَنْ أُمَّتِي السَّلَامَ.

(۱۰۷۴) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے کچھ فرشتے مقرر فرمادیئے ہیں جو زمین پر گشت لگاتے رہتے ہیں اور میری امت

(اخرجه احمد و النسائی و الحاكم و صححه والبيهقي في الشعب و البزار و اخرج ابن عدی عن ابن عباس مثله. راجع ترجمان السنة ص ۴۳۶ ج ۲ حدیث نمبر ۸۰۷)

(احمد، نسائی، مستدرک حاکم، بیہقی، ابن عدی)

(۱۰۷۵) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَرُّنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ فَمَرَرْنَا بِوَادٍ فَقَالَ أَيُّ وَادٍ هَذَا قَالُوا وَادِي الْأَزْرَقِ قَالَ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى مُوسَى فَذَكَرَ مِنْ لَوْنِهِ وَشَعْرِهِ شَيْئًا وَاضْعَا أَصْبَعِيهِ فِي أُذُنِهِ لَهُ جَوَارٌ إِلَى اللَّهِ بِالثَّلْبَةِ.

(۱۰۷۵) ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم مکہ اور مدینہ کے درمیان سفر کر رہے تھے۔ اس وقت آپ نے پوچھا اس وادی کا کیا نام ہے۔ لوگوں نے عرض کیا یہ ”وادی ازرق“ ہے۔ آپ نے فرمایا گویا میں اپنی آنکھوں سے یہاں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ فرما کہ آپ نے ان کا رنگ اور بالوں کا کچھ نقشہ بیان فرمایا کہ وہ اپنی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کانوں میں دیئے ہوئے ہیں اور اپنے رب کے نام کا تلبیہ زور زور سے پڑھتے

(۱۰۷۴) \* جو لوگ خود حاضر ہو کر آپ پر درود و سلام پیش کرتے ہیں وہ تو آپ بنفس نفیس خود سنتے ہیں اور جو دور سے درود و سلام پڑھتے ہیں اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے معین فرمادیئے ہیں وہ اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہی طریقہ دنیا میں ہے اپنی موجودگی میں سلام کی سنت آپ خود اداء کرتے ہیں اور غائب ہو کر کسی دوسرے شخص کی معرفت اپنا سلام بھیجتے ہیں۔ چونکہ وفات کے بعد یہ طریقہ قائم نہیں رہ سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے اس خدمت کے لیے یہاں ملائکہ اللہ مقرر فرمادیئے ہیں جو اس خدمت کو انجام دیتے ہیں۔ اگر انبیاء علیہم السلام میں آثار حیات نہیں تو پھر یہ کس لیے ہوتا ہے اور اگر یہاں حضور و غیبت کا کچھ فرق نہیں تو پھر فرشتوں کا یہ تقرر کس لیے ہے۔ اس لیے نہ یہ صحیح ہے کہ ان کی حیات کو عام لوگوں کی حیات کے برابر سمجھا جائے اور نہ اس کو بڑھاتے بڑھاتے اتنے مبالغہ کی ضرورت ہے کہ العباد باللہ حاضر و ناظر کی صفت ان کے لیے ثابت کر دی جائے۔ دین میں افراط و تفریط کی گنجائش کہیں نہیں اعتدال کا راستہ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ فاتبعوہ۔ اس جگہ ترجمان السنہ ص ۳۷۲ ج ۲ حدیث نمبر ۸۰۷ کا تشریحی نوٹ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۰۷۵) \* ان احادیث صحیحہ سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع کیا ہوتی ہے۔ ان کی موت کیا عام بشر ہی کی موت کی طرح ہے یا جس طرح وہ بحالت حیات حج و نماز میں مشغول رہا کرتے تھے اسی طرح وہ اپنی وفات کے بعد بھی ان میں مشغول رہتے ہیں پھر یہ ظاہر ہے کہ یہ بالکل بیداری کا ایک مشاہدہ تھا اور اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مبارک ہستیوں کو دیکھا تھا۔ لہذا یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کا بحالت بیداری بھی مشاہدہ ہو سکتا ہے اس بناء پر اگر اولیاء کرام اپنی بیداری کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ نقل کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس کا انکار کر دیں۔ جن علماء نے بحالت بیداری آپ کے مشاہدہ کا انکار کر دیا ہے ہماری رائے یہاں ان کے ساتھ متفق نہیں ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل آئندہ مذکور ہوگی۔





(۱۰۷۹) عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُنِي لَيْلَى الْحَرَّةِ وَمَا فِي مَسْجِدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرِي وَمَا يَأْتِي وَفْتُ صَلَوةٍ إِلَّا سَمِعْتُ الْإِذَانَ مِنَ الْقَبْرِ.

(۱۰۷۹) سعید بن المسیب فرماتے ہیں کہ جنگ حرہ کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد شریف میں میرے سواء اور کوئی نہ تھا جب نماز کا وقت آتا تو میں ہر نماز کے لیے قبر مبارک سے اذان کی آواز سنا کرتا۔ (ابونعیم)

(رواہ ابو نعیم کذا فی الخصائص ج ۲۸۰ ج ۲)

(۱۰۸۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ. (رواہ مسلم)

(۱۰۸۰) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے بیٹھتے ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ (مسلم)

(۱۰۷۹) \* جنگ حرہ کا واقعہ تاریخی واقعہ ہے۔ حدیثوں میں اس کے متعلق پہلے پیشگوئی موجود تھی۔ جس طرح اس کی ہولناکی کا نقشہ حدیثوں میں کھینچا گیا تھا اپنے وقت پر ٹھیک وہ اسی طرح نکلا۔ جہاں مخلوق خدا کا خون پانی کی طرح بہا بہا پھر رہا ہو وہاں مسجد شریف میں حاضری کی ہمت کسے تھی مگر سعید بن المسیب خود بھی اور سعید بن عبد العزیز بھی ان کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ یہ مرد خدا اس حالت میں بھی مسجد شریف سے جدا نہ رہے اور برابر نمازیں اپنے وقت پر وہیں اداء کرتے رہے۔ یہاں یہ سوال طبعاً پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں نماز کے اوقات کے معلوم ہونے کا ذریعہ کیا تھا۔ یہ صاحب واقعہ کا خود اپنا بیان ہے کہ وہ قبر مبارک سے اذان سنا کرتے تھے اور اسی پر اپنی نماز ادا کر لیتے تھے۔ کئی دن تک مسلسل ٹھیک اوقات پر اذان کی آواز سنا اور امن کے بعد پھر فوراً اس آواز کا منقطع ہو جانا یہ کسی وہم و خیال پر مبنی نہیں ہو سکتا۔

(۱۰۸۰) \* اس حدیث کی شرح میں مختلف اقوال ہیں لیکن سب سے صحیح بات وہ ہوگی جس کی واقعات بھی شہادت دیں۔ کتاب الدعوات اور کتاب الاذکار کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیل و نہار میں جتنے مختلف جدا ہوتے پیش ہوتی تو جدا ہوتے قضا حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تو تعویذ کے خالص کلمات پڑھتے اور جب فارغ ہو کر باہر تشریف لاتے تو خاص انداز کا شکر ادا فرماتے۔ اسی طرح کھانے پینے، سونے جاگنے، گھر میں داخل ہونے اور گھر سے نکلنے غرض کہ انسانی زندگی کے جتنے مختلف شعبے ہیں سب کے متعلق آپ کے مقدس کلمات حدیثوں میں مدون موجود ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی شریعت میں ایک باب ایسا بھی ملتا ہے کہ اگر انسان اس پر مداومت کے ساتھ عمل پیرا رہے تو اس کی نیند بھی عبادت میں شمار ہو جاتی ہے پھر کچھ کلمات ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کو پڑھ لیا جائے تو اگر مخصوص اوقات کے اذکار کی ادائیگی میں غفلت ہو جائے تو ان کے پڑھنے سے اس کی بھی تلافی ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان کی تمام زندگی گویا ذکر اللہ ہی میں شمار ہونے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک حالت میں بھی گو آپ کی زبان مبارک سے مختلف اذکار ثابت ہوتے ہیں مگر بظاہر حدیث کی مراد وہی مختلف حالات ہیں جو انسانی زندگی میں مختلف طور پر پیش آتے ہیں۔ اہل جنت کی جنت میں یہی صفت ہوگی۔ وہ بھی ہمہ وقت خدا تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مشغول رہیں گے۔ انبیاء علیہم السلام میں دوام ذکر کی یہ صفت اسی عالم میں موجود ہوتی ہے۔ پھر وہ اپنی امت کو بھی اس صفت کے پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ فَادْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ میں انسان کے ان ہی مختلف اوقات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ حدیث مذکور اسی قسم کی آیتوں کی شرح سمجھنی چاہیے۔

منہا ما یتعلق بفضلا تہم علیہم  
الصلوة و السلام  
آ نحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی فضلات میں اہل جنت  
سے مشابہت

(۱۰۸۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّيَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي أَرَاكَ تَدْخُلُ  
(۱۰۸۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بیان فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ  
میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھا کرتی ہوں کہ آپ

(۱۰۸۱) \* انسانی فضلات میں اس کے بول و براز کا درجہ سب سے گرا ہوا ہے مگر اس میں بھی انسانی غذاء اور اس کی جسمانی صحت کے  
فرق سے کیفیات کا بلکہ مقدار کا بھی بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام بھی اس بشری صنف سے مستثنیٰ نہیں ہوتے مگر چونکہ ان کے جسمانی  
خواص عام انسانوں سے کہیں بالاتر ہوتے ہیں چنانچہ ان کے جسم اور جسم کا پسینہ خوشبودار ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے اس لیے ہو سکتا ہے  
کہ ان کے یہ فضلات بھی بعض احکام میں عام انسانوں سے ممتاز ہوں۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے  
ان فضلات کو زمین فوراً جذب کر لیتی تھی۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں اس لیے اگر کہیں غذاء کی  
مادیت حائل نہ ہو جاتی تو یہ بھی ممکن تھا کہ اہل جنت کی طرح آپ کی غذاؤں کا فضلہ بھی محض پسینہ کی راہ سے خارج ہو جاتا۔ شیخ بدرالدین  
یعنی نے صحیح بخاری کی شرح میں حنفیہ کی طرف اور شیخ جلال الدین سیوطی نے بعض کبار علماء کی طرف آپ کے فضلات کے متعلق طہارت کا  
قول بھی نقل کیا ہے۔

حدیث مذکور کا روایتی پہلو گو کمزور ہے مگر یہ مسئلہ کوئی عقائد یا عمل کا مسئلہ تو نہیں جس کے متعلق اعلیٰ درجہ کی صحت درکار ہو صرف ایک  
فضیلت کا باب ہے اور وہ بھی زندگی کے ایک ایسے شعبہ سے متعلق ہے جس کی عوام کو اطلاع نہیں ہو سکتی۔ نیز ان امور تبلیغیہ میں داخل بھی  
نہیں ہے جن کا تعلق امت کے ساتھ وابستہ ہو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ذاتی خصوصیت ہے جس پر ایمان لانے کی کسی کو  
دعوت بھی نہیں دی گئی ہے۔ پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص حیات کا کوئی مستور گوشہ ضعیف اسناد کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے تو  
اسی درجہ میں اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ظاہر ہے کہ یہاں اگرچہ ثبوت ضعیف ہے مگر اس کے خلاف کوئی ضعیف سے ضعیف  
دلیل بھی موجود نہیں ہے نہ اس امر کے تسلیم کر لینے میں کسی عقیدہ پر کوئی زد پڑتی ہے پھر وہ علماء اور محدثین کے درمیان ہمیشہ نقل بھی ہوتا چلا آیا  
ہے حتیٰ کہ بعض ائمہ اس کے طہارت کے بھی قائل ہو چکے ہیں ان وجوہات کی بناء پر یہاں قطعیت کے ساتھ اس کا انکار کر ڈالنا قطعاً بے  
احتیاطی ہے۔

جامع ترمذی میں بہت سے ابواب کے تحت ایسی حدیثیں ذکر کی گئی ہیں جن پر امام موصوف نے خود ضعیف کا حکم لگایا ہے اگرچہ وہ  
دوسری کتب حدیث میں اچھی اسانید کے ساتھ بھی مل جاتی ہیں لیکن امام موصوف نے اسی ضعیف اسناد کو ذکر فرما کر اس پر عمل کرنے والے  
ضحابہ و تابعین کے اسماء گرامی کی ایک ایک فہرست پیش کر دی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بعض مرتبہ حدیث کا اسنادی پہلو کسی خاص سبب کی  
بناء پر گو ضعیف ہوتا ہے مگر وہاں خارجی قرائن اور متواتر عمل یا دوسری وجوہات کی بناء پر اس کی اصلیت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اعلیٰ درجہ  
کی اسنادی ثبوت نہ ملنے کے باوجود پھر وہ کسی مرتبہ میں معمول یہ رہتی ہے حتیٰ کہ شیخ ابن ہمام نے باب الصلوٰۃ علی المیت کے آخر میں  
تحریر فرمایا ہے کہ الاستحباب یثبت بالحديث الضعیف غیر الموضوع (ص ۶۲ ج ۲ فتح القدیر) یعنی اگر حدیث موضوع نہ ہو تو کبھی  
ضعیف حدیث سے بھی استحباب ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ دلیل اگر ضعیف ہوتی ہے تو اس کا اثر بھی ضعیف ہی رہتا لہذا.....



الْخَلَاءُ ثُمَّ يَجِيءُ الَّذِي بَعْدَكَ فَلَا يَرَى لِمَا يَخْرُجُ مِنْكَ أَثَرًا فَقَالَ يَا عَائِشَةُ أَمَا عَلِمْتَ آتِ هَؤُلَاءِ مِنْكَ بَعْدَ مَا عَلِمْتَ

صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء میں تشریف لے جاتے ہیں پھر وہاں سے واپس آتے ہیں اس کے بعد جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جاتا ہے وہ آپ

للہ..... ہے، فرائض اور واجبات اس سے ثابت نہیں ہو سکتے یہ بھی اس وقت جب کہ خارجی قرائن اس کی تائید میں ہوں، لیکن اگر خارجی قرائن ساتھ نہ دیں اور ضعف بھی شدید ہو تو پھر وہ حدیث معطل ہو جاتی ہے، یعنی اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا، اور اگر اس کے خلاف ثبوت موجود ہے تو پھر اس کو رد بھی کیا جاسکتا ہے۔ حافظ ابن القیمؒ نے امام احمدؒ کے فقہ کی ایک اصل ہی حدیث ضعیف پر عمل کرنا قرار دی ہے بشرطیکہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری حدیث نہ ہو، اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مسلک بھی یہی قرار دیا ہے۔ دیکھو اعلام المؤمنین - ص ۲۵ ج ۱۔

مزید وضاحت کے لیے ہم آپ کے سامنے بعض مسائل پیش کرتے ہیں جن میں نقل کی بہت قلت نظر آتی ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے مسائل چونکہ یہ مسائل بھی وقتی اور خاص آپ کی ذات سے متعلق تھے ادھر جہاد کے معرکہ ہمہ وقت گرم رہا کرتے تھے ان سے فرصت ملی تو تازہ تازہ احکام اتر رہے تھے اس لیے عام صحابہؓ کے افکار اس طرف متوجہ نہ ہو سکے جب یہ حادثہ جانکاہ رونما ہوا تو آپ کے غسل، صلوٰۃ جنازہ اور دفن کے خصوصی مسائل سامنے آ گئے آخر رفیق غار صدیق اکبرؓ نے اس طرف راہبری کی اور فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دفن کے لیے سب سے پسندیدہ مقام وہی ہوتا ہے جہاں ان کی وفات ہوتی ہے۔ کسی جث کے بغیر سب نے فوراً اسی وقت اس پر عمل کر لیا اور کسی نے خلاف کی ایک آواز بھی نہیں نکالی۔ اسی طرح ایک غیبی آواز پر غسل کے وقت آپ کی قمیص جسم اطہر سے نہیں اتاری گئی اور قبر کی نوعیت کا فیصلہ بھی قدرت کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ جب لحد کھودنے والا شخص پہلے آ گیا تو سب کی رائے یہی قائم ہو گئی کہ آپ کے حق میں قدرت کو لحد ہی پسند ہے۔ اس کے برخلاف وہ مسائل تھے جن کا تعلق عام امت کے ساتھ تھا وہاں خوب گرم و نرم بحثیں ہوتیں اور جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا تو ہر شخص اپنی رائے پر مختار چھوڑ دیا جاتا یہی راز تھا کہ مسائل صلوٰۃ اس نقد و تبصرہ کے باوجود بعض جگہ مختلف فیہا باقی چلے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فضائل کا مسئلہ تو آپ کی ان خصوصیات میں سے تھا جس کا امت کے ساتھ کسی لحاظ سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر حضرت عائشہؓ اپنی فطری ذہانت اور دانائی کی بناء پر اس طرف توجہ نہ فرماتیں تو شاید آپ کی اس خصوصیت کا تذکرہ کسی ضعیف حدیث میں بھی آپ کے سامنے نہ آتا۔ آپ کے سایہ نہ ہونے کا مسئلہ اس سے ذرا مختلف ہے کیونکہ یہ ہمہ وقت سب کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ عقل یہ باور نہیں کرتی کہ اگر صحابہ کرامؓ نے آپ کی اس فضیلت کو ہمہ وقت اپنی آنکھوں کے سامنے درخشاں دیکھا ہوتا تو وہ اس کے بیان سے سکوت اختیار کر سکتے تھے یقیناً وہ بھی آپ کے جسم اور آپ کے پسینہ کی خوشبو کی طرح روایات و حکایات میں مہک اٹھتا۔ آپ کے قد و قامت کی غیر معمولی صفت بھی چونکہ سب کی آنکھوں کے سامنے تھی اس لیے عام طور پر یہ چرچا رہا کرتا تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم.....

۱۔ الاصل الرابع الاخذ بالمرسل والحديث الضعيف اذا لم يكن في الباب شيء يدفعه وهو الذي رجحه على القياس وليس المراد بالضعيف الباطل ولا المنكر ولا في رواية من هو مهتم بحديث لا يسوغ الذهاب اليه وليس احد من الائمة الا وهو موافقه على هذا الاصل. اعلام المؤمنین (اعلام المؤمنین) ج ۱ ص ۲۵ ج ۱ ص ۲۶ یہاں حافظ ابن تیمیہؒ نے اور ان کی اتباع میں بعض علماء نے جو تاویل کی ہے اس کی تصدیق خود امام احمدؒ کے مسند سے نہیں ہوتی اس لیے ہمارے نزدیک امام کے مختار کی وہ تاویل قرار نہیں دی جاسکتی ہاں خود ان کا اپنا مسلک وہ ہو تو ہو۔

أَنَّ اللَّهَ أَمَرَ الْأَرْضَ أَنْ تَبْتَلِعَ مَا خَرَجَ مِنْ الْأَنْبِيَاءِ. (رواه السيوطي في الخصائص) صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلہ کا کوئی نشان تک نہیں پاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عائشہ! کیا تم نہیں جانتیں اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا ہے کہ وہ

اللہ..... اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت بھی کتنی عجیب ہے کہ جب تنہا ہوتے ہیں تو نہایت میاں نہ قدر نظر آتے ہیں اور جہاں مجمع میں آگئے تو یوں معلوم ہونے لگا کہ سب سے دراز قامت آپ ہی ہیں۔ آپ کے بول و براز کا معاملہ ایسا نہیں ہے اس لیے اگر محدثین اس کو نقل کرتے ہیں تو اس کو مان لینا آپ کی محبت کا تقاضا ہونا چاہیے۔ اس کا بلند آہنگی سے انکار آپ کی محدثی کا ثبوت تو نہیں مگر آپ کی بے نمکی کا ثبوت ضرور ہے۔

اس جگہ حافظ ابن تیمیہؒ نے ایک بہت مفید تنبیہ فرمائی ہے جو اس قسم کے مواضع میں محدثین کا نظریہ سمجھنے کے لیے نہایت اہم ہے:

الخبر ان قام دليل على صدقه او كذبه و الابقى ممالم تصدقه و لم نكذبه و اهل العلم بالحديث اذ قالوا هذا الحديث رواه فلان و هو مجروح او ضعيف او سنى الحفظ او ممن لا تقبل روايته و نحو ذلك فهو كقول القائل هذا الشاهد مجروح او سنى الحفظ او ممالم تقبل شهادته و هذا يفيد انه لا يحكم به و لا يفيد الحكم بانه كاذب بل قد يمكن انه صادق فلا يقال انه كاذب الابحجة و ان قالوا في الحديث انه ضعيف فهذا مراد هم انه لم يثبت و لا يحتج به و لا يجوز الحكم بصدقه ليس مراد هم انه بمجرد ذلك يحكم بكذب الناقل و ينفي انقله و يقول ان هذا لم يكن من غير علم منا بهذا النفي بل ان قام دليل على انتفاء خبره حكمنا بذلك و الا سكتنا لم تنفه و لم متبته فهذا اصل يجب معرفته فان كثيراً من الناس لا يميز بين ما ينفيه لقيام الدليل على نفسه و سيس مالم شية لعدم دليل اثباته بل ترون نيفون ما لم يعلموا اثباته فيكونون قد نفوا مالم يس لهم به علم و قالوا بافوا هم مالم يس لهم به علم. (الجواب الصحيح ص ۲۹۶ ج ۴)

کسی خبر کے صدق و کذب کا اگر ثبوت مل جائے جب تو اس پر صادق یا کاذب ہونے کا حکم لگا دینا صحیح ہے ورنہ ہم اس کی نہ تصدیق کریں گے نہ تکذیب۔ محدثین جب کسی حدیث کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس کو فلاں شخص نے روایت کیا ہے اور وہ مجروح یا ضعیف ہے تو اس کا مطلب ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کوئی شخص یہ کہے کہ یہ شاید مجروح یا ضعیف ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس جرح کی وجہ سے اس پر کاذب ہونے کا حکم لگا دیا گیا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ نفس الامر میں صادق ہو اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس کو صادق نہیں کہا جائے گا اور بس اب رہا یہ کہ اس کو کاذب بھی کہہ دیا جائے تو یہ حکم کسی دلیل کے بغیر لگانا صحیح نہیں ہے۔ ایسا ہی جب کسی حدیث کے متعلق محدثین یہ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے تو ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ اس پر صدق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا اس کی یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ بس صرف اتنی بات سے اس کے راوی پر کذب کا حکم لگا دیا جائے یا جو مضمون اس نے نقل کیا ہے اس کی نفی کر دی جائے اگرچہ اس کی نفی کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل بھی نہ ہو۔ لہذا اس قسم کے مقامات پر ہم سکوت کریں گے نہ اس کا اثبات کریں گے اور نہ نفی۔ اس قاعدہ کو یاد رکھنا اور اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کیونکہ بہت سے لوگ کسی بات کی مدلل نفی کرنے میں اور بے دلیل بات پر ثبوت کا حکم نہ لگانے میں کوئی فرق ہی نہیں کرتے اور ہر ایسی بات کی نفی کر ڈالتے ہیں جس کا ثبوت ان کے علم میں نہیں ہوتا اور لا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ کا خلاف کرتے ہیں۔

ثم قال و ما كان من الامور مستلزماً لوازم لو كان موجوداً فانه يستدل بانتفاء لازم على انتفاء الملزوم .....



الكبرى من سبع طرق وقال هذا من انبياء عليهم السلام کے خارج شدہ فضلہ کو جذب کر لے۔

اقولها ونقل عن ابن دحية انه سند ثابت و في طريقه انا معاشر الانبياء تنبت اجسادنا على ارواح اهل الجنة واعلم ان الحديث الضعيف اذا لم يكن مخالفا للنص او حديث صحيح او عقيدة مجمعة عليها

للہ ..... کا لامور التی لو كانت موجودة لوجب ان ينقل نفلًا متواترًا شائعًا كما لو قال قائل انه بنی بین العراق و الشام مدينة اعظم من بغداد و الموصل ... و نحو ذلك فانه يعلم كذبه فان هذا مما تتوهمهم الناس على نقله لو كان موجودًا. (الجواب الصحيح ص ۲۹۷ ج ۴)

اس کے بعد لکھتے لکھتے فرماتے ہیں کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ موجود ہوں تو یقینی طور پر ان کے یہ لوازم ہوں گے اس قسم کے مقام پر اگر یہ لوازم موجود نظر نہ آئیں تو ملزوم کے نہ ہونے کا بھی حکم لگانا صحیح ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ عراق اور شام کے درمیان بغداد اور موصل سے بھی بڑا ایک اور شہر ہے اب ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً لوگ اس کو نقل کرتے اس کے باوجود جب ایک شخص بھی ان دونوں شہروں کے درمیان اتنی بڑی بستی کا وجود بیان نہیں کرتا تو اس کے غلط کا حکم لگانا بالکل صحیح ہے۔

ثم قال ... ثم هذه اللوازم منها جلی و منها خفی يعرفه الخاصة فلماذا كان اهل العلم باحوال الرسول بقطون بكذب احاديث لا بقطع غيرهم بكذبها لعلمهم بلوازم تلك الاحاديث و انتفاء لوازمها .... و هكذا يعلمون ان فلانا اخطأ في هذا الحديث على فلان لانهم قد علموا من وجوه ثابتة ان ذلك الحديث انما رواه على صورة معينة فاذا روى

غير الثقة ما يناقض ذلك علموا بطلان ذلك و انه اخطأ او تعمد الكذب. (ص ۲۹۸ و ۲۹۹ ج ۴)

پھر لکھتے ہیں کہ یہ لوازم کبھی تو بالکل واضح ہوتے ہیں اور کبھی دقیق ہوتے ہیں جن کو خاص خاص لوگ ہی جانتے ہیں ہر شخص ان کو نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حدیثوں پر محدثین تو قطعی طور پر کذب کا حکم لگا دیتے ہیں مگر جو ان دقیق لوازم کو نہیں پہچانتا وہ یہاں قطعی حکم نہیں لگاتا۔ اسی طرح محدثین یہ بھی جانتے ہیں کہ اس حدیث میں فلاں شخص نے فلاں موقعہ میں غلطی کی ہے کیونکہ ان کو مستند طریقوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حدیث دراصل اس خاص صورت پر روایت کی گئی ہے لہذا جب کوئی غیر ثقہ راوی اس کے خلاف روایت کرتا ہے تو وہ اس کے بطلان کا حکم لگا دیتے ہیں۔

فالصدق له دلائل مستلزمة له تدل على الصدق و الكذب له دلائل مستلزمة له تدل على الكذب .... و ما لم يعلم صدقه و لا كذبه و لا ثبوته و لا انتفائه و فانه يجب الامساك عنه و يقول القائل هذا لم اعلمه و لم يثبت عندی و لا اجزم به و لا احكم به و لا استدلل به و لا ابني عليه مذهبي و اعتقادي و عملي و نحو ذلك. لا يقول هذا اقطع بكذبه و انتفائه ... فالقطع بجهل مشبهه المعتقد له غير القطع بانتفائه فمن قطع

بشيء بلا دليل يوجب القطع قطعنا بجهله و ضلاله و خطاه. (الجواب الصحيح ص ۳۰۰ ج ۴)

خلاصہ یہ ہے کہ جس بات کے صدق یا کذب کی دلیل معلوم نہ ہو اس کے متعلق بس اتنا ہی کہنا مناسب ہے کہ میں اس کو نہیں جانتا یا میرے علم میں یہ بات ثابت نہیں ہوئی یا مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہنا کہ مجھے اس کے ثبوت کا یقین حاصل نہیں ہو سکا اور بات ہے اور یہ کہنا کہ اس کے نہ ہونے کا مجھ کو یقین حاصل ہے بالکل اور بات ہے۔ لہذا جو شخص دلیل کے بغیر کسی ایک بات کا حکم بھی قطعیت کے ساتھ لگائے گا ہم بھی اس پر قطعیت کے ساتھ جہل کا حکم لگا دیں گے۔ للہ .....

ولم یکن یتعلّق بامر کثیر الوقوع و یكون من خصوص الاحوال التي لا یطلع علیها احد فانه لا حيلة لردّها سیما اذا كان من باب الفضائل و المزايا اللازمة)

للہ ..... لا یجوز للانسان ان نیفی علم غیره و قطع غیره من غیر علم منه بالاسباب التي یعلم بها و ینخبر فانه کثیر اما یكون للانسان دلائل کثیرة تدل علی صدق شخص معین و ثبوت امر معین و ان کان غیره لا ینعرف شیئاً من تلك الدلائل و هذا ایضاً مما یغلط فیہ کثیر من الناس ینظرون فی انفسهم و مبلغ علمهم فاذا لم یجدوا عندهم ما یوجب العلم بذلك الامر جعلوا غیرهم كذلك من غیر علم منه بانتفاء اسباب العلم عند ذلك الغير و قد ینقسمون حججاً صفیفة علی ان غیرهم لا یعلم ذلك مثل ما ینفعله کثیر من الناس بالنظر و الاستدلال و الاعتبار و من لم یساویهم فی نظرهم و ادلتهم و قوة اذهانهم لا یعلم ما علموه و کثیر من الناس یعلم بالاخبار و النقل و الاستدلال بذلك اموراً کثیرة و من لم یشارکهم فیما سمعوه و فیما عرفوه من احوال المجزیین و المخبریه و کمال معرفتهم بذلك لا یعلم ما علموه فلہذا کان لاهل النظر العقلی طرق لا ینعرفها اهل الاخبار و لاهل الاخبار السمعیة طرق لا تعرف بمجرد العقول و لہذا کان لہؤلاء من الطرق الدالة علی صدق الرسول و نبوته و الاستدلال علی ذلك امور کثیرة لا ینعرفها اهل الحدیث و الآثار و عند هؤلاء من الاحادیث المتواترة عندهم و الآثار المستفیضة عندهم ما یعلمون بها صدق الرسول و ان کان اولئک لا ینفونہا بل طرق معرفة الصانع و تصدیق رسوله قد یكون لكل قوم منها طریق او طرق لا یعلمها آخر و ان وہم مشترکون فی الاقرار باللہ و رسوله ..... بل ماتواتر عندهم من احوال الرسول قد یكون المخبرون لہؤلاء الذین تواتر عندهم ما اخبروہم بہ من آیاتہ و شرائعہ غیر المخبرین لاولئک کما کان الصحابة المخبرون لاهل الشام بآیات الرسول و بالقران و شرائع الاسلام غیر الصحابة المخبرین لاهل العراق و لكن خبر هؤلاء ینصدق هؤلاء و ان کان کل من الطائفتین لا یعلم اعیان اولئک الذین اخبروا اولئک و عامة ما یعلمہ الناس بالحس هو من هذا الباب فان الانسان یحس باحوال نفسه من جوعه و عطشه و شعبه و ریه و جسد بغضه و شہوته و نفرتہ و امه و لذتہ بل یحس باعضائه کبطنه و فرجه و لا یحس باحوال غیره و لكن یشترک ان فی الجنس العام خیشتر کون فی جنس الاحساس بجوعہم و شعبہم. (ص ۳۰۲ و ۳۰۳ الجواب الصحیح جلد ۴)

اسی طرح یہ بات بھی کسی شخص کے لیے درست نہیں کہ جب تک اس کو ان اسباب کا علم حاصل نہ ہو جائے جن سے کہ وہ خبر معلوم ہوئی ہے تو وہ دوسرے شخص کے علم کی نفی کر ڈالے۔ کیونکہ بسا اوقات کسی بات کے ثبوت کے لیے ایک شخص کے پاس بہت سے دلائل موجود ہوتے ہیں جن کو دوسرا شخص نہیں جانتا یہاں بھی یہی مصیبت ہے کہ بہت سے لوگوں کو جب خود ان اسباب کا علم نہیں ہوتا تو جس کو ان اسباب کا علم ہوتا ہے وہ اس کو بھی اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں اور اتنی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اتنی بات معلوم کر لیں کہ اس خبر کے معلوم ہونے کے جو ذرائع اور اسباب ہیں وہ اس شخص کو معلوم ہیں یا نہیں۔ اگر معلوم ہیں تو اس کو لا علم سمجھنا کیونکر صحیح ہے چنانچہ بہت سے لوگوں کو دنیا کے واقعات اور اس کے بیان کرنے والوں کے وہ حالات معلوم نہیں ہوتے جو مؤرخین کو معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان واقعات کے علم کے جو اسباب ہیں ان کو مؤرخ تو جانتا ہے اور یہ نہیں جانتے اور جب ان اسباب ہی کو نہیں جانتے تو پھر ان کو ان واقعات کا علم کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ للہ .....



- (۱۰۸۲) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كُنْتُ أَسِيرُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَدْنُ مِنِّي فَدَنَوْتُ مِنْهُ فَمَا شَمَمْتُ مِسْكَاً وَلَا غَيْرًا أَطِيبَ مِنْ رِيحِ رَسُولِ اللَّهِ. (رواه البزار كما في الخصائص. و اخرج الشيخان نحوه)
- (۱۰۸۳) عَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَسْلُكْ طَرِيقًا فَيَتَّبِعُهُ أَحَدٌ إِلَّا عَرَفَ أَنَّهُ قَدْ سَلَكَهُ مِنْ طِيبِ عَرَفِهِ أَوْ قَالَ مِنْ رِيحِ عَرَفِهِ. (رواه الدارمی)
- (۱۰۸۲) معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کر رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذرا میرے قریب آنا میں قریب گیا تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سی خوشبو نہ تو مشک میں دیکھی نہ عنبر میں۔ (بزار)
- (۱۰۸۳) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی راستہ پر جاتے پھر آپ کے بعد کوئی دوسرا شخص اسی راستہ پر جاتا تو وہ ضرور پہچان لیتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر اس طرف سے ہوا ہے کیونکہ آپ کی خوشبو سے راستہ مہکا ہوا ہوتا تھا۔ (دارمی)

اللہ..... اہل نظر و عقل کے بہت سے دلائل ایسے ہوتے ہیں جن کو مورخ نہیں جانتا اور محدثین کے بہت سے دلائل ایسے ہوتے ہیں جن کا علم صرف عقل سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہذا صداقت رسول کے بہت سے وہ دلائل جو اہل نظر کو معلوم ہوتے ہیں ان کا اہل حدیث کو کوئی علم نہیں ہوتا بہت سے ایسے واقعات جو اہل حدیث کے نزدیک تو اتر کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں جن سے کہ صداقت رسول ثابت ہوتی ہے ان کا اہل نظر کو کوئی علم نہیں ہوتا یہاں کسی فریق کے لیے بھی یہ صحیح نہیں ہے کہ ان دلائل اور اسباب کے علم کے بغیر وہ اس خبر کا انکار کر ڈالے گا گاہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ رسول کے ان احوال متواترہ کے بیان کرنے والے مختلف جماعتوں کے سامنے مختلف لوگ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ وہ صحابہ جو اہل الشام کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور قرآن کریم اور دینی احکام کے ناقل تھے اور وہ جو اہل عراق کے سامنے ناقل تھے اور تھے لیکن پھر ان دونوں جماعتوں کے بیانات ملتے جلتے تھے اور ایک دوسرے کے لیے مصدق تھے اگرچہ ان میں ایک جماعت کو دوسری جماعت کا کوئی علم نہ تھا۔ یہاں ان راویوں کا صرف کسی خبر میں مشترک ہونا کافی سمجھا جاتا ہے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس خبر کا بیان کرنے والا ایک ہی گروہ ہو تمام حیات و وجدانیات کا حال یہی ہے ایک انسان اپنے حالات مثلاً بھوک، پیاس، محبت، عداوت اور تکلیف و لذت وغیرہ کا خود تو احساس رکھتا ہے مگر دوسروں کے ان حالات کا احساس نہیں رکھتا لیکن چونکہ وہ جنس عام میں ان کا شریک ہوتا ہے لہذا وہ دوسروں کے متعلق بھی یہ حکم لگا دیتا ہے کہ ان کو بھی ہماری طرح ان حالات کا احساس ہوتا ہے۔

- (۱۰۸۲) \* حضرت معاذ بن جبلؓ یہاں آپ کے پسینہ کی ایک خصوصیت بیان فرما رہے ہیں اور اس کو جس انداز سے نقل فرما رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف ان کی حسن عقیدت کی بات نہ تھی بلکہ سرتاسر حقیقت تھی۔ آپ کے اس عطر بیز پسینہ کا راوی ایک صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے اور صحابہ بھی ہیں پھر ہر ایک نے اس کو مختلف صورتوں اور مختلف محل پر اس طرح نقل کیا ہے جس سے آپ کے فضائل کی برتری کا اعتراف کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے اس کی چند مثالیں ذیل کی احادیث میں آپ کے سامنے ہیں۔
- (۱۰۸۳) \* دیکھئے یہاں راوی معاذؓ کی بجائے حضرت جابرؓ ہیں اور وہ آپؐ کی اس خوشبو کا حال استدلالی رنگ میں بیان فرما رہے ہیں اور وہ بھی اس تاکید کے ساتھ کہ اس میں کسی خاص یا عام شخص کی کوئی بحث نہیں ہے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ آپ کے راستے سے جو شخص بھی گذرتا وہ آپ کی خوشبو کی وجہ سے یہ پہچان لیتا تھا کہ یہ آپ ہی کی مہک ہے۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہہ دیتی ہے خوشبو جسم و جان کی

(۱۰۸۴) عَنْ أَنَسٍ قَالَ دَخَلَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِنْدَنَا فَعَرَقٌ وَجَاءَتْ أُمِّي بِقَارُورَةٍ فَجَعَلَتْ تَسْلِيْتُ الْعَرَقَ فَاسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا أُمُّ سُلَيْمٍ مَا هَذَا الَّذِي تَصْنَعِينَ قَالَتْ هَذَا عَرَقٌ نَجَعَلُهُ لَطِينًا وَهُوَ أَطْيَبُ الطَّيْبِ. (رواه مسلم وفي رواية قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ نَرْجُو بَرَكَتَهُ لِمِيبًا نَا قَالَ أَصَبْتَ.

(و روی البخاری نحوه)

(۱۰۸۵) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ

(۱۰۸۴) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے اور ایسا ہوا کہ دوپہر میں آپ نے ہمارے ہی گھر استراحت فرمائی آپ کو پسینہ آیا تو میری ماں ایک شیشی لائیں اور آپ کا پسینہ پوچھ پوچھ کر اس میں ڈالنے لگیں آپ بیدار ہو گئے اور پوچھا اے ام سلیم یہ کیا کر رہی ہو۔ انہوں نے عرض کیا یہ آپ کا پسینہ ہم اپنے عطروں میں اس کو ملا لیتے ہیں اور یہ عطر ہمارے یہاں سب سے زیادہ خوشبودار ہو جاتا ہے۔ (مسلم شریف) ایک روایت میں اتنا اور ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا ہمیں امید ہے کہ اس کی برکت ہمارے بچوں کو بھی لگ جائے۔ آپ نے فرمایا تم نے درست کہا۔

(۱۰۸۵) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر کی نماز اداء کی پھر آپ اپنے گھر کی طرف چلے تو

(۱۰۸۴) \* یہ آپ کی خوشبو کے بیان کا تیسرا انداز ہے اور اس سے بہت روشن طریق پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی یہ خوشبو اس لیے نہ تھی کہ آپ خوشبو کا استعمال زیادہ فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ آپ کے ان فضلات کی ہی خوشبو تھی۔ ظاہر ہے کہ عرب میں جو خوشبوئیں مستعمل تھیں وہ بھی یقیناً بہتر ہی ہوتی ہوں گی مگر ان میں آپ کے پسینہ کے قطروں کو اس جانفشانی سے جمع کر کے ڈالنا اور یہ تصریح کرنا کہ ہمارے جس عطر میں آپ کا یہ عطر بیز پسینہ شامل ہو جاتا ہے وہ سب سے مہک دار اور عمدہ سمجھا جاتا ہے اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ راویوں کا یہ بیان صرف حقیقت ہی حقیقت تھا۔ خلاصہ یہ کہ پسینہ جسم کے ان فضلات میں سے ہے جس میں کہ عام طور پر بدبو ہوتی ہے مگر یہ وہ رسول اعظم تھے جن کا پسینہ بھی عرب کے عطروں کو شرمندہ کرتا تھا۔

(۱۰۸۵) \* آپ کے پسینہ کی بجائے اس حدیث میں آپ کے جسد اطہر کی خوشبو کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک آپ کا جسم مبارک معطر نہ ہو اس کا پسینہ کیسے معطر ہو سکتا ہے ان سب راویوں کے ان سب مختلف بیانون کو سامنے رکھ کر انصاف کیجئے کہ کیا یہاں کسی شاعرانہ مبالغہ آمیزی کا احتمال ہو سکتا ہے یا بات یہ ہے کہ نبی اپنے جسم اور اس کے فضلات میں بھی عام بشر سے ممتاز ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنتی کھائیں گے بھی اور پیئیں گے بھی مگر نہ تھوکیں گے اور نہ ان کو پیشاب پاخانہ کی حاجت ہوگی اور نہ وہ ناک صاف کریں گے صحابہؓ نے عرض کی پھر ان کا یہ کھانا پینا کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ خوشبودار ڈکار اور مشک بیز پسینہ کی راہ سے خارج ہو جائے گا اور خدا کی تسبیح و تحمید ان کے لیے اس طرح غیر اختیاری ہو جائیں گی جیسا کہ سانس لینا غیر اختیاری فعل ہوتا ہے۔

اس حدیث میں یہ بات صاف کردی گئی ہے کہ اسلامی جنت صرف روحانی اور خیالی نہیں اس میں کھانا پینا بھی ہے مگر مادیت کے جو کثیف اور فانی اجزاء دنیا میں ہیں وہ ان میں نہیں۔ مثلاً تھوک، سنک اور دوسرے گندے اجزاء یہ سب کے سب چونکہ اس کثیف لٹھے.....



الْأُولَى ثُمَّ خَرَجَ إِلَى أَهْلِهِ وَخَرَجَتْ مَعَهُ  
فَاسْتَقْبَلَهُ وَلَدَانِ فَجَعَلَ يَمْسَحُ خَدَّيْ  
أَحَدِهِمْ وَاحِدًا وَاحِدًا وَأَمَّا أَنَا فَمَسَحَ

میں بھی آپ کے ساتھ ہولیا سامنے سے کچھ بچے آنکے آپ نے ازراہ محبت  
ان سب کے ایک ایک رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ جب میرا نمبر آیا تو آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے میرے دونوں رخساروں پر ہاتھ پھیرا اس وقت میں نے آپ

للہ..... مادہ کے خصائص میں سے ہیں اس لیے وہ جنت میں نہ ہوں گے اور نہ ہونے چاہئیں۔ اس پر صحابہؓ نے نہایت معقول سوال کیا کہ  
پھر یہ غذائی اجزاء جسم سے کس طرح خارج ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ معقول سوال ان کے دماغوں میں بھی پیدا ہوتے تھے اور ان کا کبھی کبھی وہ  
حل بھی دریافت کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو جواب ان کو ملا وہ کتنا معقول تھا کہ جنت کی غذاء کا تو پوچھنا ہی کیا  
ہے جب دنیوی غذاؤں کے فرق سے انسانی فضائل کی کثافت اور لطافت بلکہ ان کی کمیت اور مقدار میں بھی  
فرق ہو سکتا ہے تو آخرت میں اگر فرق ہو تو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کی ایک خصوصیت یہ ہوگی  
کہ ان کی غذا معطر پسینہ کی شکل سے خارج ہو جایا کرے گی دوم یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی عبادت دائمی ہوگی اور سانس کی طرح غیر اختیاری  
بھی ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام میں یہ دونوں صفتیں اسی جہان میں نظر آتی ہیں یعنی ان کے فضائل کا خوشبودار ہونا اور سونے کی حالت میں بھی  
ان کی قلبی بیداری اور بیداری کے تمام حالات میں ذکر اللہ اور وفات کے بعد بھی عبادات میں مشغولی یہ سب ان کی دائمی صفات ہوتی ہیں  
علماء حقائق کا خیال ہے کہ مرکز حیات ذکر اللہ ہے چونکہ جنتیوں کی حیات دائمی ہوگی اس لیے ان کو اس معنی سے موت نہیں آتی جس سے کہ  
عام بشر کو آتی ہے۔ دوام ذکر کے ساتھ موت یعنی عبادت الہی سے تعطل کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے حدیثوں میں انبیاء علیہم  
السلام کو زندہ کہا گیا ہے اور اس کی حقیقی حیات ہونے کی طرف زندگی کی ذواہم خصوصیات بقا کر تنبیہ کی گئی ہے ایک عبادت اور دوم رزق یعنی  
وفات کے بعد وہ عبادت بھی کرتے رہتے ہیں اور ان کو رزق بھی ملتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رزق روح کی صفت نہیں اس کے لیے جسم کی  
ضرورت ہے۔ پس جب کہ ان کو رزق بھی ملتا ہے تو یقیناً جسم کے ساتھ بھی ان کا کوئی نہ کوئی رشتہ قائم ہونا چاہیے۔ مگر جب اس جہان کے  
رزق کی کیفیت بھی مختلف ہے تو اس کی حیات کی کیفیات بھی ضرور مختلف ہوں گی۔ اس کو انسانی جہان کی کیفیات پر قیاس کرنا غلط ہے اس سے  
زیادہ اس مسئلہ پر گفتگو کرنی اپنی مقدار علم نہ جاننے کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کی حیات تسلیم کر لی جائے تو اس سے ان کی بشریت کے  
خلاف ذرہ برابر بھی کوئی بات نہیں نکلتی۔ کیونکہ جب وہ اس دنیا میں ایک محسوس اور مشاہد حیات کے مالک ہو کر بھی بشر ہی تھے تو وفات کے  
بعد اگر ان میں آثار حیات ثابت ہوں تو اس غیر محسوس حیات سے اور کیا نئی بات ثابت ہو سکتی ہے۔ جس جماعت نے انبیاء علیہم السلام کی  
خصوصیت کو تو حید کے خلاف سمجھ کر ان کو مضحک بنانے کی سعی کی ہے یہ محض عبث سعی ہے۔ اگر کسی انسان میں عام بشریت کے خلاف ایک ہزار  
خصوصیات بھی موجود ہوں تو بھی اس کا مخلوق ہونا ہی ایک ایسا بڑا داغ ہے جو تنہا بارگاہ الوہیت سے اس کو ممتاز کرنے کے لیے کافی ہے۔  
عیسائیوں نے جب خدائی تو حید میں شرک کی آمیزش شروع کی تو قرآن کریم نے ایک ہی کلمہ سے ان کا رد کر دیا یعنی ”بَلْ لَّهِ مَافِي  
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ“ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق انبیت کا عقیدہ اس لیے باطل ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ سب  
کا سب اس کی مملوک ہے اور مملوک ہونے کا ایک ہی عیب ایسا ہے جو انبیت کی تردید کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے ہمارے فقہاء نے یہاں  
سے اس مسئلہ کا استنباط فرمایا ہے کہ اگر والد اپنی اولاد کو کسی سے خرید لے تو وہ لڑکا والد کے اختیار کے بغیر خود بخود آزاد ہو جائے گا کیونکہ بیٹا  
باپ کا مملوک نہیں ہو سکتا۔ پس جب عیسیٰ علیہ السلام اس کے مملوک ہیں تو ان کو بیٹا کیسے کہا جاسکتا ہے۔ لہذا جب کہ صرف ملکیت کا لفظ.....

خَدَى فَوَجَدْتُ لِيَدِهِ بَرْدًا أَوْ رِيحًا كَأَنَّمَا  
أَخْرَجَهَا مِنْ جُودَةِ عَطَّارٍ . (رواه مسلم)

مِنْهَا جَوَازُ مَكْتَبِهِمْ فِي الْمَسْجِدِ  
جُنْبًا

صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی خنکی محسوس کی اور اس کی خوشبو سونگھی  
ایسا مہک رہا تھا جیسا ابھی عطر فروش کے ڈبہ سے نکلا ہے۔ (مسلم)  
بحالت جنابت آپ کے لیے مسجد میں قیام کی اجازت اور اس میں  
اہل جنت سے ایک مشابہت

(۱۰۸۶) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

..... ایک علاقہ ہی تو حید کو نکھارنے کے لیے کافی ہے تو مخلوقیت کا داغ تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے اس لیے اُن انبیاء علیہم السلام کی حیات  
محدثین کے نزدیک بھی ثابت شدہ حقیقت ہے تو اس کو تو حید کے خلاف سمجھنا کسی طرح درست نہیں۔ اسی طرح اس حقیقت کو پرورش کرتے کرتے  
سو طرح کے اور برگ و بار اپنی طرف سے اس پر لگا دینا بھی خطرناک راستہ ہے یہی وجہ ہے کہ سلف اس بحث میں نہیں پڑے۔ نہ اس کے  
اثبات میں انہوں نے غلو کیا نہ اس کی نفی کا کوئی اہتمام محسوس کیا۔ اس قسم کی مباحث ارباب حقائق نے شروع کیں پھر علماء شریعت نے ان کو  
نکھارا پھر شدہ شدہ وہ نااہلوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر خطرناک مسائل بن گئے۔ ہم نے بھی گوجا بجا اس پر تنبیہ کی ہے مگر ان کے زیر بحث آ  
جانے کے بعد اور وہ بھی بدرجہ مجبوری، مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان مسائل میں جس حد تک حدیث نے تفصیل فرمادی  
ہے اسی پر قناعت کر لینی چاہیے۔ واللہ الموفق۔

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے اس موضوع پر ”آب حیات“ ایک مستقل ضخیم رسالہ لکھا ہے۔ ہم نے اپنی استعداد کے  
موافق اس کا مطالعہ بھی کیا ہے اور کچھ سمجھا بھی ہے مگر اس کا اقتباس نقل کرنا بھی عوام کے فہم سے بالاتر معلوم ہوا اس لیے اس کا خلاصہ نقل  
کرنے سے بھی ہم نے عنان قلم کو روک لیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت علیؓ سے مروی ہے ”جِدُّوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ اتَّحِبُّونَ أَنْ  
يَكْذِبَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ“ (آخر کتاب العلم) یعنی لوگوں کے سامنے بس وہی باتیں بیان کیا کرو جو ان کے اندازہ فہم کے مناسب ہوں ورنہ  
نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ان باتوں کو سمجھیں گے نہیں اور اپنے جہل کی بناء پر اس کی تکذیب کریں گے اور اس طرح خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے  
بلند علوم کی تکذیب کا باعث تم بنو گے۔ امام بخاریؒ نے اس کی اتنی اہمیت محسوس فرمائی ہے کہ اس پر مستقل ایک عنوان ہی قائم کر دیا ہے۔ اس  
زمانہ میں مصنف کی اس احتیاط کی قدر ہوتی ہے۔

(۱۰۸۶) \* اس استثناء کی ایک ظاہری وجہ تو یہ ہے کہ چونکہ مسجد شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سکونت کا مقام ہی تھا ہر وقت آپ کی  
وہاں آمد و رفت رہتی تھی اس لیے آپ کے حق میں بحالت جنابت اس میں گزر جانے اور قیام کرنے کی گنجائش بھی دے دی گئی تھی مگر اس  
گنجائش سے آپ نے کتنا فائدہ اٹھایا یہ مشکل سے کوئی واقعہ نکل سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مساجد چونکہ عرف شریعت میں ریاض  
جنت کھلاتی ہیں اور غالباً یہ سب ٹکڑے محشر میں جنت ہی میں لے لیے جائیں گے۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے  
خواص رکھتے ہیں اس لیے جس طرح اہل جنت اپنی ہر حالت میں جنت ہی میں رہیں گے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عالم میں  
بھی اس کی اجازت حاصل تھی۔ نہ عام بشر کی دنیا میں یہ صفت ہے نہ ان کو اس حالت میں مسجد میں رہنے کی اجازت ہے۔ رہا حضرت علیؓ کا  
استثناء تو چونکہ ان کا راستہ بھی اسی طرف سے تھا اس لیے ان کو بھی اس اجازت میں تبعاً داخل کر لیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ وضاحت آئندہ  
حدیث کے نوٹ میں آتی ہے۔



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اس مسجد میں میرے اور تمہارے سوا کسی کو جنابت کی حالت میں رہنا درست نہیں ہے۔

(ترمذی - بیہقی - ابویعلی - بزار)

(۱۰۸۷) ابو حازم اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک پاک و صاف مسجد بنائیں جس میں ان کے اور حضرت ہارون علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص کو سکونت کا حق نہیں ہوگا اور مجھ کو بھی اس کا حکم دیا ہے کہ میں بھی ایک پاک و صاف مسجد بناؤں اور اس میں بھی میرے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے فرزندان کے علاوہ کوئی اور شخص سکونت کا حق نہیں رکھے گا۔

(ابن عساکر - بیہقی)

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَلِّي لَا يَحِلُّ لِأَحَدٍ أَنْ يُجْنِبَ فِي هَذَا الْمَسْجِدِ غَيْرِي وَغَيْرُكَ.

اخرجه الترمذی و البيهقي و البزار عن سعد و ابو

يعلى عن عمر بن الخطاب و البيهقي عن ام سلمة.

(۱۰۸۷) عَنْ أَبِي حَازِمٍ الْأَشْجَعِيِّ قَالَ قَالَ

رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ

أَمَرَ مُوسَى أَنْ يَبْنِيَ مَسْجِدًا طَاهِرًا لَا يَسْكُنُهُ

إِلَّا هُوَ وَ هَارُونُ وَ إِنَّهُ أَمَرَنِي أَنْ أَبْنِيَ

مَسْجِدًا طَاهِرًا لَا يَسْكُنُهُ إِلَّا أَنَا وَ عَلِيٌّ وَ

أَبْنَا عَلِيٌّ. (و اخرجہ ابن عساکر نحوه عن

جابر و ابن عساکر عن ام سلمة و البيهقي

عن عائشة كما في الخصائص)

(۱۰۸۷) \* اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی جائے عبادت اور جائے سکونت ایک ہو سکتی ہے۔ جب فقہاء نے قرآن شریف پڑھنے والے بچوں کو وضوء کیے بغیر قرآن شریف چھونے کی اجازت دے دی تو پھر رسولوں کی ہمہ وقت آمد و رفت کی وجہ سے اگر مسجد کو ان کا بیت سکونت بھی قرار دے دیا جائے تو اس میں اشکال کیا ہے اور کیوں۔ ادھر ترجمان السنہ ص ۱۱۱ میں آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بحق حضرت علیؑ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ تمہاری اور میری وہ نسبت ہے جو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کے مابین تھی۔ اس نسبت کی حقیقت صرف اسی پر ختم نہیں ہو گئی کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں حضرت ہارون علیہ السلام نے جانشینی کے فرائض انجام دیئے تھے اسی طرح حضرت علیؑ نے ایک جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کی جانشینی کی خدمت انجام دی تھی بلکہ اس کا اثر یہاں تک بھی پھیلا کہ ایک روز مرید خصوصیت جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاصل تھی وہ بھی ان کو نصیب ہو گئی اور اس بناء پر ان کے استثناء میں ایک بڑی حقیقت پنہاں منکشف ہو گئی۔ سبحان اللہ! انبیاء علیہم السلام کے دہن مبارک سے جو تشبیہات بھی نکلتی ہیں وہ حقیقت سے کتنی لبریز ہوتی ہیں۔

یہ واضح رہے کہ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ایک جزئی واقعہ پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دشمنی کی تسلی کے لیے ارشاد ہوا ہے مگر یہاں بھی آپؐ نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ اس نسبت سے نبوت کا کوئی تعلق نہیں یہ منصب میرے بعد ختم ہو چکا ہے اس لیے نبی نہ تم ہونہ کوئی اور اس کے بعد بھی اگر دنیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پھر کسی کو نبی بنالے تو شقاوت ازلیہ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ نیز حضرت ہارون علیہ السلام چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے لہذا اس حدیث کو مسئلہ خلافت سے بھی کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف ایک خاص موقعہ پر ایک ایسی نیابت تھی جس میں دوسرے مواقع پر آپؐ کے دوسرے صحابہ کو بھی شرکت کا شرف کسی حد تک حاصل ہو چکا ہے لہذا اس حدیث کو آپؐ کے بعد خلافت کے مسئلہ میں کھینچنا غلط ہے۔

و من خواص اهل الجنة كثرة

کثرت ازواج میں انبیاء علیہم السلام کو اہل جنت سے

الازواج

مشابہت

(۱۰۸۸) عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ

(۱۰۸۸)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی

(۱۰۸۸) \* شریعت میں عام طور پر ایک مرد کو چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مرد میں یقیناً اتنی طاقت بھی ضرورت و دلیعت فرمائی گئی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا معاملہ جسمانی اور روحانی طاقتوں میں عوام سے کہیں اونچا ہوتا ہے اگر ان کی جسمانی طاقتیں بھی ان کے منصب کے بقدر زیادہ نہ ہوں تو ان کو امت کی جفا کاریوں پر صبر اور دوسری طرف باروجی کا تحمل کرنا ناممکن ہو جائے اس لیے حکمت ایزدی نے ان کی جسمانی قوتیں بھی عام انسانوں سے کہیں زیادہ قوی بنائی ہیں اسی لیے نکاح میں بھی ان کے لیے عوام سے زیادہ وسعت دی گئی ہے۔ لیکن اس کمال طاقت و قوت کے باوجود انبیاء علیہم السلام کی ساری طاقتیں صرف تبلیغ دین اور خدا تعالیٰ کی راہ میں مصائب و آلام کے جھیلنے میں ہی صرف ہو گئی ہیں۔ سیرت پڑھنے والے حضرات خوب جانتے ہیں کہ ان کی طاقت و قوت کی یہ بہتات کسی ایک ہی جانب میں نہ تھی بلکہ غزوہ خندق میں جب ایک موقع پر ایک سخت پتھر کسی کی کدال سے ٹوٹ نہ سکا تو اس وقت جس کی کدال نے اس کو ریزہ ریزہ کر ڈالا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی قوت بازو کا کرشمہ تھا۔ یہ آپ کی طبعی طاقت تھی یا معجزہ تھا مگر اس کا تعلق تھا تو آپ کی قوت جسمانی ہی کے ساتھ۔ رکنا جیسے مشہور پہلوان سے کشتی لڑی اور اس کو تین بار زیر کیا یہ کرشمہ بھی آپ کی قوت جسمانی کا تھا (کما فی الخصائص) ایک مرتبہ جب صحابہ کرام نے اپنی بھوک کی بے تابی اپنے پیٹوں سے پتھر بندھے ہوئے دکھا کر ظاہر کی تو اس وقت معلوم ہوا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے پیٹ سے دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر سوار یوں کی قلت کی وجہ سے ایک ایک سواری دو دو شخصوں میں تقسیم کی گئی ہر شخص کچھ دور پیادہ پا چلتا اور پھر اس لیے آپ کے حصہ میں بھی ایک مشترک سواری آئی۔ آپ کے جاں نثار شریک نے ہزار سر پٹکا کہ آپ سوار رہیں اور وہ آپ کے عوض بھی پیادہ پا چل لے گا لیکن اس کے جواب میں اس خلق عظیم والے رسول کا جواب یہ تھا ”ما انت بالتحوی منی و ما اما باغنی عن الاجر منك“ (اَوْ كَمَا قَالَ) تو مجھ سے زیادہ قوی نہیں اور میں تجھ سے زیادہ ثواب آخرت سے بے نیاز نہیں یعنی اس کی ضرورت مجھ کو بھی ہے۔ یہاں آپ کے پہلے جملوں پر غور کیجئے۔

در اصل بات یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک شعبہ صحابہ کرام کے سامنے آتا تھا اور کیونکر نہ آتا جس کی ذات کو مجسم ”اسوہ حسنہ“ اور نمونہ بنا کر بھیجا گیا تھا ضرور تھا کہ اس کی زندگی کا ہر گوشہ اندرونی بھی اور بیرونی بھی سب کا سب سامنے آ جاتا اس لیے حسب الاتفاق یہ ایک واقعہ بھی معمول کے مطابق ضمنی طور پر ذکر میں آ گیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر چونکہ اب ایک مدت کے لیے احرام و حج کے مشاغل درپیش تھے اس لیے آپ نے مناسب سمجھا کہ ایک بار جملہ ازواج کے یہاں شب باش ہو جائیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری عمر کی سنت ہمیشہ شب باشی میں تقسیم ہی رہی ہے پس چونکہ یہ ایک ہی واقعہ تھا جو آپ کے عام طریق کے خلاف پیش آیا تھا اس لیے صحابہ کرام کے مابین اس کا تذکرہ بھی آ گیا اور اس ضمن میں آپ کی جسمانی طاقت کا تذکرہ بھی ہو گیا ورنہ احادیث کے دفتر آپ کے سامنے کھلے پڑے ہیں جس میں ہر رطب و یابس بھی جمع کر دیا گیا ہے آپ اس پر ایک بار گزر جائیے اور پوری تنقید کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے کہ کیا اس رسول عظیم کی جسمانی طاقتیں صرف جہاد مصائب و آلام کے تحمل اور تبلیغ دین میں دشمنوں کی جفا میں سہنے کے سوا کسی اور جانب کبھی صرف ہوئی ہیں۔ آپ کی سب سے مقرب بی بی حضرت عائشہ کو امی نوبت للہ.....



عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدُورُ عَلَى نِسَائِهِ فِي السَّاعَةِ  
الْوَحْدَةِ مِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُنَّ إِحْدَى  
عَشْرَةَ قُلْتُ لَأَنْسِ أَوْ كَانَ يُطِيقُهُ قَالَ كُنَّا  
نُحَدِّثُ أَنَّهُ أُعْطِيَ قُوَّةَ ثَلَاثِينَ. (اخرجه  
البخاری و من طریق عبادة كذا في الخصائص)

اللہ علیہ وسلم نے شب و روز میں کبھی بیک وقت بھی سب بیبیوں کے ساتھ  
شب باشی کی ہے حالانکہ آپ کی گیارہ بیبیاں تھیں۔ میں نے انس رضی اللہ  
تعالیٰ عنہ سے پوچھا کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی طاقت تھی۔ انہوں نے  
جواب دیا ہمارے درمیان تو یہاں تک تذکرہ ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ  
وسلم کو میں مردوں کے برابر طاقت دی گئی تھی۔ (بخاری شریف)

..... بھی آئی ہے کہ وہ آپ کو بستر پر نہ دیکھ کر جوش غیرت میں آپ کی تلاش کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہیں لیکن جب دیکھا کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے سامنے سر بسجود پڑے ہیں تو متحیر ہو کر بول انھیں یا رسول اللہ میں کس خیال میں تھی اور آپ کس جہاں میں  
ہیں۔ اس عمر بھر میں ایک واقعہ پر نظر کرنے والے تریسٹھ سال کی اس زندگی سے کیسے چشم پوشی کر لیتے ہیں جس میں آپ کی عبادت و زہادت  
صحراؤں اور غاروں میں طویل طویل مدتوں کی اقامت اور ساری عمر روزہ کی وہ کثرت جس کا مادی عقول کو تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ سب  
اس کثرت اور تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ معتدل مزاج دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں اگر محض اپنی ہوس رانی کے مذاق کی بناء پر صحیح  
احادیث کا انکار کر دینا معیار تحقیق ہے تو بس دین کا اللہ تعالیٰ ہی حافظ و محافظ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس صحیح حدیث پر تنقید کرنے والے کیا  
دشمنوں کو طرح آپ کے تعداد از دواج پر بھی اعتراض کر دیں گے یا اس واقعہ کا بھی انکار کر جائیں گے۔ خوب یاد رکھو کہ اگر اپنی ذہنیت صاف  
ہے تو نہ اس ایک واقعہ میں کوئی اشکال ہے اور نہ ان جیسے دوسرے واقعات میں ہی وجہ ہے کہ یہی واقعات صحابہ کرام کے مابین بھی تذکرہ میں  
آئے اور ان کے قلوب مطہر میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی ادنیٰ شبہ نہیں گذرا اور یہی واقعات جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو اگرچہ ان کی  
اسانید کتنی بھی صحیح ہوں مگر ہماری ذہنی ظلمت و کثافت ان کو جس نظریہ سے دیکھتی ہے پھر وہ اس کو انکار یا تاویل کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جیسا آپ پڑھ چکے ہیں انبیاء علیہم السلام کے جسم دنیا میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں آخرت میں پہنچ کر  
ان کے مراتب کے مناسب ان میں بھی اسی طرح اور اضافہ ہو جائے گا جیسا کہ عوام امت کے لیے اپنے اپنے اعمال کے مطابق ان میں  
اضافہ ہوگا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام اہل جنت کی طرح کون و فساد سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان کے فضلات اہل جنت  
کی طرح معطر ہوتے ہیں۔ ان کا سونا اہل جنت کی طرح غفلت کی نیند نہیں ہوتا اسی طرح ان کی دوسری طاقتیں بھی اس جہان میں اہل جنت  
کی طرح ہوتی ہیں اگر طبیعت میں گنجائش ہو تو تعداد از دواج کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھ لیجئے۔ پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ حسب  
بیان قرآن کریم امت کے حق میں چار بیبیوں کی قید اس لیے ہے کہ ان سے ان کے حقوق کی ادائیگی بھی مشکل ہے جہاں حق تلفی کا کوئی احتمال  
نہیں وہاں اس تحدید کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ان کی حیات طیبہ اہل جنت کی حیات کا ایک نمونہ ہوتی ہے وہ اسی حیات  
میں اپنے رب سے ہم کلام ہوتے ہیں خدا تعالیٰ کے مقدس فرشتے ان کی مجلسوں میں آتے جاتے ہیں۔ جنت و دوزخ کا ان کو مشاہدہ حاصل  
ہوتا ہے اور کسی کو تو دیدار الہی جیسی عظیم الشان نعمت سے بھی نوازا دیا جاتا ہے تو کیا اب بھی اس پاک باز ہستی کے متعلق اس ایک واقعہ میں آپ  
کو کوئی شبہ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ یہ بیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے خود نہیں ہے بلکہ آپ کے ایک واقعہ پر  
صرف صحابہ کرام کا باہم تذکرہ ہے گو وہ کتنی ہی حقیقت پر مبنی ہو لیکن پھر آپ کے اپنے بیان اور صحابہ کے باہم تذکروں میں مسئلہ کی اہمیت اور  
غیر اہمیت کا بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ اب یہ نکتہ چینی ان پر کیجئے کہ انہوں نے آپ کے متعلق ایسا خیال کیوں قائم کر لیا۔ اگر یہاں عرب لکھ.....

(۱۰۸۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سُلَيْمَانُ لَا طُوفَنَّ اللَّيْلَةَ عَلَى تِسْعِينَ امْرَأَةً وَفِي رِوَايَةٍ بِمِائَةٍ (۱۰۸۹) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا آج کی شب میں اپنی حرم سرائے میں نوے اور ایک روایت میں سو بیبیوں کے پاس جاؤں گا اور

لہ ..... کے اس عام ماحول کا بھی لحاظ کر لیا جاتا جو اس وقت کی عام تاریخوں سے ثابت ہے تو جبر و مقابلہ کے بے وجہ حسابات جو یہاں شروع کر دیئے گئے ہیں وہ شروع نہ کیے جاتے۔ اسی کے ساتھ جس بشر کا تعلق تمام امت کے ساتھ ہو اس کے لیے نسوانی احکام کی تعلیم و تفہیم کے لیے ازواج کی کثرت کتنی اہم ہوگی یہ سوال بھی قابل غور ضرور ہے۔

تنبیہ: یہ یاد رہے کہ صرف قواعد پر چلنے والے یہاں لفظ ”کان“ میں ضرور کچھ الجھیں گے مگر حقیقت شناس اور واقعات پر نظر رکھنے والے کسی راوی کے ایک لفظ سے تاریخ کے اوراق پر کبھی پانی نہیں پھیر سکتے۔

(۱۰۸۹) \* سہو نسیان کے واقعات خال خال انبیاء علیہم السلام کے زندگیوں میں بھی نظر آتے ہیں اور یہ بڑی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں ان میں صرف ان محیر العقول ہستیوں کی بشریت کی طرف اشارہ ہی نہیں ہوتا بلکہ انبیاء علیہم السلام کے مقام کی بلندی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ گویا یہ ہستیاں وہ ہیں جن کا سہو نسیان بھی دوسرے انسانوں کی ارادی خطاؤں کی طرح قابل گرفت ہوتا ہے اب یہ اندازہ فرمالیجئے کہ انبیاء علیہم السلام بشر ہی نہیں ہوتے یا ایسے کامل بشر ہوتے ہیں جن سے مواخذہ کے شرائط عام انسانوں سے کہیں شدید تر ہیں۔ جب اس واقعہ کو سامنے رکھ کر آپ یہ آیت پڑھیں گے تو اس کی پوری تفصیل آپ پر کھل جائے گی:

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَلِكَ غَدًا  
إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ. (الكهف: ۲۳-۲۴)

اور ہرگز ہرگز کسی کام پر یوں نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا۔ مگر ساتھ ہی انشاء اللہ کہہ لینا۔

سرسری نظر میں آیت بالا کو آپ صرف ایک علمی اصلاح اور عقیدہ کا مسئلہ سمجھتے ہوں گے اب آپ کو اس واقعہ کی روشنی میں اس کی اہمیت کا عملاً بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے واقعات کے دوہرانے سے قرآن کریم کا مقصد کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک نقصانات کے باریک سے باریک پہلو ایک ایک کر کے سامنے نہ آ جائیں کسی کمال کی معراج حاصل ہونا ممکن نہیں۔ لیکن ان باریکیوں کا میدان عام انسانوں کی زندگی بنائی نہیں جاسکتی۔ اس لیے تقدیر نے کچھ ہستیاں اتنی بلند پیدا فرمائی ہیں جن کی درخشاں زندگی میں سہو نسیان کے اثرات کا نمایاں ہونا بھی ان کے رتبہ سے بعید ہوتا ہے اس لیے پھر اس پر ان سے مواخذہ فرمانا بھی بالکل موزوں نظر آتا ہے۔ جس امت کو خیر امت بنانا منظور تھا اس کے سامنے یہ تمام سرد و گرم سرگزشتیں اس لیے رکھ دی گئی ہیں کہ ان کے معراج کمال تک پہنچنے کے اسباق ہی ہیں۔ یہ واقعہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات میں ایک ہی واقعہ ہے اور جب ان کو شاہی بھی وہ شاہی عطا ہوئی تھی جو رہتی دنیا تک کسی کو نصیب نہ ہو سکے یعنی جن و ملک حتیٰ کہ ہوا پر بھی ان کی قاہرانہ حکومت قائم تھی۔ تو اس شان و شکوہ کے ساتھ کثرت ازواج جو اس دور میں ظاہری ملوکیت کے لیے لازم تھی اگر مرحمت فرمادی گئی تو اس پر اعتراض کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس ایک واقعہ میں ان کی تمنا کیا تھی وہ خود حدیث میں موجود ہے۔ پھر اس پاکیزہ مقصد میں ذرا سے نسیان کا نتیجہ کیا نکلا وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ فرشتہ کی یاد دہانی کے باوجود پھر نسیان ہونا اس کی دلیل ہے کہ جو بات تقدیر میں طے ہو جاتی ہے وہ اپنے اسباب کے ساتھ طے ہوتی ہے پس جس طرح ان کا ظہور قطعی اور یقینی ہوتا ہے اسی طرح ان اسباب کا پیش آنا بھی قطعی و ضروری ہوتا ہے۔ لہ .....



۱۰..... کثرت و ازدواج کے متعلق ایک بدیہی مگر اہم تنبیہ: جن اعداد اسلام کی نظروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج کی کثرت باعث اعتراض بنی ہوئی ہے ان کی نظریں کبھی اس طرف نہیں گئیں کہ ازدواج کی کثرت کن حالات میں سامان عیش و عشرت ہو سکتی ہے۔ آج اور آج سے پہلے دنیا کی تاریخ پر نظر ڈال لیجئے آپ کو معلوم ہوگا کہ جس طبقہ کا نصب العین تعیش بن گیا ہے پھر اس کا ماحول کیا تھا، نیز اس کے اثرات اس کی زندگی اس کے ہم جنسوں اس کی محکوم رعایا بلکہ بعد کے دور تک بھی کتنی کتنی دور تک پھیل گئے ہیں۔ اس جگہ ہمیں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن بتانا صرف یہ ہے کہ صورت حال یہاں کیا تھی۔ یہاں اگر گھر کا جائزہ لیجئے تو اس کی بے سرو سامانی کا نقشہ دیکھ کر عمر جیسے مخلص کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آتے ہیں آخر جب ان سے رہا نہ گیا تو یہ درخواست کر ہی بیٹھے یا رسول اللہ دعاء فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت پر وسعت فرمادے یہ ہمت تو کہاں تھی کہ خود آپ ہی کے متعلق یہ درخواست کرتے کیونکہ جب نظر اٹھا کے دیکھا کہ ایک خشک چٹائی جو آپ کے جسم نازک میں گھسی جا رہی تھی آپ کا بچھونا تھی اور ایک آدھا خشک مشکیزہ لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا یہ پانی کا سامان تھا اور بس۔ کھانے کے تکلفات کا ذکر ہی کیا ہے، مہینوں گھر میں آگ جلنے کی نوبت نہ آتی، لباس کی یہ حالت کہ عائشہؓ نے آپ کی وفات کے بعد وہ پیوند لگی ہوئی موٹی چادریں نکال کر دکھائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ان کپڑوں میں ہوئی ہے۔ گھرا تناسادہ کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے نقشین چادر آپ کی زینت کے خیال سے لے کر لٹکا دی تو آپ گھر میں داخل نہ ہوئے جب تک کہ اس کو پھاڑ کر اس کے تکیے نہ بنادے گئے کہ زمین پر پڑے رہیں۔ بیسیوں کے درمیان وہ انصاف کہ مجال کیا کسی کا دل ذرا میلا ہو جائے۔ شب باشی میں تقسیم آپ پر واجب نہ تھی مگر پھر اس کی اتنی رعایت کہ ہر ہر بی بی کے ہاں رہنے کا دن مقرر حتیٰ کہ سفر بھی قرعہ اندازی کے بعد ہوتا۔ پھر جب آپ کے شب کے حالات کے کھوج لگائیے تو خود حضرت عائشہؓ کا بیان یہ ہے کہ ایک شب اپنی باری میں جب میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ دیکھا تو طرح طرح کے وہموں نے مجھ کو گھیر لیا جب تلاش میں نکلی تو آپ کو سر بسجود دعاء میں مشغول دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئی۔ آپ کی صلوٰۃ لیل اور صیام کی بہت سی حدیثوں کا ذخیرہ ان ہی امہات المؤمنین کے ذریعہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ اگر آپ کے ہم جنسوں کا حال دیکھنا ہو تو جس جماعت میں آپ مبعوث ہوئے تھے تو ان کا تعیش ضرب المثل تھا اور جب وہ کچھ مدت آپ کی صحبت سے مستفیض ہو چکے تو ان کا زہد ضرب المثل تھا۔ پھر کون نہیں جانتا کہ جہاد کی زندگی تعیش کی زندگی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ پھر جہاں ہمہ وقت جہاد سامنے ہو وہاں تعیش کا تصور کیسے آ سکتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ اس لیے نہیں تھا کہ سامان تعیش جمع نہ ہو سکتے تھے۔ نہیں نہیں فتوحات پر فتوحات ہو چکی تھیں، لیکن جو کچھ ہاتھ آتا وہ سب غرباء و مساکین اور دوسرے مسلمانوں پر تقسیم کے لیے تھا، اپنے گھر میں جمع کرنے کے لیے ۱۱.....

بَعْضُ الْأَسْرَارِ فِي النِّكَاحِ النَّبِيِّ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں قدرت کے بعض  
تکوینی اسرار

(۱۰۹۰) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ الْأَسْوَدِ عَنْ

أَبِيهِ قَالَ قَالَتْ عَائِشَةُ مَا تَزَوَّجَنِي رَسُولُ

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى آتَاهُ جِبْرِيلُ

بِصُورَتِي وَقَالَ هَذِهِ زَوْجَتُكَ وَتَزَوَّجَنِي وَ

أَنْتِ لَجَارِيَةٌ عَلَى حَرْفٍ فَلَمَّا تَزَوَّجَنِي أَلْقَى

اللَّهُ عَلَى حَيَاءٍ وَأَنَا صَغِيرَةٌ. (رواه الحاكم

فِي الْمُسْتَدْرَكِ وَصَحَّحَهُ الذَّهَبِيُّ)

(۱۰۹۰) عبد الرحمن بن الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت

عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجھ سے نکاح فرمانے

سے قبل ہی حضرت جبریلؑ نے میری صورت لا کر آپ کو دکھادی تھی اور فرمایا

تھایہ آپ کی بی بی ہیں۔ مجھ سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا

ہے تو اس وقت میں بالکل لڑکی تھی۔ پھر جب آپ نے عقد فرمالیا تو نوعمری

میں ہی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر حیا و شرم غالب فرمادی تھی۔

(مستدرک)

(۱۰۹۱) قَالَ قَالَتْ جُوَيْرِيَّةُ بِنْتُ الْحَارِثِ

(۱۰۹۱) حضرت جویریہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

..... کچھ نہ تھا۔ اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ عسرت در عسرت میں کثرت ازواج امتحان و ابتلاء کی منزل تھی یا سامان تقیش آج بھی اگر عسرت میں اولاد کی کثرت شروع ہو جاتی ہے تو ان لخت ہائے جگر کے لیے بھی زیادتی کے بجائے انسان موت کی تمنا کرنے لگتا ہے پس اعتراض کرنے والے صرف ایک ہی پہلو کو دیکھتے ہیں کاش اگر آپ کی پوری زندگی سامنے رکھ لیں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ نبی کے مجاہدات میں سے ایک بڑا مجاہدہ کثرت ازواج بھی تھا۔ عام مسلمانوں کو چار ازواج کی گنجائش دی گئی مگر اس تنبیہ کے ساتھ کہ ان کے درمیان عدل و انصاف پورا پورا کرنا ہوگا۔ اور یہ منزل اتنی کٹھن ہے کہ تم شاید بمشکل ہی اس سے عبور کر سکو گے۔ لیکن جن کو تمام جہان میں عدل و انصاف قائم کرنا کچھ دشوار نہ تھا ان کو چند ازواج کے درمیان انصاف قائم رکھنا کیا مشکل ہوتا۔

(۱۰۹۰) \* جس ذات قدسی صفات کو رسولوں میں بھی منتخب رسول فرمایا گیا تھا جس کا محل ولادت مقام ہجرت، جس کے ہم جلس صحابہ اور جس کے خلفاء بھی پہلے سے سب منتخب ہو چکے تھے یہ کیسے ممکن تھا کہ عالم تقدیر میں اس کی زوجیت کے لیے عورتوں کا انتخاب پہلے نہ ہو چکا ہوتا۔ جب قرآن کریم اپنا عام اعلان یہ کرتا ہے الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَ الطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ تو یہ کیونکر ہوتا کہ سارے جہان میں جو سب سے زیادہ طیب تھے ان کے لیے تمام جہاں سے بڑھ کر طیبات انتخاب نہ کی جاتیں۔ اس لیے قدرت نے آپ کی خاص زوجیت کے لیے نبیوں کے بعد سب سے اشرف انسان یعنی صدیق اکبرؑ کی سب سے اشرف صاحبزادی کو منتخب کیا اور عالم رویا میں یہ راز کھول بھی دیا کہ ہم نے ان کو شروع سے آپ کی زوجیت کے لیے منتخب کر لیا تھا مقصد یہ ہے کہ نکاح انبیاء علیہم السلام بھی کرتے ہیں مگر صرف ان سے کرتے ہیں جو ان کے حق میں پہلے سے منتخب شدہ بیبیاں ہوتی ہیں۔ اگر یہاں صرف صورت اور ظاہری عادات ہی دیکھی جاتیں تو ممکن تھا کہ بعض دوسری عورتیں بھی ان اوصاف میں مشترک مل جاتیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عام صفات کے سواء آپ کی دائمی رفاقت کے لیے اندرونی طور پر کچھ اور خصوصی شرائط بھی ضرور مرعی تھیں۔ سبحان اللہ انبیاء علیہم السلام بھی کیسے کامل بشر ہوئے ہیں۔

(۱۰۹۱) \* حضرت جویریہؓ کا یہ نکاح کتنے کثیر التعداد نفوس کی آزادی کا سبب بنایا اپنی جگہ خود ایک بڑی حکمت ہے لیکن ہمیں تو یہاں .....



رَأَيْتُ قَبْلَ قُدُومِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
بِثَلَاثِ لَيَالٍ كَانَ الْقَمَرُ أَقْبَلَ يَسِيرُ مِنْ  
يُشْرِبَ حَتَّى وَقَعَ فِي حَجْرِي فَكَرِهْتُ أَنْ  
أَخْبِرَ بِهَا أَحَدًا مِنَ النَّاسِ حَتَّى قَدِمَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سَمِعْنَا  
رَجُوتُ الرُّوْيَا فَلَمَّا اعْتَقَنِي وَتَزَوَّجَنِي وَ  
اللَّهُ مَا كَلِمَتُهُ فِي قَوْمِي حَتَّى كَانَ  
الْمُسْلِمُونَ هُمْ لَذِينَ أَرْسَلُوهُمْ وَمَا شَعُرْتُ  
إِلَّا بِجَارِيَةٍ مِنْ بَنَاتِ عَمِّي تُخْبِرُنِي الْخَبَرَ  
فَحَمِدْتُ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ. (رواه الحاكم في  
المستدرک ج ۴ ص ۲۷ و الحاكم في  
الاكلیل كما في العمدة ص ۱۰۲ ج ۵)

(۱۰۹۲) عَنْ زَيْنَبَ أَنَّهَا كَانَتْ عِنْدَ زَيْدِ بْنِ  
حَارِثَةَ فَفَارَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيهَا نَزَلَتْ فَلَمَّا قَضَى

تشریف آوری سے تین شب قبل میں نے خواب میں ایسا دیکھا تھا کہ چاند  
یثرب کی جانب چلتا آ رہا ہے یہاں تک کہ میری گود میں آ گیا ہے۔ میں  
نے کسی شخص کے سامنے اس خواب کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا، یہاں تک  
کہ آپ تشریف لے آئے تو اتفاق ایسا ہوا کہ ہم لوگ قید کر لیے گئے تو مجھے  
اب اپنے خواب کی تعبیر پوری ہونے کی امید ہوئی اس کے بعد جب  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں قبول فرما  
لیا تو بخدا میں نے اپنی قوم کی آزادی کے معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
سے ایک حرف بھی نہیں کہا بلکہ خود مسلمانوں نے ہی (آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے اس رشتہ کی خاطر) ان سب کو رہا کر دیا اور مجھ کو تو اس واقعہ کی خبر بھی  
جب ملی ہے جب کہ میری ایک چچا زاد بہن نے آ کر مجھ کو اس کی اطلاع  
دی۔ میں نے اس احسان پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

(مستدرک)

(۱۰۹۲) حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ وہ حضرت زید  
کے نکاح میں تھیں (ان کے طلاق کے واقعہ کے بعد) آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم نے ان سے عقد فرمایا تھا۔ قرآن کریم کی یہ آیت فَلَمَّا قَضَى

لله ..... یہ بتانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کس طرح پہلے سے عالم تقدیر میں منتخب ہو چکی تھیں یہ بیان کسی غیر کا نہیں  
ہے بلکہ خود ان ہی کا ہے جو آپ کے شرف زوجیت سے مشرف ہوئیں۔ ان کی خودداری دیکھئے کہ وہ اپنی قومی آزادی کا بار بھی اپنی گردن پر  
لینا نہیں چاہتیں اور بڑی صفائی کے ساتھ یہ فرما دیتی ہیں کہ میں نے اس معاملہ میں زمانہ کے عام دستور کے مطابق آپ سے سفارش کا ایک  
کلمہ تک منہ سے نہیں نکالا، لیکن یہ میری قوم کا نصیب تھا اور مسلمانوں کی اولوالعزمی اور اپنے رسول کا احترام کہ انہوں نے اس رشتہ کے بعد  
خود یہ ایثار کیا۔

(۱۰۹۲) \* حضرت زینبؓ کے نکاح پر تو خود قرآن کریم نے روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر بنی کا مسئلہ خود رسول کی زندگی میں اس  
طرح عمل نہ دکھا دیا جاتا تو قلوب میں اس کی طرف سے پوری صفائی کی کوئی شکل ہی نہ تھی ورنہ حضرت زینبؓ وہی تھیں جن کو آپ ہمیشہ سے  
جانتے پہچانتے تھے آپ ہی نے حضرت زیدؓ کے ساتھ ان کا عقد کیا تھا اور جب آپ کو ان کی باہم ناچاقی کا علم ہوا تو آپ نے حضرت زیدؓ کو  
بہت سمجھایا بھی مگر جو امر کہ عالم تقدیر میں طے پا چکا تھا آخر کار اس کے لیے ایسے ہی اسباب بن گئے کہ حضرت زینبؓ آپ کے نکاح میں آ کر  
رہیں۔ پھر تاریخ سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان حضرت زینبؓ کی طرف کچھ غیر معمولی تھا، بلکہ  
اس سے قبل جس طرح حضرت عائشہؓ آپ کی خاص مقرب تھیں اسی طرح وہی اس کے بعد بھی مقرب رہیں۔ یہاں دشمنانِ دین کی لٹہ .....

زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوْجَنَا كَمَا قَالَ فَكَانَتْ  
تَفْخَرُ عَلَى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ تَقُولُ زَوْجَنِي اللَّهُ مِنْ رَسُولِهِ وَ  
زَوْجَكُنَّ أَبَاؤُكُمْ وَأَقَارِبُكُمْ.

(رواه الحاكم في المستدرک)

(۱۰۹۳) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ وَقَعْتُ جُورِيَّةَ  
بِنْتِ الْحَارِثِ بْنِ الْمِصْطَلِقِ فِي سَهْمٍ ثَابِتٍ  
بْنِ قَيْسِ بْنِ شِمَاسٍ أَوْ ابْنِ عَمٍّ لَهُ فَكَاتَبْتُ  
عَلَى نَفْسِهَا وَكَانَتْ امْرَأَةً مَلَا حَةً تَأْخُذُهُ  
الْعَيْنُ قَالَتْ عَائِشَةُ فَجَاءَتْ تَسْأَلُ رَسُولَ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي كِتَابَتِهَا فَلَمَّا  
قَامَتْ عَلَى الْبَابِ فَرَأَيْتُهَا كَرِهْتُ مَكَانَهَا وَ  
عَرَفْتُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
سَيَرَى مِنْهَا مِثْلَ الَّذِي رَأَيْتُ فَقَالَتْ يَا

زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا الخ ان ہی کی شان میں نازل ہوئی تھی راوی کہتا ہے کہ  
حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا دوسری بیبیوں کے سامنے بڑے فخر کے  
ساتھ یہ بیان فرمایا کرتی تھیں کہ میرا نکاح تو اپنے رسول کے ساتھ خود اللہ  
تعالیٰ نے پڑھایا ہے اور تمہارا نکاح تمہارے باپ اور دوسرے عزیزوں  
نے پڑھایا ہے۔ (متدرک)

(۱۰۹۳) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت  
جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصہ جنگ  
میں آگئی تھیں اور انہوں نے ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عقد کتابت  
کر لیا تھا یعنی اتنی رقم آپ کو اداء کر کے میں آزاد ہوں۔ یہ بڑی حسین اور  
جاذب نظر تھیں۔ عقد کتابت کی رقم حاصل کرنے کے لیے یہ آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ جب میں نے ان کو دروازہ پر کھڑا  
دیکھا تو ان کا آنا مجھ کو پسند نہ آیا اور میں نے سمجھا کہ جو جاذبیت میں نے  
ان میں دیکھی ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ میں آئے گی۔ بہر  
حال انہوں نے آکر عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا نام جویریہ

للہ ..... بے وجہ رنگ آمیزیاں ان حقائق کی روشنی میں کیا قابل التفات ہو سکتی ہیں۔

حق تعالیٰ کی رحمت و رافت کا یہ نقشہ بھی محو ہونے کے قابل نہیں ہے کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ عقد کرنے کا بار خود رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم پر نہیں ڈالا گیا بلکہ وہ خود ہی اس کا متکفل ہو گیا اور معاملہ کی نزاکت کی ایک بڑی مشکل خود اس نے حل فرمادی۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس اہم تشریع کے لیے بھی یہ صورت اختیار نہیں کی گئی کہ پہلے نکاح کے قائم رہتے ہوئے ان کو آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم زوجیت میں منتقل کر دیا جاتا اور نہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف ان پر اس کا زور ڈالا گیا کہ وہ اپنی زوجہ کو طلاق  
دے دیں بلکہ جب خود بخود واقعات اس قسم کے رونما ہو گئے کہ اب باہم نباہ کی کوئی دوسری صورت ہی باقی نہ رہی اور قانونی طور پر متارکت  
عمل میں آگئی اور قانونی طور پر ہی نکاح کے لیے وجہ جواز پیدا ہو گئی تو خود رب العالمین نے اس عقد کا تکفل فرمایا جس پر حضرت زینب رضی  
اللہ تعالیٰ عنہ عمر بھر فخر کیا کریں۔

اس واقعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی بزرگی اور عظمت شان کا پتہ ملتا ہے جن کی بشری زندگی میں کبھی کبھی  
خالق کائنات براہ راست خود بھی مداخلت فرمادیتا ہے۔ کجایہ بشر اور کجاوہ بشر

(۱۰۹۳) \* حضرت جویریہ اس سے قبل اپنا امہات المؤمنین میں شامل ہونا خواب میں دیکھ چکی تھیں اور حسب بیان خود اس انتظار میں لگ  
رہی تھیں کہ اس کی تعبیر کب پوری ہوتی ہے۔ واقعات سب خلاف جارہے تھے یعنی اسیر ہو چکی تھیں اور پھر ثابت بن قیسؓ کے حصہ للہ .....  
.....



رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا جُوَيْرِيَّةُ  
بِنْتُ الْحَارِثِ وَإِنَّمَا كَانَ مِنْ أَمْرِي مَا لَا  
يَخْفَى عَلَيْكَ وَإِنِّي وَقَعْتُ فِي سَهْمِ ثَابِتِ بْنِ  
قَيْسِ بْنِ شِمَّاسٍ وَإِنِّي كَاتَبْتُ عَلَى نَفْسِي  
فَجِئْتُكَ أَسْأَلُكَ فِي كِتَابَتِي فَقَالَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَلْ لَكَ إِلَى مَا  
هُوَ خَيْرٌ مِنْهُ قَالَتْ وَمَا هُوَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ  
أَوْدَى عَنْكَ كِتَابَتُكَ وَاتَزَوَّجَكَ قَالَتْ  
قَدْ فَعَلْتُ قَالَتْ فَتَسَامِعَ تَعْنِي النَّاسُ أَنَّ رَسُولَ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ تَزَوَّجَ جُوَيْرِيَّةَ  
فَارْسَلُوا مَا فِي أَيْدِيهِمْ مِنَ السَّبْيِ فَأَعْتَقُوهُمْ  
فَقَالُوا أَصْهَارُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فَمَا رَأَيْنَا أَمْرًا كَانَتْ أَعْظَمَ بَرَكَهَةً عَلَى قَوْمِهَا  
مِنْهَا أُعْتِقَ فِي سَبْيِهَا مِائَةُ أَهْلِ بَيْتٍ مِنْ بَنِي  
الْمُصْطَلِقِ . (رواه ابو داؤد في باب بيع  
المكاتب اذا فسخت الكتابة قال ابن كثير في

تاريخه تفرده ابو داؤد)

(۱۰۹۴) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ سَوْدَةُ بِنْتُ  
زَمْعَةَ عِنْدَ السَّكْرَانِ بْنِ عَمْرِو أَخِي سُهَيْلٍ

ہے اور میں حارث کی دختر ہوں، میری جو سرگزشت ہے وہ سب آپ صلی  
اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہے کہ قیدی ہو کر ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے  
حصہ میں آ گئی ہوں میں نے ان کے ساتھ اپنی آزادی کی غرض سے  
کتابت کا عقد کر لیا ہے اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زر  
کتابت کی درخواست لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا اچھا اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے سامنے اس سے ایک اور بہتر بات  
رکھتا ہوں۔ وہ بولیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا؟ آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا زر کتابت تو میں اپنی جانب سے اداء کر دوں اور  
تم سے نکاح کر لوں۔ انہوں نے فوراً کہا مجھے بخوشی منظور ہے۔ یہ فرماتی  
ہیں لوگوں نے جیسے ہی یہ خبر سنی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہ  
رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کر لیا ہے اسی وقت ان کی قوم کے جتنے قیدی  
تھے سب نے آزاد کر ڈالے اور کہا یہ تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
سسرال کا خاندان ہو گیا۔ صحابہ کا بیان ہے کہ ہم نے کوئی عورت جو اپنے  
خاندان بھر کے لیے حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ باعث  
برکت ہو نہیں دیکھی۔ ان کی وجہ سے قبیلہ بنو مصطلق کے سو گھر آزاد ہو  
گئے۔

(ابوداؤد)

(۱۰۹۴) ابْنِ عَبَّاسٍ رَوَايَتُ كَرْتِي هِي كِي هَضْرَتِ سَوْدَةُ پهلے سكران بن عمرو  
كے نكاح ميں تھیں جو سھیل بن عمرو كے بھائی تھے یہ خواب ميں كيا ديكھتی ہیں

اللہ..... میں آ کر بظاہر اس مقام عالی تک رسائی کی اب کوئی امید نہ رہی تھی مگر جس قدرت نے حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان سے  
نکال کر تاج شاہی بخشا تھا اس کو اپنی قدرت کا نمونہ یہاں پھر دکھانا تھا یعنی عقد کتابت ایک بہانہ بن گیا اور اس طرح تقدیر کشاں کشاں ان کو  
درمقصود پر خود لے آئی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا معاملہ بھی ان کے معاملہ سے بہت ہی ملتا جلتا ہے اور ابھی آپ کے سامنے آنے  
والا ہے۔ رہا ان کے حسن و جمال کا معاملہ تو وہ جب ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظروں میں قابل اعتناء نہ تھا حتیٰ کہ انہوں نے عقد  
کتابت منظور فرمایا تو بھلا خاتم الانبیاء علیہ السلام کی نظروں میں بھلا کیا قابل التفات ہوتا۔ یوں کہیے کہ اس کا تذکرہ صرف ایک شدنی بات  
کے لیے پیرایہ بیان بن گیا تھا۔ اس سے زیادہ تفصیل حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کی تشریحی نوٹ میں عن قریب آپ کے  
ملاحظہ سے گزرے گی۔

بْنِ عَمْرٍو فَرَأَتْ فِي الْمَنَامِ كَأَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقْبَلَ يَمْشِي حَتَّى وَطِئَ  
عَلَى عُقْهَا فَأَخْبَرَتْ زَوْجَهَا بِذَلِكَ فَقَالَ  
لِئِنْ صَدَقْتَ رُؤْيَاكَ لَا مُوتَنَ وَلَا تَزَوَّ  
جَنَّاكَ مُحَمَّدٌ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ثُمَّ  
رَأَتْ فِي الْمَنَامِ لَيْلَةً أُخْرَى أَنَّ قَمَرًا انْقَضَ  
عَلَيْهَا مِنَ السَّمَاءِ وَهِيَ مُضْطَجِعَةٌ فَأَخْبَرَتْ  
زَوْجَهَا فَقَالَ لِئِنْ صَدَقْتَ رُؤْيَاكَ لَمْ أَلْبُثْ  
إِلَّا يَسِيرًا حَتَّى أَمُوتَ وَتَزَوَّجِينَ مِنْ بَعْدِي  
فَاشْتَكَى السَّكْرَانَ مِنْ يَوْمِهِ ذَلِكَ فَلَمْ  
يَلْبُثْ إِلَّا قَلِيلًا حَتَّى مَاتَ وَتَزَوَّجَهَا رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سامنے سے تشریف لارہے ہیں۔ یہاں تک  
کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ دیا ہے۔ یہ  
خواب انہوں نے اپنے شوہر سے نقل کیا اس نے یہ تعبیر دی کہ اگر تیرا خواب  
سچا ہے تو میں عن قریب مرنے والا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تجھ کو  
اپنی زوجیت میں قبول فرمائیں گے۔ دوسری شب پھر کیا دیکھتی ہیں کہ وہ لیٹی  
ہوئی ہیں تو آسمان سے چاند ٹوٹ کر ان پر آ پڑا ہے۔ اس خواب کو بھی انہوں  
نے اپنے شوہر سے ذکر کیا تو اس کی بھی اس نے یہی تعبیر دی کہ اگر تیرا  
خواب سچا ہے تو میں اب بہت کم زندہ رہوں گا اور مر جاؤں گا اور تم میرے  
بعد نکاح کر لو گی پھر ایسا ہوا کہ اسی دن سکران بیمار پڑا اور کچھ مدت نہ گزری  
تھی کہ اس کی وفات ہو گئی اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے  
ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرمایا۔

(خصائص الکبریٰ)

(کذا فی الخصائص ج ۱ ص ۱۸۱ عن ابن سعد کذا فی العمدة ص ۶۰۳ ج ۵)

(۱۰۹۵) عَنْ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ كَانَ بَعِثَنِي  
صَفِيَّةُ خُضْرَةَ فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ مَا هَذِهِ الْخُضْرَةُ بِعَيْنَيْكَ قَالَتْ قُلْتُ  
لِزَوْجِي إِنِّي رَأَيْتُ فِيمَا يَرَى النَّائِمُ كَأَنَّ

(۱۰۹۵) ابن عمر روایت فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ کی آنکھ پر کچھ نیلا سا  
نشان تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تمہاری آنکھوں پر یہ  
سبز نشان کیسا ہے؟ انہوں نے کہا میں نے اپنے شوہر سے ایک بار کہا کہ جیسا  
لوگ خواب دیکھا کرتے ہیں میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے گویا چاند

(۱۰۹۵) \* والد اور شوہر کے قتل کی تلخی کا احساس ہر ذی حس طبیعت کو طبعی اور غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے۔ حضرت صفیہؓ نے کس صفائی کے  
ساتھ کہہ دیا کہ اس سے میں بھی خالی نہ تھی لیکن جب ایمان کی حقیقی حلاوت دل کی تہ میں اتر جاتی ہے تو طبعی تلخی کا اثر بھی سب کا فور ہو جاتا  
ہے۔ حضرت صفیہؓ بھی کتنی بانصیب تھیں بھلا یہ کون تصور کر سکتا تھا کہ ایک یہودی سردار کی بی بی کل امہات المؤمنین کے زمرہ میں شامل  
ہونے والی ہیں۔ مگر چونکہ وہ عالم تقدیر کی نظر انتخاب میں آ چکی تھیں لہذا کچھ دن قبل یہ راز سب سے پہلے خود ان ہی پر افشاء کر دیا گیا۔ یہاں  
دیکھنا یہ بھی ہے کہ اس کا شوہر یہودی ہے مگر وہ اس خواب کو سنتے ہی کس طرح یہ تعبیر دے دیتا ہے کہ اس چاند کا مصداق عالم میں بجز  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی بشر ہو نہیں سکتا۔ یہ بات بہت زیادہ قابل لحاظ ہے کہ آپؐ کی ازواج میں اس قسم کی پیماں ہونے کے  
باوجود جن کے باپ اور شوہر آپؐ کے حکم سے مقتول ہوئے ہوں تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپؐ کی پاکیزگی اور برتری کے خلاف  
مدت العمر کبھی ان کے منہ سے ایک کلمہ بھی نکلا تھا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا کتنا بدیہی ثبوت ہے۔ عجب نہیں کہ اس قسم کے نکاحوں  
میں قدرت کا یہ بھی ایک راز ہو۔



قَمَرًا وَقَعَ فِي حَجْرِي فَلَطَمَنِي وَقَالَ  
أَتُرِيدِينَ مَلِكًا يَشْرَبُ قَالَتْ وَمَا كَانَ  
أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ قَتَلَ أَبِي وَزَوْجِي فَمَا زَالَ يَعْتَذِرُ إِلَيَّ  
وَقَالَ يَا صَفِيَّةُ إِنَّ إِبَاكَ أَلْبَ عَلَى الْعَرَبِ وَ  
فَعَلَ مَا فَعَلَ حَتَّى ذَهَبَ ذَلِكَ مِنْ نَفْسِي.

(رواہ الطبرانی و رجالہ رجال الصحیح کذا

فی المجمع ص ۲۵۱ ج ۹)

(۱۰۹۶) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ  
تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَدِمْنَا خَيْبَرَ فَلَمَّا فَتَحَ اللَّهُ

میری گود میں آ گیا ہے۔ یہ سنتے ہی فوراً انہوں نے میرے منہ پر ایک تھپڑ  
مارا اور کہا کیا تیرا ارادہ اس شاہ یثرب سے نکاح کرنے کا ہے۔ وہ کہتی ہیں  
(بھلا میرا یہ ارادہ کیسے ہو سکتا تھا) میرے والد اور میرے شوہر آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتل کیے گئے تھے اس لیے مجھے تو آپ کی طرف  
سے اس کی سخت ناگواری تھی لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو یہ  
سمجھایا کہ تمہارے والد ہی تمام عرب کو میرے مقابلہ کے لیے چڑھا کر لائے  
تھے اور میرے ساتھ یہ یہ عداوتیں کی تھیں تو پھر میرے دل سے یہ بات نکل  
گئی۔ (الطبرانی)

(۱۰۹۶) انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم خیبر میں داخل ہوئے اور جب اللہ  
تعالیٰ نے خیبر کا قلعہ فتح کر دیا (اور حسب ضابطہ دشمنوں کی اسارت اور قید کا

(۱۰۹۶) \* حضرت صفیہ کا یہ دوسرا نکاح تھا اور اب تیسری بار تقدیر الہی ان کو آپؐ کی زوجیت میں لانے والی تھی اس لیے ایک خواب  
کے ذریعہ پہلے ہی خود حضرت صفیہ کو اس کی بشارت دے دی گئی تھی۔ اب ذرا دیکھئے تقدیر کیا ہے اور واقعات کتنے خلاف ہیں یعنی وہ خود  
یہودی ہیں اور ایک یہودی کے نکاح میں بھی پھر قلعہ خیبر سر ہو جانے کے بعد دجیہ کی درخواست پر ان کے نامزد بھی ہو چکی ہیں، لیکن اچانک  
تقدیر غالب آتی ہے اور واقعات کا رخ کتنی دور جا کر پھر کدھر بدلتا ہے۔ کسی کے منہ پر ان کے حسن کا تذکرہ آتا ہے اور کسی کی زبان پر ان کی  
سرداری کا ذکر آ جاتا ہے اور خود صحابہ کی جانب سے یہ مشورہ پیش ہو جاتا ہے کہ ان حالات میں مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر آپؐ ان کو بحق  
نبوت قبول فرمائیں تو پھر یہ سارے خیالات دلوں سے یکسر نکل سکتے ہیں۔ عرب میں باندیوں کا عام دستور تھا اس سے قبل اور اس کے بعد  
ہمیشہ ہر قسم کی باندیاں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں، جن میں حسین سے حسین بھی تھیں اور شریف سے شریف بھی مگر کبھی کسی کے دل میں یہ  
وسوسہ بھی نہ گذرا کہ فلاں باندی کو صرف آپؐ ہی کی ملک ہونا چاہیے مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوا بھی اور پھر وہیں ختم ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ آپؐ  
کے روبرو بھی اس کا تذکرہ آ گیا۔ اس کے بعد بھی قیاس یہی کہہ سکتا تھا کہ اب یہ بجائے دجیہ کے آپؐ کی باندی رہیں گی لیکن تقدیر میں طے  
شدہ یہ تھا کہ ان کو ام المؤمنین بنانا ہے اس لیے آپؐ نے اس معاملہ کو قبول بھی کیا اور پھر ان کو آزاد کر کے ان سے عقد فرمایا اور اس طرح  
حضرت صفیہ کا خواب پورا تو ہوا مگر ہوا اسباب کے پردہ میں۔ اس واقعہ کی اس وقت کچھ بھی اہمیت نہ ہوئی اور ان کا ولیمہ بھی جس انداز کا  
ولیمہ بحالت مضر ہو سکتا تھا ہو گیا اور ان کے سردار ہو کر دجیہ کی ملک میں آنے کی جو ناموزونیت کا خیال پیدا ہو کر کسی اختلاف کا موجب بن سکتا  
تھا اس طرح وہ بھی سب ختم ہو گیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر نکاح میں خدا جانے کیا کیا اسرار ربانی ہوں گے جو ہم کو  
معلوم نہیں ہو سکے اگر اتفاق سے کسی روایت کی بدولت ان کے رخ سے کہیں ذرا سانچا اٹھ گیا ہے تو اس کی ذرا سی چمک بھی نظر آ گئی  
ہے۔ ابوداؤد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بدلہ دجیہ کو آپؐ نے اپنی جانب سے سات راسیں عطا فرمائی تھیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت خضر کی پوری پوری سرگزشتیں الہی حکمتوں اور واقعات کی سطحوں کی بے ارتباطی اور لٹلے.....

معاملہ شروع ہو گیا تو اس میں صفیہؓ بھی قید کر لی گئیں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کے جمال کا ذکر کیا گیا، ان کے شوہر جنگ میں مقتول ہو چکے تھے تازہ تازہ ان کی شادی ہوئی تھی اور ابھی وہ دلہن ہی شمار ہوتی تھیں اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجیہ کی فرمائش پر پہلے ان کو دے دیا تھا۔ پھر کسی نے آپؐ سے عرض کی یا نبی اللہ وہ تو قبیلہ قریشہ و نضیر کی سردار عورت ہیں آپؐ کے سواء ان کو کسی اور کو دینا مصلحت نہیں ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بحق نبوت خود لے لیا اور ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں قبول فرمالیا۔ چلتے چلتے جب ہم لوگ مقام سد صہباء میں پہنچے تو اب صفیہؓ اپنے نسوانی عذر سے فارغ ہو چکی تھیں یہاں آپؐ نے اپنا ولیمہ کیا یعنی ایک مختصر سے دسترخوان پر تھوڑا سا حلہ تیار کر کے رکھا اور فرمایا کہ آس پاس جو لوگ ہوں ان کو بھی بلا لو حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ کا ولیمہ بس صرف یہ تھا۔ اس کے

الْحِصْنُ ذَكَرَ لَهُ جَمَالُ صَفِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا بِنْتُ حَيٍّ بْنِ أَخْطَبَ وَقَدْ قُتِلَ زَوْجُهَا وَكَانَتْ عَرُوسًا فَاصْطَفَاهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهِ فَخَرَجَ بِهَا حَتَّى بَلَغْنَا سَدَّ الصَّهْبَاءِ خَلَّتْ فَبَنَى بِهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ صَنَعَ حَيْسًا فِي نِطْعٍ صَغِيرٍ ثُمَّ قَالَ لِي إِذْ مِنْ حَوْلِكَ فَكَانَتْ تِلْكَ وَلِيمَةً عَلَى صَفِيَّةَ ثُمَّ خَرَجْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَوِّي لَهَا وَرَاءَهُ بَعَاءَةً ثُمَّ يَجْلِسُ عِنْدَ بَعِيرِهِ فَيَضَعُ رُكْبَتَهُ وَتَضَعُ صَفِيَّةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا رِجْلَهَا عَلَى

للہ..... ان کے اندرونی ارتباط کی واضح مثالیں ہیں۔ یعنی مثلاً مقصد تو یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کی نظروں میں اونچے سے اونچا ثابت کیا جائے، مگر واقعات کی سطح میں مسلسل ذلتیں ہی ذلتیں نظر آ رہی ہیں، موت کے کوئیں میں گرنا، غلام بن کر مصر کے بازار میں فروخت ہونا اور محرم کی حیثیت میں قید میں پڑ جانا ایک سے ایک بڑی ذلت تھی کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا نتیجہ جو آخر میں ظاہر ہو گا وہی ان کے خواب کی تعبیر ہو گی۔ پھر جب آخر کار اس کی تعبیر کا دن آیا تو ظاہر ہو گیا کہ یہی ذلتوں کے گڑھے درحقیقت عزت و احترام کی سیڑھیاں تھیں۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کا مقصد تو اپنے محسن ملاحوں پر احسان کرنا تھا مگر اس کی صورت کیا ہے یہ کہ ان غریبوں کے رزق کا جو چھوٹا سا سہارا تھا اس کو بھی توڑ دیا۔ ان کا مقصد ایک بچہ کے والدین کی خیر خواہی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان کی ہزاروں آرزوؤں کے پھول کو مثل ڈالا۔ کون باور کر سکتا تھا کہ ان واقعات کی تہ میں کوئی معقول حکمت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے چہروں سے ذرا نقاب اٹھایا تو معلوم ہو گیا کہ یہ تمام واقعات بڑی حکمتوں پر مبنی تھے۔

پس اسی طرح آپ انبیاء علیہم السلام کے حالات زندگی پر جلدی سے تنقید کرنے کی عادت نہ ڈالیں اور ان کی حکمتوں کے دریافت کے درپے بھی نہ ہوں۔ ایمان کا راستہ یہ ہے کہ اگر کہیں آپ کو شبہ گذرتا بھی ہو تو اس کو اپنی عقل کی کوتاہی سمجھیں۔ یہی بات دانش مندی کی بھی ہے اور دیانت کی بھی۔ اگر اس کا کچھ شوق دامن گیر ہو تو آپ بھی کسی خضر راہ کی تلاش رکھیے ممکن ہے کہ حکیم علی الاطلاق کی حکمتوں کا کوئی شمع آپ کے علم میں آ جائے۔

اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقوق شناسی کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ اگر باندیوں کو آزاد کر کے ان سے نکاح کرنے کی ترغیب آپؐ نے اپنی امت کو دی ہے تو اس سے اپنے نفس کو بھی عملاً مستثنیٰ نہیں رکھا اور اس طرح باندیوں کی آزادی کا سامان اپنے قول و عمل سے مہیا فرما دیا ہے۔ اگر اسلام کا مقصد کسی کو دائمی غلامی میں رکھنا ہوتا تو ہرگز اس سخاوت کے ساتھ باندیاں للہ.....



رُكِبَتْ حَتَّى تَرُكِبَ.

(رواہ البخاری فی غزوة خیبر ص ۶۰۶ ج ۲)  
و فی باب ما یدکر فی الفخذ عنده فحاء رجل  
انی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا نبی اللہ  
اعطیت دحیة صفیة بنت حنی سیدة قریضة و  
النضیر لا تصح الا لک ج ۱ ص ۴۵)

(۱۰۹۷) عَنْ أُمِّ حَبِیْبَةَ أَنَّهَا رَأَتْ فِي النَّوْمِ كَأَنَّ  
أَتِيًا يَقُولُ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ فَفَزَعَتْ وَ أَذْلَتْ أَنَّ  
النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَزَوَّجُنِي ذَكَرَهُ  
ابن سعد كذا فی العمدة ج ۵ ص ۶۰۲ و  
رواه الحاكم فی المستدرک مفصلاً.

(۱۰۹۸) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ تُصِيبُهُ  
مُصِيبَةٌ فَيَقُولُ مَا أَمَرَهُ اللَّهُ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ  
رَاجِعُونَ اللَّهُمَّ أَجِرْنِي فِي مُصِيبَتِي وَ أَخْلِفْ  
لِي خَيْرًا مِّنْهَا إِلَّا أَخْلَفَ اللَّهُ لَهُ خَيْرًا مِّنْهَا  
فَلَمَّا مَاتَ أَبُو سَلَمَةَ قُلْتُ أَيُّ الْمُسْلِمِينَ  
خَيْرٌ مِنْ أَبِي سَلَمَةَ أَوَّلُ بَيْتٍ هَاجَرَ إِلَى  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ إِنِّي  
قُلْتُهَا فَأَخْلَفَ اللَّهُ لِي رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواه مسلم)

بعد جب ہم مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی  
اللہ علیہ وسلم ان کے پیچھے بیٹھنے کے لیے اپنی سواری پر پردہ کا انتظام فرما رہے  
ہیں (اس سے اب خوب معلوم ہو گیا کہ وہ باندی کی حیثیت سے نکل کر  
امہات المؤمنین کے شرف سے مشرف ہو چکی ہیں) آپ اپنے اونٹ کے  
قریب بیٹھ کر اپنا زانو ٹیک دیتے ہیں تاکہ حضرت صفیہؓ اس پر اپنا پیر رکھ کر  
بآسانی اونٹ پر سوار ہو سکیں۔ (بخاری شریف)

(۱۰۹۷) حضرت ام حبیبہؓ بیان فرماتی ہیں کہ انہوں نے آپ کی زوجیت  
میں آنے سے قبل خواب میں دیکھا تھا کہ کوئی شخص ان کو یا ام المؤمنین کہہ کر  
پکار رہا ہے اس خواب سے یہ ذرا متحیر سی ہو گئیں اور انہوں نے اس کی یہی  
تعبیر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرمائیں  
گے۔ (متدرک)

(۱۰۹۸) حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
یہ ارشاد فرمایا کہ جس مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ وہی کلمات پڑھ لے  
جس کا اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا ہے یعنی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ اللّٰہُمَّ  
اَجِرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَ اَخْلِفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْہَا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ  
میں ضرور اس سے بہتر اس کو اور عنایت فرما دے گا۔ جب ابو سلمہؓ میرے  
شوہر کا انتقال ہوا تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ بھلا ان سے کون سا  
مسلمان افضل ہو سکتا ہے جنہوں نے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ  
وسلم کی طرف ہجرت کی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے ان کلمات کو پڑھ ہی  
لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کی زوجیت کا شرف بخشا۔ (مسلم شریف)

اللہ ..... رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں صدیق اکبر کی صاحبزادی کے برابر بن کر نظر نہ آ سکتیں۔

(۱۰۹۸) \* دیکھئے یہاں بھی حضرت ام سلمہؓ کو کہیں دور دور تک اس کا وسوسہ نہیں گذرتا تھا کہ ایک دن ان کو ام المؤمنین کے خطاب سے  
سرفراز ہونا ہے لیکن اس کے باوجود وہ آپ کے فرمان پر پورے یقین کے ساتھ عمل کر لیتی ہیں۔ اس کا صلہ پھر قدرت وہ دیتی ہے جو ان کے  
خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ہمارا مقصد یہاں نہ تو تعداد از دواج کی حکمتوں پر بحث کرنا ہے اور نہ خاص ان برکات کا تذکرہ کرنا ہے جو آپؐ  
کے نکاحوں میں ظاہر ہوئیں تھیں بلکہ صرف ان احادیث کو پیش کرنا تھا جو چند از دواج مطہرات کے غیبی اشارات میں ہمارے سامنے آ گئی تھیں۔  
علماء کو چاہیے کہ بقیہ از دواج مطہرات کے لیے بھی وہ اس قسم کی احادیث کی تلاش رکھیں اور ان کو بھی ان حدیثوں کے ساتھ اضافہ کر لیں۔

و من اخص خواص اهل الجنة فهم عصمتهم من الذنوب صنعائر هاو كبائر ها

انبیاء میں اہل جنت کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں

عنوان مذکور در حقیقت علم کلام کا موضوع تھا لیکن اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر علم اصول فقہ میں بھی اس پر بحث کی گئی ہے اور محدثین و مفسرین نے بھی اس میں کافی حصہ لیا ہے۔ اس لیے ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ اس موضوع کے متعلق تھوڑا سا اظہار خیال کر دیا جائے۔ مگر ہمارا اہم مقصد ان جزئی واقعات کی توجہ یا ان آیتوں کی تفسیر کرنی نہیں ہے جو یہاں ملحدین کی نظروں میں ہمیشہ سے کھٹکتی چلی آرہی ہیں، بلکہ اس پر حدیثی روشنی میں صرف اصولی حیثیت سے بحث کرنی ہے۔ آیتوں کی تفسیر پر کتب تفسیر اور کتب کلام میں سیر حاصل بحثیں کی جا چکی ہیں وہاں دیکھ لی جائیں۔

**مسئلہ عصمت میں اختلاف کا سبب** \* کتب کلام وغیرہ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس مسئلہ پر غور و خوض کی ابتدائی بنیاد ہی ان آیات پر قائم کی گئی ہے جو بظاہر عصمت کے خلاف نظر آتی ہیں، اس لیے لامحالہ مسئلہ کا رخ شروع ہی سے بدل گیا ہے، پھر متکلمین کی بحث و نظر کا میدان چونکہ زیادہ تر عقلی ٹھہر چکا تھا اس لیے ان کے نزدیک کسی قطعی مسئلہ کے زیر تردید آ جانے کے لیے صرف عقلی احتمالات کا وجود بھی کافی ہو جاتا ہے چہ جائے کہ وہ مسئلہ جہاں قرآنی آیات بظاہر خلاف نظر آرہی ہوں بھلا ان کے ذوق پر وہ کیسے قطعی مسئلہ بن سکتا تھا۔ اس کے برخلاف فقہاء کی جماعت ہے وہ ہمیشہ اپنے فیصلے واقعات کی روشنی میں کرتے ہیں اور کسی جگہ صرف عقلی احتمالات سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لیے یہاں بھی فقہاء حنفیہ تو تقریباً ایک زبان ہو کر انبیاء علیہم السلام کے مطلقاً عصمت کے قائل ہیں۔ اگر ان اصولی نظریات کے اختلاف کو سامنے رکھا جائے تو قیاس کہتا ہے کہ شاید اس مسئلہ میں درحقیقت کوئی اختلاف ہی نہ ہوگا۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف لفظی اختلاف کے قریب ہے جو جماعت یہاں اختلاف رکھتی ہے وہ درحقیقت یا تو اس کی قطعیت میں اختلاف رکھتی ہے یا صرف معصیت کے امکان و جواز میں کلام کر رہی ہے اور اگر ان کے وقوع کی بھی قائل ہے تو اس کی نظر ان آیات پر ہے جو بظاہر اس کے خلاف نظر آتی ہیں اور جس جماعت نے فیصلہ کی بنیاد خارجی واقعات پر رکھی ہے وہ بلا اختلاف عصمت کی قائل ہو گئی ہے۔

ہم یہاں علمی مباحث پھیلانا نہیں چاہتے بلکہ حقائق کی دنیا میں اس پر نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے ضروری ہے کہ عصمت کا مفہوم معلوم کر لیا جائے اس میں بھی علماء کے کلمات بہت منتشر ہیں۔

**عصمت کی حقیقت امام ماتریدی کی نظر میں** \* امام ماتریدی فرماتے ہیں کہ عصمت حق تعالیٰ کی اس خاص عنایت و مہربانی کا نام ہے جو انبیاء علیہم السلام کو ہمہ وقت خدا تعالیٰ کی حکم برداری پر مستعد رکھتی ہے اور اس کی ادنیٰ سی معصیت کے ارتکاب کرنے سے بھی دور رکھتی ہے مگر اس طریقہ پر نہیں کہ یہ طاقت و قوت ہی ان کی ذات سے سلب کر لی جائے کیونکہ جس کو مکلف بنایا گیا ہے ضرور ہے کہ اس میں صفت اختیار باقی رکھی جائے تاکہ جزاء و ثواب کا مسئلہ معقول رہے اور جس مخلوق میں یہ صفت پیدا نہیں فرمائی گئی اس کو مکلف بھی نہیں بنایا گیا پھر اس کے اعمال سے جزاء و سزا کا تعلق بھی نہیں رکھا گیا۔ (نسیم الریاض ج ۳ ص ۵۴۶)



امام ماتریدی کے ان الفاظ کی تشریح حضرت شاہ اسماعیل نے اپنے سادہ الفاظ میں اس طرح فرمائی ہے:

و معنی عصمت آنست کہ انچه بایشان تعلق میدارد  
اقوال و افعال و عبادات و عادات و معاملات و  
مقامات و اخلاق و احوال آں ہمہ راجع جل و علا از  
مداخلت نفس و شیطان و خطاء و نسیان بقدرت کاملہ  
خود محفوظ می دارد و ملائکہ حافظین را برایشان می گمارد تا  
غباء بشریت دامن پاک ایشان را نہ آلاید. (تنبیہ  
ثانی در حقیقت دلالت از منصب امامت ص ۸)

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اقوال  
ہوں یا افعال و عبادات ہوں یا عادات، معاملات و مقامات  
ہوں یا اخلاق و احوال ان سب کو حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ  
سے نفس و شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ فرماتا ہے خواہ وہ  
خطاء و نسیان کی صورت ہی سے کیوں نہ ہوں اور اپنے حفاظت  
و نگرانی کرنے والے فرشتے ان کے ساتھ ساتھ رکھتا ہے تاکہ  
غبار بشریت بھی ان کے دامن پاک پر ذرا سادھبہ نہ لگا سکے۔

مولف کے نزدیک مسئلہ عصمت میں غور و خوض کے لیے سب سے اہم نقطہ انبیاء علیہم السلام کی صفات و ملکات

سے بحث ہے \* ہمارے نزدیک یہ مسئلہ چونکہ خود ان کی ذات اور ان ہی کے کار و کردار سے متعلق ہے اس لیے ضروری ہے  
کہ یہاں سب سے پہلے ان کے جوہر فطرت ان کی تربیت ان کی صفات و ملکات ان کی بعثت کی غایت و غرض ان کے منصب کی  
اہمیت سے پھر ان کے طریق تعلیم سے اور جو اس کے اثرات خود ان کی ذات ان کے ہم جلیسوں اور ان کے تمام ماحول پر پھر ان کی  
تمام امت پر نمایاں ہوتے چلے آئے ہیں ان سب سے بحث کی جائے۔ اگر یہ تمام امور ان کے حق میں طے ہو جاتے ہیں تو پھر ان  
کی معصومیت کا عقیدہ واقعات کی روشنی میں ایک بدیہی مسئلہ ہو جانا چاہیے۔ اس تفصیلی نظر کے بعد جب آپ ان آیات کی طرف  
نظر اٹھائیں گے تو یقیناً آپ کا فیصلہ بدل جائے گا اور جو آیات پہلے آپ کو اس مسئلہ کے خلاف نظر آ رہی تھیں اب وہی اس مسئلہ کا  
سب سے بڑا ثبوت نظر آنے لگیں گی۔ یہاں براہ راست صرف ان خطابات الہیہ پر فیصلہ کر ڈالنا جن کے لب و لہجہ میں حالات و  
مخاطب کی رعایت سے گرمی و نرمی پیدا ہو جانی فصاحت و بلاغت کا ایک عام باب ہے مناسب نہیں ہے۔ یہاں نہ تو صرف عیسیٰ علیہ  
السلام کے حق میں صرف ”روح اللہ“ اور ”کلمۃ اللہ“ کی نسبت سے کوئی نیا مقام تراش لینا درست ہے اور اسی طرح نہ حق تعالیٰ کے  
اپنے مخصوص بندوں کے ساتھ کسی عتاب آمیز لہجہ سے ان کے خلاف کوئی اصولی نتیجہ نکال لینا صحیح ہے۔

اس حقیقت کے اصولاً تسلیم کر لینے کے بعد اگر اوراق نقل میں کوئی جزئی واقعہ ایسا ملتا بھی ہو جو ایک ثابت شدہ حقیقت کے  
خلاف نظر آئے تو کسی عاقل کے لیے بھی محض ایک مشتبہ یا مجمل اور شاذ واقعہ کی بنیاد پر اس قطعی فیصلہ کو رد کر دینا جائز نہیں ہو سکتا آج بھی  
تاریخ کے اصولی فیصلے جزئی واقعات کی بناء پر کبھی قابل ترمیم تصور نہیں کیے جاتے بلکہ ان واقعات ہی کے لیے وجوہ و اسباب تلاش کیے  
جاتے ہیں تاکہ ان کو اصولی تحقیق سے کوئی ٹکراؤ باقی نہ رہے اس لیے ہمارے نزدیک یہاں بھی بحث و نظر کا یہی طریقہ قائم رکھنا چاہیے۔  
لہذا اگر مفسرین و محدثین نے اس جگہ کچھ جزئی واقعات کی توجیہات بیان فرمائی ہیں تو ان کو صرف ان کے حسن ظن کا نتیجہ  
سمجھ لینا صحیح نہیں بلکہ وہ بھی اسی اصولی حقیقت پر مبنی ہیں۔ پھر جیسا اس قسم کے مقامات میں گفتگو کرتے کرتے قریب و بعید ہر قسم کے  
احتمالات زیر بحث آ جاتے ہیں وہ یہاں بھی زیر بحث آ گئے ہیں۔ ادھر جب علماء اسلام کو اعداد اسلام کے ساتھ بحثوں کی نوبتیں

آئیں تو بحث و جدل کے میدان میں پڑ کر ایک معقول سے معقول بات بھی جس طرح محل بحث بن جایا کرتی ہے یہ مسئلہ بھی نظری اور محل بحث مسئلہ بن گیا ہے۔

افسوس ہے کہ گزشتہ اقوام و امم نے اپنی نااہلیت کی بدولت اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کی کوئی ایسی مستند تاریخ ہمارے سامنے نہیں چھوڑی جو کسی بنیادی مسئلہ کے فیصلے کے لیے قابل اعتماد سند بنتی۔ ان کی سیرت کے جو گئے چنے واقعات ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں ان میں قابل اعتماد حصہ صرف اتنا ہی ہے جو کسی تقریب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا ہے اور بس۔ اس لیے اب ہمیں صرف آپ ہی کی حیات طیبہ پر غور کرنا ہے۔ کیونکہ بلحاظ نبوت و رسالت یہ تمام جماعت ایک ہی جماعت تھی نبوت کے لوازم سب میں یکساں تھے فرق جو کچھ تھا وہ فضائل و کمالات میں تھا۔ قرآن کریم نے بھی آپ کے معاملہ میں جا بجا بیان کا یہی نہج اختیار کیا ہے اور جب کبھی کفار نے آپ کی دعوت پر اعتراض کیا یا آپ کی ذات پر حملے کیے یا آپ سے ناجائز فرمائشیں شروع کیں یا ایک موقع پر خود مسلمانوں کی جماعت آپ کی وفات کی خبر سے ضرورت سے زیادہ دل شکستہ ہونے لگی تو ان سے یہی ایک بات کہی گئی ہے کہ یہ سنت سب رسولوں کی سنت ہے جو پہلے بھی سب پر جاری ہوتی چلی آئی ہے لہذا اگر آپ کے اوپر بھی جاری ہوتی ہے تو تعجب کیوں ہے؟ چنانچہ ارشاد ہے:

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ. (فصلت: ۴۳)

تم سے بھی وہی باتیں کہی جاتی ہیں جو تم سے پہلے پیغمبروں کو کہی گئی ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کی تسلی کے لیے بھی یہی فرمایا و ما محمد الا رسول۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی رسولوں کی طرح ایک رسول ہی ہیں اور جس طرح دنیا سے گزرنے کی سنت ان پر جاری ہوتی رہی ہے اگر آپ پر بھی جاری ہو جائے تو گھبرانے کی اور اس کوئی بات سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کے اس طرز سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں نفس نبوت و رسالت کے جو لوازم تھے وہ سب میں یکساں تھے۔ اس لیے اگر ہمیں آپ کی حیات طیبہ سے آپ کی پوری پوری معصومیت کا ثبوت ملتا ہے تو پھر جملہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں بھی یہی ناطق فیصلہ سمجھا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ نبوت اور عصمت ایک ہی حقیقت کے دو اعتبارات سے دو نام ہیں یعنی جو معصوم ہے وہ صرف نبی ہی کی ایک ذات ہے اور جو نبی ہے وہ یقیناً معصوم بھی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ نبوت کسب و ریاضات سے بتدریج حاصل ہونے والی نعمتوں میں سے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ نقص سے کمال تک کی راہ طے کرنے میں معصیتوں کی ٹھوکریں لگ جائیں لیکن جہاں کسب و اکتساب کا ذرا دخل نہ ہو اور معاملہ براہ راست خدا تعالیٰ کے اجتباء و اصطفاء کا آجائے۔ پھر وہاں کسی ٹھوکر کا احتمال کیا ممکن۔ حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں ”از رفتن تا برون فرق ظاہر است“ یعنی خود چلنے میں اور کسی دوسرے کے لیے چلنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ صفت اجتباء و اصطفاء کے تحت پر در وہ خود نہیں چلتے کہ بشری ضعف ان کے لیے ٹھوکر کا باعث بن جائے۔ یہاں ان

۱۔ امام قرطبی ایک موقع پر لکھتے ہیں: ان المنع من التفضیل انما هو من جهة النبوة التي هي خصلة واحدة لا تفاضل فيها و انما التفاضل في الاحوال و الخصوص و الكرامات..... تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۲۶۳۔



کو بچا بچا کر خود قدرت لے چلتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ (الحج: ۷۵)

”یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو نوع ملکی اور نوع بشری میں سے اپنی رسالت کے لیے انتخاب براہ راست خود ہی فرماتی ہے۔“

﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (الطور: ۴۸)

”آپ اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کیجئے۔ آپ تو ہماری نگرانی میں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔“

﴿وَلَوْ لَا أَنْ تَبْتَكَ لَقَدْ كَدَّتْ تَرْكُنَ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۷۴)

”اگر ہم آپ کو تھام نہ لیتے تو قریب تھا کہ کچھ نہ کچھ آپ ان کی طرف جھک جاتے۔“

ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۲۸۸ و ج ۱ ص ۲۸۹ میں ایک صحیح حدیث آپ کے ملاحظہ سے گزر چکی ہے کہ بندہ عبادات نافلہ کرتے کرتے آخر اس بلند مقام تک جا پہنچتا ہے جہاں رضاء الہی میں وہ اس طرح گم ہو کر رہ جاتا ہے کہ پھر نہ خود اس کی کوئی ہستی باقی رہتی ہے اور نہ اس کے اعمال کی بلکہ وہ سب براہ راست حضرت حق سبحانہ کی طرف منسوب ہونے لگتے ہیں۔ وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے تو صرف وہی جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ ہو اور ہاتھ بڑھاتا اور قدم اٹھاتا ہے تو صرف اسی طرف جدھر حق جل و علا کی مرضی ہوتی ہے اب سوچئے کہ اس کی اس طرح گم شدگی کے بعد اس کے اعضاء و جوارح میں کیا کسی معصیت کے لیے حرکت کرنے کی مجال باقی رہ سکتی ہے اور جب اس کے اعضاء مرضیات ایزدی کے اس طرح منقاد و مطیع بن جائیں تو اس کے اعمال میں کیا کسی ادنیٰ سی معصیت وہ بھی ارادی معصیت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ جب ان افراد کا حال یہ ہو جن کے کمالات کسب و اکتساب کا ثمرہ ہوتے ہیں تو پھر ان اولوالعزم ہستیوں کی عصمت کا پوچھنا کیا ہے جن کو یہ نعمت صفت اجتناء و اصطفاء کی بدولت روزِ اول ہی سے میسر ہو۔ جن کی عصمت کے اندازہ کرنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ جو ان کے نقش قدم پر چل پڑا اس کے اعضاء بھی خدائی معصیت کے لیے شل ہو گئے۔ انبیاء علیہم السلام کی اس اجتنائی صفت کا نظارہ کرنے کے لیے صوفیاء کرام اور ان سے پہلے صحابہ عظام کے اعمال پر نظر ڈال لینا چاہیے۔ یہاں حدیث نمبر ۴۱ ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۲۸۸ کے نوٹ پر نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ اس جگہ ترجمان السنۃ کا مقدمہ از ص ۱۳۰ تا ۱۳۶ ملاحظہ فرمائیے۔

انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کی خلقت ہی عام انسانوں سے الگ ہوتی ہے ان کی تربیت کا طریقہ بھی سب سے الگ ہوتا ہے۔ ان کی طفولیت اور ان کا شباب بھی الگ ان کا تجربہ اور ان کی حیات از دواجی بھی الگ ان کا رضاء و غضب اور جد و ہزل بھی سب سے الگ ان کی عبادت بھی سب سے الگ ہوتی ہے اور ان کا استغفار و توبہ بھی سب سے الگ ان کا ثواب بھی سب سے الگ ہوتا ہے اور ان سے مواخذہ بھی سب سے الگ۔ اور یہ سب کچھ اس لیے کہ نظر ربوبیت شروع ہی سے خود ایک الگ نوع کی طرح ان کو پیدا فرماتی ہے اور پھر اپنی رسالت کے لیے خود ہی ان کا انتخاب فرماتی ہے۔

﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ﴾ (القصص: ۶۸)

”یعنی پیدا کرنا اور پھر پیدا کر کے جس کو چاہیں اس کو چھانٹ لینا یہ دونوں صفتیں تیرے پروردگار کے ساتھ مخصوص ہیں اس میں کسی کا حصہ نہیں لگتا۔“

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ﴾ (الزخرف: ۳۱)

”یعنی کہتے ہیں کہ یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے شخص کے اوپر کیوں نہ اتارا گیا۔“

﴿أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ﴾ (الزخرف: ۳۲)

”اچھا کیا تیرے پروردگار کی رحمت یہ تقسیم کرتے ہیں۔“

اور یہ انتخاب وہ خود اس لیے کرتی ہے کہ اس منصب جلیل کی صلاحیتوں کو اس کے سوا کوئی دوسرا پا ہی نہیں سکتا۔

﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

”اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ رسالت کا کون سا محل ہے اور وہ اپنی پیغمبری کے عنایت فرمائے۔“

انبیاء علیہم السلام کا جو ہر فطرت \* ان کی خلقت اور ان کے اختیار و انتخاب کی یہ اہمیت کیوں ہوتی ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ بھی مشرکوں میں ایک مشرک، کافروں میں ایک کافر اور شاعروں میں ایک شاعر بن کر پیدا ہوں والے یا اللہ یا اس لیے کہ شرک و کفر کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں تو حید و عبودیت کی شمع فروزاں بن کر چمکیں۔ اسی لیے اور یقیناً اسی لیے ان کا خاک کا قلب گو وہی ہوتا ہے جو عام انسانوں کا گھر ان کا جو ہر فطرت خلقۃ ایسا پاکیزہ اور منور بنایا جاتا ہے کہ اس کو حرفِ معصیت سے ذرا آشنائی نہیں ہوتی پھر اس کو طرح طرح سے اور مجلی کیا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کے خواب اور بیداری کی دونوں حالتیں یکساں ہوتی ہیں وہ اپنی حالت خواب میں بھی عام انسانوں کی بیداری سے زیادہ بیدار رہتے ہیں محبت و بغض کے طوفان خیز جذبات ان کے بحر اعتدال میں ذرا سی جنبش بھی پیدا نہیں کر سکتے وہ ہر حالت میں انصاف پسند، حق گو اور بے لاگ انسان ہوتے ہیں خلق اللہ کی ہمدردی سے ان کے سینے اس درجہ لبریز ہوتے ہیں کہ ان کی غم خواری میں ان کی جان گھلی جاتی ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ إِلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ان کے سینے حق جل و علا کے احکام رضاء و غضب کے لیے آمینہ ہوتے ہیں اور ان کی ان ہی کامل صلاحیتوں کی وجہ سے خالق کائنات براہ راست خود ان کو اپنی شرف ہم کلامی سے نواز دیتا ہے۔ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ اتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا۔ یہ شرف یا صرف اُس نوعِ ملکی کو میسر ہے جو فطرۃً معصوم پیدا کی گئی ہے ایسی معصوم کہ اس کو حق تعالیٰ کی معصیت کرنے کی قدرت ہی نہیں دی گئی یا پھر نوع بشری میں ان مخصوص افراد کو میسر ہے جن میں اختیار کی صفت گو موجود ہو مگر ان کی معصومیت پر فرشتوں کی معصومیت بھی رشک کرتی ہے اس لیے ارشاد ہوا ہے اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ (الحج: ۷۵) آیت بالا میں بعض انسان اور فرشتوں کو غالباً اسی نکتہ کے پیش نظر جمع کیا گیا ہے کہ نظرِ اصطفاء جب اپنی رسالت کے لیے کسی کا انتخاب کرنا چاہتی تو اسی کا انتخاب کرتی ہے جس میں اس کی نافرمانی کرنے کا کوئی احتمال نہ ہو اس لیے یا وہ اس نوع کے افراد کا انتخاب کرتی ہے جس میں معصیت کرنے کا اختیار ہی نہیں اور اگر دوسری نوع میں کسی کا انتخاب کرتی ہے تو ان افراد کا کرتی ہے جن سے معصیت کے صدور کا کوئی احتمال نہیں۔ ملوک دنیا بھی انتخاب میں کسی ایسے شخص کا انتخاب نہیں کرتے جس میں ان کے نزدیک ایک فیصدی بھی ان کے خلاف جانے کا احتمال ممکن ہو لیکن چونکہ ان کا علم ناقص در ناقص ہوتا ہے اس لیے اس میں ان کو غلطیاں لگتی ہیں اور بعض مرتبہ ان کے تباہ کن نتائج بھی دیکھنے پڑ جاتے ہیں۔ پروردگارِ عالم کے علم میں یہ امکان نہیں اس لیے اپنی رسالت کے انتخاب فرمانے کا حق اس نے خود اپنا



رکھا ہے اور اس کو نہ تو کسی انسان کے مجاہدہ و ریاضت پر موقوف رکھا ہے اور نہ کسی کی دعاء و سفارش پر منصب نبوت کی اہمیت خدا تعالیٰ کی رسالت و سفارت کا کام اتنا نازک ہے کہ اگر اس میں ذرا سی اونچ نیچہ جائے تو کارخانہ رسالت سارا کا سارا درہم و برہم ہو جائے۔

انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے لیے اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں \* خدا تعالیٰ کے مقدس رسول دنیا میں آ کر نظام مدارس کی طرح صرف زبانی تعلیم نہیں دیتے بلکہ ان کی تعلیم کا نقشہ وہ ہوتا ہے جو ماں باپ کا اپنی اولاد لے لیے ہوا کرتا ہے یعنی جس طرح بچہ والدین کی فصیح یا غیر فصیح زبان سن کر اسی طرح کی زبان سیکھتا چلا جاتا ہے اور جس طرح کہ ان کے مہذب یا غیر مہذب افعال دیکھ دیکھ کر اسی کی نقل اتارنے لگتا ہے۔ اسی طرح رسول کی مجسم ذات تمام امت کے لیے نمونہ بنا کر بھیج دی جاتی ہے اور مخلوق خدا کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جس طرح وہ اس کے مقدس کلمات سن کر علم دین حاصل کرتے ہیں اسی طرح اس کی ہر ہر نقل و حرکت کو سامنے رکھ کر دین کا دوسرا حصہ سیکھیں یہاں قول و فعل کی تخصیص کے بغیر رسول کی ذات تمام کی تمام دین کا مکمل نقشہ ہوتی ہے اسی لیے ہر ہر امر میں ان کی اتباع کا حکم دیا جاتا ہے اگر یہاں کچھ احکام مستثنیٰ ہو سکتے ہیں تو صرف وہ کہ جن کے متعلق خود وہی کسی خصوصیت کا اعلان فرما دے۔ ان کو اس کا بھی اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو کسی مصلحت کے پیش نظر عام قانون سے کسی کو مستثنیٰ بھی فرما دیں کیونکہ رسولوں کے عواطف و میلانات بھی اللہ تعالیٰ ہی کے زیر نگرانی رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی عام تشریع اور اس سے استثناء یہ دونوں باتیں اسی کی مشیت کا ظل ہوتی ہیں ان کا سکوت اختیار کر لینا بلکہ کسی جانب سے منہ موڑ لینا یا ہاتھ کا ذرا اشارہ کر دینا جیسے امور بھی دین کے باب میں حجت شرعیہ شمار ہوتے ہیں۔

انبیاء پیدائشی طور پر نفس مطمئنہ رکھتے ہیں اور ضلالت کی تمام طاقتیں ان کے سامنے سرنگوں ہوتی ہیں \* انسان میں شر کی طاقتیں صرف دو ہیں ایک نفس یہ اندرونی طاقت ہے۔ دوسری شیطان یہ بیرونی طاقت ہے یہاں ان کو پیدائشی طور پر وہ نفس مرحمت ہوتا ہے جو فطرۃ ہر معصیت سے نفور اور نشہ عبودیت سے چور ہوتا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے ولادت کے بعد ہی جو کلمہ نکلا تھا وہ یہی تھا۔ اِنِّی عَبْدُ اللّٰہِ۔

اب اس سے اندازہ لگا لینا چاہیے کہ وہ اپنے غیر شعوری دور حیات میں بھی تو حید و عبودیت کا کتنا شعور رکھتے ہیں اگر اس دارالابتلاء میں اپنی ابتدائی حیات میں اپنی شان عبودیت کا عام طور پر اس طرح اظہار کر دینا کہیں خلاف مصلحت نہ ہوتا تو شاید خدا تعالیٰ کا ہر نبی اپنی ولادت کے ساتھ ان ہی کلمات سے مترنم نظر آتا مگر حکیم مطلق کی حکمت نے اس قسم کی کھلی ہوئی شہادت صرف اسی رسول کے ساتھ خاص فرمادی تھی جن پر خدائی کی تہمت لگائی جانے والی تھی تاکہ الوہیت کی اس بہتان طرازی میں کسی کے لیے بھی عذر و معذرت کا موقعہ باقی نہ رہے۔ انبیاء علیہم السلام کے نفوس میں تزکیہ کی یہ صفت اتنی کامل ہو جاتی ہے کہ آزمائش کے کسی نازک سے نازک موقعہ پر ان سے ذرا سی کمزوری کا احتمال نہیں ہوتا۔ یہاں زنان مصر اور حضرت یوسف علیہ السلام کے نفس مطمئنہ کی استقامت کا نقشہ سامنے رکھیے تو آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ ان کی آزمائش کا میدان جتنا خطرناک ہوتا چلا گیا ان کی عفت نفس کا جو ہر اتنا ہی اور زیادہ کھلتا چلا گیا۔ انبیاء علیہم السلام خود تو کسی خلاف ورزی کا تصور کیا لا سکتے ہیں دوسروں کی خلاف ورزی بھی ان کے آئینہ فطرت کو مکدر کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے اس لیے نہ وہ احکام الہیہ کے خلاف خود کوئی قدم اٹھاتے ہیں اور نہ کسی کا قدم

ان کے خلاف اٹھتا ہوا دیکھنا برداشت کر سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی سرگزشت قرآن کریم کے الفاظ میں ملاحظہ فرمالیجئے کتنی مشقتوں اور تمنائوں کے بعد تو وہ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس پہنچے تھے پھر کتنے عہد و پیمان کرنے کے بعد بھی صرف اپنی نبیانہ فطرت کے بدولت چند قدم بھی ان کے ساتھ نہ چل سکے۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ اب ان کے لیے صرف دو ہی راہیں باقی رہ گئی ہیں رفاقت قائم رکھنی ہے تو ہر معاملہ میں سکوت کرنا ہوگا اور اگر ٹوکنا ہے تو فراق۔ تو بڑی خوشی کے ساتھ انہوں نے دوسری صورت کو پسند فرمالیا مگر اس کا اقرار نہ کیا کہ اپنی شریعت کے خلاف ایک قدم بھی اٹھتا ہوا دیکھ کر وہ سکوت کر سکیں گے۔ حضرت خضر علیہ السلام کو ان کی اس نبیانہ فطرت کا پورا اندازہ تھا اس لیے انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ سفر شروع کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرے ساتھ رہنا اور ہر معاملہ پر سکوت کرنا یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے آپ اس کا تجربہ نہ کریں چنانچہ وہی ہوا۔ قرآن کریم نے اس سرگزشت کی اتنی اہمیت محسوس کی کہ ایک سورت میں مستقل طور پر اس کی پوری پوری تفصیلات بیان فرمادیں تاکہ منجملہ اور رموز کے یہ بھی اندازہ ہو جائے کہ نبی کی معصومانہ فطرت کس درجہ بلند ہوتی ہے۔ خود معصیت کرنا تو درکنار کسی دوسرے کا قدم معصیت کی طرف اٹھتا ہوا دیکھ کر بھی وہ سکوت کی قدرت نہیں رکھتے اس جگہ اگر ہم حضرت خضر علیہ السلام کے افعال اور ہر عمل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بے چینی اور بعد میں حقیقت کے تسلی بخش انکشاف اور ظاہری افعال کی ناموزونیت اور باطنی مصالح کی خوشنمائی کی تفصیل کریں تو ہمارا مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ ہم نے اپنے محل پر اس کی طرف صرف چند اشارات کر دیئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیان میں ان پر غور کر لیا جائے۔

یہ تو انسان کی اندرونی شرکی طاقت تھی اور اسی کا نام نفس امارہ ہے۔ شریعتوں کا سب سے اہم مقصد اسی نفس امارہ کی شائستگی اور تہذیب ہے۔ جب کوئی رسول دنیا میں آیا تو اس نے اپنی فیض صحبت اور اتباع شریعت کے ذریعہ عام مخلوق کے نفوس کی اصلاح کی جدوجہد کی ہے۔ پھر جتنے انسانوں کے نصیب میں سعادت لکھی جا چکی تھی انہوں نے خواہشات و اہوا کا راستہ چھوڑ کر رسولوں کی پیروی کی یہاں تک کہ ان کے نفوس کی سرشت بدل گئی اور شریعت کے خلاف امور میں ان کے لیے کوئی لذت باقی نہ رہی پھر کسی صاحب نصیب کا مقدر اور جاگا تو اس کے نفس کو اتباع شریعت میں وہی طبعی راحت محسوس ہونے لگی جو پہلے کبھی شریعت کے خلاف امور میں محسوس ہوا کرتی تھی اب اس کا نام امارہ کی بجائے بدل کر نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو ترجمان السنہ ج ۱ ص ۱۰۰ رہے انبیاء علیہم السلام تو ان کے نفوس پیدائشی طور پر مطمئنہ ہوتے ہیں وہ اپنے کسی دور حیات میں بھی کسی خفیف ناشایاں حرکت کی طرف میلان نہیں رکھتے۔ دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام نے جب سن کے دلربا منظر کے مقابلہ پر اپنے ملکوتی نفس کے اطمینان کا اظہار فرمایا تو اس کو بھی بڑی بلند آہنگی سے نہیں بلکہ بڑے نرم لہجہ میں اداء فرمایا اور یہ ان کے اطمینان نفس کا پہلے سے بڑھ کر مظاہرہ تھا اگر ان کی جگہ یہاں کوئی اور انسان ہوتا تو نہ معلوم اس زبردست آزمائش اور اس کے مقابلہ میں اپنی اس روشن کامیابی پر نہ معلوم تعریف و تزکیہ کی کتنی لہریاں ہانکتا مگر جو فقرہ یہاں ان کی زبان سے نکلا وہ صرف یہ تھا ﴿وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ یعنی میرے اس استقلال میری اس پاک بازی و عفت اور میرے اس شان استغناء کا حاصل دعویٰ تقدس کرنا نہیں ہے اور یہ دعویٰ میں کیونکر کر سکتا ہوں جب کہ نفس کی بالعموم خصلت صرف برائی پر برا بیچختہ کرنا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ



رحمت ایزدی نے یہاں اپنے کسی خاص بندہ کے نفس کی سرشت بدل دی ہو مگر سانپ کے زہر کی پوٹلی اگر توڑ بھی دی جائے پھر بھی سانپ ڈرنے ہی کی چیز ہوتا ہے۔ غور فرمائیے کہ جب اپنے نفس کے متعلق دعویٰ تقدس کی نفی فرمائی تو یہاں ”نفسی“ (میرا نفس) کا لفظ فرمایا۔ پھر جب اس کا سبب بیان فرمایا تو وہاں ”نفسی“ کی بجائے ”ان النفس“ کا لفظ فرمایا ہے۔ یعنی میرے اس دعویٰ تقدس سے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میرے نفس میں بھی امارگی کی صفت موجود ہے بلکہ بات یہ ہے کہ اگر کسی ناشائستہ جنس کا کوئی فرد شاذ و نادر طور پر شائستہ سے شائستہ بھی نکل آئے تو بھی اس جنس کی مذمت اپنی جگہ بحال ہی رہتی ہے۔ یہاں ان کا پہلا جملہ تو ان کی شان تواضع کا مظہر ہے اور ”ان النفس لا مارة بالسوء“ فرمانا یہ ایک حقیقت کا بیان ہے عام انسانوں کے ایک ہی کلام میں یہ تو ازن نہیں مل سکتا جب وہ تواضع پر اترتے ہیں تو حقیقت کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے اور جب حقیقت کے بیان کرنے پر آتے ہیں تو ان کی تواضع کا پلہ ہلکا نظر آنے لگتا ہے انبیاء علیہم السلام کی نہ تو تواضع کسی تصنع سے ہوتی ہے اور نہ اظہار حقیقت کسی تکلف سے اس لیے وہ ہر موقع پر بے ارادہ ان دونوں باتوں کو نبھائے چلے جاتے ہیں۔

یہاں ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس واقعہ کو سامنے رکھ کر آپ انبیاء علیہم السلام کے نفس کا کچھ اندازہ لگائیں ان کے عمل سے بھی اور خود ان کے بیان سے بھی جب ان کے عمل سے یہی ثابت ہو کہ کسی موقع پر ان کی استقامت میں ذرا سی لغزش نہیں ہو سکی اور ان کی تواضع کے پر زور کلمات میں بھی ایک حرف ایسا نہ مل سکا جس میں ان کے نفس کے خلاف ادنیٰ سا اشارہ بھی ہو تو پھر ان کی عصمت کے خلاف ہم کو کوئی کلمہ اپنی زبان سے نکالنا کتنی بڑی بے احتیاطی ہوگی۔

انبیاء علیہم السلام کی برکات صحابہ اور ماحول پر \* اب رہی بیرونی طاقت یعنی شیطان تو ان کے تقدس کے سامنے وہ بھی اس طرح بے چارہ اور سرنگوں ہو جاتی ہے کہ کسی برائی کی دعوت دینے کا اس میں کوئی حوصلہ ہی باقی نہیں رہتا بلکہ جس طرح ایک مقہور دشمن کے لیے ساز کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا اسی طرح یہاں شیطان کو بھی طوعاً و کرہاً ان کی ملکی طاقت کے ہم آہنگ ہوئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ پھر ان کی اس قہرمانی کا اثر صرف ان کی ذات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ حسب مناسب ان کے ہم جلیس اور رفقاء سے تجاوز کر کے اس تمام خطہ کو بھی محیط ہو جاتا ہے جو ان کی بعثت کا میدان ہوتا ہے۔ ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کے شیاطین بھی دن بدن کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ بھی ہر میدان میں شکست کھاتے کھاتے اتنے مایوس ہو جاتے ہیں کہ اگر ہزار کوشش کے بعد کسی سے کوئی معصیت سرزد ہو گئی تو اسی کو اپنی بڑی کامیابی تصور کرنے لگتے ہیں اور جس طرح ہر ضعیف اپنے سے قوی تر سے ڈرا کرتا ہے اسی طرح شیاطین بھی توحید کے ان علمبرداروں سے ہمہ وقت ترساں و لرزاں نظر آنے لگتے ہیں اور کسی کسی کی دینی شدت سے تو اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ جس طرف اس کا گذر ہو جائے وہ اس راستہ ہی سے کترا کر نکل جاتے ہیں ایک طرف تو ضلالت کی طاقتوں یعنی نفس و شیطان کی پسپائی اور زبونی کا عالم یہ ہوتا ہے دوسری طرف ملکوتی طاقتیں اپنے پورے عروج پر آ جاتی ہیں اور ان کے اثرات بھی اسی طرح متعدی ہو کر عالم کے گوشہ گوشہ میں پھیلنے لگتے ہیں اسی لیے مقابلہ کے ہر میدان میں مستقل فتح و کامرانی ان کا حصہ ہو جاتی ہے اور دائمی ذلت و ناکامی نصیب اعداء بن جاتی ہے۔

اعتمادات و عادات کی دنیا آباء و اجداد کی رسومات اور فطری خوبواتی تیزی کے ساتھ بدلنے لگتی ہے کہ منکرین کو یہ گمان

کرنے کے سواء کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ ضرور یہ جادو یا سحر کا اثر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ جہاں فرش سے عرش تک عصمت و تقدس ہی کا سائبندھا ہوا ہو ضلالت کی قوتیں دن بدن مضحمل ہو کر فنا ہو رہی ہوں وہاں حق کی فتح و ظفر اور اسباب ہدایت میں نمو اسی طرح فطری بن جاتا ہے جیسا کہ موسم خزاں میں زمین کا خشک ہو جانا اور موسم بہار میں چپہ چپہ کا سبزہ زار ہو جانا فطری ہو جاتا ہے۔ جس طرح موسم بہار کے چند قطرے صحراؤں کا رنگ بدل دیتے ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی آمد کے بعد قلب و دماغ کا رنگ و بو بھی بدلنے لگتا ہے۔ وہ سینے جو کبھی ظلمات کفر سے تیرہ و تاریک تھے ان کی فیض صحبت سے ایسے جگمگا اٹھتے ہیں گویا عالم قدس کی وہ سب سے بلند جلوہ گاہ ہیں۔ حضور و یقین کی بیش بہا نعمت ان کو بآسانی اس درجہ پر ہاتھ آ جاتی ہے جیسا عالم آخرت ان کے سامنے کھلا ہوا رکھا ہے۔ اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے کوئی کوئی فرشتوں کی جماعت میں اس طرح بھی گھل مل جاتا ہے کہ وہ اس کو سلام کرتے ہیں اور یہ اس کو سنتا ہے۔ یہ تمام کرشمے اس مرکز نور کے ہوتے ہیں جو ان کے درمیان آفتاب درخشاں کی طرح موجود ہوتا ہے اور اسی کے قلب مبارک کے انسلاک کے ساتھ دوسروں کے قلوب میں بھی حسب استعداد یہ نور اس طرح تقسیم ہوتا رہتا ہے جس طرح کہ مختلف قوتوں کے بلبوں میں پاور ہاؤس سے روشنی تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ اس فیضان بصیرت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے رفقاء کی نظروں میں بھی متاع دنیا کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ دل فریب نظاروں کی فریب کاری ان پر بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے اور آخرت کا جزم و یقین ان کے دلوں میں اس طرح راسخ ہو جاتا ہے کہ معصیت کی جرأت کرنا تو درکنار ناموزوں خطرات اور وساوس کا دل میں گزرنا بھی ان کے لیے اتنا شاق ہو جاتا ہے کہ اپنا جل کر خاک ہو جانا ان کو اس سے بدرجہا بہتر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دیکھو ترجمان السنہ ج ۱ ص ۲۸۰ اور اگر کسی سے شاذ و نادر حالات میں معصیت کا صدور ہو جاتا ہے تو وہ آخرت کی گرفت کے مقابلہ میں شریعت کی سخت سے سخت سزا کے نفاذ پر اس طرح بے چین و مضطر ہو جاتا ہے گویا اس کی ساری راحت اور کامل سرور اس سزا کے نفاذ ہی میں ہے۔ اب ان کے اس پاکیزہ ماحول اور اس قدسی صفت جماعت کو سامنے رکھیے پھر ان کی بلند صفات پر بھی نظر ڈالیں تو آپ کو یقین ہو جائے گا کہ جن کی ذاتی صفات یہ ہوں اور جن کے اثرات سے ماحول اتنا پاکیزہ بن جاتا ہو کیا ان سے کسی معصیت کا صدور ہو سکتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے خصائل و عادات کا اثر ان کی امتوں پر اسی طرح ہوتا ہے جیسا والد کا اس کی اولاد پر بلکہ اس سے بڑھ کر \* یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح استاد کے خصائل اس کے شاگردوں میں اور والدین کے ان کی اولاد میں منتقل ہونے ضروری ہوتے ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے کمالات و نقائص کا ظہور بھی ان کی امتوں میں لازمی ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے خطاء و نسیان کا ایک قدم اٹھ گیا تو یہی ان کی اولاد کی سرشت بن گئی یہ بات دوسری ہے کہ جو مواخذہ اس پر ہونا تھا وہ ان سے ہی ہولیا اور جب رحمت ایزدی نے اصل انسانی سے اس کو درگزر فرما دیا تو اب وہ نسل انسانی کے لیے بھی قابل چشم پوشی بن گیا۔ اگر کہیں معصیت کرنی انبیاء علیہم السلام کی سرشت میں داخل ہو جائے (والعیاذ باللہ) تو عاصی انسانوں کا بیڑا بحر عصیان میں غرق ہو کر رہ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شب معراج میں دو جام پیش کیے گئے ایک دودھ کا دوسرا شراب کا۔ نبی کی معصوم فطرت نے فوراً آگے بڑھ کر دودھ کا جام لے لیا۔ آپ سے کہا گیا کہ اس تخیر و انتخاب



کو معمولی بات نہ سمجھنا اگر کہیں آپ مے کا جام لے لیتے تو معاملہ صرف اسی پر ختم نہ تھا بلکہ آپ کی ساری امت گرداب ضلالت میں غرق ہو کر رہ جاتی سبحان اللہ! عین تعظیم و اکرام کی شب میں ایسے نازک اور خطرناک امتحان بھی گزر رہے تھے مگر جب قدرت کو اپنے انعامات و اکرام کی تکمیل منظور تھی تو آپ کو اس انعام کی بشارت سے کیسے محروم رکھا جاسکتا تھا جس کے لیے نبی کا قلب سب سے زیادہ بے چین ہوتا ہے یعنی امت کی بہبودی بے شک امتحان بہت خطرناک تھا لیکن جب تک معاملہ کی ہولناکی معلوم نہ ہو اس وقت تک اس سے نجات کی نعمت کا بھی پورا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ان سطور میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحابہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ایک حصہ تو ترجمان السنہ کی حدیثوں کے ضمن میں پہلے آپ کے ملاحظہ سے گزر چکا ہے اور جو باقی رہ گیا ہے وہ ان شاء اللہ تعالیٰ احادیث ہی کی روشنی میں ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آنے والا ہے۔ ان کو بیک وقت سامنے رکھ کر یہ فیصلہ فرما لیجئے کہ ان نفوس قدسیہ سے کیا عدا کسی معصیت کا ارتکاب کرنا ممکن ہے؟ یہ واضح رہے کہ معصیت کی جو قسم بھی ہے اس میں قصد و ارادہ ہونا ضروری ہے۔ انسان کے وہ افعال جو اس کے قصد و اختیار سے نہ ہوں وہ معصیت کی تعریف میں نہیں آتے۔ پس جب نافرمانی اور قصد انا نافرمانی کا تصور عام انسانوں کے تقدس پر بدنماداغ سمجھا جاتا ہے تو پھر کیا وہ انبیاء علیہم السلام کے لیے شایان شان سمجھا جاسکتا ہے؟

ہمارے نزدیک اس مسئلہ کی ایک ذوقی اور وجدانی دلیل یہ بھی ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام پیدائشی طور پر اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں جس کی شہادت گزشتہ اوراق میں آپ کے سامنے گزر چکی ہے تو پھر اہل جنت کے صفات میں سے اگر معصومیت کی صفت بھی ان میں موجود ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔ لہذا یہ جنتی جنت میں خدا تعالیٰ کی معصیت کریں گے نہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں معصیت کرتے ہیں اسی لیے اپنی اخروی فلاح و بہبود کا ان کو جزم حاصل ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شان تو اضع اور اپنی کمال خوف و خشیت کے باوجود مرض الوفات میں حضرت فاطمہؑ سے پورے وثوق کے ساتھ فرمایا۔ ”لا کرب علی ابیک بعد الیوم“ آج کے بعد تیرے والد پر بے چینی کا نام و نشان ہوگا۔ سب چین ہی چین ہوگا اور جب کہ یہ مقررہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب اپنی امتوں کے لیے شافع ہوں گے تو کیا جو خود مجرم ہوں وہ شفاعت کے مستحق ہو سکتے ہیں شفاعت کبریٰ کے لیے جو کلمات انبیاء علیہم السلام نے استعمال فرمائے وہ اس لیے تھے کہ یہ مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پہلے سے رزرو ہو چکا تھا۔ تمام جہان کے حق میں سفارش وہی کر سکتا ہے جس کی ساری عمر کے متعلق مغفرت و عفو کا حتمی اعلان ہو چکا ہو۔ اگر آپ کے حق میں یہ اعلان نہ ہو چکا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ آپ بھی رب العزت کی بارگاہ بلند میں پیش ہونے سے شاید معذرت کا کوئی پیرایہ اختیار فرما لیتے لیکن چونکہ رحمت حق نے اس عقدہ کشائی کے لیے آپ کو منتخب فرمایا تھا اس لیے آپ اہل محشر سے بڑے تسلی کے انداز میں فرمائیں گے ”انا لہا انا لہا“ ”بے شک آج شفاعت کرنے کا حق میرا ہی ہے۔“ اس کے بعد جب باب شفاعت کھل جائے گا تو پھر ہر نبی اپنی اپنی امت کی شفاعت کرے گا۔ اس مسئلہ پر بحث و نظر کا ایک طریقہ تو یہ تھا۔ بعض علماء نے یہاں دوسرا طریقہ استدلالی اختیار کیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ عصمت کے ظاہری اسباب چار ہیں۔

عصمت کے ارکان اربعہ \* عدالت و ثقاہت خیر و شر کے عواقب کا قطعی علم۔ پھروجی الہی سے ان علوم کی مزید تائید و تاکید۔

نسیان اور ترکِ اولیٰ پر بھی مواخذہ کا خطرہ (الروضۃ البہیہ ص ۵۹) چونکہ انبیاء علیہم السلام میں یہ چاروں صفاتیں کامل طور پر موجود ہوتی ہیں اس لیے ان میں عصمت کی صفت بھی کامل طور پر موجود ہونی ضروری ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام میں ان صفات کے علاوہ دائمی حضوری کی ایک صفت ہی ایسی ہوتی ہے کہ تنہا یہ صفت ہی ان کی عصمت کے لیے کافی ہے۔ اسی کے ساتھ عصمت کے جتنے موانع ہو سکتے ہیں وہ بھی ان میں موجود نہیں ہوتے یعنی ان کی اندرونی اور بیرونی طاقتیں سب کی سب اپنے رب کی حکم برداری کے نشہ میں اس طرح ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں کہ اس کی نافرمانی کا ان کو کبھی تصور ہی نہیں آتا۔ دوسرے انسانوں میں اس حضوری میں! کچھ نہ کچھ فرق پڑھ سکتا ہے لہذا ان کی قوم کی غلطی کا امکان بھی ہوتا ہے یہاں دائمی حضوری میں ادنیٰ سے فرق کا کوئی امکان نہیں ہوتا وہ بظاہر جتنی غفلت میں نظر آتے ہیں اتنے ہی اور ہشیار ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نیند کے علوم بھی بیداری کے علوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر غفلت و تکلیف کا وقت انسان کی نزع روح کا وقت ہوتا ہے وہ اس نازک وقت میں اور اتنے مستغرق ہو جاتے ہیں کہ رفقاء دینار سے ان کی نظریں کسر منقطع ہو کر صرف ”الرفیق الاعلیٰ“ کی طرف لگ جاتی ہے۔ پھر بھوک و پیاس، مسرت و غم اور شکست و فتح کے حالات کا تو ذکر ہی کیا ہے یہ تو غفلت کی بجائے برعکس ان کی گرمی محفل کے سامان ہوتے ہیں۔ عین جنگ کی گرم بازاری کے موقع پر آپ کی توجہ اور انابت الی اللہ کا جو نقشہ رہا ہے وہ احادیث اور کتب سیر میں موجود ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام کا اپنی عصمتوں کے متعلق نظریہ کیا تھا \* انبیاء علیہم السلام کی پاک نفسی، ان کی اندرونی و بیرونی طاقتوں کی شائستگی و تہذیب، ان کی بعثت کی غایت و غرض، ان کے منصب کی اہمیت، ملائکہ اللہ کے ساتھ ہمہ اوقات ان کی صحبت اور ان سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ ان کی شرف ہم کلامی کے بعد یہ سوال بھی اہم ہے کہ خود ان کا عقیدہ اس مسئلہ میں اپنے متعلق کیا تھا۔ کیا وہ اپنے نفس کا معاصی کے ساتھ ملوث ہونا تسلیم کرتے تھے کیا اپنے متعلق عدل و انصاف کے خلاف ذرا سا تصور کرنا یا اپنے کسی فیصلہ کو کسی طبعی رجحان کا اثر سمجھ لینا یا ان کے کسی عمل کو خلافِ اولیٰ پر حمل کرنا کسی کے لیے جائز سمجھتے تھے۔ یا اس کے برعکس جہاں ان کے متعلق کسی ادنیٰ سے وسوسہ کا احتمال بھی پیدا ہو سکے اس کے ازالہ کا پورا پورا اہتمام فرماتے تھے۔ جہاں تک حدیثوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شانِ عبدیت و تواضع کے باوجود اپنے حق میں اس قسم کے تصور کی کسی کے لیے کبھی کوئی گنجائش نہیں دی بلکہ اگر کسی نے آپ کے عمل کو آپ کی رفعت شان اور اپنی کمتری کی وجہ سے بھی ناقابلِ اتباع سمجھا ہے تو اس پر بھی آپ کو سخت ناگواری گذری ہے۔ دیکھو ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۳۹۵ و ۳۹۶ اور ج ۲ ص ۳ و ۳۹۸ یہ بات دوسری ہے کہ جب کبھی مخلوقات کے دائرہ سے نکل کر معاملہ بارگاہِ صمدیت کے سامنے آ گیا ہے تو پھر وہ عجز و نیاز احد انابت و استغفار کا ایک پیکر بن گئے ہیں اور یہی شانِ انبیاء علیہم السلام ہونی چاہیے۔

مسئلہ عصمت کی بحث میں ایک فروگزاشت \* درحقیقت اسی دقیق فرق کے ذہول سے ان کی عصمت کے خلاف بے وجہ ایک تعمیر کھڑی کر لی گئی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس رخ پر بھی اصولی طور پر قدرے روشنی ڈال دی جائے۔

سب سے پہلے یہاں دو باتیں سامنے رکھنی چاہئیں ایک یہ کہ لغت عرب میں خطاء، ذنب، زلۃ، اسراف اور معصیت سب



متراشف الفاظ نہیں ہیں۔ ہم یہاں صرف ان کے اردو ترجموں پر کفایت کرتے ہیں۔ اردو میں بھی غیر ارادی غلطی۔ ناشائیاں کام۔ لغزش۔ زیادتی۔ اور نا فرمانی کا مفہوم الگ الگ ہے یہاں سب کا ترجمہ گناہ کر دینا صحیح نہیں ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کسی عمل پر بھی معصیت کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ صرف ایک آدم علیہ السلام کے معاملہ میں یہ لفظ ضرور استعمال ہوا ہے مگر اس کی تشریح ابھی آپ کے سامنے آتی ہے۔

دوم یہاں بڑی اہمیت کے ساتھ اس پر بھی توجہ کرنی چاہیے کہ جن آیات کو ان کی عصمت کے خلاف سمجھا گیا ہے۔ کیا وہ عمل ان کی نظروں میں بھی ان کی عصمت کے خلاف تھے؟ اس کے فیصلہ کے لیے سب سے واضح حدیث شفاعت کی حدیث ہے جہاں ہر نبی نے شفاعت کے لیے قدم نہ اٹھانے کا سبب اپنی اپنی زبانوں سے خود بیان کیا ہے یہاں ہم کو کسی حدیث سے ثابت نہیں ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے متعلق شرک فی التسمیہ کا ایک حرف بھی کہا ہو یا حضرت خلیل علیہ السلام کی زبان مبارک سے ﴿رَبِّ ارْنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتِیَ﴾ کی فرمائش پر اپنی ندامت کا ایک کلمہ بھی نکلا ہو بلکہ یہاں جو فہرست ہمارے سامنے آتی ہے اس میں حضرت آدم علیہ السلام کا شجرہ ممنوعہ کھا لینا، حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے ایک عزیز کے حق میں طوفان سے حفاظت کے لیے نادانستہ طور پر سفارش کرنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی زبان سے دین کی حمایت میں تین مختلف مقامات پر تور یہ کے کلمات کہہ گزرنا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک عمل ہے جو نبوت سے پہلی زندگی میں ان کے دشمن کی موت کا باعث بن گیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا ان کو خدا تعالیٰ کا شریک ٹھہرا لینا معلوم ہوتا ہے اور بس۔

حضرت آدم علیہ السلام کی زلت قرآن کریم کی نظر میں \* جب قرآن کریم کی روشنی میں اس پر نظر کی جاتی ہے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ نظر ربوبیت میں سب سے اہم سمجھا گیا تھا مگر خود قرآن فی تفصیلات جو ان کے اس اقدام کے متعلق نظر آتی ہیں وہ یہ ہیں:

هَلْ اَدْلٰکَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْکِ لَا یَبٰی. (طہ: ۱۲۰)

(شیطان نے ان سے کہا تھا کہ) کیا میں تم کو بتاؤں صدا زندہ رہنے کا درخت اور لازوال بادشاہت۔

وَقَا سَمَہُمَا اِنِّیْ لَکُمَا لِمَنْ النَّا صِحِیْنِ فَدَ لَہُمَا بَغْرُور. (اعراف: ۲۱-۲۲)

اور ان کے آگے قسم کھائی کہ یقین کرو میں تمہارا خیر خواہ دوست ہوں اور اس طرح فریب دے کہ ان کو مائل کر لیا تھا۔

فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا. (طہ: ۱۱۵)

آدم بھول گئے تھے اور اس میں ہم نے ان کا ارادہ ذرا بھی نہ پایا تھا۔

ان آیات کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو بات ان کے سامنے ان کی فریب دہی کے لیے رکھی گئی وہ خدا تعالیٰ کی جنت میں ان کی دائمی زندگی تھی اور اس کی توثیق و تصدیق کے لیے خدا تعالیٰ کا نام لے کر ان کے سامنے قسم کھائی گئی پھر جس طرح ہر انسان اپنی کسی انتہائی کامیابی اور بے نہایت فوز و فلاح کے تصورات و تمناؤں میں پڑ کر دوسری جانب سے ذہول میں پڑ جایا کرتا ہے۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی اور حضرت آدم علیہ السلام کو قرب ایزدی کی تمناؤں پھر شیطان کی قسموں کے سامنے یہ خیال بھی نہ رہا کہ مجھ سے کہا گیا تھا بس اس فریب میں آ کر پوری فراموشی کے عالم میں ان سے اس خلاف ورزی کا ارتکاب

ہو گیا۔ قرآن کریم نے ضرور اس کو معصیت کہا ہے، لیکن اس کی تشریح بھی جو خود اس نے بیان کی ہے اس کے بعد کسی انسان کو ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر معصیت کا لفظ اطلاق کرنے کا حق نہیں رہتا یعنی یہاں معاملہ کی نوعیت ہے اتنی نازک ہو گئی تھی کہ اس کے سامنے کسی فرد سے تحمل و صبر کرنا مشکل تھا۔ ادھر ان کے نسیان کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے درحقیقت وہی ان کی عصمت اور بے گناہی کا بڑا ثبوت ہے۔ پھر غور فرمائیے کہ صرف ان کی فراموشی کے ذکر پر کفایت نہیں کی گئی بلکہ پورے مبالغہ کے ساتھ اس کا منفی پہلو بھی صاف کر دیا گیا ہے اور اس کو بھی لفظ ”و لم یعزم“ سے اداء نہیں کیا گیا جس کا ترجمہ یہ ہوتا کہ انہوں نے پختہ ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ یوں فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں ان کے ارادہ کا ذرا بھی دخل نہ تھا۔ پس اگر قرآن کریم سے ان کے اس عمل کا معصیت ہونا ثابت ہوتا ہے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف نسیان کا ایک قدم تھا۔

**مقام عصمت کی نزاکت کا تقاضہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع میں کسی ناشایاں عمل کی صورت بھی حقیقت کی برابر شمار ہو \*** اب اگر ان دونوں باتوں کو جمع کر لو تو نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا غیر ارادی عمل بھی دوسروں کے ارادی عمل کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں معصیت کی حقیقت گونہیں ہوتی مگر جس عمل کی صورت نا فرمانی کی صورت ہو وہ بھی ان کے حق میں اس عمل کے مشابہ سمجھا جاتا ہے جو حقیقت میں بھی معصیت ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے سمجھنے کے لیے دو باتیں سامنے رکھنی چاہئیں مقام عصمت کی نزاکت۔ دوم بارگاہ الوہیت کی شان عظمت مقام عصمت کی نزاکت چاہتی ہے کہ جب ایک طرف عصمت ہے تو دوسری طرف نسیان بھی کیوں ہو اور اگر کسی مصلحت کے پیش نظر ایسا ہو جائے تو اس پر مواخذہ کیوں کیا جائے۔ ترجمان السنہ جلد دوم کے اوائل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے یہ سوال کیا بتاؤ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے تو اپنے اندازہ فہم کے موافق جو جواب انہوں نے دیا وہ یہی تھا کہ فرشتوں کا اور انبیاء علیہم السلام کا مگر آپ نے اس پر یہ فرمایا ان کے سامنے تو عالم قدس سب کھلا ہوا موجود ہوتا ہے وہ کیوں ایمان نہ لائیں (پوری حدیث اور اس کی تشریح وہاں دیکھ لی جائے) اس سے معلوم ہوا کہ جو بات عام لوگوں کے حق میں کمال شمار ہوتی ہے اگر یہاں وہ موجود ہو تو کچھ قابل تعجب نہیں ہوتی۔ آفتاب سے اگر روشنی نکلتی ہے تو نکلتی چاہیے تعجب کی بات کیا ہے کمال سے کمالات ہی کا صدور ہوا کرتا ہے۔ یہاں تعجب ہوتا ہے تو اس پر کہ اس کمال پر ان کے منصب کے خلاف کوئی بات سرزد ہوتی ہے تو کیوں عام انسان اگر بھولتے ہیں تو رحمت اس کو درگزر کرنے کے لیے تلی ہوئی نظر آتی ہے لیکن جن کے قالب بھی اس جہان میں اہل جنت کے

۱۔ کتاب الا انبیاء صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک شخص نے چوری کی جب عیسیٰ علیہ السلام نے اس کو سرزنش کی تو اس نے قسم کھا کر کہا میں نے چوری نہیں کی اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے صرف دو راستے تھے یا وہ اس قسم کھانے والے کو متہم کرتے یا اپنی نظر کو متہم کرتے۔ انہوں نے سنت آدم علیہ السلام پر عمل کیا اور اپنی نظر کا قصور قرار دینا اس سے آسان تر سمجھا کہ وہ کسی شخص پر اللہ تعالیٰ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی تہمت لگائیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن القیم سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ابلیس کے قسم کھانے کے بعد تصدیق کرنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس چور کی تصدیق کرنے کی صفت نبوت یکساں نظر آتی ہے۔ (دیکھو ترجمان السنہ ص ۲۳۶ ج ۲ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں منقول ہے ”و کان و قافا عند سماع آية من القرآن“ وہ بھی اسی جنس کی ایک صفت تھی۔



مشابہ ہوں ان سے کسی ادنیٰ سی بات کا ذہول ہوتا ہے تو اس پر فوراً مواخذہ ہونے لگتا ہے قدرت نے اگر ایک طرف ان کو معصوم پیدا کیا ہے تو دوسری طرف ان کی گرفت بھی سخت کر دی ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب عصمت ہے تو پھر یہ فرو گذاشت کیوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول بھی ہو گئی اور ان کو خلعت خلافت سے نواز بھی دیا گیا مگر اپنے اس نسیان کا انفعال پھر محشر تک ان کے قلب سے محو نہ ہو سکا یہ اس لیے نہیں کہ یہاں معصیت کی حقیقت کا کوئی وجود تھا بلکہ یہ صرف ان کی عصمت کا اقتضاء تھا کہ جب عصمت تھی تو نسیان سے بھی ایسا عمل کیوں ہوا۔ بعض روایات میں ہے کہ جب اہل محشر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں سفارش کے لیے آئیں گے تو وہ بڑے انفعال کے ساتھ یہ عذر فرمائیں گے کہ مجھ کو تو میری قوم نے خدا تعالیٰ کے سواء معبود بنا لیا تھا۔ اب سوچئے کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جرم کیا تھا۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی فطرت اتنی پاکیزہ ہوتی ہے کہ ان کی امتوں کی معصیتوں کی چھینٹیں بھی ان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ دیکھئے یہاں صرف معصیت کا گو کوئی شائبہ نہ تھا مگر پھر مقام عصمت اپنوں کی معصیت سے منفعل تھا۔ پس جہاں دوسروں کی معصیت سے تاثر کا یہ عالم ہو وہاں بھلا خود کسی معصیت کا تصور کیا ہو سکتا ہے۔

یہ تو مقام عصمت کی نزاکت کا مختصر سا حال تھا اب خدائے قدوس کی رفعت و بلندی کا ہلکا سا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے متعلق بھلا کیا لب کشائی کی جاسکتی ہے۔ بس اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ جو متفق علیہ معصوم مخلوق ہے جب اس کا معاملہ بھی خالق کائنات کے سامنے آ گیا تو وہ بھی سرتاسر قصور نظر آنے لگی۔ اسی معاملہ میں فرشتوں کی سرگذشت ذرا سامنے رکھ لیجئے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حرف معصیت سے یہ مسلوب الاختیار مخلوق بھی شاید انسانوں کی صف میں کھڑی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کے سلسلہ میں فرشتوں کا ایک ہی واقعہ ہمارے سامنے آیا ہے اگر کہیں دو چار واقعات اسی طرح کے اور سامنے آ جاتے تو شاید ہمارے علماء کلام کو یہاں بھی تردد پیدا ہو جاتا مگر چونکہ اس طرف ان کا ایک ہی واقعہ سامنے تھا دوسری طرف ان کی عصمت کا عقیدہ حاصل تھا۔ اس لیے اس واقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی حالانکہ حقیقت واضح ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ یہاں حقیقت معصیت کا صدور ہوتا ہے لیکن جب کبھی مخلوق کا معاملہ خالق کائنات کے سامنے آ جائے تو ایک طرف قادر مطلق دوسری طرف مجسم بے چارگی موجود ہوتی ہے اس لیے ہزار عصمت کے باوجود یہاں معاملہ قصور در قصور ہی کا نظر آتا ہے اسی لیے جب اسی معاملہ کو خالق کائنات کے دربار سے الگ کر کے صرف ایک معاملہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو اس میں ایک حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ مقدمہ جب حق تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوا تو اس میں معصیت کا لفظ تک بھی استعمال ہوا اور یہاں تک بھی اس نے طول پکڑا کہ عالم کے ایک بہت بڑے انقلاب کی یہی ایک لغزش بنیاد بن گئی۔ لیکن جب اسی واقعہ کو خالق کائنات کے حضور سے اٹھا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے مابین رکھا گیا تو حسب بیان حدیث شریف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لا جواب ہو جانا پڑا یعنی (جب حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے یہ فرمایا ”والد بزرگوار! آپ نے ذرا سی لغزش کر کے اپنی ساری اولاد کو جنت سے باہر نکلوا دیا۔“ تو اس پر حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا ”اے موسیٰ تم کو تو رات ملی ہے جو میرے وجود سے بھی سالوں پہلے علم الہی میں موجود تھی کیا اس میں میری اس لغزش کا ذکر نہیں؟ پھر والد پر اس عمل کے ارتکاب سے کیا اعتراض جو اس کے وجود سے بھی

پہلے اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔“ یہ وہی آدم ہیں کہ جب ان کا مقدمہ خالق کائنات کے سامنے پیش تھا اور سوال بعینہ یہی تھا تو بجز اعتراف و توبہ کے جواب کا ایک حرف نہ تھا۔ پس جب مخلوق کا کوئی معاملہ خالق کائنات کے سامنے آ جائے بس سمجھ لو کہ اب اس کی صفائی مشکل ہے یہاں اعترافِ خطاء ہی ایک صحیح راستہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب محشر میں تمام مخلوق کے حساب کا کٹھن مرحلہ سامنے آئے گا تو وہ رحمتِ جواہل دنیا میں صرف ایک حصہ نازل فرمائی گئی ہے پورے سو حصوں کے ساتھ مخلوق کا حساب لینے کے لیے آ جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل محشر میں ایسا کون تھا جو محض اپنے عمل کے بل بوتہ پر فردوس بریں کا مستحق بن سکتا۔

افسوس ہے کہ لغزشوں کو چن چن کر اس طرح بیان فرمانے کی روح تھی تو کیا اور اس کو سمجھا گیا کیا۔ مقصد تو یہ ظاہر کرنا تھا کہ کن حالات میں کیا قدم اٹھایا گیا تھا پھر وہ بھی عمر بھر میں گنتی کے کتنے واقعات تھے مگر ان کو بھی ان کی شان سے کتنا بعید سمجھا گیا۔ اس سے نتیجہ تو یہ نکالنا چاہیے تھا کہ جن کی اتنی سی فروگذاشت پر بھی اتنی گرفت ہو وہ کس درجہ معصوم ہوتے ہیں مگر یہاں جو نتیجہ نکالا گیا وہ بالکل اس کے برعکس تھا، والعیاذ باللہ اگر مقام عصمت کی نزاکت اور بارگاہ الوہیت کی بلندی کو سامنے رکھ کر یہ واقعات پڑھے جاتے تو یہی ان کی معصومیت کا سب سے بڑا ثبوت نظر آنے لگتے۔

الحاصل اگر فیصلہ صرف قرآن کریم کے طرزِ خطاب پر ہی دائر کر دیا جائے اور متکلم و مخاطب کی ان خصوصیات کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے تو پھر یہاں کبار و صغائر کی بحث تو درکنار بلکہ شاید کفر و اسلام میں بھی بحث پیدا ہو سکتی ہے والعیاذ باللہ بلکہ اگر بحث و نظر کا یہی طریقہ ملائکہ اللہ کے معاملہ میں بھی قائم رکھا جائے تو پھر ان کی متفق علیہ عصمت سے بھی شاید ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی تحریر فرماتے ہیں:

فَعَلِمَ أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ لَا يَشَارُكُونَ  
غَيْرَهُمْ فِي ارْتِكَابِ حَرَامٍ وَلَا مَكْرُوهِ إِلَّا  
لِبَيَانِ الْجَوَازِ وَلَكِنْ لَمَّا شَرَفَ مَقَامَهُمْ  
سَمَّى اللَّهُ تَعَالَى وَقْعَهُمْ فِي خِلَافِ  
الْأُولَى مَعْصِيَةً وَخَطِيئَةً.

(اليواقيت و الجواهر ج ۲ ص ۵۹)

و القاعدة ان كل من عظمت مرتبه عظمت

صغيرته. (ج ۲ ص ۶۲)

ہمارے بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام ارتکابِ حرام یا مکروہ میں دوسرے انسانوں کے شریک نہیں ہوتے اگر کسی مکروہ تنزیہی فعل کا وہ ارتکاب کرتے ہیں تو وہ بھی صرف اس کے جواز کا پہلو بنانے کے لیے کرتے ہیں ان کا قدم اگر اتفاق سے کہیں خلافِ اولیٰ میں جا پڑتا ہے تو ان کے مقام کی نزاکت کی وجہ سے اسی کا نام معصیت اور خطا بن جاتا ہے۔

یہاں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس کا مرتبہ جتنا بلند ہوتا ہے اس کی معمولی باتوں پر گرفت بھی اتنی ہی سخت ہوتی جاتی ہے۔

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے چند جزئی واقعات کے علاوہ کچھ آیتیں ایسی بھی ملتی ہیں جن کو ان کی عصمت کے خلاف سمجھا گیا ہے۔ مثلاً معاصی، رذائل، اور دیگر نوع کے قبیح افعال سے اجتناب کے خطابات۔ ہمارے نزدیک یہ بھی کلام کی فصاحت و بلاغت کے اسلوب سے ناآشنائی کا ثمرہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ دنیا میں کلام کا ایک طریقہ ہے۔ گفتہ آید در حدیث دیگران بھی ہے



فالحطاب له و المراد غیرہ۔ ان  
الحق من شأنہ ان يؤدب الكبير  
بالصغير و كما ادب الله الامۃ  
بتاديب رسولها۔  
ان مقامات پر خطاب گو آپ کو ہے مگر مراد دوسرے لوگ ہیں حق تعالیٰ  
کی شان یہ ہے کہ وہ کبھی چھوٹوں کی تنبیہ کے ذریعہ بڑوں کو ادب سکھاتا  
ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ خطاب رسول کو ہوتا ہے اور مقصود ان کی  
امت کو ادب سکھاتا ہوتا ہے۔

بعض آیتوں میں شرک و کفر اور اس قسم کے دوسرے افعال سے اجتناب رکھنے کی بھی ان کو ہدایت کی گئی ہے۔ شیخ لکھتے ہیں  
کہ یہاں بھی ان کی ذات مقصود نہیں ہوتی بلکہ کفار مراد ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ کو یہ اظہار منظور ہوتا ہے کہ ان کو اپنا مخاطب بنانا بھی  
اس کو پسند نہیں ہے۔ اگر وہ ہمارے رسول سے ہمارے کلام کا بغور سننا پسند نہیں کرتے تو ہم بھی ان کو اپنا مخاطب پسند نہیں کرتے۔  
و الحکمة فی هذا الخطاب مقابلة لا عراض الکفار  
عن استماع ما جاء به الرسول فلذلك اعرض الحق  
عنهم مقابلة اعراض باعراض مع كونهم هم المراد  
بذلك الخطاب فاسمعهم فی غیرهم عقوبة لهم و  
استهانة بامرهم۔ (ج ۲ ص ۱۴)  
اس طرز خطاب میں یہ بھی حکمت ہوتی ہے کہ چونکہ وہ  
ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہمارے کلام  
کے سننے سے اعراض کرتے ہیں اس لیے اس کی جزاء  
یہ ہے کہ ہم بھی ان کو ناقابل التفات سمجھ کر ان سے  
خطاب نہ کریں اگرچہ مراد وہی ہوں۔

ہمارے نزدیک شیخ موصوف کی یہ رائے بہت صحیح ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بعض آیتوں میں آپ کو ان امور سے بھی  
خطاب کیا گیا ہے جن کا عقلاً کوئی امکان ہی نہ تھا مثلاً والدین کے ادب و احترام کے سلسلہ میں آپ کو اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ  
ان کے سامنے اف کا کلمہ بھی نہ نکالا جائے و لا تقل لهما اف و لا تنهرهما۔ اب کون نہیں جانتا کہ اس وقت آپ کے والدین  
موجود ہی کہاں تھے اس لیے مخاطب گو یہاں آپ نظر آئیں مگر یقیناً مراد آپ کی امت ہے۔ اس کے علاوہ اس طرز خطاب میں ایک  
بڑی حکمت ان امور کی اہمیت پر تنبیہ کرنی ہوتی ہے۔ یعنی مثلاً شرک و کفر جب ایسے خطرناک عمل ہیں کہ اگر بالفرض رسول کے حق میں  
بھی ان کا تصور کیا جائے تو اس کے اعمال کے لیے بھی تباہ کن ہوں گے تو بھلا دوسروں کے اعمال کے لیے تباہ کن کیونکر نہ ہوں گے۔  
یہی وجہ تھی کہ یہ سب آیتیں دشمنوں کے سامنے تلاوت کی جاتی تھیں اور وہ ان پر غیر معقول سے غیر معقول اعتراضات بھی  
کرتے تھے مگر یہ کبھی ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کے کیر کڑ اور اس کے ذاتی کار و کردار پر بھی کبھی ان کو کوئی اعتراض ہوا ہے یا ان  
آیات کو انہوں نے خود رسول کے برخلاف شہادت سمجھا ہے کیونکہ وہ ذوقِ سخن سے خوب واقف تھے اور اس قسم کے خطابات کا  
مقصد بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔

انبیاء علیہم السلام کی شان استغفار عصمت کے خلاف نہیں \* اسی طرح رسولوں کی شان استغفار تو بہ کا مسئلہ بھی واضح  
ہے۔ یہ بھی اس بناء پر نہیں ہوتا کہ وہ درحقیقت کسی ادنیٰ سی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ مقام عصمت کی نزاکت اور بارگاہ  
صمدیت کی بے نیازی کا استحضار اپنے نفسوں کی برأت اور تزکیہ کا ان کو تصور کرنے نہیں دیتا اس لیے وہ اس بارگاہ میں جہاں بے  
قصور کا دعویٰ کرنا ہی سب سے بڑا تصور ہے اپنے لیے توبہ و استغفار کرتے رہتے ہیں اور مقصود یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے مقبول

احاطہ میں ان کی امتیں بھی شامل ہو جائیں۔ کیونکہ نظرِ رحمت اگر مجرموں کی طرف نظر کرتی ہے تو ان ہی کے واسطے سے کرتی ہے اور ہماری استغفار کی اس دربارِ عالی تک کوئی رسائی ہو سکتی ہے تو ان نفوسِ قدسیہ ہی کے واسطے سے ہو سکتی ہے۔ اب آیات ذیل پر توجہ کے ساتھ ذرا غور فرمائیے کہ درحقیقت ان کا مصداق ہے کون۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو یہاں پہلے نمبر میں رکھا گیا ہے تو کیوں؟

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَ  
الْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ  
بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَابَ  
عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رءُوفٌ رَحِيمٌ وَعَلَى الثَّلَاثَةِ  
الَّذِينَ خُلِفُوا. (توبہ: ۱۱۷-۱۱۸)

اور اللہ تعالیٰ مہربان ہوا نبی پر اور ان مہاجرین و انصار پر جو  
ساتھ رہے نبی کے مشکل کی گھڑی میں۔ اس کے بعد کہ قریب  
تھا کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جائیں پھر مہربان ہوا ان  
پر بے شک وہ ان پر مہربان اور رحم کرنے والا ہے اور ان تین  
شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا۔

یومَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ.  
(التحریم: ۸)

جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان  
لائے ان کے ساتھ۔

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُمْ مِنْ قَبْلُ وَإِيَّايَ.  
(الاعراف: ۱۵۵)

انہوں نے عرض کی اے رب اگر تو چاہتا تو ان کو پہلے ہی ہلاک  
کر دیتا اور مجھ کو بھی۔

وَاسْتَغْفِرْ لِدُنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ. (محمد: ۱۹)

اور استغفار کرو اپنے گناہ کے لئے اور مؤمنوں کے گناہ کے لئے۔

پہلی آیت میں غزوہ تبوک کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں تین صحابہ سے کچھ تساہل ہو گیا تھا لیکن جب ان کی توبہ کی قبولیت کا وقت آیا تو یہاں سب سے پہلے اپنے معصوم رسول کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری آیت قیامت کے دن کا واقعہ ہے جہاں نبی کی ذات کے لئے رسوا ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں تیسری آیت بنی اسرائیل کی اس خود سری کے متعلق ہے جب کہ انہوں نے کوہ طور پر جا کر خود اپنے کانوں سے کلامِ الہی سن لیا تھا، مگر اس پر بھی وہ ایمان نہ لائے اور ایک دوسری گستاخی یعنی رویت باری تعالیٰ کی ناممکن بات کی فرمائش کر بیٹھے آخر اس گستاخی کی ان کو سزا ملی اور سب ہلاک کر دیئے گئے اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے ترجم کی درخواست میں یہ کلمات نکل گئے۔ حضرت شاہ عبدالقادر کے فوائد سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس قسم کے مواضع پر سب سے پہلے اپنے نفسوں کو اس لئے شامل فرما لیتے ہیں کہ ان کو معصوم نفوس کی شمولیت کی برکت سے مجرموں کے لئے بھی یہ درخواستیں قابل توجہ بن جائیں۔ رحمت ان کے نام پر جھک پڑتی ہے پھر اس کی دسعت مجرموں سے کترانا گوارا نہیں کرتی اور اس طرح مجرموں کی بخشش کا یہ ایک یقینی ذریعہ بن جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی استغفار و توبہ میں اس حکمت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ہماری اس تفصیل کے بعد اب آپ کو عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا مفہوم خوب واضح ہو گیا ہو گا اور یہ بات بھی صاف ہو گئی ہو گی کہ عصمت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان میں معصیت کا داعیہ تو پیدا ہوتا ہے مگر پھر قدرتِ ایزدی ان کو اس کے ارتکاب کرنے سے روک لیتی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی نہاد ہی میں جو بشری قوتیں رکھی جاتی ہیں وہ فطرۃً اتنی شائستہ اور مذہب رکھی جاتی ہیں



کہ ان میں کسی معصیت کی طرف ادنیٰ سارحجان ہی نہیں ہوتا۔ جس طرح کہ ایک لطیف مزاج انسان کو نجاست اور گندگی سے طبعی نفرت ہوتی ہے اسی طرح ان نفوس قدسیہ کو معصیت کی ہر نوع سے طبعی نفرت ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی حکم برداری میں ان کو وہ طبعی راحت محسوس ہوتی ہے جو مچھلی کو پانی میں اس لیے وہ اپنے قصد و ارادہ سے کسی ادنیٰ سی معصیت کا تصور بھی نہیں لا سکتے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان میں بھوک، پیاس، غضب، محبت اور اسی قسم کی دوسری بشری قوتیں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں۔ اگر ان میں یہ قوتیں موجود نہ ہوں تو پھر ان کی عصمت اتنا بڑا کمال ہی کیوں ہو اور ملائکہ اللہ کی عصمت سے ان کو امتیاز ہی کیا رہے۔ یہاں فرق ہے تو یہی ہے کہ ملائکہ اللہ اگر معصوم ہیں تو اس لیے کہ ان میں سرے سے یہ قوتیں ہی موجود نہیں وہ اگر معصیت کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ان کی شان میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (تحریم: ۶)

وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اس میں جس کا ان کو حکم ہوتا ہے اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ اللہ کی عصمتوں میں فرق \* آیت بالا کا مقصد ملائکہ کی صرف عصمت بتانی نہیں ہے بلکہ الگ اپنی ایک ایسی مخلوق بتانی ہے جس میں خیر کے سوا شر کی طاقت ہی نہیں اس لیے وہ معصیت کر ہی نہیں سکتے بلکہ نیکی بھی صرف وہی کر سکتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے اسی لیے نہ ان میں ترقی کا کوئی احتمال ہوتا ہے نہ تنزل کا۔

﴿وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ﴾ اور ہم میں جو بھی ہے اس کا ایک معلوم مقام ہے (اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا) (الصافات: ۱۶۴)

اور اسی لیے قرآن کریم میں کسی جگہ اپنے حق میں توبہ و استغفار کی نسبت ان کی طرف نہیں کی گئی وہ اگر استغفار کرتے ہیں تو بنی آدم کے لیے ان کے حق میں توبہ و استغفار کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں اس لیے وہ حق تعالیٰ کی صفات میں سے صفت غفار و قہار رزاق کا ذوق بھی نہیں رکھتے۔

﴿وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَن فِي الْأَرْضِ﴾ (الشوری: ۵)

اور فرشتے تسبیح کرتے ہیں اپنے رب کی اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں۔

یعنی فرشتوں کا وظیفہ اپنے لیے صرف تسبیح و تحمید ہے اور اہل زمین کے حق میں استغفار اور ان کے لیے بخشش مانگنا۔ وظائف کی یہ تقسیم اتفاقی نہیں بلکہ انسانی اور ملکی خلقت کی تقسیم میں مبنی ہے۔ فرشتے چونکہ معصیت سے منزہ بنائے گئے ہیں اس لیے ملکوتی وظیفے یعنی تسبیح و تقدیس کے ساتھ استغفار بھی اس کے وظیفہ میں شامل ہے پھر چونکہ بشریت اس کی جو ہر ذات ہے اور ملکیت اس کی مفت اس لیے اس کا خاص وظیفہ استغفار ہے۔

اب یہ غور کر لینا چاہیے کہ ان دو عصمتوں میں سے بلند عصمت کون سی ہے کیا وہ عصمت جو جبری ہو؟ یا وہ عصمت جو اختیاری

۱۔ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا ارحسنی یا بلال پھر ایک حدیث میں فرمایا جعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ۔

ہو؟ کمال یہ ہے کہ قوتیں سب ہوں مگر سب شائستہ اور مہذب ہوں یا کمال یہ ہے کہ سرے سے وہ قوتیں ہی مفقود ہوں؟ ملک اور فرشتہ ہونا بھی بے شک ایک کمال ہے مگر اس کمال میں تمام تر کمال صانع ہی کا ظاہر ہوتا ہے خود فرشتوں کی اس میں تعریف کیا ہے لیکن بشر ہو کر اگر پھر وہ فرشتہ صفت ہو تو یہ اس کی بھی تعریف ہے اور اس سے بڑا کمال ہے۔ زنان مصر ایک طرف تو اس کا یقین رکھتی تھیں کہ جس کے حسن و جمال کا وہ نظارہ کر رہی ہیں وہ بے شبہ ایک بشر کی صورت ہے مگر جب وہ اس کی عفت و عصمت کا نقشہ دیکھتی تھیں تو ان کو اپنے اس چشم دید یقین میں بھی شبہ گزرنے لگتا تھا۔ ذیل کی آیت میں ان کی اس حیرت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

﴿مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ (یوسف: ۳۱) یہ شخص آدمی نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔

گویا کھلے طور پر بشر ہو کر یہ پاک بازی ایسی ہے جیسی فرشتوں میں بھی کسی بڑے فرشتہ کی ہو سکتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اس قسم کی گویا کوئی طاقت ہی نہیں ہے۔ پس اسباب و دوائی موجد ہونے کے باوجود معصیت سے نفور ہونا جتنا قابل تعجب ہے ان اسباب کے نہ ہونے کی صورت میں معصیت سے نفور ہونا اتنا قابل تعجب نہیں۔ ملک اگر پاک بازی دکھلائے تو یہ اس کی فطرت ہے مگر تعجب تو اس پر ہے جو ہے تو بشر مگر اس کی پاک بازی کا نقشہ پھر وہ ہے جو ملک کا ہونا چاہیے۔

اچھا جب ان کی صفت عصمت کا عالم یہ ہوتا ہے تو پھر ان کی حفاظت الہی اور فرشتوں کی اعانت کا مطلب کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ انسان خلق ضعیف بنایا گیا ہے جیسا کہ خلق الانسان ضعیفا سے ظاہر ہے اس لیے بعض مرتبہ وہ مقابل طاقتوں کا پورا پورا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس کا امکان نظر آنے لگتا ہے کہ اپنے قصد و ارادہ کے بغیر اس کا قدم لغزش کر جائے۔ انبیاء علیہم السلام کا معاملہ صرف ایک انفرادی معاملہ نہیں ہوتا پھر ان کی آزمائش بھی معمولی انسانوں کی آزمائش کی طرح نہیں ہوتی۔ ایک طرف تنہا وہ ہوتے ہیں دوسری طرف کفر کا پورا جتھا سامنے ہوتا ہے جو ان کے مقابلہ پر ایسی ایسی تدابیر اختیار کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ پہاڑ بھی ہو تو وہ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائے۔

﴿وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ (ابراہیم: ۴۶)

انہوں نے اپنی سب تدابیر کر ڈالی تھیں اور ان کی یہ سب تدابیر اللہ تعالیٰ کے سامنے تھیں۔ اگرچہ ان کی تدابیر ایسی تھیں کہ پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا دیں۔

اس لیے قرآن کریم نے ان کی اس پاک نفسی کو بھی ذکر کیا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے ماحول کی اس نزاکت پر بھی تنبیہ فرمائی ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ان حالات میں اگر کسی میں غلط قدم اٹھانے کے دوائی و اسباب نہ بھی ہوں تو بھی اگر کسی خارجی باعث سے انسان کا قدم اس طرف اٹھ جائے تو کچھ بعید نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کے نگراں ہم ہوتے ہیں اس لیے وہ ان نازک مواضع میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں اور ان موانع کے باوجود ان کی عصمت میں ذرا فرق نہیں پڑتا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں دیکھئے حالات کتنی نزاکت اختیار کر چکے تھے یعنی جس طرف سے انکار کا خطرہ ہو سکتا تھا اب اسی جانب سے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت دی جا رہی تھی۔ سوء اور فحشاء کی بھیانک صورت سے ورہ خود خواہ کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں مگر وہ از خود ان کے اتنا قریب آچکا تھا کہ اگر کوئی طاقت اس کو دھکا نہ دے دیتی تو اگر یہ از خود اس میں نہ گرتے



تو یقیناً وہ خود آ کر ان کو گھیر چکے تھے۔ جب صورت حالات اتنی نزاکت اختیار کر گئی تو دیکھو پروردگار کی حفاظت کس طرح مدافعت کے لیے سامنے آ گئی اور کس طرح حضرت یوسف علیہ السلام پر اس کا ذرا ساداغ بھی نہ لگ سکا۔ صورت حالات کی اسی نزاکت کو اس آیت میں ادا کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأٰهُنَّ  
رَبُّهُ (یوسف: ۲۴)

عورت نے تو یوسف کا ارادہ کر لیا تھا اور اگر یوسف اپنے پروردگار کی محبت اور برہان نہ دیکھتے تو وہ بھی عورت کا ارادہ کر لیتے۔

یعنی ایک جانب تو ارادہ ہو ہی چکا تھا اور اس بناء پر دوسری جانب میں عصمت کے خلاف جتنے اسباب ہو سکتے تھے وہ سب موجود ہو گئے تھے اور نقشہ کچھ ایسا بن گیا تھا کہ اگر کہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے برہان رب نہ آ جائے تو اس طرف سے بھی قصد پیدا ہو جانا کچھ بعید نہ تھا مگر ان حالات کے باوجود پھر یہ ارادہ بھی کیوں نہ ہو سکا؟ اس لیے کہ ان کے رب کی برہان ان کے سامنے تھی پھر جب اس طرف ارادہ کا بھی وجود نہ تھا تو عصمت کے اس بلند مقام کو اداء کرنے کے لیے جو تعبیر یہاں اختیار کی گئی ہے وہ بھی کتنی بلند ہے۔

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ  
مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ  
یہ برہان دکھانا اور اس طرح ثابت قدم رکھنا اس لیے تھا تاکہ ہم ہٹائیں اس سے برائی اور بے حیائی کو بے شک وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں ہے۔ (یوسف: ۲۴)

یہاں لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَ الْفَحْشَآءَ نہیں فرمایا گیا یعنی صرف کا تعلق جو کچھ بھی رہا وہ سوء اور فحشاء کے ساتھ رہا اس کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کچھ نہ تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سوء اور فحشاء چونکہ خود بڑھ کر ان کی طرف آ رہا تھا اس لیے فعل صرف کا تعلق اسی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام چونکہ اپنی جگہ بدستور ثابت قدم رہے اس لیے یوں نہیں فرمایا کہ ہم نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو سوء اور فحشاء سے باز رکھا یہ تعبیر اس وقت مناسب تھی جب کہ یہاں ان کا ادنیٰ سا قدم بھی اٹھانا ثابت ہوتا۔ پس اندازہ لگائیے کہ قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی عصمت بیان کرنے میں کتنی احتیاط سے کام لیتا ہے اور اس کے لیے تعبیر بھی وہ اختیار فرماتا ہے جو ان کی شان عصمت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کر سکے۔ اسی طرح ایک موقع پر آپ کے سامنے منافقین نے ایک مسلمان پر جھوٹی تہمت لگائی اور اس کے لیے اس قسم کے قرائن اور شہادتیں مہیا کر دیں کہ ایک خالی الذہن انسان کے لیے ان کے موافق فیصلہ دیئے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس لیے اگر یہاں آپ مسلمان کے خلاف فیصلہ فرما دیتے تو بالکل قرین قیاس ہوتا، مگر خدائی عصمت نے آپ کو ایسے فیصلہ سے بچالیا اور وحی الہی نے تمام حقیقت کھول کر رکھ دی دیکھئے

۱۔ اس جگہ یہ بحث کرنی کہ وہ برہان رب تھی کیا غیر ضروری بحث ہے جس کے بیان سے سکوت کر لیا گیا اس کی تحقیق میں پڑنا ہمارے لیے بھی مناسب نہیں۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ضرور وہ کوئی ایسی بات ہوگی جو عین اس وقت ان کے سامنے آئی اس سے قبل اس کا ظہور نہ تھا، دوم یہ کہ وہ کوئی ایسی چیز تھی جس سے رویت متعلق ہوئی تھی۔ یعنی نظر آنے کی چیز تھی۔ یہاں اس کا مصداق صرف نفس کی پاکی قرار دینا ظاہر کے خلاف ہے اور یوں باطل کو قلم کے زور سے حق ثابت کر دینا علیحدہ بات ہے و ان من البیان لسحرا کی ایک شرح یہ بھی کی گئی ہے۔

واقعہ کی اس نزاکت پھر آپ کی غیبی عصمت کو قرآن کریم نے کس انداز سے اداء کیا ہے:

وَلَوْ لَا أَنْ تَبْتَئِكَ لَقَدْ كَذَبْتَ تَرْكُنَ إِلَيْهِمْ  
شَيْئًا قَلِيلًا. (بنی اسرائیل: ۷۴)

جاتے۔

یہاں بھی آپ کے حق میں احتیاط کے جتنے پہلو ممکن تھے ان سب کی رعایت کر لی گئی ہے یعنی جس بات کا خطرہ ظاہر کیا گیا ہے وہ آپ کا کوئی عملی قدم نہ تھا بلکہ صرف میلان طبع تھا پھر اس پر لفظ کدت اضافہ فرما کر یہ بتا دیا گیا کہ آپ کا یہ میلان بھی ہوا تو نہ تھا مگر حالات اس کے قریب آ گئے تھے کہ اگر ہم نہ سنبھال لیتے تو ایسا ہو جاتا اسی پر بس نہیں کی گئی بلکہ شیاء کے ساتھ قلیل کی صفت بڑھا کر یہ اور تنبیہ کی گئی کہ اگر آپ کا رجحان ہوتا تو وہ بھی بہت خفیف ہوتا۔ اس معاملہ میں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں یوں معلوم ہوتا ہے گویا بہت سنبھال سنبھال کر الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں ادھر ان کی عصمت کی یہ رعایت ہے دوسری طرف اس کا امتنان بھی منظور ہے کہ اتنی عصمت پر بھی ان میدانوں میں ایسی صاف گلو خلاصی صرف ہماری حفاظت کا ثمرہ ہے۔ اگر ہماری دست گیری نہ ہو تو یہ ممکن نہیں۔ پھر جہاں کسی تکوینی مصلحت سے قدرت یہ دستگیری نہیں فرماتی بس وہیں قدم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ دیکھئے حضرت آدم علیہ السلام کے معاملہ میں جب مشیت الہی نے ان کی ایک ذرا سی لغزش میں عالم کی آبادی کا راز پنہاں فرما دیا تھا تو یہی نازک مراحل ان کے سامنے آ گئے۔ شیطان نے آ کر جو بات ان کے سامنے رکھی وہ خدا تعالیٰ کے دارالرضوان میں دائمی حیات کی دولت تھی جس کے لیے نبی تو نبی ایک عام مسلمان کا دل بھی بے چین ہوتا ہے۔ پھر اس پر جھوٹی قسمیں کھا کر کچھ ایسا سا باندھا کہ جو بات ان سے کہی گئی تھی وہ اس وقت ان کے دماغ سے بالکل نکل گئی مگر چونکہ تکوینی طور پر قدرت ہی کو یہ لغزش منظور تھی اس لیے یہاں ان کو سنبھالا نہیں گیا۔ آخر کار ان کا قدم پھسلا اور یہ آواز آئی۔

وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكَمَا  
الشَّجَرَةِ وَ أَقُلْتُ لَكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ  
مُبِينٌ. (اعراف: ۲۲)

ہے۔

مگر آدم علیہ السلام نے گریہ وزاری کے علاوہ عذر و معذرت کا ایک کلمہ تک منہ سے نہ نکالا کیونکہ جانتے تھے کہ اگر نسیان کا عذر کرتا ہوں تو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اچھا یہ نسیان بھی کیوں ہوا؟ پھر جب انہوں نے یہ شان عبودیت دکھلائی تو ادھر سے شان معبودیت اس طرح ظاہر ہوئی کہ عفو و درگزر کے ساتھ اب خود اس کا عذر بھی بیان فرما دیا گیا۔ سبحان اللہ! انبیاء علیہم السلام بھی کتنے ادب شناس ہوتے ہیں۔ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (طہ) یعنی جو لغزش بھی ان سے ہو گئی وہ صرف نسیان کی بناء پر ہوئی۔ عزم و ارادہ کا تو یہاں نام و نشان بھی نہ تھا ابھی ابھی یا تو یہ باز پرس تھی مگر جب اعتراف جرم ہے تو ابھی یہ نوازش ہے گویا جرم کچھ بھی نہ تھا انبیاء علیہم السلام کی لغزش بھی تمام جہان سے نرالی ہوتی ہے پھر ان کی بخشش بھی سب سے نرالی ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام پر نسیان بھی قدرت ہی کی طرف سے ڈالا جاتا ہے اسی لیے وہ بہت سے انعامات اور جدید احکام الہی کا منشاء بن جاتا ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کتنے اہم مقصد کے لیے تو سفر کیا پھر ان کے رفیق کو ٹھیک مقصود پر پہنچ کر کیا



نسیان ہوا اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے لیے جو علامت ان کو بتائی گئی تھی وہ بچشم خود دیکھنے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کا تذکرہ کرنا بھول گئے اور آگے چل پڑے مگر چونکہ یہ نسیان قدرتِ پروردگار کا لایا گیا تھا اس لیے اس کی یاد دہانی کی شکل بھی قدرت ہی نے پیدا فرمائی وہ یہ کہ اس تمام سفر میں ایک دن بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکان محسوس نہ ہوا تھا مگر آج ذرا دور چل کر ہی ان کو تکان محسوس ہونے لگا اور وہ ذرا دم لینے کے لیے یہ کہہ کر بیٹھ گئے۔ لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا۔ آج کے سفر میں تو ہم کو تکان ہو گیا۔ آخر بیٹھ کر جب ناشتہ دان کھولا گیا دیکھا تو مچھلی نذر تھی اسی وقت ان کے رفیق کو مچھلی منزل کی بات یاد آ گئی اور انہوں نے کہا کہ مچھلی تو میرے سامنے زندہ ہو کر پانی میں گھس گئی تھی ادھر قدرت نے یہ سامان کر رکھا تھا کہ جس جگہ مچھلی گھستی تھی اس جگہ پانی منجمد ہو کر رہ گیا تھا اور وہ جگہ طاق کی شکل میں کھلی کی کھلی باقی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہی تو وہ جگہ تھی جس کی ہم کو تلاش تھی آخر وہ لوٹے اور وہیں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات زندگی اور ان کے سہو و نسیان کے واقعات میں اس پر بھی نظر رکھی جاتی کہ ان میں کیا کیا اسرار اور موعظت و عبر کے کتنے سبق پنہاں ہوتے ہیں تو قرآن کے تکرارِ قصص کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک شب اپنی حرم سرائے میں جانے کا اس لیے ارادہ کیا کہ ہر ہر بی بی سے ایک ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہو۔ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ نبی تھے اس پر فرشتے نے بھی یاد دلایا کہ ان شاء اللہ کہہ لیجئے مگر ان کو یہ مبارک کلمہ کہنا پھر یاد نہ رہا آخر اس کا جو کچھ نتیجہ ظاہر ہوا وہ اسی جلد میں آپ کے سامنے ہے۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام کے نسیان کا قدم بھی گرفت میں آ جاتا ہے۔ اگر کہیں قدرت ان کو سنبھالے نہ رہے تو اپنی گونا گوں ذمہ داریوں میں نہ معلوم ان کے کتنے قدم نسیان کے اٹھ جائیں۔ عام انسانوں کو معمولی پریشانیوں میں اہم سے اہم باتیں بھول جاتی ہیں پھر ان نفوس کا تو حال کیا ہو گا جن کے سر پوری نوع انسانی کے بننے اور بگڑنے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

لہذا اس قسم کی جتنی آیتیں ہیں ان کو بھی عصمت کے خلاف سمجھنے کے بجائے براہین عصمت سمجھنا چاہیے ہم پہلے ترجمان السنہ میں لکھ چکے ہیں کہ نبی کے قول و عمل کا تو کہنا ہی کیا اس کی رائے کو بھی عصمت حاصل ہوتی ہے اور اگر کہیں اس پر ٹوکا گیا ہے تو یہ ان کی عصمت ہی کی بناء پر ٹوکا گیا ہے کیونکہ یہی اس کی دلیل ہے کہ ان کی ہر ہر نقل و حرکت بلکہ ان کی رائے بھی سب پروردگار کے زیر نگرانی ہوتی ہے اور اسی باطنی حفاظت کے اظہار کے لیے شاذ و نادر صورتوں میں کہیں ان کو ٹوک بھی دیا جاتا ہے اس کے برخلاف ان کی امتوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے اگر اجتہاد و کوشش کے بعد ان سے خطا واقع ہو جائے تو اس پر بھی ان کے لیے ایک اجر کا وعدہ ہے۔

ان تمام تفصیلات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ لگائیے کہ مقام نبوت کی نزاکت اور اس کا حسن کیا کسی ادنیٰ سی معصیت کے داغ کا بھی متحمل ہے۔ حاشا و کلا۔ و الحمد لله اولاً و آخراً۔

چونکہ اس موضوع کے متعلق مجھ کو قدیم سے شغف رہا ہے اس لیے اس مضمون کی تصانیف مطالعہ کرنے کا مجھ کو ہمیشہ موقع ملتا رہا ہے۔ حسن اتفاق سے آج سے تیس سال پہلے اسی مضمون پر ایک مطبوعہ فارسی مکتوب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا تحریر کردہ میرے ہاتھ آ گیا تھا اور مجھ کو اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے اسی وقت اس کی ایک نقل لے کر اپنے پاس رکھ لی تھی اور الحمد للہ کہ آج بھی یہاں وہ میرے دم کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے بعد جب قسمت نے متقدمین و متاخرین کی چند کتب کے مطالعہ کا موقع بخشا تو اندازہ یہ ہوا کہ جو کچھ ان متفرق اوراق میں بکھرا پڑا تھا وہ اس مکتوب میں یکجا جمع شدہ موجود ہے۔ پھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فطری جدت پسندی نے طرز استدلال کا اس پر ایک اور ایسا نیا روغن چڑھا دیا ہے کہ وہی استدلال جس کو ملانہ کھا جاسکتا تھا اب فلسفیانہ بن گیا ہے۔ مجھ کو اس کا تصور بھی نہ تھا کہ میں کسی مناسب صورت میں اپنے قدردانوں کے سامنے کبھی اس کو پیش کر سکوں گا مگر الحمد للہ کہ آج قدرت نے مجھ کو اس کا موقع عنایت فرمادیا اور بڑی مسرت کے ساتھ میں اس کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے فارسی زبان ہی علمی زبان تھی، اسلامی معلومات کا بڑا ذخیرہ اسی زبان میں منتقل ہوا ہے۔ حضرت مولانا قدس سرہ اس میں بھی تمام علماء سے جداگانہ اپنی ایک امتیازی شان رکھتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں فارسی زبان تو بالکل متروک ہی ہو چکی ہے اور اردو بھی ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔ پھر اتنی طویل مدت گزر جانے کی وجہ سے میری نقل کردہ تحریر جگہ جگہ سے مشکوک بھی ہو چکی ہے۔ میں نے اس پر بھی تھوڑا سا وقت خرچ تو کیا ہے کہ حتی المقدور اس کی تصحیح کروں پھر اس کا ترجمہ بھی کسی حد تک قابل فہم کر دوں۔ اس فکر میں زیادہ میں اس لیے نہیں پڑا کہ ہیں مصنف کا اصل مقصود ہی فوت نہ ہو جائے۔ اب آپ پورے غور کے ساتھ میرے تحریر کردہ مقالہ کو پڑھیں جو اسی مکتوب کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد اس سے زیادہ غور کے ساتھ مکتوب مذکور کا بسم اللہ کر کے ترجمہ دیکھیں۔ واللہ المیسر۔





بسم اللہ الرحمن الرحیم

## مکتوب حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ در معصومیت انبیاء علیہم السلام وہم تحقیق حقیقہ کل طبعی

ترجمہ اردو

احقر کے نزدیک انبیاء صغائر و کبار ہر دو قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں اپنی نبوت سے قبل بھی اور بعد بھی۔ میری یہ رائے اگرچہ بظاہر اقوال اکابر کے خلاف نظر آتی ہے لیکن مسئلہ کی پوری تقریر کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ موافق نظر آئے گی۔ چونکہ ہر دعویٰ کے لیے دلیل کی ضرورت ہے صرف کسی بات کا انکار کر دینا کافی نہیں اس لیے پہلے ہم اپنے دعویٰ کی دلیل قرآن کریم سے پیش کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ”قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ“ کہہ دیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ یعنی تمہارے لیے رسول اللہ میں بہترین نمونہ ہے! ان ہر دو آیات میں جب ہر معاملہ میں آپ کی اتباع اور ہر بارہ میں آپ کی ہستی کو نمونہ فرمایا گیا ہے اب اگر آپ کے افعال و اقوال میں معصیت کا احتمال ہو تو لازم ہوگا کہ معصیت میں بھی آپ کی اتباع ضروری ہو حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ہم نے جنات اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کیا کریں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ اُن کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کریں۔ ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد صرف عبادت ہے نہ کہ معصیت! اور اس کو صرف اسی کا حکم دیا گیا ہے تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ معصیت میں بھی اس کو اتباع کا حکم دیا جاسکے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے اس کی ذات کے کچھ لوازم ہوتے ہیں جس جگہ وہ ذات موجود ہوتی ہے وہاں اس کے یہ لوازم بھی ضرور موجود ہوتے ہیں اسی لئے ان کی ذات کے لوازم کہا جاتا ہے جیسے آگ اس کے لئے جلانا لازم ہے جہاں آگ ہوگی ضرور جلانے گی۔ اس قاعدہ کے موافق ہمارے سامنے دو قسم کی مخلوق

مکتوب اصل بزبان فارسی

برعم احقر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام از صغائر و کبار قبل النبوة و بعد النبوة بہر طور کہ باشد معصوم اند۔ و ایں رائے جدید ہر چند کہ بظاہر مخالف اقوال اکابر است اما ہر کرا بہرہ از فہم دادہ اند ان شاء اللہ بعد تنقیح اصل مراد موافق اقوال اکابر خواہند یافت چوں ہر دعویٰ را دلیل بکار است نہ فقط لاسلم و انکار می باید کہ ایں دعویٰ را اولاً موجبہ نمایم۔ برادر من در کلام اللہ می فرماید ”قتل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحبکم اللہ“ وہم چنین لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ فرمودہ اند ایں دو آیت باتل مطلق ہدایت می فرماید و ایں طرف آیت ”وما خلقت الجن و الانس الا ليعبدون۔ و ما امروا الا ليعبدوا اللہ مخلصین له الدين“ باہم پیوستہ بایں جانب مشیر اند کہ مقصود از انسان ہمانست کہ مامور بآنست و آں جز عبادت ہیچ نیست۔ مگر می دانی کہ ہر چیز را از لوازم ذات خود ناگزیر است چہ ”الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ“ و ایں ظرف در تعریف ملائکہ و شیطان می خوانی کہ جاتا ہے جیسے آگ اس کے لئے جلانا لازم ہے جہاں آگ ہوگی ضرور جلانے گی۔ اس قاعدہ کے موافق ہمارے سامنے دو قسم کی مخلوق

ہیں۔ ملائکہ و شیاطین ان کی ذات کے لئے بھی کچھ لوازم ضروری ہیں۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی ذات کے لئے کفر لازم ہے **كَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا**۔ اور ملائکہ کے لئے فرمانبرداری لازم ہے وہ فرماں برداری جس میں سرتابی و نافرمانی کی مطلق گنجائش نہ ہو **وَلَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ**۔

پس شیطان راعصیان و ملائکہ را اذعان فرمان لازم آمد و چون ایں قدر پیشتر گوش خوردہ آں عزیز است کہ لازم ذات از ملزوم خود عام نمی باشد لازم ذات ادست بجائے دیگر نمی رود و چگونہ تو اں شد الواحد لا یصد رالاعن الواحد لازم آمد کہ در مصداق (خلطوا عملاً صالحاً و اخر سیئاً) از ہر دونوع پارہ در خمیر نہادہ باشند بلکہ ہر کہ اخیال خیر و خطرہ شربہ دل می رود از ہر دونوع چیزے در آغوش دادہ اند و از ہر قسم قدرے قدرے در بر نہادہ اند ورنہ لازم آید کہ لازم ذات عام باشد اندریں صورت مثال ترکیب ارواح انسانی ازیں دو قسم مادہ چنانا باشندہ در ہر مادہ ترکیب انواع مرکبہ از اربع عناصر شنیدہ بلکہ چنانکہ از خواص اربعہ پیوست و رطوبت و برودت و حرارت کہ در اجسام مرکبہ یافتہ یثوند و لوازم ذات خاک و آب و باد و آتش اند ترکیب اجسام مرکبہ ازیں اجسام چارگانہ پے بردہ اند ورنہ کیست کہ وقت آفرینش نگریت ہم چنین ترکیب ارواح انسان ما و شما از و عنصر ملکی و شیطانی پے تو اں بردگو ما و رائے ایں دو چیز ہائے دیگر باشند۔ اندریں صورت لازم افتاد کہ ذات یا برکات حضرت خلاصہ موجودات سرور کائنات علیہ و علی آلہ افضل الصلوٰات و اکمل التسلیمات از شائبہ شیطانی مبرا باشد و رنہ اتباع مطلق چگونہ صورت بندہاں اگر از لوازم ذات امید مفارقت بودے می تو اں گفت کہ ہر چند کہ در ذات شریف حضرت حبیب رب العالمین جزوی از نوع شیطانی است اما عصیان کہ لازم آن بود در این مادہ مفارقت

چونکہ یہ امر بھی مسلم ہے کہ ذات کے لوازم ہوتے ہیں وہ اس ذات کے علاوہ دوسری جگہ نہیں پائے جاسکتے۔ اس لئے ملائکہ اللہ کے علاوہ اذعان و فرماں برداری اور شیطان کے علاوہ کفر سرکشی کسی دوسری جگہ پائی نہیں جاسکتی۔ لیکن ان دو مخلوق کے سواء یہاں ایک تیسری مخلوق اور نظر آتی ہے یعنی حضرت انسان جس میں یہ دونوں باتیں جمع نظر آتی ہیں ارشاد ہے **خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَ اٰخَرَ سَيِّئًا** یعنی انہوں نے نیک عمل کے ساتھ کچھ برے عمل بھی کئے ہیں لہذا حسب بیان سابق ضروری ہے کہ انسان میں ہر دو قسم کا مادہ موجود ہو۔ مادہ شیطانی بھی اور مادہ ملکی بھی ورنہ برائی اور بھلائی جو دراصل ان دو قوتوں کے ذات کے لوازم تھے عام بن جائیں گے۔ ان اجزاء سے انسان کی ترکیب پر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسا کہ عناصر اربعہ سے اس کی ترکیب پر ظاہر ہے کہ انسان کے لئے عناصر اربعہ کے اجزاء ترکیبی ہونے کا ثبوت بھی ہمارے پاس بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ جو ان عناصر کے لوازم ہیں مثلاً رطوبت، پیوست، برودت اور حرارت یہ سب انسان میں موجود نظر آتے ہیں۔ رطوبت کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ آب جس کے لئے رطوبت لازم ہے انسان میں موجود ہے اسی طرح بقیہ اثرات کو دیکھ کر بھی تسلیم کرنا ضروری ہوگا کہ اس میں باد و آتش و خاک کے عناصر بھی موجود ہیں ورنہ ایسا کوئی شخص ہے جس نے انسانی آفرینش کے وقت ان اجزاء کا مشاہدہ کیا ہو۔ پس جس طرح ہم نے یہاں صرف لوازم کے وجود سے ان عناصر کے وجود پر استدلال کیا ہے اسی طرح عام انسانوں میں اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ کے اثرات کو دیکھ کر تسلیم کرنا بھی لازم ہوگا کہ اس



نمود بالجملہ الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ اگر نعوذ باللہ مادہ  
شیطانی در خمیر حضرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بودے  
اتباع مطلق را نشانستے آخر کم از کم کیفیت از اں عارض حال  
اوشان شدے و رنگے از عصیان پدید آمد پس اگر ہر گونہ  
اتباع اد خان فرمودہ شود بعضیاں نیز ارشاد کردہ شود  
اندریں صورت تصحیح این حصر و الامر والا لیعبدوا اللہ مخلصین  
لہ الدین چگونہ تو اں شد و چوں منشاء گناہ صغیرہ باشد یا  
کبیرہ ہماں مادہ شیطانی است لازم آمد کہ حضرت سرور  
انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم معصومان از اندیشہ گناہ معصوم باشند  
باز باید شنید کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم را ارشاد میفرمایند  
فہد اہم اقتدہ و ایں ارشاد نیز باقتدار مطلق شدہ  
است تخصیص نوعی از افعال و تقلید قیّمی از اخلاق و اقوال  
نیست و ہم مقرر است کہ چوں صلہ را بے قرینہ حذف  
میکند چنانکہ در اللہ اکبر صلہ اکبر را حذف فرمودہ اند ایں  
حذف بتعمیم میباشد لہذا اکبریت اللہ تعالیٰ مخصوص باحدے  
نیست پس لازم آمد کہ حضرت و دیگر انبیاء علیہم  
الصلوٰۃ والسلام نیز ازیں عیب مبرا باشند علاوہ بریں  
در آیت عالم الغیب فلا یظهر علی غیبہ احدا الا  
من ارتضیٰ ضمیر است راجع بسوئے خدا تعالیٰ و ضمیر  
مفعول کہ راجع بسوئے من است مخدوف باز ارتضیٰ  
را مطلق داشته اند یعنی ایں نفرمودہ اند کہ ارتضیٰ فی الاعمال  
او الاخلاق او فی ہذا الامر و بعد ایں ہمہ من رسول گفتہ  
اند و پیدا است کہ من در من رسول بیانیہ است نہ غیر آں  
لہذا ضروری افتاد کہ ہمہ عناصر روحانی رسل محبوب و مرضی  
خداوندی باشند و جہش ایں است کہ چنانکہ زردنقرہ را بر  
معیار سودہ میگردانند تا غش از خالص معلوم شو ہم دچین امتحان

میں وہ دونوں قوتیں بھی ضرور ہیں جس کے یہ دو لوازم ہوگا یعنی  
بادہ ملکی مادہ شیطانی - اس تمہید کے بعد اب یہ ضروری ہوگا کہ  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مادہ شیطانی سے مبرا ہوں - ورنہ  
اگر آپ کی ذات اقدس میں بھی یہ مادہ موجود ہو تو یہ لازم  
آئے گا کہ جو اس کے لوازم ہیں یعنی معصیت وہ بھی آپ کی  
ذات میں موجود ہو العیاذ باللہ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو  
جب قرآن کریم ہر معاملہ میں آپ کی اتباع کا حکم دیتا ہے تو یہ  
بھی لازم ہوگا کہ اس معصیت میں بھی آپ کی اتباع ضروری  
ہو - حالانکہ (وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ  
الذِّينَ) میں حصر کے ساتھ فرما دیا گیا ہے کہ تم کو صرف عبادت  
کرنے کا ہی حکم دیا گیا ہے معصیت کا نہیں - یہاں اب اگر  
معصیت میں بھی آپ کی اتباع تسلیم کی جائے تو یہ حصر باطل ہو  
جائے گا - لہذا ماننا پڑے گا کہ آپ میں مادہ شیطانی جو منشاء  
گناہ ہے موجود نہیں اور چونکہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ دونوں کے  
صدور کا منشاء مادہ شیطانی ہے - لہذا جب آپ میں یہ مادہ  
شیطانی نہیں تو آپ کا ہر قسم کی معصیت سے معصوم ہونا بھی  
ضروری ہے - (اب رہی یہ بحث کہ اس بیان سے صرف آپ  
کی ذات کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے جمیع انبیاء علیہم السلام کا  
معصوم ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے) تو قرآن کریم میں  
آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ فَبِهْدَاهُمْ أَقْتَدِهِ آپ انبیاء علیہ  
السلام سابقین کے طریقے کی پیروی کیجئے - یہاں بھی آپ کو  
ان کے طریقے کی پیروی کرنے کا مطلقاً حکم دیا گیا ہے کسی  
خاص قول و فعل کی تخصیص نہیں کی گئی - اور یہ نحو کا قاعدہ ہے کہ  
جب صلہ حذف کرتے ہیں تو وہاں مراد عموم ہوتا ہے  
جیسا اللہ اکبر میں دیکھو یہاں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ  
اللہ تعالیٰ کس سے بڑا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر چیز سے بڑا

عناصر روحانی یعنی اخلاق و ملکات و قوی با اعمال می کنند تا نیک از بد متمیز شود چنانچه خود میفرماید: لیسو کم ایکم احسن عملا و ظاہر است کہ فعل داد و دہش از آثار ملکہ سخاوت و معرکہ آرائی از آثار شجاعت و دردنہا ہم چنین جملہ افعال از آثار ملکات و قوی و خلاق کا من می باشند و ایں آثار و افعال را با آں اخلاق و ملکات ہماں نسبت است کہ خطوط معیار را با زاء نقرہ پس چناں کہ در زرد نقرہ قدر و قیمت ہماں زرد نقرہ را باشد نہ آں خطوط را در مقصود اصلی و محبوب زد و نقرہ بودنہ آں خطوط بلکہ آں خطوط فقط مظہر حسن و قبح زرد نقرہ باشند نہ اصل مقصود و محبوب و بلع و مرغوب ہمیں ساں قصہ دین است اصل محبوب و مقصود و مطلوب اخلاق مرضیہ اند نہ اعمال و در بازار آخرت در اصل قدر و قیمت ہماں اخلاق را باشند نہ ایں اعمال را ایں اعمال مظہر آں اخلاق و ملکات اند نہ بذات خود محبوب و مرضی اند ریں صورت ضرور است کہ ہمہ اخلاق و ملکات و قوی در رسولاں محبوب و مرضی خدا تعالی باشند ایں نتواں شد کہ بعض از آنہا منجملہ مرضیات باشند و بعض از اں خلاف مرضی ورنہ اطلاق ”ارتضی“ باطل گردد مگردانی کہ اندر ریں صورت معصومیت انبیاء از صغائر و کبائر ضروری است و از انجا کہ بعد ارتضی بایراد من رسول کہ در آں من بیانہ آورده اند بیان ایں معنی فرمودہ اند کہ ہر کہ مصداق من ارتضی باشد رسول شدنش ضروری است ہمہ فہمیدہ باشند کہ سوا انبیاء کس را بمعصومیت یعنی امتناع صدور عصیاں صغیرہ باشد یا کبیرہ صفت نتواں کرد مگر غرضم از صدور ایں است کہ مصدر معصیت یعنی قوتیکہ مقتضائش عصیان باشد در خمیر بودنہ اینکہ مثل آب گرم کہ از ذات

ہے۔ اسی طرح جب یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ کس بات میں ان کی پیروی کیجئے تو ثابت ہوا کہ مراد یہ ہے ”ہر بات میں“ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح جملہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت بھی ثابت ہوگئی۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک اور عام دلیل بھی ہے جس سے جملہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت ثابت ہوتی ہے۔ عَالِمُ الْغَيْبِ الْخَفِیُّ فعل ارتضیٰ میں ارتضیٰ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹی ہے۔ یہاں بھی فعل کو مطلق رکھا گیا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس کو بھی اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ اور اس کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی کہ حق تعالیٰ کی اس رضاء کا تعلق ان کے کس خاص عمل کے یا کسی خاص قول کے ساتھ ہے۔ تو ماننا پڑے گا کہ یہاں بھی عموم و اطلاق ہی مراد ہے اور ”من رسول“ میں من چونکہ بیانہ ہے اس لیے ثابت ہوا کہ مَنِ ارْتَضٰی یعنی جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ رسول ہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ رسول جتنے بھی ہیں سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مرتضیٰ ہیں اور وہ بلا تخصیص ہر بات اور ہر اداء میں محبوب و مرتضیٰ ہوتے ہیں۔ اب اگر ان سے معصیت کا صدور ممکن ہو تو وہ علی العموم محبوب و مرتضیٰ کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد یہ سمجھے کہ جس طرح چاندی اور سونے کو کسوٹی پر اس لیے گھتے ہیں تاکہ اس کا کھرا اور کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے۔ یہاں کسوٹی پر گھسنے سے جو لکیریں پیدا ہو جاتی ہیں وہ خود مقصود نہیں ہوتیں بلکہ وہ چاندی اور سونے کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا صرف ایک معیار ہوتی ہیں اصل قدر و قیمت اسی چاندی اور سونے کی ہوتی ہے۔ اسی طرح عناصر روحانی یعنی اخلاق و ملکات اور انسانی افعال و کردار کی مثال ہے۔ یہاں بھی اعمال کی تشریح کا اصل مقصد اختلاق حسنہ و اخلاق سیئہ کا امتحان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاتِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا زندگی اور موت کو ہم نے اس لیے پیدا کیا



خود میتواں شد معروض عصیاں از خارج ہم نمی توان  
 بعروض حرارت خارجیہ از ذات خود میتواں شد معروض  
 عصیان از خارج ہم نمی توان شد آری باوجود امکان  
 عروض عصیاں انبیاء را از عروض آن نگاہ میدارند چنانچہ  
 فرمودہ اند کذلک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا  
 المخلصین مگر آنکہ بعض اقسام معصیت از سوء و فحشاء ہم  
 خارج باشند بالجملہ ایس آیت بر امکان عروض ہم دلالت  
 دارد ورنہ "صرف" بچہ کار آمدے در محفوظ ماندن انبیاء ہم  
 شاہد است ورنہ بیکار رفتے بہر حال معصومیت بمعنی مذکور  
 مخصوص بانبیاء است اولیاء را ہم شریک اوشاں بدیں  
 صفت نتواں گفت ان اولیاء ہ الا المتقون کہ بہ تعریف  
 اولیاء فرمودہ اند بہ ایس معنی اشارہ دارد تفصیل این اجمال  
 اینکہ متقون صیغہ اسم فاعل است و ضمیرش راجع سوء اولیاء  
 و مفعولش ہر چہ باشد مخدوف لیکن حاصل اتقاء ہمیں  
 اجتناب از معاصی و غیر مرضیات بود دزیں بعد بشنو کہ  
 حاصل متقی از ایس است کہ موصوف بوصف بوصف اتقاء  
 مبنی للفاعل باشد بر تعدی الی المفعول ضرور نیست و ایس  
 بداں ماند کہ در ایام برشکال مثلاً وقت رفتار خود را از  
 افتادن باز میدارند و با ایہنمہ گاہے پائے روندہ می لغزدو  
 از پائے افتد و بریں بناء بدیگراں میگویند کہ من ہر چند  
 خود را از افتادن نگاہ بداشتم مگر نتوانستم غرض از یں تعریف  
 کہ در کلام اللہ مذکور شد عدم امکان صدور معاصی نمی برآید  
 آرے بشہادت پنجمو آیت یثبت اللہ الذین امنوا بالقول  
 الثابت فی الحیوة الدنیا و فی الآخرة. محفوظ ماندن  
 اوشاں از معاصی می برآید زیرا کہ اطلاق امنوا اشارہ  
 بکمال ایمان می کند فرمودہ اند المطلق یراد بہ الفرد الکامل

ہے تاکہ تمہاری آزمائش کریں کہ تم میں بلحاظ عمل کون بہتر رہتا  
 ہے۔ دیکھئے انسان کی داد و دہش کا عمل اس کا شاہد ہوتا ہے کہ اس  
 میں ملکہ سخاوت موجود ہے اسی طرح اس کی معرکہ آرائی اس کی  
 دلیل ہوتی ہے کہ اس میں شجاعت کی صفت پنہاں ہے۔ علی ہذا  
 القیاس انسان کے جتنے اعمال بھی ہیں وہ سب درحقیقت اس کے  
 ان اخلاق کی دلیل ہوتے ہیں جو اس میں پوشیدہ موجود ہیں۔  
 یہاں بھی کسوٹی کے خطوط کی طرح خود یہ اعمال مقاصد نہیں ہوتے  
 بلکہ اصل مقصود وہ مخفی اخلاق و ملکات ہوتے ہیں اور یہ اعمال اس پر  
 دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بازار آخرت میں تمام ترقیمت انسان  
 کے ان مخفی اخلاق ہی کی ہے۔ اس بنا پر ضروری ہوا کہ انبیاء علیہم  
 السلام کے یہ عناصر روحانی یعنی اخلاق و ملکات جو کہ مبداء  
 اعمال ہیں سب کے سب حسنہ اور رب العزت کی نظر میں  
 پسندیدہ ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض پسندیدہ اور بعض غیر  
 پسندیدہ ہوں ورنہ ارتضیٰ من رسول میں رسولوں کو بلا کسی استثناء  
 کے پسندیدہ فرمانا کیونکر مستقیم ہو سکتا ہے۔ لہذا جب ان کے جملہ  
 اخلاق و ملکات پسندیدہ حق ہو گئے تو ان کے جملہ اعمال کا بھی  
 حسنہ ہونا ثابت ہو گیا اور ان کی معصومیت بھی ثابت ہو گئی من  
 ارتضیٰ کے بعد من رسول میں اسی نکتہ پر تنبیہ کے لیے من بیانہ  
 لائے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ مِنْ رَسُولٍ یہ مِنْ اِرْتَضٰی  
 کا بیان ہے یعنی جو شخص اس عموم کے ساتھ حق سبحانہ و تعالیٰ کی نظر  
 میں پسندیدہ ہو وہ صرف ایک رسول ہی ہو سکتا ہے اسی لیے  
 انبیاء علیہم السلام کے سواء کسی کو اس معنی سے معصوم نہیں کہا جاسکتا  
 کہ اس سے گناہ کا صدور ناممکن ہو۔ یہ واضح رہے کہ گناہ صادر  
 نہ ہونے سے یہاں ہماری مراد یہ ہے کہ اس کی ذات میں وہ  
 قوت ہی موجود نہ ہو جو صدور عصیان کی مقتضی ہو یہ مطلب نہیں  
 ہے کہ جس طرح اس کی ذات میں نافرمانی کرنے کا منشاء موجود

و پیدا است کہ کمال ایمان با ولایت و مساز است باز بار استعانت در بالقول ثابت برای امر دلالت دارد کہ انچه براں ثابت میدارد آں چیز دیگر است لیکن پیدا است کہ انچه در تحقیق قول ثابت یعنی لا اله الا الله راد دخل است ہمی طاعت و تقوی است نظر بر ایں اگر گویند کہ مؤمنان کامل را بہ برکت لا اله الا الله ابر طاعت و تقوی ثابت می دارند بجاست و ظاہر است کہ ایں دقت محفوظیت از معاصی ضرورست. باقی وجہ تخصیص معصومیت بہر انبیاء و محفوظیت بہر اولیاء با آنکہ ہر دو متحد المفہوم می نمایند در خور ایں عجالہ نیست ورنہ ان شاء الله دریں بارہ ہم چیزے رقم میزدیم باقی ماند اینکہ ایں جرائم مسلم الثبوت از کجا خاستند اگر مادہ مذکور نبود صدور جرائم محال بود جوابش ایں است کہ افعال راد دجہت است یکے نیت و مبادی آنکہ آنرا مصدر افعال تو اں گفت دوم پیکر و ہویات آنکہ مظہر آں تو اں خواند. لیکن پیدا است کہ مصدر و مظہر را بیک و تیرہ نداشته اند یک فعل بیک مظہر میباشد و انواع نیات بلکہ مدارج یک نوع ہم از اں متفادات اندریں صورت میتواں شد کہ پیکرے و مظہرے در یوزہ گر مصادر شتی باشد ہاں از ایں قدر انکار نتواں کرد کہ بعض مظاہر ارتباط طبعی با بعض مصادر دارند و از ایں جہت در صورت صدور آں از مصدر دیگر بیندہ را بغلط اندازد و

نہ ہو اسی طرح کسی عارضی اور خارجی سبب سے بھی اس سے کوئی عمل ایسا نہ ہو سکے۔ جس پر عصیان کا شبہ ہو۔ دیکھو گرم پانی میں گرمی پانی کی ذات سے نہیں ہے مگر خارج سے پیدا ہو سکتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام پر عصیان کو خارجی عوارض کی وجہ سے طاری ہو سکتا ہے مگر قدرت ان کی نگہبان رہتی ہے۔ اور اس خارجی سبب کی وجہ سے بھی نافرمانی سے بچا لیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے (كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ) آیت بالا سے چند فوائد معلوم ہوئے۔ اول یہ کہ جو نوع سوء اور فحشاء کی تعریف میں نہ آتی ہو اس کا صدور کسی عارضی وجہ سے مستثنی ہو سکتا ہے۔ دوم یہ کہ سوء اور فحشاء کا تحقق خارجی اسباب سے یہاں بھی ہو سکتا ہے سوئم یہ کہ اس امکان کے باوجود قدرت ان کے صدور سے بھی نگہبان رہتی ہے اگر خارجی اسباب سے معصیت کا صدور ناممکن ہوتا تو پھر آیت بالا لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ یعنی صرف کا کوئی فائدہ ہی نہ رہتا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ معصومیت بایں معنی کہ اس کی ذات میں صدور معاصی کا منشاء نہ ہو صرف انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے اس معنی میں اولیاء اللہ بھی ان کے شریک نہیں ہیں۔ اولیاء اللہ کی شان میں ارشاد ہے (اِنَّ اَوْلِيَاءَ هٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ) یہاں اولیاء کی شان میں متقی ہونا فرمایا گیا ہے۔ یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے اس کے معنی ہیں بچنے والا۔ یہاں بھی مفعول محذوف ہے جس کا مطلب وہی عموم ہے۔ یعنی ہر قسم کی معصیت سے بچنے والا مگر جو خود بچنے والا ہو اس کے لیے یہ لازم نہیں۔ ہے کہ بچ بھی جائے۔ برسات کے موسم میں جب راستے کچے ہوتے

۱۔ حضرت مولانا مرحوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اس تحقیق سے جو فرق فہم ناقص میں آتا ہے اس کی طرف ترجمہ میں اشارہ کر دیا گیا ہے یعنی معصوم اور محفوظ گناہوں سے معصوم ہونے میں گودونوں شریک ہوں لیکن معصوم میں مبداء عصیان ہی نہیں ہوتا اس لیے اس سے معصیت کا صدور ممکن ہی نہیں اور محفوظ کی فطرت تقدس کے اس مرتبہ میں نہیں ہوتی اس سے معصیت کا صدور ممکن ہے گویا انبیاء علیہم السلام میں یہ صفت ذاتی ہوتی ہے اور اولیاء اکرام میں خارجی اور عارضی۔ واللہ اعلم بالصواب۔



خود بامصدر دیگر ساز و مثلاً پیکر صلوة اعنی ایں صورت خاصہ از رکوع و سجود علاقہ طبعی بامصدر خاص کہ اخلاص است میدارد باینہمہ بامصادر دیگر اعنی نیات فاسدہ نیز گاہے خود رami سپارد و زیر پردہ نیات دیگر مثل ریاء و سمعہ سرمی برآمد لیکن بوجہ ہماں علاقہ طبعی کہ مذکور شد در بادی النظر براخلاص کہ عین تعبدست محمول میشود و ہمیں است کہ در حق منافقان سرمایہ اطمینان دامن شد ورنہ در کفر و اوشاں چہ کمی بود کہ آب تیغ جند اللہ بخشیدند ہمیں طور بعض پیکر و ہیا کل بعض افعال را مثل سب و شتم و نقصان مال و جان دوست و گریباں شدن یکے بد گیرے و دروغ و امثال آں علاقہ خاص با عصیان ست گو گاہ بگاہ مصدر آنہا چیزے دیگر شدہ باشد۔ مقاتلہ جہاد و کشت و خون فساد و عناد ہر چند ہر نگ یک دیگر اند لیکن بوجہ آنکہ ایں قصد را عناد و فساد اتحادی است طبعی گود ستاویر بغض فی اللہ و مظہر اطاعت نیز میتواں شد ہمیں است کہ بسیارے از انسان صورت آں جہاد را ظلم و ستم انگاشتہ دل از حقیقت دین اسلام برداشتہ اند چوں ایں مقدمہ مجہد شد سخن دیگر کہ ہم از اں سر میزند باید شنید بحکم۔ انما الاعمال بالنیات و ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اعمالکم و لکن اللہ ینظر الی قلوبکم و تیاتکم او کما قال مدار اعتبار کار و بار بنی آدم بر مصادر اعنی نیات و مبادی آں خواہد بود۔ حسن یا قبح کہ در ذات افعال و دیعت نہادہ اند از اں حساب نخواہند فرمود اندر ایں صورت نوے از حسن و قبح از طرف مصادر بسوئے مظاہر خواہد آمد دلا جرم آں حسن و قبح در حق مصادر لازم ذات و در حق مظاہر عارضی خواہد بود پس اگر مصادر آں قبح بالذات و مذموم حضرت رفیع

ہیں آدمی کوشش کرتا ہے کہ سنبھلے مگر پیر کبھی پھسل جاتا ہے اور گر جاتا ہے۔ اس لیے کہا کرتے ہیں کہ میں نے بہت کوشش کی مگر آخر پھسل گیا اور بچ نہ سکا۔ پس آیت بالا سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے جو اولیاء ہیں وہ گناہوں سے بچتے ہیں مگر یہ کہ صدور معصیت کا ان سے امکان نہیں ہوتا یہ ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں ایک اور آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت امکان عصیان کے باوجود ان کو بھی گناہ کے ارتکاب سے بچا لیتی ہے ارشاد ہے۔ (يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا) یہاں الذین امنوا یعنی مؤمنین سے مراد وہی اولیاء اللہ ہیں چونکہ یہاں بھی یہ صفت مطلق رکھی گئی ہے اور چونکہ مطلق سے فرد کامل ہی مراد ہوتا ہے اس لیے یہاں مؤمنین سے مراد ان کے مرد کامل ہوں گے وہ اولیاء اللہ ہیں اگرچہ آیت بالا میں جس امر پر ثابت و قائم رکھنے کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہ حسب تصریح آیت القول الثابت ہے یعنی کلمہ طیبہ مگر ظاہر ہے کہ کلمہ طیبہ پر ثابت قدمی نتیجہ اسی تقویٰ اور ان کی اطاعت شعاری کا ہے اس بناء پر اولیاء کی معصومیت بھی ثابت ہو گئی۔ لیکن علماء نے اولیاء کے حق میں معصومیت کی بجائے محفوظیہ کا لفظ استعمال کرنا مناسب سمجھا ہے۔ اس وقت اس عجلت میں ان دونوں کے فرق پر روشنی ڈالی نہیں جاسکتی فرصت ہوتی تو اس کے متعلق بھی کچھ تحریر کرتا۔ اب رہا یہ سوال کہ جب انبیاء علیہم السلام میں معاصی کا منشا ہی موجود نہ تھا تو پھر ان سے ان افعال کا صدور کیسے ہوا جن کی نسبت قرآن کریم کی تصریحات موجود ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ افعال کی دو جہتیں ہوتی ہیں ایک ان کی نیت و مبادی جن کو مصادر افعال کہنا مناسب ہے۔ دوم ان کے قوالب اور اشکال جن کو مظاہر سے تعبیر کرنا موزوں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مصادر و مظاہر افعال دونوں ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی فعل کا مظہر یعنی شکل اپنے مبادی یعنی نیات کے اختلاف سے مختلف ہو سکتا ہے بلکہ ایک ہی نوع کی

الدرجات است مثل جو و عناد و تکبر ہواؤ ہوس آنرا گناہ  
باید پنداشت و ہر چہ مصادر آں حسن بالذات و محمود خالق  
کائنات است اگر از قسمی است کہ آنرا علاقہ طبعی  
بامصادر قبیحہ و ذمیمہ است بد حال متصور است یکے آں  
کہ غلط فہمی باعث تحرک اخلاق حمیدہ گشتہ کہ ایں پیکر بداں  
وابستہ است۔ آں را خطائے اجتہادی باید گفت دوم آنکہ  
غلط فہمی را دریں سلسلہ مداخلتے نباشد ایں قسم را از زلات  
باید خوانند مثال اول مناقشہ حضرت موسیٰ علیہ السلام  
با حضرت ہارون علیہ السلام و حضرت خضر علیہ السلام است  
و مثال ثانی معاملہ برادران حضرت یوسف علیہ السلام  
بادشان دقصہ گریختن حضرت یونس علیہ السلام بنماید چہ  
مصدر ایں حرکات و باعث صدور آں از اخوان یوسف  
علیہ السلام محبت دنیا نبود جملہ یوسف و اخوہ احب الی ایما  
منا خود بر ایں قد رگواہ است کہ باعث ایں حرکات  
عنایات حضرت یعقوب علیہ السلام بود۔ ظاہر است کہ  
یعقوب علیہ السلام از ملوک روزگار و امراء وقت و سردار  
نبودند کہ عنایات اوشان بحال یوسف علیہ السلام موجب  
حصول مناصب دنیوی می شد از ایں باعث عرق حسد  
برادران بجوش می آمد نے بلکہ توجہ حضرت یعقوب علیہ  
السلام مورث برکات دینی بود و موجب حصول مقاصد یقینی  
زیں باعث برادران اوشان را حسد از دس سرزدومی دانی  
کہ حسد از لوازم بحث و آثار آنست ہر قسم محبت کہ باشد  
پس اگر محبت دنیوی است حسد نیز لازم و در حکم و اعتبار  
تابع آن خواہد بود اگر محبت خداوندی است ہچنان حسد  
آں بہماں حساب شمرده خواہد شد۔ بانجملہ ایں رشک  
اوشان از آثار محبت خداوندی می نماید آرے

نیت میں بھی بے شمار مراتب پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس بناء پر یہ ہو سکتا  
ہے کہ فعل کی صورت و مظہر تو بظاہر یکساں نظر آئے مگر اس کے مبادی  
یعنی نیتوں اور مصادر میں زمین و آسمان کا فرق رہے اسی کے ساتھ یہ  
حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ بعض افعال کی صورتوں کو بعض مصادر  
و نیات کے ساتھ طبعی ربط ہوتا ہے اس بناء پر اگر اسی فعل کا صدور کسی  
دوسرے مصدر اور کسی دوسری نیت سے ہو جس کے ساتھ اس کو وہ طبعی  
ربط حاصل نہ ہو تو دیکھنے والے کو یہاں مغالطہ لگ جاتا ہے اور وہ اس  
طبعی ربط کی وجہ سے یہاں بھی مصادر کے اتحاد کا حکم لگا دینے پر مجبور  
ہو جاتا ہے مثلاً نماز کی خاص ہیات جو رکوع و سجود سے مرکب ہے اس  
کہ اخلاص کے ساتھ ایک ایسا ربط حاصل ہے جس کی وجہ سے نماز  
مصلیٰ کے اخلاص کے لیے برہان بن جاتی ہے۔ بایں ہمہ کبھی نماز  
مصادر فاسدہ سے بھی اداء کی جاسکتی ہے یعنی اس میں فاسد نیت بھی  
ہو سکتی ہے۔ لیکن اسی طبعی علاقہ کی وجہ سے نمازی پر گمان غالب یہی  
ہوتا ہے کہ وہ مخلص ہے اور یہی وجہ تھی کہ منافقین کے حق میں بھی یہ  
نمازیں سرمایہ اطمینان بنی ہوئی تھی اور ان کے جان و مال دونوں محفوظ  
تھے ورنہ ان کے کفر میں شبہ کیا تھا۔ اس کے برعکس بعض اشکال و صور کو  
بھی بعض معاصی کے ساتھ طبعی ربط ہوتا ہے۔ جیسے سب و شتم، جنگ و  
جدل اور قتل و غارت وغیرہ یہاں بھی نیات کے تفاوت کی وجہ سے ان  
افعال کے معصیت اور طاعت ہونے میں اختلاف ہو سکتا ہے اور اسی  
طبعی ربط کی وجہ سے مغالطہ لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد کی  
صورت چونکہ ناحق کشت و خون کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے اور کشت و  
خون کو عناد و فساد کے ساتھ طبعی ربط حاصل ہے اس لیے جہاد پر کشت و  
خون کا مغالطہ لگ جاتا ہے حالانکہ یہ بغض فی اللہ کا مظہر اور اطاعت  
ربانی کا مرقع ہے ان کا قالب گو یکساں نظر آئے مگر ان کا مصدر قطعاً  
مختلف ہے اسی اشتباہ کی وجہ سے بعض کوتاہ فہموں کے لیے تو جہاد کی  
مشروعیت حقانیت اسلام کے سمجھنے میں شبہ کا موجب بن گئی ہے۔



پیکر نازیبا در بر گرفتہ بود ظاہر بیناں ایں را جریمہ خوانند و مرتکبان را گناہگار انگارند و بندہ گنام ایں را از قسم زلات می شمار و ہمیں است کہ مغفور شدند در نہ فساد ذات البین را حالقہ فرمودہ اند و ازیں جامعنی لاحسد الا فی اثنین پیدا شدہ باشد و ہم ہویدہ شدہ باشد کہ دریں حدیث حسد بمعنی خود است حاجت آں نیست کہ بمعنی غبط گیرند مگر غرض نہ آنست کہ کار بند ایں قسم حسد ہم باید شد و بزد و کوب و ایذاء رسانی باید پرداخت نے بلکہ ہر آدم آنست کہ ایں قسم حسد کہ از آثار محبت خداوندی است در عرضش بر طع کے را اختیار نیست بذات خود مذموم نسبت ازیں جادریافت کردہ باشی کہ جرم چیزے دیگرست و زلہ و خطار اجتہاد چیزے دیگر بلحاظ پیکر یکے را از قسم دیگر شمر دن نشاید و ہم دریافتہ باشی کہ کذب و غیرہ کہ منشاء آں ہمیں حسد متفرع بر محبت خداوندی شدہ باشد در حکم و اعتبار و شمار ہماں حسد خواہد بود اندریں صورت کذبات اخوان یوسف را جریم نہاید گفت زلت باید خواند باقی وجہ تسمیہ ہم ازیں بیان خواہد یافت لیکن ایں قدر باید نوشت کہ در صورتے کہ مصدر گناہ صغیرہ باشد یا کبیرہ ہماں مادہ شیطانی شد چہ پیش آمد کہ اکابر دین امتناع کبار پس و پیش نبوت برابر شمر دند و صغار را مخصوص بزمانہ پس نبوت دانستند مقتضائے اتحی و منشاء آں بود کہ ہر دو یکساں می بودند در جوابش آنچہ فہم احقر می آید انیست کہ کبار بذات خود مقصود می باشند و صغار ذرائع کبار می بودند فتح کبار بہ نسبت صغار ذاتی می باشد و فتح آں عرضی چہ کبار را بجز یک مصدر معین مصدرے دیگر نمی باشد و ذرائع را مصادر کثیرہ می بود و آنہم بسا اوقات متبدل یثود ہمیں ست کہ زناء باہر کہ

اسی مقدمہ کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ بمقتضائے اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ اصل محاسبہ کا مدار مصادر افعال رہیں گے نہ ان کے مظاہر و اشکال لہذا محاسبہ صرف افعال کے مظاہر حسنہ اور قبیحہ پر نہ ہوگا بلکہ اصل حسن و قبح کا مدار ان کے مصادر یعنی نیتوں پر رہے گا اور ان نیتوں کے اختلاف کی وجہ سے ہی ان کے مظاہر و اشکال پر بھی حسن و قبح کا حکم لگایا جاسکے گا یہ حسن و قبح ان مصادر کے حق میں تو ذاتی اور اصلی ہوگا اور مظاہر کے لیے عارضی لہذا اگر مصادر افعال بالذات قبیح ہوں اور حق تعالیٰ کے نزدیک قابل مذمت و نفرت ہوں جیسے تو حید کا انکار، عناد و تکبر، ہوا و ہوس، یہ افعال ہر حالت میں معاصی شمار ہوں گے۔ کیونکہ یہ افعال ایسے ہیں جن کا قبح بالذات اور اصلی ہے عارضی نہیں اور جن افعال کے مصادر حسن بالذات ہوں اور خالق کائنات کے نزدیک عمدہ ہوں تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کو مصادر قبیحہ کے ساتھ کوئی طبعی علاقہ تو نہیں ہے اگر ہے تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے اخلاق حمیدہ ان مظاہر کے ارتکاب کا محرک بن سکتے ہیں دوم یہ کہ کسی غلط فہمی کا محل ہی نہ ہو۔ پہلی صورت کو خطا اجتہادی کہا جاتا ہے اور دوسری کا نام زلت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ پہلی قسم میں داخل ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو سلوک ان کے ساتھ کیا تھا وہ صرف اس غلط فہمی میں تھا کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں ان سے کچھ نہ کچھ تساہل ہوا ہے۔ اس کے برخلاف برادران یوسف علیہ السلام اور حضرت یونس علیہ السلام کا معاملہ دوسری قسم یعنی زلت میں داخل ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام سے جو فعل سرزد ہوا اس کی بنیاد دنیا کی محبت نہ تھی بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ان کی جانب غیر معمولی میلان تھا جیسا کہ وَ أَخُوهُ أَحَبُّ إِلَيَّ اِسْا پر شاہد ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کوئی ظاہری بادشاہ تو نہ تھے

باشد ممنوع و بوس و کنار با اولاد خود محمود و دانی کہ اندریں صورت کبار موصوف بالذات و صغائر بالعرض و قابل عروض خواهند بود قبل عروض اطلاع قابلیت لغایت عمیر مثل اطلاع موصوف بالذات سهل و آشکار اینست مع ہذا تحدید حدود کار خداوند معبودست نبی را ہم اگر ایں علم میسری آید بذریعہ وحی میسری آید و غالباً و وجدک ضالاً فہدی ہمیں معنی داشتہ باشد مگر علم حدود کبار بایں وجہ کہ بوجہ مقصود بودن آں و اشتہار مذمت آن قرن بعد قرن اتفاق انبیاء در اں روشن تر است چنداں محتاج وحی نیست بایں وجہ لازم آمد کہ ہم پیش از نبوة و ہم بعد از نبوة ممتنع باشد باقی ماند صغائر چوں آنہا در ایں مرتبہ اشتہار نمی باشند و نہ چنان مقصود و بر روی کار گوئند اختفاء در آں راہ یافت کہ بے نزول وحی علم بسیارے ازاں در حکم ممتنع باشد آخر کیست کہ نمی داند کہ ممانعت ذرائع زناء کہ از حدیث و کلام اللہ می بر آید ہر گز بخیاں احدے نمی آید ہاں بعضے ازاں مثل کذب کہ علم بطلان آں طبعی ست در بارہ امتناع و انتہاء انبیاء ازاں محتاج وحی نیست مگر اینہمہ تا ہماں دم است کہ جریمہ باشد و اگر از قسم زلت بود امتناعش در حق او شاں ممتنع نمی نماید ہاں ایں قدر صحیح کہ قوت علمیہ و قوت عملیہ از کمالات ذاتیہ بلکہ اصل آنست - و کذب بظاہر دلالت بر فساد اول دارد کہ اشرف ست و بعد اطلاع تعدد کذب در اخبار دنیوی رافع اعتماد مطلق ست پس خدا را چہ امید کہ وحی بکنسہ خواهد رسا نید و بنی نوع را چہ یقین کہ ہر چہ از خدا آوردہ بے کم و کاست آوردہ بایں وجہ کیکہ کذب مقتضاء طبعش بود نبوت را شاید لیکن از پاک نہاد اں بوقت غلبہ مصدر چنانچہ صدور کبار ممکن است و جملہ لولا ان رأی برہان

کہ ان کے میلان میں کسی ظاہری نفع کا خیال پیدا ہو سکتا ہو بلکہ ایک نبی تھے جن کی محبت پر صرف آخرت ہی کا نفع باعث حسد بن سکتا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حسد لوازم محبت میں سے ہے خواہ وہ دنیوی محبت ہو یا اخروی لہذا جیسی محبت ہوگی اس کے حسد کا حکم بھی اسی کے تابع رہے گا چونکہ بردارن یوسف علیہ السلام کے حسد کا باعث خداوندی محبت تھی اس لیے ان کے حسد کا باعث بھی محبت خداوندی کے آثار میں شمار ہوگا ہاں یہ ضرور ہے کہ جو اس کا قالب اختیار کیا گیا وہ یقیناً نازیبا تھا - یہاں ایک ظاہر ہیں جو صرف افعال کی ظاہری صورت پر نظر رکھتا ہے اس کو معصیت اور گناہ ہی شمار کرے گا لیکن ہمارے نزدیک وہ زلت میں داخل ہے یہی وجہ تھی کہ یہ ذات البین جس کے حق میں حائقہ کا لفظ وارد ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کی سفارش پر بارگاہ رب العزت میں معاف ہو گئی - اس تقریر سے حدیث لا حسد فی الاثنین کے معنی میں کسی تاویل کی ضرورت نہ رہی ( کیونکہ نیات کے تفاوت سے بعض مواضع میں حسد کی گنجائش نکل آتی ) اس بیان سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس قسم کا حسد کرنا اپنے اختیار سے بھی درست ہے اور کسی مسلم کی ایذا رسانی خواہ کتنی ہی اچھی نیت سے ہو حلال ہو سکتی ہے - بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس حسد کا باعث خداوندی محبت ہو وہ غیر اختیاری ہوتی ہے اس لیے قابل درگزر ہو سکتی ہے برخلاف اس حسد کے جس کی بنیاد حُب دنیا ہو اس تقریر سے جرم زلت اور خطائے اجتہادی میں فرق واضح ہو گیا یہاں سب کی صورت گواہی ہی نظر آتی ہے مگر معنی اور احکام کے لحاظ سے ان میں بڑا فرق ہوتا ہے - جرم قصداً معصیت کرنے کا نام ہے اور خطاء اجتہادی اس غلطی کو کہتے ہیں جہاں غلط فہمی کا کوئی منشاء پیدا ہو سکتا ہے - اس کے برخلاف زلت ہے جہاں غلط فہمی کا کوئی منشاء تو نہیں ہوتا مگر اس میں احتیاط کے باوجود غیر اختیاری طور پر انسان مبتلا ہو جاتا ہے ( جیسا کہ خود زلت کا لفظ جس کے معنی لغزش



ربہ شاہد بر آں کذب و آنہم بطور زلت بدرجہ اولی ممکن  
 باشد البتہ کبیرہ بوجہ تعین مصدر بطور زلت صما در نتواں  
 شد زیں وجہ عصمت لازم افتا۔

اور پھسلنے کے ہیں اس پر دلالت کرتا ہے) اب رہا یہ سوال کہ جب  
 مصدر گناہ خواہ وہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ایک ہی ٹھہرا یعنی مادہ شیطانی تو پھر  
 علماء نے ان دونوں کے صدور میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے  
 حق میں تفریق کیوں کی ہے اگر ان میں مادہ شیطانی نہیں ہے تو پھر ان سے ہر دلوغ کا صدور ممنوع ہونا چاہیے اور قبل از نبوت اور بعد از  
 نبوت کی کوئی تفصیل بھی نہ ہونی چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبار وہ گناہ ہیں جو بذات خود مقصود ہوتے ہیں اور صغار وہ ہیں جو بذات  
 خود مقصود ہوتے ہیں اور صغار وہ ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ کسی کبیرہ کے لیے ذریعہ اور تمہید ہوتے ہیں اس لیے کبار کا قبح  
 صغار کی نسبت سے ذاتی اور صغار کا عرضی ہوتا ہے کیونکہ کبار میں نیت فاسدہ کے سوائے کوئی اور دوسری نیت ہی نہیں ہوتی اور ان کے  
 ذرائع یعنی صغار میں مختلف نیا ت بھی ہو سکتی ہیں اور ان نیتوں کے اختلاف سے ان افعال کا حکم بھی مختلف ہو سکتا ہے دیکھو زنا جو کبار میں  
 ہے مطلقاً حرام ہے خواہ وہ کسی کے ساتھ ہو اور بوس و کنار جو صغار میں شمار ہے اگر اجنبی عورت کے ساتھ ہو تو حرام ہے مگر اپنی بیوی کے  
 ساتھ حرام نہیں بلکہ مطلوب و محمود ہے۔ پس جب صغار میں قبح عارضی ہو یعنی کہیں ہوا اور کہیں نہ ہوا تو ان کا قبح بھی کبار کی طرح کھلا ہوا  
 واضح اور ظاہر نہیں ہوگا اس لیے یہاں وحی کی اطلاع کے بغیر یہ حکم لگانا مشکل ہوگا کہ قبح کہاں عرضی ہے اور کہاں اصلی ان حدود کی تحدید  
 صرف ایک احکم الحاکمین کا حق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اگر اس حقیقت کی اطلاع ہوتی ہے تو بذریعہ وحی ہوتی ہے۔ غالباً وجدک  
 ضالاً فہدیٰ کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں اس کے برخلاف کبار کا معاملہ ہے وہ شرائع سابقہ سے لے کر آج تک اتنا روشن ہوتا چلا آیا  
 ہے کہ ان کے قبح پر وحی الہی کو تنبیہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی اس لیے انبیاء علیہم السلام سے ان کا صدور نہ قبل از نبوت ہو سکتا ہے  
 نہ بعد از نبوت صغار کا قبح اس درجہ شہرت پذیر نہیں ہوتا اس لیے ان کا معاملہ اتنا دقیق ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کی شناخت وحی کے بغیر  
 ناممکن ہوتی ہے کون نہیں جانتا کہ جس طرح زنا ہر شخص کے نزدیک معصیت ہے اسی طرح اس کے مقدمات کھلی ہوئی معصیت نہیں اگر  
 قرآن و حدیث ان کی ممانعت نہ فرماتے تو کسی کے ذہن میں بھی ان کی اتنی مذمت نہ آ سکتی۔ ہاں بعض معاصی ایسے ہیں کہ ان کے مذموم  
 ہونے کی شہرت بھی کبار کی طرح ہے جیسے کذب یہاں بھی اس کے قبح کے لیے وحی کی تنبیہ کی احتیاج نہیں ہے مگر یہ بھی اسی وقت ہوگا کہ  
 اس کا صدور قصداً ہو نہ کہ زلت کے طور پر غیر اختیاری۔ انسان کے کمالات کی دو قسمیں ہیں کمالات علمیہ اور کمالات عملیہ کذب انسان  
 کے کمالات علمیہ کے فساد پر ضرور دلالت کرتا ہے اس لیے اگر کوئی شخص قصداً جھوٹ بولے تو نہ وہ خدا تعالیٰ کی نظر میں قابل اعتماد ہو سکتا ہے  
 نہ انسانوں کی نظروں میں کیا معلوم جب اس کی عادت کذب کی ٹھہری تو وہ وحی الہی کو بھنسنے پہنچائے گا یا نہیں۔ ہر بنی نوع انسان کو کیا  
 اطمینان کہ جو وحی اس پر آئی تھی وہی اس نے بعینہ پہنچائی ہے۔ اس لیے جس کی فطرت میں دروغ گوئی کی صفت ثابت ہو جائے وہ منصب  
 نبوت کے قابل نہیں ہو سکتا ہاں اگر کذب کا صدور غیر اختیاری شور پر ہو جائے تو اس کا امکان ہو سکتا ہے مگر کبار میں چونکہ مصادر متعین  
 ہوتے ہیں یعنی ان میں فاسد نیت کے سوائے کوئی دوسری نیت ممکن ہی نہیں اس لیے بطور زلت بھی ان کا صدور ناممکن ہے۔



(۱۰۹۹) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اسْتَخْلَفَ خَلِيفَةً إِلَّا لَهُ بَطَانَتَانِ بَطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالْخَيْرِ وَتَحْصُهُ عَلَيْهِ وَبَطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالشَّرِّ وَتَحْصُهُ عَلَيْهِ وَالْمَعْصُومُ مَنْ عَصَمَ اللَّهُ .

(رواہ البخاری فی کتاب القدر)

الرَّسُولُ الْعَظِيمُ وَعِصْمَتُهُ فِي عَهْدِ طُفُولِيَّتِهِ  
(۱۱۰۰) عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

(۱۰۹۹) ابوسعید خدریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ جو خلیفہ بھی ہوتا ہے اس کے لئے دو قسم کے مشیر ضرور ہوتے ہیں ایک مشیر وہ جو اس کو نیکی کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور اسی کی رغبت دلایا کرتا ہے دوسرا وہ جو برائی کا مشورہ دیتا ہے اور بری باتوں کی طرف ابھارتا رہتا ہے پھر برائی سے محفوظ تو صرف وہی رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

(بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہدِ طفولیت

(۱۱۰۰) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام رسول

(۱۰۹۹) \* حدیث مذکور پر امام بخاریؒ نے ”بطاتہ الامام و اہل مشورتہ“ کا عنوان قائم کر کے غالباً اس طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ یہاں مشیر مراد ہیں جو ہر خلیفہ و حاکم کے ساتھ عام طور پر ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت حدیث مذکور کا تعلق فرشتہ اور شیطان کی خیر و شر کی ان دو طاقتوں سے مخصوص نہ ہوگا جو عام انسانوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جب انسانی فطرت ظاہری مشیروں سے متاثر ہو سکتی ہے تو خیر و شر کی ان دو مرکزی طاقتوں سے بھلا کیونکر متاثر نہ ہوگی اس بناء پر اگر حدیث کو عام رکھا جائے تو اس میں بھی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا۔ حدیث کا آخری جملہ یہ پتہ دیتا ہے کہ مقام عصمت یعنی وہ مقام کہ انسان شیطان یا غلط مشیر کا کوئی اثر قبول نہ کر سکے یہ اپنے بس کی بات نہیں جس کو خدا تعالیٰ محفوظ رکھے بس وہی محفوظ رہ سکتا ہے یہ شان صرف انبیاء علیہم السلام کی ہے چونکہ ان کو خود اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے انتخاب فرماتا ہے اس لیے وہی ہر قسم کی غلطی سے ان کو بچانا بھی ہے ان کے علاوہ جتنے انسان ہیں ان کا معاملہ خطرہ میں ہے۔

(۱۱۰۰) \* نور محمدی قرنہا قرن سے قوالب انسانہ سے گذرتا ہوا آ رہا تھا اور اب وہ وقت آچکا تھا جب کہ بطن آمنہ سے براہ راست پیکر انسانی میں وہ جلوہ گر ہو جائے۔ اس لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ قالب انسانی کے خواص سے یکسر خالی ہوتا۔ مگر قدرت چاہتی ہے کہ آپ کا قالب بھی تمام دوسرے بشر سے علیحدہ اور ممتاز رہے اس لیے اس کام کے لیے وہ اپنا سب سے مقدس فرشتہ بھیجتی ہے وہ آ کر سب سے مقدس پانی سے اس کو صاف کرتا ہے پھر ایمان کے آب زلال میں اس کو غوطہ دیتا ہے یہ تو ہو سکتا تھا کہ آپ کے جسد اطہر میں پیدائشی طور پر ہی یہ حصہ نہ رکھا جاتا مگر عالم اسباب کے تحت جب یہ قالب مبارک اسی صورت سے منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا جیسا کہ عام انسانی قالبوں کا انتقال ہوتا ہے تو ان خواص سے علیحدہ رہنا کیسے ممکن تھا ادھر یہ بھی منظور تھا کہ اپنی خصوصی نظر تربیت کا اظہار کیا جائے۔ تربیت کا ترجمہ پرورش ہے یہ تدریج کی متقاضی ہے اس لیے رب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چاہتا تھا کہ اپنی خصوصی پرورش کا اظہار فرمائے اور قدم قدم پر یہ روشن فرمائے کہ یہ ذات قدسی صفات کسی دوسرے کی نگرانی میں پرورش پاری ہے۔ دیکھو والد کا سایہ والدہ مبارکہ کا سایہ اور آخر میں عم بزرگوار کا سایہ یہ سب سایے اٹھے مگر اٹھے رفتہ رفتہ اور آخر میں پھر ایک اسی ذات پاک کا سایہ رہ گیا جس نے شروع سے آپ کو براہ راست اپنی تربیت میں لے رکھا تھا۔ حافظ سہیلیؒ نے یہاں ایک عجیب نکتہ تحریر فرمایا ہے۔ اس کے لیے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قالب انسانی کی تخلیق کی اصل نطفہ ہے جس کا ظہور شہوت سے ہوتا ہے۔ یہی نطفہ تدریجی طور پر بستہ خون پھر تو تھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی بستہ خون مغز شیطان کہلاتا ہے۔ چونکہ شہوات کے تمام مقامات پر شیاطین دلچسپی کے ساتھ نظر رکھتے ہیں اس لیے قالب انسانی کے اس جزء پر بھی خاص لطف.....



اس تفصیل سے آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ دنیا میں بچے سب ہی معصوم ہوتے ہیں، مگر ان کی عصمت کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ گناہ نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھی وہ جھوٹ بھی بولتے ہیں اور کوئی کوئی ان میں بد اطوار بھی ہوتا ہے پھر ان کی عصمت کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ قانونِ یسر کے ماتحت قدرت ان کے ان افعال پر قلمِ غفور کھینچ دیتی ہے اور مواخذہ نہیں فرماتی مگر یہ وہ معصوم ہیں جن کی معصوم فطرت للہ.....

الشَّيْطَانِ مِنْكَ ثُمَّ غَسَلَهُ فِي طَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مَاءٍ زَمْزَمٍ ثُمَّ لَامَهُ وَاعَادَهُ فِي مَكَانِهِ وَجَاءَ الْعِلْمَانُ يَسْعَوْنَ إِلَى أُمِّهِ يَعْنِي ظَنَرَةَ فَقَالُوا إِنَّ مُحَمَّدًا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قُتِلَ فَاسْتَقْبَلُوهُ وَهُوَ مُنْتَقِعُ اللَّوْنِ قَالَ أَنَسٌ فَكُنْتُ أَرَى أَثَرَ الْمُحِيطِ فِي صَدْرِهِ.

(رواہ مسلم)

الرَّسُولَ الْعَظِيمَ وَعِصْمَتَهُ فِي ابْنِ شَبَابِهِ (۱۱۰۱) عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَا هَمَمْتُ بِقَبِيحٍ مِمَّا كَانَ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَهْمُونَ بِهِ إِلَّا مَرَّتَيْنِ مِنَ الدَّهْرِ كَلَّمَا هُمَا يَعِصُمْنِي اللَّهُ مِنْهُمَا قُلْتُ لِفَتَى كَانَ مَعِيَ مِنْ قُرَيْشٍ بِأَعْلَى مَكَّةَ فِي

آپ میں یہ تھا شیطان کا حصہ جس کو میں نے نکال کر پھینک دیا ہے۔ پھر آپ کے قلب مبارک کو زم زم کے پانی سے ایک سونے کے طشت میں ڈال کر دھویا پھر اس کو سی دیا اور اپنی جگہ پر رکھ دیا بچے آپ کی دودھ پلائی کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور اطلاع دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو قتل کر دیئے گئے۔ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے لیے نکلے تو آپ کا رنگ فق پڑا تھا۔ انسؓ کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ اس سلامتی کا نشان آپ کے سینہ مبارک میں دیکھا کرتا تھا۔ (مسلم شریف)

### آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہد شباب

(۱۱۰۱) حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جن ناشائستہ حرکات کا جاہلیت کے لوگ عام طور پر ارادہ کیا کرتے تھے بجز دو مرتبہ کے میرے دل میں کبھی ان کا خطرہ بھی نہیں گذرا اور ان دونوں مرتبہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ان میں شرکت کرنے سے بچالیا ہے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ ایک قریشی نوجوان جو مکہ مکرمہ کی بالائی جانب میں اپنی بکریاں چرایا کرتا تھا وہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کہا تم ذرا میری

لئے..... کو اور طرح طرح سے معصوم بنایا جا رہا ہے تاکہ گناہ کا صدور تو درکنار اس میں کسی ادنیٰ سی معصیت کی طرف میلان بھی نہ رہے اس لیے یہ وہ معصوم ہیں جو گناہ کرنا جانتے ہی نہیں اب اندازہ فرمالیجئے کہ جس تعمیر کی اساس میں اس طرح عصمت کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے تو اس تعمیر کی عصمت کا عالم کیا ہوگا۔

(۱۱۰۱) \* ملکی اور وطنی عادات انسان میں خلقی عادات کی طرح راسخ ہوتی ہیں۔ اگر نزول وحی سے قبل آپ کے قلب میں ان کا خطرہ خطرہ بھی نہ گزرتا تو یہ قانون فطرت کے خلاف ہوتا لیکن اگر آپ کی اس میں اس طرح قدرت کی تکوینی حفاظت ثابت نہ ہوتی تو یہ صفت عصمت کے مناسب نہ ہوتا اس لیے آپ کا ارادہ ہونا بھی ضروری تھا۔ پھر ایسے اسباب بھی سامنے آنے ضروری تھے کہ آپ اس میں شرکت نہ فرما سکیں۔ اچھا اگر فرض کر لو ایک بار ایسے موانع پیش آ بھی گئے تھے تو دوبارہ پھر ایسا ہی کیوں ہوا؟ اور اس کے بعد پھر آپ کا قلب مبارک اس خیال سے خالی کیوں ہو گیا؟ جب آپ ان سوالات پر غور کریں گے تو جواب صرف یہ ہوگا کہ صفت عصمت کا تقاضہ یہی تھا۔ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ جس بات کا یہاں ارادہ ہوا تھا اس کی حیثیت تھی کتنی؟ صرف ایک افسانہ گوئی کی شرکت۔ یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہ تھا کہ اس زمانہ کے لحاظ سے اس کو بد اخلاقی کی فہرست ہی میں شمار کیا جاسکتا۔ مگر چونکہ نبوت کے پراز صدق و صفا فطرت کو صدق و صفا ہی کے ماحول میں رکھنا منظور تھا اس لیے فرضی افسانوں سے بھی اس کو دور رکھا گیا اور اس طرح عصمت کے اسباق قدرت خفیہ درخفیہ آپ کو واقعات کے ضمن ہی میں پڑھاتی رہی۔



أَغْنَامٍ لَهَا تَرْعَى أَبْصِرْ لِي غَنَمِي حَتَّى أَسْمَرَ  
هَذِهِ اللَّيْلَةَ بِمَكَّةَ كَمَا يَسْمُرُ الْفَتَيَانُ قَالَ  
نَعَمْ فَلَمَّا خَرَجْتُ فَجِئْتُ أَدْنَى دَارٍ مِنْ  
دُورِ مَكَّةَ سَمِعْتُ غَنَاءً وَصَوْتَ دُفُوفٍ وَ  
زَمِيرٍ فَقُلْتُ مَا هَذَا قَالُوا فُلَانٌ تَزَوَّجَ فُلَانَةٌ  
لَرَجُلٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَلَهُوْتُ بِذَلِكَ الْغَنَاءِ وَ  
بِذَلِكَ الصَّوْتِ حَتَّى غَلَبَتْنِي عَيْنِي فَمَا  
أَيْقِطْنِي إِلَّا مَسُّ الشَّمْسِ فَرَجَعْتُ إِلَى  
صَاحِبِي فَقَالَ لِي مَا فَعَلْتَ قُلْتُ مَا فَعَلْتُ  
شَيْئًا فَوَاللَّهِ مَا هَمَمْتُ بَعْدَهَا بِسُوءٍ مِمَّا  
يَعْمَلُ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ حَتَّى أَكْرَمَنِي اللَّهُ  
بُنُبُوَّتِهِ.

(رواه ابن زاهويه في مسنده و ابن اسحاق و  
البخاري و البيهقي و ابو نعيم و ابن عساکر قال  
ابن حجر اسناده حسن متصل و رجاله ثقات  
كذا في الخصائص)

(۱۱۰۲) حَدَّثَنَا عُمَرُو بْنُ دِينَارٍ قَالَ سَمِعْتُ

بکریوں کی بھی دیکھ بھال رکھنا میں بھی اور نو جوانوں کی طرح آج مکہ مکرمہ جا کر  
افسانہ گوئی کے شغل کا ارادہ کر رہا ہوں اس نے کہا اچھی بات ہے جب میں چلا اور  
مکہ مکرمہ کی آبادی کے قریب ایک گھر کے نزدیک پہنچا تو میں نے گانے دف اور  
باجہ بجانے کی آوازیں سنیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے لوگوں نے کہا فلاں  
قریشی شخص کافلاں عورت سے نکاح ہوا ہے میں اس گانے بجانے کے قصہ میں پڑ  
کر قصہ گوئی کی محفل کی شرکت سے غافل ہو گیا اور اس زور کی نیند آئی کہ پھر  
دھوپ کی تیزی سے ہی میری آنکھ کھلی۔ میں اپنے رفیق کے پاس لوٹ آیا اس  
نے پوچھا کہو یہاں سے جا کر تم نے کیا کیا۔ میں نے ازاول تا آخر سارا ماجرا اس  
کو سنا دیا۔ ایک شب پھر میں نے اس سے ایسا ہی کہا وہ راضی ہو گیا اور پھر میں  
قصہ گوئی کے لیے نکلا پھر مجھے گانے کی آواز آئی اور جیسا شادی کا قصہ مجھ سے  
پہلے کہا گیا تھا اس مرتبہ پھر وہی مجھ سے کہا گیا۔ اس قصہ میں لگ کر میں پھر ایسا  
غافل ہوا کہ مجھ کو نیند آ گئی حتیٰ کہ دھوپ کی تیزی سے میری آنکھ کھلی۔ جب میں  
لوٹ کر اپنے رفیق کے پاس آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہو یہاں سے جا کر تم  
نے کیا کیا میں نے کہا میں نے کہا میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ خدا کی قسم اس کے بعد پھر کبھی  
میں نے کسی ایسی حرکت کا ارادہ نہیں کیا جس کے جاہلیت کے لوگ عادی تھے  
یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے شرف نبوت سے مجھ کو نوازا دیا۔ (بخاری بیہقی خصائص)  
(۱۱۰۲) عمرو بن دینار رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے جابر

(۱۱۰۲) \* اس واقعہ کے وقت آپ کے سن مبارک میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ تاہم یہ متفق علیہ ہے کہ یہ واقعہ نبوت سے قبل کا ہے۔  
دیکھئے کیا یہاں یہ ممکن نہ تھا کہ تہ بند کھولنے سے قبل ہی آپ کو عریانی سے بچا لیا جاتا، مگر پھر یہ کیسے ثابت ہوتا کہ یہ وہ نہیں جن کی برہنگی ایک  
مرتبہ بھی قابل برداشت ہو۔ اس لیے نظر تربیت چاہتی ہے کہ ایک واقعہ نادانستگی میں ایسا بھی پیش آ جائے اور اس پر گرفت بھی ہو اور اس  
طرح یہ ظاہر کر دیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی ہستی عام انسانوں سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔ معیاری اخلاق کے خلاف قدرتہ کو ان کا کوئی  
عمل گوارا نہیں ہوتا۔ آخر قدم قدم پر قدرت کی یہ روک ٹوک قوم کی نظروں میں ان کو ممتاز کرتی چلی جاتی ہے تا آنکہ نبوت سے قبل ہی قبل یہ  
بات ذہنوں میں بیٹھ جاتی ہے کہ یہ ہمارے طبقہ سے کوئی الگ اور بلند انسان ہیں۔ اتنی بات کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ان سے کوئی  
ایسا فعل ہی سرزد ہو جو معصیت کی تعریف میں آتا ہو خواہ وہ صغیرہ ہی سہی بلکہ ہر وہ کام جو کسی اعلیٰ معیار سے ذرا سا بھی گرا ہوا ہو اس کا صدور  
وہ بھی ایک دو مرتبہ بس اتنا ہی کافی ہے کہتے ہیں کہ شریعت موسویہ میں ستر کا مسئلہ اتنا مکمل نہ تھا جتنا کہ ہماری شریعت میں ہے اس لحاظ سے  
اس وقت تک عریانی میں چنداں مضائقہ بھی نہ تھا ادھر اس وقت آپ کا سن مبارک بھی زیر اختلاف ہے۔ نیز اس وقت عرب میں لٹہ.....

جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ يُحَدِّثُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْقُلُ مَعَهُمُ الْحِجَارَةَ لِلْكَعْبَةِ وَعَلَيْهِ إِزَارَةٌ فَقَالَ لَهُ الْعَبَّاسُ عَمُّهُ يَا ابْنَ أَخِي لَوْ حَلَلْتَ إِزَارَكَ فَجَعَلْتَهُ عَلَى مَنْكَبِكَ دُونَ الْحِجَارَةِ قَالَ فَحَلَّهُ فَجَعَلَهُ عَلَى مَنْكَبِهِ فَسَقَطَ مَغْشِيًا عَلَيْهِ فَمَا رَأَى بَعْدَ ذَلِكَ غُرْيَانًا.

(رواه البخاری فی باب کراهیة التعری و فی باب بنیان الکعبہ و طمحت عیناه الی السماء و فی حدیث ابی الطفیل فتودی یا محمد عظم عورتک فذلک اول مانودی فمارأیت له

عورة قبل و لا بعد)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے خود سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی تعمیر کے لیے دوسرے لوگوں کے ساتھ پتھر لارہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تہبند باندھ رکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا عزیز بھتیجے! اگر تم اپنا تہبند کھول کر اپنے کاندھوں پر پتھر کے نیچے رکھ لیتے تو آسانی ہو جاتی۔ ان کے فرمانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہبند کھول کر کاندھوں پر ڈال تو لیا مگر اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے یہوش ہو کر گر گئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں ہے کہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں اور غیب سے ایک آواز آئی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ستر ڈھکو۔ وہ دن ہے کہ پھر کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برہنہ نہیں دیکھا گیا۔ اور یہ پہلی آواز تھی جو غیبی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔

(بخاری شریف)

اللہ..... کوئی شریعت ہی نہیں تھی وہ لوگ اپنے نفس کو گو حنیف کہتے تھے مگر ملت حنیفہ کا تخم بھی کہو بیٹھے تھے۔ پھر اس ایک واقعہ پر اتنی بڑی تنبیہ اس کا لازمی ثمرہ یہ ہونا تھا کہ لوگوں کی نظریں آپ کی طرف اٹھنے لگیں اور ان میں یہ شعور پیدا ہونے لگے کہ ضرور جن کا اول یہ ہے ان کا آخر کچھ ہو کر رہے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک تو بہت بلند ہے۔ آپ کے رفیق غار صدیق اکبر کے متعلق جب کسی نے شیخ ابو الحسن اشعری سے پوچھا کہ زمانہ جاہلیت میں ان کا حال کیا تھا تو شیخ موصوف نے کیا عجیب جملہ فرمایا ہے۔ ”انہ مازال بعین الرضاء من اللہ عز و جل“ یعنی وہ تو ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی چشم رضاء کے تحت رہے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جو اس طرح کا پروردہ ہو وہ کسی شرک و کفر میں کب مبتلا ہو سکتا ہے۔ جب آپ کے ایک امتی کا حال یہ ہو تو خود بارگاہ رسالت کا حال کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ اسی ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ دیکھو ابی الوقت والجواہر۔ ص ۳۷ ج ۲۔ المبحث الثالث و الاربعون فی بیان ان افضل الاولیاء المحمديین الخ۔ آپ کی حیات طیبہ میں یہ کل ایک واقعہ ہے وہ بھی نبوت سے قبل کا اس میں بھی نبوت سے قبل کا اس میں بھی تصریح ہے کہ یہ عم بزرگوار کی تعمیل ارشاد پر ہوا اپنی فطرت سے نہیں۔ اور اسی پر اس شدت کے ساتھ غیبی گرفت موجود ہے سوچئے جس دور میں ابھی نزول ملک بھی شروع نہ ہوا ہوا اپنی شریعت کا کوئی تصور نہ ہو پہلی شریعت موجود نہ ہو ایسے دور میں کشف ستر کی حیثیت کیا رہنی چاہیے اور کیا اس ایک واقعہ کی وجہ سے جو اس طرح زیر تنبیہ آچکا ہوا انبیاء علیہم السلام کی نبوت سے قبل کی زندگی میں صغار کے لیے اصولی طور پر کوئی گنجائش تسلیم کر لینی چاہیے یا اس کے برعکس ان کی عصمت کا سبق لینا چاہیے۔ ابن ہشام بحیرار اہب کا قصہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

آپ جو ان ہوئے تو اس طرح پر اللہ تعالیٰ آپ کی نگرانی فرماتا آپ کی حفاظت رکھتا اور جاہلیت کی تمام ناشایاں حرکتوں سے آپ اللہ.....

فشب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و اللہ تعالیٰ یکلوه و یحفظه و یحوطه من



(۱۱۰۳) عَنْ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ قَالَ كَانَ صَنَمٌ مِنْ نَحَاسٍ يُقَالُ لَهُ إِسَافٌ وَ نَائِلَةٌ يَتَمَسَّحُ بِهِ بَت تَّهَا جَسَاسٌ كَوَلُوكَ إِسَافٌ وَ نَائِلَةٌ كَهْتَمُ تَحْتِ مَشْرُكٍ جَب طَوَافُ كَرْتِ تَوْتَبْرَكَ

اللہ..... اقدار الجاهلیۃ لما یرید بہ من کرامتہ و رسالتہ حتی بلغ ان کان رجلاً افضل قومہ، مروءۃ و احسنہم خلقاً و احسنہم جواراً و اعظمہم حلماً و اصدقہم حدیثاً و اعظمہم امانۃ و ابعدهم من الفحش و الاخلاق التی تدنس الرجال تنزہاد تکرما حتی ما اسمہ فی قومہ الا الامین لراجمع اللہ فیہ من الامور الصالحۃ۔

کو دور دور رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ اپنے عین دور شباب میں بلحاظ مروت سب سے افضل، اخلاق میں سب سے بہتر، پڑوس کی رعایت سب سے زیادہ رکھنے والے، حلم و بردباری میں سب سے بڑھ کر گفتگو میں سب سے زیادہ راست باز، امانتداری میں سب سے زیادہ امانت دار، تمام فحش باتوں اور ان تمام بد اخلاقیوں سے جو انسان کے لیے بدنما داغ ہوں کوسوں دور تھے اور ان ہی اوصاف حسنہ کی وجہ سے آپ کی قوم میں آپ کا لقب امین تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ کو رسالت کے منصب جلیل سے نوازا منظور تھا۔

(۱۱۰۳) \* شرک و کفر سے انبیاء علیہم السلام کا مجتنب رہنا تو کسی کے نزدیک بھی زیر بحث نہیں ہے۔ اس لیے یہاں غور صرف اس پر کرنا چاہیے کہ جب شرک و کفر سے صرف قدرت ہی ان کی نگراں ہوتی ہے تو پھر اس کی نگرانی صرف اسی حد پر کیوں ختم سمجھی جائے اور کیوں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس کی نگرانی کا دائرہ فسوق و عصیان تک بھی وسیع ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی نظر میں یہ تینوں قسمیں مکروہ تر ہیں گو ان کے مراتب میں فرق ہو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مکروہ سے تو ان کی حفاظت کی جائے اور دوسرے مکروہ سے ان کی حفاظت نہ کی جائے۔ قرآن کریم کا ارشاد تو یہاں عام مؤمنوں کے حق میں یہ ہے۔

﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَ زَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَ كَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوقَ وَ الْعِصْيَانَ﴾ (الحجرات: ۷)

یہ خدا تعالیٰ کا انعام ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی ہے اور اس کو خوشنما بنا دیا ہے (اور یہ بھی اس کا انعام ہے) کہ اس نے کفر، گناہ اور نافرمانی کی نفرت پیدا کر دی ہے۔

پھر جن کے طفیل میں خدا تعالیٰ کا یہ انعام تقسیم ہوتا ہو خود ان کے حق میں بھی کسی ادنیٰ سی معصیت کا تصور کیسے معقول ہو سکتا ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایمان و کفر و ضد ہیں اس لیے ایک کی محبت کے لیے دوسری جانب کی کراہت لازم ہے چونکہ آیت بالا میں ایمان کا مقابل صرف کفر کو نہیں رکھا گیا بلکہ عصیان بھی اس میں داخل ہے اس لیے محبت ایمانی اسی وقت کامل شمار ہوگی جب کہ کفر و عصیان سے نفرت بھی کامل ہو۔ اس لیے اگر انبیاء علیہم السلام میں محبت ایمانی کامل تسلیم کی جائے تو ان ہر سہ انواع سے کراہت تسلیم کر لینی بھی لازم ہوگی اور اگر ان ہر سہ انواع میں کسی سے کراہت میں کوئی نقصان تسلیم کیا گیا تو دوسری طرف محبت ایمانی میں بھی اتنا ہی نقصان تسلیم کرنا لازم ہوگا و العیاذ باللہ۔

انبیاء علیہم السلام میں یہ ایمانی محبت ذاتی اور فطری ہوتی ہے اور کفر و معصیت سے نفرت بھی فطری اور ذاتی ہوتی ہے۔ اس ذاتی محبت و نفرت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی خلقت میں ایسی کوئی شے نہیں ہوتی جو ان کو کسی ادنیٰ سی برائی کی طرف مائل کر سکے پھر شیطان جو شر کی خارجی طاقت ہے وہ بھی ان کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے اس لیے داخل اور خارج کسی جانب سے بھی ان میں شر کا داعیہ نہیں ابھرتا۔ لہذا.....

الْمُشِيرُ كُونَ إِذَا طَافُوا فَطَافَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَطُفْتُ مَعَهُ فَلَمَّا مَرَرْتُ بِهِ مَسَحْتُ بِهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَمْسُهُ قَالَ زَيْدٌ فَطُفْنَا فَقُلْتُ فِي نَفْسِي لَا مُسَنَّهُ حَتَّى أَنْظُرَ مَا يَكُونُ فَمَسَحْتُهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَمْ تَنْه. قال البيهقي زاد غيره عن محمد بن عمرو باسناده قال زيد فوالذي أكرمه و أنزل عليه الكتاب ما استلم صنما قط حتى أكرمه الله تعالى بالذي أكرمه و أنزل عليه.

الرُّسُولُ الْعَظِيمُ وَ سَيِّطْرَةُ عَصَمَتِهِ وَ  
انقياد قوى الضلالة له

(۱۱۰۴) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ

اس کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا میں نے بھی آپ کے ساتھ طواف کیا۔ جب میں اس بت کے پاس سے گزرا تو حسب دستور میں نے بھی اس کو ہاتھ لگایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو ہاتھ نہ لگانا۔ زید کہتے ہیں میں نے اپنے دل میں کہا میں ضرور ہاتھ لگا کر رہوں گا دیکھو تو کیا ہوتا ہے چنانچہ میں نے اس کو ہاتھ لگادیا۔ آپ نے فرمایا باز نہیں آؤ گے۔ بیہقی کہتے ہیں بعض راویوں نے اس روایت میں اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ زید کہتے ہیں اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبوت سے سرفراز کیا اور آپ پر قرآن نازل فرمایا، آپ نے کبھی کسی بت کو نبوت سے قبل بھی ہاتھ نہیں لگایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے نوازا اور آپ پر قرآن کریم نازل فرمایا۔ (بیہقی کذا فی البدایہ والنہایہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عصمت کا رعب و دبدبہ اور گمراہی کی طاقتوں کا اس کے سامنے سپر ڈال دینا

(۱۱۰۴) ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لہ ..... دوسرے انسانوں میں مغز شیطانی بھی موجود ہوتا ہے ان کی اندرونی طاقتیں بھی انبیاء علیہم السلام کی طرف فطرۃ شائستہ اور مہذب نہیں ہوتیں ان کا شیطان بھی شروع سے شکست خوردہ نہیں ہوتا اس لیے داخلی یا خارجی عوارض کی وجہ سے ان میں فسوق و عصیان کی کراہت کے باوجود پھر ان کی طرف میلان ہو جانا ممکن ہے۔ قرآن کریم کے لفظ کفرہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں کفر و عصیان کی یہ کراہت پہلے موجود نہ تھی مگر یہ حق تعالیٰ نے پیدا فرمادی ہے اور یہ اس کا انعام ہے کہ جو چیز پہلے تم کو محبوب تھی اللہ تعالیٰ نے اب اس کو تمہارے لیے مکروہ بنا دیا ہے پھر شریعت مطہرہ پر عمل کرنے کرتے اور حب ایمان اور کراہت کفر غالب آتے آتے وہ وقت بھی آ جاتا ہے جب کہ ایک مسلمان کے اعضاء مرضیات الہیہ کے اس طرح منقاد و مطیع بن کر رہ جاتے ہیں کہ ان میں خلاف حرکت کرنے کی طاقت ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر ان کی شان ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے ساتھ ذرا سی دشمنی خدا تعالیٰ کے اعلان جنگ کا موجب بن جاتی ہے۔ ترجمان السنن احادیث نمبر ۴ اور اس کا تشریحی نوٹ یہاں ضرور ملاحظہ فرمائیے انبیاء علیہم السلام کی شان یہاں ابتداء ہی سے اتنی بلند ہوتی ہے کہ کسی طرف سے ان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لیے وہ معصوم کہلاتے ہیں اور دوسرے انسان کو معصوم نہ ہوں مگر ان کی اتباع سے معصیت سے محفوظ کہے جاسکتے ہیں۔

(۱۱۰۴) \* حدیث مذکور میں لفظ فاسلم کو کسی نے بصیغہ متکلم پڑھا ہے اور اسی کے مطابق ہم نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ بعض علماء نے اس کو بصیغہ غائب سمجھا ہے اس بناء پر اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ میرا شیطان اسلام قبول کر چکا ہے اس لیے وہ صرف بھلائی کا مشورہ دیتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے یہاں ایک تیسری شرح فرمائی ہے اور ان ہر دو شرحوں کو ناپسند فرمایا ہے: لہ .....



صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وَكَّلَ اللَّهُ بِهِ قَرِينَهُ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِينَهُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالُوا وَإِيَّاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ وَإِيَّايَ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمْتُ فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِخَيْرٍ.

ہے تم میں سے ہر شخص پر اللہ تعالیٰ نے دو قوتیں مقرر فرمائی ہیں جو اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک جن دوسرا فرشتہ۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیا یہ دونوں قوتیں آپ کے ساتھ بھی ہیں۔ فرمایا جی ہاں میرے ساتھ بھی ہیں لیکن شر کی قوت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی ہے اس لیے میں اس کے فریب سے محفوظ رہتا ہوں۔ مجھ کو وہ بھی بھلائی ہی کا مشورہ دیتی ہے۔ (مسلم شریف)

(رواہ مسلم) ہے۔ (مسلم شریف)

للہ ..... والمراد فی اصح القولین استسلم و انقادلی و من قال حتی اسلم انا فقد حرف معناه و من قال الشیطان صاء مأمونا. (مؤمننا) فقد حرف لفظه.

”جس شخص نے یہاں حدیث کے لفظ کو بصیغہ متکلم پڑھا ہے اس نے تو اُس کے معنی میں تحریف کی ہے اور جس نے اس کو بصیغہ ماضی پڑھ کر یہ سمجھا ہے کہ آپ کا شیطان اسلام قبول کر چکا تھا اس نے لفظی تحریف کی ہے صحیح مراد یہ ہے کہ اسلم بمعنی انقاد ہے یعنی وہ میرا مطیع و تابع رہ گیا۔“

دارمی روایت مذکور کے بعد لکھتے ہیں و من الناس من يقول اسلم استسلم يقول ذلّ. (ص ۳۰۶ ج ۲) اس سے بھی حافظ موصوف کی شرح کی تائید ہوتی ہے۔ سبحان اللہ! معصومیت کا مقام بھی کیا بلند مقام ہے جہاں سامان ضلالت بھی اسباب ہدایت بن کر رہ جاتا ہے۔ اب ذرا سوچئے کہ جہاں منبع شر بھی گردن تسلیم خم کر دے وہاں پھر شر کی گنجائش کس راستہ سے نکل سکتی ہے۔ جس کی معصومیت کی قوت کا اثر معصیت کی قوتوں پر بھی اتنا گہرا پڑتا ہو کہ وہ بھی موثر ہونے کے بجائے خود اس سے متاثر ہو کر رہ جائیں اور اس لیے اس کی معصومیت کے سامنے انقیاد و تسلیم کے سوا ان کے لیے کوئی چارہ کار نہ رہے ان کی عصمت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ. (الحجر: ۴۲) جو میرے خاص بندے ہیں ان کے مقابلہ پر تجھ کو ذرا بھی غلبہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس سے کچھ یہی مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے سامنے وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ اس لیے خود بڑی خود سری کے موقع پر بھی اس کو إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ. (مگر جو تیرے خاص بندے ہیں ان کو میں گمراہ نہ کر سکوں گا) کا استثناء کرنا پڑا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

ان المؤمن لیضنی شیاطینہ کما یضنی احدکم بعیرہ فی السفر.

بندہ مؤمن اپنے شیطانوں کو خدا تعالیٰ کی فرمان برداری کرتے کرتے اس طرح لاغر کر دیتا ہے جس طرح ایک شخص سفر کرتے کرتے اپنا اونٹ لاغر کر دیتا ہے۔

(رواہ احمد بسند فیہ ابن لہیقہ کما فی المجمع)

اب ظاہر ہے کہ جب ایسے مؤمن کی شیطانی طاقت کمزور ہوگی تو اس کی ملکی طاقت ضرور مسرور ہوگی۔ اور جتنی وہ مسرور ہوگی اتنی ہی ہر کام میں اس کی معین و مددگار رہے گی حتیٰ کہ اس کی شیطانی طاقت میں برائی پر برا بیچختہ کرنے کا کوئی حوصلہ ہی نہ رہے گا۔ اور اس وقت اس آیت کے معنی اس کے سامنے منکشف ہو جائیں گے۔

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا. (النساء: ۷۶)

(۱۱۰۵) عَنْ جَابِرٍ قَالَ وَرُبَّمَا سَأَلْتُ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوا عَلَى الْمُعِيَّاتِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي وَرُبَّمَا قَالَ يَسْلُكُ الشَّيْطَانُ مِنْ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ قَالُوا وَ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَاسْلَمَ. (رواه الدارمی راجع ترجمان السنة ص ۳۲۴ ج ۲)

(۱۱۰۵) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جن عورتوں کے شوہر گھر میں نہ ہوں کہیں باہر سفر میں چلے گئے ہوں ان کے پاس نہ جایا کرو کیونکہ شیطان انسان میں اس طرح گھوم جاتا ہے جیسا خون رگوں میں۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی شیطان ہے۔ فرمایا جی ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی ہے تو وہ میرے سامنے جھک چکا ہے۔ (دارمی) اسی مضمون کی دوسری حدیث ترجمان السنہ ص ۳۲۴ ج ۲ میں بھی گزر چکی ہے۔

(۱۱۰۶) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قِيلَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ (۱۱۰۶) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

لئے..... جب انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے والوں کی شان یہ ہو تو اب انبیاء علیہم السلام کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ اگر وہ العیاذ باللہ خود اس کے فریب میں آسکتے ہیں تو پھر ان پر ایمان لانے والے اس سے بچ کر بھلا کہاں نکل سکتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ شریعت میں فرشتے اور شیطان کا وجود تو اتر کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے اس لیے یہاں حدیث میں تاویل کرنا اور ان سے نفس انسانی میں صرف خیر و شر کا رجحان مراد لے لینا قطعاً غلط ہوگا۔ جامع ترمذی میں عبد اللہ بن مسعودؓ سے ایک روایت ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ شیطان اور فرشتہ ابن آدم کے قلب میں دونوں باتیں القاء کرتے ہیں القاء شیطانی کی علامت یہ ہے کہ اس میں شر اور حق کی تکذیب کا مضمون ہو اور فرشتہ کی جانب سے ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس میں خیر اور حق کی تصدیق کا مضمون ہو لہذا جس کے دل میں اس قسم کی بات آئے اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ فرشتہ کی جانب سے ہے اور اگر اس کے خلاف قسم کی بات آئے تو شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لینی چاہیے۔ اس کی شہادت میں آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ. (تفسیر سورہ بقرہ) علماء کہتے ہیں کہ لمہ شیطان کا نام وسوسہ اور لمہ ملکی کا نام الہام ہے۔

(۱۱۰۶) \* حدیثوں میں بیماریوں کے ظاہری اسباب کے ساتھ کچھ باطنی اسباب بھی مذکور ہو جاتے ہیں مثلاً استخاضہ کے متعلق آپ نے فرمایا تِلْكَ رَكْضَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ. یہ شیطان کی ایذا رسانی کا اثر ہے۔ جمائی کے متعلق فرمایا۔ یہ بھی شیطان کا اثر ہوتی ہے طاعون کے متعلق فرمایا کہ یہ جنات کے نیزہ کا نتیجہ ہے وغیرہ۔ اس زمانہ میں چونکہ شیطان اور فرشتہ دونوں کا سرے سے انکار ہی انکار ہو رہا ہے اس لیے اس قسم کی حدیثوں کی صرف تاویل ہی کی طرف ذہن جاتا ہے لیکن اگر ان ہر دو مخلوق کا یقین حاصل ہو پھر انسانوں کے ساتھ ان کی عداوت یا دوستی کا حال بھی معلوم ہو تو اس قسم کے مواضع پر تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے شیطان اور اصل انسانی سے عداوت کا تذکرہ کر کے یہی بتانا چاہا ہے کہ اس پشتپشت کی عداوت کو ختم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ اب ان دونوں میں قیامت تک کے لیے جنگ رہے گی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی کوئی حالت کھانے پینے سونے جاگنے حتیٰ کہ اس کی ازدواجی زندگی بھی اور عبادات کے ہر ہر شعبہ میں بھی کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کی مداخلت نہ ہو ترجمان السنہ ص ۴۱۹ ج ۲ میں عبد اللہ بن مسعود کی بی بی کی آنکھ لٹکے.....



عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّا نَتَخَوَّفُ أَنْ يَكُونَ بِكَ ذَاتُ  
الْجَنْبِ قَالَ إِنَّهَا مِنَ الشَّيْطَانِ وَمَا كَانَ اللَّهُ  
لِنُسَلِّطَهُ عَلَى . (رواه ابن اسحاق و ابن سعد  
و البيهقي كذا في الخصائص. ص ۲۷۰ و  
عن ام سلمة و ابن عباس نحوه)

(۱۱) علالت میں کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہمیں اندیشہ ہے  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہیں ذات الجنب کی بیماری نہ ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے فرمایا یہ بیماری شیطانی اثر ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ  
میرے اوپر مسلط فرمادے۔

(خصائص)

(۱۱۰۷) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا اخْتَلَمَ نَبِيٌّ  
قَطُّ وَ إِنَّمَا الْإِخْتِلَامُ مِنَ الشَّيْطَانِ.

(۱۱۰۷) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ کسی نبی کو کبھی  
احتلام نہیں ہوا کیونکہ اس کا منشاء شیطانی خواب ہوتا ہے۔

(طبرانی)

(۱۱۰۸) قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا  
لَدُنَّاهُ فِي مَرَضِهِ فَجَعَلَ يُشِيرُ إِلَيْنَا أَنْ لَا

(۱۱۰۸) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ ہم نے  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں دواء

(رواه الطبرانی كما في الخصائص)

للہ..... دکنے کا قصہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں اور آئندہ اپنے باب میں آپ اس کی مزید تفصیلات بھی پڑھیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ لہذا  
کسی حقیقت کے علم کے بغیر اس کی نفی میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ ذات الجنب کے جو اسباب اطباء اور ڈاکٹروں نے بتائے ہیں ان کا  
انکار نہیں ہے لیکن وہ اسباب کیونکر پیدا ہو جاتے ہیں گفتگو اس میں ہے۔ اسباب ظاہری کا جتنا نظم و نسق ہے وہ سب باطنی اسباب کا مسخر ہے  
اب جو ان کو نہیں جانتا اس کے لیے تمسخر کے سواء اور راستہ کیا ہے۔ الناس اعداء ما جھلوا۔ پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ بہت سی بیماریوں  
کے اسباب میں بلکہ معالجہ میں بھی ڈاکٹروں اور طبیعوں کے درمیان کتنا بڑا اختلاف ہوتا ہے لیکن علاج کی کامیابی اور نا کامیابی کے نتیجہ میں  
اوسطاً دونوں برابر رہتے ہیں اب اگر ان کے ساتھ تعویذات کا فن بھی اور شامل کر لیا جائے تو یہاں بہت سی مواقع پر جہاں اطباء عاجز ہوں  
سو فیدی کامیابی تجربہ میں آ چکی ہے۔ پس اگر انکار کی بنیاد صرف علاجی تجربہ ہے تو تعویذات سے شفاء کا تجربہ یہاں بھی ہے۔ بلکہ زہریلے  
جانور جیسے سانپ و بچھو یا جس کو نظر لگنا کہتے ہیں جھٹی مفید اس کے لیے جھاڑ پھونک ہے اتنا مفید اور سریع التاثر علاج نہیں۔ پھر یہ بھی یاد رہے  
کہ یہ آپ کا ایک اجمالی بیان ہے۔ ذات الجنب کے جملہ اقسام اور ان کے معالجات بیان کرنا آپ کا وظیفہ نہیں۔

(۱۱۰۷) \* احتلام کی عام صورت قوتِ شہوانیہ کا انتعاش ہی ہوا کرتا ہے اسی لیے اس قسم کے اسباب کی قلت و کثرت سے احتلام میں بھی  
قلت و کثرت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی اوعیہ منی کے پر ہو جانے سے بھی احتلام ہو جاتا ہے۔ جب اوعیہ منی پر ہو جاتا ہے تو طبعی طور پر وہ  
خارج ہو جاتا ہے۔ بظاہر اس قسم کے احتلام کی صورت یہاں بھی ممکن ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔ بہر حال ابن عباسؓ کی اس تعلیل سے آپ کو اس کا  
تو کچھ نہ کچھ اندازہ ہوا ہو گا کہ انبیاء علیہم السلام کی فطرت کو شیاطین سے کتنا بعد ہوتا ہے کہ طبعی عوارض جیسے احتلام و مرض وغیرہ میں بھی شیطان  
کے اثرات سے کتنے دور ہوتے ہیں۔ سونے کی حالت میں عام بشر کے حواس معطل ہوتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام اس حالت میں اتنے  
بیدار رہتے ہیں کہ اس حالت میں بھی ان کے باطنی احساسات معطل نہیں ہوتے۔

(۱۱۰۸) \* ”لدود“ اس دواء کو کہتے ہیں جو مریض کے منہ میں ڈالی جائے جیسا کہ ”سعوط“ وہ دواء ہے جو ناک میں ڈالی جائے للہ.....

تَلْدُونِي فَقُلْنَا كَرَاهِيَةَ الْمَرِيضِ لِلدَّوَاءِ فَلَمَّا  
أَفَاقَ قَالَ أَلَمْ أَنْهَكُمُ أَنْ تَلْدُونِي قُلْنَا كَرَاهِيَةَ  
الْمَرِيضِ لِلدَّوَاءِ فَقَالَ لَا يَبْقَى أَحَدٌ فِي  
الْبَيْتِ إِلَّا لَدَوْنَا أَنْظُرُوا إِلَّا الْعَبَّاسَ رَضِيَ اللَّهُ  
تَعَالَى عَنْهُ فَإِنَّهُ لَمْ يَشْهَدْكُمْ.

(رواه البخاری و فی لفظ ابن سعد فلما  
افاق قال كنتم ترون ان الله يسلط على  
ذات الجنب ما كان الله ليجعل لها على  
سلطانا)

لدود استعمال کرانے کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے منع  
فرمادیا۔ مجھ کو یہ دواء نہ دینا ہم نے اپنے دل میں کہا کہ مریض تو دواء کے  
استعمال سے گھبرایا ہی کرتا ہے جب آپ کو غفلت سے ذرا ہوش آیا تو آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں نے تم کو لدود کے استعمال سے منع نہیں  
کیا تھا۔ ہم نے عذر کیا کہ غلطی سے ہم نے یہ سوچا کہ مریض دواء کا استعمال  
پسند نہیں کرتے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ گھر والوں میں جو  
جو اس میں شریک ہو سب کو یہ دواء استعمال کرائی جائے بجز عباس رضی اللہ  
تعالیٰ عنہ کے کیونکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے۔

(بخاری شریف)

للہ ..... انبیاء علیہم السلام جو حکم دے دیں وہ سب واجب التعمیل ہوتا ہے خواہ وہ غصہ کی حالت میں ہوں یا رضاء کی مرض کی حالت میں  
ہوں یا صحت کی ان کی بہ عذر حکم عدولی بھی بلا عذر حکم عدولی کی طرح قابل مواخذہ ہوتی ہے۔ اس میں ذرا سا پس و پیش کرنا بھی غلطی ہے اور  
اس کی حکمت کے درپے ہونا بھی اپنے حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ میں اہمیت یوں پیدا ہو گئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی  
طویل مدت افہام و تفہیم کے بعد بالخصوص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری لمحات حیات میں اس قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے تھی۔ عام  
انسانوں میں بھی آخر وقت کا مرحلہ نازک سمجھا جاتا ہے اور نبی کے معاملہ میں تو نزاکت کا ایک خطرناک پہلو اور بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ صریح حکم  
کے بعد اس کی حکم عدولی کبھی کبھی انتقام الہی کا سبب بن جاتی ہے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت نے تقاضہ کیا کہ اس کے انتقام کا  
تکفل خود فرمالیں تاکہ آئندہ غیرت خداوندی خود اس کا انتقام نہ لے۔ کوئی شبہ نہیں کہ صریح ممانعت کے بعد ”لدود“ کا استعمال کرنا بڑی  
فروگزاشت تھی۔ مگر یہ اسی قسم کی فروگزاشت تھی جیسا کہ ابوالبشر سے ایک بار ہو چکی تھی وہ بھی ممانعت کے باوجود شجرہ ممنوعہ استعمال کر بیٹھے  
اور صحابہ نے بھی ”لدود“ کے استعمال میں غلط قدم اٹھایا۔ شان عفو نے گوہر دو مقامات میں درگزر کر دیا مگر دونوں جگہ اس کا کچھ نہ کچھ خمیازہ  
پھر بھگتنا ہی پڑا۔

ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات الجنب میں گو عام طور پر ”لدود“ مفید سمجھا جاتا تھا مگر اس کی ایک قسم وہ بھی ہے جو  
شیطان کی ایذا سے پیدا ہوتی ہے۔ اب کسی بنی کے آخری لمحات میں کوئی حرکت ایسی کر بیٹھنا جس سے کسی کو یہ وہم گزرنے کا موقعہ پیدا ہو  
سکے کہ خدا کا رسول بھی سطوت شیطانی کے زیر اثر آ سکتا ہے۔ یقیناً ایک بڑی مہلک غلطی تھی اس لیے آپ کی نظر میں اس کی اہمیت اور بڑھ گئی  
تھی اور اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ جس طرح حالت مرض میں بے وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ”لدود“ استعمال کرا دیا گیا اسی  
طرح ان کو بھی بے وجہ ”لدود“ استعمال کرا کے ان کے جرم کو ہلکا کر دیا جائے۔ سبحان اللہ خدا کے رسول کی عظمت اور اس کے عفو کی دونوں  
شانیں کیسی نرالی ہوتی ہیں۔ اب اندازہ فرمائیے کہ جن کے متعلق شیطان کے اتنے سے دخل کا تصور بھی جرم ہو ان کے حق میں کیا معصیت کا  
تصور کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔



الرسول العظيم و عصمته من تمثيل  
الشیطان فی صورته

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم شکل بننے سے شیطانوں  
کا عاجز رہنا

(۱۱۰۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَمُّوا بِاسْمِي وَلَا تَكْتُمُوا  
(۱۱۰۹) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرا نام شوق سے رکھا کرو

(۱۱۰۹) \* سبحان اللہ آپ کا مقام بھی کیا بلند مقام تھا اور آپ کی شکل مبارک بھی کتنی مطہر شکل تھی کہ شیطان میں تمثیل بشری کی طاقت کے باوجود یہ طاقت نہ تھی کہ وہ آپ کی صورت میں تمثیل ہو سکے۔ بے شک جو ابد الابد کے لیے ملعون ہو اس کی کیا مجال کہ وہ ان کی صورت اختیار کر سکے جو کونین کے حق میں مجسم رحمت ہوں۔ نہ خدا کی لعنت اس کی رحمت کی صورت بن سکتی ہے نہ شیطان کی یہ طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کی صورت اختیار کر سکے۔ سبحان اللہ جس کی صورت اتنی مبارک ہو اس کی سیرت کا بھلا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک پر تو کوئی دسترس کیا ہوتی اس کو یہ قدرت بھی نہیں کہ وہ خارجی طور پر اپنی شکل آپ کی شکل بنا سکے۔ پھر جب وہ عالم خواب میں آپ کی شکل بنانے پر قادر نہیں تو یقیناً بیداری میں بھی کسی کے سامنے آپ کی صورت بنانے پر قادر نہ ہوگا۔ لہذا جس طرح خواب کی زیارت میں شیطانی رویت کا شبہ نہیں ہو سکتا اسی طرح عالم بیداری کی زیارت میں بھی یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ عام طور پر خواب کی صرف دو قسمیں ہی مذکور ہوتی ہیں۔ بشری من اللہ یعنی خدا کی طرف سے بشارت دوم تخرین من الشیطان یعنی شیطان کی طرف سے مؤمن کا جی برا کرنے کی بات۔ لیکن بعض مقامات سے ایک تیسری قسم بھی ثابت ہوتی ہے یعنی تحدیث النفس النفس کے اپنے خیالات۔

اس تقسیم کی بناء پر حدیث مذکور میں خواب کی حالت کی زیارت میں صرف شیطانی مداخلت کی نفی ہوگی مگر تیسری قسم کا احتمال پھر باقی رہے گا کیونکہ وہاں نفی صرف شیطانی تمثیل کی فرمائی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض مرتبہ نفسی محبت کی وجہ سے خیالی بھی ہو سکتی ہے۔ لہذا خواب کی ہر زیارت پر قطعیت کے ساتھ حقیقی زیارت کا حکم لگایا نہیں جاسکتا۔ اس میں خیالی زیارت کا احتمال ہو سکتا ہے۔ بالخصوص جب کہ زیارت میں کوئی بات ظاہر شریعت کے مخالف بھی نظر آئے۔

ان جماعة من ائمة الشريعة نصوا على ان من كرامة الولي انه يرى النبي صلى الله عليه وسلم و يجتمع به في اليقظة و ياخذ عنه ما قسم له من معارف و مواهب و ممن نص على ذلك من ائمة الشافعية الغزالي و البارزي و التاج ابن السبكي و العفيف الياضي و من ائمة المالكية القرطبي و ابن ابي جمره و ابن الحاج في المدخل و قد حكى عن بعض الاولياء انه حضر مجلس فقيه فروى ذلك الفقيه حديثا فقال له اولي هذا الحديث باطل فقال الفقيه و من اين لك هذا فقال هذا النبي صلى الله عليه وسلم واقف على رأسك يقول اني لم اقل هذا الحديث و كشف للفقيه فراءة. و قال الشيخ ابو الحسن الشاذلي لو حجت عن النبي صلى الله عليه وسلم طرفه عين ما عدت نفسي من المسلمين. (الحاوي ص ۱۶۳ ج ۲)

ائمہ شریعت کی ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ولی بندہ کرامت کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالت بیداری بھی کر سکتا ہے اور آپ کی محفل میں حاضر بھی ہو سکتا ہے بلکہ اپنی استعداد کے مناسب کچھ علوم و لہجہ.....

بِکُنْیَتِیْ وَ مَنْ رَأَى فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَأَى فَاِنَّ مگر میری کنیت نہ رکھا کرو۔ جس شخص نے مجھ کو خواب کی حالت میں دیکھا

للہ..... معارف کا استفادہ بھی کر سکتا ہے اس کی تصریح کرنے والے ائمہ شافعیہ میں غزالی، بارزی، ابن السبکی اور یافعی جیسے حضرات ہیں اور ائمہ مالکیہ میں سے امام قرطبی، حافظ ابن ابی جمرة، ابن الحاج وغیرہ حضرات ہیں۔ انہوں نے بعض اولیاء کے حالات میں نقل کیا ہے کہ وہ کسی فقیہ کی مجلس میں تشریف لے گئے تو اس فقیہ نے کوئی روایت بیان کی یہ ولی بولے یہ حدیث تو باطل ہے اس فقیہ نے کہا تم نے یہ حکم کیسے لگا دیا اس ولی اللہ نے کہا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرے سامنے کھڑے ہوئے فرما رہے ہیں کہ یہ حدیث میں نے بیان نہیں کی۔ اس فقیہ کو بھی اس کا انکشاف ہو گیا اور اس نے بھی آپ کو دیکھ لیا۔ شیخ ابوالحسن شاذلی کا مقولہ تو یہ ہے کہ اگر میرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی حجاب پڑ جائے تو میں اپنے آپ کو زمرہ مسلمین میں شمار نہ کروں۔

ثم قال ابن العربي من عنده و رؤية الانبياء و الملائكة و سماع كلامهم ممكن للمؤمن كرامة و للكافر عقوبة اهـ اس کے بعد ابن العربی اپنی رائے بیان کرتے ہیں کہ میرے نزدیک انبیاء علیہم السلام اور فرشتوں کی زیارت اور ان کے کلام کا سننا بھی ممکن ہے مؤمن اور کافر دونوں کے لیے مگر مؤمن کے لیے کرامت کے طور پر اور کافر کے لیے عقوبت کے طور پر۔ و قال الشيخ غر الدين بن عبد السلام في القواعد الكبرى و قال ابن الحاج في المدخل رؤية النبي صلى الله عليه وسلم في اليقظة باب ضيق مع اننا لانكر من بقع له هذا من الاكابر الذين حفظهم الله في ظواهرهم و بواطنهم قال و قد انكر بعض علماء الظاهر رؤية النبي صلى الله عليه وسلم في اليقظة. (الحاوی ص ۲۵۸ ج ۲) شیخ غرالدین بن عبد السلام قواعد کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ ابن الحاج نے ”المدخل“ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بحالت بیداری زیارت کا مسئلہ بہت دقیق ہے باایں ہمہ جو اکابر اس رتبہ کے ہوں ان کے حق میں ہم اس کے منکر نہیں ہیں لیکن بعض علماء ظاہر نے اس کا انکار کیا ہے۔

و قال القاضي شرف الدين هبة الله بن عبد الرحيم البارزي و قد سمع من جماعة من الاولياء في زماننا و قبله انهم رؤوا النبي صلى الله عليه وسلم في اليقظة حيا بعد وفاته. قاضی شرف الدین فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے زمانہ کے اولیاء اور گزشتہ دور کے اولیاء کے متعلق بھی سنا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زیارت کی ہے۔

ثم نقله السيوطي عن الشيخ ابي عبد الله القرشي انه رأى الخليل عليه السلام و عن الشيخ سراج الدين بن الملقن في طبقات الاولياء قال الشيخ عبد القادر الكيلاني رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل الظهر الخ و في ترجمة الشيخ خليفه بن موسى و كان كثير الرؤية لرسول الله صلى الله عليه وسلم يقظة و مناماً و في ترجمة الصفي ابي عبد الله محمد بن يحيى الاسواني كتب عنه ابن دقيق العيد و القطب العسقلاني و كان يذكر انه يرى النبي صلى الله عليه وسلم و كان الشيخ عبد الغفار يرى رسول الله صلى الله عليه وسلم في كل ساعة و كان للشيخ ابي العباس المرسى و صلة بالنبي صلى الله عليه وسلم اذا سلم على النبي صلى الله عليه وسلم و يجاوبه اذا للہ.....



الشَّيْطَانُ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي وَمَنْ كَذَبَ      بلاشبہ اس نے مجھ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بن سکتا اور جس

للہ..... تحدث معه. و ذکر عنه (کما فی لطائف المنن) لوحجب عنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طرفۃ عین ماعدوت نفسی من المسلمین. ثم ذکر السیوطی رویۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقظۃ عن عدۃ من اولیاء منهم الشیخ عبد اللہ الدلاصی و الشیخ ابو العباس الحرار و السید احمد الرفاعی و السید نور الدین الایجی و ابی نصر الکرخی و یوسف بن علی الزمانی و محمد بن سمعون و ابن ثابت و ذکر قصصهم. (الحاوی ص ۲۶۱ و ۲۶۲ ج ۲)

پھر علامہ سیوطی نے ان حضرات کی ایک فہرست پیش کی ہے جن کو یہ سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی ہے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں: ابو عبد اللہ قرشی، سراج الدین بن الملقن، شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ خلیفہ بن موسیٰ، الشیخ محمد بن یحییٰ، الشیخ عبد الغفار یہ صاحب ہمہ وقت آپ کی زیارت سے مشرف رہا کرتے تھے۔ شیخ ابو العباس یہ صاحب وہی ہیں جن کا مقولہ آپ نے پڑھا کہ اگر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف زیارت سے ایک لمحہ کے لیے بھی محروم رہوں تو میں زمرہ مسلمین میں اپنا شمار نہ کروں۔ الشیخ عبد اللہ الدلاصی۔ الشیخ ابو العباس الحرار۔ سید احمد رفاعی۔ سید نور الدین۔ ابو نصر کرخی۔ یوسف بن علی۔ محمد بن سمعون۔ ابن ثابت رحمہم اللہ تعالیٰ علیہ۔

شیخ عبد الوہاب الشعرانی نے علامہ سیوطی سے نقل کیا ہے کہ خود علامہ موصوف کو بھی یہ شرف حاصل تھا۔

قال الشیخ جلال الدین السیوطی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی یقظۃ بضعا و سبعین مرة و قلت له فی مرة منها هل انا من اهل انامن اهل الجنة یا رسول اللہ فقال نعم فقلت من غیر عذاب یسبق فقال لک ذلک. قال الشیخ عطیہ و سالت الشیخ جلال الدین مرة ان یجتمع بالسلطان الغوری فی ضرورة وقعت لی فقال لی یا عطیہ انا اجتمع بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم یقظۃ و اخشی ان اجتمعت بالغوری ان یحتجب صلی اللہ علیہ وسلم عنی. ثم قال ان فلانا من الصحابة كانت الملائكة تسلم علیہ فاغتوی فی جسده لضرورة فلم یر الملائكة بعد ذلک عقوبة له علی اکتوائہ. اه (البواقیت و الجواهر ص ۱۳۳ ج ۱)

شیخ عبد الوہاب شعرانی حافظ سیوطی سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالت بیداری ستر مرتبہ سے بھی زیادہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا میں جنتی ہوں؟ فرمایا ہاں۔ میں نے کہا کیا عذاب کے بغیر؟ فرمایا جاؤ تمہارے لیے یہ بھی سہی۔ شیخ عطیہ کہتے ہیں میں نے شیخ سیوطی سے ایک مرتبہ یہ درخواست کی کہ میری ایک ضرورت کے متعلق آپ سلطان غور کے پاس جا کر سفارش فرمادیں تو انہوں نے جواب دیا۔ عطیہ! میں بحالت بیداری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں حاضر ہوتا ہوں مجھے خطرہ ہے اگر میں سلطان غوری کی محفل میں جاؤں تو کہیں اس سعادت سے محروم نہ ہو جاؤں۔ اس کے بعد فرمایا۔ بعض صحابہ کو ملائکہ سلام کیا کرتے تھے انہوں نے ایک مرض کی وجہ سے اپنے جسم پر لوہے کا داغ دے کر علاج کیا تو وہ اس سعادت سے محروم ہو گئے۔

ثم قال الشعرانی ان ما ذکرناہ عن الشیخ جلال الدین ذکرہ الاشیاخ الثلاثة العدول الدین لایتهمون فی مثل ذلک یعنی الشیخ الصالح عطیہ و الشیخ الصالح قاسم المغربی و القاضی زکریا الشافعی. ....

عَلَى مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ  
نے جان کر مجھ پر جھوٹ باندھا اس کو چاہیے کہ اپنی جگہ دوزخ میں تیار کرے  
(رواہ البخاری فی کتاب العلم) لے۔ (بخاری شریف)

اللہ..... شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ لکھتے ہیں کہ شیخ سیوطیؒ سے اس واقعہ کو نقل کرنے والے تین بڑے بڑے مشائخ ہیں جن کی نسبت غلط بیانی کا تصور نہیں کیا جاسکتا بالخصوص ایسے نازک معاملہ میں (ہوسکتا ہے کہ شیخ سیوطیؒ نے جب اس قسم کے اشخاص کی فہرست شمار کرائی ہو تو اولیاء کے دستور کے موافق اپنے نام کے اظہار سے قصد اسکوٹ فرمایا ہو)

قال السيوطي في ختأواه ان اكثر ما وقع رؤية النبي صلى الله عليه وسلم في اليقظة بالقلب ثم يترقى الى ان يرى البصر. لكن ليست الرؤية البصرية كالرؤية المتعارفة عند الناس من رؤية بعضهم لبعض و انما هي جمعية حالية و حالة برزخية و امر و جداني لا يدرك حقيقة الامن باشره و قد تقدم عن الشيخ عبد الله الدلاصي فلما احرم الامام و احرمت اخذتني اخذة فرأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فاشار بقوله اخذة الى هذه الحالة. (الحاوی ص ۲۶۲-۲۶۳ ج ۲)

اس زیارت کی حقیقت ٹھیک وہ نہیں سمجھتی چاہیے جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے بلکہ اس زیارت کا ادراک پہلے قلب سے شروع ہوتا ہے پھر وہ حاسہ بصر تک بھی سرایت کر جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک برزخی کیفیت ہوتی ہے اور ایک نوع کا وجدان ہوتا ہے جس کا صحیح اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو یہ کیفیت حاصل ہو۔

قال الشيخ اكمل الدين البابرتي الخفي في شرح المشارق في حديث "من راني" الاجتماع بالشخصين يقظة و مناما لحصول مابه الاتحاد و له خمسة اصول كلية الاشتراك في الذات اوفى صفة فصاعداً اوفى الافعال اوفى المراتب و كل ما يتعقل من المناسبة بين شيئين او اشياء لا يخرج عن هذه الخمسة و حسب قوته على مابه الاختلاف و ضعفه يكثر الاجتماع و بقل و قد يقوى على ضده فتقوى المحبة بحيث يكاد الشخصان لا يقتربان و اقد يكون بالعكس و من حصل الاصول الخمسة و ثبتت المناسبة بينه و بين ارواح الكمل الماضيين اجتمع بهم متى شاء. اه (الحاوی ص ۲۵۸ ج ۲)

شیخ اکمل الدین تحریر فرماتے ہیں کہ اس قسم کی زیارت کا مدار انسان کی اندرونی مناسبت ہوتی ہے۔ جس شخص میں یہ مناسبت جتنی زیادہ ہوتی ہے اسی کے مناسب اس کو یہ زیارت بھی میسر آتی ہے حتیٰ کہ بعض لوگوں کو گزشتہ بزرگوں کی ارواح کے ساتھ اتنی مناسبت ہوتی ہے کہ وہ جب ارادہ کرتے ہیں ان سے روحانی ملاقات کر لیتے ہیں۔ (الحاوی ص ۱۶۳ و ۲۵۸ و ۲۶۱ و ۲۶۲ و ۳۲۳ ج ۲)

حافظ ابن تیمیہؒ نے بیداری میں رؤیہ کا اپنی حسب عادت بڑی شد و مد کے ساتھ انکار فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں:

و كثير منهم رأى من ظن انه نبى او صالح او الخضر و كان شيطاناً و قد ثبت في الصحيح من رآنى في المنام فقد رآنى حقاً فان الشيطان لا يتمثل في صورتي. فهذا في روية المنام تكون حقاً و تكون من الشيطان فمنعه الله ان يتمثل به في المنام و اما في اليقظة فلا يراها احدٌ بعينه في الدنيا فمن ظن ان المرئى هو الميت فانما أتى من جهله. (التوسل و الوسيلة ص ۲۵)

ایسا بہت ہوا ہے کہ بیداری کی حالت میں دیکھنے والے شخص کو یہ گمان ہوا ہے کہ جس کو اس نے دیکھا تھا وہ نبی یا کوئی لہ.....



## الرسول العظيم و خوف الشياطين

من بعض اصحابه

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ کا شیطانوں پر

خوف اور ڈر

(۱۱۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا فَمِئَمْنَا لَغَطًا وَصَوْتُ صَبِيَّانِ فَقَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا حَبَشِيَّةٌ تَزْفِنُ وَالصَّبِيَّانِ

(۱۱۰) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ دفعۃً ہم نے کچھ شور اور بچوں کے غل مچانے کی آواز سنی آپ آواز سن کر اٹھے کیا دیکھتے ہیں ایک حبشی عورت ہے جو اچھل کود رہی ہے اور بچے ہیں کہ اس کے ارد گرد جمع ہیں۔ آپ نے فرمایا عائشہ! آؤ تم بھی

اللہ ..... بزرگ یا حضرت خضر علیہ السلام تھے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ شیطان ہوتا تھا۔ بے شک یہ صحیح حدیث ہے کہ جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے ٹھیک مجھ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ خواب میں کسی کی رؤیہ دونوں صورتیں ممکن تھیں یہ بھی کہ وہ اسی انسان کی ہو اور یہ بھی کہ شیطان نے اس کی صورت اختیار کر لی ہو اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت کے متعلق شیطان سے یہ قدرت سلب فرمائی ہے کہ وہ کسی کو خواب میں آپ کی صورت میں نظر آ سکے مگر یہ بات صرف خواب ہی کے معاملہ تک محدود ہے۔ اب رہا بیداری کا معاملہ تو جس شخص کو بھی یہ گمان ہو کہ اس نے مثلاً فلاں مردہ شخص کو دیکھا ہے تو یہ صرف اس کا جہل ہے۔

(۱۱۰) \* ایک سیاہ فام حبشی عورت کا اس وقت عرب کے عام دستور کے مطابق اتفاقاً آنکنا اور بچوں کا اس کے ارد گرد جمع ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خلق کریم کہ ایک نو عمر بی بی کی خاطر جن کی فطرت کو بچپن کی دلچسپیوں سے بھی پوری طرح آزادی حاصل نہیں ہوئی تھی خود بلا کر پورا کرنا کتنی غیر معمولی بات تھی پھر اس نو عمری میں فیض نبوت سے منور بی بی کی اولوالغری بھی کتنی قابل داد تھی کہ اس احوال میں ان کو ادھر ذرا التفات نہ تھا ساری فکر تھی تو یہ کہ سردارِ دو جہاں کے دل میں ان کے لئے جگہ کتنی ہے۔

یہاں جو بات زیادہ تر قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن اقدس سے وابستہ ہو جانے کے بعد عمر کی فطرت میں کمالاتِ نبوت کا کیسا انعکاس ہوا تھا کہ ان کے سایہ سے بھی شیطان ترساں ولرز ایں رہنے لگے تھے۔ یہ وہی عمر ہیں جن سے کبھی شیاطین کھیل ا کرتے تھے اور آپ کے زیر سایہ آ جانے کے بعد یہ وہیں جن سے شیطان اس طرح دبکتے پھرتے ہیں کہ جس راستہ سے عمر نکل جائیں شیاطین وہ راستہ ہی چلنا چھوڑ دیتے تھے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ مباحات کا آخری درجہ محرمات کی ابتدائی سرحد کے پاس لگا ہوا ہوتا ہے اس لئے ایک حدیث میں تشبیہ دے کر اس کی تفہیم یوں کی گئی ہے کہ محرمات سے بچنے کا راستہ صرف یہ ہے کہ اس کے خطرہ سے کچھ ایسے مباحات بھی جو محرمات کی سرحد سے لگتے ہوں ترک کر دیئے جائیں۔ جیسا ایک چرواہے کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو خاص شاہی چراگا ہوں سے دور دور چرائے ورنہ ایک دن اس کے جانور یقیناً شاہی جنگل میں بھی منہ ڈال کر رہیں گے۔ اسی طرح ایک حبشیہ عورت کا جو غالباً مسلمان نہ تھی آنکنا اور ایسی حرکات کرنا جو اگر ذرا بڑھ جائیں تو حرام کی زد میں بھی آ سکتی تھیں۔ ان مباحات میں داخل تھا جو حرام کی سرحد سے بالکل متصل ہوتے ہیں۔ یہ شیاطین کے لئے بھی سب سے زیادہ دل چسپی کا محل ہوتا ہے ان کی سعی ہوتی ہے کہ کسی طرح ضعیف انسان کا قدم یہاں ذرا لغزش کھا جائے تو اس حرام میں گھسیٹ لیں۔ یہ منظر عوام کی نظروں میں تو ضرور دلچسپی کا منظر ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی لئے .....

دیکھ لو۔ میں گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھے اور سر مبارک کے درمیان اپنا چہرہ رکھ کر اس کو دیکھنے لگی۔ (کچھ دیر کے بعد) آپ نے فرمایا۔ ابھی تمہارا دل نہیں بھرا، ابھی تمہارا دل نہیں بھرا؟ میں ہر بار کہہ دیتی۔ ابھی نہیں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ آپ کے قلب میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ لگاؤں (کہ میری خاطر کب تک تکلیف گوارا فرماتے ہیں) اتنے میں حضرت عمرؓ آنکے۔ ان کا آنا تھا کہ جتنے لوگ وہاں تھے سب اس کو چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خوف سے شیطانی فطرت کے انسان اور جنات سب بھاگ گئے اس کے بعد میں وہاں سے لوٹ کر اپنے کمرہ میں آ گئی۔ (ترمذی شریف)

حَوْلَهَا فَقَالَ يَا عَائِشَةُ تَعَالَى فَأَنْظُرِي فَبِئْسَتْ فَوَضَعْتُ لَحْيِي عَلَى مَنْكِبِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلْتُ أَنْظُرُ إِلَيْهَا مَا بَيْنَ الْمَنْكِبِ إِلَى رَأْسِهِ فَقَالَ لِي أَمَا شَبِعْتَ أَمَا شَبِعْتَ فَجَعَلْتُ أَقُولُ لَا لِأَنْظُرَ مَنْزِلَتِي عِنْدَهُ إِذْ طَلَعَ عُمَرُ فَأَرَفَضَ النَّاسُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّي لَا أَنْظُرُ إِلَى شَيَاطِينِ الْجَنِّ وَالْإِنْسِ قَدْ فَرُّوا مِنْ عُمَرَ قَالَ فَرَجَعْتُ. (رواه الترمذی و قال هذا حدیث حسن غریب صحیح)

(۱۱۱۱) عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَتْ خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ (۱۱۱۱) بَرِيدَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا رَوَيْتُ فَرَمَاتِي فِي أَنْ نَحْضُرَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

ﷺ ..... نظروں میں انسان کے لئے ابتلاء و آزمائش کا نازک مقام ہوتا ہے ان کی شان دوسری ہوتی ہے اگر وہ یہاں ممانعت کا لفظ زبان سے نکالتے ہیں تو اسی وقت وہ مباح اپنے درجہ سے نکل کر حرام کی فہرست میں داخل ہوتا ہے مگر یہاں یہ منظور نہیں ہوتا۔ جو رسول ہر قسم کی طبیعت اور جمیع نوع بشری کے لئے رسول تنبیہ و ترہیب کے ذریعہ ان کو اس کے ارتکاب سے روک بھی دیا جائے۔ چنانچہ طلاق ایک ایسی چیز ہے جس کی ضرورت کسی ناگزیر موقع پر یقینی ہو جاتی ہے اس لئے اس کی اجازت دیئے بغیر بھی چارہ تھا۔ مگر یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ناپسندیدہ ہونے کا اظہار بھی کر دیا جائے اس لئے یوں ارشاد فرمایا گیا ”ابغض المباحات عند الله الطلاق“ مباحات کی فہرست میں جو بات نظر ربوبیت میں سے زیادہ ناپسندیدہ ہے وہ طلاق ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں عورت کا کوئی مقام ہی نہیں ہے یا طلاق کوئی منصفانہ آئین نہیں وہ ذرا آنکھ کھول کر ان باتوں کو بھی سامنے رکھیں۔ پس ایک حبشیہ عورت کو روکنا تو مناسب تھا مگر یہ ممانعت بذریعہ عمرؓ ہی مناسب تھی۔ آخر عمرؓ میں یہ جذبات کہاں سے پیدا ہوئے اور اس فعل کے مذموم ہونے کی خبر بچوں تک کو کس نے دی جو عمرؓ کو دیکھتے ہی بھاگ پڑتے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ فیض نبوت ہی تھا، مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر کہیں براہ راست اس کی ممانعت فرمادیتے تو پھر یہ ممانعت صرف ایک مصلحت نہ رہتی بلکہ مسئلہ بن جاتا اور مباحات کی فہرست سے نکل کر محرمات میں داخل ہو جاتا۔ آئندہ عنقریب ایک دوسرا واقعہ آپ کے سامنے آئے والا ہے۔ جس میں عید کے دن کچھ لڑکیوں نے جنگی اشعار وہ بھی اپنے گھر کے اندر پڑھے تھے تو صدیق اکبرؓ نے اس کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ان کو جھڑک کر منع بھی فرمایا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ وہ اس موقع پر خاموش تھے۔ تفصیل تشریحی نوٹ میں آرہی ہے اس جگہ ترجمان السنۃ ص ۳۳۸ ج ۱ بھی ملاحظہ فرمائیے جس میں شانِ عمریؓ کا یہ کرشمہ مذکور ہے کہ جس راستہ کو وہ چلتے ہیں شیاطین وہ راستہ ہی چلنا چھوڑ دیتے ہیں۔

(۱۱۱۱) \* قدیم زمانہ میں مسرت اور خوشی کے موقع پر دف بجانے کا بڑا اہتمام تھا۔ دف لکڑی کا بنا ہوا ایک گول دائرہ ہوتا ہے ﷺ .....



صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ مَغَازِيهِ فَلَمَّا  
انْصَرَفَ جَاءَتْ جَارِيَّةٌ سَوْدَاءُ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ  
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي كُنْتُ نَذَرْتُ اِنْ  
رَدَّكَ اللّٰهُ صَالِحًا اَنْ اَضْرِبَ بَيْنَ يَدَيْكَ  
بِالدُّفِّ وَاتَغْنَى فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كُنْتُ نَذَرْتَ فَاضْرِبِي وَاِلَّا فَلَا  
فَجَعَلَتْ تَضْرِبُ فَدَخَلَ ابُو بَكْرٍ وَهِيَ تَضْرِبُ  
ثُمَّ دَخَلَ عَلِيٌّ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ  
وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَالْقَتِ الدُّفَّ  
تَحْتَ اسْتِهَا ثُمَّ فَعَدَتْ عَلَيْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ  
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ لِيَخَافُ  
مِنْكَ يَا عُمَرُ اِنِّي كُنْتُ جَالِسًا وَهِيَ تَضْرِبُ  
فَدَخَلَ ابُو بَكْرٍ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عَلِيٌّ وَ  
هِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ وَهِيَ تَضْرِبُ فَلَمَّا  
دَخَلْتَ اَنْتِ يَا عُمَرُ اَلْقَتِ الدُّفَّ

(رواه الترمذی و قال هذا حديث حسن صحيح

غریب. وراجع ترجمان السنۃ ص ۳۷۴ ج ۱)

وسلم کسی غزوہ کے لیے باہر تشریف لے گئے تھے۔ جب صحیح و سلامت واپس  
تشریف لے آئے تو ایک سیاہ فام باندی حاضر ہوئی اور کہنے لگی یا رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے یہ منت مان رکھی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ صلی  
اللہ علیہ وسلم کو صحیح و سالم واپس لے آیا تو میں اس کی خوشی میں آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم کے سامنے دف بجاؤں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے  
فرمایا۔ اگر تو نے یہ منت مانی تھی تو خیر اس کو پورا کر لے ورنہ نہیں۔ اس پر  
وہ دف بجانے لگی اتنے میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگئے وہ دف بجاتی  
رہی پھر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے وہ اسی طرح دف بجاتی رہی۔ پھر عثمان  
رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے تو بھی وہ اسی طرح دف بجاتی رہی اس کے بعد  
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے تو فوراً دف نیچے ڈال اس پر بیٹھ گئی یہ دیکھ کر  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تم سے  
شیطان بھی ڈرتا ہے۔ میں بیٹھا ہوا تھا تو بھی یہ لونڈی دف بجاتی رہی جب  
ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آئے تو بھی یہ بجاتی رہی پھر علی (رضی اللہ تعالیٰ  
عنہ) آئے تو بھی بجاتی رہی پھر عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) آئے تو بھی یہ  
بجاتی رہی پھر جب اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تم آئے تو (تم کو دیکھ کر)

اس نے دف ڈال دیا۔

(ترمذی شریف)

للہ..... جس کے صرف ایک طرف چمڑا چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ آواز تو ضرور ہوتی ہے مگر بالکل بے کیف۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

حضرت مریم نے جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی ہم شیرہ تھیں اس  
دن خوشی میں دف بجایا تھا جس دن کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام  
اور ان کی قوم کو نجات عطا فرمائی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق

ان مریم اخت موسیٰ و ہارون ضربت بالدف  
یوم نجا اللہ موسیٰ علیہ السلام و قومہ و  
اغرق و ملاہ۔

کردیا تھا۔

(البدایہ و انہایہ ص ۶۷ ج ۲)

غالباً اسی سنت کے مطابق اس جاریہ نے بھی آپ کی بعافیت واپسی پر خوشی منائی ہوگی۔ چونکہ آپ کی بحافظت واپسی کی خوشی منانا ایک شرعی  
خوشی تھی اس لئے اس کی نذرمانی بھی درست تھی۔ آپ نے اس کی اجازت دے تو دی مگر بادل نا خواستہ اور صاف واضح کر دیا کہ اگر یہ نذر  
نہ کی گئی ہوتی تو پھر اس کی بھی اجازت نہ دی جاتی۔ اب رہے ڈھول اور دیگر مزامیر تو شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں

الرسول العظيم و يأسُ الشيطان من

عبادة الاصنام في جزيرة العرب

(۱۱۱۲) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدَائِسَ مِنْ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّونَ فِي جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَلَكِنْ فِي التَّحْرِيشِ بَيْنَهُمْ. (رواه مسلم و صاحب

المشكوة في باب الوسوسة)

الرسول العظيم ولطافة فطرته السليمة

(۱۱۱۳) عَنْ شَيْبِ بْنِ أَبِي رَوْحٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى صَلَاةَ الصُّبْحِ فَقَرَأَ الرُّومَ فَالْتَبَسَ عَلَيْهِ فَلَمَّا صَلَّى قَالَ مَا بَالُ أَقْوَامٍ يُصَلُّونَ مَعَنَا لَا يُحَسِّنُونَ الطُّهُورَ وَ إِنَّمَا يُلْبَسُ عَلَيْنَا الْقُرْآنُ أَوْلَيْكَ. (رواه النسائي)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص محل بعثت میں شیطان کی مایوسی

(۱۱۱۲) جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے شیطان اس بات سے تو بالکل مایوس ہو چکا ہے کہ نمازی لوگ کبھی آئندہ جزیرۃ العرب میں اس کی عبادت کریں گے۔ اس لیے اب وہ صرف ایک دوسرے کو ابھارنے پر ہی راضی ہو گیا ہے۔ (مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت سلیمہ کی پاکیزگی

(۱۱۱۳) شیبہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ سے ناقل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھائی اور اس میں سورہ روم پڑھی آپؐ اُس میں کہیں اٹکے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا۔ لوگوں کا بھی کیا حال ہے کہ نماز تو ہمارے ساتھ پڑھتے ہیں اور پھر وضوء ٹھیک طور سے کرتے نہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ہمارے قرآن پڑھنے میں رکاوٹ کا باعث بن جاتے ہیں۔

(نسائی شریف)

(۱۱۱۲) \* حدیثوں میں مستقبل کے متعلق جو خبریں دی جاتی ہیں ان میں جو جو قیدیوں مذکور ہوں وہ نظر انداز نہیں کرنی چاہئیں یہاں حدیث میں سب سے پہلے تو جزیرہ عرب کی تخصیص ہے کیونکہ یہی جزیرہ آپؐ کی بعثت کا سب سے پہلا مقام تھا پھر اس میں بھی جس طبقہ کے متعلق خبر دی گئی ہے وہ نمازی لوگوں کا طبقہ ہے۔ پھر جس بات سے مایوسی کی خبر دی گئی ہے وہ نمازی طبقہ کی بت پرستی کرنا ہے۔ اور یہ خبر بھی ان الفاظ سے نہیں دی گئی کہ ان میں کوئی بت پرستی نہیں کرے گا بلکہ صرف شیطان کی اپنی مایوسی کا ذکر ہے۔ اس بناء پر اب حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع تو بہت بلند ہے۔ آپؐ کی عصمت کا اثر آپؐ کے خاص مقام بعثت پر بھی اتنا گہرا پڑ چکا تھا کہ شیطان بھی وہاں کے خاص بندوں پر اپنی کامیابی سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو چکا تھا۔ الحمد للہ العزیز کہ آپؐ کی پیش گوئی حرف بحرف آج تک آفتاب درخشاں کی طرح روشن ہے عرب کے ناخواندہ لوگ جو پشہا پشت سے بت پرستی کے عادی تھے اسلام کے بعد آج تک بت پرستی سے اتنے متنفر ہیں کہ دوسرے مقامات کے خواندہ بھی اتنے متنفر نہ ہوں گے۔ ان کے تعلیم یافتہ پھر نمازیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

(۱۱۱۳) \* حدیث مذکور میں جس امر کی شکایت کی جا رہی ہے وہ بے وضوء نماز اداء کرنے کی نہیں بلکہ ناتمام وضوء کرنے کی شکایت ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کا تقدس تو دیکھئے کہ دوسروں کا قصور بھی آپؐ پر کس درجہ بارِ عظیم بن رہا ہے۔ حتیٰ کہ آپؐ کی قرأت قرآن میں بھی خلل کا باعث بن گیا ہے۔ پس جب دوسروں کا قصور آپؐ کی فطرت کے لیے اتنا بار ہو تو سوچئے کہ کیا براہ راست قصور کی یہاں کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔ معصیت کا تو ذکر کیا ہے۔



(۱۱۱۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي خَمِيصَةٍ لَهَا أَعْلَامٌ فَنَظَرَ إِلَى أَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ إِذْ هَبُوا بِخَمِيصَتِي هَذِهِ إِلَى أَبِي جَهْمٍ وَاتُّوْنِي بِابْنِ جَانِيَةِ أَبِي جَهْمٍ فَإِنَّهَا الْهَتْنِي إِنْفَا عَنْ صَلَوَتِي.

(متفق عليه و فی روایۃ للبخاری قال كنت انظر الى علمها و انا في الصلوة فاحاف ان يفتنني)

(۱۱۱۵) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ أَهْدَى لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرُوجَ حَرِيرٍ فَلَبَسَهُ ثُمَّ صَلَّى فِيهِ ثُمَّ انْصَرَفَ فَزَعَهُ نَزْعًا شَدِيدًا كَأَنَّ لَكَارِهِ لَهُ ثُمَّ قَالَ لَا يَنْبَغِي هَذَا لِلْمُتَّقِينَ. (متفق عليه)

(۱۱۱۴) \* پھول دار کمبلی نا جائز لباس نہیں پھر معمولی سے پھول کی حیثیت ہی کیا تھی مگر اللہ رے نبی کی فطرت جہاں حضوری میں کسی ادنیٰ سی چیز کے حائل ہونے کا خطرہ بھی پیدا ہو سکتا ہے وہ بھی اس کو برداشت نہیں۔ سو چونکہ ایسی بلند فطرت سے کیا کسی ادنیٰ سی معصیت کا صدور ممکن ہے۔ علماء کو یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ جب یہ چادر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے ناموزوں سمجھ کر اتار دی تو پھر اس کو ابو جہم کے لیے کیسے پسند فرمایا جو جواب ان حضرات نے دیے ہیں وہ تو اپنی جگہ دیکھ لیے جائیں۔ ہمارے نزدیک تو نبی کی شان وہ ہے کہ جس کو وہ غفلت کے اندیشہ سے تعبیر کرتا ہے اگر وہ دوسروں کو میسر آ جائے تو ان کی ہزاروں حضوریوں سے بھی بلند تر ہوگی۔ پس ابو جہم اس کو پہن کر شوق سے نماز پڑھیں۔ بلکہ اس سے بھی پیش قیمت چادر پہن لیں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ان کے مرتبہ کی حضوری پھر قائم رہ سکتی ہے۔ مگر نبی کی حضوری کا اندازہ کسی کو ہو سکتا ہے جس کو معمولی ایک پھول سے بھی اپنی حضوری میں خلل کا خطرہ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

یاد رکھیے حدیث میں اندیشہ کا لفظ تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس نے کوئی اثر پیدا بھی کر دیا تھا۔ اگر انبیاء علیہم السلام کسی ادنیٰ لغزش کے خطرہ سے بھی اتنے خائف نہ رہیں تو ان کی عصمت کا ثبوت ہمارے سامنے اس درجہ بدیہی کیسے ہو۔ یہی خوف و خشیت ان کی عصمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

(۱۱۱۵) \* ریشم کا استعمال اس وقت تک درست تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم فطرت پر جو لباس حرام ہونے والا تھا وہ اس سے پہلے ہی بار بن رہا تھا۔

(۱۱۱۴) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نقشین کمبلی میں نماز اداء کی۔ نماز کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ذرا اس کے پھولوں پر جا پڑی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا اس کمبلی کو تو ابو جہم (ایک صحابی کی کنیت ہے) کو جا کر دے دو اور ان کی وہی موٹی کمبلی مجھے لا دو۔ اس نے تو مجھے ابھی میری نماز سے بھی غافل کر دیا ہوتا۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ میں نے اس کے پھولوں کو دیکھا تو قریب تھا کہ میری نماز کی حضوری میں فرق پڑ جاتا۔

(بخاری شریف)

(۱۱۱۵) عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ریشمین عبا ہدیہ پیش کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پہنا اور اس کو پہنے ہوئے نماز اداء فرمائی۔ جب نماز سے فارغ ہو گئے تو بڑی نفرت کے انداز میں اس کو اتار پھینکا اور فرمایا۔ یہ لباس متقیوں کے شایان شان نہیں۔ (متفق علیہ)

الرسول العظيم و خشيته من ربه

عز وجل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر الہی سطوت و

جبروت کا استیلاء

(۱۱۱۶) عَنْ مُطَرِّفِ بْنِ الشَّخِيرِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ  
 أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ  
 يُصَلِّي وَلِجُوفِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمَرْجَلِ يَعْنِي  
 يَبْكِي وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي وَفِي صَدْرِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ  
 الرَّحَى مِنَ الْبَكَاءِ. (رواه احمد و روى

النسائي الاولى و ابوداود الثانية)

(۱۱۱۷) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى  
 عَنْهُمَا قَالَ قَالَ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ  
 يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ  
 شَبَّتَ قَالَ شَبَّتْنِي هُوْدُ وَالْوَاقِعَةُ وَ  
 الْمُرْسَلَاتِ وَ عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ وَإِذَا الشَّمْسُ  
 كُوْرَتْ. (رواه الترمذی)

(۱۱۱۶) مطرف بن شخیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ نماز  
 پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینہ مبارک سے گریہ وزاری کی آواز اس طرح  
 گونج رہی تھی جیسا ہانڈی کے جوش مارنے کی آواز۔ دوسری روایت میں  
 ہے کہ میں نے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور رونے کی وجہ سے آپ  
 کے سینہ مبارک میں چھکی کی سی آواز آ رہی تھی۔

(احمد-نسائی)

(۱۱۱۷) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضرت  
 ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ  
 صلی اللہ علیہ وسلم تو بوڑھے ہو گئے فرمایا مجھ کو سورہ ہود سورۃ الواقعة سورۃ  
 المرسلات عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ اور إِذَا الشَّمْسُ كُوْرَتْ کے ہولناک مناظر  
 نے بوڑھا کر دیا ہے۔

(ترمذی شریف)

(۱۱۱۶) \* جن قلوب پر خوف الہی کا عالم یہ ہو کیسے ممکن ہے کہ ان سے کسی ادنیٰ سی معصیت کا صدور بھی ہو جائے۔

(۱۱۱۷) \* انبیاء علیہم السلام کے علوم چونکہ کسب و اکتساب کا ثمرہ نہیں ہوتے اس لیے وہ صرف دماغی خیالات یا ذاتی تحقیقات کی طرح  
 نہیں ہوتے بلکہ نفسیات اور طبعیات کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں یقین و اذعان کی وہ کیفیت ہوتی ہے جو مشاہدہ میں ہوا کرتی ہے اس لیے  
 ان پر اس کے اثرات بھی وہی ہوتے ہیں جو مشاہدہ کے ہو سکتے ہیں۔ ہم اگر قیامت کا یقین رکھتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ اتنا جتنا کہ مثلاً کلکتہ  
 شہر کا مگر ظاہر ہے کہ جس نے کلکتہ کا پچشم خود مشاہدہ کیا ہو اس کی نظروں میں اس شان و شوکت اور وسعت کا جو نقشہ ہو گا وہ ہماری نظروں میں  
 صرف سن کر قائم نہیں ہو سکتا۔ ان کے جزم و یقین کا اندازہ بس اسی سے فرمایا جائے کہ ان کی شریعت میں امتیوں کے حصہ میں بھی ”احسان“ کا  
 ایک مستقل باب آ گیا ہے۔ آپ پہلی جلد کے آخر میں پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کے جواب میں ایمان و  
 اسلام کی تشریح فرما کر آخر میں احسان کی جو تشریح فرمائی وہ یہ تھی کہ خدا تعالیٰ کی عبادت اس کیفیت سے کرنے لگنا جیسا آنکھوں سے دیکھ کر  
 رہتی ہے۔ اس کے بعد جلد ثانی میں اسی باب کی متعدد حدیثیں آپ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہیں جن میں اس مشاہدہ کی کیفیت خود صحابہ رضی  
 اللہ تعالیٰ عنہم کی زبانوں سے منقول ہے۔

(دیکھو ترجمان السنہ ج ۲ ص ۳۰ حدیث ۲۶۷ و ج ۲ ص ۴۳ و ج ۱ ص ۴۹۹ معہ تشریحی نوٹ و ج ۱ ص ۳۹ و ج ۲ ص ۴۶ وغیرہ)



الرسول العظيم وقوته في الدين و

صفاء اليقين

(۱۱۱۸) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ أَنْعَمَ وَصَاحِبُ الصُّورِ قَدْ اتَّقَمَهُ وَ أَصْغَى سَمْعَهُ وَ حَسَى جَبْهَتَهُ مَتَى يُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا تَأْمُرُنَا قَالَ قُولُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ

(رواه الترمذی)

(۱۱۱۹) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُهْرِيقُ الْمَاءَ فَيَتِمَّمُ بِالتُّرَابِ فَقَوْلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ الْمَاءَ مِنْكَ قَرِيبٌ يَقُولُ مَا يُذَرِّبُنِي لَعَلِّي لَا أَبْلُغُهُ. (رواه في شرح السنة و ابن الجوزی فی کتاب الوفاء)

(۱۱۲۰) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ مَرَّبْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا وَ أُمِّي نَطِينُ شَيْئًا فَقَالَ مَا هَذَا يَا عَبْدَ اللَّهِ قُلْتُ شَيْءٌ نُصْلِحُهُ قَالَ الْآمُرُ أَسْرَعُ مِنْ ذَلِكَ

(رواه احمد و الترمذی و قال هذا حديث غريب)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم آخرت کا استحضار اور اس کا یقین

(۱۱۱۸) ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں دنیوی لذتوں سے بھلا کیونکر لطف اندوز ہوں جب کہ دیکھ رہا ہوں کہ صور پھونکنے والے فرشتے نے (نفخ صور کی تیاری میں) صور اپنے منہ میں لے لیا ہے اپنی پیشانی جھکالی ہے اور کان لگا رکھے ہیں کب ان کو نفخ صور کا حکم ملتا ہے لوگوں نے عرض کی فرمائیے اس حالت میں ہمیں کیا حکم ہے۔ ارشاد ہوا بس حَسْبُنَا اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ پڑھتے رہو۔

خدا تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہی ہمارا بہترین کارساز ہے۔ (ترمذی شریف)

(۱۱۱۹) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب سے فارغ ہوتے اور مٹی سے تیمم فرما لیتے۔ میں کہتا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہاں قریب ہی موجود ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتے کیا خبر ہے شاید میں پانی تک پہنچ نہ سکوں (اور اس سے قبل ہی موت آ جائے) (شرح السنۃ)

(۱۱۲۰) عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمارے گھر سے گذر ہوا اس وقت میں اور میری والدہ گھر کی لپ لپ اور مرمت کرنے میں مشغول تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عبد اللہ! یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے عرض کی کچھ مرمت کر رہا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہیں حکم ربی اس سے پہلے تیزی کے

ساتھ نہ آ جائے۔ (احمد-ترمذی)

(۱۱۲۰) \* یہ تینوں حدیثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عالم آخرت کا استحضار اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی انسان کے سامنے یہ نقشہ ہمہ وقت متحضر رہے تو کیا اس کی توجہ معصیت کی طرف ہو سکتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی شان اپنی مقدس فطرت اپنی قلبی کیفیات ملائکہ اللہ کی ہمہ وقت مصاحبت اور سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ کے ساتھ شرف مکالمہ اور تجلیات ربانیہ کی چھ اس قسم کے تمام نقائص سے برتر و بالا ہوتی ہے جن کے لیے غفلت و کدورت کا ہونا لازم ہے جہاں غافل آ کر ہوشیار ہو جائیں وہاں بھلا اس قسم کے تصورات کیا ممکن۔

الرسول العظيم و كون الدنيا أهون

عنده من جناح بعوضة

(۱۱۲۱) عَنْ جَابِرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِجَدِي أَسْكَ مَيِّتٍ قَالَ أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنْ هَذَا لَهُ بِدَرَاهِمٍ فَقَالُوا مَا نَحِبُّ أَنَّهُ لَنَا بِشَيْءٍ قَالَ فَوَاللَّهِ لِلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللَّهِ مِنْ هَذَا عَلَيْكُمْ. (رواه مسلم)

(۱۱۲۲) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللَّهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً. (رواه احمد والترمذی وابن ماجه)

(۱۱۲۳) عَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ وَاللَّهِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک نظر میں متاع دنیا کی

حقیقت

(۱۱۲۱) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مردار بکری کے بچہ کے پاس سے گزرے جس کے ناک و کان بھی کٹے ہوئے تھے آپؐ نے فرمایا تم میں ہے کوئی جو اس کو ایک درہم میں لینا قبول کرے؟ لوگوں نے کہا ہمیں تو یہ مفت لینا بھی پسند نہیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بخدا جتنا یہ مردار بچہ تم کو ذلیل نظر آ رہا ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے ساری دنیا اس سے زیادہ ذلیل ہے۔ (مسلم شریف)

(۱۱۲۲) سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں دنیا کی قدر چھڑکے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو وہ اس کا ایک گھونٹ بھی نہ چکھاتا۔ (ترمذی وغیرہ)

(۱۱۲۳) مستورد بن شداد بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے بخدا دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں اتنی

(۱۱۲۱) \* ہمارے دور کے مفکرین کی مرعوبیت کا عالم بھی ترس کھانے کے قابل ہے کہ وہ بے چارے ہر اس بات کے اظہار کرنے سے خائف رہتے ہیں جو موجودہ زمانہ کے ذرا بھی مذاق کے خلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی سچی سچی بات ہو بے شک متاع دنیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں انتہاء درجہ ذلیل تھی اور دنیا کی حقیقت بھی یہی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جب انسان خود اسی دنیا میں موجود ہے تو وہ اس دنیا سے بالکل مستغنی ہے۔ نہیں نہیں وہ اس کے طلب کا مامور ہے مگر حرام ذرائع سے نہیں حلال ذرائع سے دارِ آخرت پر ترجیح دے کر نہیں بلکہ متاع کا سد سمجھ کر۔ اس سبق کا حاصل دنیوی ترقیات سے روکنا نہیں بلکہ ایک لازوال ملک سے عقلیت کو روکنا ہے۔

(۱۱۲۲) \* کافروں پر دنیا کی وسعت دیکھ کر آپؐ تو خدا تعالیٰ کی نظر میں ان کے قرب کا وسوسہ لاتے ہیں۔ اور حدیث یہ کہتی ہے کہ اس وسعت کا سبب کافر کی قدر و منزلت نہیں بلکہ خود متاع دنیا کی بے قدری و ذلت ہے۔

انسان کمزور ہے اور بیک وقت وہ دو کی محبت نباہ نہیں سکتا۔ تجربہ کر لیجئے جو دنیا کے پیچھے لگ گئے آخرت میں ان کی جدوجہد کیا رہ گئی جو آخرت کے طالب بن گئے دنیا کے لیے ان کی مساعی کتنی ست پڑ گئیں شانِ جامعیت علیحدہ چیز ہے لیکن اگر ان دو میں کسی ایک ہی کو اختیار کرنا ہے تو پھر آپؐ ہی فیصلہ فرمائیے بہتر کیا ہوگا؟

(۱۱۲۳) \* ان جملہ احادیث کا منشا یہ ہے کہ جس دنیا میں انسان خود پیدا ہوتا ہے جس کے تمام علائق اسی کے ساتھ وابستہ ہیں اس کے نقصانات و منافع اور تکالیف و لذتوں سے وہ ہر وقت آشنا ہے اور اس کی ضرورت اپنی زندگی کے گوشہ گوشہ میں محسوس کر رہا ہے وہ لہذا.....



بھی نہیں جتنا کہ تم اگر سمندر میں انگلی ڈالو پھر دیکھو کہ اس میں کتنا پانی لگا ہے۔ (مسلم)

مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ أَصْبَعَهُ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ. (رواہ مسلم)

(۱۱۲۴) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الوفا میں میرے پاس آپ کے چھ یا سات دینار امانت کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ میں ان کو تقسیم کر دوں، مگر آپ کی بیماری میں مجھ کو اس کا خیال نہ رہا۔ آپ نے ایک بار پھر پوچھا وہ چھ یا سات دینار تقسیم ہو گئے یا نہیں۔ میں نے عرض کی، خدا کی قسم تقسیم نہیں ہو سکے اور صرف آپ کی علالت کی فکر کی وجہ سے مجھ سے یہ غفلت ہو گئی۔ آپ نے ان دیناروں کو منگا کر اپنے ہاتھ پر رکھا اور فرمایا۔ اللہ کے اس نبی کے متعلق کیا گمان ہے جس کی اپنے رب سے ملاقات کا اگر وقت آ گیا ہو تو وہ اس حالت میں جائے کہ یہ دینار اس کے پاس موجود ہوں۔ (احمد)

(۱۱۲۴) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ كَانَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدِي فِي مَرَضِهِ سِتَّةٌ دَنَانِيرٌ أَوْ سَبْعَةٌ فَأَمَرَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ أَفْرِقَهَا فَشَغَلَنِي وَجَعُ نَبِيِّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ سَأَلَنِي عَنْهَا مَا فَعَلْتَ السِّتَّةُ أَوِ السَّبْعَةُ قُلْتُ لَا وَاللَّهِ لَقَدْ كَانَ شَغَلَنِي وَجَعُكَ فَدَعَا بِهَا ثُمَّ وَضَعَهَا فِي كَفِّهِ فَقَالَ مَا ظَنُّ نَبِيِّ اللَّهِ لَوْ لَقِيَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ وَهَذِهِ عِنْدَهُ. (رواہ احمد)

(۱۱۲۵) ابوامامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اللہ..... ان احساسات میں پڑ کر کہیں اس آخرت کو بھول نہ جائے جس میں اس کو ہمیشہ رہنا ہے مگر اس کے نفع نقصان سے وہ ابھی تک آشنا نہیں اور نہ ابھی تک اس کی ضرورت اپنی زندگی کے کسی گوشہ میں محسوس کرتا ہے۔ جس ایک محسوس مگر عارضی زندگی اور ایک غیر محسوس مگر دائمی زندگی پر تنبیہ کے لیے یہ مختلف تعبیریں ہیں اور اسی کے لیے مختلف پیرایہ بیان ہیں۔ دنیا کے متعلق جن کا عقیدہ تھا وہ تو دنیا کے فاتح بن چکے اور جن کا عقیدہ اس کے برعکس ہے وہ آج خود دنیا کے مفتوح ہیں۔ اس پر ان کو گمان یہ ہے کہ وہ دنیا کے فاتح ہیں۔ اکبر مرحوم کہتے ہیں۔

فخر کیا ہے جو بدلا ہے زمانہ نے تمہیں

مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں!

(۱۱۲۵) \* انبیاء علیہم السلام کی بلند نظریں دنیا کی متاع خسیس کی طرف کبھی نہیں اٹھتیں۔ ان کے نزدیک ساری دنیا کی قدر و قیمت ایک مچھر کے پر کی برابر بھی نہیں ہوتی ان کے یہاں قیمت تضرع اور ذکر اللہ کی ہے اس کی حمد و ثناء اور اس کے شکر کی ہے وہ انسان کی ضعیف خلقت سے پورے خبردار ہوتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ بھوک کی برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہمیشہ شکم سیری کے خطرناک عواقب سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس لیے ایک طرف بھوکوں کے ساتھ بھوکا رہنے کی دعاء تو کرتے ہیں مگر وہ بھوکا نہیں جو بھوک میں اپنے مالک کی یاد اور اس کے سامنے تضرع و الحاح کو فراموش کر بیٹھے اور دوسری طرف شکم سیروں میں شکم سیر ہونے کی دعاء بھی فرماتے ہیں، مگر وہ شکم سیر نہیں جو پیٹ بھر جانے کے بعد بھی اپنے مالک کی حمد و ثناء اور اس کے شکر سے غافل ہو جائے۔ اس طرح کی بھوک اگر ہو تو وہ بھی نبوت کی وراثت ہے اور اس طرح کی شکم سیری اگر ہو تو وہ بھی اسوۂ نبوت ہے۔ جب تک انسان ساری دنیا سے بے نیاز نہ ہو جائے وہ افراط و تفریط کے ان حالات میں خدائی یاد کبھی قائم نہیں رکھ سکتا۔

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلَى رَبِّي لِيَجْعَلَ لِي بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا فَقُلْتُ لَا يَا رَبِّ وَلَكِنْ أَشْبَعُ يَوْمًا وَ أَجُوعُ يَوْمًا فَإِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ إِلَيْكَ وَ ذَكَرْتُكَ وَ إِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُكَ وَ شَكَرْتُكَ.

(رواہ احمد و الترمذی)

(۱۱۲۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَ لِي مِثْلُ أُحُدٍ ذَهَبًا لَسَرَّيْنِي أَنْ لَا يَمُرَّ عَلَيَّ ثَلَاثُ لَيَالٍ وَ عِنْدِي مِنْهُ شَيْءٌ إِلَّا شَيْءٌ أُرْصِدُهُ لِدَيْنٍ.

(رواہ البخاری و عند الدارمی نحوه عن ابی ذر)

(۱۱۲۷) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلَى حَصِيرٍ فَقَامَ وَ قَدْ أَثَرَفِي جَسَدِهِ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ لَوْ أَمَرْتَنَا أَنْ نَبْسُطَ لَكَ وَ نَعْمَلَ فَقَالَ مَا لِي وَ لِلدُّنْيَا وَ مَا أَنَا وَ الدُّنْيَا إِلَّا كَرَائِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَ تَرَكَهَا. (رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجہ و

رواہ الطیالسی باسناد صحیح)

(۱۱۲۸) عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ أَخَذَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعْضِ جَسَدِي فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ وَ عُدَّ نَفْسَكَ فِي أَهْلِ الْقُبُورِ. (رواہ البخاری)

حق تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کے اس پتھریلی میدان کو میرے سامنے کر کے مجھ کو یہ اختیار دیا تھا اگر میں پسند کروں تو وہ اپنی قدرت سے اس کو سونا بنا دے میں نے عرض کی پروردگار! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن شکم سیر رہوں تو ایک دن بھوکا بھی رہوں۔ جب بھوکا ہوں تو تیرے سامنے گریہ وزاری کروں اور تیری یاد کروں اور جب شکم سیر ہوں تو تیری حمد و ثناء کروں اور تیرا شکر بجا لاؤں۔ (احمد و ترمذی)

(۱۱۲۶) ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ کی برابر بھی سونا ہوتا تو بھی میری خوشی اسی میں ہوتی کہ تین راتیں بھی نہ گزرنے پائیں کہ اس میں سے کچھ بھی میرے پاس باقی رہ جائے۔ ہاں صرف اتنی مقدار جتنی کہ میں اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے رکھ لوں۔ (بخاری شریف)

(۱۱۲۷) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار چٹائی پر سو رہے جب آپ اٹھے تو آپ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت ہو تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک بچھونا تیار کر لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے دنیا سے کیا کام میری اور دنیا کی مثال بس اس مسافر سوار کی سی ہے جو درخت کے سایہ کے نیچے ذرا سی دیر بیٹھے پھر اس کو چھوڑ کر چل دے۔

(احمد - ترمذی - ابن ماجہ - ابوداؤد - طیالسی)

(۱۱۲۸) ابن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے جسم کا بعض حصہ (شفقت کے انداز میں) پکڑ کر فرمایا دنیا میں اس طرح بسر کرو جیسے تم ایک مسافر ہو اور مسافر بھی وہ جو منزل طے کر رہا ہو اور اپنے نفس کو ایسا سمجھو جیسے قبر کا مردہ۔ (بخاری شریف)

(۱۱۲۸) \* ان واقعات سے یہ انداز کرنا چاہیے کہ جن کے قلوب میں خشیت الہی اس درجہ ہو جس کا نقشہ احادیث مذکورہ میں آپ نے ملاحظہ فرمایا اور جن کے قلوب میں دنیا کی بے ثباتی اس درجہ ہو جو آپ کے سامنے ہے ان میں معصیت کا داعیہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔



الرسول العظيم و ابتعاده عن الاثام  
(۱۱۲۹) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا  
قَالَتْ مَا خَيْرَ رَسُولٍ اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا  
فَإِنْ كَانَ إِثْمًا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهِ فِي  
شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا يُنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللَّهِ فَيَنْتَقِمَ لِلَّهِ  
بِهَا. (متفق عليه)

(۱۱۳۰) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا  
قَالَتْ مَا ضَرَبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ لِنَفْسِهِ شَيْئًا قَطُّ بِيَدِهِ وَلَا امْرَأَةً وَلَا  
خَادِمًا إِلَّا أَنْ يُجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا نِيلَ  
مِنْهُ شَيْءٌ قَطُّ فَيَنْتَقِمَ مِنْ صَاحِبِهِ إِلَّا أَنْ  
يُنْتَهَكَ شَيْءٌ مِنْ مَحَارِمِ اللَّهِ فَيَنْتَقِمَ لِلَّهِ.

(رواه مسلم)

(۱۱۳۱) عَنْ سَعِيدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ  
لَمَّا كَانَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ آمَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ إِلَّا أَرْبَعَةَ نَفَرٍ وَ  
امْرَأَتَيْنِ وَقَالَ أَقْتُلُوهُمْ وَإِنْ وَجَدْتُمُوهُمْ  
مُتَعَلِّقِينَ بِأَسْتَارِ الْكَعْبَةِ مِنْهُمْ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ  
سَعْدِ بْنِ أَبِي سَرْحٍ فَاخْتَبَأَ عِنْدَ عُثْمَانَ بْنِ  
عَفَّانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَلَمَّا دَعَا رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ إِلَى الْبَيْعَةِ جَاءَ  
بِهِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ بَايِعْ عَبْدَ اللَّهِ فَرَفَعَ

حرف گناہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی نفرت و بیزاری  
(۱۱۲۹) حضرت عائشہؓ محترمہ فرماتی ہیں کہ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ  
وسلم کو دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا اختیار دیا گیا ہے (تو امت کی سہولت  
کی خاطر) آپ اسی کو اختیار فرماتے جو دونوں میں آسان تر ہوتی مگر جب  
کہیں گناہ کا معاملہ آجاتا تو پھر آپ سے بڑھ کر کوئی شخص نہ تھا جو اس سے دور  
دور رہنے والا ہوتا۔ آپ نے اپنے نفس کی خاطر کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا،  
بجز اس صورت کے کہ جس میں خدائی احترام پر کوئی زد پڑتی ہو۔ پھر تو اللہ  
تعالیٰ کے احترام کی خاطر آپ اس کا انتقام لے کر رہتے تھے۔ (متفق علیہ)  
(۱۱۳۰) حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے  
اپنی غرض کے لیے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو تنبیہ نہیں فرمائی نہ کبھی کسی عورت کو  
اپنے ہاتھ سے مارا اور نہ کسی خادم کو مگر ہاں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو جہاد کیے  
ہیں وہ بات الگ ہے۔ اسی طرح ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ آپ کو ایذا دی گئی  
ہو پھر آپ نے اس ایذا دینے والے شخص سے اس کا بدلہ لیا ہو۔ بجز اس  
صورت کے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کے خلاف کوئی بات ہو تو پھر آپ  
ناموس حدود اللہ کی خاطر اس کا انتقام لیتے۔ (مسلم شریف)

(۱۱۳۱) سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا  
تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز چار شخصوں اور دو عورتوں کے سب کے  
لیے امن عام کا اعلان فرما دیا تھا اور صرف چند لوگوں کے متعلق یہ حکم دیا تھا  
کہ ان کو قتل ہی کرنا اگرچہ وہ تم کو کعبہ کے پردے پکڑے ہوئے بھی ملیں۔  
ان میں سے ایک شخص عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح تھا یہ حضرت عثمان کے  
پاس آ کر چھپ گیا تھا۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو  
بیعت کرنے کے لیے بلایا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اس کو لے کر  
آئے اور عرض کی یا رسول اللہ عبد اللہ کو بھی بیعت فرمائیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ  
وسلم نے اپنا سر مبارک اوپر اٹھا کر اس کو تین بار دیکھا ہر بار بیعت کے لیے

(۱۱۳۱) \* فتح مکہ میں دشمن سے دشمن کی بھی بخشش ہو گئی لیکن صرف ان معدودے چند اشخاص کی جن کی پیہم ایذا رسائیوں دنا ت للہ.....

رَأْسَهُ فَنَظَرَ إِلَيْهِ ثَلَاثًا كُلُّ ذَلِكَ يَابِي يُبَايِعُهُ  
ثُمَّ بَايَعَهُ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى أَصْحَابِهِ فَقَالَ أَمَا كَانَ  
فِيكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ يَقُومُ إِلَى هَذَا حِينَ رَأَيْتُ  
كَفَفْتُ يَدِي عَنْ بَيْعَتِهِ فَيَقْتُلُهُ فَقَالُوا مَا  
يَذَرِينَا يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا فِي نَفْسِكَ هَلًا أَوْ  
مَاتَ إِلَيْنَا بِعَيْنِكَ قَالَ إِنَّهُ لَا يَنْبَغِي لِنَبِيٍّ أَنْ  
يَكُونَ لَهُ خَائِنَةٌ الْأَعْيُنُ . (قال الحافظ ابن

تيمية رواه ابو داود باسناد صحيح و النسائي

انکار ہی فرماتے رہے اس کے بعد اس کو بھی بیعت فرمالیا پھر اپنے صحابہ کی  
طرف متوجہ ہو کر فرمایا تم میں کوئی ایسا سمجھ دار شخص نہ تھا کہ جب اس نے دیکھ  
لیا تھا کہ میں اس کے بیعت کرنے سے اپنا ہاتھ کھینچ رہا ہوں تو اٹھتا اور اس کو  
قتل کر دیتا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
ہمیں کیا علم تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے اپنی آنکھ کا ذرا سا اشارہ کر دیا ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی  
نبی کی یہ شان نہیں کہ اس کی آنکھ بھی خیانت کرنے والی ہو۔

(ابوداؤد نسائی، ابن مردویہ)

كذلك و كان ابن ابی السرح اخا عثمان من الرضاة كذا في الصارم المسلول ص ۱۰۸

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جزم و یقین کہ آخرت میں  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی  
مواخذہ نہیں

الرسول العظيم و جزمه بانه لا

يكون عليه مظلمة لاحد يوم القيامة

و انه لا كرب عليه بعد وفاته

(۱۱۳۲) عَنْ أَنَسٍ قَالَ غَلَا السَّعْرُ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ بَيَان كَرْتِے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

للہ ..... اور سخت طبع سے اس کی کوئی امید نہ تھی کہ آئندہ وہ اسلام کے ساتھ آشتی کا ادنیٰ سا برتاؤ بھی کر سکیں گے۔ ان میں ایک شخص  
عبداللہ بن ابی السرح بھی تھا، جس کا کام منجملہ اور خبیث افعال و حرکات کے آپ کی ہجو کرنا بھی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ آج کہیں مفر کی  
صورت نہیں ہے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی آکر پناہ لی۔ یہ قدیم سے مجسمہ اخلاق تھے اپنے گھر میں پناہ لینے والے کو کیسے نکال باہر  
کرتے اس پر یہ ان کا رضاعی بھائی بھی تھا۔ اس لیے اس کی سفارش پر مجبور ہو گئے۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کیسے ممکن تھا کہ  
اس کو عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسے شخص سفارش کے لیے لے کر آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو صاف جواب دے دیں۔ لہذا آپ نہ تو  
صاف انکار کرنا پسند فرماتے تھے اور نہ اپنی زبان سے امن کا لفظ نکال کر پھر اس کے قتل کا حکم دے سکتے تھے اس لیے کچھ دیر توقف سے کام لیتے  
رہے تاکہ اگر کوئی شخص سابق حکم کے ماتحت اس کو قتل کر دے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سفارش رد کرنے کی  
نوبت ہی نہ آئے۔ لیکن اس میں آپ اور زیادہ توقف نہ فرما سکے۔ آخر اس کو بیعت فرمالیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ کاش تم لوگ میرے  
اس توقف سے کچھ فائدہ اٹھا لیتے صحابہ کا جواب آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اب اندازہ فرمائیے کہ ایک واجب القتل شخص کے قتل کے متعلق اگر  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ذرا سا اشارہ فرمادیتے تو کیا یہ کسی معصیت کی تعریف میں آتا۔ مگر جب آپ نے اتنی سی بات بھی گوارا نہ فرمائی  
اور وہ بھی اس عنوان سے کہ یہ نبی کی شان نہیں کہ وہ آنکھ کا بھی کوئی ایسا اشارہ کر سکے جو صورتہ بھی خیانت شمار ہو تو کیا پھر کھلی معصیت کرنی  
خواہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہو نبی کی شان ہوگی۔ (العیاذ باللہ)

(۱۱۳۲) \* پہلے زمانہ میں نرخ کا اتار چڑھاؤ تاجروں کے ہتھکنڈوں سے نہ ہوتا تھا بلکہ اشیاء کی باہر سے آمد اور پیداوار کی قلت للہ .....



النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَعِرْنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَإِنِّي لَا رُجُوءَ أَلْفَى رَبِّي وَ لَيْسَ أَحَدٌ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلَمَةٍ بَدَمٍ وَلَا مَالٍ.

(رواه ابوداؤد و الترمذی و ابن ماجه و الدارمی)

(۱۱۳۳) عَنْ أَنَسٍ قَالَ لَمَّا ثَقُلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَعَلَ يَتَغَشَّاهُ الْكَرْبُ فَقَالَتْ فَاطِمَةُ وَ أَكْرَبَ أَبَاهُ فَقَالَ لَهَا لَيْسَ عَلَيَّ أَبِيكَ كَرَبٌ بَعْدَ الْيَوْمِ فَلَمَّا مَاتَ قَالَتْ يَا أَبَتَاهُ أَجَابَ رَبًّا دَعَاهُ يَا أَبَتَاهُ مِنْ جَنَّةٍ

ایک بار اشیاء کے نرخ بہت چڑھ گئے۔ اس پر لوگوں نے آپ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی یا رسول اللہ! آپ اپنی جانب سے نرخ مقرر فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا نرخ کا چڑھنا اتنا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے وہی رازق ہے اور رزق کا تنگ و فراخ کرنے والا بھی وہی ہے مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے پوری امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کے روبرو اس شان سے حاضر ہوں گا کہ تم میں ایک شخص بھی اپنے خون یا مال کے ادنیٰ سے

معاملہ کا بھی مجھ سے مطالبہ کرنے والا نہ ہوگا۔ (ابوداؤد وغیرہ)

(۱۱۳۳) انس بیان کرتے ہیں کہ آخر میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدت اور بے چینی بہت بڑھ گئی تو حضرت فاطمہؓ نے فرمایا میرے والد کو کیسی تکلیف ہے؟ آپؐ نے فرمایا تمہارے والد کو جو تکلیف بھی ہے وہ صرف آج کے دن تک ہے اس کے بعد پھر کوئی تکلیف نہیں۔ اور جب آپ کے وفات ہو گئی تو شدت غم میں ان کی زبان سے یہ کلمات نکلے اے والد

للہ .... و کثرت سے ہوا کرتا تھا۔ ادھر شریعت مطہرہ نے اس کا بند و بست پہلے سے خود فرما رکھا تھا کہ بے وجہ اشیاء کے نرخ نہ چڑھیں۔ تاجروں کو باہر سے باہر اشیاء خرید کر لینے کی ممانعت تھی۔ کھانے کی اشیاء اکٹھی خرید کر دبا لینی پھر ان کو گراں قیمت پر فروخت کرنے پر سخت وعید فرمادی گئی اسی طرح ان جملہ صورتوں کا سد باب کر دیا گیا تھا۔ جن سے اہل شہر پر کسی تجارتی چکر سے گرانی کا خطرہ ہو سکتا تھا اب اگر قدرتی گرانی پر بھی قیمت پر کوئی سرکاری کنٹرول کر دیا جاتا تو یقینی اس میں ایک طبقہ کی حق تلفی کا اندیشہ تھا۔ اس لئے آپ نے اس کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ بظاہر اس میں گوعوام کی بہبودی معلوم ہوتی تھی لیکن ایک فرقہ کے لئے یہ مضرت رسانی کا موجب بھی ہو سکتا تھا اور نبی کی عصمت اس کو گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی ذات سے کسی تنفس کا بال برابر بھی کوئی نقصان ہو اس تنبیہ کے بعد آپ کی پوری شان تواضع کے ساتھ آپ کا یہ جملہ کتنا پر از عظمت جملہ تھا کہ مجھ کو یقین ہے کہ قیامت میں میرے ذمہ کسی کا کوئی حق نہ ہو گا یہ کون ہیں وہ جن کا تعلق ہر ہر فرد امت کے ساتھ وابستہ ہے۔ پھر کس عموم و اطلاق کے ساتھ۔ حقوق العباد سے اپنی عصمت کا اعلان فرما رہے ہیں۔ جہاں حقوق العباد اتنے صاف ہوں وہاں حقوق اللہ کی صفائی کا پوچھنا ہی کا ہے۔ عصمت کے بغیر کیا یہ جملہ زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔

(۱۱۳۳) \* اس حدیث میں بھی آپؐ نے پورے جزم و ثوق کے ساتھ فرمایا ہے کہ آخرت میں آپ سے کسی امر میں کوئی گرفت نہ ہوگی۔ کیا علی الاطلاق عصمت کے بغیر یہ ممکن ہے اب اگر اس پر بھی عصمت کے خلاف منطقی احتمالات نکالتے ہیں تو لوگوں نے دلائل توحید کے خلاف احتمالات نکالنے میں بھی کا کوتاہی کی ہے۔ آپؐ کی اول سے آخر تک زندگی پر نظر ڈالئے آپ کی صفات و ملکات پر نظر ڈالئے آپ کی خدا ترسی اور دنیا سے بے رغبتی پر نظر ڈالئے اس کے بعد آپ کے ان جملوں پر بھی نظر ڈالئے جو اس عالم کے متعلق ہیں جہاں کسی کو اپنے متعلق اطمینان بخش ایک حرف نکالنا بھی مشکل ہے تو صرف یہی نتیجہ نکلے گا کہ آپؐ معصوم ہیں آپؐ معصوم ہیں۔

الْفِرْدَوْسِ مَا وَاهُ يَا أَبَتَاهُ إِلَى جَبْرِئِيلَ نَعَاهُ  
فَلَمَّا دُفِنَ قَالَتْ فَاطِمَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى  
عَنْهَا يَا أَنَسُ أَطَابَتْ أَنْفُسُكُمْ أَنْ تَحْثُوا عَلَى  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ التُّرَابَ.

(رواه البخاری)

(۱۱۳۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَ  
كَذَا تَعْنِي قَصِيرَةً فَقَالَ لَقَدْ قُلْتَ كَلِمَةً لَوْ  
مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ.

(رواه احمد و الترمذی و ابوداؤد)

(۱۱۳۵) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَحَبُّ إِلَيَّ حَكِيَّتُ أَحَدًا  
وَأَنْ فِي كَذَا وَكَذَا.

(رواه الترمذی و صححه)

(۱۱۳۶) عَنْ أَنَسٍ قَالَ بَلَغَ صَفِيَّةَ قَالَتْ بِنْتُ  
يَهُودَى فَبَكَتْ فَدَخَلَ عَلَيْهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهِيَ تَبْكِي فَقَالَ مَا تُبْكِيكِ

بزرگوار وہ کہ جنہوں نے اپنے رب کی دعوت قبول فرمائی وہ کہ جن کا مقام  
جنت الفردوس بن چکا اے والد بزرگوار آپ کا یہ المناک حادثہ ہم جبرئیل  
علیہ السلام کو سناتے ہیں۔ پھر جب آپ دفن ہو چکے تو حضرت فاطمہؓ نے  
شدت غم سے فرمایا۔ انسؓ تمہارے دلوں نے یہ کس طرح گوارا کر لیا کہ تم  
نے اپنے ہاتھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی دی۔ (بخاری شریف)

(۱۱۳۴) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر میں نے رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا آپ کو بس بس وہی صفیہ کافی  
ہیں یعنی جو پستہ قد ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا تم نے ایسا کلمہ منہ سے نکالا  
ہے اگر اس کو سمندر میں ملا دیا جائے تو باوجودیکہ اس کا پانی سخت بدمزہ ہوتا  
ہے مگر وہ اس کا مزہ بھی بدل دے۔ (احمد - ترمذی - ابوداؤد)

(۱۱۳۵) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے کسی کی نقل اتارنا پسند نہیں اگرچہ اس کے مقابلہ  
میں میرے لیے بڑی سے بڑی بھی کوئی چیز ہو۔

(ترمذی شریف)

(۱۱۳۶) انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت صفیہؓ کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت حفصہؓ  
ان کے متعلق ”دختر یہودی“ کا لفظ کہتی ہیں۔ اس پر وہ رونے لگیں۔ حسب  
الاتفاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے تو اس وقت وہ زور ہی

(۱۱۳۶) \* کسی شخص کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا سب سے سچا معیار اس کی اندرونی زندگی ہوتی ہے اور اس میں بھی بیبیوں کا معاملہ  
بھی سب سے اہم ہے یہاں بشری فطرت اپنی طبعی مناسبت کی وجہ سے کبھی کسی کی طرف زیادہ میلان بھی رکھ سکتی ہے اور اتنی باپ پر اس کو  
ملامت بھی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ یہ بات انسان کے اختیار کی نہیں ہوتی پھر اس میلان کے اثرات بھی باہم معاملات میں بھی نظر آنے ناگزیر  
ہو جاتے ہیں۔ بس یہاں پہنچ کر ہی عام بشر کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں لیکن جب کسی نبی کی اندرونی زندگی دیکھی جائے تو ان معاملات میں بھی  
وہ اتنی ہی صاف نظر آتی ہے جتنی کہ اس کے بیرونی معاملات میں۔ حضرت عائشہؓ بیشک ازواج مطہرات میں سب سے بلند مقام رکھتی تھیں مگر  
جب حضرت صفیہؓ کے متعلق ان کی زبان ذرا سا ایک کلمہ وہ بھی طبعی غیرت میں منہ سے نکلا تو آپؐ نے فوراً اس پر تنبیہ فرمائی اس طرح حضرت  
حفصہؓ اگرچہ عمر فاروقؓ جیسے رفیق کی صاحبزادی سہی لیکن ان کے ایک صحیح کلمہ کو بھی آپؐ نے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا کیونکہ اس کی  
غایت و غرض بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ پھر اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اسی مکروہ کلمہ کی ایسی اصلاح نر مادی کہ جو کلمہ پہلے حقارت کا باعث تھا اب وہی قابل  
فخر نظر آنے لگا۔ اس کے بعد نہ تحقیر کرنے والا اس کو دہرا سکتا تھا اور نہ سننے والا اس کو برا مان سکتا تھا۔ یہ ہے نبی کی اندرونی زندگی للہ.....



فَقَالَتْ قَالَتْ لِي حَفْصَةُ اَنِّي اِنْتِ يَهُودِيٌّ  
فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكَ لَا  
بُنْتُ نَبِيٍّ وَاِنَّ عَمَّكَ لَنَبِيٌّ وَاِنَّكَ لَتَحْتَ  
نَبِيٍّ فَعِمْ تَفْخَرُ عَلَيْكَ ثُمَّ قَالَ اتَّقِيَ اللَّهَ يَا  
حَفْصَةُ. (رواه الترمذی و النسائی)

تھیں۔ فرمایا کیوں روتی ہو؟ انہوں نے عرض کی اس لیے کہ حفصہ مجھے  
یہودی کی لڑکی کہتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا تم تو نبی کی اولاد میں ہو اور تمہارے  
چچا بھی ایک نبی تھے اور اب تم ایک نبی کی بی بی ہو۔ پھر حفصہ اگر تمہارے  
مقابلہ پر فخر کرتی ہیں تو آخر کس بات پر؟ اس کے بعد حضرت حفصہ کو خطاب  
کرتے ہوئے فرمایا حفصہ! اللہ سے ڈرو۔ (ترمذی۔ نسائی)

(۱۱۳۷) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا غُرْتُ عَلَى  
أَحَدٍ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا  
غُرْتُ عَلَى خَدِيجَةَ وَ مَا رَأَيْتُهَا وَلَكِنْ كَانَ  
يُكْثِرُ ذِكْرَهَا وَ رُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ ثُمَّ يَقْطَعُهَا  
أَعْضَاءً ثُمَّ يَبْعَثُهَا فِي صَدَائِقِ خَدِيجَةَ فَرُبَّمَا

(۱۱۳۷) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جتنی غیرت مجھ کو حضرت خدیجہؓ پر آیا  
کرتی تھی اتنی آپؐ کی بیبیوں میں کسی پر بھی نہ آتی تھی حالانکہ مجھے ان کے  
دیکھنے کی نوبت کہاں آئی تھی (ان کا تو مجھ سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا)  
بات یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور  
جب کبھی بکری ذبح کرنے کی نوبت آتی تو اس کی بوٹیاں بنوا کر ان کی

للہ ..... آپؐ کی ازواج میں ام حبیبہؓ بھی شامل تھیں جن کے والد اس وقت تک آپؐ کے دشمنوں کی صف میں تھے اور حضرت صفیہؓ بھی  
اس شرف سے مشرف ہو چلی تھیں اور وہ بھی اپنے والد چچا اور شوہر کے قتل کا زخم کھائے بیٹھی تھیں لیکن اس کے باوجود کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ  
آپؐ کی اندرونی زندگی کے متعلق ان شریف اور غیور عورتوں کی زبانوں سے کبھی ادنیٰ سے نقص کا ایک کلمہ بھی نکلا تھا۔ بلکہ ام حبیبہؓ سے تو یہاں  
تک منقول ہے کہ ایک مرتبہ ان کے والد اپنے زمانہ شرک میں آپؐ کے تشریف لائے تو ایک بچھونا جو سامنے بچھا ہوا تھا انہوں نے فوراً ایک  
طرف لپیٹ کر رکھ دیا۔ ان کے والد ابوسفیان نے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا۔ کیا میں بستر کے لائق نہیں۔ فرمایا کہ یہ بستر رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کا ہے اور آپؐ مشرک ہیں (مشرک کو قرآن کریم نے ناپاک کہا ہے) اب اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپؐ کی ازواج پر بھی آپؐ  
کی عصمت اور آپؐ کے تقدس کا سکھ کس درجہ جما ہوا ہوگا۔ کثرت ازواج اسلامی تعلیمات کی اشاعت و تفہیم کے لئے کتنی اہم تھی۔ یہ بات تو  
جدا گانہ ہے مگر یہاں اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب مختلف مزاج، مختلف حالات اور مختلف خاندانوں کی بیبیاں بھی آپؐ کی اندرونی  
پاکبازی کی سب سے بڑی شاہد ہوں تو پھر آپؐ کی عصمت و پاکبازی کا مسئلہ بدیہی ہونا یقینی ہے۔

(۱۱۳۷) \* حضرت خدیجہؓ آپؐ کی نبوت کے ابتدائی حالات میں آپؐ کی پوری پوری دمساز رہ چکی تھیں اس لئے ان کی خدمات اور ان  
کی وفا شعار آپؐ کو کبھی فراموش نہ ہوتی تھیں زندگی تک تو ہر انسان اپنے مخلصوں کی قدردانی کیا کرتا ہے، لیکن جو موت کے بعد بھی یاد تازہ  
رکھے ایسے انسان کم ہیں۔ یہاں حضرت عائشہؓ بڑی صفائی کے ساتھ اظہار فرما رہی ہیں کہ میری زبان سے جو کلمات بھی حضرت خدیجہؓ کی  
شان میں نکل گئے یہ صرف ایک سوت کی طبعی غیرت تھی اس کو حسد سمجھنا غلط ہے کیونکہ میں نے تو ان کو دیکھا بھی نہ نہیں تھا۔ مگر رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم کے طور و طریق سے چونکہ ان کے ساتھ محبت و تعلق کے کلمات برابر سنتی بس وہی میری غیرت کو برا بیچتے کر دیتے تھے۔ مگر دیکھئے کیا  
حضرت عائشہؓ کی خاطر آپؐ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر سکوت فرما سکے۔ اور کیا یہاں بھی ایک ایسی بات نہ فرمادی جس کے بعد  
حضرت عائشہؓ دوسری بار اس کا ذکر نکال ہی نہیں سکتی تھیں، یعنی ان کا صاحب اولاد ہونا۔ عورتوں میں لا ولد ہونا آج بھی موجب نقص گناہ لہ.....

قُلْتُ لَهُ كَأَنَّهُ لَمْ تَكُنْ فِي الدُّنْيَا امْرَأَةً إِلَّا خَدِيجَةً فَيَقُولُ إِنَّهَا كَانَتْ وَكَانَتْ وَكَانَ لِي مِنْهَا وَلَدٌ.

(متفق علیہ و راجع حدیث الصحفۃ و حدیث الخیر من ترجمان السنۃ ص.....)

(۱۱۳۸) عَنْ أُسَيْدِ بْنِ حُضَيْرٍ رَجُلٍ مِّنَ الْأَنْصَارِ قَالَ بَيْنَمَا هُوَ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ وَكَانَ فِيهِ مُزَاحٌ بَيْنَمَا يُضْحِكُهُمْ فَطَعَنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي خَاصِرَتِهِ بِعُودٍ فَقَالَ اصْبِرْنِي قَالَ اصْطَبِرْ قَالَ إِنَّ عَلَيْكَ قَمِيصًا وَ لَيْسَ عَلَيَّ قَمِيصٌ فَرَفَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَمِيصِهِ فَاحْتَضَنَهُ وَ جَعَلَ يَقْبَلُ كَشْحَهُ فَقَالَ إِنَّمَا أَرَدْتُ هَذَا يَا رَسُولَ اللَّهِ. (رواه ابوداؤد)

سہیلیوں کے پاس بھی بھیجا کرتے تھے۔ میں اس وقت کبھی شدت غیرت سے یہ کہہ بیٹھتی کہ آپؐ تو ان کا ذکر ہر وقت اس طرح رکھتے ہیں جیسے دنیا میں (حضرت) خدیجہؓ کے علاوہ کوئی اور عورت ہی نہیں تو آپؐ یہ فرما دیتے جی ہاں بس وہ تھیں اس کو میں جانتا ہوں اور بڑی بات یہ ہے کہ میری اولاد بھی ان سے ہی تھی۔ (متفق علیہ)

(۱۱۳۸) اسید بن حضیر سے روایت ہے کہ ایک انصاری صحابی نے جن کے مزاج میں ظرافت تھی اپنے سلسلہ گفتگو میں بیان کیا کہ اس اثناء میں جب کہ وہ لوگوں کو ہنسا رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لکڑی ان کی کونکھ میں ذرا چھو دی انہوں نے کہا میں تو اس کا بدلہ لوں گا۔ آپؐ نے فوراً فرمایا اچھا لے لو۔ انہوں نے کہا آپؐ کے جسم پر تو قمیص ہے اور میرے جسم پر قمیص نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت اپنی قمیص اٹھا دی۔ پھر کیا تھا وہ آپؐ کو لپٹ گئے اور آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو کو بوسہ دیتے جاتے اور یہ کہتے جاتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری دیرینہ تمنا تو بس یہ تھی۔ (ابوداؤد)

اللہ..... جاتا ہے۔ طبعی حالات چونکہ ایک حد تک غیر اختیاری سے ہوا کرتے ہیں اس لئے جب تک اس کے خلاف بھی ایسے ہی طبعی حالات پیدا نہ ہو جائیں پورے طور پر ان سے علیحدگی اختیار کر لینا ایک دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے مواقع پر ایسے دوسرے حالات بھی پیدا کر دیتے تھے جن کے بعد ان کے اعادہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہو سکیں یہاں دو واقعات اور بھی ملاحظہ فرمالیجئے جو ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۱۷۴ اور ج ۲ ص ۱۷۵ اور ج ۲ ص ۸۷ پر مذکور ہیں۔ تاکہ آپؐ کو اور روشن ہو جائے کہ روزمرہ کے بیبیوں کے معاملات میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کتنی بے لاگ رہی ہے حالانکہ یہی محل جذبات کے امتحان کا سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ یہاں دس تاویل کر کے انسان کا رخ ادھر ہی پھر جاتا ہے جس طرف کہ اس کے قلب کا رخ ہوتا ہے۔ مگر اس نازک امتحان میں بھی جب رسول کی فطرت کہیں ذرا نہیں ڈگمگاتی تو اندازہ فرمالیجئے کہ پھر حق تعالیٰ کی ادنیٰ سے اولیٰ نافرمانی بھلا وہ کیا کر سکتی ہے۔

(۱۱۳۸) \* حدیث مذکور کو ملاحظہ فرمائیے آپؐ کو معلوم ہو گا کہ اس اقتدارِ اعلیٰ پر یہ اندازِ بے تکلفی اور اس اندازِ بے تکلفی میں ایک زبردست صحابی کے طلب انتقام پر یہ اندازِ رضا مندی یہ آپؐ کے عصمتِ نفس کی کتنی بڑی شہادت ہے۔ ہم بارہا تنبیہ کر چکے ہیں کہ اہم مواقع پر انسان کی آزمائش بھی گواہ کی بڑی آزمائش ہوتی ہے مگر یہاں فطرتاً ہر انسان اس کی کچھ نہ کچھ تیاری کر لیتا ہے مگر روزمرہ کے وہ واقعات جن کی نظروں میں نہ اس جانب کوئی اہمیت ہوتی ہے نہ اس جانب ان میں لغزشوں سے اس طرح محفوظ رہنا گویا نفس کی افتادِ طبیعت یہی ہے یہ انسان کی پاک نفسی کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے۔ انسان کی لغزش کا سب سے بڑا مقام حقوق العباد ہی کی گھائیاں ہوتی ہیں۔ لہذا.....



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کا

الرسول العظیم کان اسوة حسنة

پسندیدہ نمونہ تھا

للناس كافة من الله عز وجل

(۱۱۳۹) عَنْ عُمَرُو بْنِ دِينَارٍ قَالَ سَأَلْنَا ابْنَ عُمَرَ عَنْ رَجُلٍ طَافَ بِالْبَيْتِ فِيْ عُمْرَةٍ وَلَمْ

(۱۱۳۹) عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ ہم نے ابن عمرؓ سے ایک شخص کے متعلق فتویٰ پوچھا جس نے عمرہ کا احرام باندھ کر بیت اللہ کا طواف تو کر لیا تھا مگر

للہ ..... یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر گھائی سے اس طرح صاف نکل گئے ہیں گویا ان میں کہیں ایک کا ثنا بھی نہ ہوتا۔ ازواج مطہرات کی خانگی معاملات آپؐ نے پڑھے۔ اہل ذمہ اور یہود کی سخت کلامی اور ناروا کلمات آپؐ نے سنے اور پھر اب آپؐ کے فداکاروں کی اس قسم کے واقعات بھی دیکھے۔ یہ بات تو بعد میں کھلی کہ اس جاں نثار کا جذبہ محبت کس موقعہ کا متلاشی تھا لیکن اس سے قبل صورت حال جتنی نا موزوں نظر آ رہی تھی وہ ظاہر ہے مگر اوّل سے لے کر آخر تک کیا ممکن کہ کسی ایک مقام پر بھی آپؐ کا قدم جاہد اعتدال سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہٹا ہو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی ذات پاک کیا تھی بحر سکون کا ایک بے پایاں سمندر تھا جس میں کنکر پتھر تو کیا اگر پہاڑ بھی اٹھا کر ڈال دو تو بھی اس میں ذرا جنبش نہیں ہو سکتی۔ حضرت انسؓ آپؐ کے دیرینہ خادم بیان کرتے ہیں کہ اس طویل مدت میں مجھے کبھی یاد نہیں آتا کہ آپؐ نے کسی نقصان کرنے پر کبھی مجھ کو ٹوکا ہو بلکہ اگر کسی اور شخص نے بھی کچھ کہا ہے تو اس کو بھی یہ کہہ کر منع فرما دیا ہے۔ شدنی معاملات ہو کر رہتے ہیں انسؓ کو کچھ نہ کہو۔

(۱۱۳۹) \* اسلام میں رسول کی شخصیت کے متعلق ایک اصولی اور سب سے مقدس تصور یہ ہے کہ اس کی ذات اور اس کی ایک ایک ادا اس کی امت کے لئے مرضیات الہیہ کا نمونہ اور ”اسوہ حسنہ“ بنا کر بھیجی جاتی ہے اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خالق کی نظر میں جتنی پسندیدہ صفات ہیں وہ سب کی سب اس کی ذات میں جمع کر دی جاتی ہیں اور جتنی صفات ناپسندیدہ ہیں وہ ایک ایک کر کے اس کی ذات سے علیحدہ کر دی جاتی ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کے نمونہ کہنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ صاحب نمونہ کی پسندیدگی کا معیار ہے۔

حق تعالیٰ نے اس امت کو جہاں اپنی جانب سے اپنی کتاب دے کر سرفراز فرمایا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کتاب کا ایک عملی نمونہ بھی عطا فرمایا تھا لہذا جس طرح اس کی کتاب ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ تھی اسی طرح اس کا نمونہ بھی ہر عیب و نقص سے مبرا ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی ذات کو کسی تفصیل کے بغیر ”اسوہ حسنہ“ نہیں فرمایا اور صحاب نے کسی حجت کے بغیر اس کو اپنا ”اسوہ“ بنا لیا۔ پھر جس طرح کہ اس نے تبلیغ احکام کے لئے آپؐ کو اپنا رسول بنا کر خود بھیجا تھا اسی طرح آپؐ کی ذات کو نمونہ اور ”اسوہ حسنہ“ بھی خود ہی بنا کر بھیجا تھا لہذا جس طرح آپؐ کے علوم کی قدرت ضامن تھی اسی طرح آپؐ کے اعمال و افعال کی بھی قدرت ہی خود نگراں تھی اور عصمت رسول کا مفہوم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ لہذا ”اسوہ حسنہ“ کو رسول کی عصمت کا دوسرا مدلل عنوان سمجھنا چاہیے اب اگر رسول کے کسی قول و عمل میں معصیت کی گنجائش تسلیم کر لی جائے تو دو باتوں میں سے ایک بات ماننی لازم ہوگی یا رسول کی ذات اسوہ نہ رہے یا معصیت بھی اسوہ کا جزو بن جائے اور امتوں کے حق میں معصیت کا یہ عمل بھی مذموم نہ رہے۔ کیونکہ جب وہ معصیت خود قدرت کے نمونہ میں موجود ہے تو پھر اس کی اتباع پر امت سے باز پرس کیوں ہو۔ یہ دونوں باتیں ایک لمحہ کے لیے بھی قابل تسلیم نہیں اس لیے یہی بات تسلیم کرنی ہوگی کہ رسول چونکہ معصوم ہوتا ہے اس لیے اس کے کسی عمل پر معصیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا اس کا ہر عمل نظر ربوبیت میں حسنہ اور نیکی شمار ہوتا ہے اور نیکی بھی وہ جس کو نمونہ کہا جاسکے۔

يُطْفَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ سَبْعًا أَيَّتِي امْرَأَتُهُ  
فَقَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فَطَافَ بِالْبَيْتِ سَبْعًا وَصَلَّى خَلْفَ الْمَقَامِ  
رَكْعَتَيْنِ وَطَافَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ سَبْعًا وَ  
قَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ وَ  
قَالَ (عَمْرُو بْنُ دِينَارٍ) وَسَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ  
عَبْدِ اللَّهِ فَقَالَ لَا يَقْرَبْنَهَا حَتَّى يَطُوفَ بَيْنَ  
الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ. (رواه البخاری)

(۱۱۴۰) عَنْ نَافِعٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ أَرَادَ  
ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا الْحَجَّ عَامَ  
حَجَّةِ الْحَرُورِيَّةِ فِي عَهْدِ ابْنِ الزُّبَيْرِ فَقِيلَ لَهُ  
إِنَّ النَّاسَ كَائِنٌ بَيْنَهُمْ قِتَالٌ وَنَخَافُ أَنْ  
يَصُدُّوكَ فَقَالَ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ  
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ إِذْ أَنْصَحَ كَمَا صَنَعَ رَسُولُ اللَّهِ  
أَشْهَدُكُمْ أَنِّي قَدْ أَوْجَبْتُ عُمْرَةً حَتَّى كَانَ  
بِظَاهِرِ الْبَيْدَاءِ قَالَ مَا شَأْنُ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ إِلَّا  
وَاحِدٌ أَشْهَدُكُمْ أَنِّي قَدْ جَمَعْتُ حَجَّةً مَعَ عُمْرَةٍ وَ  
أَهْدَى هَذِيَا مُقْلَدًا اشْتَرَاهُ حِينَ قَدِمَ فَطَافَ  
بِالْبَيْتِ وَبِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَلَمْ يَزِدْ عَلَى  
ذَلِكَ وَلَمْ يَحْلِلْ عَنْ شَيْءٍ حَرَمٍ مِنْهُ حَتَّى  
يَوْمَ النَّحْرِ فَحَلَّقَ وَنَحَرَ وَرَأَى أَنْ قَدْ قَضَى  
طَوَافَهُ لِلْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ بِطَوَافِهِ الْأَوَّلِ ثُمَّ قَالَ  
كَذَلِكَ صَنَعَ النَّبِيُّ. (رواه البخاری)

(۱۱۴۱) حَدَّثَنَا حَكِيمٌ أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ

ابھی صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر نہ لگائے تھے کیا وہ اپنی بی بی کے  
ساتھ صحبت کر سکتا ہے۔ اس پر انہوں نے یہ جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تھے تو آپ نے بیت اللہ کے گرد سات  
چکر کیے اس کے بعد مقام ابراہیم پر آ کر دو رکعتیں طواف کی اداء فرمائیں  
پھر صفا و مروہ کے سات چکر لگائے اور تمہارے واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کی ذات ہی بہترین نمونہ ہے۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ ہم نے جابر  
سے بھی یہ مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا جب تک صفا و مروہ کے درمیان  
پوری سعی سے فارغ نہ ہو لے بی بی کے قریب نہ پھٹکے۔ (بخاری شریف)

(۱۱۴۰) نافع بیان کرتے ہیں کہ جس سال خوارج کے ساتھ جنگ تھی  
حضرت ابن عمرؓ نے حج کا ارادہ فرمایا یہ عبد اللہ بن زبیرؓ کا زمانہ تھا۔ لوگوں  
نے کہا کہ سامنے جنگ کھڑی ہے ہمیں اندیشہ ہے کہ دشمن کہیں آپ کو جانے  
نہ دیں۔ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات  
میں تمہارے لیے بہتر نمونہ موجود ہے اگر ایسا ہوگا تو میں بھی وہی کروں گا جو  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقعہ پر کیا تھا یہ فرما کر ابن عمرؓ نے فرمایا  
گواہ رہو میں عمرہ کی نیت کر چکا۔ اس کے بعد جب مقام بیداء پر پہنچے تو فرمایا  
کہ حج اور عمرہ کا معاملہ یکساں ہی ہے لہذا میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ عمرہ کے  
ساتھ میں حج کی بھی نیت کیے لیتا ہوں اور جو ہدی آتے وقت مقام قدید سے  
خرید کی تھی اس کو قلدادہ پہنا کر ساتھ لے چلے۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر انہوں نے بیت  
اللہ اور صفا و مروہ کا طواف کیا اس کے سوا اور کچھ نہ کیا اور عید قرباں کے دن تک  
بدستور محرم رہے جب دسویں تاریخ ہوئی تو اب سرمنڈایا اور ہدی کا جانور ذبح  
کیا اور ان کا خیال یہ تھا کہ حج و عمرہ کے لیے جو طواف ان کے ذمہ ضروری تھا وہ  
پہلا طواف کر کے انہوں نے ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ (بخاری شریف)

(۱۱۴۱) حکیم کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ سے ایک شخص کے متعلق مسئلہ پوچھا گیا جس

(۱۱۴۱) \* صحیح بخاری میں اس روایت کے بعد ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ کنت مع ابن عمر فساله رجل قال لله ..... صحیح بخاری میں اس روایت کے بعد ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ کنت مع ابن عمر فساله رجل قال لله .....



عُمَرَ عَنْ رَجُلٍ نَذَرَ إِلَّا يَأْتِيَ عَلَيْهِ يَوْمٌ إِلَّا صَامَ فَوَافَقَ يَوْمَ أَضْحَىٰ أَوْ فِطْرٍ فَقَالَ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن يَكُنْ يَصُومُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَلَا أَضْحَىٰ وَلَا يَرَىٰ صِيَامَهُمَا. (رواه البخاری)

(۱۱۴۲) عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ فِي الْحَرَامِ يُكْفَرُ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.

(رواه البخاری)

(۱۱۴۳) عَنْ زِيَادِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ أَتَى عَلَى رَجُلٍ قَدْ أَخَذَ بَدَنَتَهُ يَنْحَرُهَا قَالَ ابْعَثْهَا قِيَامًا مَّقِيدَةً سَنَةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواه البخاری)

(۱۱۴۴) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ قَرَأَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا أُمِرَ وَ سَكَتَ فِيمَا أُمِرَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.

(رواه البخاری)

(۱۱۴۵) عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَحِبْتُ النَّبِيَّ صَلَّى

نے یہ نذر کر لی تھی کہ جب تک وہ زندہ رہے گا ہر سہ شنبہ یا چہار شنبہ کو روزہ رکھا کرے گا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس دن عید الفطر یا عید قربان آ گئی اب وہ کیا کرے۔ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں تمہارے لیے بہتر نمونہ موجود ہے آپ نہ عید الفطر میں روزہ رکھتے تھے نہ عید قربان میں اور ان دونوں دنوں میں روزہ رکھنا درست سمجھتے تھے۔ (بخاری)

(۱۱۴۲) سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ ابن عباس فرماتے تھے اگر کوئی شخص اپنی بی بی سے ”انت علی حرام“ کے لفظ کہہ دے تو اس کو کفارہ یمین ادا کرنا چاہیے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں تمہارے لیے بہتر نمونہ ہے۔ (بخاری شریف)

(۱۱۴۳) زیاد بن جبیر بیان کرتے ہیں میں نے دیکھا کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا گزر ایک شخص پر ہوا جو اپنے اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس کا گھٹنا باندھ کر کھڑا کر۔ یہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ (بخاری شریف)

(۱۱۴۴) ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس بات کا حکم ہوا وہ آپ نے پڑھ کر سنا دی اور جہاں خاموش رہنے کا حکم ہوا وہاں آپ خاموش رہے (اس لیے آپ کا نطق و سکوت دونوں حکم الہی کے ماتحت تھا) وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا. (مریم) اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی میں بہترین نمونہ ہے۔ (لہذا بے وجہ کھود کر ید مت کیا کرو) (بخاری شریف)

(۱۱۴۵) ابن عمر کہتے ہیں کہ میں سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

للہ ..... نذرت ان اصوم کل یوم ثلثاء او اربعاء. ہم نے اوپر کی روایت کا ترجمہ اسی روایت کی روشنی میں کیا ہے۔ اگر یہاں شارحین نے اس کو علیحدہ علیحدہ دو واقعات قرار دیے ہوں تو پھر اس روایت کا ترجمہ بدل جائے گا۔

(۱۱۴۲) \* حضرت ابن عباس کا مطلب یہ تھا کہ یہ الفاظ کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ صرف کفارہ یمین ادا کر دینا کافی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک واقعہ میں آپ نے شہد کے متعلق فرمادیا تھا کہ آئندہ میں شہدا استعمال نہیں کروں گا تو اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذمہ کفارہ ادا کرنا ہی لازم فرمایا تھا۔

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ أَرَهُ يُسَبِّحُ فِي السَّفَرِ وَ  
قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ  
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (رواه البخاری)

(۱۱۴۶) عَنْ رَجُلٍ أَنَّهُ سَأَلَ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ  
فَقَالَ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ إِنَّا نَجِدُ صَلَوةَ  
الْخَوْفِ وَ صَلَوةَ الْحَضَرِ فِي الْقُرْآنِ وَلَا  
نَجِدُ صَلَوةَ السَّفَرِ فَقَالَ يَا ابْنَ أَخِي إِنَّ اللّٰهَ  
بَعَثَ إِلَيْنَا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ  
لَا نَعْلَمُ شَيْئًا فَإِنَّمَا نَفْعَلُ كَمَا رَأَيْنَاهُ يَفْعَلُ.

(رواه مالک فی الموطأ)

(۱۱۴۷) عَنْ سَعِيدِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ  
ابْنِ عُمَرَ فِي سَفَرٍ فَتَخَلَّفْتُ عَنْهُ فَقَالَ ابْنُ  
كُنْتُ فَقُلْتُ أَوْ تَرْتُ فَقَالَ أَلَيْسَ لَكَ فِي  
رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ  
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوتِرُ عَلَى رَاحِلَتِهِ.

(رواه الترمذی و قال حدیث حسن صحیح)

رہا ہوں میں نے سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوافل پڑھتے نہیں دیکھا۔  
اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات ہی میں بہتر  
نمونہ ہے۔ (بخاری شریف)

(۱۱۴۶) ایک شخص نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا اے ابو  
عبدالرحمن (ان کی کنیت ہے) قرآن کریم میں ہم کو صلوة الخوف کا بھی ذکر  
ملتا ہے اور اقامت کی حالت کا بھی ذکر ملتا ہے مگر سفر کی نماز کا ذکر نہیں ملتا۔  
انہوں نے فرمایا میرے بھتیجے! اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے زمانہ  
میں بھیجا تھا کہ ہم کچھ بھی نہ جانتے تھے بس جیسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو  
کرتے دیکھا ایسا ہی ہم کر لیتے تھے۔

(امام مالک)

(۱۱۴۷) سعید بن یسار کہتے ہیں کہ میں ایک سفر میں ابن عمرؓ کے ساتھ تھا۔  
ایک جگہ میں ان سے ذرا پیچھے رہ گیا۔ انہوں نے پوچھا کہاں رہ گئے تھے  
میں نے عرض کی پیچھے اتر کر وتر پڑھنے لگا تھا۔ اس پر انہوں نے فرمایا کیا  
تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی میں بہتر نمونہ موجود نہ  
تھا۔ میں نے آپ کو اپنی سواری ہی پر وتر پڑھتے دیکھا ہے۔

(ترمذی شریف)

(۱۱۴۷) \* ان تمام واقعات میں صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف عمل کا ذکر کیا ہے اور ہر عمل کی اتباع کرنے کی دعوت  
اسی بناء پر دی ہے کہ آپ کی ذات بابرکات امت کے لیے ”اسوۂ حسنہ“ تھی۔ اس لیے اگر اس میں کچھ ایام میں روزہ جیسی عبادت کا ترک  
نظر آتا ہے تو پھر وہی سب سے بڑی عبادت ہے اگر کسی نماز کا سواری کے اوپر پڑھنا ثابت ہوتا ہے تو یہی کمال ہے اگر حالت سفر میں پابندی  
کے ساتھ نوافل نظر نہیں آتے تو نوافل کا اسی طرح ادا کرنا ہی افضل ہے حتیٰ کہ اگر حج و عمرہ جیسی قدیم عبادت کا کسی عذر سے نا تمام چھوڑ دینا  
منقول ہے تو کسی تردد کے بغیر یہی مستحسن ہے پس صرف عبادات ہی میں آپ کی ذات اسوۂ حسنہ تھی ترک عبادات میں بھی اسوۂ حسنہ تھی مطلب  
یہ تھا کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ترک عبادت ثابت ہے وہاں عبادت کرنا بعض اوقات معصیت تھا۔ جیسے عیدین کا روزہ۔ صحابی  
یہاں اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیتا ہے اور اس کے لیے سب سے محکم اور آخری دلیل یہی بیان کرتا ہے کہ ان ایام کا روزہ اسوۂ حسنہ میں ہم  
کو نظر نہیں آتا۔ اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درمیان قرآن کریم کے اس عنوان اور خاص آپ صلی اللہ  
علیہ وسلم کے اس لقب کی کتنی اہمیت تھی۔



## آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہر عمل میں

لازم ہے

(۱۱۴۸) عطاء کہتے ہیں میں نے چند اور اشخاص کے ساتھ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ ہم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت تھے ہم نے صرف حج کا احرام باندھا تھا اور اس کے ساتھ عمرہ کا احرام نہ باندھا تھا۔ عطاء ذکر کرتے ہیں کہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا ذی الحجہ کی چار تاریخ ہو چکی تھی۔ چوتھی کی صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ جب ہم حاضر ہوئے تو آپ نے ہم کو حلال ہونے کا حکم دیا اور فرمایا احرام سے نکل جاؤ اور عورتوں کے ساتھ صحبت کرو۔ عطاء کہتے ہیں کہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حکم سے مقصد صرف یہ تھا کہ اب یہ فعل بھی تمہارے لیے حلال ہو گیا ہے کوئی تاکید حکم نہ تھا (حج قریب تھا ادھر آپ حالت احرام میں تھے اس لیے قبل از وقت حلال ہو جانا ہم کو بہت شاق گذرا) آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچ گئی کہ ہم لوگ کہتے ہیں کہ حج میں تو صرف پانچ دن ہی باقی رہ گئے اور اب آپ نے ہم کو حلال ہونے کا حکم دیا ہے اگر ہم اب حلال ہوں اور عورتوں کے ساتھ صحبت کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب پھر دوسرا احرام باندھ کر عرفہ میں اس طرح حاضر ہوں گویا اب صحبت سے فارغ ہو کر آ رہے ہیں۔ عطاء کہتے ہیں کہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس طبعی کراہت کا اپنے ہاتھ سے نقشہ کھینچ کر بھی بتایا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا۔ تم سب جانتے ہو کہ سب میں زیادہ متقی سب سے زیادہ راست گو اور سب سے بڑھ کر نیک عمل کرنے والا میں ہوں۔ اگر میرے ساتھ ہدی کے جانور موجود نہ ہوتے تو جس طرح تم حلال ہوئے ہو میں بھی حلال ہو جاتا کاش اگر مجھ کو آغاز سفر میں اس انجام کی خبر ہوتی تو میں اپنے ساتھ قربانی کے جانور ہی نہ لاتا۔ آپ کا خطبہ سن کر ہم سب نے آپ کے فرمان کے سامنے سر تسلیم جھکا دیا اور سب حلال ہو گئے۔ (بخاری شریف) یہی روایت مختصر صورت سے ترجمان السنہ ج ۲ ص ۳۷۷ میں گزر چکی ہے۔

## الرسول العظیم ووجوب الاتباع

بافعالہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کلہا

(۱۱۴۸) أَخْبَرَنِي عَطَاءُ رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي أَنْاسٍ مَعَهُ قَالَ أَهْلَلْنَا أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْحَجِّ خَالِصًا لَيْسَ مَعَهُ عُمْرَةٌ قَالَ عَطَاءُ رَحْمَةُ اللَّهِ تَعَالَى عَلَيْهِ قَالَ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فَقَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صُبْحَ رَابِعَةٍ مَضَتْ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ فَلَمَّا قَدِمْنَا أَمَرَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَحِلَّ وَقَالَ أَحِلُّوا وَاصْبِرُوا مِنَ النِّسَاءِ قَالَ عَطَاءُ قَالَ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ وَلَمْ يَعْزِمُ عَلَيْهِمْ وَلَكِنْ أَحَلَّهُنَّ لَهُمْ فَلَمَّا قَدِمْنَا أَمَرَنَا أَنْ نَحِلَّ إِلَى نِسَائِنَا فَسَأَلَنِي عُرْفَةُ تَقَطَّرُ مَذَاكِيرَنَا الْمَنَى قَالَ وَيَقُولُ جَابِرٌ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ بِيَدِهِ هَكَذَا وَحَرَكَهَا فَقَامَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُمْ أَنِّي اتَّقَاكُمْ لِلَّهِ وَاصْدَقُكُمْ وَأَبْرَكُكُمْ وَلَوْ لَا هَدَيْتُ لَحَلَلْتُ كَمَا تَحِلُّونَ فَحِلُّوا فَلَوْ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا أَهْدَيْتُ فَحَلَلْنَا وَسَمِعْنَا وَأَطَعْنَا.

(رواہ البخاری ص ۱۰۹۵ وراجع ترجمان

سنۃ ج ۲ ص ۳۷۷ حدیث نمبر ۸۱۲)

(۱۱۴۹) عَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ أَنَّهُ دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أُمِّ الْحَكَمِ يَخْطُبُ قَاعِدًا فَقَالَ انْظُرُوا إِلَى هَذَا الْخَبِيثِ يَخْطُبُ قَاعِدًا وَقَدْ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَ تَرَكَوْكَ قَائِمًا. (رواه مسلم)

(۱۱۵۰) عَنْ عُمَارَةَ بْنِ رُوَيْبَةَ أَنَّهُ رَأَى بِشْرَ بْنَ مَرْوَانَ عَلَى الْمِنْبَرِ رَافِعًا يَدَيْهِ فَقَالَ قَبَّحَ اللَّهُ هَاتَيْنِ الْيَدَيْنِ لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَزِيدُ عَلَى أَنْ يَقُولَ بِيَدِهِ هَكَذَا وَ أَشَارَ بِأَصْبَعِهِ الْمُسَبَّحَةِ.

(رواه مسلم)

(۱۱۵۱) عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا اسْتَوَى رَسُولُ اللَّهِ

(۱۱۴۹) کعب بن عجرہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے تو اس وقت عبدالرحمن بن ام الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا ذرا اس خبیث کو دیکھو تو (کیسا) بیٹھا بیٹھا خطبہ دے رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَ تَرَكَوْكَ قَائِمًا۔

(مسلم شریف)

(۱۱۵۰) عمارہ بن رویبہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے بشر بن مروان کو دیکھا کہ وہ منبر پر خطبہ میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر انہوں نے فرمایا خدا تعالیٰ ان دو ہاتھوں کا ناس کرے۔ کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کی صرف شہادت کی انگلی اٹھاتے تھے اس کو عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا۔ (مسلم شریف)

(۱۱۵۱) جابر سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۱۴۹) \* شیخ جلال الدین نے تفسیر اتقان میں اس پر روایت پیش کی ہے کہ پہلے جمعہ کے دن خطبہ نماز کے بعد ہوا کرتا تھا۔ یہ بات اسی زمانہ کی ہے۔ وہ عسرت اور تنگی کا زمانہ تھا جب لوگ نماز ادا کر لیتے تو اب صرف ایک خطبہ رہ جاتا جس کی حیثیت بھی ابتداءً صرف ایک تقریر و وعظ کی سی سمجھی گئی تھی ایک بار ایسا ہوا کہ باہر سے کوئی قافلہ کھانے پینے کی اشیاء لے کر آیا سامعین فطرۃ ادھر اٹھ کر چل دیے۔ یہ حرکت ناپسند ہوئی اور اس کے بعد ہی خطبہ کو مقدم کر دیا گیا۔ قرآن کریم نہایت مؤثر انداز میں اسی کا شکوہ کر رہا ہے اور لوگوں میں بڑی سے بڑی ضرورت میں بھی آخرت ہی کی طرف متوجہ رہنے کی خو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کعب بن عجرہ جب مسجد میں تشریف لے گئے تو عبدالرحمن کو دیکھا کہ سنت کے خلاف بیٹھے بیٹھے خطبہ دے رہے ہیں آخر ضبط نہ کر سکے اور ان کی اس زشت اعمالی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر حرکت دیکھ کر یہ کلمات کہنے پر بے اختیار مجبور ہو گئے۔

(۱۱۵۰) \* بشر بن مروان حاکم وقت ہے لیکن ایک صحابی سے سنت کے خلاف اس کو دونوں ہاتھ اٹھائے دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا۔ اب یہاں اندازہ فرمائیے کہ مخالفت کتنی سی بات میں تھی اور ان کے غصہ کا عالم کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جن کے سامنے اتباع سنت کی بحث تھی ان کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ اس مسئلہ کی حیثیت فرض کی ہے یا مستحب کی۔ اس اشارہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ کس غرض سے ہوتا تھا۔ کسی نے سمجھا ہے کہ دعاء کے لیے تھا اور کسی کا ذہن اس طرف بھی گیا ہے کہ تفہیم کے لیے تھا۔

(۱۱۵۱) \* واضح رہنا چاہیے کہ اتباع رسول ایمان بالرسول کی روح ہے اس باب کی اہمیت حسب ذیل آیت سے ظاہر ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي

ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم

.....



صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَى الْمَنْبَرِ قَالَ اجْلِسُوا فَسَمِعَ ذَلِكَ ابْنُ مَسْعُودٍ فَجَلَسَ عَلَى بَابِ الْمَسْجِدِ فَرَأَاهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّي اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ تَعَالَى يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ. (رواه مسلم)

(۱۱۵۲) حَدَّثَنَا أَبُو حَازِمٍ أَنَّ رَجُلًا اتَّوَسَّهَلَ

خطبہ کے لیے منبر پر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے تو لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا۔ سب بیٹھ جائیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مسجد کے دروازہ پر سنا اور فوراً وہیں بیٹھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ لیا اور فرمایا عبد اللہ بن مسعود! آگے آ جاؤ۔ (مسلم شریف)

(۱۱۵۲) ابو حازم بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان آپ کے منبر کی

اللہ..... يُحِبُّكُمْ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ. (آل عمران : ۳۱)

تم کو میری پیروی کرنی چاہیے (اگر تم نے ایسا کیا) تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہاری خطائیں بخش دے گا۔

اس بات کو خود قرآن کریم نے قائم کیا ہے اور اپنی محبت کا اسی کو معیار مقرر فرمایا ہے انسان کی یہ بڑی خود سری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی محبت کا تو دم بھرتا ہے مگر کسی دوسرے انسان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے کتراتا ہیں حضرت آدم علیہ السلام کی سرگذشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے سامنے سر جھکانے سے تو شیطان کو بھی انحراف نہ تھا لیکن جب انسان کے سامنے سر جھکانے کا وقت آیا تو حکم ربانی کے باوجود انحراف ہی انحراف تھا یہود و نصاریٰ کا حال بھی یہی تھا وہ بھی نحن ابناء اللہ و احباءہ کی لٹریاں گایا کرتے تھے مگر قرآن کریم نے انگلی رکھ کر بتا دیا کہ میری محبت کا معیار یہ ہیں جو ان کی اتباع نہیں کرتا وہ میری محبت میں جھوٹا ہے پھر عجیب بات ہے کہ آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بجائے اتباع کا لفظ رکھا گیا ہے معلوم ہوا کہ جس طرح آپ کی اتباع کے بغیر اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ غلط ہے اسی طرح آپ کی اتباع کے بغیر آپ کی محبت کا دعویٰ بھی غلط ہے۔ یہ اتباع ”اسوۂ حسنہ“ کے لوازم میں سے ہے۔ جب آپ نمونہ ہیں تو پھر نمونہ کی اتباع کیوں نہ ہو پھر جب نمونہ صاحب نمونہ کی پسندیدگی کا معیار ہے تو جو اس نمونہ کی نقل اتارے وہ اس کی نظر میں پسندیدہ کیوں نہ ہو اس لیے فرمایا کہ آپ ہمارا محبوب نمونہ ہیں اس لیے جو آپ کی اتباع کرے گا وہ بھی ہماری نظر میں محبوب بن جائے گا پھر جتنا وہ ہمارے نمونہ سے ملتا جلتا چلا جائے گا اتنا ہی شان محبوبیت میں بھی اونچا ہوتا چلا جائے گا۔ العیاذ باللہ اگر کہیں رسول معصوم نہ ہوتے تو کیا اسی اطلاق کے ساتھ ان کے اتباع کا حکم دیا جاسکتا تھا۔ حدیث مذکور میں آپ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان اتباع ملاحظہ کی کہ انہوں نے آپ کی زبان سے ”بیٹھ جاؤ“ کا کلمہ جس جگہ سنا بس اسی جگہ بیٹھ گئے اور ایک قدم آگے نہ اٹھا سکے حالانکہ خطاب سامنے کے حاضرین کو تھا نہ ان کو جو ابھی مسجد کے دروازہ میں ہیں اور خطبہ سننے کے لیے آ رہے ہیں مگر یہاں جذبہ اتباع نے میں سیکھ نکلنے کی مہلت نہ دی جہاں آپ کی آواز کان میں پڑی وہیں بیٹھ گئے۔ (مسلم شریف)

(۱۱۵۲) \* حدیث مذکور میں اتباع کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ نماز جیسی چیز کو آج منبر پر صرف اس لیے ادا کیا جا رہا ہے کہ مقتدیوں کا ہر ہر فرد آپ کی نماز کو چشم خود ملاحظہ کر لے اور پھر موہ بہ مواس کی نقل کرنے کی سعی کر لے۔ حالانکہ جو لوگ پنجوقتہ آپ ہی کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے ان کو ایک حد تک آپ کی نماز کا مشاہدہ حاصل ہی تھا مگر نہ معلوم آپ کی اتباع کی نظر ربوبیت میں اہمیت کتنی تھی کہ آپ نے یہ بھی پسند نہ فرمایا کہ صف اول و ثانی کے فرق سے آپ کے ارکان صلوٰۃ کے مشاہدہ میں جو فرق آسکتا ہے وہ بھی باقی رہے اس لیے اس کا یہ اہتمام فرمایا کہ بیک وقت آپ کی نماز کا جتنا حصہ زیادہ سے زیادہ مشاہدہ میں آسکتا ہے وہ بلا واسطہ سب کے ہی لئے.....

بُن سَاعِدِ السَّاعِدِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ وَ  
 قَدْ امْتَرَوْا فِي الْمَنْبَرِ مِمَّ عُوْدُهُ فَسَأَلُوهُ عَنْ  
 ذَلِكَ فَقَالَ وَاللَّهِ إِنِّي لَا عَرَفَ مِمَّا هُوَ وَ  
 لَقَدْ رَأَيْتُهُ أَوَّلَ يَوْمٍ وَضَعَ وَ أَوَّلَ يَوْمٍ جَلَسَ  
 عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
 أَرْسَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى  
 فُلَانَةَ امْرَأَةٍ مِنَ الْأَنْصَارِ قَدْ سَمَّاهَا سَهْلًا  
 مُرِي غُلَامَكَ النَّجَّارَ أَنْ يَعْمَلَ لِيْ أَعْوَادًا  
 أَجْلِسُ عَلَيْهِنَّ إِذَا كَلَّمْتُ النَّاسَ فَأَمَرْتُهُ  
 فَعَمَلَهَا مِنْ طَرَفَاءِ الْغَابَةِ ثُمَّ جَاءَ بِهَا  
 فَأَرْسَلْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
 وَسَلَّمَ فَأَمَرَهَا فَوُضِعَتْ هُنَا ثُمَّ رَأَيْتُ  
 رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى  
 عَلَيْهَا وَ كَبَّرَ وَ هُوَ عَلَيْهَا ثُمَّ نَزَلَ الْقَهْقَرَى  
 فَسَجَدَ فِي أَصْلِ الْمَنْبَرِ ثُمَّ عَادَ فَلَمَّا فَرَغَ  
 أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ  
 إِنَّمَا صَنَعْتُ هَذَا لِتَاْتُمُوا بِي وَ لِتَعْلَمُوا  
 صَلَاتِيْ.

(رواه البخاری فی باب الخطبة علی المنبر)

لکڑی کے متعلق کچھ اختلاف ہوا وہ کس لکڑی کا تھا۔ اس لیے وہ سہل بن  
 ساعد کے پاس آئے اور ان سے اس کی تحقیق کرنی چاہی۔ انہوں نے فرمایا  
 بخدا میں خوب جانتا ہوں منبر کس لکڑی کا تھا۔ میں نے تو اس کو اس دن دیکھا  
 تھا جب کہ وہ پہلے پہل رکھا گیا تھا اور جب کہ آپ اس پر سب سے پہلے  
 رونق افروز ہوئے تھے۔ بات یوں ہوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 ایک انصاری شخص کی بی بی کے پاس یہ کہلا کر بھیجا تھا (جن کا نام بھی سہل نے  
 بیان کیا تھا) کہ اپنے غلام سے جو نجاری کا کام جانتا ہے کہہ دو کہ جب میں  
 لوگوں کے سامنے خطبہ دینا چاہوں تو میرے بیٹھنے کے لیے وہ لکڑیوں کا ایک  
 منبر بنادے۔ انہوں نے اسی وقت اپنے غلام کو حکم دیا۔ اس نے مقام غابہ  
 کے جھاؤ کے درخت کا منبر تیار کر کے حاضر کر دیا۔ ان بی بی صاحبہ نے وہ آپ  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے  
 مطابق وہ وہاں رکھ دیا گیا (یعنی جو منبر کی جگہ تھی) اس کے بعد پھر ایک موقعہ  
 پر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر نماز ادا فرمائی اس  
 طرح پر کہ جب تکبیر کہی تو آپ اس کے اوپر ہی تھے پھر جب سجدہ کا وقت آیا  
 تو پچھلے پیروں اتر گئے اور اتر کر منبر کی جڑ میں سجدہ کیا پھر لوٹ کر منبر پر تشریف  
 لے گئے جب نماز سے فارغ ہو گئے تو لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ لوگو!  
 دیکھو (آج) میں نے اس طرح نماز اتر کر اور چڑھ کر اس لیے ادا کی ہے  
 تاکہ تم سب کے سب دیکھ کر میری نماز سیکھ سکو اور دیکھ کر میری اقتدا کر سکو۔

(بخاری شریف)

للہ ..... مشاہدہ میں آجائے۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر آپ کے اس ارشاد سے کہ آج میں نے منبر پر نماز اس لیے ادا کی ہے ثابت ہوتا ہے  
 کہ آپ کا آج کا عمل نماز کی مستقل سنت نہ تھا۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل قابل اتباع تھا حتیٰ کہ اگر  
 کہیں آپ یہ تنبیہ نہ فرمادیتے تو اس طرح نماز ادا کرنے کو بھی ایک سنت سمجھا جاسکتا تھا۔ تعجب ہے کہ اپنے جس عمل کی وجہ آپ نے خود بیان  
 فرمادی ہو اس پر آئندہ بحثوں کی ضرورت ہی کیا تھی یہ عمل قلیل تھا یا فعل کثیر مگر بہر حال نہ آپ کے سوا کوئی ایسا ہے جس کی ایک ایک امت  
 کے سامنے آنے کی ضرورت ہو اور اس لیے نہ آئندہ کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ منبر پر اس طرح نماز ادا کر سکے اس لیے اس عمل کو عہد رسالت  
 پر ہی ختم کر دینا چاہیے۔



الرسول العظيم و اباءه على من تنزه  
عن الاتباع بافعاله باي تأويل كان

(۱۱۵۳) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ  
جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا أُخْبِرُوا بِهَا كَانَهُمْ  
تَقَالُوهَا فَقَالُوا أَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ غَفَرَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَ  
مَا تَأَخَّرَ فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَمَا أَنَا فَاصْلَى اللَّيْلِ  
أَبَدًا وَقَالَ الْآخَرُ أَنَا أَصُومُ النَّهَارَ أَبَدًا وَلَا  
أُفْطِرُ وَقَالَ الْآخَرُ أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا  
أَتَزَوَّجُ أَبَدًا فَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ أَنْتُمْ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَ  
كَذَا أَمَا وَاللَّهِ إِنِّي أَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَاتَّقَاكُمْ لَهُ  
لَكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ وَ  
أَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ  
مَنِّي. (متفق عليه)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل میں اتباع کرنے میں پس  
وپیش کرنا آپ کے غصہ کا موجب ہے

(۱۱۵۳) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ تین شخص آئیں آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج طہبات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا  
حال دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ جب ان سے اس کی تفصیل  
بیان کی گئی تو ایسا انداز ہوا گویا وہ اپنے حق میں اس کو کم سمجھے۔ انہوں نے کہا  
بھلا ہمارا حال خستہ کہاں اور آپ کی شان رفیع کہاں آپ کے تو گزشتہ اور  
آئندہ سب معاملات کی مغفرت ہو چکی ہے۔ اس لیے ان میں ایک بولا میں  
تو ہمیشہ تمام شب نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھا  
کروں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے  
الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ اسی اثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ  
وسلم بھی تشریف لے آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا تم ہی وہ لوگ  
ہو جنہوں نے ایسی باتیں کہی ہیں۔ سن لو! تم سب میں اللہ تعالیٰ سے  
زیادہ ڈرنے والا میں ہوں اور تم سب سے بڑھ کر متقی میں ہوں۔ میں تو  
روزہ بھی رکھوں گا اور افطار بھی کروں گا، شب میں نماز بھی پڑھوں گا اور  
سوؤں گا بھی اور عورتوں سے نکاح بھی کروں گا۔ اب جو شخص میرے طریقہ  
سے اعراض کرے گا جو مجھ سے نہ ہوگا۔ (متفق علیہ)

(۱۱۵۳) \* مذکورہ بالا حدیث پر غور فرمائیے کہ صحابہ کرام نے یہ کلمات فرمائے کیوں؟ صرف آپ کی شان کی برتری اور اپنے احساس کمتری  
کی بناء پر۔ مگر اس پر بھی ان کو تنبیہ کی گئی۔ بات یہ تھی کہ جس طرح جذبات کے دباؤ میں انسان کو بعض اہم گوشوں سے ذہول ہو جایا کرتا ہے اسی  
طرح ان کو بھی یہاں ذرا سا ذہول ہو گیا اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی تعلیم امت ہے۔ اس لیے جب تک وہ خود تصریح نہ فرما  
دیں ان کے کسی عمل کو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص سمجھ لینا خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت تاویل کے ساتھ کیوں نہ ہو مستحسن نہیں ہے۔ نبی کا حق یہ  
ہے کہ اس کی اتباع کی جائے اور اتباع کی حقیقت قدم بہ قدم چلنا ہے یہاں جس طرح ایک قدم اگر پیچھے رہ گیا تو اتباع نہیں رہی اسی طرح اگر  
ایک قدم آگے پڑ گیا تو بھی اتباع نہ رہی اس لیے صرف کثرت عبادت کچھ کمال نہیں نبی وقت میں دو صفتیں اپنی تمام امت سے کامل ہوتی ہیں  
علم باللہ اور تقویٰ۔ پھر ان صفات میں ان کا رتبہ خود قیاس کر لو جن کا دامن قیامت کے انسانوں تک پھیلا ہوا ہے پھر ان کے کسی عمل کو بھی اپنے  
لیے باعث کمال نہ سمجھنا سب بڑا نقص ہوگا۔ عملی کوتاہی کے صرف دو سبب ہوتے ہیں یا علمی نقصان یہ جذبہ عمل کا فقدان۔ جہاں یہ دونوں سبب  
موجود ہوں وہاں کسی عمل کے متعلق بھی یہ تصور کرنا کہ وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کے حق میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ نہ ہوگا یہی بڑی کوتاہی ہے۔

(۱۱۵۴) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ صَنَعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا تَرَحَّصَ فِيهِ فَتَنَزَّهُ عَنْهُ قَوْمٌ فَلَبِغَهُ ذَلِكَ فَخَطَبَهُ فَحَمِدَ اللَّهَ وَاتَّنى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُونَ عَنِ الشَّيْءِ أَصْنَعَهُ فَوَ اللَّهُ إِنِّي لَا أَعْلَمُهُمْ بِاللَّهِ وَ أَشَدُّهُمْ لَهُ خَشْيَةً.

(اخرجه الشيخان)

(۱۱۵۵) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ وَقَفَ عَلَى الْبَابِ وَ أَنَا أَسْمَعُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أَصْبِحُ جُنُبًا وَ أَنَا أُرِيدُ الصِّيَامَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ أَنَا أَصْبِحُ جُنُبًا وَ أَنَا أُرِيدُ الصِّيَامَ فَاغْتَسِلْ وَ أَصُومُ فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّكَ لَسْتَ مِثْلَنَا قَدْ غَفَرَ اللَّهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ فَعَضَبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ وَ اللَّهُ إِنِّي لَا رَجُوانَ أَكُونُ أَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَ أَعْلَمُكُمْ بِمَا اتَّقَى. (رواه مالك)

(۱۱۵۴) حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) کوئی ایسا کام کیا جس میں آپ نے رخصت پر عمل فرمایا (یعنی دین کا وہ پہلو جو دوسرے پہلو کی نسبت آسان ہو) بعض لوگوں نے اس کی اتباع کرنے سے کنارہ کشی کی یہ بات آپ کو بھی پہنچ گئی اس پر آپ نے تقریر فرمائی اور خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی بات کرنے سے بھی احتراز کرتے ہیں جو خود میں کرتا ہوں۔ خدا کی قسم ان سب میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں اور ان سب سے زیادہ ڈرنے والا میں ہوں۔ (شیخین)

(۱۱۵۵) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہوئے تھے اس وقت ایک شخص نے آپ سے یہ مسئلہ پوچھا اور میں سن رہی تھی یا رسول اللہ اگر صبح کو میں ناپاک اٹھوں اور میرا ارادہ روزہ رکھنے کا ہو تو کیا میں جنابت کی حالت میں روزہ کی نیت کر سکتا ہوں آپ نے جواب دیا اگر صبح کو میں جنابت کی حالت میں ہوتا ہوں اور میرا ارادہ روزہ رکھنے کا ہوتا ہے تو میں پہلے غسل کرتا ہوں پھر اس کے بعد روزہ کی نیت کر لیتا ہوں اور بس۔ اس پر وہ شخص بولا۔ بھلا آپ کی شانِ عالی کہاں آپ کے تو اگلے پچھلے سب معاملات بخشنے جا چکے ہیں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگواری ہوئی اور آپ نے فرمایا خدا کی قسم مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ تقویٰ کی راہ کا علم رکھنے والا ہوں گا۔ (مالک)

(۱۱۵۶) عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَجُلًا قَبَّلَ

(۱۱۵۶) \* اس روایت کے مختلف سیاق میں آپ کی زبان مبارک سے ”انا اعلمکم“ کا لفظ نکلا ہے۔ مگر جب یہی لفظ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلا تھا تو گرفت میں آ گیا تھا اس لیے سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ کسی معمولی فرد و گذاشت پر گرفت کا معاملہ مالک کی مرضی پر دائر ہوتا ہے اگر وہ چاہے تو درگزر فرمادے اگر چاہے تو اس پر گرفت فرمائے۔ مگر یہاں کچھ اور فرق بھی ہے ایک تو یہ کہ ان تمام مقامات پر آپ نے اپنے نفس کو مطلقاً علم نہیں فرمایا بلکہ کہیں ”اعلم باللہ“ کہیں ”اعلم بحدودہ“ اور کہیں ”اعلم بما اتقى“ لہذا.....



امْرَأَتَهُ وَهُوَ صَائِمٌ فِي رَمَضَانَ فَوَجَدَ مِنْ ذَلِكَ وَجَدًا شَدِيدًا فَأَرْسَلَ امْرَأَتَهُ تَسْئِلُ لَهُ عَنْ ذَلِكَ فَذُخِلَتْ عَلَى أُمِّ سَلَمَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَتْ ذَلِكَ لَهَا فَأَخْبَرَتْهَا أُمُّ سَلَمَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْبَلُ وَهُوَ صَائِمٌ فَرَجَعَتْ إِلَى زَوْجِهَا فَأَخْبَرَتْهُ فَزَادَهُ ذَلِكَ شَرًّا وَقَالَ لَسْنَا مِثْلَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُ يَحِلُّ لِرَسُولِهِ مَا يَشَاءُ ثُمَّ رَجَعَتْ امْرَأَتُهُ إِلَى أُمِّ سَلَمَةَ فَوَجَدَتْ عِنْدَهَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ مَا لِهَذِهِ الْمَرْأَةِ فَأَخْبَرَتْهُ أُمُّ سَلَمَةَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ إِلَّا أَخْبَرْتِيهَا أَنِّي أَفَعَلُ ذَلِكَ

میں اپنی بی بی کا بوسہ لے لیا پھر اس حرکت پر اس کو سخت غم ہوا۔ اس نے مسئلہ دریافت کرنے کے لیے اپنی بی بی کو بھیجا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سب واقعہ ان سے ذکر کیا انہوں نے فرمایا کہ روزہ کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کر لیتے تھے۔ انہوں نے لوٹ کر یہ جواب اپنے شوہر کو سنا دیا۔ اس پر ان کا غم اور دونا ہو گیا وہ بولے ہم بھلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کہاں ہیں (کہ آپ کی نقل کر سکیں) اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے حق میں جو چاہے حلال فرما دے سکتا ہے۔ ان کی بی بی پھر ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اس مرتبہ وہ آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں رونق افروز تھے۔ آپ نے پوچھا یہ عورت کیسے آئی ہیں؟ حضرت ام سلمہؓ نے ان کا واقعہ بیان کیا آپ نے فرمایا تم نے اس سے کہہ دیا ہوتا کہ میں بھی ایسا کر لیتا ہوں۔ انہوں نے عرض کی۔ میں نے کہہ تو دیا تھا مگر جب انہوں نے اپنے شوہر کو جا کر اس کی اطلاع دی تو ان کو اور زیادہ غم

لے..... کے الفاظ فرمائے ہیں۔ یہ تمام الفاظ مقید تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جو کلمات نکلے اگرچہ بے شبہ مقصد ان کا بھی یہی تھا مگر ان کے لفظوں میں پھر اطلاق تھا دوم یہ کہ آپ کے ان الفاظ کا اصل مقصد اپنا اظہار علم نہ تھا بلکہ ہر امر میں اپنی اتباع کی تاکید فرمانا تھی۔ ہاں اس کی دلیل میں آپ نے اپنی اعلیٰ ضرورت بیان فرمائی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہی یہ کیا گیا تھا ”ای الناس اعلم“ یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ علم کس کو ہے اس پر موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا ”انا اعلم“ میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ صحیح بخاری میں ہے ”فَعَتَبَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهِ اِذْ لَمْ يَرِدْ الْعِلْمُ اِلَيْهِ فَاَوْحَى اللَّهُ اِلَيْهِ اَنْ عَبْدًا مِنْ عِبَادِي بِجَمْعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ اَعْلَمُ مِنْكَ“ یعنی اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو عتاب ہوا کہ انہوں نے اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالہ کیوں نہیں کیا اور ان پر یہ وحی آئی کہ مجمع بحرین میں ہمارے بندوں میں ایک بندہ ایسا ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ علم کی صفت اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ میں سے ایک بڑی صفت ہے اس میں کسی درجہ کی بھی کسی کو شرکت حاصل نہیں ہو سکتی ہاں صرف اتنی جتنی کہ خود مشیت الہیہ کسی کے حق میں مقدر فرما دے۔ اس لیے یہاں لفظی اطلاقات اور غیر ارادی عموم پر بھی گرفت کر لی جاتی ہے مگر یہ گرفت ہوتی ہے ان ہی کے ساتھ جن کی شان سے اتنی سی فروگزاشت بھی بعید سمجھی جائے۔ بہر حال ان دو مقامات میں جس طرح خود نفس کلمات میں بھی اطلاق و تنقید کا فرق ہے اسی طرح سیاق و سباق کے لحاظ سے مقاصد میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔

ہم نے یہاں ان سب واقعات کو وقت کی فرصت کے لحاظ سے ایک جگہ جمع کر دیا ہیں جہاں صحابہ کرام کی جانب سے آپ کے کسی عمل میں اتباع کرنے سے ذرا سا بھی پس و پیش ہوا ہے اور آپ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے۔ ان تمام واقعات کو بیک نظر پیش لے.....

ہوا اور انہوں نے یہ کہا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کہاں ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے حق میں جو چاہے حلال فرما دے سکتا ہے۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگواری ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخدا میں تم سب سے زیادہ اللہ کا تقویٰ رکھتا ہوں اور اس کے حلال و حرام کی حدود کا سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ (مالک)

(۱۱۵۷) جابر بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سال جس میں کہ مکہ مکرمہ فتح ہوا رمضان المبارک میں سفر کے لیے نکلے اور آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں نے بھی روزہ رکھا لیا۔ جب مقام ”کراغ الغمیم“ پر پہنچے تو آپ نے ایک پیالہ میں پانی منگایا اور اپنے ہاتھ میں اس کو اتنا اونچا اٹھایا کہ سب لوگوں نے دیکھ لیا، اس کے بعد (افطار کرنے کی غرض سے) اس کو پی لیا، اس کے بعد آپ کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ بعض لوگ تو اب بھی روزہ دار ہیں اس پر آپ نے فرمایا یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں، یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔ (مسلم شریف)

فَقَالَتْ قَدْ أَخْبَرْتُهَا فَذَهَبَتْ إِلَى زَوْجِهَا فَأَخْبَرَتْهُ فَزَادَهُ ذَلِكَ شَرًّا وَقَالَ لَسْنَا مِثْلَ رَسُولِ اللَّهِ يُحِلُّ اللَّهُ لِرَسُولِهِ مَا شَاءَ فَغَضِبَ رَسُولُ اللَّهِ وَقَالَ وَاللَّهِ إِنِّي لَأَتَقَاكُمْ لِلَّهِ وَاعْلَمُكُمْ بِحُدُودِهِ. (رواہ مالک)

(۱۱۵۷) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ إِلَى مَكَّةَ فِي رَمَضَانَ فَصَامَ حَتَّى بَلَغَ كُرَاعَ الْغَمِيمِ فَصَامَ النَّاسُ ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ فَرَفَعَهُ حَتَّى نَظَرَ النَّاسُ إِلَيْهِ ثُمَّ شَرِبَ فَقِيلَ لَهُ بَعْدَ ذَلِكَ إِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ فَقَالَ أُولَئِكَ الْعَصَاةُ أُولَئِكَ الْعَصَاةُ.

(رواہ مسلم)

للہ ..... نظر رکھیے اور پھر یہ فیصلہ فرمائیے کہ جہاں والعیاذ باللہ کسی ادنیٰ سی معصیت کا بھی امکان ہو ان کی زبان مبارک سے کیا انداز خطاب یہی ہونا چاہیے۔ پھر کسی ایک مقام پر بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک اس احتراز و تنزیہ کا سبب آپ کے عمل میں اس قسم کے امکان کا کوئی احتمال تھا حاشا و کلا اس روایت میں صاف تصریح موجود ہے۔ ”اللہ یحل لرسول ما یشاء“ یعنی آپ کا عمل اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خاص آپ کے حق میں حلال ہو۔ اس کے علاوہ ان کے دماغوں میں کوئی دوسرا تصور نہ تھا جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اور ان کے صحابہ کی جانب سے یہ احتمال نہیں نکالا گیا تو کیا یہ اس کا ثبوت نہیں ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ان کا محل ہی نہیں ہوتی۔

(۱۱۵۷) \* اب غور فرمائیے کہ یہاں معاملہ ایک عبادت یعنی روزہ کا تھا اور روزہ بھی رمضان کا، پھر اگر لوگوں نے اس کو نہ توڑا تو کیا وہ شاد باش کے مستحق نہ تھے مگر چونکہ آپ کے اس علی الاعلان عمل کے بعد بھی روزہ نہ توڑنا یہ آپ کی اتباع میں کوتاہی تھی اس لیے اب وہی اہم عبادت معصیت بن گئی معلوم ہوا کہ رسول کی ہستی وہ ہے کہ اگر وہ عبادت کرے تو جس طرح عبادت میں اس کی اتباع کرنا عبادت ہے اسی طرح اگر وہ عبادت شروع کرے توڑ دے تو پھر اس کا توڑ دینا یہی عبادت ہے۔ گویا عبادت کی حقیقت کیا ہے؟ اتباع رسول اور معصیت کی حقیقت کیا ہے؟ رسول کی نافرمانی۔ اسی لیے قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کی اطاعت پر جتنا زور دیا ہے ان کی معصیت سے ممانعت پر بھی اتنا ہی زور دیا ہے۔ گویا جس طرح اطاعت ایزدی اور رسول کے کسی فعل میں بھی معصیت ہونے کا احتمال ہو والعیاذ باللہ تو ان کی ہر خلاف ورزی کو معصیت کیسے کہا جاسکتا ہے اور ان کی نافرمانی سے علی الاطلاق ممانعت کیسے درست ہے۔ للہ .....



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات پر خاموشی بھی شریعت میں اس کے جواز کی قطعی دلیل ہے

(۱۱۵۸) ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ام حفیدہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھوڑا سا گھی، کچھ پنیر اور چند گوہ (ایک جانور ہوتا ہے) بطور ہدیہ پیش کیں آپ نے ان کو منگوا لیا اور آپ کے دسترخوان پر دوسرے لوگوں نے ان کو کھایا لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرح نفرت سے چھوڑ دیا جیسے گھن کی چیز چھوڑی جاتی ہے اور ان کے کھانے کے لیے بھی کسی کو نہ فرمایا۔ اگر گوہ حرام ہوتی تو آپ کے دسترخوان پر لوگوں کے کھانے میں نہ آ سکتی۔ (بخاری شریف)

(۱۱۵۹) جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم عزل کیا کرتے تھے اور اس وقت قرآن

الرسول العظیم و کون تقریرہ صلی اللہ علیہ وسلم حجة قاطعة فی الدین

(۱۱۵۸) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ أُمَّ حَفِيدَةَ بِنْتَ الْحَارِثِ بْنِ حَرْبٍ أَهْدَتْ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمْنًا وَاقِطًا وَاضْبًا فَدَعَا بِهِنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَكَلْنَ عَلَى مَائِدَتِهِ فَتَرَكَهُنَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَالْمُتَقَدِّرِ لَهُ وَلَوْ كُنَّ حَرَامًا مَا أَكَلْنَ عَلَى مَائِدَتِهِ وَلَا أَمَرَ بِأَكْلِهِنَّ. (رواه البخاری)

(۱۱۵۹) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ

اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اس کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر نکل گیا تو وہ آگ کے عذاب میں ڈالا جائے گا اور ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔

اس دن وہ (حسرت و ندامت سے) تمنا کریں گے کہ کاش زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اس دن یہ اللہ تعالیٰ سے اپنی کوئی بات بھی چھپا نہیں سکیں گے۔

اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں جا پڑا۔

لَهُ ..... وَمَنْ يُعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ. (النساء: ۱۴)

يَوْمَئِذٍ يَوْمَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوْا الرُّسُولَ لَوُ تَسْوَى بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا. (النساء: ۴۲)

وَمَنْ يُعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا. (الاحزاب: ۳۶)

(۱۱۵۸) \* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امر و نہی کا رتبہ تو بہت بلند ہے۔ جو چیز آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے اور اس پر آپ سکوت فرمائیں تو آپ کا یہ سکوت بھی جواز کی قطعی حجت سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ آپ کے سامنے کوئی ناجائز فعل ہو اور آپ اس پر سکوت اختیار فرمائیں۔ اب اندازہ فرمائیے کہ دین کے باب میں کسی ناجائز بات پر جہاں سکوت کا امکان بھی نہ ہو وہاں خود کسی معصیت کے ارتکاب کرنے کا بھلا کیا امکان ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی سرگزشت کا ایک اہم سبق یہی ہے۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

(۱۱۵۹) \* صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اس استدلال کا حاصل یہی ہے کہ اگر یہ بات نادرست ہوتی تو اس کے علم میں آ جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کیسے سکوت فرما سکتے تھے پس جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق دین کے باب میں حجت تھا اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت بھی حجت تھا بلکہ اس سے زیادہ سکوت و نطق کی ایک ایک ادا بھی دین میں حجت سمجھی جاتی تھی۔

كُنَّا نَعَزِلُ وَ الْقُرْآنُ يَنْزِلُ (متفق علیہ) و زاد مسلم فَبَلَغَ ذَلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَنْهَنَا.

(۱۱۶۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ أَبُو بَكْرٍ وَ عِنْدِي جَارِيتَانِ مِنْ جَوَارِي الْأَنْصَارِ تَغْنِيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتِ الْأَنْصَارُ يَوْمَ بُعَاثٍ قَالَتْ وَ لَيْسَتَا بِمُغْنِيَتَيْنِ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ أِبْمَزَامِيرِ الشَّيْطَانِ فِي بَيْتِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ ذَلِكَ فِي يَوْمٍ عِيدٍ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا أَبَا بَكْرٍ إِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيدًا وَ هَذَا عِيدُنَا. رواه البخاری و فی رواية عنده فَاَضْطَجَعَ (رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) عَلَى الْفِرَاشِ وَ حَوْلَ وَجْهَهُ وَ فی رواية عنده وَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهِ فَانْتَهَرَ هُمَا أَبُو بَكْرٍ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَجْهِهِ فَقَالَ دَعُهُمَا يَا أَبَا بَكْرٍ.

نازل ہو رہا تھا (متفق علیہ) مسلم کی روایت میں یہ بات اور زیادہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے اس عمل کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اس کو منع نہیں فرمایا۔ (عزل کا مطلب یہ ہے کہ انزال کے وقت عضو باہر کر لیا جائے تاکہ عورت حاملہ نہ ہو) (۱۱۶۰) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ والد بزرگوار ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور اس وقت میرے گھر میں قبیلہ انصار کی دولڑکیاں وہ اشعار پڑھ رہی تھیں جو انصار نے جنگ بعاث کے موقع پر حسب دستور فخریہ طور پر کہے تھے۔ یہ لڑکیاں ڈونیاں نہ تھیں (یعنی پیشہ ورگانے والی نہ تھیں) صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ازراہ سرزنش فرمایا یہ شیطانی آوازیں اور پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں۔ یہ قصہ عید کے دن کا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوبکر! ہر قوم عید مناتی ہے اور یہ ہمارے عید منانے کا دن ہے (بخاری شریف) دوسری روایت میں یہ اضافہ اور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر اس طرف سے اپنا چہرہ مبارک پھیر لیا تھا۔ ایک روایت میں اس طرح سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کپڑے سے اپنا چہرہ مبارک ڈھانکے ہوئے تھے۔ ان لڑکیوں کو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جھڑکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رخ انور سے کپڑا اتار کر فرمایا۔ ابوبکر! رہنے دو! (یہ عید کا دن ہے)

(۱۱۶۰) \* روایت مذکورہ میں دولڑکیوں کے اشعار پڑھنے کا تذکرہ ضرور ہے مگر وہ لڑکیاں جو نہ گانے سے واقف تھیں اور نہ یہ پیشہ کرتی تھیں اشعار بھی وہ جو جنگی ترانہ کے تھے اور دن بھی عید کا دن جس میں خوشی منانا عام عادت تھی ادھر زمانہ وہ تھا جو تقدس و پاکیزگی کا سب سے زریں دور تھا اتنی قیود کے بعد بھی ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظروں میں اس کی حقیقت کیا تھی۔ یہ کہ وہ مزامیر شیطان ہے اور یہ کہ آپؐ کے گھر میں وہ اور زیادہ مکروہ ہے۔ یہ فہم ابوبکرؓ میں کہاں سے پیدا ہوئی تھی اس کا خود اندازہ فرمالیجئے۔ ابوبکرؓ نے ان کو جھڑکا اور ان کو جھڑکنا لائق تر تھا مگر کیا ابوبکرؓ کے فرمان یا ممانعت کرنے سے شریعت بن سکتی تھی لہذا اگر بطور (مسئلہ نہ سہی تو بطور مصلحت سہی جو کچھ انہوں نے کیا وہ مناسب کیا مگر یہاں صورت حال کیا ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ضرور ہیں مگر اس جانب سے اپنا رخ بدلے ہوئے ہیں کپڑا منہ پر ڈھکا ہوا ہے۔ یوں معلوم ہو رہا ہے کہ گویا عالم خواب میں ہیں یا بیدار ہیں تو اس طرف ذرہ برابر کوئی التفات نہیں ہے اب اگر آپؐ منہ کھول لیتے تو ایک حد تک اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی شرکت ثابت ہوتی اور اگر صریح منع فرما دیتے تو چند گھر کی بچیوں کا خوشی اور عید کے مواقع میں جنگی اشعار پڑھنا بھی حرام کی فہرست میں آ جاتا۔ اس لیے منہ بھی نہیں کھولتے اور زبان بھی بند رکھتے لہذا.....



(۱۱۶۱) عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَى بِشَرَابٍ فَشَرِبَ وَ عَنْ يَمِينِهِ غُلَامٌ وَ عَنْ يَسَارِهِ الْأَشْيَاحُ فَقَالَ لِلْغُلَامِ إِنْ أَذِنْتُ لِيْ أَعْطَيْتُ هَؤُلَاءِ فَقَالَ مَا كُنْتُ لِأَوْثَرِ بَنَصِيْبِيْ مِنْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَحَدًا فَتَلَّهُ فِي يَدِهِ.

(رواه البخاری)

الرُّسُولُ إِنْ لَمْ يَكُنْ مَعْصُومًا فَكَيْفَ  
يَا مِنْهُ اللَّهُ عَلَى أَهْلِ الْأَرْضِ

(۱۱۶۲) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ حُنَيْنٍ أَثَرُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ

(۱۱۶۱) سہل ابن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پانی پیش کیا گیا آپ نے اس کو پیا اس وقت آپ کے دائیں جانب ایک نوجوان اور بائیں جانب معمر اور سن رسیدہ اصحاب موجود تھے آپ نے اس نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا - اجازت دو تو میں بقیہ پانی ان لوگوں کو دے دوں - وہ بولے یا رسول اللہ آپ کے جھوٹے پانی میں قدرت نے جو میرا حصہ لگا دیا ہے میں کسی کے لیے بھی اس میں سخاوت نہیں کر سکتا - اس پر آپ نے ناگواری سے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دے کر پانی ان کے ہاتھ پر رکھ دیا - (بخاری)

رسول اگر معلوم نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ تمام روئے زمین کے حق میں ان پر کیسے اعتماد کر سکتا ہے

(۱۱۶۲) عبد اللہ سے روایت ہے کہ جنگ حنین کے موقع پر جب مال تقسیم کرنے کی نوبت آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اقرع بن حابس

للہ..... ہیں - یہ شان شارع کی ہے جن کے نطق و سکوت تو کیا ذرا سی شرکت اور ادنیٰ سے اغماض سے بھی مسائل بن جاتے تھے -

اب آپ رسول کی عصمت اور اس کی عظمت شان کا اندازہ فرمائیے اگر ان میں معصیت کا ادنیٰ سا بھی شبہ موجود ہو تو کیا ان کے طبعی رجحانات اور صرف سکوت و اغماض شریعت بن سکتے ہیں -

(۱۱۶۱) \* جذبات وہ بھی نوعمری کے ایک متحمل سے متحمل انسان کو بھی بے قابو بنا دیتے ہیں یہاں قسمت سے اس نوجوان کو ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا کہ جس پانی سے خاتم الانبیاء علیہم السلام کا دہن مبارک لگ چکا تھا ضابطہ میں وہ ان کا حق تھا اگر یہاں اس کے جذبات مچل گئے تو کسی حد تک قابل معذوری ہے مگر جن کی شان اخلاقیات میں سب سے اونچی بنائی گئی تھی وہ چاہتے تھے کہ ان کے رفقاء و اصحاب بھی ان ہی اخلاق سے رنگین ہو جائیں لیکن اس طرح کہ کسی کی حق تلفی بھی نہ ہو اور ایثار کی عالی خصلت کی ترغیب بھی ہو جائے - اگر آپ یہ پانی عمر کی رعایت سے معمر لوگوں کو عطاء فرما دیتے تو دائیں جانب بیٹھنے والے نوعمروں کا آئین میں کوئی حق ہی نہ رہتا اور اگر اظہار ناگواری کیے بغیر پانی حوالہ فرما دیتے تو اس موقع پر ایثار کا کوئی سبق نہ ملتا - اس لیے پانی دیا تو مگر ذرا سی ناگواری کے ساتھ کہ اس قسم کے مقامات پر جو تقاضا اخلاق کا ہو سکتا تھا اس کا سبق مل جائے - آپ کی یہ دونوں ادائیں دو حکم شرعی کی علیحدہ علیحدہ بنیادیں بن گئیں - پس نبی کا صرف قول و فعل ہی نہیں بلکہ اس کا نطق و سکوت بھی بلکہ اس کے نطق و سکوت کی ادائیں بھی ایک حکم شرعی بن جاتی ہیں - اگر العیاذ باللہ ان کے قول و فعل میں معصیت کا کوئی ادنیٰ سا احتمال بھی ہو تو کیا ان کو یہی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے - منطقیوں کی اور باتیں جیسی بھی ہوں مگر ان کی ایک یہ بات ہم کو بھی یہاں پسند ہے - اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال - پس اگر ان کے افعال میں کوئی دوسرا احتمال ہو سکتا ہے تو پھر ان کے قول و فعل کو بھی حجت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا -

(۱۱۶۲) \* روایت مذکور کے سب الفاظ کو سامنے رکھ لیجئے آپ کو واضح ہو جائے گا رسولوں کی شان کیا ہونی چاہیے - یہاں جس للہ.....

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْقِسْمَةِ أُعْطِيَ الْأَفْرَعُ بْنُ حَابِسٍ مِائَةً مِنَ الْأَبْلِ وَ أُعْطِيَ عُيَيْنَةً مِثْلَ ذَلِكَ وَ أُعْطِيَ أَنْاسًا مِنْ أَشْرَافِ الْعَرَبِ وَ أَثَرَهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْقِسْمَةِ قَالَ رَجُلٌ وَ اللَّهُ إِنَّ هَذِهِ لِقِسْمَةٌ مَا عُدِلَ فِيهَا أَوْ مَا أُرِيدَ فِيهَا وَجْهَ اللَّهِ فَقُلْتُ وَ اللَّهُ لَا خَيْرَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاتَيْتُهُ فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ فَمَنْ يَعْدِلُ إِذَا لَمْ يَعْدِلِ اللَّهُ وَ رَسُولُهُ رَحِمَ اللَّهُ مُوسَى قَدْ أُؤْذِيَ بِأَكْثَرِ مِنْ هَذَا فَصَبِرَ . رواه البخاری فی الجہاد و فی کتاب الادب و یلک من یعدل اذا لم اعدل و فی المغازی و یلک او لست احق اهل الارض ان یتقی اللہ و فی باب علامات النبوة قد خبت و خسرت ان لم اکن اعدل و فی کتاب الانبیاء ص ۴۷۲ فقال من یطیع اللہ اذا عصیت آیا مننی اللہ علی اهل الارض و لا تأمنونی .

(ایک شخص کا نام) کو سواونٹ دے دیئے اور اتنے ہی اونٹ عیینہ کو (ایک شخص کا نام ہے) اور اسی طرح عرب کے اور چند بڑے بڑے لوگوں کو عطا فرمائے اور اس دن مال کی تقسیم میں دوسرے لوگوں پر ان کو ترجیح دی۔ اس پر ایک شخص بولا خدا کی قسم اس تقسیم میں تو انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ یا یہ کہا کہ یہ تقسیم خلوص کے ساتھ نہیں کی گئی۔ میں نے کہا اچھا خدا کی قسم میں ضرور اس بات کی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوں گا۔ میں حاضر ہوا اور اس واقعہ کی آپ کو خبر دی آپ نے فرمایا ارے اگر اللہ اور اس کا رسول بھی انصاف نہ کرے گا تو بتاؤ پھر اور کون انصاف کرے گا۔ خدا تعالیٰ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر رحم فرمائے ان کو اس سے بھی زیادہ تکلیفیں دی گئیں مگر انہوں نے صبر ہی کیا۔ بخاری شریف میں دوسری جگہ یہ لفظ ہے ”تیرا ناس ہو اگر میں انصاف نہ کروں تو اور کون کرے گا۔“ کتاب المغازی کے لفظ یہ ہیں۔ ”کیا روئے زمین میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خوف کرنے کا میں حق دار نہیں۔“ علامات نبوت میں یہ لفظ ہیں ”اگر میں نے انصاف نہ کیا تو میں تو بڑے ٹوٹے میں رہا اور بہت ناکام رہا۔“ کتاب الانبیاء کے الفاظ یہ ہیں ”اگر میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں تو پھر اور کون ہے جو اس کی حکم برداری کرے گا۔ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ تم تو مجھے قابل اعتماد نہ سمجھو اور اللہ تعالیٰ ساری روئے زمین کے حق میں مجھ پر اعتماد کر لے۔ (بخاری شریف)

..... اللہ شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بدگمانی کا کلمہ منہ سے نکالا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں ”ویل“ (ہلاکت) کا لفظ فرمایا ہے کیونکہ یہ شخص تو ہین نہ تھی بلکہ منصب رسالت کی تو ہین تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس طرح غیر معقول بھی قرار دیا کہ جس کو بندے قابل اعتماد نہ سمجھیں کیا حق تعالیٰ اپنی ساری مخلوق کے حق میں اس کو قابل اعتماد سمجھے گا۔ پھر جب رسول مال کی تقسیم میں قابل اعتماد ہوتا ہے تو اپنے اور افعال میں بھی قابل اعتماد کیوں نہیں ہوتا۔ ہم کو روایات سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل پر معصیت کا گمان کیا ہو اور جب کسی ناشائستہ شخص کی زبان سے ایسا کلمہ نکلا ہے تو یاد نہیں آتا کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اظہارِ ناگواری نہ فرمایا ہو۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنے کسی خاص عمل پر معصیت کا لفظ طلاق نہیں کیا گیا تو محض عقلی طرز فکر سے کسی کا اس پر معصیت کا اطلاق کرنا کیسے درست ہوگا۔



لو عصى الانبياء عليهم السلام

لغوت اممهم

(۱۱۶۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ أُسْرَى بِي لَقِيتُ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ فَنَعْتَهُ فَإِذَا رَجُلٌ حَسْبَتُهُ قَالَ مُضْطَرِبٌ رَجُلُ الرَّأْسِ كَأَنَّهُ مِنْ رِجَالِ شَنْوَاءَ قَالَ وَ لَقِيتُ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ فَنَعْتَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رُبْعَةٌ أَحْمَرُ كَأَنَّمَا خَرَجَ مِنْ دِيْمَاسٍ يَعْنِي الْحَمَّامَ وَ رَأَيْتُ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ أَنَا أَشْبَهُ وَلَدِهِ قَالَ وَ أُوتِيتُ بِإِنَائَيْنِ أَحَدُهُمَا لَبَنٌ وَ الْآخَرُ فِيهِ خَمْرٌ فَقِيلَ لِي خُذَا يَهُمَا شِئْتَ فَآخَذْتُ اللَّبَنَ فَشَرِبْتُهُ فَقِيلَ لِي هَدَيْتَ الْفِطْرَةَ أَوْ أَصَبْتَ الْفِطْرَةَ أَمَا إِنَّكَ لَوْ آخَذْتَ الْخَمْرَ غَوَتْ أُمَّتُكَ.

(رواه البخاری)

اگر انبیاء علیہم السلام معصیت کریں (والعیاذ باللہ) تو ان کی امتیں گمراہ ہو کر رہ جائی

(۱۱۶۳) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شب میں مجھ کو معراج ہوئی تھی تو موسیٰ علیہ السلام سے بھی میری ملاقات ہوئی، اس کے بعد آپؐ نے ان کا حلیہ اس طرح بیان فرمایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چہریرے جسم کے سر کے بال کچھ خمیدہ اور کچھ سیدھے جیسے ان میں کنگھی کی گئی ہو، بس ایسے تھے جیسے شنوءۃ قبیلہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ نے ان کا حلیہ بیان فرمایا، میانہ قد، سرخ رنگ کے ایسے نہائے دھوئے جیسے ابھی ابھی حمام سے نکلے ہیں اس شب میں میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی دیکھا، اگر ان کی اولاد میں ان کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ شخص کو دیکھنا ہو تو وہ مجھ کو دیکھ لو اس کے بعد آپؐ نے فرمایا۔ میرے سامنے دو برتن لائے گئے ایک میں دودھ اور دوسرے میں شراب تھی اور امتحان کے طور پر مجھ سے کہا گیا ان میں سے کون سا جام لیتے ہو؟ میں نے اٹھا کر دودھ کا جام لے لیا اور اس کو پی لیا۔ اس وقت مجھ سے کہا گیا آپؐ نے ٹھیک فطرت کے مطابق انتخاب کیا، یا آپؐ نے منشاء فطرت کو پالیا۔ اور خوب سن لو اگر کہیں تم شراب والا جام لے لیتے تو تمہاری ساری امت گمراہ ہو جاتی۔ (بخاری شریف)

(۱۱۶۳) \* رسول کا معنوی علاقہ اپنی امت کے ساتھ والد اور اولاد کے ظاہری علاقہ سے کہیں قوی تر ہوتا ہے پھر جب والد کے خصائل کا اولاد میں ظاہر ہونا ضروری ہے تو رسول کی کسی فروگزاشت کا اثر اس کی امت میں کیونکر ظاہر نہ ہو۔ صحیح حدیث میں ہے ”نسی ادم فنسیت ذریتہ خطا ادم فخطات ذریتہ“ یعنی آدم علیہ السلام سے نسیان ہوا تو ان کی ذریت میں بھی یہ خصلت ظاہر ہو کر رہی اور آدم علیہ السلام سے ذرا چوک ہو گئی تو یہ ذرا سا نقص ان کی اولاد میں بھی نظر آتا رہا اسی طرح اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں دوسرا جام اختیار فرما لیتے تو یہ معصیت کی طرف آپ کے رجحان کی دلیل ہوتی، پھر کیسے ممکن تھا کہ آپ کی امت کا قدم سنبھل سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی وقت اپنی امت کے تمام کمالات کے لیے مصدر و مرکز ہوتا ہے امت کے جملہ کمالات اپنے نبی کے کمال کا فیض ہوتے ہیں اسی لیے جو افضل الرسل تھے ان کی امت خیر الامم کہلائی۔ اب اگر نبی میں اصولی لحاظ سے کسی معصیت کا امکان ہو اور والعیاذ باللہ تو پھر جو بالطبع عاصی ہوں ان کی کیا گت بن کر رہ جائے۔ اسی لیے نبی کو معصوم فطرت پیدا کیا جاتا ہے تاکہ اس کی امت کشاں کشاں معصیت سے معصومیت کا رنگ اختیار کرتی چلی جائے اور اس طرح پھر اس جنت کی مستحق بن جائے جہاں کی آبادی کے لیے معصومیت شرط اول ہے۔ آدم علیہ السلام سے ذرا سی غلطی ہو لگے.....

الوسوسة بما يخالف عصمة الرسول  
العظیم مما يخشى منه الهلاك

(۱۱۶۳) أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ أَنَّ صَفِيَّةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرَتْهُ أَنَّهَا جَاءَتْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزْوُرُهُ فِي اعْتِكَافِهِ فِي الْمَسْجِدِ فِي الْعَشْرِ الْآخِرِ مِنْ رَمَضَانَ فَتَحَدَّثَتْ عِنْدَهُ سَاعَةً ثُمَّ قَامَتْ تَنْقَلِبُ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهَا يَقْلِبُهَا حَتَّى إِذَا بَلَغَتْ بَابَ الْمَسْجِدِ عِنْدَ بَابِ أُمِّ سَلَمَةَ مَرَّ رَجُلَانِ مِنَ الْأَنْصَارِ فَسَلَّمَا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُمَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى زِسْلُكُمَا إِنَّمَا هِيَ صَفِيَّةُ بِنْتُ حَيٍّ فَقَالَا سُبْحَانَ اللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَكَبَّرَ عَلَيْهِمَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَبْلُغُ مِنَ الْإِنْسَانِ مَبْلَغَ الدَّمِّ وَإِنِّي خَشِيتُ أَنْ يَقْذِفَ فِي قُلُوبِكُمَا شَيْئًا وَفِي رَوَايَةٍ فَتَهْلِكَا.

(وفی روایۃ عبدالرحمن بن اسحاق ما اقول لکما

• هذا ان تكونا تظنان شرا و لكن قد علمت الخ)

آپ کی عصمت کے خلاف قلب میں وسوسہ بھی ایسی خطرناک بات ہے جس سے ہلاکت کا خطرہ ہے

(۱۱۶۳) علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نقل فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بی نے ان سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ وہ دورانِ اعتکاف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے مسجد میں آئیں۔ یہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا موقع تھا، تھوڑی دیر آپ سے بات چیت کی پھر رخصت ہونے کے لیے کھڑی ہوئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو رخصت فرمانے کے لیے ان کے ساتھ ساتھ تشریف لے چلے یہاں تک کہ جب وہ مسجد کے اس دروازہ کے پاس پہنچیں جو حضرت ام سلمہؓ کے دروازہ کے متصل تھا تو دو انصاری شخصوں کا اس طرف سے گذر ہوا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ آپ نے ان سے فرمایا ذرا ٹھہرنا دیکھو یہ میرے ساتھ صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ سبحان اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیا فرماتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ان کے لیے بڑی مجبوری کا باعث بن گیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان انسان میں خون کی طرح گھوم جاتا ہے۔ مجھ کو اس کا خطرہ ہوا مبادا تمہارے دل میں کوئی وسوسہ ڈالے اور اس کی وجہ سے تم خواہ مخواہ ہلاک ہو جاؤ۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ یہ بات میں نے اس لیے نہیں کہی تھی کہ تم کوئی بدظنی کرتے بلکہ بات یہ ہے کہ میں خوب جانتا ہوں کہ کبھی شیطان دل میں غیر اختیاری وساوس ڈال دیتا ہے۔ (بخاری شریف)

اللہ..... گئی تو عصمت کے باوجود جنت چھوڑنے پر مجبور ہو گئے پھر جب تک عاصی انسان اپنی معصیت کی سزا بھگت کر معصومیت کا رنگ اختیار نہ کر لے جنت میں بھلا کیسے داخل ہو سکتا ہے خدا تعالیٰ کے مقدس رسول چونکہ اسی عالم میں جنت کی مخلوق ہوتے ہیں اس لیے وہ اہل جنت کی طرح معصوم بھی ہوتے ہیں، تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ واضح رہے کہ اس امتحان کا نظارہ صرف آپ کی فطرت کی عصمت کے اظہار کے لیے تھا، اسی لیے دوسری صورت کو صرف فرضی طریقہ پر ادا کیا گیا ہے تاکہ نبی اور امتی کا باہم اندرونی علاقہ معلوم ہو جائے۔ آپ حیات میں حضرت مولانا نانوتویؒ نے اس کی خوب تشریح فرمائی ہیں۔ عوام کے ذہن سے اس کا نقل کرنا مناسب نہیں علماء دیکھ لیں۔

(۱۱۶۳) \* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحالتِ اعتکاف تھے اگر یہاں شیطان کوئی وسوسہ ڈالتا تو یہی کہ یہ نقاب پوش کوئی اجنبی عورت نہ ہوں والی عیاذ باللہ پھر اجنبی عورت سے تنہائی میں گفتگو اور بات چیت اگر معصیت تھی تو کس درجہ کی معصیت تھی اس کے بعد آپ کا کس اللہ.....



## آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تشریع میں

## الانبياء عليهم الصلوة والسلام ومكانتهم في التشريع

(۱۱۶۵) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر حج فرض قرار دیا ہے اس لیے حج ادا کیا کرو۔ اس پر ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ کیا ہر سال؟ آپ خاموش رہے یہاں تک کہ جب اس نے تین بار یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا اگر میں اس کا اقرار کر لیتا اور ہاں کہہ دیتا تو ہر سال تم پر حج فرض ہو جاتا۔ پھر تم ہر سال حج ادا نہ کر سکتے اس کے بعد اصولی طور پر یہ نصیحت فرمائی کہ جب تک میں خود تم سے کچھ نہ کہا کروں تم بھی مجھ سے کچھ نہ پوچھا کرو؛ کیونکہ تم سے پہلی امتیں جو ہلاک ہوئی ہیں وہ ان ہی بے جا سوالات اور اپنے انبیاء علیہم السلام کے سامنے بے جا اختلافات کی بدولت ہی ہلاک ہوئی ہیں۔ لہذا جب میں تم کو کسی بات کا حکم دیا کروں تو اپنے مقدور بھر اس کو بجالایا کرو اور جس بات سے روک دیا کروں بس اس کو یک قلم چھوڑ دیا کرو۔ (مسلم)

(۱۱۶۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ فَحَاجُّوا فَقَالَ رَجُلٌ أَكُلَّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَكَتَ حَتَّى قَالَهَا ثَلَاثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوْ جَبْتُ وَلَمَّا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ بَكثَرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاجْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأَتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوهُ.

(رواہ مسلم)

اللہ ..... اہتمام سے اس کا بھی ازالہ فرمانا وہ بھی اس لیے نہیں کہ صحابہؓ سے اس بدگمانی کا کوئی اندیشہ تھا جیسا کہ خود آپ نے صاف فرما دیا کہ میرا یہ کہنا اس بناء پر نہیں ہے کہ تمہارے دل میں اس قسم کی کوئی بدگمانی موجود ہے بلکہ صرف اس لیے ہے کہ بعض مرتبہ شیطان غیر اختیاری طور پر دل میں بے بات بے سبب کوئی وسوسہ ڈال دیتا ہے صرف اس کی پیش بندی کے لیے میں نے تم کو خبردار کیا ہے مگر اس غیر اختیاری وسوسہ کا وہ بھی صرف ایک اجنبی عورت سے تنہائی میں ملاقات کا اثر کیا ہوتا؟ تمہاری ہلاکت اور آخرت کی بربادی۔ اب اس سے اندازہ فرما لیجئے کہ نبی کی شان عصمت کیا ہوتی ہے یہ کہ اگر اس کے خلاف ذرا سا وسوسہ بھی دل میں آئے اور جم جائے تو ایمان کی خیریت نہیں رہتی۔ کیا والعیاذ باللہ اگر رسول معصوم نہ ہوں تو ان کی شان یہی ہونی چاہیے۔

(۱۱۶۵) \* اسلام میں نبی کی حیثیت ایک مقنن کی حیثیت قرار دی گئی ہے اسی لیے قرآن کریم نے جا بجا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا بھی مستقل حکم دیا ہے گو رسول کا جو حکم بھی ہے وہ خدا تعالیٰ ہی کے حکم کے تحت ہوتا ہے مگر حکمت الہیہ کا تقاضہ یہی تھا کہ کچھ باتوں کا حکم تو وہ براہ راست خود دے اور کچھ باتیں ایسی بھی چھوڑ دے جن کا حکم وہ براہ راست خود نہ دے بلکہ اس کا رسول دے دے۔ ادھر حاکم علی الاطلاق کو مقصود یہی تھا قطعیت کے جس مرتبہ میں تمام قرآن کی حفاظت ہو اس درجہ میں ہر حدیث کی حفاظت نہ ہو اور اس طرح حفاظت کی نوعیت کے فرق سے کہیں کہیں ان کی قطعیت میں بھی فرق پڑ جائے اور اس طرح کمزور امت کی تفصیلات میں یہ کچھ خفت کا سبب بن جائے۔ اگر کہیں ہر حکم اسی مرتبہ میں آ جاتا جس میں کہ قرآن پاک کی آیات تھیں تو شاید اس امت کے عاصیوں کا معاملہ بہت زیادہ نازک ہو جاتا۔ رحمت نے صرف اتنے ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ اپنے رسول کے ساتھ زیادہ کھود کرید کرنے کی ممانعت بھی فرمادی تاکہ ابہام اور اجمال سے کمزوروں کو جتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ اور پہنچ جائے۔ نیز یہ رسول کے خود اپنے فرائض میں داخل ہے کہ جو تفصیلات ضروری ہوں لفظہ .....

(۱۱۶۶) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّخَذَ حُجْرَةً فِي الْمَسْجِدِ مِنْ حَصِيرٍ فَصَلَّى فِيهَا لَيْلًا حَتَّى اجْتَمَعَ عَلَيْهِ نَاسٌ ثُمَّ فَقَدُوا صَوْتَهُ لَيْلَةً وَظَنُّوا أَنَّهُ قَدْ نَامَ فَجَعَلَ بَعْضُهُمْ يَتَنَحَنَحُ لِيُخْرِجَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ مَا زَالَ بِكُمْ الَّذِي رَأَيْتُمْ مِنْ صَنِيعِكُمْ حَتَّى خَشِيتُ أَنْ يَكْتُبَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ كُتِبَ عَلَيْكُمْ مَا قُمْتُمْ بِهِ فَصَلُّوا أَيُّهَا النَّاسُ فِي بُيُوتِكُمْ فَإِنَّ أَفْضَلَ صَلَوةِ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا الصَّلَوةَ الْمَكْتُوبَةَ.

(متفق علیہ)

(۱۱۶۷) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى

(۱۱۶۶) زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ماہ رمضان میں) اپنی مسجد میں ایک بوریے کا حجرہ سا بنالیا تھا۔ چند شب آپؐ نے اسی کے اندر نماز ادا کی یہاں تک کہ لوگ بھی آپؐ کے پیچھے آ کر نماز میں شریک ہونے شروع ہو گئے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ لوگوں نے آپؐ کی آواز نہ سنی اور گمان یہ کیا کہ شاید آپؐ خواب استراحت فرما رہے ہیں تو کسی کسی نے کھانسنے بھی شروع کیا تا کہ آپؐ نماز کے لیے باہر تشریف لے آئیں آخر آپؐ نے فرمایا تمہارے ذوق و شوق کے ساتھ آ کر اقتداء کرنے کا یہ معاملہ میں سب دیکھتا رہا ہوں یہاں تک کہ مجھ کو یہ اندیشہ ہو گیا کہ یہ نماز کہیں تم پر فرض قرار نہ دے دی جائے پھر تم اس کو ادا نہ کر سکو۔ تو لوگو آئندہ سے تم یہ نماز اپنے اپنے گھروں میں ہی ادا کر لیا کرو۔ کیونکہ فرض نماز کو مستثنیٰ کر کے آدمی کی جتنی اور نمازیں ہیں وہ سب گھروں میں ہی افضل ہوتی ہیں۔ (متفق علیہ)

(۱۱۶۷) عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

ﷺ ..... ان کو وہ خود اپنی جانب سے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دے کیونکہ اس کو مبین ہی کی حیثیت سے بھیجا جاتا ہے۔ پس جہاں اس نے سکوت اختیار کر لیا تم کو بھی چاہیے کہ وہاں سکوت اختیار کر لو اور زیادہ سوال و جواب کی چپقلش میں نہ پڑو ورنہ یہ اس پر بھی کوتاہی کے ایک الزام کے مرادف ہو گا۔ ادھر نزول وحی کے زمانہ میں تم جتنی زیادہ تفصیلات کے درپے ہو گے وہ سب کھول دی جائیں گی، پھر وہ تمہارے ہی حق میں تکلیف کا سامان بن جائیں گی۔ لہذا خاموشی کے ساتھ سکوت کرنے میں رسولؐ کا احترام بھی ملحوظ رہتا ہے اور تمہاری بہتری بھی اسی میں مضمر ہے۔ ضروری بات تم سے پوشیدہ نہیں رکھی جائے گی، غیر ضروری بات کا سوال تم مت کیا کرو۔ رسولؐ کی عظمت کا اس سے اندازہ فرمائیجئے کہ اس کی ایک جنبش لب سے فرض و حرمت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱۱۶۶) \* نبی کے نطق و سکوت کا رتبہ تو بہت بلند ہے یہاں اس کی انفرادی عبادت میں اجازت کے بغیر سکوت کے ساتھ شرکت کرنا بھی معمولی بات نہیں ہوتی بعض مرتبہ وہ عبادت صرف اسی کی ذات کے لیے مناسب ہوتی ہے اس میں جا جا کر شریک ہونا چھوٹا منہ بڑی بات ہے بعض مرتبہ وہ اس کی خصوصیت تو نہیں ہوتی مگر اس میں شرکت کرنا کسی بڑی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے جیسے یہاں کہ نزول وحی کا زمانہ تھا احکام میں کمی و بیشی جاری تھی۔ اس مبارک مہینہ میں اس طرح ذوق و شوق کے ساتھ مبارک اجتماع پھر کس مبارک نبی کی اقتداء میں اس کو فرشتے بھی دیکھ کر غبطہ کر سکتے تھے بہت ممکن تھا کہ ملائعہ اعلیٰ میں اس کو وہ شرف قبول حاصل ہو جاتا اس کو فرض ہی قرار دے دیا جاتا پھر آئندہ ضعفاء امت کے لیے یہ مشکلات و درمشکلات کا سبب بن جاتا۔ اس جگہ حجۃ اللہ ج ۱ ص ۹۶ ضرور ملاحظہ کر لی جائے۔

(۱۱۶۷) \* یہاں قربانی کے جانور میں ایک شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استثناء فرما دینا صحیح سند کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ حسب آیت ﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات چونکہ خود مؤمنوں کی جانوں سے زیادہ ان کی خیر خواہ تھی اس لیے جس طرح والد کو اولاد پر دلالت حاصل ہوتی ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑھ کر مؤمنوں کی ﷺ.....



اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْطَاهُ غَنَمًا يَقْسِمُهَا عَلَى صَحَابَتِهِ ضَحَايَا فَبَقِيَ عَتُودٌ فَذَكَرَهُ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ضَحَّ بِهِ أَنْتَ . (متفق عليه و في رواية ابى بردة اذ بحهاو لن تجزئ عن احد بعدك . و نحوه قصة زيد بن خالد عند ابى داؤد و ابى زيد الانصارى عند ابن ماجة)

(۱۱۶۸) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ لَعَنَ اللَّهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغْيِرَاتِ خَلْقَ اللَّهِ فَجَاءَتْهُ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ إِنَّهُ بَلَغَنِي أَنَّكَ لَعَنْتَ كَيْتَ وَ كَيْتَ فَقَالَ مَالِي لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ هُوَ فِي كِتَابِ اللَّهِ (تَعَالَى) فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَأْتُ

کچھ بکریاں ان کے سپرد کیں تاکہ وہ ان کو قربانی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں تقسیم کر دیں (چنانچہ انہوں نے بکریاں تقسیم کر دیں) آخر میں صرف ایک بکری بچ رہی جو پورے سال کی نہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چلو بس تم تو اس کی قربانی کر ہی لو۔ متفق علیہ۔ ابو بردہ کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ خیر تم تو اس کو ذبح کر دو مگر تمہارے بعد اس عمر کی بکری آئندہ کسی شخص کے لیے بھی کافی نہ ہوگی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ زید بن خالد کا ابو داؤد میں اور ابو زید انصاری کا ابن ماجہ میں موجود ہے۔

(۱۱۶۸) عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر لعنت کرے جو جسم کو گودتی ہیں یا گدواتی ہیں یا خوبصورتی کے لیے بال نچواتی ہیں یا دانتوں کے درمیان جھری کھلاتی ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی خلقت بدلنا چاہتی ہیں اتنے میں ایک عورت آئی اور اس نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس قسم کی عورتوں پر لعنت فرماتے ہیں انہوں نے فرمایا۔ جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اور اللہ تعالیٰ نے بھی لعنت فرمائی ہو میں ان پر کیوں لعنت نہ کروں۔ اس نے کہا کہ قرآن شریف تو میں نے بھی پڑھا ہے مگر اس میں میں نے تو وہ بات کہیں نہیں پڑھی جو آپ فرماتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا اگر تو قرآن ذرا سمجھ کر پڑھتی

للہ..... جان و مال پر ولایت حاصل تھی اور اس لیے آپ کو ان کی جان و مال میں جملہ قسم کے تصرف کا حق حاصل تھا۔ اگر آپ چاہیں تو کسی کا نکاح فرما دے سکتے تھے اور اگر کوئی اپنے غلام پر ظلم کرے تو آپ اس کو اپنی جانب سے آزاد بھی کر سکتے تھے بعض حدیثوں کی جواب دہی کے ضمن میں کچھ علماء کی رائے اس طرف بھی ہے۔ اس لیے ترجمان السنہ ج ۲ ص ۸۹ حدیث نمبر ۳۳۷ کے تشریحی نوٹ میں ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ ”بعض مقامات پر رسول جیسی شخصیت کو بھی آئینی دست اندازی کا کوئی حق نہیں ہوتا“ اس کی بجائے اب اس کو اس طرح درست فرما لیجئے ”یہاں پہنچ کر رسول جیسی شخصیت کو بھی آئینی دست اندازی نہیں کرتی اور صرف اتنے ہی پراکتفا کر لیتی ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کر دے اور بس“

تنبیہ: بعض حدیثوں میں ایک شخص کے لیے نمازوں کے متعلق بھی آپ کے استثناء فرمانے کا ایک واقعہ اور دوسرا ایک عورت کے لیے نوحہ کرنے کی اجازت دے دینے کا واقعہ بھی ملتا ہے بعض علماء نے ان دونوں واقعات کو بھی اسی جنس کے واقعات میں شمار کیا ہے لیکن ان کے متعلق جو رائے ناقص ہماری تھی ہم پہلے اس کا اظہار کر چکے ہیں۔ دیکھو ترجمان السنہ ج ۲ ص ۵۳ و ج ۲ ص ۵۶۔

(۱۱۶۸) \* احادیث سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ نے احکام یا غیر احکام میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان کہیں تفریق کی ہو۔ منکرین حدیث کی یہ سخت جرات ہے کہ تشریع احکام میں رسول کا کوئی مقام ہی تسلیم نہیں کرتے اور اس بہانہ سے درپردہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے بھی دست بردار ہونا چاہتے ہیں حالانکہ کتاب اللہ اور احادیث ہی نہیں بلکہ دین کی تاریخ از اول تا آخر اس کے خلاف ہے۔

مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ فَمَا وَجَدْتُ فِيهِ مَا تَقُولُ  
قَالَ لَنْ كُنْتُ قَرَأْتِيهِ لَقَدْ وَجَدْتِيهِ أَمَا قَرَأْتَ  
مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ  
فَانْتَهُوا قَالَتْ بَلَى قَالَ فَإِنَّهُ قَدْ نَهَى عَنْهُ.

(متفق علیہ)

(۱۱۶۹) عَنْ سَهْلَةَ امْرَأَةِ أَبِي حُذَيْفَةَ أَنَّهَا  
ذَكَرَتْ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
سَالِمًا مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ وَدُخُولَهُ عَلَيْهَا  
فَأَمَرَهَا أَنْ تَرْضِعَهُ فَأَرْضَعَتْهُ وَهُوَ رَجُلٌ كَبِيرٌ  
بَعْدَ مَا شَهِدَ بَدْرًا. (اخرجه ابن سعد و  
الحاكم كما في الخصائص ج ۲ ص ۲۶۳)  
(۱۱۷۰) عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ أَبِي سَائِرُ  
أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ  
يُدْخَلَ عَلَيْهِنَّ أَحَدٌ بِهَذَا الرِّضَاعِ وَقُلْنَ إِنَّمَا  
هَذَا رُخْصَةٌ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ لِسَالِمٍ خَاصَّةً. (اخرجه الشيخان)

(۱۱۷۱) عَنْ أَبِي النُّعْمَانِ الْأَزْدِيِّ قَالَ زَوْجُ

تو جو بات میں کہتا ہوں ضرور ضرور اس میں دیکھ لیتی کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی  
مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ الخ جو بات تم کو رسول بتائے اس کو قبول کر لو اور جس بات  
سے روک دے اس سے رک جاؤ۔ اس نے کہا یہ آیت تو پڑھی ہے۔ اس پر  
انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افعال کی ممانعت فرمائی ہے  
(اس لیے ان کو نہ کرنا قرآن ہی کا حکم کہا جائے گا۔) (متفق علیہ)

(۱۱۶۹) سہلہ جو ابو حذیفہ کی بیوی تھیں کہتی ہیں کہ انہوں نے آنحضرت صلی  
اللہ علیہ وسلم سے سالم کے متعلق تذکرہ کیا یہ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام تھے  
کیا وہ ان کے گھرا ب بھی آمد و شد رکھ سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا۔ جاؤ  
ان کو اپنا دودھ لے کر پلا دو۔ چنانچہ انہوں نے اپنا تھوڑا سا دودھ نکال کر ان  
کو پلا دیا اس وقت یہ پورے مرد تھے اور جنگ بدر میں شریک ہو چکے تھے۔  
(حاکم)

(۱۱۷۰) حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اس قسم کی  
رضاعت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ ازواج نے اختلاف  
رائے ظاہر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ  
خاص سالم ہی کے لیے اجازت تھی۔ عام مسئلہ نہیں تھا۔  
(متفق علیہ)

(۱۱۷۱) ابونعمان ازدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ

(۱۱۷۰) \* یعنی مدت رضاعت کے بعد دودھ پلانا جائز نہیں اور اس کا کوئی اثر بھی نہیں ہے اور نہ ایسے آدمی کو رضاعی اولاد یا رضاعی  
بھائی کھا جاسکتا ہے۔ سہلہ کی روایت اگر صحیحین کی نہ ہو مگر حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی  
ثابت ہوتا ہے کہ بعض مواضع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عام قوانین سے مستثنیٰ کرنے کا شرعی حق بھی حاصل تھا۔

(۱۱۷۱) \* مہر کے باب میں ایک شخص کو عام قانون سے مستثنیٰ کرنے کی یہ دوسری مثال ہے۔ گو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
سے اس کے ثبوت میں کلام ہو مگر مکحول وغیرہ کے بیانات سے کسی درجہ میں اس کی تائید ہو جاتی ہے ہماری غرض یہاں ان مسائل پر روشنی ڈالنی  
نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا ہے کہ عموم قاعدہ سے استثناء کرنے کا حق بھی آپ کو حاصل تھا اور یہ حقیقت صحیح احادیث سے بھی ثابت ہے ایک  
موقعہ پر خطبہ دیتے ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم مکہ کی گھاس کاٹنے کی ممانعت فرمائی تو ایک صحابی نے کھڑے ہو کر ”اذخر“ کے  
استثناء کی درخواست پیش کی کیونکہ یہ گھاس لوگوں کی بہت سی ضروریات میں مستعمل تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منظور فرمالیا۔ اس  
جگہ ان سب کا استقصاء کرنا منظور نہیں ہے۔



علیہ وسلم نے ایک عورت کا نکاح قرآن کی ایک سورت پر پڑھا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ تمہارے بعد یہ مہر کسی اور شخص کا نہیں ہو سکے گا۔ اس حدیث کی اسناد ضعیف در ضعیف ہیں۔ لیکن ابوداؤد میں ہے کہ مکحول کی ذاتی رائے یہی تھی کہ جن واقعات میں صحت سند کے ساتھ قرآن کریم کا مہر مقرر ہونا ثابت ہوتا ہے وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر محمول ہے۔

(الخصائص ج ۲ ص ۲۶۳)

النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ امْرَأَةً عَلَى سُورَةٍ مِنَ الْقُرْآنِ وَقَالَ لَا يَكُونُ لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِكَ مَهْرًا. (رواه سعيد بن منصور مرسلًا وفيه من لا يعرف و أخرجه ابوداؤد عن مكحول قال ليس هذا لأحد بعد النبي صلى الله عليه وسلم و أخرجه ابن عوثة عن الليث بن سعد نحوه كذا في الخصائص ج ۲ ص ۲۶۴)

(۱۱۷۲) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْمَعْلِيِّ قَالَ كُنْتُ أَصَلِّي فِي الْمَسْجِدِ فَدَعَانِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ أُجِبْهُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي كُنْتُ أَصَلِّي فَقَالَ أَلَمْ يَقُلِ اللَّهُ: اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ. ثُمَّ قَالَ لِي لَأَعْلَمَنَّكَ سُورَةً هِيَ أَعْظَمُ السُّورِ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِي فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَخْرُجَ قُلْتُ لَهُ أَلَمْ تَقُلْ لَأَعْلَمَنَّكَ سُورَةً هِيَ أَعْظَمُ سُورَةٍ مِنَ الْقُرْآنِ قَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُوتِيَتْهُ.

(رواه البخاری)

الرسول العظيم وعصمة رايه في القرآن  
(۱۱۷۳) عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ كَانَ النَّبِيُّ

(۱۱۷۲) ابوسعید روایت کرتے ہیں ایسا ہوا کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آواز دی تو میں نماز میں تھا اس لیے آپ کو جواب نہ دے سکا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور معذرت کی یا رسول اللہ میں نماز میں تھا اس لیے جواب نہ دے سکا۔ آپ نے فرمایا کیا فرمان الہی یہ نہیں استجیبوا للہ وللرسول الخ یعنی رسول جس وقت بھی تم کو اس بات کے لیے بلائے جو تمہاری حیات کا موجب ہو تو فوراً اللہ اور اس کے رسول کو لبیک کہا کرو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ مسجد سے باہر نکلنے سے پہلے پہلے میں تم کو وہ سورت بتاؤں گا جو قرآن کریم کی تمام سورتوں میں سب سے بڑی شان کی سورت ہے اس کے بعد آپ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب آپ مسجد سے باہر نکلنے لگے تو میں نے عرض کی آپ نے تو فرمایا تھا میں تجھ کو قرآن کریم کی سب سے افضل سورت بتاؤں گا آپ نے فرمایا (توسن لو) وہ سورت الحمد للہ رب العالمین والی سورت ہے یہی سبع مثانی ہے اور یہی وہ قرآن عظیم ہے جو مجھ کو عطا ہوا ہے۔ (بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کی عصمت

(۱۱۷۳) ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی

(۱۱۷۳) \* دیکھئے حدیث مذکور میں یوں نہیں فرمایا گیا کہ ”تم سفارش کیے جاؤ اور رسول جو چاہیے گا وہ فیصلہ فرما دے گا۔“ بلکہ یوں فرمایا گیا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی زبان سے جو فیصلہ چاہے گا صادر فرما دے گا۔“ اس تعبیر میں یہ اشارہ ہے کہ رسول دوسرے حاکموں کی طرح صرف اپنی رائے سے فیصلے نہیں فرماتے بلکہ ان کی زبان خداوندی احکام کے اجراء کے لیے صرف ایک آلہ ہوتی ہے حکم للہ.....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا آتَاهُ السَّائِلُ أَوْ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے پاس جب کوئی سائل یا کوئی صاحب ضرورت آتا (راوی کو

اللہ ..... درحقیقت یہاں اللہ تعالیٰ ہی کارہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں کے سب فیصلہ ناطق اور ناقابل اپیل ہوتے ہیں ان سے معارضہ کرنا کفر اور ان میں ذرا تردد کرنا بھی مؤمن کی شان سے بعید ہوتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ رسالت کی حقیقت ہے کیا اور جو عقلاء زمانہ کہلاتے ہیں وہ اس کو سمجھے کیا ہیں۔  
قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ. (الاحزاب: ۳۶)  
اور کسی مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو حق نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں۔  
دوسری جگہ ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا. (النساء: ۶۵)  
تمہارے پروردگار کی قسم جب تک یہ لوگ اپنے جھگڑوں میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور تم جو فیصلہ کر دو اس سے اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں اس وقت تک مؤمن نہ ہوں گے۔  
تیسری جگہ ارشاد ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ. (النساء: ۱۰۵)  
ہم نے آپ پر قرآن سچائی کے ساتھ اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات میں اس رائے کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ آپ کو سمجھائے۔

پہلی آیت میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کا فیصلہ ایک ہی قرار دیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ یہاں قوتِ حاکمہ بہر کیف ایک ہی رہتی ہے اگرچہ بظاہر حاکم دو نظر آئیں اسی طرح یہاں فیصلہ بھی ایک ہی ہوتا ہے اگرچہ اس کی نسبت الگ الگ ہو۔ رسول کے فیصلوں کی اس اہمیت کے بعد جو دفعہ اس سے بھی زیادہ اہم بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے فیصلہ کے بعد سب اختیارات معطل ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اس کی آزادی رائے بھی سلب ہو جاتی ہے اور یہ اس لیے کہ خالق کے فیصلہ کے سامنے مخلوق کو ادنیٰ سی سرتابی کرنے کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا۔ رسول کا فیصلہ چونکہ بعینہ خالق کا فیصلہ سمجھا جاتا ہے اس لیے جو حقوق خالق کے فیصلے کے ہیں وہی رسول کے فیصلے کے سمجھے جاتے ہیں اس بارے میں آیت بالا میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے مابین کوئی تفریق نہیں کی گئی۔

دوسری آیت میں اس سے زیادہ یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ مخلوق کے ذمہ یہاں اس سے پہلے ایک فرض اور عائد ہوتا ہے وہ یہ کہ اپنے ہر معاملہ کا مرافعہ خواہ وہ باہمی نزاعات ہی کا کیوں نہ ہو رسول ہی کی خدمت میں کرے۔ رسول کی موجودگی میں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملہ کا مرافعہ اس کے سوا کسی اور شخصیت کے سامنے لے جائے اور نہ کسی دوسرے انسان کا یہ حق ہے کہ وہ رسول کی موجودگی میں کوئی فیصلہ دے سکے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی اہم مخلوق کے ذمہ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کے ہر فیصلہ پر اپنے قلب میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کرے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس منفی جزء کے بعد وہ دوسرے اثباتی جزء کا فرض بھی ادا کرے یعنی اپنے اعتراف و تسلیم کا بھی سرخم کر دے۔ امام رازی آیت بالا کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ منفی جزء کا حاصل انقیاد باطن ہے اور مثبت جزء کا حاصل انقیاد و ظاہر ہے اور دونوں جزء کا منشاء یہ ہے کہ رسول کے فیصلہ کا حق یہ ہے کہ وہ اپنے جسم و جان سے اس پر راضی ہو جائے۔ ایسی رضاء جس میں انحراف یا کراہت قلبی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہ رہے۔ اللہ .....  
یا کراہت قلبی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہ رہے۔



رُبَّمَا قَالَ جَاءَهُ السَّائِلُ أَوْ صَاحِبُ الْحَاجَةِ لفظوں میں شک ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے - تم لوگ تو ضرورت

للہ..... واضح رہے کہ ظاہر کے انقیاد کا ایک مرتبہ تو انقیاد باطن سے بھی پہلے ہوتا ہے اور یہ اس کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔ ایمان و اسلام ابتداء میں انسان کے صرف جوارح اور ظاہر تک محدود رہتا ہے پھر شدہ شدہ اس کے باطن میں سرایت کرتا ہے حتیٰ کہ جب انسان کا باطن ایمان کامل کے رنگ سے رنگیں اور اس کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو پھر باطن کا اثر لوٹ کر اس کے جوارح پر بھی نظر آنے لگتا ہے۔ انقیاد ظاہر کا یہ مرتبہ کمال ایمان کے آثار میں سے ہے اور یہ صرف اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہوتا ہے۔ مثال کے طور سے یوں سمجھئے کہ ایک تو اضع تو وہ ہے جو انسان کے اعضاء پر اس کے علمی و عقلی شعور کا نتیجہ ہوتی ہے یہ تو اضع تو اختیاری ہے لیکن ایک تو اضع تو وہ ہے جو انسان کے باطنی عجز و انکسار اور اس کے ذاتی نقص و افتقار کے دائمی استحضار کا ثمرہ ہوتی ہے یہ اضطراری ہوتی ہے یا مثلاً ایک خوف تو مصنوعی ہوتا ہے اور ایک وہ ہوتا ہے جو انسان کے باطن پر مستولی ہو جانے کی وجہ سے اس کے ظاہر پر بھی نظر آتا ہے۔ یہ خوف اتنا اضطراری ہوتا ہے کہ انسان اگر اس کو چھپانے کی سعی بھی کرے تو چھپا نہیں سکتا۔ یہ اضطراری صفت ہے۔ اسی طرح انقیاد باطن کامل ہو جانے کے بعد اس کے جو اثرات انسانی جوارح پر نظر آتے ہیں یہ بھی اضطراری ہوتے ہیں۔ یہاں بھی انسان کے تصنع اور اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا اس بناء پر آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کے فیصلہ پر انسان کا ضمیر اس طرح رضا مند ہو جانا چاہیے کہ پھر انقیاد ظاہر میں کوئی تصنع نہ رہے بلکہ وہ اس کی ایک صفت اضطراری بن جائے۔ **إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ** میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اسلام کے کسی ایسے ہی اعلیٰ مرتبہ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

تیسری آیت کے الفاظ بہت زیادہ قابل غور ہیں یہاں **إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ** کے بعد **لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ** کے لفظ فرمائے ہیں اور یوں نہیں فرمایا کہ **لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا رَأَيْتُ** جس کا ترجمہ یہ ہوتا کہ یہ کتاب ہم نے آپ پر اس لیے نازل فرمائی ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ وہ فرمائیں جو آپ کی رائے میں آجائے بلکہ اس کی بجائے **بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ** کے لفظ فرمائے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ آپ کی رائے میں ڈالے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی رائے بھی ارادة الہیہ کے تابع رہتی ہے اسی لیے اس کو معصومیت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے کسی انسان کی رائے کو یہ مقام حاصل نہیں۔ اسی لیے رسول کے فیصلہ کے سواء کسی کے فیصلہ کو الہی فیصلہ اور قضاء الہی نہیں کہا جاسکتا اور نہ رسول کے فیصلہ کے علاوہ کسی اور بشر کا فیصلہ نکتہ چینی سے بالاتر ہو سکتا ہے اور اس لیے رسول کے علاوہ ہر انسان کے فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہونا لازم قرار دیا نہیں جاسکتا ہے ہر سہ آیات بالا کے مضامین پر اگر غور کرو تو سب کی روح ایک ہی ہے وہ یہ کہ رسول درمیان میں صرف ایک پیامبر ہوتا ہے اور اس کا جو فیصلہ ہوتا ہے وہ حکم ربانی کے تحت ہوتا ہے حتیٰ کہ اگر اس کی رائے بھی ہو تو وہ بھی ارادة الہیہ کے تابع ہوتی ہے کسی دوسرے انسان کی رائے کو یہ رتبہ حاصل نہیں۔ حضرت عمر کی رائے اور ان کے اجتہاد کا رتبہ کتنا بلند تھا اللہ اکبر کبھی کبھی وحی الہی بھی اسی کی موافقت کرتی تھی لیکن اس کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ یقیناً ارادة الہی سے پیدا ہوئی ہے اور کوئی دوسرا احتمال اس میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے منشی نے ان کے ایک فیصلہ کی پیشانی پر یہ الفاظ لکھ دیئے ”یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے عمر کے خیال میں ڈالا ہے“ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یوں مت لکھو یوں لکھو ”یہ فیصلہ وہ ہے جو عمر نے خود اپنی رائے اور اپنے خیال کے مطابق کیا ہے۔“ (ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۱۵۷) دوسرے مقام پر اس کی وجہ بھی خود بیان فرمائی ہے ”لو گودیکھو دین کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس لیے صواب ہی صواب تھی کہ وہ للہ.....

قَالَ اِسْفَعُوْا فَلَئِنْ جَرُّوْا وَيَقْضِيَ اللّٰهُ عَلٰی مندوں کی سفارش کر دیا کرو اور اس پر ثواب کمائے جاؤ، رہا اس کے فیصلہ کا

للہ ..... خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تھی ہماری رائے تو ہماری جانب سے صرف ایک اٹکل ہوتی ہے تو ترجمان السنہ ص ۱۵۷ ج ۱)

عن عمرو بن دینار رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال  
قيل لعمر ا حکم بما اراک اللہ قال ان هذا  
للنبی صلی اللہ علیہ وسلم خاصۃ.  
(درمنثور ص ۲۱۹ ج ۲)

عمر بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال  
ایاکم و الراۓ فان اللہ تعالیٰ قال لنبیہ صلی  
اللہ علیہ وسلم لتحکم بین الناس بما  
اراک اللہ و لم یقل بما رأیت.  
(درمنثور ص ۲۱۹ ج ۲)

یہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان محض خاکساری کے طور پر نہ تھا بلکہ اس عمیق حقیقت کی طرف اشارہ تھا جو اس تیسری آیت  
میں رسول اور غیر رسول کی رائے کے فرق کے متعلق کیا گیا ہے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ رسول کی رائے کے سوا قطعی طور پر صواب رسی کا حکم کسی  
دوسرے انسان کی رائے پر لگایا نہیں جاسکتا اور اس لیے نہیں لگایا جاسکتا کہ کسی انسان کے متعلق وحی الہی نے یہ تصریح نہیں کی کہ اس کی رائے  
ہمیشہ اراء الہی کے تابع اور منجانب اللہ ہی ہوگی۔

ایک مرتبہ ایک جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بريدہ صحابی کو امیر لشکر بنا کر بھیجا مگر ان کو صاف یہ ہدایت فرمادی گئی کہ دیکھو  
اگر محاصرہ کے بعد صلح کی نوبت آئے تو اس صلح نامہ پر یہ نہ لکھنا کہ یہ فیصلہ خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اور اس کے حکم کے مطابق ہے بلکہ یہ لکھنا  
کہ یہ فیصلہ میری اور میرے رفقاء کی رائے کے مطابق لکھا جاتا ہے کیونکہ تمہارے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ تمہارا جو فیصلہ ہوگا وہ یقیناً خدا  
تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی ہوگا۔ (ترجمان السنہ ج ۱ ص ۱۴۷)

اس سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ رسالت کا مقام کیا ہے اور امامت و اجتہاد کا رتبہ اس سے کتنا فروتر ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ اس تفریق کی وجہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ رسول کی فطرت اتنی مجلی و مصفی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ شیطانی اتصال کا کوئی  
احتمال ہی نہیں ہوتا دوسروں کی فطرت خواہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو مگر وہاں قطعیت کے ساتھ اس احتمال کی نفی نہیں کی جاسکتی اس لیے دوسرے  
انسانوں کے رائے میں بہر حال یہ احتمال ہوتا ہے کہ کسی راستہ سے اس میں شیطانی مداخلت ہو گئی ہو اگرچہ وہ عمدانہ ہو خطا ہو اور اس وجہ سے  
قابل مواخذہ بھی نہ ہو۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هَلْ اُنْبَاکُمْ عَلٰی مَنْ تَنْزَلُ الشَّيَاطِیْنُ تَنْزَلُ  
عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اِثْمٍ. (الشعراء: ۲۲۱: ۲۲۲)

اچھا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں وہ ہر جھوٹے  
گنہگار پر اترتے ہیں۔

حافظ موصوف فرماتے ہیں کہ آیت بالا میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ شیطان کا نزول صرف ان افراد پر ہوتا ہے جو ان کے ساتھ مزاجی للہ .....



لِسَانِ رَسُولِهِ بِمَا شَاءَ. (رواہ البخاری قلت و معاملہ تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے جو فیصلہ

للہ ..... مناسبت رکھتے ہیں۔ چونکہ شیاطین کا مزاج بھی خدائی نافرمانی اور افتراء پر داری ہوتا ہے اس لیے جن انسانوں میں فریب یا بعید جتنی یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے ان پر اسی تناسب سے ان کا نزول بھی ہو سکتا ہے۔ عام انسانوں کے متعلق چونکہ رسولوں کی سی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اس لیے ان کی رائے پر قطعیت کے ساتھ شیطانی مداخلت سے برأت کا حکم بھی نہیں لگایا جاسکتا اس لیے حضرت ابن مسعود نے سائل کے ایک استفسار کا جواب دے کر فرمایا:

اقول فيه برأى فان يكن صواباً فمن الله و  
ان يكن خطأ فمنى و من الشيطان و الله و  
رسوله برئان منه.

اگر میرا یہ جواب درست ہو تو صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے ورنہ  
میری غلطی ہے اور شیطانی مداخلت کا اثر ہے اللہ اور اس کا رسول  
یقیناً اس سے بری ہیں۔

اس کے بعد بطور خلاصہ حافظ موصوف لکھتے ہیں:

فالرسول برئ من تنزل الشيطان عليه في  
العمد و الخطاء بخلاف غير الرسول فانه  
قد يخطئ و يكون خطأ من الشيطان و ان  
كان خطأ ه مغفوراً له.

خلاصہ یہ ہے کہ رسول کی ذات خطاء اور عمدہ کی ہر دو صورتوں میں  
شیطانی مداخلت کا احتمال نہیں رکھتی اس کے برخلاف ہر انسان کی  
رائے میں شیطانی مداخلت سے غلطی واقع ہونے کا احتمال ہو سکتا  
ہے اگرچہ اس کی یہ غلطی خطاء اجتہادی ہونے کی وجہ سے معاف

(الجواب الصحيح ص ۸۵ ج ۴) ہوں

اس تفصیل کے بعد یہ سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ عنوان بالا کے تحت مذکورہ حدیث میں رسول کے فیصلوں کی حیثیت مستقل ہونے کے  
باوجود ان کو پھر قضاء اللہ یعنی خدائی فیصلہ کیوں کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں شیطانی مداخلت کا کوئی احتمال ہی نہیں ہوتا اور فیصلہ کرنے  
والی گویا ہر رسول کی ذات نظر آتی ہے مگر چونکہ درحقیقت وہ الہی فیصلہ ہوتا ہے اس لیے اس کو قضاء اللہ بھی کہا جاتا ہے گویا یہاں حاکم دو ہیں  
مگر حکم ایک ہی ہوتا ہے جیسا کہ آپ رسول کی اطاعت کے متعلق پڑھ چکے ہیں کہ یہاں بھی فعل اطاعت گو متعدد نظر آئے مگر مطاع دراصل  
ایک ہی ذات پاک اللہ تعالیٰ کی رہتی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ترجمان السنہ جلد ۱ ص ۱۰۰) اس لیے رسول کے فیصلوں کی نسبت یہ کہنا  
بھی صحیح ہو گا کہ یہ رسول کا فیصلہ ہے اور بہ نظر حقیقت یہ کہنا بھی درست ہو گا کہ وہ خدا تعالیٰ کا فیصلہ ہے یہ دونوں نسبتیں مناسبت مقام اور  
مصلحت کی رعایت سے آپ کو احادیث میں نظر آئیں گی۔ حسب بیان آیت بالا جس طرح یہ معلوم ہوا کہ نزول شیاطین کن کن قسم کے  
انسانوں پر ہوتا ہے اس کے برعکس یہ بھی معلوم ہوا کہ نزول ملائکہ کن کن افراد پر ہوتا ہے یعنی جس طرح نزول شیاطین کے لیے مزاجی مناسب  
درکار ہے اسی طرح نزول ملکی کے لیے بھی مزاجی مناسبت ضروری ہوگی۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول ملکی کے لیے شرط اول اقرار  
ربوبیت اور اس کے بعد اس پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا  
تَنْزِيلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا  
تَحْزَنُوا﴾ (فصلت: ۳۰)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ اس پر قائم رہے  
ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے کہ) نہ تو خوف کرو اور نہ غم  
میں پڑو۔ للہ .....

من هذا الباب ما روى مرفوعاً في شأن عمر  
چاہے گا صادر فرمادے گا۔

للہ..... آیت بالا کے بموجب جن افراد میں ایمان باللہ اور اس پر استقامت موجود ہوگی ان کے طبائع کے ساتھ ملائکہ اللہ کا اتصال بھی ممکن ہوگا اب جن مزاجوں پر پہلی مناسبت اتنی غالب ہوگئی ہے کہ ان میں دوسری مناسبت کا تخم ہی نہیں رہا جیسے کفار ان پر صرف شیاطین کا نزول ہوگا ملائکہ اللہ کے نزول کا یہاں کوئی احتمال نہیں ہوگا غالباً پہلی آیت میں اسی لیے ”افساک ائیم“ دونوں صیغے مبالغہ کے استعمال کیے گئے ہیں اس کے برخلاف جن افراد میں اقرار ربوبیت کی صفت انتہاء درجہ غالب آگئی ہے ان پر نزول ملکی ہوتا ہے مگر چونکہ دوسری صلاحیت کی قطعیت کے ساتھ ان سے نفی نہیں کی جاسکتی اس لیے یہاں ان کی رائے میں مداخلت شیطان کا احتمال لگا رہتا ہے۔ دوسری آیت میں ”رَبُّنَا اللَّهُ“ کے ساتھ استقامت کی قید غالباً اسی ملکی صلاحیت کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو قسم کی طاقتیں پیدا کی گئی ہیں ایک فرشتہ اور دوسری شیطان۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرا شیطان بھی اسلام لا چکا ہے اس لیے وہ بھی مجھ کو خیر کے سواء برائی کا مشورہ نہیں دیتا۔ ہمارے نزدیک اس کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ ہر انسان چونکہ مکلف بنایا گیا ہے اس لیے اس میں کم و بیش دونوں صلاحیتیں پیدا فرمائی گئی ہیں۔ ان میں سے ملکی جانب کا خطرہ سعادت اور دوسری جانب کا غلبہ شقاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ ہدایت خلق کے لیے مبعوث ہوتے ہیں اس لیے یہاں بھی گود دوسری طاقت پیدا تو کی جاتی ہے مگر یہ طاقت بھی ان کی قوت قدسیہ کے سامنے سرنگوں رہتی ہے اور سواء خیر اور بھلائی کے ان کو دوسرا مشورہ دے نہیں سکتی پھر جس فرقہ امت سے اہواء اور شیطان کی نسبت جتنی بعید ہوتی چلی جائے گی اسی قدر اس کے اقوال کی نسبت اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی حتیٰ کہ کوئی کوئی اس معراج کو بھی پہنچا ہے جس کا نام محدثیت ہے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ یہ اپنی فطری استعداد کی وجہ سے چونکہ محدثیت کے رتبہ پر تھے اس لیے ان کی رائے کا رتبہ نبی کی رائے سے دوسرے نمبر پر آچکا تھا، حتیٰ کہ بعض اوقات وحی الہی ان ہی کی رائے کے مطابق اتر آتی تھی۔ اور درحقیقت یہ ان کے اسی مناسبت کی طرف اشارہ تھا۔ لیکن محدثیت کا حکم نہ تو قطعیت کے ساتھ کسی خاص فرد امت پر لگایا جاسکتا ہے اور اس لیے نہ کسی خاص فرد کے فیصلہ کو قطعیت کے ساتھ قضاء اللہ کہا جاسکتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اپنے انداز میں اشارہ فرمایا ہے۔

تحقیق بالا سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ آیت ”لَتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ“ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول کے لیے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور اس کے لیے فیصلہ کی صورت صرف وحی میں منحصر کر دی گئی ہے بلکہ آیت بالا یہ صراحت کرتی ہے کہ رسول کو اجتہاد کی بھی گنجائش دی گئی ہے۔ کیونکہ یہاں یوں نہیں فرمایا گیا کہ ”إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بِهِ بَيْنَ النَّاسِ“ بلکہ ”بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ“ فرمایا گیا ہے گویا اس کے لیے یہ وسعت دے دی گئی ہے کہ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں اجتہاد کر کے حکم دینے کا بھی حق دار ہے مگر چونکہ اس کی رائے کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ہمیشہ ”بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ“ کے مطابق ہی ہوتی ہے اور اگر کہیں ایک دو واقعہ میں اس کی رائے میں ادنیٰ سی بھی کمی سمجھی گئی ہے تو اس پر فوراً وحی کی جانب سے تنبیہ کر دی گئی ہے۔ اس لیے اس کی رائے کو بہر کیف من جانب اللہ کہا جاتا ہے کسی دوسرے انسان کی رائے کی یہ نگہداشت وحی کی طرف سے نہیں ہوتی اس لیے اس کی رائے کو الہی رائے نہیں کہا جاسکتا بالخصوص جب کہ اس میں شیطانی



جعل الله الحق على لسان عمر رضى الله عنه. (بخاری شریف)

..... مداخلت کا احتمال بھی موجود ہو۔ حضرت عطیہ عوفی آیت بالا کی تفسیر میں فرماتے ہیں:  
 قال (امعناہ) الذی اراہ فی کتابہ یعنی بما اراک اللہ کا مطلب یہ ہے کہ جو رائے کتاب میں غور کے بعد آپ کے دل  
 میں ڈالے۔ (درمنثور ص ۲۱۹ ج ۲)  
 اس سے صاف معلوم ہوا کہ آیت بالا رسول کے اجتہاد کرنے کے خلاف نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کا ثبوت ہے۔  
 امام قرطبی فرماتے ہیں:

معناہ علی قوانین الشرع اما یوحى و نص او بنظر جاء علی سنن الوحى و هذا اصل فی القیاس و هو يدل علی  
 ان النبى اذا رأى شیئا اصاب لان الله تعالى اراہ ذلک. (تفسیر قرطبی ص ۳۷۶ ج ۵)  
 آیت بالا میں بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ کا مطلب یہ ہے کہ آپ فیصلہ فرمایا کریں اس رائے کے مطابق جو یا تو کسی نص کے موافق ہو یا  
 ایسے اجتہاد اور رائے سے ہو جو وحی کی منشاء اور اس کے اقتضاء کے موافق ہو اور یہ حجیت قیاس کی ایک دلیل ہے اور اس کی بھی کہ  
 رسول جب اجتہاد کرتا ہے تو وہ صواب ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ من جانب اللہ ہوتا ہے۔  
 امام ابو منصور ماتریدی فرماتے ہیں:

معنى الآية بما الهكم الله بالنظر فى الاصول المنزلة و قال فيه دليل على جواز الاجتهاد فى حقه. (مدارك التنزيل)  
 آیت کا مطلب یہ ہے کہ نازل شدہ اصول پر غور کے بعد جو اللہ تعالیٰ آپ کے دل میں ڈالے آپ اس کے مطابق فیصلہ فرمائیں  
 اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو بھی اجتہاد کرنا جائز تھا۔

ہماری اس تحقیق سے یہ بھی صاف ہو گیا کہ رسول کی رائے کے من جانب اللہ ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اب کبھی کسی اجتہاد پر  
 اس کو ٹوکا ہی نہیں جائے گا ہو سکتا ہے کہ اس کو ٹوکا جائے بلکہ اس کی رائے کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے کہ اس کی جو رائے بھی ہوتی  
 ہے وہ وحی کی نگرانی میں قائم ہوتی ہے اسی لیے اگر سر مو اس میں فرق ہوتا ہے تو فوراً اس پر اس کو متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ مطلب نہ ہو تو پھر  
 حکم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اور حکم بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ دونوں صورتیں ایک ہی بن جائیں گے۔  
 حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پانی پتی زیر تفسیر آ یہ بالا لکھتے ہیں:

و هذه الآية دليل على ان النبى صلى الله عليه وسلم لم یکن یعمل بالمظنون لكنها لا ینفی الاجتهاد عن النبى  
 صلى الله عليه وسلم لانه اذا حصل للنبي صلى الله عليه وسلم ظن بالاجتهاد و قرر الله سبحانه و لم یطلعه  
 علی الخطاء ظهر شدہ بیقین انه الحق بخلاف المجتهد. (تفسیر مظہری)

یہ آیت اس کی دلیل تو ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظنی بات پر عمل نہ فرماتے تھے مگر اس کی دلیل نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ  
 وسلم اجتہاد بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد کرتے اور اس کے متعلق وحی کی جانب سے کوئی اصلاح نہ کی  
 جاتی تو اس کی حقانیت کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین حاصل ہو جاتا ہر مجتہد کے اجتہاد کا یہ معاملہ نہیں اس لیے وہ صرف ظن کی حد  
 تک رہتا ہے۔ .....

اللہ..... اسی طرح آیت بالا میں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں دی گئی کہ رسول کو ہمیشہ صورت واقعہ کی بھی اطلاع دے دی جائے گی بلکہ اس کے فیصلہ کے بِمَآرَاکَ اللہ ہونے کا مطلب صرف اتنا ہوگا کہ وہ اصول منزلہ اور کتاب اللہ کے موافق ہوگا۔ مثلاً فیصلہ کرنے کا آئین یہ بتایا گیا ہے کہ صورت حالات کو مکمل سن لینے کے بعد مدعی سے گواہ طلب کیے جائیں اور گواہاں نہ ہونے کی صورت میں مدعی علیہ سے قسم لے کر اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے اس کے بعد خواہ خارجی واقعات کچھ بھی ہوں ایسے فیصلہ کو بِمَآرَاکَ اللہ فیصلہ ہی کہا جائے گا کیونکہ نہ واقعات کی تک پہنچ جانا شریعت عامہ بنایا جاسکتا ہے نہ یہ ہمیشہ انسان کی قدرت میں ہوتا ہے اس لیے آئین بالا کے موافق یہی فیصلہ بِمَآرَاکَ اللہ کے موافق فیصلہ سمجھا جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے آیت بالا کی تفسیر حضرت مطر سے یہی نقل فرمائی ہے ”قال بالبینات و الشہود“ (درمنثور ص ۲۱۹ ج ۳) ہمارے نزدیک حضرت مطر نے بینہ اور گواہ کو بطور ایک مثال کے ذکر فرمایا ہے۔ صرف اسی میں انحصار نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ فیصلہ فرمادینے کے بعد بھی اہل مقدمہ کو برابر آپ کی ہدایت یہی ہوتی رہی ہے کہ میرے اس آئینی فیصلہ کے بعد بھی اگر اہل معاملہ نے حقیقت سے ذرا بھی عدول کیا ہے تو وہ عند اللہ اپنے آپ کو محرم ہی سمجھیں۔ میرا فیصلہ صرف ایک نظامی آئین کے تحت ہوا ہے اس کو ہمیشہ وبال آخرت سے نجات کا باعث نہ سمجھنا لینا چاہیے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی کا اجتہاد بھی درحقیقت وحی ہی کا حکم رکھتا ہے نہ وحی میں خطا کا احتمال ہوتا ہے اور نہ اجتہاد رسول میں خطا پر استقرار کا احتمال ہے۔ ہماری اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اجتہاد رسول کے باب میں جو اختلاف مدون ہے دراصل وہ لفظی اختلاف ہے جس نے حقیقت کی طرف نظر کی اس نے اجتہاد جائز قرار دیا اور جس نے یہ دیکھا کہ وہ بہر کیف وحی ربانی ہی کی نگہداشت میں ہوتا ہے اس لیے اس کو بھی وحی کے حکم میں سمجھا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

حافظ سیوطیؒ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے قرآن کریم ہی سے ہوا کرتے تھے مگر اس کو اجتہاد نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

و الدلیل علی ذلک ان العلماء حکوا خلافا فی جواز الاجتہاد للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فلو کان حکم بما یفہمہ من القرآن یشمی اجتہاداً لم تتجسہ حکایتہ الخلاف. (الحاوی ص ۱۵۶ ج ۲)

اس کی دلیل یہ ہے کہ علماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اجتہاد کے جواز میں اختلاف کیا ہے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فیصلوں کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظم قرآنی سے مستنبط فرما کر صادر فرماتے تھے اجتہاد کہا جاسکتا تھا تو یہ اختلاف نقل کرنا ہی صحیح نہ ہوتا۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی ارشاد فرمایا ہے وہ یا تو صاف صاف قرآن میں موجود ہے ورنہ اس کی اصل ضرور موجود ہے اور اسی طرح جو فیصلے بھی آپ نے فرمائے وہ سب قرآن ہی کی روشنی میں تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ کوئی اس کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ پھر ابن مسعودؓ سے نقل فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں ہماری ضرورت کے سب علوم موجود ہیں، لیکن ہمارا علم ہی ان کے ادراک سے قاصر ہے۔ (ج ۲ ص ۱۶۰)

اب ذرا غور فرمائیے کہ رسول کو معصومیت کا مقام حاصل نہ ہو تو کیا اس کی رائے کو معصومیت کا یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے بلکہ رائے تو رائے رسول کے خطرات و عواطف قلبیہ بھی وحی ربانی کی زیر نگرانی ہوتے ہیں۔

(تفصیل کے لیے دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۳۱ و ۱۳۲ ج ۱ و حاشیہ ص ۱۳۲ ج ۱ بحوالہ اعلام الموقعین ص ۱۹۸ ج ۱)



انبیاء علیہم السلام سے بددعا کی کلمات کا بر محل صدور بھی صرف بشریت کی بناء پر ہوتا ہے

(۱۱۷۴) حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ دونوں صاحبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء فرمائی۔ الہی میں تجھ سے ایک وعدہ لیتا ہوں امید ہے تو مجھ سے ہرگز اس کا خلاف نہ فرمائے گا۔ میں ایک بشر ہی ہوں۔ تو جس کسی مؤمن بندہ کو میں نے کوئی تکلیف دی ہو یا برا بھلا کہا ہو یا یہ فرمایا کہ اس پر لعنت کی ہو (راوی کو لفظ میں شک ہے) یا اس کے کوڑے لگانے کا حکم دیا ہو تو اس کے حق میں تو اس کو کفارہ رحمت اور قیامت کے دن اپنے دربار میں باعث تقرب بنادینا۔

(خصائص الکبریٰ)

(۱۱۷۵) عبد اللہ بن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ابو الطفیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت وہ کچھ ہشاش بشاش نظر آئے میں نے عرض کی ابو الطفیل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے آپ مجھ کو ذرا ان لوگوں کے نام بتا دیجئے۔ انہوں نے ابھی بیان فرمانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ان کی بیوی سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بولیں ابو الطفیل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! ذرا ٹھہر جائیے کیا آپ کو یہ اطلاع نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء بھی تو فرمائی تھی کہ میں ایک بشر ہی ہوں تو جس کسی مؤمن بندہ کے متعلق میری زبان سے بددعاء کے کلمات نکل گئے ہوں تو الہی تو اس کے حق میں ان کو کفارہ اور رحمت بنادینا۔ (طبرانی۔ احمد)

دعوت الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام  
وما یأتی علیہم انما یأتی من جهة البشریۃ  
(۱۱۷۴) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ وَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ  
قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
اللَّهُمَّ إِنِّي اتَّخِذُ عِنْدَكَ عَهْدًا لَا تُخْلِفْتِهِ  
فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ فَأَيُّ الْمُؤْمِنِينَ أَذِيتُهُ أَوْ سَبِّتُهُ  
أَوْ قَالَ لَعْنَتُهُ أَوْ جَلَدْتُهُ فَاجْعَلْهَا لَهُ زَكَاةً وَ  
صَلَاةً وَ قُرْبَةً تُقَرِّبُهُ بِهَا إِلَيْكَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ.

(رواہ ابو یعلیٰ قال الہیثمی و اسنادہ حسن و  
اخرجه الشیخان بتغییر یسیر عن ابی ہریرۃ  
کما فی الخصائص ص ۲۴۴ ج ۲)

(۱۱۷۵) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُثْمَانَ بْنِ خِثْمٍ قَالَ  
دَخَلْتُ عَلَى أَبِي الطُّفَيْلِ عَامِرِ بْنِ وَائِلَةَ  
فَوَجَدْتُهُ طَيِّبَ النَّفْسِ فَقُلْتُ يَا أَبَا الطُّفَيْلِ  
أَخْبِرْنِي عَنِ النَّفَرِ الَّذِينَ لَعَنَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَمَّ أَنْ يُخْبِرَنِي فَقَالَتْ امْرَأَتُهُ  
سُودَةُ مَهْ يَا أَبَا الطُّفَيْلِ أَمَا بَلَغَكَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ فَأَيُّمَا  
عَبْدٍ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ دَعَوْتُ عَلَيْهِ بِدَعْوَةٍ فَاجْعَلْهَا  
لَهُ زَكَاةً وَ رَحْمَةً. (رواہ الطبرانی فی الاوسط و  
اللفظ له و احمد بنحوه و اسنادہ حسن)

(۱۱۷۴) \* اس جگہ آپ کی زبان سے جو پہلا لفظ نکلا ہے وہ یہی ہے ”الہی میں ایک بشر ہوں“ یہی کلمہ آئندہ روایت میں بھی ہے۔ اور اس طرح اس باب کی پانچویں روایت میں بھی موجود ہے اس سے پہلے بھی ترجمان السنہ کی مختلف روایات میں ہر معذرت کے موقع پر آپ کی زبان مبارک پر شکل اصل کلی کے یہ کلمہ آتا رہا ہے۔ (دیکھو حدیث نمبر ۸۰۴) پھر تعجب ہے کہ جو بات انبیاء علیہم السلام کی نظروں میں اتنی اہم ہو اسی کا انکار لوگوں کی نظروں میں کیونکر اہم بن گیا ہے۔

(۱۱۷۶) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَفَعَ إِلَى حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ رَجُلًا وَقَالَ لَهَا اخْتَفِظِي بِهِ فَعَفَلَتْ حَفْصَةُ وَمَضَى الرَّجُلُ فَدَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا حَفْصَةُ مَا فَعَلَ الرَّجُلُ قَالَتْ غَفَلْتُ عَنْهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَخَرَجَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطَعَ اللَّهُ يَدَكَ فَقَالَتْ بِيَدِهَا هَكَذَا فَدَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا شَأْنُكَ يَا حَفْصَةُ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ قُلْتُ قَبْلُ كَذَا وَكَذَا قَالَ ضَعِي يَدَكَ فَإِنِّي سَأَلْتُ رَبِّي تَبَارَكَ وَتَعَالَى أَيُّمَا إِنْسَانٍ مِنْ أُمَّتِي دَعَوْتُ عَلَيْهِ أَنْ يَجْعَلَهَا لَهُ مَغْفِرَةً.

(رواہ احمد و رجالہ رجال الصحیح و اخرجه فی الخصائص ایضاً ص ۳۴۴ ج ۲ و راجع فی الترجمان ج ۲ ص عن عائشة)

(۱۱۷۶) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نگرانی میں دیا اور ان سے فرمایا یہ انتظام رکھنا کہ وہ بھاگ نہ جائے۔ ایسا ہوا کہ کسی سبب سے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ذرا سی غفلت ہو گئی اور وہ آدمی چل دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ حفصہ! وہ شخص کدھر گیا؟ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے معاملہ میں مجھ سے غفلت ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناگواری کے ساتھ باہر تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ کلمات تھے ”قَطَعَ اللَّهُ يَدَكَ“ خدا تیرے ہاتھ توڑ دے۔ بس اسی وقت ان کے ہاتھ اس طرح مڑ کر رہ گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لائے تو ان کے ہاتھ کی یہ صورت دیکھ کر پوچھا۔ حفصہ! یہ کیا ہوا؟ انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات فرمائے تھے بس ایسا ہو گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنا ہاتھ نیچے رکھ دو میں نے اپنے رب سے یہ دعاء کی ہے کہ اپنی امت میں جس کے لیے بھی میرے منہ سے بد دعاء کے کلمات نکل گئے ہوں الہی تو اس کے حق میں ان کو مغفرت و بخشش کا سبب بنا دینا۔

(اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے)

(۱۱۷۶) \* بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جو ترجمان السنۃ ص ۳۲۲ ج ۲ حدیث نمبر ۱۵۷ میں گزر چکا ہے لیکن وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک ہی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر کسی راوی نے اس کو حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف اور کسی نے حضرت عائشہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ ہم نے دونوں جگہ اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے گویا آپ کے کلمات کا اثر اسی وقت حادثہ کی صورت میں ظاہر ہو چکا تھا یہ ترجمہ ہم نے حضرت استاذ قدس سرہ کے ایک بیان کی روشنی میں کیا ہے ورنہ اس کا ظاہری ترجمہ دونوں جگہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے دعائیہ کلمات کی وجہ سے میں نے اپنے ہاتھ موڑ موڑ کر دیکھنے شروع کیے کہ ان میں سے آپ کی بد دعاء کا اثر کس میں ہے۔ پہلی روایت کے لفظ ”انظر ایہما تقطعان“ میں دیکھ رہی تھی کہ کس ہاتھ کو یہ بد دعاء لگتی ہے اور اس روایت کے لفظ ”ضعی یدک“ اپنا ہاتھ نیچے رکھ دو۔ اس کی تائید کرتے ہیں کہ ان کلمات کا اثر اب تک ظاہر ہونے نہیں پایا تھا۔ اس جگہ حدیث سابق نمبر ۱۵۷ کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ وہ حقیقت اپنی جگہ پھر مسلم ہے۔



(۱۱۷۷) عَنْ أَبِي السَّوَّارِ عَنْ خَالِهِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَانَّاسٌ يَتَّبِعُونَهُ فَاتَّبَعْتُهُ مَعَهُمْ قَالَ فَفَجِئَنِي الْقَوْمُ يَسْعَوْنَ قَالَ وَابْقَى الْقَوْمُ قَالَ فَآتَنِي عَلَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَرَبَنِي ضَرْبَةً إِمَّا بِعَصِيْبٍ أَوْ قَضِيبٍ أَوْ سِوَاكَ أَوْ شَيْءٍ كَانَ مَعَهُ قَالَ فَوَاللَّهِ فَمَا أَوْجَعَنِي قَالَ فَبِتُّ بِلَيْلَةٍ قَالَ أَوْ قُلْتُ مَا ضَرَبَنِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا لِشَيْءٍ عَلِمَهُ اللَّهُ فِي قَالَ وَحَدَّثَنِي نَفْسِي أَنَّ اتَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَصْبَحْتُ قَالَ فَنَزَلَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنَّكَ رَاعٍ لَا تُكْسِرُ قُرُونَ رَعِيَّتِكَ قَالَ فَلَمَّا صَلَّيْنَا الْغَدَاةَ أَوْ قَالَ صَبَحْنَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُمَّ إِنَّ إِنْسَانًا يَتَّبِعُونَنِي وَلَا يُعْجِبُنِي أَنْ يَتَّبِعُونَنِي اللَّهُمَّ فَمَنْ ضَرَبْتُ أَوْ سَبَبْتُ فَاجْعَلْهَا لَهُ كَفَّارَةً وَاجْرَأْ أَوْ قَالَ مَغْفِرَةً وَرَحْمَةً أَوْ كَمَا قَالَ.

(رواه احمد ج ۵ ص ۲۹۴)

(۱۱۷۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّهُمَّ أَنَا بَشَرٌ فَأَيُّ الْمُسْلِمِينَ لَعْنَتُهُ أَوْ شَتَمَتُهُ أَوْ جَلَدَتُهُ

(۱۱۷۷) ابوالسوار اپنے ماموں سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے لگ رہے ہیں، میں بھی ان کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے لگ گیا یہ بیان کرتے ہیں کہ اتنے میں ناگاہ طور پر لوگ بھاگتے ہوئے میرے اوپر آ پڑے۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ لوگوں کو چھوڑ کر میری طرف تشریف لائے اور کھجور کی ایک تر شاخ یا چھڑی یا مسواک یا کوئی اور ایسی ہی چیز ہوگی جو اس وقت آپ کے پاس تھی، آپ نے اس کو لے کر مجھ کو ہلکے سے مار دیا۔ بخدا مجھے کو اس سے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ کہتے ہیں کہ میں نے بڑی بے چینی سے رات کاٹی، یا میں نے یہ بات کہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تنبیہ ضرور کسی ایسی نامناسب بات کی وجہ سے ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں میرے نفس میں ہوگی۔ پھر میرے دل نے کہا کہ کسی طرح صبح ہو تو میں فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ادھر جبریل علیہ السلام وحی لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ گئے اور فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قوم کے نگراں ہیں، اپنی رعایا پر سختی نہ فرمایا کریں۔ یہ کہتے جب ہم صبح کی نماز اداء کر چکے یا یہ کہا کہ جب صبح ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء فرمائی الہی لوگ میرے پیچھے پیچھے لگ جاتے ہیں اور مجھ کو یہ اچھا نہیں لگتا کہ اس طرح وہ میرے پیچھے پیچھے لگے رہیں۔ تو الہی جس کو میں نے مار دیا ہو یا برا بھلا بھی کہا ہو تو اس کے حق میں تو اس میری تنبیہ کو گناہوں کا کفارہ اور ثواب کا سبب بنا دینا یا یہ فرمایا کہ مغفرت اور رحمت بنا دینا، یا اسی کے قریب اور کلمات فرمائے۔ (احمد)

(۱۱۷۸) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الہی میں بھی بشر ہوں تو مسلمانوں میں جس پر بھی میں نے لعنت کی ہو یا اس کو برا بھلا کہا ہو یا اس کے کوڑے لگوانے کا حکم دیا ہو تو اس

(۱۱۷۸) \* اس حدیث میں آپ کی دعاء کا پہلا کلمہ پھر یہی ہے ”میں بشر ہوں“ درحقیقت آپ کے ان تمام کلمات کی روح یہی ہے کہ جب میں بشر ہوں تو بشری خصلت سے بری نہیں ہو سکتا۔ معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ غصہ نہیں آئے گا، کسی کو کوئی تنبیہ نہیں کی جائے گی اور کسی کی کوئی حرکت خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو ناگوار نہیں گذرے گی۔ نہیں نہیں یہ سب کچھ ہو گا مگر ہوا نفس کی بناء پر نہیں، تکبر و لہو....

فَاجْعَلْهَا لَهُ صَلَوةً وَ رَحْمَةً وَ قُرْبَةً تُقَرِّبُهُ بِهَا  
إِلَيْكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ عَنْ جَابِرٍ مِثْلُهُ إِلَّا أَنْ

فِيهِ زَكَاةٌ وَ رَحْمَةٌ. (رواه الدارمی)

(۱۱۷۹) عَنْ مُعَاوِيَةَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ اللَّهُمَّ مَنْ لَعَنْتُ  
فِي الْجَاهِلِيَّةِ ثُمَّ دَخَلَ فِي الْإِسْلَامِ فَاجْعَلْ  
ذَلِكَ قُرْبَةً لَهُ إِلَيْكَ. (رواه الطبرانی کما

فِي الْخَصَائِصِ ص ۲۴۴ ج ۲)

(۱۱۸۰) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرِ  
الصَّدِيقِ قَالَ كَانَ فُلَانٌ يَجْلِسُ إِلَى النَّبِيِّ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا تَكَلَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اخْتَلَجَ بِوَجْهِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنْ كَذَلِكَ فَلَمْ يَزَلْ  
يَخْتَلِجُ حَتَّى مَاتَ رَوَاهُ الْحَاكِمُ فِي صَحِيحِهِ.

کے حق میں تو اس کو باعثِ رحمت و برکت اور قیامت کے دن اپنے دربار  
میں باعثِ تقرب بنادینا۔

(دارمی شریف)

(۱۱۷۹) حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے۔ الہی جس کسی کی جاہلیت کے دور  
میں میں نے اس پر لعنت کی ہو پھر وہ اسلام قبول کر چکا ہو تو اس کو تو اس کے  
حق میں اپنے دربار میں تقرب کا سبب بنادینا۔

(طبرانی شریف)

(۱۱۸۰) عبدالرحمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے  
فرزند ارجمند روایت کرتے ہیں کہ فلاں شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی  
محفل میں آ کر بیٹھا کرتا اور جب آپ گفتگو فرماتے تو استہزاء کے طور پر منہ  
بنایا کرتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا تو یونہی ہو جائے (اللہ تعالیٰ  
نے اس کا منہ اسی طرح بنادیا) اور جب تک وہ جیسا اسی طرح منہ بناتا رہا۔

(حاکم)

اللہ..... غرور کی بناء پر نہیں اور ظلم و تعدی کے طور پر نہیں بلکہ ضعف بشری کی بناء پر۔ یہ معذرت اس لیے نہیں کہ معصیت کا صدور ہوا ہے  
بلکہ اس لیے ہے کہ جب معصومیت ہے تو یہ کلمات بھی معصوم منہ سے کیوں نکلے پھر اس کی معذرت یوں ہے کہ میں بشر ہوں۔ جو رسولوں کو بشر  
نہیں مانتے وہ ان کے عجز و نیاز کی روح سے بھی آشنا نہیں۔

(۱۱۷۹) \* ان حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کی حق تلفی کا گمان ہو تو اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ اس صاحب حق کے لیے  
دعاء کی جائے مگر یہ اس صورت میں ہے جب کہ صاحب حق کے حق کی ادائیگی کی اور کوئی صورت نظر نہ آئے گویا آپ کے ان تواضع و نیاز  
کے کلمات سے امت کے لیے ایک اور اہم سنت معلوم ہوگئی۔

یہ واضح رہے کہ ہر لغت کے محاورات میں کچھ کلمات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے مثلاً بچہ کو پیار و محبت میں  
شریر کا لفظ کہہ دیتے ہیں بعض اوقات بد معاش کا لفظ بھی مہذب زبانوں پر آ جاتا ہے مگر یہ صرف اس ماحول کے ایک محاورہ کی حد تک ہوتا ہے  
اسی طرح عرب میں بھی اس قسم کے کلمات رائج تھے اگر وہ کسی مناسب محل پر شاذ و نادر آپ کی زبان پر آ گئے ہوں تو بشریت کے سواء ان کو  
اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ واقعات مذکورہ پر نظر ڈالی جائے ہر موقع محل تنبیہ ہی تھا اور جو تنبیہی کلمات عرب کے محاورات میں تھے وہی بڑی احتیاط  
کے ساتھ یہاں استعمال ہوئے ہیں مگر معصومیت کا تقاضہ ہے کہ دعائیں دے دے کر ان کی بھی تلافی کر دی جائے۔



(۱۱۸۱) عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا أَكَلَ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِمَالِهِ فَقَالَ كُلْ بِيَمِينِكَ قَالَ لَا اسْتَطِيعُ قَالَ لَا اسْتَطَعْتَ مَا مَنَعَهُ إِلَّا الْكِبَرُ فَمَا رَفَعَهَا إِلَى فِيهِ.

(رواه مسلم) رياض الصالحين ص ۳۱۴.

(۱۱۸۲) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلَى أَعْرَابِيٍّ يَعُودُهُ وَكَانَ إِذَا دَخَلَ عَلَى مَرِيضٍ يَعُودُهُ قَالَ لَا بَأْسَ طَهُورٌ إِنْ شَاءَ اللَّهُ فَقَالَ لَهُ لَا بَأْسَ طَهُورٌ إِنْ شَاءَ اللَّهُ قَالَ كَلَّا بَلْ حُمَّى تَفُورُ عَلَى شَيْخٍ كَبِيرٍ تُزِيرُهُ الْقُبُورَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَعَمْ إِذَا.

(رواه البخاری)

مِنْهَا اسْتَغْفَارُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (۱۱۸۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللَّهِ إِنِّي لَا أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَآتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً. (رواه البخاری)

(۱۱۸۴) عَنْ الْأَعْرَضِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ

(۱۱۸۱) سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ اس نے کہا دائیں ہاتھ سے تو مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بڑائی کی وجہ سے نہیں کھاتا اچھا تو پھر جیسا تو کہتا ہے ایسا ہی ہو۔ اس کے بعد وہ شخص اپنا دایاں ہاتھ منہ تک اٹھا ہی نہ سکا۔ (مسلم شریف)

(۱۱۸۲) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بادیہ نشین شخص کے پاس اس کی عیادت فرمانے کے لیے تشریف لے گئے اور عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب کسی مریض کی عیادت کو جاتے تو یہ کلمات فرمایا کرتے تھے ”لا بأس الخ“ یعنی خدا کرے کوئی تکلیف نہ رہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بیماری گناہوں کا کفارہ ہے۔ چنانچہ اس سے بھی یہی کلمات فرمائے لا بأس الخ وہ بولا ہرگز نہیں یہ تو ایک سخت بوڑھے کو تیز بخار چڑھ رہا ہے اور اس کو قبرستان لیجا کر چھوڑے گا۔ اس پر آپ نے ناگواری سے فرمایا اچھا تو یونہی سہی۔ (بخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ استغفار

(۱۱۸۳) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ بخدا میں بھی ایک ایک دن میں ستر ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے سامنے استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔ (بخاری شریف)

(۱۱۸۴) اغرمزنی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

(۱۱۸۲) \* انبیاء علیہم السلام کی حکم عدولی استہزاء سے ہو خواہ شدت جہالت سے کسی صورت میں مبارک نہیں ہوتی۔ جس کی شان یہ ہو کہ اگر ان کی آواز سے آواز بلند کی جائے تو کی کرائی نیکیاں برباد ہو جائیں۔ ان کی بات کا مقابلہ کرنا بعض مرتبہ بہت خطرناک عواقب کا موجب بن جاتا ہے۔ استہزاء تو کفر ہے، کبر فسوق ہے اور گنوار پن خوفناک عیب ہے ان پر ہمیشہ گرفت کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ قدرت چاہتی ہے کہ جمال کے ساتھ ساتھ کہیں اس کے جلال کا بھی مظاہر ہو جائے تاکہ مخلوق نڈر نہ ہو جائے اور رسولوں کے سامنے اس پیرایہ سے ان کو ادب کا سبق بھی ملتا رہے۔

اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ تَوُوبُوا إِلَى اللَّهِ فَإِنِّي أَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ مِائَةً مَرَّةً. (رواه مسلم)

لوگو! اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کیا کرو کیونکہ میں بھی ایک دن میں سو سو بار توبہ کرتا ہوں۔

(مسلم شریف)

(۱۱۸۵) عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنَّهُ لِيُغَانُ عَلَى قَلْبِي وَإِنِّي لَا سَتَغْفِرُ اللَّهُ فِي الْيَوْمِ مِائَةً مَرَّةً. (رواه مسلم)

(۱۱۸۵) اغرمزنی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے قلب پر ایک بادل سا چھاتا ہے اور میں بھی اللہ تعالیٰ سے دن میں سو سو بار استغفار کرتا ہوں۔ (مسلم شریف)

(۱۱۸۵) \* بشر ایک ضعیف مخلوق ہے اور اس لیے ایک ضعیف مخلوق کے لیے بجائے استکبار کے استغفار کرنا ہی مناسب ہے آفرینش عالم کے وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں تین قسم کی مخلوق تھی۔ نوری یعنی فرشتے وہ معصوم تھے اس لیے ان کا معاملہ صرف ایک تسبیح سے قابل اغماض بن گیا۔ ”سُبْحَنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا“۔ ناری یعنی جنات و شیاطین انہوں نے بڑائی اور استکبار کی چال چلی ”اِسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ“ وہ اسی تکبر کی بدولت ملعون بن گئی خاکی یعنی آدم علیہ السلام انہوں نے عجز و نیاز کے ہاتھ پھیلا دیئے توبہ و استغفار کی زبان کھول دی اور اپنے رب کے سامنے اعتراف و تسلیم کا سر جھکا دیا۔ ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ اس ذل و افتقار اور انابت و استغفار کے صلہ میں تاج خلافت ان کو پہنا دیا گیا۔ یہی سرگزشت پھر آئندہ مخلوق کے استکبار یا استغفار کی بنیاد بن گئی۔ یعنی اولاد ابلیس میں استکبار اور بنی آدم میں استغفار کی سنت قائم ہو گئی اس لیے بنی آدم میں جو مخصوص افراد فطرت پر پیدا ہوتے اور فطرت ہی پر قائم رہتے توبہ و استغفار کرنا ان کی فطرت کی پکار تھی اور جو اس کے برخلاف چل پڑے وہ ابلیس کے قدم پر کہلائے۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام کی استغفار و استغفار فرشتوں کی تسبیح کی طرح فطری ہوتی ہے وہ ان کے ضعف بشری کا تقاضہ ہوتا ہے۔ وہ حقیقتاً کسی گناہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ معصیت کا تصور اور بشری ضعف اس کا مدعی ہوتا ہے۔ جو خود استغفار کرنا نہیں جانتے وہ دوسروں کو استغفار کی تعلیم دینا بھی نہیں جانتے۔ رحمت چاہتی ہے کہ سنت آدم علیہ السلام کو تازہ رکھنے کے لیے ایسے نفوس قدسیہ آتے رہیں جن کی زبانیں توبہ و استغفار کے لیے شب و روز کھلی ہوں اور اس طرح نظر رحمت میں بنی آدم کے لیے اپنے آبائی وطن کی وراثت کا استحقاق پھر قائم ہو جائے آخری حدیث میں کچھ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے بھی کبھی کبھی ایسا سامندہ جاتا ہے کہ میری استغفار بھی صرف مجازی نہیں رہتی بلکہ آدم علیہ السلام کی طرح اس میں حقیقت کی لذت پیدا ہو جاتی ہیں خلاصہ یہ کہ استغفار کو صرف معصیت ہی میں منحصر سمجھ لینا بہت نادانی ہیں ورنہ یہاں لفظ ”عنین“ یعنی بادل کے لفظ کی بجائے صاف معصیت کا لفظ کیوں نہ فرما دیا گیا۔ استغفار انبیاء علیہم السلام کے کمال کی معراج ہے اور اسی لیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت نزدیک آ گیا تو سورہ ”النصر“ میں آپ کو تسبیح و استغفار میں منہمک رہنے کا حکم دیا گیا۔ ”فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ“ تسبیح و استغفار کے اس طرح جمع فرمانے میں انسان کی شان جامعیت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی استغفار کے ساتھ چونکہ اس میں ملکوتی صفت بھی ہے اس لیے ان کا وظیفہ تسبیح و استغفار کا مجموعہ ہے اور اس لیے صرف تسبیح کرنے والوں کی رسائی اس مقام تک نہیں ہوتی جہاں تک کہ تسبیح کے ساتھ استغفار کرنے والوں کی رسائی ہوتی ہے۔

ہمارے اس بیان سے آدم علیہ السلام کی لغزش کے تکوینی اسرار پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے اور جو بات اس عاصی مخلوق کے خلیفہ بنانے میں فرشتوں کی فہم میں نہ آ سکی تھی وہ بھی کچھ نہ کچھ سمجھ میں آنے لگتی ہے اور یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان ہر سہ انواع میں خلافت کا استحقاق للہ.....



### آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبادت

مِنْهَا عِبَادَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(۱۱۸۶) عَنْ الْمُغِيرَةَ قَالَ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى

اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ فَقِيلَ

لَهُ لَمْ تَصْنَعْ هَذَا وَقَدْ غُفِرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ

ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ قَالَ أَفَلَا أَكُونُ عَبْدًا

شَكُورًا. (متفق علیہ)

(۱۱۸۶) مغیرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا طویل

قیام فرمایا ہے کہ پیروں پر ورم چڑھ گیا اس پر لوگوں نے عرض کی آپ کے تو

اگلے پچھلے معاملات سب درگزر ہو چکے آپ کس لیے یہ مشقت اٹھاتے

ہیں؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ

ہوں۔ (متفق علیہ)

للہ..... کس کو ہونا چاہیے۔ فرشتوں کی نظر صرف بنو آدم کی معصیت تک ہی محدود رہی اور اسی حد تک ان کی عصمت کا تقاضہ ہونا چاہیے وہ

معصیت سے آشنا نہ تھے اس لیے استغفار و توبہ کی حقیقت پہچانتے تو کیسے پہچانتے رحمت نے یہ کرشمہ دکھلا دیا کہ صورت معصیت کے ساتھ اگر

استغفار و توبہ رہے تو جنت سے بہوٹ بہوٹ نہیں وہ خلود کی بشارت ہے اور اس کا نقد ثمرہ خلافت الہیہ ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ زمین پر وقت کے

سب سے بڑے اور آخری خلیفہ ہوں ان کی زبان سے مخلوق خدا ایک ایک مجلس میں سو سو بار بھی استغفار سن لے۔

خوب یاد رکھیے خطرہ معصیت سے نہیں خطرہ یہ ہے کہ معصیت کے بعد استغفار نہ ہو اور جب استغفار نہ ہو تو پھر صرف معصیت ہی

معصیت رہ جائے اور اس طرح انسان بنی آدم کی فہرست سے نکل کر اولاد ابلیس میں شمار نہ ہو جائے اب آپ ہی اندازہ فرمائیے کہ جب آغاز

عالم میں مخلوق الہی میں مقبول و مردود کی تقسیم کی بنیاد استغفار ٹھہری اور آئندہ بھی اس درمیانی مخلوق کی اس طرف یا اس طرف مردم شماری کا مدار اسی

استغفار پر ٹھہرا تو پھر استغفار کرنا کتنا اہم وظیفہ ہونا چاہیے اور نیز یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں یہ دلیل معصیت ہوئی یا برہان معصیت۔ وَاللَّهُ

يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ.

(۱۱۸۶) \* انبیاء علیہم السلام کی نقلی عبادت کا معیار بہت بلند ہوتا ہے وہ فرائض میں امت کی خاطر تخفیف کا لحاظ رکھتے ہیں لیکن جہاں ان کا

انفرادی معاملہ آیا پھر وہاں ان کی شان الگ نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبد کی ترقی کا سارا راز ہی جب عبادت میں پنہاں ہو تو جتنا بڑا عبد

ہو اس کی شان عبادت بھی اتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو۔ یہاں قرآن کا حکم بھی یہی تھا۔ ﴿قُمِ اللَّيْلَ أَقَلِيلًا﴾ آپ کی عبادت کی ایک صورت

یہ ہے کہ رات بھر مصروف عبادت رہیں اور صرف تھوڑے سے حصہ میں استراحت ہو۔ تو پھر حکم ایزدی کی تعمیل میں آپ کی جدوجہد جتنی بھی

وسیع ہو سب بجا تھی۔ پھر آپ کی اتباع میں آئندہ بھی بعض ائمہ نے اس سنت کو تازہ رکھا ہے۔ اس حدیث میں یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ

عبادت کی کثرت صرف اس میں منحصر نہیں کہ گناہ موجود ہوں بلکہ بندہ کی شکر گزاری کی بڑی سے بڑی صورت یہی ہے اس لیے بخشش و کرم کا

انعام جتنا زیادہ ہو عبادت کی شان بھی اتنی ہی اونچی ہونی چاہیے۔ یہاں آپ نے دو لفظ فرمائے ہیں عَبْدٌ شَكُورٌ۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ

عبادت پہلے تو تقاضہ عبدیت ہے پھر تقاضا شکر گزاری بھی یہی ہے۔ جب میں عبد بھی عبد شکور ٹھہرا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میری عبادت اسی

کے مناسب نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کے عبد سب ہی ہیں اس لیے اس نعمت کا شکر سب ہی کے ذمہ واجب ہے لیکن ایسے عبد نادر ہیں جو عبد بھی ہوں اور شکور بھی

ہوں۔ ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ میں کفران نعمت کا شکوہ ہے۔ یہ جماعت انبیاء علیہم السلام ہی کا خاصہ ہے کہ وہ پیدائشی طور پر شکر

گزار ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شکور نہیں وہ گویا بعد ہی نہیں۔ ﴿إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾ بے شک نوح شکر گزار بندے تھے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی

تعداد

الانبياء والرسل عليهم الصلوة و

السلام واعداهم

(۱۱۸۷) عَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
(۱۱۸۷) ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے پوچھا یا رسول اللہ کل انبیاء علیہم السلام کی تعداد کتنی تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک لاکھ

(۱۱۸۷) \* واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی سب سے ممتاز شان یہ ہے کہ ان سب کو ماننا بھی ایمان کا ایک رکن اعظم ہے جن کا نام بیان میں آچکا ہے ان کے نام کے ساتھ اور جن کا نام بیان میں نہیں آیا ان پر اجمال کے ساتھ۔ یہاں انبیاء علیہم السلام کی ذات گو سب کے مشاہدہ میں موجود ہوتی ہے مگر ان کی نبوت کا معاملہ پھر اسی طرح عالم غیب میں داخل ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے اور جنت و دوزخ کا۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام کو خود بھی اپنی اور جملہ انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ جو چیز مشاہدہ میں ہوتی ہے وہ صرف ان کی ذات ہے ان کی نبوت نہ مشاہدہ ہوتی ہے اور نہ وہ مشاہدہ کرنے کی چیز ہے۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ کا منکر کافر ہوتا ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں کسی ایک فرد کا انکار یا اجمال ان کی جنس ہی کا انکار یہ سب کفر ہیں اَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ اَمِنَ بِاللَّهِ وَ مَلِكِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ رُسُلِهِ. (البقرہ: ۲۸۵)

لفظ نبی کا اشتقاق: حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ نبی کا لفظ نبأ سے مشتق ہے اور لغت میں انباء گو ہر چیز کے لیے مستعمل ہو سکتا ہے لیکن اس کا عام استعمال اب صرف غیب کی خبروں میں ہونے لگا ہے۔ آیات ذیل ملاحظہ فرمائیے:

وَأَنْبَأَكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَ مَا تَدْخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ. (آل عمران: ۷۹)

پھر جب آپ نے اس بات کو جلا دیا تو وہ بولیں آپ کو یہ خبر کس نے دی آپ نے فرمایا اس نے بنادیا جو بڑا جاننے والا اور واقف کار ہے۔

قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ. (ص: ۶۷-۶۸)

کہہ دو کہ ایک بڑی خبر ہے جس کو تم دھیان میں نہیں لاتے۔

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيمِ. (عم: ۱-۲)

کس چیز کے متعلق یہ باہم گفت و شنید کر رہے ہیں ایک بہت بڑی خبر کے متعلق۔ (یعنی قیامت)

وَاِنْ يَأْتِ الْاَحْزَابُ يَوْدُوْا الْوَالُوْا اَنْهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَغْرَابِ يَسْأَلُوْنَ عَنْ اَنْبَاءِكُمْ. (الاحزاب: ۲۰)

اور اگر وہ فوجیں آجائیں تو یہ آرزو کریں کہ کسی طرح ہم گاؤں میں باہر نکلے ہوئے ہوں پوچھ لیا کریں تمہاری خبریں۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ. (الزمر: ۸۸)

اور تمھوڑے دنوں بعد اس کی خبر جان لو گے۔

لِكُلِّ نَبَأٍ مُّسْتَقَرٌّ. (انعام: ۶۷)

ہر خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور قریب ہے کہ تم اس کو جان لو گے۔

اَنْبِئُونِيْ بِاَسْمَاءِ هٰؤُلَاءِ. (البقرہ: ۳۱)

(فرشتوں سے فرمایا) اچھا ان چیزوں کے نام مجھ کو بتاؤ۔

يَا اٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ. (البقرہ: ۳۳)

اے آدم تم ان کو بتا دو ان چیزوں کے نام۔ اللہ.....



کُمْ الْأَنْبِيَاءُ قَالَ مِائَةُ أَلْفِ نَبِيٍّ وَ أَرْبَعَةٌ وَ عِشْرُونَ أَلْفًا قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ كَمْ الرُّسُلُ مِنْهُمْ قَالَ ثَلَاثٌ مِائَةٍ وَ ثَلَاثَةٌ عِشْرَ جَمِّ غَفِيرٍ

چوبیس ہزار۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ اس میں رسول کتنے تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین سو تیرہ کی بڑی تعداد۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذر! ان میں چار نبی تو سریانی تھے۔ آدم، شیث، نوح

لِلّٰہِ ..... قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ نَبَّأَنَا اللّٰہُ مِنْ

کہہ دو بہانہ مت بناؤ ہم ہرگز تمہاری بات نہ مانیں گے اللہ تعالیٰ ہم کو تمہارے حالات بتا چکا ہے۔

أَخْبَارِكُمْ. (التوبہ)

دیکھو ان تمام مواضع میں لفظ انباء کا استعمال صرف ان خبروں میں ہوا ہے جو اپنے علم و مشاہدہ کی نہیں ہیں بلکہ لاعلمی اور عدم موجودگی کی ہیں اس لیے اس کو نبی پڑھنا چاہیے تھا لیکن تخفیف کے لیے ہمزہ حذف کر دیا گیا ہے اور اب بجائے مہموز کے اس کو نبی (معتل) استعمال کرنے لگے ہیں۔ اس کے مہموز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی جمع انبیاء آتی ہے۔ دیکھو کتاب البوات ص ۲۲۲ و ص ۲۲۳۔

نبی کے معنی: حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ ”نبی“ فاعیل کے وزن پر ہے۔ لغت عرب میں یہ وزن ”فاعل“ اور ”مفعول“ دونوں معنی میں مستعمل ہوتا ہے مگر یہاں اس کو مفعول کے معنی میں لینا زیادہ موزوں ہے۔ اس لحاظ سے ”نبی اللہ“ کے معنی یہ ہوں گے الذی نبأہ اللہ یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہو اور اس کو غیب کی خبریں دی ہوں۔ اب یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو بھی ان کی اطلاع دے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا تو وہ دوسروں کو بھی اس کی اطلاع دے دے گا۔ ورنہ نہیں لیکن جس بات پر اس کا ”نبی اللہ“ ہونا موقوف ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو غیب کی خبریں دی جائیں۔ پس جس حرف سے نبی اور غیر نبی میں امتیاز پیدا ہوتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیب کی خبریں دینا نہ دینا ہے۔ غیب کی خبریں جس طرح انبیاء علیہم السلام بیان کرتے ہیں اسی طرح ان کے علاوہ کاہن و جوتشی وغیرہ بھی بیان کرتے ہیں مگر پھر ان کو انبیاء کیوں نہیں کہا جاتا؟ صرف اس لیے کہ کاہن کو خبر دینے والا شیطان ہوتا ہے رحمن نہیں ہوتا اس لیے وہ نبی اللہ کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ لفظ رسول کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہیے ”رسول اللہ“ بھی صرف اسی کو کہا جائے گا جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہو پس جیسے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا رسول ہو کسی غیر کا رسول نہیں ہو سکتا اور نہ کسی دوسرے کا حکم مان سکتا ہے اسی طرح ”نبی اللہ“ بھی غیر اللہ کا نبی نہیں بن سکتا اور نہ وہ کسی اور کی خبریں دینا قبول کر سکتا ہے۔ جب حقیقت یہ ٹھہری کہ اس کی خبریں صرف انہی خبروں میں منحصر ہو گئیں تو ان پر ایمان لانا بھی لازم ہو گیا کیونکہ اس کے متعلق یہ وہم ہی نہیں ہو سکتا کہ جو خبریں وہ دیتا ہے اس میں شیطان کی وحی کا کوئی احتمال ہو سکتا ہے۔ غیر نبی کی یہ شان نہیں۔ اولیاء اللہ بھی غیب کی خبریں مگر چونکہ وہ ”نبی اللہ“ نہیں ہوتے اس لیے ان کی خبروں پر یہ اعتماد نہیں ہو سکتا کہ اس میں شیطان کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہو سکتی یہ صرف ”نبی اللہ“ کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ فطرۃً غیر اللہ کی خبر قبول ہی نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ دوسروں کی خبروں میں یہ امکان موجود ہوتا ہے اس لیے وہاں حق و باطل مشتبہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی خبروں پر ایمان لانا واجب نہیں ہوتا اور اسی لیے رسول کی طرح ان کی اطاعت کرنی واجب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول اور نبی نہیں بنایا تو اب اس کی کیا ضمانت ہے کہ غیر اللہ نے اس کے قلب میں کوئی بات القاء نہیں کی پھر ان کی اطاعت کو بعینہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کیسے کہا جاسکتا ہے۔ رسول چونکہ اسی لیے رسول بنایا جاتا ہے کہ وہ خدائی احکامات دوسروں تک پہنچا دے اس لیے وہاں یہ احتمال نہیں ہو سکتا اور اس لیے دوسروں کو اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ لہذا.....

ثُمَّ قَالَ يَا أَبَا ذَرٍّ! أَرْبَعَةٌ سُرِّيَا نِيُونِ آدَمُ خَنُوحَ (عليهم السلام) یہ اور لیس علیہ السلام کا نام ہے اور یہ پہلے وہ نبی ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا۔ اور چار ان میں عرب کے ہیں۔ ہود صالح، شعیب (عليهم السلام) اور تمہارا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بنی اسرائیل میں جو

لِلَّهِ ..... وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ  
بِإِذْنِ اللَّهِ. (النساء: ۶۴)  
اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمان سے۔

علماء امت بھی گواہ اللہ تعالیٰ ہی کی حکم برداری اور اسی کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں اور اکثر ان کا یہ حکم درست ہی ہوتا ہے، مگر چونکہ ان کو غیر اللہ کی اطاعت پر اللہ کی اطاعت سمجھنے کی غلط فہمی ہو سکتی ہے اس لیے نادانستگی میں وہ غیر اللہ کی اطاعت کا حکم بھی دے سکتے ہیں اسی لیے علماء کی اطاعت کو بعینہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی حال امت کے محدثین اور ملہمین کا ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہامات ہوتے ہیں وہ بھی معصوم نہیں ہوتے اس لیے ان کے الہامات میں بھی شیطانی وساوس کا احتمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے الہامات کے حق و ناحق ہونے کا معیار انبیاء علیہم السلام کی وحی سے مطابقت و مخالفت قرار دیا گیا ہے۔ شیاطین کو چونکہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پوری عداوت ہوتی ہے اس لیے وہ خوب پہچانتے ہیں کہ رحمن کی وحی کیا ہے اور شیطان کا فریب کیا ہے۔ کتاب النبوات ص ۶۶ و ص ۱۶۷۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کیا عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو احکامات رسول کے واسطے سے ہمارے پاس آئیں وہ تو کسی تفصیل کے بغیر بے چون و چرا قابل تسلیم ہوں اور جو ہم خود بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے سنیں یعنی الہام کے طور پر وہ اس وقت تک قابل اعتماد نہ ہوں جب تک کہ رسول کی وحی پر اس کو تول نہ لیا جائے۔ چنانچہ رسول کی شان میں ارشاد ہے:

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ  
فَانْتَهُوا. (الحشر: ۷)  
رسول جو تم کو دے وہ لے لو اور جس بات سے روکے اسے چھوڑ دو۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ رسول کی بات مطلقاً قبول کر لینی فرض ہے۔ اب یہ کیسی تعجب کی بات ہے کہ رسول اللہ کی ذات خود تو مقید ہے (ظاہر ہے کہ انسان ہر گوشہ میں مقید ہے اپنی ذات میں بھی اور اپنی صفات میں بھی) مگر اس کا حکم ماننا مطلقاً واجب ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات گو خود تو مطلق ہے مگر اس کے بلا واسطہ احکام کا قبول کرنا مفید ہے۔ یعنی اس کو میزان شریعت پر تولنا ضروری ہے۔ پھر اس کی تفصیل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ رسول چونکہ خود معصوم ہوتا ہے اور اس کو اسی لیے بھیجا جاتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے احکام مخلوق کے سامنے بیان کرے اس لیے جب اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے تو پھر اس کی حکم برداری کا حکم مطلق کیوں نہ ہو۔ رسول کے علاوہ کسی کو اس لیے مقرر نہیں کیا جاتا کہ وہ احکام ربانی دوسروں تک پہنچائے، اس لیے ”مبین“ یعنی کھول کر بیان کرنے والا۔ ان کا منصب نہیں ہوتا اس لیے وہاں نہ احتمال موجود ہوتا ہے کہ اس میں کوئی غیبی آزمائش ہو قدرت کو یہ امتحان منظور ہو کہ اعتماد رسول کی وحی پر ہے یا اپنے الہام پر۔ پھر اگر اپنے الہام پر اعتماد کر لیا گیا ہے تو کیوں؟ قدرت نے جب ان کو نبی نہیں بنایا تو ان پر شیطان دشمن کی طرف سے وحی کیوں نہیں آ سکتی اور ان کے پاس اس کی ضمانت کیا ہے کہ جس کو انہوں نے الہام رحمن سمجھا ہے وہ درحقیقت الہام رحمن ہی ہے۔ یہ ضمانت صرف ایک رسول کے حق میں ہے ان کے علاوہ کسے باشند ان کے علوم میزان یہی علوم نبوت ہیں۔ ایواقیۃ والجواہر۔ ص ۴۴ و ۴۵ ج ۲۔

نبی اور رسول کا فرق: حافظ ابن تیمیہؒ نبی اور رسول کا فرق لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو غیب کی خبریں لکھے.....



وَصَالِحٌ وَشُعَيْبٌ وَنَبِيُّكَ وَأَوَّلُ نَبِيٍّ مِنْ  
 أَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ  
 آخِرُهُمْ عِيسَى وَأَوَّلُ النَّبِيِّينَ آدَمُ وَآخِرُهُمْ  
 سب سے پہلے نبی تھے وہ موسیٰ علیہ السلام تھے اور سب سے آخری عیسیٰ  
 (علیہ السلام) تھے خلاصہ یہ کہ نبیوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام  
 تھے اور سب سے آخر میں تمہارا نبی (اللہم صل وسلم وبارک علیہم) یہ

لہ ..... دے کر نبی بنا دے تو وہ ”نبی اللہ“ بن جاتا ہے۔ اور جب تک کسی کافر قوم کو خدائی پیغامات پہنچانے کا اس کو حکم نہ دے اس  
 وقت تک وہ صرف ”نبی اللہ“ ہی رہتا ہے خواہ وہ کسی پہلی شریعت پر ہی عمل کرتا رہے ہاں جب اس کو کسی کافر قوم کو خدائی احکام پہنچانے کا  
 حکم ہو جائے تو اب وہ ”نبی اللہ“ ہونے کے ساتھ ”رسول اللہ“ بھی بن جاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے  
 درمیان جو اس کے برگزیدہ بندے گزرے ہیں وہ سب انبیاء تھے۔ ”رسول اللہ“ ان میں کوئی نہ تھا۔ ان کا وظیفہ صرف یہ تھا کہ وحی ربانی  
 پر خود عمل کریں اور مومنوں کی جو جماعتیں ان کے سامنے تھیں ان کو بھی عمل کرنے کا حکم دیں۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا اور کفر  
 ظاہر ہوا تو اب ان کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے اور وہ رسول اللہ کہلائے۔ اسی لیے ان کو حدیثوں میں  
 سب سے پہلا رسول کہا گیا ہے۔

علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل کا مقصد: اس بیان سے ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تذکیر و نصیحت کا تعلق صرف مومنوں کے  
 دائرہ تک محدود رہا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر احکامات آتے اور وہ ان کو مومنوں کو سنا دیتے جیسا کہ انبیاء بنی اسرائیل تھے وہ خود  
 تورات کی شریعت پر عامل تھے۔ اگرچہ خاص خاص معاملات میں ان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے خاص خاص وحی بھی آتی تھی۔ پھر وہ اس وحی  
 کی روشنی میں بنی اسرائیل کے مقدمات کے فیصلے کرتے ہیں۔ یہی نکتہ تھا کہ آپ نے اپنے علماء امت کو بنی اسرائیل کے انبیاء سے تشبیہ دی  
 ہے اور علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل فرمایا ہے اور بنی اسرائیل کے رسولوں سے تشبیہ دے کر یوں نہیں فرمایا علماء امتی کو سل بنی اسرائیل۔  
 اس کے بعد حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ رسول کے لیے جدید شریعت الانا قطعاً ضروری نہیں۔ دیکھو حضرت یوسف علیہ السلام رسول اللہ  
 تھے باوجودیکہ وہ ملت ابراہیمی پر تھے۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی رسول اللہ تھے اور شریعت تورات  
 پر عامل تھے۔ کتاب النبوات ص ۷۳ و ۷۴۔

نبوت اور رسالت کی اس تشریح سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ صرف وحی یا ارسال یا بعثت کے لفظ سے نہ رسالت ثابت ہوتی ہے نہ  
 نبوت یہ سب الفاظ لغت میں عام معنی میں بھی مستعمل ہوتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

وحی کا عام اطلاق: ﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا لِّخَلْوَةٍ﴾ (النحل: ۶۸)

”اور تمہارے پروردگار نے وحی بھیجی (یعنی حکم دیا) شہد کی مکھی پر کہ پہاڑوں میں چھتے بنالے۔“

﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ (یوسف: ۱۵)

”اور ہم نے (یوسف علیہ السلام) کو اشارہ کیا (وحی کی) کہ تم ان کے کام ان کو جتاؤ گے اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے۔“

﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ﴾ (القصص: ۷)

”اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو حکم بھیجا کہ اس کو دودھ پلاتی رہ۔“

﴿وَإِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي﴾ (المائدة: ۱۱)

نَبِیِّکَ (اخرجه ابن حبان فی صحیحہ و قال حدیث موضوع تو نہیں مگر ضعیف ہے۔

صاحب الدر المنثور و الصواب انه ضعیف لا (درمنثور)

صحیح و لا موضوع) (اخرجه عبد بن حمید و الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول و ابن حبان فی صحیحہ و الحاکم و ابن عساکر) وقد تکلم الحافظ ابن کثیر فی اسانیده و ضعفها کما فی البدایة و النہایة ج ۲ ص ۱۵۱ و ج ۳ ص ۱۵۳ و ج ۱ ص ۹۷

للہ..... ”اور جب میں نے دل میں ڈال دیا حواریوں کے کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر۔“

﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَآءِهِمْ﴾ (الانعام: ۱۲۱)

”اور شیطان دل میں ڈالتے ہیں اپنے دوستوں کے۔“

﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَنُحَاسٌ﴾ (الرحمن: ۳۵)

”چھوڑے جائیں تم پر آگ کے صاف شعلے اور دھواں ملے ہوئے۔“

رسالت کے عام معنی: ﴿وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَّاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ﴾ (الاعراف: ۵۷)

”اور وہی ہے کہ ہوائیں خوش خبری لانے والی چلاتا ہے بارش سے پہلے۔“

﴿يَا لَوْ طُوتِ أَرْسُلُ رَّبِّكَ لَنُيْصِلُوا إِلَيْكَ﴾ (هود: ۸۱)

”مہمانوں نے کہا اے لوط ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ یہ ہرگز آپ تک نہ پہنچ سکیں گے۔“

﴿الْم تَرَانَا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَوْرَهُمْ آزًا﴾ (مریم: ۸۲)

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کافروں پر شیطان رکھ چھوڑے ہیں جو ان کو ابھارا بھار کر اچھالتے ہیں۔“

بعثت کے دوسرے معنی: ﴿فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَٰئِهِمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ﴾ (بنی اسرائیل: ۵)

”پھر جب پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے بھیجے۔“

﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيُبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ يُّسَوِّمُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ﴾ (الاعراف: ۱۶۷)

”اور اس وقت کو یاد کرو جب تیرے رب نے خبر کر دی تھی کہ یہود پر ایسے شخص کو ضرور بھیجتا رہے گا جو ان کو بڑا عذاب دیا کرے۔“

پہلی پانچ آیتوں میں وحی کا اطلاق وحی نبوت کے علاوہ عام معنوں میں ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ منہ نبیہ تھیں نہ رسول اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام پر جس وحی کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ان کے بچپن کا واقعہ ہے اس وقت تک وہ رسول نہ تھے۔ اسی طرح حواری بھی رسول نہ تھے۔ حتیٰ کہ اس عام معنی کے لحاظ سے اس کا استعمال شہد کی مکھی میں بھی آیا ہے اور آخری آیت میں شیطانی القاء کو بھی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ لغت کے لحاظ سے ہر وہ بات جو خفیہ طور پر اور اشارات میں کہی جائے وحی کہلاتی ہے۔ وحی نبوت ایک خاص اصطلاح ہے۔ اسی طرح لفظ رسول اور ارسال بھی عام ہے۔ اس لفظ کو بھی اللہ تعالیٰ ملائکہ شیطانی آتش اور ہواؤں میں بھی استعمال فرمایا گیا ہے۔ آیات بالا ملاحظہ فرمائیے لیکن اصطلاح میں اس کا اطلاق اب صرف اللہ تعالیٰ کی رسالت سے للہ.....



للہ..... مخصوص ہے۔ عام رسالت کا مقصد صرف کسی مقررہ خدمت کا انجام دینا ہوتا ہے۔ یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مخلوق کو کوئی پیغام پہنچایا جائے یہی حال لفظ بعث کا ہے اس کا استعمال بھی بعثت شرعی اور بعثت کوئی دونوں میں آیا ہے۔ یہاں گفتگو ان کے عام معانی میں نہیں بلکہ خاص ”وجی النبوة“ ”و”نبی اللہ“ ”و”رسول اللہ“ بالاضافت کے معنی میں ہے اور جو تشریح اوپر بیان کی گئی ہے وہ ان مقید الفاظ ہی کی ہے۔<sup>۱</sup>



۱۔ واضح رہے کہ نبی اور رسول کے الفاظ اسلامی تصانیف میں اللہ کے اسم مبارک کے بعد دوسرے درجہ کی شہرت رکھتے ہیں حتیٰ کہ علمی کتابوں میں شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہوگی خواہ وہ کسی فن کی کیوں نہ ہو جس میں ان الفاظ کی تشریح نہ کی گئی ہو مگر آپ کو حیرت ہوگی کہ اصطلاحات کی ریاضت نے اس بدیہی مسئلہ کو بھی اتنا الجھا دیا ہے کہ اس جیسا صاف مسئلہ بھی ہر جگہ نظری بنا ہوا نظر آتا ہے۔ حافظ موصوف نے جس طرح یہاں اس کو سلجھا دیا ہے اتنا صاف ہماری نظر سے اور کہیں نہیں گذرا۔ حضرت استاذ قدس سرہ فرماتے تھے کہ حافظ موصوف کی پوری کتاب النبوات میں ایک یہی مسئلہ قابل قدر ہے۔ اس لیے اگر آیات قرآنیہ اور صحیح حدیثوں کی روشنی میں یہ تحقیق درست ثابت ہوتی ہے تو کسی ضعیف روایت کی بناء پر اس کو ترک کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ آدم علیہ السلام کے متعلق اکثر حدیثوں میں ”نبی مکرم“ کے لفظ آتے ہیں۔ اگر کسی راوی نے یہاں رسول کا لفظ نقل کر دیا ہے تو اتنی بیش قیمت تحقیق کو صرف راوی کے ایک لفظ سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اس روایت کی بناء پر جن بعض اکابر نے حافظ موصوف سے یہاں اختلاف رائے فرمایا ہے ہمیں ان کے ساتھ اتفاق نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

## سیدنا و سید ولد ادم الرسول الاعظم محمد النبی الامی المطلبی الهاشمی

### اولہم خلقا و اخرہم بعثا صلوات اللہ وسلامہ علیہ

معنوی نظر میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سروری کا کچھ اندازہ کرنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ قرآن شریف سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت کی ابتداء و انتہاء بشکل دائرہ ہوئی ہے۔ اس لیے یہ بات معلوم کرنی ضروری ہے کہ ایک دائرہ کے لیے کیا کیا باتیں ضروری ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ دائرہ کی ابتداء اور اس کی انتہاء بالکل یکساں ہوتی ہے اس کے دونوں سروں میں اگر ذرا سا بھی فرق رہ جائے تو دائرہ تمام نہیں ہو سکتا، پھر ہر دائرہ کے لیے ایک مرکز کا ہوتا بھی لازم ہے۔ مرکز کے بغیر کسی دائرہ کا موجود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب تک مرکز متعین نہ ہو جائے اس وقت تک دائرہ کا خط کھینچ ہی نہیں جاسکتا۔ پھر جب مرکز متعین ہو جائے تو دائرہ میں جتنے بھی نقطے فرض کیے جائیں ضروری ہے کہ ان سب کا رخ اسی مرکز کی طرف رہے اگر کوئی نقطہ اس مرکز سے ذرا علیحدہ فاصلہ پر رہے گا بس نہ وہیں سے دائرہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر جس طرح وجود دائرہ کے لیے مرکز کا تعین پہلے ضروری ہوتا ہے اسی طرح ظہور مرکز کے لیے دائرہ کے وجود کی ضرورت ہوتی ہے یعنی جب دائرہ کھینچا جاتا ہے تو ضرور کسی مرکز سے کھینچا جاتا ہے مگر جب تک دائرہ تمام نہیں ہو لیتا اس وقت تک مرکز کا وجود معرض ظہور میں نہیں آتا۔ پھر یہ کہ کسی دائرہ میں دو مرکز نہیں ہو سکتے، البتہ ایک ہی مرکز پر چھوٹے بڑے بہت سے دائرے کھینچے جاسکتے ہیں۔ اب سنیے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے **إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ** اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت کی آفرینش بشکل دائرہ ہوئی ہے اسی لیے اس کا ابتدائی نقطہ یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور اس کا انتہائی نقطہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں کو یکساں فرمایا گیا ہے۔ یہ صفت دائرہ ہی کی ہوتی ہے کہ جو اس کا ابتدائی نقطہ ہوتا ہے وہی آخر میں اس کا انتہائی نقطہ بن جاتا ہے۔ خط مستقیم میں یہ صفت نہیں ہوتی اس کے ابتداء و انتہاء کے دونوں نقطے بالکل علیحدہ علیحدہ ممتاز ہوتے ہیں۔ یہاں جب دائرہ کے ابتدائی نقطہ کی طرف نظر کی جاتی ہے تو وہ حضرت آدم علیہ السلام نظر آتے ہیں جن کے نہ والدہ تھیں نہ والد۔ ان کے بعد حضرت حواء کا وجود ہوا جو حضرت آدم علیہ السلام کی پہلی سے بنائی گئی تھیں اس لیے اس کو ولادت سے تعبیر کیا نہیں جاسکتا جیسے کسی شخص سے اگر اس کا ہاتھ الگ کر لیں تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ہاتھ اس سے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت حواء کو چونکہ ضلع آدم علیہ السلام سے بنایا گیا تھا اس لیے ان کو آدم علیہ السلام کی ذریت میں شمار نہیں کیا جاسکتا لہذا اب ان کو بھی سلسلہ تخلیق میں اسی مرتبہ میں رکھنا پڑے گا جس میں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام بہ حیثیت والد کے نہ سہی بہ حیثیت اصل ہونے کے حضرت حواء سے اشرف ہوں مگر یہ نسبت صرف ان دونوں کے درمیان رہے گی بنی آدم کے لیے دونوں ہی مبداء ہوں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سلسلہ خلافت کے لیے اور اجسام انسانیہ کے مبداء اول اور حضرت حواء صرف اجسام انسانیہ کے لیے مبداء مگر مبداء ثانی ہوں گی۔ اب اگر ان پر غور کیا جائے تو حضرت حواء کے لیے والدہ کوئی نہیں ہاں حضرت آدم علیہ السلام ان کی اصل ہونے کی وجہ سے والد کی جگہ کہے جاسکتے ہیں۔ پس جب تخلیق کے ابتدائی نقطہ جو اس کے مقابلہ میں آ کر دائرہ کو پورا کر سکتا ہے ایسا ہی ہونا چاہیے جس میں ایک مذکر اور ایک مؤنث ہو مگر یہاں والدہ ہو مگر والد کوئی نہ ہوتا کہ اطراف دائرہ میں ایک طرف کی کمی اور دوسری طرف کی زیادتی بالمقابل آ جائیں یعنی اگر ابتداء میں والدہ کی کمی ہے تو انتہاء میں والدہ کی زیادتی ہو اور اگر ابتداء میں والد کی زیادتی ہے تو انتہاء میں والدہ کی کمی رہے اور اس طرح اطراف دائرہ کے نشیب و فراز دونوں مل کر ایک دائرہ پورا ہو سکے۔ یہاں جب تمام انبیاء علیہم السلام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس صفت کا انسان بجز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور کوئی نہیں ملتا۔ سلسلہ تخلیق میں اگر ایک طرف



حضرت حواء ہیں جن کی والدہ نہ تھیں تو دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کے والد نہ تھے۔ شاید یہ خیال گزرے کہ اس بناء پر تشبیہ ان دو میں ہوئی لہذا بظاہر آیت یوں ہونی چاہیے تھی کہ ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل حواء تا کہ جو دو نقطے مقابل تھے وہی معرض بیان میں آتے اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے مقصد چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا والد کے بغیر صرف اپنی قدرت کاملہ سے ظاہر کرنا منظور ہے اس لیے اس میں حضرت آدم علیہ السلام ہی کے ساتھ تشبیہ دینی زیادہ مؤثر تھی اگر کمثل حواء فرماتے تو حضرت حواء کے لیے حضرت آدم علیہ السلام والد کے قائم مقام موجود اور یہاں منظور یہ تھا کہ علاقہ والدیت کا یکسر قلع قمع کر دیا جائے لہذا ایسی ہستی کے ساتھ تشبیہ دی جن کے لیے نہ والد تھے نہ والدہ تا کہ خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بھی پورا ثبوت ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں کسی ادنیٰ سی تشبیہ سے بھی والد کا خطرہ ذہن میں نہ گذر سکے۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ دائرہ نبوت جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آ کر ختم ہو گیا۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں:

واللہ تعالیٰ کے قول اذ جعل فیکم انبیاء کی تفسیر یہ ہے کہ جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو تم میں سے ہی دوسرا نبی اس کے قائم مقام آ جاتا۔ تمہارے والد (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) سے لے کر بعد تک یہی دستور رہا اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی دعوت دیتے رہے اور اس کے عذاب سے ڈراتے رہے یہاں تک کہ

و قوله اذ جعل فیکم انبیاء ای کلما ہلک نبی قام فیکم نبی من لدن ابراہیم الی من بعدہ و کذلک کانوا لا یزال فیہم الانبیاء یدعون الی اللہ و یحذرون نعمتہ حتی ختموا بعیسی علیہ السلام۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۳۱) یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آ کر ختم کر دیا گیا۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس تقدیر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کیا رہے گی تو اس کا جواب ظاہر ہے وہ یہ کہ آپ کی حیثیت مرکز کی حیثیت ہے اسی لیے آپ کو مرکز کی طرح ظاہری طور پر بھی سلسلہ نبوت سے بالکل الگ سلسلہ میں پیدا فرمایا گیا تھا اور تعجب ہے کہ یہاں بھی اس کی رعایت رکھی گئی کہ جس طرح مرکز ایک ہی ہوتا ہے اسی طرح حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور دوسرا رسول ہی پیدا نہ ہو۔ پھر جس طرح آپ کو دائرہ نبوت کا مرکز بنایا گیا تھا اسی طرح آپ کی ولادت کے لیے بھی وہی مقام پسند فرمایا گیا جو زمین کا مرکز کہلاتا ہے یعنی مکہ مکرمہ۔ اور جس طرح بیت اللہ کو زمین کا مرکز قرار دے کر سب سے پہلے وجود میں لایا گیا تھا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق بھی سب سے پہلے مقدر ہوئی تا کہ تعین مرکز ہو لے تو دائرہ نبوت اسی کے ارد گرد کھینچا جاسکے لیکن مرکزیت کا ظہور چونکہ دائرہ کی تمامیت پر موقوف ہوتا ہے اس لیے مقدریوں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حسی طور پر ظہور قدسی جملہ انبیاء علیہم السلام کی آمد کے بعد ہوا اور جس طرح محیط دائرہ کی نسبت ہر طرف سے اپنے مرکز سے مساوی ہوتی ہے اسی طرح جملہ انبیاء علیہم السلام کی نسبت مرکزیت سے آپ کے ساتھ برابر ہے حتیٰ کہ اگر موسیٰ علیہ السلام جیسی بڑی شریعت والا رسول بھی آپ کے دور میں آتا تو اس کو بھی آپ کی اتباع کیے بغیر کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اسی مرکزیت کے اعلان کے لیے جملہ انبیاء علیہم السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت کا قولاً و عملاً عہد لیا گیا تھا اور اسی کے اظہار کے لیے شب معراج میں جملہ انبیاء علیہم السلام کی امامت کا شرف آپ کو ہی عنایت ہوا اور اسی حقیقت کے عالم آشکارا کرنے کے لیے محشر میں ”لواء الحمد“ یعنی حمد کا جھنڈا آپ ہی کے ہاتھ میں ہو گا جس کے نیچے آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سب انبیاء علیہم السلام ہوں گے۔ تفصیل کے لیے ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۳۲۳ حدیث نمبر ۱۱۲ کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

اس بیان کے اہم رکن دو ہیں۔ تکوینی نظر میں نبوت کی تخلیق بشکل دائرہ ہونی اور آپ کی تخلیق بہ حیثیت مرکز ہونی ان دونوں کی طرف قرآنی آیات میں اشارہ موجود ہے اس لیے ہمارے اس بیان کو گوبرہان کا درجہ حاصل نہ ہو مگر محض خیالی بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارے مذکورہ بالا بیان سے اب حدیث انسا اولہم خلقا و اخرہم بعثا کی پوری شرح بھی ہوگئی۔ اس مضمون کی تائید قرآن کریم کی ایک اور آیت سے بھی ہوتی ہے ارشاد ہے۔ **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ**۔ یعنی ابتداء آفرینش دین ایک ہی تھا پھر جو جو اختلاف رونما ہوئے وہ امتوں کی کج رویوں سے رونما ہوئے۔ اسی طرح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں دین پھر ایک ہی رہ جائے گا جس کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دست مبارک سے ڈال چکے ہیں۔ مذاہب سماویہ میں بنیادی لحاظ سے قبلہ دورہ چکے ہیں: بیت مقدس، بیت اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے خود بیت مقدس کا بھی استقبال فرمایا اس کے بعد پھر بیت اللہ کو قبلہ متعین فرمادیا۔ سوچئے جب آخر کار قبلہ یہی ہونا تھا تو بیت مقدس کے عارضی استقبال کی حکمت کیا تھی؟ بے شک ایک حکمت یہ بھی تھی کہ آخری رسول کے دور میں سابقہ سب اختلافات کو ختم کر کے پھر ایک دین پر جمع کر دیا جائے اور اس کی صورت یہی تھی کہ آپ عملی طور پر یہ بتادیں کہ اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی تھا۔ قبلہ کے مسئلہ کو صرف نا فہمی سے اختلافات کی بنیاد بنایا گیا۔ اس لیے مدینہ طیبہ میں آ کر پہلے آپ نے بیت مقدس ہی کا استقبال فرمایا اور عملاً یہ ثابت فرمادیا کہ یہ مسئلہ کوئی بنیادی اختلاف کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی لیے جو رسول وحدت ادیان کا اہم مقصد لے کر آیا ہے وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ قبلہ کی تقسیم صرف ایک وقتی مصلحت کے پیش نظر رہی ہے ورنہ اصل مقصد توحید الی اللہ ہے اور یہ کسی خاص سمت کے ساتھ مخصوص نہیں **فَاَيْنِسْمَا تَوَلَّوْا فَسَمَّ وَجْهَ اللَّهِ**۔ اس حقیقت کو آپ نے اتنا واضح فرمایا کہ استقبال قبلہ جو نماز کی صحت کی شرائط میں شمار ہوتا ہے نفل نمازوں میں بحالت سفر مسافر کی سہولت پر چھوڑ دیا۔

الغرض جب ابتداء میں دین ایک تھا تو چونکہ دائرہ کی ابتداء اور انتہاء یکساں ہوتی ہے اس لیے عالم کی انتہاء میں پھر دین ایک ہی ہو جانا چاہیے اس لیے اس کی صورت یہ مقدر ہوئی کہ جس طرح ایک اسماعیلی رسول نے آ کر اسرائیلی قبلہ کا استقبال کیا تھا اسی طرح ایک اسرائیلی رسول آ کر اسماعیلی قبلہ کا استقبال کر لے اور یہ بات پورے طور پر واضح ہو جائے کہ نہ تو اصل دین میں کوئی اختلاف ہے اور نہ انبیاء علیہم السلام میں باہم کوئی اختلاف ہے۔ جو اختلافات بھی ہوئے یہ سب امتوں کی کج روی کے نتائج تھے۔ **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ**۔ اب اگر اس مقصد کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوتی تو یہ ختم نبوت کے خلاف تھا اس لیے مقدر یوں ہوا کہ آپ سے پہلے وہ بہ حیثیت نبوت ان کا ظہور بھی ہو جائے پھر اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپ کی دوسری آمد بہ حیثیت امامت بھی ہو ظاہر ہے کہ جو بنی اسرائیل کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اب بنی اسماعیل میں اس کی آمد سے اس کے نبی ہونے نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ اپنے دورہ نبوت کو پورا کر کے اب بہ حیثیت امامت امت محمدیہ تشریف لائیں گے اور ہم پہلے ترجمان السنۃ ج ۳ ص ۳۴۳ میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ مقام وہ تھا جس کو اولو العزم انبیاء نے بھی تمنا کی ہے اس لیے یوں مقدر ہوا کہ اس اہم مقصد کے ظہور کے لیے عالم کے خاتمہ پر وہ رسول آئے جو پہلے نبی سے مشابہ ہوتا کہ جس طرح دین پہلے ایک تھا آخر میں پھر ایک ہی رہ جائے اور جب اس طرح اتحاد ملل کا کام مکمل ہو جائے تو پیدائش عالم کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو جانے کی وجہ سے عالم کی صف لپیٹ کر رکھ دی جائے اور قیامت آجائے۔

اللَّهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ أَوَّلِهِمْ خَلْقًا وَ آخِرِهِمْ بَعثًا





(۱۱۸۸) عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا أَوَّلُ شَفِيعٍ فِي الْجَنَّةِ لَمْ يُصَدَّقْ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ مَا صَدَقْتُ وَإِنْ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ نَبِيًّا مَا صَدَّقَهُ مِنْ أُمَّتِهِ إِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ. (رواه مسلم)

(۱۱۸۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ وَأَوَّلُ شَافِعٍ وَأَوَّلُ مُشَفِّعٍ. (رواه مسلم)

(۱۱۹۰) عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا أَكْثَرُ الْأَنْبِيَاءِ تَبَعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَنَا أَوَّلُ مَنْ يَقْرَعُ بَابَ الْجَنَّةِ.

(رواه مسلم)

(۱۱۹۱) عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّبِعْ بَابَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَاسْتَفْتِحْ فَيَقُولُ الْخَازِنُ مَنْ أَنْتَ فَقُولُ مُحَمَّدٌ فَيَقُولُ بِكَ أَمْرٌ أَنْ لَا أَفْتَحَ لِأَحَدٍ قَبْلَكَ. (رواه مسلم)

(۱۱۹۲) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَبِيَدِي لَوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ وَمَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ آدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ إِلَّا تَحْتَ لَوَائِي وَأَنَا أَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْأَرْضُ وَلَا فَخْرَ. (رواه الترمذی)

(۱۱۹۳) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَلَسَ نَاسٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(۱۱۸۸) میں جنت کے لیے سب سے پہلا شفاعت کرنے والا ہوں۔ انبیاء سابقین میں اس کثرت کے ساتھ کسی کی تصدیق نہیں کی گئی جتنی کہ میری۔ بعض انبیاء تو ایسے بھی ہوئے ہیں جن کی تصدیق صرف ایک ہی شخص نے کی ہے۔

(مسلم شریف)

(۱۱۸۹) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ روزِ محشر تمام اولادِ آدم کا سردار میں ہوں گا۔ قبر پھٹ کر جو سب سے پہلا شخص باہر آئے گا وہ میں ہوں جو نبی سب سے پہلے مخلوق کی شفاعت کرے گا وہ میں ہوں اور جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی وہ میں ہوں۔ (مسلم شریف)

(۱۱۹۰) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت میں جس نبی کے ماننے والے سب سے زیادہ ہوں گے وہ میں ہوں اور جو سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھلوانے کے لیے دستک دے گا وہ میں ہوں۔

(۱۱۹۱) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن میں جنت کے دروازہ پر آؤں گا اور دروازہ کھلواؤں گا۔ جنت کا دربان پوچھے گا آپ کون؟ میں کہوں گا میں ہوں محمدؐ وہ عرض کرے گا مجھ کو حکم ملا ہے کہ سب سے پہلے میں آپ ہی کے لیے دروازہ کھولوں آپ سے پہلے کسی شخص کے لیے نہ کھولوں۔ (مسلم شریف)

(۱۱۹۲) ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن تمام اولادِ آدم کا سردار میں ہوں اور یہ کوئی فخر نہیں۔ حمد و ثناء کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور وہ بھی کوئی فخر نہیں اور اس دن آدم علیہ السلام اور ان کے سوا جتنے رسول ہیں سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور سب سے پہلا شخص جو زمین پھٹ کر باہر آئے گا وہ میں ہوں اور یہ کوئی فخر نہیں۔ (ترمذی شریف)

(۱۱۹۳) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ بیٹھے ہوئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے۔

فَخَرَجَ حَتَّى إِذَا دَنَا مِنْهُمْ سَمِعَهُمْ يَتَذَكَّرُونَ  
قَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ اللَّهَ اتَّخَذَ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا وَ  
قَالَ الْآخَرُ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ كَلِمَةً تَكْلِيمًا  
وَقَالَ الْآخَرُ عِيسَى كَلِمَةً اللَّهُ وَرُوحَهُ وَ  
قَالَ الْآخَرُ آدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اصْطَفَاهُ اللَّهُ  
فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ وَقَالَ قَدْ سَمِعْتُ كَلَامَكُمْ وَ  
عَجَبْتُكُمْ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ خَلِيلُ اللَّهِ  
وَهُوَ كَذَلِكَ وَمُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ نَجِيُّ  
اللَّهِ وَهُوَ كَذَلِكَ وَعِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ  
رُوحُهُ وَكَلِمَتُهُ وَهُوَ كَذَلِكَ وَآدَمُ عَلَيْهِ  
السَّلَامُ اصْطَفَاهُ اللَّهُ وَهُوَ كَذَلِكَ آلا وَ أَنَا  
حَبِيبُ اللَّهِ وَلَا فَخْرَ وَ أَنَا حَامِلُ لَوَاءِ  
الْحَمْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَحْتَهُ آدَمُ فَمَنْ دُونَهُ وَلَا  
فَخْرَ وَ أَنَا أَوَّلُ شَافِعٍ وَ أَوَّلُ مُشَفَّعٍ يَوْمَ  
الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَ أَنَا أَوَّلُ مَنْ يُحَرِّكُ غَلَقَ  
الْجَنَّةِ فَيَفْتَحَ اللَّهُ لِي فَيُدْخِلْنِيهَا وَمَعِيَ  
فَقَرَاءُ الْمُؤْمِنِينَ وَلَا فَخْرَ وَ أَنَا أَكْرَمُ  
الْأَوَّلِينَ وَ الْآخِرِينَ عَلَى اللَّهِ وَلَا فَخْرَ.

(رواه الترمذی و الدارمی)

(۱۱۹۴) عَنْ عَمْرِو بْنِ قَيْسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَحْنُ الْآخِرُونَ وَ  
نَحْنُ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ إِنِّي قَائِلٌ قَوْلًا  
غَيْرَ فَخْرِ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلُ اللَّهِ وَ مُوسَى صَفِيُّ  
اللَّهِ وَ أَنَا حَبِيبُ اللَّهِ وَمَعِيَ لَوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَ  
الْقِيَامَةِ وَ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَنِي فِي أُمَّتِي وَ أَجَارَهُمْ

جب ان کے قریب آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گفتگو سنی کوئی تعجب  
سے کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا ہے۔ کوئی  
کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر براہ راست گفتگو کی ہے۔ کوئی کہتا  
تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہلانے کا شرف بخشا ہے۔  
کوئی اور یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو صفی اللہ کے لقب سے نوازا ہے۔  
جب آپ باہر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا میں نے تمہاری تمام گفتگو اور  
تمہارے تعجب کا معاملہ دیکھا اور سنا۔ کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام  
خلیل اللہ تھے جیسا کہ تم کہہ رہے تھے اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو  
شرف ہم کلامی عطا ہوا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور  
روح اللہ کے لقب سے نوازے گئے تھے اور اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام نظر  
ربوبیت میں خلافت کے لیے منتخب ہوئے۔ لیکن تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں  
حبیب اللہ ہوں اور یہ فخریہ بات نہیں ہے اور قیامت میں حمد و ثناء کا جھنڈا میرے ہی  
ہاتھ میں ہوگا۔ آدم علیہ السلام اور ان کے سوا سب مخلوق اس کے نیچے ہوگی اور یہ  
بھی فخریہ بات نہیں ہے اور قیامت میں سب سے پہلا مخلوق کی شفاعت کرنے والا  
رسول میں ہوں اور سب سے پہلے جس کی شفاعت قبول ہوگی وہ رسول بھی میں  
ہوں اور یہ بھی فخریہ بات نہیں ہے۔ جنت کی کنڈی جو سب سے پہلے کھٹکھٹائے گا وہ  
رسول میں ہوں اللہ تعالیٰ سب سے پہلے میرے لیے جنت کھولے گا اور مجھ کو اس  
میں داخل فرمائے گا اور اس وقت میرے ساتھ ساتھ محتاج مومنوں کی جماعت  
بھی ہوگی اور میں اللہ تعالیٰ کی نظر میں گذری ہوئی اور آنے والی تمام مخلوق میں  
سب سے زیادہ معزز و مکرم ہوں اور اس میں فخر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

(۱۱۹۴) عمرو بن قیس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا کہ دنیا میں گو ہم سب سے بعد میں آئے ہیں لیکن قیامت میں ہم سب  
سے آگے ہوں گے اور دیکھو میں ایک بات کہتا ہوں اور کسی فخر سے نہیں کہتا  
ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں اور موسیٰ علیہ السلام صفی اللہ ہیں لیکن میں  
حبیب اللہ ہوں۔ قیامت میں حمد و ثناء کا جھنڈا میرے ساتھ ہوگا۔ اور اللہ  
تعالیٰ نے میری امت کے معاملہ میں مجھ سے وعدہ فرمایا ہے اور تین باتوں



مِنْ ثَلَاثٍ لَا يَغْمُهُمْ بَسَنَةٌ وَلَا يَسْتَأْصِلُهُمْ  
عَذْرٌ وَلَا يَجْمَعُهُمْ عَلَى ضَلَالَةٍ.

(رواہ الدارمی)

(۱۱۹۵) وَ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ  
النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَنَا قَائِدُ  
الْمُرْسَلِينَ وَلَا فَخْرَ وَأَنَا خَاتِمُ النَّبِيِّينَ وَلَا  
فَخْرَ وَأَنَا أَوَّلُ شَافِعٍ وَمُشَفِّعٍ وَلَا فَخْرَ.

(رواہ الدارمی)

(۱۱۹۶) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ  
قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا  
أَوَّلُ النَّاسِ خُرُوجًا إِذَا بُعِثُوا وَأَنَا قَائِدُهُمْ  
إِذَا وَفِدُوا وَأَنَا خَطِيئُهُمْ إِذَا انْصَبُوا وَأَنَا  
مُسْتَشْفَعُهُمْ إِذَا حُبِسُوا وَأَنَا مُبَشِّرُهُمْ إِذَا  
أَيَسُوا الْكِرَامَةَ وَالْمَفَاتِيحَ يَوْمَئِذٍ وَ  
لِوَاءِ الْحَمْدِ يَوْمَئِذٍ وَأَنَا أَكْرَمُ وَلَدِ  
آدَمَ عَلَى رَبِّي يَطُوفُ عَلَى أَلْفِ خَادِمٍ كَانَهُمْ  
بَيْضٌ مَكُونُونَ أَوْ لَوْلُو مُنْشُورُونَ.

(رواہ الترمذی و الدارمی و قال الترمذی

حدیث غریب)

(۱۱۹۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَأُكْسَى حُلَةً مِنْ حُلَلِ الْجَنَّةِ  
ثُمَّ أَقُومُ عَنْ يَمِينِ الْعَرْشِ لَيْسَ أَحَدٌ مِنَ  
الْحَلَائِقِ يَقُومُ ذَلِكَ الْمَقَامَ غَيْرِي.

(رواہ الترمذی و فی رواية جامع الاصول عنه

الاول) مَنْ تَنَسَّقُ عَنْهُ الْأَرْضُ فَأُكْسَى.

سے ان کو پناہ دے دی ہے ایک یہ کہ عام قحط میں ان کو مبتلا نہیں کرے گا۔

دوم یہ کہ ان کا دشمن بیخ و بن سے ان کو ہلاک نہیں کر سکے گا۔ تیسرے یہ کہ

میری پوری کی پوری امت گمراہی میں پڑ جائے ایسا بھی نہیں ہوگا۔ (دارمی)

(۱۱۹۵) جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام

رسولوں کا قائد میں ہوں اور یہ فخر یہ بات نہیں اور میں تمام نبیوں کے آخر

میں آیا ہوں اور یہ بات بھی فخر یہ نہیں اور تمام مخلوق کی سب سے پہلا

شفاعت کرنے والا میں ہوں اور جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی

وہ رسول میں ہوں اور یہ بات بھی فخر یہ نہیں ہے۔ (دارمی)

(۱۱۹۶) انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمام

لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلے باہر آنے والا میں ہوں گا

جب وہ جماعتیں بن کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گے تو ان کا قائد میں ہوں

گا اور جب سب خاموش رہیں گے تو ان کی جانب سے بولنے والا میں ہوں گا اور

جب وہ میدانِ محشر میں پھنس جائیں گے تو ان کے لیے شفاعت کی اجازت

طلب کرنے والا میں ہوں گا اور جب وہ مایوس ہوں جائیں گے تو ان کو بشارت

دینے والا میں ہوں گا۔ بزرگی اور کنجیاں اس دن سب میرے ہاتھ میں ہوں گی

اور حمد و ثناء کا جھنڈا بھی اس دن میرے ہی ہاتھ میں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں

تمام اولاد آدم میں سب سے پیارا میں ہوں گا۔ میرے ارد گرد ہزار خادما حاضر

رہیں گے جو اس طرح سفید رنگ ہوں گے گویا وہ حفاظت سے رکھے ہوئے

انڈے ہیں یا بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ (ترمذی۔ دارمی)

(۱۱۹۷) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت

کرتے ہیں کہ سب سے پہلے قبر سے میں اٹھوں گا اس کے بعد جنتی حلوں میں

سے ایک حلہ (ایک لباس کا نام ہے) لا کر مجھ کو پہنایا جائے گا پھر میں عرش

کے دائیں جانب آ کر کھڑا ہوں گا جہاں کھڑے ہونے کا منصب میرے

سوا اور کسی کا نہیں۔

(ترمذی شریف)

(۱۱۹۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَلُوا اللَّهَ لِي الْوَسِيلَةَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا الْوَسِيلَةُ قَالَ أَعْلَى دَرَجَةٍ فِي الْجَنَّةِ لَا يَنَالُهَا إِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ وَارْجُو أَنْ أَكُونَ أَنَا هُوَ. (رواه الترمذی)

(۱۱۹۹) عَنْ أَبِي بِنِ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ كُنْتُ إِمَامَ النَّبِيِّينَ وَخَطِيبَهُمْ وَصَاحِبَ شَفَاعَتِهِمْ غَيْرَ فَخْرٍ. (رواه الترمذی)

(۱۲۰۰) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وَلَاةً مِنَ النَّبِيِّينَ وَ إِنْ وَلِيَ أَبِي وَ خَلِيلُ رَبِّي ثُمَّ قَرَأَ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لِلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَ هَذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ اللَّهُ وَ لِيَ الْمُؤْمِنِينَ.

(رواه الترمذی)

(۱۲۰۱) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى فَضَّلَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ وَ عَلَى أَهْلِ السَّمَاءِ فَقَالُوا يَا ابْنَ عَبَّاسٍ بِمِ فَضَّلَهُ اللَّهُ عَلَى أَهْلِ السَّمَاءِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى قَالَ لِأَهْلِ السَّمَاءِ وَ مَنْ يُقُلُّ مِنْهُمْ أَنِّي إِلَهٌ مِنْ دُونِهِ فَذَلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ وَ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا فَتَحْنَالِكَ فَتَحًا مُبِينًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ قَالُوا وَ مَا فَضَّلَهُ عَلَى

(۱۱۹۸) ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لیے اللہ تعالیٰ سے مقام وسیلہ کی دعاء مانگا کرو۔ لوگوں نے پوچھایا رسول اللہ وسیلہ کیا چیز ہے؟ فرمایا وہ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے جو صرف ایک شخص کو ملے گا اور مجھ کو پوری امید ہے کہ وہ شخص میں ہی ہوں۔ (ترمذی شریف)

(۱۱۹۹) ابی بن کعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ جب قیامت آئے گی تو سب نبیوں کا امام میں ہوں گا اور میں ہی ان کا خطیب اور شفاعت کرنے والا ہوں گا اور یہ بات فخریہ نہیں ہے۔ (ترمذی شریف)

(۱۲۰۰) عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی کے لیے انبیاء میں سے کوئی ولی ہوتا ہے۔ میرے ولی وہ ہیں جو میرے دادا اور میرے رب کے خلیل ہوتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی بلاشبہ سب میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے حضرت ابراہیم کے ساتھ وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کی اتباع کی اور یہ نبی ہیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ ایمان والے اور اللہ تعالیٰ سب مؤمنوں کا ولی ہے۔ (ترمذی شریف)

(۱۲۰۱) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء پر بھی فضیلت بخشی ہے اور آسمان والے تمام فرشتوں پر بھی لوگوں نے پوچھا اے ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) فرمائیے جس بات سے سب فرشتوں پر فضیلت دی ہے وہ کیا ہے؟ جواب دیا وہ بات یہ ہے کہ فرشتوں کے حق میں تو یہ فرمایا ہے کہ جو ان میں سے یہ کہہ گا کہ میرے سوا خدا کوئی اور ہے تو اس کو ہم بس دوزخ کی جزا دیں گے اور نا منصفوں کو ہم ایسی ہی جزا دیتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح نصیب فرمائی ہے تاکہ اللہ آپ کے گزشتہ اور آئندہ تمام فروگزاشتوں سے درگزر فرمائے (مخاطب دونوں جگہ معصوم مخلوق ہے مگر طرز خطاب میں فرق کتنا ہے) لوگوں نے عرض کی اچھا



الْأَنْبِيَاءُ قَالَ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ الْآيَةُ وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ فَأَرْسَلَهُ إِلَى الْجِنِّ وَالْإِنْسِ. (رواه الدارمی)

(۱۲۰۲) عَنْ مَالِكِ بْنِ صَعْصَعَةَ أَنَّ نَبِيَّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَهُمْ عَنْ لَيْلَةٍ أُسْرِى بِهِ بَيْنَمَا أَنَا فِي الْحِطِيمِ وَرُبَّمَا قَالَ فِي الْحَجَرِ مُضْطَجِعًا إِذَا تَأَنَّى اتِ فَشَقَّ مَا بَيْنَ هَذِهِ إِلَى هَذِهِ يَعْنِي مِنْ ثَغْرَةٍ نَحَرِهِ إِلَى شَعْرَتِهِ فَاسْتَخْرَجَ قَلْبِي ثُمَّ أُتِيَتْ بِطُسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مَمْلُوءٍ إِيْمَانًا فَغَسَلَ قَلْبِي ثُمَّ حَتَّى ثُمَّ أُعِيدُوا فِي رَوَايَةٍ ثُمَّ غَسَلَ الْبُطْنَ بِمَاءٍ زَمْ زَمْ ثُمَّ مُلِئَ إِيْمَانًا وَحِكْمَةً ثُمَّ أُتِيَتْ بِدَابَّةٍ دُونَ الْبَغْلِ وَفَوْقَ الْحِمَارِ أَبْيَضُ يُقَالُ لَهُ

تو جس بات سے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت ہے وہ بات کیا ہے انہوں نے جواب دیا کہ سب رسولوں کے حق میں تو ارشاد یہ ہے کہ ہم نے جو رسول بھیجا وہ اپنی قوم کی زبان کا بھیجا اس کے بعد پھر جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا گمراہ کیا، الخ۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے تو آپ کو جنات و انسان سب کے لیے رسول بنایا۔

(۱۲۰۲) حضرت مالک بن صعصعہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے اس شب کا واقعہ جس میں آپ کو بیت مقدس اور آسمانوں کی سیر کرائی گئی تھی اس طرح بیان فرمایا کہ میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا اور کبھی حجر کا لفظ کہا (مراد دونوں کی ایک ہے) کہ ایک فرشتہ آیا اور اس نے یہاں سے لے کر یہاں تک میرا پیٹ چاک کیا یعنی کوڑی کے پاس سے لے کر زیر ناف تک پھر اس نے میرے قلب کو نکالا اور اس کے بعد ایک سونے کا طشت ایمان و حکمت سے بھرا ہوا لایا گیا اور اس فرشتہ نے میرے قلب کو دھویا۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ پھر میرے پیٹ کو آب زم زم سے دھویا اور اس کے بعد اس میں ایمان و حکمت بھر دیا پھر میرے سامنے ایک جانور پیش کیا گیا جو خچر سے ذرا چھوٹا اور گدھے سے ذرا بڑا سفید رنگ

(۱۲۰۲) \* معراج کے واقعہ پر اہل قلم اور علماء کبار کے اتنے مضامین مسلمانوں کے سامنے آچکے ہیں کہ ان کے بعد اب اس کی تفصیلات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے یہاں چند باتیں تحریر فرمائی ہیں جو عام طور سے ہماری نظر سے نہیں گذریں اس لیے ہم اس اہم موضوع کو صرف ان کی مختصر تنبیہات پر ختم کرتے ہیں۔ عام لوگ تو کیا خاص لوگ بھی خال خال یہ علم رکھتے ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا تذکرہ پہلے صحیفوں میں بھی آچکا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر علامات میں اس کو بھی بطور ایک علامت کے شمار کرایا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ موصوف لکھتے ہیں:

قال دانيال النبي: ايضاً سالت الله و تضرعت اليه ان يبين لي ما يكون من بني اسرائيل فذكر شانهم الي ان قال حتى ابعث نبيا من بني اسمعيل الذي بشرت به هاجو فذكر صفاته الي ان قال اسرى به اتى و ارقيه من السماء الي سماء حتى يعلو قاذنيه و اسلم عليه و اوحى اليه ثم ارداه الي عبادى بالسر درد الغبطه ثم سرد دانيال قصة رسول الله صلى الله عليه وسلم و هذه اليشارة الي الآن عند اليهود و النصارى يقرؤنها و يقولون لم يظهر صاحبها بعد. (الجواب الصحيح ج ۴ ص ۳)

حضرت دانیال نبی نے کہا کہ میرے دعا مانگی کہ بنی اسرائیل کا حال مجھ سے بیان فرمائیے تو اس نے ان کے لئے.....

الْبَرَّاقُ يَضَعُ خَطْوَهُ عِنْدَ أَقْصَى طَرَفِهِ  
فَحَمَلْتُ عَلَيْهِ فَاَنْطَلَقَ بِي جِبْرِئِيلُ حَتَّى آتَى  
السَّمَاءَ الدُّنْيَا فَاسْتَفْتَحَ قِيلَ مَنْ هَذَا قَالَ  
جِبْرِئِيلُ قِيلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ فِيلَ وَ  
قَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ  
الْمَجْئِي جَاءَ فَفَتَحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا فِيهَا  
آدَمُ قَالَ هَذَا أَبُوكَ آدَمُ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ  
فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا  
بِالْأَبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِي  
حَتَّى آتَى السَّمَاءَ الثَّانِيَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيلَ مَنْ  
هَذَا قَالَ جِبْرِئِيلُ قِيلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ  
مُحَمَّدٌ قِيلَ وَ قَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قَالَ  
مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجْئِي جَاءَ فَفَتَحَ فَلَمَّا  
خَلَصْتُ إِذَا بِيَحْيَى وَعِيسَى وَهُمَا ابْنَا خَالَةٍ  
قَالَ هَذَا يَحْيَى وَ هَذَا عِيسَى فَسَلَّمَ عَلَيْهِمَا  
فَسَلَّمْتُ فَرَدَّا ثُمَّ قَالَا مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ

کا تھا اس کو براق کہا جاتا ہے (اس کی رفتار کی حالت یہ تھی) کہ وہ اپنا قدم اس جگہ ڈالتا تھا جہاں اس کی نظر پہنچتی تھی مجھے اس پر سوار کیا گیا اور مجھے لے کر جبریل علیہ السلام اوپر چلے یہاں تک کہ جب اس دنیا کے آسمان تک پہنچے تو انہوں نے دروازہ کھلوا یا ان سے دریافت کیا گیا کون؟ انہوں نے جواب دیا میں ہوں جبریل۔ پوچھا گیا آپ کے ہمراہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے؟ جبریل علیہ السلام نے فرمایا ہاں اس پر کہا گیا خوش آمدید کیا مبارک تشریف آوری ہے۔ یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ جب میں دروازہ سے نکل گیا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے فرمایا یہ آپ کے والد ماجد آدم ہیں ان کو سلام کیجئے میں نے سلام کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا پھر فرمایا صاحب فرزند اور نیک نبی خوش آمدید مبارک ہو پھر مجھ کو لے کر جبریل اور اوپر چڑھے اور دوسرے آسمان پر آئے دوسرے آسمان پر پہنچے تو انہوں نے دروازہ کھلوا یا ان سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ جبریل نے کہا میں جبرائیل ہوں کہا گیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ ان کو معراج ہوئی ہے؟ کہاں ہاں! اس کے بعد فرشتوں نے خوش آمدید کہا اور تشریف آوری پر مبارک باد پیش کی پھر دروازہ کھول دیا چنانچہ جب میں اندر داخل ہوا تو

للہ ..... حالات بیان فرمادیے یہاں تک کہ فرمایا کہ میں بنی اسماعیل میں ایک نبی اٹھاؤں گا جس کی بشارت میں نے ہاجر کو دی پھر اس نبی کی صفات ذکر کیں یہاں تک کہ فرمایا میں شب میں اس کو بلاؤں گا اور آسمان در آسمان سیر کراتے ہوئے اس کو اوپر بلاؤں گا اور اس کو اپنے قریب کر کے اس پر صلوٰۃ و سلام بھیجوں گا اور اس کو وحی کے ذریعہ اسرار پہنایا سے آگاہ کروں گا اس کے بعد شادان و فرحاں اپنے بندوں کے پاس اس کو پھر واپس کروں گا۔ اس کے بعد دانیال علیہ السلام نے آپ کا پورا قصہ ذکر فرمایا۔ یہ بشارت آج تک یہود کے ہاں چلی آتی ہے نصاریٰ بھی اس کو پڑھتے ہیں مگر یہ کہتے ہیں کہ اس کا مصداق ابھی نہیں آیا۔ حافظ موصوف کی اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ قصہ اسراء و معراج صرف اسی امت میں متواتر نہیں بلکہ اس کا تذکرہ پہلے انبیاء علیہم السلام کے صحف میں بھی اسی طریقہ پر موجود ہے اگر اس واقعہ کی حیثیت صرف ایک خواب کی سی ہوتی تو کیا اس کا تذکرہ اسی انداز سے کتب سماویہ میں ملنا چاہیے اور کیا اکتیس صحابہ کو تواتر کے ساتھ اس کو روایت کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ایک دوسرے موقعہ پر حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کا تذکرہ سورہ اسراء میں مسجد اقصیٰ تک صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ جتنے حصہ کے متعلق کفار کے مقابلہ میں دلیل قائم ہو سکتی تھی وہ اتنا ہی حصہ تھا اس کے بعد آپ کی آسمانوں کی سیہ پر کوئی دلیل ایسی قائم نہیں کی جاسکتی جو ان کو للہ .....



وفعتہ دیکھا کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام تشریف فرما ہیں یہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے حضرت جبرئیل نے بتایا یہ یحییٰ علیہ السلام ہیں اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں آپ ان دونوں کو سلام کیجئے میں نے ان کو سلام کیا دونوں نے سلام کا جواب دیا اس کے بعد انہوں نے میرا استقبال کرتے ہوئے فرمایا۔  
مرحبا مرحبا آئیے برادر صالح۔ آئیے نبی صالح پھر حضرت جبرئیل مجھے لے کر تیسرے آسمان کی طرف بڑھے دروازہ کھلوا یا وہاں بھی پوچھا گیا آپ کون ہیں؟  
کہا گیا جبرئیل سوال ہوا آپ کے ساتھ کون ہیں؟ جواب دیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے؟ حضرت جبرئیل نے کہا جی ہاں! مرحبا مرحبا کی صدا آئی اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھول دیا آگے بڑھا تو دیکھا حضرت یوسف علیہ السلام ہیں ان کو سلام کیجئے میں نے سلام کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا پھر انہوں نے مرحبا بالآخ الصالح و النبی الصالح کے الفاظ سے خوش آمدید کہا پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے لے کر چوتھے آسمان کے پاس پہنچے پوچھا گیا کون ہیں؟ حضرت جبرئیل نے کہا میں جبرئیل ہوں کہا گیا کہ آپ کے ساتھ کون بزرگ ہیں؟ انہوں نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں پوچھا گیا کیا ان کو معراج ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں! مرحبا مرحبا اور خوش آمدید

و النبی الصالح ثم صعد بی الى السماء الرابعة فاستفتح قيل من هذا قال جبرئیل و من معک قال محمد قيل و قد أرسل الیه قال نعم قيل مرحبا به فینعم المجدی جاء ففتح فلما خلصت اذا یوسف قال هذا یوسف فسلم علیہ فسلمت علیہ فرد ثم قال مرحبا بالآخ الصالح و النبی الصالح ثم صعد بی حتی اتی السماء الخامسة فاستفتح قيل من هذا قال جبرئیل و من معک قال محمد قيل و قد أرسل الیه قال نعم قيل مرحبا به فینعم المجدی جاء ففتح فلما خلصت فاذا ادریس فقال هذا ادریس فسلم علیہ فسلمت علیہ فرد ثم قال مرحبا بالآخ الصالح و النبی الصالح ثم صعد بی حتی اتی السماء الخامسة فاستفتح قيل من هذا قال جبرئیل و

للہ ..... ساکت کر سکے۔ پھر جب بیت مقدس تک آپ کا سفر بحالت بیداری قابل تسلیم ہو جائے تو چونکہ یہ ایک ہی سفر تھا اس لیے اس کا دوسرا حصہ خود بخود تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ اگر آپ کی صداقت اس حصہ کے متعلق ثابت ہو جاتی ہے تو دوسرے حصہ کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ یہاں کسی کا خیال یہ بھی ہے کہ اسراء صرف اتنے ہی حصہ کا نام ہے دوسرے حصہ کا نام معراج ہے مگر اس بناء پر یہ سوال پھر اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ جب یہ دونوں سفر ایک ہی سلسلہ کے تھے تو جدا گانہ دو سورتوں میں اس کے بیان فرمانے کا نکتہ کیا ہے۔ حافظ موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ سورۃ اسراء میں گو دوسرے حصہ کی تفصیل نہیں کی گئی مگر یہ اشارہ صراحت کے ساتھ کر دیا گیا ہے کہ اس سفر کا مقصد بلند کچھ اور تھا اور وہ یہ کہ ہم کو اپنی کچھ خاص نشانیاں آپ کو دکھانی مقصود تھیں جن کا تذکرہ سورۃ والنجم میں واضح فرما دیا گیا ہے۔ سورۃ اسراء میں ”النورۃ من ایاتنا“ فرمایا ہے اور سورۃ والنجم میں ”ولقد رای من ایات ربہ الکبریٰ“ فرمایا ہے۔ جس میں سے سدرۃ المنتہیٰ جنت و دوزخ اور جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصلی صورت پر دیکھنا تھا۔

و کذلک صعودہ لیلۃ المعراج الی مافوق السموات و هذا مما تواترت به الاحادیث و اخبر به القرآن اخبر بمسراہ لیلۃ من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ و فی موضع آخر بصعودہ الی السموات للہ .....

مَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ  
قَالَ نَعَمْ قِيلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ  
فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصَتْ فَإِذَا هَارُونُ قَالَ هَذَا  
هَارُونُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ  
قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ  
ثُمَّ صَعِدَ بِي حَتَّى أَتَى السَّمَاءَ السَّادِسَةَ  
فَاسْتَفْتَحَ قِيلَ مَنْ هَذَا قَالَ جِبْرِيلُ قِيلَ مَنْ  
مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ  
نَعَمْ قِيلَ مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فُتِحَ  
فَلَمَّا خَلَصَتْ فَإِذَا مُوسَى قَالَ هَذَا مُوسَى  
فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ  
مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ فَلَمَّا  
جَاوَزْتُ بَكِي قِيلَ لَهُ مَا يُبْكِيكَ قَالَ أَبْكِي  
لَأَنَّ غُلَامًا بَعَثَ بَعْدِي يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِهِ  
أَكْثَرَ مِمَّنْ يَدْخُلُهَا مِنْ أُمَّنِي ثُمَّ صَعِدَ بِي إِلَى  
السَّمَاءِ السَّابِعَةِ فَاسْتَفْتَحَ جِبْرِيلُ قِيلَ مَنْ  
هَذَا قَالَ جِبْرِيلُ قِيلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ  
مُحَمَّدٌ قِيلَ وَقَدْ بَعَثَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيلَ  
مَرْحَبًا بِهِ فَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ فَلَمَّا خَلَصَتْ  
فَإِذَا إِبْرَاهِيمُ أَبُوكَ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ  
عَلَيْهِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَبْنِ  
الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ رُفِعْتُ إِلَى

کے الفاظ کے ساتھ استقبال ہوا اور دروازہ کھول دیا میں اندر بڑھا تو  
حضرت ادریس علیہ السلام کو موجود پایا انہوں نے بتایا کہ یہ حضرت ادریس ہیں  
ان کو سلام کیجئے حضرت جبریل کے اس تعارف کے بعد میں نے سلام کیا انہوں  
نے جواب دیا پھر حضرت ادریس نے مرحبا مرحبا اخ صالح نبی  
صالح کہہ کر استقبال فرمایا پھر حضرت جبریل مجھے لے کر آگے بڑھے پانچویں  
آسمان پر پہنچے وہاں سوال ہوا کون؟ کہا جبریل ہوں پوچھا گیا آپ کے ساتھ  
کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پوچھا گیا ان کو  
معراج ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں انہوں نے کہا خوش آمدید بہت خوب  
تشریف آوری ہوئی یہ کہہ کر دروازہ کھولا میں اندر پہنچا تو حضرت ہارون نظر  
آئے۔ جبریل نے بتایا۔ یہ حضرت ہارون علیہ السلام ہیں۔ ان کو سلام کیجئے میں  
نے سلام کیا انہوں نے جواب دیا پھر انہوں نے مبارک باد پیش کی پھر یہاں  
سے مجھے لے کر حضرت جبریل چھٹے آسمان پر پہنچے دروازہ کھولنے کی درخواست  
کی پوچھا گیا آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا جبریل امین سوال ہوا آپ کے  
ساتھ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں پوچھا گیا ان کو معراج  
کی دولت نصیب ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں مرحبا اور خوش آمدید کہا اور دروازہ  
کھول دیا میں اندر داخل ہوا تو دیکھا حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف فرما ہیں حضرت  
جبریل نے بتایا یہ حضرت موسیٰ ہیں۔ سلام کیجئے میں نے سلام کیا انہوں نے سلام کا  
جواب دیا انہوں نے بھی مجھے مبارک باد پیش کی۔ میں جب آگے بڑھا تو حضرت  
موسیٰ علیہ السلام رونے لگے پوچھا گیا کیوں رورہے ہیں آپ نے فرمایا اس لیے روتا  
ہوں کہ ایک نوجوان جو میرے بعد مبعوث ہوئے ہیں ان کی امت میری امت سے  
زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوگی۔ پھر حضرت جبریل مجھے لے کر اوپر چڑھے  
اور ساتویں آسمان پر پہنچے اور دروازہ کھولنے کو کہا پوچھا آپ کون؟ انہوں نے کہا

للہ ..... واخبر انه نعل ذلك ليريه من آياته و كان في اخباره بالمسرى ليريه من آياته بيان انه رأى من  
آياته ما لم يره الناس وقد بين في السورة الاخرى و انه رأى جبرئيل عليه السلام عند سدره المنتهى عند  
هاجنة الماوى و انه رأى بالبصر آيات ربه الكبرى و ذكر كما في تلك السورة المسرى. لانه للہ .....  
.....



سِدْرَةُ الْمُنْتَهَى فَإِذَا نَبَقَهَا مِثْلُ قِلَالٍ هَجَرَ وَ  
إِذَا وَرَقَهَا مِثْلُ أَذَانِ الْفِيلَةِ قَالَ هَذَا سِدْرَةُ  
الْمُنْتَهَى فَإِذَا أَرْبَعَةُ أَنْهَارٍ نَهْرَانِ بَاطِنَانِ أَنْ  
قُلْتُ مَا هَذَانِ يَا جَبْرِئِيلُ قَالَ أَمَّا الْبَاطِنَانِ  
فَنَهْرَاتُ فِي الْجَنَّةِ وَ أَمَّا الظَّاهِرَانِ فَالنَّيْلُ وَ  
الْفُرَاتُ ثُمَّ رَفَعَ إِلَى الْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ثُمَّ  
أَتَيْتُ بِنَاءً مِنْ خَمَرٍ وَ إِنَاءً مِنْ لَبَنٍ وَ إِنَاءً مِنْ  
عَسَلٍ فَآخَذْتُ اللَّبَنَ فَقَالَ هِيَ الْفِطْرَةُ أَنْتِ  
عَلَيْهَا وَ أُمْتُكَ ثُمَّ فَرَضْتُ عَلَى الصَّلَاةِ  
خَمْسِينَ صَلَاةً كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ فَمَرَرْتُ  
عَلَى مُوسَى فَقَالَ بِمَا أُمِرْتُ قُلْتُ أُمِرْتُ  
بِخَمْسِينَ صَلَاةً كُلَّ يَوْمٍ قَالَ إِنَّ أُمْتُكَ لَا  
تَسْتَطِيعُ خَمْسِينَ صَلَاةً كُلَّ يَوْمٍ وَ إِنِّي وَ  
اللَّهُ قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَ عَالَجْتُ  
بَنِي إِسْرَائِيلَ أَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ إِلَى  
رَبِّكَ فَسَلِّهُ التَّخْفِيفَ لِأُمَّتِكَ فَوَجَعْتُ  
مَوْضِعَ عَنِّي عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسَى  
فَقَالَ مِثْلَهُ فَوَجَعْتُ فَوْضَعَ عَنِّي عَشْرًا  
أَفَرَجَعْتُ فَوْضَعَ عَنِّي عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلَى  
مُوسَى فَقَالَ مِثْلَهُ فَوَجَعْتُ فَوْضَعَ عَنِّي  
عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسَى فَقَالَ مِثْلَهُ  
فَرَجَعْتُ فَوْضَعَ عَنِّي عَشْرًا فَأُمِرْتُ بِعَشْرِ  
صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَوَجَعْتُ إِلَى مُوسَى فَقَالَ

جبریل امین پوچھا آپ کے ساتھ کون؟ انہوں نے جواب میں کہا محمد صلی اللہ  
علیہ وسلم پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا ہاں! مرحبا خوش آمدید  
جب میں آگے بڑھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نظر آئے۔ انہوں نے بتایا یہ  
حضرت ابراہیم ہیں ان کو سلام کیجئے۔ میں نے سلام کیا انہوں نے جواب دیا  
انہوں نے کہا مرحبا اے ابن صالح خوش آمدید اے نبی صالح پھر میری طرف  
سدرۃ المنتہی لایا گیا میں نے دیکھا کہ اس کے پھل مقام بحر کے مشکوں کے برابر  
تھے اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر حضرت جبریل نے بتایا کہ یہ  
سدرۃ المنتہی ہے وہاں مجھے چار نہریں نظر آئیں دو اندر کی جانب اور دو باہر کی  
جانب میں نے جبریل سے پوچھا یہ دونوں نہریں کیسی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جو  
نہریں اندر جا رہی ہیں یہ جنت کی نہریں ہیں اور جو باہر کی جانب ہیں یہ نیل و  
فرات ہیں پھر میرے سامنے بیت المعمور لایا گیا اس کے بعد میرے پاس تین  
برتن لائے گئے ایک میں شراب تھی دوسرے میں دودھ اور تیسرے میں شہد میں  
نے دودھ والا برتن اٹھا لیا جبریل نے کہا کہ یہی فطرت ہے اور آپ اسی پر ہوں  
گے اور آپ کی امت بھی پھر مجھ پر ہر دن پچاس نماز فرض کی گئیں طوبستے ہوئے  
میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا حکم کیا گیا؟ میں  
نے بتایا کہ ہر دن پچاس وقتوں کی نماز کا حکم ملا ہے انہوں نے فرمایا کہ آپ کی  
امت ہر دن پچاس نماز ادا کرنے میں قادر نہ ہو سکے گی خدا کی قسم آپ سے پہلے  
میں نے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ زور آزمائی کر چکا ہوں  
آپ اپنے رب کے پاس واپس ہوں اور تخفیف کی درخواست کریں میں پلٹ  
گیا تو اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں معاف کر دیں۔ میں جب اس کے بعد موسیٰ علیہ  
السلام کے پاس آیا تو انہوں نے پھر ویسی ہی بات کی چنانچہ میں پھر واپس ہوا  
اور اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں اور معاف کر دیں مگر جب پھر موسیٰ علیہ السلام کے  
پاس لوٹ کر آیا تو انہوں نے پھر پہلے جیسی بات فرمائی اب میں پھر پلٹ کر

للہ ..... امکانہ ان یقیم علیہ برہانا۔ (الجواب الصحیح ج ۴ ص ۱۶۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر جانا تو اتر کے ساتھ حدیثوں سے ثابت ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے  
چنانچہ ایک عورت میں مسجد اقصیٰ تک اس کا ذکر ہے اور دوسری سورت میں آسمانوں کے سفر کا ذکر ہے۔ قرآن کریم للہ .....  
.....

مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَأَمَرْتُ بِخُمْسِ صَلَوَاتِ كُلِّ  
يَوْمٍ فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسَى فَقَالَ بِمَا أَمَرْتُ  
قُلْتُ أَمَرْتُ بِخُمْسِ صَلَوَاتِ كُلِّ يَوْمٍ قَالَ  
إِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيعُ خُمْسَ صَلَوَاتِ كُلِّ  
يَوْمٍ وَإِنِّي قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَ  
عَالَجْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَشَدَّ الْمُعَالِجَةِ فَارْجِعْ  
إِلَى رَبِّكَ فَسَلُّهُ التَّخْفِيفَ لِأُمَّتِكَ قَالَ  
سَأَلْتُ رَبِّي حَتَّى اسْتَحْبَبْتُ وَلَكِنِّي أَرْضَى  
وَأُسَلِّمَ قَالَ فَلَمَّا جَاوَزْتُ نَادَى مُنَادٍ  
أَمْضَيْتُ فَرِيضَتِي وَخَفَفْتُ عَنْ عِبَادِي.

گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ بھی دس نمازیں معاف کر دیں، لوٹ کر جب موسیٰ  
علیہ السلام کے پاس آیا اب کی مرتبہ پھر انہوں نے وہی بات دہرائی، چنانچہ پھر  
واپس گیا، چنانچہ پانچ نمازوں کا روزانہ حکم دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے  
فرمایا آپ کی امت کو اس پانچ وقت کے نباہنے کی بھی استطاعت نہ ہوگی۔  
چنانچہ میں آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں اور بنی اسرائیل کے معاملہ  
میں کافی محنت اٹھا چکا ہوں لہذا پھر آپ اپنے رب کے پاس واپس جائیں اور  
تخفیف کی درخواست کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے بار بار  
اپنے رب سے درخواست کی اب مزید جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لہذا میں اب  
اس پر راضی ہوں اور خوش ہوں اس کے بعد فرمایا کہ جب میں آگے بڑھا، تو  
ایک منادی نے آواز دی اب میں اپنا آخری حکم جاری کر چکا اور اپنے بندوں پر  
جو تخفیف کرنی تھی کر چکا۔ (متفق علیہ)

(اعلم ان الاسراء ورد مطولا و مختصرا من حديث انس و ابى بن كعب و بريدة و جابر بن عبد الله و حذيفة بن اليمان و  
سمرة بن جندب و سهل بن سعد و شداد بن اوس و صهيب و ابن عباس و ابن عمرو ابن مسعود و عبد الله بن اسعد بن  
زرارة و عبد الرحمن بن قرط و على بن ابى طالب و عمر بن الخطاب و مالك بن صعصعة و ابى امامة و ابى ايوب الانصارى  
و ابى حبة و ابى الحمراء و ابى ذر و ابى سعيد الخدرى و ابى سفيان بن حرب و ابى ليلي الانصارى و ابى هريرة و عائشة و  
اسماء بنتى ابى بكر و ام هانئ و ام سلمة رضى الله عنهم كذا فى الخصائص الكبرى ج ۱ ص ۱۵۲ و قال فى الشقاو ذهب  
معظم السلف و المسلمين الى انه اسراء بالجسد و فى اليقظة و هذا هو الحق و ذهب اليه من الصحابة ابن عباس و جابر و  
انس و حذيفة و عمرو ابى هريرة و مالك بن صعصعة و ابى حبة البدرى و ابن مسعود رضى الله عنهم اجمعين و من  
التابعين الضحاك و سعيد بن جبیر و قتادة و ابن المسيب و ابن شهاب و ابى زيد و الحسن البصرى و ابراهيم النخعى و  
مسروق و مجاهد و عكرمة و ابن جريج رضى الله تعالى عنهم و جماعة عظيمة من المسلمين و هو قول اكثر المتأخرين  
من الفقهاء و المحدثين و المتكلمين و المفسرين)

اللہ..... نے خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ بیت مقدس تک آپ کا سفر اس لیے تھا کہ آئندہ آپ کو اپنی خاص نشانیاں دکھانی  
مطلوب تھیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نشانیاں ایسی ہونی چاہئیں جن کو عام انسانوں نے نہ دیکھا ہو۔ پھر دوسری سورت میں  
خود ان کی تفصیل فرمادی گئی کہ ان آیات میں سدرۃ المنتہیٰ اور اس کے پاس ہی جبریل علیہ السلام کو اصل صورت میں دیکھنا ہے اور  
وہیں جنت الملوئی بھی ہے اور قرآن کریم نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کو آنکھوں سے دیکھا  
البتہ سورہ اسرئٰی میں بیت مقدس تک کا سفر صرف اس لیے ذکر کیا ہے کہ مخالفوں پر اتنے ہی حصہ کے متعلق حجت قائم کی جاسکتی تھی۔



## ابوالبشر سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اول نبی اللہ فی الارض

حضرت آدم علیہ السلام کے معاملہ میں جو اختلافات قابل ذکر ہیں ان میں سب سے پہلا یہ ہے کہ جس جنت میں ان کو سکونت کا حکم دیا گیا تھا وہ جنت خلد یعنی بہشت بریں تھی یا اسی زمین پر کوئی باغ تھا۔ اس میں جمہور کا پہلا قول قرار دیا ہے۔ صحیح حدیثوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جنت سے خلد بریں ہی مراد ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے مناظرہ میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ آپ نے اپنی ذریت کو جنت سے نکلوا یا۔ اور حدیث شفاعت میں خود حضرت آدم علیہ السلام کا بیان بھی ہے کہ میری ہی وجہ سے تم خلد بریں سے نکلے میں اس کے لئے آج شفاعت کیسے کروں۔ قرآن کریم کی آیت وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان جیسے صریح اور صحیح دلائل کے باوجود یہاں حافظ ابن تیمیہ جیسے شخص کا رجحان پھر معزلہ کے قول کی طرف ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب البوات)

دوسرا اختلاف ان کے موضع ہبوط کے متعلق ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ وحناں تھا جو مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان کوئی مقام ہے۔ حسن سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام کے محل ہبوط ہند، حواء کا ہبوط جدہ، ابلیس کا دستمیان (بصرہ کے قریب ایک جگہ ہے) اور سانپ اصہبان تھا۔ آدم علیہ السلام کے محل ہبوط کے متعلق سدی کی روایت بھی یہی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہبوط کوہ صفا پر اور حضرت حواء علیہا السلام کا کوہ مروہ پر ہوا تھا۔

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام صنعتوں کی تعلیم دے کر زمین پر اتارے گئے تھے اور جنت کے پھل بھی ان کے ہمراہ کئے گئے تھے۔ حضرت انس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو بننا اور حضرت حواء علیہا السلام کو کاتنے کی تعلیم دی تھی۔ آدم علیہ السلام نے اپنے لئے جبہ اور حواء علیہا السلام کے لئے ایک کرتی (قمیص) اور ایک اوڑھنی تیار کی تھی اور ان کی پہلی پوشش اون کی تھی۔ (البدایہ ج ۱ ص ۹۲)

کعب احبار بیان کرتے ہیں کہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ سب بے ریش ہوں گے، صرف ان کے ڈاڑھی ہوگی، اسی طرح سب اپنے ناموں کے ساتھ پکارے جائیں گے اور یہ کنیت کے ساتھ ان کی کنیت ابو محمد ہوگی۔

(البدایہ ج ۱ ص ۹۷)

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ کعبۃ اللہ کے پہلے بانی یہی تھے۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ عرش الہی کے محاذ میں

زمین پر وہ بیت اللہ کی تعمیر کریں اور جس طرح انہوں نے ملائکہ اللہ کو عرش الہی کا طواف کرتے دیکھا ہے اسی طرح خود اس کا طواف کریں۔ (البدایہ ج ۱ ص ۹۶)

حضرت آدم علیہ السلام کے موضع دفن کے متعلق مشہور قول یہ ہے کہ ہند میں جس جگہ ان کا بہوٹ ہوا تھا اسی جگہ کسی پہاڑ کے قریب ان کا دفن مبارک ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ میں جبل ابوقبیس مشہور پہاڑ میں آپ مدفون ہیں کوئی کہتا ہے بیت مقدس میں ان ہر دو اصل انسانی کے مزارات ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور تاریخ البدایہ والنہایہ میں ان تمام اختلافات کو ذکر کیا ہے انہوں نے یہ بھی نقل کی ہے کہ حضرت حواء کے ہمیشہ ایک لڑکا اور لڑکی ایک ہی حمل سے پیدا ہوتے تھے اور ان دونوں کے درمیان شادی کی رسم ممنوع قرار دی گئی تھی۔ حکم یہ تھا کہ ایک حمل کے لڑکے کی شادی دوسرے حمل کی لڑکی کے ساتھ کی جائے۔ ہابیل و قابیل کے قتل کے قصہ میں قتل کا ایک سبب یہ بھی ہو گیا تھا۔ اہل تاریخ و سیر نے ہابیل کے قتل پر حضرت آدم علیہ السلام کے جو اشعار نقل کئے ہیں حافظ ابن کثیرؒ نے اس میں کلام کیا ہے اور اس کی یہ تاویل کی ہے کہ بظاہر یہ ان کے درد و غم کی کسی اور شخص نے ترجمانی کی ہے۔

یہاں امام ترمذی نے باسناد حسن عن سمرۃ ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت حواء کے کوئی اولاد زندہ نہ رہتی تھی شیطان نے آکر ان کو بہکایا کہ اس مرتبہ جو لڑکا پیدا ہو تو اس کا نام عبدالحارث رکھ دینا وہ زندہ رہے گا۔ انہوں نے شیطان کے کہنے پر اس بچہ کا نام عبدالحارث ہی رکھ دیا تھا۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مرفوع ہوئے میں کلام ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ موقوف ہے یعنی صحابی کا قول ہے اور صحابہ نے جس طرح بعض اسرائیلیات روایت فرمائی ہیں یہ بھی اسرائیلیات ہی کی روایت معلوم ہوتی ہے۔ اس پر قرینہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ اصل بشری کے اس جوڑے سے تمام نسل انسانی کو پھیلائے تو یہ کیسے قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت حواء کی کوئی اولاد ہی زندہ نہ رہتی۔ پھر یہ کہ جس آیت کی شرح میں حضرت حسن سے یہ روایت نقل کی گئی ہے خود حضرت حسن سے اس کی دوسری تفسیر موجود ہے۔ اگر حسن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تفسیر موجود ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس مرفوع تفسیر کے خلاف کوئی اور دوسری تفسیر اختیار فرماتے۔ (البدایہ ج ۱ ص ۹۹)

شارحین نے حدیث مذکور کی اور تو جیہات بھی ذکر فرمائی ہیں وہ اپنے محل میں دیکھ لی جائیں۔

حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سلسلہ نسب حضرت شیث علیہ السلام سے چلا ہے۔ شیث کے معنی بہتہ اللہ ہیں یعنی عطاء الہی۔ چونکہ ان کی ولادت ہابیل کے مقتول ہونے کے بعد ہوئی تھی اس لئے ان کا نام شیث رکھا گیا تھا محمد بن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے قرب وفات میں حضرت شیث علیہ السلام کو چند باتوں کی تعلیم دی تھی اور شب و روز کی ساعتیں اور ہر ساعت کی خاص عبادت کی تعلیم بھی دی تھی اور بعد میں طوفان آنے کی اطلاع بھی فرمائی تھی۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۹۸)



(۱۲۰۳) سَمِعْتُ أَبَا أُمَامَةَ أَنَّ رُجُلًا قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْبَى كَانِ أَدَمَ قَالَ نَعَمْ مُكَلَّمٌ قَالَ فَكُمُ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ نُوحٍ قَالَ عَشْرَةُ قُرُونٍ . (رواه ابن حبان في صحيحه قال ابن كثير في البداية والنهاية ج ۱ ص ۱۰۲ على شرط مسلم ولم يخرجه .)

(۱۲۰۳) راوی کہتا ہے میں نے ابو امامہ سے خود سنا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آدم علیہ السلام نبی تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں نبی تھے اور ایسے نبی تھے جو اس کی شرف ہم کلامی سے مشرف تھے۔ پھر اس نے پوچھا اچھا ان کے اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان کتنا زمانہ گزرا ہے۔ فرمایا دس قرن۔ (ابن حبان)

و رواه الطبرانی قال الهيثمي و رجاله رجال الصحيح غير احمد بن حنبل و هو ثقة و في الدر المنثور عشرة اباء مكان عشرة قرون ج ۱ ص ۵۳)

(۱۲۰۴) عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ ابُو ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ كَيْتَ هِي فِي مِيْن نِي عَرَضَ كِي يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى

(۱۲۰۳) \* حافظ ابن کثیر نے بروایت بخاری ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان دس قرن کی مدت گزری ہے جن میں سب لوگ اسلام ہی پر تھے ان کے بعد جب بت پرستی اور گمراہیوں کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے۔ اسی لحاظ سے ان کو سب سے پہلا رسول کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جن مؤرخین نے لکھا ہے کہ قابیل اور اس کی اولاد نے آتش پرستی شروع کر دی تھی یہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ابن عباس کی روایت اس کی تردید کرتی ہے۔ حدیث مذکور میں قرون کا لفظ مبہم ہے۔ لغت میں ”قرن“ کا اطلاق سو سال کی مدت پر بھی آتا ہے اور لوگوں کے ایک طبقہ میں بھی آتا ہے پہلے معنی کے لحاظ سے دس قرن ایک ہزار سال کے ہوتے ہیں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ مدت ہزاروں سال کی ہوگی کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں عمریں بہت طویل ہوا کرتی ہیں اس لحاظ سے ایک طبقہ کے گزرنے کے لیے ہی بہت طویل مدت درکار ہوگی پھر اسی نسبت سے دس قرن کا اندازہ کر لینا چاہیے (البداية ج ۱ ص ۱۰۲) درمنثور میں دس قرون کی بجائے دس پشتوں کا لفظ ہے۔

(۱۲۰۴) \* حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش حسب بیان قرآن شریف صرف حق تعالیٰ کے ایک تکوینی ارادہ کے ماتحت ہوئی تھی یہاں مسئلہ ارتقاء سے متاثر ہو کر قرآن کریم کی تاویل کرنی ظلم عظیم ہے اس مسئلہ کے متعلق اسلام کے تفصیلی بیانات اور مسئلہ ارتقاء پر غائر نظر کرنے کے بعد کوئی اجتماع کی صورت باقی نہیں رہتی یہ سعی خام صرف ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے یا تو مسئلہ ارتقاء کے اطراف و جوانب کو ملحوظ نہیں رکھا یا قرآن کریم میں بے جا تاویل کی اہمیت نہیں سمجھی فلسفہ قدیم کے افلاک تسعہ اور عقول عشرہ کو بھلا اسلامی افلاک سبعہ اور ملائکہ اللہ سے کیا مناسبت مگر یہاں بھی بے جوڑ تطبیق کی کوشش کی گئی تھی اور اب مرکز حیات یعنی اسلامی روح اور پروٹوپلازم کے مابین تطبیق کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ بھی خلاف واقع تھا اور یہ بھی خلاف واقع ہے۔ اور یہ سب کچھ مرعوبیت کے نتائج ہیں پہلے فلسفہ قدیم سے دنیا متاثر تھی اور اب فلسفہ جدید سے مرعوب ہے۔

عربی زبان میں آج کل اس کو ”بروتوبلاسم“ کہا جاتا ہے۔ ہمارے علم میں قرآنی تفسیر میں اس کو سب سے پہلے داخل کرنے والے تفسیر المنار کے مؤلف ہیں۔ دیکھو تفسیر المنار ص ۳۲۰ ج ۳۔ ان کے بعد پھر ان کے اتباع میں دوسرے لوگوں نے اس لفظ کو جابجا استعمال کیا ہے۔ ہم اس موقع پر صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ جو لوگ پروٹوپلازم کے قائل ہیں وہ اس حیات کو محض ایک مادی حیات قرار دیتے.....

کَمُ الْاَنْبِیَاءِ مِائَةً اَلْفٍ وَ اَرْبَعَةً وَ عِشْرُونَ  
 اَلْفًا قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ  
 وَسَلَّم وَ کَمُ الرُّسُلُ مِنْهُمْ قَالَ ثَلَاثِمِائَةٍ وَ  
 ثَلَاثَةُ عَشَرَ جَمَّ غَفِیْرٌ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ  
 اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم کُلُّ اَنْبِیَاءِ عَلَیْهِمُ السَّلَامُ کِی تَعْدَادُ کَتَنِی تَحِی؟ فَرَمَیَا اِیْکَ لَاکَھ چوبیس ہزار  
 مِیْنِ نَی عَرَضُ کِی اِن مِیْنِ رَسُوْلَ کَتَنِی تَحِی؟ فَرَمَیَا تِیْنِ سَوْتِیْرَہ کا بہت بڑا گروہ  
 تَحِ۔ مِیْنِ عَرَضُ کِی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّم اِن مِیْنِ سَبِّ سَی پَہلَا رَسُوْل  
 کَوْن تَحِ؟ فَرَمَیَا آدَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ مِیْنِ نَی عَرَضُ کِی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کِیَا وَہ بنی مرسل

..... دیتے ہیں ان کے نزدیک انسانی حیات و موت کی حقیقت ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح پر کہ نباتات کی حیات و موت کی ان میں  
 نشوونما کی استعداد پیدا ہونے کا نام حیات ہے اور اس استعداد پیدا ہونے کا نام حیات ہے اور اس استعداد کے فقدان کا نام موت۔ آپ  
 کے نزدیک حیات و موت کا تمام تعلق عالم غیب سے وابستہ ہے۔ روح ایک غیبی حقیقت ہے اس کے نفع سے انسانی حیات پیدا ہوتی ہے پھر  
 اس غیبی حقیقت کے نکل جانے کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ نہیں جو کسی شاعر نے کہا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے ان اجزاء کا پریشاں ہونا

اب سوچئے کہ پروٹوپلازم کا صرف نام لے کر کر آپ ان دو راستوں میں کوئی اتحاد پیدا کر سکتے ہیں۔ خوب یاد رکھئے اگر آپ ایک  
 لاکھ بار بھی پروٹوپلازم کا اقرار کر لیں اور افسوس یہ کہ اس کو قرآن کریم کی تفسیر بھی بنا ڈالیں جب بھی وہ قوم روح کے اس تخیل سے جو آپ  
 کے ذہن میں ہے آپ سے برابر بدکتی رہے گی۔ لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَہُوْدُ وَ لَا النَّصَارٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔ اس لیے اس خیال خام  
 اور سعی لا حاصل میں پڑنے کی ضرورت نہیں اور بے وجہ بحث کر کر کے اسلامی بیانات اور تحقیقات عصریہ کے مابین مطابقت پیدا کرنے کی  
 ضرورت بھی نہیں اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ بلکہ اسلامی تاریخ کی اس تحریف کا ہم کو حق بھی نہیں ہے۔

ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ شریعت سلام نے چونکہ محالات کے تسلیم کرنے کا بوجھ ہم پر کہیں نہیں ڈالا اس لیے اگر واقعہ میں کوئی بات  
 ایسی موجود ہو جو اسلامی عقل کے چونکہ محال سمجھی جائے تو اس جگہ بے شک تاویل نہ کرنا جمود ہوگا۔ ہم نہ اس آزادی کے حامی ہیں نہ اس جمود  
 کے قائل۔ امام رازی نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تفسیر میں دو جگہ اس مذموم مسئلہ کو چھیڑا ہے اور لکھا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت عقلی لحاظ  
 سے کسی ایک انسان پر جا کر ختم ہونی چاہیے۔ لا بد من انتهاء الناس الی انسان۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۴۸۵ ج ۵ ص ۲۷۵)

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی تعلیم کی بناء پر نسل انسانی کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی ہے اور تمام انسانوں کے لیے ان کے  
 وجود کو ایک اساس مانا جاتا ہے اسی بنا پر ان کو ابو البشر کا لقب عنایت ہوا ہے پھر یہ لقب اتنا مشہور کیا گیا ہے کہ اکثر مقامات میں حضرت آدم  
 علیہ السلام کو اسی لقب کے ساتھ یاد فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس دور میں صرف ایک انسان نیست ہی نیست ہوا ہو۔ ابھی قوم اور شریعت کا  
 پتہ تک نہ ہو اس کو رسول اور نبی کے لفظ سے کیسے یاد کیا جاسکتا تھا۔ باوجودیکہ وہ خدا تعالیٰ سے نبیوں کی طرح ہمکلام بھی تھا لیکن اس کا نقشہ  
 حیات جتنا کہ بحیثیت ابوة قابل بیان تھا اتنا بہ حیثیت رسالت نہ تھا۔ انسانی پیدائش کے بعد جو ہم تر مسئلہ سامنے آتا ہے وہ انسانی معاشیات  
 کا تھا کیونکہ اسی پر اس کے بقاء و نشر کا مدار تھا۔ یہاں اصولی عقائد میں ابھی کوئی تفریق کا محل ہی نہ تھا۔ اولاد کے کانوں میں خدا اور اس کی  
 توحید کے سوا کوئی دوسری آواز ہی نہیں پڑی تھی گویا اس وقت عقائد کا مقام وہ تھا جو فطری خصائل کا ہو سکتا ہے اس کے باوجود جب کہیں  
 صف انبیاء علیہم السلام بچھی ہے تو اس میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر ضرور آ گیا ہے اور رسولوں ہی کے ساتھ آیا ہے۔ دیکھو شب معراج  
 میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جب آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام کا اجتماع کیا گیا حالانکہ حسب بیان احادیث یہ لہے.....



تھے؟ فرمایا جی ہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دست مبارک سے پیدا فرمایا تھا۔  
پھر ان میں اپنی خاص روح پھونکی اور اپنے سامنے ان کو ہر طرح سے لیس کر  
دیا تھا۔

(ابن حبان)

صحیحہ کذا فی البدایۃ و الہایۃ ص ۹۷

(۱۲۰۵) عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا صَوَّرَ اللَّهُ آدَمَ فِي الْجَنَّةِ تَرَكَهُ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَتْرُكَهُ فَجَعَلَ ابْلِيسُ

(۱۲۰۵) حضرت انس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنت میں حضرت آدم کا کالبد تیار کر لیا تو جب تک اس کو منظور تھا اسی صورت پر اس کو رکھا۔ اس درمیان میں ابلیس اس کے گرد

لٹے ..... اجتماع بہت ہی محدود پیمانہ پر تھا لیکن اس پر بھی حضرت آدم علیہ السلام وہاں موجود نظر آتے ہیں محشر میں جہاں رسولوں کے سوا کسی کو لب کشائی کی مجال نہ ہوگی اہل محشر کی نظریں جب شفاعت کے لیے رسولوں کی طرف اٹھیں گی تو سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف اس طرح اٹھیں گی گویا ان کی رسالت انسانی فطرت میں مرکوز تھی پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کی طرف نظر کی جاتی ہے تو ان کا جواب بھی وہاں ٹھیک اسی انداز کا نظر آتا ہے جو دوسرے انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ گویا خود وہ بھی اپنے نفس کو اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھتے ہیں، لیکن یہ حقیقت کتنی ظاہر ہے کہ جو سارے انسانوں کی بنیاد ٹھہر چکا ہو اس کے لقب کے لیے دنیا و آخرت میں ابوالبشر سے بڑھ کر اور کون سا لقب ہو سکتا تھا۔

حیرت ہوتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت ایسے دور میں زیر بحث آگئی ہے جس میں کرشن جی کی نبوت قرین قیاس سمجھی جا رہی ہے۔ اہل قلم چاہتے ہیں کہ بچ بچ کر جس طرح ممکن ہو کرشن کی نبوت کا عقیدہ اس طرح دماغوں میں اتار دیں کہ کسی خلاف کے ٹکراؤ کا اندیشہ بھی نہ ہو اور ان کی نبوت بھی ثابت ہو جائے۔ ادھر تو یہ فراخ حوصلگی ادھر یہ تنگی کہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق اس طرح شبہات سامنے لاتے ہیں کہ ان پر کوئی گرفت بھی نہ ہو سکے اور ایک نبی کی نبوت کا عقیدہ ذہنوں سے اگر نکل نہ سکے تو کم از کم اس میں شبہات تو ضرور پیدا ہو جائیں۔ ہمیں یہاں کسی فرد کی نبوت و عدم نبوت کی تحقیق کرنی منظور نہیں ہے بلکہ انسانی جدت پسندی کا نوحہ کرنا ہے اور اس پر اہمیت سے تنبیہ کرنی ہے کہ نبوت کوئی ایسا مقام نہیں جو محض حسن ظنی کی بناء پر کسی کے حق میں تجویز کر دیا جائے یہاں احتیاط کا قدم بس یہ ہے کہ جن رسولوں کے نام ہم کو بتائے جا چکے ہیں ان پر تو خاص ایمان رکھا جائے اور ان کے سوا خصوصی اشخاص کے متعلق نہ اس جانب کسی رجحان کا اظہار کیا جائے نہ اس جانب۔ دوم یہ بھی تنبیہ ضروری ہے کہ صرف کسی انسان کی خدا ترسی اس کی نبوت کا ثبوت نہیں ہے کہ اس کے حق میں نبوت کی حسن ظنی بھی پیدا کر لی جائے۔ امم سابقہ میں کتنے ہی انسان گذرے ہیں جن کے معتقدین نے نبص حدیث ان کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا ہے مگر ان کے حق میں رسالت کا بے دلیل کوئی گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ سوم یہ بات بھی قابل فراموشی نہیں ہے کہ اگر دین کے عام مسلمات جو متقدمین علماء حق کے نزدیک محقق اور مختار ہیں کسی بین اور بدیہی ثبوت کے بغیر غیر معتمد قرار دے دیئے جائیں تو پھر شاید اسلام از اول تا آخر بدلا جاسکتا ہے۔ دین محمدی صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوا اس کے کچھ بدیہی مسلمات ہیں جو توارث سے ثابت ہیں اس مقام پر لفظی دلائل کے ساتھ توارث کا خیال رکھنا بھی لازم ہے فیصلہ صرف لفظی بحث سے کر دینا عجلت پسندی مذموم اور جدت طرازی ہے۔

(۱۲۰۵) \* اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی صورت خلد بریں میں ہی بنائی گئی تھی۔ اگر جنت سے مراد دنیا کا کوئی باغ ہوتا تو یہ کوئی اتنی اہم بات نہ تھی جس کا تذکرہ حدیثوں میں آتا پھر جب وہیں ان کی صورت بنی تو یقیناً وہیں ان کی سکونت بھی تھی.....

يَطُوفُ بِهِ يَنْظُرُ مَا هُوَ فَلَمَّا رَأَاهُ أَجُوفٌ  
عَرَفَ أَنَّهُ خُلِقَ خَلْقًا لَا يَتِمَّا لَكَ

(رواہ مسلم)

(۱۲۰۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَفْتَخِرُونَ  
بِأَبَائِهِمُ الَّذِينَ مَاتُوا إِنَّمَا هُمْ فَحَمٌ مِنْ جَهَنَّمَ  
أَوْ لَيَكُونَنَّ أَهْوَنَ عَلَى اللَّهِ مِنَ الْجَعَلِ الَّذِي  
يُذْهِدُهُ الْخِرَاءُ بَانْفِهِ كُلُّهُمْ بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِنْ  
تُرَابٍ. (رواہ الترمذی و ابوداؤد)

(۱۲۰۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ فِيهِ  
الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِيهِ  
أُذْخِلَ الْجَنَّةَ وَفِيهِ أُخْرِجَ مِنْهَا.

(رواہ مسلم و فی الصحیح و فیہ تقوم الساعة)

چکر لگاتا اور دیکھتا کہ یہ کیسی مخلوق ہے جب اس نے دیکھا کہ وہ تو اندر سے  
کھوکھلی ہے (ٹھوس نہیں ہے) تو سمجھ لیا کہ یقیناً یہ ایسی مخلوق بنائی گئی ہے جو  
اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکے گی۔ (مسلم شریف)

(۱۲۰۶) ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ  
نے تنبیہ کے لہجہ میں فرمایا۔ یا تو یہ لوگ جو اپنے ان مردہ باپ دادوں پر جومر  
کر جہنم میں کوئلہ ہو چکے ہیں فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ  
پاخانہ کے اس کیڑے سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل ہوں گے جو نجاست کو اپنی  
ناک سے ہٹا ہٹا کر کھسکتا ہے سب آدم ہی کی اولاد ہیں اور آدم کی پیدائش  
مٹی سے ہوئی ہے۔ (پھر فخر کس بات کا) (ترمذی و ابوداؤد)

(۱۲۰۷) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا سب سے مبارک دن جس میں آفتاب طلوع کرتا ہے جمعہ  
کا دن ہے اسی دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اسی دن جنت میں داخل  
ہوئے اور اسی دن جنت سے نکلے اور قیامت بھی اسی دن آئے گی۔

(مسلم شریف)

اللہ..... ہوگی اور اسی وقت جنت کو آدم علیہ السلام کی وراثت کہنا بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم کی کسی ایک آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا  
کہ وہ کوئی دنیا کا باغ تھا۔ آدم علیہ السلام کی سرگزشت مختلف مقامات میں ذکر کی گئی ہے مگر کسی ایک مقام پر بھی اس کی طرف اشارہ نہیں کیا  
گیا۔ آج بھی بہت سے انسان باغوں میں رہتے ہیں اس لیے یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں جس کا قرآن کریم بار بار اس انداز سے ذکر  
فرمائے گویا وہ ان پر قدرت کی طرف سے بہت بڑا انعام تھا۔ اور معصیت کے بعد پھر اس سے نکلنا کوئی بہت بڑی محرومی تھی جو ہمیشہ قابل  
یادگار تھی۔

يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ  
أَبَوَيْكُمُ مِنَ الْجَنَّةِ. (الاعراف: ۲۷)

اے اولاد آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں ڈال دے جیسا اس نے  
تمہارے ماں باپ کو جنت میں سے باہر کر دیا۔

(۱۲۰۷) \* قرآن کریم میں جا بجا چھ دن میں عالم کی تخلیق کا تذکرہ آیا ہے اس کے بعد پھر استواء علی العرش کا ذکر ہے۔ اسلامی نقول کے  
لحاظ سے عالم کی پیدائش ہفتہ سے شروع ہو کر جمعرات پر ختم ہو گئی ہے اور اس جمعہ میں کچھ اور پیدا نہیں کیا گیا۔ اسی لحاظ سے ہمارے یہاں  
جمعہ کا دن تعطیل کا دن شمار ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ کتنی مدت کے بعد کسی اور جمعہ میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے ہیں۔ لہذا یہاں  
جمعہ سے مراد عالم کی تخلیق کے بعد متصل جمعہ مراد نہ لینا چاہیے۔ جس دن میں قدرت کے اتنے اہم افعال جمع ہوں ظاہر ہے کہ وہ کتنا عظیم  
الشان دن ہوگا۔



(۱۲۰۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ طُولُهُ سِتُونَ ذِرَاعًا فَلَمَّا خَلَقَهُ قَالَ اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلَى أَوْلِيكَ النَّفَرِ وَهُمْ نَفَرٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ جُلُوسٍ فَاسْتَمِعَ مَا يُحْيُونَكَ فَإِنَّهَا تَحْيِيكَ وَتَحْيِيَةُ ذُرِّيَّتِكَ فَذَهَبَ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَقَالُوا السَّلَامُ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللَّهِ قَالَ فَرَأَوْهُ وَرَحْمَةُ اللَّهِ الْحَدِيثُ. (متفق عليه)

(۱۲۰۸) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی خاص صفات پر پیدا فرمایا، ان کا قد ساٹھ گز لمبا تھا۔ جب ان کو پیدا فرما چکا تو اس نے کہا جاؤ یہ جو فرشتوں کی جماعت بیٹھی ہے اس کو سلام کرو اور جو جواب وہ تم کو دیں اس کو غور کے ساتھ سننا کیونکہ تمہاری اور تمہاری اولاد کی آئندہ سلام کی وہی سنت ہوگی۔ یہ گئے اور انہوں نے فرمایا ”السلام علیکم“ انہوں نے جواب میں ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ“ کا لفظ اور زیادہ کر دیا۔

(متفق علیہ)

وقد رواه الترمذی بسط منه و فیہ قصۃ اعطاء ادم ابنہ داؤد علیہ السلام من عمرہ.

(۱۲۰۸) \* نسل انسانی کو جو جو اہم اسباق قدرت کو سکھانے تھے وہ ابتداء سے ہی اصل انسانی میں ودیعت فرمادیے تھے تاکہ وہ انسانی فطرت کا جزء بن جائیں۔ پھر جب اس کو اپنی خلافت خاصہ سے نواز کر کرۂ ارضی پر اپنا نائب بنایا تو یہ بھی ضروری ہوا کہ خلیفہ اپنے اصل مالک کے کمالات کا مظہر ہو اور اس لیے یہ بھی مناسب ہوا کہ تاج پوشی کی رسم کے لیے ایک بار خلیفہ کے حق میں بھی انقیاد و تسلیم کا وہ نقشہ دکھا دیا جائے جو اصل مالک کے لیے مخصوص تھا، یعنی ”سجدہ تہیہ“ نیز جب آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تو ضروری ہوا کہ ان کی ماتحت مخلوق کی فطرت میں جذبہ انقیاد کا تخم بھی ڈال دیا جائے۔ اس لیے سب سے قوی مخلوق کو جو بقیہ تمام مخلوق پر نگران بنائی گئی تھی سجدہ کا حکم دیا گیا تاکہ بقیہ تمام مخلوق میں آدم علیہ السلام کی اطاعت شعاری ان کی سرشت بن جائے اور کسی کو سرتابی کا حوصلہ نہ رہے اسی عام تسخیر کو جو آسمانوں سے لے کر کرۂ ارضی تک نظر آتی ہے۔ قرآن کریم میں جا بجا بطریق امتنان ذکر فرمایا گیا ہے، جدید فلسفہ کہتا ہے کہ یہ قوی کے ضعیف پر غیر محدود زمانہ کے تسط کا اثر ہے، مگر مذہب یہ بتاتا ہے کہ یہ قدرت کی پوشیدہ کار فرمایاں ہیں۔ پھر جب یہ عام تسخیر مقدر ہوئی تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اس خلیفہ کو اصل کے خاص کمالات کا مظہر بنایا جائے اور اس کے خاص صفات میں سے صفت علم میں سب سے ممتاز بنایا جائے حتیٰ کہ ملائکہ اللہ سے بھی اسی نکتہ سے فرشتوں کی نظر چوک گئی اور انہوں نے اپنی تسبیح و تقدیس اور عبودیت کو پیش کیا حالانکہ یہ اگر کمال تھا تو مخلوق اور عبد کا کمال تھا، حاکم اور خالق کا تو نہ تھا۔ آدم علیہ السلام اگر کسی دوسری مخلوق کے خلیفہ ہوتے تو ان کی یہ بحث شاید بر محل ہوتی مگر یہاں خلافت الہیہ کا منصب عطاء ہو رہا تھا، یہاں عبودیت کی خاص صفت کی بجائے اصل مالک کی خاص صفات کا مظہر ہونا لازم تھا۔ حیات، قدرت، سمع و بصر، مشیت و ارادہ، کلام کے آثار تو دوسری مخلوق میں بھی کم و بیش موجود تھے ان سب میں نمایاں اور خاص صفت علم کی صفت تھی اس لیے اسی کو معیار مقرر کیا گیا اور اسی پر خلافت کی بحث ختم کر دی گئی اور اسی وقت یہ راز مخلوق پر روشن ہو گیا کہ جو اصل خالق کے کمالات کا سب سے بڑا مظہر ہو وہی اس کی خلافت کا سب سے زیادہ مستحق ہونا چاہیے۔

اب رہی یہ بحث کہ ساٹھ ذراع شرعی جو ہمارے تیس ذراع ہوتے ہیں اس طول کے انسان کا دنیا کے کسی دور میں ہونا عصری تحقیقات کے خلاف ہے تو یہ صرف ایک قیاسی بحث ہے اور اس پر عقلی طور پر گفتگو کرنے کی بہت گنجائش ہے، اب جس پر اپنی تحقیق کا غلبہ ہو گا وہ اسی طرف جھکتا رہے گا اور جس پر اخبار شریعت کا غلبہ ہو گا وہ اسی پر اعتماد و وثوق کرے گا۔ صرف عقلی میدان میں کسی کو بازی لے جانا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ ایک روایت میں ”ستون ذراعاً فی السماء“ کی تصریح ہے۔ حضرت شیخ اس کی مراد یہ بیان فرماتے تھے کہ آدم علیہ السلام کے قد کی یہ درازی جنت میں تھی، جب ان کو زمین پر اتارا گیا تو اس میں مناسب تخفیف کر دی گئی۔

(۱۲۰۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَفَعَهُ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللَّهُ  
آدَمَ عَطَسَ (ای لَمَّا دَخَلَ الرُّوحُ فِي رَأْسِهِ)  
فَقَالَ الْحَمْدُ لِلَّهِ فَقَالَ لَهُ رَبُّهُ رَحِمَكَ رَبُّكَ  
يَا آدَمُ. (رواه البزار قال الحافظ ابن كثير في  
البدایة ج ۱ ص ۸۶ و هذا اسناد لا بأس به و

قد روی ابن حبان فی صحیحہ عن انس بنحوہ)

(۱۲۱۰) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا  
قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
إِنَّ أَوَّلَ مَنْ حَجَدَ آدَمُ قَالَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ إِنَّ  
اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمَّا خَلَقَهُ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَأَخْرَجَ  
ذُرِّيَّتَهُ فَعَرَضَهُمْ عَلَيْهِ فَرَأَى فِيهِمْ رَجُلًا يَزْهَرُ  
فَقَالَ أَيُّ رَبِّ زِدْ فِي عُمُرِهِ قَالَ لَا إِلَّا أَنْ  
تَزِيدَهُ أَنْتَ مِنْ عُمُرِكَ فَزَادَهُ أَرْبَعِينَ سَنَةً  
مِنْ عُمُرِهِ فَكَتَبَ اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ كِتَابًا وَ

(۱۲۰۹) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا (اور  
روح ان کی ناک تک پہنچی) تو ان کو چھینک آئی انہوں نے کہا ”الحمد للہ“ ان  
کے پروردگار نے اس کے جواب میں فرمایا ”یا ادم رحمک ربک“  
اے آدم تمہارا رب تم پر رحم فرمائے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۸۶)

(۱۲۱۰) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
جس نے سب سے پہلے انکار کیا وہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ آپؐ نے یہ  
جملہ تین بار فرمایا۔ بات یوں ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کر لیا اور  
ان کی پشت سے ان کی ذریت نکال کر ان کے سامنے کی تو انہوں نے ان  
میں ایک شخص دیکھا جو چمک رہا تھا۔ انہوں نے عرض کی پروردگار اس کی عمر  
کچھ اور بڑھا دے ارشاد ہوا یہ نہیں ہو سکتا مگر اس صورت سے کہ تم اپنی عمر  
سے کچھ ان کو دے دو۔ آدم علیہ السلام نے اپنی عمر کے چالیس سال اس کو  
دے دیئے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس معاملہ کی نوشتہ و خواندہ کے بعد اس پر

(۱۲۰۹) \* اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ چھینک آثار حیات میں سے ہے اس لیے آج تک اس پر الحمد للہ کہنا سنت آدم شمار ہوتا ہے۔  
اسی طرح اس کے جواب میں ”رحمک اللہ“ کہنا اسی قدیم سنت کے مطابق ہے۔ ان احادیث سے تحیہ و تحمید کے الفاظ کی اہمیت سمجھنی چاہیے اسی  
لیے حدیثوں میں اس پر ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے جو اپنے محل میں آئے گا۔ افسوس کہ مسلمانوں نے آج ان دونوں مقامات پر سنت آدم  
کو فراموش کر کے نئے نئے الفاظ اپنی جانب سے تراش لیے ہیں اور کسی نے تو چھینک کو برکت کی بجائے اس کو اور آثار نحوست تک سمجھ لیا ہے۔

(۱۲۱۰) \* حضرت آدم علیہ السلام جس طرح تخلیق انسانی کی اساس تھے اسی طرح قدرت کے بہت سے اسرار تکوینیہ کا ایک مرکب نسخہ بھی  
تھے۔ ان کا لبد مختلف رنگ و بو کی مٹی سے بنایا گیا تو ان کی ذریت میں ہر رنگ کا انسان اور اس میں نرمی و گرمی ہر قسم کی خو پیدا ہو گئی۔ اسی  
طرح جب سہو و نسیان اور جھوٹ و خفا کا تخم بھی گو کسی حیثیت کا ہوان میں بودیا گیا۔ تو وہی تخم بڑھ کر خدا تعالیٰ کے قہر و مہر کا سامان بن گیا یعنی سہو  
و نسیان بڑھا تو غفلت کی شکل بن گئی خطا نے ترقی کی تو عمد کی صورت ظاہر ہو گئی اور جب جھوٹ کی خصلت بڑھی تو کفر و نما ہو گیا۔ والعیاذ باللہ  
اگر طینت آدم علیہ السلام میں مختلف رنگوں کی مٹی شامل نہ ہوتی تو نہ تو نسل انسانی کے رنگوں میں اختلاف نظر آنا اور نہ ان کے خصائل و طبائع  
میں۔ سب ایک ہی باپ کی اولاد تھے اور اس لیے اپنے رنگ و بو میں بھی سب یکساں ہوتے اسی طرح اگر ان میں بنیادی طور پر انسانی ضعف  
نہ رکھا جاتا تو نسل انسانی میں بھی کمزوری کا اثر نظر نہ آتا۔

واضح رہے کہ صاحب مشکوٰۃ نے مذکورہ بالا واقعہ کو اپنی تالیف میں دو جگہ ذکر فرمایا ہے۔ کتاب القدر میں اور باب السلام میں اور لفظ.....



أَشْهَدُ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَقْبِضَ  
رُوحَهُ قَالَ إِنَّهُ بَقِيَ مِنْ أَجَلِي أَرْبَعُونَ سَنَةً  
فَقِيلَ لَهُ إِنَّكَ قَدْ جَعَلْتَهَا لِابْنِكَ دَاوُدَ  
عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ فَجَحَدَ قَالَ فَأَخْرَجَ اللَّهُ  
الْكِتَابَ وَ أَقَامَ عَلَيْهِ الْبَيِّنَةَ فَاتَمَّهَا لِدَاوُدَ  
عَلَيْهِ السَّلَامُ مِائَةً سَنَةً وَ أَتَمَّ لِأَدَمَ عَلَيْهِ  
السَّلَامُ عُمرَهُ أَلْفَ سَنَةٍ.

فرشتوں کی گواہی لے لی پھر جب ان کی قبض روح کا وقت آیا تو آدم علیہ السلام نے فرمایا ابھی تو میری عمر کے چالیس سال باقی ہیں ان سے کہا گیا آپ تو وہ اپنے فرزند داؤد کو بخش چکے ہیں۔ آدم علیہ السلام کو وہ بات یاد نہ رہی اس لیے انہوں نے انکار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اقرار نامہ نکال کر ان کے سامنے کیا اور اس کا ثبوت دے دیا (بس اصل انسانی کے اس انکار کا اثر نسل انسانی میں بھی چلتا رہا۔ اور نسیان کی طرح انکار بھی انسان کی سرشت بن گئی) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی عمر بھی سو سال پوری کر دی اور آدم علیہ السلام کی عمر بھی بدستور ہزار سال رہنے دی۔ (مسند احمد)

(رواہ الامام احمد)

لہذا ..... دوسری جگہ اس میں اربعین کی جگہ ستین سنہ کا لفظ نقل فرمایا ہے یعنی آدم علیہ السلام نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی عمر میں سے ساٹھ سال عطا فرمائے تھے مگر اس روایت میں داؤد علیہ السلام کی عمر چالیس سال مذکور ہوئی ہے اور پہلی روایت میں جہاں آدم علیہ السلام کا چالیس اپنی عمر میں سے عطا فرمانا مذکور ہے۔ وہاں داؤد علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال بیان کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک دونوں روایتوں کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی درخواست ان کی عمر پوری سو سال ہونے کے متعلق تھی۔ پس اگر ان کی عمر ساٹھ سال تھی تو اس میں چالیس کی کسر تھی اور اگر چالیس سال تھی تو ساٹھ سال کی کسر تھی۔ دونوں صورتوں میں ان کی عمر پورے سو سال ہو جاتی ہے۔ روایوں کو یہاں اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی اصل عمر کیا بیان فرمائی تھی اس لیے سو سال کی تکمیل میں بھی اسی حساب سے ان کو مختلف رہنا چاہیے تھا۔ یہاں حدیث کی جو توجیہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نقل فرمائی ہے وہ مشکوٰۃ کے حواشی میں دیکھ لی جائے۔ اس کے حساب سے ان کی عمر ۱۲۰ سال بن جاتی ہے۔ اپنی رائے ناقص ہم بیان کر چکے ہیں۔ شارحین کی نظر یہاں صرف آخر حصہ پر رکھی ہے۔ یعنی یہ کہ آدم علیہ السلام نے ان کو چالیس سال بخشے تھے یا ساٹھ اور اسی پر بحث شروع کر دی ہے۔ اگر اس طرف بھی ان کی نظر چلی جاتی کہ یہاں دوسرا اختلاف اس سے پہلے داؤد علیہ السلام کی اصل عمر میں بھی موجود ہے تو بات صاف ہو جاتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ترمذی شریف کی اس دوسری روایت میں یہ لفظ اور ہیں قال فمن يومئذ امر بالكتاب و الشهود.

تقدیر کے بیان میں اس روایت کے اہم اجزاء پر کلام کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمالیا جائے۔ یہاں مسند احمد کی یہ روایت خاص اس لیے نقل کی گئی ہے کہ اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی عمریں پوری کی پوری ہی عطا فرمادیں اور حساب سے جو کمی بیشی ہوئی تھی اس کی رعایت نہیں کی۔

اس سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ سہو و نسیان جو دو عصیان کی نسبت گواہیہم علیہم السلام کی جانب بھی آ گئی ہے مگر ان میں اس کی حقیقت کیا ہوگی کہ ان کے سہو و نسیان اور جو د پر بھی رحمت کی اتنی بارشیں ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر قرآن کریم کے فوائد میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی ذریت کے لیے نمونہ تقدیر تھے۔ سہو و نسیان اور جو د و عصیان کی جو جو خصائیں ان کی ذریت میں مقدر تھیں وہ سب ان کے آئینہ میں پہلے سے نظر آ گئیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ شدت و خفت کے لحاظ سے اس کی نوعیت میں وہ اختلاف پیدا ہو گیا جو صورت و حقیقت میں ہوتا ہے۔ یہاں صرف ان کی صورت ہی صورت تھی اور آگے چل کر وہ صورت ترقی کر کے حقیقت کا رنگ اختیار کر گئی یہ بھی ایک ارتقائی حرکت سمجھنی چاہیے۔

(۱۲۱۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ عورت (بائیں) پسلی سے بنائی گئی ہے وہ کبھی ایک سیدھے طریقہ پر

(۱۲۱۱) \* حضرت حواء کی تخلیق کے متعلق قرآنی اور حدیثی بیان ہمارے پاس صرف ایک یہی ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا بیان موجود نہیں۔ حضرت حواء کی پسلی سے پیدائش گو فہم سے بالاتر بات ہے۔ لیکن اگر حدیث کے الفاظ پر ذرا غور کر لیا جائے تو پھر اس میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ حدیث میں حضرت حواء کے متعلق ”ولد“ کا لفظ نہیں بلکہ ”خلق“ کا لفظ ہے۔ چونکہ اردو زبان میں دونوں کا ترجمہ یکساں ہے اس لیے یہاں بے وجہ کی الجھن پیدا ہو گئی ہے حدیث یہ نہیں کہتی کہ حضرت حواء کی ولادت پسلی سے ہوئی تھی بلکہ یہ کہتی ہے کہ ان کی خلقت پسلی سے ہوئی ہے یعنی جس طرح آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے تھے حضرت حواء ضلع آدم یعنی ان کی پسلی سے بنائی گئی تھیں۔ ہمارے نزدیک تو انسان کی ایک انسان سے تخلیق اتنی بعید نہیں جتنی کہ انسان کی مٹی سے بعید ہے اب اگر ہمارے روزمرہ کے مشاہدہ نے اس کو بدیہی بنا دیا ہے تو اس سے اصل حقیقت کا معمہ پھر حل نہیں ہوتا۔ حدیث کے اس بیان کو اگر سورہ نساء کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے:

﴿يَسَاءُ لِلنَّاسِ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾ (النساء: ۱)

”اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں۔“

آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت نہ تو براہ راست ابتداء پیدا کی گئی ہے اور نہ صرف ایک وحدت سے پیدا کی گئی ہے بلکہ اس میں ایک تدریج ملحوظ رکھی گئی ہے اور اس کی شکل یہ ہوئی کہ پہلے ایک ہی نفس کو پیدا فرمایا گیا۔ پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا گیا پھر اس جوڑے سے انسانوں کی یہ کثرت پیدا کی گئی اب اگر فرض کرو کہ حضرت حواء کی تخلیق بھی حضرت آدم علیہ السلام کی طرح مستقل ہوتی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مادہ تخلیق کیا تھا۔ قرآن کریم اور حدیث میں مذکورہ بالا صورت کے علاوہ اس باب میں کوئی بیان موجود نہیں نیز اگر حضرت حواء کی تخلیق بھی مستقل مانی جائے تو پھر انسانوں کی کثرت کے ظہور کے لیے جو نسق بیان اختیار فرمایا گیا ہے اس کی بجائے سیدھی بات یہ تھی کہ ہم نے اس کثرت کو آدم و حواء سے پیدا کیا ہے جیسا کہ حضرت حواء کے بعد یہی نسق بیان اختیار فرمایا گیا۔ ”وَبَثَّ مِنْهُمَا“ یعنی پھر ہم نے اس جوڑے سے کثرت پیدا کی۔ سورہ بقرہ میں امام قرطبی نے صرف اسی تفسیر کو ذکر فرمایا ہے بلکہ اس میں ایک لفظی نکتہ بھی لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں عورت کو ”امراة“ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ”المرء“ سے بنی ہے جس کے معنی مرد کے ہیں اور ان کا نام حواء بھی اسی لیے رکھا گیا تھا، کیونکہ وہ ایک ”حی“ یعنی زندہ ہستی سے بنائی گئی تھیں۔ گویا یہ حقیقت حضرت حواء کی تخلیق سے لے کر ان کے نام تک سرایت کر گئی ہے بلکہ احکام میں بھی اس کا اثر یہاں تک ظاہر ہوا کہ امام شافعیؒ کے مذہب میں شیر خوار لڑکے کا پیشاب بہ نسبت شیر خوار لڑکی کے نجاست میں خفیف سمجھا گیا ہے۔ پھر جب خود امام شافعیؒ سے اس تفریق کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے ایک علمی نکتہ کے طور پر فرمایا کہ نوع انسانی میں مذکر کی پیدائش آب و گل سے ہوئی ہے اور وہ پاک ہے اور مؤنث کی گوشت و خون سے اور وہ ناپاک ہے اس لیے نسل انسانی میں بھی اپنی اصل کے آثار باقی رہ گئے ہیں۔ امام موصوف کا یہ بیان صرف ایک علمی نکتہ ہے اس کی اصل بنا صحیح حدیثوں پر ہے فروعی تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں عقلی طور پر تخلیق کی چار صورتیں ہیں اور وہ چاروں انسانی تخلیق میں پوری کردی گئی ہیں۔ والدین اللہ.....



ضَلَحَ لَنْ يَسْتَقِيمَ لَكَ عَلَى طَرِيقَةٍ فَإِنْ  
اِسْتَمْتَعْتَ بِهَا اِسْتَمْتَعْتَ وَبِهَا عَوَجٌ وَاِنْ  
ذَهَبَتْ تُقِيمُهَا كَسَرَتْهَا وَكَسَرُهَا طَلَاقُهَا۔  
تمہارے ساتھ بسر نہیں کر سکتی اب اگر اس سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسی  
کجی کے ساتھ نفع حاصل کرتے رہو! اگر کہیں تم نے اس کے سیدھا کرنے کا  
ارادہ کیا تو یاد رکھو کہ تم اس کو توڑ دو گے۔ یعنی اس کو طلاق دینی ہوگی۔

(مسلم شریف)

(رواہ مسلم و فی البخاری نحوه)

(۱۲۱۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (۱۲۱۲) ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ملہ ..... کے بغیر پیدائش جیسے آدم علیہ السلام والدین سے پیدائش جیسا کہ معمول ہے۔ صرف والدہ سے پیدائش جیسا کہ حضرت عیسیٰ  
علیہ السلام۔ اب صرف ایک یہی صورت باقی رہتی ہے جس میں صرف مذکر سے تخلیق ہو۔ اب اگر حدیث مذکور میں تاویل نہ کی جائے تو  
حضرت حواء اس چوتھی صورت کا مصداق ہوں گی ورنہ دائرہ تخلیق میں صرف یہی ایک قسم ہوگی جس کی مثال نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ عقل کے  
نزدیک دوسری قسم کے سواء سب صورتیں ناقابل فہم ہیں چنانچہ نصاریٰ نے گو صرف والدہ سے پیدائش کا اعتراف تو کر لیا مگر وہ بھی پورے  
طور پر اس کے سمجھنے سے قاصر رہے حتیٰ کہ اسی کو عیسیٰ علیہ السلام کی ابیت کی دلیل بنا بیٹھے دوسری طرف یہود نے اس خلقت کو غیر معقول سمجھا تو  
عالم کی ایک پاک باز ترین عورت کو متہم کرنے سے باز نہ رہ سکے اب رہ گئی حضرت حواء کی شخصیت تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کے اہم  
واقعات میں اس طرح گم ہے کہ یہاں نئے نئے محققین نے صاف طور پر سامنے آ کر کوئی بات تو نہیں کہی مگر ان کے دلوں کے اندر ہی اندر  
تخلیق کی اس نوع میں بہت سے شبہات کھٹک رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک مذکورہ بالا حدیث قرآن کریم کی آیت خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کا بیان ہے اور اس طرح تخلیق کا نکتہ بھی خود قرآن کریم

ہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا﴾ (اعراف: ۱۸۹)

”وہی تمہارا پروردگار ہے جس نے تم کو اکیلی جان سے پیدا کیا۔ اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے تسکین حاصل کرے۔“

سورہ نساء اور سورہ اعراف میں دونوں جگہ حضرت حواء کے حق میں ایک ہی لفظ یعنی خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا ارشاد فرمایا گیا ہے مگر یہاں  
اس کی حکمت بھی بیان فرمادی گئی ہے یعنی یہ بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حضرت حواء حضرت آدم علیہ السلام ہی سے بنائی گئی تھیں۔ کیونکہ  
انسان کو جتنی کشش اپنے ہم جنس کی طرف ہوتی ہے اس سے زیادہ کشش اس کی طرف ہوتی ہے جو خود اسی سے پیدا شدہ ہو۔ اسی لیے جو محبت  
اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے وہ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اجنبی مرد و عورت کے درمیان عقد نکاح کے فوراً بعد جس محبت کا مشاہدہ  
ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ بعید نہیں کہ ان کے اصول میں ضرور کوئی ایسا ہی رشتہ ہونا چاہیے امام قرطبی تحریر فرماتے ہیں کہ آدم علیہ  
السلام کو حضرت حواء کی اس طرح تخلیق سے قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہوئی اگر ایسا ہوتا تو نسل انسانی میں کسی مرد کو کسی عورت کی طرف کبھی رغبت  
نہ ہوتی اور اصل انسانی میں تکلیف کی تاریخ نسل انسانی میں اثر دکھائے بغیر نہ رہتی۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

(۱۲۱۲) \* بنی اسرائیل کی فرمائش پر من و سلویٰ نازل ہوا تھا مگر ان کو یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ وہ کچھ بچا کر نہ رکھا کریں مگر انہوں نے حکم

عدولی کی۔ آخر یہ رسم بد آئندہ نسلوں میں بھی چل پڑی اور اپنی حاجت سے فاضل گوشت جمع کرنا شروع کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ سڑنے کی نوبت

آنے لگی۔ کیا تعجب ہے کہ انسانی اخلاق کسی زمانہ میں گوشت جیسی چیز کا ضرورت سے زیادہ جمع رکھنا مکروہ سمجھتے ہوں۔ پھر اخلاق کی ملکہ.....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ لَا بَنَى إِسْرَآئِيلَ لَمْ يَخْنِزِ اللَّحْمُ وَلَوْ لَا حَوَاءُ لَمْ تَخْنِ الْإِنْسَى زَوْجَهَا الدَّهْرَ. (متفق عليه)

اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو (گوشت جمع کر کے رکھنے کی بری رسم نہ پڑتی) اور گوشت (گھروں میں پڑا پڑا) نہ سڑا کرتا۔ اور اگر حضرت حواء نہ ہوتیں تو کوئی عورت زمانہ بھر میں کبھی اپنے شوہر کے ساتھ خیانت نہ کرتی۔ (متفق علیہ)

لہذا ..... پستی کی بدولت اس کا جمع کرنا شروع ہو گیا ہو اور اس کے سڑنے کی نوبت آئی ہو۔ آج بھی بخیل طبائع حاجت مندوں میں کھانا تقسیم کرنے سے اس کو سزا دینا بہتر سمجھتی ہیں کاش اگر بنی اسرائیل اس رسم بد کی بنیاد نہ ڈالتے تو دنیا اس بخل کی عادی نہ ہوتی۔ اسی طرح جدی خصائل آئندہ نسل میں نمودار ہوا کرتے ہیں۔ حضرت حواء علیہا السلام کا جو معاملہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا گو اس کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو مگر اس خصلت کا ظہور بھی عورتوں میں ایک جزء لازم بن گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر عورت کی اپنی فطرت کی بلندی و پستی کے لحاظ سے اس کی نوعیت میں فرق ضرور پڑتا رہا۔ مگر شوہر کے ساتھ ناقبت اندیشی کی جو بنیاد ایک مرتبہ قائم ہو چکی تھی وہ بدل نہیں سکی۔ ابو ہریرہ کی ان ہر دو جدیثوں سے صنف رجال کی برتری اور صنف نساء کی فطری کمزوری یعنی مرد کے مقابلہ میں ان کی کمتری بھی ثابت ہوتی ہے۔ خدا کی مخلوق میں ضعف و قوت کا یہ اختلاف سماوی مخلوق سے لے کر ارضی مخلوق تک موجود ہے آسمان پر جب نظر کی جاتی ہے تو اس میں بھی شمس و قمر تمام ستاروں میں سب سے روشن اور بڑے نظر آتے ہیں پھر ستاروں میں بھی ان کی جسامت اور نورانیت میں بھی بڑا اختلاف موجود ہے۔ زمین میں بھی حیوانات میں بڑا اختلاف ہے اور اس جنس میں بھی مذکر و مؤنث میں طاقت و جسامت کے اندر کھلا اختلاف موجود ہے۔ یہی اختلاف انسانوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہاں مذکر و مؤنث یعنی مرد و عورت کی صنف میں قوت و ضعف کا بڑا اختلاف ہے۔ اس فطری اختلاف کو اگر جدید تحقیقات کی روشنی میں دیکھنا ہو تو ”المرءة المسلمة“ کا مطالعہ کیا جائے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے جس کا نام ”مسلمان عورت“ ہے۔ ان اختلافات کے علاوہ خود ایک ہی شخص کے دائیں بائیں اعضاء میں فرق ہوتا ہے مگر ان تمام اختلافات کو قدرت کے کمال کے سوا کہیں کسی کی حق تلفی نہیں سمجھا گیا نہ کبھی کسی نے ان بدیہی اختلافات کے انکار کی ہمت کی ہے مگر ہمارے دور میں صرف یورپ کے اعتراضات کی بناء پر عورت کے شرعی اور فطری نقصان کے انکار کی سعی جاری ہے حالانکہ قرآن و حدیث میں اس دعوے کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن کریم میں اگر دو جگہ عورتوں کا تذکرہ آیا ہے تو سو جگہ نہیں آیا۔ ہمارے نزدیک صنف نازک کو مرد قوی کے بالکل برابر لا کھڑا کرنے کی سعی ایسی ہی ہے جیسی کہ بائیں اعضاء کی دائیں اعضاء کے بالکل برابر بنانے کی۔ فطرت کے ان اختلافات کا انکار کرنا بد اہت کا انکار کرنا ہے۔

بعض اہل قلم کو اس مسئلہ سے اتنا شغف ہے کہ انہوں نے سورہ یوسف کی آیت اِنْ كُنَّ عَصَائِمُ کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ عالم کے واقعات پر جہاں کہیں نظر ڈالی جائے تو ہر جگہ عورت ہی معصوم نظر آتی ہے اور ہر جگہ در پردہ مرد ہی کی کار فرمائی ثابت ہوتی ہے۔ اور اتنا نہیں سوچا کہ کیا اس فقرہ کا محل سورہ یوسف ہی رہ گئی تھی۔ جس میں صرف مرد کی عصمت اور عورت کے فریب کی سرگزشت بیان کرنی مقصود ہے۔ لیکن یہ انسان کا فطری ضعف ہے کہ جب وہ کسی جانب مائل ہوتا ہے تو آنکھ میچ کر اس طرح ڈھلتا چلا جاتا ہے کہ محل و بے محل کی طرف اس کو کوئی توجہ نہیں رہتی اس لیے ہمیں اس کی وضاحت کرنی ضروری ہے کہ احادیث بالا کی روشنی میں صنف نازک بے شبہ مرد کی نسبت سے ضعیف اور ناقص بنائی گئی ہے مگر اس کے باوجود وہ مرد کے ایک اہم گوشہ حیات کے لیے باعث تکمیل بھی ہے۔ اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر مذکورہ حدیث کی روشنی میں ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف یہ دو حرف لکھ کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی اتنی بڑی تعداد میں کسی عورت کو منصب نبوت سے نوازا نہیں گیا۔ اور اس طرح دنیا کے ملوک و سلاطین کی تاریخوں میں بھی عورتوں کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ مذہب و دنیا کی تاریخوں کے اس توافق کے بعد اب واقعات کی دنیا میں تو آپ کے اس لئے .....



## سیدنا ادریس علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق مؤرخین کو اختلاف ہے کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام سے پیشتر ہوئے ہیں یا بعد میں۔ اس تاریخ بحث کی اہمیت اس لیے ہے کہ اگر وہ پہلے ہیں تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں ان کا ہونا یقینی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی کو جمہور کا قول قرار دیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت شیث علیہ السلام کے بعد یہ پہلے وہ شخص تھے جو نبوت سے سرفراز ہوئے۔ درمنثور میں حاکم کی روایت سے ان کا حلیہ مبارک یہ نقل کیا ہے: گورارنگ، دراز قامت، بھاری پیٹ، چوڑا سینہ، جسم پر بال کم، سر کے بال گھنے، ایک آنکھ زیادہ فراخ اور سینہ پر ذرا سا سفید دھبہ۔

سلف میں صرف دونوں کے متعلق آسمان پر اٹھائے جانے کی شہرت تھی ایک یہ دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان دونوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع تو تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور ادریس علیہ السلام کے رفع کے متعلق کوئی مرفوع روایت صحت کو نہیں پہنچی۔ البتہ صحابہؓ اور تابعین میں اس کا تذکرہ ضرور رہا ہے اور چونکہ حضرت ابن عباسؓ اور ابوسعید خدریؓ وغیرہما سے ان کا رفع آیت ”وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا“ کی تفسیر میں منقول ہے اس لیے اس کو بے اصل اسرائیلیات میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ حافظ ابن کثیر نے یہاں جن روایات پر منکر ہونے کا حکم لگایا ہے وہ اس جزء کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان روایات میں اور بہت سی بے تحقیق باتیں موجود ہیں جو بے اصل ہیں۔ چنانچہ ان کے قول وفی بعضہ نکارۃ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ عجلت پسندوں نے یہاں یہ سمجھ لیا ہے کہ انہوں نے پوری روایت پر منکر ہونے کا حکم لگا دیا ہے۔ اسی لیے صحابہؓ کے ان آثار کو انہوں نے ضعیف قرار نہیں دیا اور نہ ان کو منکر کہا ہے بلکہ اپنی تاریخ میں خود ان کو نقل فرمایا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا اور اس لیے نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کی طرح اس کو عقائد کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کو بے اصل کہا جاسکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اسرائیلیات کو مطلقاً بے اصل سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اسرائیلیات کا جو حصہ ”دین محمدی“ علیٰ صاحبہا الف الف صلوات و تحیات کے خلاف نہ ہو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ اس کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی مشہور تصنیف ”التوسل والوسیلہ“ میں اس پر مبہوط بحث کی ہے۔

لہذا ..... فیصلہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے لیے آپ کو کوئی دوسرا جہان تلاش کرنا ہوگا۔

ہمارے نزدیک اعتدال کی راہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت میں جداگانہ جداگانہ قسموں کی صلاحیتیں پیدا فرمائی ہیں اور ہر ہر صنف دوسری نوع کی خاص صلاحیتوں سے خالی ہے عالم انسانیت کی تکمیل کے لیے ان دونوں کا وجود ضروری ہے۔ پس انسانی عالم کو عالم نساء کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ کسی ناقص کو اپنے کمال کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ پس ایک لحاظ سے عورتوں کے کمال اور ضرورت کا انکار نہیں۔ مگر یہ بات صاف ہے کہ جو صلاحیتیں مرد میں رکھی گئی ہیں وہ ان سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہیں جو عورتوں میں پیدا کی گئی ہیں۔ نبوت اور رسالت تو بڑے مقامات ہیں۔ ت میں روزمرہ کی نماز کی امامت کی صلاحیت بھی نہیں بلکہ مقتدیوں کی صف اول میں شامل ہونے کی صلاحیت بھی نہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کا موقف تمام صفوف رجال کے پیچھے ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے عورتوں کے مردوں کے ساتھ جمیع حقوق میں مساوات کی ہمیں تو کوئی اصل معلوم نہیں ہو سکی۔ پھر معلوم نہیں مسلمان اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بے جا او ایلا کس لیے ہے۔

(۱۲۱۳) عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ السَّلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُمُورًا كُنَّا نَصْنَعُهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ كُنَّا نَأْتِي الْكُهَّانَ قَالَ فَلَا تَأْتُوا الْكُهَّانَ قَالَ كُنَّا نَتَطَيَّرُ قَالَ ذَاكَ شَيْءٌ يَجِدُهُ أَحَدُكُمْ فِي نَفْسِهِ فَلَا يَصُدِّتْكُمْ قَالَ قُلْتُ مِنَّا رَجُلٌ يَخْطُونَ خَطًّا قَالَ كَانَ نَبِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَخْطُ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ فَذَاكَ.

(رواہ مسلم)

(۱۲۱۴) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا عُرِّجَ بِي رَأَيْتُ إِدْرِيسَ فِي السَّمَاءِ الرَّابِعَةِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ فِي الصَّحِيحِينَ فِي حَدِيثِ الْمَعْرَاجِ نَحْوَهُ وَ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى وَ رَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا قَالَ رَفَعَ إِلَى السَّمَاءِ السَّادِسَةِ وَ عَنْ الْعَوْفِيِّ كَمَا فِي الْبَدَايَةِ فَمَاتَ بِهَا وَ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ فِي السَّمَاءِ الرَّابِعَةِ وَ عَنْ مُحَاهِدٍ رَفَعَ إِدْرِيسَ كَمَا رَفَعَ عِيسَى وَ لَمْ يَمُتْ. كُلُّهُ فِي الدَّرَالْمَنْشُورِ وَ فِي الْبَدَايَةِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ مَاتَ بِهَا وَ نَحْوَهُ عَنْ كَعْبٍ.

(۱۲۱۳) معاویہ بن حکم سلمی کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم زمانہ جاہلیت میں بہت سے افعال کرتے تھے ان کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ ہم کاهنوں کے پاس بھی جاتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا ان کے پاس جا کر خبریں دریافت نہ کیا کرو (یہ بے اصل بات ہے) انہوں نے عرض کی۔ ہم بد فالی کے بھی قائل تھے۔ آپؐ نے فرمایا قدیم عادت کی بناء پر تمہارے دل میں اس کا احساس تو ضرور ہوتا ہوگا مگر عملاً اس کی تردید کا طریقہ یہ ہے کہ جو کام کرنا ہے وہ کر لو اور اس احساس کی وجہ سے اس کے کرنے سے باز نہ رہو۔ پھر انہوں نے عرض کی۔ ہم رمل کا حساب بھی کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو یہ علم عطا فرمایا تھا تو تم میں جس شخص کا حساب حسب اتفاق ان کے ساتھ مطابق ہو جاتا ہے تو وہ درست بھی نکل آتا ہے۔ (مسلم)

(۱۲۱۴) انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب مجھ کو معراج نصیب ہوئی تو میں نے ادریس علیہ السلام کو چوتھے آسمان پر دیکھا تھا۔ (ترمذی شریف) وَ رَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا کی تفسیر میں ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو چوتھے آسمان پر اٹھالیا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے چوتھے کے بجائے چھٹے آسمان کا لفظ کہا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اٹھائے گئے اسی طرح حضرت ادریس علیہ السلام بھی اٹھائے گئے تھے۔ پھر ان کی وفات نہیں ہوئی لیکن حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ آسمان پر ہی ان کی وفات ہو گئی۔ کعب احبار بھی آسمان پر ان کی وفات کے قائل تھے۔

(۱۲۱۳) \* حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ نبی حضرت ادریس علیہ السلام ہی تھے۔ پھر جس طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرف بہت سے غلط افسانے منسوب کر دیئے گئے ہیں ان کی طرف بھی بہت سی غلط باتیں منسوب کر دی گئی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اس روایت میں اس خط کی پوری تفصیلات مذکور نہیں ہیں لہذا صرف اس اجمالی بیان سے رمل کے متعلق جتنی باتیں مشہور ہیں وہ سب اس حدیث کے تحت درج نہیں کی جاسکتیں۔

(۱۲۱۴) \* سلف میں کسی بشر کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے امکان و عدم امکان و عدم امکان کی بحث کبھی نہیں ہوئی وہ یہ بات کسی تردد کے بغیر جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ ان میں جب کبھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام.....



## سیدنا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام اول رسول اللہ الی الارض

حضرت نوح علیہ السلام کو انبیاء علیہم السلام کی صف میں ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے اور اسی خصوصیت کی بناء پر حدیثوں میں ان کو ”اول رسول“ کہا گیا ہے۔ حافظ ابن کثیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں جو سب دین حق پر قائم تھے۔ اس روایت کی وجہ سے انہوں نے مؤرخین کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ قابیل کی نسل میں آتش پرستی شروع ہو گئی تھی ان کی تحقیق یہ ہے کہ کفر و شرک کی بنیاد حضرت نوح علیہ السلام کے عہد ہی کے قریب میں پڑی تھی اور اس کے ابطال و تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا جو رسول بھیجا وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور اسی لئے ان کو حدیثوں میں ”اول رسول“ کہا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اصولی مباحث کے بیان و ایضاح میں انہوں نے بہت بڑی جدوجہد فرمائی تھی۔ حتیٰ کہ دجال کا فتنہ جو دنیا کے آخر میں نمودار ہونے والا تھا اس سے بھی اپنی امت کو پوری طرح خبردار کر دیا تھا۔ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی گذشتہ تحقیق کے مطابق ان کے اول رسول ہونے کا مطلب کسی توجیہ کے بغیر واضح ہو جاتا ہے۔

حافظ ابن کثیر نے ابن جبیر وغیرہ کے حوالہ سے ان کی قوم کا نام بنو راسب نقل فرمایا ہے۔ حافظ سیوطی نے درمنثور میں حضرت نوح علیہ السلام کا شجرہ نسب اس طرح تحریر فرمایا ہے۔

نوح بن لامک بن متوشلح بن ادریس و ہواخنوخ بن یرد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام کے بعد دنیا کی آبادی نے ان ہی کے زیر سایہ اطمینان و سکون کا سانس لیا تھا اس لیے ان کو نوح سکین کہتے تھے۔ اور ان کے نوح کہلانے کی وجہ یہ تھی کہ ساڑھے نو سال تک اپنی امت کو تبلیغ و ارشاد فرماتے رہے اور جب وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی تو ان پر ہمیشہ غم کے آنسو بہاتے رہے۔ (درمنثور ج ۳ ص ۹۴)

حضرت نوح علیہ السلام کی حیات کا سب سے مشہور تاریخی واقعہ طوفان کا ہے جو بعد میں ہمیشہ نظم و نثر میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس کے متعلق اہل کتاب اور مؤرخین کا اختلاف ہے۔ فارس اور اہل ہند تو سرے سے اس کا انکار کر

لے..... السلام کے رفع کا تذکرہ آیا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے نزدیک دین کے دوسرے بدیہی مسلمات کی طرح ایک مسلم بات تھی۔ نیز ان کے نزدیک اس میں بھی کوئی اشکال نہ تھا کہ کوئی انسان اگر آسمان میں وفات پا جائے تو اس کی تجہیز و تکفین اور دفن کی صورت کیا ہوگی۔ موت روح اور جسم کی صرف علیحدگی کا نام ہے۔ اتنی بات اگر آسمانوں پر ہو جائے تو اس میں عقل کے نزدیک بھی کیا دشواری ہے۔ پھر جب انبیاء علیہم السلام کے جسم اس مٹی میں دفن ہونے کے بعد بھی کون و فساد سے محفوظ رہتے ہیں تو آسمانوں پر ان کے رہنے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ انسان جب کسی بات کا انکار کرنا چاہے تو بے وجہ ہر بات کو اپنی عقل نارسا کے لیے ناقابل تحمل بوجھ بنالے۔ ہم یہاں یہ فیصلہ کرنا نہیں چاہتے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق رائج کیا ہے کیونکہ براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس کا کوئی واضح اور مستند سامان ہمارے علم میں نہیں ہے۔

رہے ہیں۔ ہم ذیل میں صرف حافظ ابن کثیر کے الفاظ نقل کرتے ہیں جو بالاتفاق مسلم محدث بھی ہیں اور معتبر مؤرخ بھی:

وقد اجمع اهل الاديان الناقلون عن رسل الرحمن مع تواتر عند الناس في سائر الازمان على وقوع الطوفان و انه عم جميع البلاد و لم يبق الله احدا من كفره العباد استجابة لدعوته نبيه الموءد المعصوم و تنفيذا لما سبق في القدر المختوم.

تمام ۳ ادیانِ سماویہ کا اور ہر دور میں تواتر کے ساتھ لوگوں کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام پوری زمین کو محیط تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کی بد دعاء کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سب کافروں کو ہلاک کر دیا تھا۔

(البداية ج ۱ ص ۱۱۸)

حافظ ابن تیمیہؒ بھی اسی کی تصحیح فرماتے ہیں کہ طوفان نوح علیہ السلام پورے کرۂ ارضی کو محیط تھا:

فنوح عليه السلام ابو الآدميين الذين حدثوا بعد الطوفان فان الله اغرق ولد آدم عليه السلام الا اهل السطينة و قال في نوح عليه السلام وجعلنا ذريته هم الباقين.

اس لیے نوح علیہ السلام ان سب انسانوں کے والد قرار پائے جو طوفان کے بعد پیدا ہوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کشتی والوں کے سوائے تمام اولاد آدم علیہ السلام کو غرق کر دیا تھا چنانچہ ارشاد ہے وجعلنا ذرية الخ یعنی ہم نے صرف ان ہی کی نسل کو باقی رہنے والا رکھا۔

(الجواب الصحيح ج ۱ ص ۱۹۴-۱۹۵)

محقق ابن خلدون کی رائے بھی اسی طرف ہے۔ دیکھو مقدمہ ص ۱۲ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کی تحقیق بھی یہی ہے۔ دیکھو اظہار الحق ج ۲ ص ۱۱۰۲ اس کے علاوہ اکثر محدثین و مفسرین کا مختار بھی یہی ہے۔ ہاں نصاریٰ ضرور اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور بعض علماء بھی بظاہر اس خیال سے کہ اس سے ان کی بعثت کا عموم ثابت ہوتا ہے دوسری طرف چلے گئے ہیں، ورنہ قرآنی عموم و اطلاقات کا ظاہر یہی ہے کہ طوفان تمام کرۂ ارضی کو محیط تھا واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس تحقیق کی بناء پر چونکہ دنیا کی نشاۃ ثانیہ ان ہی کی ذات سے ہوئی اس لیے ان کو آدم ثانی کہا جاتا ہے حافظ موصوف نے ان کی قبر کے متعلق زیادہ صحیح یہی قرار دیا ہے کہ وہ مسجد حرام میں ہے اور اکثر متاخرین کے اس خیال کو مرجوح کہا ہے کہ وہ مشہور مقام کرک نوح میں ہے۔ جہاں لوگوں نے ایک بڑی مسجد بھی تعمیر کر دی ہے شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے ایک روایت پیش کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چار نبیوں کی قبریں زم زم اور رکن یعنی حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان ہیں۔ حضرت نوحؑ، ہودؑ، شعیبؑ و صالحؑ علیہم السلام۔ (درمنثور ج ۱ ص ۸۶)

شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک مرفوع روایت بھی پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب کسی نبی کی امت ہلاک ہو جاتی تھی تو وہ مکہ مکرمہ آ کر اپنا وقت عبادت میں پورا کیا کرتا تھا اور نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ اور شعیبؑ علیہم السلام کی قبریں زم زم اور حجر اسود کے درمیان ہیں ج ۱ ص ۱۳۶ اور ایک ضعیف روایت میں ستر قبروں کا لفظ بھی ہے۔ مگر یہ مرفوع نہیں ہے۔



(۱۲۱۵) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجِيئُ نُوحٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَأُمَّتُهُ فَيَقُولُ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ هَلْ بَلَغْتَ فَيَقُولُ نَعَمْ أَيْ رَبِّ فَيَقُولُ لَا أُمَّتِهِ هَلْ بَلَغَكُمْ فَيَقُولُونَ لَا مَا جَاءَنَا مِنْ نَبِيِّ فَيَقُولُ لِنُوحٍ مَنْ يَشْهَدُ لَكَ فَيَقُولُ أُمَّتُهُ فَتَشْهَدُ أَنَّهُ قَدْ بَلَغَ وَهُوَ قَوْلُهُ تَعَالَى وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا.

(رواه البخاری)

(۱۲۱۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِلَّا أَحَدٌ تُكُفُّمُ عَنِ الدَّجَالِ حَدِيثًا مَا حَدَّثَ بِهِ نَبِيٌّ قَوْمَهُ إِنَّهُ أَعْوَرُ وَ إِنَّهُ يَجِيئُ مَعَهُ بِمِثَالِ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَ التِّي يَقُولُ عَلَيْهَا الْجَنَّةُ هِيَ النَّارُ وَ إِنِّي أَنْذَرُكُمْ كَمَا أَنْذَرَهُ نُوحٌ قَوْمَهُ.

(رواه البخاری)

(۱۲۱۵) ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت میں جب حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی امت آئے گی تو اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام سے سوال فرمائے گا۔ تم نے پیغام رسالت پہنچا دیا تھا؟ وہ عرض کریں گے میرے پروردگار! جی ہاں۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے سوال کرے گا۔ اچھا تم بتاؤ تم کو پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے نہیں ہمارے پاس تو کوئی نبی نہیں آیا اس پر نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا آپ کے پاس کوئی گواہ ہے جو آپ کی گواہی دے وہ کہیں گے میرے گواہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کی امت ہے۔ یہ امت گواہی دے گی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے پیغام رسالت پہنچا دیا تھا۔ قرآن کریم کی حسب ذیل آیت کا مطلب یہی ہے۔ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا الخ۔

(۱۲۱۶) ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا دجال کے متعلق میں تم کو ایسی صاف بات نہ بتا دوں جو کسی نبی نے اپنی قوم کو نہ بتائی ہو۔ دیکھو وہ کانا ہوگا اور اس کے ساتھ دو چیزیں ہوں گی جو دیکھنے میں جنت اور دوزخ کے مشابہ ہوں گی۔ مگر جس کو وہ جنت کہے گا وہ دراصل دوزخ ہوگی (لہذا جس کو وہ جنت میں داخل کرے گا وہ دوزخ میں جائے گا) دیکھو میں تم کہ دجال کے فتنے سے اسی اہمیت کے ساتھ ڈراتا ہوں جیسا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی امت کو ڈرایا تھا۔ (بخاری)

(۱۲۱۶) \* حدیث مذکور میں آپ نے دجال کے فتنے کا بڑی خصوصیت کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے اور اس کی اہمیت کا اظہار اس طرح فرمایا ہے کہ اس عظیم فتنے کی ہولناکی کی اطلاع ہر نبی نے دی ہے۔ پھر ان انبیاء میں آپ نے حضرت نوح علیہ السلام کا نام خاص طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ خدا کی زمین پر یہی سب سے پہلے رسول تھے بے شبہ ہر شفیق و حریص نبی کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ مستقبل کے فتنوں سے اپنی امتوں کو ڈرایا کرتا ہے خواہ ان کے ظہور کا وقت کچھ بھی ہو آخر قیامت کے تذکرہ سے بھی ہر نبی و رسول نے اپنی اپنی امتوں کو ڈرایا ہے اس کا منشاء ان اہم واقعات کے ظہور سے پہلے استعدادِ عمل ہے۔ لیکن یہ عظیم فتنہ چونکہ آپ ہی کی امت میں ظاہر ہونے والا تھا اس لیے یہ حق آپ ہی کا تھا کہ آپ اس کے متعلق ایسی ایسی واضح علامات بیان فرمادیں جس کے بعد اس کے پہچاننے میں ذرا سا بھی کوئی شبہ نہ رہے۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ اس کے متعلق میں تم سے وہ بات کہتا ہوں جو حضرت نوح علیہ السلام نے بھی نہ فرمائی تھی۔ اس واقعہ کی سیر حاصل تفصیلات آئندہ اوراق میں آپ کے ملاحظہ سے گزرے گی ان شاء اللہ۔

(۱۲۱۷) عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ نوح علیہ السلام بقرعید و بقرعید کے صوم دہر رکھا کرتے تھے (یعنی ان ایام کے سواء ہمیشہ روزہ رکھتے تھے) اور داؤد علیہ السلام نصف دہر روزہ رکھتے تھے۔ یعنی ایک دن روزہ رکھتے ایک دن افطار کرتے تھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر ماہ میں تین دن روزہ رکھتے تھے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں صوم دہر کے برابر شمار تھا اگرچہ تین دن کے علاوہ ہمیشہ افطار کرتے تھے۔

(طبرانی - ابن ماجہ)

(۱۲۱۸) سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نوح علیہ السلام کی اولاد میں عرب سام کی اور حبش حام کی اور روم یافث کی نسل سے ہیں۔

(ترمذی شریف)

(۱۲۱۷) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ صَامَ نُوحٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ الدَّهْرَ إِلَّا يَوْمَ الْفِطْرِ وَالْأَضْحَى وَصَامَ دَاوُدُ عَلَيْهِ السَّلَامُ نِصْفَ الدَّهْرِ وَصَامَ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ صَامَ الدَّهْرَ وَأَفْطَرَ الدَّهْرَ. (رواه الطبرانی و ابن ماجه نحوه و فی اسناد یھما ابن لھیعۃ کذا فی البدایۃ)

(۱۲۱۸) عَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَامَ أَبُو الْعَرَبِ وَ حَامُ أَبُو الْحَبَشِ وَ يَافِثُ أَبُو الرُّومِ.

(رواه امام احمد و الترمذی نحوه)

(۱۲۱۷) \* آخرت میں ایک نیکی دس کے برابر شمار ہوگی اس لیے تین روزے تیس کے برابر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخشی وہ اس ملت حنیف کے سب سے اولوالعزم رسول کی امت کو بھی بخش دی اس لیے صوم دہر کی فضیلت حاصل کرنے کی ایک صورت حدیث میں ہر ماہ میں تین روزے رکھنا بھی آئی ہے۔

(۱۲۱۸) \* حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں روم سے مراد روم اول ہے جس کو یونان کہتے ہیں ان کا نسب نامہ یہ ہے:

رومی بن بطی بن یونان بن یافث بن نوح علیہ السلام۔ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مرفوع روایت پیش کی ہے کہ عرب فارس اور روم یہ سام کی اولاد میں ہیں اور ان میں خیر رہے گی۔ اور یاجوج و ماجوج ترک اور سقالبہ یافث کی اولاد ہیں اور ان میں خیر کا نام نہ ہوگا اور قبط و بربر اور سودان یہ حام کی اولاد ہیں۔ مگر حافظ موصوف نے اس روایت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول تسلیم نہیں کیا اور فرمایا ہے کہ سعید بن المسیب کا قول ہے۔ حام و سام و یافث کے متعلق بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ تینوں طوفان کے بعد کی پیدائش ہیں مگر حافظ موصوف نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور طوفان سے قبل کی پیدائش قرار دیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ تورات کی تصریح کے مطابق ان تینوں کشتی میں موجود ہونا ثابت ہے۔ حافظ موصوف فرماتے ہیں کہ موجودہ بسیط ارض کی تمام آبادی صرف ان تین ہی کی نسل سے ہے۔ (ج ۱ ص ۱۱۵ البدایۃ) جو لوگ یہاں اختلاف رکھتے ہیں وہ طوفان نوح علیہ السلام کے عام ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن حافظ ابن کثیر اس نظریہ سے متفق نہیں ہے۔



## سیدنا ہود علیہ الصلوٰۃ والسلام

حسب بیان حافظ ابن کثیر ان کا نسب نامہ یہ ہے ہود بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح علیہ السلام۔ ان کے نسب میں اس کے علاوہ بھی اور چند اقوال ہیں۔ حضرت ابو ذر کی روایات کی بناء پر چار عربی انبیاء علیہم السلام سے یہ پہلے عربی نبی تھے۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے عربی بولنے والے نبی یہی تھے۔ مگر حافظ ابن کثیر کا میلان اس طرح ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ ان کا قبیلہ عاد بن عوص بن سام بن نوح علیہ السلام تھا۔ تاریخ میں ان کو عادِ اوّل کہا جاتا ہے۔ عادِ ثانیہ ان کے بعد ہوئے ہیں۔ اور آیت اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادِ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ میں انہی کا تذکرہ ہے۔ طوفانِ نوح کے بعد سب سے پہلے انہوں نے ہی بت پرستی شروع کی تھی۔ ان کے بتوں کے نام صدا و صمود ہوا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لئے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور جب انہوں نے سرکشی کی راہ نہ چھوڑی تو عذابِ الہی سے نیست و نابود کر دیئے گئے۔

حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ ان کی قبر بلادِ یمن میں ہے کوئی کہتا ہے کہ دمشق میں ہے اور دمشق کی جامع مسجد کی قبلہ کی دیوار کی طرف ایک قبر ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہی ہود علیہ السلام کی قبر ہے۔ (البدایہ ج ۱ ص ۱۳۰)

(۱۲۱۹) عَنْ أَبِي وَائِلٍ عَنِ الْحَارِثِ وَهُوَ ابْنُ حَسَّانٍ وَیَقَالُ ابْنُ یَزِیدِ الْبَکْرِی قَالَ خَرَجْتُ اَشْکُو الْعَلَاءَ بْنَ الْحَضَرَمِیِّ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ فَمَرَرْتُ بِالرَّبَذَةِ فَاِذَا عَجُوزٌ مِنْ بَنِی تَمِیْمٍ مُنْقَطِعٌ بِهَا فَقَالَتْ يَا عَبْدَ اللّٰهِ اِنَّ لِیْ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ حَاجَةً فَهَلْ اَنْتَ مُبْلِغٌ اِلَیْهِ قَالَ فَحَمَلْتُهَا فَاتَتْ الْمَدِیْنَةَ فَاِذَا الْمَسْجِدُ غَاصُّ بِاَهْلِهِ وَاِذَا رَاٰیَاتُ سُودٍ تَخْفِقُ وَاِذَا بِلَالٌ مُتَقَلِّدُ السَّیْفِ بَيْنَ یَدَی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ فَقُلْتُ

(۱۲۱۹) حارث روایت کرتے ہیں کہ میں علاء بن حضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرا گزر جب مقام ربذہ سے ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں بنی تمیم قبیلہ کی ایک بوڑھی عورت ہے جو سواری نہ ہونے کی وجہ سے سفر سے رہ گئی ہے۔ اس نے کہا اے اللہ کے بندے! مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ کام ہے۔ کیا تم اتنا کرو گے کہ مجھ کو ان تک پہنچا دو۔ یہ کہتے ہیں میں نے اس کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ جب مدینہ میں داخل ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد شریف لوگوں سے بھری ہوئی ہے اور سیاہ جھنڈے ہوا میں لہرا رہے ہیں اور ادھر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلوار لگائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کو کسی مہم پر روانہ کرنا ہے۔ یہ کہتے ہیں میں بیٹھ

(۱۲۱۹) \* ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ اس روایت کو بہت سے مفسرین نے عادِ اوّل کی ہلاکت کے سلسلہ میں بیان کیا ہے حالانکہ یہ واقعہ بظاہر عادِ ثانیہ کا ہے۔ کیونکہ اول تو اس واقعہ میں مکہ مکرمہ کا ذکر ہے اور عادِ اوّل کے زمانہ میں اس کی بناء ہی نہیں ہوئی تھی اس کو بعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا ہے اور عادِ اوّل ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ نیز اس میں معاویہ بن بکر اور اس کے اشعار لکھے.....

مَا شَأْنُ النَّاسِ قَالُوا يُرِيدُ أَنْ يَبْعَثَ عَمْرُ وَبْنُ  
الْعَاصِ وَجْهًا قَالَ فَجَلَسْتُ قَالَ فَدَخَلَ  
مَنْزِلَهُ أَوْ قَالَ رَحْلَهُ فَاسْتَأْذَنْتُ عَلَيْهِ فَادْنِ لِي  
فَدَخَلْتُ فَسَلَّمْتُ فَقَالَ فَهَلْ كَانَ بَيْنَكُمْ وَ  
بَيْنَ بَنِي تَمِيمٍ شَيْءٌ فَقُلْتُ نَعَمْ وَكَانَتْ لَنَا  
الدَّبْرَةُ عَلَيْهِمْ وَمَرَرْتُ بِعَجُوزٍ مِنْ بَنِي  
تَمِيمٍ مُنْقَطِعٍ بِهَا فَسَأَلْتُنِي أَنْ أَحْمِلَهَا إِلَيْكَ  
وَهَاهُنَا بِالْبَابِ فَادْنِ لَهَا فَدَخَلْتُ فَقُلْتُ يَا  
رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنْ رَأَيْتَ  
أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ بَنِي تَمِيمٍ حَاجِزًا فَا  
جْعَلِ الدَّهْنُ فَإِنَّهَا كَانَتْ لَنَا قَالَ فَحَمَيْتِ  
الْعَجُوزَ وَاسْتَوْفَزْتُ وَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِلَى ابْنِ تَضَطَّرُّ  
مُضْرُكُ فَقُلْتُ إِنْ مَثَلِي مَا قَالَ الْأَوَّلُ  
(مِعْزَى حَمَلْتُ حَتْفَهَا) حَمَلْتُ هَذِهِ الْأَمَةَ وَ  
لَا أَشْعُرُ أَنَّهَا كَانَتْ لِي خَصْمًا أَعُوذُ بِاللَّهِ وَ  
رَسُولِهِ أَنْ أَكُونَ كَوَافِدِ عَادٍ قَالَ هِيَ وَمَا وَ  
فِدِ عَادٍ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْحَدِيثِ مِنْهُ وَلَكِنْ  
يَسْتَطِيعُهُ قُلْتُ إِنْ عَادًا قُحِطُوا فَبَعَثُوا وَفَدَا  
لَهُمْ يُقَالُ لَهُمْ قِيلَ فَمَرَّ بِمُعَاوِيَةَ بْنِ بَكْرٍ  
فَأَقَامَ عِنْدَهُ شَهْرًا يَسْقِيهِ الْخَمْرَ وَيُغْنِيهِ

گیا اتنی دیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تشریف لے گئے۔  
میں نے حاضری کے لیے اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
اجازت دے دی میں اندر حاضر ہوا اور سلام بجالایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے فرمایا کہو تمہارے اور بنی تمیم کے درمیان کوئی قصہ پیش آ گیا ہے۔ میں  
نے عرض کی جی ہاں۔ ہمارا ایک نشیبی زمین کے بارے میں ان پر دعویٰ ہے۔  
نیز راستہ میں مجھے ایک بوڑھی عورت ملی جس کے پاس سواری نہ تھی۔ اس  
نے مجھ سے کہا کہ میں اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ تک پہنچا دوں۔ تو  
وہ دروازہ پر حاضر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی اجازت دے  
دی اور وہ بھی اندر آ گئی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
مہربانی فرما کر ہمارے اور بنی تمیم کے درمیان ایک حد فاصل مقرر فرمادیں  
اور اگر مناسب خیال فرمائیں تو مقام ”دہنا“ مقرر فرمادیں کیونکہ یہ مقام  
ہمارا ہی تھا۔ یہ سن کر عورت گرم ہو گئی اور جلدی سے بولی یا رسول اللہ تو پھر یہ  
آپ کا قبیلہ مضر کدھر جائے گا۔ اس کی گفتگو سن کر میں نے کہا میری مثال تو  
وہی ہو گئی جو پہلوں نے کہا تھا کہ ”بکری اپنی موت خود اپنے ساتھ لائی“  
میں اس عورت کو خود ساتھ لے کر آیا تھا مجھ کو یہ کیا خبر تھی کہ یہی میرے  
مخالف بولے گی۔ میں اللہ اور اس کے رسول کی پناہ لیتا ہوں کہ میرا حشر وہ نہ  
ہو جو ”وافد عاد“ کا ہوا تھا۔ یہ جملہ سن کر آپ نے فرمایا۔ خوب! جانتے بھی  
ہو و افد عاد کا قصہ کیا تھا۔ گو اس قصہ کو آپ ان سے زیادہ خود جانتے تھے مگر  
آپ نے چاہا کہ ان سے بھی سنیں۔ یہ کہتے ہیں میں نے عرض کی کہ ایک بار  
قوم عاد قحط میں مبتلا ہوئی تو انہوں نے اپنے دستور کے مطابق ”قیل“ کو اپنی  
جانب سے وفد کا سردار مقرر کر کے مکہ مکرمہ دعاء کے لیے بھیجا۔ اس شخص کا

اللہ..... کا ذکر بھی موجود ہے یہ اشعار عاد اولیٰ کے ذوق سے ملتے جلتے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ ذوق بعد کے لوگوں کا ہے۔ تیسرے یہ کہ  
اس قصہ کے الفاظ میں یہ بھی منقول ہے کہ اس بادل میں آگ اور چنگاریاں نظر آئی تھیں حالانکہ عاد اولیٰ ہوا کے عذاب سے ہلاک کیے گئے  
تھے اور ابن مسعود اور عباس اور بہت سے تابعین سے منقول ہے کہ یہ ہوا نہایت سرد تھی۔ ان وجوہات کی بناء پر عاد اولیٰ کی تفسیر میں اس  
روایت کا تذکرہ چسپاں نہیں ہے۔ البدایہ ج ۱ ص ۱۲۸ اس سلسلہ کی حدیث ترجمان السنہ ج ۲ ص ۳۰ میں گزر چکی ہے۔



جَارِيَتَانِ يُقَالُ لَهُمَا الْجَرَادُ تَانِ فَلَمَّا مَضَى  
الشَّهْرُ خَرَجَ إِلَى جِبَالِ تِهَامَةَ فَقَالَ اللَّهُمَّ  
إِنَّكَ تَعْلَمُ إِنِّي لَمْ أَجِئْ إِلَى مَرِيضٍ فَأَدَاوِيهِ.  
وَلَا إِلَى أَسِيرٍ فَأُقَادِيهِ. اللَّهُمَّ اسْقِ عَادًا مَا  
كُنْتُ تَسْقِيهِ فَمَرَّتْ بِهِ سَحَابَاتٌ سَوْدٌ  
فَنُودِيَ مِنْهَا اخْتَرْ فَأَوْمَأَ إِلَى سَحَابَةٍ مِنْهَا  
سَوْدَاءٌ فَنُودِيَ خُذْهَا رِمَادًا رِمْدًا لَا تَبْقَى  
مِنْ عَادٍ أَحَدًا قَالَ فَمَا بَلَغَنِي أَنَّهُ بُعِثَ عَلَيْهِمْ  
مِنَ الرِّيحِ إِلَّا كَقَدْرٍ مَا يَجْرِي فِي خَاتَمِي  
هَذَا مِنَ الرِّيحِ حَتَّى هَلَكُوا قَالَ أَبُو وَائِلٍ وَ  
صَدَقَ وَكَانَتِ الْمَرْأَةُ وَالرَّجُلُ إِذَا بَعَثُوا  
وَقَدْأَ لَهُمْ قَالُوا لَا تَكُنْ كَوَافِدِ عَادٍ.

(ہکذا رواہ الترمذی عن عبد بن زید بن  
الحباب بہ و رواہ النسائی من حدیث سلام  
ابی المنذر عن عاصم بن بہدلة و من طریقہ  
رواہ ابن ماجہ و ہکذا اور دہذا الحدیث و  
ہذہ القصۃ عند تفسیر ہذہ القصۃ غیر واحد  
من المفسرین کابن جریر و غیرہ و قد یکون  
ہذا السیاق لاہلاک عاد الاخرۃ)

گذرا اپنے دوست معاویہ بن بکر کے پاس ہوا یہ اس کے پاس ایک ماہ ٹھہرا رہا،  
وہ اس کو شراب پلاتا اور اس کے یہاں دو گانے والی لونڈیاں تھیں جن کو ”جراد  
تان“ کہا جاتا تھا ان کا گانا سنو اتا (جب اس کے قیام کی مدت دراز ہوئی گئی تو  
اس کو اپنی قوم کے حال زار پر ترس آیا مگر زبان سے بھلا کیا کہہ سکتا تھا اس لیے  
ان گانے والیوں سے کہا کہ آنے گانے میں اپنی قوم کے قحط کا نقشہ گائیں یہ سن  
کر) ایک ماہ بعد اس کو اپنی قوم کا خیال آیا اور وہ تہامہ کی پہاڑوں کی طرف دعا  
کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ اور یہ دعاء کی۔ الہی تو جانتا ہے کہ میں نہ تو کسی بیمار  
کی دوا دارو کے لیے آیا ہوں اور نہ فدیہ دے کر کسی قیدی کو چھڑانے کے لیے  
آیا ہوں میں تو اپنی قوم عاد کے لیے بارش مانگنے آیا ہوں تو جو کچھ تجھ کو ان کو پلانا  
ہے وہ پلا دے۔ اس دعاء کے بعد ہی اس کے سامنے سے سیاہ سیاہ بادل  
گذرے اور آواز آئی کہ ان میں سے جس کو دل چاہے پسند کر لے اس نے  
کالے کالے ایک بادل کی طرف اشارہ کیا (اور یہ سمجھا کہ اس میں بہت پانی ہو  
گا) آواز آئی لے جا جلی پھونکی راکھ جو قوم میں سب کا خاتمہ کر دے۔ یہ کہتے  
ہیں کہ جو بات مجھ کو پہنچی یہ ہے کہ ان پر ہوا کا عذاب آیا جس سے وہ سب ہلاک  
و برباد ہو کر رہ گئے حالانکہ وہ عذاب کی ہوا ان پر صرف اتنی سی چھوڑی گئی تھی اور  
اشارہ کر کے بتایا کہ جتنی میری اس انگٹھی کے حلقہ سے نکل سکے۔ ابو وائل کہتے  
ہیں انہوں نے یہ درست کہا۔ اس کے بعد یہ مثل بن گئی کہ جب کوئی مرد یا  
عورت کسی کو اپنا وفد بنا کر بھیجتے تو یہ کہہ دیتے دیکھنا کہیں وفد عاد کی طرح نہ ہو  
جانا جو گیا تو تھا بارش کے لیے اور لایا عذاب۔ (ترمذی شریف وابن ماجہ)

## سیدنا صالح علیہ الصلوٰۃ والسلام

ان کا نسب نامہ یہ ہے صالح بن عبد بن ماتح بن عبید بن حاجر بن شمود بن عابر بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام اس نسب  
نامہ کے لحاظ سے حضرت صالح علیہ السلام قوم شمود میں سے تھے ان کی قوم کو شمود اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان کے جد اعلیٰ شمود تھے ان کا  
مقام سکونت ”حجر“ تھا جو حجاز اور تبوک کے درمیان واقع ہے۔ قوم شمود کی عمریں بہت طویل ہوتی تھیں۔ جب یہ رہائش کے لئے کوئی  
مکان بناتے تو وہ ایک شخص کی عمر کو بھی کافی نہ ہوتا اور اسی کی حیات میں ڈھیر ہو کر گر جاتا۔ اس لئے پہاڑوں کو کھود کر انہوں نے  
مکانات بنانے شروع کر دیئے تھے۔

ایک دن حضرت صالح علیہ السلام ان کو وعظ و نصیحت فرما رہے تھے تو ان کی قوم نے یہ فرمائش کی کہ اگر آپ اس پتھر سے ان ان صفات کی ایک ناقہ نکال دیں تو ہم آپ کو مان لیں گے۔ ان کی دعا سے پتھر پھٹا اور اس میں سے ان ہی کی مطلوبہ صفات کی ایک ناقہ برآمد ہو گئی۔ اس پر ایک جماعت تو ایمان لے آئی مگر اکثر افراد بدستور اپنے کفر پر قائم رہے۔ ایمان قبول کرنے والی جماعت کے سردار کا نام جندع بن عمر بن لبید تھا۔ چونکہ یہ فیصلہ پہلے ہو چکا تھا کہ جس دن یہ ناقہ پانی پئے گی اس دن قوم کا کوئی فرد کنوئے سے پانی نہیں لے سکے گا۔ اس لیے اس دستور کے مطابق ایک مدت تک یہی عمل چلتا رہا آخر اس میں ان کو تنگی محسوس ہونے لگی اور ان کے رئیس قدار بن سالف نے اپنی قوم کے مشورہ سے ناقہ کو زخمی کر کے مار دیا۔ اور اسی کی پاداش میں عذاب الہی سے ہلاک کر دی گئی۔ دیکھو البدایۃ والنہایۃ۔

اب رہا یہ سوال کہ ناقہ پتھر سے کیسے پیدا ہوئی تو ہر چند کہ یہاں کوئی قرآنی بیان نہیں ہے تاہم کتب محدثین سے جو صورت یہاں منقول ہے اس کی تکذیب کی بھی کوئی وجہ ہمارے سامنے نہیں ہے بالخصوص جب کہ قرآن کریم نے اس کو معجزہ کہا ہے اور معجزات کا اپنی حقیقت کے لحاظ سے اس قسم کے عجائبات پر مشتمل ہونا کوئی جدید بات نہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ جن تفصیلات کی تصدیق کے لیے اجمالی سامان موجود ہو اور ان کی تکذیب کے لیے کوئی دلیل نہ ہو تو اس کو صرف اپنی عقل کی بناء پر ہر جگہ ساقط الاعتبار قرار نہیں دینا چاہیے۔ موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ایک ضرب سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلنا اور پتھر پھٹ کر ناقہ کا نکل آنا دونوں باتیں خلاف عادت ہیں اور قدرت کے سامنے دونوں یکساں ممکن ہیں اس لیے ان کے انکار و تردید کی یہاں کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۱۲۲۰) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ زُمَعَةَ قَالَ خَطَبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ النَّاقَةَ وَذَكَرَ الَّذِي عَقَرَهَا فَقَالَ (إِذَا أَنْبَعَتْ أَشَقَّاهَا) أَنْبَعَتْ لَهَا رَجُلٌ مِنْ غَارِمٍ عَزِيزٍ مَنِيعٍ فِي رَهْطِهِ مِثْلُ أَبِي زُمَعَةَ. (رواه الامام احمد اخرجاه من

(۱۲۲۰) عبد اللہ بن زمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ذکر فرمایا اور جس نے اس کو زخمی کر کے ہلاک کیا تھا اس کا بھی ذکر فرمایا جس کا تذکرہ قرآن شریف کی اس آیت میں کیا گیا ہے "إِذَا أَنْبَعَتْ أَشَقَّاهَا" فرمایا یہ شخص اپنی قوم میں بڑا معزز اور سردار تھا۔ جیسا مکہ مکرمہ میں یہ ابو زمعہ ہے۔

(مسند احمد)

(۱۲۲۱) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ لَمَّا مَرَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحَجْرِ قَالَ لَا تَسْأَلُوا الْآيَاتِ فَقَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ صَالِحٌ فَكَانَتْ يَعْنِي هَذِهِ لِلنَّاقَةِ تَرُدُّ مِنْ هَذَا الْفَجِّ وَ

(۱۲۲۱) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام حجر سے گزرے تو فرمایا معجزات کی فرمائش نہ کرنا۔ صالح علیہ السلام کی قوم نے معجزہ کی فرمائش کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی فرمائش کے مطابق ان کو اونٹنی دے دی گئی جو ایک راستہ سے گھاٹ پر پانی پینے آتی اور پانی پی

(۱۲۲۱) \* اس صورت سے ارض حرم کا احترام بھی اپنی جگہ باقی رہا اور عذاب مقدر سے پھر جان چھوٹ نہ سکی۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ پاداش عمل کسی باعث سے گویا خیر ہو جائے مگر آخر کار بھگتنی ہی پڑتی ہے اس لیے تھوڑی تاخیر سے مغرور نہ ہونا چاہیے۔ اللہ.....



تَصُدُّرُ مِنْ هَذَا الْفَجِّ (فَعْتُوا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَعَقَرُواهَا) وَكَانَتْ تَشْرَبُ مَاءَ هُمْ يَوْمًا وَ يَشْرَبُونَ لَبَنَهَا لَوْمًا فَعَقَرُواهَا فَآخَذَتْهُمْ صِيحَةٌ أَهْمَدًا لِلَّهِ مَنْ تَحْتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ مِنْهُمْ إِلَّا رَجُلًا وَاحِدًا كَانَ فِي حَرَمِ اللَّهِ فَقَالُوا مَنْ هُوَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ هُوَ أَبُو رَغَالٍ فَلَمَّا خَرَجَ مِنَ الْحَرَمِ أَصَابَهُ مَا أَصَابَ قَوْمَهُ. (قال ابن كثير هذا الحديث على شرط مسلم وليس هو في شيء من الكتب الستة البداية ج ۱ ص ۱۳۷)

کر دوسرے راستہ سے لوٹ جاتی تھی۔ مگر انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم کا مقابلہ کیا اور اس کو زخمی کر ڈالا۔ طریقہ یہ تھا کہ ایک دن اونٹنی ان کے حصہ کا پانی پیا کرتی (اس دن پانی میں ان کا کوئی حق نہ تھا) اور ایک دن وہ اس کا دودھ پیتے۔ آخر ایک چنگھاڑ کے عذاب نے ان کو پکڑ لیا اور آسمان کے نیچے ان کا جو فرد بھی تھا اللہ تعالیٰ نے سب کو فنا کر دیا۔ صرف ایک شخص بچا رہا جو اس وقت حرم کی زمین میں موجود تھا۔ لوگوں نے عرض کی۔ یا رسول اللہ وہ کون شخص تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ ابو رغال تھا پھر جب وہ حرم کی زمین سے نکلا تو جو عذاب اس کی قوم پر آیا تھا وہی اس پر ٹوٹ پڑا۔ (مسند احمد)

للہ..... نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر قدرت کے متعارض قوانین میں تطبیق کی صورت خود قدرت ہی کے علم میں ہوتی ہے۔ یہاں عقلی گھوڑے دوڑانے غلط ہیں۔ اب دیکھئے ”مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا“ کا اقتضایہ تھا کہ ابو رغال امن میں رہتا اور قومی عذاب کا تقاضا یہ تھا کہ وہ عذاب اس پر بھی آتا۔ مگر علم الہی میں ان دونوں میں توافق کی صورت کیا تھی یہ پہلے سے کس کو معلوم تھا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ رزق کی طرح رحمت و عذاب کا بھی ایک حصہ رسد ہوتا ہے جو مل کر رہتا ہے پھر اس کے ملنے کے لیے قدرت کیا پیرایہ اختیار کرتی ہے یہ ہمارے علم سے باہر بات ہے۔ لہذا نہ تو بد اعمالی پر مواخذہ نہ ہونے سے بے خوف ہونا چاہیے اور نہ نیک چلنی پر انعامات نہ ہونے سے مایوس ہونا چاہیے۔ ہر عمل کے بدلے کے لیے ایک وقت ہے۔ بس اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ اسی لیے قرآن میں فرمایا ہے: فَانْتَظِرْ أَنَّهُمْ مُنْتَظَرُونَ. (الشعراء: ۲۲۷)

وَسَيَعْلَمُ الَّذِي ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ اور ظالم عن قریب جان لیں گے کہ کس کروٹ الٹتے ہیں۔

لِكُلِّ نَبَأٍ مُسْتَقَرٌّ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ. (الاعراف: ۶۷) ہر ایک خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عن قریب معلوم ہو جائے گا۔

حدیث مذکور کی روشنی میں اب اس پر غور کر لینا چاہیے کہ جس طرح معذب مقامات میں آثار عذاب مسلسل رہتی ہیں اسی طرح متبرک مقامات میں آثار برکت و رحمت بھی مسلسل رہنے چاہئیں اور جس طرح کہ معذب مقامات میں عذاب الہی کی گرفت کا خطرہ ہوتا ہے اسی طرح مقامات برکت و رحمت میں قیام سے رحمت کا امیدوار بھی رہنا چاہیے اور جس طرح کہ معذب مقامات کی آب و ہوا اور غذاء مسموم ہوتی ہے اسی طرح رحمت کے مقامات کی آب و غذاء بھی متبرک ہونی چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں سے اور آپ کے جھوٹے پانی سے امت ہمیشہ برکت حاصل کرتی رہی ہے یہ بات علیحدہ ہے کہ عوام کے عقیدہ کے فساد کے خطرہ سے کوئی عمل مصلحت اس کو ترک فرما دیا پس مسئلہ اور مصلحت دونوں کی رعایت لازم ہے اور یہی وہ دقیق مقام ہے جہاں اکثر لغزش ہو جاتی ہے۔ یعنی ان دونوں کے درمیان پورا توازن قائم نہیں رہتا اور کبھی مصلحت کی رعایت اتنی ہو جاتی ہے کہ مسئلہ کے خلاف ہو جاتا ہے اور کبھی مسئلہ کی جانب اتنی نظر ہوتی ہے کہ مصلحت بالکل نظر انداز ہو جاتی ہے۔ صحیح راہ اعتدال کی ہے۔

(۱۲۲۲) عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ لَمَّا نَزَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ عَلَى تَبُوكَ نَزَلَ بِهِمُ الْحِجْرُ عِنْدَ بَيْوتِ ثُمُودَ فَاسْتَقَى النَّاسُ مِنَ الْآبَارِ الَّتِي كَانَتْ تَشْرَبُ مِنْهَا ثُمُودٌ فَعَجَنُوا مِنْهَا وَنَصَبُوا الْقُدُورَ فَأَمَرَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَهْرَاقُوا الْقُدُورَ وَغَلَفُوا الْعَجِينَ لِلَّيْلِ ثُمَّ ارْتَحَلَ بِهِمْ حَتَّى نَزَلَ بِهِمْ عَلَى الْبُئْرِ الَّتِي كَانَتْ تَشْرَبُ مِنْهَا النَّاقَةُ وَنَهَاهُمْ أَنْ يَدْخُلُوا عَلَى الْقَوْمِ الَّذِي عَذَّبُوا إِنِّي أَخْشَى أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلَ مَا أَصَابَهُمْ فَلَا تَدْخُلُوا عَلَيْهِمْ.

(رواہ الامام احمد)

(۱۲۲۳) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ بِالْحِجْرِ لَا تَدْخُلُوا عَلَى هَؤُلَاءِ الْمُعَذِّبِينَ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا بَاكِينَ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا بَاكِينَ فَلَا تَدْخُلُوا عَلَيْهِمْ أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلَ مَا أَصَابَهُمْ. (رواہ الامام احمد)

(۱۲۲۲) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کو جاتے ہوئے جب وادی حجر سے گزرے جہاں ثمود کی (ویران شدہ) بستیاں تھیں تو لوگوں نے جن کنوؤں سے کہ قوم ثمود پانی پیا کرتی تھی ان ہی سے پانی پینا شروع کیا، اسی کے پانی سے آئے گوندھ لیے اور ہانڈیاں چڑھا دیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا سب ہانڈیاں الٹ دی جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر فوراً ہانڈیاں گرا دی گئیں اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد آگے چلے اور جب اس کنوئیں سے گزرے جس سے کہ خاص صالح علیہ السلام کی ناقہ پانی پیا کرتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کو عذاب شدہ قوموں کی بستیوں کے اندر داخل ہونے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا مجھ کو اندیشہ ہے کہ جو عذاب ان پر ہے کہیں اس کی لپیٹ میں تم بھی نہ آ جاؤ، لہذا ایسی بستیوں میں داخل

ہی نہ ہو۔

(۱۲۲۳) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ وادی حجر سے گزرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو ان عذاب شدہ بستیوں میں داخل نہ ہونا۔ مگر گریہ و زاری کرتے ہوئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر ان میں داخل نہ ہونا۔ کہیں تم بھی اسی عذاب کے لپیٹ میں نہ آ جاؤ جو ان کو ہو رہا ہے۔

(احمد - شیخین)

(۱۲۲۳) \* یہ عالم غیب کی ایک بڑی حقیقت کی طرف اشارہ تھا۔ عام آنکھیں صرف ان بستیوں کو دیکھتی تھیں اور خیال یہی ہوتا تھا کہ ان بستیوں پر کبھی عذاب آیا تھا اور اب ختم ہو گیا مگر صاحب نبوت نے تنبیہ فرمائی کہ معذب مقامات ہمیشہ معذب ہی رہتے ہیں اور جس طرح وبائی آب و ہوا میں تندرست آدمی بھی جاتے ہوئے خوف کھاتا ہے اسی طرح معذب بستیوں میں سیر و تفریح کے لیے جانا بڑی غلطی ہے یہ تفریح کے مقامات نہیں۔ یہ بڑے خوف اور بڑی عبرت کے مقامات ہیں۔ ان فضاؤں میں عذاب الہی کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہے اس لیے سیر و تفریح کے بجائے یہاں صورت عجز و انکسار اور خوف و خشیت کی بنانی چاہیے اور اس ماحول کی اشیاء بھی استعمال میں لانی نہیں چاہئیں اور ان سے اسی طرح پرہیز کرنا چاہیے جس طرح کہ وبائی علاقوں کی اشیاء سے دنیا آج پرہیز کرتی ہے۔ وبائی امراض سے حفاظت میں آج تو اتنا مبالغہ ہے کہ خارجی ممالک کے سفر کے لیے بھی مختلف قسم کے انجکشن اور ذرا سی بات پر قرنطینہ لازم قرار دیا گیا ہے۔ افسوس !.....



اُخْرِجَاهُ فِي الصَّحِيحِينَ مِنْ غَيْرِ وَجْهِ وَفِي  
بَعْضِ الرِّوَايَاتِ اِنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا  
مَرَّ بِمَنَازِلِهِمْ قَنَّ رَأْسَهُ وَاسْرَعَ رَاحِلَتَهُ وَ  
نَهَى عَنْ دُخُولِ مَنَازِلِهِمْ اِلَّا اَنْ تَكُونُوا  
بَاكِينَ وَفِي رِوَايَةٍ فَاِنْ لَمْ تَبْكُوا فَتَبَاكُوا  
خَشِيَةَ اَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا اَصَابَهُمْ.

(۱۲۲۴) قَالَ مَعْمَرٌ اَخْبَرَنِي اِسْمَاعِيلُ بْنُ  
أُمَيَّةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِقَبْرِ  
أَبِي رَغَالٍ فَقَالَ أَتَدْرُونَ مَنْ هَذَا؟ قَالُوا اللَّهُ  
وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ هَذَا قَبْرُ أَبِي رَغَالٍ رَجُلٍ  
مِنْ ثُمُودَ كَانَ فِي حَرَمِ اللَّهِ فَمَنَعَهُ حَرَمُ اللَّهِ  
عَذَابَ اللَّهِ فَلَمَّا خَرَجَ أَصَابَهُ مَا أَصَابَ  
قَوْمَهُ فَدُفِنَ هَهُنَا وَ دُفِنَ مَعَهُ غُصْنٌ مِنْ ذَهَبٍ  
فَنَزَلَ الْقَوْمُ فَابْتَدَرُوهُ بِأَسْيَافِهِمْ فَبَحَثُوا عَنْهُ  
فَاسْتَخْرَجُوا الْغُصْنَ . (رواه عبد الرزاق) . قَالَ  
ابن كثير هذا مرسل من هذا الوجه وقد جاء  
من دجه اخر متصلا كما رواه ابو داود و  
يحتمل ان يكون رفعه و هم لكن في هذا

المرسل و في حديث جابر شاهد له . كذا في البداية ج ۱ ص ۱۳۷

بعض روایات میں اس طرح ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی  
بستیوں سے گزرے تو اپنا سر مبارک جھکا لیا اپنی اونٹنی تیز کر دی اور صحابہ  
کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کو منع فرمایا کہ ان بستیوں کے اندر نہ  
جائیں مگر گریہ وزاری کے ساتھ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم گریہ وزاری  
کی صورت ہی بنالیں۔ مبادا جو عذاب ان کو ہے کہیں تم بھی اس کے لپیٹ  
میں نہ آ جاؤ۔

(۱۲۲۴) اسماعیل بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کا ابو رغال کی قبر سے گزر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا۔ جانتے ہو یہ کس کی قبر ہے؟ لوگوں نے عرض کی اللہ اور اس کے رسول  
صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اس کا علم ہے۔ فرمایا یہ قبر ابو رغال کی ہے۔ یہ شخص بھی  
قوم ثمود کا ایک فرد تھا۔ جب ثمود پر اللہ کا عذاب آیا تھا تو یہ اس وقت حرم کی  
زمین میں موجود تھا۔ خدائی حرم کی وجہ سے اس وقت تو عذاب الہی سے محفوظ  
رہا۔ بس حرم الہی سے اس کا نکلنا تھا کہ جو عذاب اس کی قوم پر آیا تھا اسی نے  
اس کو آ پکڑا اور وہ بھی ہلاک ہو گیا۔ اور جب دفن کیا گیا تھا تو اس کے ساتھ  
سونے کی ایک شاخ بھی دفن ہو گئی تھی۔ یہ سن کر لوگ لپکے اور اپنی تلواروں  
سے اس کی قبر کھود ڈالی (دیکھا تو سونے کی وہ شاخ موجود تھی چنانچہ اس کو  
نکال لیا)

(عبد الرزاق)

اللہ ..... ہے کہ یہی محتاط دماغ جب ان معذب مقامات سے گزرتے ہیں تو یہاں احتیاط کرنا مذہبی وہم پرستی سمجھتے ہیں۔  
اسی طرح مسرت و سرور کے حالات میں جن میں کہ شیطان نخوت و غرور کا نشہ پیدا کر سکتا ہے تو وضع و انکسار میں ڈوب جانا چاہیے  
کہیں ہوا کا رخ پھر نہ پلٹ جائے اسی لیے بنی اسرائیل کو یہ حکم ہوا تھا کہ بیت المقدس میں جب داخل ہوں تو تواضع و عاجزی کی شکل بنا کر سر  
جھکائے ہوئے داخل ہوئے مگر اس متمرّد قوم نے اس کے برعکس ہی کیا۔ اسی سنت کے مطابق جب مکہ فتح ہوا اور جس مقام سے مسلمان کبھی  
بڑی کس پرسی سے نکالے گئے تھے آج پھر بڑی شان سے فاتحانہ داخل ہو رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تواضع کا عالم یہ تھا  
کہ اونٹنی پر سوار تھے اور مارے تواضع کے سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ ریش مبارک کے بال کجاوہ کی لکڑی سے جا جا لگتے تھے۔ دیکھو البدایہ والنہایہ  
ج ۱ ص ۳۲۴۔

## سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام خلیل اللہ وجد سیدنا حبیب اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت تمام انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بہت سی حیثیات سے نمایاں ہے اور اس عالم سے لے کر عالم آخرت تک اپنی گونا گوں خصوصیات سے معمور ہے ان کے بعد نبوت کا ان کی ذریت میں منحصر ہو جانا خود قرآن کریم کا بیان ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو سب حنیف تھے مگر یہاں بھی ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ان کی ملت کا نام ہی حنیفیہ ہے۔ اس جگہ ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۶۸ حدیث نمبر ۳۱۳ اور اس کا تشریح نوٹ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ شریعت محمدیہ کی زمین ملت حنیفیہ ہی ہے ہم نے پہلے چالیس وہ احکام نقل کر دیئے ہیں جو دونوں شریعتوں میں مشترک ہیں۔ اس کے بعد ابن قتیبہ کی مشہور تالیف تاویل مختلف الحدیث ہماری نظر سے گزری اس میں چند اور مشترک احکام کی فہرست سامنے آئی۔ مثلاً قرابت و صہر کے رشتہ سے محرمات ایک اور دو طلاق کے بعد شوہر کو رجعت کا حق رہنا۔ نفس کی دیت سواونٹ ہونا۔ جنابت سے غسل کرنا اور خنثی میں مذکر و مؤنث کی غالب علامت کا اعتبار کرنا۔ دیکھو تاویل مختلف الاحادیث ص ۱۳۵ اس لحاظ سے اب مشترک احکام کی تعداد چالیس کی بجائے پینتالیس ہو جائے گی۔

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے زمانہ میں عبادت اصنام یعنی بت پرستی اور کواکب پرستی کی عام و بلاء پھیلی ہوئی تھی اور کفر کا اس درجہ غلبہ ہو چکا تھا کہ حضرت خلیل علیہ السلام ان کی بیوی اور ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی کلمہ گو موجود نہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ کے لیے ان کو مبعوث فرمایا۔ اس سلسلہ میں بادشاہوں کے ساتھ ان کے مناظرے قوموں کی تفہیم اور جا بجا اثبات توحید اور ابطال شرک کے قاہرانہ براہین کا تذکرہ خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ اسی لیے ہم نے آپ کے حالات زندگی کے تفصیلی تذکرہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ آفتابِ عالم تاب کی طرح سب ادیان سماویہ کی نظروں میں ہمیشہ درخشان رہی ہے۔

آپ کا مولد بابل یا غوطہ تھا، آپ کی والدہ ماجدہ کا نام ”امیلہ“ یا ”بلونا“ تھا۔ والد ماجد کا نام حسب ترجیح حافظ ابن کثیر آزر تھا۔ جمہور نساب تارخ اور اہل کتاب تارخ لکھتے ہیں اور زبانوں کے اختلاف سے ناموں کی نقل میں اختلاف ہو جانا کوئی بعید بات نہیں ہے۔ پھر علم اور لقب کا فرق بھی اگر ملحوظ رکھا جائے تو بہت سی الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اگر صفاتی نام بھی اسماء کی فہرست میں آسکتے ہیں تو پھر پیش گوئیوں میں جو بے وجہ مباحث پیدا کی گئی ہیں وہ سب آسانی سے حل ہو سکتی ہیں۔ آپ کی کنیت ابو الضیفان تھی، اور آپ کی ایک اہم ضیافت کا تذکرہ بھی قرآن کریم میں موجود ہے۔ آپ کی حیات طیبہ میں بناء کعبہ اور آزمائشی میدانوں میں آپ کا صبر و استقامت اس کا سب سے نمایاں حصہ ہے ذبحِ عظیم اور آپ پر آتش کے برد و سلام جیسے عظیم الشان واقعات تو زباں زد خاص و عام ہو چکے ہیں اس سلسلہ میں جبریل علیہ السلام کے اصرار پر آپ کا فرمان ”اما الیک فلا“ حسب بیان حافظ ابن کثیر صرف بعض سلف کا مقولہ ہے۔

آپ کی بیوی حضرت سارہ شاہ حران کی بیٹی تھیں۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ جس کسی نے یہ کہا کہ وہ آپ کی بھیجی تھیں یہ



بالکل بے تکی بات ہے اس پر یہ دعویٰ کرنا اور زیادہ بے اصل ہے کہ پہلے بھتیجی سے نکاح کرنا درست تھا۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ ان جائزات میں سے ہوگا جس کا انبیاء علیہم السلام کبھی ارتکاب نہیں فرماتے۔

حضرت سارہ کا مشہور واقعہ جس ظالم بادشاہ کے ساتھ پیش آیا تھا حسب بیان بعض اہل تاریخ وہ ضحاک ظالم کا بھائی تھا اور اس کا نام سنان بن علوان تھا۔ ابن ہشام نے اپنی کتاب العیجان میں اس کا نام عمرو بن امرء القیس بن مایلون یا مایلون لکھا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی قبور مبارک شہر حبرون میں موجود ہیں۔ جس کو آج کل ”الخلیل“ کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کی علیحدہ علیحدہ تعین یقینی طور پر معلوم نہیں۔ البدایہ ج ۲ ص ۱۷۵۔

(۱۲۲۵) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَيْتُ عِيسَى بْنَ مَرْيَمَ وَمُوسَى وَابْرَاهِيمَ فَأَمَّا عِيسَى فَأَحْمَرُ جَعْدٌ عَرِيضُ الصَّدْرِ وَأَمَّا مُوسَى فَأَدَمُ جَسِيمٌ قَالُوا لَهُ فَأَبْرَاهِيمَ قَالَ انْظُرُوا إِلَى صَاحِبِكُمْ يَعْنِي نَفْسَهُ.

(۱۲۲۵) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو عیسیٰ علیہ السلام سرخ رنگ، گھونگر والے بال اور چوڑے سینہ کے تھے۔ اور موسیٰ علیہ السلام گندم گوں رنگ اور لانبے چوڑے جسم کے آدمی تھے۔ رہ گئے ابراہیم علیہ السلام تو وہ مجھ کو دیکھ لو۔

(احمد بخاری شریف، مسلم شریف)

(رواہ الامام احمد وروی البخاری و مسلم نحوه فی الحج و فی البلس ایضا)

(۱۲۲۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ فِي الْجَنَّةِ قَصْرًا أَحْسَبُهُ قَالَ مَنْ لَوْلُؤُهُ لَيْسَ فِيهِ فَضْمٌ وَلَا وَهْيٌ عَذَّةُ اللَّهِ لِخَلِيلِهِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ نَزْلًا.

(۱۲۲۶) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جنت میں ایک محل ہے میرا گمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ ایسے موتی کا ہے جس میں کہیں ذرا بال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے خلیل علیہ السلام کی مہمانی کے لیے تیار فرمایا ہے۔

(بزار)

(۱۲۲۷) عَنْ جُنْدُبِ الْبَجَلِيِّ وَ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو وَ ابْنِ مَسْعُودٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللَّهَ اتَّخَذَنِي خَلِيلًا كَمَا اتَّخَذَ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا.

(۱۲۲۷) جندب بجلی، عبد اللہ بن عمرو اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو! سن لو اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا تھا مجھ کو بھی اپنا خلیل بنایا ہے۔

(متفق علیہ)

(رواہ الشیخان)

(۱۲۲۸) عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُونٍ قَالَ إِنَّ مُعَاذًا لِمَا قَدِمَ الْيَمَنَ صَلَّى بِهِمُ الصُّبْحَ فَقَرَأَ وَ اتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا.

(۱۲۲۸) عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ معاذ جب یمن آئے اور لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی تو اس میں یہ آیت پڑھی وَ اتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تو ان لوگوں میں سے ایک شخص بولا ابراہیم

قَرَّتْ عَيْنُ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ.

(رواہ البخاری)

(۱۲۲۹) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قِيلَ لَهُ مَا الْمَقَامُ الْمُحْمُودُ قَالَ ذَلِكَ يَوْمُ يَنْزِلُ اللَّهُ تَعَالَى عَلَى كُرْسِيِّهِ فَيَأْطُ كَمَا يَأْطُ الرَّحْلُ الْجَدِيدُ مِنْ تَضَائِقِهِ وَهُوَ كَسْعَةٍ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَيُجَاءُ بِكُمْ حُفَاةَ غُرَاةٍ غُرْلًا فَيَكُونُ أَوَّلُ مَنْ يُكْسَى إِبْرَاهِيمُ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى اكْسُوا خَلِيلِي فَيُؤْتَى بِرِبِطَتَيْنِ بِيضَاوَيْنِ مِنْ رِيَاطِ الْجَنَّةِ ثُمَّ اُكْسَى عَلَى آثَرِهِ ثُمَّ أَقْوَمَ عَنْ يَمِينِ اللَّهِ مَقَامًا يَغْبِطُنِي الْأَوَّلُونَ وَالْآخِرُونَ. رواه الدارمی و اخرج الحافظ برواية البيهقي من كتاب الاسماء والصفات نحوه كما في الفتح ج ۶ ص ۲۴۴ و الحافظ العيني في عمدة القاري ج ۷ ص ۳۴۷.

(۱۲۳۰) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي كَلِمَاتِ إِبْرَاهِيمَ

عليه السلام کی والدہ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں (کہ اتنی بڑی فضیلت ان کے فرزند کو نصیب ہوئی) (بخاری شریف)

(۱۲۲۹) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ مقام محمود کیا چیز ہے؟ فرمایا یہ ایک مقام ہے جو مجھ کو اس دن نصیب ہو گا جب کہ اللہ تعالیٰ عرش عظیم سے اپنی کرسی پر تجلی فرمائے گا تو وہ اس طرح آواز کریں گی جیسا نیا کجاوہ کسی بڑی چیز کے وزن سے آواز کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ اس کرسی کی وسعت آسمان و زمین کے درمیان فاصلہ کی برابر ہے اس کے بعد پھر تم سب مخلوق کو حاضر کیا جائے گا اور سب پا برہنہ برہنہ جسم اور غیر مختون ہوں گے۔ پھر جن کو سب سے پہلے جنت کا لباس پہنایا جائے گا وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں گے۔ ارشاد ہو گا۔ میرے خلیل کو پوشش پہناؤ۔ فوراً جنت کی چادروں میں سے دو سفید رنگ کی چادریں لا کر ان کو پہنائی جائیں گے اس کے بعد ہی پھر مجھ کو پوشش پہنائی جائے گی اور میں اللہ تعالیٰ کے دائیں آ کر ایسے مقام پر کھڑا ہوں گے جہاں سب اگلے اور پچھلے مجھ پر غبطہ کریں گے۔ (دارمی شریف)

(۱۲۳۰) ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کے متعلق جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے

(۱۲۳۰) \* ان تین باتوں کا تفصیلی تذکرہ آپ ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۲۲۷ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کا ذکر فرما کر یہ بات پورے طور پر صاف فرمادی ہے کہ وہ تینوں باتیں ہر طرح پر صحیح تھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ خدائی دین کی حفاظت کی خاطر اختیار کی گئی تھیں۔ یہ خدا تعالیٰ کے خلیل کی بلند فطرت تھی کہ مخاطبوں کو چونکہ ان کی مراد سمجھنے میں غلط فہمی پیدا ہو گئی اس لیے انہوں نے اس کذب نما صدق کو بھی کذب کی برابر شمار کیا اور اس کو صوری کذب قرار دے کر اس پر ہمیشہ اتنے نادم رہے کہ قیامت تک اس کا انفعال ان کی فطرت سے محو نہ ہو سکا۔ جن لوگوں کو انبیاء علیہم السلام کے بلند مقام کا اندازہ نہیں ہے انہوں نے بے وجہ یہاں بخاری شریف کی اس حدیث میں بھی تاویل شروع کر دی ہیں۔ حالانکہ جب ان کی حقیقت خود روایت میں واضح ہو چکی تو اب سوال اس کے سوا اور کیا رہتا ہے کہ اس حقیقت پر کذب کا اطلاق کیوں کیا گیا لیکن اگر ذرا اس طرف بھی نظر اٹھ جاتی کہ یہاں صرف ایک ابراہیم علیہ السلام ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کی پوری کی پوری جماعت کے حالات زندگی اسی قسم کی سخت گیریوں اور مواخذات لفظیہ کا مرقع ہیں تو یہاں کوئی اشکال نہ رہتا۔ آخر آدم علیہ السلام کی جو سرگذشت کہ خود قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اس کے بعد پھر جو لغزش ان سے ہوئی لفظ.....



الثَلَاثِ الَّتِي قَالَ مَا مِنْهَا كَلِمَةٌ إِلَّا مَا حَلَّ بِهَا نكلی تھیں فرمایا کہ ان تینوں میں ایک بات بھی ایسی نہ تھی جس سے ان کا

للہ ..... اس کی اہمیت کتنی رہ جاتی ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے اس صوری فروگزاشت کو ارادی فروگزاشت کے انداز میں ذکر کیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی جانب معصیت کی نسبت فرمادی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی پوری جماعت پر نظر ڈال جائے۔ آپ کو یہی ثابت ہوتا چلا جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی شان میں الفاظ گو وہی استعمال ہوتے ہیں جو عرف عام میں مستعمل ہوتے ہیں مگر ان کے مصداق میں ذرا سا بھی اشتراک نہیں ہوتا۔ ترجمان السنہ میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ پس حدیث میں تو یہ پر کذب کا اطلاق اسی نوع کا ہے جیسا قرآن کریم میں ایک زلت پر معصیت کا۔ انکشاف حقیقت کے بعد ان اطلاق سے انبیاء علیہم السلام کی کسر شان نہیں نکلتی بلکہ اور ان کی عظمت کا ثبوت ملتا ہے۔

ہم اس وقت یہ بات اور بتا دینی چاہتے ہیں کہ کذب کا اطلاق صرف اس معنی میں منحصر سمجھ لینا جس کو عام طور پر جھوٹ کہا جاتا ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس جگہ حافظ ابن تیمیہؒ نے جو تحقیق فرمائی ہے چونکہ وہ بہت جگہ کارآمد ہوگی اس لیے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ کذب کا اطلاق ہمیشہ ارادی کذب پر نہیں ہوتا بلکہ ایسی خلاف واقع بات پر بھی ہوتا ہے جس کے کہنے کا انسان کو شرعی طور پر حق نہ ہو خواہ اس میں دروغ گوئی کا ارادہ نہ ہو۔

(۱) جیسا ایک بار ایک حاملہ عورت کے شوہر کے انتقال پر مسئلہ دریافت کیا گیا کہ اس کا وضع حمل ہو چکا ہے تو کیا اب وہ جدید نکاح کر سکتی ہے۔ اس پر ابوالسنابل صحابی نے جواب دیا ”ما انت بنا کحة حتی یمر علیک اربعة اشهر وعشر“ یعنی جب تک تو چار ماہ دس دن تک عدت نہ گزار لے تجھ کو نکاح کا کوئی حق نہیں۔ جب اس بات کی آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا ”کذب ابو السنابل“ ابو السنابل نے جھوٹ کہا۔

ا: اسی طرح عام صحابی کی کی اپنی تلوار اتفاقی طور پر لگ جانے کی وجہ سے جب ان کی موت واقع ہوئی تو لوگوں نے کہا: عامر کا جہاد تو برباد ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: ”کذب من قالها“ جس نے بھی یہ کہا جھوٹ کہا۔  
ب: فتح مکہ کے موقع پر سعد بن عبادہ کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا ”اليوم يوم الملحمة“ آج ہے جنگ کا دن تو آپ نے فرمایا ”کذب سعد“ سعد نے جھوٹ کہا۔

ج: عبادہ بن صامت کے سامنے کسی نے بیان کیا کہ ابو محمد کہتے کہ تو رواج ہے تو انہوں نے فرمایا ”کذب ابو محمد“ ابو محمد نے جھوٹ کہا۔  
د: حضرت ابن عباس سے کسی نے کہا کہ نوف کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کے ساتھ جس موسیٰ کا واقعہ پیش آیا تھا وہ موسیٰ بنی اسرائیل نہ تھے کوئی اور موسیٰ تھے تو فرمایا ”کذب نوف“ نوف نے جھوٹ کہا۔

(۲) اسی طرح جو شخص ایسی خبر بیان کرے جس کی تصدیق شرعی طور پر شہادت کے بغیر ممنوع ہو تو وہ بھی جھوٹ کہلاتی ہے چنانچہ کسی پر تہمت لگانے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَوْ لَا جَاءَ وَاعْلِيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاِذْ لَمْ يَأْتُوْا  
بِالشُّهَدَاءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكَافِبُوْنَ. (النور: ۱۳)

(۳) جو شخص بے علمی سے غلط باتیں بنائے وہ بھی جھوٹ کی فہرست میں داخل ہے خواہ اس کے اپنے علم میں وہ حق ہی کیوں نہ ہوں۔ جیسا للہ .....

عَنْ دِينَ اللَّهِ: (رواه ابن ابی حاتم)

مقصد اللہ تعالیٰ کے دین کی تائید کرنی نہ ہو۔ (ابن ابی حاتم)

(۱۲۳۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اخْتَنَ إِبْرَاهِيمُ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَهُوَ ابْنُ ثَمَانِينَ سَنَةً بِالْقُدُومِ.

(۱۲۳۱) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں کسلہ سے ختنہ کی تھی۔

(رواه البخاری و مسلم)

(بخاری و مسلم)

(۱۲۳۲) عَنْ عَلِيِّ بْنِ رَبَاحٍ أَنَّ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَمَرَ أَنْ يَخْتَنَ وَهُوَ حَنِئِدُ ابْنُ ثَمَانِينَ سَنَةً فَعَجَّلَ وَ اخْتَنَ بِالْقُدُومِ فَاشْتَدَّ عَلَيْهِ الْوَجَعُ فَدَعَا رَبَّهُ فَأَوْحَى إِلَيْهِ أَنْكَ عَجَلْتَ قَبْلَ أَنْ نَأْمُرَكَ بِإِلَيْهِ قَالَ يَا رَبِّ كَرِهْتُ أَنْ أُؤَخِّرَ أَمْرَكَ.

(۱۲۳۲) علی بن رباح روایت کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب ختنہ کرنے کا حکم ہوا تو ان کی عمر اس وقت اسی سال کی تھی انہوں نے خدائی حکم بجالانے میں جلدی کی اور فوراً کسلہ لے کر اپنی ختنہ کر ڈالی جب تکلیف زیادہ محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعاء کی ادھر سے وحی آئی ہمارے ختنہ کا طریقہ بتانے سے پہلے ختنہ کرنے میں تم نے خود جلدی کی۔ انہوں نے عرض کی پروردگار مجھ سے یہ گوارا نہ ہو سکا کہ میں تیرے حکم میں

(درمنثور ج ۱ ص ۱۱۵) ذرا سی تاخیر بھی کروں۔ (درمنثور)

لہ..... کاہنوں پر شیطان یہی ظاہر کرتا ہے کہ جو خبریں وہ بیان کرتے ہیں یہ سب درست ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی خبروں کے بیان کرنے والوں کو کاذب قرار دیا ہے۔

تَنْزِلُ عَلَى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَ أَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ. (الشعراء: ۲۲۲-۲۲۳)

ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں جو سنی ہوئی بات (اس کے کان میں) لا ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہیں۔

اس کے علاوہ امام خطابی شرح ابوداؤد میں فرماتے ہیں کہ کذب کا اطلاق عربی زبان میں خطاء کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے کہتے ہیں ”کذب سمعی۔ کذب بصری“ ای زل و لم یدرک۔ میری چشم و گوش نے جھوٹ بولا یعنی سننے اور دیکھنے میں غلطی کھائی اور جس شخص نے اپنے مریض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر شہد پلایا تھا اس کو شروع میں افادہ نہ ہوا تو جب اس نے آپ سے آ کر پھر شکایت کی تو آپ نے فرمایا صدق اللہ و کذب بطن اخیک۔ تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے اور اللہ تعالیٰ سچا ہے۔ یعنی شہد میں تو شفا یقینی ہے مگر تیرے بھائی کو نا موافق رہا ہے۔ یہ بات دوسری ہے۔ معالم السنن ج ۱ ص ۱۳۲۔

(۱۲۳۱) \* صحیح بخاری کی روایت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سن کی تصریح ہوتے بھی بعض مصنفین نے یہ کیسے لکھ دیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال کی ہوئی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تیرہ سال تو اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ختنہ کرو۔ یہاں البدایہ و النہایہ میں گوئی ابن حبان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت ۱۲۰ سال بھی نقل کی ہے مگر پھر ترجیح بخاری شریف کو ہی رہے گی۔

(۱۲۳۲) \* اب اس ایک ہی واقعہ سے اندازہ فرمالیجئے کہ انبیاء علیہم السلام سے مواخذات کا معیار کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ”انا اعلم“ ایک کلمہ نکل گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا اور آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی قرب کی خاطر بھول سے ایک قدم اٹھایا تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مستحسن تو یہ کہ کلمات منہ سے نکلے تو اس کا انفعال کہاں تک باقی رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نادان قوم نے ان کو خدا کا شریک بنایا تو اس کا اثر بھی ان کی مقدس فطری پر کتنا شدید رہا۔ الی غیر ذلک۔



(۱۲۳۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ أَوَّلَ مَنْ أَضَافَ الضَّيْفَ وَ أَوَّلَ مَنْ قَصَّ الشَّارِبَ وَ أَوَّلَ مَنْ رَأَى الشَّيْبَ وَ أَوَّلَ مَنْ قَصَّ الْأَظْفِيرَ وَ أَوَّلَ مَنْ اخْتَنَنَ بِقَدُّومِهِ. (رواه ابن عدی و البیهقی کذا فی الدر المنثور ج ۱ ص ۱۱۵ و اخرج البیهقی عن سفیان بن عیینة انه اول من تسرول و اول من فرق و اول من استحد ايضا. و عند ابن ابی شیبة و البزار انه اول من خطب علی المنبر و عند ابن عساکر انه اول من رتب العسکر فی الحرب میمنة و میسرة و قبا و عند ابن ابی شیبة انه اول من عقد الالویة و عند ابن ابی الدنیا انه اول من عمل القسی و عنده فی کتاب الاخوان و الخطیب فی تاریخه و الدیلمی فی مسند الفردوس انه اول من عانق و عند ابن سعد انه اول من ثرد الثرید و عند الدیلمی انه اول من اتخذ الخبز المبلقس و عند الشیخین و غیرهما انه اول من یکسی يوم القيامة کله من الدر المنثور. و روی بعضه مالک فی مؤطاہ)

(۱۲۳۳) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (چند باتیں وہ ہیں جو سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوئیں) سب سے پہلے مہمانی کی سنت انہوں نے شروع کی۔ سب سے پہلے انہوں نے مونچھیں تراشیں، سب سے پہلے سر میں بڑھاپے کے آثار انہوں نے دیکھے۔ سب سے پہلے ناخن انہوں نے تراشے۔ سب سے پہلے کسلہ لے کر اپنی ختنہ انہوں نے کی۔ سب سے پہلے پاجامہ انہوں نے پہنا۔ سب سے پہلے مانگ انہوں نے نکالی۔ سب سے پہلے استرہ سے زیر ناف بال انہوں نے لیے۔ سب سے پہلے منبر پر انہوں نے خطبہ دیا۔ لشکر کے میمنہ، میسرہ اور قلب کی سب سے پہلے تقسیم انہوں نے ایجاد کی۔ سب سے پہلے جھنڈے پر پرچم انہوں نے لگایا۔ سب سے پہلے کمان انہوں نے بنائی۔ سب سے پہلے معانقہ انہوں نے کیا۔ سب سے پہلے ٹرید کھانا انہوں نے تیار کیا۔ وہ روٹی جو قریہ بلقس کی طرف منسوب ہے سب سے پہلے انہوں نے تیار کی۔<sup>۱</sup>

(۱۲۳۴) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ

(۱۲۳۴) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دس باتیں فطرت میں داخل ہیں۔ مونچھ تراشنا،

(۱۲۳۳) \* یہ جملہ امور اولیات ابراہیم علیہ السلام کے عنوان سے مشہور ہیں ہم نے ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ یہ سب اشیاء ممکن ہے کہ سب سے پہلے ان سے ہی شروع ہوئی ہوں یا ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی خصوصیت ایسی ہو جس کی بناء پر ان کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب اولی سمجھی گئی ہو۔

(۱۲۳۴) \* حافظ ابن کثیر نے اس حدیث کی تشریح نہایت پر مغز اور مختصر الفاظ میں حسب ذیل فرمائی ہے:

و المقصود انه عليه الصلوة والسلام كان لا يشغله القيام بالاخلاص لله عز وجل و خشوع العبادة العظيمة عن مراعاة مصلحة بدنه و اعطاء كل عضو ما يستحقه من الاصلاح و التحسين و ازالة ما يشين من زيادة لل...

الشَّارِبِ وَاعْفَاءِ اللَّحْيَةِ وَالسَّوَاكِ وَ  
اِسْتِنْشَاقِ الْمَاءِ وَقَصُّ الْأَظْفَارِ وَغَسْلُ  
الْبَرَاجِمِ وَتَنْفُ الْأَبْطِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَ  
اِنْتِقَاصُ الْمَاءِ يَعْنِي الْاِسْتِنْجَاءَ. (رواه مسلم  
ریش بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی دینا، ناخن تراشنا، انگلی کے جوڑوں  
کو صاف کرنا، زیر بغل بالوں کو اکھاڑنا، زیر ناف بالوں کا مونڈنا اور استنجاء  
کرنا - ختنہ کرنا -)

(مسلم شریف)

و اهل السنن و فى الصحيحين ذكر الختان و الاستحداد ايضا

(۱۲۳۵) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى  
عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا  
رَأَى الصُّورَ فِي الْبَيْتِ لَمْ يَدْخُلْ حَتَّى  
أَمَرَبَهَا فَمُحِيتْ وَرَأَى إِبْرَاهِيمَ وَاسْمَعِيلَ  
عَلَيْهِمَا السَّلَامُ بَايِدِيهِمَا الْأَزْلَامُ فَقَالَ قَاتَلَهُمُ  
اللَّهُ. وَاللَّهُ إِنْ يَسْتَقْسِمَا بِالْأَزْلَامِ قَطُّ.

(رواه البخارى و لم يخرجہ مسلم)

(۱۲۳۶) عَنْ نَافِعٍ أَنَّ امْرَأَةً دَخَلَتْ عَلَى  
عَائِشَةَ فَإِذَا رُمُحٌ مَنْصُوبٌ فَقَالَتْ مَا هَذَا  
حاضر ہوئیں کیا دیکھتی ہیں ایک نیزہ کھڑا ہوا ہے۔ انہوں نے پوچھا یہ نیزہ

ہیں کہ انہوں نے پانسے کے تیر کبھی نہیں ڈالے۔ (بخاری شریف)

(۱۲۳۶) نافع بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت حضرت عائشہ کی خدمت میں

للہ ..... شعرا و ظفر او وجود قلع او وسخ فهذا من جملة قوله تعالى و ابراهيم الذی و فى.

(البدایة و النہایة ج ۱ ص ۱۷۲)

اصل مقدمہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا بڑا کمال یہ تھا کہ ایک طرف وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی پورے خشوع و خضوع سے ادا  
فرماتے تھے اور دوسری طرف اپنی بدنی مصالح کی بھی پوری رعایت رکھتے تھے کہیں جسم پر قابل نفرت بال یا ناخن یا میل کچیل باقی  
نہ رکھتے تھے جو موجب نفرت ہو ان ہی مجموعہ حقوق کی اس طرح ادائیگی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے و ابراہیم  
الذی و فى۔ یعنی ابراہیم وہ تھے کہ جنہوں نے پورے طور پر حقوق کی ادائیگی فرمائی تھی۔

(۱۲۳۶) \* واضح رہے کہ جہاں آتش نمرود کے سرد ہو جانے کا ذکر ہو وہاں بعض حیوانات کی حمایت اور بعض کی عداوت سے بھلا کیا  
تعجب ہونا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ طبعیت کی سلامتی اور خباثت یہ دونوں خواص انسان اور حیوانات میں فطری طور پر موجود ہوتے ہیں ان  
کے ظہور کے لئے صرف فطرت کافی ہوتی ہے۔ دیکھئے شیر اور بھیڑ یا دونوں ہی خونخوار جانور ہیں مگر پھر دونوں کی شرافت اور دنائت میں  
زمین و آسمان کا فرق ہے یہاں ارادہ و شعور کی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ جس قسم کی فطرت ہوتی ہے اسی قسم کے افعال کا ظہور غیر ارادی اور  
غیر شعوری طور پر ہوتا ہے رہتا ہے۔ اسی لئے مشہور ہے۔

نیش عقرب نہ از پئے کینست      مقتضائے طبیعتش اینست للہ.....



الرَّمُحُ فَقَالَتْ نَقُلُ بِهِ الْأَوْزَاعَ ثُمَّ حَدَّثَتْ عَنْ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ إِبْرَاهِيمَ  
لَمَّا أُلْقِيَ فِي النَّارِ جَعَلَتِ الدَّوَابُّ كُلُّهَا تُطْفِئُ  
عَنْهُ النَّارَ إِلَّا الْوَزْغَ فَإِنَّهُ جَعَلَ يَنْفُخُهَا عَلَيْهِ.

کیسا ہے انہوں نے فرمایا ہم اس سے چھپکیاں مارتے ہیں۔ اس کے بعد  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب  
آگ میں ڈالے گئے تو تمام جانور آگ بجھانے کے لیے کوشاں تھے بجز  
چھپکلی کے کہ یہ اور پھونک مارنے لگی۔ (احمد)

(رواہ احمد من وجہ اخر ایضا قال ابن کثیر تفرد بہ احمد من ہذین الوجهین وقد رواہ ابن ماجہ ایضا وقد اخرجہ  
احمد باسنادہ ایضا)

## سیدنا اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ذبح اللہ

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حسب بیان اہل کتاب جب حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت ہوئی تو  
اس وقت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر مبارک چھپاسی سال کی تھی۔ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے تیرہ سال بعد  
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بطن سارہ سے (حضرت) اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ  
والسلام یہ سن کر سجدہ میں گر گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ بشارت ہوئی کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حق میں جو دعائیں  
کی وہ قبول ہوگئی اور اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں بڑی برکت دے گا اور بارہ بڑی ہستیاں ان میں پیدا فرمائے گا۔ ٹھیک اسی نوع کی  
بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت میں بارہ خلفاء کے متعلق دی ہیں حافظ سہیلی لکھتے ہیں کہ عورتوں میں ختنہ کی رسم  
سب سے پہلے حضرت ہاجرہ سے شروع ہوئی ہے اور کان بندھوانے اور دامن دراز رکھنے کی سنت کی ابتداء بھی ان ہی سے ہوئی ہے۔  
حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جس بیوی کے طلاق دینے کا حکم دیا تھا  
اس کا نام عمارہ بنت سعد تھا اور جس کے ساتھ نباہ کا حکم دیا تھا اس کا اسیدہ بنت مضاض تھا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زندگی میں بناء کعبہ کی شرکت اور خود ان کے ذبح ہونے کے واقعات سب سے زیادہ مشہور اور نمایاں ہیں۔

للہ ..... پس جس طرح بچھوکا کا ثنا اس پر موقوف نہیں کہ پہلے سے دشمنی یا عداوت کا شعور اس میں موجود ہو۔ پھر ایسا ہوتا کیوں ہے اس  
لئے کہ اس کی فطرت یہی ہے۔ اسی طرح چھپکلی کی یہ حرکت صرف اس کی ایک فطرت تھی۔ یہاں تمام مقدمات اس کے پیش نظر ہونے  
ضروری نہیں۔ بندر چوہا، کواد غیرہ جیسے موذی جانوروں کی ایذا دہی کی عجیب و غریب حکایات سب کو معلوم ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سے حیوانات  
ہیں جن کو حدیث میں موذیات کا لقب دیا ہے اور ان کا مارنا ہر حالت میں درست قرار دیا ہے۔ چھپکلی میں انسانی ایذا رسانی کی یہ خصلت  
آج تک موجود ہے کہ نمک پر پیشاب کرتی ہے۔ اگر اس نمک کو استعمال کر لیا جائے تو اس کے سمی اثر سے جسم پر برص کے داغ پیدا ہو جانے  
کا خطرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح خواص حیوانات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض حیوانات میں فطری طور پر ایذا رسانی کی خصوصیات  
موجود ہیں۔ پس اگر قدرت کے کسی خاص مظاہرہ کے وقت حیوانات میں بھی وقتی طور پر کوئی شعوری یا غیر شعوری حرکت پیدا ہو جائے تو اس کا  
انکار یا تاویل دونوں صریح طریق نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حیوانات کا کلام کرنا جلد ثانی کی شروع حدیثوں میں آپ  
پڑھ چکے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں شیر و بکری کی باہم معاشرت کا ذکر آپ کے سامنے آنے والا ہے پس عجائبات قدرت صرف  
چند قطرات نہیں ہیں بلکہ ان کا بھی ایک سمندر ہے جس کی طوفان خیر موجوں کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح ہونے میں اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان مناقشات و مباحثات کی پوری تفصیلات اپنے مقام میں مدون ہیں اس کا یہ محل نہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ظاہری نظم میں حضرت اسحق علیہ السلام کے ذبح ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ پہلے قرآن کریم نے ذبح کا قصہ ذکر فرمایا ہے اس کے بعد ارشاد ہوا ہے ”وَبَشِّرْنَاهُ بِاسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ“ گویا ذبح کا قصہ حضرت اسحق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت سے بھی پہلا ہے۔ پھر حضرت اسحق علیہ السلام ذبح کیسے ہو سکتے ہیں۔ حافظ موصوف نے یہاں محمد کعب قرظی کا ایک دوسرا عجیب استدلال اور نقل کیا ہے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے

﴿فَبَشِّرْنَاهَا بِاسْحَاقَ وَمِنْ وَرَاءِ اسْحَاقَ يَعْقُوبَ﴾ (ہود: ۷۱) ”تو ہم نے اس کو اسحق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی۔“

آیت بالا میں جب حضرت اسحق علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام کے عطاء ہونے کی بشارت دی گئی تھی تو اب یہ کیسے مناسب تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت سے قبل صغریٰ ہی میں حضرت اسحق علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم دے دیا جاتا۔ اندازہ فرمائیے کہ ایک طرف ان کے ذبح کا حکم دوسری طرف ان کے فرزند کی بشارت کیا یہ دونوں باتیں جوڑ کھاتی ہیں۔ (البدایہ ج ۱ ص ۱۵۹)

واضح رہے کہ ہم نے صرف وقتی لحاظ سے یہاں حافظ موصوف کی تاریخ کے یہ دو جملے نقل کر دیئے ہیں ان سے مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور دیگر علماء اسلام نے ہر پہلو سے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحثیں کر دی ہیں وہ دیکھ لی جائیں۔

(۱۲۳۷) عَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ أَخْبَرَتْنِي امْرَأَةٌ مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ قَالَتْ أَرْسَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى عُثْمَانَ بْنِ طَلْحَةَ وَ قَالَ مَرَّةً إِنَّهَا سَأَلَتْ عُثْمَانَ لِمَ دَعَاكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنِّي كُنْتُ رَأَيْتُ قَرْنِي الْكَبْشِ حِينَ دَخَلْتُ الْبَيْتَ فَنَسِيتُ أَنْ أُمَرَكَ أَنْ تُحْمَرَ هُمَا فَحَمَرُهُمَا فَإِنَّهُ لَا يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ فِي الْبَيْتِ شَيْءٌ يَشْغُلُ الْمُصَلِّيَ قَالَ سُفْيَانُ لَمْ تَزَلْ قَرْنَا الْكَبْشِ فِي الْبَيْتِ حَتَّى احْتَرَقَ الْبَيْتُ فَاحْتَرَقَا. (رواه احمد قال في البداية و هذا روى عن ابن عباس ان رأس الكبش لم يزل

(۱۲۳۷) صفیہ بنت شیبہ روایت کرتی ہیں کہ بنو سلیم قبیلہ کی ایک عورت نے مجھ سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ سے کہلا بھیجایا خود انہوں نے عثمان سے پوچھا تھا (راوی کو شک ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو کیوں بلایا تھا۔ انہوں نے کہا یہ کہنے کے لیے بلایا تھا کہ جب میں بیت اللہ میں داخل ہوا تھا تو میں نے اس میں ذبح عظیم والے مینڈھے کے دو سینگ رکھے دیکھے تھے۔ مجھے ان کے متعلق تم سے یہ کہنا یاد نہ رہا کہ ان کو ڈھانک دینا۔ تو اب جا کر ان کو ڈھانک دو کیونکہ بیت اللہ کے اندر ایسی کسی چیز کا کھلا رہنا مناسب نہیں جسے دیکھ کر نماز پڑھنے والے آدمی کا دل بے۔ سفیان راوی حدیث کہتے ہیں کہ وہ دونوں سینگ بیت اللہ میں ہمیشہ موجود رہے یہاں تک کہ جب بیت اللہ کے جلنے کا حادثہ پیش آیا تو وہ بھی اس میں جل گئے تھے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ کعبہ کے پرنا لے کے پاس

(۱۲۳۷) \* حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ صرف یہی ایک روایت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح ہونے کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ دور طفولیت میں یہی مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اور ہمارے علم میں حضرت اسحق علیہ السلام کی صغریٰ میں یہاں آمد کہیں ثابت نہیں۔



معلقا عند میراب الکعبۃ قدیس ج ۱ ص ۱۵۸)

(۱۲۳۸) عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ  
أَوَّلُ مَا اتَّخَذَ النِّسَاءُ الْمِنْطَقَ مِنْ قَبْلِ أُمِّ  
إِسْمَاعِيلَ اتَّخَذَتْ مِنْطَقًا لِتَغْفِيَ اثْرَهَا عَلَى  
سَارَةِ ثُمَّ جَاءَ بِهَا إِبْرَاهِيمُ وَبَابِنَهَا إِسْمَاعِيلُ وَ  
هِيَ تُرْضِعُهُ حَتَّى وَضَعَهُمَا عِنْدَ الْبَيْتِ عِنْدَ  
رُوحَةٍ فَوْقَ ذُمَزَمَ فِي أَعْلَى الْمَسْجِدِ وَ لَيْسَ  
بِمَكَّةَ يَوْمَئِذٍ أَحَدٌ وَ لَيْسَ بِهَا مَاءٌ فَوَضَعَهُمَا  
هُنَا لَكَ وَ وَضَعَ عِنْدَهُمَا جَرَابًا فِيهِ تَمْرٌ وَ  
سِقَاءٌ فِيهِ مَاءٌ ثُمَّ قَفَى إِبْرَاهِيمُ مُنْطَلِقًا  
فَتَبِعَتْهُ أُمُّ إِسْمَاعِيلَ فَقَالَتْ يَا إِبْرَاهِيمُ أَيْنَ  
تَذْهَبُ وَ تَتْرُكُنَا فِي هَذَا الْوَادِي الَّذِي  
لَيْسَ فِيهِ ابْنَسٌ وَ لَا شَيْءٌ فَقَالَتْ لَهُ ذَلِكَ  
مِرَارًا وَ جَعَلَ لَا يَلْتَفِتُ إِلَيْهَا فَقَالَتْ لَهُ اللَّهُ  
أَمَرَكَ بِهَذَا قَالَ نَعَمْ قَالَتْ إِذْنُ لَا يُضِيعُنَا  
ثُمَّ رَجَعَتْ فَانْطَلَقَ إِبْرَاهِيمُ حَتَّى إِذَا كَانَ  
عِنْدَ الثَّنِيَّةِ حَيْثُ لَا يَرُونَهُ اسْتَقْبَلَ بِوَجْهِهِ  
الْبَيْتَ ثُمَّ دَعَا بِهَوْلَاءِ الدَّعَوَاتِ وَ رَفَعَ يَدَيْهِ  
فَقَالَ رَبِّ إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ  
ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ حَتَّى بَلَغَ  
يَشْكُرُونَ جَعَلْتُ أُمِّ إِسْمَاعِيلَ وَ تَشْرَبُ مِنْ  
ذَلِكَ الْمَاءِ حَتَّى إِذَا نَقِدَ مَا فِي السَّقَاءِ  
عَطَشْتُ وَ عَطَشَ ابْنُهَا وَ جَعَلْتُ تَنْظُرُ إِلَيْهِ  
يَتَلَوَّى وَ قَالَ يَتَلَبَّطُ فَانْطَلَقْتُ كَرَاهِيَةً أَنْ  
تَنْظُرَ إِلَيْهِ فَوَجَدْتُ الصِّفَا أَقْرَبَ  
جَبَلٍ فِي الْأَرْضِ يَلِيهَا فَقَامْتُ

اس مینڈھے کا سر لٹکا ہوا تھا حتیٰ کہ لٹکے لٹکے وہ سوکھ گیا تھا۔

(۱۲۳۸) حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے تھے۔ سب سے پہلے جس نے منطق کا لباس بنایا تھا وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ تھیں، انھوں نے یہ لباس اس لئے بنایا تھا تا کہ زمین پر اس کے گھسنے سے ان کے نشانات قدم محو ہو جائیں جو حضرت سارہ کو ان کا پتہ نہ لگ سکے۔ حضرت ابراہیمؑ ان کو اور ان کے لڑکے اسماعیل علیہ السلام کو جو بھی دودھ پی رہے تھے لائے اور بیت اللہ کے پاس ایک درخت کے نیچے زمزم کے نزدیک مسجد کے بالائی حصہ میں چھوڑ دیا، اس وقت مکہ میں نے کوئی آدمی تھا اور نہ کہیں پانی کا کا نام و نشان، حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے ان کے پاس ایک مشک پانی اور ایک تھیلا کھجور رکھ دیا، اور پھر رخ پھیر کر روانہ ہو گئے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں یہ کہتے ہوئے ان کے پیچھے لگ گئیں کہ اے ابراہیمؑ آپ کہاں جا رہے ہیں اور ہمیں اس وادی میں چھوڑ رہے ہیں جہاں نہ کوئی غم گسار ہے اور نہ کوئی چیز یہ بار بار کہہ رہی تھیں مگر وہ ان کی طرف توجہ نہیں کر رہے تھے، انھوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم فرمایا ہے حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے کہا ہاں، انھوں نے کہا تو پھر وہ ہمیں برباد نہ ہونے دے گا، اور یہ کہہ کر وہ بچہ کی طرف پلٹ گئیں اور حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام چلتے رہے، جب وہ گھائی سے اتنی دور نکل آئے، جہاں سے وہ سب ان کو نہ دیکھ سکیں، تو قبلہ رہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، اے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد لاکر تیرے محترم گھر کے پاس ایسی وادی میں آباد کر دی ہے، جہاں کھیتی کا نام و نشان تک نہیں ہے، یَشْكُرُونَ تک کلمات آپ نے فرمائے، ادھر ام اسماعیل تھیلے سے کھجور اور مشکیزہ سے پانی پیتی رہیں۔ تا آنکہ پانی ختم ہو گیا اور خود وہ اور ان کا بچہ پیاس سے بے چین ہوا، وہ دیکھ رہی تھیں کہ بچہ شدت پیاس سے لوٹ پوٹ کر رہا ہے، چنانچہ اس حالت بے تاب میں وہ بچے کے پاس سے چل پڑیں، ان سے بچہ کا حال نہ دیکھا گیا۔ انھوں نے سب سے قریب زمین کے پہاڑوں میں سے صفا کی پہاڑی دیکھی، وہ اس جگہ چڑھ کر وادی میں دیکھنے

عَلَيْهِ ثُمَّ اسْتَقْبَلَتِ الْوَادِي تَنْظُرُ هَلْ تَرَى  
أَحَدًا فَهَبَطَتْ مِنَ الصَّافَا حَتَّى إِذَا بَلَغَتْ  
الْوَادِي رَفَعَتْ طَرْفَ رِدْعِهَا ثُمَّ سَعَتْ سَعَى  
الْإِنْسَانِ الْمَجْهُودِ حَتَّى جَاوَزَتْ الْوَادِي ثُمَّ  
أَتَتْ الْمَرْوَةَ فَقَامَتْ عَلَيْهَا فَنَظَرَتْ هَلْ تَرَى  
أَحَدًا فَفَعَلَتْ ذَلِكَ سَبْعَ مَرَّاتٍ قَالَ ابْنُ  
عَبَّاسٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فَلِذَا لَكَ سَعَى النَّاسُ بَيْنَهُمَا فَلَمَّا أَشْرَفَتْ  
عَلَى الْمَرْوَةِ سَمِعَتْ صَوْتًا فَقَالَتْ صَهْ تَرِيدُ  
نَفْسَهَا ثُمَّ تَسَمَّعَتْ فَسَمِعَتْ أَيْضًا فَقَالَتْ قَدْ  
اسْمَعْتُ إِنْ كَانَ عِنْدَكَ غَوَاثُ فَإِذَا هِيَ يَا  
الْمَلِكِ عِنْدَ مَوْضِعِ زَمْزَمَ فَبَحَثَ بِعَقْبِهِ أَوْ  
قَالَ بِجَنَاحِهِ حَتَّى ظَهَرَ الْمَاءُ فَجَعَلَتْ  
تَحْوِضُهُ وَتَقُولُ بِيَدِهَا هَكَذَا وَجَعَلَتْ  
تَغْرِفُ مِنَ الْمَاءِ فِي سَقَائِهَا وَهُوَ يَفُورُ  
بَعْدَمَا تُغْرِفُ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْحَمُ اللَّهُ أُمَّ اسْمِعِيلَ  
لَوْ تَرَكَتْ زَمْزَمَ أَوْ قَالَ لَوْلَمْ تَغْرِفْ مِنَ  
الْمَاءِ لَكَانَتْ زَمْزَمَ عَيْنًا مَعِينًا قَالَ فَشَرِبَتْ  
وَارْضَعَتْ وَلَدَهَا فَقَالَ لَهَا الْمَلِكُ لَا  
تَخَافِي الضَّيْعَةَ فَإِنَّ هَهُنَا بَيْتُ اللَّهِ يَبْنِي هَذَا  
الْغُلَامُ وَابْنُ اللَّهِ لَا يُضِيعُ أَهْلَهُ وَكَانَ  
الْبَيْتُ مُرْتَفِعًا مِنَ الْأَرْضِ كَالرَّابِيَةِ تَأْتِيهِ  
السُّيُولُ فَنَاخُذُ عَنْ يَمِينِهِ وَشِمَالِهِ فَكَانَتْ  
كَذَاكَ حَتَّى مَرَّتْ بِهِمْ رُفْقَةٌ مِنْ جُرْهُمِ  
أَوْ أَهْلِ بَيْتٍ مِنْ جُرْهُمِ مُقْبِلِينَ مِنْ طَرِيقِ

لگیں کوئی نظر تو نہیں آتا، لیکن کوئی نظر نہ آیا، آخر صفا کی پہاڑی سے اتریں  
اور جب وادی میں پہنچیں، تو اپنا دامن اٹھا کر ایک پریشان حال انسان کی  
طرح دوڑ پڑیں، یہاں تک کہ وادی سے آگے بڑھ گئیں اور مروہ کی پہاڑ  
پر نہیں، اور اس پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدم نظر آتا ہے یا  
نہیں، اسی طرح سات مرتبہ چکر لگایا، عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا  
بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی کی یاد میں لوگ صفا  
و مروہ کی سعی کرتے ہیں۔ اخیر میں جب وہ مروہ پر چڑھیں تو انھوں نے ایک  
آواز سنی، انھوں نے اپنے جی سے کہا، کہ تو خاموش رہ، پھر کان لگایا تو پھر  
آواز آئی۔ انھوں نے کہا کہ تم نے اپنی آواز سنا دی، اب اگر تیرے پاس  
میرے لئے کوئی مدد ہو تو وہ بھی کر دے چنانچہ دفعۃً ان کو زمزم کے پاس ایک  
فرشتہ نظر آیا، اس نے اپنی ایڑ زمین پر لگائی یا اپنا بازو لگایا، یہاں تک کہ پانی  
اُبل آیا، وہ اس کو چاروں کناروں سے گھیرنے لگیں اور پانی چلو میں لے  
لے کر مشکیزہ بھرنے لگیں، مگر پانی اس کے بعد بھی اُبل ہی رہا تھا، عبد اللہ بن  
عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ  
تعالیٰ حضرت اسمعیل علیہ السلام کی مادر مہربان پر رحم فرمائیں، اگر وہ زمزم کو  
اسی حال پر چھوڑ دیتیں یا فرمایا کہ چلو سے لے کر مشکیزہ میں نہ ڈالتیں، تو  
زمزم بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔ فرمایا کہ انھوں نے خود پانی پیا اور بچہ کو دودھ پلایا،  
فرشتہ نے ان سے کہا کہ ہلاکت کا خطرہ محسوس نہ کرو، یہاں اللہ تعالیٰ کا گھر  
ہے یہ بچہ اور اس کے والد محترم اس کو بنائیں گے، اور اللہ تعالیٰ یہاں والوں  
کو برباد نہ ہونے دے گا، اور بیت اللہ عام زمین سے اونچا ایک ٹیلہ کی  
صورت تھا، جب سیلاب آتا اس کے دائیں بائیں سے گذر جاتا، چنانچہ وہ  
اس حال پر رہا یہاں تک کہ جرہم کا ایک قبیلہ یا قافلہ یہاں سے گذرا،  
جو کد کے راستے سے آ رہا تھا، وہ مکہ کے نشیبی علاقہ میں فروکش ہوا، انھوں  
نے پرندوں کو منڈلاتے ہوئے دیکھا، یہ دیکھ کر انھوں نے کہا معلوم ہوتا ہے  
کہ یہ پرندے پانی پر منڈلا رہے ہیں، کہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے، ہم اس وادی  
سے گذر چکے ہیں، یہاں پانی نہ تھا، انھوں نے اپنے ایک یا دو تیز و چست



كَذَّاءَ فَزَلُّوا فِي أَسْفَلِ مَكَّةَ فَرَّأُوا طَائِرًا عَائِفًا  
فَقَالُوا إِنَّ هَذَا الطَّائِرَ لَيَدُورُ عَلَى الْمَاءِ لَعَهْدَنَا  
بِهَذَا الْوَادِي وَمَا فِيهِ فَارْسَلُوا جَرِيًّا أَوْ جَرِيَيْنِ  
فَإِذَا هُم بِالْمَاءِ فَرَجَعُوا فَاخْبَرُوهُمْ بِالْمَاءِ  
فَأَقْبَلُوا قَالُوا أُمِّ إِسْمَاعِيلَ عِنْدَ الْمَاءِ فَقَالُوا  
اتَّذِنِينَ لَنَا أَنْ نَنْزِلَ عِنْدَكَ قَالَتْ نَعَمْ وَلَكِنْ  
لَا حَقَّ لَكُمْ فِي الْمَاءِ قَالُوا نَعَمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ  
قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَالْفَى ذَلِكَ  
أُمِّ إِسْمَاعِيلَ وَهِيَ تُحِبُّ الْإِنْسَ فَزَلُّوا وَ  
أَرْسَلُوا إِلَى أَهْلِهِمْ فَزَلُّوا مَعَهُمْ حَتَّى إِذَا كَانَ  
بِهَا أَهْلُ آيَاتٍ مِنْهُمْ وَشَبَّ الْغُلَامُ وَتَعَلَّمَ  
الْعَرَبِيَّةَ مِنْهُمْ وَانْفُسَهُمْ وَاعْجَبَهُمْ حِينَ شَبَّ  
فَلَمَّا أَذْرَكَ زَوْجُوهُ امْرَأَةً مِنْهُمْ وَمَاتَتْ أُمُّ  
إِسْمَاعِيلَ فَجَاءَ إِبْرَاهِيمُ بَعْدَ مَا تَزَوَّجَ إِسْمَاعِيلُ  
يُطَالِعُ تَرْكَنَهُ فَلَمْ يَجِدْ إِسْمَاعِيلَ فَسَأَلَ امْرَأَتَهُ  
عَنْهُ فَقَالَتْ خَرَجَ يَنْبَغِي لَنَا ثُمَّ سَأَلَهَا عَنْ  
عَيْشِهِمْ وَهَيْئَتِهِمْ فَقَالَتْ نَحْنُ بِشَرِّ نَحْنُ فِي  
ضَيْقٍ وَشِدَّةٍ فَشَكْتُ إِلَيْهِ قَالَ فَإِذَا جَاءَ  
زَوْجُكَ أَفْرَأَى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَقَوْلِي لَهُ يُغَيِّرُ  
عَتَبَةَ بَابِهِ فَلَمَّا جَاءَ إِسْمَاعِيلُ كَانَتْ أَنْسَ شَيْئًا  
فَقَالَ هَلْ جَاءَ كُمْ مِنْ أَحَدٍ قَالَتْ نَعَمْ جَاءَنَا  
الشَّيْخُ كَذَا وَكَذَا فَسَأَلْنَا عَنْكَ فَاخْبَرْتَهُ وَ  
سَأَلَنِي كَيْفَ عَيْشُنَا فَاخْبَرْتَهُ أَنَا فِي جَهْدٍ وَ  
شِدَّةٍ قَالَ أَوْصَاكَ بِشَيْءٍ قَالَتْ نَعَمْ أَمَرَنِي أَنْ  
أَقْرَأَ عَلَيْكَ السَّلَامَ وَيَقُولُ غَيْرُ عَتَبَةَ بَابِكَ  
قَالَ ذَاكَ أَبِي وَقَدْ أَمَرَنِي أَنْ أَفَارِقَكَ

آدمیوں کو بھیجا، دفعۃً انھوں نے پانی دیکھا۔ پلٹ کر انھوں نے پانی کی خبر لی، چنانچہ وہ سب ادھر چل پڑے، وہاں پہنچے تو دیکھا پانی کے پاس حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ماں بیٹھی ہوئی ہیں، انھوں نے ان سے کہا کہ کیا ہمیں اس کی اجازت ہے کہ ہم یہیں آپ کے پاس قیام پزیر ہو جائیں۔ انھوں نے کہا اجازت ہے، لیکن اس پانی میں آپ لوگوں کا کوئی حق نہ ہوگا انھوں نے کہا بہتر ہے، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ام اسماعیل تنہا تھیں، چاہتی تھیں کہ مانوس لوگوں ہوں، چنانچہ وہ آ بسے اور اپنے لوگوں کے پاس آدمی بھیج کر ان کو بھی بلا لیا، اور وہ بھی آ گئے جب ان کے یہاں کئی گھر آباد ہو گئے اور ادھر حضرت اسماعیلؑ جو بچے تھے جو ان ہو گئے اور ان سے عربی سیکھ لی اور وہ سب ان کو بھلے بھی معلوم ہوئے چنانچہ جب یہ پورے جوان ہو گئے، قبیلہ جوہم کے لوگوں نے اپنے خاندان کی ایک خاتون سے ان کی شادی کر دی، کچھ دنوں بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ وفات پا گئیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے کہ جن کو چھوڑ کر گئے، ان کا حال معلوم کریں، حضرت اسماعیلؑ کو موجود نہیں پایا ان کی بیویوں سے ان کے متعلق دریافت کیا، کہ کہاں گئے، اس نے کہا ہمارے لئے رزق کی تلاش میں گئے ہیں پھر انھوں نے پوچھا زندگی کیسی گذرتی ہے اور کیا حال ہے؟ اس نے کہا ہم برے حال میں ہیں، تنگی میں ہیں، تکلیف میں ہیں، اس نے ان سے معاش کی شکایت کی، آپ نے اس سے فرمایا جب تیرا شوہر آئے، تو میرا سلام پہنچانا، اور کہنا کہ وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالیں، حضرت اسماعیلؑ آئے تو انھوں نے گویا انس محسوس کیا، اور پوچھا کیا تمہارے یہاں کوئی آیا تھا، اس نے کہا ہاں ایک شیخ تشریف لائے تھے، ان کی یہ ہیئت تھی، انھوں نے آپ کے بارے پوچھا، میں نے انہیں بتایا، پھر گذر بسر کے متعلق سوال کیا، میں نے کہا کہ مشقت اور تکلیف میں ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ کچھ کہہ بھی گئے، اس نے کہا ہاں فرما گئے کہ میں آپ کو ان کا سلام پہنچا دوں اور آپ سے فرما گئے کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دیں، آپ نے فرمایا وہ میرے پدر

الْحَقِیْ بِأَهْلِكَ فَطَلَّقَهَا وَتَزَوَّجَ مِنْهُمْ  
 أُخْرَى فَلَبِثَ عَنْهُمْ إِبْرَاهِيمُ مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ  
 أَتَهُمْ بَعْدُ فَلَمْ يَجِدْهُ وَدَخَلَ عَلَى امْرَأَةٍ  
 فَسَأَلَهَا عَنْهُ فَقَالَتْ خَرَجَ يَتَغَيُّ لَنَا قَالَ  
 كَيْفَ أَنْتُمْ وَسَأَلَهَا عَنْ عَيْشِهِمْ وَهَيْئَتِهِمْ  
 فَقَالَتْ نَحْنُ بِخَيْرٍ وَسَعَةٍ وَأَنْتَ عَلَى اللَّهِ  
 قَالَ مَا طَعَامُكُمْ قَالَتْ اللَّحْمُ قَالَ فَمَا  
 شَرَابُكُمْ قَالَتْ الْمَاءُ قَالَ اللَّهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ  
 فِي اللَّحْمِ وَالْمَاءِ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
 وَسَلَّمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ يَوْمَئِذٍ حُبٌّ وَلَوْ كَانَ  
 لَهُمْ دَعَا لَهُمْ فِيهِ قَالَ فَهَمَّا لَا يَخْلُو عَلَيْهِمَا  
 أَحَدٌ بِغَيْرِ مَكَّةَ إِلَّا لَمْ يُوَافِقَاهُ قَالَ فَإِذَا جَاءَ  
 زَوْجُكَ فَأَقْرِئْ عَلَيْهِ السَّلَامَ وَمُرِيهِ يُثَبِّتَ  
 عَتَبَةَ بَابِهِ فَلَمَّا جَاءَ إِسْمَاعِيلُ قَالَ هَلْ أَتَكُمْ  
 مَنْ أَحَدٍ قَالَتْ نَعَمْ أَتَانَا شَيْخٌ حَسَنُ الْهَيْئَةِ وَ  
 أَتْنَتْ عَلَيْهِ فَسَأَلْنِي عَنْكَ فَأَخْبَرْتُهُ فَسَأَلْنِي  
 كَيْفَ عَيْشُنَا فَأَخْبَرْتُهُ إِنَّا بِخَيْرٍ قَالَ  
 فَأَوْصَاكَ بِشَيْءٍ قَالَتْ نَعَمْ هُوَ يُقْرِئُ  
 عَلَيْكَ السَّلَامَ وَيَأْمُرُكَ أَنْ تُثَبِّتَ عَتَبَةَ  
 بَابِكَ قَالَ ذَاكَ أَبِي وَأَنْتَ الْعَتَبَةُ أَمَرَنِي  
 أَنْ أُمْسِكَ ثُمَّ لَبِثَ عَنْهُمْ مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ  
 جَاءَ بَعْدَ ذَلِكَ وَاسْمِعِيلُ يَبْرِي نَبْلًا لَهُ  
 تَحْتَ دَوْحَةٍ قَرِيبًا مِنْ زَمْزَمَ فَلَمَّا رَأَاهُ قَامَ  
 إِلَيْهِ فَصَنَعَا كَمَا يَصْنَعُ الْوَالِدُ بِالْوَلَدِ وَالْوَلَدُ  
 بِالْوَالِدِ ثُمَّ قَالَ يَا إِسْمَاعِيلُ إِنَّ اللَّهَ أَمَرَنِي  
 بِأَمْرٍ قَالَ فَاصْنَعْ كَمَا أَمَرَكَ رَبُّكَ قَالَ

بزرگوار تھے اور وہ حکم فرما گئے کہ میں تم سے جدائی اختیار کر لوں، تو اپنے گھر  
 والوں میں چلی جا، چنانچہ اس کو طلاق دے دی، اسی خاندان کی دوسری عورت  
 سے شادی کر لی، پھر عرصہ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آنا نہ ہوا، پھر بعد میں  
 آئے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہیں پایا۔ آپ کی بیوی کے پاس گئے، اور  
 آپ کے متعلق دریافت کیا کہ کہاں ہیں، اس نے کہا تلاش معاش میں گئے ہیں،  
 انھوں نے پوچھا تم لوگ کس طرح رہتے سہتے ہو، اور گذر بسر کا کیا حال ہے،  
 اس نے کہا ہم بعافیت ہیں، اور کشادہ حال ہیں، اس نے خدا کا بڑا شکر ادا کیا،  
 انھوں نے پوچھا تمہارا کھانا کیا ہے، ان سے بتایا گوشت، پوچھا پینا کیا ہے، اس  
 نے کہا پانی، انھوں نے دعا کی اے اللہ! ان کے لئے گوشت اور پانی میں  
 برکت عطا فرما، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس زمانہ میں ان کے یہاں  
 غلہ کا رواج نہ تھا، اگر وہ ہوتا تو اس کے لئے بھی دعا فرما دیتے اور اس دعا کی  
 برکت ہے کہ صرف گوشت پانی کی غذا مکہ کے سوا اور کہیں موافق نہیں آتی،  
 حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چلتے ہوئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اہلیہ  
 سے فرمایا کہ جب تیرے شوہر آجائیں تو ان سے میرا سلام کہنا، اور کہنا کہ  
 دروازہ کی چوکھٹ قائم رکھیں، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام باہر سے واپس  
 آئے انھوں نے بیوی سے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا، اس نے کہا ہاں  
 ایک شیخ صاحب تشریف لائے تھے جن کی ہیئت بہت عمدہ تھی اور ان کی تعریف  
 کی، انھوں نے آپ کے بارے میں مجھ پوچھا میں نے ان کو بتایا کہ آپ کہاں  
 گئے پھر انھوں نے ہمارے گذر بسر کے متعلق سوال کیا، میں نے بتایا کہ بخیر و  
 خوبی سب کچھ چل رہا ہے آپ نے پوچھا کچھ فرما بھی گئے اس نے کہا ہاں وہ  
 آپ کو سلام کہہ گئے اور حکم دے گئے کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ قائم رکھیں،  
 آپ نے فرمایا وہ میرے والد محترم تھے، اور تو چوکھٹ ہے، مجھے حکم دے گئے کہ  
 میں تجھ کو باقی رکھوں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت دنوں جب تک اللہ نے  
 چاہا نہ آئے۔ اس کے بعد تشریف لائے، اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام  
 اپنے لئے ایک، خت کے نیچے تیر بنا رہے تھے، جو زمزم کے قریب تھا، جو نبی  
 آپ علیہ السلام نے دیکھا فوراً لپک کر کھڑے ہو گئے اور دونوں نے باہم



وَتُعَبِّنِي قَالَ وَاعْيُنُكَ قَالَ فَإِنَّ اللَّهَ أَمَرَنِي أَنْ أَبْنِيَ هَهُنَا بَيْتًا وَ أَشَارَ إِلَى أَكْمَةِ مَرْتَفَعَةٍ عَلَى مَا حَوْلَهَا قَالَ فَعِنْدَ ذَلِكَ رَفَعَا الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ فَجَعَلَ اسْمَعِيلُ يَأْتِي بِالْحِجَارَةِ وَ إِبْرَاهِيمُ يَبْنِي حَتَّى إِذَا ارْتَفَعَ الْبِنَاءُ جَاءَ بِهِذَا الْحَجَرِ فَوَضَعَهُ فَقَامَ عَلَيْهِ وَ هُوَ يَبْنِي وَ اسْمَعِيلُ يَنَازِلُهُ الْحِجَارَةَ وَ هُمَا يَقُولَانِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ قَالَ فَجَعَلَا يَبْنِيَانِ حَتَّى يَدُورَ أَحْوَالُ الْبَيْتِ وَ هُمَا يَقُولَانِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ.

(رواه البخاری)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ (۱۲۳۹) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ ذَكَرَ لَيْلَةً أُسْرِيَ بِهِ فَقَالَ مُوسَىٰ أَدُمُ طَوَالَ كَانَهُ مِنْ رِجَالِ شَنْوَاءَةٍ وَ قَالَ عِيسَىٰ جَعْدٌ مَرْبُوعٌ وَ ذَكَرَ مَا لِكَا خَازِنِ النَّارِ وَ ذَكَرَ الدَّجَالَ. (رواه البخاری)

(۱۲۴۰) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ غُرِضْتُ عَلَى الْأُمَمِ وَ رَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيرًا سَدَّ الْأَفَقَ فَقِيلَ هَذَا مُوسَىٰ فِي قَوْمِهِ.

(رواه البخاری)

(۱۲۴۱) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا قَدِمَ الْمَدِينَةَ وَجَدَهُمْ يَصُومُونَ يَوْمًا يَعْنِي يَوْمَ عَاشُورَاءَ فَقَالُوا

اس تعلق و محبت کا اظہار کیا جو بیٹے باپ کیا کرتے ہیں، پھر انھوں نے فرمایا اے اسماعیل! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حکم دیا ہے، آپ نے کہا آپ کر گزریے، جیسا آپ کو آپ کے رب نے فرمایا ہے، انھوں نے فرمایا تم میری اعانت کرو گے، آپ نے عرض کیا میں ضرور آپ کی اعانت کروں گا انھوں نے فرمایا کہ رب العالمین نے مجھے حکم کیا ہے کہ ایک گھر تعمیر کروں اور اس ابھرے ہوئے ٹیلہ کی طرف اشارہ فرمایا، اس کے بعد دونوں باپ بیٹے نے بیت اللہ کی بنیاد اٹھائی، حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو لگاتے جاتے تھے، جب دیوار بلند ہو گئی، تو اس مخصوص پتھر کو لائے اور اس کو رکھ دیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہوئے اور بیت اللہ کی تعمیر کرنے لگے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر دیتے جاتے تھے اور دونوں فرما رہے تھے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. (بخاری شریف)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ

(۱۲۳۹) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ موسیٰ گندم گوں رنگ اور دراز قامت تھے جیسا قبیلہ شنوۃ کے لوگ ہوتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام گھونگر والے بال اور میانہ قد کے تھے اور اس شب کے عجائبات میں آپ نے مالک داروغہ دوزخ اور دجال کے دیکھنے کا بھی ذکر فرمایا۔ (بخاری شریف)

(۱۲۴۰) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور آپ نے فرمایا میرے سامنے تمام امتیں پیش کی گئیں تو میں نے ایک امت اتنی کثیر تعداد میں دیکھی کہ تمام امت اس نے گھیر رکھا تھا۔ اس وقت مجھ کو بتایا گیا یہ موسیٰ علیہ السلام اپنی امت میں ہیں۔

(بخاری شریف)

(۱۲۴۱) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہاں لوگ عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ بہت عظیم الشان دن ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ

علیہ السلام کو نجات عطا فرمائی تھی اور فرعون کو غرق فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام نے شکر کے طور پر اس دن روزہ رکھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا ان سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام سے قریب تر میں ہوں پھر آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (بخاری شریف)

(۱۲۴۲) علی بن رباح رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے عتبہ بن النذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خود سنا ہے وہ بیان کرتے تھے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے ایسا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سورہ ”طس“ تلاوت فرمائی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر پہنچے تو فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پاک دامنی اور اپنی معاش کی خاطر آٹھ یا دس سال کے لیے اپنی خدمات سپرد کر دی تھیں۔

(ابن ماجہ)

(۱۲۴۳) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی ﴿فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ﴾ الخ..... اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا انگوٹھا انگلی کے اوپر کے پورے پر رکھ کر بتایا کہ بس اتنی سی تجلی ہوئی تھی کہ طور پہاڑ زمین میں دھنس گیا تھا۔

(احمد ترمذی)

(۱۲۴۴) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا۔ فرمائیے آپ کا پروردگار کیا سوتا بھی ہے؟ انہوں نے فرمایا ذرا اللہ سے ڈرو۔ اس پر ان کے پروردگار کی طرف سے آواز آئے موسیٰ یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ کا پروردگار سوتا ہے؟ تو تم اپنے دونوں ہاتھوں میں دو شیشے لے لو اور رات بھر کھڑے رہنا۔ موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب تہائی شب گزری تو ان کو اونگھ آئی اور وہ گھٹنوں کے بل گر گئے پھر اٹھ کر سنبھلے یہاں تک کہ جب آخر شب ہوئی تو پھر اونگھے اور دونوں شیشے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ گئے۔ ارشاد ہوا اے موسیٰ اگر کہیں ہم

هَذَا يَوْمٌ عَظِيمٌ وَهُوَ يَوْمٌ نَجَّى اللَّهُ فِيهِ مُوسَى وَاغْرَقَ آلَ فِرْعَوْنَ فَصَامَ مُوسَى شُكْرًا لِلَّهِ فَقَالَ أَنَا أَوْلَى بِمُوسَى مِنْهُمْ فَصَامَهُ وَآمَرَ بِصِيَامِهِ. (رواه البخاری)

(۱۲۴۲) عَنْ عَلِيِّ بْنِ رَبَاعٍ قَالَ سَمِعْتُ عُتْبَةَ بْنَ النَّذْرِ يَقُولُ كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَأَ ”طس“ حَتَّى إِذَا بَلَغَ قِصَّةَ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ إِنَّ مُوسَى أَجَرَ نَفْسَهُ ثَمَانِي سِنِينَ أَوْ عَشْرَةَ عَلَى عِفَّةٍ فَرَجِهِ وَطَعَامِ بَطْنِهِ. (رواه ابن ماجه فى باب استيجار الاجير قال ابن كثير و هذا من هذا الوجه لا يصح لان مسلمة بن على الحسنی)

(۱۲۴۳) عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ ﴿فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا﴾ قَالَ هَكَذَا بِأَصْبَعِهِ وَوَضَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْإِبْهَامَ عَلَى الْمِفْصَلِ الْأَعْلَى مِنَ الْخِنْصَرِ فَسَاخَ الْجَبَلُ. (رواه ابن جرير و رواه احمد و الترمذی و صححه و الحاكم ايضا)

(۱۲۴۴) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ قَالُوا لِمُوسَى هَلْ يَنَامُ رَبُّكَ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ فَنَادَاهُ رَبُّهُ يَا مُوسَى سَأَلُوكَ هَلْ يَنَامُ رَبُّكَ فَخُذْ جَاجَتَيْنِ فِي يَدَيْكَ فَقِمِ اللَّيْلَ فَفَعَلَ مُوسَى فَلَمَّا ذَهَبَ مِنَ اللَّيْلِ ثُلُثُ نَعَسَ فَوَقَعَ لِرُكْبَتَيْهِ ثُمَّ اتَّعَشَ فَضَبَطَهُمَا حَتَّى إِذَا كَانَ آخِرَ اللَّيْلِ نَعَسَ فَسَقَطَتِ الزَّجَاجَتَانِ فَانْكَسَرَتَا فَقَالَ يَا مُوسَى لَوْ كُنْتُ أَنَامُ لَسَقَطَتِ السَّمَوَاتُ وَ



الْأَرْضُ فَهَلَكُنْ كَمَا هَلَكَتِ الزَّجَاجَتَانِ فِي يَدَيْكَ قَالَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرْسَى.

(رواہ ابن ابی حاتم کما فی البدایہ و النہایہ)

(۱۲۴۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مُوسَى كَانَ رَجُلًا

حَيًّا سِتِيرًا لَا يُرَى مِنْ جِلْدِهِ شَيْءٌ اسْتَحْيَاءَ

مِنْهُ فَإِذَا هُوَ مِنْ أَذَاهُ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ فَقَالُوا مَا

يَسْتَوْهَذَا السُّتْرُ إِلَّا مِنْ عَيْبٍ بِجِلْدِهِ إِمَّا

بَرَصٌ وَإِمَّا أَذْرَةٌ وَإِمَّا آفَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ أَرَادَ أَنْ

يُبْرَأَهُ مِمَّا قَالُوا بِمُوسَى فَخَلَا يَوْمًا وَخَدَّهُ

فَوَضَعَ شِيَابَهُ عَلَى الْحَجَرِ ثُمَّ اغْتَسَلَ فَلَمَّا

فَرَغَ أَقْبَلَ إِلَى ثِيَابِهِ لِيَأْخُذَهَا وَأَنَّ الْحَجَرَ

عَدَا بِشُوبِهِ فَأَخَذَ مَرْلَى عَصَاهُ وَطَلَبَ

الْحَجَرَ فَجَعَلَ يَقُولُ ثُوبِي حَجَرٌ ثُوبِي

حَجَرٌ حَتَّى انْتَهَى إِلَى مَلَأَ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ

فَرَأَوْهُ غُرِيَانًا أَحْسَنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ وَابْرَأَهُ مِمَّا

يَقُولُونَ وَقَامَ حَجَرٌ فَأَخَذَ ثُوبَهُ فَلَبَسَهُ وَطَفِقَ

بِالْحَجَرِ ضَرْبًا بِعَصَاهُ فَوَاللَّهِ إِنَّ بِالْحَجَرِ

لِنَدْبًا مِنْ أَثَرِ ضَرْبِهِ ثَلَاثًا أَوْ أَرْبَعًا أَوْ خَمْسًا

فَذَلِكَ قَوْلُهُ تَعَالَى يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا

تَكُونُوا كَالَّذِينَ أَذُوا مُوسَى فَبَرَأَهُ اللَّهُ مِمَّا

قَالُوا وَكَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِبْهًا. (رواہ البخاری)

سوتے تو زمین و آسمان گر کر اسی طرح پاش پاش ہو جاتے جیسے تمہارے ہاتھوں میں یہ دونوں شیشے ہو گئے۔

(ابن ابی حاتم)

(۱۲۴۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام بہت شرمیلے اور پردہ والے شخص تھے حیا

کا اثر یہ تھا کہ ان کے جسم کا کوئی حصہ کھلا ہوا دیکھا نہیں جاسکتا تھا بنی

اسرائیل میں سے جس کو ایذا پہنچانی تھی اس نے آپ کو ایذا پہنچائی اور وہ

کہنے لگے کہ آپ اتنا پردہ اس لیے کرتے ہیں کہ ہونہ ہو آپ کے جسم میں

کوئی نہ کوئی عیب ہے یا برص ہو یا ورم خصیہ یا اسی طرح کی کوئی اور بیماری

اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ آپ کو ان عیوب سے بری کر دے جو وہ لگاتے تھے

چنانچہ ایک دن آپ نے تنہائی میں اپنے کپڑے اتار کر پتھر پر رکھ دیئے پھر

غسل کرنے لگے جب غسل سے فارغ ہوئے کپڑے کی طرف متوجہ ہوئے

کہ اس کو لے کر پہنیں لیکن وہ پتھر کپڑے لے کر بھاگا حضرت موسیٰ علیہ

السلام نے اپنی لاشی اٹھائی اور پتھر سے کپڑے کا مطالبہ کیا اور فرمانے لگے

پتھر میرے کپڑے لاؤ پتھر میرے کپڑے دو اس کا پیچھا کرتے ہوئے بنی

اسرائیل کے ایک مجمع کے پاس پہنچ گئے انہوں نے آپ کو ننگا دیکھا اور ان

تمام عیوب سے پاک جو بنی اسرائیل (برص وغیرہ کا) لگاتے تھے یہاں آ

کر پتھر رک گیا آپ نے اپنے کپڑے لیے اور پہنے اور پھر اپنی لاشی سے

پتھر کو مارنے لگے خدا کی قسم آپ کے ڈنڈے برسانے کی وجہ سے پتھر پر تین

یا چار یا پانچ نشان پڑ گئے اسی کا تذکرہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے یَا

أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ

(بخاری شریف)

(۱۲۴۵) \* پتھر تکوینی طور پر شعوری یا غیر شعوری حرکت پیدا ہو جانی بالکل ممکن ہے۔ پھر جس پتھر سے شعوری حرکات سرزد ہوں اس کو ذی شعور

کی طرح تنبیہ کرنا بھی بالکل معقول ہے اور اس پر نشانات پڑنے میں تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئے کہ جو معاملات

تکوینی ہیں یعنی براہ راست قدرت کے افعال ہیں ان کو بواسطہ اسباب افعال پر قیاس کرنا سخت غلطی ہے آسمان یا زمین اتنے بڑے لفظ.....

(۱۲۴۶) أَخْبَرَنِي سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ قَالَ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ نَوْفًا الْبَكَّانِيَّ يَرَعُمُ أَنَّ مُوسَى لَيْسَ بِمُوسَى بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنَّمَا هُوَ مُوسَى آخَرُ فَقَالَ كَذَبَ عَدُوُّ اللَّهِ حَدَّثَنَا أَبِي بْنُ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَامَ مُوسَى النَّبِيُّ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) خَطِيبًا فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ فَسُئِلَ أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ فَقَالَ أَنَا أَعْلَمُ فَعَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِ إِذَا لَمْ يَرُدُّ الْعِلْمَ إِلَيْهِ فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيْهِ أَنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِي بِمَجْمَعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ قَالَ يَا رَبِّ وَكَيْفَ بِهِ فَقِيلَ لَهُ وَاحْمِلْ حُوتًا فِي مِكْتَلٍ فَإِذَا فَقَدْتَهُ فَهُوَ ثُمَّ فَاَنْطَلَقَ وَانْطَلَقَ بِفَتَاهُ يُوشَعَ بْنِ نُونٍ وَحَمَلَا حُوتًا فِي مِكْتَلٍ حَتَّى كَانَا عِنْدَ الصَّخْرَةِ وَضَعَارُءُ وَسَهْمَا وَنَا مَا فَاَنْسَلَّ الْحَوْتَ مِنَ الْمِكْتَلِ فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا وَكَانَ لِمُوسَى وَفَتَاهُ عَجَبًا فَاَنْطَلَقَا بِقِيَّةٍ لَيْلَتِهِمَا وَيَوْمِهِمَا فَلَمَّا أَصْبَحَ

(۱۲۴۶) سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا کہ نوف بکائی تو یہ کہتے ہیں کہ جن موسیٰ کی سرگزشت خضر علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم میں مذکور ہے وہ بنی اسرائیل والے موسیٰ علیہ السلام نہیں تھے بلکہ کوئی دوسرے موسیٰ ان کے ہم نام شخص تھے اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نوف خدا کے دشمن نے غلط کہا۔ ہم سے ابی بن کعبؓ نے خود بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سامنے کھڑے ہوئے وعظ فرما رہے تھے تو ان سے سوال ہوا فرمائیے انسانوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ سب سے بڑا عالم میں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب ہوا کہ انہوں نے اس بات کا علم خدا تعالیٰ کے حوالے کیوں نہ کیا اس لیے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی (اے موسیٰ) مجمع بحرین میں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی پروردگار پھر اس سے ملاقات کیسے اور کہاں ہو؟ ارشاد ہوا تو یوں کرو کہ ایک زنبیل میں مچھلی اپنے ہمراہ لے لو اور جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے بس وہیں وہ ملے گا، موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمراہ ان کے رفیق یوشع بن نون روانہ ہو گئے اور (حسب ہدایت) اپنے ہمراہ زنبیل میں ایک مچھلی بھی

لے کر .... کرات متحرک ہیں مگر اس میں کسی کو مجال شبہ نہیں۔ یہ قدرت کا بلا واسطہ افعال ہیں پس اگر زمین جیسے بڑے کرہ کو حرکت کرنا ممکن ہے تو صرف ایک پتھر کی حرکت پر تعجب کیوں ہے۔ اصل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام قدرت کے براہ راست ترجمان ہوتے ہیں اس لئے ان کے ماحول میں قدرت کے بہت سے براہ راست کا ظہور ہونا یہ بھی ایک عادتہ اللہ ہے اس لئے یہاں ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾ کی آیت پڑھنا بے محل ہے۔

(۱۲۴۶) \* حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی سرگزشت کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کا تفصیلی تذکرہ خود قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اور جب اس پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام سرگزشت کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دہن مبارک سے نکلا ہوا ایک ذرا سا کلمہ تھا جس کو اگر مخلوق کے دائرہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو سرتا سر صدق ہی صدق نظر آتا ہے۔ یعنی سائل بنی اسرائیل ہیں اور مخاطب نبی وقت موسیٰ علیہ السلام ہیں ادھر محاورات میں صیغہ تفضیل کا مطلقاً کہنا زیادتی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اب اس میں کیا شبہ تھا کہ نبی وقت پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا نبی ان سے بڑھ کر علم میں اور کون شخص ہو سکتا تھا لیکن جب یہی معاملہ رسول اور خالق کے درمیان آیا تو اس صدق در صدق میں بھی خامی کا ایک پہلو نکل آیا اور وہ یہ کہ صیغہ تفضیل عرف عام میں خواہ کسی معنی میں مستعمل ہو لیکن بلحاظ لغت لفظ ....



لے لی چلتے چلتے جب ایک بڑے پتھر کے پاس پہنچے تو اپنا سر رکھ کر وہاں دونوں سو گئے ادھر مچھلی زنبیل سے نکل گئی اور اس طرح سمندر میں داخل ہوئی کہ اس کے داخل ہونے کی جگہ پر سرنگ کی شکل بن گئی اس پر موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفیق کو بعد میں بڑا تعجب ہوا۔ وہ آگے چل پڑے اور جب بقیہ ایک دن رات کی مسافت طے کر چکے اور صبح ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سے کہا لاؤ بھی ذرا ہمارا ناشتہ تو نکالو آج کے سفر میں تو ہم کو کچھ تکان ہو گیا اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو سفر میں تکان محسوس نہیں ہوا تھا اور آج بھی تکان اس وقت محسوس ہوا جب کہ وہ اس جگہ سے آگے نکل چکے تھے جس کا ان کو پتہ دیا گیا تھا ان کے رفیق سفر نے عرض کی جی ہاں جہاں ہم نے پتھر کے پاس آرام کیا تھا مچھلی تو اس جگہ گم ہو گئی تھی مگر مجھ کو آپ سے اس کا ذکر کرنا یاد نہیں رہا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اسی جگہ کی تو ہم کو تلاش تھی آخر پھر اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اسی راستے پر واپس ہوئے جب اس پتھر کے پاس پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص

قال مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِفَتَاهُ إِنَّا غَدَاءُ نَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا وَلَمْ يَجِدْ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَسَامِنَ النَّصَبِ حَتَّى جَاوَرَا مَكَانَ الَّذِي أُمِرَ بِهِ فَقَالَ لَهُ فَتَاهُ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحَوْتَ قَالَ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْعُ فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا فَلَمَّا أَتَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ إِذَا رَجُلٌ مُسَجًى بِثَوْبٍ أَوْ قَالَ تَسَجًى بِثَوْبِهِ فَسَلَّمَ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ الْخَضِرُ وَأَنَا بِأَرْضِكَ السَّلَامُ فَقَالَ أَنَا مُوسَىٰ فَقَالَ مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَنِي إِسْرَائِيلَ قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ

للہ..... اس میں اتنی وسعت اور اطلاق کا لفظ استعمال کرنا ایک نبی کی شان کے مناسب نہ تھا اس لیے جب سوال یہ ہے کہ سب سے بڑا عالم کون ہے تو نبی کی شان کے مطابق جواب یہ ہونا چاہیے کہ اس عموم و اطلاق کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو ہے چونکہ جواب میں ذرا سی خامی رہ گئی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ”أَنَا أَعْلَمُ“ (میں سب سے بڑا عالم ہوں) کا لفظ نکل گیا اس لیے فوراً گرفت ہو گئی اور ارشاد ہوا کیوں نہیں ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اس پر جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کا پتہ دریافت کیا تو ان کے علمی نقصان کا ظہور تو یہیں سے شروع ہو گیا اور اس پہلے قدم پر ہی علم کا اتنا قصور واضح ہوا کہ جب ایسے بڑے علم والے شخص کے مقام کا بھی تم کو علم نہیں تو سوچو تمہارے علم کا مقام کیا ہے؟ پھر جب پتہ بتایا گیا ہو تو وہ بھی ایک ابہام کے ساتھ یعنی یہ کہ جہاں مچھلی گم ہو جائے اب کہاں؟ یہ معلوم نہیں۔ پھر جب سفر شروع ہوتا ہے تو موقع کی تلاش ہے مگر جب موقع سامنے آ جاتا ہے تو وہیں ذہول ہوتا ہے اور سفر کا قدم آگے بڑھ جاتا ہے آخر پھر واپس ہونا پڑتا ہے آخر جب خود کشش ربانی ہی کھینچ کر ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے تو معاہدہ کے وقت جو پہلی بات وہ سنتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو علم مجھ کو ہے وہ تم کو نہیں اور جو تم کو ہے وہ مجھ کو حاصل نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ علمی دنیا میں ہم دونوں ناقص در ناقص ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علمی قصور کی منزل ختم ہوئی تو اب خضر علیہ السلام کے علمی و فور کی منزل شروع ہوئی اور اس کا آغاز بھی ایک پرندہ کی آمد سے اس طرح ہوا کہ اے موسیٰ علیہ السلام ہمارا اور تمہارا دونوں کا علم مل کر بھی کچھ نہیں ہے۔ آخر بڑے عہد و پیمان کے بعد سفر شروع ہوا اور قدم قدم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاعلمی اور حضرت خضر علیہ السلام کے علم کی برتری کا ظہور ہوتا چلا گیا۔ آخر جب واقعات سفر اور ان کے حکم سب بیان میں آ گئے تو کچھ اور عجائبات قدرت کے سننے کی تمنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں رہ گئی اور آپ نے بڑی حسرت کے انداز میں فرمایا کاش کہ موسیٰ علیہ السلام ذرا اور صبر سے کام لیتے۔ للہ.....

اتَّبِعْكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِي مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا  
 قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا يَا مُوسَىٰ  
 عَلَيْهِ السَّلَامُ إِنِّي عَلَىٰ عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللَّهِ  
 عُلِّمْنِيهِ لَا تَعْلَمُهُ أَنْتَ وَ أَنْتَ عَلَىٰ عِلْمٍ  
 عَلَّمَكَ اللَّهُ لَا أَعْلَمُهُ قَالَ سَتَجِدُنِي إِنِ شَاءَ  
 اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا فَاذْطَلَقَا

ہے جو چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سلام کیا۔ اس پر خضر علیہ السلام نے کہا اس ملک میں سلام کہنے والا کہاں۔ انہوں نے فرمایا میں موسیٰ ہوں۔ انہوں نے کہا کیا وہ موسیٰ جو بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے ہیں انہوں نے فرمایا جی ہاں میں وہی موسیٰ ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کیا میں آپ کے ہمراہ رہ سکتا ہوں تاکہ جو علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے وہ آپ مجھ کو بھی تعلیم فرمائیں۔ انہوں نے کہا آپ ہرگز صبر کے ساتھ اس کو حاصل نہیں کر سکتے اے

اللہ..... اس ایک واقعہ ہی سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت کا معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کتنا نازک ہوتا ہے۔ یہاں صغائر و کبائر درکار ہیں یا حسنات میں کسی باریکی کی فروگزاشت بھی کافی ہے۔ ابھی آپ پڑھ چکے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ صلوات اللہ وسلامہ کو جب ختنے کا حکم ہوا اور امتثال امر کی عجلت میں انہوں نے فوراً بسولہ لے کر ختنہ کر ڈالی۔ تو کیا اس سے بڑھ کر بھی وفاداری اور اطاعت شعاری کا مظاہرہ کچھ ہو سکتا تھا، مگر جب انہوں نے اپنی تکلیف کا اظہار فرمایا تو جواب یہ ملا کہ ختنہ کس طرح کرنی چاہیے یہ ہم سے پوچھا کیوں نہیں گویا اب اگر تکلیف ہوئی تو یہ تمہارا قصور ہے۔ سبحان اللہ! جو لوگ گرفت کی اس شدت کو نہیں جانتے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ”رَبِّ السَّجُنِ احْبُ الْيَ“ پر گرفت کا راز بھلا کیا سمجھ سکتے ہیں۔ ادھر ہمارے متکلمین ہیں کہ وہ صرف تعبیرات کی شدت سے انبیاء علیہم السلام کی علی الاطلاق عصمت میں اختلاف کر رہے ہیں۔ اگر ان لغزشوں پر پھر اس کے نتائج پر غور سے نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لغزشیں حکم و اسرار کا ایک بحر بیکراں تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش سب سے پہلے ہے مگر عالم کی آبادی کا سارا راز اسی ایک لغزش میں پنہاں تھا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دہن مبارک سے لغزش کا یہ کلمہ ضرور نکلا اور ان کو اس طویل سفر کی مشقت بھی جھیلی پڑی مگر اس سفر میں کتنے اسرار حکمت کے دریا بہ نکلے اس کا اندازہ کچھ اسی سے فرما لیجئے کہ اس پورے سفر کو قرآن کریم نے کس تفصیل سے بیان کیا ہے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا مزے لے لے کر اس کو سنا آخر جب یہ طویل سفر ختم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بھی اس کی حسرت رہ گئی کاش کہ یہ سفر کچھ اور دراز ہو جاتا تو عجائبات قدرت کچھ اور بھی کھلتے۔

اس سرگزشت میں نہ معلوم کتنے درس عبرت ہوں گے۔ ہم اپنے قصور علم اور وقت کی فرصت کے لحاظ سے چند اہم اسباق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ واقعات کی سطح اور اندرونی حکم ربانی کے درمیان مناسبتوں کا ادراک انسانی عقول کے احاطہ سے باہر ہے اور اسی لیے ان حکمتوں کے ادراک کے درپے ہوئے بغیر صبر کے ساتھ واقعات کا مطالعہ کرنا چاہیے مگر یہی صبر عقول انسانیہ کے لیے بڑا امتحان ہے۔ اسی کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے ﴿عَسَىٰ أَنْ تَحْبُوا شَيْئًا وَ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَ عَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (البقرہ: ۲۱۶) اور یہ کہ خضر علیہ السلام کو جب واقعات و حکم کے اس غیر مدد رک بالعقول ربط کا علم بخشا گیا تھا تو اسی کے ساتھ ان کو وہ قوت بھی عنایت فرمادی گئی تھی جس کی وجہ سے ایک گرنے والی دیوار صرف ان کے ایک اشارہ سے سیدھی ہو گئی بلکہ اتنی مستحکم ہو گئی تھی کہ جب تک اس کے نیچے کے دھینکے کا مالک جو ان نہ ہو لے وہ دیوار نہ گر سکے اور یہ کہ جب تک مصالح ربانیہ کا کسی کو قطعی علم حاصل نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ خود قطعی طور پر ان کا مامور بھی نہ ہو اس وقت تک شریعت میں وہ افعال جرم اور معصیت ہی کی فہرست میں شمار ہوں گے اور یہ کہ تکوینی امور کا راستہ تشریعی احکام سے الگ ہے اور ان کی تعمید کے لیے بھی تشریعی احکام کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بندے مقرر ہیں مگر وہ اتنے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی ان کا علم ضروری نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ ایسے افراد کو قدرت اس لیے عوام للہ.....



موسیٰ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں سے جو علم مجھ کو عطا فرمایا ہے وہ آپ نہیں جانتے اور جو علم آپ کو بخشا ہے وہ میں نہیں جانتا، انہوں نے فرمایا انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر دیکھیں گے اور کسی معاملہ میں آپ کے خلاف نہیں کروں گا۔ اس کے بعد وہ دونوں سمندر کے کنارہ کنارہ روانہ ہو گئے کشتی ان کے پاس نہ تھی کہ دریا عبور کر سکتے۔ آخر ادھر سے ایک کشتی گزری تو انہوں نے اس کے ملاح سے گفتگو کی کہ ان کو بھی سوار کر لے اتفاق سے کسی نے خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور کسی اجرت کے بغیر ان کو کشتی میں بٹھالیا اتنے میں ایک چڑیا اڑتی ہوئی آئی اور آ کر کشتی کے کنارہ بیٹھ گئی اور سمندر میں ایک دو چونچیں ماریں۔ اس پر خضرؑ نے فرمایا اے موسیٰ میرا اور تمہارا علم مل کر بھی اللہ تعالیٰ کے علم سے اتنی نسبت بھی نہیں رکھتا جتنی کہ اس چڑیا کی چونچ کے پانی کی اس سمندر کے ساتھ ہے اس کے بعد حضرت خضر اٹھے اور کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ پھینکا موسیٰ علیہ السلام فوراً بولے۔ یہ وہ شریف لوگ تھے جنہوں نے اجرت لیے بغیر ہم کو کشتی میں بٹھالیا تھا آپ نے یہ کیا کیا کہ لگے تو ان ہی کی کشتی کو توڑ ڈالا تا کہ سارے کشتی والوں کو ڈبودیں انہوں نے کہا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ صبر کے ساتھ میرے ہمراہ نہیں رہ سکتے، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں بھول گیا، اور آپ بھولی بات پر مجھ سے گرفت نہ فرمائیں۔ یہ پہلی بے صبری موسیٰ علیہ السلام سے ازراہ نسیان سرزد ہوئی آگے چلے تو ایک بچہ جو بچوں میں کھیل رہا تھا خضر علیہ السلام نے اس کا سر پکڑ کر گردن سے اکھاڑ ڈالا۔ موسیٰؑ

يَمْشِيَانِ عَلَى سَاعِلِ الْبَحْرِ لَيْسَ لَهُمَا سَفِينَةٌ فَمَا بِهِمَا سَفِينَةٌ فَكَلَّمُوهُمُ أَنْ يَحْمِلُوَهَا فَعَرَفَ الْخَضِرُ فَحَمَلُوَهَا بِغَيْرِ نَوْلٍ فَجَاءَ عُصْفُورٌ فَوَقَعَ عَلَى حَرْفِ السَّفِينَةِ فَتَقَرَّرَ نَقْرَةً أَوْ نَقْرَتَيْنِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَا مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا نَقَصَ عِلْمِي وَ عِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللَّهِ إِلَّا كَنَقْرَةٍ هَذَا الْعُصْفُورُ فِي الْبَحْرِ فَعَمِدَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ إِلَى لَوْحٍ مِنَ الْوَاحِ السَّفِينَةِ فَتَنَزَّعَهُ فَقَالَ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَوْمٌ حَمَلُونَا بِغَيْرِ نَوْلٍ عَمِدَتْ إِلَى سَفِينَتِهِمْ فَخَرَقَتْهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا قَالَ لَا تَوَّءَا خِذْنِي بِمَا نَسِيتُ فَكَانَتْ الْأُولَى مِنْ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ نَسِيَانًا فَأَنْطَلَقَا فَإِذَا غُلَامٌ يَلْعَبُ مَعَ الْغُلَمَانِ فَآخَذَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِرَأْسِهِ مِنْ أَعْلَاهُ فَامْتَلَعَ رَأْسُهُ بِيَدِهِ

ﷺ ..... کی نظروں سے پوشیدہ رکھتی ہے کہ ان کے اس قسم کے افعال شریعت کی زد میں آ کر اختلال نظم کا باعث نہ بنیں اور یہ کہ علم تشریعی کا درجہ علم تکوینی سے بلند ہے اور یہ کہ افضل کو اگر اس قسم کے جزئیات کا علم نہ ہو تو اس سے اس کے فضل و کمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور یہ کہ جن کو ان علوم کا حامل نہیں بنایا گیا ان کے لیے ان علوم کے حاملین کی نہ تلاش چاہیے اور نہ ان کی رفاقت ان کے لیے موجب کمال۔ اور اگر کہیں حسب اتفاق ملاقات ہو جائے تو ان پر زبان طعن کھولنا بھی غلط ہے۔ اس روایت کے چند الفاظ کتاب التفسیر میں بھی دیکھ لیے جائیں۔

﴿فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا﴾ و امسك الله عن الحوت جرية الماء ذمار عليه مثل الطاق.

(دریا میں سرنگ پیدا ہونے کی صورت یہ ہوئی) کہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے داخل ہونے کی جگہ سے پانی کا سیلان روک دیا تو وہاں ایک طاق کی سی شکل پیدا ہو گئی۔

خذنونا ميتا حتى ينفخ فيه الروح.

اے موسیٰ! ایک مردہ مچھلی ساتھ لے لو یہاں تک کہ اس میں روح پڑ جائے۔ ﷺ .....

فَقَالَ مُوسَى أَقْتُلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ  
قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ  
صَبْرًا قَالَ ابْنُ عِيْنَةَ وَ هَذَا أَوْ كَذْفًا نَطْلَقًا  
حَتَّى إِذَا آتَى أَهْلَ قَرْيَةٍ نِ اسْتَطَعَمَا أَهْلَهَا  
فَابَوَا أَنْ يُضَيَّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ  
أَنْ يَنْقُضَ فَاقَامَهُ قَالَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ  
بِيَدِهِ فَاقَامَهُ فَقَالَ لَهُ مُوسَى لَوْ شِئْتَ لَا  
تَخَذْتُ عَلَيْهِ أَجْرًا قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَ  
بَيْنِكَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
يَرْحَمُ اللَّهُ مُوسَى لَوَدِدْنَا لَوْ صَبَرَ حَتَّى يَقْضَى  
عَلَيْنَا مِنْ أَمْرِهِمَا. (رواه البخاری)

(۱۲۳۷) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ نَوْفَلٍ  
إِنَّ قَارُونَ كَانَ يُودِي مُوسَى وَ كَانَ ابْنُ  
عَمِّهِ فَبَلَغَ مِنْ أَذَاهُ إِيَّاهُ أَنْ قَالَ لِامْرَأَةٍ بَغِيٍّ  
إِذَا اجْتَمَعَ النَّاسُ عِنْدِي غَدًا فَتَعَالَى وَ قُولِي  
إِنَّ مُوسَى رَاوَدَنِي عَنْ نَفْسِي فَلَمَّا كَانَ

نے فرمایا۔ آپ نے یہ کیا کیا ایک معصوم بچہ کو بے گناہ مار ڈالا۔ خضرؑ نے کہا میں  
نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا آپ صبر کے ساتھ میرے ہمراہ نہیں رہ سکتے۔  
ابن عیینہ راوی حدیث کہتے ہیں یہاں لفظ ”لک“ (آپ سے) زیادہ تاکید  
کے لیے اضافہ فرمایا۔ آگے چلے تو ایک بستی سے گزرے اور ان سے مہمانی کی  
درخواست کی۔ انہوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ وہاں ایک دیوار تھی جو  
بالکل ٹوٹنے والی تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ کے ایک اشارے  
سے اس کو سیدھا کر دیا۔ موسیٰ نے فرمایا اگر آپ چاہتے تو اس کی اجرت ان سے  
لے سکتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا اچھا بس اس کے بعد اب ہماری  
آپ کی جدائی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ  
السلام پر رحم فرمائے ہماری تمنا تھی کاش کہ موسیٰ علیہ السلام ذرا اور صبر کر لیتے تاکہ  
ان کے کچھ واقعات ہم کو اور معلوم ہو جاتے۔ (بخاری شریف)

(۱۲۳۷) عبد اللہ بن الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ قارون  
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی تھا اور ہمیشہ ان کے درپے آزار رہا  
کرتا تھا اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے ایک زانیہ عورت کو فہمائش کی  
کہ لوگ جب کل میرے پاس جمع ہوں تو تو یہ کہنا کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے  
مائل کرنا چاہا میرے قلب کو چنانچہ جب کل ہوئی اور لوگ جمع ہو گئے تو وہ آئی

للہ ..... قال اما يكفيك ان التورات بيدك و ان الوحى ياتيك يا موسى ان لى علما لا ينبغي لك ان  
تعلمه و ان لك علما .

(خضر علیہ السلام نے کہا) اے موسیٰ! کیا تم کو یہ تورات کافی نہیں۔ جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اور کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ  
وحی الہی تم پر آتی ہے۔ اے موسیٰ! مجھ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا علم بخشا ہے جو آپ کے لیے مناسب نہیں اور آپ کو وہ علم دیا ہے جو  
میرے لیے مناسب نہیں۔

لا ينبغي لى ان اعلمه. و فى اصل الصخرة عين يقال له الحياة لا يصيب من مائها شىء الا حى فاصاب الحوت  
من ماء تلك العين قال فتحرك و انسل من المکتل فدخل البحر .

درخت کی جڑ میں ایک چشمہ تھا جس کو آب حیات کہتے ہیں۔ اس کا پانی جس چیز کو لگ جاتا وہ زندہ ہو جاتی تھی۔ وہ پانی کسی طرح  
اس مچھلی پر بھی پڑ گیا تو وہ زندہ ہو گئی تھی۔

واقعہ مذکورہ کے بعض مجمل الفاظ کی شرح اس تشریح کی روشنی میں سمجھ لینی چاہیے۔



الْعَدُوّاجْتَمَعَ النَّاسُ جَاءَتْ فَسَارَتْ قَارُونُ  
ثُمَّ قَالَتْ لِلنَّاسِ إِنَّ قَارُونَ قَالَ لِي كَذَا وَ  
كَذَا وَإِنَّ مُوسَى لَمْ يَقُلْ لِي شَيْئًا مِنْ هَذَا  
فَبَلَغَ ذَلِكَ مُوسَى عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَ  
هُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمَحْرَابِ فَخَرَّ سَاجِدًا  
فَقَالَ أَيُّ رَبِّ أَنْ قَارُونَ قَدْ أَذَانِي وَفَعَلَ وَ  
فَعَلَ وَبَلَغَ مِنْ أَذَاهُ أَيَّامًا أَنْ قَالَ مَا قَالَ  
فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَى مُوسَى أَنْ يَا مُوسَى إِنِّي قَدْ  
أَمَرْتُ الْأَرْضَ أَنْ تُطِيعَكَ وَكَانَ لِقَارُونَ  
غُرْفَةٌ قَدْ ضَرَبَ عَلَيْهَا صَفَائِحَ الذَّهَبِ فَاتَاهُ  
مُوسَى وَجَلَسَاوَهُ فَقَالَ لِقَارُونَ قَدْ بَلَغَ مِنْ  
إِذَاكَ أَنْ قُلْتَ كَذَا وَكَذَا يَا أَرْضُ خُذِيهِمْ  
فَاخْذِيهِمُ الْأَرْضُ إِلَى كَعْبِهِمْ فَهَتَفُوا يَا  
مُوسَى أَدْعُ لَنَا رَبَّكَ أَنْ يُنْجِنَا مِمَّا نَحْنُ  
فِيهِ فَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَّبِعَكَ فَقَالَ  
خُذِيهِمْ فَاخْذِيهِمْ إِلَى أَنْصَافِ سَوْقِهِمْ  
فَهَتَفُوا وَقَالُوا يَا مُوسَى أَدْعُ لَنَا رَبَّكَ أَنْ  
يُنْجِنَا مِمَّا نَحْنُ فِيهِ فَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَّبِعَكَ  
وَنُطِيعَكَ فَقَالَ يَا أَرْضُ خُذِيهِمْ إِلَى  
رُكْبِهِمْ فَلَمْ يَزَلْ يَقُولُ يَا أَرْضُ خُذِيهِمْ حَتَّى  
تَطَائَفَتْ عَلَيْهِمْ وَهُمْ يَهْتَفُونَ فَأَوْحَى اللَّهُ  
إِلَيْهِ يَا مُوسَى مَا أَفْظَكَ أَمَا أَنْتُمْ لَوْ كَانُوا  
إِيَّايَ دَعَوْا لَخَلَّصْتُهُمْ (رواه عبد الرزاق كما

اور قارون سے چپکے سے اس نے کوئی بات کہی۔ پھر لوگوں کو مخاطب کر کے  
بولی۔ اس قارون نے ہی مجھ کو موسیٰ علیہ السلام کے سرائیکی ایسی بات لگانے  
کے لیے کہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان باتوں میں سے کوئی حرف مجھ سے  
نہیں فرمایا۔ یہ خبر موسیٰ علیہ السلام کو بھی ہو گئی وہ اس وقت محراب میں کھڑے  
نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ سن کر سجدہ میں گر گئے اور فرمایا پروردگار قارون نے  
مجھ کو بڑی تکلیفیں دیں اور جو کچھ اس نے کیا وہ کیا یہاں تک کہ اب اس کے  
تہمت لگانے کی نوبت بھی آ گئی۔ اسی وقت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی۔  
میں نے زمین کو حکم دے دیا ہے تم اس سے جو کہو گے وہ تمہاری تابعداری  
کرے گی۔ قارون ایک بالاخانہ میں رہتا تھا جس میں اس نے سونے کے  
پتر چڑھا رکھے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے۔ اس  
وقت قارون کے احباب بھی وہاں موجود تھے اور فرمایا کہ تیری ایذاؤں کی  
اب یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ تو نے اس قسم کے کلمات بھی کہے۔ اے  
زمین تو ان کو پکڑ لے زمین نے فوراً گٹھنوں تک ان کو ہضم کر لیا۔ اس پر وہ چیخ  
پڑے۔ موسیٰ (علیہ السلام)! اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہم کو اس  
عذاب سے نجات بخش دے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے آپ کے  
ساتھ ہو جائیں گے اور آپ کے تابعدار بن جائیں گے مگر موسیٰ علیہ السلام  
نے زمین سے پھر یہی فرمایا ان کو اور گٹھنوں تک پکڑ لے موسیٰ علیہ السلام  
زمین سے برابر یونہی فرماتے رہے حتیٰ کہ زمین اوپر سے مل گئی اور وہ اس  
کے اندر چبختے کے چبختے ہی دھستے چلے گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف  
سے موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی آئی۔ موسیٰ (علیہ السلام)! تم کتنے تیز  
مزاج ہو، خوب سن لو اگر کہیں مجھ کو وہ ایک بار بھی پکارتے تو میں ان کو نجات  
دے دیتا۔

(درمنثور۔ الصارم المسلول)

افی الصارم المسلول ص ۴۱۰ و اخرج ابن ابی شیبۃ فی المصنف و ابن المنذر و ابن ابی حاتم و الحاکم نحوہ و  
صححہ کما فی الدر المنثور من قصۃ قارون ج ۵ ص ۱۳۶

(۱۲۳۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُؤْنَسُ رَفَعُ هَذَا الْحَدِيثِ إِلَى  
(۱۲۳۸) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ پہلے ملک  
الموت وفات کے وقت آمنے سامنے آیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ

النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ مَلَكُ  
الْمَوْتِ يَأْتِي النَّاسَ عَيَانًا قَالَ فَاتَى مُوسَى  
عَلَيْهِ السَّلَامُ فَلَطَمَهُ فَفَقَّاعَيْنُهُ وَفِي آخِرِهِ فَرَدَّ  
اللَّهُ عَلَيْهِ عَيْنَهُ وَكَانَ يَأْتِي النَّاسَ خُفْيَةً.

جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انہوں نے ان کے تھپڑ مارا اور ان کی آنکھ پھوٹ گئی۔ پھر پورا واقعہ ذکر فرمایا۔ اس کے بعد دستور یہ ہو گیا کہ وہ پوشیدہ طور پر آنے لگے۔

(مسند احمد)

(رواہ احمد و رفعہ ابن جریر ایضاً کما فی البدایہ و النہایہ)

### حضرت داؤد علیہ السلام

### سیدنا داؤد علیہ السلام

(۱۲۴۹) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ قَالَ  
سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
يَقُولُ كَانَ لِدَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ اللَّيْلِ سَاعَةٌ  
يُوقِظُ فِيهَا أَهْلَهَا يَقُولُ يَا آلَ دَاوُدَ قُومُوا فَصَلُّوا  
فَإِنَّ هَذِهِ سَاعَةٌ يَسْجُبُ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ فِيهَا  
الدُّعَاءَ إِلَّا بِسَاحِرٍ أَوْ عَشَّارٍ. (رواہ احمد)

(۱۲۴۹) عثمان بن ابی العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ شب میں ایک وقت تھا جب کہ داؤد علیہ السلام اس وقت پر اپنے اہل کو بیدار کر دیتے اور یہ فرماتے جاتے تھے اے آل داؤد اٹھو اور نماز پڑھو کیونکہ یہ ایسا مقبول وقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ سب کی دعائیں قبول فرماتا ہے سوائے جادوگر اور عشر وصول کرنے والے شخص کے۔ (احمد)

(۱۲۵۰) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبُّ  
الصَّلَاةِ إِلَى اللَّهِ صَلَاةُ دَاوُدَ وَ أَحَبُّ الصَّيَامِ  
إِلَى اللَّهِ صِيَامُ دَاوُدَ كَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَ  
يَقُومُ ثُلُثَهُ وَ يَنَامُ سُدُسَهُ وَ يَصُومُ يَوْمًا وَ  
يُفْطِرُ يَوْمًا. (متفق علیہ) و قد ذکرہ البخاری  
أطول من هذا فی کتاب الانبیاء.

(۱۲۵۰) عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نمازوں میں سب سے پیاری نماز اور روزوں میں سب سے پیارے روزے اللہ کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز اور ان کے روزے تھے۔ نماز کے معاملہ میں ان کا دستور یہ تھا کہ نصف شب سوتے پھر تہائی شب خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے اور آخر کے چھٹے حصہ میں پھر آرام فرماتے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔

(متفق علیہ)

(۱۲۴۹) \* آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع شریعت میں انبیاء سابقین کے درخشاں عمل چن چن کر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ آپ نے رات کی اس ساعت میں جو تہجد کے وقت اپنی ساری امت کو نماز کی تاکید فرمائی ہے پس جس امت کو انبیاء علیہم السلام کے اعمال حسنہ کی تعلیم دی گئی ہو اس کے کمالات کا اندازہ کر لینا چاہیے۔

خدائی محاسبہ بھی کیسا خوفناک مرحلہ ہے کہ جس ساعت میں دعاء کی قبولیت کا عام اعلان ہے وہاں بھی ان اشخاص کے لیے ناامیدی ہی نظر آتی ہے جن کی بد اعمالی خلق اللہ کے لیے موجب اذیت ہو ایک ساحر اور دوسرا سرکاری عشر وصول کرنے والا۔

(۱۲۵۰) \* اس صورت سے تمام حقوق کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ خالق کے حقوق تو کون ادا کر سکتا ہے مگر یہ اس کی رحمت ہے کہ بندہ کے تھوڑے سے عمل کو قبول فرما لیتا ہے جب کہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی بھی ہوتی رہے۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم و لہجہ.....



(۱۲۵۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُفِّفَ عَنْ دَاوُدَ الْقُرْآنُ فَكَانَ يَأْمُرُ بِدَوَابِّهِ فَتُسْرَجُ فَيَقْرَأُ الْقُرْآنَ قَبْلَ أَنْ تُسْرَجَ دَاوُبُّهُ وَلَا يَأْكُلُ إِلَّا مِنْ عَمَلٍ يَدِيهِ. (رواه البخاری)

### سیدنا سلیمان علیہ السلام

(۱۲۵۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتْ امْرَأَةٌ تَانِ مَعَهُمَا ابْنَاهُمَا جَاءَ الذُّنْبُ فَذَهَبَ بِأَبْنٍ أَحَدَهُمَا فَقَالَتْ صَاحِبَتُهَا إِنَّمَا ذَهَبَ بِأَبْنِكَ وَقَالَتِ الْآخَرَى إِنَّمَا ذَهَبَ بِأَبْنِكَ فَتَحَا كَمَنَا إِلَى دَاوُدَ فَقَضَى بِهِ لِلْكُبْرَى فَخَرَجَتَا عَلَى سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ فَأَخْبَرَتْهُ فَقَالَ اتُّوْنِي بِالسَّكِينِ أَشَقُّهُ بَيْنَكُمَا فَقَالَتِ الصُّغْرَى لَا تَفْعَلْ يَرْحَمُكَ اللَّهُ هُوَ إِنُّهَا فَقَضَى بِهِ لِلصُّغْرَى.

(متفق علیہ)

(۱۲۵۱) ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کے لیے زبور کے ترانے اتنے ہلکے اور خفیف کر دیئے گئے تھے کہ وہ اپنی سواری تیار کرنے کا حکم دیتے ادھر اس پر زین کسی جاتی ادھر زین کسے سے پہلے پہلے یہ زبور پڑھ کر فارغ ہو جاتے۔ ان میں بڑی خاص بات یہ تھی کہ صرف اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

### حضرت سلیمان علیہ السلام

(۱۲۵۲) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے بیان فرمایا کہ دو عورتیں تھیں ان کے ساتھ ان کے دو بچے تھے۔ بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک کا بچہ لے گیا۔ اس پر اس کی ساتھی بولی کہ تیرے بچہ کو لے گیا ہے دوسری نے کہا نہیں تیرے کو لے گیا ہے۔ یہ دونوں اپنا معاملہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس لے کر آئیں انہوں نے (روندہ مقدمہ سن کر) بڑی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس کے بعد پھر وہ دونوں سلیمان بن داؤد کی طرف چلیں اور ان دونوں نے پھر یہاں اپنا معاملہ بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا اچھا لاؤ چھری لاؤ میں اس لڑکے کو کاٹ کر آدھا آدھا تم دونوں کو دیئے دیتا ہوں۔ یہ سن کر چھوٹی بول پڑی۔ خدا تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے دیکھئے ایسا نہ کیجئے چلئے یہ لڑکا اسی کا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر انہوں نے فیصلہ دے دیا کہ لڑکا چھوٹی کو دے دیا جائے۔ (متفق علیہ)

اللہ..... جان بھی خدائی امانت ہیں اور ان کے بھی ہمارے ذمہ کچھ حقوق ہیں۔ کمال یہ ہے کہ جملہ اہل حقوق کے علیحدہ علیحدہ اداء ہوں۔ (۱۲۵۱) \* قدرت کے یہاں ایک باب طی زمان کا بھی ہے یعنی بہت سائل تھوڑے سے وقت میں ہو جانا سلف امت کے اعمال پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو اس حقیقت کا لاچار اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اگر قدرت کی طاقت کی ترازو لگانے والے ذرا غور کریں تو ان کو اس کے سمجھنے میں نہ کوئی دشواری ہو اور نہ شب معراج کے طویل سفر کے سمجھنے میں کوئی دقت رہے۔

(۱۲۵۲) \* اس روایت میں اس کی کوئی تفصیل نہیں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ کس بنیاد پر تھا۔ لہذا اس پر بحث کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت سلیمان کے فیصلہ کے تفصیلات بھی یہاں بیان میں نہیں آئیں۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ مبہم ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ شکل اس لیے اختیار کی تھی کہ کسی تدبیر سے اصل واقعہ کا انکشاف ہو جائے۔ ان کی اس غیر معمولی فہم کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے: ﴿فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا﴾ (الانبیاء: ۷۹)

## سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ کی ایک اہم سرگزشت کے متعلق

چند جدید علمی اور منصفانہ نکات قرآن و حدیث اور تاریخ کی روشنی میں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی بڑی علامت ہے اس لئے اس کو عالم کے تعمیری نظم و نسق کی بجائے تخریب عالم کے نظم و نسق پر قیاس کرنا چاہیے \* حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حیات طیبہ میں رفع و نزول کی سرگزشت بیشک عجیب تر ہے لیکن اس پر غور کرنے سے قبل سب سے پہلے یہ سوال سامنے رکھنا چاہئے کہ یہ مسئلہ کس دور اور کس شخصیت کے ساتھ متعلق ہے کیونکہ دنیا کے روزمرہ معمولی واقعات بھی زمانہ اور شخصیتوں کے اختلاف سے بہت مختلف ہو جاتے ہیں اور ان کی تصدیق و تکذیب میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی زمین پر ایک خطہ زمین ایسا بھی ہے جہاں مہینوں کی رات اور مہینوں کا دن ہوتا ہے اور ان ہی سمندروں میں ایک سمندر ایسا بھی ہے جس پر مسافر موسم سرما میں خشکی کی طرح سواریوں پر چلتے ہیں اسی طرح انسانوں کا اختلاف بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ شجاعت و طاقت اور دانائی و فرزانگی کے وہ بعید سے بعید کارنامے جو ستم و اسفند یا رانور بے اور ہٹلر، اسٹالن اور لینن وغیرہ کے حق میں بے تامل قابل تصدیق سمجھتے جاتے ہیں وہ عام انسانوں کے حق میں بڑے تامل کے بعد بھی بمشکل قابل تصدیق ہو سکتے ہیں۔ پس صرف عام انسانوں کے حالات کے لحاظ سے یا صرف اپنے دور اور اپنے زمانہ کے حالات پر قیاس کر کے کسی صحیح واقعہ کا انکار کر دینا کوئی معقول طریقہ نہیں ہے۔

لہذا مسئلہ نزول پر بحث کرنے کے وقت بھی سب سے پہلے اس پر غور کر لینا ضروری ہے کہ یہ واقعہ کس دور اور کس زمانہ سے پھر کس شخصیت سے متعلق ہے۔

جب آپ ان دو سوالوں پر محققانہ نظر ڈالیں گے تو پوری وضاحت سے ثابت ہوگا کہ یہ واقعہ تخریب عالم یعنی قیامت کے واقعات کی ایک کڑی ہے اور تخریب عالم کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو عالم کے تعمیری دور کے واقعات سے ملتا جلتا ہو۔ پس اگر تخریب عالم کے وہ سب واقعات جو تعمیری دنیا کے بعد کے واقعات سے مختلف ہونے کے باوجود قابل تصدیق ہیں تو پھر اس ایک واقعہ کی تصدیق میں آپ کو تامل کیوں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اور اس کی تخریب کے دونوں واقعات اتنے عجائبات پر مشتمل ہیں کہ جو انسان ان دونوں جانبوں سے غائب ہے وہ بے چارہ اپنے موجودہ حالات کی دنیا دیکھ کر ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ عالم کی تخلیق کے واقعات پر ذرا نظر ڈالیں، زمین کس طرح بنائی گئی، پھر کس طرح بچھائی گئی، آسمان کس طرح بنائے گئے آدم کس طرح پیدا ہوئے ان کا جوڑا کس طرح پیدا ہوا پھر کس طرح خلافت ارضی قائم ہوئی اسی طرح بہت سے واقعات ہیں جو ایک سے ایک عجیب تر ہیں اور ان سب ہی کے بیان کی ذمہ داری خود قرآن کریم نے اپنے سر رکھی ہے اگر آپ ان میں سے ایک واقعہ بھی عالم کے تعمیری دور کے نظم و نسق سے ملا کر دیکھیں تو آپ کو ان میں سے ایک واقعہ کے فہم میں بھی سخت الجھن پیش آئے گی اور اسی بنا پر ایک جماعت نے تو سرے



سے تخلیق عالم ہی کا انکار کر کے قدم عالم کا راستہ لے لیا ہے مگر آپ کے نزدیک کیا اس کا یہ طریقہ کار صحیح ہے؟

اسی طرح جب آپ تخریب عالم کے واقعات پر نظر ڈالیں گے تو وہ بھی عجیب در عجیب ہی نظر آتے ہیں یعنی کبھی نہ پھٹنے والے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے آفتاب و ماہتاب اور یہ تمام روشن ستارے بے نور ہو کر گر پڑیں گے اور کبھی جنہش نہ کرنے والے یہ بڑے بڑے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے نظر آئیں گے اور یہ سارا کاسارا عالم ہستی عدم محض اور صرف نیستی کے تحت آ جائے گا۔ یہ اور ان جیسے اور بہت سے عقل سے بالاتر واقعات کے بیان کی ذمہ داری بھی خود قرآن کریم ہی نے اٹھائی ہے اب اگر آپ ان کی تصدیق کا فیصلہ موجودہ عالم کے واقعات کے پیش نظر کرنے بیٹھ جائیں تو کیا آپ کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں گے لیکن ہاں جب آپ عالم کی تخلیف اور اس کی تخریب کے دونوں سرے ملا کر دیکھیں گے تو دونوں آپ کو بالکل یکساں صورت میں نظر آئیں گے۔

پس چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ بھی عالم کے درمیانی واقعات کا مسئلہ نہیں بلکہ تخریب عالم کے واقعات کی ایک اہم کڑی ہے اس لئے اپنی جگہ وہ بھی معقول ہے ظاہر ہے کہ جب تمام مردوں کے زندہ ہو کر ایک میدان میں جمع ہونے کا زمانہ قریب آ رہا ہو تو اس سے ذرا قبل صرف ایک زندہ انسان کا آسمانوں سے زمین پر آنا کونسی بڑی بات ہے۔ بلکہ اس طویل گمشدگی کے بعد یہ جسمانی نزول مجموعہ عالم انسانی کے جسمانی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک بدیہی اور محکم برہان ہے اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں ارشاد ہے۔ (اِنَّهُ لَعَلُّمُ السَّاعَةِ) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک مجسم علامت ہیں درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ اور حسنؓ اور قتادہؓ سے منقول ہے کہ اس آیت کا مصداق قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری ہے۔

اس کے بعد جب آپ اس پر غور کریں گے کہ یہ پیشگوئی ہے کسی شخصیت کے متعلق وہ شخصیت کسی عام بشری سنت کے تحت کوئی بشر ہے یا ان سے کچھ الگ ہے تو آپ کو یہی ثابت ہو گا کہ وہ صرف عام انسانوں ہی سے نہیں بلکہ جملہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی سب سے الگ اور سب سے ممتاز خلقت کا بشر ہے جتنے انسان ہیں وہ سب مذکر و مؤنث کی دو صنفوں سے پیدا ہوئے ہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے انسان ہیں جن کی تخلیق صرف ایک صنف انسانی سے وجود میں آئی ہے پھر اس میں میں تمثیل جبریلی اور فحی ملکی اور تکلم فی المہد کے واقعات اور بھی عجیب تر ہیں۔ اُن کے معجزات دیکھئے تو وہ بھی کچھ نزالی شان رکھتے ہیں ان میں سے ہر معجزہ ایسا ہے جس میں ”باذن اللہ“ کی قید لگانی پڑتی ہے ان کے گزشتہ دور حیات میں ملکیت کا اتنا غلبہ ہے کہ کھانے پینے رہنے سہنے شادی و نکاح کا کوئی نظم و نسق ہی نہیں ملتا یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ ان سب ضروریات سے منزہ و مبرا سچ مچ کے ایک فرشتہ ہیں پھر جب ان کی ہجرت کا مرحلہ سامنے آتا ہے تو یہاں بھی اُن کی شان سب سے نزالی نظر آتی ہے یعنی ان کی ہجرت کسی خطہ ارضی کی بجائے اُس عالم کی طرف ہوتی ہے جو ملکوت اور ارواح کا مستقر ہے غرض اُن کی حیات کے جس گوشہ پر نظر ڈالئے وہ ملکوتیہ کا ایک مرقعہ نظر آتا ہے۔ یہاں قرآن کریم نے جو لقب اُن کو عطا فرمایا ہے وہ بھی سب سے ممتاز ہے اور اس نوع کا لقب ہے جس سے کہ اُن کی زندگی کی یہ سب خصوصیات اجمالی طور پر بیک نظر سامنے آ جاتی ہیں یعنی ”روح اللہ“ اور

”کلمۃ اللہ“ گو بنی آدم جتنے بھی ہیں اُن سب کی روحیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف اور اسی کے حکم کن سے آئی ہیں مگر یہاں اس روح کی آمد میں کوئی ظاہری واسطہ بھی نہ تھا اور جو واسطہ تھا وہ ایسا ہی تھا جس کے موجود ہونے سے عالم قدس کی طرف اُن کی نسبت میں کوئی فرق نہیں پڑتا یہ تمام کا تمام وہ تذکرہ حیات ہے جو اُن کے آسمانوں پر جانے سے قبل سے متعلق ہے اب آپ نازل ہونے کے بعد اُن کے حالات پر نظر ڈالئے تو وہ پہلی زندگی کے بالکل برعکس ہیں یہاں اُن کے تمام معاملات میں دنیا کا مرتب نظم و نسق ملتا ہے حتیٰ کہ نکاح و ولادت کا بھی اور اس سے بھی بڑھ کر اُن کی حیثیت ایک امام دامیر کی ثابت ہوتی ہے گویا وہ انسانوں میں بھی کوئی معمولی طبقہ کے انسان نہیں بلکہ اس اعلیٰ طبقہ کے انسان ہیں جن کی قیادت میں اسفل طبقہ کے انسان ترقی کر کے اعلیٰ طبقہ کے انسان بن سکتے ہیں۔ غرض ان کی حیات کے یہ دو دور تمام تر قدرت کے ان عجائبات سے مشابہ ہیں جو عالم میں دست قدرت کے براہ راست پیدا کردہ ہیں وہ بیک وقت بن باپ پیدا ہو کر آغاز عالم کے واقعات میں حضرت آدم علیہ السلام کے مشابہ ہیں (إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ) اور اتنی طویل غیبت کے بعد عالم کے خاتمہ پر جسمانی نزول فرما کر علامات قیامت میں بھی شمار ہیں (وَإِنَّهُ لَعَلَّمُ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا) اگر ایک طرف اپنی پہلی حیات میں آسمانوں پر جا کر وہ فرشتوں سے مشابہ ہیں تو دوسری طرف نزول کے بعد موت اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں مدفون ہو کر عام انسانوں کی صف میں بھی داخل ہیں۔ اگر پہلی زندگی میں اُن کا معجزہ احیاء ہوتی ہے تو نزول کے بعد دوسرے دور حیات میں امانۃ دجال یعنی قتل دجال ہے۔ ان کی یہ تمام سوانح حیات قرآن کی بیان کردہ ہے۔ چنانچہ سورہ نساء آیت ﴿وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنُوا بِهِ﴾ آئندہ اُن کی وفات اُن کے نزول کی شاہد ہے جیسا کہ آئندہ اس کی تشریح آئے گی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک انسان کا آسمانوں پر زندہ جانا اور زندہ رہنا اور آخر زمانہ میں پھر اسی جسم عنصری کے ساتھ اتر آنا عام انسانوں کی سنت ہے اور نہ زمانہ کے عام واقعات کے موافق ہے لیکن اگر آپ یہ دو باتیں ملحوظ رکھیں کہ یہ مسئلہ تخریب عالم کا ایک مقدمہ ہے اور ہے بھی اس شخصیت کے متعلق جس کے دیگر حالات زندگی بھی عالم کے عام دستور کے موافق نہیں تو پھر بنظر انصاف اس میں آپ کو کوئی تردد نہ ہونا چاہیے۔ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام سے تشبیہ دے کر یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کی ہستی کو عالم کے درمیانی سلسلہ پر قیاس کرنا صحیح نہیں اگر اُن کے حالات کو قیاس کرنا ہی ہے تو تخلیق عالم کے حالات پر قیاس کر کے دیکھو تمہارا سب تعجب جاتا رہے گا۔

اصل یہ ہے کہ مادی عقول کے نزدیک کچھ یہی ایک مسئلہ نہیں ہے جو زیر انکار آ رہا ہو بلکہ عالم غیب کے تمام حقائق ہی زیر انکار ہیں۔ اور درحقیقت یہ عقل و نقل کی اصولی جنگ کا ثمرہ ہے ارباب عقل یہ سمجھتے ہیں کہ اخبار انبیاء علیہم السلام سب خلاف عقل ہوتے ہیں اور اصحاب نقل یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات بھی عقلی ہو وہ سب شریعت کے خلاف ہوتی ہے۔ یہ نزاع وجدل درحقیقت عقل و شرع کا صحیح مفہوم متعین نہ کرنے سے پیدا ہو رہا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: کون نہیں جانتا کہ قرآن و سنت نے جا بجا عقل کی تعریف فرمائی ہے بلکہ اپنی دعوت کا مخاطب ہی صرف اہل فہم اور اہل عقل کو قرار دیا ہے۔ مجنون اور بچے اس کی دعوت کے احاطہ سے ہی باہر ہیں لیکن جب بعض اہل بدعت نے



بعض کلامی مسائل کو جو دراصل قرآن و سنت کے بھی خلافت تھے اصول دین میں داخل کر دیا اور اس کا نام عقلیات رکھا تو اب اہل شرع کو عقلیات کے نام ہی سے ایسی نفرت پیدا ہو گئی کہ جو شخص بھی عقلی استدلال کرتا نظر آتا اُن کے نزدیک بدعتی اور باطل پرست سمجھا جاتا دوسری طرف جب عقلاء نے اہل شرع سے وہ مسائل سنے جو صریح عقل اور یقینی تاریخ کے خلاف تھے اُس پر ان کا یہ دعویٰ سنا کہ وہ قرآن و حدیث کے بیان کردہ ہیں تو ان کے دلوں میں نفس قرآن و سنت ہی کے متعلق خلاف عقل ہونے کی بدگمانی بیٹھ گئی حتیٰ کہ اب جو قرآن و سنت سے استدلال کرتا اُن کے نزدیک قانون فطرت اور تقاضہ عقل کا مخالف ہوتا۔ یہاں غلطی دونوں فریق کی ہے۔ عقلاء کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے تحقیق کئے بغیر ہر خلاف عقل بات کا نام شرع کیوں رکھ دیا اور علماء کی کوتاہی یہ ہے کہ انہوں نے جو عقل صحیح کا تقاضہ نہ تھا اس کو شرع کے مفہوم میں کیسے داخل کر دیا حالانکہ شریعت کا ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جو عقل سلیم کے نزدیک قابل انکار ہو یا محالات کی تعریف میں آتا ہو لیکن جب کسی ابتدائی غلطی پر کچھ مدت گزر جاتی ہے تو وہ غلطی راسخ ہوتے ہوتے عقائد کا رنگ پیدا کر لیتی ہے اور جو کسی صحیح حقیقت پر نتائج و آثار مرتب ہوتے ہیں وہی اس غلطی پر مرتب ہونے لگتے ہیں اس لئے اگر مسائل پر گفتگو کرنے سے قبل عقل و شرع کا صحیح صحیح مفہوم متعین کر لیا جائے تو عقلاء اور علماء کے درمیان بحث و جدل کا یہ وسیع میدان بہت تنگ ہو سکتا ہے۔

علماء ہر خلاف عقل بات کو شرع کے مفہوم میں داخل کرنے کی سعی کرنا ترک کر دیں اور عقلاء شرع کی ہر بات پر خلاف عقل ہونے کی بدگمانی دل سے نکال ڈالیں اور عقل و فکر کا کوئی صحیح معیار مقرر کر لیں۔ (کتاب البوت ص ۶۴)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ قابل تسلیم نہیں ہے تو پھر آپ کو بھی ایک فیصلہ کرنا ہوگا کہ عالم کے تخلیق و تخریب کے دوسرے تمام واقعات بھی قابل تسلیم نہیں ہیں اور اگر وہ سب قابل تصدیق ہیں تو پھر یہ مسئلہ بھی قابل تصدیق ماننا ہوگا۔ صرف اس لئے آغازِ عالم کے تعمیری واقعات سے آپ کی زندگی کا اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا یہ مستقبل بعید کے تخریبی واقعات کے موجودہ دور کے انسانوں کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ان سب سے صرف نظر کر کے بحث کا رخ صرف مسئلہ نزول میں منحصر کر دینا اپنے نفس کو بھی مغالطہ میں رکھنا ہے اور دوسروں کو بھی مغالطہ میں ڈالنا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جزئی معاملات کی اہمیت \* واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اس لحاظ سے بھی سب میں ممتاز ہے کہ اُن کے جزئی جزئی واقعات کو بھی قرآن کریم نے اصولی معاملات کی سی اہمیت دی ہے مثلاً اُن کی ولادت کا معاملہ یہ ایک جزئی معاملہ ہے مگر اُن کی ولادت کو بھی قرآن کریم نے بڑی اہمیت سے ذکر کیا ہے یعنی فرشتہ کا بصورت بشری آنا اور اپنی آمد کی غرض و غایت بتانا اُس پر حضرت مریم کا ناکتھائی کی حالت میں تعجب فرمانا پھر فرشتہ کا جواب اور اس کے بعد ان کے گریبان میں پھونک مارنا یہ سب تفصیلی ذکر ہیں حتیٰ کہ اُن کی والدہ کا دروازہ بھی پھر ولادت اور اُس پر لوگوں کی چہ میگوئیاں بھی ظاہر ہے کہ ان سب معاملات میں سے کسی معاملہ کو اصولی اور بنیادی کہا جاسکتا ہے؟ مگر کیا ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی ہے جس کو آپ صرف ایک جزئی معاملہ کہہ کر ٹال سکتے ہوں اور جس پر عقیدہ رکھنا کوئی ضروری بات نہ ہو پھر عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے اہم واقعہ کو صرف ایک جزئی معاملہ کہہ کر آپ کیونکر عقائد کی فہرست سے خارج کر سکتے ہیں۔

**مسئلہ نزول کی حیثیت کتب عقائد میں \*** یہی وجہ ہے کہ شروع سے لے کر آج تک کتب عقائد میں اس مسئلہ کو بھی دیگر عقائد کے ساتھ ساتھ ایک عقیدہ ہی شمار کیا ہے حتیٰ کہ محدثین نے جو مؤلفات ترتیب دی ہیں گو ان کو عقائد کی شکل پر مرتب نہیں فرمایا ان کے مقاصد دوسرے ہیں لیکن اس کے باوجود امام مسلم نے جن کی کتب کو بلحاظ ترتیب بخاری شریف پر بھی فوقیت دی گئی ہے نزول عیسیٰ علیہ السلام کو ابواب ایمان کا ایک جزء قرار دیا ہے پھر یہ کہنا کتنی کوتاہ نظری ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ چونکہ ایک جزئی مسئلہ ہے اس لئے اس کو عقائد اور ایمانیات کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ معجزات کی بحث میں ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس پر اور مبسوط بحث کریں گے کہ رسولوں کی اخبار پر ایمان رکھنا یہ جزئی مسئلہ نہیں بلکہ ایک بنیادی مسئلہ ہے رہا خاص نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ تو اس کو اس حیثیت کے علاوہ رسالت اور قیامت کے مسئلہ سے بھی براہ راست تعلق ہے جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آنے والی ہے۔ یہاں ایک عجیب بات یہ ہے کہ ذات و صفات قضاء و قدر، حشر و نشر اور رؤیہ باری تعالیٰ وغیرہ جن مسائل کو بے چون و چرا عقائد میں داخل سمجھا گیا ہے۔ ان میں تو کافی اختلافات بھی ملتے ہیں چنانچہ معتزلہ ان سب مسائل میں اہل سنت والجماعت سے اپنا علیحدہ خیال رکھتے ہیں حتیٰ کہ اشاعرہ و ماتریدیہ کے مابین بھی بعض مسائل میں ضرب المثل اختلاف موجود ہے لیکن اس کے باوجود ان مسائل کو کسی نے عقائد کی فہرست سے خارج نہیں کیا اس کے برخلاف نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ ہے جس میں سلف سے لے کر آج تک ائمہ دین میں سے کسی کا اختلاف ثابت نہیں پھر اس کو عقائد کی فہرست سے کس طرح خارج کیا جاسکتا ہے۔ حیرت ہے کہ معتزلہ جو مذکورہ بالا مسائل میں اہل سنت سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں وہ بھی اس مسئلہ میں جمہور امت کے ساتھ متفق ہیں جیسا کہ زحشری نے کشاف میں اس کی تصریح کی ہے۔ ابن عطیہ لکھتے ہیں کہ تمام امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قرب قیامت میں بحکم غصری پھر تشریف لانے والے ہیں جیسا کہ متواتر حدیثوں سے ثابت ہے۔ (بحر محیط ج ۲ ص ۲۷۳)

**مسئلہ نزول کی حیثیت احادیث میں \*** اس بارے میں اگر حدیثوں پر نظر ڈالئے تو میں صحابہ سے تقریباً سو حدیثوں میں باسالیب مختلفہ اس مسئلہ کو بتکرار قسمیں کھا کھا کر دہرایا گیا ہے۔ اس بڑے ذخیرہ میں سے چالیس حدیثیں تو ایسی ہیں جن کی تصحیح و تحسین محدثین نے صراحت کے ساتھ ثبت فرمادی ہے اور بقیہ کے متعلق گو صراحتہً ان سے تحسین منقول نہ ہو لیکن کوئی صاف جرح بھی ثابت نہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس پیشگوئی کا رتبہ کیا ہے دعویٰ سے کہا جاسکتا ہے کہ متواتر حدیث کی جو بڑی سے بڑی مثال پیش کی گئی ہے اس پیش گوئی کا پلہ کسی طرح بھی اس سے ہلکا نہیں ہے۔ پھر جب کتب سابقہ پر نظر ڈالی جائے تو یہاں انجیل بھی احادیث نبویہ کے ساتھ اس درجہ مطابق ملتی ہے کہ اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور یہ یقین بد بھی بن جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول صرف اسی شریعت کا مسئلہ نہیں بلکہ جملہ ادیان سماویہ کا ایک ایسا متفقہ عقیدہ ہے جس میں اصول دین کی طرح کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا۔

**مسئلہ نزول کی حیثیت انجیل میں \*** پھر اس مسئلہ کی حقیقت ایک عام اور مجمل پیشگوئی کے سمجھ لینے میں کتنی بڑی فروگزاشت ہوگی انجیل متی باب ۲۴ آیت ۳ میں ہے :- اور جب وہ زیتون کے پہاڑ پر بیٹھا تھا اس کے شاگردوں نے خلوت میں اس کے پاس



آ کر کہا، ہم سے یہ کہہ کہ یہ کب ہوگا اور تیرے آنے کا اور زمانہ کے آخر ہونے کا نشان کیا ہے؟ تب یسوع نے جواب میں اُن سے کہا۔ خبردار کوئی تمہیں گمراہ نہ کرے کیونکہ بہترے میرے نام پر آئیں گے اور کہیں گے کہ میں مسیح ہوں اور بہتوں کو گمراہ کریں گے۔ اور تم لڑائیوں اور لڑائیوں کی افواہوں کی خبر سنو گے خبردار مت گھبراؤ کیونکہ ان سب باتوں کا ہونا ضرور ہے پر اب تک آخر نہیں ہے کہ قوم قوم پر اور بادشاہت بادشاہت پر چڑھ آئے گی اور کال اور مرینی پڑے گی اور جگہ جگہ بھونچال آئیں گے یہ سب کچھ مصیبتوں کا شروع ہے۔

انجیل متی باب ۲۲-۲۳-۲۸۔ اس وقت اگر کوئی تم سے کہے کہ دیکھو مسیح یہاں ہے یا وہاں ہے تو یقین نہ کرنا کیونکہ جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اُٹھ کھڑے ہوں گے اور ایسے بڑے نشان اور عجیب کام دکھائیں گے کہ اگر ممکن ہو تو برگزیدوں کو بھی گمراہ کر لیں۔ دیکھو میں نے پہلے ہی تم سے کہہ دیا ہے پس اگر وہ تم سے کہیں کہ دیکھو وہ بیابان میں ہے تو باہر نہ جانا دیکھو وہ کوٹھڑیوں میں ہے تو یقین نہ کرنا کیونکہ جیسے بجلی پورب سے کوند کر پچھم تک دکھائی دیتی ہے ویسے ہی ابن آدم کا آنا ہوگا جہاں مردار ہے وہاں گدھ جمع ہو جائیں گے۔

اور فوراً ان دنوں کی مصیبت کے بعد سورج تاریک ہو جائے گا اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور ستارے آسمان سے گریں گے اور آسمان کی قوتیں ہلائی جائیں گی اور اس وقت ابن آدم کا نشان آسمان پر دکھائی دے گا اور اس وقت زمین کی ساری قوتیں چھاتی پٹیں گی اور ابن آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھیں گی انجیل لوقا ۲۱-۲۶ میں اتنی زیادتی اور ہے۔ اور ڈر کے مارے اور زمین پر آنے والی بلاؤں کی راہ دیکھتے دیکھتے لوگوں کی جان میں جان نہ رہے گی۔ اور جب یہ باتیں ہونے لگیں تو سیدھے ہو کر سراو پر اُٹھنا اس لئے کہ تمہاری مخلصی نزدیک ہوگی انجیل مرقس و لوقا میں۔

انجیل متی باب ۲۲-۳۲ \* اب انجیر کے درخت کی ایک تمثیل سیکھو جو نبی اس کی ڈالی نرم ہوتی ہے اور پتے نکلتے ہیں تم جان لیتے ہو کہ گرمی نزدیک ہے اسی طرح جب تم ان سب باتوں کو دیکھو تو جان لو کہ وہ نزدیک ہے بلکہ دروازہ پر ہے۔

اعمال باب ۱ آیت ۹ \* اور وہ یہ کہہ کے ان کے دیکھتے ہوئے اوپر اُٹھایا گیا اور بدلی نے اُسے اُن کی نظروں سے چھپایا اور اُس کے جاتے ہوئے جب دے آسمان کی طرف تک رہے تھے دیکھو دو مرد سفید پوشاک پہنے اُن کے پاس کھڑے تھے اور کہنے لگے اے جلیل مردو تم کیوں کھڑے آسمان کی طرف دیکھتے ہو۔ یہی یسوع جو تمہارے پاس سے آسمان پر اُٹھایا گیا ہے اسی طرح جس طرح تم نے اُسے آسمان کو جاتے دیکھا ہے پھر آئے گا۔

ان صحابہ کے اسماء مبارکہ یہ ہیں جن کی تفصیلی روایات دیکھنی ہوں تو رسالہ ”التصريح بما تواتر من الاحاديث في نزول المسيح“ مؤلفہ محترم جناب مولانا محمد شفیع صاحب مفتی پاکستان ملاحظہ فرمائیں۔

- (۱) ابو ہریرہ (۲) جابر بن عبد اللہ (۳) نواس بن سمان (۴) ابن عمر (۵) حذیفہ بن اسید (۶) ثوبان (۷) مجمع (۸) ابوالامۃ (۹) ابن مسعود (۱۰) ابونضرہ (۱۱) سمرۃ (۱۲) عبد الرحمن بن جبر (۱۳) ابوالطفیل (۱۴) انس (۱۵) وائلہ (۱۶) عبد اللہ بن سلام (۱۷) ابن عباس (۱۸) اوس (۱۹) عمران بن حصین (۲۰) عائشہ (۲۱) سفینہ (۲۲) حذیفہ (۲۳) عبد اللہ بن مغفل (۲۴) عبد الرحمن بن سمرۃ (۲۵) ابوسعید الخدری (۲۶) عمار (۲۷) ربیع (۲۸) الحسن (۲۹) عمرو بن ردیم (۳۰) کعب (۳۱) الامام جعفر۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

**مسئلہ نزول کی حیثیت قرآن کریم میں \*** خدا تعالیٰ کی سب سے آخری کتاب قرآن کریم ہے جب اُس پر نظر ڈالئے تو اس میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی یہی حیثیت ثابت ہوتی ہے رہا اُن کے رفع جسمانی کا مسئلہ تو اُس کو تو قرآن کریم نے اہل کتاب کے مقابلہ میں اپنی جانب سے ایک فیصلہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آتی ہے ﴿وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنُوا بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمًا وَيَوْمًا يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا﴾ (النساء: ۱۵۹) یعنی اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئے۔ آیت بالا میں اس کی تصریح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ابھی فوت نہیں ہوئے نیز یہ کہ آئندہ زمانہ میں کسی شبہ کے بغیر اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا ہے یہی وجہ ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی صحیح حدیث روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر اس پیشگوئی کو تم قرآن کریم کی روشنی میں دیکھتا چاہو تو آیت بالا کو پڑھ لو۔ اس کی مزید تشریح آئندہ آئے گی اور اس مغالطہ کو بھی دور کر دیا جائے گا کہ نزول کا لفظ قرآن کریم میں کیوں نہیں آیا۔ پس اگر یہ مسئلہ جو کتب سابقہ سے لے کر احادیث نبویہ اور خود کتاب اللہ میں اس تو اتر کے ساتھ ثابت ہے عقائد کی فہرست میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہے تو پھر اور کس مسئلہ کو عقائد میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ تعجب ہے کہ یہاں کتب سماویہ کو اس پر جتنا اصرار ہے ہماری مادی عقول کو اس سے اتنا ہی انکار ہے۔ فالی اللہ المشتکی

**مسئلہ نزول کی اہمیت اور اصول دین سے اس کا تعلق \*** موجودہ دور کے مبصرین کی نظر یہاں ایک اور واضح حقیقت سے بھی چوک گئی ہے وہ صرف اس بحث میں الجھ کر رہ گئی ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کی خبر صرف ایک پیشگوئی ہے لہذا جو اُمت اس رسول کی تصدیق پہلے سے کر چکی ہے اس کے حق میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ اور اسی غلط فہمی میں اُنھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اصل دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کو یہ علم ہی نہیں کہ اس پیشگوئی کو ایک اصولی اہمیت بھی حاصل ہے کیونکہ اہل کتاب کی دو مرکزی جماعتوں کا نقطہ ضلالت یہی پیشگوئی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ کتب سابقہ میں دو مسیح کی آمد کی پیشگوئی کی گئی تھی ایک مسیح ہدایت کی جس کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور دوسری مسیح ضلالت کی جس کا مصداق دجال ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو یہود بے بہود نے اُن کو تو مسیح ضلالت کا مصداق ٹھہرا لیا اور اس لئے اُن کی ایذا رسانی اور قتل کے درپے رہے اور جب مسیح ضلالت ظاہر ہوگا یعنی جدال تو اُس کو مسیح ہدایت کا مصداق ٹھہرائیں گے یہی وجہ ہے کہ تمام یہود دجال کی اتباع کر لیں گے۔ اس کے برعکس نصاریٰ ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح ہدایت کا مصداق تو مانا مگر حد سے بڑھا کر ان کو اقا نیم ثلاثہ کا ایک جزء بنا لیا اب یہاں ان دونوں بڑی بڑی جماعتوں کو جو بسیط ارض پر پھیلی پڑی ہیں ایک مسیح کی آمد کا انتظار لگ رہا ہے یہود کو تو اس لئے کہ اُن کے نزدیک مسیح ہدایت کی جو پیشگوئی کی گئی تھی اُس کا ظہور ابھی باقی ہے۔ لہذا مسیح ہدایت کو آنا چاہیے اور نصاریٰ کو اس لئے کہ اُن کے زعم میں وہی مسیح دوبارہ آ کر مخلوق کا حساب لیں گے اور یہی دن قیامت کا دن ہوگا۔ (دیکھو الجواب الصحیح ج ۱ ص ۳۴۱ وج ۱ ص ۱۸۱)

اس مسئلہ پر بحث کے وقت اگر اس اہم تاریخ کو بھی سامنے رکھ لیا جاتا تو یہ واضح ہو جاتا کہ اس پیشگوئی کی حقیقت نہ صرف ایک پیشگوئی کی ہے اور نہ ایک جزئی واقعہ کی بلکہ اس کا تمام تر تعلق اصول دین کے ساتھ ہے کیونکہ رسالت اور قیامت کے دونوں



مسئلے اصولی مسئلے ہیں اور اس مسئلہ کو ان دونوں سے گہرا تعلق ہے۔ یہاں یہودیوں کی یہ گمراہی کتنی اصولی گمراہی تھی کہ انہوں نے مسیح ہدایت یعنی خدا تعالیٰ کے ایک سچے رسول کو مسیح ضلالت یعنی دجال ٹھہرا لیا تھا اور نصاریٰ کی یہ گمراہی بھی کتنی اصولی تھی کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے ایک رسول کی آمد کو خدائی آمد اور اُس کی آمد کے دن کو قیامت کا دن سمجھ رکھا تھا۔ ان دو اصولی غلطیوں کی اصلاح پر دنیا کی ان دو بڑی بڑی امتوں کے ایمان کا دار و مدار ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی آمد کی پیشگوئی کی وہی اہمیت محسوس فرمائی ہے جو کسی اصولی معاملہ کی کی جاسکتی ہے اور مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کی تفصیلات بیان فرمادی ہیں کہ پھر آئندہ ان دونوں کے ظہور کے وقت ان کی شناخت میں دونوں قوموں کو کوئی مغالطہ نہیں لگ سکتا یہود آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جس کو انہوں نے مسیح ضلالت سمجھا تھا (والعیاذ باللہ) درحقیقت وہ مسیح ہدایت تھے اور نصاریٰ کو یہ خوب ثابت ہو جائے گا کہ جس کو انہوں نے خدائے تعالیٰ کا شریک ٹھہرا لیا تھا۔ درحقیقت وہ اس کا ایک بندہ اور اُس کی مخلوق تھا اور اُن کی آمد قیامت کا دن نہیں بلکہ اس کی ایک بڑی علامت تھی اور ساری غلطیاں خود عیسیٰ علیہ السلام ہی کی زبان سے دور کر دی جائیں گی تاکہ اختتامِ عالم سے قبل اتحادِ ملل کے راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی تھیں وہ ایک ایک کر کے سب دور کر دی جائیں اور مللِ سماویہ کی وحدت کا وعدہ پوری صفائی اور صداقت سے پورا ہو جائے وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَعَدًا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اہمیت تاریخی نظر میں \* یہ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ان انبیاء علیہم السلام میں سے نہیں ہیں جن کا تذکرہ تاریخ نے محو کر ڈالا ہو بلکہ اُن اولوالعزم رسولوں میں سے ہیں جن کا تذکرہ ہر دور میں بڑی اہمیت کے ساتھ ہوتا رہا ہے اہل کتاب کے وہ بڑے بڑے گروہ اُن کی ایک ایک علیحدہ تاریخ رکھتے ہیں اور خود اہل اسلام کے پاس بھی اُن کی ایک منفی تاریخ موجود ہے۔ یہود کی تاریخ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو انہوں نے قتل کر ڈالا ہے اس لئے اُن کے نزدیک تو اُن کی حیات اور دوبارہ تشریف آوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا رہ گئے نصاریٰ تو وہ اُن کے دوبارہ تشریف آوری کے قائل ہیں مگر وہ اُس دن کو قیامت کا دن سمجھتے ہیں اور مجمل طور پر اُن کے سولی چڑھائے جانے اور زندہ ہو کر آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بھی قائل ہیں۔ اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ نہ وہ قتل ہوئے اور نہ سولی دیئے گئے بلکہ زندہ اسی جسمِ عنصری کے ساتھ آسمانوں پر اٹھائے گئے اور قیامت سے پہلے پھر اسی جسمِ عنصری کے ساتھ تشریف لائیں گے اور مدینہ طیبہ میں جو آ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں وفات کے بعد مدفون ہوں گے۔ اب ایسے اولوالعزم رسول کے متعلق یہ حق کس کو پہنچتا ہے کہ وہ کوئی ایسی جدید تاریخ بنا لے جو دنیا میں کسی جماعت کو بھی مسلم نہ ہو۔ مثلاً یہ کہنا ہے کہ وہ سولی پر چڑھائے گئے پھر نیمِ مردنی کی حالت میں اتار لئے گئے تھے پھر کہیں جا کر اپنی طبعی موت سے مر گئے اور آخر کشمیر یا کسی اور شہر میں جا کر ایسی گمنامی کی حالت میں مدفون ہو گئے جس کی اطلاع کسی کو نہیں ہو سکی۔ اس جلیل القدر رسول کی اس جدید تاریخ کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسا آج کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرے کہ آپ کی وفات اور دفن کا سب افسانہ غلط ہے۔ بلکہ جب کفار نے آپ کو زیادہ ستا تا تو آپ اپنے جسمِ عنصری کے ساتھ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور آئندہ پھر تشریف لانے والے ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی عاقل ایسا ہے جو اس رسولِ اعظم کی اس جدید تاریخ پر غور کرے اور اس کے دلائل سننے کے لئے تیار ہو۔ ہمارے نزدیک ایک مسلم فوت شدہ رسول کے زندہ آسمانوں پر

جانے کی تاریخ میں اور ایک مسلم زندہ آسمانوں پر موجود رسول کے متعلق اُن کی موت اور دفن کی جدید تاریخ میں کوئی فرق نہیں نہ وہ عقلاء کے نزدیک قابل توجہ ہے نہ یہ قابل التفات ہو سکتی ہے۔

**حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کی اہمیت تاریخ کی نظر میں \*** یہ بات کتنی عجیب ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام خود نبی اولوالعزم ہیں اُن کی امت بھی تسلسل کے ساتھ کسی انقطاع کے بغیر اب تک چلی آ رہی ہے پھر ان کی موت اور اُن کی قبر کا صحیح حال آج تک ان سب پر کیسے مخفی رہ گیا۔ بالخصوص یہود جو ان کے قتل کے مدعی تھے وہ اس اہم واقعہ سے کیسے غفلت اختیار کر سکتے تھے۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول ہونے کے لئے ان کی قبر کی نشاندہی اُن کے لئے سب سے کھلا ہوا ثبوت تھی مگر یہاں نہ تو یہود اُن کی قبر کا پتہ نشان بتا سکتے ہیں اور نہ اس بارے میں نصاریٰ کے پاس ہی کوئی صحیح علم ہے ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان جو مدت ہے وہ تقریباً چھ سو سال کی مدت ہے یہ اتنی طویل مدت نہیں کہ اس میں کسی ایسی اولوالعزم تاریخی شخصیت کی قبر اتنی لاپتہ ہو جائے کہ نہ اس کے ماننے والے بلکہ پوجنے والوں کو معلوم ہو اور نہ اُس کے دشمنوں کو اس اُمت میں نہ معلوم کتنے اولیاء اللہ گذر چکے ہیں جن کی وفات پر اس سے کہیں زیادہ کی مدت گزر چکی ہے مگر اُن کی قبریں آج تک تازہ یاد گاریں معلوم ہوتی ہیں پھر عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور ان کی قبر کی ایسی گمنامی یہ کیسے قرین قیاس ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر اُن کے حق میں کبھی موت کا ایک حرف نہیں فرمایا اور نہ اُن کی قبر کا کہیں نشان بتایا۔ درانحالیکہ یہ مسائل آپ کی آنکھوں کے سامنے زیر بحث چل رہے تھے اس کے برعکس فرمایا تو یہ کہ وہ دوبارہ تشریف لائیں گے اور ابھی ان کی وفات نہیں ہوئی اور قبر بتائی تو مستقبل بعید میں اپنے پہلو کے قریب مدینہ طیبہ میں۔ اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے تردید الوہیت کے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معمولی سے معمولی حالات کا تذکرہ فرمایا ہے مثلاً ان کا کھانا کھانا گماناً یا کُلانِ الطَّعَام۔ مگر ان کی الوہیت کے خلاف جو سب سے واضح ثبوت تھا یعنی یہ کہ وہ مر چکے ہیں اس کو ایک جگہ بھی عیسائیوں کے مقابلہ میں ذکر نہیں فرمایا۔ اور کبھی آپ کی زبان مبارک سے یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تو مدت ہوئی وفات ہو چکی ہے۔ پھر وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ بارہا عیسائیوں کے ساتھ آپ کے مکالمات ہوئے ہیں۔ پھر اس تحقیقاتی دور میں جہاں جبل ایورسٹ (Evarest) پر رسائی ہو چکی ہو، فرعون کی لاش دستیاب ہو چکی ہو اور سفینہ نوح علیہ السلام کے نشانات معلوم کئے جا چکے ہوں وہاں کیا اس مقدس رسول کی قبر مخفی رہ سکتی تھی۔ ان حالات میں بھی اگر اپنی جانب سے ہم ان کی موت اور قبر کی نشاندہی کے مدعی بنتے ہیں تو تاریخی دنیا میں اُس کی کیا قدر و منزلت سمجھی جاسکتی ہے۔

اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی تو نصاریٰ اور اہل اسلام خاص طور پر ان ہی کی حیات کے قائل کیوں ہیں \* یہاں تھوڑا سا غور اس پر بھی کر لینا چاہیے کہ اگر بالفرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت واقع ہو چکی تھی تو پھر تمام انبیاء علیہم السلام میں سے ایک ان ہی کی خصوصیت کیا تھی کہ ان ہی کے معاملہ میں نصاریٰ سے لے کر اہل اسلام تک اُن کی حیات اور اُن کے نزول کے تسلسل کے ساتھ قائل چلے آ رہے ہیں۔ چلئے نصاریٰ اگر اپنی فرط عقیدت سے کسی بے اصل بات کا دعویٰ کر ڈالیں تو جائے تعجب نہیں مگر یہاں ان علماء اسلام کے لئے اس کا کیا محل ہو سکتا تھا جو ہمیشہ تردید الوہیت میں سرگرم رہے ہیں بلکہ اس



سلسلہ میں کسی کے قلم سے ایسے کلمات بھی نکل گئے ہیں کہ اگر کہیں اتنی بڑی تہمت اُن کے سر نہ رکھی جاتی تو وہ کلمات ہرگز ان کے زیر قلم نہ آ سکتے تھے۔ پھر کسی غلطی کا اگر امکان تھا تو چلئے یہ کسی خاص فرد میں ہو سکتا تھا لیکن جمہور امت اور صحابہ و تابعین پھر ائمہ دین اور مفسرین و شارحین سب ہی کا ایک بدیہی البطلان غلطی پر متفق ہو جانا یہ کیونکر قرین قیاس مانا جاسکتا ہے۔ چلئے اگر یہ مسئلہ الہیات کے دقیق مسائل یا حیات برزخی کے بالاتر از فہم کیفیات کی طرح کوئی باریک مسئلہ ہوتا تو بھی کسی غلط فہمی کا امکان تھا مگر ایک شخص کی موت و حیات کا مسئلہ تو کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ نہ تھا جس کے فہم میں کوئی دشواری تھی یا اس میں اختلاف رائے کی کوئی گنجائش تھی یہ تو عام انسانوں سے لے کر انبیاء علیہم السلام کی جماعت تک کی ایک عام سنت بشری تھی پھر انبیاء علیہم السلام کی تمام جماعت میں سے ان ہی کی موت میں غلط فہمی کیوں پیدا ہو گئی اور حیرت درحیرت یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی صاف نہ ہو سکی بلکہ اور مستحکم ہوتی رہی۔ پس اگر حقیقت حال یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے تو پھر کسی تاریخ سے یہ ثبوت پیش کرنا لازم ہوگا کہ کم از کم مسلمانوں میں اس کے خلاف ان کی حیات کے عقیدہ کی بنیاد کب سے پڑی لیکن یہاں تو ہم جتنا صحابہ و تابعین اور اُن سے اوپر احادیث مرفوعہ کی طرف نظر کرتے چلے جاتے ہیں اتنا ہی ہم کو رفع و نزول کا ثبوت اور بہم پہنچتا چلا جاتا ہے اور اس کے برعکس آخر میں موت کے عقیدہ کی بدعت سیئہ جس کسی فرد نے ایجاد کی ہے تاریخ انگلی رکھ کر اس کا نام و نشان بتاتی ہے اور ہمیشہ اس کو مسلمانوں کے خلاف عقیدہ کا شخص شمار کرتی ہے حتیٰ کہ اس مدت میں جو مدعی مسیحیت گزرے ہیں وہ بھی اپنے دعویٰ سے قبل تمام عمر اس بارے میں عام امت کے ساتھ ہی نظر آتے ہیں یہ بات دوسری ہے کہ جب زمین ہموار ہو گئی اور انہوں نے خود مسیح ہونے کا دعویٰ شروع کیا تو پھر جس عقیدہ پر اُن کی ساری عمر گزری تھی اسی کو انہوں نے مشرکانہ عقیدہ ٹھہرا دیا بلکہ اس سے بڑھ کر اس مضمون کی صحیح حدیثوں کے متعلق ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے مکروہ ترین الفاظ بھی لکھ مارے ہوں۔ کُبْرُث کَلِمَۃٌ تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَقُولُوْنَ اِلَّا كَذِبًا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر وفات پا چکے ہیں تو اُن کے متعلق قرآن و حدیث میں کہیں موت کا صاف لفظ کیوں نہیں \* اس مقام پر دقیقہ بھی قابلِ فرو گذاشت نہیں ہے کہ ایک انسان کی موت کا واقعہ کونسا پیچیدہ واقعہ ہے جس کے بیان کرنے میں ایک معمولی سے معمولی انسان کو بھی کوئی دشواری ہو سکتی ہے اگر قرآن کریم کسی ایک جگہ بھی صراحت کے ساتھ یہ لفظ فرمادیتا کہ ”ان عیسیٰ مات“ یعنی عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہیں تو بس اسی ایک لفظ سے ساری بحثیں ختم ہو جاتیں اور بے وجہ لفظ توفیٰ پر دفتر کے دفتر خرچ کر کے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہ رہتی کہ توفیٰ لغت عرب میں موت کے ہم معنی ہے۔ افسوس ہے کہ لفظ توفیٰ کے موت کے معنی میں ثابت کرنے کے لئے تو عمریں صرف کی گئیں مگر اس پر کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہ کیا گیا کہ جب عربی زبان میں موت کے لئے دوسرا صاف لفظ موجود تھا تو پھر یہاں موضع اختلاف میں اس صاف اور سیدھے لفظ کو چھوڑ کر ایسے مشتبہ لفظ کو کیوں اختیار کیا گیا ہے جو بڑی کاوشوں کے بعد بھی موت میں منحصر نہیں ہو سکتا بالخصوص جبکہ عیسائی یہ ڈنکہ بجا رہے ہوں کہ وہ اللہ تھے والعیاذ باللہ تو کیا یہ بات سیدھی اور صاف نہ تھی کہ اللہ کا سب سے پہلا نام ”الْحَیُّ“ ہے اور عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہیں۔ سورہ آل عمران میں جو نصاریٰ ہی کی تردید کے لئے اُتری اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کو ”الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ“ کہہ کر

ان کی تردید کی گئی مگر ساری سورت میں ایک بار بھی عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں موت کا لفظ نہ بولا گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا مسئلہ عام انسانوں کی موت پر قیاس کرنا صحیح نہیں \* یہ اچھی طرح واضح رہنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا مسئلہ صرف عام انسانوں کی موت پر قیاس کر کے طے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عام انسانوں کی حیات و موت سے قومی تاریخ یا مذہبی عقیدہ کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے یہاں طویل کشدگی کو بھی موت کا قرینہ بنا لیا جاتا ہے لیکن ایک ایسے اولوالعزم نبی کی وفات کا مسئلہ جس کی حیات و موت کی بحث دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ سے چل رہی ہو پھر جس کی حیات کے واضح اور مستحکم دلائل بھی موجود ہوں اس کو صرف عام انسانوں پر قیاس کر کے کیسے طے کیا جاسکتا ہے یہ بالکل اتنا ہی غیر معقول ہے جتنا کہ کسی ایسے زندہ شخص کی طویل کشدگی سے اس کی موت کا حکم لگا دینا جس کی حیات کی شہادت معتمد اخبارات کے ذریعہ بھی اور خود اُس کے بیانات سے بھی مسلسل موصول ہو رہی ہو یہاں کوئی عاقل ایسا نہیں ہوگا جو ان حالات میں صرف اس کی مدت سفر کے غیر معمولی طوالت کی وجہ سے اس کے ترکہ تقسیم کا دعویٰ کسی عدالت میں دائر کر سکے اور نہ کوئی عدالت یہاں اُس کی وراثت کی تقسیم کا حکم دے سکتی ہے۔

خوب یاد رکھو جہاں کوئی معاملہ خاص دلائل کی روشنی میں پایہ ثبوت کو پہنچ جائے وہاں صرف عام قیاسات سے کوئی حکم لگانا کھلی ہوئی غلطی ہے۔ مثلاً آج جبکہ فرعون کی لاش پختہ ثبوت کے ساتھ دریافت ہو چکی ہے تو اب محض اس بناء پر اس کا انکار کرنا کہ ایک غرق شدہ لاش کا وہ بھی سینکڑوں سال کے بعد صحیح و سالم برآمد ہونا چونکہ عام دستور کے خلاف ہے اس لئے فرعون کی لاش کا برآمد ہونا بھی قابل تسلیم نہیں یا قابل یقین نہیں ہے ظاہر ہے کہ اس قیاس کی عقل و تاریخ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا مسئلہ بھی ہے۔ یہاں صرف عام قیاسات اور عام دلائل پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اُن کا معاملہ قرآن وحدیث کے واضح سے واضح اور مستقل طور پر علیحدہ بیان میں آچکا ہے۔

حیات و موت کا مسئلہ دنیا کے عام واقعات میں شامل ہے پھر قرآن وحدیث میں اس کی اہمیت کیوں ہے \* اس امر پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ حیات و موت دنیا کے عام واقعات میں شامل ہیں بہت سے انبیاء علیہم السلام فوت ہوئے اور بہت سے نااہل اُمتوں کے ہاتھوں شہید بھی ہوئے اسی طرح مستقبل میں بہت سے مبارک اور نامبارک افراد و اشخاص کے ظہور کی پیشگوئیاں کی گئی ہیں مگر آخر ان سب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد اور اُن کی حیات کے مسئلہ کی اہمیت کیا تھی کہ کتب سابقہ سے لے کر قرآن کریم تک نے اس کے بیان و ایضاح کا اہتمام کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بار بار اُن کے متعلق نزول کی پیشگوئی فرمائی اور اس کی اتنی تفصیلات فرمائی ہیں جتنی کہ کسی اور دوسرے شخص کے متعلق نہیں فرمائیں۔ یقیناً اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کا تعلق آئندہ زمانہ سے ابھی باقی ہے اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح فوت ہو چکے ہوتے تو جس طرح اُن کی موت اور سوانح موت کی تفصیلات سے سکوت اختیار کر لیا گیا تھا۔ یہاں بھی سکوت اختیار کر لیا جاتا مگر چونکہ اُن کو ابھی دوبارہ تشریف لانا باقی تھا اس لئے آپ نے اُن کی آمد کی تفصیلات کا خاص اہتمام فرمایا ہے تاکہ جن کے متعلق پہلی بار دو بڑی قومی گمراہ ہو چکی تھی دوسری بار اب وہ اپنی اپنی غلطیوں کو صاف طور پر سمجھ جائیں اور اجتماعی حیثیت سے جس طرح وہ



پہلی بار کفر پر جمع ہو گئی تھیں اس مرتبہ ایمان پر جمع ہو سکیں اور ان من اهل الكتاب الا لیؤمن بہ قیل موتہ کی پیشگوئی پوری  
آب و تاب سے پوری ہو جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح اور شافی بیان جس طرح کہ اس امت پر ایک احسان عظیم ہے  
اسی طرح دوسری امتوں پر بھی ہے کہ اُن کو صرف آپ کے طفیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح معرفت اور ان پر صحیح ایمان کا  
سامان میسر آ گیا اسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل و برتری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مسائل جو آج تک اُلجھے ہوئے  
چلے آ رہے تھے وہ آپ کے دور میں کس طرح سلجھتے چلے جا رہے ہیں۔

نافہم لوگ یہ کہتے ہیں کہ جن کی پہلی آمد امتوں کے فتنے کا موجب بنی اُن کی دوسری آمد سے ہدایت کی کیا توقع ہو سکتی ہے  
اور اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اس کی ذمہ داری اگر تمام تر اُمتوں پر عائد ہوتی ہے تو اُن کی دوبارہ آمد میں خطرہ کیا ہے اور اس کا مطلب  
یہ ہے کہ یہ ذمہ داری خود اُن ہی پر عائد ہے والعیاذ باللہ تو یہ براہ راست خدا کے ایک معصوم رسول پر حملہ ہے اور صحیح معنی میں یہود کی  
اتباع ہے ہمارے بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ اُن کی دوبارہ تشریف آوری درحقیقت اسی عمیق حکمت کے اظہار کے لئے ہے کہ یہ  
بات عالم آشکار کر دی جائے کہ جن کو جماعتوں نے مرکز ضلالت ٹھہرایا تھا یہ ان کی شقاوت تھی درحقیقت وہ مرکز ہدایت تھے اور اس  
طرح جہاں ایک طرف اُن کی بزرگی ثابت ہو دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان بھی ظاہر ہو۔ کہ اب جو جہان  
بھر کے نافہم تھے وہ آپ کے دور میں کتنے بافہم تھے وہ آپ کے دور میں کتنے بافہم بن چکے ہیں۔

خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں لفظ نزول کی اہمیت \* یہ امر بھی خاص طور پر قابل غور ہے کہ اگر حضرت  
عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے اور اب وہ دوبارہ تشریف نہیں لائیں گے تو حدیثوں میں نزول کی پیشگوئی خاص اسی نام و  
نسبت کے شخص کے متعلق کیوں کی گئی ہے اور کیوں صاف طور پر دنیا کے دستور کے موافق اُس کا وہی نام ذکر نہیں کیا گیا جو اس کا  
اصل نام تھا نیز یہ سوال بھی اہم ہے کہ کسی ایک حدیث میں ان کے متعلق ولادت کا سیدھا لفظ کیوں نہیں فرما دیا گیا تاکہ یہ بات  
صاف ہو جاتی کہ جو شخص آئندہ آنے والا ہے وہ عام انسانوں کی طرح کسی وقت پیدا ہوگا اور وہ مسیح اسرائیل نہیں بلکہ کوئی اور دوسرا  
انسان ہے بالخصوص جبکہ امام مہدی اور دجال جو بھی مبارک و نامبارک انسان آئندہ ظاہر ہونے والے تھے اُن کے حق میں ولادت  
ہی کا صاف لفظ بولا گیا ہے اور اُن کی وہی نام و نسبتیں ذکر فرمائی گئی ہیں جو اُن کی اصل نام و نسبتیں تھیں۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگر  
مسیح ابن مریم درحقیقت فوت ہو چکے تھے اور ان کی بجائے کوئی اور شخص ان کا ہمرنگ اس امت میں پیدا ہونے والا تھا تو اُس کے  
حق میں کہیں ولادت کا لفظ بولا نہ جاتا اور کسی ایک حدیث میں اس کے اصل نام و نسبت کی تصریح نہ کی جاتی اور کہیں اُس کے اصل  
شہر اور محل پیدائش کا پتہ بتایا نہ جاتا بلکہ ہر مقام پر وہی نام و نسبت وہی شہر وہی تمام صفات اور وہی حلیہ ذکر کیا جاتا جو درحقیقت مسیح  
اسرائیل کا تھا۔ کیا جس نام و نسبت والے شخص کے متعلق عیسائی قوم دوبارہ آمد کا انتظار کر رہی تھی اسی نام و نسبت والے شخص کی  
دوبارہ آمد کی پیشگوئی کر کے عیسائیوں کی کھلے طور پر تائید کرنی نہیں ہے اس انداز بیان کا مطلب ایک سیدھی بات کو اور اُلجھاؤ دینا  
اور ہدایت کی بجائے اور گمراہی میں مبتلا کرنا ہے والعیاذ باللہ۔ پس اگر صرف اسی ایک بات پر غور کر لیا جاتا کہ حدیثوں میں حضرت  
عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بار بار کیوں نزول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور کیوں ایک مرتبہ بھی ولادت کا لفظ نہیں بولا گیا اور

کیوں تمام مقامات پر اُسی اسرائیلی رسول بزرگ کے نام نسبت اور شکل و شائل کو ذکر کیا گیا ہے اور کیوں اس کا اصل نام و نسبت ذکر نہیں کیا گیا تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی کہ یقیناً وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنے والے ہیں جو ایک بار پہلے آ چکے ہیں اور وہ زندہ ہیں اور آئندہ زمانہ میں اُن کو نازل ہونا ہے۔ حدیثوں کے اس واضح بیان کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں حدیثوں کی تاویل کرنا اور اُن کو بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک پیدا ہونے والا انسان شمار کرنا ٹھیک اسی طرح تحریف ہوگا جیسا امام مہدی علیہ السلام یا دجال کے بارے میں ولادت کے صاف لفظ مذکور ہو جانے کے باوجود یہ دعویٰ کرنا کہ امام مہدی علیہ السلام اور دجال بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان سے نازل ہوں گے پس جس طرح امام مہدی علیہ السلام کے حق میں اُن کے نزول کی بجائے اُمت کو اُن کی ولادت ہی کا انتظار ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ان کی پیدائش کے بجائے اُن کے اترنے کا انتظار ہونا چاہیے۔ ہم کو اس کا کوئی حق نہیں کہ حدیثوں میں جہاں صاف طور پر نزول کا صاف لفظ آچکا ہے وہاں اُس کے معنی ولادت کے اور جہاں ولادت کا صاف لفظ وارد ہے اس کے معنی نزول کے کر ڈالیں۔

غیر موقت پیشگوئیوں کا انکار یا تاویل دونوں خطرناک اقدام ہیں \* جو پیشگوئیاں موقت نہیں ہیں ان کے متعلق بل از وقت تھک کر یہ کہنا کہ مسلمانوں کا مسیح و مہدی جب آج بھی نہ آیا تو آخر کب آئے گا بالکل کفار کے اس قول کے مشابہ ہے جو انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں قیامت کے بارے میں کہا تھا ﴿وَيَقُولُونَ مَتَى هُوَ قُلْ عَسَى أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا﴾ حقیقت یہ ہے کہ اسلام چونکہ قیامت تک باقی رہنے والا مذہب ہے اس لئے اس کی پیشگوئی کا دامن بھی قیامت تک وسیع رہنا چاہیے بہت سی پیشگوئیاں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پوری ہو چکیں پھر کچھ حصہ ہے صحابہ کے زمانہ میں پورا ہوا اس کے بعد اسی طرح ہر دور میں اُن کا ایک ایک حصہ پورا ہوتا رہا حتیٰ کہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ زمانہ کا کوئی دور خالی نہیں گذرا جس میں آپ کی پیشگوئی کا کوئی نہ کوئی حصہ آنکھوں کے سامنے نہ آتا رہا ہو۔ ۱۷ء میں ہنگاموں کی سرگزشت بہت مختصر اور جامع الفاظ میں اگر آپ کو پڑھنی ہو تو آپ اُن الفاظ میں پڑھ لیجئے جو صحیح مسلم میں موجود ہیں ”ایک زمانہ آئے گا جس میں ایسی جنگ ہوگی کہ قاتل کو یہ بحث نہ ہوگی کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے اور مقتول کو یہ علم نہ ہوگا کہ وہ کس جرم میں قتل کیا جا رہا ہے۔“ ہم نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان ہنگاموں میں قتل کا یہی نقشہ تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان اور ایک جماعت دوسری جماعت کے قتل کے درپے تھی اور کسی کو اس تحقیق کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ اُس کے موافق ہے یا مخالف۔ قتل کرنے والا کس گناہ میں دوسرے کو قتل کر رہا ہے اور مقتول کیوں مفت مارا جا رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کی پیشگوئیوں کو صرف گزشتہ زمانہ میں ختم کر دینا اور مستقبل میں پوری ہونے والی پیشگوئیوں کا قبل از وقت انتظار کر کے تھک جانا اور ان کے انکار پر آمادہ ہو جانا درحقیقت یہ آپ کی عموم بعثت کا انکار ہے کیونکہ اگر آپ کی بعثت قیامت تک کے لئے ہے تو پھر اس کی صداقت کے نشانات بھی دُنیا کے ہر دور کے انسان کے سامنے آنے چاہئیں اسی لئے قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ کی سب پیشگوئیاں آپ ہی کی حیات طیبہ میں پوری ہوں گی۔ بلکہ بعض یعنی کچھ کا لفظ فرمایا۔

﴿فَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ﴾ (یونس: ۱۱)



﴿وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِيبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ﴾ (غافر: ۲۴)

اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بھی آپ قبل از وقت انتظار کر کے خود بخود تھک جائیں اور پھر صریح حدیثوں کی ایسی ایسی تاویلیں کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں جو دنیاۓ عالم میں قابل مضحکہ اور سارے دین میں شبہ کا باعث بن جائیں کیونکہ جب دین کے ان واضح الفاظ کی یہ حقیقت ثابت ہو تو پھر کیا اطمینان کیا جاسکتا ہے کہ ذات و صفات اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے واضح الفاظ کی صحیح حقیقتیں کیا ہوں گی اور اس طرح پورے کے پورے دین پر کیا اطمینان باقی رہ سکتا ہے۔

قرآن کریم میں نزول کا مسئلہ بھی رفع جسمانی کی طرح صاف طور پر کیوں ذکر میں نہیں آیا \* قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے اور مقتول نہ ہونے کا تذکرہ صرف یہود کے اسباب لعنت کے بیان کے ضمن میں آ گیا ہے اس ضمن میں قرآن شریف نے یہ نقل کیا ہے کہ یہود واقع کے خلاف اُن کے قتل کرنے کے مدعی ہیں اور نصاریٰ گو بہت سے بے تحقیق باتیں بناتے ہیں مگر اجمالاً اُن کے رفع کے قائل ہیں اس لئے یہاں قابل توجہ صرف یہی مسئلہ تھا کہ وہ مقتول ہوئے یا نہیں اور اگر مقتول نہیں ہوئے تو آسمان پر اُٹھائے گئے یا نہیں رہا اُن کے نزول کا مسئلہ تو وہ کسی مقام پر بھی زیر بحث نہیں آیا۔ پھر ہم کو کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا کہ نزول یا عدم نزول کا مسئلہ کبھی اہل کتاب نے آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ لہذا جب یہ مسئلہ کہیں آپ کے سامنے زیر بحث ہی نہیں آیا اور نہ قرآن کریم ہی کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو اب صراحت کے ساتھ نزول کا لفظ ذکر ہوتا تو کیسے ہوتا ہاں اگر نزول کا مسئلہ بھی اس وقت کہیں زیر بحث آ جاتا تو جس طرح یہاں رفع کا لفظ صراحت کے ساتھ مذکور ہوا تھا نزول کا لفظ بھی یقیناً اسی طرح صراحت کے ساتھ ذکر ہو جاتا لیکن جب یہ مسئلہ کہیں زیر بحث آیا ہی نہیں تو اب قرآن کریم میں صراحت لفظ نزول کا مطالبہ کرنا کتنی بڑی بے انصافی ہے اور اگر بالفرض یہ لفظ مذکور ہو بھی جاتا ہے جب بھی حیلہ جو طبعیتوں کو فائدہ کیا تھا؟ آخر صحیح سے صحیح حدیثوں میں یہ لفظ بار بار آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے قسموں کے ساتھ آیا مگر پھر اُن کو کیا فائدہ ہوا۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول یعنی آمد ثانی کا مسئلہ خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو مگر اس وقت وہ زیر بحث ہی نہ تھا۔ ہاں قومی تاریخ کے لحاظ سے جو فرقہ اُن کے رفع جسمانی کا قائل تھا وہ اُن کی آمد ثانی کا بھی منتظر تھا اور اب تک ہے اور جو اُن کے قتل کا مدعی تھا اُن کے نزدیک اُن کی آمد ثانی محل بحث ہی کیا ہو سکتی تھی پس اگر یہاں قرآنی فیصلہ اُن کے رفع کا ہو جاتا ہے تو اُن کے نزول کا مسئلہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے اور اگر تحقیق یہ ہو کہ وہ مقتول ہوں گے (والعیاذ باللہ) تو پھر ایک شخص کے دوبارہ آمد کی بحث ہی پیدا نہیں ہو سکتی لہذا اگر قرآن کریم کی کسی آیت میں رفع کے صاف لفظ کی طرح نزول کا لفظ مذکور نہیں تو اس سے مسئلہ نزول کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا پھر خاص نزول کا لفظ مذکور ہونا ہی کیوں ضروری ہے جبکہ قرآن کریم یہ تصریح کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ابھی وفات نہیں پائی اور قیامت سے پہلے تمام اہل کتاب کو اُن پر ایمان لانا باقی ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہے اور ابھی تک اُس کو موت نہیں آئی ضرور ہے کہ وہ زمین پر نازل ہوتا کہ اہل کتاب اُن کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اُن پر ایمان لے آئیں اور وہ اپنی مقررہ مدت عمر پوری کر کے دنیا کی آنکھوں کے سامنے وفات پا کر مدفون ہو۔ اسی

لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث روایت کر کے فرماتے ہیں کہ اگر اس پیشگوئی کو تم قرآن کریم کے الفاظ میں دیکھنا چاہو تو سورہ نساء کی یہ آیت پڑھ لو۔ ﴿وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَلْأُولَئِينَ مِنْ قَبْلِ مَوْتِهِ﴾

آیت بالا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لئے جو سب سے زیادہ صاف اور واضح لفظ ہو سکتا تھا وہ قبل موتہ کا لفظ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جس زندہ شخص کی اب تک وفات ثابت نہیں ہوئی اُس کی حیات کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت کیا ہے۔ یہاں جو شخص اُن کی موت کا مدعی ہو یہ فرض اُس کا ہے کہ وہ اُن کی موت ثابت کرے۔ پھر آیت بالا میں خاص اہل کتاب کے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام کو اُن پر اس وقت بھی صحیح ایمان حاصل ہے لہذا جن کا ایمان لانا قابل ذکر ہو سکتا تھا وہ صرف اہل کتاب کا ایمان ہے اب اگر فرض کر لو کہ اہل اسلام بھی نصاریٰ کی طرح اُن کے سولی پر چڑھنے کو تسلیم کرتے ہوں یا یہود کی طرح اُن کے مردہ ہونے کے قائل ہوں تو پھر اہل اسلام کا ایمان بھی اُن پر صحیح ایمان نہیں رہتا اہل کتاب اگر اس بارے میں ایک غلطی پر ہیں تو اہل اسلام بھی دوسرے اعتبار سے غلطی میں مبتلا ہیں پھر اس تخصیص کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

قرآن کریم نے جہاں اُن کی موت کی صاف نفی فرما کر یہ بتایا ہے کہ ابھی آئندہ زمانہ میں اہل کتاب کو اُن پر ایمان لانا باقی ہے اسی طرح دوسری طرف یہ بھی تصریح کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُن پر شہادت دینا باقی ہے ان دونوں باتوں کے لئے اُن کی تشریف آوری لازم ہے کیونکہ شہادت شہود سے مشتق ہے لہذا عیسیٰ علیہ السلام جب تک کہ پھر تشریف لا کر ان میں موجود نہ ہوں اُن پر گواہی کیسے دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ﴾ (المائدہ: ۱۱) یعنی میں اُن پر گواہ تھا جب تک کہ میں ان میں موجود رہا اور جب تو نے مجھ کو اٹھالیا تو تو ہی اُن کا نگران حال تھا۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر دو زمانے گزرے ہیں ان میں سے آپ کی شہادت کا زمانہ صرف وہ ہے جس میں کہ آپ اُن کے اندر موجود تھے اور دوسرا زمانہ جس میں کہ آپ اُن میں موجود نہ تھے وہ آپ کی شہادت سے خارج ہے پس آئندہ اہل کتاب پر آپ کی شہادت کے لئے دوبارہ آپ کی تشریف آوری ضروری ٹھہری۔ اسی لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس آیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی دلیل فرماتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ صحابی جلیل القدر تو نزول کی پیشگوئی کو قرآنی پیشگوئی کہتا ہے ایک بدنصیب جماعت وہ ہے جو اس کو حدیثی پیشگوئی بھی کہنے کو تیار نہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَالَهُ مِنْ نُورٍ

قرآن کریم کے رفع جسمانی اور حدیث کے نزول جسمانی کے اہتمام فرمانے کی حکمت \* حجت حدیث کے

مضمون میں ہم یہ بات پوری وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ حدیث و قرآن کے مابین متن و شرح کی سی نسبت ہے۔ آیات قرآنیہ اور تشریحات حدیثیہ پر آپ جتنا غور کرتے چلے جائیں گے یہ حقیقت آپ کو اتنی ہی روشن ہوتی چلی جائے گی اسی لئے آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ جہاں کہیں قرآن کریم کسی مصلحت کے پیش نظر کسی مسئلہ کا ایک پہلو اپنے بیان میں لے لیتا ہے تو فوراً اُس کا دوسرا پہلو حدیث لے لیتی ہے اور اُس طرح مسئلہ کے دونوں پہلو صاف ہوتے چلے جاتے ہیں اور درحقیقت حدیث کے بیان کہلانے کا



منشا بھی یہی ہے۔ مثلاً جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے صف رجال میں ایک تباہ کن فاحشہ کی بنیاد ڈالی تو قرآن کریم نے اس عمل کی حرمت کا تذکرہ بھی صرف رجال یعنی مردوں ہی میں فرمایا اور صنف نساء میں بے وجہ اس عمل کی حرمت پر زور دینا اپنے انداز بلاغت کے خلاف سمجھا۔ ظاہر ہے کہ جب اس ماحول میں اس نوع کا وجود ہی نہ ہو تو پھر اُس کا تذکرہ کر کے خواہ مخواہ ذہنوں کو اس طرف متوجہ کیوں کیا جائے لیکن چونکہ شرعی نظر میں ان دونوں عملوں کی حرمت یکساں تھی اس لئے حدیث نے صنف نساء میں اس کی حرمت کا اسی شد و مد سے اعلان کیا جس طرح کہ قرآن کریم نے صنف رجال میں اس کی حرمت کا اعلان کیا تھا اور اس طرح دونوں صنفوں کے احکام وضاحت سے ہمارے سامنے آ گئے۔ ہمارے اس بیان سے یہ سوال بھی حل ہو گیا کہ اس عمل کے حرمت کی قرآن کریم میں صنف رجال کی تخصیص اور حدیث میں صنف نساء کی تخصیص کا سبب کیا ہے اسی طرح سماوی عذر کے ایام میں صنف نساء کے ساتھ حدود و اعتزال اور اختلاط کا مسئلہ ہے یعنی اس زمانہ میں عورتوں سے کس حد تک الگ رہنا چاہیے اور کہاں تک اُن سے اختلاط رکھا جاسکتا ہے۔ یہاں یہود نے تو اجتناب نجاسات کے باب میں اتنا مبالغہ کر رکھا تھا کہ ان ایام میں وہ اپنے گھروں میں بھی داخل نہ ہوتے تھے اور نصاریٰ نے اتنی لا پرواہی اختیار کر لی تھی کہ نجاسات سے اجتناب کرنے کا ان کے ہاں باب ہی ندارد تھا۔ دیکھو الجواب (صحیح ج ۱ ص ۲۳۲) جب اس مسئلہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا تو چونکہ یہاں قرآن کریم نے اپنے بیان میں اعتزال کا پہلو لے لیا تھا اور یہی ضعف بشریٰ کے مناسب بھی تھا اور صاف فرمادیا تھا کہ ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ﴾ ان ایام میں عورتوں سے الگ رہو۔ تو اس کے جواب میں آپ نے اپنے قول و عمل سے فوراً حدود و اختلاط بیان فرمادئے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جب آیت ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ﴾ نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿اصنعوا كل شيء الا النكاح﴾ یعنی ان ایام میں ہم بستری کے علاوہ سب کچھ جائز ہے۔ اب اندازہ فرمائیے کہ قرآن کریم نے تو لفظ اعتزال کا فرمایا تھا پھر آپ نے اُس کی تشریح میں حدود و اختلاط کیوں بیان فرمائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حدود و اعتزال اس وقت تک معین ہی نہیں ہو سکتی تھیں جب تک کہ حدود و اختلاط بیان میں نہ آجائیں۔ و بصل ما تبين الاشياء لهن ايهااں وہ حدیثیں جو ان ایام میں امہات المؤمنین کے ساتھ آپ کے اختلاط کے متعلق روایت کی گئی ہیں اسی روشنی میں پڑھنی چاہئیں تاکہ یہ بات پورے طور پر حل ہو جائے کہ ان میں آپ نے اس تاکید کے ساتھ اُس کی عملی وضاحت کی کیا ضرورت سمجھی تھی۔ غرض جہاں بھی قرآن کریم نے مسئلہ کے عموم کے باوجود کسی وقتی مصلحت سے اس کا ایک پہلو بیان میں لے لیا ہے وہاں اس کا دوسرا پہلو فوراً حدیث نے لے لیا ہے اور درحقیقت حدیث کے بیان ہونے کا یہی منشاء بھی ہے۔ اسی مقام سے حدیث کی اہمیت اور اُس کی ضرورت کا اندازہ کر لینا چاہیے۔

اس مقدمہ کے ذہن نشین کر لینے کے بعد جب آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معاملہ پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جب قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کا مسئلہ وضاحت سے آچکا تھا تو یہاں حدیث کا فرض بھی ہونا چاہئے کہ وہ اسی ضابطہ کے ماتحت رفع کے بعد نزول کا مسئلہ جو اُس کا دوسرا پہلو ہے پورے طور پر روشن کر دے اسی لئے نزول کا دوسرا پہلو حدیثوں میں اتنی تفصیل و تاکید سے قسمیں کھا کھا کر بیان کیا اور اس کو مختلف صحابہ اور مختلف مجلسوں میں پیرایہ بہ پیرایہ اتنا واضح فرما

دیا کہ ایک طرف تو عیسیٰ علیہ السلام کے نزول میں کسی شبہ کا محل باقی نہیں رہا۔ دوسری طرف قرآن کریم کے لفظ رفع کی ایسی تشریح ہوگئی کہ اب اس میں ادنیٰ سا ابہام بھی باقی نہ رہا۔ اب آپ قرآنی لفظ رفع اور حدیث کے لفظ نزول کو جتنا ملا کر پڑھیں گے اتنا ہی اُن کے رفع جسمانی اور نزول جسمانی کا مسئلہ آپ کے سامنے کھلتا چلا جائے گا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص جسم کے ساتھ اترے گا وہ یقیناً جسم ہی کے ساتھ اٹھایا گیا ہے اور جو جسم کے ساتھ اٹھایا گیا ہے اس کو یقیناً دوبارہ اپنے جسم ہی کے ساتھ اترنا چاہئے۔

اب یہ عقیدہ بھی حل ہو گیا کہ حدیثوں میں جس کثرت کے ساتھ نزول کا تذکرہ ملتا ہے اس کثرت کے ساتھ رفع جسمانی کا تذکرہ کیوں نہیں ملتا اور اسی طرح قرآن کریم میں جس صراحت کے ساتھ رفع جسمانی کا تذکرہ ملتا ہے اس صراحت کے ساتھ نزول کا تذکرہ کیوں نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب قرآن کریم ان کے رفع کی تصریح فرما چکا تھا تو اب حدیث کی نظر میں یہ مسئلہ تو ایک طے شدہ مسئلہ تھا اس کے تکرار کی ضرورت کیا تھی اس لئے حدیثوں میں اس کے دوسرے پہلو پر یعنی نزول پر زور دیا گیا ہے اور اسی پہلو پر زور دینا مناسب بھی تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جتنی تفصیلات ثابت ہو چکیں کیا اسکے بعد بھی یہاں تاویل کرنا معقول ہے \* حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ ہر ممکن تشریح کے ساتھ معرض بیان میں آچکا ہے یعنی آپ کا اسم مبارک آپ کا نام و نسب اور اس خاص نسب نامہ کی خصوصیت یعنی صرف ماں سے آپ کی پیدائش آپ کا حلیہ مبارک اس شہر کا نام جہاں آپ کا نزول ہوگا اور پھر خاص اس جگہ کا نام بھی جہاں آپ کا نزول ہوگا، نزول کا وقت اور اس وقت آپ کا مکمل نقشہ نزول کے بعد پہلی نماز میں آپ کا امام یا مقتدی ہونا، آپ کا منصب، آپ کی خدمات مفوضہ، آپ کی مدت قیام، آپ کے دور کی محیر القول فراوانی اور عدل و انصاف، آپ کی زندگی کے اہم کارنامے، آپ کی شادی کرنا اور اولاد ہونا حتیٰ کہ آپ کا وفات پانا اور آپ کے مدفن کی مکمل تحقیق۔ اب انصاف سے فرمائیے کہ اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے آپ کو اور کن تفصیلات کا انتظار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی واقعہ کی تعیین و تشریح کے لئے اس سے زیادہ آخر اور کیا طریق اختیار کیا جائے۔ آج دنیوی مقدمات میں صرف مدعی اور مدعی علیہ اور اُن کے باپ دادوں کے نام ان کی تعیین کے لئے کافی سمجھے جاتے ہیں اور آئندہ ہم قدمہ کی تمام کارروائی اسی معین شدہ شخص سے متعلق سمجھی جاتی ہے اسی طرح خطوط، بیسے، منی آرڈر اور رجسٹریاں وغیرہ صرف شہر اور اس شخص کے نام لکھ دینے سے اس کو تقسیم کردی جاتی ہیں حیرت ہے کہ جب دنیا کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ میں معمولی درجہ کی تعیین کافی سمجھی جاتی ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اتنی مفصل تاریخ کیوں ناکافی ہے۔ اچھا فرض کر لیجئے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ آپ خود اپنی عبارت میں ادا کرنا چاہیں تو آخر آپ وہ اور کس طرح ادا کریں گے کہ اس کے بعد اس میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ اگر درحقیقت اس پیشگوئی کا مصداق رسول اسرائیل کی بجائے خود اسی امت کا کوئی فرد ہو جو اسی امت میں پیدا ہونے والا ہو جس کا نہ یہ نام ہو نہ یہ نسب نامہ نہ یہ حلیہ نہ یہ جائے نزول نہ یہ منصب اور نہ یہ کارنامے تو کیا اس بیان کو ایسے شخص کے حق میں ایک گمراہ کن بیان نہ کہا جائے گا۔ کیا آج کسی شخص کی پیدائش کا معمولی مسئلہ کوئی ادنیٰ زبان داں شخص بیان کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اسی طرح اس کو مجاز و استعارہ کی بھول بھلیاں میں ادا کرے گا چہ جائے کہ ایک رسول اور رسول بھی وہ جو انصح العرب والعجم ہو پس اگر دنیوی معاملات میں



بادشاہوں سے لے کر فقراء اور اولیاء سے لے کر رسولوں تک کی پیدائش کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کئے جاتے تو پھر مجاز و استعارہ کی یہ ساری رام کہانی خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے بارے میں کیوں گائی جاتی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے معاملہ میں سب سے زیادہ اہم لفظ رفع کا ہے توفی کا لفظ قرآن کریم کی نظر میں اتنا اہم نہیں \* حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں سورۃ آل عمران میں تین لفظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ توفی۔ رفع الی اللہ اور تطہیر اور سورۃ نساء میں جہاں اُن کے مقدمہ پر خاص طور پر بحث کی گئی ہے وہاں صرف رفع الی اللہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ان تینوں الفاظ میں تطہیر کا لفظ توفی و رفع کے تابع ہے کیونکہ کفار سے ان کی تطہیر کا مقصد ان سے ان کی علیحدگی تھی اب وہ خواہ کسی صورت سے بھی ہو اس لئے قابل بحث دو ہی لفظ ہیں۔ توفی۔ رفع الی اللہ۔ ان دو میں سے جس لفظ کو ان کے مقدمہ میں بصیغہ ماضی ذکر کیا گیا ہے وہ صرف لفظ رفع کا ہے جس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ توفی اور رفع کے دو وعدوں میں سے رفع کا وعدہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے پہلے پورا ہو چکا تھا اور اسی لئے اس کو بصیغہ ماضی ذکر نہیں فرمایا گیا۔ ہاں سورۃ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی زبان سے توفی کا لفظ گو بصیغہ ماضی استعمال کیا گیا ہے۔ مگر حسب تصریح قرآن کریم وہ ان کے مقدمہ کے ذیل میں نہیں ہے بلکہ اس سوال کے جواب میں ہے جو محشر میں اُن سے ہوگا اور ظاہر ہے کہ قیامت سے قبل اُن کی موت واقع ہونا سب کو مسلم ہے لیکن جہاں قرآن کریم نے اُن کے مقدمہ پر بحث کی ہے اور اُن کے معاملہ کے انکشاف کی طرف توجہ فرمائی ہے وہاں صرف لفظ رفع ہی استعمال فرمایا ہے اور توفی کا لفظ ذکر نہیں فرمایا جیسا کہ سورۃ نساء میں ہے۔ ﴿وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ﴾ یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی طرف اٹھالیا۔ اگر توفی کے معنی موت ہوتے اور اُن کی موت واقع ہو چکی ہوتی تو ضروری تھا کہ یہاں بل تَوَفَّاهُ إِلَيْهِ فرمایا جاتا۔

خلاصہ یہ کہ اس معاملہ میں اصل فیصلہ کن لفظ رفع کا ہے اسی لئے مقدمہ کے فیصلہ میں خاص طور پر اسی لفظ پر زور دیا گیا ہے اور توفی کے لفظ کو اہمیت نہیں دی گئی اس لئے یہاں جنہوں نے لفظ توفی کی لغوی تحقیق پر اپنا وقت خرچ کیا ہے وہ بالکل ضائع کیا ہے کیونکہ توفی خواہ کسی معنی میں بھی مستعمل ہو مگر قرآن کریم نے اپنے فیصلہ میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ کیا یہ امر قابل غور نہیں ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی موت واقع ہو چکی تھی تو آخر ہر مقام پر اس حقیقت کا اخفاء کیوں کیا گیا ہے اور کیوں صاف الفاظ میں یہ نہیں فرمادیا گیا۔ ﴿وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ مَاتَ﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ پوری تفصیلات کے ساتھ زیر بحث آچکا ہے یہاں اُن کے معاملہ میں ایک ایک لفظ پر علیحدہ بحث کرنا معقول نہیں \* یہ بات بھی بڑی اہمیت کے ساتھ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معاملہ قدرے مشترک طور پر ایک قومی تو اتر رکھتا ہے۔ کتب سابقہ سے لے کر قرآن کریم اور احادیث نبویہ تک اُس کے جزئی جزئی واقعات کی تفصیل آچکی ہے۔ یہاں کتب لغت اٹھا کر صرف نزول یا صرف لفظ رفع یا صرف توفی کے الفاظ پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنی صرف ایک بے معنی بحث ہے بلکہ ایک حقیقت کے مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ ان کے بارے میں

جتنے تفصیلی واقعات معرض بیان میں آچکا ہیں اُن کی روشنی میں ان الفاظ کے معنی متعین کئے جائیں کیونکہ الفاظ صورت واقعہ کے بغیر ایک وسیلہ ہوتے ہیں یہاں واقعہ سے قطع نظر کر کے الفاظ میں مجاز و استعارہ کی بے وجہ بحث کھڑی کر دینی حد درجہ غیر معقول ہے۔ پس کسی لفظ کے معنی حقیقی یا مجازی متعین کرنے کے لئے صرف لغت کی عام بحث شروع کر دینی صحیح طریقہ نہیں بلکہ پہلے اُس کے استعمال کا محل اور دوسرے قرائن اور خارجی حالات پر نظر ڈالنی بھی ضروری ہے۔ مثلاً لفظ ”اسد“ عربی زبان میں اس کے معنی ”شیر“ ہیں۔ اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ عربی اردو محاورات میں ایک بہادر شخص کو بھی مجازاً شیر کہہ دیتے ہیں اب کسی سے صرف ہذا اسد کا جملہ سن کر یہی رٹ لگائے جانا کہ اس جملہ کا مقصد صرف کسی بہادر شخص کی طرف اشارہ کرنا ہے اور اس محاورہ کے لئے دوا دین عرب اور شعراء کے کلام سے استدلال کرتے چلے جانا کتنی بڑی غلطی ہے۔ بسا اوقات اس کے متکلم کے لئے باعث ہلاکت بھی بن سکتی ہے یہاں اس بحث سے پہلے یہ تحقیق کرنی ضروری ہوگی کہ یہ جملہ کس مقام پر کہا گیا ہے بستی میں یا جنگل میں کسی عام مجمع میں یا کسی بیابان میں سیاق کلام کسی کی مدح و ثنا کا ہے یا خوف و ہراس کا۔ اب اگر یہ جملہ جنگل میں کسی شخص کی زبان سے نکلتا ہے جس کے سامنے شیر کھڑا ہے اس کی آواز کانپ رہی ہے اور جسم لرز رہا ہے تو اس وقت انصاف فرمائیے کہ لفظ ”اسد“ کے مجازی معنی یعنی بہادر انسان مراد لینا اور اس کے لئے ہزاروں اشعار پڑھ ڈالنا اور یہی کہے چلے جانا کہ اس شخص کی مراد شیر نہیں بلکہ ایک بہادر انسان کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ کیا ایک صحیح العقل انسان کا کام ہو سکتا ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زیر بحث معاملہ میں بھی ان تمام تفصیلات کو پیش نظر رکھنا لازم ہے جو صحیح طریقوں سے ثابت ہیں پھر جب اس طرف بھی نظر کی جائے گی کہ قرآن و حدیث میں جو جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ الفاظ کسی دوسرے شخص کے حق میں بیک وقت آج تک استعمال نہیں کئے گئے تو یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ ان کا معاملہ ہی سب سے جداگانہ معاملہ ہے چنانچہ لفظ توفیٰ اور رفع کا علیحدہ علیحدہ استعمال قرآن کریم میں آپ کو بہت جگہ نظر آئے گا۔ لیکن ایک ہی شخصیت کے بارے میں یہ دونوں لفظ ایک ہی سیاق میں کسی دوسری شخصیت کے متعلق آپ کو کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ سورہ آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں یہ ہر دو لفظ اس طرح سے فرما دیئے گئے ہیں۔

يَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَرَافِعَكَ اِلَىٰ - ان کے علاوہ کسی کے حق میں ان دونوں لفظوں کو جمع نہیں کیا گیا۔ اسی طرح نزول کا لفظ بھی محاورات میں بہت جگہ آپ کی نظروں سے گزرے گا لیکن نزول کے ساتھ رفع اور رفع کے ساتھ نزول پھر نزول کی اتنی تفصیلات کسی ایک مقام پر بھی کسی کے حق میں آپ کی نظروں سے نہیں گذریں گی نہ کسی لغت میں نہ شعراء کے کلام میں نہ کسی آیت میں اور نہ کسی حدیث میں پس جب آپ ان جملہ امور پر غور کریں گے کہ حدیث و قرآن میں جو الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں وہ کسی بشر کے لئے بیک وقت ایک جگہ جمع نہیں کئے گئے تو پھر صرف ایک یہی نتیجہ بدیہی ہو کر آپ کے سامنے آ جائے گا کہ ان کا معاملہ بھی یقیناً سب سے الگ معاملہ ہے۔ یہاں ایک ایک لفظ کو علیحدہ علیحدہ لے کر بحث کرنا یا اس میں مجاز و استعارہ کی آڑ لینا کتنا بے جا ہے سوال سیدھا یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں قرآن و حدیث میں بیک وقت یہ سب الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اسی کے ساتھ اس کے یہ تفصیلی سوانح حیات بھی موجود ہیں کیا اس کے بعد بھی ان میں لغوی موشگافیوں اور مجاز و استعارہ کی تاویلات کی گنجائش نکل سکتی ہے۔



اسلام صرف علمی مذہب نہیں بلکہ سلف صالحین سے اس کی عملی صورت بھی منقول چلی آتی ہے۔ لہذا محض کتب لغت کی حدود سے اس کی کوئی اور شکل بنالینا درست نہیں \* یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اسلام صرف ایک علمی مذہب نہیں ہے جس کو صرف دماغی کاوشوں نے پیدا کیا ہو بلکہ وہ ایک مجموعی شکل و صورت کے ساتھ عملاً بھی منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ ہمارے دین کا تمام تر تعلق اوپر سے ہے ہم نیچے سے کسی نئے دین تراشنے کے مجاز نہیں اس کے بانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے ان سے صحابہ نے اس کے شعبہ اعمال اور اس کے بنیادی عقائد بھی سیکھے آپ نے ان پر خود بھی ایمان رکھا اور ان ہی پر بعد کی امت کو ایمان رکھنے کی وصیت فرمائی اور پھر کسی درمیان انقطاع کے بغیر اسی طرح دین سپرد ہوتا رہا ہے۔ ادھر حفاظت الہیہ کا یہ عجیب کرشمہ تھا کہ بحث و تمحیص کا جو مرحلہ تھا وہ سب تبع تابعین کے ماحول ہی میں ختم ہو چکا تھا یہ وہ قرآن ہے جس کے متعلق خیریت کی شہادت خود لسان نبوت سے نکل چکی ہے اس لئے جب کسی دین کے مسئلہ پر بحث کی جائے تو اس کو محض دماغی کاوش اور لغت کی مدد سے سر نو شروع کر دینا ایک بنیادی غلطی ہے یہاں ریسرچ کے اصول کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ کام خود انبیاء علیہم السلام کا بھی نہیں اس کو قدرت نے براہ راست خود اپنے ہی دست قدرت میں رکھا ہے۔ ان کی بھی مجال نہیں کہ حکم ایزدی کے بغیر وہ ایک نقطہ کا اضافہ یا ایک نقطہ کی ترمیم کر سکیں چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالِی الَّذِیْنَ لَا یُرْجُوْنَ لِقَاءَ نَآئِثِ بَقْرٰنٍ غَیْرِ هٰذَا اَوْ بَدَّلَہٗ قُلُ مَا یَكُوْنُ لٰی اَنْ اُبَدَّلَہٗ مِنْ تَلْقَآءٍ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ. الخ (یونس: ۱۵)

جب ہمارے کھلے کھلے احکام ان لوگوں کو پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تو جن لوگوں کو ہماری ملاقات کی امید نہیں وہ تم سے یہ فرمائش کرتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا کم از کم اسی میں کچھ رد و بدل کر دو ان سے کہہ دو کہ میرا تو ایسا مقدور نہیں کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی رد و بدل کر سکوں میں تو اسی پر چلتا ہوں جو میرے پاس وحی آتی ہے۔

اس ترمیم و تبدل کا انحصار کچھ الفاظ ہی پر نہیں ہے بلکہ اس کے معانی کو بھی شامل ہے اور وہ لفظی ترمیم سے زیادہ شدید ہے۔ یہود بے بہود نے دونوں قسموں کی تحریفیں کی تھیں تو رات کے الفاظ میں بھی اور ان کے معانی میں بھی قرآن کریم چونکہ آخری کتاب تھی اس لئے وہ دونوں قسموں کی تحریفوں سے محفوظ ہے لفظی ترمیم کا تو یہاں کوئی امکان ہی نہیں رہی معنوی ترمیم و تحریف تو امت کے بعض ملحد فرقوں نے گواہی میں یہود کو بھی مات دے دی ہے مگر اس کی معنوی حفاظت کی وجہ سے وہ اصل دین پر کچھ اثر انداز نہیں ہوگی اور ہر دور میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کیا جاتا رہا ہے پس اگر کوئی شخص آج یہ دعویٰ کرنے لگے کہ نمازیں پانچ نہیں صرف دو ہیں اور اسی کے لئے دماغی تراشیدہ دلائل کا ڈھیر لگا دے تو بالکل بے سود سعی ہے اس کو یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ امت اوپر سے بھی صرف دو ہی نمازیں پڑھا کرتی تھی۔ بلکہ اس کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ پانچ نمازوں کی فرضیت اگر غلط ہے تو پھر اس کی بنیاد کس دن سے قائم ہوئی اسی طرح مسئلہ جنت و دوزخ، فرشتے اور جنات وغیرہ کی حقیقتیں صرف لفظی بحثوں سے نئی نئی بنا کر پیش کرنی بھی غلط ہے کیونکہ یہ الفاظ جس طرح اوپر سے منقول ہوتے چلے آئے ہیں اسی طرح ان کے معانی بھی اوپر ہی سے مفہوم اور معلوم ہوتے چلے آئے ہیں اسی طرح ختم نبوت اور نزول مسیح علیہ السلام کے الفاظ کا حال ہے یہ بھی امت میں ہمیشہ سے مستعمل ہوتے

چلے آئے ہیں اور ہر دور میں اس کے صرف یہی ایک معنی سمجھے گئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں بنے گا اور اسی کے ساتھ یہ بھی منقول ہوتا چلا آیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آنے والے ہیں اب ذرا اس پر غور فرمائیے کہ ایک طرف نبی کی آمد کی ممانعت بھی منقول ہے اور اسی کے ساتھ اسرائیلی رسول کی آمد بھی منقول ہے۔ اب اگر کوئی صرف اپنی دماغی کاوش سے یہ کہنے بیٹھ جائے کہ جب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں تو عیسیٰ علیہ السلام بھی نہیں یا اگر عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو اور نبی بھی آئیں گے تو اس کا حاصل صرف اپنی دماغی کاوش سے ایک علمی دین بنانا ہوگا اس کو منقول شدہ دین نہیں کہا جاسکتا اور اگر فرض کر لو کہ ہمارا کہنا صحیح نہیں تو پھر آپ کو کسی تاریخ سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ فلاں تاریخ سے اس غلط عقیدہ کی بنیاد قائم ہوئی ہے مگر یہاں اسلامی تاریخ تو درکنار اگر اس بارے میں دوسرے اہل مذاہب سے آپ اس امت کا عقیدہ پوچھیں تو وہ بھی کسی تردد کے بغیر آپ کو یہی بتائیں گے کہ ان کے نزدیک کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا ہاں وہی عیسیٰ علیہ السلام اسرائیلی رسول آئیں گے اس وقت یہ بحث نہیں ہے کہ یہ عقیدہ خلاف قیاس ہے یا نہیں اور نزول کے اور خاتم کے لغت میں معنی کیا ہیں اور ختم نبوت اور نزول میں حروف تطبیق کیا ہے۔ بلکہ بحث صرف یہ ہے کہ امت میں ان الفاظ کے معنی کیا سمجھے جاتے رہے ہیں تو آپ صرف اسی ایک مذکورہ بالا نتیجہ پر پہنچیں گے یہی وجہ ہے کہ تفسیروں میں اور شروح حدیث میں کتب عقائد میں اور دین کے تمام معتبر لٹریچر میں اسی حقیقت کو دہرایا گیا ہے اور اسی حقیقت کے ماتحت ہر مدعی نبوت اور ہر مدعی مسیحیت کی تکفیر و تردید کی گئی ہے لہذا یہاں صرف مجاز و استعارہ یا نا تمام نقول یا مبہم یا محرف الفاظ سے کوئی ایسی حقیقت تراش لینی جو آج تک امت کے بیان کردہ حقیقت کے برعکس ہو دین محمدی کہلانے کے قابل نہیں اس کو نیا دین کہنا بجا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق آیات پر غور کرنے سے قبل یہاں ان کے مقدمہ کی پوری وہ روئداد جو قرآن کریم نے نقل فرمائی ہے اور فریقین کے بیانات پیش نظر رکھنا ضروری ہیں \* قرآن کریم پر غور کرنے سے قبل یہاں یہ غور کر لینا بھی ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جو مسئلہ زیر بحث آیا ہے وہ کیا مسئلہ ہے اور وہ کیوں زیر بحث آیا ہے۔ جب آپ اس طرف توجہ فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سورہ نساء میں جس امر کی اہمیت محسوس کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو قوم کل تک خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کا گہوارہ بنی ہوئی تھی آخر کیوں یک لخت وہ ان تمام نعمتوں سے محروم کر دی گئی اور کیوں نعمتوں کی بجائے لعنت کا مورد بن گئی اس سلسلہ میں قرآن کریم نے ان کے ان پے در پے جرائم کا ذکر کیا ہے جو ایک سے ایک بدتر تھے اور جس کی کہ یہ قوم عادی بن چکی تھی جو جرم ان کے یہاں شمار کئے گئے ہیں ان میں کچھ تو ان کے حیاناک اقوال ہیں اور کچھ زشت افعال۔ ان کے زشت افعال میں خدا تعالیٰ کے مقدس انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا اور ان کے حیاناک اقوال میں معصومہ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان طرازی اور ان کے ملکی صفت فرزند مطہر کے متعلق قتل کرنے کا دعویٰ کاذب ہے۔ اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ یہاں یہود ملعون کا بیان کیا ہے اور پھر ان بیانات ہی کی روشنی میں قرآنی فیصلہ پر غور کرنا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کی حیثیت چونکہ ایک حکم اور فیصل کی ہے اس لئے ہم کو یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جس معاملہ کے متعلق قرآن کریم نے فیصلہ فرمایا ہے اس میں فریقین کے بیانات کیا نقل کئے ہیں یہاں کسی ایک حرف کا اپنی جانب سے



اضافہ کرنا جو مقدمہ کی جان ہو قرآن پر خیانت یا عجز کا بڑا اتہام ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہر عدالت کے لئے یہ کتنا ضروری ہے کہ وہ فریقین کے بیانات نہایت احتیاط کے ساتھ ضبط کرے اور بالخصوص جو اجزاء کسی فریق کے مقدمہ کی اصلی روح ہوں ان کو پورے طور پر واضح کر دے آج بھی اگر کوئی عدالت فریقین کے بیانات قلمبند کرنے میں ایسی تقصیر کر جائے تو اس کے حق میں یہ کتنا بڑا سنگین جرم شمار ہوتا ہے پس ہمارے نزدیک جو بات یہاں صورت واقعہ کو آسانی سے حل کر دے سکتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے ہم فریقین کے بیانات کو حاشیہ آرائی کے بغیر دیکھیں اس کے بعد کسی تاویل کے بغیر قرآنی فیصلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس قاصرہ کے موافق جب ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ سامنے رکھتے ہیں تو جو بیان ہم کو یہاں یہود کا ملتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم نے ان کو قتل کر ڈالا ہے رہا یہ کہ کس غرض سے ان کو قتل کیا ہے اور کس آلہ سے قتل کیا ہے اس کو انہوں نے نہ یہاں بیان کیا ہے اور نہ یہ باتیں ان کے نزدیک کچھ اہم معلوم ہوتی ہیں۔ جس بات پر انہوں نے اپنے بیان دعویٰ میں زور دیا ہے۔ وہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کی تشخیص و تعیین ہے دوم ان کے قتل کرنے کا پورا جزم و یقین ہے اسی لئے مقتول کے صرف نام یا لقب ہی پر انہوں نے کفایت نہیں کی بلکہ خاص طور پر ان کی خاص مادری نسبت کا بھی ذکر کیا ہے یعنی والد کے بغیر پیدائش اور اس سے بھی زیادہ یہ کہا ہے کہ یہ شخص وہی ہے جو ”رسول اللہ“ کہلاتا ہے اس کے بعد انہوں نے اپنی جس جرأت کا بے باکانہ ذکر کیا ہے وہ قتل کا جرم ہے چنانچہ اس کو بھی انہوں نے لفظ ”اِنَّ“ سے ذکر کیا ہے جو عربی زبان میں جزم و یقین کے لئے مستعمل ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ان کو نہ تو اپنے فعل قتل میں کوئی شبہ ہے اور نہ اس مقتول کی ذات میں کوئی شبہ ہے جس کے قتل کا ان کو دعویٰ تھا۔ اس سے زیادہ کوئی اور بات یہاں نقل نہیں کی گئی۔ اس لئے قرآنی فیصلہ بھی ہم کو صرف اسی بیان کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

نصاری کے متعلق یہاں قرآن کریم نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ وہ یقینی طور پر کوئی بات نہیں کہتے مختلف باتیں بناتے ہیں اور چند جو بات کی بناء پر حقیقت کا ان کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے اس لئے صرف انکل کے تیر چلانے کے سوا ان کے لئے چارہ کار ہی کیا ہے ہاں اجمالی طور پر ان کا یہ خیال ضرور تھا کہ وہ اپنے جسم ناسوتی یا لاحوتی کے ساتھ آسمانوں پر اٹھائے گئے۔ اب ظاہر بات ہے کہ قرآنی الفاظ کے مطابق جو بات یہاں متنازع فیہ نظر آتی ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صرف زندہ شخصیت ہے۔ یہود کہتے تھے کہ ہم نے ان کو قتل کر ڈالا ہے اور نصاریٰ اس خیال میں تھے کہ وہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں۔ ان کی روح کے متعلق یہاں کوئی تذکرہ ہے اور نہ روح کا تذکرہ معرض بحث میں لایا جاسکتا ہے کیونکہ روح کا معاملہ ایک غیبی معاملہ ہے وہ انسان کے ادراک سے بالاتر بات ہے۔ اس پر نہ یہود کوئی حجت قائم کر سکتے ہیں اور نہ قرآنی بیان کو وہ تسلیم کرتے ہیں اس لئے حسب تصریح قرآن کریم ان کے دعویٰ ہی میں روح زیر بحث نہ تھی تو فیصلہ میں اس کا ذکر کیسے آسکتا ہے ظاہر ہے کہ قتل کا فعل جسم پر وارد ہوتا ہے روح پر وارد نہیں ہو سکتا۔ لہذا ان کے مقابلہ میں جب قرآنی فیصلہ یہ ہو کہ وہ مقتول نہیں ہوئے بلکہ مرفوع ہوئے ہیں تو یہاں رفع سے جسم ہی کا رفع مراد ہوگا نہ کہ روح کا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے اور ان کے عزت سے مرجانے کی جدید داستان \* یہاں ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا تھا ان کے سر پر کانٹوں کا تاج بھی رکھا، منہ پر تھوکا بھی

اور جو کچھ نہ کرنا تھا وہ سب کچھ بھی کر لیا تھا (والعیاذ باللہ) حتیٰ کہ جب ان کو پورا یقین ہو گیا کہ انہوں نے ان کو درحقیقت مار ڈالا ہے تو ان کو سولی سے اتار اگر ان میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی آخر وہ چھپ کر کشمیر یا دنیا کے کسی اور غیر معروف شہر میں آ کر اپنی موت سے مر گئے تھے۔ اس جماعت کے نزدیک یہود کا یہ گمان تھا کہ جو شخص بھی صلیب کے ذریعہ مارا جاتا ہے وہ لعنتی موت مرتا ہے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے کی بجائے اُن کا ملعون ہونا ثابت کریں اس لئے اُن کے نزدیک یہ از بس ضروری تھا کہ ان کی موت صلیبی موت ہوتا کہ وہ ان کے لعنتی ہونے کا ثبوت بن سکے۔ اس جماعت کو یہود کے یہ سب جرائم مسلم ہیں یعنی ان کا سولی دینا اور تمام اہانت کے اسباب کا ارتکاب کرنا حتیٰ کہ ان کو اس نوبت میں پہنچا دینا کہ ان کے حق میں زندگی کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہے اور یہاں قرآنی تردید کا حاصل صرف یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ میں گو اسباب موت سب پورے ہو چکے تھے مگر ان میں کچھ جان باقی رہ گئی تھی اس لئے وہ صلیبی موت سے نہیں مرے بلکہ کہیں جا کر خود اپنی موت سے مرے ہیں اس لئے ان کی موت لعنتی موت نہیں ہوئی بلکہ ان کو بڑی عزت کی موت نصیب ہوئی ہے اور ان کے بڑے درجے بلند ہوئے ان کے نزدیک بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ کی تفسیر یہی ہے۔

اب اگر واقعہ درحقیقت یہی تھا جو اس جماعت کا خیال ہے تو یہاں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

(الف) اگر درحقیقت یہود کا دعویٰ یہاں ان کی صلیبی موت کا تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ان کے بیان میں صلیب کا دعویٰ نقل نہیں کیا اور کیوں قتل کا ایک عام لفظ نقل کیا ہے۔

(ب) اور کیا وجہ ہے کہ جبکہ ان کا تمام زور صلیبی موت کے متعلق تھا تو تردید میں صرف نفی قتل پر زور دیا گیا ہے اور کیوں ایک ایسے غیر متعلق جرم کی نفی پر زور دیا گیا ہے جس کی نفی سے اُن کے دعویٰ کی تردید کا کوئی تعلق نہیں تھا یعنی فعل قتل ظاہر ہے کہ یہ ایک عام جرم ہے جو صلیب اور غیر صلیب ہر آلہ سے حاصل ہو سکتا ہے قتل کی نفی پر تو زور نہ دینا اور ایک عام جرم کی نفی پر زور دینا یہ کہاں تک مناسب ہے۔

(ج) پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے اگر ایک بار صلیب کا انکار بھی کیا تو وہ بھی ایسے محل پر کیا ہے جو اس کا صحیح محل نہ تھا یعنی جب قرآن کریم ان کی لعنتی موت تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کی بجائے ان کی موت کو عزت کی موت قرار دیتا ہے تو پھر بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کو مقابل بنا کر ذکر کرنا چاہیے تھا اور یوں کہنا تھا کہ وَمَا صَلَبُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہاں بھی قرآن کریم نے خاص صلیب کی بجائے صرف ایک عام فعل قتل کی نفی فرمائی ہے اور یوں فرمایا ہے کہ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ۔

(د) اس تفسیر کی بناء پر یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ جو چیز موقعہ واردات پر واقع ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ کشمیر یا اور کسی طرف چلے گئے تھے رہا ان کی موت کا مسئلہ تو اگر ان کی موت کہیں جا کر واقع ہوئی تو یہ سالوں یا مدتوں بعد کا معاملہ ہے پس جو بات یہاں صورت حال بتانے کے لئے ضروری تھی اس کو کیوں حذف کر دیا گیا ہے اور صاف طور پر یہ کیوں نہیں فرما دیا گیا کہ یہود نے ان کو سولی نہیں دی بلکہ وہ زندہ کشمیر وغیرہ کہیں چلے گئے تھے تا کہ یہ بات واضح ہو جاتی کہ صلیبی موت سے بچنے کی ان کی شکل کیا ہوئی پس اصل



حقیقت کا تو اخفاء کرنا اور موت کی ایک عام سنت کا بیان کرنا یہ کس درجہ بے محل اور غیر متعلق بات ہے۔

(ھ) اس سے بڑھ کر یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اصل بات ان کی طبعی موت تھی تو یہاں بل دفعہ اللہ الیہ کی بجائے بل توفاه اللہ کہنا زیادہ مناسب تھا تا کہ ثابت ہو جاتا کہ وہ صلیبی موت سے نہیں مرے بلکہ طبعی موت سے مرے ہیں اور جب اپنی طبعی موت سے مرے ہیں تو رفع درجات کا مسئلہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے پس اگر صورت حال کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ اسی صورت سے ہوتا ہے کہ یہاں ان کی طبعی موت کا ذکر کیا جائے۔

لیکن آیت بالا میں یہاں ان تینوں الفاظ میں سے کوئی لفظ نہیں ہے۔

نہ یہ (۱) وَمَا صَلَّبُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ۔

نہ یہ (۲) وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ اذْهَبَهُ اللَّهُ إِلَى الْاَكْشَمِيرِ۔

نہ یہ (۳) وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ تَوَفَّاهُ اللَّهُ۔

اب اگر ہم اس جماعت کے خیالات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں تو ہم کو یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ سرے سے یہود کا اصل دعویٰ ہی یہاں مذکور نہیں یعنی خاص صلیب دینا کیونکہ ان کے بیان کے مطابق ان کی لعنتی موت ہونا اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ان کی موت صلیب کے ذریعہ واقع ہوئی ہے اس لئے یہاں ان کے دعوے میں قتل کے عام جرم کا نقل کرنا مدعیین کے دعویٰ کے بھی اور ان کے مقاصد کے بھی بالکل خلاف ہیں۔ اسی طرح جب ہم قرآن کریم کے فیصلہ پر نظر کرتے ہیں تو یہاں بھی واقعہ کی اصل صورت بالکل مبہم نظر آتی اور صورت حال کا کچھ انکشاف نہیں ہوتا کیونکہ نہ یہاں ان کے کشمیر جانے کا ذکر ہے نہ ان کے طبعی وفات پانے کا کوئی تذکرہ ہے اس لئے اس کا کوئی انکشاف نہیں ہوتا کہ ملزمین جس کے قتل کے اس شد و مد کے ساتھ مدعی تھے اور اگر وہ شخص مقتول نہیں ہوا تو آخر پھر کدھر گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے متعلق جو نہ صرف ان کے زیر حراست آچکا تھا بلکہ ان کی آنکھوں کے سامنے مر بھی چکا تھا صرف یہ کہہ دینا کہ وہ سولی پر نہیں مرا تھا بلکہ عزت کی موت مرا تھا کیا تشفی بخش تھا ہاں اگر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم نے اس کو فلاں مقام پر بھیج دیا تھا اور اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا جاتا کہ مدعیین کے لئے اس مغالطہ لگنے کا باعث کیا تھا تو بیشک صورت حال پر روشنی پڑ سکتی تھی لیکن صرف یہ کہہ دینا کہ ان کی عزت کی موت واقع ہوئی ہے بے معنی فیصلہ ہے اور بالکل بعید از قیاس بھی ہے کیونکہ جو لوگ ان کے قتل کے مدعی تھے وہ یہود تھے اور اس بارے میں ان کو اتنا یقین تھا کہ اپنے بیان میں اس کے متعلق تاکید اور یقین کے جتنے طریقے وہ استعمال کر سکتے تھے سب استعمال کر چکے تھے۔ اب اگر قرآن کریم یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ تم نے ان کو سولی پر چڑھا دیا تھا مگر جب وہ سولی سے مردہ سمجھ کر اتارے گئے تھے تو وہ پورے طور سے نہیں مرے تھے۔ اگرچہ تم کو مردہ معلوم ہوتے تھے پھر بعد میں ان کو کسی غیر جگہ لے جا کر خود ہم نے ان کو موت دی تھی یہ بیان جتنا خلاف قیاس ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ خاص کر جب کہ ان کی موت تسلیم کر لی جائے جو لوگ یقینی اسباب قتل کا ارتکاب کر چکے تھے ان سے یہ کہنا کہ وہ ان اسباب سے نہیں مرے بالکل اتنی ہی مضحکہ خیز بات ہوگی جیسے کوئی قاتل اپنی صفائی کے بیان میں یہ کہے کہ مقتول کے پیٹ میں چھرا تو میں نے ہی گھونپا تھا مگر مقتول اس کی وجہ سے نہیں مرا بلکہ وہ اپنی طبعی موت سے مرا ہے یہ سب جانتے ہیں کہ قاتل کے یقینی آلہ قتل

کے استعمال کرنے کے بعد ان حالات میں جبکہ موت کا ظاہری سبب وہی ہو کوئی عدالت اس کے اس عذر کو معقول نہیں سمجھے گی بلکہ اس کی سماعت مقتول کے حق میں ایک ظلم تصور کرے گی پھر یہاں سولی کا جرم تسلیم کر لینے کے بعد اور وہ بھی اس حد تک کہ ملزمین کے نزدیک اس کی موت یقینی ہو چکی ہو خالق کائنات کا یہ فیصلہ دینا کہ وہ تمہارے مارنے سے نہیں مرے بلکہ ہمارے مارنے سے مرے ہیں ان کے مقابلہ میں کیا اثر انداز ہو سکتا ہے بالخصوص جبکہ اس بعید از قیاس دعویٰ کے لئے کوئی قرینہ بھی یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں اگر اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہی نکلے گا کہ اپنے دشمن کی ہلاکت جو ہر شخص کا مقصد ہوتا ہے یہاں اس کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے پورا کر دیا تھا۔ دشمنوں کے مقابلہ میں اب یہ بحث کھڑی کرنی کہ ان کی یہ موت بڑی عزت کی موت تھی ہمارے نزدیک زخموں پر نمک پاشی سے کم نہیں۔

یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ حسب بیان قرآن کریم یہود کے جرم کی جو نوعیت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں تھی وہی نوعیت دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی تھی یعنی قتل دونوں مقامات پر قرآن کریم نے ایک ہی لفظ قتل کو استعمال فرمایا ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل ہونے کو اس نے تسلیم نہیں کیا اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے حق میں تسلیم کر لیا ہے تو اب سوال یہ ہے کہ جب یہاں مدعیین بھی ایک ہی قوم تھی اور دعویٰ بھی ایک تھا تو پھر صرف ایک عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کیا تھی کہ ان کے حق میں ان کے رفع روحانی یا عزت کی موت کی تصریح ضروری سمجھی گئی ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے حق میں ان کی موت کے متعلق ایک کلمہ تک نہیں فرمایا گیا حالانکہ یہود کا مقصد ان کے قتل کرنے سے بھی اس کے سواء اور کیا تھا کہ ان کے نزدیک یہ سب مقدس گروہ بھی لعنتی تھا۔ والعیاذ باللہ۔ کیا اس سکوت کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ ان کے معاملہ میں رفع روحانی یا رفع درجات تسلیم نہیں کیا گیا۔ والعیاذ باللہ۔ حقیقت یہ ہے کہ روح کے رفع یا عدم رفع کا مسئلہ نہ یہاں زیر بحث تھا اور نہ یہ مسئلہ کسی کے حق میں خواہ عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا دیگر انبیاء علیہم السلام زیر بحث آنے کے قابل ہے۔

پھر اگر یہاں رفع سے رفع روحانی مراد ہوتا تو کیا اس کے لئے صرف بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ كَالْفِظِ كَانِي نہ تھا۔ یہاں لفظ إِلَيْهِ کا بے ضرورت کیوں اضافہ کیا گیا ہے۔

صلیبی موت کا لعنتی ہونا اور اسکے مقابلہ میں عزت کی موت کا افسانہ اسلام میں بالکل بے اصل بلکہ غیر معقول ہے  
رفع روحانی اور عزت کی موت کا یہ سارا افسانہ اس پر مبنی ہے کہ صلیبی موت کے لعنتی موت ہونے کی شریعت کی نظر میں کوئی اصلیت بھی ہو لیکن اگر تخیل ہی بے بنیاد ہے تو پھر نہ قرآن کریم کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہو سکتی ہے اور نہ کسی غلط بنیاد پر وہ اپنے صحیح فیصلہ کو مبنی کر سکتا ہے۔ جب اس پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ لعنتی موت کا اسلام میں کوئی تصور ہی نہیں ہے یہاں کفار جتنے ہیں وہ سب کے سب ملعون ہیں خواہ زندہ ہوں یا مردہ سولی پا کر مریں یا گولی کھا کر آخر جب ملعون قرار دیئے گئے تو کیا یہ لعنت ان کے دم کے ساتھ ساتھ نہ رہی یقیناً حیات سے لے کر موت اور موت سے لے کر قیامت اور قیامت سے جہنم تک ان کے دم کے ساتھ لگی رہے گی۔ جملہ ادیانِ سماویہ میں موت کے اچھے اور برے ہونے کا تعلق انسانوں کے اعمال پر رکھا گیا ہے نہ کہ کسی خاص آلہ قتل کی وجہ سے لعنتی بن جائے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے دیگر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہود کے جرم قتل کا اعتراف کر لینے کے باوجود



ان کی عزت کی موت ہونے کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی اور نہ اس بدیہی بات کی طرف توجہ کی ضرورت تھی بلکہ جس بات کی اہمیت محسوس فرمائی وہ یہ ہے کہ یہ وہ مقدس جماعت ہے جس کے قتل کا وبال یہ ہے کہ جو جماعت کل تک نعمت کا گہوارہ بنی ہوئی تھی اب وہ مورد لعنت بن گئی ہے تعجب ہے کہ یہاں سیاق کلام تو یہود کے ملعون ہونے کے اسباب بیان کرنے کا تھا اور اس میں بے بنیاد اور الثا عیسیٰ علیہ السلام کے ملعون ہونے نہ ہونے کی بحث کھڑی کر دی گئی۔

رفع کا لفظ قرآن کریم میں ایک جگہ بھی لغتی موت کی تردید کے لئے مستعمل نہیں \* بحث کا پہلو یہ ہے کہ لفظ رفع کے معنی پر بھی غور کر لینا چاہیے کیا یہ لفظ عرف قرآنی میں کہیں عزت کی موت کے لئے استعمال ہوا ہے؟ جہاں تک ہم نے قرآن کریم اور کتب لغت پر نظر کی ہے ہم کو اس لفظ کے معنی کہیں لغتی موت کے بالمقابل عزت کی موت دینے کے ثابت نہیں ہوئے بلکہ اس لفظ کا استعمال غیر ذی روح میں بھی ہوتا ہے جہاں موت کا احتمال ہی نہیں ارشاد ہوتا ہے رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔  
رفع کے معنی قرآن ولغت میں \* یہاں لفظ ”رفع“ آسمانوں کے متعلق استعمال ہوا ہے اسی طرح اس کا استعمال زندوں اور مردوں میں یکساں نظر آتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب آیات ذیل پر نظر فرمائیے:

(۱) ﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾ (الزحرف: ۳۲)

(۲) ﴿يَرَفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ (مجادلہ: ۱۱)

(۳) ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ﴾ (الاعراف: ۱۷۶)

(۴) ﴿وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ (مریم: ۵۷)

(۵) ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (الشرح: ۴)

(۶) ﴿وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ﴾ (یوسف: ۱۰۰)

ان تمام آیتوں میں رفع کا لفظ انسانوں ہی میں استعمال ہوا ہے مگر کسی ایک جگہ بھی اس کے معنی عزت کی موت کے مراد نہیں ہیں بلکہ مردوں میں اس کا استعمال ہی نہیں ہوا۔ یہاں ایک بڑا مغالطہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی کا مسئلہ گویا صرف لفظ رفع سے پیدا ہو گیا ہے اور اس لئے ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ رفع کا لفظ رفع جسمانی کے لئے کہیں آیا ہے یا نہیں۔ درحقیقت یہ بحث کا رخ پلٹنے کے لئے صرف ایک چال ہے اصل سوال یہ تھا کہ یہ لفظ عزت کی موت کے لئے کہیں استعمال ہوا ہے یا نہیں اور چونکہ یہ معنی کہیں ثابت نہیں اس لئے بحث کا رخ بدلنے کے لئے ذہنوں کو ایک دوسرے سوال کی طرف متوجہ کر دیا گیا ہے تاکہ اصل سوال کی طرف کسی کا ذہن متوجہ ہی نہ ہو سکے۔

اصل بات یہ ہے کہ رفع کا لفظ صرف بلند کرنے اور اٹھانے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اس میں نہ جسم کی خصوصیت ہے نہ روح کی بلکہ وہ غیر ذی روح میں بھی مستعمل ہوتا ہے جب عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جسم کا رفع اس لئے مراد لیا گیا ہے کہ یہاں زیر بحث جسم ہی کا معاملہ تھا یہود اس کے قتل کے مدعی تھے اور نصاریٰ اس کے رفع کے پس جب یہاں روح زیر بحث ہی نہ تھی تو رفع سے روح کا رفع مراد ہو کیسے سکتا تھا۔ اس مقام کے علاوہ قرآن کریم میں کسی جگہ اور کسی شخص کے متعلق یہ بحث نہیں ملتی کہ وہ قتل کیا

گیا ہے یا اپنے جسم کے ساتھ اٹھایا گیا ہے اس لئے کسی اور جگہ خاص جسم کے رفع کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے پس انسانوں میں جن کے جسم مشاہدہ میں ہوتے ہیں جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو چونکہ وہاں ان کے جسم کے رفع کا احتمال ہی نہیں ہوتا اس لئے وہاں معنوی رفع یعنی درجات کی بلندی مراد ہوتی ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ اس لفظ کا استعمال ہر قسم کی بلندی کے لئے ہوتا ہے جسم کی ہو یا معنوی جیسا موقع اور محل ہو گا اس کے مطابق اس کے معنی مراد لئے جائیں گے یہی حال لفظ تسو فی کا ہے وہ بھی زندوں اور مردوں دونوں میں یکساں مستعمل ہے عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں لفظ توفی - رفع نزول اور اس کی پوری تفصیلات موجود ہیں اس کے ساتھ یہاں قومی تاریخیں بھی موجود ہیں پس یہ مسئلہ قومی تاریخ اور آیات و احادیث کی روشنی سے ثابت ہوا ہے یہ سمجھنا بڑی نا فہمی ہے کہ یہ مسئلہ صرف لفظ رفع کی پیداوار ہے جیسا کہ آیت نمبر ۶ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین کے جسمانی رفع کا معاملہ صرف لفظ رفع سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے لئے دوسرے خارجی قرائن بھی تھے اور یہاں تو قرائن نہیں بلکہ دلائل موجود ہیں اور وہ بھی واضح سے واضح اور مستحکم سے مستحکم - خلاصہ یہ کہ جب ایک طرف لعنتی موت کا افسانہ بے بنیاد ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف رفع کا استعمال بھی عزت کی موت یعنی لعنتی موت کی تردید کے لئے نہیں ملتا تو پھر آیت بالا کی یہ تفسیر کیسے قبول کی جاسکتی ہے -

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا قرآن کریم سے اور اس کی تردید \* اب ذرا اس پر بھی نظر ڈالتے چلے کہ خاص عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ان کا سولی دیا جانا ان کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھنا ان کے منہ پر تھوکا جانا اور طرح طرح سے ان کی توہین و تذلیل کرنا کیا یہ تاریخ قرآن کریم کو مسلم ہے؟

یہاں سب پہلے یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم نے جب یہود کے ملعون ہونے کے اسباب کا تذکرہ کیا ہے تو خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ میں کسی سبب کا ذکر کیا ہے آیت ﴿وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ﴾ (النساء: ۱۵۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں صرف ان کا یہ کہنا کہ ہم نے ان کو قتل کر ڈالا ہے ان کے لعنت در لعنت کا سبب بن گیا تھا اب سوال یہ ہے کہ اگر اس معاملہ میں ان کی جانب سے وہ تمام بدترین اور توہین و تذلیل کی حرکات ناشائستہ سرزد ہو چکی تھیں جو ابھی ذکر ہو چکیں تو ان تمام مکروہ افعال کا ذکر نہ کرنا اور صرف ایک دعویٰ قتل کو نقل کرنا کیا یہ معقول ہو سکتا ہے - عقل ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتی کہ اگر اس سلسلہ میں ان مکروہ افعال کا ان سے صدور ہوا تھا اور ان تمام مظالم اور جرائم پر پردہ ڈال دیا جاتا اور صرف ایک دعویٰ قتل کو ان کے اسباب لعنت میں ذکر کیا جاتا اور اس سے کہیں بڑھ کر اسباب لعنت کے ذکر سے سکوت کر لیا جاتا ہمارے نزدیک دشمنوں اور مجرموں کے حق میں اس سے بڑھ کر فیاضی کی مثال ملنا ناممکن ہے -

اس کے علاوہ سورہ مائدہ میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے تو ان میں ایک بڑا انعام یہ بھی شمار کیا ہے وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ اور یہ انعام بھی قابل یاد ہے جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تم سے دور روک رکھا اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا تھا اور سب ناروا سلوک ان کے ساتھ کر لئے تھے تو کیا بنی اسرائیل کی اس دسترس کے بعد عربی ادب و لغت کے لحاظ سے مذکورہ بالا جملہ استعمال کرنا صحیح ہے دوم پھر کیا یہ دردناک مظالم اور تذلیل و توہین کا سلوک اس قابل ہے کہ ان کے عجیب و غریب معجزات اور نزول ماندہ جیسے انعامات



کے پہلو بہ پہلو ایک انعام بنا کر اس کو ذکر کیا جائے۔ تیسرے سورہ آل عمران میں یہ ارشاد ہے۔

﴿وَمَكْرُؤًا وَّمَكْرًا ۖ اللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ﴾ (آل عمران: ۵۴)

”یہود نے بھی خفیہ سازش کی اور ہم نے ان کے مقابلہ میں خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے والوں میں سے بہتر و برتر ہے۔“

آیت بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ جب یہود بے بہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی تدبیریں کیں تو ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر فرمائی اور یہ ظاہر ہے کہ جب قدرت خود ضعیف انسان کی تدبیر کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو جائے تو پھر کسی کی ضعیف یا قوی تدبیر کیا چل سکتی ہے یہ بات الگ ہے کہ جب قدرت تدریج و امہال کے قانون کے ماتحت کسی گرفت کا ارادہ ہی نہ فرمائے تو کچھ مدت کے لئے انسان اپنی سب تدبیروں میں کامیاب نظر آئے لیکن اگر قدرت الہیہ ان تدابیر کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو جائے تو کیا پھر اس رسوائی و ذلت کی کوئی مثال مل سکتی ہے جو یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں نا فہموں نے اپنی جانب سے تراش لی ہے اور کیا اب دشمنوں کے مقابلہ میں قرآن کریم کا یہ دعویٰ کرنا کہ ﴿وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ﴾ اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بڑھ کر تدبیر کرنے والا ہے۔ قابل مضحکہ نہیں ہے۔

لفظ مکر کے معنی عربی لغت میں خفیہ تدبیر کے ہیں \* یہ خواب واضح رہنا چاہیے کہ یہاں یہ قرآن کریم نے یہود کے مقابلہ میں جو لفظ استعمال کیا ہے وہ لفظ مکر ہے جس کے معنی لغت میں خفیہ تدبیر کے ہیں پس اس لفظ کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں کوئی تدبیر ایسی ہونی چاہیے جس کا دشمنوں کو علم بھی نہ ہو سکے اور نتیجہ کے لحاظ سے وہ اس درجہ ناکام بھی رہیں کہ پھر ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا خیر الماکرین ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو جائے۔

آنحضرتؐ کے ہجرت کے واقعہ میں لفظ مکر کا استعمال بھی ہوا ہے ہر دو مقامات پر تدبیر الہی اور اس کا موازنہ اور آنحضرتؐ کی شان برتری کا اس میں ظہور \* اس قسم کا ایک جملہ قرآن کریم میں ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے متعلق بھی ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ﴾ (الانفال: ۳۰)

”ادھر تو وہ خفیہ سازش کر رہے تھے اور ادھر خدا خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور خدا سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔“

یہاں بھی قریش کی سازش کا ذکر ہے پھر اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے خفیہ تدبیر فرمانے کا تذکرہ ہے اور آخر میں پھر وہی

کلمہ دہرایا گیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں کہا گیا تھا یعنی وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ۔

عجیب بات ہے کہ ہجرت کے لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے تو یہاں بھی کفار محاصرہ کر چکے تھے اور یہاں بھی آپ حضرت علیؓ کو اپنی بجائے چھوڑ گئے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمانوں پر ہجرت کرنے لگے تو یہاں بھی دشمن گھیرا ڈال چکے تھے اور یہاں بھی ایک شخص ان کی بجائے دشمنوں کے ہاتھوں میں موجود تھا قرآن کریم نے دونوں مقامات پر اپنی تدبیر اور کفار کی غلط فہمی کو اسی لفظ مکر سے ادا فرمایا ہے۔ ان دونوں ہجرتوں میں جب خدائی تدبیر کا موازنہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو تدبیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ظاہر ہوئی وہ دشمنوں پر ایک بڑی کاری ضرب تھی۔ ان دونوں مقامات پر

خدا تعالیٰ کے یہ دونوں رسول گو دشمنوں کے زرنے میں سے صاف نکل گئے اور کسی کا بال بیکا نہ ہو سکا مگر غور فرمائیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دشمنوں کے علم میں اسی سرزمین پر صحیح و سالم موجود رہنا اور ہر معرکہ میں ان کو شکست دیتے رہنا آخر ۸ھ میں اپنے آبائی وطن کو فتح کر لینا جتنا قریش کے لئے سواہن روح ہو سکتا تھا آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں پر چلے جانا یہود پر شاق نہیں ہو سکتا۔ ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں ایک مقتول لاش بھی موجود تھی مگر اس کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہونے نہ ہونے میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے یہ مسئلہ زیر بحث آ گیا تھا کہ مقتول وہی حضرت مسیح علیہ السلام ہیں یا کوئی دوسرا شخص۔ مگر یہاں حضرت علیؓ سب کے جانے پہچانے شخص تھے۔ یہاں قریش کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی شبہ کے بغیر ان کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں اور پھر طرفہ یہ کہ ان سے ذرا فاصلہ پر ان کا سر کچلنے کے لئے موجود بھی ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام با ایں ہمہ رافت و رحمت جب دوبارہ اپنے وطن لوٹ کر تشریف لائیں تو یہاں ان کے دشمنوں کے حق میں قتل مقدر ہوا حتیٰ کہ یہودی ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوٹ کر اپنے وطن مکہ مکرمہ پہنچے تو آپ کے دشمنوں کے حق میں یہ مقدر ہوا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں اور پھر وہی آپ کے ساتھ غزوات میں شریک ہو کر آپ پر اپنی جانیں قربان کریں۔ ذرا اس پر بھی غور فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی فتح و نصرت کے لئے ایک بار آپ کی ہجرت اور ہجرت کے بعد پھر اسی مقام پر فاتحانہ واپسی مقدر ہوئی تو عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں بھی اگر پہلے ان کی ہجرت پھر اپنے وطن اصلی کی طرف واپسی مقدر ہو تو اس میں تعجب کیا ہے۔ یہاں اگر فرق ہے تو صرف دارالہجرت ہی کا تو ہے یعنی وہاں دارالہجرت آسمان مقرر ہوا اور یہاں مدینہ طیبہ مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ دونوں مقامات برابر تھے ہاں اگر فرق تھا تو خود روح اللہ اور عبد اللہ کی جانب سے تھا روح اللہ اور کلمۃ اللہ کی طبعی کشش آسمانوں کی طرف تھی آخر جو فتح جبرئیلی سے ظاہر ہوئے وہ جاتے تو اور کہاں جاتے۔ عبد اللہ کی طبعی کشش زمین کی جانب تھی اس لئے اگر وہ کسی خطہ ارض کی طرف نہ جاتے تو اور کہاں جاتے بے شک خدا تعالیٰ قادر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آسمانوں پر اٹھا لیتا لیکن کیا یہ اس آخری رسول کی شان کے مناسب ہوتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر آسمانوں پر تشریف لے گئے تو ان کے بعد دوسرا رسول اعظم دنیا کو نصیب ہو گیا لیکن اگر آپ تشریف لے جاتے تو امت کا نگہبان کون ہوتا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر دوبارہ تشریف لائیں گے تو ان کو اس امت میں شامل ہونے کا دوسرا وہ شرف حاصل ہوگا جس کی اولوالعزم انبیاء علیہم السلام تمنائیں رکھتے تھے۔ لیکن اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ تشریف لاتے تو آپ کو کونسا دوسرا شرف حاصل ہوتا پھر روح اللہ اگر آسمانوں پر گئے تو دشمنوں سے حفاظت کے لئے بلائے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب آسمانوں پر بلائے گئے تو صرف تشریف و تکریم کے لئے بلائے گئے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر گئے تو چوتھے آسمان تک گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو ساتوں آسمان طے کر کے وہاں تک پہنچ گئے جہاں جاتے جبرئیل علیہ السلام کے بھی پر جلتے تھے۔ ان دونوں ہجرتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مقام پر امام رازی کے قلم سے کیا اچھا جملہ نکل گیا۔ وہ لکھتے ہیں جو شرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو میسر ہوا وہ عروج تھا اور جس شرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نوازے گئے اس کا نام معراج ہے۔ میں کہتا ہوں جی ہاں وہ روح اللہ تھے اور یہ عبد اللہ ہیں۔



اللَّهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَى عَبْدِكَ وَرَسُولِكَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَاحِبِ الْمِعْرَاجِ وَالْبِرَاقِ وَالْقَلَمِ وَعَلَى آلِهِ وَاصْحَابِهِ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا.

گو ان دونوں ہجرتوں میں اللہ تعالیٰ کی شان خیر الما کربین دونوں جگہ عیاں تھی اور دونوں مقامات میں اس کا جو ظہور ہوا وہ کامل ہی تھا مگر کیا جو تدبیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے جلوہ گر ہوئی وہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مناسب تھی۔ ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اگر ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا اور آخر کار کشمیر وغیرہ میں جا کر کہیں اپنی طبعی موت سے مرجانا تسلیم کر لیں تو اس کے لئے نہ قرآنی الفاظ میں کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی دنیا کی تاریخ اس کی شہادت دے سکتی ہے اور نہ اس میں خدائی تدبیر کا کچھ ظہور ہوتا ہے اور نہ اس تقدیر پر یہود کے دعویٰ کی کوئی معقول تردید ہو سکتی ہے کیونکہ جب سولی کے ساتھ جملہ موت کے مقدمات تسلیم کر لئے جائیں اور گفتگو صرف اتنی رہ جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تم نے مارا یا کہیں گناہ مقام میں لے جا کر خود ہم نے مارا تو اب یہ گفتگو ایک عبث گفتگو ہے۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ جو بات دشمن چاہتے تھے وہ خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے خود پوری فرمادی۔ والعیاذ باللہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب و رفع کی تحقیق قرآنی روشنی میں \* اسی طرح صلیب کے تسلیم کر لینے کے بعد یہاں نصاریٰ کی بھی کوئی تردید نہیں نکلتی کیونکہ جب اصولی طور پر عیسیٰ علیہ السلام کا سولی چڑھنا تسلیم کر لیا جائے اور رفع جسمانی کا قرآن کریم خود اعلان فرمادے تو اب اُن کے ساتھ بھی جو اختلاف رہے گا وہ صرف نظریات ہی کا رہے گا اور صلیب پرستی کی یہ ایک بنیاد قائم ہو جائے گی اس لئے ضروری ہے کہ آیت کے اصل مفہوم پر غور کیا جائے اور جو مطلب کسی تاویل کے بغیر اس سے ظاہر ہوتا ہو اس کا اعتقاد رکھا جائے۔ پہلے ایک بار پوری آیت پڑھ لیجئے۔

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَ اللَّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا. (النساء: ۱۵۷-۱۵۸) ہیں۔

اور (ہم نے ان کو سزا میں مبتلا کیا) اُن کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا ہے حالانکہ نہ انہوں نے قتل کیا اور نہ ہی ان کو سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا اور جو لوگ ان کے بارہ میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں۔ بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور انہوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں۔

آیت بالا کے مطالعہ کے بعد جو بات پہلی بار سمجھ میں آ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے مدعی تھے اور اس بارے میں وہ اپنے پورے جزم و یقین کا اظہار کرتے تھے لیکن نصاریٰ چونکہ باہم خود مختلف تھے اس لئے ثلاث باتیں کہتے تھے ان ہر دو فریق کے مقابلہ میں قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ دونوں کے دونوں غلطی پر ہیں یہود کا دعویٰ قتل تو سرتا پا غلط ہے اس لئے اس کو دوبار رد کیا گیا ہے تاکہ جتنا زور انہوں نے اپنے قتل کرنے پر صرف کیا تھا اتنا ہی اس کے انکار پر صرف کیا جائے رہے

گئے نصاریٰ تو وہ قدرے مشترک طور پر ان کے مصلوب ہونے کے آج تک قائل ہیں اس لئے ضروری تھا کہ گو وہ کسی بات کے مدعی نہ ہوں مگر ان کے اس غلط خیال کی تردید بھی کر دی جائے اس لئے یہود کے دعویٰ قتل کے ساتھ ساتھ صلیب کی بھی نفی کر دی گئی اور اُس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا گیا کہ ان کو خود کچھ علم نہیں ہے وہ صرف انکل کے تیر چلاتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو قوم اپنے یقین کا دعویٰ رکھتی ہو صرف اس کی تردید کر دینا اس کے لئے کچھ تشفی بخش نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی غلط فہمی کے اسباب بھی بیان نہ کر دیئے جائیں۔ اس کو وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ سے بیان کیا گیا ہے یعنی یہاں قدرت کی طرف سے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے تھے جس کی رو سے حقیقت حال ان پر مشتبہ ہو گئی تھی۔ ایک طرف چونکہ سبت کا دن آ رہا تھا اس لئے اس ارادہ بد کی تکمیل میں ان کو خود عجلت تھی دوسری طرف اس قسم کے ہنگاموں میں جو ایک طبعی وحشت ہوا کرتی ہے وہ بھی ان پر سوار تھی اس لئے اپنی دانست میں گواہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے قتل کا قصد کیا تھا مگر ان مشتبہ کن حالات کی وجہ سے وہ اس ارادہ بد میں ناکام رہے اور ان کی توجہ اس طرف قائم نہ رہ سکتی کہ وہ کس کو قتل کر رہے ہیں اور اس کی کھلی شہادت یہود و نصاریٰ کا باہم اختلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حالات ضرور کچھ ایسی پیچیدہ بن گئی تھی کہ حس و مشاہدہ کا یہ صاف واقعہ بھی مبہم ہو کر رہ گیا تھا اور پیچیدگی کی وجہ سے قرآن کریم نے واقعہ کے انکشاف کی طرف توجہ فرمائی ہے ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل دوسرے انبیاء علیہم السلام کے متعلق بھی یہود اسی جرم کے ارتکاب کا دعویٰ کرتے تھے لیکن چونکہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے معاملہ میں وہ اپنے دعوے میں صادق تھے اس لئے قرآن کریم نے نہ ان کی کوئی تردید کی ہے اور نہ ان کے معاملہ میں کسی شبہ و اشتباہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے زیادہ تفصیلات میں پڑنا قرآن کریم نے پسند نہیں فرمایا اور نہ یہ احکم الحاکمین کی شان کے مناسب تھا اور غالباً لفظ مکر اللہ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ خفیہ تدبیر کو کچھ خفیہ ہی رہنے دیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر درحقیقت مقتول کی لاش ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ تھے بلکہ کوئی دوسرا ان کا شبیہ شخص تھا جو عجلت میں غلطی سے قتل کر دیا گیا تھا تو یہ بتانا چاہیے کہ پھر عیسیٰ علیہ السلام جو یقیناً ان کی زیر حراست آچکے تھے آخر وہ کدھر نکل گئے اگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا تو ماننا پڑتا ہے کہ پھر مقتول کی جو لاش موجود تھی وہ عیسیٰ علیہ السلام ہی تھے اس لئے قرآن کریم نے اپنے فیصلہ میں قتل کی نفی کے بعد یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھالیا تھا اس لئے زمین پر ان کی تلاش کرنا عبث ہے لیکن ایک ضعیف انسان چونکہ نہ اس قدرت کا تصور کر سکتا ہے اور نہ اس عظیم حکمت کو پاسکتا ہے اس لئے یہاں خاص طور پر اپنی ایسی دو صفتوں کا تذکرہ فرما کر بحث کو ختم کر دیا ہے جن کے اقرار کے بعد کوئی استبعاد باقی نہیں رہتا۔ وَ كَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی توانا اور بڑی حکمت والی ہے اس کے سامنے یہ سب باتیں آسان ہیں۔ اس واضح فیصلہ سے جس طرح یہود کی کھلی ہوئی تردید ہو گئی اسی طرح نصاریٰ کے مذہب کی تمام بنیاد بھی منہدم ہو جاتی ہے کیونکہ جب صلیب کا سارا افسانہ ہی بے سرو پا ثابت ہوا تو اب کفارہ کا اصولی عقیدہ بھی خود بخود باطل ہو گیا۔ اب اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ اسی حد پر ختم ہو چکا تھا اور مستقبلِ زمانہ کے ساتھ اس کا کچھ تعلق باقی نہ رہا تھا تو آئندہ آیت میں اس کی دوسری تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن چونکہ یہاں ایک اور مشکل تر سوال سامنے آ گیا تھا اور وہ یہ کہ اگر وہ آسمانوں پر اٹھائے گئے ہیں تو پھر کیا



وہ آسمانوں ہی پر وفات پائیں گے اس لئے اس کی بھی وضاحت کر دی گئی اور پوری قوت کے ساتھ اس کا اعلان کر دیا گیا کہ ابھی ان کو طبعی موت نہیں آئی بلکہ موت سے قبل اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا مقدر ہو چکا ہے اس لئے یقیناً وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور اب خدا تعالیٰ کی وہ خفیہ تدبیر بھی عالم آشکارا ہو جائے گی اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنے جسم کے ساتھ تشریف لائے ہیں تو یقیناً جسم کے ساتھ ہی اٹھائے گئے تھے۔

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَلْيَوْمِئِذِ بِهِ  
قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ  
شَهِيدًا. (النساء: ۱۵۹)

اور کوئی اہل کتاب نہیں ہوگا مگر ان کی موت سے پہلے ایمان لے  
آئے گا اور قیامت کے دن وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ہوں گے ان  
پر گواہ۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو ہریرہؓ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث بیان فرماتے تو یہ بھی فرماتے کہ یہ پیشگوئی صرف حدیثی نہیں قرآنی ہے اور یہی آیات بالا پڑھ کر سنا دیتے۔ اب یہ مسئلہ بالکل سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حدیثوں میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بار بار بیان فرمانے کی اہمیت کیوں محسوس کی گئی ہے یہ ظاہر ہے کہ رفع جسمانی چونکہ عام انسانوں کی سنت نہیں تھا اس لئے اس کی تفہیم کے لئے اس حقیقت کے ذہن نشین کرنے کی بڑی اہمیت تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ابھی وفات نہیں ہوئی اور ابھی ان کو آسمان سے اترنا ہے اور بہت سی خدمات مقوضہ ادا کرنی ہیں اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا ہے اور دجال جیسے ایمان کے غارت گر کو قتل کرنا ہے اور بالآخر خدا تعالیٰ کی زمین کو شر و فساد سے پاک کر کے عام انسانوں کی سنت کے مطابق وفات پانا ہے اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونا ہے یہ ہے قرآنی بیان اور قرآنی بے لاگ فیصلہ اب یہاں ان کی موت کا دعویٰ کرنا ٹھیک ٹھیک یہودیوں کی اتباع ہے اور ان کو مصلوب مان لینا یہ نصاریٰ کی کھلی موافقت ہے۔ کیونکہ اگر ہم عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا تسلیم کر لیتے ہیں اور پھر کسی غیر معلوم مقام پر جا کر ان کی موت مان لیتے ہیں تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ یہود و نصاریٰ کی وہ غلط باتیں جن کی قرآن کریم نے پوری تردید فرمائی تھی ہم نے دونوں کو مان لیا ہے اور اس کے بعد ان کے ساتھ ہمارا اختلاف صرف نظریات کا اختلاف رہ جاتا ہے یہود کے ساتھ تو اس لئے کہ ان کی موت کے وہ بھی قائل تھے فرق صرف یہ رہے گا کہ یہ موت لعنتی تھی یا عزت کی اور نصاریٰ کے ساتھ اس لئے کہ جب وہ سولی دے دیئے گئے تو اب اس کی حقیقت امت کی تطہیر اور کفارہ تھی یا کچھ اور۔ ظاہر ہے کہ ان امور کے اصولاً تسلیم کر لینے کے بعد یہ نظریاتی اختلافات بالکل بے نتیجہ ہیں۔ ہماری مذکورہ بالا تفسیر کی بناء پر دونوں قوموں کے عقائد کی بنیاد ہی اکھڑ جاتی ہے اور قرآن کریم پر اپنی جانب سے کسی حاشیہ آرائی کی کوئی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لانے کے بعد جملہ اہل اسلام کے نزدیک بھی وفات پائیں گے زیر اختلاف

اُن کی گزشتہ موت ہے \* حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ اہل اسلام جہاں ان کے رفع کے قائل ہیں اسی کے ساتھ نزول کے بعد ان کی موت کے بھی قائل ہیں اس بارے میں ہمارے علم میں ایک تنفس کا اختلاف بھی نہیں یوں تو ان کی ولادت بلکہ ان کی زندگی کا ہر گوشہ ان کی تردید الوہیت پر برہان قاطع ہے لیکن صرف ان کی موت کا عقیدہ مستقل اس کی ایک ایسی واضح دلیل ہے جس کے بعد ان کی الوہیت کی تردید کے لئے کسی اور دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ لہذا ان کی

ولادت اور موت تسلیم کرنے کے بعد اگر ایک ہزار بار بھی ان کے رفع الی السماء کا اقرار کر لیا جائے تو اس میں عیسائیوں کے مسئلہ الوہیت کی کوئی تائید نہیں ہوتی اس لئے اگر بالفرض یہاں ابن عباسؓ یا کسی اور شخص سے ان کی موت منقول ہوتی ہے تو اس کو اجماع امت کے خلاف سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی تحقیق \* پس اگر تسلیم کر لیا جائے کہ ابن عباسؓ سے انی متوفیک کی تفسیر انی ممیتک مروی ہے تو زیادہ سے زیادہ اس سے یہی ثابت ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی موت آنی ہے مگر اس کا انکار کس کو ہے۔ زیر بحث تو یہ ہے کہ وہ موت ان کو آچکی اور کیا وہ فی الحال مردوں میں شامل ہیں۔ اور اب دوبارہ نہیں آئیں گے دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ نہ یہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے اور نہ امت مسلمہ میں کسی اور معتمد عالم سے بلکہ ابن عباسؓ سے باسناد قوی یہ ثابت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اٹھائے گئے اور نزول کے بعد پھر وفات پائیں گے اور ٹھیک یہی تمام امت کا عقیدہ ہے۔

امام بخاری کی کتاب التفسیر میں حل بغات کا حصہ خود ان کا تصنیف کردہ نہیں بلکہ امام ابو عبیدہ کا ترتیب دادہ ہے \* یہاں بے علموں کو ایک مغالطہ یہ بھی لگ گیا ہے کہ ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا تفسیر چونکہ امام بخاری کی کتاب میں موجود ہے۔ لہذا اس سے ثابت ہوا کہ امام بخاری کا مختار بھی یہی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جب امام بخاری ہی کی کتاب میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث موجود ہے تو پھر کس دلیل سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اس موت سے گذشتہ موت مراد ہے بلکہ جب خود حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہ ثابت ہے کہ یہ موت نزول کے بعد والی موت ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک بھی اس موت سے وہی مراد ہے اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ ان ہی کی کتاب میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا اقرار بھی موجود ہے۔

پھر ان مسکینوں کو اتنا علم بھی نہیں کہ امام بخاری نے کتاب التفسیر میں جو لغات اور تراکیب نحو یہ نقل فرمائی ہیں یہ خود ان کی جانب سے نہیں ہیں بلکہ ان کی جانب سے صرف وہی حصہ ہے جو انہوں نے اپنی اسناد کے ساتھ روایت فرمایا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام بخاری کے پاس ابو عبیدہ کی کتاب التفسیر موجود تھی۔ امام موصوف نے اس پوری کتاب التفسیر کو کسی تنقید و انتخاب کے بغیر جگہ اٹھا کر اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے۔ لہذا جتنے اقوال مرجوحہ اصل کتاب میں موجود تھے وہ بھی سب کے سب یہاں نقل ہو گئے ہیں۔ لہذا یہ سمجھنا بالکل بے اصل ہے کہ امام بخاری نے خاص طور پر ابن عباسؓ کی اس تفسیر کو اختیار فرمایا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابو عبیدہ کی کتاب التفسیر میں چونکہ ابن عباسؓ کا یہ قول مروی تھا اور جب امام بخاری نے ان کو پوری کتاب التفسیر ہی کو اپنی کتاب میں کسی انتخاب کے بغیر نقل کر دیا تھا تو یہ جزء بھی چونکہ ابو عبیدہ کی کتاب التفسیر میں بہت سے مقامات پر حل لغات میں تسامح بھی ہوا ہے اقوال مرجوحہ بھی نقل ہو گئے ہیں اور ان کی ترتیب میں بھی اچھا خاصہ اختلال واقع ہو گیا ہے۔ لیکن امام بخاری خود ان جملہ نقائص سے بری ہیں اس کی ذمہ داری اگر عائد ہوتی ہے تو ابو عبیدہ پر عائد ہوتی ہے۔ امام بخاری کی کتاب کی علوصحت کے متعلق جو دعویٰ ہے وہ ان احادیث مرفوعہ کے متعلق ہے جو اس میں اسناد کے ساتھ امام نے از خود روایت فرمائی ہیں نہ کہ ان اقوال کے متعلق جو اسناد کے بغیر کسی جانب سے کتاب میں نقل ہوئے ہیں۔ لہذا اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ ان کے نزدیک مذکورہ بالا تفسیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے وہ موت مراد ہے جو آخر زمانہ میں تشریف لانے کے بعد ہوگی اور اس موت میں کسی کا بھی



اختلاف نہیں ہے اسی طرح ابن حزم کی طرف بھی موت کی نسبت کی گئی ہے اگرچہ کسی شاذ فرد کے اختلاف سے جمہور امت کی رائے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے وہ ابن حزم جیسے شخص کے اختلاف سے جس کے تفردات امت میں ضرب المثل ہیں لیکن وہ بھی متعدد مقامات پر اس کی تصریح کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخری دور میں تشریف لائیں گے لہذا زیر اختلاف مسئلہ پر ان شاذ نقول کا بھی کوئی اثر نہیں۔ چنانچہ ابن حزم نے اپنی کتاب المحلی ص ۳۹۱ میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کو امت کا عقیدہ شمار کیا ہے دیکھو ص ۲۲۹ ج ۳ کتاب الفصل میں بھی اس کی تصریح کی ہے اس کے علاوہ اور متعدد مقامات میں بھی اسی عقیدہ کو امت کا عقیدہ لکھا ہے۔

جس جمہور امت نے آپ کی نبوت اور اس کی علامات اور قرآن شریف کو نقل کیا ہے اسی امت نے صحیح طریقوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ نے یہ خبر دی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا سوائے ایک عیسیٰ علیہ السلام کے کہ ان کے نزول کی خبر صحیح حدیثوں سے ثابت ہے یہ وہی ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور جن کے قتل و صلب کا یہود نے دعویٰ کیا تھا۔ لہذا ان باتوں کا اقرار کرنا ہم پر لازم ہے۔ اور یہ بطریق صحیح ثابت ہے کہ نبوة کا وجود آپ کے بعد ہرگز نہیں ہوگا۔

وقد صح عن رسول الله صلى الله عليه وسلم بنقل الكواف التي نقلت نبوة و اعلامه و كتابه انه اخبره انه لا نبى بعده الا ما جاءت الاخبار الصحاح من نزول عيسى عليه السلام الذي بعث الى بنى اسرائيل و ادعى اليهود قتله و صلبه فوجبت الاقرار بهذه عليه السلام لا يكون البتة.

(ج ۱ ص ۷۷ الفصل و ج ۲ ص ۲۳ و ج ۲ ص ۵۵ و ج ۲ ص ۷۳ و ج ۲ ص ۸۷ کتاب مذکور)

قرآن کریم میں مشرکانہ عقائد کی تردید کا جتنا اہتمام کیا گیا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ نصاریٰ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے لیکن جب اس نسبت کا نام معقولیت ان کے سامنے ظاہری کی جاتی ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ولدیت اور ابیت سے ان کی مراد حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ اتحاد کی وہ خاص نسبت ہے جو مابین خالق اور عیسیٰ علیہ السلام موجود ہے اور اسی کو مجازاً اس لفظ سے اداء کیا گیا ہے لیکن اس لفظ کے استعمال سے چونکہ عیسائیت کی لفظی تائید ہوتی تھی اس لئے قرآن کریم نے یہاں مجاز و استعارہ کی بھی اجازت نہیں دی بلکہ اس عنوان ہی کو خواہ وہ کسی معنی سے ہو اپنے سخت غیظ و غضب کا باعث قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

ابھی اس افترا سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین ٹکڑے ہو جائے

اور پہاڑ ڈھسے کر گر پڑیں اس پر کہ پکارتے ہیں رحمان کے نام

پر اولاد۔

تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ

الْأَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًا أَنْ دَعَوْا

لِلرَّحْمَنِ وَلَدًا. (مریم: ۹۰-۹۱)

پس اگر قرآن کریم لفظ امن اور ولد کا مجازی استعمال بھی حرام قرار دیتا ہے کیونکہ اس میں عیسائیت کی تقویت اور اس کی ترویج ہوتی ہے تو اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع یعنی آسمان پر اٹھائے جانے کا عقیدہ بھی صرف عیسائیوں کا عقیدہ تھا اور اس میں مشرکانہ عقیدہ کی ذرا بھی غلط تائید ہوتی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ٹھیک اسی لفظ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں خود استعمال

فرماتا جو عیسائی استعمال کرتے تھے۔ یہ کیسی عجیب در عجیب منطق ہے کہ یہود نے جب اِنَّا قَتَلْنَا کہا تو ان کی تردید میں تو قرآن کریم نے دوبارہ ﴿وَمَا قَتَلُوهُ﴾ فرمایا مگر جب عیسائیوں نے ”رفع“ کہا تو قرآن کریم نے ایک بار بھی ”و ما رفع“ نہیں فرمایا بلکہ ”رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ“ میں لفظ ”الیہ“ کا اور اضافہ فرما کر رفع کے عقیدہ کو اور مضبوط بنا دیا۔ کیا اس سے یہی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ بالکل درست تھا البتہ ان کے مصلوب ہونے کا خیال چونکہ بالکل بے اصل تھا اس لئے جس طرح کہ یہود کی تردید میں ﴿وَمَا قَتَلُوهُ﴾ فرمایا گیا تھا اسی طرح عیسائیوں کی تردید میں ﴿وَمَا صَلَّبُوهُ﴾ کا لفظ فرما دیا گیا اور اس طرح اہل کتاب کی ہر دو جماعتوں کی تردید علیحدہ علیحدہ دو لفظوں سے صراحتہ کر دی گئی اور اسی کے ساتھ عیسائیوں کے بنیادی عقیدہ کا بطلان بھی واضح ہو گیا کیونکہ ان کے مذہب میں کفارہ کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور کفارہ کا عقیدہ تمام تر صلیب پر مبنی ہے لہذا جب قرآن کریم نے صراحتہ ﴿وَمَا صَلَّبُوهُ﴾ فرما کر صلیب کی صاف تردید فرمادی تو پھر اس پر جتنی بے اصل تعمیر قائم کی گئی وہ خود بخود سب منہدم ہو گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمات میں صلیب شکنی کا نکتہ \* یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صلیب چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے نام سے پوجی گئی تھی اس لئے ضروری ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی دوبارہ تشریف لا کر خود اس کے توڑنے کا حکم دیں تاکہ جن کے نام پر یہ شرک ایجاد ہوا تھا ان ہی کے حکم سے اس کا استیصال بھی ہو جیسا کہ عرب نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے سربت پرستی کی جھوٹی تہمت لگائی تو خود آپ کے سب سے عظیم اور جلیل القدر فرزند یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر اس کی تردید فرمائی اور فتح مکہ میں اپنے دست مبارک سے ان تمام بتوں کی تصاویر محو کر دیں جو ملت ابراہیمی کے نام پر خانہ کعبہ کے اندر بنائی گئی تھیں یہ خیال کتنا احمقانہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اگر صلیب توڑ دیں گے تو عیسائی اور بہت سی صلیبیں بنالیں گے۔ اگر یہی اعتراض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بت شکنی پر کیا جائے تو کیا یہ قابل مضحکہ نہ ہو گا اصل بات یہ ہے کہ فاتح کی بت شکنی اور صلیب شکنی کا اندازہ غلامانہ ذہنیت کا محکوم ہو کر ہو ہی نہیں سکتا جو صلیب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک سے توڑی جائے گی وہ پھر کبھی بنائی نہیں جاسکتی جیسا کہ جو بت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے توڑے گئے وہ جزیرہ عرب میں آج تیرہ سو سال کے بعد بھی دوبارہ معبود نہیں بن سکے۔

قرآن کریم کی شان اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے کہ وہ دشمنان اسلام کے خوف سے حقائق کے بیان کرنے میں ادنیٰ پس و پیش بھی اختیار کرے \* قرآن کریم کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے سیاق تردید میں صرف دشمنوں کے خوف سے کسی حقیقت پر بھی پانی پھیر دے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اگر ”رَفَعَ“ کے لفظ سے ان کی الوہیت کے بارے میں کوئی بے سبب اشتباہ پیدا ہو سکتا تھا تو اس سے کئی درجہ زیادہ اشتباہ لفظ ”رُوحُ اللّٰہ“ اور ”کَلِمَةُ اللّٰہ“ سے پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ آج تک عیسائی ان ہی الفاظ کو لے کر اہل اسلام کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں اسی طرح ان کے معجزات کا حال بھی ہے مگر کیا ایک ایسے بشر پر جس میں جملہ بشری خواص کھلے ہوئے نظر آ رہے ہوں بے دلیل الوہیت کی تہمت رکھ دینے والوں کی قرآن کریم نے کوئی رعایت کی ہے کیا اس نے ”رُوحُ اللّٰہ“ اور ”کَلِمَةُ اللّٰہ“ کا لقب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود ہی نہیں دیا



کیا بے عقلوں کے خوف سے ان سے احیاء موتی کا معجزہ عطا کرنے میں کوئی پس و پیش کیا گیا ہے اگر نامعقول جماعت نے دلائل بشریت ہی کو برعکس دلائل ربوبیت بنا ڈالا ہو تو اس میں سرتاسر جرم ان ہی کا ہے۔ لہذا یہاں قرآن کریم پر یہ زور ڈالنا کہ اس نے ”رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ“ کا لفظ کیوں استعمال فرمایا ہے ایسا ہی ہے جیسا یہ کہتا کہ اس نے کَلِمَةُ اللَّهِ اور رُوحُ اللَّهِ کا لفظ کیوں استعمال فرمایا۔

خوب یاد رکھو اگر ہم اپنی مزعوم خیر خواہی میں قرآن کریم کے صریح الفاظ کی تاویل کریں گے تو اس کا نتیجہ صرف قرآن کریم کے الفاظ کی تحریف نہیں ہوگا بلکہ بہت سے حقائق کا انکار بھی ہوگا اگر رب العزت کے ان کے بن باپ پیدا فرمانے میں نامعقولوں کی رعایت کا حق کسی کو نہیں ہے تو اس سے ان کے زندہ آسمانوں پر اٹھانے میں نامعقولوں کی رعایت کے مطالبہ کا حق کس کو ہے قدرت و حکمت والا ہمیشہ اپنی قدرت و حکمت کے مظاہر کرتا رہے گا۔ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ۔

شبہات اور وساوس کا اثر عقائد کی تخریب ہے کسی صحیح حقیقت کی تعمیر نہیں پس صرف شبہات سے عقائد کی ترمیم

کرنا غلط ہے خود ان کا جواب دینا چاہیے \* یہ بات قاعدہ کلیہ کی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ دین کا کوئی مسئلہ جب اپنے دلائل کے ساتھ روشنی میں آجائے تو اس پر بے تامل جزم و یقین کر لینا چاہیے اب اگر اس میں کچھ شبہات اور اعتراضات دل میں گذرتے ہوں تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ان شبہات ہی کا جواب تلاش کرنا چاہئے اور ان کو حل کر لینا چاہئے نہ یہ کہ اس ثابت شدہ حقیقت ہی کا انکار کر دیا جائے کیونکہ شبہات زیادہ سے زیادہ دلائل کی روشنی مدھم تو کر سکتے ہیں مگر کوئی دوسری روشنی پیدا نہیں کر سکتے اس لئے جب کبھی آپ اپنا رخ خود ان شبہات ہی کی طرف پھیر دیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ اور تاریکی در تاریکی میں جا گرے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شبہ کی بنیاد پر ختم نبوت کا اجماعی عقیدہ بدل دیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جتنے اشکالات اس عقیدہ میں پیدا ہو سکتے تھے اس سے کہیں بڑھ کر شبہات دوسری صورت میں پیدا ہونے لگے درحقیقت یہ شیطان کا ایک بڑا علمی فریب ہے کہ جب وہ کسی گمراہی کی دعوت دیتا ہے تو پہلے ایک حق بات میں شبہات ڈالنا شروع کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ ان شبہات کو بڑھا کر ان کو ایک حقیقت کی صورت پہنا دیتا ہے پھر اس کے دلائل کی تلاش لگاتا ہے اور اس تمام تدریجی سلسلہ میں ایک بار بھی انسان کا ذہن اصل عقیدہ کے دلائل کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا حتیٰ کہ وہ عقیدہ جو پہلے ان شبہات کے وجود سے مجروح ہو چکا تھا اب ان وہی دلائل سے باطل نظر آنے لگتا ہے اور ان دلائل پر دماغ میں کسی ادنیٰ شبہ کا گذر ہونے نہیں دیتا اس کے بعد پھر انسان کو ایسا دلیر بنا دیتا ہے کہ اس کے نو ساختہ عقیدہ کے خلاف انسان واضح سے واضح دلائل کی تاویل بلکہ تحریف میں ذرا نہیں شرماتا اور اس طرح وہ انسان کو دین سے منحرف کر دیتا ہے اور اس کے ایمان بالغیب کی ساری دنیا برباد کر ڈالتا ہے۔ اسی کی مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ ہے یہاں بھی صرف شبہات پیدا کر کے پہلے وہ اس یقین کو متزلزل کرنے کی سعی کرتا ہے اور جب اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر انسان کو بیسیوں حدیثوں کی تاویل بلکہ انکار پر آمادہ کر دیتا ہے۔ مثلاً یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ دجال کو قتل کرنے کے لئے خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے تشریف لانے کی ضرورت کیا پڑی ہے پھر اتنے دن ان کا زندہ رہنا کیوں تسلیم کیا جائے اور اس کے لئے جتنے مقدمات ہو سکتے ہیں ان کو خوب مبرہن کرتا چلا جاتا ہے لیکن ایک مؤمن ان شبہات کی بناء پر قرآن و حدیث کی تاویل کرنے کی بجائے خود ان شبہات ہی کے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور صرف وساوس و اوہام سے اپنے قیمتی

ایمان کو زخمی نہیں کرتا۔ اگر یہاں کتب سابقہ اور اہل کتاب کی تاریخ پر ذرا نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ کتب سابقہ میں دوسرے کے آمد کی پیشگوئی کی گئی تھی ایک مسیح ہدایت اور دوسرا مسیح ضلالت چونکہ یہود نے مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت کا مصداق قرار دے دیا تھا اور مسیح ضلالت کو اس کے برعکس مسیح ہدایت ٹھہرایا گیا اس لئے کیا یہ مناسب نہ تھا کہ مسیح ضلالت کے ظہور کے وقت خود مسیح ہدایت ہی تشریف لا کر اس کے مقابلہ پر یہ ثابت کر دیں کہ مسیح ہدایت کون ہے اور مسیح ضلالت کون تا کہ ایک طرف جو پہلے مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت ٹھہرانے والے تھے وہ جھوٹے ثابت ہوں اور دوسری طرف مسیح ضلالت کی اتباع کرنے والے بھی نامراد ہو جائیں اور اس طرح جو مغالطے پہلے لگ چکے تھے اب وہ خود ان ہی زبان سے دور ہو جائیں صلیب ان کے نام سے پوجی گئی تھی وہی آ کر اس کو توڑیں اور سور بھی ان ہی کے نام سے حلال کیا گیا تھا اب وہی آ کر اس کے قتل کا حکم دیں اور اس طرح قیامت میں یہود و نصاریٰ پر خدا کی حجت پوری ہو اور اتحاد ملل کے سلسلہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی تھیں وہ ایک ایک کر کے سب اٹھ جائیں اور آخر میں پھر دین اسی طرح ایک ہی باقی رہ جائے جیسا کہ آغاز عالم میں ایک ہی دین تھا۔ وَ تَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ صِدْقًا وَ عَدْلًا۔

نیز چونکہ دجال آخر میں مدعی الوہیت ہوگا اور احیاء موتی کا مدعی ہوگا اس لئے کیا یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے قتل کے لئے ایک ایسا ہی رسول آتا جس پر دعویٰ الوہیت کی تہمت لگائی گئی ہو تا کہ ایک طرف تو قتل ہو کر جھوٹے مدعی الوہیت کا جھوٹ ثابت ہو جائے دوسری طرف اس قوم کا جھوٹ بھی ثابت ہو جائے جنہوں نے خدا کے مقدس رسول پر دعویٰ الوہیت کی بے بنیاد تہمت لگائی تھی اور روز روشن کی طرح یہ واضح ہو جائے کہ جو مدعی الوہیت کا قاتل ہو وہ خود مدعی الوہیت کیسے ہو سکتا ہے۔ ان امور کے علاوہ جب یہود کے دعوے کو دیکھا جاتا ہے تو وہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے بھی قتل کا دعویٰ رکھتے تھے مگر قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ قتل نہیں ہوئے بلکہ آسمان پر اٹھائے گئے اور اس میں خدا تعالیٰ تو انا و حکیم کی بڑی حکمت مضمر تھی کیا اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کچھ اور تھا کہ جس کو مقتول ٹھہرایا گیا تھا وہی آ کر پہلے خود ان کے سرغنہ کو قتل کرے یعنی دجال کو پھر ان کے قتل کا حکم دے اور گویا اس طرح خود ایک نبی پہلے اپنی قوم انبیاء علیہم السلام کے قاتلین سے ان کا قصاص لے لے اور دوسری طرف اپنے متعلق دعویٰ قتل کا مزہ بھی چکھا دے۔

پھر جب ختم نبوت پر زیادہ گہرائی سے نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ضرورت کے وقت امت میں کسی نبی کی پیدائش کی بجائے کوئی گذشتہ نبی آئے کیونکہ دجال اکبر کے آمد کی پیشگوئی نوح علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کرتے چلے آئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ اتنی بڑی گمراہی دنیا کی پیدائش سے لے کر آج تک کبھی ظاہر نہیں ہوئی اس لئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ دجال ایک مرکزی طاقت ہے اور ایک مرکزی طاقت کے مقابلہ کے لئے ضرور کوئی مرکزی طاقت ہی آنی مناسب ہے۔ اب اگر اس کے مقابلہ میں کسی امتی کو کھڑا کر دیا جاتا تو وہ اس کا صحیح مقابل ہی نہیں ہو سکتا تھا دنیا میں بھی کشتی میں پہلوانوں کا جوڑ دیکھا جاتا ہے اور اسی طرح حکومتوں کے مقابلہ کے وقت بھی ان کی طاقتوں کا توازن ضروری ہوتا ہے جس کو آج کل (Ballance Of Power) کہا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ابن صیاد کے متعلق جب حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ حکم دیجئے تو میں اس کی گردن اڑا دوں تو اس کے



جواب میں آپ نے فرمایا ”ان یکن ہو فلن تسلط علیہ“ اگر یہ وہی دجال اکبر ہے تو تم اس کے قتل پر مسلط نہیں ہو سکتے پس جب امت میں حضرت عمرؓ جیسا بھی اس کو قتل نہ کر سکے تو اب دوسرا کون اس کا قاتل ہو سکتا ہے اس لئے ضروری ٹھہرا کہ اس کا قاتل کوئی نبی ہو پس جب نبی کی ضرورت کے وقت بھی اس امت میں سے کسی کو نبی نہیں بنایا گیا بلکہ ان ہی گذشتہ انبیاء علیہم السلام ہی میں سے ایک نبی کو لا کر کھڑا کیا گیا تو فرمائیے کہ ختم نبوت کا مسئلہ اب کتنا واضح ہو گیا گویا آج تک ختم نبوت کا ثبوت صرف علمی تھا اور اس وقت تاریخ اور مشاہدہ سے بھی اس کا ثبوت ہو گیا کیونکہ جب ضرورت کے وقت پھر انبیاء سابقین ہی میں سے ایک رسول آیا تو یہ اس کا بدیہی ثبوت ہے کہ درحقیقت رسولوں میں سے کوئی فرد بھی باقی نہیں رہا تھا اس لئے یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سب سے آخری رسول تھے لہذا یہ شبہ نہیں رہا کہ جب آپ خاتم النبیین ہیں تو آپ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کیسے آئیں گے بلکہ ان کا نزول ہی ختم نبوت کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا اگر وہ دوبارہ تشریف نہ لائیں تو مشاہدہ میں یہ کیسے ثابت ہوتا کہ سب رسول آچکے ہیں اور آپ ہی سب سے آخری رسول ہیں۔

جلد اول میں ختم نبوت کی پہلی حدیث میں ہم یہ بھی بہ تفصیل لکھ چکے ہیں کہ حسب تصریح قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جملہ انبیاء علیہم السلام سے ایمان اور بوقت ضرورت نصرت کا عہد بھی لیا جا چکا ہے اس لئے یوں مقدور ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام تشریف لا کر اپنی طرف سے اصالۃ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرف سے وکالۃ اس عہد کو پورا فرمائیں۔ کیا ان چند وجوہات سے جو فوری طور پر زیر قلم آگئے ہیں گذشتہ شبہات کا جواب نہیں ہو جاتا۔

کتاب اللہ میں اور حدیثوں میں دیگر موجودہ کتب سماویہ کے مقابلہ میں مجازات اور استعارہ کا استعمال بہت کم ہے اور یہ اسلام کا ایک طغریٰ امتیاز بھی ہے \* جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ہم کو یہی ثابت ہوا ہے کہ دیگر کتب سماویہ کی نسبت ہماری شریعت میں استعارات و مجازات کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ کتب سابقہ کی موجودہ صورت پر گو کوئی اعتماد نہیں کیا جاسکتا تاہم ہمارے موازنہ کے لئے ان کے موجودہ نسخوں کے علاوہ ہمارے سامنے کوئی اور سامان بھی نہیں ہے۔ جب ہم حدیث و قرآن کریم کی پیشگوئیوں اور اس کے دیگر بیانات کی کتب سابقہ کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو ہم کو آفتاب درخشاں کی طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ ہماری شریعت نے اس بارے میں استعارات و مجازات کا دائرہ بجز ان مجازات کے جو حقیقت سے زیادہ متعارف ہوں بہت تنگ رکھا ہے اور عقائد کے باب سے تو اس کا کوئی تعلق ہی نہ رکھا۔ اس کے برخلاف موجودہ انجیل کا حال یہ ہے کہ اس میں الوہیت و رسالت کے بنیادی مسائل بھی مجازات و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کئے گئے ہیں حتیٰ کہ منصف عیسائی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کے مذہب میں تو حید کا مسئلہ بھی تقدیر کے مسئلہ کی طرح مذہب کا ایک راز اور ناقابل مہم مسئلہ ہے اس کے برعکس قرآن کریم کا بیان ہے یہاں عقائد و احکام کا تو ذکر ہی کیا ہے پیشگوئیوں کا عام باب بھی اس طرح کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی صحیح فہم والے شخص کے لئے ان میں کوئی تردد نہیں رہتا۔ فارس و روم کی جنگ میں فتح کی پیشگوئی، فتح مکہ کی پیشگوئی، اعضاء انسانی کا کام کرنا، دجال کی پیدائش، اس کا اور اس کے والدین کا نقشہ، سر کے بل انسانوں کا محشر میں چلنا، برہنہ قبور سے نکلنا اور مردوں اور عورتوں کا ایک میدان میں اسی طرح جمع ہونا، غرض حشر و نشر اور جنت و دوزخ کی تفصیلات جو مادی عقلوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کے نزول سے کہیں بعید تر ہیں ان سب کے متعلق صاحب شریعت کی طرف سے ہم پر بھی زور دیا گیا ہے کہ وہ سب کی سب حقیقت ہی حقیقت ہیں اور کسی تاویل کے بغیر ہمیں ان کو حقیقت ہی پر محمول کرنا چاہیے چنانچہ اگر جنت کے تذکرہ میں حسب الاتفاق اس کا ذکر آ گیا ہے کہ وہاں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی تو سامعین نے کبھی اس کو مبالغہ پر حمل نہیں کیا بلکہ اپنے ذوق کے مطابق وہی سوالات کئے ہیں جو ان الفاظ کے حقیقی معنی میں پیدا ہو سکتے تھے۔ مثلاً کسی نے یہ سوال کیا کہ کیا جنت میں کاشت اور کھیتی بھی ہوگی اور جب کبھی جنت میں صنفی تعلقات کا ذکر آ گیا ہے تو سامعین میں سے اس پر کسی نے ولادت کے مسئلہ کا حل بھی دریافت کیا ہے۔ اسی طرح بقیہ مسائل کے متعلق بھی ایسے سوالات کئے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے مخاطب صحابہ ہمیشہ آپ کے کلام کو حقیقت ہی پر محمول کرنے کے عادی تھے پھر ان کے جو جوابات آپ سے منقول ہیں وہ بھی اسی کی دلیل ہیں کہ خود آپ نے بھی ان الفاظ سے حقیقی معنوں ہی کا ارادہ فرمایا ہے مثلاً پہلے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اگر کسی زراعت منش آدمی کے دل میں وہاں بھی یہ جذبہ پیدا ہوگا گا تو زراعت اس کی بالیدگی و پختگی سب آن کی آن میں ہو جائے گی اور ذرا سی دیر نہ ہوگی کہ کھیتی کٹ کٹا کر اس کے گھر میں آ جائے گی اور قدرت کی طرف سے ارشاد ہوگا۔ ابن آدم لے تو یہ بھی لے تیری ہوس آخر کسی طرح پوری بھی ہوگی اگر یہاں مجازی معنی استعمال ہوتے تو جواب صاف تھا کہ جنت میں کھیتی کہاں اس کا مطلب تو صرف ایک معنی مجازی اور مبالغہ تھا اسی طرح دوسرے سوال کے جواب میں بھی آپ یہی فرما سکتے تھے کہ اگر کوئی شخص ولادت کی تمنا کرے تو فوراً حمل ولادت اور وضع حمل کا سلسلہ آنا فنا پورا ہو کر کھیلتا ہوا بچہ اس کو مل جائے گا مگر جو دنیا میں میزان تو فی لانے کے لئے نہیں آئے بلکہ حقیقت ہی حقیقت بتانے آئے تھے انہوں نے یہاں بھی وہی جواب نہیں دیا جو صرف قیاس سے دیا جاسکتا تھا بلکہ وہ جواب عنایت فرمایا جو حقیقت میں اس کا جواب تھا۔ ارشاد ہے کہ اگر جنت میں کسی کے دل میں یہ تمنا ہوتی تو ایسا ہی ہوتا مگر وہاں کسی کے دل میں یہ تمنا ہی نہ ہوگی۔

غرض شریعت اسلام کی تاریخ میں متکلم و مخاطب دونوں کے حالات سے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جانبوں سے شرعی الفاظ کے ہمیشہ حقیقی معنی ہی مراد لئے گئے ہیں بجز اس کے کہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے وہاں استعارہ و مجاز اتنا واضح ہو کہ حقیقی معنی کی طرف عام طور پر ذہن کا انتقال ہی مشکل ہو۔ مثلاً صبح کے لئے الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ کا لفظ اور شب کی تاریکی کے لئے الْخَيْطُ الْأَسْوَدُ کا لفظ فصیح لغت میں ایک ایسا مجاز ہے کہ اس مجاز کو چھوڑ کر یہاں حقیقت کا استعمال کرنا گویا انداز بلاغت ہی کو چھوڑ دینا ہے اس کے باوجود جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ﴾ (البقرة: ۱۸۷) تو کسی دماغ نے اس کھلے ہوئے مجاز کو بھی حقیقت ہی پر محمول کیا اور سیاہ و سفید رنگ کے دو دھاگے لے کر اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور رات کو اس وقت تک کھاتا پیتا رہا جب تک کہ یہ دو دھاگے علیحدہ علیحدہ صاف صاف نظر نہ آنے لگے جب صبح کو اس واقعہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے بلیغانہ انداز میں فرمایا تمہارا تکیہ بھی کتنا لمبا چوڑا ہے جس کے نیچے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں سما گئیں یعنی ان الفاظ سے مراد معنی مجازی تھے اور یہاں مجاز ایسا متعین ہے کہ حقیقت کی طرف ذہن جانا ہی مشکل ہے تم نے اس کو حقیقت پر کیسے محمول کر لیا۔ لیکن اس انفرادی غلطی کے باوجود اس کی اتنی اہمیت محسوس کی گئی کہ کلمہ ”مِنَ الْفَجْرِ“ اور نازل ہو گیا تا کہ پھر یہ مجاز متعارف بھی حقیقت کے اتنا قریب آ جائے کہ یہاں کسی ایک فرد کو بھی احکام کے باپ میں اس غلط فہمی کا امکان



نہ رہے۔ ا

خلاصہ یہ کہ دیگر کتب سماویہ کے مقابلہ میں قرآن کریم اور احادیث نبویہ کا یہ بھی ایک طغریٰ امتیاز ہے کہ یہاں جملہ بیانات اتنے واضح ہیں جتنا کہ وہ ہو سکتے ہیں پھر اگر ان میں کوئی ابہام رہ گیا ہے تو وہ بھی اسی حد تک ہے جو ناگزیر ہے بلکہ وہاں یہ ابہام ہی مناسب ہے۔ بعض مرتبہ مصداق کے ظہور سے قبل وہ ابہام اس لئے بھی ناگزیر ہوتا ہے کہ اس کی تشریح کے لئے عقل انسانی متحمل نہیں ہو سکتی جیسے برزخی کیفیات ظاہر ہے کہ عالم برزخ جب عالم مادیات سے جدا عالم ہے تو جب تک ایک انسان سے عام مادہ میں موجود ہے وہ علم برزخ کے دوسرے عالم کی پوری تفصیلات کا پورا احاطہ کیسے کر سکتا ہے۔

اور درحقیقت آخری شریعت کی یہی صفحہ ہونی بھی چاہیے کیونکہ پہلی کتب میں اگر کوئی ابہام رہ گیا تو آئندہ نبی نے آ کر اس کو واضح کر دیا ہے لیکن اگر ضروری امور میں اس شریعت میں بھی ابہام رہ جائے تو اب یہاں کون ہے جو آئندہ آ کر اس کی ذمہ دارانہ تشریح کر سکے مجتہدین کا بیان اس جگہ نا کافی ہے ان کو یہاں دو طرفہ عمل کے لئے وسعت ہوتی ہے اس کے باوجود ان کے بیان کی وہ حیثیت نہیں جو رسول کے سرکاری بیان کی ہو سکتی ہے۔

صریح حدیثوں میں تاویل کا خطرناک نتیجہ \* صریح الفاظ اور صریح بیانات کو پیچیدہ بنانے اور ان کی تاویلات کرنے کا نتیجہ کبھی اچھا برآمد نہیں ہوا یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی پیشگوئی میں تاویل کی آخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے دجال کا مصداق سمجھا اور جب دجال ظاہر ہوگا تو اُس کو مسیح ہدایت سمجھ کر اس کی اتباع کریں گے اسی طرح نصاریٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف صاف پیشگوئیوں کی تاویلات کیں آخر اس کا بھی جو نتیجہ ظاہر ہونا تھا وہ ہوا اور انہوں نے بھی اسی غلطی کی بدولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا۔ لہذا صاف اور واضح بیانات میں تاویلات کرنا نہایت خطرناک قدم ہے اور اس کا ثمرہ بھی یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ غلط مسیح، مسیح حق مان لئے جائیں اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں تو یہودیوں کی طرح ان کا انکار کر دیا جائے۔ اگر نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اتنے واضح اور صریح الفاظ میں بھی تاویلات یا مجازات و استعارات جاری کر دینا صحیح ہے تو پھر یہود و نصاریٰ کو بھی قصور وار ٹھہرانا غلط ہوگا جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشگوئیوں میں تاویلیں کر کے اپنا ایمان برباد کیا۔

والعیاذ باللہ من الزیغ والالحاد

ا۔ اس سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ یہاں ایسے مجازات کا تو بھلا کیا امکان ہوگا جن کی طرف کسی اہل زبان کا ذہن ہی منتقل نہ ہو سکے حتیٰ کہ ان کے زبردستی منوانے کے لئے جدید وحی کی ضرورت محسوس ہو اور کسی نبی مزموم کو آ کر پہلے خود بھی سالوں کا مغالطہ لگا ہے اور وہ بھی ان کو حقیقی معنی پر ہی حمل کرتا رہے پھر جب وہ مدعی مسیحیت بنے تو ان کے مجازی معنی مراد لے اور اس کے سمجھانے میں اس کو امت کے ساتھ مدتوں جنگ کرنی پڑے۔ مثلاً یہ کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی عیسیٰ ابن مریم سے مجازاً فلاں شخص (جس کا باپ بھی موجود ہے اور ماں کا نام بھی مریم نہیں ہے) مراد ہے اور نزول سے مجازاً ولادت اور حاکم سے مجازاً حکومت اور دمشق سے فلاں شہر اور دوزرد چاروں سے مجازاً آدم و مرثض مراد ہیں غرض کہ اس پیشگوئی کے جملہ الفاظ میں مجازی معنی مراد لے لئے بجز ایک منارہ کے کہ اس کے معنی حقیقی مراد لے اور حقیقی معنی بھی وہ خود اپنے نزول یعنی ولادت بلکہ دعویٰ مسیحیت کے بعد اپنے چندہ سے منارہ بنا کر پیدا کرے بیشک مجاز و استعارہ فصاحت و بلاغت کا ایک اہم باب ہے اور ہر زبان میں پایا جاتا ہے مگر کیا ایسے استعارہ و مجاز کی مثال بھی کسی زبان میں ملتی ہے اگر اس قسم کے استعارہ و مجاز کے لئے بھی کوئی وجہ جواز نکل سکتی ہے تو پھر دنیا میں جھوٹ اور کذب کی کوئی مثال نہیں مل سکتی ہر جھوٹ استعارہ و مجاز کے پردے میں چل سکتا ہے۔

## سیدنا روح اللہ عیسیٰ بن مریم و قطعہ مهمہ من حیاتہ الطیبۃ علیہ الصلوٰۃ والسلام

سیدنا روح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کی حیات طیبہ کی ایک اہم سرگزشت

نزل عیسیٰ بن مریم علیہ السلام حق جزم بہ النبی ﷺ حتی حلف علیہ

(۱۲۵۳) عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَيُوشَكَنَّ أَنْ يَنْزَلَ فِيكُمْ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرُ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلَ الْخَنَزِيرَ وَيَضَعَ الْحَرْبَ وَيَفِيضَ الْمَالَ حَتَّى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ حَتَّى تَكُونَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا ثُمَّ يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ وَأَقْرَأُوا إِن شِئْتُمْ (وَأَنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا)

(رواہ البخاری و مسلم ص ۸۷ ج ۱)

(۱۲۵۳) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ یقیناً وہ زمانہ قریب ہے جبکہ ابن مریم تمہارے درمیان اتریں گے وہ ایک منصف فیصلہ کرنے والے کی حیثیت سے آئیں گے صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور سور کو قتل کریں گے اور جنگ ختم کر دیں گے اور ان کے دور میں مال اس طرح بہا پڑے گا کہ کوئی شخص اس کو قبول کرنے والا نہ ملے گا اور لوگوں کی نظروں میں ایک سجدہ کی قدر و قیمت دنیا و مافیہا سے بھی زیادہ بڑھ جائے گی یہ مضمون روایت فرما کر ابو ہریرہؓ کہتے تھے کہ اگر تم اس مضمون کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہو تو سورۃ النساء کی یہ آیت پڑھ لو ﴿وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ﴾ (آیت: ۱۵۹)

(بخاری و مسلم ج ۱ ص ۸۷)

(۱۲۵۳) \* حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول میں اگر عام عادت کے خلاف کوئی بات نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قسم کھا کھا کر کیوں بیان فرماتے ہیں معلوم ہوا کہ یہاں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے کسی انسان کی والدت مراد نہیں کیونکہ اس میں کوئی ایسی جدید بات نہیں جس پر قسم کھانے کی ضرورت ہو پھر اس پیشین گوئی کی اہمیت راوی حدیث کی نظر میں اتنی ہے کہ وہ اس کو قرآنی پیشین گوئی کہتا ہے اب اس سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ جو پیشین گوئی قسم کے ساتھ حدیثوں میں بیان کی گئی ہو بلکہ قرآن کریم میں موجود ہو وہ جزم و یقین کے اس درجہ میں ہوگی۔ حدیث مذکور میں ان کے زمانہ کی چند ایسی برکات کا تذکرہ بھی آ گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت ایک غیر معمولی شخصیت ہوگی وہ کوئی معمولی محکوم انسان نہیں ہوں گے بلکہ حاکم بھی وہ حاکم ہوں گے جو وقت کی بڑی طاقت یعنی نصرانیت کا صرف روحانی طور پر ہی نہیں بلکہ مادی طور پر بھی استیصال فرمائیں گے اور شعائر نصرانیت میں سب سے بڑا شعار یعنی ”صلیب“ اس کو نیست و نابود کر دیں گے اخروی برکات کے ساتھ ساتھ دنیوی برکات بھی ان کے قدموں سے لگی ہوئی ہوں گی اور یہ سب اللہ ...



و فی لفظ مَنْ رَوَايَةَ عَطَاءٍ وَ لَتَذْهَبَنَّ  
الشَّحْنَاءُ وَ التَّبَاغُضُ وَ التَّحَاسُدُ. (رواہ  
مسلم شریف میں عطاء کی روایت میں یہ الفاظ اور ہیں کہ ان کے زمانہ کی  
برکات میں سے یہ بھی ہوگا کہ لوگوں میں کینہ بغض اور حسد کا نشان باقی نہ  
ابوداؤد و ابن ماجہ و احمد فی مسندہ رہے گا۔

ص ۴۹۳ ج ۲ و ص ۴۹۴ ج ۲ و لطریق اخر فی ص ۴۱۱ ج ۲.

و لفظہ یوشک من غاش منکم ان یلقی عیسیٰ بن مریم و عزاه السیوطی فی الدر المنثور ص ۲۴۲ ج ۲ لابن ابی  
شیبہ و عبد بن حمید و اخرجه ابن مردويه و فی لفظہ و تكون السجدة واحدة لله رب العالمین و اقرءوا ان شئتم  
و ان من اهل الکتاب الا لیؤمنن به قبل موته موت عیسیٰ بن مریم ثم یعیذها ابوهريرة ثلث مرات.

(۱۲۵۴) و اخرج ابو یعلیٰ مرفوعاً و الذی  
(۱۲۵۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذات کی قسم کھا کر فرمایا جس  
نفسیٰ بیدہ لیزلن عیسیٰ بن مریم ثم لن  
قام علی قبری و قال یا محمد لا جینہ.

(کذا فی روح المعانی من الاحزاب ص ۶)

(۱۲۵۵) عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
(۱۲۵۵) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ  
اللہ علیہ وسلم مَنْ أَدْرَكَ مِنْكُمْ عِيسَى بْنُ  
صلى الله عليه وسلم نے فرمایا ہے تم میں سے جس شخص کی بھی عیسیٰ بن مریم علیہا  
مَرِيَمَ فَلْيَقْرَأْهُ مِنَ السَّلَامِ. (کذا فی الدر المنثور  
السلام سے ملاقات ہو وہ ان کو میری جانب سے ضرور سلام کہہ دے۔ (احمد)

ج ۲ ص ۴۴۵ و قد رواه احمد فی مسنده عن ابی هريرة مرفوعاً ايضاً بسند رجال البخاری

(۱۲۵۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مَوْقُوفًا عَلَيْهِ أَنِّي  
(۱۲۵۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میری زندگی

برکات اتنی ظاہر و باہر ہوں گی کہ اس وقت کے انسانوں کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وہی ”اسرائیلی“ رسول ہونے کا بدیہی ثبوت  
دیں گے۔ یہ بھی واضح رہے کہ حدیث مذکور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ”حکم“ فرمایا گیا ہے اور حکم وہی ہو سکتا ہے جو فریقین کے  
نزدیک مسلم ہو اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ نازل ہونے والے وہی اسرائیلی عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ ان کی شخصیت ہی اہل کتاب اور امت  
محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کے نزدیک مسلم ہو سکتی ہے اگر بالفرض اس پیشین گوئی کا مصداق کسی ایسے شخص کو قرار دیا جائے جو خود اسی امت  
میں پیدا ہو تو اس کو حکم نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اہل کتاب کے نزدیک وہ مسلم نہیں ہوگا۔ یہاں حکم یعنی ثالث کی ضرورت اس لئے ہے کہ دنیا  
کے خاتمہ پر جملہ ادیان کا پھر ملت واحدہ بن جانا ضروری ہے اور اس کے لئے اہل کتاب اور اہل قرآن کا باہم اختلاف ختم ہو جانا لازم ہے۔  
چونکہ اللہ تعالیٰ کے سب فیصلے دلائل و براہین کی روشنی میں ہوتے ہیں اس لئے اس کی مصلحت نے تقاضا کیا کہ اس مقصد کے لئے ایک ایسی  
شخصیت آئے جو فریقین کے نزدیک مسلم ہو تاکہ خدائے تعالیٰ کی حجت دونوں فریق پر پوری ہو جائے اس لئے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی  
کا تشریف لانا مقدر ہوا۔ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا۔

(۱۲۵۶) \* ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یقینی امر ہے اور ایسا یقینی ہے کہ اس پیشین گوئی کے لئے....

لَا رُجُوءَ إِنْ طَالَتْ بِي حَيَوَةٌ أَنْ أَدْرِكَ  
عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ فَإِنْ عَجَّلَ بِي مَوْتُ فَمَنْ  
أَدْرَكَهُ فَلْيُقْرَأْهُ مِنِّي السَّلَامَ. (مسند احمد  
ج ۲ ص ۲۹۸) و رجالہ رجال البخاری و دے۔ (مسند احمد)

قد اخرج البخاری بهذا لاسناد احادیث فراجع ج ۲ ص ۱۰۰۷ و ج ۲ ص ۹۹۹.

ان عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام لم  
یمیت الی الان و انه راجع الینا  
ثم یراتی علیہ الفناء

(۱۲۵۷) عَنْ الْحَسَنِ مَرْفُوعًا وَ مَوْقُوفًا قَالَ  
قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
لِلْيَهُودِ إِنَّ عِيسَى لَمْ يَمُتْ وَ إِنَّهُ رَاجِعٌ  
إِلَيْكُمْ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَمَةِ. اخرجہ ابن جریر مرفوعاً  
(۱۲۵۷) حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے ارشاد فرمایا۔ عیسیٰ علیہ السلام  
ابھی مرے نہیں ہیں اور قیامت سے پہلے ان کو لوٹ کر تمہارے پاس آنا  
ہے۔ (ابن کثیر)

عنه و اخرج ابن كثير من ال عمران و ذكره في النساء من طريق اخر موقوفا عليه و اخرج ابن ابی حاتم مرفوعاً.  
(۱۲۵۸) عَنْ الرَّبِيعِ مُرْسَلًا قَالَ إِنَّ نَصَارَى  
أَتَوْا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
(۱۲۵۸) ربیع مرسل بیان کرتے ہیں نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی  
خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسیٰ بن مریمؑ کے معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ

للہ.... راویوں کی نظروں میں اس کا انتظار لگ رہا تھا۔ نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت غیر معمولی شخصیت ہے۔ امت کا فرض ہے کہ  
پیشینگوئی کو یاد رکھے اور جس خوش نصیب کو وہ زمانہ ہاتھ آ جائے اس پر لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پہنچا کر آپ کی وصیت کو پورا  
کرنے کی سعادت حاصل کرے۔

(۱۲۵۷) \* عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں یہود و نصاریٰ کو علیحدہ علیحدہ  
خطاب فرمایا ہے چونکہ یہود عیسیٰ علیہ السلام کو مردہ تصور کرتے ہیں اور ان کی دوبارہ آمد کے منکر ہیں اس لئے جب آپ نے خاص یہود کو  
خطاب فرمایا تو ان کے مقابلہ میں خاص طور پر ان کی دوبارہ تشریف آوری پر زور دیا ہے اور صراحت کے ساتھ ان کی موت کی نفی فرمادی ہے  
جس سے ثابت ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہی نہیں ہوئی تو پھر ان کا دوبارہ تشریف لانا خود بخود ضروری ہے اور اس حقیقت کی مزید تاکید  
کے لئے جو شخص آسمانوں پر گیا ہے وہی شخص دوبارہ آئے گا لفظ ”رجوع“ یعنی لوٹنے کا استعمال فرمایا ہے۔ اس کے برعکس نصاریٰ ہیں وہ ان  
کو خدا مانتے ہیں لہذا ان کے نزدیک وہ فناء کے تحت آ ہی نہیں سکتے لہذا آپ نے جب خاص ان سے خطاب فرمایا تو ان کو یہ کہہ کر قائل کیا  
ہے کہ خدا وہ ہے جس کو کبھی فناء نہ ہو اور عیسیٰ علیہ السلام کو اترنے کے بعد موت آنی ہے پھر وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔

(۱۲۵۸) \* اگر بالفرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موت آ چکی تھی تو کیا اس حقیقت کے انکشاف کے لئے اس سے زیادہ بڑھ کر لفظ....



فَخَاصَمُوهُ فِي عَيْسَى بْنِ مَرْيَمَ وَقَالُوا لَهُ مَنْ  
أَبُوهُ وَقَالُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ وَالْبُهْتَانُ  
فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السُّتُمُ  
تَعْلَمُونَ أَنَّهُ لَا يَكُونُ وَلَدًا إِلَّا وَهُوَ يَشْبَهُ أَبَاهُ  
قَالُوا بَلَى قَالَ السُّتُمُ تَعْلَمُونَ أَنَّ رَبَّنَا حَتَّى  
لَا يَمُوتُ وَ أَنَّ عَيْسَى يَأْتِي عَلَيْهِ الْفَنَاءُ قَالُوا  
بَلَى. (الحديث كذا في الدر المنثور من اول  
سورة ج ۲ ص ۲۰۳)

وسلم سے جھگڑنے لگے اور کہنے لگے (کہ اگر وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے نہ تھے) تو  
بتائیے ان کا والد کون تھا؟ اور حق تعالیٰ شانہ پر طرح طرح کے جھوٹ اور  
بہتان لگانے لگے آپ نے ان سے فرمایا کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہر بیٹا  
اپنے باپ کے مشابہ ہوا کرتا ہے انہوں نے کہا کیوں نہیں پھر آپ نے فرمایا  
کیا تم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے اس کو  
موت کبھی نہ آئے گی اور عیسیٰ علیہ (علیہ السلام) کو موت آنی ہے انہوں نے  
اس کا اقرار کیا اور کہا بے شک ان کو موت آنی ہے (تو پھر وہ حق تعالیٰ کے  
مشابہ کہاں رہے) (در منثور)

(۱۲۵۹) ابوالطفیل حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر سے تشریف لائے اس وقت ہم  
قیامت کے متعلق گفتگو میں مشغول تھے آپ نے فرمایا کیا گفتگو کر رہے ہو؟  
ہم نے عرض کی قیامت کے متعلق باتیں کر رہے ہیں آپ نے فرمایا قیامت  
اس وقت تک ہرگز نہیں آسکتی جب تک کہ اس سے پہلے تم دس نشانیاں دیکھ  
نہ لو۔ دھواں، دجال، دابۃ الارض، مغرب کی جانب سے آفتاب کا طلوع،

(۱۲۵۹) عَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ أَسِيدٍ  
الْغِفَارِيِّ قَالَ أَطَّلَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
عَلَيْنَا وَنَحْنُ نَتَذَكَّرُ فَقَالَ مَا تَذَكَّرُونَ قَالُوا  
نَذَكُرُ السَّاعَةَ قَالَ إِنَّهَا لَنْ تَقُومَ حَتَّى تَرَوْنَ قَبْلَهَا  
عَشْرَ آيَاتٍ فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالْجَحَالَ وَالْذَّابَةَ وَ  
طُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُولَ عَيْسَى بْنِ

ﷺ... کوئی اور موقعہ تھا آپ یہاں صاف فرما دیتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو کبھی کے مرچکے ہیں مگر قرآن و حدیث میں عیسائیوں کے  
سامنے ایک جگہ بھی ہم کو اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔

(۱۲۵۹) \* حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کا آنا یقینی ہے مگر اس سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول چند اور علامات کے  
ساتھ بھی اتنا ہی یقینی ہے حتیٰ کہ ان کی تشریف آوری سے قبل قیامت کا تصور کرنا گویا بے حقیقت بات ہے۔ نیز مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ  
السلام کا نزول جن اور دیگر علامات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہر علامت اپنی اپنی نوعیت میں عجیب ہی ہے اور بظاہر ہے کہ انقلاب  
عالم کے عجیب تر حادثہ کی علامات ایسے ہی عجیب و غریب ہونی چاہئیں اس کو تاویلیں کر کر کے دنیا کے عام حوادث کی صف میں کھینچنا قیامت  
کی حقیقت سے ناواقف کی دلیل ہے بلکہ ایک طرح پر قیامت ہی کا انکار ہے کیونکہ قیامت کا وجود ان علامات کے وجود سے کہیں عجیب تر ہے  
پس اگر یہ علامات مادی عقول کے نزدیک خلاف عقل ہونے کی بناء پر قابل تاویل ہیں تو پھر قیامت کا وجود بدرجہ اولیٰ قابل تاویل ہونا چاہئے  
والعیاذ باللہ۔ اہل عقل و انصاف کو ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا چاہئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول حدیثوں میں قیامت کے  
قریب تر متعلقات میں شمار کیا گیا ہے پھر اگر اس کو قیاس کرنا ہی ہے تو قیامت پر قیاس کرنا چاہئے۔ عالم کے عام نظم و نسق میں اس کو شامل کر  
لینا کتنی بڑی نادانی ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ علامات قیامت میں قیامت کی علامات کی دو قسمیں  
قراردی ہیں۔ صغریٰ (چھوٹی) اور کبریٰ (بڑی) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول علامات کبریٰ میں شامل فرمایا ہے جس کا حاصل ﷺ...

مَرْيَمَ وَيَا جُوجَ وَمَا جُوجَ وَثَلَاثَةَ خُسُوفٍ  
خَسَفَ بِالشَّمْسِ وَخَسَفَ بِالشَّمْسِ وَخَسَفَ بِالشَّمْسِ  
خَسَفَ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذَلِكَ نَارٌ  
تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلَى مَحْشَرِهِمْ.

عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کا اترنا، یا جوج و ما جوج کا ظہور، تین خسوف، ایک  
مشرق میں، ایک مغرب میں اور تیسرا جزیرہ عرب میں اور سب سے آخر میں  
وہ آگ جو یمن سے ظاہر ہوگی اور سب کو دھکا دے کر محشر تک لے جائے  
گی۔ (مسلم شریف)

اخرجه مسلم ص ۳۹۳ و عن واثلة نحوه اخرجہ الطبرانی و الحاکم و وافقه الذہبی علی نصیحہ.

(۱۲۶۰) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ  
أُمَّتِي عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ عَلَى مَنْ نَاوَاهُمْ حَتَّى  
يَأْتِي أَمْرُ اللَّهِ تَنَارُكَ وَتَعَالَى وَيَنْزِلُ عِيسَى  
بُنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ. (مسند احمد ج ۴ ص

(۱۲۶۰) حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے  
ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری امت میں  
ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی جو اپنے دشمنوں کے مقابلہ پر غالب رہے  
گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو اور حضرت عیسیٰ بن  
مریم اتریں۔

(مسند احمد)

(۱۲۶۱) عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ مَرْفُوعًا قَالَ إِنَّ  
الْمَسِيحَ بْنَ مَرْيَمَ خَارِجٌ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَ  
يَسْتَعْنِ بِهَ النَّاسُ عَمَّنْ سِوَاهُ. (کنز العمال ج

(۱۲۶۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت سے پہلے عیسیٰ بن مریم (علیہا السلام) یقیناً  
تشریف لا کر رہیں گے اور ان کی آمد کے بعد لوگ ان کے سوا سب سے بے  
نیاز ہو جائیں گے۔ (کنز العمال)

(۱۲۶۲) عَنْ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوعًا لَيْفَ تَهْلِكُ  
أُمَّةٌ أَنَا فِي أَوَّلِهَا وَعِيسَى فِي آخِرِهَا. (کنز

(۱۲۶۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے  
روایت کرتے ہیں بھلا وہ امت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے جس کے اول میں  
تو میں ہوں اور آخر میں عیسیٰ (علیہ السلام) ہوں۔

ضمن اثر كعب و حسنه في الفتح من فضائل اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم و ذكره في المشكوة في ثواب هذه  
الامة عن رزين سلسلة الذهب قال في التيسير ص ۳۰۲ رواه النسائي وغيره۔

(۱۲۶۳) عَنْ جُبَيْرِ بْنِ نَفِيرٍ الْحَضْرَمِيِّ

(۱۲۶۳) جبیر بن نفیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

... حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ اس کے بعد قیامت کا اس طرح انتظار کرنا چاہیے جیسے جانور کے حمل کی مدت پوری ہو جانے کے بعد اس کا مالک  
بچہ کی پیدائش کا انتظار کیا کرتا ہے جیسا کہ اس باب کے آخر کی حدیثوں میں عنقریب آپ کے ملاحظہ سے گذرے گا۔

(۱۲۶۰) \* حدیث مذکور اگرچہ ایک دوسرے مضمون کی حدیث ہے مگر چونکہ قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری  
قیامت کی طرح یقینی مسئلہ ہے اس لئے جب کہیں قیامت کا تذکرہ آتا ہے تو اگر وہاں سیاق کلام میں ذرا کوئی مناسبت نکل آتی ہے تو  
مسلمات کی طرح فوراً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا تذکرہ بھی آ جاتا ہے۔

(۱۲۶۳) \* حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یقینی ہے اور اس نزول میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لئے...



مَرْفُوعًا سَلَا لَنْ يُخْزِيَ اللَّهُ أُمَّةً أَنَا فِي أَوَّلِهَا وَ  
عِيسَى فِي آخِرِهَا. (کذا فی الدر المنثور ج ۲ ص ۲۴۵) اور آخر میں عیسیٰ (علیہ السلام) ہوں۔ (در منثور)

و قال الذهبي في التلخيص هو خبر منكر ولم يذكر له وجهها وجهها بل الصحيح انه ان لم يكن صحيحا فلا ينحط عن  
درجة الحسن كما صرح به الحافظ في الفتح ج ۷ ص ۵ و عن عروة بن رويم مثله كما في الكنز ج ۷ ص ۲۰۲ و عن  
كعب مثله مرفوعا في ضمن اثره الموقوف عليه كذا في الدر المنثور و عن جعفر الصادق عن ابيه عن جده مرفوعا في  
حديث نحوه رواه رزين كما في المشكوة من باب ثواب هذه الامة

إِنَّ عِيسَى عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ يُنْزِلُ  
مِنَ السَّمَاءِ وَلَا يُولَدُ فِي الْأَرْضِ  
حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام آسمان سے اتریں گے اور زمین  
کے کسی خطہ میں پیدا نہیں ہوں گے

(۱۲۶۳) عَنْ الْحَاطِبِ بْنِ أَبِي بَلْتَعَةَ قَالَ بَعَثَنِي  
حَاطِبُ بْنُ أَبِي بَلْتَعَةَ بَيَانُ كَرْتِهِ هِيَ كَرْتُهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

ﷺ.... امت کے لئے ایک بڑی رحمت بھی پنہاں ہے۔ یوں تو ہر گزشتہ امت دور رسولوں کے درمیان ہی ہوتی چلی آئی ہے مگر چونکہ پہلے ہر رسول  
کی امت مستقل ہوتی تھی اس لئے اس کو پہلی امت کے آخر میں شمار کرنا بے معنی بات تھی وہاں ہر رسول کا اصل مقام اپنی امت کے اول ہی میں تھا  
جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گونصاری کے بعد تشریف لائے مگر چونکہ آپ مستقل رسول تھے اور آپ کی امت علیحدہ امت تھی اس لئے آپ کو  
امت عیسیٰ علیہ السلام کے آخر میں شمار کرنا اور یہ کہنا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی امت بھی دور رسولوں کے درمیان ہے اس کے اول میں عیسیٰ علیہ السلام  
ہیں اور آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل بے معنی بات ہے۔ لیکن اس امت کا معاملہ بالکل مختلف ہے یہاں اس امت کے رسول تو صرف  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری اس امت میں بہ حیثیت رسالت نہ ہوگی اس لئے ان کی امت بھی کوئی  
جدید امت نہ ہوگی اس لئے ان کو اس امت کے آخر میں شمار کرنا بالکل درست ہے اور اس امت کے حق میں بڑی رحمت کا باعث ہے۔

حدیث مذکور سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ آخر میں آنے والے رسول وہی اسرائیلی رسول ہوں گے اور خود اس امت میں پیدا نہیں  
ہوں گے کیونکہ اگر وہ خود اس امت میں پیدا ہوں تو پھر ان کو امت کے آخر میں کہنا مناسب نہیں پس یہاں جس طرح امت کے اول میں آنے  
والے رسول کو اس امت میں شمار کرنا صحیح نہیں اسی طرح اس کے آخر میں آنے والے رسول کو اس امت میں پیدا شدہ کہنا صحیح نہیں بلکہ وہ ایسا  
رسول ہونا چاہئے جو خود رسول ہو مگر آئندہ اس کی کوئی علیحدہ امت نہ ہوتا کہ اس کو اس امت کے آخر میں کہنا صحیح اور بامعنی بات ہو یہ بات  
دوسری ہے کہ چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں آئے گا اس لئے دورہ نبوت کے لحاظ سے اس کو آپ کی امت میں بھی شمار کرنا  
درست رہے تو پھر اس میں ایک عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص نہیں تمام انبیاء علیہم السلام بھی آپ کی نبوت کے تحت ہیں اور اس لئے صحیح حدیثوں  
میں آتا ہے کہ محشر میں آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سب آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ مگر چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ  
السلام کی یہ شان ایک بار دنیا میں بھی ظاہر ہوگی اس لئے تمام انبیاء علیہم السلام میں سے خاص ان کے اندر یہ رشتہ زیادہ نمایاں رہے گا اس لئے  
علماء حقائق نے لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں اس خصوصیت کا ظہور قیامت کے دن بھی سب میں ممتاز رہے گا عجب نہیں کہ انا اولی الناس  
بابن مریم کی صحیح حدیث میں اس طرف بھی کچھ اشارہ ہو۔

(۱۲۶۳) \* اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حاطب اور شاہ مقوقس کے درمیان ایک مربوط گفتگو کا تذکرہ ہے....

رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى الْمُقَوْسِ  
مَلِكِ الْأَسْكَندَرِيَّةِ قَالَ فَجِئْتُهُ بِكِتَابِ رَسُولِ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَنْزَلَنِي فِي مَنْزِلِهِ وَ  
أَقَمْتُ عِنْدَهُ ثُمَّ بَعَثَ إِلَيَّ وَقَدْ جَمَعَ بِطَارِقَةً وَ  
قَالَ إِنِّي سَأُكَلِّمُكَ بِكَلَامٍ وَأُحِبُّ أَنْ تَفْهَمَهُ  
مِنْهُ قَالَ قُلْتُ هَلُمَّ قَالَ أَخْبَرَنِي عَنْ صَاحِبِكَ  
أَلَيْسَ هُمْ نَبِيًّا قُلْتُ بَلَى هُوَ رَسُولُ اللَّهِ قَالَ  
فَمَا لَهُ حَيْثُ كَانَ هَكَذَا لَمْ يَدْعُ عَلَى قَوْمِهِ  
حَيْثُ أَخْرَجُوهُ مِنْ بَلَدِهِ إِلَى غَيْرِهَا قَالَ فَقُلْتُ  
عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ أَلَيْسَ تَشْهَدُ أَنَّهُ رَسُولُ اللَّهِ فَمَا  
لَهُ حَيْثُ أَخَذَهُ قَوْمُهُ فَأَرَادُوا أَنْ يَصْلُبُوهُ أَنْ لَا  
يَكُونَ دَعَا عَلَيْهِمْ بِأَنْ يُهْلِكُ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ حَتَّى  
رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ فِي السَّمَاءِ الدُّنْيَا قَالَ أَنْتَ  
الْحَكِيمُ الَّذِي جَاءَ مِنْ عِنْدِ الْحَكِيمِ. (اخرجه  
البيهقي في الخصائص ج ۱ ص ۱۲) قلت ولم  
يذكره الشيخ قدس سره في رسالته في نزول  
المسيح عليه السلام

وسلم نے مجھ کو مقوقس شاہ اسکندریہ کے پاس بھیجا یہ کہتے ہیں کہ جب رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے  
مجھ کو اپنی جگہ پر بٹھایا اور میں ان کے ہاں مقیم رہا پھر کسی فرصت میں انہوں  
نے مجھ کو یاد فرمایا اور اپنے مذہبی بزرگوں کو بھی دعوت دی اور کہا مجھ کو تم  
سے ایک بات کہنی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کو خوب سمجھ لو یہ کہتے  
ہیں میں نے عرض کی فرمائیے! فرمائیے! انہوں نے فرمایا اچھا اپنے پیشوا  
کے متعلق بتاؤ کیا وہ نبی ہیں؟ میں نے عرض کی یقیناً وہ اللہ کے رسول ہیں  
اس پر انہوں نے کہا تو پھر ان کی قوم نے ان کو اپنے وطن سے ہجرت  
کرنے پر مجبور کیا تھا تو انہوں نے کیوں ان پر بددعا نہ کی؟ یہ کہتے ہی میں  
نے اس کے جواب میں شاہ مقوقس سے کہا کیا آپ عیسیٰ علیہ السلام کے  
متعلق یہ گواہی نہیں دیتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو پھر جب ان کی  
قوم نے ان کو پکڑ کر سولی دینے کا ارادہ کیا تھا تو انہوں نے اس وقت ان  
کے حق میں بددعا کیوں نہ کی کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کر دے یہاں تک کہ  
اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اس آسمان پر ان کو اٹھالیا۔ یہ سن کر شاہ مقوقس نے  
کہا تو خود بھی دانا شخص ہے اور جس ہستی کا فیض یافتہ ہے وہ بھی بڑی  
صاحب حکمت ہے۔

(بیہقی)

..... ہے جس کو پڑھ کر بے ساختہ دل اس کی تصدیق پر مجبور ہو جاتا ہے اس گفتگو میں صحابی کو مقوقس کے جواب میں گو صرف اتنا کہہ دینا کافی  
تھا کہ ”پھر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنوں پر بددعا کیوں نہیں کی“ مگر انہوں نے شاہ مقوقس پر اور زیادہ زور ڈالنے کے لئے یہ حقیقت بھی  
واضح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہجرت فرمائی تھی وہ تو صرف ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف تھی مگر عیسیٰ علیہ السلام کی ہجرت تو  
ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف تھی ظاہر ہے کہ آپ نے وطن چھوڑا مگر پھر بھی رہے وطن ہی کے قریب و بعید میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام  
نے تو ایسی جگہ ہجرت فرمائی جہاں نہ وطن کی خبر رہی نہ اہل وطن کی پس بددعا کا سوال وہاں زیادہ چسپاں ہوتا ہے جہاں مظلومیت زیادہ ہو اس  
پر شاہ مقوقس نے یہ نہیں کہا کہ تم یہ کیا نامعقول بات کہتے ہو حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر کہاں گئے ان کی تو مدت ہوئی وفات ہو چکی ہے بلکہ  
وہ لا جواب ہو کر چپ رہ گیا اور اس کو خود ان کی بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی غائبانہ داد دینی پڑی۔ معلوم ہوا کہ شاہ مقوقس کے  
نزدیک بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ زندہ آسمان پر تشریف لے گئے ہیں اس لئے آسمان ہی سے اتریں گے ان کے  
علاوہ کسی دوسرے انسان کا دنیا میں پیدا ہونے کا خیال یہ صرف جدید تراشیدہ افسانہ ہے جس کے اہل کتاب ہی قائل تھے نہ علماء اسلام۔



(۱۲۶۵) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ مِنَ السَّمَاءِ فِيكُمْ وَآمَمَكُمْ مِنْكُمْ. (ذکرہ البیہقی فی کتاب الاسماء والصفات ص ۳۰۱ و عزاء للبخاری و مسلم علی عادة المحدثین فی کون مرادهم به اصل الحديث)

(۱۲۶۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بھلا اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب عیسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان آسمان سے اتریں گے اور تمہارا امام خود تم میں کا ہوگا۔ (الاسماء والصفات)

و عن ابن عباس فی تفسیر قوله تعالیٰ ان تعذبهم فانهم عبادک و ان تغفر لهم ای من ترک منہم و مدفی عمرہ حتی اہبط من السماء الی الارض یقتل الدجال فنزلوا عن مقاتلہم و وحدوک و افروا انا عبید و عنہ قال لما اراد اللہ ان یرفع عیسی الی السماء خرج الی اصحابہ و فی البیت اثنا عشر رجلاً من الحواریین فخرج علیہم من غیر البیت و راسہ یقطر ماء .

ابن عباسؓ آیت ﴿و ان تعذبہم﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے یعنی ان لوگوں کو جن کو تو باقی رکھے۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی عمر دراز کر دی گئی ہے یہاں تک کہ جب وہ آسمان سے زمین پر اتریں اور دجال کو قتل کر دیں تو جو باقی ماندہ اپنے مشرکانہ عقیدے سے باز آ کر تیری واحدانیت کے قائل ہو جائیں اور یہ اقرار بھی کریں کہ میں تیرا ایک بندہ ہی ہوں تو تو قادر اور حکمت والا ہے۔ نیز ابن عباسؓ رُفِعَ اللہ الیہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو وہ اپنے صحابہ کے پاس تشریف لائے اس وقت گھر میں صرف بارہ شخص موجود تھے اور وہ گھر کے دروازہ کی بجائے روشندان سے تشریف لے گئے اور اس وقت ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

(درمنثور ج ۲ ص ۲۳۸)

(۱۲۶۶) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوعًا قَالَ الدَّجَالُ

(۱۲۶۶) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ

(۱۲۶۵) \* حدیث مذکور میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے ہر چند کہ آسمان کے لفظ کی ان تفصیلات کے بعد جو عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں بیان میں آ چکی تھیں کوئی ضرورت نہ تھی مگر اس کے باوجود چونکہ وہ ایک حقیقت تھی اس لئے اگر بضرورت نہ سہی تو ایک حقیقت کے اظہار کے طور پر ہی سہی اس کا جا بجا تذکرہ ملتا ہے حتیٰ کہ حضرت ابن عباسؓ بھی جن کے متعلق یہ داستان گائی جاتی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے قائل تھے مختلف مقامات میں ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کی تصریح فرماتے ہیں پھر اس میں شبہ کیا ہے کہ ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مرنا ہے کلام صرف اس میں ہے کہ یہ مقدر موت واقع ہو چکی ہے یا آئندہ واقع ہونے والی ہے کتنی نا فہمی ہے کہ بالفرض اگر ان کے بارے میں کسی سے موت کا لفظ منقول بھی ہے تو اس کو فوراً بے تحقیق گذشتہ موت پر حمل کر لیا جائے حالانکہ وہ اس کا صاف اقرار بھی کر رہا ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے جا چکے ہیں اور آئندہ تشریف لا کر عام انسانوں کی طرح وفات پائیں گے۔

(۱۲۶۶) \* اس حدیث میں بھی صراحت کے ساتھ آسمان کا لفظ موجود ہے اور ان کے دور کے امن و امان اور اصلاح و امان عام کا ایسا نقشہ موجود ہے جس سے بد اہتہ ثابت ہوتا ہے کہ یقیناً وہ کوئی غیر معمولی انسان ہوں گے اب اگر کسی کے دل میں ہر حقیقت کو مجاز بنا بنا لیں ....

أَوَّلُ مَنْ يَتَّبِعُهُ سَبْعُونَ أَلْفًا مِنَ الْيَهُودِ عَلَيْهِمُ  
السَّيِّجَانُ (الی قولہ) قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعِنْدَ  
ذَلِكَ يَنْزِلُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ مِنَ السَّمَاءِ  
عَلَى جَبَلٍ أَمِيقٍ إِمَامًا هَادِيًا وَحَكَمًا عَادِلًا  
عَلَيْهِ بُرْنَسٌ لَهُ مَرْبُوعُ الْخَلْقِ أَمَلَتْ سَبْطُ  
الشَّعْرِ بِيَدِهِ حَرْبَةً يَقْتُلُ الدَّجَالَ فَإِذَا قَتَلَ  
الدَّجَالَ تَضَعُ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا فَكَانَ السَّلَامُ  
فَيَلْقَى الرَّجُلُ الْأَسَدَ فَلَا يَهِيْجُهُ وَيَأْخُذُ  
الْحَيَّةَ فَلَا تَضُرُّهُ وَتَنْبُتُ الْأَرْضُ كَنْبَاهِهَا  
عَلَى عَهْدِ آدَمَ وَيُؤْمِنُ بِهِ أَهْلُ الْأَرْضِ وَ  
يَكُونُ النَّاسُ أَهْلَ مِلَّةٍ وَاحِدَةٍ. (اسحق ابن  
بشیر کنز ج ۷ ص ۶۸۰)

حَزْمُ النَّبِيِّ ﷺ بَانَ النَّازِلُ هُوَ عِيسَى  
بْنُ مَرْيَمَ الَّذِي وَلَدَ مِنْ غَيْرِ آبٍ وَشَيْدُهُ  
لَا بِمَا لَا مَزِيدَ عَلَيْهِ مِنْ ذِكْرِ اسْمِهِ وَنَسَبِهِ  
وَ حُلِيِّهِ وَالْأَعْمَالُ الْمَهْمَةُ الَّتِي يَنْزِلُهَا وَ  
مَنْصَبُهُ الَّذِي يَنْزِلُ بِهِ وَ كَيْفِيَّةُ الْأَمْنِ  
الشَّامِلِ وَسُعَةِ الرِّزْقِ وَ فَيْضَانِ الْمَالِ وَ  
غَيْرِهَا فِي عَهْدِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
(۱۲۶۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے سب سے پہلے جو لوگ دجال کی  
اتباع کریں گے وہ ستر ہزار یہود ہوں گے ان کے سروں پر طیلسان ہوں  
گے اس سلسلہ میں ابن عباسؓ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام کوہ اقیق پر آسمان سے  
اتریں گے اور وہ امام ہادی اور منصف حاکم ہوں گے برنس (باران کوٹ کی  
طرح ہوتا ہے) پہنے ہوئے ہوں گے وہ میانہ جسم کے ستے ہوئے رخسار اور  
سیدھے بالوں والے ہیں ان کے ہاتھ میں نیزہ ہوگا دجال کو قتل کریں گے اور  
جب اس کے قتل سے فارغ ہو جائیں گے تو جنگ ختم ہو جائے گی اور امن و  
سلامتی کا یہ عالم ہوگا کہ آدمی اور شیر کا آمنا سامنا ہوگا مگر اس پر حملہ کرنے کا  
اس کے دل میں ذرا خیال نہ آئے گا آدمی سانپ کو اپنے ہاتھ میں لے گا اور  
وہ اس کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچائے گا اور زمین کی پیداوار میں وہ برکت ہوگی  
جو کبھی آدم علیہ السلام کے زمانہ میں تھی اور زمین کے بسنے والے ان پر ایمان  
لے آئیں گے اور سب مخلوق ایک ہی ملت و مذہب کی ہو جائے گی۔ (کنز)  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے یقین کے ساتھ فرمایا ہے کہ  
آئندہ تشریف لانے والے وہی عیسیٰ ہوں گے جن کی پیدائش بغیر  
والد کے ہوئی ہے چنانچہ اسی کی وضاحت کے لئے آپؐ نے ان  
کے نام ان کے نسب اور ان کی شکل و صورت بیان فرمانے کا خاص  
اہتمام فرمایا ہے اسی کے ساتھ آپؐ کی خدمات مفوضہ ان کا منصب  
ان کے زمانہ امن عام کی کیفیت رزق کی فراوانی اور دیگر امور کی  
تفصیلات بھی بیان فرمائی ہیں

(۱۲۶۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ﷺ.... کہ اس پیشین گوئی کو اپنے نفس پر صادق کرنے کا جذبہ ہو تو اس کا علاج کس کے پاس ہے ہاں جو شخص کسی کی ہوائے نفسانی کی خاطر  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان بصیرت افروز ارشادات کی بے جاتا دیلات پر یقین لانے کو ترجیح دے وہ اپنا ٹھکانا خود سوچ لے و مَنْ  
لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَالَهُ مِنْ نُورٍ۔

(۱۲۶۷) \* اس حدیث پر پہلی نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں اسی مسیح (اسرائیلی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ ہے جو ایک ﷺ....



عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةُ الْعَلَاتِ أَبُوهُمْ  
وَاحِدٌ وَأُمَّهُاتُهُمْ شَتَّى وَأَنَا أَوْلَى النَّاسِ  
بِعِيسَى بْنِ مَرْيَمَ لِأَنَّهُ لَمْ يَكُنْ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ  
وَأَنَّهُ نَازِلٌ فَإِذَا أَرَأَيْتُمُوهُ فَأَعْرِفُوهُ فَإِنَّهُ رَجُلٌ  
مَرْبُوعٌ إِلَى الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ سَبْطٌ كَانَ رَأْسُهُ  
يَقْطُرُ وَإِنْ لَمْ يُصْبِهِ بَلَلٌ بَيْنَ مُمَصَّرَتَيْنِ  
فَكَيْسَرُ الصَّلِيبِ وَيَقْتُلُ الْخَنْزِيرَ وَيَضَعُ  
الْحِزْبِيَّةَ وَيَعْطِلُ الْمِلَلَ حَتَّى يَهْلِكَ اللَّهُ فِي  
زَمَانِهِ الْمِلَلَ كُلُّهَا غَيْرَ الْإِسْلَامِ وَيَهْلِكَ اللَّهُ  
فِي زَمَانِهِ الْمَسِيحَ الدَّجَالَ الْكَذَّابَ وَتَقَعُ  
الْأَمْنَةُ فِي الْأَرْضِ حَتَّى تَرْتَعَ الْإِبِلُ مَعَ الْأَسَدِ  
جَمِيعًا وَالنَّمُورُ مَعَ الْبَقَرِ وَالذَّبَابُ مَعَ الْغَنَمِ وَ  
يَلْعَبُ الصِّبْيَانُ وَالْغُلَمَانُ بِالْحَيَّاتِ لَا يُضَرُّ  
بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَيَمُوتُ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَمُوتَ  
ثُمَّ يَتَوَفَّى فَيُصَلَّى عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ وَيَذْفُونَهُ.

(مسند احمد ج ۲ ص ۴۳۷)

سے روایت کرتے ہیں کہ جتنے انبیاء ہیں سب باپ شریک بھائیوں کی طرح  
ہیں والد ایک اور مائیں علیحدہ علیحدہ ہوں عیسیٰ علیہ السلام سے سب سے  
زیادہ نزدیک میں ہوں میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں دیکھو وہ  
ضرور اتریں گے اور جب تم ان کو دیکھو تو فوراً پہچان لینا کیونکہ ان کا قدمیانہ  
ہوگا رنگ سرخ و سفید کنگھی کئے ہوئے سیدھے سیدھے بال یوں معلوم ہوگا  
کہ سر سے پانی ٹپکنے والا ہے اگرچہ اس پر کہیں تری کا نام نہ ہوگا وہ گيرو کے  
رنگ کی چادریں اوڑھے ہوں گے وہ اتر کر صلیب کو توڑ ڈالیں گے سور کو قتل  
کریں گے جزیہ ختم کر دیں گے اور تمام مذاہب ان کے زمانہ میں ختم ہو کر  
صرف ایک مذہب اسلام باقی رہ جائے گا اور ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ  
جھوٹے مسیح دجال کو ہلاک کرے گا اور زمین پر امن و امان کا وہ نقشہ قائم ہو  
گا کہ اونٹ شیروں کے ساتھ اور چیتے بیلوں کے ساتھ اور بھیڑیے بکریوں  
کے ساتھ چریں گے اور لڑکے بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے اور ایک  
دوسرے کو ذرا کوئی تکلیف نہ دے گا اسی حالت پر جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور  
ہوگا وہ رہیں گے پھر ان کی وفات ہوگی اور مسلمان ان پر نماز جنازہ ادا  
کریں گے اور ان کو دفن کر دیں گے۔

(مسند احمد)

... بار یہ حیثیت نبوت کے پہلے آچکے ہیں اور وہی اس امت پر ایک بڑی مصیبت کے وقت دوبارہ پھر تشریف لانے والے ہیں کیونکہ  
زمانہ کے لحاظ سے آپ سے وہی اتنے قریب ہیں کہ ان کے اور آپ کے درمیان کوئی نبی نہیں اس لئے بھی اس مصیبت کے وقت آپ کی  
امت کی ہمدردی کا فرض سب سے پہلے ان ہی پر عائد ہوتا ہے نیز آپ نے اس کی مزید توضیح کے لئے ان کا وہی نام و نسب ان کی اسی ملکی  
نظافت و طہارت اور ان کے اسی حلیہ مبارک کا تذکرہ فرمایا ہے جس کے بعد کسی مجنون کے لئے بھی اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی پھر  
آپ نے صرف ان کے ماضی سوانح کے بیان پر ہی کفایت نہیں فرمائی بلکہ ان کے مستقبل کے ایسے کارنامے اور ایسی روشن برکات کا بھی  
تذکرہ فرمادیا ہے جن کے بعد ان کی شناخت میں کوئی ادنیٰ تردد نہیں ہو سکتا اب اگر آپ کے فرمودہ پر ایمان لانا ہے تو وہ واضح سے واضح  
انداز میں یہ آپ کے سامنے موجود ہے اور اگر اپنے خیالات پر ایمان لانا ہے تو یہود اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق  
میں یہی راستہ اختیار کر چکے ہیں۔ کتب سماویہ صاف سے صاف انداز میں آپ کے نام و نسب آپ کی شکل و شمائل اور آپ کے کارناموں کو  
کھول کھول کر بیان کرتی رہیں اور یہ بدنصیب ان سب کی تاویلیں کر کر کے آپ کا انکار کرتے رہے۔ ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا  
بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شہر کا نام  
اور اُس شہر میں خاص محل نزول کا نام اور نزول  
کے وقت اُن کا مکمل نقشہ اور ان کے زمانہ  
کی برکات

الْبَلَدُ الَّذِي يَنْزِلُ فِيهِ عِيسَى عَلَيْهِ الصَّلَاةُ  
وَالسَّلَامُ وَ مَوْضِعُ النُّزُولِ مِنْهُ بَعَيْنُهُ وَ  
هِيَانُهُ عِنْدَ نَزْوِلِهِ وَالْبَرَكَةُ الْعَامَّةُ فِي  
الْأَشْيَاءِ فِي عَهْدِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
(۱۲۶۸) عَنْ النُّوَاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ ذَكَرَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الدَّجَالَ  
ذَاتَ غَدَاةٍ فَخَفَضَ فِيهِ وَ رَفَعَ حَتَّى ظَنَّاهُ  
فِي طَائِفَةِ النَّخْلِ فَلَمَّا رُحْنَا إِلَيْهِ عَرَفَ  
ذَلِكَ فِينَا فَقَالَ مَا شَأْنُكُمْ قُلْنَا يَا رَسُولَ  
اللَّهِ ذَكَرْتَ الدَّجَالَ غَدَاةً فَخَفَضْتَ فِيهِ وَ  
رَفَعْتَ حَتَّى ظَنَّاهُ فِي طَائِفَةِ النَّخْلِ فَقَالَ  
غَيْرُ الدَّجَالِ أَخَوْفَنِي عَلَيْكُمْ أَنْ يَخْرُجَ وَ أَنَا  
فِيكُمْ فَأَنَا جَحِيحَةٌ دُونَكُمْ وَ أَنْ يَخْرُجَ وَ  
لَسْتُ فِيكُمْ فَأَمْرٌ جَحِيحٌ نَفْسِهِ وَاللَّهِ  
خَلِيفَتِي عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ. إِنَّهُ شَابٌّ قَطَطَ  
عَيْنُهُ طَافَةٌ كَانَ أَشْبَهُهُ بِعَبْدِ الْعَزِيِّ بْنِ قَطَنِ  
فَمَنْ أَدْرَكَ مِنْكُمْ فَلْيَقْرَأْ عَلَيْهِ فَوَاتِحَ  
سُورَةِ الْكَهْفِ. إِنَّهُ خَارِجٌ خَلَّةً بَيْنَ الشَّامِ وَ  
الْعِرَاقِ فَعَاثَ يَمِينًا وَ عَاثَ شِمَالًا يَا  
عِبَادَ اللَّهِ فَاتَّبِعُوا قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَ مَا لَبِثُهُ

(۱۲۶۸) نواس بن سمعان روایت کرتے ہیں کہ ایک دن صبح کو رسول اللہ صلی  
اللہ علیہ وسلم نے اتنی اہمیت سے دجال کا تذکرہ فرمایا کہ مارے دہشت کے ہم کو  
یوں معلوم ہونے لگا گویا وہ یہیں کسی باغ میں موجود ہے جب ہم آپ کی  
خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ہمارے اس دہشت و خوف کو محسوس کر لیا  
اور پوچھا تم ایسے پریشان کیوں نظر آتے ہو؟ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم آپ نے صبح دجال کا ذکر اتنی اہمیت کے ساتھ فرمایا کہ ہم کو یوں معلوم  
ہونے لگا گویا وہ یہیں کسی باغ میں ہے آپ نے فرمایا مجھ کو تم پر دجال سے بڑھ  
کر دوسری باتوں کا زیادہ اندیشہ ہے دجال کا کیا ہے اگر وہ میری موجودگی میں  
نکلا تو میں تمہارے بجائے خود اس سے نمٹ لوں گا ورنہ تو ہر شخص خود اس کا مقابلہ  
کرے اور میں نے تم سب کو خدا کے سپرد کیا۔ دیکھو وہ جوان ہوگا اس کے بال  
سخت گھونگر والے اور اس کی آنکھ انگور کی طرح باہر کو ابھری ہوئی ہوگی بالکل اس  
شبابت کا شخص سمجھو جیسا یہ عبدالعزیٰ بن قطن ہے تو تم میں جو شخص بھی اس کا زمانہ  
پائے اس کو چاہئے کہ وہ سورہ کہف کی اول کی آیتیں پڑھ لے۔ وہ شام اور عراق  
کی درمیانی گھاٹیوں سے ظاہر ہوگا اور اپنے دائیں بائیں ہر سمت بڑا ادھم مچائے  
گا تو اے اللہ کے بندو! دیکھو اس وقت ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کی یا رسول  
اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کتنے عرصہ تک زمین پر رہے گا؟ فرمایا چالیس دن

(۱۲۶۸) \* اس حدیث میں دجال کا تذکرہ قدرے محل غور ہے اس کے مباحث اپنے محل میں آئیں گے ان میں سے صرف ایک بات کی  
تشریح یہاں کرنی مناسب ہے حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کے زمانہ میں ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا حتیٰ کہ اس ایک دن  
میں ایک سال کی نمازیں اداء کرنی ہوں گی۔ دن کی اس طوالت کی صورت کیا ہوگی؟ اس کا حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک  
جب دنیا میں ان عجائبات کے ظہور کا زمانہ شروع ہو جائے گا تو عالم کے موجودہ نظم و نسق کے تحت ان واقعات کے حل کرنے اور سمجھنے کی کوشش  
کرنی بھی مفت کی دردسری ہے تاہم حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ علامات قیامت میں شیخ محی الدین ابن تہلک ....



لیکن پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا اور پھر دوسرا ایک ماہ اور تیسرا ایک جمعہ کے برابر ہوگا اس کے بعد بقیہ دن تمہارے عام دنوں کے برابر ہوں گے ہم نے پوچھا جو دن ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس دن ہم کو ایک ہی دن کی نمازیں ادا کرنی کافی ہوں گی؟ فرمایا نہیں بلکہ ایک دن کی برابر نمازوں کا اندازہ کر کر کے نمازیں ادا کرتے رہنا۔ ہم نے پوچھا وہ کس رفتار سے زمین پر گھومے گا؟ فرمایا اس تیز رفتار بادل کی طرح جس کو پیچھے سے ہوا اڑائے لا رہی ہو وہ کچھ لوگوں کے پاس آ کر ان کو اپنی خدائی پر ایمان لانے کی دعوت دے گا وہ اس پر ایمان لے آئیں گے وہ خوش ہو کر آسمان کو بارش کا حکم دے گا فوراً بارش آ جائے گی اور زمین کو حکم دے گا اسی وقت وہ سبزہ زار ہو جائے گی اور شام کو جب ان کے حیوانات چراگا ہوں سے چر کر واپس ہوں گے تو ان کے اونٹوں کے گوبان پہلے سے زیادہ لمبے لمبے ان کے تھن پہلے سے زیادہ دودھ سے لبریز اور ان کی کونکھیں پہلے سے زیادہ تنی ہوئی ہوں گی اس کے بعد وہ کچھ اور لوگوں کے پاس جائے گا اور ان کو بھی اپنی خدائی کی دعوت دے گا مگر وہ اس کو نہ مانیں گے جب وہ ان کے پاس سے واپس ہوگا تو یہ بیچارے سب قحط میں مبتلا ہو جائیں گے اور ان کے قبضہ میں کوئی مال نہ رہے گا (سب دجال کے ساتھ چلا جائے گا) پھر وہ ایک شورش زمین سے گزرے گا اور اس کو یہ حکم دے گا ”اپنے تمام خزانے باہر اگل دے“ وہ سب کے سب اس کے پیچھے پیچھے اس طرح ہو لیں گے جیسے مکھیوں کے سردار کے پیچھے پیچھے سب مکھیاں ہوتی ہیں اس کے بعد ایک شخص کو بلائے گا جو اپنے پورے شباب پر ہوگا اور تلوار سے اس کے

فِي الْأَرْضِ قَالَ أَرْبَعُونَ يَوْمًا. يَوْمَ كَسَنَةِ. وَ يَوْمَ كَشْفِهِ وَ يَوْمَ لَجْمَعَةٍ وَ سَائِرُ أَيَّامِهِ كَمَا يَمُكُّكُمْ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ فَذَلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَسَنَةِ اتَّكَفَيْنَا فِيهِ صَلَوةً يَوْمَ قَالَ لَا أَقْدِرُوا لَهُ قَدْرُهُ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا أَسْرَعُهُ فِي الْأَرْضِ قَالَ كَالْغَيْتِ اسْتَدْبَرْتَهُ الرِّيحُ فَيَأْتِي عَلَى الْقَوْمِ فَيَدْعُوهُمْ فَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَ يَسْتَجِيبُونَ لَهُ فَيَأْمُرُ السَّمَاءَ فَتُمْطَرُ وَالْأَرْضُ فَتَنْبُتُ فَتَرْوَحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَتُهُمْ أَطْوَلَ مَا كَانَتْ ذُرَى وَ أَسْبَغَهُ ضُرُوعًا وَ أَمَدَهُ خَوَاصِرَ ثُمَّ يَأْتِي الْقَوْمَ فَيَدْعُوهُمْ فَيَرُدُّونَ عَلَيْهِ قَوْلَهُ فَيَنْصَرِفُ عَنْهُمْ فَيَصْبَحُونَ مَمْحِلِينَ لَيْسَ بِأَيْدِيهِمْ مِنْ شَيْءٍ مِنْ أَمْوَالِهِمْ وَ يَمُرُّ بِالْخَرْبَةِ فَيَقُولُ لَهَا أَخْرِجِي كُنُوزَكَ فَتَتَّبَعُهُ كُنُوزُهَا كَيْعًا سَيِّبَ النِّحْلَ ثُمَّ يَدْعُوهُمْ رَجُلًا مُمْتَلِنًا شَبَابًا فَيَضْرِبُهُ بِالسَّيْفِ فَيَقْطَعُهُ جَزَلَتْنِ رَمِيَّةَ الْغَرَضِ ثُمَّ يَدْعُوهُ فَيُقْبَلُ وَ يَهْلُلُ وَجْهَهُ وَ يَضْحَكُ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَلِكَ إِذَا بَعَثَ اللَّهُ

ﷺ .... عربی سے نقل کیا ہے کہ مصائب و آلام کے ان ہنگاموں میں اگر عام گردوغبار اور غلیظ ابر کی وجہ سے رات و دن متمیز نہ ہوں سکیں تو کچھ بعید نہیں ہے آج بھی معمولی بارشوں میں عصر و مغرب و عشاء کی نمازوں میں تقدیم و تاخیر ہو جانا، معمولی بات ہے ذرا زیادہ گرہن لگ جائے تو ظہر کا پتہ ملنا بھی مشکل ہے صبح کی نماز کا تو کہنا ہی کیا ہے پس بہت ممکن ہے کہ اس سب سے بڑے فتنے کا ظہور کے وقت جس طرح روحانیت کا عالم تاریک در تاریک ہوگا اسی طرح عام غصریات بھی گردوغبار اور ابر و باران کی وجہ سے اتنا مکدر اور تاریک ہو جائے کہ صحیح طور پر یہ اندازہ ہی ممکن نہ رہے کہ رات کب ختم ہوئی اور دن کب آیا اور تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قضاء عالم یکساں نظر آنے لگے ان حالات میں اس کے سواء اور کیا صورت ہوگی کہ اوقات نماز کا صرف ایک اندازہ رکھا جائے رہا گھڑیوں کا سوال تو گو گھڑیاں موجود ہیں مگر سب جانتے ہیں کہ خاص کر عرب میں نماز دن کا تعلق اب بھی آفتاب کے طلوع و غروب ہی کے ساتھ ہے یعنی غروب آفتاب پر یہاں سب گھڑیوں ﷺ ....

دو ٹکڑے کر کے اتنی دور پھینک دے گا جتنا تیر انداز اور اس کے نشانہ لگانے کی جگہ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے پھر اس کو آواز دے کر بلائے گا وہ ہنستا کھلکھلاتا چلا جائے گا ادھر وہ یہ شعبہ بازیاں دکھلا رہا ہوگا ادھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کو بھیجے گا وہ دمشق کے مشرقی سفید منارہ پر اتریں گے اور دو زرد زعفرانی چادریں اوڑھے ہوئے دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے سر جھکائیں گے تو پانی کے قطرے ٹپکتے معلوم ہوں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو بالوں میں چاندی کے سے موتی گرتے محسوس ہوں گے جس کافر کو ان کے سانس لگ جائیں گے وہ زندہ نہ رہ سکے گا اور ان کے سانس کا اثر اتنے فاصلہ تک پڑے گا جہاں تک کہ ان کی نظر جائے گی وہ دجال کا پیچھا کریں گے اور باب لد (بیت مقدس میں ایک مقام ہے) پر اس کو پکڑ لیں گے اور یہاں اس کو قتل کر دیں گے اس کے قتل سے فارغ ہو کر عیسیٰ علیہ السلام پھر ان لوگوں کے پاس آئیں گے جو اس کے فتنہ سے بچ رہے ہوں گے اور ان کو تسلی و تشفی دیں گے اور جنت میں ان کے مراتب کا حال بیان فرمائیں گے پھر عیسیٰ علیہ السلام پر وحی آئے گی کہ اب میری ایک ایسی مخلوق نکلنے والی ہے جس کے مقابلہ کی کسی میں طاقت نہیں لہذا میرے بندوں کو کوہ طور کی طرف لے جا کر

الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ فَيُنْزِلُ عَبْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ بَيْنَ مَهْرُودَتَيْنِ وَاضِعًا كَفِّهِ عَلَى أَجْنَحَةِ مَلَكَيْنِ إِذَا طَاطَأَ رَأْسَهُ قَطْرًا وَإِذَا رَفَعَهُ تَحَدَّرَ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّوْلُوفِ فَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ رِيحَ نَفْسِهِ إِلَّا مَاتَ وَنَفْسُهُ يَنْتَهِي إِلَى حَيْثُ يَنْتَهِي طَرَفُهُ فَيَطْلُبُهُ حَتَّى يُدْرِكَهُ بَبَابٍ لَدَفِيقُتْلُهُ ثُمَّ يَأْتِي عِيسَى قَوْمًا قَدْ عَصَمَهُمُ اللَّهُ مِنْهُ فَيَمْسَحُ عَنْ وُجُوهِهِمْ وَيُحَدِّثُهُمْ بِدَرَجَاتِهِمْ فِي الْجَنَّةِ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَلِكَ إِذْ أَوْحَى اللَّهُ إِلَى عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ إِنِّي قَدْ أَخْرَجْتُ عِبَادَ آلِي لَا يَدَانِ لِأَحَدٍ بِقَتَالِهِمْ فَحَرِّزْ عِبَادِي إِلَى الطُّورِ وَيَبْعَثِ اللَّهُ يَاجُوجَ وَمَاجُوجَ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ فَيَمُرُّ أَوَائِلُهُمْ عَلَى بَحِيرَةٍ طَبْرِيةٍ

اللہ .... میں ۱۲ بجادیئے جاتے ہیں اس وجہ سے تمام سالمین یہاں مغرب و عشاء کا وقت کبھی نہیں بدلتا یعنی مغرب ہمیشہ بارہ بجے اور اس کے بعد عشاء ہمیشہ ڈیڑھ بجے کے قریب ہوتی ہے اور اس لئے روزمرہ غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ گھڑی کو بھی موسموں کے لحاظ سے آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے شہروں میں تاریخ کی تبدیلی نصف شب کے بعد ہوتی ہے۔ یہاں ہمیں اس پر گفتگو کرنی نہیں ہے کہ ان دونوں نظاموں میں کونسا نظام معقول اور بہتر ہے کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ موجودہ عقول کے سامنے مادی ہر مشکل مشکل ہے لیکن اس کے مقابلہ میں صحیح ہے صحیح حدیثوں کا انکار یا تاویل کوئی مشکل نہیں اس لئے دماغوں میں یہ سوال گذر سکتا ہے کہ گھڑیوں کے بعد نمازوں کے اوقات میں اب کوئی مشکل نہیں ہو سکتی۔

۱۔ اس تفصیل میں اس وقت ہم جانا پسند نہیں کرتے کہ جس زمانے میں ان مصنوعات کا تصور بھی دماغوں میں موجود نہ ہو اس میں ایک امی قوم کے سامنے ان جدید آلات کا تذکرہ کرنا ایک سیدھی بات کے سمجھنے میں کتنی مشکلات کا باعث بن سکتا تھا غالباً اسی مصلحت سے یا جوج و ماجوج کے خاص آلات حرب کے نام بھی تذکرہ میں نہ آئے ہوں پھر یہ کس کو خبر ہے کہ ایسی طاقتوں کے استعمال کے نتیجہ میں آئندہ قوانین جنگ میں آلات حرب کی اجازت کس حد تک رہ جائے گی۔ بہر حال جب تک مستقبل حوادث کے متعلق یہ تفصیلات حدیث میں نہیں آئیں تو صرف اپنے دماغی سوال و جواب سے ان ثابت شدہ تفصیلات کا انکار کرنا کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا جو صحیح طریقوں سے معرض بیان میں آچکی ہیں۔



فَيُشْرَبُونَ مَا فِيهَا وَيَمُرُّ آخِرُهُمْ  
فَيَقُولُونَ لَقَدْ كَانَ بِهَذِهِ مَرَّةٍ وَيُحْصِرُ نَبِيُّ  
اللَّهِ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاصْحَابُهُ حَتَّى  
يَكُونَ رَأْسُ الثَّوْرِ لِأَحَدِهِمْ خَيْرًا مِنْ مَائَةِ  
دِينَارٍ لِأَحَدِكُمْ الْيَوْمَ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللَّهِ عِيسَى  
عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاصْحَابُهُ فَيُرْسِلُ عَلَيْهِمُ  
النَّغْفَ فِي رِقَابِهِمْ فَيُصْحَبُونَ فَرَسِي كَمُوتِ  
نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ يَهْبِطُ نَبِيُّ اللَّهِ عِيسَى عَلَيْهِ  
السَّلَامُ وَاصْحَابُهُ إِلَى الْأَرْضِ فَلَا يَجِدُونَ  
فِي مِثْلِي الْأَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرِ الْأَمْلَأَةِ  
زَهْمُهُمْ وَنَتْنُهُمْ فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللَّهِ عِيسَى  
عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاصْحَابُهُ إِلَى اللَّهِ فَيُرْسِلُ اللَّهُ  
طَيْرًا كَأَغْنَقِ الْبُخْتِ فَتَحْمِلُهُمْ فَتَطْرُقُهُمْ  
حَيْثُ شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ يُرْسِلُ اللَّهُ مَطَرًا لَا يَكُنْ

جمع کر دو۔ پھر یا جوج و ما جوج ہر پست زمین سے نکل پڑیں گے پہلے ان کا  
گذر طبریہ کے (مقام کا نام ہے) پانی پر ہو گا وہ اس کو پی کر اس طرح ختم کر دیں  
گے کہ جب ان کا آخری گروہ ادھر سے گذرے گا تو یوں کہے گا ”کبھی یہاں پانی  
تھا“ پھر بیت مقدس کے خبر پہاڑ پر پہنچیں گے اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں کہیں  
گے ہم زمین والوں کو تو ختم کر چکے لو آؤ اب آسمان والوں کا بھی کام تمام کر دیں  
اور اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے قدرت اُن کے تیروں کو خون آلود کر  
کے واپس کر دے گی ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی جماعت کوہ طور میں  
محصور ہوگی یہاں تک کہ نیل کا ایک سراتنا قیمتی ہو جائے گا جیسا آج تمہارے  
نزدیک سودینار ہیں اس تنگی کی حالت میں عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی جماعت مل  
کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگی ان کی دعاء سے ان کی گردنوں میں پھوڑے  
نکل آئیں گے اور وہ سب کے سب ایک دم میں اس طرح پھول پھٹ کر مر  
جائیں گے جیسا ایک آدمی مرتا ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے اتر  
کر آئیں گے تو زمین پر کہیں بالشت بھر جگہ نہ ہوگی جہاں ان کے سڑے ہوئے  
گوشت کی بدبو اور چربی کا اثر نہ ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی جماعت پھر اللہ

ﷺ اس کے علاوہ حدیث مذکور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی بھی کچھ تفصیلات مذکور ہیں ان کو آپ خالی الذہن ہو کر بار بار پڑھیں پھر یہ  
سوچیں کہ عربی زبان کے مطابق کیا ان تفصیلات میں کسی مجاز و استعار کا ارادہ کیا گیا ہے۔ ہم کو مجاز و استعار سے انکار نہیں مگر آپ کو بھی  
حقیقت سے انکار نہ ہونا چاہئے اگر سیاق کلام سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہاں متکلم نے یقیناً استعار و مجاز سے کام نہیں لیا تو پھر بے وجہ کھینچ کھینچ  
کر ایک حقیقت کو استعارہ و مجاز کا لباس پہنانا لا حاصل ہے۔

ابھی آپ حضرات ابن عباسؓ سے یہ روایت پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان پر اٹھائے گئے تھے تو اس وقت ان  
کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے یہ کرشمہ قدرت ہے کہ جب وہ نازل ہوں گے تو اس وقت بھی یونہی نظر آئے گا کہ ان کے  
بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں گویا وہ غسل کر کے ایک دروازہ سے نکلے تھے اور پانی خشک ہونے سے پہلے اب دوسرے دروازہ  
سے داخل ہو رہے ہیں۔ جس عالم میں نہ دن ہو نہ رات نہ سردی ہو نہ گرمی اور نہ صحت ہو نہ مرض پھر اس عالم میں اگر پانی کے یہ قطرے بھی  
کسی تغیر سے محفوظ رہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

پھر جس خدا تعالیٰ میں یہ قدرت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کو پرندوں کی زندگی کا سبب بنا دے اس میں یہ طاقت  
کیوں نہیں کہ اسی سانس کو وہ دجال کے حق میں ستم قاتل قرار دے دے۔ اسی طرح یہ بھی اس کی حکمت ہے کہ دجال جیسی قوت کو وہ ان کے  
صرف ایک اشارہ سے ہلاک کر دے اور دوسری طرف یا جوج و ما جوج کے مقابلہ سے عاجز بنا کر طور یک گوشہ نشینی پر مجبور کر دے تاکہ ﷺ

مِنْهُ بَيْتٌ مَدْرٍ وَلَا وَبَرٍ فَعَسَلُ الْأَرْضِ حَتَّى  
يَتْرَكَهَا كَالزَّلْفَةِ ثُمَّ يُقَالُ لِلْأَرْضِ أَنْتِ  
ثَمَرَتِكَ وَرُدِّي بَرَكَتِكَ فَيَوْمَئِذٍ تَأْكُلُ  
الْعَصَابَةُ مِنَ الرُّمَانَةِ وَيَسْتَظِلُّونَ بِقَحْفِهَا وَ  
يُبَارِكُ فِي الرَّسْلِ حَتَّى أَنْ اللَّقْحَةَ مِنَ  
الْغَنَمِ لَتَكْفِي الْفَخِذَ مِنَ النَّاسِ فَيَيْنَمَا هُمْ  
كَذَلِكَ إِذَا بَعَثَ اللَّهُ رِيحًا طَيِّبَةً فَتَأْخُذُهُمْ  
تَحْتَ أَبْطَاهِمُ فَتَقْبِضُ رُوحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَ  
كُلِّ مُسْلِمٍ وَيَبْقَى شِرَارُ النَّاسِ يَتَهَا رَجُونَ  
فِيهَا نَهَارَ الْحَمْرِ فَعَلَيْهِمْ تَقُومُ السَّاعَةُ.

(رواہ مسلم صفہ ۴۰۲ ج ۲ و ابو داؤد  
ص ۱۳۵۰ ج ۲ و غراہ فی الكنز ص ۳۶۸  
ج ۱ لابن عساکر و فی لفظہ انہبط عیسیٰ  
ابن مریم و احمد فی مسندہ ص ۱۸۱ و ص  
۱۸۲ ج ۱)

تعالیٰ کے سامنے آہ وزاری کرے گی اس پر اللہ تعالیٰ ایک قسم کا پرندہ بھیجے گا جن  
کی گردنیں بختی اونٹوں کی طرح لمبی لمبی ہوں گی وہ ان کو اٹھا کر جہاں اللہ تعالیٰ کو  
منظور ہوگا ڈال دیں گے اور ایک روایت میں ہے کہ مقام نہبل میں پھینک دیں  
گے پھر مسلمان ان کے تیر و کمان اور ترکشوں سے سات سال تک آگ جلاتے  
رہیں گے اور آسمان سے اس زور کی بارش برے گی کہ کوئی بستی نہ رہے گی اور جنگل  
میں کوئی خیمہ نہ بچے گا جس میں بارش نہ ہو یہاں تک کہ تمام زمین میں پانی کی  
نالیوں کی طرح پانی ہی پانی ہوگا پھر زمین کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا کہ اپنے پھل اور  
اپنی سب برکت ظاہر کر دے تو وہ برکت ظاہر ہوگی کہ ایک انار سے ایک جماعت کا  
پیٹ بھر جائے گا اور اس کا چھلکا ان کے سایہ کے لئے کافی ہوگا اور اونٹنی کے ایک  
مرتبہ کے دودھ میں اتنی برکت ہوگی کہ ایک دودھ والی اونٹنی کئی کئی جماعتوں کے  
لئے کافی ہوگی اور ایک دودھ کی گائے ایک قبیلہ کو اور ایک دودھ کی بکری ایک  
چھوٹے خاندان کو کافی ہوگی مخلوق خدا اسی فراغت و عیشی کی حالت میں ہوگی کہ ایک  
اچھی ہوا چلے گی اور اس سے مسلمانوں کی بغلوں میں پھوڑے نکل آئیں گے اور  
ان سب کو موت آجائے گی اور صرف بدترین قسم کے کافر بچ رہیں گے جو گدھوں  
کی طرح منظر عام پر رتا کرتے پھریں گے ان ہی پر قیامت قائم ہوگی۔ (مسلم)

اللہ .... طرف دنیا کو یہ واضح ہو جائے جس پر دعویٰ الوہیت کی تہمت لگائی گئی تھی وہ تو مدعی الوہیت کا قاتل ہے اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو  
جائے کہ جس نے ایک مدعی الوہیت کو قتل کیا ہے وہ خود خدا نہیں بلکہ وہ تو ایک بے چارہ بشر ہے اور اس طرح طاقت و ضعف کے ان دونوں  
مظاہروں میں اصل خدائے قہار ہی کی طاقت کا جلوہ نظر آئے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر و طغیان کی طاقتوں کو قدرت نے پہلے ہی قدم پر سزا نہیں دے دی بلکہ استدراج و امہال کا قانون  
برابر ان کے ساتھ جاری رہا ہے فرعون و نمرود شداد و ہامان کی داستانیں پڑھ لو تم کو ثابت ہوگا کہ جب کفر و طغیان اپنی پوری طاقت کو پہنچ چکا  
ہے تو اس کے بعد پاداشِ عمل کے قانون نے ان کو پکڑا ہے پھر وہی سنت یہاں یا جوج و ماجوج کے ساتھ بھی جاری ہوگی جب وہ آسمان  
والوں کے قتل سے مطمئن ہو جائیں گے تو پھر ایسے ہی طریقے سے ان کو ہلاک کیا جائے گا جو آسمان والے کی طرف سے ہوگا تاکہ عالم علوی  
کی شکست کا جواب سب غلط ہو کر رہ جائے۔

پھر دنیا کے خاتمہ پر وہی ایک ڈین رہ جائے گا جو حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے شروع ہوا تھا اور آسمان و زمین کی وہی برکتیں ظاہر ہو چکی  
ہیں اور اس طرح سے إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ کادوسرا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے کن حکمتوں سے عالم کو بچھایا  
کن حکمتوں سے اس کو پھیلایا پھر کن حکمتوں سے اس کو سمیٹے گا یہ خود وہی جانتا ہے۔ ہم بے وجہ ہر جگہ ان کے سمجھنے کے لئے اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں۔

دریا محیط خویش موبے دارد      خس پندارد کہ ایں کشاکش بادلیت



ذَكَرَ عِيسَى عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ  
فِي مُحَاوَرَتِهِ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ الْمَعْرَاجِ أَنَّهُ نَازِلٌ  
قَبْلَ قِيَامِ السَّاعَةِ وَأَنَّهُ قَاتِلُ الدَّجَالِ  
وَلَمْ يَذْكُرْ فِيهِ أَنَّهُ يَنْزِلُ لِاصْلَاحِ  
هَذِهِ الْأُمَّةِ خَاصَّةً وَانَّمَا يَكُونُ هَذَا  
مِنْ وَظَائِفِ إِمَامِهَا

(۱۲۶۹) عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَقِيتُ لَيْلَةَ اسْرِي بِي  
إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى قَالَ فَتَذَكَّرُوا  
أَمْرَ السَّاعَةِ فَرُدُّوا أَمْرَهُمْ إِلَى إِبْرَاهِيمَ فَقَالَ  
لَا عِلْمَ لِي بِهَا فَرُدُّوا الْأَمْرَ إِلَى مُوسَى فَقَالَ  
لَا عِلْمَ لِي بِهَا فَرُدُّوا الْأَمْرَ إِلَى عِيسَى فَقَالَ  
أَمَّا وَجَبَتْهَا فَلَا يَعْلَمُ بِهَا أَحَدٌ إِلَّا اللَّهُ تَعَالَى  
ذَلِكَ وَفِيمَا عَهْدَ إِلَى رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ أَنَّ  
الدَّجَالَ خَارِجٌ قَالَ وَمَعِيَ قَضِيَّانِ فَإِذَا  
رَأَيْتُنِي ذَابَ كَمَا يَذُوبُ الرِّصَاصُ قَالَ  
فَيُهْلِكُهُمُ اللَّهُ تَعَالَى حَتَّى أَنْ الْحَجَرَ  
وَالشَّجَرَ لِيَقُولَ يَا مُسْلِمُ أَنْ تَحْتِيَ كَافِرًا  
فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ قَالَ فَيُهْلِكُهُمُ اللَّهُ تَعَالَى ثُمَّ يَرْجِعُ  
النَّاسُ إِلَى بِلَادِهِمْ وَأَوْطَانِهِمْ قَالَ فَعِنْدَ ذَلِكَ

شب معراج میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنحضرتؐ سے یہ  
تذکرہ کرنا کہ قیامت کی آمد کا صحیح وقت ان کو بھی معلوم نہیں مگر  
صرف یہ معلوم ہے کہ اس سے پہلے ان کو دجال کو قتل کرنا ہے  
اس ضمن میں انہوں نے امت محمدیہ کی اصلاح کا ایک حرف  
بھی ذکر نہیں فرمایا کیونکہ یہ خدمت دراصل خود اس امت ہی  
کے ایک شخص کے متعلق ہوگی اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی  
طرف منتقل ہو جائے گی۔

(۱۲۶۹) حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے شب معراج کا واقعہ بیان کرتے  
ہوئے فرمایا کہ حضرت ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ (علیہم السلام) سے بھی میری  
ملاقات ہوئی تھی انہوں نے باہم قیامت کا ذکر چھیڑا آخر فیصلہ کے لئے  
انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے معاملہ پیش کیا انہوں نے  
فرمایا مجھ کو تو صبح وقت کی کچھ معلومات نہیں پھر معاملہ موسیٰ علیہ السلام کے  
سامنے آیا انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار فرمایا۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کے  
سامنے معاملہ آیا تو انہوں نے فرمایا قیامت کے آنے کا ٹھیک وقت تو بجز  
ایک ذات اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو بھی نہیں ہے ہاں صرف اتنی بات میں  
جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ فرمایا ہے کہ دجال نکلے گا اور میرے  
ساتھ دو شاخیں ہوں گی اور جب اس کی نظر مجھ پر پڑے گی تو وہ اس طرح  
پگھل جائے گا جیسا سیسہ (آگ میں) پگھل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو  
ہلاک کر دے گا پھر یہ نوبت آجائے گی کہ درخت اور پتھر آوازیں دے  
دے کر کہیں گے اے مسلمان! دیکھ میرے پیچھے کا فر چھپا ہوا ہے لپک کر آ اور

(۱۲۶۹) \* دیکھئے یہاں جب قیامت کا تذکرہ آیا اور جواب کی نوبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آئی تو انہوں نے اپنی لاعلمی کے ساتھ  
ساتھ فوراً اسی بات کا تذکرہ فرمایا جو قیامت کے ساتھ یقین کے اسی درجہ میں ہے۔ یعنی ان کا پھر تشریف لانا اور دجال کو قتل کرنا۔ احادیث  
میں کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے تشریف لانے کا اصل مقصد اس امت کی اصلاح ہوگی تاکہ یہ سوال پیدا ہو کہ اس امت کے اصلاح کے  
لئے اسرائیلی رسول کی آمد میں اس امت کی کسر شان ہے۔ حالانکہ یہ سوال ہی جاہلانہ سوال ہے ہم آج بھی خدا تعالیٰ کے سب رسولوں پر تلے....

يُخْرِجُ يَاجُوجَ وَ مَاجُوجَ وَ هُمْ مِنْ كُلِّ  
حَدَبٍ يَنْسِلُونَ فَيَطْنُونَ بِلَادَهُمْ لَا يَأْتُونَ  
عَلَى شَيْءٍ إِلَّا أَهْلَكُوهُ وَلَا يَمُرُّونَ عَلَى مَاءٍ  
إِلَّا شَرَبُوهُ ثُمَّ يَرْجِعُ النَّاسُ إِلَى فَيْشِكُونَهُمْ  
فَادْعُوا عَلَيْهِمْ فَيَهْلِكُ اللَّهُ تَعَالَى وَ يُمِيتُهُمْ  
حَتَّى تَجْوَى الْأَرْضُ مِنْ نِتْنِ رِيحِهِمْ قَالَ  
فَيَنْزِلُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ الْمَطَرُ فَتَجْرِفُ  
أَجْسَادَهُمْ حَتَّى يَقْدِفَهُمْ فِي الْبَحْرِ قَالَ أَبِي  
ذَهَبَ عَلَى هَهْنَا شَيْءٌ لَمْ أَفْهَمْهُ كَادِيمٌ وَ  
قَالَ يَزِيدُ يَعْنِي ابْنَ هَارُونَ ثُمَّ تُنَسَفُ الْجِبَالُ  
وَ تَمْدُ الْأَرْضُ مَدًّا لَا دِيمَ ثُمَّ رَجَعَ إِلَى  
حَدِيثِ هُشَيْمٍ. قَالَ فَفِيمَا عَهْدَ إِلَى رَبِّي  
عَزَّ وَ جَلَّ إِنَّ ذَٰلِكَ إِذَا كَانَ كَذَٰلِكَ فَإِنَّ  
السَّاعَةَ كَالْحَامِلِ الْمُتَمِّ الَّتِي لَا يَدْرِي أَهْلُهَا  
مَتَى تَفْجَأُهُمْ بِوِلَادِهَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا. (رواه  
احمد في مسنده ص ۳۷۵ ج ۱ والحاكم في  
المسندرك و قال صحيح على شرط الشيخين

اس کو بھی قتل کر آ خر کا فرسب ہلاک ہو جائیں پھر لوگ اپنے اپنے شہر اور  
وطن کو واپس ہوں گے تو اس وقت یا جوج و ماجوج کی قوم کا حملہ ہوگا اور وہ  
ہر پست زمین سے نکل نکل کر بکھر پڑیں گے۔ بستیوں میں گھس پڑیں گے  
جس جس چیز پر بھی ان کا گذر ہوگا اس کو برباد کر ڈالیں گے اور جس پانی پر  
سے گذریں گے وہ سب پی کر ختم کر دیں گے آ خر لوگ شکایت لے کر  
میرے پاس آئیں گے میں ان پر بددعا کروں گا اللہ تعالیٰ میری بددعا  
سے ان سب کو ہلاک کر دے گا اور وہ سب مرجائیں گے تمام زمین ان کی  
بدبو سے سڑ جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ بارش نازل فرمائے گا جو ان کی نعشوں  
کو بہا کر سمندر میں ڈال دے گی راوی کہتا ہے کہ اس مقام پر میرے والد  
نے کچھ فرمایا تھا وہ لفظ میری سمجھ میں نہ آیا صرف ”کادیم“ کا لفظ سننے  
میں آیا۔ یزید بن ہارون راوی کہتا ہے پوری بات یہ تھی کہ پھر پہاڑ دھن  
دیئے جائیں گے اور زمین جانور کے چمڑے کی طرح پھیلا کر سیدھی کر دی  
جائے گی اس کے بعد پھر اصل حدیث بیان فرمائی کہ عیسیٰ علیہ السلام نے  
فرمایا اور منجملہ ان باتوں کے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمائی ہیں یہ ہے کہ  
جب ایسا ہو تو پھر قیامت اتنی نزدیک سمجھنا چاہئے جیسا وہ گا بھن جانور جس  
کے بچے کی پیدائش کی مدت پوری ہو چکی ہو اور اس کے مالک ہر وقت اس  
انتظار میں ہوں کہ دن رات میں نہ معلوم کب بچہ پیدا ہو جائے۔

و لم يخرجاه و وافقه الذهبي على ذلك في التلخيص و اقر الحافظ في الفتح من نزول عيسى عليه السلام. و اخرجه ابن  
ماجه و ابن ابى شيه و ابن جرير و ابن المنذر و ابن مردويه و البيهقي كذا في الدر المنثور ج ۴ ص ۳۳۶)

مِنْ أَهْمٍ وَ ظَائِفٍ عِيسَى عَلَيْهِ الصَّلَاةُ  
وَالسَّلَامُ قَتْلُ الدَّجَالِ

(۱۲۷۰) عَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ فِي حَدِيثٍ (۱۲۷۰) حَضْرَتِ ابُوَامَامَہِ بَاہِلِی دَجَال کی ایک طویل حدیث میں نقل کرتے

ﷺ.... ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے لئے نہ صرف یہ کہ یہ موجب شرف ہے بلکہ مدارِ نجات ہے تو پھر اگر کوئی رسول آ کر ہماری اصلاح کرتا ہے تو  
ہمارے لئے اس میں کسر شان کی بات کیا ہے ہاں اگر کسی رسول کی آمد سے ہمارے رشتہ امت پر زد پڑتی ہے اور وہ ہم کو دوسری امت بنانا  
چاہتا ہے تو اس میں صرف ہماری کسر شان نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسر شان بھی ہے۔ و العیاذ باللہ۔

(۱۲۷۰) \* سبحان اللہ جس شخصیت عظمیٰ کی برکات یہ ہوں وہ یقیناً کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتا ضرور وہ کوئی خدا تعالیٰ کا قدوس ﷺ....



ہیں کہ ام شریک نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس دن (یعنی دجال کے زمانہ میں) عرب کہاں چلے جائیں گے (کہ مسلمانوں کا یہ ابتر حال ہو جائے گا) فرمایا اس وقت عرب بہت کم رہ جائیں گے اور اکثر وہ بیت مقدس میں ہوں گے اور اس وقت ان کا امام ایک نیک شخص ہوگا۔ اس اثنا میں کہ یہ امام صبح کی نماز پڑھانے آگے بڑھ چکا ہوگا کہ دفعۃً عیسیٰ علیہ السلام اتر آئیں گے۔ یہ ان کو دیکھ کر مصلیٰ سے پچھلے پیروں اُلٹے ہٹ آئیں گے تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کو نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھائیں تو عیسیٰ علیہ السلام (شفقت کے انداز میں) اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں گے آگے بڑھو اور تم ہی نماز پڑھا کیونکہ اس نماز کی اقامت تو تمہارے ہی نام سے کہی گئی ہے۔ چنانچہ یہ نماز تو یہی امام پڑھائیں گے۔ نماز سے فراغت کے بعد عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمائیں گے دروازہ کھولو دروازہ کھولا جائے گا ادھر دجال نکل چکا ہوگا اس کے ہمراہ ستر ہزار یہودی ہوں گے ہر ایک کے پاس مزمین تلوار اور سر پر طیلسان ہوگا جب دجال کی نظر عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پڑھے گی تو وہ نمک کی طرح پگھل جائے گا اور بھاگنے لگے گا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمائیں گے میرے لئے تیرے نام کی ایک ضرب مقدر ہو چکی ہے اس سے بچ کر تو مجھ سے کہاں نکل سکتا ہے آخر اس کو باب لد پر پکڑ لیں گے اور اس کو قتل کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ سب یہودیوں کو ہلست دے گا۔ اس وقت مال کی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ صدقہ دینے کے لئے کوئی فقیر نہ ملے گا لہذا بیت المال کی طرف سے کوئی شخص بکری وصول کرنے والا رہے اور نہ اونٹ وصول کرنے والا اور بغض و کینہ سب دلوں سے نکل جائے گا اور تمام

طویل من ذکر الدجال فقالت ام شریک بنت ابی یارسول اللہ فاین العرب یومئذ قال العرب یومئذ قلیل و جلہم ببیت المقدس و امامہم رجل صالح فینما امامہم قد تقدم یصلی بہم الصبح اذا نزل علیہم عیسی ابن مریم الصبح فرجع ذالک الامام ینکض یمشی قہقری لیقدم عیسی لیصلی فیضع عیسی یدہ بین کتفیه ثم یقول لہ تقدم فیصل فانہا لک اقیمت فیصلی بہم امامہم فاذا انصرف قال عیسی علیہ السلام افتحوا الباب فیفتح و راء الدجال و معہ سبعون الف یہودی کُلُّہ ذوسیف محلی و تاج فاذا نظر الیہ الدجال ذاب کما یدوب الملح فی الماء و یطلق ہارباً و یقول عیسی ان لی فیک ضربۃ لن تسبقنی بہا فیدرکہ عند باب اللہ للشرقی فیقتلہ فیہزم اللہ الیہود (الی قولہ) و یرک الصدقہ فلا یسعی علی شاة ولا علی بعیر و ترفع الشحاء و التباغض و تنزع حمة کل ذات حمة حتی یدخل الولید یدہ فی الحیة فلا تضرہ و تقر الولیدۃ الاسد فلا یضرہا و یكون

اللہ .... نبی ہونا چاہئے اور یقیناً وہ کوئی ایسا ہی رسول ہونا چاہئے جس کے سب سے بڑے دشمن یہود ٹھہر چکے ہوں اور جس کے جھوٹے قتل کے کھنڈر میں ایک بار وہ ملعون ٹھہر چکے ہوں دوسری بار اسی کے ہاتھ سب موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں۔ انبیاء علیہم السلام سے عداوت اور بغاوت کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکل سکتا اس بد خصلت کی بدولت پہلے وہ نبوت سے محروم کر دیئے گئے تھے اور آخر میں صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیئے جائیں گے۔ بے شک جو قوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رافت و رحمت والے رسول کے ساتھ بھی اپنا طریق کار نہ بدلے ان کی وجہ سے دنیا کو پاک کرنے میں انسانیت کی فلاح ہے۔ رب انک ان تذرہم یصلو عبادک للہ ....

الدُّنْبُ فِي الْغَنَمِ كَأَنَّهُ كُلُّهَا وَتُمْلَأُ الْأَرْضُ  
مِنَ الْمُسْلِمِ كَمَا يُمْلَأُ الْأَنْاءُ مِنَ الْمَاءِ وَ  
تَكُونُ الْكَلِمَةُ وَاحِدَةً فَلَا يَعْبُدُ إِلَّا اللَّهَ  
تَعَالَى. (الحديث أخرجه أبو داود و ابن ماجه ص  
۳۰۸ واللفظه له و رواه ابن حبان و ابن خزيمة في  
صحيحهما و الضياء في المختارہ نقله كذلك في  
شرح المواهب للزرقاني ص ۵۳ من ذكر المعراج)

نَزُولِ عِيسَى عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَظُهُورِ  
كَرَامَةِ هَذِهِ الْأُمَّةِ وَشَرَفِهَا فِي ذَلِكَ

(۱۲۷۱) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ  
قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ يَقُولُ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ

زہریلے جانوروں کے ڈنگ بے کار ہو جائیں گے یہاں تک کہ ایک  
چھوٹی سی لڑکی سانپ کے سوراخ میں ہاتھ ڈال لے گی تو وہ اس کو نہ  
کاٹے گا اور شیر کو دوڑائیں گے تو وہ اس کو کچھ نہ کہے گا اور بکریوں کے  
ریوڑ میں بھیڑ یا اس طرح ساتھ ساتھ پھرے گا جیسے ریوڑ کا کتا اور زمین  
مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی جیسے برتن پانی سے اور صرف ایک  
خدا کی توحید باقی رہ جائے گی اور ایک اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی  
عبادت نہ ہوگی۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری اور اس میں  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ظہور برتری

(۱۲۷۱) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں  
نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ میری امت  
میں ایک جماعت ہمیشہ حق کے مقابلہ پر جنگ کرتی رہے گی اور وہ تاقیامت

لہ .... وَلَا يَلْدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا شاید موجود زمانہ میں اطراف عالم سے ہٹ کر ان کا ایک جگہ جمع ہونا اسی قومی استیصال کے لئے پیش خیمہ ہو۔  
حدیث مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کا اہم مقصد دجال کا قتل کرنا ہے اور چونکہ اس کا مقابلہ براہ راست  
انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہے اسی لئے ہر نبی نے اس کی آمد سے اپنی امت کو ڈرایا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اس کے قتل کے لئے خدا تعالیٰ کے  
ہاتھوں ہلاک ہوتے رہے لیکن جو دجال کے خاتم الدجالہ یعنی سب دجالوں کے آخر میں آئے گا اور خدائی افعال کے شعبہ بازیوں ظاہر  
کرے گا اس کے قتل کے لئے ایک نبی ہی کی تشریف آوری ضروری تھی اس صورت میں اس امت کے لئے یہ کتنی بڑی کرامت اور شرافت ہوگی کہ  
جب اس پر کوئی خارجی حملہ ہو تو ان کی ہمدردی کے لئے خدا تعالیٰ کے رسول پیش قدمی فرمائیں۔ اور وہ بھی بڑی تمناؤں اور بڑے فخر کے ساتھ کیسے  
تعجب کی بات ہے کہ جس بات میں اس امت کی شرافت تھی اسی کو برعکس اہانت سمجھا جائے۔ ومن لم يجعل الله نورا فماله من نورا۔

(۱۲۷۱) \* اس امت کی شرافت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اس کے رسول کی وفات پر اتنی طویل مدت گزر جانے پر بھی اس میں ایسے  
افراد موجود ہیں کہ اسرائیلی سلسلہ کا ایک مقدس رسول آ کر بھی اس کی امانت کو برقرار رکھے اور اس کے پیچھے آ کر نماز میں اس کی اقتداء کر  
لے اور اس کا اعلان بھی کرے کہ جس کرامت و شرافت کے تم پہلے مستحق تھے اتنی مدت دراز کے بعد آج بھی اسی شرافت و کرامت کے مستحق  
شوچے اور ذرا انصاف فرمائیے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لا کر اس طرح اس امت کے پیچھے اقتداء نہ فرماتے تو نبیوں کے دور میں  
بھی اتم کے افراد لائق تر گزرے ہیں مگر آخر کچھ مدت کے بعد ہی ان کا حشر کیا کچھ نہیں ہو گیا جو نبوتوں کے مستحق تھے وہ لعنت کے تحت آ گئے یا  
نہیں لیکن ایک یہ امت بھی ہے جس کی شرافت میں اتنی طویل مدت گزرنے پر بھی ذرا فرق نہیں آیا۔

یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم اس طرف بھی نظر کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر آخرت کے وقت بھی  
ایک نماز کا نقشہ یہی تھا کہ مرض الموت میں آپ نے منصب امامت کو سب سے بزرگ صدیق اکبر کے سپرد کر دیا تھا اس درمیان لہ ..



عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ قَالَ  
فَيَنْزِلُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فَيَقُولُ أَمِيرُهُمْ تَعَالِ فَصَلِّ فَيَقُولُ لَا إِنَّ  
اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی اس کے بعد آپؐ نے فرمایا آخر عیسیٰ بن مریم  
(علیہما السلام) اتریں گے (نماز کا وقت ہوگا) مسلمانوں کا امیر ان سے عرض  
کرے گا تشریف لائیے اور نماز پڑھا دیجئے وہ فرمائیں گے یہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ .... میں ایک ایسا وقت آیا کہ ان کی امامت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر ان کے پیچھے نماز ادا فرمائی اور درحقیقت یہ  
اس کا اعلان تھا کہ یہ امت اب اس کمال کو پہنچ چکی ہے کہ ایک رسول کی نماز اس کے پیچھے ادا ہو سکتی ہے لہذا اب سمجھ لینا چاہئے کہ رسول کی آمد کا  
جو مقصد اعظم ہوتا ہے وہ پورا ہو چکا ہے اس لئے رسولوں کے دستور کے مطابق اس کی وفات کا وقت بھی آجائے تو تعجب کی بات نہیں۔ ایک  
طرف امامت و اقتداء کا یہ نقشہ آپؐ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے اس کے ہزار سال سے کہیں زیادہ مدتوں کے بعد امامت و اقتداء کا یہ دوسرا  
نقشہ بھی سامنے رکھے جو یہاں حدیث میں آپؐ کے سامنے موجود ہے تو آپؐ کو بدابہت ثابت ہو جائے گا کہ جس مدت میں پہلی امتیں ہلاک ہو  
ہو کر دنیا سے نیست و نابود ہو چکی ہیں یہ امت اس سے زیادہ مدت گزرنے پر بھی اپنی اس شرافت و کرامت پر باقی ہے جو کبھی اس کو اپنے عہد  
کمال میں حاصل تھی۔ اس سے جہاں ایک طرف اس امت کی بزرگی کا ثبوت ملتا ہے اس سے بڑھ کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت  
عظمیٰ اور آپؐ کے کمالات کی ثبوت ملتا ہے اور یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ آپؐ حقیقی معنی میں خاتم النبیین ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں بن سکتا  
کیونکہ جب قیامت تک آپؐ کی امت میں صفت کے لوگ موجود رہیں کہ اگر کوئی قدیم رسول آئے تو بے تکلف وہ ان کے پیچھے آ کر نماز اداء  
کر لے تو اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپؐ آخری رسول ہیں اور آپؐ کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح ذہن  
نشین رکھنا چاہئے کہ اصل وظائف رسالت و نبوت خدائی دین کی تائیس و اشاعت ہے کسی خاص شخص کا قتل کرنا اصل وظائف رسالت میں  
داخل نہیں ہے خدا تعالیٰ کے بہت سے رسول وہ ہیں جو قتل کرنے کی بجائے خود دشمنوں کے ہاتھوں مقتول ہو گئے ہیں مگر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ  
انہوں نے وظیفہ نبوت کے ادائیگی میں ذرا سا بھی قصور کیا تھا والعیاذ باللہ۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دجال کو قتل کرنے سے یہ ثابت  
نہیں ہوتا کہ وہ جدید رسالت کی حیثیت سے تشریف لائیں گے بلکہ یہ خدمت کسی حکمت سے ان کے سپرد کی گئی ہے جیسا کہ بہت سے امور  
حضرت خضر علیہ السلام کے سپرد ہوئے مگر ان عجائبات سے ان کی رسالت کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا چنانچہ آج تک امت میں اختلاف ہے کہ  
وہ رسول تھے یا نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کے لئے صاحب شریعت رسول ہونا قرآن کریم سے ثابت ہے اور ان پر ہر  
امت کو ایمان لانا یہ ان کی رسالت کا حق ہے جو پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ شریعت صرف آق کی  
شریعت ہے اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی آ کر اسی کی اتباع فرمائیں گے بلکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب تورات بھی آجائیں تو  
ان کے لئے بھی شریعت یہی شریعت ہوگی اگر کوئی کامل سے کامل رسول آ کر اس کی اتباع کرتا ہے تو اس سے اس کی نبوت و رسالت میں ذرا  
برابر بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا بہت سے انبیاء علیہم السلام گزرتے ہیں جن کی اپنی کوئی شریعت ہی نہ تھی لیکن پھر وہ خدا تعالیٰ کے نبی کہلائے  
پھر جو شریعت کہ سب شرائع کی جامع ہو اگر کوئی رسول آ کر اس کی اتباع کرتا ہے تو اس میں اس کی رسالت کے خلاف بات کیا ہے لہذا یہ  
سوال کتنا نامعقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو کیا رسالت کی صفت ان سے سلب کر لی جائے گی جی نہیں وہ رسول ہی  
ہوں گے اور جس طرح اس وقت ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں ان طرح اس وقت بھی ایمان رکھیں گے صرف اتباع شریعت کا مسئلہ ہے تو جب ہر  
رسول کی اپنی شریعت میں ناسخ و منسوخ ہونے سے اس میں کوئی فرق نہیں آتا اسی طرح اگر ایک شریعت منسوخ ہو کر دوسری شریعت آجائے تو  
اس سے بھی اس میں کوئی فرق نہیں آتا اس کے کمالات وہی ہیں اس پر ایمان رکھنا اسی طرح ضروری ہے اور جس شریعت کی وہ دعوت دے اس  
کی اتباع ہر وقت لازم ہے پس پہلے زمانہ میں ان کی شریعت قرآن انجیل تھی اور نزول کے بعد اب ان کے لئے قرآن کریم شریعت ہو گا لہذا ....

اس امت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اکرام و اعزاز ہے کہ تم خود ہی ایک دوسرے کے امام و امیر ہو۔

(مسلم شریف)

(۱۲۷۲) حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فجر کی نماز میں اتریں گے تو اس وقت مسلمانوں کا جو امیر ہوگا وہ ان سے عرض کرے گا اے روح اللہ آگے تشریف لا کر نماز پڑھائیں۔ وہ فرمائیں گے یہ امت اپنی فضیلت کی وجہ سے خود ہی ایک دوسرے کی امیر ہے اس پر وہ امیر آگے بڑھ کر نماز پڑھائیں گے جب نماز ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اپنا نیزہ لے کر دجال کی طرف جائیں گے وہ جب ان کو دیکھے گا تو اس طرح پکھل جائے گا جیسا آگ پر سیسہ پکھل جاتا ہے وہ اپنا نیزہ اس کے سینہ کے درمیان لگائیں گے اور اس کو ختم کر دیں گے اور اس کا سب گروہ منتشر ہو جائے گا اور کوئی چیز ان کو پناہ نہ دے گی یہاں تک کہ درخت اور پتھر بھی کہے گا اے مؤمن (میری آڑ میں) یہ کافر موجود ہے (اس کو بھی قتل کر دے)

دوسری روایت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب اس طرح منقول ہے کہ اس نماز کی اقامت آپ ہی کے نام کی ہوئی ہے یہ کہہ کر وہ ان ہی کے پیچھے نماز ادا کریں گے۔

و عن جابر نحوه. و هكذا عند ابی یعلیٰ عنه و فیہ انت احق بعرضکم امراء علی بعض اکرم اللہ بہ هذه الامة کذا فی الحاوی لسیوطی ج ۲ ص ۱۲۷ و لیست هذه الرواية فی رسالة الشيخ قدس سره. و فی رواية فیقول له عیسیٰ انما اقيمت الصلوة لك فیصی خفہ کذا فی البداية والنهاية ج ۲ ص ۹۶)

بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ أُمَرَاءُ تَكْرِمَةً لِلَّهِ عَلَى هَذِهِ الْأُمَّةِ. (رواه مسلم ج ۱ ص ۸۷ و احمد فی مسنده ج ۳ ص ۳۴۵ و ج ۳ ص ۳۸۴)

(۱۲۷۲) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ (فذكر الحديث و فيه) وَيَنْزِلُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عِنْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ فَيَقُولُ لَهُ أَمِيرُ هُمْ يَا رُوحَ اللَّهِ تَقْدَمُ صَلِّ فَيَقُولُ هَذِهِ الْأُمَّةُ الْأُمَرَاءُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ فَيَقْدَمُ أَمِيرُ هُمْ فَيُصَلِّي فَإِذَا قَضَى صَلَاةَ أَخَذَ عِيسَى حَرْبَتَهُ فَيَذْهَبُ نَحْوَ الدَّجَالِ فَإِذَا يَرَاهُ الدَّجَالُ ذَابَ كَمَا يَذُوبُ الرِّصَاصُ فَيَضَعُ حَرْبَتَهُ بَيْنَ ثَدْوَتِهِ فَيَقْتُلُهُ وَيَنْهَزِمُ أَصْحَابُهُ لَيْسَ يَوْمِنَا شَيْءٌ يُوَارِي مِنْهُمْ أَحَدًا حَتَّى أَنْ الشَّجَرَةَ لَتَقُولُ يَا مُؤْمِنُ هَذَا كَافِرٌ يَقُولُ الْحَجَرُ يَا مُؤْمِنُ هَذَا كَافِرٌ. (اخرجه

احمد فی مسنده ص ۲۱۶ و ص ۲۱۷ ج ۴ بطريقين و اخرجه ابن ابی شيبه و الطبرانی و الحاكم و صحيحه کذا فی الدر المنثور ج ۲ ص ۲۴۳.

۱۱..... پہلے جب وہ شریعت انجیل کے داعی تھے اس وقت قرآن کریم نہ تھا اور جب وہ تشریف لائیں گے تو ان سے پہلے انجیل منسوخ ہو چکی ہوگی اور ان کے سامنے قرآنی شریعت ہوگی لہذا اب وہ خود بھی اسی کا اتباع فرمائیں گے۔ کسی شریعت کے خاص خاص احکام یا شریعت کے منسوخ ہو جانے سے رسالت کے مسلوب ہونے نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال نہ یہاں پیدا ہوتا ہے اور نہ اس حدیث میں پیدا ہوتا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ اگر بالفرض وہ آ کر آپ کی شریعت کی اتباع کریں تو کیا اپنی رسالت سے معزول ہو جائیں گے۔ والعیاذ باللہ۔



إِنَّمَا يَنْزِلُ عِيسَى عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مِنْ بَيْنِ سَائِرِ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ خَاصَّةً  
لأنه أولى الناس بالنبي صلى الله عليه وسلم

(۱۲۷۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ يَعْنِي عِيسَى. وَإِنَّهُ نَازِلٌ فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَعْرِفُوهُ رَجُلٌ مَرْبُوعٌ إِلَى الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ بَيْنَ مُمَصَّرَتَيْنِ كَانَ رَأْسُهُ يَقْطُرُ وَ إِنْ لَمْ يُصْبَهُ بَلَلٌ فَيَقَاتِلُ النَّاسَ عَلَى الْإِسْلَامِ فَيَذُقُ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيُهْلِكُ اللَّهُ فِي زَمَانِهِ الْمَلَلَ كُلَّهَا إِلَّا الْإِسْلَامَ وَيُهْلِكُ الْمَسِيحَ الدَّجَالَ فَيَمُوتُ فِي الْأَرْضِ أَرْبَعِينَ سَنَةً ثُمَّ يَتَوَفَّى فَيُصَلَّى عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ. (رواه أبو داود ج ۲ ص ۱۳۵ و أخرجه ابن أبي شيبة و أحمد

(۱۲۷۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرے اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے وہ ضرور اتریں گے جب تم ان کو دیکھنا تو پہچان لینا کہ وہ میانہ قد سرخ و سفید رنگ کے اور دو زعفرانی چادریں اوڑھے ہوئے ہوں گے ان پر وہ شگفتگی و تازگی ہوگی یوں معلوم ہوگا کہ ان کے سر مبارک سے پانی کے قطرے اب ٹپکے اگرچہ ان پر پانی کی نمی بھی نہ ہوگی۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے صلیب کو چورا چورا کر ڈالیں گے سور کو قتل کریں گے جزیہ کی رسم اٹھادیں گے۔ ان کے دور میں اللہ تعالیٰ تمام مذہب ختم کر دے گا اور صرف ایک مذہب اسلام باقی رہ جائے گا اور ان کے دست مبارک پر اللہ تعالیٰ دجال کو قتل کرے گا چالیس سال تک زمین پر زندہ رہیں گے اس کے بعد ان کی وفات ہوگی اور مسلمان ان پر نماز جناہ ادا کریں گے۔ (ابوداؤد)

فی مسنده ج ۶ ص ۴۳۷ و ابن حبان فی صحیحہ و ابن جریر کذا فی الدر المنثور ج ۲ ص ۲۴۲ و صحیحہ الحافظ فی الفتح من نزول عیسیٰ علیہ السلام)

حجہ و اتیانہ علی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم و سلامہ و ردہ علیہ علیہما الصلوٰۃ والسلام

(۱۲۷۴) وَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِيَهْلَنَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ يَفْجَ الرُّوحَاءُ بِالْحَجِّ أَوْ بِالْعُمْرَةِ أَوْ يُشَيَّهَمَا جَمِيعًا. (رواه مسلم فی الحج) و أخرجه أحمد

(۱۲۷۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ضرور مقام فحج روحاء پر حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھیں گے مسلم شریف مسند احمد میں حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اتریں گے سور کو قتل کریں گے، صلیب کا نام و نشان باقی نہ چھوڑیں گے اور مال اتنا تقسیم کریں گے کہ اس کو قبول کرنے والا نہ ملے گا اور جزیہ و خراج اٹھائیں گے اور مقام فحج روحاء میں حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھیں گے اس کی شہادت میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت

وَتَلَا أَبُو هُرَيْرَةَ وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ

بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا  
فَزَعَمَ حَنْظَلَةُ أَنَّ أَبَاهُ رِيْرَةَ وَقَالَ يُؤْمِنُ بِهِ قَبْلَ  
مَوْتِ عِيسَى فَلَا آخِرَ لِهَذَا كُلُّهُ حَدِيثُ النَّبِيِّ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ شَيْءٌ قَالَهُ أَبُو هُرَيْرَةَ.  
مسند احمد ص ۲۹ ج ۲ و اخرجه ابن جرير  
مثله والحاكم وصححه ولفظه ليهبطن ابن مريم  
حكما عدلا و اماما مقسطا و ليسلكن فجاحاجا  
او معتمرا و لياتين قبري حتى يسلم علي  
ولارذن عليه يقول ابو هريرة اي بني اخي ان  
رايتموه فقولوا ابو هريرة يقرئك السلام.

(درمنثور ج ۲ ص ۲۴۵)

يَتَزَوَّجُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَيُولَدُ  
لَهُ ثُمَّ يَتَوَفَّى وَيُدفن بِيَانُ مَوْضِعِ دَفْنِهِ  
(۱۲۷۵) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو مَرْفُوعًا يَنْزِلُ  
عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ إِلَى الْأَرْضِ فَيَتَزَوَّجُ وَيُولَدُ لَهُ  
الْحَدِيثُ. وَغَرَاهُ الْكِتَابُ الْوَفَاءُ وَآخِرُجُهُ ابْنُ  
الْمِرَاغِي فِي الْمَدِينَةِ وَابْنُ الْجَوْزِي فِي  
الْمُنْتَظَمِ كَذَا فِي الْكَنْزِ. وَهَكَذَا فِي الْمَشْكُوتِ.  
(۱۲۷۶) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مَرْفُوعًا طَوِيلًا لِعِيشٍ  
بَعْدَ الْمَسِيحِ يُؤْذَنُ لِلسَّمَاءِ فِي الْقَطْرِ وَيُؤْذَنُ  
الْأَرْضِ فِي النَّبَاتِ حَتَّى لَوْ تَذَرُ حَبْكُ فِي  
الْصَفَالَتِ وَحَتَّى يَمُرَّ الرَّجُلُ عَلَى الْأَسَدِ فَلَا  
يَضُرُّهُ وَيَطَاءُ عَلَى الْحَيَّةِ فَلَا تَضُرُّهُ وَلَا تَشَاحِنُ  
وَلَا تَبَاغُضُ.

(اخرجه ابو سعيد النقاش في فوائد العراقيين كذا في الكنز ص ۲۰۲ و ۲۰۳ ج ۷ ابو سعيد عنه)

فرمائی وَاِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ  
يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا یعنی اہل کتاب میں کوئی شخص ایسا نہ رہے گا جو ان  
کی وفات سے پہلے یقیناً ان پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت میں عیسیٰ  
علیہ السلام ان پر گواہ ہوں گے حنظلہ (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ اس  
آیت کی تفسیر میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ”قبل موتہ“ سے  
مراد عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موت سے پیشتر ہے اب یہ مجھ کو معلوم نہیں  
کہ یہ تفسیر سبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہے یا خود  
ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائی ہے۔  
(درمنثور ج ۲ ص ۲۴۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول کے بعد شادی کرنا پھر ولادت  
ہونی اس کے بعد آپ کی وفات اور مقام دفن کا ذکر

(۱۲۷۵) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) زمین پر اتریں گے  
اور نکاح کریں گے اور ان کی اولاد ہوگی۔

(۱۲۷۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد زندگی اور فارغ  
البالی کے کیا کہنے آسمان کو بارش کا حکم مل جائے گا اور زمین کو پیدائش کا حتیٰ کہ  
اگر تم پتھر پر دانہ ڈال دو گے تو بھی وہ جم جائے گا اور اتنا امن ہوگا کہ آدمی شیر کے  
قریب سے گزرے گا اور وہ اس کو ذرا نقصان نہ پہنچائے گا اور بغض و کینہ کا کہیں  
نام و نشان نہ رہے گا۔



(۱۲۷۷) عن محمد بن يوسف بن عبد الله بن سلام عن أبيه عن جده قال مكتوب في التوراة صفة محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم و عيسى بن مريم يدفن معه .

(۱۲۷۷) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے کہ تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی لکھی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آپ کے پاس دفن ہوں گے۔

أخرجه الترمذی و حسنه ( کذا فی الدر المنثور ص ۲۴۵ ج ۲ ) قلت و قد تکلم فی اسناده الحافظ ابن کثیر فی البدایة و النہایة ج ۲ ص ۹۹ . و قال فی اسناد رواية الترمذی هذه عثمان بن الضحاک و الصواب الضحاک بن عثمان المدني .

(۱۲۷۸) عن عبد الله بن سلام قال يدفن عيسى مع رسول الله صلى الله عليه وسلم و صاحبه فيكون قبره رابعا اخرجه البخاري في تاريخه و الطبراني . (در المنثور ص ۲۴۵ ج ۲)

(۱۲۷۸) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے دو جاں نثار یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس دفن ہوں گے اور اس لحاظ سے ان کی قبر چوتھی ہوگی۔

(۱۲۷۹) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أُرَى أَنِّي أَعِيشُ مِنْ بَعْدِكَ فَتَأْذَنُ لِي أَنْ أَدْفِنَ إِلَى جَنْبِكَ فَقَالَ وَ أَنَّى لِي بِذَلِكَ مِنْ مَوْضِعٍ مَا فِيهِ إِلَّا مَوْضِعُ قَبْرِي وَ قَبْرِ أَلِي بَكْرٍ وَ عُمَرُ وَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ . (أخرجه ابن عساكر كذا في الكنز ج ۷ ص ۲۶۸ و صی فصل الخطاب باسناد المستغفری فی دلائل نبوة اله)

(۱۲۷۹) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتیں تھیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا خیال ہوتا ہے شاید میں آپ کے بعد تک زندہ رہوں گی تو آپ مجھ کو اس کی اجازت دیں کہ میں آپ کے پہلو میں دفن ہوں؟ آپ نے فرمایا میں اس کی بھلا کیسے اجازت دے سکتا ہوں یہاں تو صرف میری قبر اور ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی قبریں اور عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر مقرر ہے۔

(ابن عساكر)



(۱۲۷۷) \* عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ”اولی الناس“ کا لفظ فرمایا تھا اس کا ظہور یوں ہوا کہ اول تو آپ کے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں گذرا گویا دونوں کے زمانے متصل رہے پھر اسی مناسبت کی وجہ سے وہی آپ کی امت میں تشریف لائیں گے اور ویں بھی ہوا کہ وقت بھی آپ کے پاس ہی آ کر ہوں گے۔ زمانی اور مکانی اور موت کی یہ خصوصیات ان کے سوا کسی اور نبی کو میسر نہیں آئیں۔

الرُّسُولُ الْأَعْظَمُ النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ الْهَاشِمِيُّ الْمُطَّلِبِيُّ سَيِّدِنَا مُحَمَّدُ بْنُ

عَبْدِ اللَّهِ آخِرُهُمْ بَعَثَا وَ أَوَّلُهُمْ خَلَقَا صَلَوَاتُ اللَّهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ

نبی امی و مطلبی الهاشمی سیدنا محمد بن عبد اللہ جو سب سے برتر رسول ہیں بلحاظ بعثت سب

سے آخر اور بلحاظ پیدائش سب سے اول، اُن پر خدا کے بے شمار درود و سلام

دل میں آرزوئیں تھیں اور نہ معلوم کتنی آرزوئیں تھیں کہ رسالت کے ابواب ترتیب دینے میں اپنی پوری ہمت صرف کی جاتی اگرچہ ایک بے بضاعت کی ہمت ہی کیا تھی لیکن جہد المقل و موعہا ایک آرزو یہ بھی تھی کہ ہر نبی و رسول کے تذکرہ سے قبل اس کے ایسے جامع اور مختصر حالات آجائے جس کے مطالعہ سے اس کی زندگی کی چیدہ چیدہ خصوصیات کچھ نہ کچھ بیک نظر سامنے آجائیں مگر جب اپنی محرومی اور بد نصیبی سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے تذکروں ہی میں یہ تمنا پوری نہ ہو سکی تو آج جب کہ میں اس رسول الاعظم کے متعلق حدیثیں جمع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہوں جن کے تذکروں سے عالم تکوین و تشریع گونج رہا ہے کتب سماویہ ان کے ذکر سے لبریز ہیں انبیاء علیہم السلام ان کی مدح و تصنیف میں رطب اللسان ہیں حتیٰ کہ عرش عظیم پر ان کی عظمت و برتری کا چرچا ہے تو پھر قلم میں کیا طاقت ہے کہ اس موضوع میں کچھ جنبش کر سکے سبحان اللہ میدان تو کتنا وسیع ہے کہ اس کا قصد کرنا بھی مشکل مگر عقل و فہم یہاں اتنی در ماندہ ہے کہ ایک قدم اس کو حرکت کرنا بھی مشکل اس لئے آپ کی صرف ایک مجمل سی سیرت پر کفایت کرتا ہوں جس کو صاحب حیوة الحیون نے لفظ براق کے تحت عجیب اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ تذکرہ تو ایک بار آپ انبیاء علیہم السلام کے تذکروں کے شروع میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور لیجئے ایک بار پھر آخر میں بھی ملاحظہ فرما لیجئے وہ تذکرہ آپ کی خلقت کی اولیت کے اعتبار سے تھا اور یہ آپ کی بعثت کی آخریت کے لحاظ سے ہے۔ اللہم صلی علی سیدنا محمد عبدک و نسیک و رسولک النبى الامى -

اہل تاریخ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اسی سال ہوئی تھی جس سال کہ واقعہ فیل پیش آیا تھا ولادت بعد ۵ سال کی عمر میں آپ کی والدہ ماجدہ کی مقام ابواء میں وفات ہوئی پھر آپ اپنے دادا عبدالمطلب کی پرورش میں رہے اور ابھی آپ کی عمر مبارک ۸ سال کی ہوگی کہ آپ کے دادا کا بھی انتقال ہو گیا اس کے بعد آپ اپنے شفیق چچا جناب ابوطالب کی پرورش میں رہے اور ان کے ہمراہ بارہ سال کی عمر میں شام جانے والے قافلہ میں تشریف لے گئے پھر ۲۵ سال کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے تجارتی کاروبار کے لئے باہر تشریف لے جاتے رہے اور اسی سال ان کے ساتھ آپ کا عقد بھی ہوا۔ قریش نے بناء کعبہ کا ارادہ کیا تو اس وقت آپ کا سن مبارک ۲۵ سال کا تھا اس سلسلہ میں جب باہم ان میں اختلاف ہونے لگا تو انہوں نے آپ کو اپنا حکم بنایا۔ چالیس (۴۰) سال کی عمر میں آپ نبوت سے سرفراز ہوئے اور جس وقت ابوطالب کی وفات ہوئی تو اس وقت آپ کا سن مبارک ۴۹ سال ۸ ماہ اور گیارہ دن تھا ابوطالب کے ۳ دن بعد حضرت خدیجہ کا بھی وصال ہو گیا اس کے تین ماہ کے بعد آپ زید بن حارثہ کو ساتھ لے کر بغرض تبلیغ طائف تشریف لے گئے اور ایک ماہ قیام فرمایا اس کے بعد معطم بن عدی کی پناہ میں آپ مکہ مکرمہ واپس تشریف لے آئے جب آپ کا سن مبارک ۵۰ سال کا ہوا تو تصبیہ کے جن آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے جب آپ کا سن مبارک ۵۱ سال اور ۹ ماہ کا ہوا تو آپ کو معراج نصیب ہوئی



اور ۵۳ سال کی عمر میں آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی آپ کی بعثت کو اب یہ تیرھواں سال تھا اور کوئی چودھواں کہتا ہے اس سفر میں صدیق اکبر آپ کے رفیق سفر رہے ان کا غلام عامر بن فہیرہ بھی ہمراہ تھا اور عبداللہ بن اریقظ راستہ بتاتے جاتے تھے۔ اسلامی تاریخ کی ابتداء اسی سال سے ہوتی ہے اور تاریخ اسلامی میں یہ پہلا سال شمار ہوتا ہے اسی سال آپ نے صحابہ کے درمیان عقد مواخاۃ فرمایا تھا اور حضرت علیؑ کی اخوت کا اعلان بھی اسی سال ہوا تھا مقیم کو چار رکعتیں اور مسافر کے لئے دو رکعتیں پڑھنا یعنی اتمام وقصر کی سنت اسی سال شروع ہوئی تھی اور اسی سال حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کا عقد نکاح بھی ہوا ہے۔ دوسرے سال غزوہ ودان ہوا ہے ودان ایک مقام کا نام ہے۔ غزوہ بواطؑ غزوہ عثیرہ اور بدر اولیٰ کے غزوات سب اسی سال کے واقعات ہیں بواط مقام رضوی کا جانب واقع ہے غزوہ بدر اولیٰ ماہ جمادی الاخرہ میں ہوا ہے اور غزوہ بدر کبریٰ ۱۳ رمضان المبارک جمعہ کے دن ہوا ہے کفار کے بڑے بڑے سردار اسی غزوہ میں قتل ہوئے اور غزوہ بنی سلیم ذی الحجہ میں ہوا ہے۔ صورت یہ ہوئی کہ آپ ابو سفیان کی خبر سن کر نکلے تھے مگر اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی ہجرت کے تیسرے سال غزوہ بنو نضیرؑ غزوہ ذات الرقاع ہوئے ہیں۔ پانچویں سال غزوہ دومہ الجندلؑ غزوہ خندق غزوہ بنی قریظہ ہوئے ہیں۔ چھٹے سال غزوہ بنی لحيانؑ غزوہ مصطلق ہوئے ہیں ساتویں سال آپ نے اپنا منبر بنوایا اور غزوہ خیبر اور قصہ فدک سب اسی سال ہوئے ہیں۔ باغ فدک صرف آپ کے تصرف میں تھا۔ آٹھویں سال غزوہ مودہؑ فتح مکہ غزوہ حنینؑ غزوہ طائف اور قبیلہ ہوازن سے اس حاصل کردہ مال تقسیم فرمایا ہے۔ نویں سال غزوہ تبوک ہوا ہے اور دسویں سال حجة الوداع ہوا ہے اس حج میں آپ نے اپنے دست مبارک سے ۶۳ قربانیاں ذبح کی اور ۶۳ غلام آزاد فرمائے اور آپ کی عمر بارک بھی یہی ہوئی ہے گیارہویں سال آپ کا وصال ہو گیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ شروع ربیع الاول میں آپ کی علامت کی ابتداء ہوئی اور بارہویں ربیع الاول کو وفات ہو گئی آپ کی کل عمر ۶۳ سال کی تھی جس میں مدینہ میں آپ دس سال رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ آپ کی سب اولاد حضرت خدیجہؑ سے تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ماریہ قبطیہ سے تھے ان کے اسماء مبارک یہ ہیں طیبؑ، طاہرؑ، قاسمؑ، فاطمہؑ، زینبؑ، رقیہؑ، ام کلثومؑ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی سب پوری اولاد عہد طفولیت ہی میں انتقال کر چلی تھی۔

حضرت خدیجہؑ کی حیات میں آپ نے کسی اور سے عقد نہیں فرمایا پھر ان کے بعد حضرت سودہ بنت زمعہ اور حضرت عائشہؑ آپ کی زوجیت میں آئیں۔ حضرت عائشہؑ کے علاوہ آپ کی ازواج میں اور کوئی کنواری نہ تھیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد ۵۸ھ میں ۲۷ کے سن میں ان کا وصال ہوا۔ ۳ھ میں حضرت حفصہؑ کے ساتھ آپ کا عقد ہوا اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ان کا وصال ہوا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بی بی صاحبہ حضرت زینب بنت خزیمہ تھیں صرف ان کا انتقال آپ کی حیات طیبہ ہی میں ہوا ہے۔ ان کے بعد حضرت خدیجہؑ کے علاوہ سب کا انتقال آپ کے بعد ہوا ہے ۴ھ میں حضرت ام سلمہؑ سے آپ کا عقد ہوا ان کی والدہ عاتکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صاحبہ تھیں ان کا انتقال ۹ھ میں حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں ہوا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ۱۱ھ میں عاشورہ کے دن انتقال ہوا اور اسی دن حضرت امام حسینؑ کی شہادت ہوئی تھی ۵ھ میں حضرت زینب بنت جحشؑ سے آپ کا عقد ہوا اور ۲۰ھ میں حضرت عمرؓ کے عہد میں ان کا انتقال ہوا آپ کی ازواج میں آپ کے بعد سب سے پہلے ان ہی کی وفات ہوئی ہے حضرت ام حبیبہؑ بھی اسی سال آپ آپ کی زوجیت میں آئیں ان کا نام زملہ بنت ابی سفیان تھا ۴۴ھ میں حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں وفات ہوئی حضرت جریرہ بنت حارث سے بھی اسی سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں اور ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ کے عہد میں ان کا انتقال ہوا اور ۷۷ھ میں حضرت میمونہؑ آپ کے نکاح میں آئیں ان کا وصال ۴۰ھ میں ہوا ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اس وقت آپ کے عقد میں ۹ بیبیاں تھیں۔

(۱۲۸۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُونِ بَنِي آدَمَ قَرْنَا فَقَرْنَا حَتَّى كُنْتُ مِنَ الْقُرْنِ الَّذِي كُنْتُ مِنْهُ. (رواه البخاری)

(۱۲۸۱) عَنْ وَائِلَةَ بِنِ الْأَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى كِنَانَةَ مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيلَ وَاصْطَفَى قُرَيْشًا مِنْ كِنَانَةَ وَاصْطَفَى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ. (رواه مسلم و

فی رواية للترمذی ان الله اصطفی من ولد ابراهيم اسماعیل واصطفی من ولد اسماعیل بنی کنانة)

(۱۲۸۲) عَنْ الْعَبَّاسِ أَنَّهُ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَهُ سَمِعَ شَيْئًا فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ مَنْ أَنَا فَقَالُوا أَنْتَ رَسُولُ اللَّهِ قَالَ أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَيْنِ فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ فِرْقَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَائِلَ فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ قَبِيلَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُيُوتًا فَجَعَلَنِي فِي خَيْرِهِمْ بَيْتًا فَأَنَا خَيْرُهُمْ نَفْسًا وَخَيْرُهُمْ بَيْتًا (فَأَنَا خَيْرُهُمْ نَفْسًا وَخَيْرُهُمْ بَيْتًا) (رواه الترمذی)

(۱۲۸۳) عَنْ قَيْسِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ وَلَدْتُ أَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفِيلِ

(۱۲۸۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں شروع سے لے کر ہمیشہ انسانوں کے بہتر سے بہتر طبقوں میں گذرتا رہا ہوں یہاں تک کہ جس طبقہ میں پیدا ہوا ہوں وہ سب سے بہتر طبقہ ہے۔ (بخاری شریف)

(۱۲۸۱) حضرت وائلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے میں نے خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے قبیلہ کنانہ کو انتخاب فرمایا پھر کنانہ میں سے قریش کو انتخاب فرمایا اور قریش میں سے قبیلہ بنو ہاشم کو پھر بنو ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔ (مسلم)

فی رواية للترمذی ان الله اصطفی من ولد ابراهيم اسماعیل واصطفی من ولد اسماعیل بنی کنانة)

(۱۲۸۲) حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے گویا انہوں نے اس وقت مشرکین عرب کی جانب سے کچھ طعن کا کلمہ سنا تھا اس پر آپ نے ممبر پر تشریف لا کر خطبہ دیا اور فرمایا بتاؤ میں کون ہوں؟ لوگوں نے کہا آپ رسول اللہ ہیں فرمایا میں (بملاحظہ) محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہوں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق بنائی تو مجھ کو اپنی سب سے بہتر مخلوق میں پیدا فرمایا اس کے بعد ان کے دو فرقے بنائے تو جو ان میں بہتر تھا مجھ کو ان میں پیدا فرمایا اسی طرح پھر ان کے خاندان بنائے اور ان کے خاندانوں میں جو بہتر تھا اس میں مجھ کو پیدا فرمایا حتیٰ کہ پھر ان میں مختلف گھرانے بنائے اور ان گھرانوں میں جو سب سے بہتر تھا مجھ کو اس میں پیدا فرمایا تو میں تم سب میں اپنے نسب اور اپنے گھرانے کے لحاظ سے بہتر ہوں۔ (ترمذی شریف)

(۱۲۸۳) حضرت قیس بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں اسی سال پیدا ہوئے تھے جس سال میں

(۱۲۸۳) \* حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک آپ کی ولادت باسعادت اصحاب الفیل ہی کے سال میں ہوئی ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اس واقعہ کے کتنی مدت بعد ہوئی ابو جعفر باقر کہتے ہیں کہ اصحاب فیل کی آمد نصف محرم میں ہوئی تھی اور اس کے پچپن دن بعد ....



كُنَّا لَدَيْنَ قَالَ وَ سَأَلَ عُثْمَانُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ  
قَبَاثَ بْنَ أَشِيمَ أَخَابِنِي يَعْمُرُ بْنُ لَيْثٍ أَنْتَ  
أَكْبَرُ أَمْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكْبَرُ  
مَنِّي وَأَنَا أَقْدَمُ مِنْهُ فِي الْمِيلَادِ وَ رَأَيْتُ  
خَزَقَ الْفِيلَ أَخْضَرَ مُحِيلًا. (رواه الترمذی)

(۱۲۸۴) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ حَدَّثَنِي  
أُمِّي أَنَّهَا شَهِدَتْ وَلَادَةَ أَمْنَةَ بِنْتِ وَهَبِ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً وَلَدَتْهُ  
قَالَتْ فَمَا شَيْءٌ أَنْظَرُ فِي بَيْتِ الْأَنْوَرِ وَأَنْتِ  
أَنْظُرُ إِلَى النُّجُومِ تَذْنُو حَتَّى أَنْتِ لَا قَوْلُ  
لَيَقَعْنَ عَلَى الْأَرْضِ. (رواه البيهقی)

(۱۲۸۵) هُوَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ  
بْنِ هَاشِمٍ بْنِ عَبْدِ مَنَافٍ بْنِ قُصَيٍّ بْنِ كِلَابٍ بْنِ  
مَرَّةَ بْنِ كَعْبٍ ابْنِ لُؤَيٍّ بْنِ غَالِبٍ بْنِ فِهْرِ بْنِ  
مَالِكٍ بْنِ نَضْرٍ بْنِ كِنَانَةَ بْنِ خَزِيمَةَ بْنِ مُدْرِكَةَ  
بْنِ الْيَاسِ بْنِ مُضَرَ بْنِ نَزَارٍ بْنِ مُعَدٍّ بْنِ عَدْنَانَ.

بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

(رواه البخاری فی ترجمة الباب فی باب مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

کہ اصحاب الفیل کا قصہ پیش آیا تھا ہم دونوں ہم عمر تھے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قباث بن اشیم سے پوچھا جو یحییٰ کے بھائی تھے کہ تم بڑے ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ بولے کہ بڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں ہاں پیدائش میں میں آپ سے پہلے ہوں (سبحان اللہ کیا ادب کا جواب ہے) اور میں نے ہاتھیوں کا گوبر دیکھا جو سبز رنگ کا تھا اور متغیر ہو چکا تھا (یعنی میری پیدائش اصحاب الفیل کے قصہ سے بہت ہی قریب تھی) (ترمذی)

(۱۲۸۴) حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میری والدہ بیان فرماتی تھیں کہ جس شب میں حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی تو اس وقت وہ وہاں خود موجود تھیں وہ بیان کرتی تھیں کہ گھر میں جس چیز پر بھی میری نظر پڑتی تھی میں دیکھتی تھی کہ وہ منور ہے اور میں دیکھتی تھی کہ ستارے اس طرح جھلکے پڑتے تھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب زمین پر آگریں گے۔ (بیہقی)

(۱۲۸۵) حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبد اللہ بن عبد المطلب (آپ کا نام شیبۃ الحمد تھا) بن ہاشم (عمرو) بن عبد مناف (المغیرۃ) بن قصی (زید) بن کلاب (المہذب یا حکیم) بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر (قریش) بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ (عمرو یا عامر) بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

(رواه البخاری فی ترجمة الباب فی باب مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اللہ .... کے بعد آپ کی ولادت ہوئی ہے اس کے علاوہ اور بھی متعدد اقوال ہیں۔

(۱۲۸۵) \* عرب میں نسب کی حفاظت کا بڑا اہتمام تھا اور شریعت نے بھی ایک حد تک اس کا اہتمام فرمایا ہے آج بھی عدالت مدعی اور مدعا علیہ کے کم از کم باپ کا نام لکھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے حافظ یعنی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب بھی ایک دو پشت تک یاد رکھنا فرض ہے دیکھو یعنی ج ۷ ص ۲۸۱۔ اگر کاش آپ کی امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی الفت و محبت میں آپ کا پورا مذکورہ بالا نسب نامہ یاد کر لے تو یہ اس کے جذبہ محبت کا تقاضہ ہونا چاہئے راقم الحروف بھی قارئین کرام کی خدمت میں امید کے ساتھ یہ درخواست پیش کرتا ہے۔ علماء انساب اس پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ عدنان تک بالاختلاف صحیح ہے اس کے بعد اس میں اختلاف ہے قاضی سید سلیمان صاحب نے اپنی سیرت رحمۃ العالمین میں اس پر بہت مفصل اور بہت محقق بحث فرمائی ہے اور چونکہ حضرت ہاجر کے نسب پر اہل کتاب نے اعتراض کیا ہے اس لئے اس کا لفظ ....

(۱۲۸۶) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ  
 اسْتَأْذَنَ حَسَّانُ بْنُ ثَابِتٍ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هِجَاءِ الْمُشْرِكِينَ قَالَ كَيْفَ  
 بِنَسَبِي فِيهِمْ فَقَالَ حَسَّانُ لَا سُلْكَ مِنْهُمْ  
 كَمَا تَسْلُ الشَّعْرَةَ مِنَ الْعَجِينِ .  
 (رواه البخاری فی باب من احب ان لا  
 یسب نسبه)

(۱۲۸۶) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حسان  
 بن ثابت نے مشرکین کی ہجو کرنے کی آپ سے اجازت طلب کی آپ نے  
 فرمایا کہ قریش کے ساتھ میرا نسب بھی جا ملتا ہے پھر اس کا کیا کرو گے  
 (کیونکہ اس وقت ان کی ہجو کرنے سے خود میری بھی ہجو ہو جائے گی) اس پر  
 حسان نے عرض کی میں آپ کو ان میں سے اس طرح صاف نکال لوں گا  
 جیسے بال آٹے میں سے صاف نکال لیا جاتا ہے (یعنی ان کے افعال و اعمال  
 پر ان کی ہجو کروں گا)۔ (بخاری شریف)

(۱۲۸۷) عَنْ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ قَالَ  
 وَلَدَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَخْتُونًا

(۱۲۸۷) حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب پیدا ہوئے تو آپ ختنہ شدہ تھے اور

لہ... بھی بہت دندان شکن جواب دیا ہے جو قابل مراجعت ہے قاضی صاحب نے محنت اٹھا کر اس آبائی سلسلہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی  
 اللہ علیہ وسلم کی امہارت مکرمات کا بھی ذکر فرمایا ہے جس کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ فخبیراہ اللہ تعالیٰ خیر اعناو عن جمیع  
 المسلمین۔

نمبر شمار	آباء کرام	امہاء عظام	نمبر شمار	آباء کرام	امہاء عظام
۱	عبداللہ	آمنہ	۱۲	مالک	جندلہ
۲	عبدالمطلب	فاطمہ	۱۳	نضر	عکرمشہ
۳	ہاشم	سلمیٰ	۱۴	کنانہ	برہ
۴	عبد مناف	عاتکہ	۱۵	خزیمہ	عوانہ (ہند)
۵	قصی	جبیٰ	۱۶	مدرکتہ	سلمیٰ
۶	کلاب	فاطمہ	۱۷	الیاس	لیلیٰ (خندف)
۷	مرہ	ہند	۱۸	مضر	رباب
۸	کعب	مغشیہ	۱۹	نزار	سودہ
۹	لوی	ماویہ	۲۰	معد	معانہ
۱۰	غالب	عاتکہ	۲۱	عدنان	مہدو
۱۱	فہر ملقب بقریش	لیلیٰ			

(۱۲۸۶) \* عرب میں ہجو و مدح کا عام دستور تھا اور اپنے دشمن کے ہجو کرنی ان کے نزدیک اس کے قتل کرنے سے بھی زیادہ شدید سمجھا  
 جاتی تھی کیونکہ قتل سے تو اس کو صرف ایک بار ہی تکلیف پہنچتی تھی اور ہجو کے اشعار چونکہ گلی کو چوں میں بچے پڑھتے پھرتے تھے اس لئے اس کی  
 تکلیف ان کو تلوار اور برچھے سے بھی زیادہ ہوتی تھی اس لئے آپ نے فرمایا لہی اشد علیہم من رشق النبل او کما قال یہ ان کے  
 نزدیک تیروں کی بوچھاڑ سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اسلام میں جہاد کی ایک قسم جہاد باللسان بھی ہے۔



مَسْرُورًا قَالَ فَأَعْجَبَ جَدُّهُ وَ حَظَى عِنْدَهُ وَ  
قَالَ لِيَكُونَنَّ لِابْنِي هَذَا شَأْنٌ فَكَانَ لَهُ شَأْنٌ.

(بخاری شریف)

(رواہ البیہقی قال الحافظ ابن کثیر و هذا الحدیث فی صحیحہ نظر)

(۱۲۸۸) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ كَانَ أَحْبَابُ  
يَهُودَ بَنِي قُرَيْظَةَ وَالنَّضِيرِ يَذْكُرُونَ صِفَةَ  
النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا طَلَعَ  
الْكُوكَبُ الْأَحْمَرُ أَخْبَرُوا أَنَّهُ نَبِيٌّ وَأَنَّهُ لَا  
نَبِيَّ بَعْدَهُ وَاسْمُهُ أَحْمَدُ وَ مُهَاجِرُهُ إِلَى  
يَثْرِبَ فَلَمَّا قَدِمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ الْمَدِينَةَ انْكُرُوا وَ حَسَدُوا وَ كَفَرُوا.

(۱۲۸۸) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ بنو  
نضیر اور بنو قریظہ کے علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے قبل آپ کا  
حلیہ مبارکہ اور آپ کے سب علامات بیان کرتے تھے حتیٰ کہ جب سرخ رنگ  
کا ستارہ طلوع ہوا تو انہوں نے خبر دی کہ یہ (اسی رسول کے ظہور کی علامت  
ہے) یقیناً آپ نبی ہیں اور آپ کے بعد اور کوئی نبی نہیں ہوگا۔ آپ کا اسم  
مبارک احمد اور آپ کی ہجرت کے شہر کا نام یثرب ہے مگر جب آپ مدینہ  
تشریف لائے تو ان ہی یہود نے پھر آپ پر حسد کیا اور آپ کا انکار کیا اور  
کافر بن گئے۔ ابو نعیم

(رواہ ابو نعیم من طرق متعدده)

(۱۲۸۹) عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ عَنْ أَصْحَابِ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُمْ قَالُوا يَا رَسُولَ  
اللَّهِ أَخْبِرْنَا عَنْ نَفْسِكَ قَالَ دَعْوَةُ إِبْرَاهِيمَ وَ  
بُشْرَى عِيسَى وَ رَأَتْ أُمِّي حِينَ حُبَلُهُ كَانَهُ خَرَجَ  
مِنْهَا نُورًا ضَاءَتْ لَهُ بَصْرَى مِنْ أَرْضِ الشَّامِ.

(۱۲۸۹) حضرت خالد بن معدان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ سے  
یہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا آپ  
اپنے متعلق کچھ ہم سے ارشاد فرمائیں آپ نے فرمایا کہ میرے لئے حضرت  
ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے دعا فرمائی اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام  
نے بشارت دی اور حالت حمل میں میری والدہ نے دیکھا گویا ان سے ایک نور ظاہر  
ہوا جس سے کہ بصری جو ملک شام کا ایک شہر ہے سب روشن ہو گیا۔ (مسند احمد)

(رواہ الامام احمد قال ابن کثیر اسناد جید)

(۱۲۸۹) \* حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس مختصر تذکرہ سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ میری بعثت اور ظہور کا تذکرہ سب انبیاء علیہم السلام میں رہا ہے  
چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن کی طرف عرب اپنی نسبت کرتے ہیں سب سے پہلے بڑی ایضاح و الحاح کے ساتھ میرے لئے دعا فرمائی  
اس کے بعد بنی اسرائیل کے سب سے آخری نبی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے میری بشارت دی جس سے ظاہر یہ ہے کہ درمیانی سب انبیاء علیہم  
السلام نے بھی میری بشارت دی تھی پس جس کی آمد آمد کی خبریں اس طرح انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعتوں میں مسلسل جاری آرہی ہوں اس کی  
شرافت و نبوت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے اس کے بعد حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں و فیہ بشارۃ لاهل محلنا ارض بصری  
البح کہ اس میں ہمارے شہر بصری کے لئے ایک بڑی بشارت ثابت ہوتی ہے کیونکہ شام کی زمین میں سب سے پہلا شہر یہی ہے جس میں نور نبوت  
پہنچا چنانچہ صدیق اکبرؓ کی خلافت میں کسی جنگ کے بغیر یہ شہر صلحاً فتح ہوا اور اس شہر میں نبوت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبار تشریف بھی  
لاچکے ہیں ایک بار بارہ سال کی عمر میں جس میں کہ بحیراء راہب کا قصہ پیش آیا تھا دوسری بار میسرہ غلام کے ساتھ اور اس شہر میں آپ کے ناقہ کے  
بیٹھنے کی جگہ بھی موجود ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں آپ کی ناقہ بیٹھی تھی اور اس کا نشان پڑ گیا تھا اور یہ وہی ٹھہرے کہ جہاں کے اونٹوں کی  
گردنیں اس آگ کی وجہ سے جو ایک بار ۶۵ھ میں حجاز میں لگی تھی چمکتی نظر آتی تھیں اور جس کے متعلق آپ پہلے پیش گوئی فرما چکے ہیں۔

(۱۲۹۰) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا اعْتَرَفَ آدَمُ الْخَطِيئَةَ قَالَ يَا رَبِّ اسْأَلْكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ إِلَّا غَفَرْتَ لِي فَقَالَ اللَّهُ يَا آدَمُ كَيْفَ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا وَلَمْ أَخْلُقْهُ بَعْدُ فَقَالَ يَا رَبِّ لَأَنَّكَ لَمَّا خَلَقْتَنِي بِيَدِكَ وَنَفَخْتَ فِيَّ مِنْ زَوْجِكَ رَفَعْتَ رَأْسِي فَرَأَيْتُ عَلَى قَوَائِمِ الْعَرْشِ مَكْتُوبًا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ فَعَلِمْتُ أَنَّكَ لَمْ تُضِفْ اسْمَكَ إِلَّا أَحَبَّ الْخَلْقِ إِلَيْكَ فَقَالَ اللَّهُ صَدَقْتَ يَا آدَمُ إِنَّهُ لَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَيَّ وَإِذْ قَدْ سَأَلْتَنِي بِحَقِّهِ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَوْ لَا مُحَمَّدًا مَا خَلَقْتُكَ. (رواه الحاكم)

قال البهيقي تضرد به عبدالرحمن بن زيد بن اسلم وهو ضعيف والله اعلم.

(۱۲۹۱) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ بَنُو أَبِي طَالِبٍ يُصْبِحُونَ رُمَصًا عُمَصًا وَيُصْبِحُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَقِيلًا دَهِيْنًا وَكَانَ أَبُو طَالِبٍ يُقَرِّبُ إِلَى الصَّبِيَّانِ مَضْحَتَهُمْ أَوَّلَ الْبُكْرَةِ فَيَجْلِسُونَ وَيَسْتَهْبُونَ وَيُلْفُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ

(۱۲۹۰) حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آدم علیہ السلام سے خطاء سرزد ہوگئی تو انہوں نے یوں دعا کی اے رب اس حق کے طفیل میں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تو نے رکھا ہے مجھ کو بخش دے اللہ تعالیٰ نے فرمایا آدم! تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسے پہچانا میں نے تو ان کو اب تک پیدا بھی نہیں کیا انہوں نے عرض کی اے رب! جب تو نے مجھ کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور اپنی جانب سے اس میں روح ڈالی تو میں نے جب سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عرش کے پایوں پر یہ کلمہ لکھا ہوا تھا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُولُ اللَّهُ میں سمجھ گیا کہ جس کے نام کو تو نے اپنے اسم مبارک کے ساتھ رکھا ہے وہی شخص ہو سکتا ہے جو تجھ کو اپنی مخلوق بھر میں سب سے پیارا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے آدم تم نے درست کہا بے شک وہ مجھ کو تمام مخلوق میں سب سے پیارے ہیں اور جب تم نے ان کے حق کے وسیلہ سے مجھ سے سوال کیا ہے تو جاؤ میں نے تم کو بخش دیا اگر یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ ہوتے تو میں تم کو بھی پیدا نہ کرتا۔ (حاکم) بیہقی کہتے ہیں کہ اس میں ایک راوی عبدالرحمان بن زید بن اسلم ہیں اور وہ ضعیف ہیں۔

(۱۲۹۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ابوطالب کی اولاد جب صبح کو اٹھتی تو عام دستور کے مطابق ان کی آنکھوں میں میل ہوتا اور پرانگندہ بال ہوتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاف ستھرے اٹھتے یوں معلوم ہوتا کہ جیسے آپ کے بالوں میں تیل لگا ہوا ہے ابوطالب کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے بچوں کو سویرے ناشتہ دے دیتے بچے بیٹھ جاتے اور بچوں کی عادت کی طرح چھینا جھٹی شروع کر دیتے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ

(۱۲۹۱) \* حافظ ابن کثیر نے اپنی مشہور تاریخ البدایہ والنہایہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے آپ کے نسب شریف کا تذکرہ کیا ہے اور تاریخ و احادیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ آپ عرب میں سب کے نزدیک مسلم شریف النسب تھے جیسا کہ ہر قل کی حدیث میں ابوسفیان کی شہادت پہلے گزر چکی ہے اس کے بعد آپ کی ولادت باسعادت کی تاریخ پر بحث کی ہے پھر آپ کے والد ماجد حضرت عبد اللہ کی پیشانی پر آپ کا اور چمکنا اور حضرت آمنہ کے حاملہ ہو جانے کے بعد اس نور کا محسوس نہ ہونا اور اس سلسلہ میں عرب کی عورتوں کے اشتیاق کے سب واقعات بھی ذکر فرمائے ہیں اس کے بعد جس شب آپ کی ولادت باسعادت ہوئی ہے اس کے عجائبات کا مفصل تذکرہ لکھا ہے اور اس کے بعد ایوان کسریٰ کے کنگروں کا گرنا اور آتش کدہ فارس کی آگ گل لہے ....



فَلَا يَنْتَهَبُ مَعَهُمْ فَلَمَّا رَأَى ذَلِكَ عَمَّهُ  
عَزَلَ لَهُ طَعَامُهُ عَلَى حِدَةٍ . (كذا في البداية  
والنهاية ج ۲ ص ۲۸۳)  
وسلم اپنا ہاتھ کھینچے رکھتے اور دوسرے بچوں کے ساتھ اس چھینا جھٹی میں  
شریک نہ ہوتے جب ابوطالب نے آپ کی یہ کیفیت دیکھی تو پھر آپ کو  
علحدہ ناشتہ دینے لگے تاکہ آپ پیٹ بھر کر کھا سکیں۔

## نبذة من حلیۃ الشریفۃ تنباک عن نبوتہ و نباہۃ شانہ صلوات اللہ و سلامہ علیہ

آنحضرت ﷺ کا مختصر حلیہ شریفہ جس کو پڑھ کر آپ کی نبوت اور آپ کی شان کی بزرگی کا کچھ

اندازہ ہوتا ہے شامل نبویہ ﷺ کے پڑھنے والوں سے ایک ضروری خطاب \* واضح رہے کہ آج یہ عام دستور  
ہے کہ ہر کتاب کے شروع میں اس کے مؤلف کا فوٹو بھی لگایا جاتا ہے جس کی بڑی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ علم قیافہ کی رو سے یہ اندازہ لگایا جاسکے  
کہ اس کتاب کا مؤلف کس خلوص نیت، کس علو ہمت، کس علم و فراست اور کن اخلاق و ملکات کا مالک ہے تاکہ اس کے کام کے مطالعہ سے قبل اس  
کے طالع انور کا مطالعہ کر لینا کتاب کے دیباچہ کا کام دے۔ گذشتہ اوراق میں آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و شامل اور آپ کی پاکیزہ و  
بلند تعیمات اور آپ کی محیر العقول تربیت کا کچھ نقشہ ملاحظہ فرما چکے ہیں اب آپ کا مختصر حلیہ شریفہ بھی ملاحظہ کر لیجئے تاکہ آپ کے کمالات علمیہ کو  
دیکھ کر آپ کے مقدس حلیہ کی کچھ تصویر آپ کے سامنے آسکے اور آپ کی مبارک صورت کو پڑھ کر آپ کے علمی کمالات کا کچھ اندازہ کیا جاسکے۔ ہر  
چند کہ حسن الامحود والفاظ و حروف سے کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے تاہم اس بارے میں آپ کے مقدس صحابہؓ آپ کے حلیہ شریفہ کے متعلق جو کچھ بیان  
میں لے سکتے تھے وہ لے آئے ہیں یہ ان کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس غائب امت کے لئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایدار سے محروم  
رہی کم از کم یہی سامان تسلی چھوڑ دیا ہے۔ ع بلا بودے اگر ایں ہم پنودے

لہذا اب آپ اسی کو پورے ذوق و شوق اور پورے ایمان و ایقان کے ساتھ پڑھیں اور بار بار پڑھیں شاید کہ اسی راستہ سے آپ کے  
قلب میں حسن نبوت کا عشق سما جائے اور اس طرح پروردگار کے حسن حقیقی کا کوئی جلوہ نصیب ہونے کی راہ کھل جائے۔  
دادیم تراز گنج مقصود نشان! گر مانر سیدیم تو شاید برسی!

۱۔... ہو جانے وغیرہ پر بھی مستقل ایک باب باندھا اسی طرح آپ کی عہد طفولیت اور شباب کے ایک ایک واقعہ کو علیحدہ علیحدہ لکھ کر آپ کی  
بعثت کا ذکر شروع کیا ہے اور اس سلسلہ میں تورات و انجیل کی بشارات اور علماء یہود و نصاریٰ کی بشارتیں اور شہادتیں بھی پوری تفصیل کے  
ساتھ ذکر فرمائی ہیں حتیٰ کہ سیف بن ذی یزن کی بشارت پر ایک مستقل فصل قائم کی ہے۔ اور آخر میں جنات کے مختلف آوازوں کا ہنوں کی  
خبروں اور بتوں سے آپ کے ظہور کی جو شہادتیں سنی گئی تھیں ان کو بھی ایک مستقل باب میں ذکر فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں احادیث و تاریخ  
کے علاوہ شعراء عرب کے اشعار کا بھی ایک اچھا خاصہ حصہ نقل فرمایا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جب دنیا میں  
ظاہر ہوتے ہیں تو اس وقت عالم میں انقلاب کا عالم کیا ہوتا ہے ان کے سچائی نشانات ان سے پہلے اور ان کے ساتھ کس درجہ کثرت اور صفائی  
کے ساتھ عالم کے ذرہ ذرہ اور اس کے گوشہ گوشہ سے ہویدا ہوتے ہیں۔ پھر جب نبی امی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو کس طرح  
یہ سارے نشانات آسمان و زمین پر چمک رہے تھے کتب سماویہ اور اہل کتاب کے علماء ہی نہیں بلکہ جن و انس کا سارا عالم کس طرح آپ کے  
لئے چشم براہ تھے اور اس سے گذر کر عالم جمادات بھی آپ کی آمد آمد کی خبریں دے رہا تھا لیکن اس مادی دنیا میں کون ہے جو ان حقائق کی  
دنیا کا اقرار کر کے اپنی مادی دنیا کو نہیں لگانا برداشت کر کے اس لئے ہزار حیلہ کر کے اس کے انکار کے درپے ہے۔

(۱۲۹۲) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ شَمَطُ مُقَدَّمِ رَأْسِهِ وَلِحْيَتِهِ وَكَانَ إِذَا ذَهَنَ لَمْ يَتَبَيَّنْ وَإِذَا شَعَثَ رَأْسُهُ تَبَيَّنَ وَكَانَ كَثِيرَ شَعْرِ اللَّحْيَةِ فَقَالَ رَجُلٌ وَجْهَهُ مِثْلُ السَّيْفِ قَالَ لَا بَلْ كَانَ مِثْلَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَكَانَ مُسْتَدِيرًا وَرَأَيْتُ الْخَاتَمَ عِنْدَ كَتِفِهِ مِثْلَ بَيْضَةِ الْحَمَامَةِ يُشَبِّهُ جَسَدَهُ.

(رواه المسم)

(۱۲۹۳) عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِالطَّوِيلِ الْبَائِنِ وَلَا بِالْفَصِيرِ وَلَا بِالْبَيْضِ الْأَمْهَقِّ وَلَا بِالْأَدَمِ وَلَا لَيْسَ بِالْجَعْدِ ابْقَطِطِ وَلَا بِالسَّبْطِ بَعَثَهُ اللَّهُ عَلَى رَأْسِ أَرْبَعِينَ سَنَةً فَأَقَامَ بِمَكَّةَ عَشْرَ سِنِينَ وَبِالْمَدِينَةِ عَشْرَ سِنِينَ وَتَوَفَّاهُ اللَّهُ عَلَى رَأْسِ سِتِّينَ سَنَةً وَلَيْسَ فِي رَأْسِهِ وَلِحْيَتِهِ عَشْرُونَ شَعْرَةً بَيْضَاءَ (وفى رواية) يَصِفُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ رُبْعَةً مِنَ الْقَوْمِ لَيْسَ بِالطَّوِيلِ وَلَا بِالْقَصِيرِ أَزْهَرُ اللَّوْنِ وَقَالَ كَانَ شَعْرُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى أَنْصَافِ أُذُنَيْهِ وَغَاتِقِهِ. (متفق عليه)

وَفِي رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ قَالَ كَانَ ضَخْمَ الرَّأْسِ وَالْقَدَمَيْنِ لَمْ أَرْبَعْدَهُ وَلَا قَبْلَهُ مِثْلَهُ وَكَانَ بَسُطَ الْكَفَّيْنِ وَفِي أُخْرَى لَهُ قَالَ كَانَ شَتْنِ الْقَدَمَيْنِ وَالْكَفَّيْنِ.

(۱۲۹۲) حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں میں اور ڈاڑھی میں کچھ سفیدی آگئی تھی مگر وہ اتنی قلیل تھی کہ جب تیل لگاتے تو تیل کی چمک کی وجہ سے وہ سفیدی ظاہر نہ ہوتی اور جب سر میں تیل نہ ہوتا تو چمکتی آپ کی ریش مبارک گنجان تھی۔ ایک شخص نے پوچھا کیا آپ کا روئے انور تلوار کی طرح روشن تھا؟ تو دوسروں نے کہا نہیں بلکہ آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکدار اور گولائی لئے ہوئے تھا (تلوار لمبی ہوتی ہے) میں نے مہر نبوت کو دیکھا ہے وہ چینی ہڈی کے پاس تھی جیسے کبوتر کا انڈا اور اس کا رنگ وہی تھا جو آپ کے جسم مبارک کا رنگ تھا۔ (مسلم)

(۱۲۹۳) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت دراز قامت تھے اور نہ پست قد اور نہ بالکل چوڑے کی طرح سفید اور نہ گندم گوں (بلکہ سرخی مائل گورے) آپ کے بال کچھ خمیدہ نہ بہت زیادہ گھونگر والے اور نہ بالکل سیدھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چالیس سال کی عمر منصب نبوت سے نوازا اس کے بعد دس سال آپ مکہ مکرمہ میں رہے پھر دس سال مدینہ طیبہ میں اس طرح جب آپ کی وفات ہوتی تو اس وقت آپ کی عمر مبارک ساٹھ برس کی تھی (راوی نے کسر شمار نہیں کی ہے) اس وقت تک کہ ریش مبارک اور سر میں بیس بال سفید نہ ہوئے تھے۔ دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ وہ آپ کا حلیہ مبارک یوں بیان فرماتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میانہ قد تھے نہ بہت لائے نہ ٹھگنے آپ کا رنگ روشن اور چمکدار تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کے متعلق یہ بیان کرتے تھے کہ بعض اوقات وہ نصف کانوں تک بھی ہوتے تھے۔ بخاری کی۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک بڑا تھا اور پیر بھی کسی قدر بڑے تھے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا حسین و خوبصورت نہ آپ سے پہلے کوئی دیکھا اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلیاں، کشادہ نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیر اور ہتھیلیاں پر گوشت اور گداز تھیں۔



(۱۲۹۳) عَنْ أَبِي عُبَيْدَةَ بْنِ مُحَمَّدٍ بْنِ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ قُلْتُ لِلرَّبِّيعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ صَفَى لَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ يَا بُنَى لَوِ رَأَيْتَهُ رَأَيْتَ الشَّمْسَ طَالَعَةً. (رواه الدارمی)

(۱۲۹۵) وَ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي لَيْلَةٍ اضْحِيَّانَ فَجَعَلْتُ أَنْظُرَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ إِلَى الْقَمَرِ وَ عَلَيْهِ حُلَّةٌ حُمْرَاءُ فَإِذَا هُوَ أَحْسَنُ عِنْدِي مِنَ الْقَمَرِ. (رواه الترمذی و الدارمی)

(۱۲۹۶) عَنْ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ مَرْبُوعًا بُعِيدَ مَا بَيْنَ الْمُتَكَمِّينَ لَهُ شَعْرٌ بَلَغَ شَحْمَةَ أُذُنَيْهِ رَأَيْتُهُ فِي حُلَّةٍ حُمْرَاءَ لَمْ أَرِ شَيْئًا قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَ فِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ مِنْ ذِي لَمَّةٍ أَحْسَنَ فِي حُلَّةٍ حُمْرَاءَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَعْرُهُ يَضْرِبُ مَنْكِبَيْهِ بَعِيدَ مَا بَيْنَ الْمَنْكَبَيْنِ لَيْسَ بِالطَّوِيلِ وَ لَا بِالْقَصِيرِ.

(۱۲۹۷) عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَلِيعَ الْفَمِ أَشْكَلَ الْعَيْنِ مِنْهُوْشِ الْعَقَبَيْنِ قِيلَ لِسِمَاكِ مَا ضَلِيعُ الْفَمِ قَالَ عَظِيمُ الْفَمِ قِيلَ مَا أَشْكَلُ الْعَيْنِ قَالَ طَوِيلُ شِقِّ الْعَيْنِ قِيلَ مَا مِنْهُوْشُ الْعَقَبِ بْنِ قَالَ قَلِيلُ لَحْمِ الْعَقَبِ. (رواه مسلم)

(۱۲۹۴) ابو عبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر روایت کرتے ہیں کہ میں نے ربیع بنت معوذ سے عرض کی آپ ہم سے کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک بیان فرمائیں انھوں نے فرمایا عزیز من! اگر تم آپ کو دیکھتے تو یہ دیکھتے کہ آفتاب نکل آیا ہیں۔

(دارمی شریف)

(۱۲۹۵) جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار چاندنی رات میں دیکھا تو میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور کبھی چاند کو دیکھنے لگا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سرخ حلہ پہنے ہوئے تھے مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاند سے زیادہ حسین نظر آتے تھے۔

(ترمذی شریف. دارمی)

(۱۲۹۶) براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میانہ قد تھے آپ کے دونوں شانوں کے درمیان ذرا فاصلہ تھا آپ کے بال تھے جو کبھی کانوں کی لو تک ہوتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ آپ کو سرخ لباس میں دیکھا تو آپ سے بڑھ کر میں نے کسی کو خوبصورت نہیں دیکھا (متفق علیہ) مسلم کی روایت میں اس طرح ہے کہ میں نے سرخ لباس میں کسی گیسو والے شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر خوبصورت نہیں دیکھا۔ آپ کے بال کبھی شانوں تک بھی آ جاتے تھے آپ کے دونوں شانوں کے درمیان کچھ فاصلہ تھا آپ نہ بہت دراز قامت نہ زیادہ پست قد تھے۔

(۱۲۹۷) جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کشادہ دہن والے تھے آپ کی آنکھیں لمبی آپ کی ایڑیاں باریک تھیں۔ سماک راوی سے سوال کیا گیا کہ ضلیع الغم کا مطلب کیا ہے انہوں نے کہا کہ منہ کا دہانہ بڑا ہونا پھر ان سے پوچھا گیا کہ اشکل العین کے معنی کیا ہیں انہوں نے کہا کہ آنکھوں کا خانہ لمبا ہونا پھر پوچھا گیا کہ منہووش العقین کے معنی کیا ہیں انہوں نے کہا کہ ایڑیوں کا پر گوشت نہ ہونا۔ (مسلم شریف)

(۱۲۹۸) عَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ

اللَّهِ كَانَ أَبْيَضَ مَلِيحًا مُقْضَدًا. (رواه مسلم)

(۱۲۹۹) عَنْ ثَابِتٍ قَالَ سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ

خِضَابٍ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فَقَالَ إِنَّهُ لَمْ يَلُغْ مَلِيخُضَبَ لَوْ شِئْتُ أَنْ أَعْدَّ

شَمْطَاتَهُ فِي لِحْيَتِهِ وَفِي رِوَايَةٍ لَوْ شِئْتُ أَنْ

أَعْدَّ شَمْطَاتٍ كُنَّ فِي رَأْسِهِ فَعَلْتُ مُتَّفِقٌ عَلَيْهِ

وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ إِنَّمَا كَانَ الْبَيَاضُ فِي

عَنْقَبِهِ وَفِي الصُّدُغَيْنِ وَفِي الرَّأْسِ نَبَذًا.

(۱۳۰۰) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ مَا رَأَيْتُ شَيْئًا

أَحْسَنَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

كَانَ الشَّمْسُ تَجْرِي فِي وَجْهِهِ وَمَا رَأَيْتُ

أَحَدًا أَسْرَعَ فِي مَشْيِهِ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ كَانَمَا

الْأَرْضُ تُطْوَى لَهُ إِنَّا لَنُجْهِدُ أَنْفُسَنَا وَإِنَّهُ

لَغَيْرُ مُكْتَرَبٍ. (رواه الترمذی)

(۱۳۰۱) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ فِي

سَاقِي رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حُمُوشَةٌ وَكَانَ لَا يَضْحَكُ إِلَّا تَبَسُّمًا وَ

كُنْتُ إِذَا نَظَرْتُ إِلَيْهِ قُلْتُ أَكْحَلُ الْعَيْنَيْنِ وَ

لَيْسَ بِأَكْحَلٍ. (رواه الترمذی)

(۱۳۰۲) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفْلَجَ الشَّيْئِينَ إِذَا

تَكَلَّمَ رَأَى كَالنُّورِ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ ثَنَائِيَاهُ.

(رواه الدارمی)

(۱۳۰۳) عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

(۱۲۹۸) ابوالطفیل بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

دیکھا گورے رنگ اور میانہ قد کے تھے۔ (مسلم شریف)

(۱۲۹۹) ثابت روایت کرتے ہیں کہ انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ

آپ کے بال اتنے سفید ہی کہاں تھے کہ ان کے خضاب لگانے کی نوبت

آتی آپ کی ریش مبارک میں کل اتنے بال سفید تھے کہ اگر میں ان کو شمار

کرنے کا ارادہ کرتا تو شمار کر لیتا۔ مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ صرف

چند بال آپ کے ریش بچہ کے سفید ہوئے تھے اور کچھ کنپٹیوں میں اور کچھ

آپ کے سر میں۔

(۱۳۰۰) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو نہ دیکھا یوں معلوم ہوتا تھا گویا کہ اس میں

آفتاب چمک رہا ہے اور آپ سے زیادہ تیز رفتار بھی میں نے کسی کو نہیں

دیکھا جب آپ چلتے تو یوں معلوم ہوتا گویا زمین آپ کے لئے لپیٹی جا رہی

ہے آپ اپنی معمولی رفتار سے چلتے تھے اور ہم مشکل سے آپ کے ساتھ چل

سکتے تھیں۔ (ترمذی شریف)

(۱۳۰۱) جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی پنڈلیاں پر گوشت نہ تھیں ہلکی ہلکی سی ہوئی تھیں اور آپ کھل کھلا کر نہ

ہنسنے صرف مسکراتے تھے جب میں آپ پر نظر کرتا تو اپنے دل میں کہتا کہ

آپ سرمہ لگائے ہوئے ہیں مگر آپ سرمہ لگائے ہوئے نہ ہوتے تھے۔

(قدرتی سرگیں چشم تھے) (ترمذی شریف)

(۱۳۰۲) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے دو دانتوں کے درمیان کشادگی تھی جب آپ گفتگو فرماتے تو ویں

معلوم ہوتا کہ آپ کے دانتوں کے درمیان سے نور پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا

ہے۔ (دارمی)

(۱۳۰۳) کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم جب خوش ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انور ایسا چمکنے لگتا جیسا



چودھویں رات کے چاند کا ٹکڑا ہے اور اس سے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کو پہچان لیتے -

(متفق علیہ)

(۱۳۰۴) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت دراز قامت تھے نہ پست قد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر بڑا ریش مبارک گنجان ہتھیلیاں اور پیر گداز اور پر گوشت رنگ میں سرخی جسم کے جوڑ بڑے پیٹ پر بالوں کی دھاری لمبی جب چلتے تو سامنے کو جھک کر یوں معلوم ہوتا گویا پستی میں اتر رہے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا حسین نہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دیکھا نہ بعد میں -

(ترمذی شریف)

(۱۳۰۵) حضرت علیؓ جب حضور کا حلیہ بیان فرماتے تو کہا کرتے تھے کہ آنحضرتؐ نہ لائے تھے نہ زیادہ پستہ قد بلکہ میانہ قد لوگوں میں تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال نہ بالکل خمیدہ تھے نہ بالکل سیدھے بلکہ کچھ خمیدگی لئے ہوئے تھے نہ آپؐ موٹے بدن والے تھے نہ گول چہرہ کے البتہ تھوڑی سی گولائی آپ کے چہرہ میں تھی (یعنی چہرہ انور بالکل گول تھا نہ بالکل لانا بلکہ دونوں کے درمیان تھا) حضور کا رنگ سفید سرخی مائل تھا آپ کی آنکھیں نہایت سیاہ تھیں اور مٹرگاں دراز بدن کے جوڑ موٹے تھے (مثلاً کہدیاں اور گھٹنے) ایسے ہی دونوں شانوں کے درمیان کی جگہ بھی موٹی اور پر گوشت تھی آپ کے بدن مبارک پر (معمولی لور سے زائد) بال نہیں تھے (یعنی بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بدن پر بال ہی بال ہو جاتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن پر خاص خاص حصوں کے علاوہ جیسے بازو و پنڈلیں وغیرہ ان کے علاوہ اور کہیں بال نہیں تھے) آپ کے سینہ سے ناف تک بالوں کی لکیر تھی آپ کے ہاتھ اور قدم مبارک پر گوشت تھے جب آپ تشریف لے چلتے تو قدموں کو قوت سے اٹھاتے گویا کہ پستی میں اتر رہے ہیں بلکہ سے رکھتے - جب آپ کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن کے ساتھ توجہ فرمانے (یعنی صرف گردن پھیر کر متکبرانہ متوجہ نہ ہوتے تھے) آپ

علیہ وسلم إذا سُرَّ اسْتَنَارَ وَجْهُهُ حَتَّى كَانَ وَجْهُهُ قِطْعَةً قَمَرٍ وَ كُنَّا نَعْرِفُ ذَلِكَ.

(متفق علیہ)

(۱۳۰۴) عَنْ عَلِيٍّ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِالطَّوِيلِ وَلَا بِالْقَصِيرِ ضَخَمَ الرَّأْسِ وَاللَّحْيَةُ شَتْنُ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ مُشْرَبًا حُمْرَةَ ضَخَمَ الْكَرَادِيسِ طَوِيلَ الْمَسْرُوبَةِ إِذَا مَشَى تَكَفَّأ تَكَفَّأ كَأَنَّمَا يُنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ لَمْ رَقْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ مِثْلَهُ ﷺ

(رواه الترمذی و قال هذا حدیث حسن صحیح)

(۱۳۰۵) عَنْ عَلِيٍّ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ كَانَ إِذَا وَصَفَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمْ يَكُنْ بِالطَّوِيلِ الْمُمَغِطِ وَلَا بِقَصِيرِ الْمَرْدَدِ وَ كَانَ رُبْعَةً مِنَ الْقَوْمِ وَ لَمْ يَكُنْ بِالْجَعْدِ الْقَطِطِ وَلَا بِالسَّيْطِ كَانَ جَعْدَ أَرْجُلًا وَلَمْ يَكُنْ بِالْمُطَهَّمِ وَلَا بِالْمُكَلَّمِ وَ كَانَ فِي الْوَجْهِ تَدْوِيرًا أَبْيَضُ مُشْرَبٌ أَدْعَجَ الْعَيْنَيْنِ أَهْدَبَ الْأَشْفَارِ جَلِيلَ الْمُشَاشِ وَ الْكَتَدِ أَجْرَدُ ذُو مَسْرُوبَةٍ شَتْنُ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ إِذَا مَشَى يَتَقَلَّعُ كَأَنَّمَا يَمْشِي فِي صَبَبٍ وَ إِذَا التَفَتَ التَفَتَ مَعَابِينَ كَسَفِيهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ وَ هُوَ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ أَجْوَدُ النَّاسِ صَدْرًا وَ أَصْدَقُ النَّاسِ لَهْجَةً وَ يَنْهَمُ عَرَبِيكَةً وَ أَكْرَمُهُمْ عَشِيرَةً مَنْ رَأَاهُ بِدِيهَةِ هَابَهُ وَ مَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةً أَحَبَّهُ يَقُولُ نَاعَتُهُ لَمْ أَرَقْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ

مِثْلُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور تھے بھی آپ خاتم النبیین

(رواہ الترمذی) (یعنی یہ اس کی علامت تھی کہ آپ سب نبیوں کے آخر میں تھے آپ سب سے

زیادہ سختی دل والے تھے اور سب سے زیادہ سچی زبان والے سب سے زیادہ نرم طبیعت والے تھے اور سب سے زیادہ شریف گھرانے والے تھے) غرض آپ کے دل زبان طبیعت خاندان اوصاف ذاتی اور نسبی ہر چیز سب سے زیادہ افضل تھے) آپ کو یکا یک جو شخص دیکھتا مرعوب ہو جاتا تھا (یعنی آپ کا وقار و بلہ میں دیکھنے والا رعب کی وجہ سے ہیبت میں آ جاتا تھا) البتہ جو شخص پہچان کر آپ کے ساتھ رہنے لگتا وہ دل و جان سے آپ کا فریفتہ ہو جاتا تھا آپ کا حلیہ مبارک بیان کرنے والا صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا باجمال و باکمال نہ حضور سے پہلے دیکھا نہ بعد میں دیکھا۔ (ترمذی)

(۱۳۰۶) عن الحسن بن علی رضی اللہ

تعالیٰ عنہما قال سألت خالی ہند بن ابی

ہمالہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و کان و صافاً عن

حلیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و انا

اشتہی ان لصف لی منها شینا اتعلق بہ

فقال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فحماً مفتحاً بتلاً لا تلاً لؤ القمر لیلۃ البدر

اطول من المربوع و اقصر من المشذب

عظیم الہامۃ رجل الشعران انفرقت عقیقۃ

فرق و الا فلا یحاوز شغرة شحمة اذنیہ

اذا هو و فرۃ ازهر اللون و اسع الجبین

ازج الحواجب سوابغ من غیر قرن بینہما

عرق یدرہ الغضب اثنی العرنین لہ نور

یعلوہ یحسبہ من لم یتأملہ اشم کث

اللحیۃ سهل الخدین ضلیع الفم مفلج

الاسنان دقیق المسرۃ کان عنقہ جید

مۃ فی صفاء الفضة معتدل الخلق باذن

مماسک سواء البطن و الصدر بعید

مابین منکبین ضخیم الکرا دیس انور

(۱۳۰۶) حضرت امام حسن رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہند

بن ابی ہمالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک دریافت کیا اور وہ آپ کا

حلیہ بیان کرنے کا بڑا شغف رکھتے تھے میں نے چاہا کہ وہ آپ کے اوصاف جمیلہ کا

میرے سامنے بھی کچھ ذکر فرمائیں تاکہ میں ان کو انے اندر پیدا کرنے کی کوشش

کروں (حضرت امام حسنؑ آپ کے وصال کے وقت بہت کم سن تھے اس لئے اس

وقت تک ان امور پر غور کرنے کا ان کو موقع نہ مل سکا تھا) چنانچہ ان کی فرمائش پر

انہوں نے آپ کا حلیہ اس طرح بیان فرمایا کہ آپ خود بڑے بھاری بھر کم تھے اور

لوگوں کی نظروں میں بھی بزرگ و برتر تھے آپ کا روئے انور اس طرح چمکتا تھا

جیسے چودھویں رات کا چاند پورے میانہ قد والے سے ذرا دراز قامت اور بالکل

بے ذول سے پست قامت - سر مبارک بڑا - بال اتنے خمیدہ جیسے گھونگر والے بالوں

میں کنگھی کی ہو اگر سہولت سے مانگ نکل آتی تو نکال لیتے ورنہ زیادہ تکلف نہ

فرماتے تھے - جب آپ کے گیسو ذرا دراز ہو جاتے تو کانوں کی لو سے ذرا نیچے آ

جاتے - رنگ بڑا رونق دار اور روشن پیشانی کشادہ - ابرو خمدار باریک اور گنجان اور

دونوں ابرو جدا جدا درمیان میں ایک رگ جو غصہ میں ابھر جاتی - بلند بینی اس پر چمکتا

ہو انور سر سری طور پر دیکھنے والا یوں سمجھئے کہ شاید آپ کی ناک ہی بلند ہے (حالانکہ

وہ نور کی چمک ہوتی) ریش مبارک گنجا - ستے ہوئے رخسار (اٹکے ہوئے پر گوشت

نہیں) فراخ دھن - دندان مبارک کے درمیان ذرا ذرا سا فاصلہ - سینہ سے لے کر

ناف تک بالوں کی ایک باریک سی دھاری - گردن موڑتی کی سی تراشی ہوئی اور

چاندی کی طرح سفید چمکدار - نہایت معتدل پر گوشت جسم گھٹے ہوئے سینہ شکم



الْمُتَجَرِّدُ. مَوْصُولٌ مَا بَيْنَ اللَّبَّةِ وَالسُّرَّةِ  
بِشَعْرِ بَجْزَى كَالْحَطِّ. عَارِي الثَّدْيَيْنِ وَ  
الْبُظْنِ مِمَّا سَوَى ذَلِكَ أَشْعَرُ الذَّرَاعَيْنِ وَ  
الْمَنْكَبَيْنِ وَ أَعَالَى الصَّدْرِ. طَوِيلُ الزَّنْدَيْنِ  
رَحْبُ الرَّاحَةِ. شَتْنُ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ  
سَائِلُ الْأَطْرَافِ أَوْ قَالَ سَائِلُ الْأَطْرَافِ  
حُمْصَانِ الْأَحْمَصَيْنِ. ذَرِيعُ الْمَشْيَةِ إِذَا  
مَشَى كَأَنَّمَا بَنَحَظُّ مِنْ سَبَبٍ. وَ إِذَا التَفَتَ  
التَفَتَ جَمِيعًا خَافِضُ الظَّرْفِ نَظْرُهُ إِلَى  
الْأَرْضِ أَكْثَرُ مِنْ نَظَرِهِ إِلَى السَّمَاءِ جُلُّ  
نَظَرِهِ الْمَلَا حِظَّةٌ يَسُوقُ أَصْحَابَهُ يَبْدَأُ مَنْ  
لَقِيَ بِالسَّلَامِ.

(رواه الترمذی)

(۱۳۰۷) عَنْ الْحَسَنِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ  
فِي حَدِيثِهِ عَنْ خَالِهِ كَمَا مَرَّ قَالَ الْحَسَنُ  
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فَكَتَمْتُهَا الْحُسَيْنُ  
رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ زَمَانًا ثُمَّ حَدَّثَهُ  
فَوَجَدْتُهُ قَدْ سَبَقَنِي إِلَيْهِ فَسَأَلْتُهُ عَمَّا سَأَلْتُهُ  
عَنْهُ وَ وَجَدْتُهُ قَدْ سَأَلَ أَبَاهُ عَنْ مَدْخَلِهِ وَ  
عَنْ مُخْرَجِهِ وَ شَكَّلَهُ فَلَمْ يَدْعُ مِنْهُ شَيْئًا  
قَالَ الْحُسَيْنُ فَسَأَلْتُ أَبِي عَنْ دُخُولِ  
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ  
كَانَ إِذَا أَوَى إِلَى مَنْزِلِهِ جُزْأُ دُخُولِهِ ثَلَاثَةٌ  
أَجْزَاءُ جُزْءٌ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَ جُزْءٌ لِأَهْلِهِ وَ  
جُزْءٌ لِنَفْسِهِ ثُمَّ جُزْءٌ جُزْءٌ هَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ  
النَّاسِ فَيَرُدُّ ذَلِكَ بِالْخَاصَّةِ عَلَيْهَا وَ

ہموار (یعنی پیٹ بڑا نہ تھا) دونوں مونڈوں کے درمیان ذرا فاصلہ اور کشادگی مضبوط  
جوڑ و بند کپڑوں سے باہر جسم کا حصہ گورا (توڑھکے ہوئے کا کیا کہنا) حلق اور ناف  
کے درمیان بالوں کی ایک لکیر اس کے علاوہ چھاتیاں اور پیٹ بالوں سے خالی البتہ  
دونوں بازو اور کندھوں اور سنہ کے بالائی حصہ پر بال تھے۔ آپ کی کلاں یاں دراز  
ہتھیلیاں فراخ دونوں ہاتھ اور پیر پر گوشت اور گداز اور انگلیاں درازی مائل پیروں  
کے تلوے ذرا گہرے۔ قدم ایسے چکنے کہ پانی اس پر نہ ٹھہر سکے۔ جب قدم اٹھاتے  
تو زمیں سے اٹھا کر (یعنی گھسیٹ کر نہ چلتے) اور آگے کو جھک کر جب زمین پر قدم  
رکھتے تو آہستہ (متکبرانہ نہیں) تیز رفتاریوں معلوم ہوتا گویا پستی میں اتر رہے ہیں  
جب کسی کی طرف متوجہ ہوتے تو پورے جسم کے ساتھ (متکبروں کی طرف نہیں)  
نظریں نیچی بہ نسبت آسمان کے آپ نظر اکثر زمین کی طرف رہتی ہاں اگر وحی کا  
انتظار ہوتا تو آسمان کی طرف دیکھتے (اکثر گوشہ چشم سے دیکھتے) حیاء کی وجہ  
سے) چلتے میں اپنے صحابہ کو آگے رکھتے اور جس شخص سے ملتے پہلے اس کو خود سلام  
کرتے۔ (سبحان اللہ کیا حسن سیرت اور کیا جمال صورت تھا) (ترمذی شریف)  
(۱۳۰۷) حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ گذشتہ روایت فرما کر کہتے ہیں کہ  
ایک زمانہ تک اس حدیث کو میں نے اپنے بھائی حسن رضی اللہ عنہ سے ذکر  
نہیں کیا تھا پھر کے ذکر کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ تو مجھے سے پہلے وہ  
حدیث پوچھ کر سن چکے تھے بلکہ جو میں نے پوچھا تھا وہ بھی میرے ماموں  
سے پوچھ چکے تھے اور اس کے علاوہ اپنے والد ماجد سے آپ کے اندر  
تشریف لانے اور باہر آنے اور صحابہ کے درمیان آپ کے طور و طریق کا  
حال بھی پوچھ چکے تھے حتیٰ کہ کوئی بات انہوں نے نہ چھوڑی تھی (اب سنو)  
امام حسین رضی اللہ عنہ فرماتے کہ میں نے اپنے والد سے رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کے اندر تشریف لانے کے حالات دریافت کئے تو انہوں نے بیان  
کیا جب آپ اپنے گھر میں تشریف تو اس وقت کے تین حصے کرتے ایک  
حصہ اپنے رب کے لئے ایک اپنے گھر والوں کے لئے اور ایک اپنی راحت  
کے لئے پھر جو حصہ اپنے لئے رکھتے اس کو بھی خاص لوگوں کے ذریعہ سے  
عام لوگوں تک پہنچا دیتے اور ان سے کسی بات کا اخفاء نہ فرماتے تھے آپ کی

لَا يَدْخُرُ عَنْهُمْ شَيْئًا وَكَانَ مِنْ سِيرَتِهِ فِي  
جُزْءِ الْأُمَّةِ إِثَارُ أَهْلِ الْفَضْلِ بِأَذْنِهِ وَ  
قَسَمِهِ عَلَى قَدَرِ فَضْلِهِمْ فِي الدِّينِ فَمِنْهُمْ  
ذَوُ الْحَاجَةِ وَ مِنْهُمْ ذَوُ الْحَاجَتَيْنِ وَ مِنْهُمْ  
ذَوُ الْحَوَائِجِ فَيَتَسَاعَلُ بِهِمْ وَ يُسْتَعْلَمُ  
فِي مَا يُصْلِحُهُمْ وَ الْأُمَّةُ مِنْ مَسْئَلَتِهِمْ عَنْهُ  
وَ أَخْبَارُهُمْ بِالَّذِي يَنْبَغِي لَهُمْ وَ يَقُولُ  
لِيُبْلَغَ الشَّاهِدُ مِنْكُمْ الْغَائِبَ وَ ابْلَغُونِي  
حَاجَةً مَنْ لَا يَسْتَطِيعُ ابْلَاغَهَا فَإِنَّهُ مَنْ  
ابْلَغَ سُلْطَانًا حَاجَةً مَنْ لَا يَسْتَطِيعُ ابْلَاغَهَا  
ثَبَّتَ اللَّهُ قَدَمِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ لَا يُذَكِّرُ  
عِنْدَهُ إِلَّا ذَلِكَ وَ لَا يَقْبَلُ مِنْ أَحَدٍ غَيْرَهُ  
يَدْخُلُونَ رُؤُودًا وَ لَا يَفْتَرِقُونَ إِلَّا عَنْ  
ذَوَاقٍ وَ يَخْرُجُونَ أَدْلَةً يَعْنِي عَلَى الْخَيْرِ  
قَالَ فَسَأَلْتُهُ عَنْ مَخْرَجِهِ كَيْفَ كَانَ يَصْنَعُ  
فِيهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ يَحْزَنُ لِسَانَهُ إِلَّا فِيمَا يَعْنِيهِ وَ  
يُؤَلِّفُهُمْ وَ لَا يُنْفَرُهُمْ وَ يُكْرِمُ كَرِيمَ كُلِّ  
قَوْمٍ وَ يُؤَلِّيهُ عَلَيْهِمْ وَ يُحَذِّرُ النَّاسَ وَ  
يَحْتَرِسُ مِنْهُمْ مَنْ غَيْرِ أَنْ يَطْوِيَ عَلَى  
أَحَدٍ مِنْهُمْ بَشْرَهُ وَ لَا خُلُقَهُ وَ يَتَفَقَّدُ  
أَصْحَابَهُ وَ يَسْئَلُ النَّاسَ عَمَّا فِي النَّاسِ وَ  
يُحَسِّنُ الْحَسَنَ وَ يَقْوِيهِ وَ يَقْبَحُ الْقَبِيحَ وَ  
يُؤْهِيه. مُعْتَدِلُ الْأَمْرِ غَيْرُ مُخْتَلِفٍ وَ لَا  
يَغْفِلُ مُخَافَةً أَنْ يَغْفِلُوا وَ يَمْلُؤُوا. لِكُلِّ  
حَالٍ عِنْدَهُ عِتَادٌ لَا يَقْصُرُ عَنِ الْحَقِّ وَ لَا

عادت مبارکہ اس جزء میں جو آپ کی امت کے لئے ہوتا یہ تھی کہ صاحب  
فضیلت لوگ ہوتے ان کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور ان کے درمیان بھی  
دینداری کا لحاظ مقدم رکھتے پس لوگوں میں کوئی شخص ایک ضرورت والا کوئی  
دو ضرورت والا ہوتا اور کسی کی ضرورتیں اور زیادہ ہوتیں تو آپ ان کی  
ضروریات پورا فرمانے میں مشغول ہو جاتے اور ان کو ایسی باتوں میں  
مشغول کر دیتے جو ان کے بعد تمام امت کی اصلاح اور کارآمد کا سبب ہوں  
ا طرح پر کہ وہ اپنی ضرورت کی باتیں آپ سے پوچھتے رہتے اور آپ ان کو  
جو ان کے مناسب ہوتا بتاتے جاتے اور فرماتے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں  
وہ ان مضامین کو ان لوگوں کو بھی پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں نیز دیکھو یہ بھی  
ضروری ہے کہ جو شخص اپنی ضرورت کی خبر مجھ کو نہیں دے سکتا تم اس کی خبر مجھ  
کو دے دیا کرو کیونکہ جو شخص کسی اہل ضرورت کی ضرورت کسی باختیار شخص کو  
پہنچا دے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے قدم ڈمگانے سے محفوظ رکھے  
گا۔ بس آپ کے پاس ان ہی باتوں کا ذکر ہوتا تھا اور ان باتوں کے علاوہ آپ  
کسی سے اور کوئی بات نہ سنتے تھے آپ کی محفل میں جب لوگ آتے تو سائل اور  
محتاج کی حیثیت میں آتے اور جب واپس جاتے تو دین کے ہادی بن کر واپس  
ہوتے اور جب اٹھتے تو ضرور کچھ نہ کچھ کھاپی کراٹھتے (اگر اس وقت آپ کے گھر  
کچھ ہوتا) اور یہ بھی بیان فرمایا کہ میں نے آپ باہر تشریف لانے کے حالات بھی  
پوچھے کہ آپ اس میں کیا کیا کرتے تھے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم اپنی زبان سوائے مفید اور ضروری باتوں کے ہر قسم کی باتوں سے محفوظ رکھتے  
تھے اور لوگوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے کہ ان کو اور محبت پیدا اور نفرت نہ پیدا  
ہو ہر قبیلہ کے شریف شخص کی عزت کرتے اور اس کو ان پر والی اور افسر بناتے اور  
لوگوں کو بھی غیر ضروری باتوں سے بچنے کی ہدایت فرماتے اور خود بھی غیر ضروری  
اختلاط سے بچتے لیکن اس طرح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خندہ پیشانی اور خوش  
خلقی میں ذرا فرق نہ آسکے اور اپنے رفقاء کا حال دریافت کرتے رہتے اور لوگوں  
سے عام لوگوں کے حالات بھی پوچھتے اور اچھی بات کو اچھا کہتے اور اس کی  
تائید فرماتے اور بری بات کو برا کہتے اور اس کی تردید فرماتے ہر معاملہ میں اعتدال



يُجَاوِزُهُ. الَّذِينَ يُلُونَهُ خِيَارُهُمْ أَفْضَلُهُمْ  
عِنْدَهُ أَعْمَهُمْ نَصِيحَةً وَ أَعْظَمُهُمْ عِنْدَهُ  
مَنْزِلَةً أَحْسَنُهُمْ مُوَاسَاةً وَ مُوَازَرَةً قَالَ  
فَسَأَلْتُهُ عَنْ مَجْلِسِهِ فَقَالَ كَانَ رَسُولُ  
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُومُ وَ لَا  
يَجْلِسُ إِلَّا عَلَى ذِكْرٍ وَ إِذَا انْتَهَى إِلَى  
قَوْمٍ جَلَسَ حَيْثُ يُنْتَهَى بِهِ الْمَجْلِسُ وَ  
يَأْمُرُ بِذَلِكَ يُعْطَى كُلُّ جَلِيسٍ بِنَصِيْبِهِ  
وَ لَا يَحْسَبُ جَلِيسُهُ أَنْ أَحَدًا أَكْرَمُ عَلَيْهِ  
مِنْهُ. مَنْ جَالَسَهُ أَوْ فَاوَضَهُ فِي حَاجَةٍ  
صَابِرَةً حَتَّى يَكُونَ هُوَ الْمُنْصَرَفُ وَ مَنْ  
سَأَلَهُ حَاجَةً لَمْ يَرُدَّهُ إِلَّا بِهَا أَوْ بِمِثْلٍ  
مِنَ الْقَوْلِ قَدْ وَسَّعَ النَّاسُ بَسْطَهُ وَ خُلِقَهُ  
وَ مَنْ سَأَلَهُ حَاجَةً لَمْ يَرُدَّهُ إِلَّا بِهَا أَوْ  
بِمِثْلٍ مِنَ الْقَوْلِ قَدْ وَسَّعَ النَّاسُ  
بَسْطَهُ وَ خُلِقَهُ فَصَارَ لَهُمْ أَبَاوَصَارُوا  
عِنْدَهُ فِي الْحَقِّ سَوَاءً مَجْلِسُهُ مَجْلِسُ  
عِلْمٍ وَ حَيَاءٍ وَ صَبْرٍ وَ أَمَانَةٍ لَا تَرْفَعُ فِيهِ  
الْأَصْوَاتُ وَ لَا تُؤْبَنُ فِيهِ الْحُرُمُ وَ لَا تُنْشَى  
فَلَائِيهِ مُتَعَادِلِينَ يَتَفَاضِلُونَ فِيهِ بِالتَّقْوَى  
مُتَوَاضِعِينَ يُوقِرُونَ فِيهِ الْكَبِيرُ وَ  
يَرْحَمُونَ فِيهِ الصَّغِيرُ وَ يُؤَثِّرُونَ  
ذَاللْجَاجَةِ وَ يَحْفَظُونَ الْغَرِيبَ

(رواه الترمذی)

ہوتا افراط و تفریط کچھ نہیں لوگوں سے غافل نہ ہو جاتے اس خطرہ سے کہ کہیں  
وہ غافل نہ ہو جائیں یا اکتا جائیں۔ آپؐ کے یہاں بر بات کا ایک انتظام  
تھا حق بات میں نہ ذرا سی کوتاہی کرتے اور نہ ذرا اس سے آگے تجاوز  
فرماتے۔ جو لوگ آپؐ کے خاص ہم نشین ہوتے وہ وہی ہوتے جو ان میں  
بہتر سمجھے جاتے کہ آپؐ کے نزدیک افضل وہ ہوتا جو سب میں زیادہ  
مسلمانوں کا خیر خواہ ہوتا اور سب سے بڑا مرتبہ والا وہ ہوتا جو سب میں بڑھ  
کر لوگوں کا خیر خواہ اور ان کا مددگار ہوتا وہ کہتے ہیں اس کے بعد میں نے  
آپؐ کی محفل کا حال پوچھا تو میرے والد نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کی نشست و برخاست سب خدا تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ ہوتی تھی۔  
جب آپؐ خود کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں مجلس ختم ہوتی وہیں  
بیٹھ جاتے (اور آگے جانے کی سعی نہ کرتے) اور اسی بات کا دوسروں کو بھی  
حکم دیتے۔ اہل مجلس میں ہر شخص کی طرف التفات فرماتے حتیٰ کہ مجلس  
میں ہر شخص کو یہی خیال ہوتا تھا کہ آپؐ کے نزدیک اس سے بڑھ کر اور کوئی  
شخص قابل التفات نہیں ہے جو آپؐ کے ساتھ بیٹھتا یا کسی معاملہ میں بات  
چیت شروع کر دیتا تو آپؐ گورو کے رکھتا یہاں تک وہی خود واپس ہوتا اور جو  
شخص بھی آپؐ سے کچھ مانگتا آپؐ اس کو واپس نہیں کرتے مگر یا تو اس کی  
حاجت پوری فرما کر ورنہ کوئی مناسب بات فرما دیتے۔ آپؐ کی خندہ پیشانی  
اور آپؐ کے اخلاق اس طرح عام تھے کہ آپؐ ان کے والد کی جگہ تھے اور  
حق کے معاملہ میں تمام لوگ آپؐ کے نزدیک بالکل برابر اور ایک حیثیت  
رکھتے تھے آپؐ کی مجلس علم کی مجلس تھی شرم و صبر کی مجلس تھی اس میں کسی کی آواز  
اونچی نہ ہوتی اور کسی کی آبروریزی نہ کی جاتی اور اگر کسی سے کوئی لغزش ہو  
جاتی تو اس کو شہرت نہ دی جاتی۔ آپس میں سب برابر شمار ہوتے۔ ایک  
دوسرے پر فضیلت کا معیار تھا تو صرف تقویٰ تھا وہ سب باہم ایک دوسرے  
کے ساتھ تواضع سے پیش آتے۔ بڑے کی تعظیم کرتے اور چھوٹے سے محبت  
کرتے اور حاجت والے کو آگے کر دیتے اور مسافر شخص کی پوری نگرانی  
کرتے۔ (بخاری شریف)

(۱۳۰۸) عَنْ الْحَسَنِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ  
 بَنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ قَالَ  
 الْحُسَيْنُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ بَنِ عَلِيٍّ  
 رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ سَأَلْتُ أَبِي عَنْ سِيرَةِ  
 رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي  
 جُلُوسَاتِهِ فَقَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَائِمَ الْبُشْرِ سَهْلَ الْخُلُقِ لَيِّنَ  
 الْجَانِبِ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيظٍ وَلَا صَحَابٍ  
 وَلَا فَحَّاشٍ وَلَا عِتَابٍ وَلَا مَشَاحٍ يَتَغَافَلُ  
 عَمَّا لَا يَشْتَهُي وَلَا يُؤْلِسُ مِنْهُ وَلَا يَجِيبُ  
 فِيهِ قَدْ تَرَكَ نَفْسَهُ مِنْ ثَلَاثِ الْمَرَاعِ وَالْأَكْبَارِ  
 وَمَا لَا يَغْنِيهِ وَتَرَكَ النَّاسَ مِنْ ثَلَاثٍ  
 كَانَ لَا يَذُمُّ أَحَدًا وَلَا يُعَيِّبُهُ وَلَا يَطْلُبُ  
 عَوْرَتَهُ وَلَا يَتَكَلَّمُ إِلَّا فِيْمَا رَجَا ثَوَابَهُ وَإِذَا  
 تَكَلَّمَ أَطْرَقَ جُلُوسَاتُهُ كَأَنَّمَا عَلَى رُؤُسِهِمُ  
 الطَّيْرُ فَإِذَا سَكَتَ تَكَلَّمُوا لَا يَتَنَازَعُونَ عِنْدَهُ  
 الْحَدِيثُ وَمَنْ تَكَلَّمَ عِنْدَهُ انْصَتُوا لَهُ حَتَّى  
 يَفْرُغَ حَدِيثَهُمْ عِنْدَهُ حَدِيثٌ أَوَّلُهُمْ  
 يَضْحَكُ مِمَّا يَضْحَكُونَ مِنْهُ وَيَتَعَجَّبُ مِمَّا  
 يَتَعَجَّبُونَ وَيَضْرِبُ لِلْغَرِيبِ عَلَى الْجَفْوَةِ فِي  
 مَنْطِقِهِ وَمَسْأَلَتِهِ حَتَّى إِنْ كَانَ أَصْحَابُهُ  
 يَسْتَجْلِبُونَهُمْ وَيَقُولُ إِذَا رَأَيْتُمْ طَالِبَ حَاجَةٍ

(۱۳۰۸) امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام حسینؑ نے کہا کہ میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور کا اپنے اہل مجلس کے ساتھ طرز پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ہمیشہ خندہ پیشانی خوش خلقی کے ساتھ متصف رہتے تھے کسی بات میں آپ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تھی تو سہولت سے موافق ہو جاتے تھے نہ آپ بد خو تھے نہ سخت گو اور نہ سخت دل نہ آپ چلا کر بولتے تھے نہ بد کلامی فرماتے تھے نہ عیب گیر تھے۔ ناپسند بات سے اعراض فرماتے دوسرے کی کوئی خواہش آپ کو پسند نہ آتی تو اس کو مایوس بھی نہ فرماتے اور صاف جواب بھی نہ دیتے تھے۔ آپ نے تین باتوں سے اپنے آپ کو مبرا فرما رکھا تھا جھگڑے سے اور تکبر سے اور بیکار بات سے اور تین باتوں سے لوگوں کو بچا رکھا تھا نہ کسی کی مذمت فرماتے نہ کسی کو عیب لگاتے نہ کسی کے عیوب تلاش فرماتے آپ صرف وہی کلام فرماتے جو باعث اجر ہوتا جب آپ گفتگو فرماتے تو آپ صحابہ اُس طرح گردن جھکا کر بیٹھتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں جب آپ چپ ہو جاتے تب وہ حضرات کلام کرتے آپ کے سامنے کسی بات میں نزاع نہ کرتے آپ سے جب کوئی شخص بات کرتا تو اس کے خاموش ہونے تک سب ساکت رہتے ہر شخص کی بات (توجہ سے سننے میں) ایسی ہوتی جیسے پہلے شخص کی گفتگو (یعنی بے قدری سے کسی کی بات نہ سنی جاتی) جس بات سے سب ہنستے آپ بھی تبسم فرماتے اور جس سے سب لوگ تعجب کرتے تو آپ بھی تعجب میں شریک رہتے یہ نہیں کہ سب سے الگ چپ چاپ بیٹھے رہیں مسافر آدمی کی سخت گفتگو اور بے تمیزی کے ہر سوال پر صبر فرماتے اسی لئے بعض صحابہ آپ کی مجلس اقدس تک مسافروں کو کراہیا کرتے تھے (تاکہ ان کے جا بے جا ہر قسم کے سوالات سے خود بھی منتفع ہوں اور وہ امور جو اذیت کی وجہ سے یہ حضرات خود نہ پوچھ سکتے تھے وہ بھی معلوم ہو جائیں) آپ یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی طالب

(۱۳۰۸) \* حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی ان دو حدیثوں میں حیات انسانی کے کتنے اہم اسباق آپ کو عملاً سکھا دیئے گئے ہیں اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات صرف علمی اور درسی رنگ میں نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ہوتی ہیں اسی لئے شروع میں ہم نے تنبیہ کی تھی کہ شامل کی حدیثوں کو صرف سرسری طور پر پڑھنا نہیں چاہئے بلکہ اس کو تکمیل انسانیت کا ایک اہم جز سمجھ کر پڑھنا چاہئے افسوس ہے کہ اس وقت اس کی تفصیل کے لئے وقت میں کنجاش نہیں ہے۔ اللہ.....



يَطْلُبُهَا فَارْفِدُوهُ وَلَا يَقْبَلُ الشَّاءَ إِلَّا مِنْ  
مُكَافِي وَلَا يَقْطَعُ عَلَى أَحَدٍ حَدِيثَهُ حَتَّى  
يَجُوزَ فَيَقْطَعَهُ بِنَهْيِ أَوْ قِيَامِ.

(رواه الترمذی)

حاجب کو دیکھو تو اس کی امداد کیا کرو (اگر آپ کی کوئی تعریف کرتا تو آپ اس کو  
گوارا نہ فرماتے) البتہ بطور شکریہ اور اداء احسان کے ذیل میں کوئی آپ کی تعریف  
کرتا تو آپ اس پر سکوت فرما لیتے کسی کی گفتگو کو قطع نہ فرماتے البتہ اگر کوئی حد  
سے تجاوز کرنے لگتا تو اس کی کوروک دیتے یا کھڑے ہو جاتے تاکہ وہ خود رک جائے۔

## مَشْتِ



اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ سَيِّدِنَا آدَمَ وَ سَيِّدِنَا إِبْرَاهِيمَ وَ سَيِّدِنَا مُوسَى وَ سَيِّدِنَا عِيسَى وَ مَا بَيْنَهُمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَ  
الْمُرْسَلِينَ صَلَوَاتٍ وَ سَلَامَةٍ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِينَ.

یا رحمة الله انی خائف و جل  
و لیس لی عمل القی العلیم به  
فکن امانی من شر الحیوة و من  
تَحِیة الصمد المولی و رحمته  
یا نعمة الله انی مفلس عافی  
سوی محبتک العظمی و ایمانی  
شر الممات و من احراق جُثمانی  
ما غنت، الورق فی اوراق اغصانی

اللهم صلی علی سیدنا محمد و علی آل سیدنا محمد صلوة تكون لك رضا وله جزاء و لحقه اداء و اعطه  
الوسيلة و الفضيلة و الما قام المحمود الذی و عذته و اجزه عنا ما هوا هله و اجزه افضل ما جازیت نبیا عن  
قومه و رسولا عن امته و صل علی جمیع اخوانه من النیین و الصالحین یا ارحم الراحمین . (آمین)

## استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں انشاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔  
نشاندہی کے لئے ہم بے حد شکرگزار ہوں گے۔

(ادارہ)



